روشنی کم، تپش زیادہ

عُریانی، فُحش نگاری اور اخلاقی احتساب

علی اِقبال

rekhta

جملہ حقوق محفوظ بحقِ مُرتب ومُدّون

اشاعتِ اوّل : (پاکستان میں) ۲۰۱۱ء
پبلشر : رائل بک کمپنی
BG-5 ریکس سینٹر فاطمہ جناح روڈ
کراچی 75530، پاکستان
فون نمبر: 35653418، 35684244، 37015471،
فیکس 92-21-37015472
ای میل: royalbook@hotmail.com
ویب سائٹ: www.royalbook.com.pk
مطبع : ذکی سنز پرنٹرز کراچی
کمپوزنگ : ڈیسنٹ پرنٹ انٹرپرائزز کراچی، فون: 32700131

ISBN: 978-969-407-359-0

اِقبالؔ کے اس شعر کے نام ؎

ناپاک جسے کہتی تھی مشرق کی شریعت
مغرب کے فقیہوں کا یہ فتویٰ ہے کہ ہے پاک!

(بال جبریل)

rekhta

مشمولات

ابتدائیہ	علی اقبال	۱۹
تقریظ	شان الحق حقی	۲۹
پیشِ لفظ	ڈاکٹر منظور احمد	۳۳

شاعری

’بے شرمی‘ کی باتیں	الطاف حسین حالی	۳۹
مطلق عُریاں، یکسر حیا سوز	نیاز فتح پوری	۳۹
اخلاقی اور غیر اخلاقی شاعری	نیاز فتح پوری	۳۹
فاسقانہ شاعری	حسرت موہانی	۴۰
’نئی‘ شاعری	محمد حسن عسکری	۴۱
ابہام یا فحاشی	ن م راشد	۵۴
زمانہ بدل چکا ہے	جلیل قدوائی	۵۵
پرانا معیار	ابو اللیث صدیقی	۵۵
شاعری میں جنس نگاری	قاضی محمد اختر جونا گڑھی	۵۷
فضول توقع	یونس حسنی	۶۰
’جنسی‘ شاعری	کامل القادری	۶۱
جذبات کی قے	خواجہ رضی حیدر	۶۲

rekhta

دیگر اصناف

تاریخ نگاری	مہدی حسن افادی گورکھ پوری	۶۵
'ادبِ لطیف'	آلِ احمد سرور	۶۵
داستانیں	گیان چند جین	۶۵
ڈراما	احمد ندیم قاسمی	۶۶
لطیفے	'ساحل' کراچی	۶۶
پروز پوئم (نثری نظم)	قمر جمیل	۶۹

ادب

عریانی کا تصور	برٹرینڈ رسل	۷۳
فکشن اور فحش نگاری	ڈی ایچ لارنس	۷۴
عریانی کے مفہوم کا ازسرِنو تعین	ہیولاک ایلس	۷۶

☆☆☆

ادب میں عریانی	کلیم الدین احمد	۹۷
ادب میں عریانی اور فحاشی	عندلیب شادانی	۹۸
ادب اور فن میں فحش کا مسئلہ	محمد حسن عسکری	۱۰۹
بات عریانی کی	محمد حسن	۱۲۱
ادبیات میں ابتذال	ن م راشد	۱۲۵
رنگینی اور شوخ نگاری	ن م راشد	۱۲۸
ادب، فحاشی اور سماجی قدریں	سید محمد تقی	۱۲۹
ادب میں عریانی کا سوال	محمد احسن فاروقی	۱۳۳
فحاشی کی تعبیریں	سلیم اختر	۱۴۱

rekhta

فحش ادب کیا ہے!	شہزاد منظر	۱۴۹
ادب اور فحاشی	اے بی اشرف	۱۶۷
ادبی فحاشی	طاہر جاوید مغل	۱۷۲
فحشیات اور جنسیات	رئیس امروہوی	۱۷۵
افسانوی ادب اور فحش نگاری	خالد ارمان	۱۷۸
زبان کے زخم	زاہدہ حنا	۱۸۳
جنس اور ادب و فن	علی عباس جلالپوری	۲۰۷
ادب اور جنس	وزیر آغا	۲۲۱
ادب میں جنس اور زندگی	سلیم اختر	۲۲۷
ادب اور جنسی خواہشات	عالم صحرائی	۲۳۰

'نیا' ادب

'نئے' ادب کے تار و پود	رشید احمد صدیقی	۲۳۵
نام نہاد ادب	ابو الاعلیٰ مودودی	۲۴۰
رنگینیٔ عبارت	ماہر القادری	۲۴۳
نصب العین کا مسئلہ	جسٹس (ریٹائرڈ) ڈاکٹر جاوید اقبال	۲۴۶
جنسی موضوع	عزیز احمد	۲۵۷
جنسی حقیقت نگاری	ممتاز شیریں	۲۶۱
مزاج اور طبیعت کا میل	اوپندر ناتھ اشک	۲۶۳

☆☆☆☆☆

ترقی پسندوں کی نمائندگی	سید سجاد ظہیر	۲۶۳

قدامت پرستوں کے حملے	سردار جعفری	۲۶۴
مختلف آوازیں	سید احتشام حسین	۲۶۵
فحاشی مقصود بالذات	سید احتشام حسین	۲۸۸
جنسی جذبے کی اوّلیت	ممتاز حسین	۲۸۰
موضوعِ گفتگو	دین محمد تاثیر	۲۸۲
حقیقت نگاری اور عریانی	آل احمد سرور	۲۹۴
اس نوع کی تنقید	فیض احمد فیض	۲۹۷
'ادب جدید'	سعادت حسن منٹو	۲۹۹
یہ فحش نگاری کیا ہوتی ہے!	عصمت چغتائی	۳۰۵
ادیبوں کا نصب العین	احمد ندیم قاسمی	۳۱۱

چوں کفر از کعبہ برخیزد......

شیخ سعدی کی حُسن پسندی	شبلی نعمانی	۳۲۳
ایشیائی شعراء	شبلی نعمانی	۳۲۳
قُلقلِ مینا	عطاءاللہ پالوی	۳۲۳
اسلامی شاعری پر بہتان	سلیم احمد	۳۲۴
مطائباتِ مولانا رومؒ	علی عباس جلالپوری	۳۲۵
خُسرو	ن م راشد	۳۲۷
فحاشی کا سرچشمہ	طلوعِ اسلام، کراچی	۳۳۱
وعظ یا میڈیکل لیکچر!	عنایت اللہ المشرقی	۳۳۴
یہ پورنوگرافی نہیں ہے	ڈاکٹر مبین اختر	۳۳۴
ناپاک حالتیں	عباس ناصر مرزا	۳۳۶

کتابیں

گفتنی، ناگفتنی	ستار طاہر	۳۴۱
مطالعہ کا چسکا	محمد بدر منیر	۳۴۷
عورتیں کیا پڑھتی ہیں!	مولانا صلاح الدین احمد	۳۵۵
لڑکیاں اور فحش بینی	زاہدہ حنا	۳۵۶
ایک اقرار	مصطفےٰ زیدی	۳۶۲

فنونِ لطیفہ

عُریاں آرٹ اور نیم ' آرٹ	مرتضیٰ رضوی	۳۶۵

تھیٹر

تماشہ جاری ہے	مدیحہ گوہر	۳۷۱
اور پھر بغلیں بجائی گئیں	فرائی ڈے ٹائمز	۳۷۶
پارسی سے پارسا تھیٹر تک	خالد احمد	۳۷۸
تھیٹروں پر پولیس کے چھاپے	خالد احمد	۳۸۱
کیا تفریح گناہ ہے!	خالد احمد	۳۸۳

فلم

اردو، پنجابی فلمیں	فوزیہ رفیق	۳۸۷
۱۹۹۶ء کی سیکسی فلمیں	ثاقب ملک	۳۹۱

☆☆☆☆☆

فلمیں اور موسیقی	عقاب (کراچی)	۳۹۶
فلمیں اور رقص	دوشیزہ (کراچی)	۳۹۸

(ب)

بلیو فلمیں	حسن منظر	۴۰۳

انٹرنیٹ

فحاشی اور نئی دنیا	مُبین مرزا	۴۱۳
انٹرنیٹ اور معاشرہ	ریحان احمد یوسفی	۴۲۹
فحش سائنس	'اشراق'	۴۳۲
انٹرنیٹ: امکانات وخطرات	'دیسوی'	۴۳۴
ابوظہبی کے اسکولوں میں	انجنا سرکار	۴۳۶
آخری قہقہہ	'سنڈے ٹیلی گراف' لندن	۴۳۸
ایک کالم	آرٹ بک والڈ	۴۳۹

صُورتِ احوال

ملبوس کی عُریانیاں	'دوشیزہ' کراچی	۴۴۳
زیرجاموں کی ایک نمائش	فریحہ الطاف	۴۴۷
اپنی زبان سنبھالئے' پلیز	'چوئس' کراچی	۴۵۵
'چلو جاؤ' آئندہ احتیاط برتنا'	میاں اعجاز الحسنان	۴۵۲

'ذرا سنئے تو'......(معذورات)

(ہزل گو شعراء)

بات کھری کھری	رفیع احمد خاں	۴۵۹
لیاقت وصلاحیت	جوش ملیح آبادی	۴۵۹

(شعراء)

لذتوں کا پُر خلوص اظہار	فراق گورکھ پوری	۴۶۰

فحاشی کے عناصر	ن م راشد	۴۶۴
الزامات	ن م راشد	۴۶۶
معانی سازی	ن م راشد	۴۶۸
جنسی حیثیت	میراجی	۴۶۸
’مجھے کبھی تائب نہیں ہونا پڑا‘	سلیم احمد	۴۶۹
عریانی اور فحاشی میں فرق	سلیم احمد	۴۷۰

(شاعرات)

فحش نظمیں	فہمیدہ ریاض	۴۷۲
میری نظمیں فحش نہیں	فہمیدہ ریاض	۴۷۲
راہ کے پتھر	پروین شاکر	۴۷۳

(نثر نگار)

خیریّت کا نام سنجیدگی	مہدی حسن افادی گورکھ پوری	۴۷۴
عریانیات کوئی عیب نہیں	عطاءاللہ پالوی	۴۷۴
طرزِ بیان کی بے حجابی	قاضی عبدالغفار	۴۷۶
جنسِ کاسد	شورش کاشمیری	۴۷۷
افسانہ نگار اور جنسی مسائل	سعادت حسن منٹو	۴۷۸
سفید جھوٹ	سعادت حسن منٹو	۴۸۲
’دھواں‘ اور ’کالی شلوار‘ کے بارے میں	سعادت حسن منٹو	۴۹۱
پانچواں مقدمہ	سعادت حسن منٹو	۴۹۷
غلاظت تو ان کے اپنے دماغ میں ہے	عصمت چغتائی	۵۰۵
شہرت نہیں بدنامی کہیے	عصمت چغتائی	۵۰۶

rekhta

گندی سے گندی بات	محمد حسن عسکری	۵۰۹
میں عریانی پر کیوں اتر آتا ہوں!	محمد احسن فاروقی	۵۱۱

پردہ پوشی	ممتاز مفتی	۵۱۸
میں جان بُوجھ کر نہیں کرتا	اشفاق احمد	۵۱۸
اظہارِ حقیقت	ایم شفیق بریلوی	۵۱۹
میرا ناول فحش نہیں	حاجی فضل الرحمٰن خاں	۵۱۹

ایک بدنیت بڑے میاں	خوش ونت سنگھ	۵۲۰
بے اعتدالیوں کی بے نقابی	سلیم اختر	۵۲۱

عصمت کو بھی مات دے دی	واجدہ تبسم	۵۲۱
فحش نگاری کی انتہا کر دی	واجدہ تبسم	۵۲۲

پورنوگرافی کی تلاش	امریتا پریتم	۵۲۳
نفسیاتی خانہ تلاشی	امریتا پریتم	۵۲۳
عصمت کا اثر	ہاجرہ مسرور	۵۲۴
محض الزام	رضیہ بٹ	۵۲۴
معاشرے کی عکاسی	بُشرہ رحمان	۵۲۵

فحاشی کا فتویٰ	کشور ناہید	۵۲۵
اے کی لکھ دِتا اے!	پروین عاطف	۵۲۵

(ناشرین)

روشنی کم، تپش زیادہ	مورس ژیغورس	۵۲۶

(ب)

پہلا پتھر	ستار طاہر	۵۳۷
جھوٹ کا پٹارا	محمد عباس	۵۳۸
بُرا آدمی	سرور سکھیرا	۵۳۹
'جسمانے'	خالد ارمان	۵۴۰
دیگ کا ایک دانہ	'دھنک' (لاہور)	۵۴۲

(ج)

'نجو زمانی باپ'!	'پکار' لائل پور	۵۴۸
ہمارا قصور!	'عکس' (ملتان)	۵۴۹
'ناپاک شے'	'شالیمار' (لاہور)	۵۵۰

(مُصوران)

عریانی نہیں، برہنگی	آذر زوبی	۵۵۱
جُز نہیں، کُل	آذر زُوبی	۵۵۲
سفاکانہ مُبہم	صادقین	۵۵۲
ریشمی سیاہ برقعہ	(احمد سعید) ناگی	۵۵۲
ارتعاش	جمیل نقش	۵۵۳
بے لباس خاکے	اے آر ناگوری	۵۵۳
ردِ عمل	جمال شاہ	۵۵۴

☆☆☆

فطری اظہار	لیلیٰ شہزادہ	۵۵۴
شور مچانے کی ضرورت!	شاکرہ ہادی	۵۵۵
ہیومن نیوڈز	سُنبل نذیر	۵۵۵

بلا جھجک تعاون	رفعت علیانی	۵۵۶

(فنکارائیں)

’بُری‘ عورت	مدیحہ گوہر	۵۵۶
بُرقع اوڑھ کر	ناہید صدیقی	۵۵۶
مجھے یاد ہے	ناہید صدیقی	۵۵۷
دروازے پر دستک	نگہت چودھری	۵۵۷
اعضاء کی شاعری	شبانہ شیخ	۵۵۷
شہرت کے بھوکے	انیتا ایوب	۵۵۸

(ہیروئنیں)

سوچ اور ’اپروچ‘	روحی بانو	۵۵۸
آخر ’سیکس‘ ہے کیا!	میرا	۵۵۸

(ب)

ایک بڑی اداکار کا مشورہ	شمع	۵۵۹
رول کا تقاضہ	عاشی	۵۶۰
عوام کا ردِ عمل	فردوسی	۵۶۰
عوام کا مزاج	نجمہ رومانی	۵۶۰
عریانی کا زینہ	نجمہ	۵۶۱
میرا کیا قصور!	نجمی	۵۶۱
آہ آہ، واہ واہ!	نغمی	۵۶۱

(ہدایت کار)

عریانی کا سیلاب	دلجیت مرزا	۵۶۲
دوطرفہ ذمہ داری	نعمان	۵۶۲

سینماٹوگرافی ایکٹ کا مطالعہ	اسلم ڈار	۵۶۲
عریانی کی لہر	سیّد نور	۵۶۳
’بری بات‘	شہزاد رائے	۵۶۴

(سنسر بورڈ کے اراکین)

آنکھیں شرم سے جھک جاتی ہیں	رانی	۵۶۵
میری مجبوری	مولانا عبدالقادر	۵۶۶

(پی ٹی وی والے)

پاکستان ٹیلی ویژن کے پروگرامز	آغا ناصر	۵۶۷
فیصلہ کا حق	طلعت حسین	۵۶۸

عریانی کے خلاف محاذ

اسلام کے نام پر یلغار	عبدالسّلام خورشید	۵۷۱
اپنی پسند کا اخلاق	رفیع اللہ شہاب	۵۷۵
عریانیت کیا ہے!	ایم صدیقی	۵۷۷
ایک پرانی بات	الحان نیاز	۵۸۰
عُریانی سے جنگ	ایس‘ طلعت	۵۸۳
فحش فحش فحش‘ اُڑا دے ہوش	جمیل اختر	۵۸۵
فحاشی کا ایک اور دورہ	خالد احمد	۵۹۱

☆☆☆☆☆

تھوڑی سی سیکس اور، پلیز	سعدیہ دہلوی	۵۹۵

اخلاقی احتساب

قوانین اشاعت برٹرینڈ رسل ۶۰۱
جنسی آزادی ٹائن بی، دیاگوا کیڈا ۶۰۲
غلط اور صحیح کا تعین ٹائن بی، دیاگوا کیڈا ۶۰۹
فحاشی اور احتساب ایک مذاکرہ ۶۱۳
احتساب: ریاستی اور وفاقی این رین ۶۱۷

☆☆☆☆☆

"اقبال" اور فحشیات عطاء اللہ یالوی ۶۳۶
حسرت موہانی اور عریانی سید سجاد ظہیر ۶۳۷
بزرگ بمقابلہ نوجوان کرشن چندر ۶۳۹
اقدار سے بغاوت محمد حسن عسکری ۶۴۰
واضح حل ن م راشد ۶۴۱

احتسابی ادارے

سنسر بورڈ 'فلم بین' ۶۴۵
پیمرا، عوامی ذوق کی ضابطہ بندی ڈاکٹر خلیل احمد ۶۵۰

عدالتی فیصلے

'یولی سیز' جیمز جائس ۶۵۵
'گوڈز لیٹل ایکر' ارسکن کالڈویل ۶۶۱

☆☆☆☆☆

اسد اللہ خاں غالبؔ بنام مولوی امین الدین مولوی عبدالحق ۶۶۳

☆☆☆☆☆

‘ٹھنڈا گوشت’ سعادت حسن منٹو ۶۸۶
(۱) مجسٹریٹ درجۂ اول
(۲) اپیل برائے سیشن
(۳) اپیل برائے ہائیکورٹ
‘بو’ سعادت حسن منٹو ۶۹۸
‘میری ایکٹریس بھابی’ عصمت چغتائی ۷۰۰
‘وہ بچہ کیا جانے!’ عشرت رحمانی ۷۰۹
‘وہ آوارہ ہوگئی’ سعید امرت ۷۱۸
‘آفت کا ٹکڑا’ حاجی فضل الرحمٰن خاں ۷۲۲
‘ضبط شدہ’ پینٹنگز (بملکیت ‘جے اے رحیم) ۷۲۴

۹ فہرستیں

پہلی فہرست سات نام ۷۳۱
دوسری فہرست دو نام ۷۳۹
تیسری فہرست ایک نام ۷۴۰
چوتھی فہرست کئی نام ۷۵۲

(ب)

پانچویں فہرست کئی نیک نام ۷۶۲
چھٹی فہرست ‘مشہور’ لکھنے والوں کی ‘بدنام’ تحریریں ۷۶۵
ساتویں فہرست خواتین کے پرکشش ناموں سے لکھنے والے ۷۷۲
آٹھویں فہرست بدنام خودنوشتیں/خطوط ۷۷۳

نویں فہرست ناحق بدنام تحریریں ۷۷۵
ماٰخذ: (اردو) ۷۷۶
ماٰخذ: (انگریزی) ۷۸۳
Recommended Readings ۷۹۹
اِشاریہ ۸۰۰

rekhta

اِبتدائیہ

علی اقبال

مذہب اور سیاست کی طرح، سیکس یعنی جنس بھی ایک نہایت احتیاط طلب موضوع سمجھا جاتا ہے اور مشرق کے بند معاشروں میں آدابِ محفل کا لحاظ رکھنے والے اس پر گفتگو کرنے سے گریز کرتے ہیں۔ صنفیات اور حیاتیات کے حوالے سے تو اس موضوع پر بولنے اور لکھنے کی اجازت ہوتی ہے، ورنہ کسی اور پہلو سے، خصوصاً جمالیات کے حوالے سے اس موضوع پر طبع آزمائی کی جسارت کو مستحسن نظروں سے نہیں دیکھا جاتا۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے معیاری ادب و فنون میں اس موضوع کی طرف ہلکے سے اشارے بھی نہیں ملتے۔

بہر حال، اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ جنسی موضوع مشرق میں ہمیشہ سے ممنوع رہا ہے کیوں کہ حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے اور صنفیاتی ادب کے بیشتر فحش پارے، قدیم ہندوستان، چین، جاپان اور عرب دنیا ہی کے رہینِ منت ہیں۔ قدیم مصریوں ہی کو لے لیجیے۔ جنسی امور سے جتنی دلچسپی انھیں تھی اور جس برہنگی کے آثار ان کی معبدوں میں پائے گئے ہیں، وہ تو نئی تہذیب سے بھی کچھ آگے کی بات لگتی ہے۔ ان کی جنس نوازی بلکہ فحش پروری اور فحش پرستی کا یہ عالم تھا کہ وہ نہ صرف مختلف صورتوں میں جنس کی پوجا کرتے تھے بلکہ اپنے مُردوں کے دل بہلاوے کی خاطر، عریاں اور فحش مواد ان کی قبروں میں بھی رکھ دیا کرتے تھے۔

جہاں تک جنسی معاملات کے اظہار پر قدغن کا تعلق ہے تو خواہ وہ مشرق ہو یا مغرب، یہ ایک نہایت ہی قدیم مسئلہ رہا ہے کیوں کہ اخلاقی احتساب کے بارے میں باقاعدہ بحث تو افلاطون کے دور سے پہلے ہی شروع ہو چکی تھی۔ اے ڈی ۳۸۰ میں، یونانی شاعرہ سیفو کی نظموں کو قسطنطنیہ کے اُسقف کے حکم سے نذرِ آتش اس لئے کیا گیا تھا کہ وہ شہوانی تھیں۔ البتہ بیہودہ گوئی، جنسی حقیقت نگاری، عریاں نویسی، فحش نگاری، ہوس نگاری، شہوت نگاری، نجاست نگاری، فضلاتیات، ہزلیات اور لذّت نگاری جیسی اصطلاحات وقت کے ساتھ ساتھ ڈھلتی رہی ہیں۔

۱۵۵۷ء میں عیسائی کلیسا نے ممنوعہ کتب کی ایک فہرست تیار کی اور اپنے تمام پیروؤں کو ان

کتابوں کے مطالعے سے روک دیا۔ بعد ازاں کلیسا نے عریانی کو بہتر طور پر سمجھنے کے لئے اسے چار مختلف خانوں میں بانٹ دیا: 'فطری' عریانی آدم و حوا کی جنت بدری سے پہلے ان کی بے لباسی تھی۔ 'عارضی' عریانی سے مراد دنیوی مال و متاع کی کمی سے لی گئی' 'باعصمت عریانی' اسے کہا گیا جسے سچائی کی طرح کسی پوشیدگی کی ضرورت نہیں، جب کہ 'مجرمانہ' عریانی وہ ٹھہری جو تمام اخلاقی برائیوں کی جڑ ہے اور شیطان جس کی علامت۔

عریانی و فحاشی کی اصطلاحات اکثر و بیش تر مترادفات کے طور پر استعمال ہوتی ہیں حالاں کہ ان دونوں میں بعد المشر قین ہے۔ عریانی اگر جمالیات کا تصور ہے تو فحاشی کا تعلق سماجیات سے بنتا ہے اور جو صرف پیچیدہ تہذیبوں تک محدود ہے۔ ہر معاشرے میں ناشائستگی اور آداب شکنی کے اپنے اپنے الگ اصول قائم ہیں، مثلاً بعض قدامت پرست معاشروں میں شوہر کا نام لینا معیوب سمجھا جاتا ہے۔ غرض یہ کہ یہ ایک ایسا عمیق اور اتنا وسیع موضوع ہے جس کی جڑیں ایک سے زائد معاشرتی علوم سے پیوست ہیں۔ آج کی مغربی تہذیب کی اہم ترین شناخت یعنی سول لبرٹیز اور آزادیٔ اظہار کے تصورات بھی اسی بحث کے مختلف رخ ہیں۔

عریانی و فحاشی بنیادی طور پر ایسے اضافی تصورات کے زمرے میں آتے ہیں جن کی بابت رد و قبول کے معیار نہ صرف ہر عہد اور ہر عہد کے مختلف معاشروں کے لیے، بلکہ ایک ہی معاشرے کے مختلف طبقوں کے لیے، مختلف پائے گئے ہیں۔ امریکا میں پائی جانے والی عریانی بہت سوں کے نزدیک انتہا پسندی کی ایک مثال ہے مگر خود امریکیوں کا خیال ہے کہ یورپ کے اکثر ٹی وی اسٹیشنوں کے مقابلے میں امریکی ٹی وی کے پروگرامز بہت متوازن اور محتاط ہوتے ہیں اس لئے کہ اٹلی میں ٹیلی ویژن پر سترکشائی کے علاوہ جسمانی ملاپ کی جھلکیاں بھی پیش کر دی جاتی ہیں۔ فرانس میں اس قسم کے لیٹ نائٹ پروگرام سے پہلے ٹی وی کے پردے پر ایک سفید بکس ابھرتا ہے جو اس بات کا اشارہ ہوتا ہے کہ اب بچوں کو سلا دیا جائے۔ میکسیکو میں یہ پابندی عائد ہے کہ ایک صفحے پر صرف ایک چھاتی دکھائی جا سکتی ہے جب کہ جاپان میں صرف موئے زہار کی نمائش ممنوع ہے۔

عریانی و فحاشی کے بارے میں کئی ایک فکری مغالطے عام ہیں مگر اس چیستاں کو سمجھنے کے لئے، مغرب میں بڑی فکر انگیز، عالمانہ اور عملی کوششیں کی جا چکی ہیں اور اس موضوع کے مذہبی، سماجی، تاریخی، قانونی، نفسیاتی، ادبی، فنی اور جمالیاتی پہلوؤں پر تحقیق کے دوران کئی سوالات زیرِ بحث آ چکے ہیں، مثلاً یہ کہ عریانی و فحاشی کے ان لفظی عفریتوں میں کیا معنویت مضمر ہے اور کیا ان اصطلاحات کی کوئی جامع اور متفقہ تعریف ممکن ہے! فحاشی کوئی مہلک مرض ہے، مرض کی علامت ہے یا محض تفریح کا ایک بے ضرر

ذریعہ! آیا اس کا کوئی تزکیاتی پہلو بھی ہے اور اس سے کوئی مفید کام لیا جاسکتا ہے! عریانی وفحاشی کے محرکات کیا ہیں! آیا فحش نگاری جنسی جذبات کو بھڑکاتی ہے یا بھڑکے ہوئے جذبات کو ٹھنڈا کرتی ہے! محض الفاظ کے ذریعے سفلی جذبات کیوں کر بھڑکتے ہیں! آیا فحش نگاری اور جنسی جرائم کے درمیان علت ومعلول کا کوئی ایسا رشتہ ہے جسے منطقی طور پر ثابت کیا جاسکے! کیا عریانی وفحاشی کے دیرپا اثرات بھی ہوتے ہیں! عریانی وفحاشی کی کتنی اقسام ہیں اور کیا ان پر محض قانون کے بل بوتے پر قابو پایا جاسکتا ہے! فن اور فحاشی کے درمیان خطِ امتیاز کیسے کھینچا جائے اور یہ حق کیسے حاصل ہوگا! ایک طرف، سماجی اور اخلاقی تقاضوں اور دوسری طرف حریتِ فکر اور شخصی ذوق کے تقاضوں کے مابین رواداری کے حدود کا تعین کیسے کیا جائے؟ آیا ان ماہرین کے لئے بھی کسی تربیتی نصاب کی ضرورت ہے جو اپنی علمیت کی بنیاد پر اس نزاعی مسئلے کے سلسلے میں، عدالتوں کے سامنے، بطور گواہان پیش ہوتے ہیں! آیا فحش مواد کا اثر خواتین پر یکساں ہوتا ہے، اور اگر نہیں تو اس کی وجوہ حیاتیاتی ہیں یا محض معاشرتی! آیا فحش نگاری سے حقوقِ نسواں مجروح ہوتے ہیں۔ اور یہ کہ فحش نگاری کے اثرات سے بچوں کو کس طرح محفوظ رکھا جائے!

افلاطون وہ پہلا شخص تھا جس نے آزادیٔ اظہار کے حدود کی کھل کر بات کی۔ اس کے تمام دلائل یونان کے طبقۂ اشرافیہ کے طابع تھے جس کا وہ ترجمان تھا۔ وہ غلامی کا بھی حامی تھا۔ فنی آزادی کے اخلاقی اور سیاسی حدود کا تصور اس کے سامنے تھا جسے اس نے اپنی بھرپور ذہانت کے ساتھ جمالیات پر استعمال کیا۔ اس کا واضح موقف تھا کہ فنونِ لطیفہ کو معاشرے کے سیاسی اور اخلاقی مقاصد کا طابع ہونا چاہئے۔ اس نے اپنی 'جمہوریہ' میں صاف صاف لکھا کہ بچوں کو ان کی مائیں اور انائیں وہی کہانیاں سناسکتی ہیں جن کی انھیں اجازت دی گئی ہو۔ افلاطون کی 'اطوفیہ' میں شعرا اور ڈراما نگاروں کے لئے بھی کوئی جگہ نہ تھی۔ اس نے موسیقی کی ایسی تمام دھنوں پر پابندی چاہی جو جذبات ٹھنڈے کرتی ہوں یا غم کے جذبات ابھارتی ہوں۔

کہنے کو تو ملٹن کا تعلق بھی طبقۂ اشراف ہی سے تھا مگر افلاطون کے برعکس ملٹن کو انسانی ذات پر زیادہ ہی بھروسا تھا کیوں کہ تربیت کے لحاظ سے وہ مسلکِ انسانیت کا پیرو تھا۔ اس نے اپنی کتاب 'اریوپیجیٹکا' میں فن کاروں کے لئے مکمل آزادی کی وکالت کی ہے، مگر یاد رہے کہ اس کی یہ لامحدود فکری آزادی نفاست پسندوں اور اہلِ ذوق تک محدود تھی۔ آج کا مغرب زیادہ تر اسی فلسفے پر عمل پیرا نظر آتا ہے۔

اس نقطۂ نظر کے حامیوں کی رائے میں، اخلاقی احتساب کو ایک 'ضروری' برائی سمجھ کر برتنا چاہئے، اس لیے کہ حسن کے مانند، عریانی بھی دیکھنے والے کی اپنی آنکھ میں ہوتی ہے۔ یوں بھی اخلاقی

احتساب کا معاملہ کچھ زیادہ ہی پیچیدہ ہے اور مختلف ذرائع ابلاغ کے سلسلے میں ایک ہی حکومت کی پالیسیاں مختلف ہوتی ہیں۔ مثلاً، کتابوں میں جو کچھ لکھنے کی اجازت ہوتی ہے، ان سب باتوں کو اسٹیج پر پیش نہیں کیا جا سکتا۔ جن باتوں کی فلموں میں اجازت دی جاتی ہے ان کی ٹیلی ویژن کے پردے پر اجازت نہیں ہوتی۔ گویا یہ پابندیاں، کسی مخصوص میڈیم سے متاثر ہونے والوں کی تعداد، ان کی ذہنی استعداد اور طبقاتی شعور کے مطابق عائد کی جاتی ہیں۔ بہر صورت، ناقدین فن کا اصرار تو یہی رہتا ہے کہ کسی بھی تخلیق، کو اس کی فنی کامیابی کی بنیاد پر ہی پرکھا جانا چاہیے، اور اسے ‘اچھی’ یا ‘بری’ کے خانوں میں تقسیم نہیں کرنا چاہیے۔

اخلاقی احتساب کے بارے میں، فرینک فرٹ اسکول کے ترجمان اور بنیادی تبدیلیوں کے مبلغ، ہربرٹ مارکیوزے کا نقطۂ نظر خاصا غیر روایتی بلکہ بڑی حد تک باغیانہ لگتا ہے۔ اس نے اپنی کتاب ‘این اینے آن لبریشن’ میں دوٹوک الفاظ میں، چونکا کر رکھ دینے والی ایک ایسی بات کہی ہے جو عریانی کے ایک قطعاً نئے مفہوم کو ہمارے سامنے لاتی ہے۔ مگر فطری اور غیر فطری عریانی کی مثال دیتے ہوئے وہ جو بات کہتا ہے، بہت سے لوگوں کے حلق میں اٹک کر رہ جاتی ہے۔ (ماخذ/انگریزی۔4)

سرمایہ دارانہ نظام میں ذرائع ابلاغ پر عائد شدہ پابندیوں کی پراسرار اپنی جگہ، مگر یہ بھی ایک تاریخی حقیقت ہے کہ اخلاقی اور سیاسی احتساب کے مابین ایک گہرا تعلق رہا ہے جس کی سب سے بڑی مثال ماضی کے جرمنی میں نظر آتی ہے۔ ہٹلر کے اقتدار میں آتے ہی وہاں، فرائڈ، ہیولاک ایلس، میگنس ہرش فیلڈ، کرافٹ ایبنگ، آئیون بلاخ اور کیش جیسے مایہ ناز جنسیات دانوں کے خلاف غلاظتیں اچھالنی شروع کر دی گئیں اور ۱۹۳۳ء کے دوران پیش آنے والے کتب سوزی کے واقعات میں زیادہ تر انہی مصنفین کی کتابوں کو نذر آتش کیا گیا۔ ہرش فیلڈ کے انسٹی ٹیوٹ آف سیکشوئل سائنسز پر ہلے کے دوران، ہجوم نے تمام اشیاء تباہ و برباد کر دیں اور ضبط تولید اور جنسی مشورہ دینے والے اداروں پر تالے ڈال دیئے گئے۔ ۱۹۳۷ء میں، جرمنی کی آرٹ گیلریوں میں سجائے گئے کوئی سولہ ہزار فن پاروں کو بحق سرکار ضبط کر لیا گیا کیوں کہ ہٹلر کے اپنے خیال کے مطابق، ان تمام فن پاروں کے خالقوں کا تعلق مریضانہ قسم کی بالشویکی اور صیہونی ثقافت سے تھا۔

پھر ۱۹۶۱ء کی بات ہے جب برطانیہ میں پلکنٹن کمیٹی نے بی بی سی کے شعبۂ تمثیل کا ایک تفصیلی جائزہ لیا تھا، اس لئے کہ کسی قسم کے رسمی اخلاقی احتساب کی غیر موجودگی میں یہ طے کرنا مشکل ہو گیا تھا کہ بعض مناظر کی پیش کش اور بعض الفاظ کے استعمال کے سلسلے میں خطِ فاصل کیسے کھینچا جائے جب کہ برطانوی ناظرین کی ایک بڑی تعداد ٹیلی ویژن کے پردے پر عورت کو بستر پر لیٹے دیکھتے ہی

تشنجی کیفیات کا شکار ہو جاتی ہے، خواہ وہ بستر کسی زچہ خانہ ہی کا کیوں نہ ہو۔ لیکن ۱۹۸۸ء کے بعد تو بی بی سی پر جنس، تشدد، زنا بالجبر کے مناظر اور گندی زبان کا استعمال اتنا عام ہوا کہ اس کی ساری روایات دھری کی دھری رہ گئیں۔ اب تو سوائے 'ہارڈ کور' پورنو کے، برطانوی ٹی وی پر سبھی کچھ دکھایا جاتا ہے۔

یہ ۱۹۶۵ء کی بات ہے کہ سویڈن میں رسمِ مناکحت کے خلاف تحریک چلی۔ جنسی مساوات پسند خواتین نے 'چولی گئی بھاڑ میں' کے نعرے بلند کئے اور طالبات نے دوشیزگی کو 'محض ایک جھلی' کہہ کر اس کا مذاق اڑایا۔ اور پھر ۱۹۶۷ء اور ۱۹۶۹ء کے دوران ڈنمارک میں تحریری اور تصویری فحشیات پر سرکاری پابندیاں ختم ہوتے ہی، سیکس کے تجارتی اور تفریحی مقاصد کے لئے استعمال کے بعد تو مغربی ممالک میں عریانی و فحاشی کا ایک سیلاب آ گیا اور 'سیکسوراما' کے عنوان سے جنسی مصنوعات کی نمائشیں سجنے لگیں۔ خواتین ادیباؤں نے اپنے اصلی ناموں سے اباحتی طرز کے ناول اور کہانیاں لکھنا شروع کیں، نیوڈ ماڈلنگ ایک پیشہ بن گیا، عورتوں نے رقص گاہوں میں سترکشائی کے فن کا مظاہرہ کرنے اور 'بلیو' فلموں میں اداکاری کے جوہر دکھانے شروع کیے۔ شہوانی اقلیتوں بلکہ بچوں نے بھی اپنے جنسی حقوق مانگنا شروع کر دیے۔ دوسری طرف، 'جنیٹک انجینئرنگ' اور متبادل مائیں سارے عائلی نظام کو للکارنے لگیں۔

یہ سب کی سب تو گذرے ہوئے کل کی باتیں تھیں۔ آج یہ ہو رہا ہے کہ 'نیکیڈ ٹروتھ' یعنی 'عریاں حقیقت' کے نام سے خبروں کا بلیٹن پڑھنے والی روسی لڑکیاں، ٹی وی کے پردے پر کپڑے اتارتی نظر آتی ہیں، پورنو فلموں میں کام کرنے والی اطالوی اداکارائیں، اہم سیاسی عہدے سنبھالنے لگی ہیں، اسٹیج پر برہنگی کا مظاہرہ کرنے والی برطانوی مائیں، فخریہ انداز میں، اپنی اولادوں کو بلا کر، اپنے کارنامے دکھاتی ہیں، ڈچ قحباؤں نے، اپنے آپ کو سیکس ورکرز کے طور پر منوا کر، مزدور انجمنوں کی رکنیت لے لی ہے، جنسی مصنوعات بنانے والے جرمن تاجران، اپنی اسٹاک ایکسچینج کے رکن بن گئے ہیں، 'پینٹ ہاؤس' جیسے رسائل نے اپنے خریداروں کو آن لائن شاپنگ کی سہولتیں مہیا کر دی ہیں اور پولینڈ اور سویڈن جیسے ممالک اپنی اپنی سیلائٹ سیکس چینلز چلا رہے ہیں۔ دوسری طرف 'ہیومن کلوننگ' کے سلسلے میں ہونے والے سائنسی تجربات عائلی نظام میں آخری کیل ٹھونکنے میں لگے ہوئے ہیں۔

آج کے مغرب میں، سیکس انڈسٹری یعنی لذت فروشی ایک نہایت ہی منفعت بخش کاروبار ہے۔ ۳؍جولائی ۲۰۰۴ء کو 'لندن ٹائمز' میں، چھپنے والے ایک مضمون کے مطابق، سائبر ایروٹیکا کی یہ صنعت صرف امریکا میں ۹۷۲ ارب روپے سالانہ سے تجاوز کر چکی ہے۔ مغربی دنیا کے لوگ تو اب ایک ایسی صنفی اطوفیہ کی تلاش میں ہیں جو تمام تر جنسی تعصبات سے پاک ہو اور جسے وہ اپنے تئیں، ایک نئی اخلاقی

کائنات’ کا نام دے رہے ہیں۔ اور سچ پوچھیے تو ‘روح عصر’ جنسی لذائذ کی بلاقید و بند پیش کش اور اس سے پیدا شدہ معاملات کے سوا ہے بھی کیا! ماحول میں جنسی بمباری اتنی شدید ہو رہی ہے کہ مغرب کے اس جنسی انقلاب کی پرچھائیاں ساری دنیا پر پڑ رہی ہیں۔ چین ایسی لامذہب اور سعودی عرب جیسی قدامت پرست حکومتیں بھی ‘اپنی تمام تر کوششوں کے باوجود’ اس قسم کی جنسیات کو ملک بدر کرنے میں ناکام رہی ہیں۔ ذرائع ابلاغ کی خیر ہو کہ جنسی امور سے دلچسپی ایک آفاقی مشغلہ بنتا جا رہا ہے۔ سیکس اور ہمہ جسمانیات کا یہ وہ ہم عصری پس منظر ہے جس نے خود مغرب کے قدامت پسند حلقوں میں ایک کھلبلی مچا کر رکھ دی ہے اور آج عریانی و فحاشی کا مسئلہ ‘ان پانچ یا چھ گمبھیر مسائل میں سے ایک ہے’ جسے تمام کی تمام مغربی حکومتیں اپنے اپنے طور پر حل کرنے میں لگی ہوئی ہیں۔

عریانی و فحاشی کے اس مسئلے کو ‘سرکاری سطح پر حل کرنے کی سب سے بڑی اور سب سے پہلی کوشش امریکا نے کی’ جہاں ۱۹۷۰ء میں ایک بھاری بھرکم صدارتی کمیشن قائم کیا گیا جس نے اس مسئلے کے تمام پہلوؤں کا تفصیلی جائزہ لینے کے بعد اس سلسلے میں ایک ضخیم رپورٹ مرتب کی۔ ۱۹۸۶ء میں امریکی اٹارنی جنرل نے ایک گیارہ رکنی کمیٹی بنا کر ‘اس مسئلے سے پھر نمٹنا چاہا’ اب امریکا میں ‘تمام فحشیات کو ‘ہارڈ کور’ یعنی ظاہر و باہر اور ‘سوفٹ کور’ یعنی ناگوار کے دو بڑے خانوں میں تقسیم کر دیے جانے کے بعد’ وہاں ساری توجہ ‘چائلڈ پورن’ یعنی فحشیات برائے اطفال پر قابو پانے پر مرکوز ہے۔

اسی طرح ‘برطانیہ نے بھی اس مسئلے کو حل کرنے کے لئے’ دو بار کوششیں کیں۔ ۱۹۷۱ء میں وہاں لانگ فورڈ کمیٹی تشکیل دی گئی جس نے اس مسئلے کا ایک بھرپور جائزہ لیا اور اسے حل کرنے کی ایک بڑی مدبرانہ کوشش کی۔ اس کمیٹی نے بھی اپنی ایک رپورٹ مرتب کی تھی۔ مگر ‘فحش ٹیلی ویژن پروگرامنگ’ اور ‘ترسیل فحاشی بذریعہ ٹیلی فون’ کی آمد کے بعد یہ ساری کوششیں بے معنی سی ہو کر رہ گئیں۔ برطانیہ میں کمیشن اگینسٹ پورنوگرافی (‘کیپ’) کا قیام اسی سلسلے کی ایک اور کڑی تھی۔

‘اخلاقی اکثریت’ کے نام پر ‘اس بارودی موضوع کے بل بوتے پر’ ماضی میں افغانستان’ ترکی’ ایران اور انڈونیشیا میں کئی تحریکیں چل چکی ہیں۔ جب کبھی اور جہاں کہیں ‘عریانی و فحاشی کے خلاف تحریک چلنا شروع ہوتی ہے’ انتظامیہ کے سارے کل پرزے حرکت میں آ جاتے ہیں اور اس قسم کی سب کی سب چیزیں ‘وقتی طور پر’ کاؤنٹر کے نیچے’ ‘پردے کے پیچھے’ بلکہ ‘زیرزمین’ چلی جاتی ہیں۔ اور تمام ماحول انتہائی جذباتی سا ہو جاتا ہے۔ امریکی مصنف ‘ارونگ والیس’ نے اپنے ایک ناول ‘دی سیون منٹس’ (سات منٹ) میں کچھ اسی قسم کی صورت حال پیش کی ہے۔ ایک کتب فروش طویل عرصے تک نایاب رہنے والے اسی نام کے فحش ناول کو فروخت کرتے ہوئے پکڑا جاتا ہے۔ دوسری

طرف کالج کا ایک طالب علم ایک لڑکی کی آبروریزی کے الزام میں پکڑا جاتا ہے اور اتفاقاً یہی ناول اس کے پاس بھی پایا جاتا ہے۔ اس طالب علم کا باپ ایک ایڈورٹائزنگ ایجنسی کا مالک ہے اور اس کا شمار معززین میں ہوتا ہے۔ اب تمام سرکاری اور نیم سرکاری، کلیسائی اور کاروباری قوتیں پسِ پردہ مقاصد کے حصول کے لئے، لڑکی کی آبروریزی اور کتاب کی برآمدگی کو ایک ہی واقعے کی دو منطقی کڑیاں ثابت کرنے کے لئے میدان میں آجاتی ہیں۔ ساری کہانی اس مرکزی خیال کے گرد گھومتی ہے کہ مختلف المقاصد قوتوں کے اس گٹھ جوڑ کی وجہ سے رائے عامہ کس قدر مشتعل ہو جاتی ہے اور کتب فروش کے وکیلِ صفائی کو جیوری کے سامنے اصل حقائق پیش کرنے میں کتنی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

جب ہم اس عالمی تناظر سے ہٹ کر، عریانی و فحاشی کے سلسلے میں، پاکستان کی طرف دیکھتے ہیں، تو یہاں کی صورتِ حال نہ صرف انتہائی مبہم بلکہ کئی ایک تضادات کا شکار نظر آتی ہے۔ اگر ایک طرف، صائب الرائے افراد اس مسئلے کے بارے میں 'حرفِ برہنہ' کہنے کی بجائے روایتی قسم کے مصلحتی سکوت کو اپنا مؤقف بنا کر، 'دیکھو، سنو مگر بولو مت' کی پالیسی اپنائے ہوئے ہیں تو دوسری جانب، وقتاً فوقتاً فضا میں بلند ہونے والے شور و غوغا سے یوں لگتا ہے کہ جنسی بحران ہی اس ملک کا واحد بحران ہے۔

ایسا لگتا ہے کہ اس وقت پاکستانی معاشرہ، قبولیت و مزاحمت کے ایک مصنوعی ثقافتی تناؤ اور ایک عجیب سی نظریاتی سراسیمگی سے دوچار ہے اور مختلف قسم کے رائے انداز گروہ، اس کثیرالثقافتی ملک پر، اپنی اپنی پسند و ناپسند تھوپنے میں لگے ہوئے ہیں۔ اگر ایک طرف، قدامت پرست بلکہ بنیاد پرست ہر قسم کی ثقافتی سرگرمیوں کو 'کفر کا پھیلاؤ' سمجھتے ہوئے، انہیں نظر آنے والے صنفی انتشار کے خلاف کمربستہ نظر آرہے ہیں تو دوسری طرف انہی انتہا پسند عناصر سے تنگ آئے ہوئے مغرب پرست لوگ، عوام کو روایت سے مکمل بغاوت پر اکسانے پر تلے ہوئے ہیں۔

عریانی و فحاشی کے بارے میں بنیاد پرستوں یا انتہا پسندوں کی سوچ بڑی سیدھی سادی ہے یعنی یہ کہ جو کچھ اُن کے نزدیک 'غیر اسلامی' ہے وہ ناجائز ہے اور جو کچھ ناجائز ہے وہ عریاں بھی ہے اور فحش بھی۔ سعادت حسن منٹو کی زندگی میں اُس کے خلاف اٹھنے والے طوفان، میوزک ۸۹' میں لڑکے لڑکیوں کو ایک ساتھ تالیاں بجاتے دیکھ کر غصے کا اظہار، پی ٹی وی سیریل 'کشک' کی اداکارہ کو بائیں ہاتھ سے کھاتے دیکھ کر اعتراضات کی بوچھاڑ، اسی سوچ کا نتیجہ ہیں۔

لیڈی ڈیانا کی شاہی مسجد لاہور میں آمد پر، بیٹی کی آبروریزی کے غم میں نڈھال ایک ستر سالہ قبائلی سردار کو خاتون وزیراعظم کے گلے لگانے پر، قومی اسمبلی کے ایک اسپیکر کا بردار اسلامی ملک میں کسی

انڈونیشی خاتون سفارت کار کے ساتھ رقص کرنے پر، دہلی کی کسی تقریب میں ایک ستر سالہ نامور سکھ صحافی کا پاکستانی سفیر کی بیٹی کا گال چومنے پر، اور نیوایئر نائٹ، سینٹ ویلینٹائن ڈے، بسنت کے تہوار بلکہ عید پر شائع ہونے والے عریاں کارڈز، یوم پاکستان کے موقعہ پر چُست، وردیوں میں خواتین دستوں کی سلامی، لڑکے لڑکیوں کی لمبی دوڑ اور کشمیر میں زلزلے جیسے مواقع پر شور وغل مچانے کے پیچھے بھی یہی سوچ کارفرما ہے۔

خواتین کے ہونٹوں پر سرخی لگانے، اُن کے جینز پہننے، کھیلوں کے میدان میں شرکت کرنے، ٹی وی اور فلموں میں نامحرموں کے ساتھ میاں بیوی بننے، مخلوط تعلیم، موسیقی، مصوری، رقص، مجسمہ سازی، ماڈلنگ پر تو آئے دن اعتراضات ہوتے ہی رہتے ہیں مگر، اسلام آباد اور پشاور کی وڈیو شاپس پر حملے، اسلام آباد میں ایک مساج گھر سے نو چینیوں (چھ خواتین اور تین مردوں) کا اغوا، ایک مشہور ٹی وی چینل کے کسی پروگرام میں ایک سوال پوچھے جانے پر کراچی میں اس کے مرکزی دفتر پر حملہ، اسلام آباد کی ایک این جی او کے سوالنامے میں شامل ایک سوال پر وزارتِ سماجی بہبود کی طرف سے اسے بلیک لسٹ قرار دیا جانا، ایک امریکی پاکستانی خاتون پروفیسر کی محض اپنے نظریات کی بنا پر، ہایئر ایجوکیشن کمیشن (ایچ ای سی) کی ملازمت سے چھٹی، ہری پور (ہزارہ) کی چوبیس ۲۴ آپریٹروں کی ٹیلی فون لائنوں پر ہونے والی گفتگو کی بنا پر اپنی ملازمتوں سے علیحدگی، فرانس میں کامیاب پیراسونگ پر کوچ سے گلے ملنے پر، خاتون وفاقی وزیر سیاحت نیلوفر بختیار کے خلاف فتویٰ اور ملازمت سے علیحدگی، پنجاب کی صوبائی خاتون وزیر ظلِ ہما عثمان کا گجراں والا کے ایک جلسۂ عام میں قتل، کراچی کے پانچ اخبارات پر تیس (۳۰) دن کی پابندی اور اُن کے کارکنوں کی گرفتاریاں اور کراچی ہی کے ایک سینما گھر میں سو (۱۰۰) سے زائد فلم دیکھنے والیوں کا کھلے عام ان کی چوٹیوں سے گھسیٹا جانا اور اُن کی بھیانک چیخیں بھی ریکارڈ پر موجود ہیں'۔ ان تمام واقعات کے پس پشت بھی سوچ کی یہی انتہا پسندی نظر آتی ہے۔ جن واقعات کی طرف یہاں اشارے کئے گئے ہیں، ان کو سامنے رکھئے تو 'بریکنگ دی کرفیو' کی مصنفہ ایما ڈنکن کی یہ رائے غلط نہیں معلوم ہوتی کہ 'پاکستان میں کوئی بات طے شدہ نہیں' (مآخذ/ انگریزی۔ 7)

دورِ جدید کی عریانی وفحاشی کے پھیلاؤ کی ایک بنیادی وجہ اس صدی کا ابلاغیاتی انقلاب ہے، براعظمی مواصلاتی نظام نے تمام جغرافیائی فاصلوں کو ختم کر دیا ہے اور ساری دنیا ایک 'گلوبل ولیج' میں تبدیل ہو کر رہ گئی ہے اور وہ تہذیبی یکسانیت کی ایک ایسی طاقت ور لہر سے دوچار ہے جس نے 'اخلاقی احتساب' کے مستقبل کو خطرے میں ڈال دیا ہے۔ اب تو ہمارے ہاں بھی انٹرنیٹ آچکا ہے جس کی سنسر شپ کے سامنے مغربی دنیا کے بہترین دماغ سر پکڑے نظر آرہے ہیں اور جس کی ایک 'کلک' کے ساتھ

ہی زمان ومکاں کی تمام سرحدیں ڈھے جاتی ہیں۔

بی بی سی کی ایک رپورٹ کے مطابق پاکستان میں انٹرنیٹ استعمال کرنے والوں میں سے 60 فیصد لوگ 'پورنو' ویب سائٹس بڑی باقاعدگی سے دیکھتے ہیں صرف یہی نہیں بلکہ، مئی ۲۰۰۶ء میں شائع ہونے والے 'گوگل' کے تحقیقاتی انجن کے مطابق 'دس جنسی بھوکے ممالک کی ایک فہرست جن میں چھ اور مسلم ممالک کے نام شامل ہیں' پاکستان کا نام سرفہرست ہے۔ ذرا سوچئے تو اس فضا میں، ہمارے ڈاک خانوں، محکمہ کسٹم، وزارت اطلاعات ونشریات، دیگر صوتی اور بصری ذرائع ابلاغ میں کرسی نشین افسر، مونیٹرنگ عملے اور سنسر بورڈز کے اراکین کو کھلے عام ہونے والی نشریات پر قینچی چلاتے اور اس مواد کو ڈسٹرب کرتے، سیاہ مارکروں سے ننگی بانہوں کو چھپاتے دیکھ کر، اکادکا فلم کو نوٹس جاری کرتے ہوئے، پوسٹروں کو کیموفلاج اور انسٹی ٹیوٹ آف آئی اے آر کے کتب خانے کی دیوار پر صادقین کی بنائی ہوئی 'تخلیق علم' کو چادر سے ڈھانپتے دیکھ کر کسی کو ہنسی نہیں آئے گی!

یہ حقیقت اپنی جگہ مسلّم ہے کہ اکثر اسلامی ممالک میں عریانی وفحاشی کو مخصوص سیاسی مقاصد حاصل کرنے کے لیے ایک ہتھکنڈے کے طور پر استعمال کیا جارہا ہے۔ پاکستان کی تاریخ کا بھیانک ترین زلزلہ ہو، حقوق نسواں بل ہو، چاہے کراچی میں چلنے والی طوفانی آندھی میں سائن بورڈز کا گرنا ہو، کئی لوگوں کو یہ بھیانک واقعات بھی عریانی وفحاشی کا شاخسانہ نظر آتے ہیں۔ مگر حیرت کی بات تو یہ ہے کہ کبھی کسی نے یہ سوچا بھی نہیں کہ اس مسئلہ پر پاکستان کی خاموش اکثریت کیا کہتی ہے! کیونکہ ایک امریکی صدارتی کمیشن کی تحقیقات کے دوران یہ بات بھی سامنے آئی تھی کہ عام امریکیوں کے نزدیک عریانی و فحاشی کا مسئلہ کسی خاص اہمیت کا حامل نہیں تھا جبکہ امریکی کانگریس اُسے 'ایک قومی تشویش کا مسئلہ' قرار دے چکی تھی۔

عریانی وفحاشی کے چرچے اب اتنے عام ہوچکے ہیں کہ ہمیں اس بات کی ضرورت پڑ گئی ہے کہ ہم اس مسئلہ کا علمی اور تحقیقی دیانت کے ساتھ ایک جائزہ لیں جس سے ہمیں روشنی ملے۔ اس موضوع کے مختلف پہلوؤں پر لکھی جانے والی اہم تحریروں کو ایک کتابی شکل میں پیش کرنے کا مقصد یہی ہے کہ اس جذباتی بحث کی سطح ذرا اونچی ہوسکے اور اس موضوع کو اس کی تمام تر گہرائی کے مطابق سمجھا جاسکے۔ یہ کتاب ایک ایسی دستاویز اور ایک ایسا ہمہ جہتی مطالعہ ہے جو مستقبل کی کسی بھی تحقیق میں ایک بنیاد فراہم کرسکتی ہے۔ اس میں نہ صرف مضامین، انٹرویوز، سروے، عدالتی فیصلے شامل ہیں، بلکہ اس میں 'علم' اور 'رائے' دونوں ہی کو اہمیت دی گئی ہے۔

اتنے سارے مختلف النوع مواد کو ایک ہی لڑی میں پرونے کا کام خاصا مشکل تھا مگر میں نے

ایک کوشش ضرور کی ہے۔ بعض مضامین میں شامل انگریزی اقتباسات کا ترجمہ کر دیا گیا ہے۔ چند ایک مضامین کے ایسے حصے حذف کر دیے گئے ہیں جن کا نفس مضمون سے تعلق نہ تھا۔ کچھ عدالتی فیصلوں اور مضامین کے ترجمے میں نے کیے ہیں جو 'تخلیق' 'مکالمہ' اور 'ارتقا' جیسے صف اوّل رسائل کی زینت بن چکے ہیں۔

یہ کتاب، ایک پیشہ ور صحافی ہونے کے باوجود، میں نے 'ڈیڈ لائن' سے قطعاً بے پروا ہو کر ایڈٹ کی ہے۔ اور اسی لیے محترم شان الحق حقی کی ۱۹۷۸ء میں لکھی ہوئی تقریظ کوئی پورے تیس سال کے بعد اب شائع ہو رہی ہے۔ شان صاحب جب آخری بار پاکستان تشریف لائے اس وقت بھی انہوں نے بڑی بے تابی سے کتاب کے بارے میں پوچھا تھا اور اسے موجودہ صورت میں دیکھ کر، انہوں نے ایک بین الاقوامی اشاعتی ادارے کو اُسے چھاپنے کا مشورہ بھی دیا تھا۔

آخر میں، میں ان تمام اہل قلم اور ناشرین کا تہہ دل سے شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں جن کی تخلیقات نے اس کتاب کی بنیاد فراہم کی، گو کہ ان میں سے اکثر اہل قلم، شان صاحب کی طرح، اس دنیا سے رخصت ہو چکے ہیں اور ان کی تصانیف بھی اب تقریباً ناپید ہیں۔ میں اپنے استاد محترم ڈاکٹر منظور احمد صاحب کا بھی بے حد مشکور ہوں جنہوں نے کتاب کے لیے پیش لفظ لکھا۔

تقریظ

شان الحق حقی

جنس کے ساتھ جبلّی تعلق خاصۂ حیوانی اور لازمۂ حیات ہے لیکن جنس کا شعور اور جنس کے ساتھ ذہنی و علمی تعلق صرف انسانوں ہی سے مخصوص ہے۔ جنس صرف ہماری جبلّت ہی میں داخل نہیں بلکہ ہماری زندگی کا ایک اہم مسئلہ بھی ہے، انسانی معاشرے کا ایک بنیادی مسئلہ جو مدنی زندگی کی ابتدا ہی سے اجتماعی ذہن کو الجھائے رہا ہے۔ مختلف معاشروں اور تاریخ کے مختلف ادوار میں جنس کی بابت کیا تصورات یا توہمات رائج رہے، کیا کیا رسوم و رواج پیدا ہوئے، ہر معاشرے نے کس نظر سے اس اجتماعی مسئلے کو دیکھا، عمرانی تحقیق نے اس سلسلے میں گوناگوں انکشافات کیے ہیں۔

اسی طرح جنسی 'بے راہ روی' کی بابت بہت کچھ بلکہ بہت ہی کچھ افشائے راز ہوا ہے۔ یہاں میں نے ایک مروجہ اصطلاح استعمال کی ہے جو ہمارے معاشرے کی معلومہ اقدار سے علاقہ رکھتی ہے، لیکن 'بے راہ روی' کسے کہتے ہیں اور اعتدال یا سلامت روی کی حدیں کیا ہیں، یہ بات خود بھی غور طلب ہے ہر جگہ، ہر دور میں اس قسم کے رجحانات ملتے ہیں۔ بظاہر بے راہ روی کا یہ مطلب لیا جائے گا کہ انسان جنس کے اُس مقصدِ اصلی سے تجاوز کرے جو قدرت نے اس کے لئے مقرر کیا ہے، یعنی افزائشِ نسل، لیکن قدرت خود ہی بظاہر غایتِ اصلی سے تجاوز کی حامی ہے اور اس قدر کہ اس تجاوز کی راہ میں شعوری اور قانونی بندشیں لگانی پڑتی ہیں۔ اس دور میں شعوری کوششوں اور تدبیروں کے باوجود نہ صرف افزائشِ نسل بلکہ افزائشِ جرائم پر قابو پانا مشکل ہوگیا ہے۔ علاوہ ازیں قدرت نے انسانوں میں اجتماعی خصائص کے علاوہ کچھ انفرادی خصائص بھی رکھے ہیں۔ انسانوں میں کئی طرح کے انفرادی رجحانات پائے جاتے ہیں جو طبعی ہیں نہ کہ محض اکتسابی، خواہ نسبتاً تھوڑے لوگوں میں نظر آئیں۔ جدید جمہوری معاشرہ فرد یا اقلیت کو نظر انداز کرنے کا قائل نہیں، بلکہ اسے سماجی ناانصافی قرار دیتا ہے۔ چناں چہ اس زمانے میں بعض ملکوں نے ان رجحانات کا لحاظ کرتے ہوئے ان کے لیے قانونی گنجائشیں نکال لی ہیں۔

کھانے کا اصل مقصد بھی جینا ہے لیکن اس بنا پر آپ فنِ طباخی کو اعتدال سے تجاوز قرار نہیں دیتے۔ شرم، لحاظ، غیرت کیا چیز ہے! نفسیات کی رو سے یہ اضافی تصورات ہیں، مطلق اقدار نہیں۔ ہماری

خواتین گھٹنا کھولتے لاجوں مرتی ہیں، اس کے برخلاف مغربی ملکوں میں ‘منی اسکرٹ’ تو اب آیا ہے، پہلے بھی گھٹنے تک کی عریانی کوئی عریانی نہ تھی۔ ہمارے ہاں بھی دیکھتے دیکھتے کتنے ہی ایسے چہروں پر سے نقاب اڑ گیا کہ کسی وقت میں غیر نظریں ان پر پڑتیں تو پگھل کر رہ جاتے۔ برصغیر کے بعض گوشوں میں جو کل تک ہماری مملکت ہی میں شامل تھے، مثلاً چاٹگام کے پہاڑی علاقے، عورتوں کا سینہ ڈھانپنا ایسا ہی عجیب سمجھا جاتا ہے جیسے جدید معاشرے میں منہ ڈھانپنا۔ حیا ایک نفسیاتی کش مکش کا نام ہے جس میں اجتماعی شعور کو بڑا دخل ہوتا ہے لیکن یہ شعور بدلتا رہا ہے، اور ہمارے دیکھتے دیکھتے بدل رہا ہے۔

اس لحاظ سے ہمارے ایک فاضل مجسٹریٹ نے جن کا ایک فیصلہ زیرِ نظر مجموعے میں شامل ہے، بڑی معقول بات کہی تھی کہ فحاشی پر حکم لگاتے وقت معاشرے کی مروجہ اقدار اور ذہنی معیار کو ملحوظ رکھنا ہوگا۔ انھوں نے لارڈ کاک برن کے ایک قدیم فیصلے کا حوالہ بھی دیا ہے جسے بعد کے مقدمات میں نظیر بنایا جاتا رہا ہے۔ جج موصوف نے ۱۸۶۸ء میں فحاشی کی تعریف یہ کی تھی: ‘اس قسم کا الزام زدہ مواد جو اُن لوگوں کو بداخلاقی اور بدچلنی کی ترغیب دے جن کے اذہان اس قسم کے مخرب اخلاق اثرات قبول کر سکتے ہوں اور جن کے ہاتھوں میں اس قسم کا مواد پہنچ سکتا ہو۔’

مجسٹریٹ موصوف کا یہ فیصلہ جس کے ضمن میں یہ رائے نقل کی گئی اگرچہ عدالتِ بالا نے رد کر دیا، مگر اختلاف اس کے اطلاق پر تھا، اصول پر نہیں۔ عدالت بالا کو یہ اعتراض تھا کہ فاضل مجسٹریٹ نے معیارِ اخلاق وہ بیان کیا ہے جو قرآن کی تعلیم ہے، حالاں کہ ہمارا معاشرہ قرآن حکیم کی صحیح تعلیمات سے بہت دور ہے۔ یہاں مجھے ان فیصلوں سے بحث نہیں۔ البتہ لارڈ کاک برن نے جو کانٹے کی بات کہی اس سے دو نکتے پیدا ہوتے ہیں: اول یہ کہ اگر کوئی معاشرہ ذہنی طور پر اتنا پختہ ہو کہ فحاشی کا برا اثر قبول نہ کرے بلکہ اس پر صرف تھُر تھُری کر کے رہ جائے تو عام اس سے کہ کسی تحریر کا علمی یا ادبی معیار کیا ہے، وہ قانون کی زد میں نہیں آتی۔ دوم یہ کہ اگر عام ذہنی سطح اتنی پست ہو کہ بآسانی بُرا اثر قبول کر لے تو کوئی ادبی یا فنی تخلیق خواہ کچھ بھی محاسن رکھتی ہو مذموم ہی ٹھہرے گی۔ گویا فحاشی کو پرکھنے کا کوئی معیار ہے تو وہ عوام الناس کا ذہنی معیار ہے۔ یہ جتنا پست ہوگا، تحریر آپ سے آپ اتنی ہی پست ہو جائے گی، عام اس سے کہ لکھنے والے کا ذہنی معیار یا مقصود و منشا کیا ہے۔

زندگی میں جنسی ترغیبات اتنی عام ہیں کہ کوئی آرٹسٹ یا مصنف ان میں تھوڑا ہی اضافہ کر سکے تو کر سکے۔ کسی تخلیق میں ایسی ترغیب اگر کسی جائز فنی تقاضے کے تحت پیدا ہو جائے تو گوارا کرنے کے قابل ہوگی لیکن اگر فنی خوبی سے عاری ہوگی تو مبتذل یا مذموم کہلائے گی اور بدنیتی سے لکھی گئی ہوگی تو لائق سزا بھی ہونی چاہیے۔ کسی چیز سے زن و شو کو جنسی ترغیب ہو تو اس میں چنداں نقصان کی بات نہیں۔ سوال ناپختہ اور ناکتخدا نوجوانوں کو بے وقت کی جنسی ترغیبات سے بچانے کا ہے جو انھیں ذہنی

ناآسودگی میں مبتلا کریں۔ علاوہ ازیں فن اور تخلیق پر قانونی گرفت کو سخت کرنے کی بجائے ضرورت ایک ایسے معاشرے کی تعمیر ہے، جس کا فنی شعور اتنا پختہ ہو کہ وہ خود ہی مذموم چیزوں کو قبول نہ کرے۔ جو چیز سوسائٹی کے مذاق سے گری ہوئی ہوگی' خود ہی پنپ نہ سکے گی۔

ایسا معاشرہ اہلِ فن اور اہلِ علم کے اشتراک کے بغیر وجود میں نہیں آسکتا۔ مصنف اور فن کار ہی ہیں جو عوام کی ذہنی سطح کو اونچا کرسکتے ہیں۔ یہ زیادہ سے زیادہ آزادی اور ہمت افزائی کے مستحق ہیں۔ اسی نسبت سے اہلِ قلم اور اہلِ فن کو بھی اپنے منصب کی آبرو کا پاس ہونا چاہیے۔ یہ بات اعتراف کے قابل ہے کہ ہمارے ادیبوں نے عموماً اپنی تحریروں میں اخلاقی معیار کو خاطر خواہ طور پر قائم رکھا ہے۔ یہاں ان گم نام لکھنے والوں کا ذکر نہیں جن کی تحریریں کسی طرح بھی ادب کی تعریف میں نہیں آتیں۔ ان میں اتنی جرات نہیں کہ سامنے آسکیں۔ وہ خود ہی اپنے آپ کو مجرم گردانتے ہیں اور کوکین فروشوں کی طرح چھپ چھپاتے اپنا کاروبار چلاتے ہیں۔ کاروباز کاروبار ہے اور ادب' ادب۔ گو یہ صحیح ہے کہ اس دور میں دونوں خاصے مدغم ہوگئے ہیں۔ پھر بھی ہمارا ادیب اب تک ادب ہی کا خادم چلا آتا ہے' بینگن ہی کا غلام ہے۔ وہ اظہار کے لیے لکھتا ہے۔ خواہ اصلاح کے لیے نہ سہی۔ اس کی تحریروں نے سونا اگلنا ابھی شروع نہیں کیا۔ وہ ادب کی پرورش کرتا رہا ہے' ادب نے ابھی تک اس کی پرورش شروع نہیں کی۔

بہتر ہے کہ ہم سب اپنے گریبانوں میں بھی منہ ڈال کر دیکھیں۔ ہم سب بڑے بھولے منہ لیے پھرتے ہیں' ہمارے جنسی اعمال کس نے دیکھے ہیں۔ 'در عہدِ جوانی چُوں اُفتد......'۔ کیا اخلاق صرف منفی پن کا نام ہے؟ کیا حقائق کو چھپانا ایک اخلاقی اصول کے طور پر قابلِ تسلیم ہے! کیا ہمارے بہت سے ذہنی و سماجی عوارض کی تہہ میں جنس کا ناپختہ شعور کارفرما نہیں؟ کیا ان مسائل کا حل علم و شعور کے بغیر صرف اغماض و تجاہل کے ذریعے ممکن ہے؟ جس لٹریچر سے ان مسائل کے سمجھنے میں مدد ملے' وہ ایک اہم سماجی ضرورت کو پورا کرتا ہے' اور قدر کے قابل ہے نہ کہ نفریں کا مستحق۔ البتہ جو تحریریں عام انسانوں کی جنسی کمزوریوں سے غلط فائدہ اٹھا کر ان مسائل کو اور الجھانے کی کوشش کریں' ضرور قابلِ مذمت ہیں۔

میں نے علی اقبال کی اس قابلِ قدر تالیف کا تعارف کرانے کے سلسلے میں سرسری طور پر چند ایسے مسائل کا ذکر کیا ہے جو ہم سب کو غور و فکر کی دعوت دیتے ہیں۔ اس سے مراد صرف اتنی تھی کہ اس تالیف کی اہمیت کا خاطر خواہ اندازہ ہوسکے۔ انھوں نے فحاشی کے موضوع پر بہت سی تحریروں کو یک جا کردیا ہے۔ یہ اردو میں اپنے موضوع کا پہلا اور بڑا جامع انتخاب ہے۔ اس کے لیے موضوع سے خاطر خواہ واقفیت اور بڑی لیاقت کی ضرورت تھی۔ اس کا دائرہ پاکستان تک محدود نہیں' بلکہ بین الاقوامی شہرت رکھنے والے کئی مصنفین کی تحریریں اس میں شامل ہیں' ان کے ساتھ اردو مصنفین ناشرین' اہلِ قانون اور دوسرے اہلِ فکر کے خیالات بھی۔ چناں چہ یہ مجموعہ ایک بڑی دلچسپ اور مفید علمی دستاویز بن گیا

ہے۔ آخر میں جو اشاریہ درج ہے اس سے اس کی دستاویزی اہمیت اور حوالے کی سہولت اور بھی بڑھ گئی ہے۔ یہ کتاب عام پڑھنے والوں کے لیے تو مفید ہے ہی، آئندہ بھی اس موضوع پر قلم اٹھانے والے اس سے مستفید ہوں گے اور اسے نظر انداز نہیں کر سکیں گے۔

میں علی اقبال صاحب کی ذہانت اور سلجھی ہوئی طبیعت کا قائل ہوں، وہ اپنی طالب علمی کی زمانے ہی سے معاشرتی مسائل میں دلچسپی رکھتے تھے اور جنس کے موضوع پر ان کا انداز گفتگو بڑا متین ہوتا تھا۔ یہ ان کی سلامتی طبع کی دلیل ہے۔ اب وہ ایک پختہ کار صحافی ہیں۔ لکھنا لکھانا ان کا کام ہے، پڑھنا اور سوچنا ان کی عادت اور شوق۔ وہ ایک بالغ نظر انسان ہیں جنس کے موضوع سے ان کا علمی شغف اس تالیف کا محرک ہوا، اور جو محنت اس پر صرف ہوئی ہے، انھی کا حق تھا۔ اس میں کسی نقطۂ نظر کا پرچار نہیں۔ مسئلے کے جملہ پہلو سامنے آگئے ہیں اور پڑھنے والوں کو سوچ بچار کی دعوت دیتے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ اس کتاب کی اولیت کی طرح اس کی افادیت بھی برقرار رہے گی۔

(۲۹ مارچ ۱۹۷۸ء کراچی)

پیش لفظ

ڈاکٹر منظور احمد
(ریکٹر، انٹرنیشنل اسلامک یونیورسٹی)

تیس سال سے زیادہ عرصہ گزار کر علی اقبال صاحب نے یہ کتاب مرتب کرنا شروع کی تھی۔ یہ موضوع پچھلی صدی کی چوتھی دہائی سے اردو لٹریچر میں خاص طور پر ایک متنازعہ مسئلہ رہا ہے اور اس پر متزاد آراء سامنے آتی رہی ہیں۔ اس سے قبل یہ بات خود مغربی معاشرے میں نشاۃ الثانیہ کے بعد کی تبدیلیوں کے زیر اثر موضوع بحث رہی ہے۔ فی الوقت مغرب میں یہ نزاع فکری اور مذہبی بنیادوں سے غیر متعلق ہوکر قدامت پسند اور لبرل طبقوں کے درمیان ذاتی پسند و ناپسند کے زمرہ میں شامل ہو چکا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ عریانی اور فحاشی اگرچہ انسانی تصورات ہیں لیکن اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ دو انتہاؤں کے درمیان ایک معتدل راستہ اختیار کیا جا چکا ہے جو آگے پیچھے تو ہو سکتا ہے لیکن اپنی انتہاؤں تک پہنچنے پر بے معنی ہو جاتا ہے۔

موجودہ زمانے میں اس مسئلے کی علمی اور اخلاقی حیثیت ایک اور وجہ سے زیادہ اہم اور گھمبیر ہو جاتی ہے اور وہ موجودہ زمانے کا استحصالی معاشی نظام ہے جہاں ہر شئے بشمول مذہب یا تو ایک فروختنی مال ہے یا کسی مال کی تشہیر کا سبب۔ یہ مسئلہ بڑا اہم ہے اور اس کا تجزیہ کرنے کی سخت ضرورت ہے۔

انسانی شعور میں اگرچہ اچھائی اور برائی میں تمیز کرنے کی صلاحیت موجود ہے لیکن اچھا کام کرنے کے لئے انسان کو صعوبت برداشت کرنا پڑتی ہے جبکہ برائی کے لئے وہ ایک ڈھلواں راستے پر سفر کرتا ہے۔ انسان کے وہ اعمال جو اس کو مجموعی طور پر شر کی طرف زیادہ راغب کرتے ہیں ان کا تعلق راست طور پر اس کی فطری جبلتوں سے ہوتا ہے جبکہ اعلیٰ اقدار کا تعلق اس کے شعور کی وہ عقلی جہت ہے جو جبلتوں کے مقابلے میں کم وقت رکھتی ہے اسی وجہ سے مذاہب لذائذ دنیا کو موخر کرنے کی ترغیب دیتے ہیں۔ اکثر لوگ اچھے کام ایک ایسی ابدی زندگی کے لالچ میں کرتے ہیں جس میں عیش کے وہ تمام اسباب مہیا ہوں جو اس دنیا میں نہیں ملتے یا تج دینے پڑتے ہیں۔ اخلاقی کام کے اجر و ثواب کے لیے ایک دوسری دنیا موجود ہے ہی جہاں انسان بلا جبر و تعب ان اسباب کو مہیا پائے گا جو ایک پر تعیش زندگی گزارنے کے لیے وہ سوچ سکتا ہے۔ لیکن مسئلہ اس وقت مذاہب کا نہیں بلکہ فحاشی اور عریانی اور

معاشرے سے اس کے تعلق کا ہے۔ ادب میں اس بات کی تمیز کہ کہاں کوئی عریاں تحریر ادبی تقاضوں کو پورا کرتی ہے اور کہاں اس کی موجودگی کسی ادبی کاوش کو ایک فروختنی بنانے کے ضمن میں آتی ہے، معاشرے کا وہ طبقہ کرسکتا ہے جس کو ایک علمی اور ادبی درجہ کا استناد حاصل ہو جائے۔ عدالتیں یہ فیصلہ اس لیے نہیں کرسکتیں کہ وہ تو صرف یہ دیکھتی ہیں کہ کوئی تحریر کس موجود قانون کی پکڑ میں آتی ہیں کہ نہیں۔ البتہ معاشرے کے آزاد اور روشن خیال لوگ اگر کسی مسئلے کے متعلق اپنی رائے کا اظہار کریں تو وہ رائے اس زمان و مکان کے اعتبار سے حکم سمجھی جانی چاہئے۔ ان کے فیصلوں سے اختلاف پھر بھی ممکن رہے گا لیکن اس بات کا فیصلہ کسی معاشرے، قوم و ملک کے مجموعی مزاج، تعلیم اور علمی بلوغت کو سامنے رکھ کر ایک ایسا گروہ ہی سرانجام دے سکتا ہے جو ایک عالمی اور ادبی درجے پر فائز ہو چکا ہو۔

علی اقبال صاحب کی مرتب کردہ کتاب 'روشنی کم' تپش زیادہ' اس معاملے میں زیادہ بہتر رہنمائی کرسکتی ہے کہ یہ زمانہ جدید کے اسی قسم کے افراد کی آراء پر مشتمل ہے اور اس طرح یہ کتاب محض مضامین کا ایک مجموعہ نہیں بلکہ معاشرے کی اس ذہنی روش کی نمائندہ ہے جس کو سامنے رکھ کر مزید فیصلے کیے جاسکتے ہیں۔ اصل مسئلہ صرف اس قدر ہے کہ دو انتہاؤں کے درمیان ایک راہ نکالنا معاشرے کا فرض ہے اور یہ راہ خود بخود نکلتی رہتی ہے۔

فکری طور پر وہ تمام اخلاقی تصورات جو عریانی اور فحاشی کے ضمن میں آتے ہیں وہ معاشرتی زندگی سے ہی متعلق ہیں۔ ان کا اطلاق انسانی معاشرے سے باہر نہیں کیا جاسکتا۔ زندگی کے ارتقا میں اگر ابتداء حیوی معاشروں سے ہوتی ہے اور انتہا ملکوتی معاشروں تک جاتی ہے تو یہ تصورات ابتدا اور انتہا پر لاگو نہیں ہوتے اس لیے کہ یہ تصورات دونوں قسم کے معاشروں میں بے معنی ہو جاتے ہیں۔ یہ صرف انسانی معاشرہ ہی ہے جہاں یہ مسئلہ پیدا ہوتا ہے اور پھر اس پر متضاد آراء سامنے آتی ہیں۔ میری دانست میں اس مسئلے کا بڑا اچھا حل اُس ہیگلین (Hegelian) تصور میں مضمر ہے جو متضاد تصورات اور خیالات میں ایک امتزاج پیدا کر لیتا ہے اور پھر یہ دوبارہ ایک متضاد قضیہ بن کر ایک نئے امتزاج کی تلاش میں سرگرداں ہو جاتا ہے۔ انسانی تاریخ میں اسی کشمکش کے نتیجے میں پیدا ہونے والے تصورات وہ معیار فراہم کردیتے ہیں جن کی کسوٹی پر جانچ کر یہ فیصلہ کیا جاسکتا ہے کہ ادبی سرحدیں کہاں ختم ہوتی ہیں اور فحاشی کی سرحدیں کہاں شروع ہوتی ہیں۔ مختلف تاریخی ادوار میں متضاد تصورات سامنے آسکتے ہیں اور ان میں کوئی بھی مطلق حکم کے طور پر نہیں لیا جاسکتا چاہے وہ تصور کسی مذہبی حکم پر مبنی ہو یا اخلاقی قدر پر۔ اخلاقی قدر تو اپنی جگہ مستحکم رہی ہے اور مذہبی احکام اخلاقی اقدار کی بنیاد پر ہی بنائے جاتے ہیں۔ لیکن ان اقدار کا اظہار معاشرے میں ہمیشہ ایک جیسا نہیں رہتا۔ اسی لیے یہ توقع کرنا کہ ان مسائل کے متعلق کوئی مطلق حکم صادر کیا جاسکتا ہے بڑا مشکل کام ہے۔

اس وقت مسئلہ کا ایک اہم پہلو جس پر ہمارے اہل نظر کی توجہ مرکوز نہیں ہے وہ ادبی یا جمالیاتی نہیں ہے بلکہ معاشی اور نفع اندوزی کی بڑھتی ہوئی خواہش کا ہے۔ دراصل ہمارے معاشروں میں اخلاقی قدر کا یہ پہلو ابھی اجاگر نہیں ہوا ہے اور دنیا کے وسائل اور ذرائع جس بے دردی سے اس کی بھینٹ چڑھائے جا رہے ہیں وہ بجائے خود ایک فحش اور غیر اخلاقی کام ہے۔ یہ مسئلہ اگرچہ ادب سے زیادہ سماجیات سے متعلق ہے لیکن اب یہ تمام سرحدیں آپس میں اس طرح گڈمڈ ہو گئی ہیں کہ ان کو علیحدہ خانوں میں بانٹنا بھی بڑا مشکل کام ہے۔

فحاشی کی جس سمت کی طرف میں اشارہ کر رہا ہوں وہ آج کل آپ سڑکوں، بازاروں اور خاص طور پر دنیا کے بڑے شہروں میں رات کے وقت نظر آنے لگتی ہے۔ دن میں تو یہاں بچشم سر کثیر منزلہ عمارتوں کے جنگل نظر آ سکتے ہیں جو اس زمین کے فطری وسائل کی عصمت دری کے بصری نمونے ہیں اور رات کو انسانی ہوس آور شبینہ کلبوں، سڑکوں پر لوٹ مار، چوری چکاری اور منشیات کے استعمال کی کثرت میں نمایاں طور پر دنیا کے بڑے شہروں میں نظر آتی ہے۔ دولت کا چند ہاتھوں میں سمٹ جانا اور باقی لوگوں کا فاقہ زدہ نیم حیوی سطح پر زندہ رہنا، جوتی کے تسموں اور پتلونوں کی بیلٹ کی قیمتیں جن سے ایک خاندان شاید عمر بھر گزارا کر سکتا ہو آج کل کی غربت، افلاس اور دولت کی فحاشیت کی نمونے ہیں جن سے ہم کو واسطہ پڑتا ہے۔ ممکن ہے اس کو عام لوگ فحاشی کا مسئلہ نہ سمجھیں لیکن اس کے لئے اگر زبان میں اس سے زیادہ قبیح اور ریدیٰ لفظ موجود ہو وہ بھی استعمال کیا جا سکتا ہے۔ لیکن جب تک اس عمل کو گندگی، اور غلاظت میں لتھڑا ہوا ہم نہیں دیکھتے شاید ہماری اخلاقی حسن اس کے خلاف نبرد آزما ہونے کو تیار نہیں ہوگی۔

علی اقبال صاحب نے یہ کتاب مرتب کر کے ایک بڑا اچھا کام کیا ہے۔ اور میری دانست میں یہ نہ صرف اہل علم اور ادیبوں کے لیے مزید غور و فکر کے لیے ایک در کھولتا ہے بلکہ متوازن زندگی کی طرف بھی اشارہ کرتا ہے۔ چونکہ ہمارے ادب میں اس کے سماجیاتی پہلو پر کم لکھا گیا ہے اس لیے زیادہ تر مضامین ادب سے متعلق ہیں لیکن کتاب کا وہ حصہ جو فحاشی، فلم، انٹرنیٹ اور فنون لطیفہ سے متعلق ہے اس کے سماجی پہلو پر بھی روشنی ڈالتا ہے۔ مجھے امید ہے کہ یہ کتاب اس موضوع پر مزید تحقیق کے لیے ایک بڑا محرک ثابت ہوگی۔

شاعری

الطاف حسین حالی

نیاز فتح پوری

حسرت موہانی

محمد حسن عسکری

ن م راشد

جلیل قدوائی

ابواللیث صدیقی

قاضی محمد اختر جوناگڑھی

یونس حسنی

کامل القادری

خواجہ رضی حیدر

بے شرمی کی باتیں

الطاف حسین حالیؔ

ہمارے شعرا جو باتیں بے شرمی کی ہوتی ہیں، وہاں اور بھی پھیل پڑتے ہیں اور نہایت ناگفتنی باتوں کو کھلم کھلا بیان کرتے ہیں۔

ماخذ (اُردو۔۱)

مطلق عریاں اور یکسر حیا سوز

نیاز فتح پوری

میں اس کے ماننے کے لیے تیار نہیں کہ نظیر کی عریانی کو 'مطلق عریاں' اور 'یکسر حیا سوز' کہہ کر ان کے درجۂ شاعری کو گرایا جائے اور سعدی وغیرہ ایسے اساتذہ کے کلام کی عریانی کو 'مطلق' نہ دیکھا جائے اور 'یکسر' نظر انداز کر دیا جائے۔

ماخذ (اُردو۔۱۹)

اخلاقی اور غیر اخلاقی شاعری

نیاز فتح پوری

شاعر برا ہو یا بھلا' پیدا ہوتا ہے اور اس لیے سب سے پہلے میں کسی شاعر کے کلام پر گفتگو کرنے سے قبل یہ دیکھتا ہوں کہ وہ فطرت کی طرف سے شاعر بنا کر بھیجا گیا ہے یا وہ اپنے آپ کو شاعر کی حیثیت سے پیش کرنے میں فطرت سے جنگ کرتا ہے۔ اس کا فیصلہ کرنے کے بعد میں یہ دیکھتا ہوں کہ 'قدرت نے اس کے دماغ کو کس نوع کی شاعری کے لیے وضع کیا تھا اور ماحول نے کس حد تک اس کی فطری افتاد کی موافقت یا مخالفت کی۔ اور آخرکار نتیجے کے لحاظ سے وہ کامیاب ہوا یا ناکام!

آسکر وائلڈ کا ایک تنقیدی لطیفہ ہے کہ 'کسی تصنیف یا کتاب کے متعلق یہ بحث کرنا کہ وہ اخلاق کا درس دیتی ہے یا بد اخلاقی کا' بالکل لایعنی سی بات ہے۔ اس کے متعلق صرف یہ بحث ہو سکتی ہے کہ وہ تصنیف ایک تصنیف کی حیثیت سے اچھی ہے یا بری۔' آسکر وائلڈ کی یہ رائے جملہ اصناف تصنیف وتالیف پر حاوی ہو یا نہ ہو لیکن شاعری کے باب میں یقیناً قابل عمل ہے اور میں بھی شاعری کے اخلاقی یا

غیر اخلاقی ہونے سے بحث نہیں کرتا بلکہ یہ دیکھتا ہوں کہ بری یا بھلی جو ودیعتِ فطری ایک شاعر کو عطا ہوئی اس کا استعمال اس نے درست کیا یا نہیں!

فرض کیجیے ایک شخص حد درجہ فحش و عریاں شاعری کا ذوق لے کر آیا ہے تو میں صرف فن کے لحاظ سے دیکھوں گا کہ اس نے اس میں کس حد تک کامیابی حاصل کی ہے اور سنجیدگی کے تحت اس نے اپنے ذوق کے منافی کوئی حرکت تو نہیں کی! اس کے برعکس اس کی ایک مخالف مثال کو لے کر سمجھ لیجیے۔ لیکن اس کے ساتھ یہ ضرور ہے کہ جب مراتبِ شاعری سے بحث کی جائے گی اور منازلِ شعر پر گفتگو ہوگی تو اس وقت یہ بھی کہنا پڑے گا کہ فلاں کا ذوق پست ہے اور فلاں کا بلند۔ اور نقد کی یہی ناگوار صورت پیش آجاتی ہے جب دہلی اور لکھنؤ کی شاعری سے کوئی شخص بحث کرتا ہے۔ ورنہ یوں تو لکھنوی شاعری جب تک مدارج کا سوال نہ پیدا ہو اپنی جگہ یقیناً مکمل چیز ہے۔

ماخذ (اُردو۔۱۹)

فاسقانہ شاعری

حسرت موہانی

فاسقانہ شاعری کو 'بدمذاقی' پر محمول کرنا' سوقیانہ و مبتذل قرار دینا انصاف کا خون کرنا ہے۔ حقیقتِ حال یہ ہے کہ جب شاعری کا مقصد صحیح جذبات کی مصوری مسلم ہو تو پھر اس کے دائرے کو صرف پاک جذبۂ عشق و محبت تک محدود کردینے اور عامۂ خلائق کے ۹۹ فیصدی جذباتِ ہوس کو اس سے خارج کردینے کی کوشش' اور وہ بھی محض اس بنیاد پر کہ ان کا اظہار و اعلان بعض فقیہانہ و ملایانہ طبائع کی مصنوعی پاکیزگیٔ خیال کے لیے ناگوار ثابت ہوگا' خود مخالفین ہوس نگاری کی انتہائی بدمذاقی اور بے شعوری کے سوا کسی اور چیز پر دلالت نہیں کرتا

البتہ اس ضمن میں حدِ اعتدال سے گزر جانا جیسا کہ رنگین کی بعض ریختیوں اور صاحبقراں و جان صاحب کے مبتذل اشعار میں پایا جاتا ہے' بے شک قابلِ اعتراض ہے۔ مگر ایسے کلام کو فاسقانہ کی بجائے فاحشانہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔ ہزل یا ہجو کا شمار بھی ضاحکانہ قسمِ سخن میں ہوتا ہے لیکن اگر یہ چیزیں حدِ اعتدال سے گزر کر پھکڑ بازی یا فحش گوئی کے درجے تک پہنچ جائیں تو اس کو ضاحکانہ کی بجائے سوقیانہ کہنا چاہیے۔

ماخذ (اُردو۔۸)

'نئی' شاعری

محمد حسن عسکری

یہ شکایت بہت عام ہے کہ نئی شاعری میں گھناؤنی اور نفرت انگیز چیزوں کا ذکر ہوتا ہے۔ 'مداوا' میں ایک صاحب نے کلیہ قائم کیا ہے کہ گندی چیزوں کے ذکر اور شاعری کا میل کا نہیں ہوسکتا۔ حالاں کہ اسی مضمون میں آپ پہلے کہہ آئے ہیں کہ شاعر موضوع کے انتخاب میں بالکل آزاد ہے۔ نئے شاعروں کی رہنمائی کے لیے جن شاعروں کا نام لیا گیا ہے ان میں شیکسپیئر کا نام بھی شامل ہے۔ اس لیے میں فرض کرتا ہوں کہ اسے آپ بڑا شاعر سمجھتے ہیں، گو یہ تو یقینی ہے کہ آج سے آپ اس سے نفرت کرنے لگیں گے۔ شیکسپیر کا دستور ہے کہ وہ ہر ڈرامے کی تشبیہات اور واستعارات اور تصوّرات کا ایک خاص نقشہ بنالیتا ہے جو ڈرامے کی فضا سے ہم آہنگ ہوتا ہے' تو جناب شیکسپیئر نے ایک ڈرامہ لکھا ہے جس کا نام ہے ہیملیٹ۔ اور اس ڈرامے کو عموماً شیکسپیر کی سب سے بڑی تصنیف سمجھا جاتا ہے۔ لیکن شیکسپیر کی کورذوقی ملاحظہ ہو کہ اس سب سے بڑی تصنیف کے تصورات کا نقشہ مشتمل ہے پھوڑے پھنسیوں اور پیپ وغیرہ پر، اس ایک ڈرامے میں وہ ان چیزوں کی تمام ممکنہ قسمیں گنوا گیا ہے۔ اسی طرح اوتھیلو میں استعارے لیے گئے ہیں گھناؤنے اور نفرت انگیز جانوروں سے۔ آرٹ میں کوئی چیز ویسی نہیں رہتی جیسی وہ زندگی میں ہے' آرٹ اس کی ماہیت تبدیل کردیتا ہے۔ یہاں روزمرہ کی زندگی کا اچھا اور برا نہیں دیکھا جاتا بلکہ بجا اور بے جا استعمال۔ گندگی کے خلاف ایک کلیہ نہ قائم کیجیے بلکہ انفرادی طور پر اس کا استعمال دیکھیے اور مجھے یقین ہے کہ آپ بھی 'پیپ بہتی ہوئی گلتے ہوئے ناسوروں سے' کو بے محل نہیں بتاسکتے۔

یادش بخیر' فحش اور عریانی! اس کی شکایتیں تو مدّت سے ہو رہی ہیں لیکن یہ آپ نے ابھی تک نہیں بتایا کہ آپ کس چیز کو فحش سمجھتے ہیں' نظم نقل کرکے اس کے نیچے 'فحش' لکھ دینے سے تو کام نہیں چلتا۔ فحش کی تعریف تو کیجیے۔ اپنی طرف سے تو میں فحش کی تعریف پہلے بھی کرچکا ہوں اور اب پھر دہراتا ہوں۔ میں اصل میں کسی لفظ کو بذاتِ خود فحش نہیں سمجھتا' صرف اس کا استعمال اسے فحش یا غیر فحش بناتا ہے۔ لیکن آپ حضرات کو تو محض مخالفت منظور ہے اس لیے مجھے یقین ہے کہ آپ 'وہ گئی' کو بھی فحش کہیں گے۔ آپ نئے شاعروں پر سطحی دل و دماغ رکھنے کا الزام لگاتے ہیں مگر آپ خود نئی شاعری کو سطحی طور پر

پڑھتے ہیں جبھی تو آپ اس میں عورت پرستی اور شباب پرستی دیکھتے ہیں اور 'کھاؤ پیو مگن رہو' کا نظریہ نئے شاعروں کے سر مڑھے دے رہے ہیں......

بہرحال اب میں آپ کے سامنے نئے شاعروں کی عورت پرستی کی مثال پیش کروں گا۔

فیض کی نفس پرستی ملاحظہ۔ محبوب سے کہتے ہیں ؏

اب بھی دلکش ہے ترا حسن، مگر کیا کیجئے؟

محبت کے دکھوں اور راحتوں کے علاوہ اور بھی سکھ دیکھ رہے ہیں۔ محبوب کو پہلی سی محبت بھی نہیں دے سکتے۔ منہ پھٹ اور دریدہ دہن کہ اس سے صاف کہے دے رہے ہیں ؎

تو اگر میری ہو بھی جائے   دنیا کے غم یوں ہی رہیں گے

توبہ توبہ، کیسی گھناؤنی خواہشیں ہیں کہ وصل کی آرزو میں نہیں مرتے بلکہ محبوبہ سے اخلاقی سبق سیکھنا چاہتے ہیں ؎

عاجزی سیکھی، غریبوں کی حمایت سیکھی   یاس و حرماں کے دکھ درد کے معنی سیکھے
زیردستوں کے مصائب کو سمجھنا سیکھا   سرد آہوں کے، رخِ زرد کے معنی سیکھے.

راشد کی آلودگیاں دیکھیے۔ محبوبہ کی بانہوں میں بڑے آرام سے پڑے رہنے کے بجائے اٹھ اٹھ کر بھاگ رہے ہیں۔ خوں خوار درندوں کے غول سے وطن کو بچانا چاہتے ہیں۔ کیا ہولناک ہوس کاری ہے کہ بستر کی لذتوں سے جان چھڑا کر بیچاری محبوبہ کو مفلسوں، بیماروں کے ہجوم دکھا رہے ہیں۔ اسے لے کر سرزمینِ عجم جانا چاہتے ہیں جہاں خیر و شر یزداں و اہرمن کا فرق مٹ گیا ہو۔ اس پر یہ ظلم ڈھاتے ہیں کہ ؎

مجھے آغوش میں لے
دو 'انا' مل کے جہاں سوز بنیں
اور جس عہد کی ہے تجھ کو دعاؤں میں تلاش
آپ ہی آپ ہویدا ہو جائے

یہ جذبی ہیں، طوائف سے جنسی آسودگی حاصل کر کے واپس نہیں چلے آتے بلکہ اس کی پست نگاہی کا گلہ کرنے بیٹھ جاتے ہیں۔ اوروں کو چھوڑیئے، بیچارا مخمور تک نفس پرستی کو پسند نہیں کرتا بلکہ 'لہو کی جوانیاں' میں تو اس کا انداز بڑا واعظانہ ہے۔ فراق کی بوالہوسی بھی دیکھنے کی چیز ہے ؎

ملے، دیر تک، ساتھ سو بھی لیے، بہت وقت ہے آؤ باتیں کریں

وصل سے بھی ان کی پیاس نہیں بجھتی، جنسی جذبے کو احساسِ رفاقت میں تبدیل کرتا

چاہتے ہیں۔ یہ ہے نئے شاعروں کی عورت پرستی جس پر جتنی لعنتیں بھی بھیجی جائیں، کم ہیں۔

نئی شاعری کی بنیاد جنسی الجھنوں پر بتانے والے یہ بھول جاتے ہیں کہ وہ کون سا اردو شاعر ہے جس کی شاعری اسی بنیاد پر قائم نہ ہو۔ اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ ہر شاعری خواہ وہ متصوفانہ ہو یا عارفانہ ہی کیوں نہ ہو، جنسی جذبے کی ارتفاع پائی ہوئی شکل ہوتی ہے لیکن بغیر ارتفاع کے بھی جنسی الجھنیں اچھی سے اچھی شاعری کا موضوع بنتی رہی ہیں۔ شاعری اندرونی تصادم اور کش مکش سے پیدا ہوتی ہے۔ اور یہ کش مکش جتنی تیز اور تند ہوگی، اتنا ہی شعریت کا رنگ نکھرے گا۔ نئی شاعری میں صرف و محض ہوس کاری نہیں ہے بلکہ ہر جگہ ایک شدید کش مکش کے نشان ملتے ہیں اور یہ شدت بعض اوقات زیادہ صاف الفاظ استعمال کرنے پر مجبور کرتی ہے۔ یہ جنسی الجھنیں صرف اردو کے شاعروں ہی تک محدود نہیں ہیں بلکہ عالمگیر ہیں۔ ہمارے شاعروں میں احساس اور اعتقاد کا تصادم ہو رہا ہے، خواہشات اور روایات کا۔ نئے علم اور پرانی قدروں کا، جنسیات اور اقتصادیات کا۔

ایک طرف پرانی روایات ہیں جو پاک اور غیر جسمانی محبت پر زور دیتی ہیں۔ دوسری طرف شاعر کی جنسی خواہشیں ہیں، نئی نفسیات ہے جو پاک محبت کا بڑا بے رحمانہ تجزیہ کرتی ہے جس کے نزدیک محبت دائمی نہیں بلکہ وقتی جذبہ ہے۔ نیا شاعر ان دو اصولوں کے درمیان لٹکا ہوا ہے اور ان میں سے کسی کو بھی چھوڑنے پر راضی نہیں ہوتا۔ مثالیں راشد کے یہاں دیکھیے۔

یہ مل رہی ہے مرے ضبط کی سزا مجھ کو
کہ ایک زہر سے لبریز ہے شباب مرا
گناہ ایک بھی اب تک کیا نہ کیوں میں نے؟

یا دوسری جگہ ۔

وقت کے اس مختصر لمحے کو دیکھ
تو اگر چاہے تو یہ بھی جاوداں ہو جائے گا
مطمئن باتوں سے ہو سکتا ہے کون؟
روح کی سنگین تاریکی کو دھو سکتا ہے کون؟

تیسری جگہ راشد نے ان دونوں اصولوں میں سمجھوتے کی کوشش کی ہے ۔

میں جو سرمست نہنگوں کی طرح
اپنے جذبات کی شوریدہ سری سے مجبور
مضطرب رہتا ہوں مدہوشی و عشرت کے لیے
اور تری سادہ پرستش کے بجائے

مرتا ہوں تیری ہم آغوشی کی لذت کے لیے
میرے جذبات کو تو پھر بھی حقارت سے نہ دیکھ
اور مرے عشق سے مایوس نہ ہو
کہ مرا عہد وفا ہے ابدی

بالکل یہی کش مکش اور شاعروں کے یہاں موجود ہے۔ آپ اسے تو نظر انداز کر جاتے ہیں، جو شاعری کی روح ہے اور صرف لفظ پڑھ پڑھ کر اس شاعری کو فحش کہنے لگتے ہیں۔ حال ہی میں ایک صاحب نے مطالبہ کیا ہے کہ اگر موجودہ جنسی اقدار مصنوعی ہیں تو شاعروں کے پاس جنسیات کی نئی اقدار کیا ہیں؟ لیکن نئے شاعر کسی عریانی کے کلب کا اعلان نامہ تو مرتب نہیں کر رہے ہیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ ان نظموں میں بعض پابندیوں سے بیزاری اور بعض آزادیوں کی پسندیدگی کا اظہار ملتا ہے لیکن وہ چیز جو شاعری کے لیے فائدہ مند ہے دو قسم کی قدروں کا تصادم ہے، نہ کہ نئی قدروں کی مجوزہ فہرست۔

ایک نیا جنسی عنصر ہماری دنیا میں پیدا ہوا ہے جس کا بہترین اظہار ڈی ایچ لارنس نے کیا ہے اور جس کی ہمارے یہاں ابھی صرف پرچھائیاں ہی ملتی ہیں۔ یہ ہے خود پرستی اور جنسی جبلتوں کی لڑائی۔ پہلی جبلتوں کا تقاضہ ہے کہ اپنی انفرادیت کو سب سے الگ اور نادر الوجود بنائے رکھا جائے لیکن جنسی خواہش دوسرے فرد سے ملنے پر مجبور کرتی ہے اور یہ مجبوری انفرادیت کے پرستار کو فطرت کا ظلم معلوم ہوتی ہے۔ وہ جنسی جذبے کو اپنے لیے ایک صلیب سمجھنے لگتا ہے۔ جنسیت سے یہ ڈر اور نفرت لارنس کے یہاں جس عریانی کے ساتھ ظاہر ہوئی ہے اگر اس کا شائبہ بھی اردو میں پایا جائے تو شاید آپ کتابیں جلانے لگیں لیکن ہم لارنس کی اس عریانی کو کسی طرح بھی فحش نہیں کہہ سکتے کیوں کہ اس کے اظہار کے لیے یہ عریانی ضروری ہے۔

سب سے بڑی چیز جو نئی نسل کو جنس پر اتنی توجہ صرف کرنے پر مجبور کرتی ہے وہ ایسی چیزوں اور ایسے اصولوں کی کمی ہے جن پر اپنے جذبات خرچ کیے جا سکیں۔ اس ماحول میں جس سے نئی نسل اپنے آپ کو ہم آہنگ نہیں پاتی جب اسے اپنے جذبات کی آسودگی کا سامان نہیں ملتا تو وہ زائد جذبے جنس کی طرف ڈھلک جاتے ہیں۔ اس ماحول سے ہم آہنگی تو الگ، نیا شاعر تو اسے اپنے دشمن کی حیثیت سے دیکھتا ہے۔ چوں کہ وہ اس کا مقابلہ کرنے کی طاقت اپنے اندر نہیں پاتا اس لیے لازمی طور پر اپنے احساس شکست کو جنسی جذبے میں چھپانا چاہتا ہے اور صاف صاف اس کا اقرار بھی کر لیتا ہے

زندگی پر میں جھپٹ سکتا نہیں   جسم سے تیرے لپٹ سکتا تو ہوں

یہی مجروح اور شکست خوردہ ذہنیت جب اپنے ملک کے لیے کچھ نہیں کر سکتی تو اجنبی عورت کے جسم سے انتقام لینا شروع کر دیتی ہے۔ آپ لوگوں نے اس نظم 'انتقام' پر راشد کو بہت طعنے دیے ہیں

لیکن وہ غریب تو خود اپنے آپ کو طعنہ دے رہا ہے، خود اپنے اوپر استہزا کر رہا ہے۔ آپ اس کا لہجہ نہ سمجھیں تو وہ کیا کرے۔ یہ نظم جنسی نہیں ہے جیسا کہ آپ سمجھے ہیں بلکہ سیاسی اور اخلاقی۔ ایسی نظموں میں راشد اپنی گھناؤنی خواہشوں کا اظہار نہیں کرتا بلکہ قوتِ ارادی اور 'جینے کی خواہش' کی کمزوریوں اور بیماریوں کا تجزیہ۔ محض عشرت پسندی اور تن آسانی اور کھاؤ پیؤ مگن رہو والا نظریہ آپ کو کسی نئے شاعر میں نہیں مل سکتا۔ ہر شاعر کی آواز دکھی ہوئی اور چوٹ کھائی ہوئی ہے۔ صرف لفظوں پہ غور نہ کیجیے بلکہ روح سمجھئے۔ کبھی آپ نے یہ بھی سوچا ہے کہ نئے شاعر کو اپنی 'ہوس کاری' میں سکون بھی ملتا ہے یا نہیں، یا پھر بھی اس کے اندر اسی طرح خلائیں پھیلتی رہتی ہیں۔ جن نظموں کو آپ فحش بتا رہے ہیں انھیں پھر سے پڑھیے 'بے کراں رات کے سناٹے میں' اس نظم کا شاعر اپنے آپ کو جنسی لذت میں ڈبو دینے پر مجبور ہے لیکن ساتھ ہی وہ اس سے ہچکچا بھی رہا ہے۔ جنس سے لذت لینے کے لیے اسے ایک قصہ گھڑنا پڑتا ہے کہ اس کی محبوبہ، جو شاید بیوی ہے، کسی ساحل کی دوشیزہ ہے اور وہ خود اس کے دشمن ملک کا تھکا ہوا سپاہی ہے اور ہم آغوشی سے اپنی تھکن کا بدلہ لینا چاہتا ہے۔ اس افسانے کا جادو چلتا تو ہے لیکن تھکن، پیاس، غیر آمادگی، گراں باری کے اثرات پھر بھی قائم رہتے ہیں۔

نیند آغاز زمستاں کے پرندے کی طرح
خوف دل میں کسی موہوم شکاری کا لیے
اپنے پَر تولتی ہے، چیختی ہے۔

……

آرزوئیں ترے سینے کے کہستانوں میں!
ظلم سہتے ہوئے حبشی کی طرح رینگتی ہیں

درحقیقت یہ وہ کیفیت ہے جب 'زنا' سے زیادہ آسان اور آرام دہ تو خودکشی نظر آتی ہے۔ میرا جی اس بے لطفی اور بے رنگی کے احساس میں دو ہاتھ اور آگے ہیں۔ وہ محبوبہ کے قریب پہنچنے سے پہلے ہی اداس ہو جاتے ہیں اور سوچنے لگتے ہیں کہ آخر ایسا کیا فرق پڑ جائے گا! یہ ہے نئے شاعروں کا تعیش۔ ان آلودگیوں کی اور مثالیں بھی دوں گا۔ یہ تاثیر ہیں جو حسینوں کی بانہوں میں حصار عافیت ڈھونڈنے والے کو شہ دے رہے ہیں۔

تمناؤں میں اُلجھاتا رہے گا دل کو تو کب تک
کھلونے دے کے بہلاتا رہے گا دل کو تو کب تک
ہوس کی ظلمتیں چھائی ہوئی ہیں تیری دنیا پر

……

یہ وشوامتر عادل جو ہیں اپنی جنسی فتح پر خوشی کے نعرے لگا رہے ہیں۔

مری تڑپتی ہوئی روح پھڑ پھڑاتی ہے
نحیف زیست سے عاری ہے پر بھی ٹوٹے ہوئے
مگر یہ رینگتے لمحوں کی چیونٹیاں چپ چاپ
لپٹ لپٹ کے اسے بار بار چومتی ہیں

یہ اخترالایمان ہیں نیند سے پہلے مزے لے لے کر اپنی گھناؤنی خواہشیں بیان کر رہے ہیں۔

اشک بہ جائیں گے آثار سحر سے پہلے
خون ہوجائیں گے ارمان اثر سے پہلے
سرد پڑجائے گی بجھتی ہوئی آنکھوں کی پکار
گرد برسوں کی چھپادے گی مرا جسم نزار
جاگتے جاگتے تھک جاؤں گا' سوجاؤں گا!

آپ اس خون وملال کو کیوں نہیں دیکھتے' سب سے پہلے آپ کی نظریں عریانی پر کیوں پڑتی ہیں؟ اس وجہ سے کہ آپ خود شاعری نہیں کر سکتے' لیکن اگر واقعی خلوص کے ساتھ آپ اس انداز بیان کو پسند نہیں کرتے تو ان شاعروں کی الجھنیں دور کرنے میں مدد کیجیے۔ ان کے ساتھ مل کر دنیا کو بدلیے۔ اس پر خوب یاد آیا۔ ایک صاحب فرماتے ہیں کہ اگر یہ شاعری بدلے ہوئے حالات نے پیدا کی ہے تو اسے دیکھ کر بدلے ہوئے حالات سے بھی نفرت ہوجاتی ہے۔ جی' ہم اور کیا چاہتے ہیں؟ جادو سر پر چڑھ کے بولا۔ جب ہم اس سماجی ماحول سے آپ کو نفرت دلانے میں کامیاب ہوگئے تو پھر آپ نے ہمارا نقطۂ نظر قبول کرلیا خیر' کم سے کم آپ ناانصافی تو نہ کریں اور اس روحانی تشنج کو ہوس کاری کا نام تو نہ دیں۔ لیکن یہ بھی یاد رکھیے کہ جب وقت آئے گا تو طربیہ شاعری بھی یہی آپ کے خادم کریں گے۔ آپ کے بس کا یہ روگ بھی نہیں ہے۔

کہاں ہر ایک سے بار نشاط اٹھا ہے! بلائیں یہ بھی محبت کے سر گئی ہوں گی

لیکن اگر چند ایسے چھوٹے موٹے شاعر موجود ہیں جو محض جنسی لفظوں کے بل پر شاعری کرنا چاہتے ہیں تو ان سے اس قدر گھبرا جانے کی کیا وجہ ہے؟ اور پھر اس قدر گھبرا جانا کہ سرکاری وزیروں کے پاس وفد لے کر جارہے ہیں بسورتے ہوئے کو' ہمیں چھیڑا'...... نئے شاعروں پر بگڑتے وقت تو آپ ملٹن کے شعر نقل کرتے ہیں۔ لیکن جب آپ اسے اتنا بڑا شاعر مانتے ہیں تو اپنے آپ اس سے سبق کیوں نہیں لیتے! کبھی اس کی' اریوپیجٹیکا' تو کھول کر دیکھیے کہ وہ کتابوں پر پابندیوں کا کتنا مخالف تھا۔ ملٹن کی بنیادی دلیل ہی یہ تھی کہ ہر شخص کو انتخاب کی آزادی ہونی چاہیے۔ بلکہ بری کتابیں پڑھے بغیر اچھی کتابوں کی تمیز ممکن ہی نہیں۔ اگر آپ کسی نظم کو فحش سمجھتے ہیں تو وجہ بتائیے' اس پر بحث کیجیے' اگر آپ

نے ثابت کر دیا کہ اس نظم میں شاعری نہیں ہے تو چلیے قصہ ختم ہوا۔ کوئی اسے پڑھے گا ہی نہیں اور وہ اپنے آپ مر جائے گی۔ جتنا وقت آپ گلا پھاڑ پھاڑ کر چیخنے میں صرف کرتے ہیں اگر اسے آپ لوگوں کا ذوق بلند کرنے میں لگائیں تو فحش پنپ ہی نہیں سکتا۔ لیکن جنس کے اظہار پر پابندیاں اور تعزیریں عائد کرنے کا نتیجہ ہمیشہ عریانی کی چوگنی ترقی ہوتا ہے۔ کرومویل کے زمانے میں ڈرامے کو مخرب اخلاق سمجھ کر اسٹیج کو قانوناً بند کر دیا گیا۔ دس سال کے بعد جب پابندیاں ہٹیں اور تھیٹر کھلے تو جو مواد اس دوران میں پکتا رہا تھا' اس زور سے اُبلا کہ ہر ڈرامہ نگار نے زناکاری کو اپنا موضوع بنالیا۔ لیکن اگر آپ واقعی خلوص کے ساتھ چند پابندیاں ضروری سمجھتے ہیں تو کھوئی کھوئی باتیں نہ کیجیے' فحش کی واضح تعریف بتائیے اور اس کی روشنی میں نئے شاعروں کی بدعنوانیاں گنوائیے۔ معلوم نہیں غالب آپ کے نزدیک قابلِ استناد ہے یا نہیں' لیکن آپ کی معلومات کے لیے فحش کی وہ تعریف سناتا ہوں جو انھوں نے تیغ تیز میں مہیا کی ہے۔ اصل عبارت تو میرے سامنے موجود نہیں ہے لیکن اس کا مفہوم یہ ہے کہ فحش صرف اس وقت پیدا ہوتا ہے جب اعضائے تناسل کا ذکر ہو یا کسی کی ماں' بیٹی یا جورو ننگی جائے۔ اس تعریف کو معیار بنا کر جانچیے تو کسی نئے شاعر کا ایک مصرعہ بھی گرفت میں نہیں آ سکتا۔ اگر میراجی نے اعضائے تناسل کا ذکر کیا ہے تو ایسے چکردار طریقے سے کہ بعض وقت آپ حضرات انھیں اہمال کا مجرم گرداننے لگتے ہیں۔ ایک طرف تو آپ کہتے ہیں کہ جنسیات کو خوب پردوں میں ڈھکا چھپا کر محفل میں لاؤ' جب آپ کے ارشاد کی تعمیل ہوتی ہے تو آپ پھر بگڑتے ہیں کہ اس کپڑوں کی پوٹلی میں ہمیں کچھ نظر ہی نہیں آتا۔

اس فحاشی والے اعتراض کا دم چھلّہ یہ الزام ہے کہ نئی شاعری اخلاقی قدروں کے لیے تباہ کن ہے۔ نئے شاعروں کے سامنے واقعی ترقی کا کوئی بلند مقصد نہیں ہے اور ایک نظم بھی ایسی نہیں ملتی جس سے سماج کی خدمت انجام دی جا سکتی ہو۔ پہلے تو یہ بتائیے کہ آپ حضرات جو شاعری کرتے ہیں اس سے سماج کی کیا خدمت ہوتی ہے' یا کچھ دن گزرے پارسی دوشیزاؤں اور رقاصاؤں کو دیکھ کر نیاز فتح پوری صاحب ریشہ خطمی ہوا کرتے تھے' ان کی تمام رقّت کون سی اخلاقی عمارت کے لیے گارے کا کام دے رہی ہے! پھر جب آپ خود قبول چکے کہ شعر میں آپ رنگینی اور مکروہاتِ دنیوی کے بھلانے کا سامان چاہتے ہیں تو یہ دوشیزہ (لفظ دوشیزہ کی چیختی فحاشی پر نظر رکھیے) کی ننگی باہیں دیکھ کر 'سی سی' کرتے ہیں۔ نیا شاعر اجنبی عورت کے بستر پر اپنے ذہن کو دلدل بنالینا چاہتا ہے۔ چلیے' دونوں برابر۔ آپ کا اعتراض خبیث ریاکاری بلکہ نیا شاعر آپ سے اس طرح اخلاقی حیثیت سے بلند ہے کہ ذرا سی ہونٹوں کی سرخی آپ کو ایسا مست کر دیتی ہے جیسے دونوں جہان کی دولت مل گئی ہو۔ اور نیا شاعر ہم آغوشی' بلکہ لذت اندوزی کے دوران میں بھی اعتراف کر لیتا ہے کہ شہوانیت محض ایک ریگ زار ہے۔

لیکن اگر آپ کو اخلاقی تنقید سے ایسا ہی پیار ہے تو مجھے بھی کوئی عذر نہیں ہے بلکہ میرے سب سے محبوب نقادوں میں سے ایک اروِنگ بینٹ ہے جس نے اخلاقیات کی لکڑی سے پچھلے ڈیڑھ سو سال کے ادب کو ایسا دھنا ہے کہ ادھ موا ہی کر کے چھوڑا ہے لیکن اسے کیا کیا جائے کہ آپ کے نزدیک اخلاقیات کا مفہوم صرف اتنا ہے کہ کس عورت کے ساتھ سویا جا سکتا ہے اور کس کے ساتھ نہیں۔ عیسوی اخلاق کے انکسار، یونانیوں کے تصورِ عدل اور ہندوؤں کے عقیدے سے روحِ کائنات سے ہم آہنگی کا تو آپ نے نام بھی نہیں سنا معلوم ہوتا۔ اور نہ آپ اس حقیقت سے باخبر ہیں کہ روحانی دنیا میں کوئی چیز بے کار نہیں جاتی اور زندگی کا ہر تجربہ ایک اخلاقی قوت ہوتا ہے۔ دوبارہ سوچیے کہ آپ ایسی نسل کی شاعری کو اخلاق کے منافی کہہ رہے ہیں جس نے نئی اخلاقی اقدار دریافت کرنے کا بارِ گراں اٹھایا ہے جو بڑے سے بڑا جرأت طلب تجربہ کرنے سے بھی نہیں گھبراتی، جو اپنی تمام ہزیمت خوردگی، تشکک اور ذہنی بحران کے باوجود زندگی پر کچھ ایسا بھروسہ کرتی معلوم ہوتی ہے کہ منفی عناصر سے بھی مثبت فوائد کا پھل لینے کی امید کرتی ہے۔

غبارِ رہ کے اشارے سنبھال لیتے ہیں
افق کے دھندلے کنارے سنبھال لیتے ہیں
سنا ہے ٹوٹتے تارے سنبھال لیتے ہیں
بس ایک بار سہی، ڈگمگا کے دیکھ تو لوں

یہ وہ نسل ہے جو اپنے ستواں جسم کو رقاصاؤں کے بازوؤں کی پھڑک پر پگھلا پگھلا کر ختم نہیں کر دینا چاہتی بلکہ جسم و زباں کی موت سے پہلے سچ کی حمایت میں بولنا چاہتی ہے۔ جو محبوبہ سے ذاتی نفسانی خواہشات کی تکمیل کے بجائے ایک جہاں سوز 'انا' کی تشکیل کی آرزومند ہے۔

کیوں نہ جہانِ غم اپنا لیں بعد میں سب تدبیریں سوچیں
بعد میں سکھ کے سپنے دیکھیں سپنوں کی تعبیریں سوچیں

نیا شاعر جب زندگی سے بھاگ کر عورت کے سینے میں پناہ لیتا ہے تو اپنے فرار کو خوبصورت ناموں کے پیچھے نہیں چھپاتا۔ ساتھ ہی اس کی کشش کا مرکز ہمیشہ نسائی جسم کے نشیب و فراز بھی نہیں ہوتے۔

ایک سودا ہی سہی آرزوئے خام سہی
ایک بار اور محبت کر لوں
ایک انسان سے الفت کر لوں!

نہ وہ زندگی کے مظاہر سے اتنا ڈرتا ہے کہ ان جانے اور اَن دیکھے ہوئے کے خوف کے مارے روایتی اخلاقیات کے بند کمرے سے قدم باہر نہ نکالے۔ وہ اہرمن سے اس کے تہہ خانے میں ملاقات کرنے پر آمادہ ہے۔ نئے شاعر کا دل گردہ دیکھیے۔

یا اتر جاؤں گا میں یاس کے ویرانوں میں
اور تباہی کے نہاں خانوں میں
تا کہ ہو جائے مہیا آخر
آخر حدِ تنزل ہی کی اک دید مجھے

اور یہ خوش نصیبی داد کی مستحق ہے کہ تباہی کے نہاں خانوں میں بھی وہ 'نور کی منزل آغاز' کی ایک جھلک دیکھ پانے سے ناامید نہیں ہوتا۔ اور کچھ نہیں تو اس کی تسلی کے لیے یہی بہت کافی ہوگا کہ اپنی جرأتِ پرواز کا اندازہ ہو جائے۔

اب میں ایسے موضوعات پر شعر پیش کروں گا جو سو فیصدی جنسی ہیں اور ایک ایسے شاعر کے، جو آپ کے خیال میں اپنے آپ تو ڈبوئے گا ہی مگر اوروں کو بھی لے ڈوبے گا۔ میراجی نے جو تجربیاتِ جنسی کا درس دینے کے لیے مدرسہ کھول رکھا ہے میں آپ کو وہاں لیے چلتا ہوں۔ یہ حضرت روز نت نئی عورت چاہتے ہیں اور کسی ایک کا ہو کر رہنے کا جھنجھٹ اپنے ذمے نہیں لیتے۔ وہ اس پر فخر کریں تو کریں لیکن ان کی سب سے بڑی حرام کاری تو یہ ہے کہ جنسی لذت کی چسکیاں نہیں لیتے رہے بلکہ زندگی کے انقلابات انسان کی فطرت اور نظامِ کائنات کے متعلق سوچنے لگتے ہیں اور حیرت میں ڈوب جاتے ہیں۔

اور چاند چھپا، تارے سوئے، طوفان مٹا، ہر بات گئی
دل بھول گیا پہلی پوجا، من مندر کی مورت ٹوٹی
دن لایا باتیں ان جانی، پھر دن بھی نیا اور رات نئی
پیتم بھی نئی، پریمی بھی نیا، سکھ سیج نئی، ہر بات نئی
اک پل کو آئی نگاہوں میں جھلمل جھلمل کرتی، پہلی
سندرتا اور پھر بھول گئے
ہم اس دنیا کے مسافر ہیں
اور قافلہ ہے ہر آن رواں
ہر بستی، ہر جنگل، صحرا اور روپ منوہر پربت کا
ایک لمحہ من کو لبھائے گا، ایک لمحہ نظر میں آئے گا

ممکن ہے کہ آپ یا میں اس جنسی اخلاق کو قبول نہ کریں لیکن ہمارے سامنے شادی کے مسئلے پر برٹرینڈ رسل کی کتاب تو ہے نہیں، ایک نظم ہے اور اسی حیثیت سے ہم اس پر غور کریں گے۔ شاعرانہ تخیل یہی تو کرتا ہے تاکہ کسی مخصوص جذبے کو عالمگیر زندگی کے پس منظر میں رکھ کر دیکھے اور یہی اخلاقیات کا عمل ہے۔ ایک احساس یا فعل کو پورے نظام زندگی میں جگہ دینا۔ یہی اس نظم میں کیا گیا ہے بلکہ جب ہم یہ نظم ختم کرتے ہیں تو ہم آزاد محبت کے حسن و قبح پر بحث نہیں کر رہے ہوتے۔ یہ نظم ہمارے ذہن میں نظامِ زندگی پر تحیر کا جذبہ اور ایک ہلکی سی افسردگی چھوڑ جاتی ہے۔ اس نظم کی ٹھسک سے پھوٹ بہنے کا ڈر کسی کج چینڈیے ہی کو ہو سکتا ہے۔ انفرادی، عارضی، وقتی بلکہ معمولی سے جنسی جذبے تک کو فوراً کائناتی زندگی سے متعلق کر لینا میراجی کی خصوصیت ہے جو غالباً وشنو شاعری کے اثر سے ان میں پیدا ہوئی ہے۔ مثال دیکھیے ۔

آج اشنان کیا گوری نے (آج بھلا کیوں نہائی؟)
یہ سنگار چال مایا کا، اس نے کس سے نبھائی!

اگر میں آپ کو یہ خبر سناؤں کہ میراجی نے اپنے پہلے جنسی اتصال کے متعلق ایک نظم لکھی ہے تو آپ اس کے سوا اور کچھ تصور ہی نہیں کر سکیں گے کہ انھوں نے اپنی کارکردگی کی داستان بڑے چٹخارے لے لے کر بیان کی ہوگی۔ لیکن یہ جان کر آپ مایوس ہوں گے کہ دوسری لائن ہی میں وہ انسانی زندگی پر خیال کی حکمرانی کی طرف بھٹک جاتے ہیں۔

اب کچھ نہ رہا مٹی میں ملا، جو دھن تھا پاس وہ دور ہوا
وہ دھن بھی دھیان کی موج ہی تھی، مچلی، ابھری، ڈوبی، کھوئی

پھر اسی واردات سے میراجی کو اپنی گزشتہ زندگی پر ایک نظر ڈالنے کی تحریک ہوتی ہے۔ غور کیجیے گا کہ اتنی غمگین آواز کسی شہوت پرست یا عیاش طبع کی نہیں ہو سکتی ۔

یہ دنیا ایک شکاری تھی، کیا جال بچھایا تھا اس نے
دو روز میں ہم نے جان لیا، سکھ اور کا ہے اور دکھ اپنا
سنجوگ کے دن گنتی میں نہیں اور پریم کی راتیں ہیں سپنا

اور میراجی کیسے ہوس کاری کے نشے میں چور اونچے مکان کی طرف گئے تھے، وہ بھی سن لیجیے ۔

یہ دنیا ایک بیوپاری تھی، کیسا بہکایا تھا اس نے
من جال میں پھنس کر جب تڑپا، جھنجلا اٹھا، جھنجلا اٹھا

اس مہم میں کامیاب ہونے کی خوشی تو در کنار، میراجی تو اپنی پاکیزگی زائل ہوجانے کے رنج

کو چوٹ کی طرح لیے بیٹھے ہیں ع

ے وہ پہلی اچھوتی سندرتا نیند آہی گئی، اس کو سوئی

اسی طرح کر رہے ہیں نئے شاعر اخلاق و شرافت کا ستیاناس یہ تو صرف ایسی مثالیں تھیں جن کے معنی صاف ظاہر ہیں۔ لیکن نئے شاعروں کی آواز میں جس نئی انسانیت کی گونج اور ان کے لب و لہجے میں جس نئی اخلاقیات کے قدموں کی آہٹیں سنائی دے رہی ہیں، کیا اس تصور کو واضح تر کرنا، اس خواب سیمیں کو مرئی بنانا، نوعی ترقی کی خدمت نہیں ہے کیا اس سے زیادہ نرم مزاج، زیادہ توانا، زیادہ رچے ہوئے اخلاق کی بنیادیں نہیں استوار ہو رہی ہیں؟ لیکن ہمارا مسلک خود فریبی یا عالم فریبی نہیں ہے۔ ہم اپنی کمزوریوں کو ہنروری نہیں سمجھتے۔ ہمارے اندر جو اخلاقی تضاد اور تصادم ہیں، ہمیں اچھی طرح ان کا احساس ہے۔ لیکن ان کا وہی حل کارآمد ہو سکتا ہے جو خود ہمارے اندر پیدا ہوا ہو آپ کا بخشا ہوا نہیں۔ جب آپ 'انتقام' یا 'گناہ' جیسی نظم کو مردود قرار دیتے ہیں تو آپ صرف ظاہر پرستی کر رہے ہوتے ہیں، نئی نسل کی حیرانی، جھنجھلاہٹ، افتادگی اور اذیت پسندی کو متہم کرتے وقت ایک نئے شاعر کا یہ شعر یاد رکھیے جس میں بذاتِ خود نئی اخلاقیات کی رعنائیاں جھلملا رہی ہیں ے

پاؤں کی تھرتھری نہ دیکھ، دیکھ یہ نالۂ جرس
راہ گزارِ عشق میں، چھوٹتی ہمتیں نہ دیکھ!

ایک بات اور ملحوظ رہے۔ عیسوی، یونانی یا ہندو اخلاقیات کے نقطۂ نظر سے جتنی کمزوریاں آپ نئے شاعر میں ڈھونڈھ سکیں گے ان میں سے کئی خود اقبال کے یہاں بھی ملیں گی کیوں کہ 'شاعرِ مشرق' کو کسی طرح یورپ کی رومانی تحریک سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔

شاعری اور اخلاقیات کے تعلق پر بھی ایک نظر ڈالتے چلیں تو اچھا ہے۔ اس بحث کے دو پہلو ہو سکتے ہیں جن کے کلاسیکی نمائندے افلاطون اور ارسطو ہیں۔ نئی اردو شاعری تو پھر بھی چھوٹی چیز ہے افلاطون ہر شاعری کو بنفسہٖ اخلاق کا دشمن سمجھتا تھا۔ اسے ڈر تھا کہ شاعری سے جذبات میں اتنا ہیجان پیدا ہوتا ہے جس سے طبعیت کا اعتدال قائم نہیں رہ سکتا۔ اس لیے اس نے اپنی مثالی ریاست سے شاعروں کو بہ صد تکریم رخصت کر دینے کا ارادہ کر لیا تھا۔ اس کے برخلاف ارسطو کی تخیل پسندی نے ادب کے متعلق ایسا قطعی فیصلہ نہیں کیا۔ اس کی رائے ہے کہ شاعری جذبات میں تہلکہ مچا دینے والا ہیجان پیدا نہیں کرتی بلکہ رکے ہوئے جذبات کو راہ دیتی ہے اور زوائد کو خارج کر کے دوبارہ اعتدال قائم کرتی ہے اور یہی رائے ہے جدید نفسیات کی۔

لیکن افلاطون کا انجام عبرت ناک ہے۔ حضرت بڑے دور اندیش اور پیش بیں بن کر چلے تھے، لیکن خود جناب ہی کا فلسفہ آج تک جذبات میں ہیجان پیدا کر رہا ہے اور اکثر رنگین مزاجوں کا ملجاو

مادی بن رہا ہے نہ کہ سوفوکلیز اور یوری پائیڈز کی شاعری۔ تو جب تک شاعری کو شاعری سمجھ کر پڑھا جاتا ہے اور اسے اخلاقیات کا بدل نہیں سمجھا جاتا' اس سے نقصان پہنچنے کا احتمال نہیں۔ لیکن جہاں شاعر نے اپنی حیثیت سے غیر مطمئن ہو کر شاعری سے زیادہ عارف' فلسفی' سیاسی یا مذہبی پیشوا' مصلح' معلم اخلاق' قانون ساز یا پیغمبر ہونے کا دعویٰ کیا اور لوگوں نے اس کا مطالبہ منظور کر لیا تو پھر شاعری تو خیر خطرے میں پڑی سو پڑی ہیئت اجتماعی کو بھی ڈرنا چاہیے کہ بھرے بازار میں مست ہاتھی گھس آیا' اگر شاعر اخلاقیات کے پرچار کو شاعری سے اونچا درجہ دے دے تو پیغمبری تو شاید وہ کر لے مگر شاعری اس کے بس کی نہیں رہتی۔ شاعری کا مقصد نہ تو قوموں کو زندہ کرنا ہے...... ممکن ہے اس کا یہ اثر بھی ہوتا ہو...... نہ نالیوں کی صفائی نہ چکلوں کا اشتہار دینا' بلکہ بڑا حقیر سا...... ملارمے کے الفاظ میں 'to evoke objects...' اسی کو ایلیٹ نے کہا ہے 'to present actuality...' ظاہر ہے کہ اس مفہوم میں وہ روحانی اور نفسیاتی تجربے بھی شامل ہیں جو تجربہ کرنے والے کے لیے واقعی ٹھوس چیزوں کی طرح ہوتے ہیں۔ ڈرتے ڈرتے میں اسی مفہوم کے لیے صوفیوں کی اصطلاح 'حال' پیش کروں گا۔ اخلاقی درس قال ہوتا ہے اور شاعری حال۔ شعر میں 'جو ہونا چاہیے' نہیں ہوتا بلکہ 'جو ہو چکا' امر متوقع نہیں امر واقع۔ اسی وجہ سے میں دعویٰ کرتا ہوں کہ کوئی شاعری جو اس نام کی مستحق ہے اخلاق سے باہر نہیں ہوتی۔ یہ تو تھا شعر پڑھنے کا پہلا درجہ، دوسرے درجے میں ہم اس مخصوص شعر کے اخلاقی مزاج سے بھی بحث کر سکتے ہیں۔ اسے اچھا یا برا بھی کہہ سکتے ہیں۔ اس مزاج کو اپنے اخلاقی نظام میں اونچی یا نیچی جگہ بھی دے سکتے ہیں۔ کیوں کہ ہر وقت شعر کو شعر کی حیثیت سے پڑھنے کی قدرت نہیں رکھتے لیکن دوسرے درجے کو پہلے رکھنا ہمیں ہمیشہ بہکا دے گا۔ اس مخصوص مزاج کی جگہ اپنے اخلاقی نظام میں کیسے ڈھونڈیں' یہ بھی عرض کیے دیتا ہوں۔ شعر میں' جیسا میں نے کہا' امر متوقع نہیں ہوتا بلکہ امر واقع۔ اس لیے شعر اخلاقی لائحہ عمل نہیں ہوگا بلکہ اخلاقی دستاویز جس کو آپ اپنی طرح استعمال کر سکتے ہیں۔ ایک بے ڈھنگی سی مثال دوں گا۔ شعر تو ایک اینٹ ہے جسے آپ گھر کی دیوار میں بھی لگا سکتے ہیں اور چاہیں تو راستہ چلتوں کا سر بھی پھوڑ سکتے ہیں اور اپنا بھی۔ وہی نظمیں جو آپ کو خطرناک طور پر فحش معلوم ہوتی ہیں' قومی تعمیر کے کام میں مدد دے سکتی ہیں۔ بشرطے کہ آپ انھیں استعمال کر سکیں۔ ایزرا پاؤنڈ کو اس سلسلے میں بڑی کارآمد تشبیہ سوجھی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ شاعر تو خطرے کی گھنٹی ہے۔ وہ آپ کو آگاہ کر سکتا ہے کہ آگ لگ رہی ہے لیکن اسے آپ آگ بجھانے والا انجن بننے پر مجبور نہیں کر سکتے۔ لیکن ہمارے مداوائی دوستوں کو تو ضد ہے کہ گھنٹی میں ہی سے پانی ابل پڑے ورنہ شہر جلتا رہے تو جلا کرے۔ ہم تو ہاتھ پیر ہلانے والے ہیں نہیں...... غرض یہ کہ شاعری کی اخلاقی قدر و قیمت کو افعال کی حیثیت سے نہ جانچیے بلکہ اشعار کی حیثیت سے۔ شعروں میں خواہ مخواہ اوپر سے اخلاقیات ٹھونسنے کے متعلق میری بات نہ مانیے بلکہ گوئٹے کی رائے

سنیے جسے اب سے پہلے تک نہ صرف بہت بڑا شاعر بلکہ فلسفی، معلمِ اخلاق اور عارف سمجھا جاتا رہا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ادب میں دو قسم کے جعل ساز ہوتے ہیں۔ ایک تو وہ جو فنی پہلوؤں کو غیر ضروری سمجھ کر صرف روحانیت یا خیالات کے بھروسے پر شاعری کرنا چاہتے ہیں۔ دوسرے وہ جو صرف ایک خوبصورت سا ڈھانچا بنا کر مطمئن ہو جاتے ہیں۔ دوسرا گروہ صرف اپنے آپ کو نقصان پہنچاتا ہے اور پہلا آرٹ کو۔ لیکن اگر آپ شعر پڑھتے وقت ذہنی توازن قائم نہیں رکھ سکتے اور نخوت سے گھبراتے ہیں تو پھر یہی ہوسکتا ہے کہ آپ اس نصیحت پر عمل کریں: 'تو نہ جا تیرا کورا پنڈا ہے'۔

لڑکیوں کا اخلاق درست رکھنے کی فکر بھی ایک مستحسن جذبہ ہے لیکن جب تک جنسی تعلیم کا انتظام نہیں ہوتا ان کے لیے ہر چیز اشتعال انگیز بن سکتی ہے۔ میرے مشاہدے میں تو یہ آیا ہے کہ جنسی لذت کا سبق لڑکیاں 'بہشتی زیور' سے سیکھتی ہیں بلکہ نئی شاعری ایک طرح جنسی بے راہ روی کو روکنے میں معاون ہوسکتی ہے کیوں کہ وہ محبت کے جنسی پہلو پر پردہ نہیں ڈالتی بلکہ ہم آغوشی کی آرزو پہلے ہوتی ہے، عہدِ وفا کے ابدی ہونے کا وعدہ بعد میں۔ ہاں، آپ حضرات کی تکنیک اس سے مختلف ہے۔ آپ افلاطونی محبت کی ٹٹی کے پیچھے سے شکار کھیلتے ہیں۔ حملہ کرنے سے پہلے دھواں پھیلاتے ہیں۔ نیا شاعر تو پہلے ہی سے جتا دیتا ہے کہ محبوبہ کو کیا کھونا اور کیا پانا ہے۔ بہرحال اگر کنوئیں میں گرنا ہی ٹھہرا تو آنکھوں پر پٹی باندھ کر گرنے سے بہتر آنکھیں کھول کر گرنا ہے۔ اور جب آنکھیں کھلی ہوں تو آدمی مشکل سے گرنے پر رضا مند ہوتا ہے۔

ماخذ (اُردو۔۲۵)

ابہام یا فحاشی

ن م راشد

ابہام یا فحاشی یا ہنگامی خیالات کے اظہار یا شخصی کنایات کا جدیدیت سے اصولاً کوئی تعلق نہیں، روایتی شاعروں میں بھی یہ باتیں یکساں پائی جاتی ہیں، بطور خوبی کے بھی اور بطور خامی کے بھی۔ اس ابہام کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ اکثر جدید شاعروں کو اپنے نئے تجربات اور مشاہدات کے اظہار کے لیے مناسب زبان نہیں ملتی کیوں کہ اکثر نئے تجربات اور مشاہدات خود ہمارے اپنے معاشرے کے اندر اپنے لیے مقام تو پا چکے ہیں لیکن 'نام' نہیں پا چکے۔ دوسرے پڑھنے والوں کی بڑی تعداد ابھی تک ان تجربات اور مشاہدات سے اثر پذیر نہیں ہوئی جن کا ذکر جدید شاعر کرتا ہے، پھر وہ ان تجربات اور مشاہدات سے اکثر کنارہ کش رہتا ہے جو سب کے بن چکے ہوں اور فرسودہ ہو چکے ہوں اور جن کی توقع کرنا آسان ہو۔ تاہم 'ابہام' جدیدیت کا طرۂ امتیاز ہرگز نہیں ہے۔ جہاں تک فحاشی کا تعلق ہے کچھ تو یہ جدید شاعر کی اس کوشش کا نتیجہ ہے کہ زندگی کے نئے نئے گوشے چھان ڈالے اور زندگی کو یوں برہنہ دیکھ سکے اور دکھا سکے کہ زندگی کو سمجھنے اور سمجھانے کے نئے راستے کھل جائیں جو دراصل ادب کا بنیادی مقصد ہے۔ لیکن کبھی کبھی یہ فحاشی اس لیے بھی ظاہر ہوئی ہے کہ کوئی خاص شاعر یا ادیب پڑھنے والوں کو محض جھنجھوڑنا چاہتا ہے اور ان کے اخلاقی نظریات کو صدمہ پہونچانا چاہتا ہے اس امید میں کہ شاید وہ اسی طرح زندگی کے خفیہ رازوں کو بہتر سمجھنے پر آمادہ ہو سکیں گے۔ فوری قسم کے خیالات کا اظہار جو جدید شاعروں کے ایک طبقے کی خصوصیت ہے، ایک حد تک جدید صحافت نگاری کا نتیجہ ہے۔ دوسرے ان سیاسی اور معاشرتی گروہوں کی تبلیغ کا جو ہمیشہ سے شاعر اور ادیب کو اپنے 'جلال کبریائی' کے فروغ کے لیے استعمال کرتے رہے ہیں۔ جدیدیت سے اس طرز عمل کا صرف اتنا واسطہ ہے کہ یہ بھی اُس بے قراری کا نتیجہ ہے جو جدید زندگی کی روح رواں بن گئی ہے۔ اسی طرح نہایت شخصی قسم کے تصورات کا اظہار بھی اسی اضطراب کا پرتو ہے یا موضوعات کی بنیادی قلت یا تشنگی کو کم کرنے کی کوشش ہے یا اس اپج اور ندرت کی تڑپ ہے' جو جدید عصر کی خصوصیت ہے' اور جس کے بغیر کسی فنی کارنامے کی الگ شناخت اور برتری ممکن نہیں۔ یوں بھی جدید شاعر کو اس بات کا احساس ہے کہ پوری بھرپور زندگی کے خفیہ روزن اس وقت تک وا نہیں ہو سکتے جب تک شاعر دوسروں کو دیکھنے کی بجائے اپنے آپ کو نہ دیکھ سکے اپنے اندر نہ جھانک سکے اور اپنے اندر جھانکنے میں دوسروں کی رہنمائی نہ کر سکے۔

ماخذ (اردو۔۲۱)

زمانہ بدل چکا ہے

جلیل قدوائی

آج زمانہ بدل چکا ہے دنیا کہاں کی کہاں پہنچ گئی ہے۔ ہر علم وفن کی طرح شعر وادب کے حسن وقبح کے پرانے معیار بھی بدل گئے ہیں۔ ہم مغربی شاعری میں ہر قسم کی آزاد خیالی برداشت کر لیتے ہیں۔ تو کیا فرائڈ، کارل مارکس، اینجلس اور ایلیٹ کے نظریات اور امریکی آزادی اور مساوات کے زمانے میں یہ اچھا معلوم ہوتا ہے کہ اپنے ان شعرا کے کلام کی جانچ پڑتال کے لئے وہی پرانا معیار قائم رکھیں! ان کی بدمذاقی کا دھڑا لئے بیٹھے رہیں! انہیں ان کی نام نہاد کمزوریوں کے لئے بدنام کرتے رہیں! لن یوتانگ، مشہور چینی مصنف کا قول سن لیجئے کہ ’ناظرین کی دلچسپی کو اپنی طرف منتقل اور ان کی نبض کی رفتار کو تیز کرنے کا اس سے بہتر کوئی طریقہ نہیں کہ ان کے سامنے عورت اور مرد کی حدیث چھیڑ دی جائے‘۔ لیکن ہم اپنی شاعری میں مرد اور عورت کے برملا تذکرہ اور گوشت پوست کی معشوقہ کے ساتھ اظہار عشق پر ایسی شرم محسوس کرتے ہیں جیسے کسی بڑے جرم بلکہ گناہ کے مرتکب ہو رہے ہوں۔ یہ احساس آخر کب تک قائم رہے گا، کس دن ختم ہوگا! ایک ایسے دور میں جب کہ حُسن کو نمائشوں، نقاشی، مصوری اور موسیقی کے مقابلوں، فلم، ریڈیو اور ٹیلی وژن کی ترقیوں، اخباری اشتہاروں اور منقش سرورق کے نمونوں نے خلوت ہی نہیں جلوت میں برسرِ عام، برسرِ راہ اور قدم قدم پر عورت کی تجلیاں عام کر دی ہیں، ہم اپنے ان اساتذہ کو قابل گردنی سمجھتے رہنے میں کہاں تک حق بجانب ہیں؟ وقت آ گیا ہے کہ ان کے کلام کو ایک نئے زاویہ سے پڑھا اور سمجھا جائے۔

مآخذ (اردو۔۱۰)

پُرانا معیار

ابواللیث صدیقی

اب رہا یہ سوال کہ ہمارے موجودہ اخلاقی معیار سے یہ مضامین پست ہیں تو یہ مسئلہ خود بحث طلب ہے۔ اول تو اخلاق اور شاعری کا خلط مبحث نامناسب ہے۔ پھر اگر اخلاق اور شاعری کو یک جا دیکھنا ہی ہے تو اس کے لیے اخلاقی شاعری کے بکثرت دفاتر موجود ہیں۔

آخر یا شوق کے یہاں مثنوی مولانا روم کے مضامین کی تلاش بڑی ناانصافی ہے۔ یہ چیزیں دیکھنا ہیں تو میر حسن کی مشہور مثنوی 'رموز العارفین' دیکھیے۔ خود شوق کی مثنوی 'زہرِ عشق' دیکھیے جو مخرّب اخلاق سمجھی جاتی ہے۔ ہیروئن کی زبان سے آخری ملاقات کے وقت ایک طویل اخلاقی وعظ ملاحظہ فرمایئے۔ اسی طرح یہ کہنا بھی صحیح نہیں کہ شوق کا مقصد صرف 'عریاں نگاری' ہے۔ جن لوگوں نے شوق کی مثنویوں کا مطالعہ کیا ہے انھیں معلوم ہے کہ شوق کی مثنویوں میں اس عہد کے رنگین اختر نگر (لکھنو) کی رنگین معاشرت کا صحیح اور مکمل نقشہ نظم ہوا ہے۔ شوق کا اصلی مقصد اپنے ماحول کی ترجمانی تھا اور بلاشبہ اس میں وہ کامیاب ہوئے ہیں۔

اب رہا یہ مسئلہ کہ خود وہ تہذیب و معاشرت جس کی عکاسی شوق نے اپنے ذمے لی ہے فی نفسہٖ نہایت گندی ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ ہر عہد کی معاشرت خاص حالات اور واقعات کا نتیجہ ہوتی۔ موجودہ سوسائٹی جب متقدمین کی معاشرت پر نظر ڈالتی ہے تو پرانی تصویروں میں اسے جابجا عریانی نظر آتی ہے۔ لیکن متقدمین کی نظر سے دیکھیے تو موجودہ سوسائٹی کے اکثر پہلو بالکل برہنہ اور شرم ناک ہیں۔ حالاں کہ انھیں آج کل تہذیب کی نشانی اور شرافت کا معیار سمجھا جاتا ہے۔

ماخذ (اُردو۔۸۱)

شاعری میں جنسِ نگاری

قاضی محمد اختر جونا گڑھی

قدیم زرعی معاشروں میں جنس اور اس کے متعلقات کو زرخیزی اور افزائش کے تصورات سے وابستہ کر کے مذہبی تقدس کا رنگ دیا جاتا تھا۔ دوسرے لفظوں میں ایسے زرعی معاشروں میں مرد اور عورت کے جنسی اختلاط کو ایک مذہبی تقدس حاصل ہو جاتا ہے کیوں کہ مرد اور عورت کا یہ اختلاط تخلیقِ حیات کا باعث ہوتا ہے۔ چناں چہ قدیم ہندوستان کے زرعی معاشرے میں بھی جنس کو ایک مذہبی فریضے کی حیثیت حاصل تھی اور اسے زندگی کی اعلیٰ ترین تخلیقی قوت اور علامت تصوّر کیا جاتا تھا۔ معاشرے میں مرد اور عورت کے درمیان آزادانہ میل جول اور گفت وشنید پر کسی قسم کی کوئی پابندی نہیں تھی۔ عورتوں میں مردوں سے پردے اور حجاب کا کوئی تصوّر موجود نہ تھا۔ چناں چہ ہم دیکھتے ہیں کہ قدیم ہندوستان میں مرد اور عورت کے درمیان جنسی علاحدگی کا کوئی تصوّر موجود نہیں۔ یہی سبب ہے کہ سنسکرت اور ہندی زبانوں کی شاعری اور ادب میں کسی بھی قسم کی جنسی کج روی کا سراغ نہیں ملتا۔ ہندی زبان کی عشقیہ شاعری میں اظہارِ عشق کی روایت بھی عورت سے منسوب ہے کہ بالآخر مرد اور عورت کا جنسی اور جسمانی رشتہ ہی فطرت کا بنیادی اور حیاتیاتی تقاضا ہے۔ قدیم ہندوستان کے زرعی معاشرے کے ان جنسی رجحانات کے برخلاف وسط ایشیا کی گلہ بان اور بدویانہ تہذیب و تمدن کے پروردہ غیر ملکی مسلمان فاتحین مجموعی طور پر ایک قبائلی اور پدری تہذیبی نظام سے تعلق رکھتے تھے جس میں عورت کو ایک ذاتی ملکیت تصوّر کیا جاتا تھا۔ اس کے علاوہ ان غیر ملکی فاتحین اور باشندوں کے مذہبی نظام میں بھی مرد اور عورت کے درمیان آزادانہ میل جول اور بات چیت کو مستحسن تصوّر نہیں کیا گیا تھا۔ مرد اور عورت کے درمیان پردے اور حجاب پر غیر معمولی اصرار موجود تھا جس کے نتیجے میں دونوں جنسوں میں علاحدگی اور فاصلوں کا پیدا ہونا لازمی طور پر ناگزیر تھا۔ چناں چہ وسط ایشیا کے وہ مسلمان فاتحین اور باشندے جو ہندوستان میں وقتاً فوقتاً وارد ہوئے، ہندوستان کے مقامی باشندوں کے برعکس جنس کے بارے میں اپنا ایک مختلف نظامِ فکر رکھتے تھے جس میں زمانے کے ساتھ ساتھ کافی تبدیلیاں بھی رونما ہوئی ہیں۔

جب غیر ملکی مسلمان فاتحین نے ہندوستان کا سیاسی اقتدار حاصل کر لیا تو فارسی زبان کو سرکاری حیثیت حاصل ہو گئی اور ابتدا میں اسی زبان میں شعر و ادب کی تخلیق ہوتی رہی۔ بعد میں امیر خسرو

کے عہد میں جب پراکرت اور عربی آمیز فارسی زبان کے باہمی جذب و قبول سے اردو زبان تشکیلی مراحل سے گذر رہی تھی، ریختہ گوئی کا آغاز ہوا۔ صاحب اقتدار طبقہ چوں کہ نسلی لسانی اعتبار سے وسط ایشیا اور سرزمین ایران سے بے حد گہرا اور قریبی تعلق رکھتا تھا لہٰذا اس کے شعر و ادب پر بھی وہیں کے اثرات مرتب ہونے لگے۔ بعد میں جب اردو ایک باقاعدہ زبان کی حیثیت سے وجود میں آئی اور اس میں شعر گوئی کا آغاز ہوا تو غزل ہی شاعروں کی پسندیدہ اور مقبول صنف تھی۔

ہندوستان میں غزل ایک شعری صنف کی حیثیت سے ایران سے آئی جس کے لغوی معنی ہیں 'بازنان گفتن' یعنی عورتوں سے بات چیت کرنا۔ یہ مفہوم بذات خود اس صداقت کا ثبوت ہے کہ غزل ایک ایسے معاشرے کی پیداوار ہے جہاں مرد اور عورت کے آزادانہ میل جول اور بات چیت پر سخت ترین پابندیاں عائد کر دی جاتی ہیں اور عورت کو پردے میں مقید کر دیا جاتا ہے۔ چناں چہ ہم دیکھتے ہیں کہ ایران کے معاشرے میں بھی بالخصوص عربوں کی فتح کے بعد مرد اور عورت کے باہمی میل جول پر قدغن نظر آتی ہے اور عورت پردے میں مستور ہے۔ یہی سبب ہے کہ ایران کے فارسی گو شعرا نے عربی قصیدے سے 'تشبیب' کو علاحدہ کر کے 'غزل' کے عنوان سے ایک مستقل بالذات صنفِ سخن کی حیثیت دی اور اسے عورتوں سے گفتگو اور بات چیت کا ایک ذریعہ قرار دیا۔ غزل میں رمز و کنایہ اور علائم و اشارات کی مدد سے بات کی جاتی ہے تاکہ معاشرے کی عائد کردہ پردے کی پابندیاں اور اخلاقی اقدار مجروح نہ ہوں اور مقصد بھی حاصل ہو جائے۔ دوسرے لفظوں میں ایران کے شاعروں میں غزل کی مقبولیت اور تخلیقی استعمال مرد اور عورت کے درمیان آزاد جنسی رشتوں پر پابندیوں کا مرہونِ منت ہے۔ چوں کہ ہندوستان کے صاحب اقتدار مسلمان معاشرے میں بھی کم و بیش یہی صورت حال تھی لہٰذا یہاں کے فارسی اور اردو زبان کے شاعروں میں اس علامتی صنفِ سخن کا مقبول ہونا بھی ایک فطری امر تھا۔

چناں چہ ہندوستان کے شاعروں نے فارسی غزل کی تقلید کرتے ہوئے اردو میں غزل گوئی کی ابتدا کی۔ جیسا کہ پہلے کہا گیا غزل ایک علامتی صنفِ سخن ہے جس میں رموز و اشارات کی مدد سے اظہار مدعا کیا جاتا ہے۔ عشقیہ مضامین اور جنسی محبت کے خیالات غزل کے لیے خام مواد فراہم کرتے تھے۔ چوں کہ ایرانی معاشرے میں مرد اور عورت کے فطری رشتے پر سخت پابندیاں عائد تھیں لہٰذا ایران کے غزل گو شعرا نے امرد پرستی میں جنسی جذبے کی تسکین کا سامان کیا اور اسی 'ترک شیرازی' کے حسن و جمال اور غمزہ و ادا سے بزمِ غزل کو آراستہ کیا۔ ایران میں امرد پرستی کے اثرات کا سراغ ہمیں یونان لے جاتا ہے جہاں نوجوان اور حسین و خوب رو لڑکوں سے جنسی محبت ایک نہایت مستحسن فعل تصور کیا جاتا تھا۔ اس کی بنیادی وجہ بھی یہ تھی کہ مرد اور عورت کے درمیان جنسی علاحدگی اور فاصلے موجود تھے۔

جنسیات کے ماہرین کا یہ خیال ہے کہ یونان میں ہم جنس پرستی کا یہ غیر فطری میلان سکندر

اعظم کے ہمراہ آنے والے فوجی سپاہیوں کے ساتھ ۳۰۰ قبلِ مسیح میں ایران پہنچا اور یہاں عربوں کی فتح ایران کے بعد اس ہم جنسی رجحان کو زیادہ فروغ حاصل ہوا۔ اس حقیقت کا واضح ثبوت ایران کی کلاسیکی فارسی غزل میں نمایاں طور پر مل جاتا ہے۔ فارسی غزل کے ساتھ ساتھ ہم جنس پرستی کا یہ رجحان بھی ہندوستان پہنچ گیا۔ چوں کہ جنسی حالات ایران اور ہندوستان کے مسلم معاشروں میں یکساں تھے لہٰذا یہاں غزل اور اس کے ساتھ ہم جنسیت کو بھی فوری مقبولیت حاصل ہوگئی۔ اردو زبان کے اوّلین غزل گو شاعروں نے نوجوان اور خوب رو لڑکوں سے برملا اظہار عشق کیا اور انھیں اپنی غزلوں کا محبوب کردار بنا کر پیش کیا۔ شمالی ہندوستان میں اردو غزل گوئی کا آغاز اس وقت ہوا جب اردو کے پہلے صاحب طرز شاعر ولی (گجرات) کا کلام یہاں پہنچا۔ دہلی جو اس زمانے میں اقتدار اور سیاست کا مرکز تھی، علم اور شعر و ادب کا مرکز بھی بن چکی تھی۔ چناں چہ اردو شاعری کی تاریخ میں پہلا اور باقاعدہ شعری مرکز یہی شہر دہلی ہے جو اب ایک دبستانِ شعر کی حیثیت رکھتا ہے۔

غزل ایران سے ہندوستان پہنچی تھی لہٰذا اس کے ساتھ ساتھ اَمرد پرستی اور اس کا برملا اظہار بھی اردو غزل میں رائج ہوگیا۔ اس کا مطلب یہ قطعاً نہیں ہے کہ اس عہد کے بھی اردو غزل گو شعرا عملی طور پر بھی امرد پرست تھے۔ بہر حال اس دور کے بعض شاعروں کے کلام میں مرد اور عورت کے باہمی عشق اور ان کے درمیان جنسی اختلاط اور اس کے تمام ناز و نیاز کی تفصیلی روداد بڑے دلچسپ اور رنگین انداز میں سنائی دیتی ہے۔ مرد اور عورت کے جنسی رشتے اور ان کی خلوتوں کے سربستہ راز بالخصوص ان مثنویوں میں کھلتے نظر آتے ہیں جو اس دور میں لکھی گئیں۔

دہلی کے بعد لکھنو اردو شاعری کا دوسرا بڑا مرکز تھا۔ لیکن سیاسی اور اقتصادی حالات کے اعتبار سے ان دونوں شہروں میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ دہلی کے برعکس لکھنو میں معاشی آسودہ حالی اور خوشحالی کا دور دورہ تھا دولت اور ثروت کی افراط تھی۔ لکھنوی معاشرہ ایک جاگیرداری معاشرہ تھا اور لوگوں کو فراغت اور فرصت میسّر تھی۔ ایسے حالات اور ماحول میں فطری طور پر فنونِ لطیفہ کو فروغ حاصل ہوتا ہے۔ چناں چہ لکھنو میں بھی شاعروں اور فن کاروں کو نوابین اور امرا کی سرپرستی حاصل تھی۔ اسی کے ساتھ ساتھ دولت اور ثروت کے باعث طوائف اس عہد کے لکھنوی معاشرے کا اہم اور نمایاں کردار ہے۔ زنانِ بازاری اور اربابِ نشاط سے عشق بازی اور جنسی اختلاط لکھنو کے نوجوان امرا اور رؤسا کا مرغوب ترین مشغلہ تھا۔ طوائف کو بطور داشتہ رکھنا ایک عام فیشن بن چکا تھا چناں چہ لکھنو کی جنسی شاعری میں بھی طوائف ایک نمایاں کردار ادا کرتی ہے۔

دوسرا اہم اور قابلِ غور عنصر جو لکھنو کی شاعری میں دکھائی دیتا ہے وہ عورتوں کے درمیان عشق اور جنسی اختلاط ہے جو اس دور کے لکھنوی معاشرے میں رائج شدہ حالات کے پس منظر میں فطری اور

منطقی نظر آتا ہے۔ عورتوں کے مابین جنسی محبت اور عملی جنسی تعلقات کا نقشہ جن لکھنوی شعرا نے کھینچا ہے ان میں میر یار علی جانؔ صاحب، سعادت یار خاں رنگینؔ اور انشا کے نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ ان شاعروں نے ریختہ کے برعکس 'ریختی' کو ایجاد کیا اور بیگماتی زبان، محاورے اور مخصوص اصطلاحات کے ذریعے عورتوں کی زبان میں جنس اور جنسی موضوعات پر ریختیاں لکھیں۔ ریختی میں مرد اور عورتوں کے جنسی تعلقات کا بیان ہوتا ہے لیکن بنیادی طور پر اس میں عورتوں کے درمیان جنسی تعلقات اور اس کی جزوی تفصیلات بیان کی جاتی ہیں۔

ماخذ (اردو۔ ٨٦)

فضول توقع

یونس حسنی

'طور پر' گلزارِ نسیم' کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ اس میں جنسی موضوعات خصوصاً اختلاط وغیرہ کے موقعوں پر اختصار سے کام لیا گیا ہے اور اس طرح فحش نگاری سے بچا گیا ہے۔ لکھنوی تہذیب کے پروردہ کسی شخص سے اس آلودگی سے پاک رہنے کی توقع فضول ہے (مرثیہ نگار اس ضمن میں نہیں آتے)۔ نسیم کے بارے میں یہ محض خام خیالی ہے کہ وہ فحش نگاری سے دلچسپی نہیں رکھتے۔ پوری مثنوی پر اختصار پسندی کا ماحول طاری ہے۔ اس اختصار کو انھوں نے جنسی امور کی پیش کش میں صرف کیا ہے۔ اس کے برخلاف میر حسن نے جنسی اختلاط کو بھی حسبِ معمول تفصیل سے لکھا ہے۔ بے نظیر اور بدر منیر کے وصل کا بیان پورے ایک باب پر مشتمل ہے جس میں ٥٢ اشعار ہیں۔ لیکن انھیں اشعار میں اول درجے کی شاعری بھی موجود ہے۔ اصل سوال کمیت کا نہیں کیفیت کا ہے نسیم نے چند اشعار کی مدد سے جو فحش تاثر پیدا کیا ہے، میر حسن اپنے طویل کلام کے باوجود اس سے محروم رہے۔ نسیم نے صرف اختصار ہی سے کام نہیں لیا، جنسی امور کا راست انداز میں بیان کرنے کے بجائے علامتوں کا سہارا لیا ہے مگر ان کی علامتیں ایسی ہیں جو 'وہی وہانوی' کے ناولوں کو زیب نہیں دیتی ہیں۔ ایک عورت کے مرد بن جانے کی حکایت، تاج الملوک اور بکاؤلی کا وصل اور صحرائے طلسم میں تاج الملوک کے لڑکی بن جانے کا بیان ابتذال اور فحش نگاری کی انتہا ہے۔ سخن فہم فیصلہ کر سکتے ہیں کہ فحاشی کے تاثر کے لحاظ سے ایسے مواقع پر میر حسن کے اشعار کو نسیم کے مختصر علامتی بیاں سے کوئی تعلق نہیں۔

گلزار نسیم کی کہانی نسیم کی طبع زاد نہیں ہے۔ وہ اُسے صرف نظم کرنے کے ذمے دار ہیں۔ لیکن اگر وہ فن کے تقاضوں کو مدِ نظر رکھتے تو کہانی میں خاطر خواہ تبدیلیاں کر سکتے تھے۔ نسیم نے اصل

کہانی سے انحراف بھی کیا ہے اور اضافے بھی۔ پھر فنی تقاضوں سے عہدہ برآ ہونے کے لیے اگر وہ کہانی میں کسی قسم کی تبدیلی کرتے تو انھیں کون روک سکتا تھا۔ مگر انھوں نے ایسا نہیں کیا۔ موجودہ کہانی میں بھی بہت سے کردار ہیں۔ بادشاہ ہیں، ملکائیں، شہزادیاں اور امیرزادیاں، فقیر، راجہ اندر، پریاں، دیو، اوباش عورتیں، کینہ توز بھائی، سوتیں، غریب کسان اور عام آدمی بھی موجود ہیں۔ مقامات بھی مختلف ہیں۔ گلزارِ ارم، گلشنِ نگاریں، ملکِ مشرق، آسمانی سلطنت، پرستان، صحرائے طلسم وغیرہ۔ وہ کردار نگاری، واقعہ نگاری، منظر نگاری اور جذبات کی پیش کشی کے لیے آزاد تھے۔ مگر یہ سب اسی وقت ہوتا ہے جب وہ ان چیزوں کو لوازماتِ شاعری میں شمار کرتے۔ ان کے نزدیک تو شاعری صرف ضلع جگت کا نام تھا۔

اس میں سارا قصور نسیم کا نہیں ہے، وہ جس ماحول کے پروردہ تھے اس میں اس سے زیادہ کی گنجائش بھی نہیں تھی۔ جہاں حاصل سعی توجہ حسنِ خداداد کے بجائے غازہ ہو، جہاں ہر چیز کی قدر و قیمت سے زیادہ پیکنگ کی خوش سلیقگی پر زور دیا جاتا ہو، جہاں کیفِ روح کے بجائے جسم کی مستی سے حظ اٹھانے ہی کو حاصلِ حیات تصور کیا جاتا ہو، وہاں شاعری بھی زبان کی تراش خراش اور مرصع کاری سے آگے نہیں بڑھ سکتی۔ نسیم نے اپنی مثنوی میں لکھنو کے ذوق و مذاق کی کامیاب نمائندگی کی ہے۔ انھوں نے لکھنو کی آبرو رکھ لی، مگر فن کے دوسرے تقاضوں کو برتنے میں ناکام رہے۔ اردو ادب کی تاریخ میں وہ ایک ماہر زبان داں کی حیثیت سے عزت و وقعت کی نگاہ سے دیکھے جائیں گے اور ہمیشہ زندہ رہیں گے۔ لیکن شاعر کی حیثیت سے ان کے لیے کوئی بلند مقام اردو ادب کے طالب علم کے لیے ہمیشہ باعث حیرت بنا رہے گا۔

ماخذ (اُردو۔٣٢)

جنسی شاعری

کامل القادری

جنسی شاعر، کار دگر، کے بیان سے مختص ہے۔ مذہبی، اخلاقی اور تہذیبی لحاظ سے خلوت کی حکایتِ رنگیں کا جلوت میں بیانِ ناسزا ہی سہی لیکن عالمی ادب میں یہ ناسزا نقوش موجود ہے۔ 'در عہد جوانی چنوں اُفتد' کا ذکر کچھ اردو ہی سے مختص نہیں، دنیا کی ہر زبان میں معتد بہ مقدار میں جنسی شاعری کے نمونے ملتے ہیں اور ہر جگہ توجہ (خیال) عزیمت اور عملِ مدارج کی حیثیت رکھتے ہیں اور ان سب کا ذکر جنسی شاعری میں محسوس کیا جاتا ہے۔

مآخذ (اُردو۔٨٦)

جذبات کی قے

خواجہ رضی حیدر

بدقسمتی سے آج کا قاری عورتوں کی شاعری میں بھی چٹخارے کا متلاشی رہتا ہے۔ قاری کا یہ رویہ دراصل خواتین افسانہ نگاروں کا ساخت کردہ ہے۔ عصمت چغتائی، واجدہ تبسم، امریتا پریتم وغیرہ کی تحریروں میں موجود چٹخارے نے اس حقیقت کو تقویت پہنچائی کہ عورت کی زبان سے چٹخارہ مرد کے لیے نہ صرف دل کشی کا باعث ہے بلکہ تخلیق کار کی مقبولیت کے لیے بھی ضروری ہے۔ افسانہ نگار خواتین کی اسی روایت کو شاعرات نے اپنایا اور یہ بات تصدیق کو پہنچ گئی کہ خواتین کا ادبی شہرت کے لیے مبینہ طور پر کسی حد تک ترک حیا کی منزل سے گزرنا ضروری ہے۔ یہاں یہ وضاحت میں ضروری سمجھتا ہوں کہ اس روایت کو سب شاعرات نے نہیں اپنایا۔ بعض کے یہاں اظہار وابلاغ کی ممکنہ قوت کے ساتھ پاکیزگی موجود ہے لیکن کچھ نے رمز وکنایہ کی آڑ لے لی اور ایسے استعارے تراش لیے جو ان کے مخفی جذبات کی عکاسی کرسکیں۔ یہی نہیں، کچھ شاعرات نے حوصلے کے فقدان کی بنا پر مصرعوں میں 'ذم' کے دانستہ پہلو رکھنا شروع کردیے تاکہ ان کی شاعری میں چٹخارے کا عنصر موجود رہے۔

چند سال قبل میں نے شمع صدیقی کے مجموعے 'من شمع جاں گدازم' کے پیش لفظ میں اس چٹخارے کو بہت واضح طور پر 'پراسرار جنسی رجحان' سے تعبیر کیا تھا جس پر نہ صرف کچھ خواتین بلکہ کچھ شعرا نے حرف گیری بھی کی تھی۔ ان کا اصرار یہ تھا کہ میں 'جذبات کی قے' کو شاعری قرار دوں مگر میں یہی کہتا رہا کہ اگر یہ رجحان شاعری کی اساس کے طور پر ظاہر ہو تو اس کی صورت مریضانہ ہوجاتی ہے۔ نسائی جذبات کا اظہار ایک موہوم پاکیزگی، ایک ارفع رومانیت اور ایک دل گداز و دلآویز سچائی کا متقاضی ہوتا ہے۔ اس میں سوقیانہ جذبات کی پیوندکاری پوری شاعری کی فضا کو متاثر کرتی ہے۔

ماخذ (اُردو۔۱۴)

دیگر اصناف

مہدی حسن افادی گورکھ پوری
آلِ احمد سرور
گیان چند جین
احمد ندیم قاسمی
'ساحل' کراچی
قمر جمیل

تاریخِ نگاری

مہدی حسن افادی گورکھ پوری

جی چاہتا ہے‘ عباسی اور اُموی دور کی کسی خاتون کو آپ لیجیے۔ محض جذبات کے خیال سے نہیں بلکہ زمانے کی معاشرت کا خاکہ اس وقت تک مکمل نہیں ہو سکتا جب تک آپ یہ نہ بتا سکیں کہ حرم سرا کے شبستان میں شب خوابی کا لباس کیا ہوتا تھا‘ ’مقیاس الشباب‘ کو قابو میں رکھنے کے لئے اُس وقت چھوٹے کپڑے کی تراش خراش کیا ہوتی تھی۔ یہ رکیک امور نہیں ہیں۔ آپ سے زیادہ کوئی نہیں جانتا کہ تاریخ محض اندراجِ واقعات کا نام نہیں ہے جیسا کہ متقدمین کرتے رہے۔

ماخذ (اُردو۔۱۵)

ادبِ لطیف

آل احمد سرور

ہمارا ادبِ لطیف نسوانیت لئے ہوئے ہے اقبال کے الفاظ میں اس پر ’عورت‘ سوار ہے۔ لذتیت اور حسن پرستی کا عکس ممکن ہے سجاد انصاری کے یہاں بھی لوگوں کو مل جائے۔ مگر دراصل ان کا مذہب خوش مذاقی ہے۔ خود کہتے ہیں کہ ’مذاق ادبِ لطیف میں پہلی اور آخری دلیل ہے‘ اور ’ایک لطیف گناہ ہزاروں خشک نیکیوں سے بالاتر ہے۔‘

ماخذ (اُردو۔۱۸)

داستانیں

گیان چند جین

عریانی اور فحش کی مثالوں سے ’بوستانِ خیال‘ کی جلدیں بھری پڑی ہیں۔ یہ فحش قصے کا جزو ہے‘ مترجم کی ترمیم نہیں۔ کلیم الدین احمد اپنی کتاب ’فنِ داستان گوئی‘ میں ’بوستان خیال‘ کی نہ صرف صفائی پیش کرتے ہیں‘ بلکہ اس کو سراہتے بھی ہیں۔

ماخذ (اُردو۔۳۶)

ڈراما

احمد ندیم قاسمی

ڈراما ہمارے ادب کی یقیناً بے حد قابل رحم اور غریب صنف ہے۔ اس پر ستم یہ کہ بعض عناصر ڈراما کو مذہبی اصولوں کے خلاف بھی قرار دے ڈالتے ہیں۔ حالاں کہ اس صورت میں تو شاعری، افسانہ نگاری، ناول نویسی، مصوری، غرض ہر فنِ لطیف کو گردن زدنی قرار دینا چاہئے۔ فن پارہ چاہے کسی بھی صنف سے تعلق رکھتا ہو، اس کا مجموعی تاثر عموماً یکساں ہوتا ہے، دل کا گداز، روح کا اہتزاز، حسن اور توازن اور خیر کی قوتوں سے پیار۔ اور میں ایک عام مسلمان ہونے کے باوجود دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ یہ گداز و اہتزاز اور یہ حسن و خیر سے پیار مذہب کے خلاف نہیں ہے کیوں کہ یہ تو آخری اور بڑی اور عظیم سچائی تک پہنچنے کے ذرائع ہیں۔ دراصل آج سے نصف صدی پہلے تک ہمارے اسٹیج ڈرامے نے جو روپ اختیار کرلیا تھا، اس میں شہوانی جذبات کو ابھارنے کا بڑا اہتمام کیا جاتا تھا۔ معترضین نے اس کو ڈراما سمجھ لیا، حالاں کہ یہ تو ڈرامے کے زوال کی نشانیاں تھیں۔ موسیقی کو بھی اسی لئے مطعون قرار دیا گیا کہ جن مردوں عورتوں نے اس فن کو اپنایا وہ اخلاقی لحاظ سے ہماری معاشرتی قدروں کے لئے قابل قبول نہ تھے مگر اس میں ڈرامے اور موسیقی کا کیا قصور ہے! اگر ایک طوائف اپنے جوڑے میں گلاب کا پھول سجانے کی عادی ہے تو گلاب کو پوری دنیا میں تہس نہس کرنے کا جواز کہاں سے پیدا ہوجاتا ہے؟ سو ڈرامے کی صنف بجائے خود بہت اہم صنف ہے اور جو لوگ ڈرامے کے مخالف ہیں انھیں جدید ڈراما نگاروں کا نہ سہی "آغا حشر" کے ایک ڈرامے کا وہی حصہ اسٹیج پر دیکھنے کا اہتمام کرنا چاہئے، جس میں گرد آفرید سہراب سے انتہائی محبت کرنے کے باوجود سہراب سے محض اس لئے جنگ کرتی ہے کہ وہ اس کے وطن پر قبضہ کرنے آیا ہے۔ اگر ایسے واقعات کو بھی اسٹیج پر پیش کرنا 'مخرب اخلاق' ہے تو کیا یہ بہتر نہیں ہوگا کہ ہم اپنے اخلاق کو 'خراب' ہی رہنے دیں۔

ماخذ (اُردو۔۹۲)

لطیفے

'ساحل' نے روزنامہ 'جنگ' اور 'جسارت' میں شائع ہونے والے گزشتہ کئی سال کے لطیفوں کا تنقیدی جائزہ لیا ہے۔ ان لطیفوں کے متن، ان میں پنہاں طنز و تضحیک اور ان کے موضوعات کا تعین کیا گیا تو بڑے شرم ناک نتائج سامنے آئے اور پاکستانی معاشرے کی نہایت کریہہ اور غلیظ تصویر اُبھری

۔ روزنامہ ’جنگ‘ سوادِ اعظم کی نمائندگی کرتا ہے اور ’جسارت‘ پاکستان کے بنیاد پرست طبقات کے سب سے محرک عنصر کا ترجمان ہے۔ لہٰذا ان دونوں اخباروں کے مطالعے سے پاکستانی معاشرے کے افکار، مزاج، رویوں، رجحانات کے تعین میں مدد مل سکتی ہے۔ لطیفے کسی معاشرے کے اجتماعی ضمیر کے عکاس ہوتے ہیں اور الفاظ کی پھلجھڑیوں میں معاشرے کو درپیش مشکلات، آلام، مصائب، تکالیف کا بلیغ اظہاریہ ہوتے ہیں۔ لیکن گزشتہ کئی سال کے لطیفے پڑھ کر یہ محسوس ہوتا ہے کہ پاکستان کے تمام مرد اور تمام عورتیں بے شرم اور بے حیا ہیں اور پاکستانی معاشرے میں شوہر اور بیوی ایک دوسرے کو دھوکہ دینے میں مصروف ہیں۔ ان لطیفوں سے یہ بھی پتا چلتا ہے کہ ہر عورت اپنے شوہر سے نفرت کرتی ہے اور اس کی نظر صرف شوہر کی دولت پر ہوتی ہے، اسے صرف اس بات سے غرض ہے کہ اس کا شوہر اس کے لئے کہیں سے بھی پیسے لائے، اس کی خواہشات اور تعیشات کو کسی ذریعے سے بھی پورا کرے۔ عورت اور مرد کے درمیان ہمیشہ ایک تناؤ، کھنچاؤ، کش مکش، جنگ اور جدل برپا رہتا ہے۔ اسی طرح پاکستانی مرد ہمیشہ عورتوں کے تعاقب میں مصروف نظر آتا ہے۔ اسے اپنی بیوی سے نفرت ہوتی ہے اور بیوی کے سوا اسے ہر عورت اچھی لگتی ہے۔ بہ الفاظ دیگر اسے اپنی بیوی، مسدس حالیؔ اور دوسرے کی بیوی، داغؔ کی غزل لگتی ہے۔ وہ ہر عورت کو دامِ الفت میں گرفتار کرنا چاہتا ہے۔ اسے مختلف حیلے بہانوں سے رام کرتا ہے۔ ان لطیفوں میں عورت کو نہایت سنگ دل، بے رحم اور ظالم ثابت کیا گیا ہے اور مرد کو لالچی، بے وفا اور بے حیا بتایا گیا ہے۔ لطیفوں کے بین السطور سے یہ تاثر بھی ابھرتا ہے کہ ہمارا خاندانی نظام تباہ ہو چکا ہے اور ہمارے معاشرے کی عورت، مرد اور مغربی معاشرے کے مذکر مونث میں کوئی فرق باقی نہیں رہ گیا۔ اس کے علاوہ دیگر لطائف سے معلوم ہوتا ہے کہ ہم بددیانت، جھوٹے اور فریبی لوگ ہیں، دھوکہ دہی ہمارا عام رویہ ہے۔ اگر پاکستانی معاشرہ ایسا ہی ہے تو کوئی حرج نہیں مگر حقیقتِ حال اس کے برعکس ہے۔ کیا وجہ ہے کہ ہمارے مصلحین، مفکرین اور محققین نے اس پہلو پر کبھی توجہ نہیں دی نہ تحقیق کی زحمت گوارا کی حالاں کہ اخبارات، رسالوں اور ڈائجسٹوں میں سب سے موثر اور دلچسپ ترین تحریر یہی لطیفے ہوتے ہیں جن کا ابلاغ فوری اور گہرا ہوتا ہے۔ ان لطیفوں کو پڑھ کر جوان ہونے والی قوم کن روایات، اقدار اور اخلاقیات کی نمائندہ بنے گی! یہ ایک حقیقت ہے کہ دنیا میں سب سے موثر ترین ذریعہ ابلاغ گالی ہے جس کا ردعمل فوری طور پر سامنے آتا ہے۔ اس کے بعد دوسرے نمبر پر لطیفے ہیں جن کا ردعمل چند لمحوں کے بعد سامنے آتا ہے۔ ’جنگ‘ اور ’جسارت‘ کے لطیفوں سے قطع نظر، اخبار جہاں، ’اخبار خواتین‘، بچوں کے رسالوں، مختلف ڈائجسٹوں، ہفت روزوں، ماہناموں میں شائع ہونے والے لطیفوں کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہاں بھی یہی کیفیات جلوہ گر ہیں۔ بچوں کے صفحے پر شائع ہونے والے لطیفوں میں بھی ایک دو لطیفے انہی موضوعات سے متعلق مل جاتے ہیں۔ انتہا یہ ہے کہ بعض دینی جماعتوں کی جانب سے بچوں

اور بڑوں کے لئے شائع کی جانے والی مطبوعات میں بھی یہی لطائف الفاظ کے ردوبدل کے ساتھ مل جاتے ہیں۔ کیا اس کا مطلب یہی سمجھا جا سکتا ہے کہ ہمارا پورا معاشرہ' معاشرے کے تمام طبقات' مذہبی حلقوں' غیر مذہبی گروہوں سب کا ذائقہ ذوق لطیفوں کے معاملے میں یکساں ہے؟ ہماری رائے میں صورت حال ایسی نہیں ہے مسئلہ یہ ہے کہ لطیفوں کا بہت بڑا ذخیرہ اردو میں انگریزی زبان سے منتقل ہو رہا ہے۔ عربی اور فارسی کا ذوق ختم ہو جانے کے باعث ان زبانوں کی زندگی حرکت وحرارت اب اردو میں نہیں ڈھل رہی اور صحافیوں کی نئی نسل انگریزی کے سوا کوئی زبان نہیں جانتی لہذا انگریزی لطیفے اپنے غلیظ معاشروں کی غلیظ روایات لے کر آ رہے ہیں۔ وہ معاشرے جہاں شریف النفس لوگ تو بہت ہیں مگر شریف النسل لوگ دن بہ دن کم ہوتے جا رہے ہیں، ان معاشروں کے لطیفے ذوق سلیم پر گراں کیوں نہ گزریں!

اساتذہ' سماجی علوم کے ماہرین' تعلیمی نفسیات کے محققین' علوم اسلامی کے مسند نشینوں کا یہ فرض ہے کہ وہ اس موضوع پر تحقیق کریں اور معاشرے میں پائی جانے والی بے چینی' بگاڑ' اضطراب' خاندانی انتشار' رشتوں میں تصادم اور انحراف کے اسباب کا کھوج لگائیں۔ ان لطیفوں کے ماخذ' منبعے اور سرچشمے کو دیکھیں اور لطیفہ گوئی کے فن کے ذریعے معاشرے کی اصلاح' تعمیر اور تجدید کا کوئی منصوبہ بنائیں۔ ایک بہترین لطیفہ ایک کتاب پر بھاری ہوتا ہے اور اس کا ابلاغ مسلسل رہتا ہے کیوں کہ وہ حافظے پر نقش ہو جاتا ہے اور پھر مستقل سفر کرتا رہتا ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ ہماری قوم لطیفوں کے میدان میں بھی مغرب کے لطیفوں کی جگالی کر رہی ہے اور اس کے پاس مُلّا نصر الدین کے لطیفوں کے سوا کوئی سرمایہ باقی نہیں۔ جو معاشرہ ہنسنے ہنسانے اور دل بہلانے کے لئے عمدہ لطیفے ایجاد کرنے کی صلاحیت سے محروم ہو جائے اور تراجم اور سرقوں کے ذریعے لطیفوں کو اپنائے وہ مغرب کے سانچے میں ڈھل کر رہے گا۔

ابلاغیات کے ماہرین اس ابلاغی آفت سے آگاہ نہیں ہیں بظاہر بے ضرر' بے کار لطائف کے صفحات ہمارے معاشرے' مزاج' رویّوں' عادات' اخلاق پر بہت گہرا نقش چھوڑتے ہیں اور ہم گرد و پیش ان نقوش کا مشاہدہ کر سکتے ہیں۔ اس مشاہدے کا بہترین مقام فوجی افسروں کے طعام خانے ہیں جہاں بڑے بڑے متشرع افسر بھی فحش گفتگو کو آداب محفل کا لازمی حصہ سمجھتے ہیں۔

ماخذ (اردو۔۱۲۹)

پروز پوئم

قمر جمیل

پروز پوئم پورنوگرافی نہیں ہے۔ اور نہ یہ خدا، کائنات اور انسان کو ایک سیاہ شیشے سے دیکھنے کی کوشش۔ ہم اپنے حواس کی اس دنیا کو نہ مہمل سمجھتے ہیں اور نہ ایک مردہ ساکت کائنات اور نہ ہم اسے کسی نپولین، بسمارک اور کرام ویل کے قانون اور فن کار کے خوابوں (چاہے وہ میرزا غالب اور فیض ہی کیوں نہ ہو) کے ویژن کا پابند سمجھتے ہیں۔

پروز پوئم نہ بغاوت سے پیدا ہوئی ہے اور نہ ہی پابندیوں کی اطاعت سے۔ اس کے باوجود پروز پوئم کی اپنی ایک ساخت اور اپنی ایک سالیت ہوتی ہے یعنی structural integrity اس میں فینٹیسی کا عمل بھی ہوسکتا ہے اور اشاراتی overtones بھی ۔۔ مگر نئی جسیت (New Sensibility) پروز پوئم کے تخلیقی عمل کو بروئے کار لانے کے لئے ضروری ہے۔ پروز پوئم میں دراصل ہماری ہم عصری زندگی کے تشنج اور اس کے کرب کو اپنی نئی جسیت کے ساتھ تخلیقی عمل کا موقعہ ملا ہے۔

ماخذ (اُردو۔٩٦)

ادب

برٹرینڈ رسل
ڈی ایچ لارنس
ہیولاک ایلس

☆ ☆ ☆

کلیم الدین احمد
عندلیب شادانی
محمد حسن عسکری
محمد حسن
ن م راشد
سید محمد تقی
محمد احسن فاروقی
سلیم اختر
شہزاد منظر
اے بی اشرف
طاہر جاوید مغل
رئیس امروہوی
علی عباس جلالپوری
خالد ارمان
زاہدہ حنا
وزیر آغا
عالم صحرائی

rekhta

عُریانی کا تصوّر

برٹرینڈ رسل

عُریانی کے تصوّر کی جڑیں انسانی فطرت میں پیوست ہیں۔ بغاوت کی خاطر، سائنسی روح سے وفاداری کی بنا پر یا پھر اس بنا پر کہ بدی کو جی چاہ رہا ہو (جیسا کہ بائرن کے ساتھ ہوا)۔ ہم اس کے خلاف تو ہو سکتے ہیں مگر اس طرح ہم اسے اپنے فطری اضطرارات سے ختم نہیں کر سکتے۔

بلاشبہ یہ روایات ہی ہیں جو ایک مخصوص معاشرے میں یہ طے کرتی ہیں کہ اصل میں ناشائستگی کیا ہے، مگر اس طرح کی روایات کی ہر جگہ موجودگی، اس منبع کی حتمی دلیل ہے جو محض روایتی نہیں۔ فحش نگاری اور علتِ نمائشیت کو دنیا کے زیادہ تر معاشروں میں جُرم سمجھا گیا ہے، سوائے اُن چند مواقعے کے جب یہ دونوں کسی متبرک تقریب کا حصہ ہوں۔

ماخذ (انگریزی-2)

فِکشن اور فحش نگاری

ڈی ایچ لارنس

انیسویں صدی کے تقریباً سارے ادب میں فحاشی کا ایک عنصر موجود ہے اور بہت سے مُتینہ پاک باز لوگوں میں بھی فحاشی کا ایک بدمزہ قسم کا پہلو ہوتا ہے اور آج سے پہلے کسی وقت بھی فحاشی کی اشتہا اتنی شدید نہیں تھی۔ یہ سیاسی تنظیم کی مریضانہ حالت کی ایک نشانی ہے۔ مگر اس مرض کے علاج کی یہی ایک صورت ہے کہ جنس اور جنسی مجرم کھلے میدان میں آجائیں۔ ایک اصلی فحش نگار کبھی درحقیقت بوکاچو کو (جو 'الف لیلیٰ' کے نمونے پر لکھی ہوئی 'دہ شب' کا مصنف، چودھویں صدی کا اطالوی افسانہ نگار، شاعر اور ناقد تھا) پسند نہیں کر سکتا کیوں کہ اطالوی افسانہ نگار کا تازہ، صحت مندانہ فطری پن، آج کی فحش نگار بونے کو ایک غلیظ کیڑا بنا کے رکھ دیتا ہے جو کہ وہ اصل میں ہے۔ آج بوکاچو، ہر ایک، جوان اور بڈھے کو دینا چاہیے کہ چاہیں تو اس کا مطالعہ کریں۔

جنس کے بارے میں ایک فطری اور تازہ کشادگی سے ہی کوئی فائدہ پہنچ سکتا ہے۔ اب تو ہم مخفی یا نیم مخفی فحاشی کے سیلاب میں تنکے کی طرح بہے جا رہے ہیں اور شاید (یورپ) کی نشاۃ ثانیہ کے افسانہ نگار بوکاچو، لاسکا (آنتون فرانچکو گراتزینی کا قلمی نام، جو سولھویں صدی کا اطالوی مصنف ہے اور دوسرے ادیب، بہترین تریاق ہیں، جو ہمیں مل سکتے ہیں ایسے ہی جیسے زیادہ سے زیادہ طہارت پسندوں کی پلستر بازی سب سے مضر علاج ہے جسے ہم اختیار کر سکتے ہیں۔

فحاشی کا سارا سوال ہی مجھے تو اخفا کا سوال معلوم ہوتا ہے۔ اخفا کے بغیر کوئی فحاشی ممکن نہیں ہوگی مگر اخفا اور حیا، دو مختلف قسم کی چیزیں ہیں۔ اخفا میں ایک خوف کا عنصر ہوتا ہے جس کی سرحدیں نفرت سے جا ملتی ہیں۔ حیا، نرم و نازک اور کم آمیز، ہوتی ہے۔ آج کل حیا کو اٹھا کے باہر پھینک دیا گیا ہے، خاکستری بالوں والے محافظوں کی موجودگی میں بھی مگر اخفا کو آغوش میں بٹھا لیا گیا ہے کہ یہ اپنی جگہ خود ایک برائی ہے خاکستری بالوں والوں کا یہ رویہ کچھ اس طرح کا ہے کہ ساری لڑکیو! تم بے شک ساری شرم و حیا کو بالائے طاق رکھ دو بشرطے کہ تم اپنے ننھے سے غلیظ راز کو آغوش میں چھپا کے رکھو۔

یہ 'ننھا سا غلیظ راز' آج کے لوگوں کی اکثریت کے لیے بے حد قیمتی بن چکا ہے۔ یہ ایک قسم کا چھپا ہوا پھوڑا یا کوئی سوزش ہے جس کو رگڑا یا ابھرا جائے تو ایسی تیز قسم کی سرسراہٹیں پیدا ہوتی ہیں جو

مزیدار لگتی ہیں۔ چناں چہ نسخے سے غلیظ راز کو زیادہ سے زیادہ رگڑا یا کھرچا جاتا ہے حتیٰ کہ یہ مخفی طور پر پہلے سے زیادہ سوج جاتا ہے اور فرد کی اعصابی اور نفسیاتی صحت زیادہ سے زیادہ مجروح ہوجاتی ہے۔ آسانی سے کہا جاسکتا ہے کہ آج کے آدھے عشقیہ ناولوں اور عشقیہ فلموں کی کامیابی اس نسخے سے غلیظ راز کو رگڑنے پر پوری طرح منحصر ہے۔ آپ چاہیں تو اسے جنسی تحریک یا ترغیب کا نام دے سکتے ہیں مگر یہ تحریک وترغیب، ایک نہایت مخفی، نہایت دزدانہ اور نہایت خاص قسم کی ہے۔ وہ سیدھی سادی تحریک، کھلی کھلی اور صحت بخش تحریک کو جو بوکاچو کی کہانیوں میں ملتی ہے، ایک لمحے کے لیے بھی آپ اس دزدانہ تحریک سے مخلوط نہ کیجیے جو آج کل کے 'پرفروش' ناولوں میں، نسخے سے غلیظ راز کو مخفی طور پر رگڑنے سے پیدا ہوجاتی ہے۔

ماخذ (اُردو۔۳۷)

عریانی کے مفہوم کا ازسرِ نوتعین

ہیولاک ایلس

عریانی، انسان کی معاشرتی زندگی کا ایک دائمی مسئلہ ہے اور انسانی ذہن کے بارے میں عام طور سے جو کچھ ہم جانتے ہیں، اس کی کسی گہری ضرورت سے، عریانی کا تعلق ہے۔ عریانی کسی ایک قوم، کسی ایک تہذیبی سانچے، اعلیٰ یا ادنیٰ طبقے یا وحشی اور مہذب اقوام تک محدود نہیں۔ یقیناً، عریانی اُن کے ہاں بھی پائی جاتی ہے جنھیں ہم عام طور سے 'قدیم لوگ' کہتے ہیں اور اس کا ایک مسرت بخش اظہار ہمیں اونچی نسلوں کے اعلیٰ ترین دماغوں میں بھی ملتا ہے۔ اگر ہم عریانی کی اس اساسی نوعیت کو سمجھ لیں تو ہمیں ایک مبہم ذہنی مسئلے سے بلکہ ایک تکلیف دہ اور اشتعال انگیز اخلاقی قضیے سے بھی نجات مل جائے گی کیوں کہ تجربہ تو یہی کہتا ہے کہ اس سلسلے میں کی جانے والی ساری محنت اکارت جاتی ہے۔ ذہنی اور اخلاقی تربیت تو بہرحال ضروری ہے، لیکن اگر ہم یہ سمجھ لیں کہ ہمارا اصل کام عریانی کے مفہوم کا ازسرِ نوتعین کرنا ہے، تو ہماری کوششیں رائیگاں ثابت نہیں ہوں گی۔

اس قسم کا کام اب یوں بھی غیر اہم نہیں ہے کہ ہم اسی نوع کے ایک اور کام میں خاصے آگے نکل چکے ہیں یعنی جنس کی ایک نئی قدر اندازی، کیوں کہ عریانی کو عموماً جنس کے ساتھ ہی نتھی یا گڈ مڈ کر دیا جاتا ہے۔ 'عریانی' کے موزوں معنی یہ لیے جاسکتے ہیں کہ وہ جو کچھ 'پسِ پردہ' ہے اور جسے زندگی کے اسٹیج پر کھلے بندوں پیش نہیں کیا جاتا۔ تاہم یہاں تھیئٹر کا اسٹیج مراد نہیں، کیوں کہ تھیئٹر میں تو جو دکھایا جاتا ہے وہ عام زندگی میں سامنے نہیں آتا، گویا فن زندگی کی تکمیل کا کام کرتا ہے اور اسی لیے چھوٹے موٹے ڈراما نویسوں کی طرح بڑے ڈراما نگاروں کے ہاں بھی وہ عنصر ملتا ہے جسے ہم مناسب معنوں میں عریانی کہہ سکتے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ اگر ہم عریانی کے اس تسلیم شدہ حصے پر جو دنیا کے معزز ترین اسٹیجوں پر بھی ملتا ہے، غور کریں تو ہمیں تعجب ہوگا کہ اس کے بعد بھی عریانی کے لیے کسی جواز کی ضرورت باقی رہ جاتی ہے۔

بلاشبہ، جیسا کہ میں نے بتایا، یہ جنس کے بارے میں ہماری نئی تشخیص ہے جس کی وجہ سے، عریانی کی نئی قدر اندازی ضروری ہوگئی ہے۔ یہ سچ ہے کہ عریانی دو قسم کی ہوتی ہے، ایک تو جنسی افعال کا طبعی پہلو اور دوسرا فضلاتیاتی وظائف کا طبعی پہلو۔ ہمارے عام روایتی نقطۂ نظر سے، یہ دونوں پہلو،

عریانی کے ذیل میں آتے ہیں۔ تاہم بعض حوالوں سے، اپنی انتہائی قربت کے باوجود، یہ دونوں بالکل الگ الگ ہیں اور جن کا مشاہدہ ادب میں ان مقامات پر کیا جاسکتا ہے جنھیں عریانی چھونے لگتی ہے۔ یہ ہرگز ضروری نہیں کہ ایک فضلاتیاتی عُریاں نگار (excrementally obscene writer) ایک جنسی عریاں نگار (sexually obscene writer) بھی ہو اور اس کی نمایاں اور اہم مثال سوفٹ (Swift) ہے جو فضلاتیاتی عریانی کے تو بڑے مزے لیتا ہے اور اکثر بلا ضرورت اُسے شامل بھی کر لیتا ہے مگر، جس کے ہاں جنسی عریانی کی ایک ہلکی سی جھلک بھی نہیں ملتی۔ اس سلسلے میں سوفٹ، کلیسا کے مصنفین کے ہاں پائی جانے والی ایک عام روش کی نمائندگی کرتا ہے۔ ان حضرات کے یہاں جب کبھی عریانی ملتی ہے، وہ شاذ و نادر ہی جنسی نوعیت کی ہوتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ فضلاتیاتی عریانی پر محض رسمی اور سماجی ممانعت ہوتی ہے جب کہ جنسی عریانی پر قدغن کی نوعیت اخلاقی اور مذہبی ہوتی ہے۔ فضلاتیاتی عریانی کے خلاف اخلاقی اور مذہبی ممانعت کا اطلاق نہیں ہوتا اس لیے کہ یہاں مسئلہ روایات اور مزاج کا ہے جو دونوں، عہد بہ عہد اور ایک فرد سے دوسرے فرد کے ساتھ ہی بدلتے رہتے ہیں۔

ہمیں جنسی عریانی پر ممانعت میں شامل اخلاقی اور مذہبی عوامل کی سنگینی کا غلط اندازہ ہرگز نہیں لگانا چاہیے۔ بہرحال یہ بات سچ ہے کہ اخلاقی عنصر، مقابلتاً ایک حالیہ پیداوار ہے۔ پرانے زمانے میں 'بداخلاقی' کا یہ بھوت لوگوں پر سوار نہیں ہوا کرتا تھا جس سے اب ہم بھی اچھی طرح واقف ہو گئے ہیں۔ اٹھارویں صدی کے اختتام کے قریب، ریتیف دی لا بریتونی (Retif de la Bretonne) نے کہا تھا کہ 'لفظ 'بداخلاقی' ایک نیا لفظ ہے مگر ہمیں ہر طرف اس کی بازگشت سنائی دیتی ہے'۔ پھر انیسویں صدی تو اس لفظ کے عشق میں مبتلا ہو گئی۔ اس لیے کہ ایسی کون سی چیز باقی بچی تھی جس پر اس لفظ کو چسپاں نہ کیا گیا ہو! اس سے پہلے تک، جنسی عریانی کا بداخلاقی کے نام یا بداخلاقی کی حقیقت سے تعلق بھی صرف برائے نام تھا اور کلاسیکی ازمنۂ عتیق میں تو اس طرح کے کسی تعلق کی طرف اشارہ کرنا بھی مضحکہ خیز معلوم ہوتا، حالاں کہ اُن دنوں، کراہیت کا باعث نہ سہی، عریانی کو اکثر بدشگونی کی علامت ضرور سمجھا جاتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ سولھویں صدی میں تو رابیلئس (Rabelais) کی طرح کلیسا کا کوئی بھی رکن، جنسی عریانی میں ملوث ہوسکتا تھا مگر، اٹھارویں صدی میں یا تو اُسے اپنے آپ کو سُوفٹ کی طرح، فضلاتیاتی عریانی تک محدود رکھنا پڑتا یا پھر اُسے سڑنے (Sterne) کی طرح جنسی عریانی کے سلسلے میں، ناپاک خیالی کا سہارا لینا پڑتا۔

جنسی عریانی میں مذہبی عنصر، یقیناً بہت پہلے سے، بلکہ قدیم زمانے سے موجود ہے مگر اس عنصر کی نوعیت خاصی غیر متعین بلکہ متضاد احساسات کی حامل ہے جو دونوں کام کرتی ہے۔ وہ اس طرح کہ بعض مواقع پر، عریانی کی نہ صرف اجازت ہوتی ہے بلکہ اس کا حکم دیا جاتا ہے اور شاید یہی وہ مقام

ہے جہاں ہم عریانی کے قدیم ترین سماجی فریضے کے قریب پہنچ جاتے ہیں۔

بعض حالات میں، عریانی کے بارے میں، امر و نہی کے اس مرکب کی مخصوص مثال ہمیں افریقا میں ملتی ہے جس کا مشاہدہ ایوانز پرٹ چارڈ (Evans-Pritchard) نے کیا ہے جہاں پر عریانی تقریباتی سرگرمیوں کا حصہ ہوتی ہے۔ بعض ایسے اجتماعی عریاں طور طریق، جن پر عام دنوں میں پابندی لگی رہتی ہے، اہم سماجی موقعوں مثلاً مذہبی تقریبات یا مشترکہ معاشی ذمے داریوں کا حلف اٹھاتے وقت، نہ صرف ایسی حرکتوں کی چھوٹ دی جاتی ہے بلکہ اُن کی تاکید کی جاتی ہے۔ ایونز پرٹ چارڈ کی رائے میں، اس کے تین اہم مقاصد ہوتے ہیں۔ (۱) امتناعی پابندی اٹھا لینے سے تقریب کی سماجی اہمیت بڑھ جاتی ہے۔ (۲) انسانی بحران کے مواقع پر جذبات کو ایک خاص دھارے کی طرف موڑنے میں مدد ملتی ہے اور (۳) کسی مشترکہ اور مشکل کام کے وقت اس قسم کے صلے یا ترغیب سے کام آسان ہو جاتا ہے۔

بالموازنہ، قدیم ادوار میں، عریانی کے اس مصرف سے اس کے عام وظائف کے بارے میں ایسے اہم اشارے ملتے ہیں کہ ہم اس بات کا اندازہ لگا سکیں کہ عریانی کے عوامی اظہار کو سرے سے ختم کرنے کی احمقانہ اور لاحاصل کوششوں سے ہم کتنا تہذیبی نقصان کر رہے ہیں۔ اگر ہم ان کوششوں میں کامیاب ہوتے ہیں تو ہم اس قوت کی گزرگاہیں بنانے، جوش و جذبہ پیدا کرنے اور گلو خلاصی سے محروم رہتے ہیں جب کہ دوسری صورت میں، ہم صرف اُس کے نقصانات کو بڑھا چڑھا کر پیش کر کے اور خود برافروختہ ہو کر رہ جاتے ہیں۔ ہم یہ بھول جاتے ہیں کہ یہ ایک بنیادی اور ناگزیر انسانی جذبے کا معاملہ ہے اور ہمارا کام یہ ہے کہ ہم اس کے اچھے پہلوؤں کی حفاظت کریں اور ان پہلوؤں کو کم کرنے کی کوشش کریں، جو بُرے ہیں۔

جیسا کہ پہلے کہا گیا، بہر صورت آج، ہم معقولیت کی راہ سے ہوتے ہوئے، عریانی کی جس نئی قدر اندازی کی طرف بڑھ رہے ہیں وہ ہے جنس کے بارے میں ہمارا نیا رویہ۔ جب ہم اس دور کی طرف دیکھتے ہیں جسے ہم پیچھے چھوڑ آئے ہیں تو بالکل ایسا لگتا ہے کہ گویا جنس کا تمام میدان، اپنی تمام تر وسعت اور ان پیچیدگیوں سمیت جو سائنسی اور تکنیکی نوعیت کی ہیں، ان سب کو عریاں سمجھا گیا اور وہ بھی ایک ایسی عریانی جو وحشیوں میں پائی جانے والی عریانی کے برخلاف، سماجی طور پر، ہرگز ہرگز قابل قبول نہ تھی۔ جنس کے موضوع تک صرف اُس صورت میں رسائی ہو سکتی ہے جب اُسے اس کی تمام تر ایسی خصوصیات سے الگ ہو کر سمجھا جائے جن سے جذباتیت پیدا ہوتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ عام طور سے اس موضوع پر ایک ابہام کا پردہ پڑا رہتا ہے اور اکثر اوقات ایک ناقابل نفوذ سی دھند چھائی رہتی ہے۔

ایسے حالات میں عریانی کے مسئلے کو عقلی بنیادوں پر سمجھنا ناممکن ہوتا ہے۔ جب ہر چیز عریاں

ہے تو یہ بتانا بھی ناممکن ہو جاتا ہے کہ عریانی کیا ہے؟ عریانی کی بے شمار تعریفوں اور ان کی بے معنویت کی وجہ بھی یہی ہے۔

بلاشبہ، یہ بے معنویت اتنی عیاں تھی کہ سرکاری ذہن نے یہ طے کرلیا کہ محفوظ ترین طریقہ یہ ہے کہ عریانی کے جرم کی سزا تو سنادی جائے مگر اس احتیاط کے ساتھ کہ اس کی وضاحت نہ ہونے پائے کہ عریانی کا جرم کہاں سرزد ہوا ہے۔ سر آرکی بالڈ باڈکن (Sir Archibald Bodkin) جو ایک طویل عرصے تک سرکاری شعبۂ وکالت کے ڈائریکٹر تھے اور عریانی کے خلاف نہایت سرگرم، ان کا رویہ یہی تھا۔ 'عریاں مواد کی ترسیل و اشاعت کی روک تھام' کے سلسلے میں، جنیوا میں، ایک بین الاقوامی کانفرنس بلائی گئی، تو سر آرکی بالڈ نے، برطانیہ کے نمائندے کے طور پر اس میں شرکت کی۔ جب مختلف ممالک کے متعلقہ نمائندے جمع ہو چکے تو یونان کے مندوب نے عارضی مشورے کے طور پر یہ کہا کہ بہتر ہوگا کہ پہلے لفظ عریاں کی تعریف کرلی جائے تاکہ مندوبین کو معلوم ہو جائے کہ بات کیا ہو رہی ہے! مگر باڈکن نے کھڑے ہو کر اعتراض کرتے ہوئے کہا کہ، انگلستان کے تحریری قانون میں، 'ناشائستہ' اور 'عریاں' کی کوئی تعریف موجود نہیں۔ اُن کا یہ اعتراض، سرکاری افسران کو جو وہاں موجود تھے، بہت پسند آیا اور کارروائی کو مزید آگے بڑھانے کے لیے، یہ بات متفقہ طور پر طے کرلی گئی کہ کانفرنس کے زیرِ بحث موضوع کی 'کوئی تعریف ممکن نہیں'۔

ساتھ ہی ساتھ، یہ بھی سن لیں کہ، قانون کے ذریعے عریانی کو کچلنے کی کوششوں کی ناجائز نوعیت سے اُن سرکاری افسران کی جہالت کی پول کھلتی ہے جو اس قسم کے کام اپنے ذمے لے لیتے ہیں۔

وہ جہالت کو پسند کرتے ہیں اور ہم جانتے ہیں کہ سب سے پہلی بار یہ بات کن لوگوں کے بارے میں کہی گئی تھی کہ جہالت سے محبت ایک طرح کی چالاکی ہے۔ اس لیے کہ اگر ہم، 'نفرت انگیز'، 'نجس'، 'عیاشانہ'، 'مکروہ' جیسی بے معنی جذباتی اور بیہودہ اصطلاحات کو ایک طرف رکھ کر، بہت ٹھنڈے دل و دماغ سے اور واضح الفاظ میں، عریانی کی تعریف کرنے کی کوشش کریں تو پتا چلے گا کہ یہ تو معاشرے کے خلاف کوئی جرم ہی نہیں بنتا۔ وسیع تر معنوں میں، عریانی کی تعریف یہ ہوگی کہ وہ کچھ 'جس سے جنسی جذبات اور جنسی خواہش بیدار ہو'۔ مگر، کارخانۂ قدرت کی ہر چیز، بعض اوقات، کچھ لوگوں کے لیے ہی سہی، یہی کچھ کرتی ہے بلکہ قدرت کے قائم کردہ اس تمام نظام کے مطابق اسے یہی کچھ کرنا چاہیے۔ اس لیے ہوتا یہی ہے کہ عریانی کی اس محدود طریقے سے تعریف کی جائے گویا وہ کسی خاص طرزِ اظہار میں چھپی ہوئی ہے جو اس طرز سے مختلف ہے جو تاریخ کے ایک مخصوص دور میں، ایک مخصوص معاشرتی طبقے میں مستعمل ہے۔ مگر اس طرح تو عریانی محض قائم شدہ رسوم کی خلاف ورزی یا زیادہ سے زیادہ اچھے ذوق کی ناکامی بن کر رہ جاتی ہے، جو کوئی جرم نہیں بنتا۔ ڈی ایچ لارنس کی 'لیڈی چیٹرلیز لور' کو ابھی

معنوں میں عریاں قرار دے کر اُس پر پابندی لگائی گئی۔ معروف طور پر، یہ ایک اعلیٰ اور نہایت ہی عمدہ لکھا ہوا فن پارہ ہے مگر، اس کے مصنف نے دو تین صفحات پر، جان بوجھ کر، اپنے عہد کے اچھے معاشرے، میں مستعمل خوش گوار الفاظ کی بجائے، ٹھیک ٹھاک قسم کے پُرانے اینگلوسیکسن الفاظ استعمال کر ڈالے ہیں۔ یوں تو کوئی معزز پادری بھی، لاطینی مخرج کے آٹھ یا زائد حروف پر مشتمل کوئی سے لفظ کو استعمال کر کے، نہایت احتیاط سے اس عمل کا حوالہ دے سکتا ہے جس کے ذریعے ہم اس دنیا میں وارد ہوتے ہیں۔ لیکن اگر وہ اپنے وعظ کے دوران، غلطی سے اس کام کے لیے، اچھے خاصے پرانی انگریزی کے چار حرفی لفظ (جسے بچے، معاشرے کو خطرے میں ڈالے بغیر، چاک سے دیوار پر لکھ دیا کرتے ہیں) استعمال کر بیٹھے تو اس کا مقام اسقفی تخت کی بجائے جیل کی کال کوٹھری ٹھہرے گا، اِلّا اس کے کہ اس کے احباب کی پُر جوش کوششوں سے وہ کسی پاگل خانے بھجوا دیا جائے۔ آپ نے دیکھا، اس معاملے میں سرکاری ذہن کے لیے، جہالت کے کتنے فوائد ہیں! ہم آج بھی اُس معاشرے میں سانس لے رہے ہیں جس میں صحیح ترین مترادفات کے غیر مروّجہ استعمال کے جرم کی پاداش میں کسی پر بھی جرمانہ عائد ہو سکتا ہے یا پھر اُسے جیل بھی بھجوایا جا سکتا ہے۔

زندگی میں جنس کے مقام کے ایک نئے تصور کے وجود میں آنے کے بعد، مختلف محققین نے اس تمام تر مسئلے کی مزید وضاحتیں کی ہیں۔ اس طرح کی اوّلین کوششیں، نیو یارک کے ایک وکیل تھیوڈار شروڈر (Theodore Schroeder) کے ہاں ملتی ہیں۔ جس نے ۱۹۱۱ء میں، عدالتی استعمال کے لیے 'عریاں ادب اور دستوری قانون' کے عنوان سے ایک نہایت ہی زوردار اور ٹھوس کتاب، خفیہ طور پر شائع کی۔ اُس نے اس موضوع کے تاریخی، قانونی اور سماجی پہلوؤں پر ایک انقلابی انداز میں بحث کی ہے اور اس لیے اس کتاب کی اہمیت آج بھی قائم ہے۔ جنسیاتی اور قانونی بحثوں سے یکساں واقفیت اور کچھ نسلیاتی تجربات اور خود اپنی تحقیقات کی بنا پر، اُس نے جو کچھ کہا، بڑے اعتماد سے اور ایک سند کے طور پر کہا۔ اُس نے یہ نہایت واضح کر دیا کہ اکثر کیا جانے والا یہ دعویٰ غلط ہے کہ عریانی اپنے جدید مفہوم میں، انگلستان یا امریکا کے قانونِ عامہ میں، کبھی بھی ایک جرم رہی ہو۔ برطانوی تاریخ کے سنہرے دور یعنی ملکہ الزبتھ اور شیکسپیئر کے زمانے میں، جب انگلستان کی ذہانت' زندگی اور شاعری اپنے پورے عروج پر تھی اور اسی طرح وکٹوریائی عہد میں، سائنسی اور سماجی اصلاح کے دوران کبھی کبھار، ضرورت کے تحت، مختلف صورتوں میں، اس چیز کا اظہار ہوتا رہا ہے جسے ہم عریانی کہیں گے۔ مگر وہ عریانی، بلا روک ٹوک، کھلم کھلا اور صحت مندانہ قسم کی عریانی تھی۔ اس وقت عریانی پر پابندی کے سلسلے میں کوئی قانون نہ تھا اور اس لیے کسی کو یہ ترغیب نہیں ہوتی تھی کہ کوئی دنیا بھر کے سامنے عریانی کا چرچا کرتا پھرے اور نہ ہی کسی کی حوصلہ افزائی ہوتی کہ وہ کوئی نخش چھاپا خانہ لگا کر، اپنی احمقانہ اور غلیظ مگر مردودیت کے ہالے میں گھری

ہوئی کتابوں سے خفیہ مارکیٹ لبالب بھر دے۔

یہ تو بعد میں آنے والی صدی کے دوران ایک قسم کی ہوا کے چلنے سے، اس جدید تصور نے نہایت پراسرار طریقے سے، ہولے ہولے قانون میں در آنا شروع کیا۔ اس سے پہلے تک، قانون، عریانی کی خبر گیری نہیں کرتا تھا، مگر قانون کے ذمے یہ کام تھا کہ وہ سیاسی نظام کی حفاظت کرے، جب کہ مذہبی عدالتوں کے ذمے یہ کام تھا کہ وہ مذہب کی حفاظت کریں (بعد میں یہ کام تھوڑی بہت حد تک عام عدالتوں کے سپرد کر دیا گیا) مگر یاد رکھنے کی بات یہ ہے کہ اُس زمانے میں یہ سمجھا جاتا تھا بلکہ وکلا حضرات بھی یہ سمجھتے تھے کہ 'اخلاق، مذہب کا بنیادی جزو ہے'۔ عریانی تو محض سیاسی خلفشار اور فسق و فجور کے الزامات کے لیے قانون کے میدان میں داخل ہوگئی۔ اُن دنوں کسی فعل یا تحریر کے خلاف جو محض ناشائستہ ہو، 'عریاں اشاعت' (ایک قانونی اصطلاح جو آج بھی رائج ہے) کا الزام عائد نہیں کیا جا سکتا تھا۔ بلکہ یہ ضروری ہوتا کہ عریانی کے ساتھ ہی ساتھ اُس مواد میں تشدد یا فسق و فجور کا عنصر ہونے کا الزام بھی شامل ہو۔

میں اس عام بہتان کے خلاف اکثر احتجاج کرتا رہا ہوں جس کے مطابق عریانی کو کچلنے کی تحریک کی ابتدا کی ذمے داری 'پیورویٹزم' یعنی کٹر عیسائیت پر عائد ہوتی ہے۔ کٹر عیسائیت تو ایک نجات بخش قوت تھی، ایک ایسی قوت جو آزادی کی حامی تھی۔ ہمیں اس بات کو بار بار دُہرانے کی ضرورت نہیں کہ 'ایرو پیجیٹیکا' جو احتساب کے خلاف ملامت کی فصیح ترین مثال ہے، وہ ادب کے سب سے عظیم ترین ایک انگلستانی پیورٹن ہی کا کارنامہ ہے۔ کٹر عیسائیت عریانی کے خلاف قانون وضع کرنے کی ہرگز ذمے دار نہ تھی بلکہ کٹر عیسائی تو اپنے قول و فعل کے لحاظ سے وہ کچھ ہونے کے لیے تیار تھے جسے 'عریانی' میں شمار کیا جانا چاہیے۔

لیکن ساتھ ہی ساتھ اس بات کا امکان بھی ہے کہ کٹر عیسائیت براہِ راست نہ سہی، بالواسطہ ہی سہی، عریانی کے خلاف قانونی تحریکوں کی ذمے دار رہی ہو۔ کٹر عیسائیوں نے عریانی کے خلاف قوانین نہ گھڑے ہوں اور وہ عریانی کے روادار بھی رہے ہوں، مگر جب انگریزی دولتِ مشترکہ کے دوران اُن کا تسلط تھا، انھوں نے اپنے اعمال و اقوال سے بناوٹی شرم و حیا کی ایسی مثالیں قائم کیں، جو دولتِ مشترکہ ختم ہونے کے بعد بھی، سماجی زندگی کے ضمیر میں گھل مل کر مضبوط ہوتی چلی گئیں اور ان کے اثرات کم ہونے کی بجائے بڑھتے چلے گئے۔ نمائشی حیا پسندی، کٹر عیسائیت نہیں تھی لیکن جزوی طور پر، اُسے کٹر عیسائیت ہی کی ایک ایسی شاخ سمجھا جا سکتا ہے جو مذہب سے ہی سرسبز ہوئی اور جس نے سماجی روایات و جذبات کو ایک سانچے میں ڈھالنے میں اس وقت مدد دی جب کٹر عیسائیت دم توڑ چکی تھی۔ چناں چہ دولتِ مشترکہ کے کچل دیے جانے کے دو ہی سال بعد، بظاہر ایک عام جوش و جذبے کی لہر میں،

چارلس دوم کو جسے نمائشی حیا پسندی کی مخالفت کی ایک زندہ مثال سمجھا جاتا تھا، تخت پر بٹھا دیا گیا۔ اسی دوران یہ واقعہ پیش آیا کہ سر چارلس سیڈلی نے، اپنے دو دیگر ذی شرف نوجوان دوستوں کے ہمراہ، جو بعد میں خاصے مشہور ہوئے، باؤ اسٹریٹ، کوینٹ گارڈن کے کاک ٹیورن کی بالکنی میں کھڑے ہو کر، نشے کی ترنگ میں، اپنے کپڑے اُتار پھینکے۔ اُن دنوں، اس طرح کی حرکتیں زیادہ غیر معمولی نہیں سمجھی جاتی تھیں اور بہت کم لوگ اُن کی طرف متوجہ ہوتے تھے۔ مگر اس بار اس واقعے سے ایک ہنگامہ سا ہو گیا۔ اُس زمانے میں، عود شاہی کے بارے میں لطائف سنانا ایک پسندیدہ موضوع تھا۔ سیڈلے نے بھی، اس سلسلے میں، کسی چلتے پھرتے اناڑی کی نقل کرتے ہوئے ایک وعظ دے ڈالا جس میں شاید کچھ کلمات بے حرمتی کے بھی شامل ہو گئے۔ پھر مجمع پر، قارورے سے بھری ہوئی بوتلیں پھینکی گئیں تو جواباً اُن پر پتھر پھینکے گئے۔ یہ تو صاف ظاہر ہے کہ 'عریانی' تو شاید نظر انداز کر دی جاتی مگر یہاں تو بے حرمتی اور تشدد کے عنصر بھی شامل ہو گئے تھے۔ اس کے باوجود، اس واقعے میں بھی جو کچھ ہوا، اس میں نمائشی حیا پسندی کو اتنا زیادہ دخل نہیں تھا۔ سیڈلے کا مقدمہ لارڈ چیف جسٹس فوسٹر کے سامنے پیش ہوا، جو ایک پرانی روش کے، کلیرنڈن (Clarendon) مکتبۂ فکر کے ایک عالی منش شاہ پرست تھے۔ قیاس یہی ہے کہ سیڈلی پر، ۲۰۰۰ مارکس اور سات یوم کی بھاری سزا عائد کرتے وقت وہ نوجوان شاہ پرستوں کی عزت و ناموس کی حفاظت کے جذبات سے مغلوب تھے۔ یہاں یاد رکھنے کی بات یہ ہے کہ اُن دنوں، قانون کا مقصد تشدد اور بے حرمتی کے الزامات کا مواخذہ کرنا ہوتا تھا نہ کہ عریانی کا، خواہ وہ زندگی میں کہیں نظر آئے یا ادب میں۔ یہ حقیقت اس بات سے بھی اظہر ہوتی ہے کہ اگلے پچاس سال اور بھی گزر جاتے ہیں مگر ہمیں ان الزامات کا کہیں ذکر نہیں ملتا۔ البتہ ہمیں ۱۷۵۸ء میں 'ففٹین پلیگس آف اے میڈن ہیڈ' (The Fifteen Plagues of a Maidenhead) نامی کتاب پر عریانی کے الزام میں لارڈ بالٹ کا فیصلہ ضرور ملتا ہے، جس میں اُنھوں نے اس مقدمے کو اس بنیاد پر خارج کر دیا کہ تحقیر دین یا بے حرمتی کا جرم تو قابلِ مواخذہ ہے مگر عریانی کے الزام میں سزا دینے کا حق صرف کلیسائی (مذہبی) عدالتوں کو حاصل ہے۔

مگر اس وقت تک یہ بات عیاں تھی کہ کٹر عیسائیت کا تبدیل شدہ اور انحطاط زدہ ضمیر عام لوگوں میں اپنا کام کرنے لگا ہے اور یہ بھی کہ متوسط طبقے کا دور شروع ہو چکا ہے جس نے، اعلیٰ اور ادنیٰ دونوں طبقوں کو پیچھے دھکیل کر، ایک 'غیر مقلد' ضمیر کی منادی کرا دی جس نے پرانی کلیسائی عدالتوں کے کام اپنے ذمے لے لیے۔ بہت جلد اُس نے دُنیوی عدالتوں کے کاموں میں بھی مداخلت شروع کر دی اور پھر وہ اُس کے نفاذ کے پیچھے لگ گیا جسے گول مول انداز میں 'اخلاق' کا نام دیا گیا اور جو بعد ازاں مصیبت کا ایک فساد انگیز منبع بن گیا۔

بہرحال اٹھارویں صدی کے دوران احساس کی اس تبدیلی کے بارے میں، میں یہ اضافہ کرنا چاہوں گا کہ میں اُسے زیادہ تر، بلکہ خاص طور پر، کٹر عیسائیت کی کوئی ایسی ضمنی پیداوار نہیں سمجھتا جو کٹر متوسط طبقے میں نفوذ کر چکی تھی۔ کسی حد تک تو یہی بات تھی۔ مگر اس سے بھی زیادہ وہ نتیجہ تھی اس پھیلتی ہوئی سماجی تربیت، ایک قسم کی امارت پسندی، اُس نفاست اور اعلیٰ ذوق کی نقالی کا جسے اونچے طبقے کی شناخت سمجھ کر جس کے حصول کی کوشش کی جاتی تھی۔ حالاں کہ حقیقت یہ تھی کہ یہ سب باتیں وہ اونچے لوگ محسوس نہیں کرتے تھے، جن کی کم تر لوگ نقل اُتارتے تھے۔ یہی سب کچھ، اتنی ہی کامیابی کے ساتھ، ہمیں سترھویں صدی کے فرانس میں ہوتا ہوا نظر آتا ہے۔ انیسویں صدی کی ابتدا میں، سن رسیدہ نارتھ کاٹ (Northcote) نے ہزلٹ (Hazlit) کو یہ بات بتائی، جو اُسے اپنی 'گفتگو میں رقم کرتا ہے۔ اُس نے کہا کہ اسے یاد ہے کہ گولڈ اسمتھ کی کامیڈی کو جب پہلی بار اسٹیج کیا گیا تو گیلری میں بیٹھے ہوئے لوگوں میں ایک گھٹیا لفظ کی ادائیگی پر کیسی افراتفری مچی تھی کہ بعد میں اُسے حذف کر دینا پڑا۔ نارتھ کاٹ نے ایک اور اہم بات یہ کہی کہ 'عام لوگ نفاست کو ایک 'ضیافت' کے طور پر برتتے ہیں، جب کہ اونچے لوگ، بے ہودگیوں اور پھکڑ پن کے شائق ہوتے ہیں، اس لیے کہ اُن کو اپنی انتہائی دکھاوے کی شرافت سے کچھ دیر کے لیے نجات مل جاتی ہے۔' تاہم گولڈ اسمتھ اُس بدتہذیب اور بازاری ہجوم سے، جس نے اُس کے خلاف غل غپاڑا مچایا تھا، کہیں زیادہ نفاست پسند اور حساس تھا۔ میں نارتھ کاٹ کے ایک ہم پلہ اور ہم عصر کا ذکر کروں گا۔ میری مراد سر والٹر اسکاٹ سے ہے۔ جن کے ناولوں میں جھوٹی شرم و حیا اپنے عروج پر نظر آتی ہے مگر (میرے ایک دوست کے بقول جو اسکاٹ لینڈ کے ادبی دائرے کا ایک واقف کار تھا)، وہ نجی محفلوں میں انتہائی ناشائستہ کہانیاں سنایا کرتے تھے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ یہ عوام الناس ہی ہیں جو ان معاملات میں لب و لہجہ کی تعمیل کراتے بلکہ قانون بھی ڈھلواتے ہیں۔

۱۷۲۷ء میں وقوع پذیر ہونے والے ایک مقدمے میں ہمیں قانون کے تجاوز کے آثار دکھائی دینے لگتے ہیں۔ لگتا ہے کہ ریکارڈ پر آنے والا یہ سب سے پہلا مقدمہ ہے جس میں اس کتاب کو محض 'اخلاقی' وجوہ کی بنا پر ایک 'اشاعت عریاں' کہا گیا اور اُسے موردِ الزام بھی ٹھہرایا گیا۔ اس کتاب کا نام 'وینس اِن کلووئسٹر' (Venus in the Cloister) تھا جس کے مدعا علیہ کو مجرم قرار دیا گیا۔ اُس کے مشیر قانونی نے فیصلے کو رکوانے کے لیے یہ دلیل دی کہ اس سے پہلے تک عام عدالتوں میں اس قسم کا استغاثہ پیش نہیں کیا گیا جس میں کسی اشاعت کو 'عریاں' قرار دیے جانے کا مسئلہ درپیش ہو، اس لیے کہ اخلاقی مسائل کے سلسلے میں ملامت و مذمت کا حق صرف کلیسائی عدالتوں کو حاصل ہے۔ اٹارنی جنرل نے اس بات سے تو اتفاق کیا کہ اس بارے میں کوئی نظیر نہیں ملتی مگر ساتھ ہی یہ دلیل بھی کہ نقضِ امن کے لیے قوت کا استعمال ضروری نہیں۔ اخلاق خراب کرنا امنِ عامہ کو خراب کرنا ہے اور یہ کہ امن

عامہ کا مطلب حکومت کا امن ہے۔ عدالت نے اس بظاہر معقول درخواست کو اس بنیاد پر تسلیم کرلیا کہ مذہب قانونِ عمومی (کامن لا) کا جزو ہے اور چوں کہ 'اخلاق مذہب کا بنیادی جزو ہے' اس لیے اخلاقی جرم قانونِ عمومی کی نظروں میں بھی جرم ہوگا۔ جیسا کہ شروڈر نے کہا ہے، اس فیصلے سے صاف ظاہر ہے کہ اُس وقت تک عریانی بطور عریانی قابل تعزیر نہیں سمجھی جاتی تھی۔ اس کا مواخذہ صرف اس وقت ہوتا جب اُسے ناپارسائی ہی کی ایک شکل سمجھا جاتا۔ یہ بات ایک اور مقدمے (۱۷۳۳ء) میں بھی ظاہر ہوتی ہے۔ جس میں ایک عورت پر ایک شاہ راہ پر تقریبا برہنگی کی حالت میں دوڑ لگانے کا الزام عائد ہوا تھا۔ اس عورت کو کوئی سزا نہیں ہوئی کیوں کہ اُس کا یہ فعل 'غیر قانونی' نہیں تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ اٹھارویں صدی تک، 'عریانی' کا الزام اسی وقت ثابت ہو سکتا تھا جب کہ ساتھ ساتھ کوئی اور جرم بھی شامل رہا ہو، جو عموماً 'ناپارسائی' کا ہوتا۔ شروڈر کا کہنا ہے کہ چوں کہ امریکی نوآبادیاں، اٹھارویں صدی کے ختم ہونے سے پہلے ہی علاحدہ ہو چکی تھیں، اس لیے یہ دعویٰ غلط ہوگا کہ ریاست ہائے متحدہ امریکا کو، انگلستان کی طرف سے، عریانی کے خلاف کوئی کامن لا ورثے میں ملا تھا۔

جیسا کہ ہمیں معلوم ہے، انیسویں صدی کے دوران، عریانی کی یہ تہمت، تشدد اور بے دینی کے الزامات کا سہارا لیے بغیر، نہایت بے دھڑک انداز میں عدالتوں میں داخل ہوئی اور قبول بھی کرلی گئی۔ اُسے کوئی للکارنے والا نہ تھا، سوائے گنتی کے چند غیر موثر معترضین کے اور وہ بھی وکٹوریائی ادب اور وکٹوریائی طرز زندگی کی صورت میں۔ وکٹوریائیت پر کئی جھوٹے اور احمقانہ الزامات عائد ہوئے ہوں گے مگر اس میں شک کی گنجائش نہیں کہ وہ عریانی کے خوف سے سحر زدہ تھی۔ رذالت کی مثالیں تو اکثر سامنے آتی رہیں اور وہ بھی نمایاں طور پر، مگر عریانی پر تو مکمل طور سے پردہ ڈال دیا گیا تھا اس دور کے تو بے چارے ظرافت نگار بھی بناوٹی شرم و حیا کی چادر اوڑھے ہوئے تھے۔ حتیٰ کہ کارٹون بنانے والے بھی۔ رالینڈسن ان سب میں ذہین تھا۔ جس کا انتقال ۱۹۲۷ء میں ہوا) عامیانہ پن سے باز رہتے، مسکین قسم کے روایتی لکھتے مگر وہ عریاں نگاری سے کبھی کام نہ لیتے۔ حقیقت یہ ہے کہ عریانی کا خوف ایک آسیب کی طرح ان پر مسلط تھا۔ کیوں کہ اگر آپ سوچیں تو کوئی چیز ایسی نہیں جو شاید عریانی نہ ہو اور جوں جوں وہ صدی بوڑھی ہوتی چلی گئی، یہ بات اور واضح ہوتی چلی گئی۔ اس لیے کہ عریانی کی کسی طرح بھی تشریح کی جائے (اور اس پر کبھی اتفاق نہیں ہو سکا کہ اس کی تشریح کیسے کی جائے)، عریانی سے عموماً کم از کم دو چیزیں مراد لی جاتی تھیں۔ یعنی ایک جانب تو اُس کا مطلب ننگا پن ضرور ہوتا، خواہ لفظی خواہ جسمانی، یعنی کسی چیز کو سب کے سامنے کھولنا جو معمولاً ڈھکی رہتی ہے اور یہ بات تو بالکل طے تھی۔ مگر ساتھ ہی ساتھ، عریانی سے مراد کوئی بھی ایسی شے ہوتی، جو جنسی طور پر مشتعل کرے اور ظاہر ہے کہ یہ ضروری بھی تھا۔ کیوں کہ جب تک یہ کھلا پن جنسی ترغیب کا باعث نہ بنے، اُسے 'بداخلاقی' کیوں کر

گردانا جاسکتا ہے، اس پر پابندی کیسے لگائی جاسکتی ہے!

ان حالات میں جو کچھ ہوا وہ ہم سب کو معلوم ہے۔ نہ صرف یہ کہ کئی علمی کتابیں ناگزیر طور پر 'عریاں' ٹھہریں کیوں کہ علم تو لازماً بے کم و کاست بولتا ہے اور اس طرح اُن پر پابندی لگا دی گئی۔ لیکن ادب و فن کے میدان میں تو فحش دشمنی کے اس جذبے کو کچھ زیادہ ہی موقع ملا۔ رابیلائس سے لے کر جوئس (Joyce) تک ادب کے کئی شاہ کاروں کو عدالتوں تک گھسیٹا گیا اور اُنھیں مطعون کیا گیا۔ شیکسپیئر بھی عریاں ٹھہرا۔ حتیٰ کہ انجیل جو چند صدیوں پہلے تک مسیحی دنیا میں ایک مقدس کتاب سمجھی جاتی تھی، اُسے بھی انیسویں صدی کے قانونی افسران اور خصوصاً امریکی عدالتوں نے عریاں قرار دے دیا اور اُس کے بعض حصوں کو شائع کرنے والوں کو سزا سنا دی گئی۔ بے لباس بدن بھی عریاں ٹھہرا، نہ صرف حقیقی زندگی میں بلکہ تصاویر کی حد تک بھی اور ایک لامتناہی بحث یہ چل پڑی کہ بغیر خطرہ مول لیے، کتنے انچ بدن کھولا جاسکتا ہے۔ حالاں کہ میری سمجھ کے مطابق، اس معاملے میں ایک امتیاز اکثر برتا جاتا تھا یعنی پچھلا حصہ تو دکھایا جاسکتا تھا مگر سامنے والے حصے کو عریاں قرار دیا جاتا تھا۔ یعنی انسانی بدن کا رُخ تو فحش ٹھہرا، البتہ پشت کی نمائش کے معاملے میں لاتعلقی سی برتی گئی۔

عریانی کے تصور کی ابتدا اور اُس کی قانونی نشوونما کے بارے میں تو شروڈر نے خاصی تحقیق کر ڈالی ہے مگر بعد میں چھپنے والی ایک کتاب 'ٹو دی پیور' (To The Pure) کے دو مصنفین نے عریانی کے حالیہ پھیلاؤ اور انگلستان اور امریکا میں اِس مسئلے کی صورتِ حال پر مزید تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔

ان مصنفین یعنی موریس ارنسٹ اور ولیم سیگل (Morris Ernest/ William Seagle) کی خوش انجام رفاقت، ادب و قانون میں دونوں کی عملی دلچسپی کا مظہر ہے اور اُن کی کتاب جو بیک وقت فکر انگیز اور بڑی زوردار ہے، اس مسئلے پر جس سے ہم دوچار ہیں، اِس وقت شاید سب سے مقتدر اور دلچسپ و مقبول پیش کش ہے۔ یہ صحیح ہے کہ کتاب کا نام خواہ کتنا ہی مناسب کیوں نہ ہو، اس میں چھپے ہوئے معنی سے ہم سب کو اتفاق نہیں ہوسکتا۔ کیوں کہ جب سینٹ پال نے اپنا مشہور قول ادا کیا کہ 'پاک صاف لوگوں کے لیے تمام چیزیں پاک ہیں' تو وہ ادب، مصوری یا سینما پر گفتگو نہیں کر رہے تھے بلکہ ایک ایسے مسئلے کے بارے میں جس کی زیرِ بحث موضوع سے کوئی مماثلت نہ تھی۔ فن اور کُتب کی دنیا میں کئی ایسی چیزیں ہیں، جنھیں صالح افراد، بجا طور پر صالح نہیں سمجھتے، حالاں کہ اس بات پر مشکل ہی سے اتفاق ہو سکے گا کہ وہ کون سی چیزیں ہیں اور یہ نکتہ، عریانی کے احتساب کے خلاف، مضبوط اور دائمی دلیلوں میں سے ایک ہے۔

محض شناخت کی خاطر ہی سہی، مگر حسنِ اتفاق سے مصنفین نے اپنی کتاب کا نام بھی کچھ ایسا چن لیا کہ وہ نہ صرف وکٹوریائی عہد سے لے کر آج تک، اینگلو سیکسن احتساب کی ایک ایسی مقتدر تاریخ

بن گئی جو نہ صرف معقول لگتی ہے بلکہ احتساب سے گلو خلاصی کے سلسلے میں ایک نہایت معتدل دلیل کا درجہ بھی رکھتی ہے۔ ہم نے اس میدان میں بار ہا، انتہائی عجلت اور لاپروائی کے ساتھ ایک مشق ہوتی ہوئی دیکھی ہے۔ یہاں عریانی کے خلاف احمقانہ اور غیر محتاط انداز میں گرجنے والے، دوسری جانب کے لوگوں سے جو کچھ کم احمق نہیں ہوتے اور صرف انکل بازی اور منچلی چابک دستی سے کام لیتے ہیں، ایک دوسرے کا ہم پلہ دکھائی دیتے ہیں۔ وقت آ پہنچا ہے کہ اس مسئلے کو نہایت بردباری اور سنجیدگی سے سمجھنے کی کوشش کی جائے، ایک ایسی سنجیدگی کے ساتھ جس میں خوش طبعی اور ذہانت بھی شامل ہو۔

اب ایک اور حالیہ (۱۹۳۰ء) کتاب کا تذکرہ جو انگلستان میں چھپی ہے، یعنی برنارڈ کاسٹن اور جی، گورڈن ینگ کی کتاب، Keeping It Dark Or The Censor's Handbook ۔ ان دونوں مصنّفین کا انداز بھی نہایت ذی فہم اور سنجیدہ ہے اور انھوں نے اس تمام تر موضوع کو نہایت مختصر مگر جامع انداز میں پیش کیا ہے۔ یہ دونوں مصنّفین، عریانی کے خلاف قوانین کی مکمل منسوخی کے حق میں اس لیے ہیں کہ اس طرح، موجودہ مبہم اور من مانی دفتری کارروائیوں کے مقابلے میں، صرف چند خطرے سامنے ہوں گے اور نقصانات بھی کم ہی ہوں گے۔

شاید یہی وہ نقطۂ نظر ہے جس کا غلبہ ہوتا ہوا نظر آ رہا ہے، حالاں کہ ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ وہ غالب آ چکا ہے۔ برٹرینڈ رسل کہتے ہیں کہ: 'میری سمجھ میں یہ بات پوری طرح آ چکی ہے کہ عریاں اشاعتوں کے سلسلے میں کسی قسم کا کوئی قانون نہیں ہونا چاہیے، اس لیے کہ ہر ایسے قانون کے ناخوش گوار نتائج ہمارے سامنے آتے رہے ہیں۔ کیوں کہ ایسا قانون، اچھی کتابوں پر پابندی عائد کیے بغیر، بری کتابوں پر پابندی نہیں لگا سکتا۔ جب کہ معقول جنسی تعلیم کی موجودگی میں، بری کتابوں کے اثرات برائے نام رہ جاتے ہیں'۔ اس سے بھی اہم رائے اُن کی ہے جنھوں نے عریانی کو کچلنے میں عملی دلچسپی کا مظاہرہ کیا ہے۔ اس بارے میں، 'نیو یارک جرنل آف شوشئیل ہائجین'، اپنے ایک اداریاتی نوٹ میں کہتا ہے کہ: 'عریانی کے امتناع اور احتساب کے مختلف درجوں کے بارے میں، کئی قانون سازانہ فیصلے اور ضابطے جاری ہو چکے ہیں، مگر وہ سب کے سب، اپنے مقصد میں ناکام رہے ہیں'۔

یہ بات تو صاف ظاہر ہے کہ عریانی کے بارے میں کوئی بھی معیار صرف داخلی یعنی ذاتی ہو سکتا ہے اس لیے کہ مشاہدہ کرنے والی آنکھ کے سوا، کوئی بھی چیز، بذاتِ خود عریاں نہیں ہوتی اور یہ بات عدالتوں میں پیش کی جانے والی اس تعریف سے بھی اکثر سامنے آتی رہتی ہے، (اگر کوئی بات سامنے آتی ہی ہے تو) یعنی 'وہ جس سے جنسی خواہشات بھڑکیں یا ان کو شہ ملے'۔

عریانی کی اس طرح کی تعریف ان وکیلوں کے شبہے سے بالاتر بھولپن یا کم علمی کی غماز ہے جنھوں نے اس تشریح کو وضع کیا یا اسے قبول کر لیا، کیوں کہ اس طرح انھوں نے بے خبری میں اپنے آپ

کو، اپنے مخالفین کے حوالے کر دیا۔ تاریخ میں شاید کوئی ایسا دور ضرور رہا ہوگا مگر کہیں بہت پہلے، جب جنسی جذبے کو ابھارنے والے تسلیم شدہ محرکات اتنے خام اور اتنے عیاں ہوا کرتے تھے کہ ان کے بارے میں، کسی قسم کے شک وشبہ کی گنجائش ہی نہ تھی۔ مگر اس دور کو گزرے ہوئے ایک زمانہ بیت چکا، بلکہ وہ زمانہ اس سے بھی پہلے ہی گزر چکا جب تحلیلِ نفسی نے ہمیں بتایا، غلط یا صحیح، مگر یہ کہ ہم ایک ہمہ جنسیت دنیا میں سانس لے رہے ہیں۔

حقیقت تو یہ ہے کہ اب زندگی اور فن کی دنیا میں بہت کم چیزیں ایسی ہیں، جو بعض حضرات کے جذبات اور کچھ لوگوں کی سوچ کے مطابق، 'شہوت انگیز' 'نفرت انگیز' اور 'عیاشانہ' نہ ہوں اور عریانی کی قانونی اصطلاح کے تسلیم شدہ مترادفات بھی یہی الفاظ ہیں۔ حقائق کو تسلیم کرنے والوں اور اپنی آنکھیں کھلی رکھنے والوں پر یہ بات بہت پہلے کھل چکی تھی۔ حساس قسم کے مرد اور عورتوں میں یہ بات عام طور پر دیکھنے میں آئی ہے کہ مستقل طور پر پیش آتے رہنے والے، معمولی نوعیت کے قدرتی مناظر اور واقعات سے ان کا جنسی جذبہ بیدار ہونے لگتا ہے، گویا یہ واقعات ان کے لیے شہوت انگیز، 'نفرت انگیز' اور 'عیاشانہ' ہیں۔ جنسی اشیا پرستی کے مارے ہوئے سب لوگوں کے لیے نہ سہی، ان کی اکثریت کے لیے، ایسی تمام اشیا بلکہ وہ اشیا بھی جن کا بظاہر، جنس سے دور کا تعلق بھی نہیں، جنسی تحریک کا باعث بن بیٹھتی ہیں۔ علاوہ ازیں حالیہ سالوں میں لاشعور کی کھوج لگانے کے بعد، تحلیل نفسی کے ماہرین کے مطابق اس امر کو تسلیم کرنے کی وجوہ موجود ہیں کہ جنسی تلازمات کا کوئی شمار نہیں۔ اگر ہم تمام تر امکانی عریانی کا خاتمہ کرنا چاہیں، تو ہمیں ساری دنیا کو ہی مٹانا ہوگا۔

بلاشبہ، یہی سب کچھ ادب وفن کے بارے میں بھی کہا جا سکتا ہے۔ اُن مشہور کتابوں کا شمار نہیں جن پر عریانی کے متلاشیوں نے پابندی لگوا دی یا لگانی چاہی۔ انیسویں صدی کی بعض مشہور ترین کتب جو اب ادب واحترام کے لائق سمجھی جاتی ہیں، ان پر اشاعت کے وقت مقدمات چلائے گئے جن میں سے اکثر کامیاب بھی رہے۔ بظاہر عریانی کی کوئی بھی ایسی تعریف نہیں ملتی جو انجیل پر بھی یہ جرم عائد نہ کر دے۔ مزید برآں، عملی طور پر، یہ بات عام ہے کہ جنسی امور ولادت، جلق، ضبطِ تولید، عصمت دری اور دیگر کج رویوں کے بارے میں، نوجوان اپنی ساری معلومات، انجیل ہی سے حاصل کرتے ہیں، جیسا کہ سماجی حفظانِ صحت کی ممتاز شخصیت، ڈاکٹر کیتھرائن ڈیوس نے ایک ہزار سے زائد غیر شادی شدہ خواتین سے، جو سب کی سب گریجویٹ تھیں، ملاقات کے بعد اپنی نہایت محتاط تحقیق میں کچھ ہی عرصے پہلے ہمیں بتایا ہے۔ انھی خواتین سے یہ سوال بھی پوچھا گیا تھا کہ ان کے لیے سب سے زیادہ 'اشتعال انگیز' چیز کون سی ہے (جسے عدالتوں میں 'شہوت انگیز'، 'غلیظ' اور 'نفرت انگیز' کہا جاتا ہے)۔ ان میں سے اکثر کا جواب تھا: 'مرد'۔ اس طرح اس مسئلے کا حل نہایت افسوس ناک نکلتا ہے کیوں کہ عریانی کا خاتمہ

صرف اسی وقت ہوسکتا ہے جب انسانی نسل کی نصف آبادی کو ختم کر دیا جائے۔ پھر دوسری نصف آبادی بھی کیوں بچے! اس لیے کہ اگر یہی سوال مردوں سے پوچھا جائے تو ان کی اکثریت کا بلاشبہ جواب ہوگا ’عورت‘۔ عریانی کے محتسبین اس بارے میں اتنے سنجیدہ ہیں کہ وہ یہ احساس نہیں کر پا رہے کہ وہ ایک مذاق کے مرتکب ہو رہے ہیں اور پھر وہ نادان بھی اتنے ہیں کہ وہ یہ بھی نہیں سمجھ پا رہے کہ اس مذاق کے کچھ پہلو نہایت تشویش ناک بلکہ دردناک بھی ہیں۔

عریانی کے خلاف ان دقیانوسی ممانعتوں کی وجہ سے ہونے والے سماجی نقصانات کا اندازہ لگانا ناممکن ہے۔ یہی وہ ممانعتیں ہیں جو جنسی امراض اور کثرت آبادی کے مسائل کے حل کی کوششوں میں آج تک رکاوٹ بنی ہوئی ہیں۔ ان برائیوں کے نام بھی اتنے ’عریاں‘ سمجھے جاتے تھے کہ انھیں پھلنے پھولنے یا ماہرین اور افسران کے ذمے، فنی اصطلاحات کی آڑ میں گفتگو کرنے کے لیے چھوڑ دیا گیا۔ ایک اور میدان یعنی تحلیل نفسی کے اٹھائے ہوئے مشکل سوالات کو علمی دائرے سے، جو ان کا اصل دائرہ تھا، گھسیٹ لیا گیا تا کہ انھیں تحریمِ عریانی کی کشش یا کراہیت کے ذریعے آلودہ یا مسخ کیا جا سکے۔ یہی نہیں، بلکہ تاریخ اور سوانح کے میدان میں بھی، عریانی کی یہی تحریم، شخصیتوں اور واقعات کے بارے میں صحیح معلومات کے آڑے آتی رہی ہے۔ اب جب کہ اس تحریم کا زور ٹوٹ رہا ہے، قدرتی طور پر، اس انتہا کا رخ دوسری جانب موڑ دیا گیا ہے اور ان حقائق کی اہمیت کو بڑھا چڑھا کر پیش کیا جا رہا ہے جن کو بالکل پیش ہی نہیں کیا جاتا تھا۔ کیوں کہ ان فرسودہ تحریمات کی سب سے کم سہی مگر ایک برائی یہ بھی ہے کہ وہ ناگزیر ردعمل بھی جو ان کے نتیجے میں سامنے آتے ہیں، برے ہی ہوتے ہیں۔

عریانی کے خلاف قوانین کے ذریعے، عریاں ادب کو کچلنا، بظاہر ایک نہایت ہی سادہ، نہایت معصوم اور سراسر قابلِ تحسین بات لگتی ہے۔ ہم میں سے کوئی بھی شخص اس چیز کا حامی نہیں ہو سکتا جسے ہم عریاں سمجھتے ہیں اور ہم ایسا کر بھی نہیں سکتے کیوں کہ اگر ہم معلوم کرنے کوشش کریں تو، اس لفظ کا مطلب ہی صرف اتنا ہے کہ وہ جو ’نامناسب‘ ہے۔ لیکن شائستگی کا تصور جتنا سیدھا سادہ اور جتنا اساسی معلوم ہوگا، اُسے کسی ایجابی قانون کی شکل میں تجویز کرنا، اتنا ہی مشکل ہوگا۔ کیوں کہ اس کا تعین تو خود کسی شخص کی فطرت، اس کے سماجی گروہ کے احساسات اور جو کچھ رائج الوقت ہے، اس کی روشنی میں ہوگا۔ ہم میں سے اکثر جو اب بڑی عمر کے ہو گئے ہیں وہ جانتے ہیں کہ آج کی تمام نوجوان لڑکیاں، بیس سال سے بھی کم عرصے پہلے، اپنے لباس کی بنا پر، بے حیائی کے جرم میں، قریب ترین تھانے لے جائی جا سکتی تھیں۔ اور پھر زندگی کے مقابلے میں، ادب کا فیشن تو اور بھی غیر یقینی اور مبہم سا ہوتا ہے اور اس کی ایک معقول وجہ یہ ہے کہ ادب کسی عوامی کارروائی کے نتیجے میں پیدا نہیں ہوتا۔ کتابوں کے بارے میں آرا کے تلون کی بے شمار مثالیں ہمارے سامنے آچکی ہیں یعنی وہ کتابیں جن پر سزائیں عائد کی گئیں اور

ایسی مثالیں بھی جن میں ایک ہی کتاب کو انگلستان میں عریاں قرار دیا گیا جب کہ امریکا میں اس پر کوئی پابندی نہیں لگی یا پھر امریکا میں تو اسے عریاں قرار دیا گیا لیکن انگلستان میں اس پر پابندی نہیں لگائی گئی۔ جب ہی تو کہا گیا ہے کہ: ’آج کی عریانی، آنے والے کل کی شائستگی ٹھہرے گی۔‘

قانون کو اس وقت مضحکہ خیز بنا دیا جاتا ہے جب اسے اس طرح وقت کے تقاضوں کی خاطر ذلیل کیا جاتا ہے اور بچوں کے مفروضہ تحفظ کی خاطر غلط طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ یہ خواتین اور بچے ہی تھے جن کو عریانی کے خطرے سے بچانے کی ضرورت محسوس کی گئی۔ اب صرف بچے ہی باقی رہ گئے ہیں کیوں کہ خواتین کا یہ اصرار بالکل بجا ہے کہ آئندہ اس معاملے میں انھیں بچوں کی نہیں بلکہ مردوں کی سطح پر سمجھا جائے۔ مگر بچوں کا مسئلہ ابھی باقی ہے۔ یہ واضح رہنا چاہیے کہ ہمیں یہ حق حاصل نہیں کہ ہم ایسے قوانین کے ذریعے بچوں کا تحفظ کریں جن کا اطلاق بالغوں پر بھی ہو سکے اور اس طرح، بعض دفعہ تو نہایت کامیابی کے ساتھ، بالغ لوگ، بچے بنا کر رکھ دیے جاتے ہیں۔ اس امر کو بار بار دہرانے کی ضرورت نہیں کہ یہ والدین اور اساتذہ ہی ہیں جنھیں بچوں کی حفاظت کرنا چاہیے بلکہ انھیں چاہیے کہ وہ بچوں کو اپنی حفاظت آپ کرنا سکھائیں اور وہ بھی برائی کا مقابلہ کر کے نہ کہ برائی سے فرار اختیار کر کے۔ تاہم یہ بات ارنسٹ اور سیگل نے بھی تسلیم کی ہے کہ، والدین اور حکومت کے درمیان ایک دھندلا سا علاقہ اس بارے میں ہے کہ اُس پر کس کا اختیار ہونا چاہیے، معاشیات کے حلقے تک تو بات صحیح ہے کہ ان قوتوں کی قانونی روک تھام کی جائے جو بچوں سے بہت دیر تک کام لینے اور ان کے لیے ایسی دوسری مشکلات کھڑی کرنے کی ذمے دار ہیں۔ مگر بچوں کو قانون کے ذریعے عریانی سے بچانا نہ صرف زیادہ مشکل اور زیادہ خطرناک ہے بلکہ اتنا ضروری بھی نہیں۔ اگر اتفاقی طور پر، کسی صحت مند بچے کا واسطہ، عریانی سے پڑ بھی جائے تب بھی وہ اس کے لیے ایک بے معنی اور غیر دلچسپ بات ہوگی کیوں کہ اس کا ردِ عمل، کراہت نہ سہی، ایک لاتعلقی کا ہوتا ہے۔ آج اگر بچوں کو کوئی نقصان پہنچتا ہے تو اس بات کا امکان کم ہی ہے کہ اس کی وجہ فحش نگاری ہو، بمقابلہ اس نقصان کے جو سماجی صحتیات کے نیک نہاد داعیوں کی ان انتہائی مبالغہ آمیز فلموں سے جو معصوم ذہنوں کے لیے ایک تکلیف دہ صدمہ بنتی ہیں، بالکل ایسے ہی جیسے کسی بچے کی نازک جلد اس وقت مجروح ہو جاتی ہے اگر اسے اس درجہ حرارت کے گرم پانی سے نہلایا جائے جو بڑوں کے لیے باعثِ توانائی ہوتا ہے۔ زندگی میں بہت ساری غیر سنسر شدہ ایسی چیزیں ہیں جو نوعمروں کے لیے عریانی سے بھی زیادہ نقصان دہ ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ ارنسٹ اور سیگل نے ’قانونِ فحاشی برائے اطفال‘ کی تجویز پیش کی ہے، مگر صرف آزمائشی طور پر اور وہ بھی نہایت شک و شبہے کے ساتھ۔ کیوں کہ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ اسکول اور گھر کی تعلیم، اس مسئلے کا ایک بہتر حل ثابت ہوگی۔ ہمیں والدین اور اساتذہ پر اعتماد کرنا چاہیے کہ وہ بچے کی نہایت عمدہ طریقے سے، ان خطرات میں رہنمائی کریں

گے اور وہ بھی اس طور پر کہ بالغوں کی آزادی مجروح نہ ہونے پائے۔ اور آج والدین اور اساتذہ، دونوں ہی یہ بات تسلیم کرتے ہیں کہ ان کے طریقے اکثر حالات میں علم سے مطابقت نہیں رکھتے۔

عریانی کے مفہوم کے از سرِ نو تعین یا اس کی نئی قدر پیمائی سے ہرگز ہرگز یہ مراد نہیں کہ ان چیزوں کے لیے جواز مہیا کیا جائے جنھیں اکثر معقول حضرات ناپسندیدہ اور ناخوش گوار سمجھتے ہیں۔ مگر اس کے معنی، عملی طور پر ان چیزوں کو ختم کرنے کے سلسلے میں ایک مختلف رویہ اپنانے کے ہیں۔ ماضی میں روا رکھے جانے والے رویے کے نتائج ہمیں معلوم ہیں، اس لیے کہ ہم سب اس کا شکار رہے ہیں اُن چیزوں پر جو غلیظ اور فضول ہیں اور جن پر منافع ملتا ہے۔ یہ قانون ہی ہے جو فحش نگاری کو پرکشش اور منافع بخش بناتا ہے۔ نطشے نے بہت پہلے کہا تھا کہ 'کسی (چیز) کی اس سے بہتر خدمت نہیں ہو سکتی کہ اس کا پیچھا نہ چھوڑا جائے۔' انگلستان میں ایک سیدھا سادا ہوم سیکریٹری کھڑے ہو کر اعلان کرتا ہے کہ نو عمروں کو، کتابوں، پوسٹ کارڈز اور سینما گھروں کی شکل میں موجود خوف ناک خطرات سے بچانا اس کا فرض بنتا ہے۔ یہاں یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ آج کے نو عمر نہیں چاہتے کہ انھیں ایسے خطرات سے بچایا جائے جو جلد یا بدیر، تھوڑی سی کوشش اور تھوڑے سے پیسے خرچ کر کے، مول لیے جا سکتے ہیں اور اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ ایسی چیزوں سے اکثر للچاہٹ پیدا ہوتی ہے حالاں کہ ان پر پابندیاں نہ ہونے کی صورت میں ان سے محض بیزاری اور ناپسندیدگی کا اظہار ہوتا، اس لیے کہ پھر ان کو پیش کرنے کا مقصد ہی ختم ہو جائے گا۔ موجودہ صورت میں تو، ایسی چیزوں پر یہ اتنے بڑے منافع ہی کی برکت ہے کہ اس طرح کے پوسٹ کارڈز اور دیگر چیزیں اتنی زیادہ پیش کی جاتی ہیں کہ صرف پکڑی جانے والی چیزوں کی تعداد لاکھوں تک پہنچ جاتی ہے۔ امکان تو یہی ہے کہ ہم میں سے ہر ایک کے، کسی نہ کسی عمر میں، اس قسم کی چیزیں حاصل کرنے کے لیے جذبات ہجز کے ہوں گے اور وہ صرف اس لیے کہ ان پر پابندی ہے۔

میرے اپنے تئیں، بہت پرانی بات ہے جو مجھے آج بھی یاد ہے کہ سیول (Seville) کی ایک سنسان گلی میں چور نظروں سے دیکھنے والے، پرانے کپڑوں میں ملبوس ایک شخص نے مجھے الگ کھینچ کر اپنے لمبے لبادے کے نیچے سے رنگین تصویروں سے بھری ہوئی ایک چھوٹی سی کتاب نکال کر دی اور میرے تجسس کا یہ حال تھا کہ میں بھی اس پر کئی روپے خرچ کر بیٹھا۔ مجھے تو وہ اتنی بھونڈی اور ناخوش گوار لگی کہ میں نے اسے فوراً ہی ضائع کر دیا۔ پھر میرا یہ اشتیاق ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ٹھنڈا پڑ گیا۔ ایسی چیزوں کا علم و فن سے دور کا بھی واسطہ نہیں کیوں کہ یوں بھی کسی چیز پر علم و فن کی چھوٹ پڑتے ہی اسے معافی مل جاتی ہے، بشرطے کہ اسے معافی کی ضرورت ہو۔

حقیقت تو یہ ہے کہ ہمیں یہ سمجھ کر کہ یہ مسئلہ طے ہو چکا ہے، خاموش نہیں بیٹھ جانا چاہیے۔ انیسویں صدی کا بے جان ہاتھ ابھی ہم پر رکھا ہوا ہے بلکہ ان لوگوں پر بھی جو یہ سمجھتے ہیں کہ وہ اگلی گاڑی

میں بیٹھ چکے ہیں اور اس امر کی جھلکیاں ہمیں ڈی ایچ لارنس کے اس پمفلٹ میں بعنوان 'پورنوگرافی اینڈ اوبسینٹی' (Pornography And Obscenity) میں ملتی ہیں، جو اس نے اپنی موت سے کچھ دنوں پہلے (۱۹۲۹ء) لکھا تھا۔ حالاں کہ لارنس تو خود عریانی کے سرکاری محتسبین کے ہاتھوں ایک سے زائد بار زیادتی کا شکار ہو چکا تھا مگر اس کے باوجود، تذبذب کی ایک عجیب وغریب کیفیت میں وہ یہ کہہ بیٹھا کہ 'حقیقی فحش نگاری کا احتساب وہ خود کرے گا'۔ بہرحال احتساب کا وہ نظام جسے وہ قائم کرے گا، اس نظام سے بھی جس کا وہ خود شاکی ہے، زیادہ بھیانک ثابت ہو سکتا ہے اور اس پر عمل کرنا اور بھی زیادہ مشکل ہوگا۔ لارنس کی، عریانی کی اپنی ایک خاص اور عجیب وغریب تعریف ہے جس کے تحت 'ڈیکامیرون' تو بوڑھے اور جوانوں کے لیے یکساں طور پر مناسب ہونے کی بنا پر پابندی سے مبرا ہوگی۔ یہ ایک ایسی بات ہے جس سے ممکن ہے ہم اتفاق کرلیں۔ مگر جین آئر (Jane Eyre) اور ٹرسٹان (Tristan) دونوں کی دونوں، اس کی نظر میں، خطرناک حد تک سزایابی کے قریب ہیں۔ کیوں کہ فحش نگاری کیا ہے، کے بارے میں اس کا معیار، (اس اصطلاح کے اصلی معنوں سے بالکل مختلف ہے) اور فحش نگاری سے اس کی مراد ایسا مواد ہے جس کا رجحان، عام جنسی مباشرت کی بجائے جلق کی طرف مائل کرتا ہو۔ یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ لارنس یہ کیسے فرض کر لیتا ہے کہ 'لیڈی چیٹرلیز لوور' (Lady Chatterlay's Lover) کے مقابلے میں شارلوٹ برونٹے (Charlotte Bronte) کا ناول پڑھنے سے جلق کی طرف زیادہ دھیان جاتا ہے (اگر یہ فرض بھی کرلیا جائے کہ ان میں سے کسی میں بھی اس قسم کا مواد موجود ہے تب بھی)۔ یا پھر یہ کہ وہ اس بات کا اشارہ کیوں دیتا ہے کہ ویگنر (Wagner) پر پابندی لگنا چاہیے! حالاں کہ اسے اس بات کا احساس بھی ہے کہ یہ 'رازداری' ہی ہے کہ جس سے برائی پیدا ہوتی ہے مگر اس کے باوجود وہ ہمارے ادب وفن کے بڑے حصے پر پابندی لگا کر اس پر پردہ گرا دینا چاہتا ہے۔ ژولیدہ فکری کی اس سے بڑی مثال نہیں ہو سکتی۔

لارنس ہی کے زمانے میں اور اسی سلسلے میں، وائی کاؤنٹ برینٹ فورڈ (Viscount Brentford) کا بھی ایک پمفلٹ شائع ہوا، جس کا عنوان تھا، 'کیا ہمیں سنسر کی ضرورت ہے!' (Do We Need a Censor?) لارڈ برینٹ فورڈ، سر ڈبلیو جوئے سن۔ ہکس (Sir Joyson-Hicks) اور ہوم سیکریٹری کے طور پر، اس وقت ابھر کر سامنے آیا جب عریانی کے خلاف مقدمات قائم کرنے اور اسے کچلنے کے سلسلے میں کئی ایک فیصلوں اور آرا کی ایک لہر چلی۔ ان فیصلوں اور آرا نے ادب وفن کی آزادی کے حامیوں میں دور دور تک، اس کے خلاف ایک نفرت پھیلا دی تھی۔ جب یہ پمفلٹ مجھے ملا تو مجھے اس بات کی پوری امید تھی کہ اس کے پڑھنے سے میرے اس رویے کی

تصدیق ہو جائے گی جو میں نے اس کے ہوم سیکریٹری ہونے کے زمانے میں اختیار کیا تھا۔ مگر پمفلٹ کے آخر میں اس کا حتمی فیصلہ سن کر تو میں حیران ہی رہ گیا کیوں کہ اس کی رائے بالکل وہی تھی جو اس سلسلے میں میری تھی۔ مجھے نہیں معلوم کہ آیا یہ ذہانت اسے اس کے تجربات کے طفیل ملی یا پھر وہ ایوانِ بالا کی پرسکون بلندیاں تھیں جنھوں نے اسے، چیزوں کو ان کے صحیح تر تناظر میں دیکھنا سکھایا! اگرچہ کہ وہ پمفلٹ میں کچھ مشکوک قسم کی باتیں کرتا ہے اور پھر بھی یہ سمجھتا ہے کہ اخلاق جیسی بحث طلب بات کو قانون کے دائرے میں مقید کیا جا سکتا ہے۔ مگر وہ جس نتیجے پر پہنچتا ہے وہ یہ ہے کہ یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جس کا تعلق 'دل' سے ہے اور ہم ایک ایسے دور کی طرف جا رہے ہیں جس میں اس طرح کی مقدمے بازیاں خاصی پرانی بات ہو چکی ہوں گی۔ آخر میں، (وہ ایک اچھے کلیسائی کے طور پر، مذہب کو بیچ میں لاتے ہوئے) کہتا ہے کہ 'تعلیم کے پھیلاؤ کے ساتھ ساتھ ہی لوگ خود اپنے طور پر، ہر قسم کے ناپسندیدہ ادب و فن اور چال چلن کو ٹھکرا دینا سیکھ لیں گے۔ اگر لوگ خیال، لفظ اور عمل میں پائی جانے والی ہر قسم کی ناشائستگی کو نہ صرف نظر انداز کرنا بلکہ اس سے نفرت کرنا سیکھ لیں گے تو وہ بھی دن آئے گا جب ہمیں کسی قسم کے احتساب کی ضرورت محسوس نہیں ہوگی۔ اس وقت قانون کی بنا پر، استغاثے دائر نہیں ہوا کریں گے اور پارلیمان کے بنائے ہوئے قوانین دستور کی کتابوں میں بے روح ہو چکے ہوں گے۔' سچ بات تو یہ ہے کہ مذہبی جنون سے سرشار ہو کر، لارڈ برینٹ فورڈ ہماری معقول توقعات سے کہیں آگے نکل گئے۔

کیوں کہ ایسا وقت کبھی نہیں آئے گا جب تمام لوگ اُن کے مثالیہ پر پورے اترنے لگیں اور نہ ہی ہماری یہ خواہش ہے۔ معقول بات تو یہ توقع ہے کہ تعلیم، خصوصاً جنسی تعلیم اور اس صاف ستھرے ذوق کے پھیلاؤ کے ساتھ ہی، جس پر ابھی تک ایک نہایت مختصر مگر حقیقتاً ایک روز افزوں طبقہ کی اجارہ داری ہے، وہ برائیاں برائے نام رہ جائیں گی جن کی لارڈ برینٹ اب مذمت کرنے لگے ہیں۔

بہرحال، جن باتوں کو برینٹ فورڈ اس وقت نہیں سمجھ سکے جب وہ ہوم سیکریٹری تھے اور ایک لارڈ کے مرتبہ پر فائز ہونے کے باوجود بظاہر آج بھی جو بات ان کی سمجھ سے بالاتر ہے، وہ یہ ہے کہ احتساب اور ممانعت کے کسی بھی نظام کے ذریعے، ان کے مثالیہ سے قریب تر نہیں ہوا جا سکتا۔ لارنس نے بالکل سچ کہا ہے کہ 'رازداری' کے بغیر فحاشی ممکن نہیں۔ جب تک رازداری برقرار ہے، عریانی موجود رہے گی۔ نظام کوئی سا بھی ہو، عریانی تو رہے گی کیوں کہ عریانی کی بنیاد حقیقی اور فطری ہے۔ البتہ، گھٹیا، نفرت انگیز اور احمقانہ قسم کی عریانی جسے فحش نگاری کہا جاتا ہے، یعنی وہ ادب و فن جو قحبہ خانے کا نعم البدل ہے اور انھی کی طرح بھونڈا، اس کی جڑیں فطرت میں نہیں بلکہ مصنوعی قسم کی اخفائیت میں ہیں۔ اس لیے اس ممانعتی نظام کا جو آج کل بھی ہمارے ہاں رائج ہے، کاسٹن اور ینگ کے الفاظ میں، اس کا

'واحد مقصد دنیا کو فحاشی سے محفوظ رکھنا ہے۔'

اس نکتے پر، دارالامرا میں میرے ایک اور ہم نوا ہیں جن کی رائے زیادہ صحت مندانہ اور معتدل ہے اور جو اس موضوع پر بڑی سند رکھتے ہیں۔ میری مراد کینٹر بری کے موجودہ لاٹ پادری سے ہے۔ وہ اس معاملے میں احتساب اور امتناعات کے خلاف ہیں اور کسی نوع کا ایک قابلِ برداشت احتساب بھی اُن کی سمجھ سے بالاتر ہے۔ (دیکھیے، دی ٹائمز، ۲۹ مئی ۱۹۳۰ء)۔ وہ کہتے ہیں: 'ان معاملات میں کسی قسم کی پابندی عائد کرنے سے خود مقصد ہی فوت ہو جائے گا۔ عریاں ادب کو روکنے کا صرف ایک طریقہ ہے اور وہ ہے اچھے ادب کی نشر و اشاعت کی حوصلہ افزائی۔ اشاعتوں پر اخلاقی احتساب کی تحدید سے کہیں زیادہ کارگر یہی بات ہوگی'۔ جب لاٹ پادری صاحبان عام فہمی پر مبنی، اس طرح کے باجواز عقیدے پیش کرنے لگیں تو میرے خیال میں وقت آ چکا ہے کہ میں خاموش ہو جاؤں۔

اسے بار بار دہرانے کی ضرورت نہیں مگر سچ تو یہ ہے کہ ایسا ادب و فن جو حقیقی قابلِ اعتراض معنوں میں 'عریاں' ہے اور جب کہ اس پر اخفا اور ممانعت کی چادر نہیں تنی ہوئی، تو اس بات کا امکان کم ہی رہ جاتا ہے کہ وہ عام صحت مند ذہنوں کو متاثر کر سکے۔ یہ بالکل یاد رہے کہ فحش نگاری کا مارکیٹ مصنوعی طور پر چمکایا جاتا ہے۔ صورت حال کی مرکزی صداقت یہی ہے۔ کوئی بھی کتاب اس لیے نہیں پڑھی جائے گی کہ ہوم سیکریٹری نے اس کی تعریف کی ہے۔ مگر ایسے لوگ خاصی تعداد میں ہیں جو کسی کتاب کو اس لیے پڑھیں گے کہ ہوم سیکریٹری نے اس پر پابندی لگا دی ہے۔ وہ اور اس کا ماتحت عملہ نہ صرف اس بات کے ذمے دار ہوتے ہیں کہ 'ممنوع' ہونے کا جادو جگا کر وہ اس چیز کی تشہیر کرتے ہیں جو صحیح معنوں میں 'غلیظ' کہلائی جا سکتی ہے بلکہ اس چیز کی مانگ پیدا کر کے، براہ راست وہ اس 'غلاظت' کی تخلیق کے ذمہ دار بنتے ہیں جو اس طلب کی فراہمی کرتی ہے۔ اور جہاں تک نفاست سے انتہائی عاری اور انتہائی نفرت انگیز تخلیقات کا تعلق ہے تو ہمیں یہ بات ہمیشہ یاد رکھنی چاہیے کہ صورتِ حال کی مرکزی صداقت بھی یہی ہے۔ ان لوگوں کے لیے جو ایک صحت مندانہ ماحول میں پیدا ہوتے اور پرورش پاتے ہیں، عریانی کوئی مسئلہ نہیں۔ اگر مضر قسم کی امتناعات ختم کر دیے جائیں تو اس مسئلے میں قانون سازی کی ضرورت باقی نہیں رہے گی۔ اگر بچوں کی پرورش معقول انداز میں کی جائے اور انھیں زندگی کے مرکزی حقائق سے بتدریج مانوس کیا جاتا رہے (جس کے لیے بہر حال، ہمیں سب سے پہلے صحیح قسم کے والدین کی ضرورت ہوگی) تو پھر اس صورت میں ہمارے ہوم سیکریٹریوں اور سرکاری وکیلوں کی مریضانہ سرگرمیاں، فحش نگاری کے لیے کوئی مارکیٹ پیدا نہیں کر پائیں گی۔

یہ خوف بلکہ واقعتاً خوف پر مبنی ایک قسم کی الجھن ہی ہے جو ان حضرات پر مسلط رہتی ہے جو ان معاملات میں رازداری اور احتساب سے کام لینا چاہتے ہیں، جہاں بظاہر یہ دونوں قانونِ قدرت

کے خلاف ہیں اور اسی لیے یقینی طور پر، ایسے نتائج سامنے آتے ہیں جو لاحاصل ہونے سے بھی زیادہ خراب ہوتے ہیں۔ خوف، بلاشبہ ان لوازمات کا ایک اہم حصہ ہے جو آدمی کو ورثے میں ملے ہیں۔ ان موروثی خطرات سے حفاظت کی خاطر، آدمی نے اپنے اردگرد کئی ایک دیواریں اٹھا رکھی ہیں اور ان دیواروں کے اندر اور بعض دفعہ ان دیواروں کی غیر موجودگی میں بھی، آدمی نے ایک ایسی نئی جرات کا مظاہرہ کیا ہے جو جانوروں میں نہیں پائی جاتی۔ مگر خوف کے لیے آدمی کے میلان طبع کی جڑیں اتنی گہری ہیں کہ ہمیشہ دکھائی نہیں دکھاتیں، سوائے اس کے بعض اوقات تو معقول وجہ کی بنا پر اور بعض مرتبہ وبائی خوف و ہراس کے دوران اس کی جھلکیاں ملتی ہیں۔

یورپ میں ایک بار خوف و ہراس کی ایک وبا، جادوگری کی وجہ سے چلی تھی اور پوری تین صدیوں تک یورپی زندگی، اس عجیب و غریب اور دردناک خوف کے غلبے کے دوران، بدحواسیوں کا شکار رہی۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ یوں تو دنیا بھر میں، کسی نہ کسی حد تک جادوٹونے پر یقین کیا جاتا ہے مگر، وحشی اقوام کے سروں پر بھی اس طرح کا بے پناہ جنون کم ہی دیکھنے میں آیا تھا، حالاں کہ تیرھویں صدی کے آخر تک، یورپ میں اس طرح کی کوئی بات پائی نہیں جاتی تھی اس سلسلے میں، کلیسا (جو ایک ادارے کے طور پر، آسیبیات کی حد تک خاصا اہم ہے)، کا رویہ خاصا بے اعتقادی کا اور مقابلتاً رواداری کا تھا۔ مثال کے طور پر، اس وقت کے پاپائے روم نے 'ہولی آفس' کو، نام نہاد چڑیلوں کو سزا دینے کے مسئلے کو اپنے دائرۂ اختیار میں لینے سے روک دیا تھا۔ یہ تبدیلی تو آنے والی صدی میں آئی اور پندرھویں صدی کی ابتدا میں، ایک پاپائی فرمان کے بعد تو چڑیلوں کی حرکتوں پر مبنی دہشت ناک کہانیاں معاشرے کے ہر طبقے میں سنی جانے لگیں۔ پندرھویں صدی کے آخر میں کولون میں شائع ہونے والی مشہور کتاب 'میلئس میلی فیکرم' (Malleus Malelicarum) میں جادوگری کے تمام تر نظریے کی تدوین اور تفصیل پیش کی گئی اور اس طرح اس المیے کے لیے اسٹیج مہیا کر دیا گیا ہے، کم و بیش ایک ہی صورت میں، تمام عیسائی ممالک میں پیش کیا جاتا تھا۔ اس تمام تر نظریے کی تشکیل دینیاتی اور قانونی ماہرین کے دماغوں میں ہوتی اور ہدف بننے والیوں کو اس وقت تک ایذا دی جاتی جب تک وہ مصنفین کے خیالات کے مطابق 'اعترافات' نہ کر لیتیں۔ حالاں کہ ایسے روشن خیال لوگ موجود تھے، جو کسی نہ کسی حد تک یہ جانتے تھے کہ یہ عجوبہ کیوں پیش آیا ہے مگر، بہرحال اٹھارویں صدی اور اس کے بعد تک، جادوگری کو بعض اوقات ایک مخدوش مسئلہ سمجھا جاتا تھا۔

اٹھارویں صدی میں جوں ہی، جادوگری کا غلبہ ختم ہوا، ایک اور غلبے یعنی عریانی کے غلبے نے اس کی جگہ لے لی جس کا منبع حیرت انگیز طور پر وہی تھا، یعنی ٹیڑھے میڑھے مذہبی خیالات۔ لگتا تھا کہ خوف کی اس ماقبل انسانی پیاس کو اپنے لیے کچھ نہ کچھ چاہیے تھا اور اس لیے جب جادوگری اپنی دہشت

تاکیاں کھو چکی تو عریانی کا یہ نیا سیاہ کارانہ ظلم اس کے لیے اسی طرح کام آیا۔ اس معاملے میں، تیرھویں صدی کے چڑیلوں کے متلاشی، یقیناً آج کی عریانی کے متلاشیوں کے نصف ثانی ہیں۔ چڑیل کے گرد خیرہ کن ہالہ واقعتاً نقصان دہ اثرات کا باعث ہوا کرتا تھا، بالکل اسی طرح جس طرح اب ہم عریانی کے گرد کشش کا ایک ایسا ہالہ تیار کرتے ہیں جس سے اسے وہ تاثیر ملتی ہے جو بصورتِ دیگر اس کے پاس نہیں ہوتی۔ جادوگری، عریانی کی طرح، چڑیلوں کے متلاشیوں کے وہم کی پیداوار نہیں ہوا کرتی تھی۔ مگر جب تک وہ اپنی اصلیت میں ہوا کرتی، قانون یا غوطہ خور کی چوکی اسے چھو نہیں سکتے تھے۔ وہ ایک معقول حد تک بھلمنسائی اور مہذب اثرات کے تحت، بے ضرر ہو جایا کرتی تھی۔

عین اس وقت جب کہ سائنس اور تہذیب کی نشوونما اس حد تک پہنچ چکی تھی کہ ہم جادوگری کے بارے میں کوئی صحیح اندازہ لگا سکیں، چڑیلوں کے خلاف کارروائیوں کی خوں خواری اپنی انتہا کو پہنچ گئی۔ یہی بات آج ہم عریانی کے بارے میں کہہ سکتے ہیں۔ قدیم جنسی ممانعتیں دم توڑنے لگی ہیں۔ جنس کے بارے میں اب ہم حقائق کو اس درجہ کی ذہانت اور ایک ایسے بے تکلفانہ انداز میں دیکھنے لگے ہیں کہ صرف چوتھائی صدی پہلے یہ بات ممکن نظر نہیں آتی اور یہی نئی دیانت داری اور خلوص، چڑیلوں کے متلاشیوں کی اولاد کے تعزیری پاگل پن کو بھڑکاتے ہیں۔ تاہم وہ جرم، جسے ہم انگریزی قانون میں 'قابلِ مواخذہ تقصیر' کے نام سے پکارتے ہیں، جب تک جادوگری کے جرم کی طرح ختم نہیں ہو جاتا، کسی تہذیب وتمدن کی بات کرنا بے کار ہے۔

لگتا ہے کہ عریانی کے خلاف موجودہ جنون اور چڑیلوں کے خلاف ماضی کے جنون میں پائی جانے والی گہری مشابہت کی طرف سب سے پہلے، تھیوڈار شروڈر نے اپنی ۱۹۱۱ء میں چھپنے والی کتاب "ObsceneLiterature and Constitutional Law" میں اشارہ کیا تھا اور جس پر کئی بار رائے زنی بھی ہو چکی ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ شروڈر تو سرے سے اس بات کو تسلیم ہی نہیں کرتا کہ جادوگری اور عریانی میں کوئی حقیقت بھی ہے۔ مگر جیسا کہ ہم نے دیکھا، ہمیں اتنی دور جانے کی ضرورت بھی نہیں۔ اس لیے کہ ڈائن میں بھی، ہمیں اکثر اوقات ایک فطری اور کم وبیش مریضانہ عنصر ملتا ہے اور یہ بھی بالکل بجا ہے کہ عریانی کو عام طور پر، فطری حقیقت کا ایک خفیہ پہلو سمجھا جائے۔ مگر ان ہر دو معاملات میں، وہ رجحان جس کے ذریعے ان کی صراحت وضاحت کی گئی ہے اور جس طرح انھیں بے حرمت اور غیر قانونی وجودوں کے طور پر ڈھالا جاتا ہے تاکہ انھیں سزائیں دلوانے کی خاطر عدالتوں تک گھیرا جا سکے، یہ وہ رجحان ہے جو غیر فطری بھی ہے اور بلا جواز بھی۔ جب اس قسم کے بدمزاج، اختراعی ذہنوں پر جنون سوار نہ ہو تو، جادوگری اور عریانی کا، اگر ان دونوں میں کوئی معروضی حقیقت پائی جاتی ہے تب بھی، اُن کا صحیح مقام عدالتوں کے باہر ہے۔

اور آج یہ نظر آنا شروع ہو گیا ہے۔ عریانی کے قانونی تصور کو بے معنویت کی ان چکرا دینے والی بلندیوں تک لے جایا گیا کہ وہ ایک بھرپور قہقہے کے دوران اب لڑکھڑاتے ہوئے نیچے آرہا ہے۔ آفتابی شعاعوں کے فوائد کی نئی معلومات، لباس کے سلسلے میں نئی عادات اور نسوانی حیا کی نئی روایات نے انسانی بدن کے بارے میں ہماری بصیرت کو بدل کر رکھ دیا ہے، جب کہ جنگِ عظیم جو بیسویں صدی کا اہم ترین سانحہ ہے، اس کی ہولناکیوں کے سامنے، وکٹوریائی دیوان خانے کی بناوٹی شرم و حیا پر مبنی قول و فعل مضحکہ خیز لگنے لگے ہیں۔ اٹھارویں صدی کی نوجوان نسل نے ایک نئی فلسفیانہ روشن خیالی سے مستفید ہو کر اتنا کچھ سیکھ لیا تھا کہ اسے چڑیلوں کے خوف سے نجات مل گئی تھی۔ ہماری اپنی صدی کی نوجوان نسل نے اپنی جدید روشن خیالی سے اتنا کچھ سیکھ لیا ہے کہ وہ عریانی سے خوف زدہ نہیں۔ گو کہ ہماری نسل کی روحانی تاریخ کی یہ واردات، جادوگری سے مقابلتاً مختصر ہے، پھر بھی خاصی سنگین ہے اس لیے کہ اس نے قول و فعل کے دونوں میدانوں میں یکساں طور پر، فن کی آزادی کو اپاہج کیا اور بدترین قسم کی سماجی اور انفرادی سرگرمیوں کی راہ میں رکاوٹ پیدا کی اور ابھی اس کے دن باقی ہیں۔ عریانی پر انسانی روح کی آخری فتح ابھی ہونی ہے اور اس کا فیصلہ ہمارے ہاتھوں میں ہے۔

ماخذ (انگریزی-3)

ادب میں عریانی

کلیم الدین احمد

ادب میں عریانی کوئی نئی چیز نہیں، کوئی بُری چیز بھی نہیں اُس کی اچھائی یا بُرائی کا انحصار اس بات پر ہے کہ آرٹسٹ اس سے کیا کام لیتا ہے!

میں نے کہا ہے کہ عریانی کوئی نئی چیز اور کوئی بُری چیز بھی نہیں۔ ایک ڈی ایچ لارنس ہی کو لیجیے۔ اُس کے ناولوں میں بہت زیادہ عریانی موجود ہے لیکن ہوس پرستی نہیں۔ اُس کا ایک نظریہ ہے، ایک فلسفہ ہے، ایک مذہب ہے۔ اور یہ عریانی اُس نظریے، فلسفے یا مذہب کے بیان میں اُس کی مدد کرتی ہے اور اُسے باثر بناتی ہے۔

ماخذ (اُردو۔۴)

ادب میں عریانی اور فحاشی

عندلیب شادانی

بظاہر عریانی اور فحاشی کا مفہوم ہم میں سے ہر شخص سمجھتا ہے لیکن اگر وہ سنجیدگی کے ساتھ غور کرے تو اسے اندازہ ہو جائے گا کہ عریانی اور فحاشی کے متعلق اس کا تصور غیر مبہم اور قطعی نہیں۔ پھر یہ تصور جیسا کچھ بھی ہے ہم سب کے درمیان مشترک بھی نہیں۔ فحاشی کی ایسی جامع مانع، قطعی، صریح، واضح اور غیر مبہم تعریف کہیں نہیں ملتی جس کی موجودگی میں فحاشی کے مفہوم کے متعلق کسی اشتباہ کی گنجائش باقی نہ رہے۔ لغت کی کتابوں میں فحاشی کے معنی عموماً اس طرح بیان کیے گئے ہیں کہ اس کے مترادف اور کئی لفظ دیے گئے ہیں لیکن ان مترادف الفاظ سے بھی فحاشی کا مفہوم قطعیت کے ساتھ متعین نہیں ہوتا۔

فحاشی قانوناً جرم ہے، مگر آپ کو یہ سن کر تعجب ہوگا کہ برطانیہ، امریکا اور ہندوستان یا پاکستان کے ضابطۂ فوجداری میں کہیں بھی فحاشی کی تعریف درج نہیں البتہ ان ممالک میں فحش کتابوں کے خلاف مقدمات چلائے گئے اور ججوں نے جو رائیں دی ہیں ان کی روشنی میں ایک بڑی حد تک فحاشی کا مفہوم متعین کیا جا سکتا ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ اس مفہوم میں تغیر و تبدل ہوتا رہا ہے، جس کی تفصیل میں آگے چل کر بیان کروں گا لیکن بنیادی طور پر ججوں کی رایوں کا خلاصہ یہ ہے کہ جو تحریر شہوانی اور سفلی جذبات کو برانگیختہ کرتی ہے، وہ فحش ہے۔

فحاشی کی اس اجمالی تعریف کے بعد میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ عریانی اور فحاشی کے درمیان کیا رشتہ ہے۔ میرے نزدیک عریانی کو تین درجوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ پہلے درجے میں عریانی نہ جرم ہے نہ گناہ۔ مذہب، اخلاق، قانون، کسی نے بھی اسے مکروہ یا ممنوع یا مردود قرار نہیں دیا۔ یہ عریانی صرف معصوم ہی نہیں بلکہ بعض حالات میں ناگزیر ہو جاتی ہے۔ ننھے بچوں کی برہنگی جو نوعیت رکھتی ہے اور اسے جس طرح سے دیکھا جاتا ہے، وہ کسی تشریح کی محتاج نہیں۔ تبدیلی لباس نیز غسل کے موقعے پر اکثر لوگ تمام کپڑے اتار دیتے ہیں۔ علاج کی غرض سے معالج کے سامنے مرد یا عورت کسی کی برہنگی معیوب نہیں۔ اس کے علاوہ انسانوں کی اور بھی ایسی کتنی ضرورتیں ہیں جن کی بنا پر مخصوص شرائط کے

ساتھ مذہب، اخلاق اور قانون نے برہنگی کو جائز قرار دیا ہے۔ یہ عریانی کا پہلا درجہ ہے۔ بحث میں سہولت کے خیال سے میں اسے عریانی کے بجائے برہنگی کہوں گا لیکن قیود اور حدود کو توڑ کر جب برہنگی آگے بڑھتی ہے تو برائی کی سرحدیں شروع ہو جاتی ہیں۔ یہ عریانی کا دوسرا درجہ ہے اس درجے میں عریانی کو شراب سے تشبیہ دی جاسکتی ہے۔

جس طرح شراب صحتِ جسمانی کے لیے مضر ہے، اسی طرح اس درجے میں پہنچنے کے بعد عریانی روحانی صحت کے لیے مضر ہے۔ جو لوگ روح کے قائل نہیں ان کے نزدیک غالباً یہ کلمہ یعنی روحانی صحت بے معنی ہوگا۔ وہ اسے ذہنی اور اخلاقی صحت سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ جس طرح شراب کی قسمیں ہیں کہ ان میں سے کوئی ہلکی، کوئی تیز اور کوئی بہت تیز ہوتی ہے۔ مثلاً بیئر کہ بعض لوگ تو اسے شراب ہی نہیں سمجھتے کیوں کہ اس کا نشہ برائے نام ہوتا ہے اور اس کے بعد شیری اور شیمپین کہ وہ بھی بہت ہلکی شرابیں ہیں اور اسی لیے عموماً خواتین کے لیے مخصوص ہیں۔ اور ان کے بعد وہسکی اور برانڈی جن کا نشہ بہت تیز ہوتا ہے، اس کے بعد رم اور ہمارا دیسی ٹھرا جو ایک طرف پینے والے کے ہوش و حواس کھو دیتا ہے اور دوسری طرف پھیپھڑوں کو شدید نقصان پہنچاتا ہے۔ شراب کا ایک لازمی جز 'الکحل' ہے جس کی مقدار مختلف شرابوں میں کم و بیش ہوتی ہے اور اسی مقدار کی مناسبت سے صحت کے لیے ان کی مضرت بھی کم و بیش ہوتی ہیں لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ مضرت تھوڑی یا بہت بر حال میں ہے ٹھیک یہی حال عریانی کا بھی ہے۔ اس کے مختلف مدارج ہیں بعض حالتوں میں اس کی مضرت کم، بعض میں زیادہ اور بعض میں بہت زیادہ ہوتی ہے۔

تیسرے درجے میں پہنچنے کے بعد عریانی صرف مضر ہی نہیں رہتی بلکہ مہلک بن جاتی ہے۔

اب اسے زہرِ قاتل سے تشبیہ دے سکتے ہیں۔ یوں تو افیون بھی زہر ہے، سنکھیا بھی زہر ہے اور پوٹاشیم سائنائڈ بھی زہر ہے لیکن فرق یہ ہے کہ افیون دیر میں ہلاک کرتی ہے، سنکھیا اس کے مقابلے میں بہت جلد اور پوٹاشیم سائنائڈ آنِ واحد میں۔ اسی طرح یہ عریانی انسان کی اخلاقی اور روحانی موت کا باعث ہوتی ہے۔ تیسرے درجے میں پہنچنے کے بعد جب عریانی زہر کی خاصیت اختیار کر لیتی ہے تو فحاشی بن جاتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ عریانی نیز فحاشی کے مختلف مدارج کے درمیان ایسی حدِ فاصل قائم کرنا جو قطعیت کا درجہ رکھتی ہو، بہت دشوار ہے۔ بایں ہمہ، جس طرح شراب اور زہر کے درمیان فرق کیا جاسکتا ہے اسی طرح عریانی اور فحاشی کے درمیان بھی فرق کیا جاسکتا ہے۔

عریانی اور فحاشی کے متعلق میں نے ابھی جو کچھ کہا وہ اپنی سوسائٹی کے اس خواندہ اور تعلیم یافتہ طبقے کو پیشِ نظر رکھ کر کہا ہے جس تک مغربی آزادی کی ہوا اور نئی تہذیب کی روشنی ابھی کم پہنچی ہے، جو ابھی تک اپنی دیرینہ روایات کو سینے سے لگائے ہوئے ہے اور انھی روایات کی بنا پر اس نے اپنی عملی

سرگرمیوں کے لیے کچھ حدود و قیود مقرر کر رکھی ہیں اور وہ اس حصار سے باہر نہیں نکل سکتا۔ ساتھ ہی اس کی اقتصادی حالت بھی ایسی نہیں کہ وہ زندگی کی جملہ مرغوبات، خصوصاً جنسی خواہشات و جذبات کی تسکین کا خاطر خواہ سامان آسانی سے فراہم کر سکے۔ ورنہ ہم میں سے جو لوگ مغربی تہذیب کو اپنا چکے ہیں اور اس کی لائی ہوئی تمام اچھی اور بری چیزوں سے واقف اور مانوس ہیں اور تعلیم یافتہ ہونے کے ساتھ ساتھ اتنی استطاعت بھی رکھتے ہیں کہ جنسی خواہشات کی آسودگی اور جنسی جذبات کی تسکین کا سامان بہ سہولت کر سکیں، ان کے لیے اس قسم کی عریانی اور فحاشی جس کی بنا پر سعادت حسن منٹو اور عصمت چغتائی کے افسانوں پر مقدمے چلائے گئے کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔ جس قسم کے عملی تجربات انھیں زندگی میں ہر روز ہوتے رہتے ہیں، کتابوں میں ان کا تذکرہ ان کے لیے کسی خاص تاثر کا سبب نہیں بن سکتا۔

ہمارے ملک میں چوں کہ انگریزوں کی حکومت تھی اور ہائی کورٹ کے جج عموماً انگریز ہی ہوا کرتے تھے اس لیے اکثر امور میں انگلستان کے ججوں کی رائے ہمارے یہاں کے ججوں کے لیے نظیر کا کام دیتی تھی۔ ۱۸۸۳ء میں ولایت کے لارڈ چیف جسٹس کاک برن نے ایک مقدمے کے سلسلے میں یہ رائے دی تھی کہ کسی کتاب کو فحش قرار دینے کے لیے یہ دیکھنا ضروری ہے کہ جس مواد پر فحش ہونے کا الزام آیا ہے اس میں 'ان کے اخلاق بگاڑنے اور انھیں بدراہ کرنے کی ترغیب موجود ہے یا نہیں جو اس طرح کے مخرّبِ اخلاق اثرات قبول کر سکتے ہیں اور جن تک وہ کتاب پہنچ سکتی ہے' بالکل ممکن ہے کہ کتاب نہایت نیک اور قابلِ تحسین مقصد سے لکھی گئی ہو مگر اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اگر کوئی کتاب فحش ہے تو وہ بہر حال فحش ہے، لکھنے والے کی نیت سے کوئی بحث نہیں اور کسی قابلِ تحسین مقصد کو حاصل کرنے کے لیے بھی قانون شکنی کی اجازت کسی کو نہیں دی جا سکتی۔

زمانہ دراز تک لارڈ کاک برن کے مقرر کیے ہوئے اس معیار کے مطابق فیصلے ہوتے رہے۔ چناں چہ مسٹر جسٹس بنیر جی نے جو الہ آباد ہائی کورٹ کے جج تھے ۸ر جولائی ۱۹۰۵ء کو 'عطرِ قرآن' نامی کتاب کے متعلق اپنے فیصلے میں لکھا کہ 'اگر کسی کتاب کا مطالعہ کرنے والوں پر ایسا اثر پڑے کہ ان کے اخلاق خراب ہوں تو اس بات کو قطعاً نظر انداز کر دینا پڑے گا کہ لکھنے والے کا مقصد کیا ہے'۔

الہ آباد ہائی کورٹ کے مسٹر جسٹس اسٹریٹ نے ۳ر جون ۱۸۸۱ء کو 'حملہ ہند' نامی ایک کتاب کے متعلق اپنے فیصلے میں لکھا کہ میں اس بات کو ماننے کے لیے تیار نہیں کہ کسی کتاب کو اس لیے فحش قرار نہیں دیا جا سکتا کہ اس میں صرف ایک ہی ٹکڑا فحش ہے۔ اس اصول کو اگر تسلیم کر لیا جائے تو اس کا منطقی نتیجہ یہی نکلے گا کہ گندے سے گندی اور فحش سے فحش چیزیں کسی کتاب میں شائع کی جا سکتی ہیں بشرطے کہ انھیں ایک حدِ معینہ کے اندر محدود کر دیا جائے۔ میں اس رائے سے شدید اختلاف کرتا ہوں، میری

رائے میں ’حملہ ہند‘ کے صفحہ ۹۴ پر جو عبارت ہے وہ کتاب کو فحش قرار دینے کے لیے بالکل کافی ہے اور اس کی بنا پر ملزم پر مقدمہ چلایا جا سکتا ہے۔‘

ان فیصلوں سے دو باتیں واضح ہو گئیں۔ ایک تو یہ کہ لکھنے والے کی نیت زیر بحث نہیں آ سکتی، صرف الزام زدہ مواد کی نوعیت کو دیکھنا ہوگا۔ دوسرے یہ کہ کوئی کتاب کسی ایک فحش ٹکڑے کی بنیاد پر بھی فحش قرار دی جا سکتی ہے۔ ۱۹ویں صدی کے آخر میں بوکیچو کی ’ڈیکا میرون‘ کے متعلق مساچوسٹ کے جج نے فیصلہ دیتے ہوئے کہا تھا: ’چوں کہ یہ کتاب جو ادب کے طلبا میں اچھی طرح مشہور ہے، چھاپے کی ایجاد سے بہت پہلے لکھی گئی تھی ایسے زمانے میں جب کہ جہالت عام تھی جس کی بنا پر بہت ہی کم لوگ اس کو پڑھ سکتے تھے تو ظاہر ہے کہ لکھنے والے کا مقصد یہ نہ تھا کہ اس کے ذریعے نوجوانوں کے اخلاق بگاڑے جائیں۔‘

مساچوسٹ کی عدالت نے اس مقدمے کے ضمن میں فحاشی کے متعلق ایک نیا قدم اٹھایا گیا۔ انگلستان کے ججوں کی رائے میں مصنف کی نیت کی بنا پر کسی کتاب کو فحش یا غیر فحش قرار نہیں دیا جا سکتا۔ مساچوسٹ کی عدالت نے اس مقدمے میں مصنف کی نیت اور مقصد کا بھی جائزہ لیا اور اس سلسلے میں دلچسپ بات یہ ہے کہ ابھی چند مہینے ہوئے، ولٹ شائر کے مجسٹریٹ نے یہ حکم صادر کیا کہ ’ڈیکا میرون‘ ضائع کر دی جائے کیوں کہ یہ فحش کتاب ہے۔ لیکن اپیل کورٹ نے اس فیصلے کو مسترد کر دیا۔ اطالوی مصنف بوکیچو نے یہ کتاب چودھویں صدی عیسوی میں لکھی تھی۔ فلورنس میں پلیگ پھیلا تھا، کچھ درباری امرا پلیگ سے بچنے کے لیے فلورنس سے بھاگ گئے۔ انھوں نے وقت گزاری کے لیے ایک دوسرے کو کچھ کہانیاں سنائی تھیں یہ کتاب انھیں کہانیوں کا مجموعہ ہے اور کلاسکس میں شمار کی جاتی ہے اور برطانیہ کی اکثر لائبریریوں میں موجود ہے۔

آپ نے دیکھا کہ انگریز ججوں اور ان کے پیرو ہندوستانی ججوں کی رائے میں مصنف کی نیت کو نظر انداز کر دیا گیا لیکن امریکی ججوں نے مقصد اور ارادے کو پیش نظر رکھنا ضروری خیال کیا۔ کاساتوا کی کی ’ہوم کمنگ‘ اپنے پاس رکھنے کے جرم میں ایک شخص کو سزا ہوئی۔ جج واگنر نے عدالتِ ماتحت کے فیصلے کو بحال رکھتے ہوئے بڑے پُرزور الفاظ میں یہ رائے دی کہ زبان کا حسن، خیالات کی خوبی، طرز بیان کی دلکشی، حتیٰ کہ مصنف کی عظمت و شہرت یہ تمام چیزیں ایک ادبی نقاد کے لیے بہت اہم ہو سکتی ہیں لیکن ان تمام خوبیوں کے موجود ہوتے ہوئے بھی یہ ممکن ہے کہ کوئی کتاب اس قابل نہ ہو کہ عامۃ الناس کو اس کے مطالعے کا موقع دیا جائے۔ ریڈکلف ہال کے ناول ’ویل آف لونلی نیس‘ کے ادبی محاسن مسلم ہیں پھر بھی عدالت نے اس کتاب کو فحش قرار دیا تھا لیکن رفتہ رفتہ اس معیار میں تبدیلی ہوئی اور اس امر کی جانچ ضروری ٹھہری کہ جس کتاب پر فحش ہونے کا الزام ہے اس کی ادبی حیثیت کیا ہے!

عام طور پر نیو یارک کی عدالتوں نے کسی کتاب کو فحش قرار دینے کا یہی معیار پیش نظر رکھا ہے کہ نوعمروں پر بحیثیت مجموعی اس کتاب کا کیا اثر ہوگا۔ لیکن ۱۹۳۴ء میں جیمس جوئس کے ناول 'یولی سس' کے مقدمے میں فیڈرل کورٹ نے جو فیصلہ صادر کیا تھا اس کا نیو یارک کی ماتحت عدالتوں پر بہت اثر پڑا کیونکہ روایتی معیار سے قطع نظر کرکے انھوں نے صرف اسی چیز کو فحش قرار دیا جو عیاشی اور بدچلنی کی ترغیب دیتی ہو۔ وہ کتابیں جو صحیح معنوں میں ادب پارے کہلانے کی مستحق ہیں، انھیں اس مد سے خارج کردیا۔ کوئی کتاب صحیح معنی میں ادب پارہ ہے یا نہیں، اس کا معیار یہ چیزیں قرار پائیں کہ عامۃ الناس نے اس کی پذیرائی کس طرح کی، نقادوں اور ادیبوں نے اسے کس نظر سے دیکھا، وہ کس حد تک صداقت پر مبنی ہے اور آیا اس میں کسی سماج کی یا کرداروں کی یا کسی خاص دور کی صحیح عکاسی کی گئی ہے اور جن ٹکڑوں پر فحش ہونے کا الزام ہے، ان کا کتاب کے بنیادی موضوع سے کیا تعلق ہے! اور اس امر کو بھی پیش نظر رکھا گیا کہ عامۃ الناس کو اس کے مطالعے سے جو فائدہ پہنچے گا وہ اس نقصان کے مقابلے میں جو تھوڑے لوگوں کو پہنچ سکتا ہے، زیادہ ہے یا نہیں!

جسٹس پرل مین نے اس مقدمے کے ضمن میں یہ بھی کہا تھا کہ عدالت کو یہ دیکھنا چاہیے کہ اس افسانے کا مطالعہ کرنے والے بالغوں کی اکثریت پر کیا اثر ہوا نہ کہ نوعمروں اور جذباتی طور پر ناپختہ کاروں نے اس سے کیا اثر لیا۔ اگر اس افسانے کے مطالعے سے کچھ لوگوں کو ایسی مفید باتیں معلوم ہوجاتی ہیں جن سے انھیں اپنے بعض سماجی مسائل کی دشواریوں کے حل کرنے میں مدد مل سکتی ہے تو ناپختہ نوعمر کو اس سے جو نقصان پہنچنے کا امکان ہے، وہ نظر انداز کردینے کے قابل ہے۔ میرے نزدیک جسٹس پرل مین کا یہ معیار معقول اور قابل قبول ہے، لیکن جب ہم اردو کی کسی کتاب کے متعلق یہ فیصلہ کرنے لگیں کہ آیا وہ فحش ہے یا نہیں تو مندرجہ بالا امور کے علاوہ ہمیں یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ یہ کتاب یورپ یا امریکا کے عوام کے لیے نہیں لکھی گئی ہے۔ مختلف اسباب کی بنا پر ہمارے خواندہ عوام ابھی ذہنی ارتقا کی اس منزل تک نہیں پہنچے جہاں یورپ اور امریکا کے خواندہ عوام پہنچ چکے ہیں۔ پھر ہمارے سماجی اور تمدنی حالات بھی یورپ اور امریکا کے سماجی اور تمدنی حالات سے بہت مختلف ہیں۔ فحاشی کے معیار کا تعین کسی سوسائٹی کے مخصوص عقائد و خیالات اور حالات کو پیش نظر رکھنے کے بعد ہی کیا جاسکتا ہے۔ اگر فحاشی کو روکنے کا مقصد یہ ہے کہ عامۃ الناس کی اخلاقی حالت بگڑنے نہ پائے تو عامۃ الناس کے طبعی رجحانات کا لحاظ رکھنا نہایت ضروری ہے۔

یورپ اور امریکا کی مثال ہمارے کام نہیں آسکتی۔ ایک طرف ہماری عورتیں ہیں جو گھر کی چار دیواری سے باہر نہیں نکل سکتیں اور اگر نکلیں بھی تو کم سے کم برقع پہننا اور منہ ڈھانکنا ان کے لیے ضروری ہے اور دوسری طرف یورپ اور امریکا کی وہ عورتیں جو زندگی کے ہر شعبے میں مردوں کے دوش

بدوش کام کرتی ہیں۔ ان دونوں سے ایک ہی قسم کے اثرات قبول کرنے کی توقع رکھنا انصاف نہیں۔ تھوڑے سے اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگوں کو چھوڑ کر ہمارے ملک میں مردوں کی ذہنیت بھی ایک خاص نوعیت رکھتی ہے جو ہمارے مخصوص سماجی حالات کا نتیجہ ہے اور اس مخصوص ذہنیت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ہمارے ادیبوں، شاعروں، آرٹسٹوں اور نفسیات کے ماہروں میں بے شک یہ صلاحیت موجود ہے کہ وہ کسی افسانے میں ادبی اور فنی محاسن دیکھ سکتے ہیں اور نفسیات کے ان لطیف نکتوں تک پہنچ سکتے ہیں جنھیں مصنف نے برتا ہے، لیکن عام لوگ یہ نقطۂ نظر کہاں سے لائیں۔ جن کی نظر صرف سطح پر پڑتی ہے، وہ صرف سامنے کی چیزیں دیکھ سکتے ہیں اور اسی سے اثر لیتے ہیں اس لیے ہمیں اپنے مخصوص سماجی ماحول، لوگوں کے عقائد و خیالات، ان کے ذہنی میلانات، ان کی دیرینہ روایات، ان کی ذہنی سطح اور کسی خاص لٹریچر سے متاثر ہونے کی صلاحیت کو پیشِ نظر رکھنا نہایت ضروری ہے ورنہ نظریاتی حیثیت سے ہمارا فیصلہ درست ہوتے ہوئے بھی عملی حیثیت سے غلط ثابت ہوگا۔

اس ضمن میں سعادت حسن منٹو کے ان افسانوں کا ذکر بے محل نہ ہوگا جن پر فحش ہونے کے الزام میں مقدمے چلائے گئے۔ ان افسانوں میں سے ایک افسانہ 'ٹھنڈا گوشت' بھی ہے۔ سعادت حسن منٹو نے یہ افسانہ اپنے عزیز دوست احمد ندیم قاسمی کی خاطر سے 'نقوش' کے لیے لکھا تھا لیکن قاسمی صاحب نے اس افسانے کو پڑھنے کے بعد اسے 'نقوش' میں شائع کرنے سے انکار کر دیا۔ اس کے بعد اس افسانے کو 'ادبِ لطیف' میں شائع کرنے کی کوشش کی گئی مگر یہ کوشش بھی ناکام رہی۔ اس کے بعد یہ افسانہ 'نیا دور' میں چھاپنے کے لیے ممتاز شیریں صاحبہ کے پاس بھیجا گیا۔ پڑھنے کے بعد انھوں نے بھی اسے واپس کر دیا۔ پھر جب یہ افسانہ 'جاوید' میں شائع ہوا اور اس کی بنا پر رسالہ ضبط ہو گیا تو پاکستان ٹائمز کے دفتر میں ایڈوائزری بورڈ کی ایک میٹنگ ہوئی۔ 'زمیندار' کے ایڈیٹر مولانا اختر علی، 'نوائے وقت' کے ایڈیٹر حمید نظامی، 'سفینہ' کے ایڈیٹر وقار انبالوی، 'جدید نظام' کے ایڈیٹر امین الدین صحرائی اور پریس برانچ کے انچارج چوہدری محمد حسین نے متفقہ طور پر اس افسانے کو ملعون و مردود قرار دیا۔ پھر مقدمے کے دوران میں مولانا تاجور نجیب آبادی، سید ضیا الدین احمد مترجم پریس برانچ پنجاب گورنمنٹ، آغا شورش کاشمیری ایڈیٹر 'چٹان' اور ابوسعید بزمی 'احسان' لاہور نے بھی اس افسانے کو فحش قرار دیا۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ 'نقوش'، 'ادبِ لطیف' اور 'نیا دور' کے ایڈیٹروں نے 'ٹھنڈا گوشت' کو شائع کرنے سے کیوں انکار کر دیا حالاں کہ وہ خود اس افسانے کو پسند کرتے تھے اور سعادت حسن منٹو کے احباب میں سے تھے؟ وجہ ظاہر ہے کہ وہ حکومت کے احتساب سے ڈرتے تھے۔ حکومت کو سعادت حسن منٹو سے کوئی عداوت نہ تھی لیکن اسے عامۃ الناس کی ذہنی سطح کو سامنے رکھ کر اس افسانے کے فحش ہونے یا نہ ہونے کا فیصلہ کرنا تھا۔ مولانا اختر علی، مسٹر حمید نظامی، مسٹر وقار انبالوی، مسٹر امین الدین

صحرائی، چوہدری محمد حسین، مولانا تاجور نجیب آبادی، سید ضیاالدین احمد، شورش کاشمیری اور مسٹر ابوسعید بزمی بھی سعادت حسن منٹو کے دشمن نہ تھے اور انھوں نے جو اس افسانے کو مردود قرار دیا تو اس کا سبب ذاتی عداوت ہرگز نہ تھی بلکہ ان کے پیشِ نظر یہ امر تھا کہ عام پڑھنے والوں کی اکثریت پر اس افسانے کا کیا اثر ہوگا۔ جن لوگوں نے اس مقدمے میں سعادت حسن منٹو کی حمایت کی، ان میں سے کسی نے اسے 'ادب پارہ' کہہ کر فحاشی کے الزام سے بچانا چاہا، کسی نے اُسے نفسیاتی مسائل کی روشنی میں دیکھا۔ میں یہ نہیں کہتا کہ یہ نقطہ سراسر غلط ہے لیکن یہ ظاہر ہے کہ ہمارے عام پڑھنے والوں کی اکثریت افسانے کی اُن ادبی اور نفسیاتی محاسن کو نہیں دیکھ سکتی جو سید عابد علی عابد، مسٹر احمد سعید پروفیسر نفسیات، ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم، فیض احمد فیض، صوفی غلام مصطفیٰ تبسم، پروفیسر کپور اور مسٹر عبدالرحمٰن چغتائی کے پیشِ نظر تھے۔

اس ضمن میں یہ بات لطف سے خالی نہیں کہ ان بزرگوں نے 'ٹھنڈا گوشت' کی حمایت میں اپنی طرف سے کچھ نہیں کہا بلکہ انھیں دلیلوں کو دہرا دیا جو اس قسم کے مقدمات میں نیویارک کی عدالتوں میں پیش کی جا چکی تھیں اور مزے کی بات یہ ہے کہ جج صاحب نے بھی اپنے فیصلے میں ملزم کو بری کرنے کے لیے وہی دلائل اختیار کیے جو نیویارک کے ججوں نے ایسے مقدموں میں پیش کیے تھے۔ اس سلسلے میں ایک اور اہم بات قابلِ ذکر ہے۔ میں نے ایسے بہت سے مقدمات کی روداد پڑھی ہے جو انگلستان، امریکا اور پاکستان میں عریانی و فحاشی کے الزام کی بنا پر کتابوں کے خلاف چلائے گئے۔ دو چار کیسز کو چھوڑ کر باقی سب میں یہ بات مشترک ہے کہ ابتدائی عدالت نے کتاب کو فحش قرار دے کر مصنف یا ناشر یا دونوں کو سزا دے دی، لیکن عدالتِ بالا نے عدالت ماتحت کے فیصلے کو مسترد کر کے ملزمین کو بری کر دیا اور کتاب کا فحش ہونا تسلیم نہیں کیا۔

قدرتاً یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ عدالتِ ماتحت اور عدالت بالا کے فیصلوں میں یہ تضاد کیوں پیدا ہوا! کیا ابتدائی عدالت کے مجسٹریٹ مسئلے کو سمجھنے کی صلاحیت نہیں رکھتے تھے؟ کیا وہ فحش اور غیر فحش میں امتیاز نہیں کر سکتے تھے؟ کیا انھیں مصنف کے ساتھ کوئی ذاتی پرخاش تھی؟ کسی ایک خاص کیس میں تو یہ صورتیں ممکن ہو سکتی ہیں لیکن یہ بات کسی طرح سے بھی قابلِ تسلیم نہیں کہ ابتدائی عدالت کا ہر مجسٹریٹ کم علم، نا اہل، نالائق اور مصنف کا دشمن تھا اور اس نے انصاف نہیں کیا۔ درحقیقت ایسی کوئی بات نہیں۔ عدالتِ ماتحت اور عدالتِ بالا کے فیصلوں میں یہ تضاد اس لیے پیدا ہوا کہ ججوں کے نقطۂ نظر میں اختلاف تھا۔ عدالتِ ماتحت نے عوام الناس کی ذہنی سطح کو سامنے رکھ کر فیصلہ کیا اور عدالتِ بالا نے خواص کے نقطہ نظر سے دیکھا اور کتاب کو ادبی اور فنی معیار سے جانچا اور نفسیات کی روشنی میں اس کے حُسن و قبح کو پرکھا۔ اسی لیے وہ ایک ایسے نتیجے پر پہنچی جو عدالتِ ماتحت کے فیصلے سے مختلف تھا۔ یہ ایک جداگانہ سوال ہے کہ سوسائٹی کی عام بہبود و فلاح کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے کون سا نقطہ قابلِ ترجیح ہے؟

ادب میں عریانی و فحاشی کوئی نئی بات نہیں۔ دنیا میں کسی بھی زبان کا ادب کسی زمانے میں بھی ان ناشائستہ عناصر سے پاک نہیں رہا اور اردو ادب کے چمنستان میں تو یہ گندا نالا شروع ہی سے بہہ نکلا تھا یہاں تک کہ دہلی سے لکھنو پہنچتے پہنچتے یہ ایک دریائے ذخار بن گیا۔ ہر صاحب کمال نے اپنی بساط بھر کھل کھیلنے کی کوشش کی اور یہ کوشش اکثر کامیاب رہی۔ عریانی کا یہ میلان ہمارے ادب میں صرف نظم تک محدود نہیں رہا بلکہ نثر کا بھی وہی حال ہے چناں چہ ہماری مشہور طلسمی اور دوسری داستانوں سے عریاں لٹریچر کا اچھا خاصا مواد فراہم کیا جا سکتا ہے۔

یہ عریانی کچھ ہمارے ادب کے لیے مخصوص نہیں، عربی اور فارسی کا بھی یہی حال ہے اور انگریزی بھی کسی سے پیچھے نہیں رہی۔ ۱۸۸۸ء میں وزے ٹیلی نے زولا کے ناولوں کا انگریزی ایڈیشن شائع کیا تو اس پر فحش کتابیں شائع کرنے کا جرم عائد کیا گیا اور بالآخر اسے اس جرم کی سزا میں جیل جانا پڑا۔ مقدمے کے دوران وزے ٹیلی نے انگلش کلاسکس کا ایک انتخاب مرتب کیا تھا یہ دکھانے کے لیے کہ اگر زولا کے ناولوں کو قانونی طور پر ممنوع قرار دیا گیا تو منطقی طور پر انگریزی ادب کی بہترین تصانیف کو بھی اس مد سے خارج نہیں کیا جا سکتا کیوں کہ ان میں بھی اس قسم کا فحش مواد موجود ہے۔ 'وزے ٹیلی نے یہ انتخاب شیکسپیئر، بیومون، فلیچر، سُوِیفٹ، بین جان سن، جوہن فورڈ، آٹووے، وچرلے، کونگریو، ڈفو، فی لڈنگ، سمولیٹ، سٹرنے، روزیٹی، کیریو، ڈرائڈن، بائرن اور سُوِن برن کی تصانیف سے مرتب کیا تھا۔ اس سلسلے میں سر جسٹس جیمز فٹز جیمز اسٹیفن جج آف دی ہائی کورٹ 'لندن' کے یہ ریمارکس توجہ کے قابل ہیں کہ 'یورپ کے تمام بہترین اور نامور مصنفین کی تصانیف کے بعض حصے ایسے ہیں جو لازمی طور پر کم و بیش فحش قرار دیے جا سکتے ہیں اور جن کے جواز میں کوئی دلیل بھی پیش نہیں کی جا سکتی۔ میں نہیں سمجھ سکتا کہ ان کتابوں کی اشاعت کیوں کر روا رکھی جا سکتی ہے سوائے اس کے کہ یہ مان لیا جائے کہ مجموعی طور پر مشاہیر ادب کے کارنامے عامۃ الناس کے فائدے کی چیز ہیں اس لیے انھیں جوں کا توں شائع کیا جائے تا کہ ان کے ذریعے ہم لکھنے والوں کے کردار کا نیز ان کے زمانے کا زیادہ سے زیادہ صحیح اندازہ لگا سکیں۔'

یہاں قدرتی طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر فحش کتابوں کی روک تھام اس لیے کی جاتی ہے کہ عامۃ الناس کے اخلاق بگڑنے نہ پائیں تو کیا کلاسکس کے مطالعے سے لوگوں کے اخلاق پر برا اثر نہیں پڑتا اور جس زمانے میں یہ چیزیں لکھی گئی تھیں، کیا اس زمانے کے لوگوں کی اخلاقی حالت ہمارے زمانے کے لوگوں کی اخلاقی حالت کے مقابلے میں پست تھی! میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ کلاسکس کے

مطالعے سے عموماً لوگوں کے اخلاق پر ایسا مضر اثر نہیں پڑتا جو قابلِ لحاظ ہو نہ ہم سے پہلی نسلوں کے اخلاق ہمارے اخلاق کے مقابلے میں پست تھے۔ بات یہ ہے کہ ہر زمانے میں ہر سوسائٹی میں انسان کی زندگی میں کچھ ایسے عوامل کارفرما رہے ہیں جن کا اثر اسے بدراہ کرنے میں کتابوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ ہے۔

کتابوں کو فحش قرار دیتے وقت یہ نفسیاتی نکتہ پیشِ نظر نہیں رکھا جاتا کہ کسی قوی عامل اور محرک کے مقابلے میں اس سے بہت کمزور عامل اور محرک کا اثر کوئی حیثیت نہیں رکھتا، جو شخص ٹھرّا پینے کا عادی ہے اسے بیئر سے کیا نشہ ہوگا! ہماری سوسائٹی کے جن طبقوں میں نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کو آزادی کے ساتھ باہم ملنے جلنے کی اجازت نہیں اُن کے لیے صرف اتنی ہی بات شورشِ جذبات کا سبب بن سکتی ہے کہ اچانک انھیں آزادی کے ساتھ ملنے کا موقع مل جائے۔ یہی وجہ ہے کہ اس طبقے کے نوجوان جب تعلیم کی غرض سے ولایت جاتے ہیں اور ان تمام چیزوں کو سہل الحصول پاتے ہیں جن تک رسائی ان کے وہم وگمان میں بھی نہ تھی تو ان چیزوں پر دیوانہ وار گرتے ہیں۔ بہت چھوٹی باتیں جن کے وہ عادی نہیں ہوتے، ان کے جذبات میں آگ لگا دیتی ہیں لیکن ان چیزوں اور انھیں باتوں سے یورپ کے نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں پر کسی قسم کا کوئی خاص اثر نہیں ہوتا کیوں کہ یہ باتیں ان کے معمولاتِ زندگی میں شامل ہو چکی ہیں اور ان کے لیے کوئی اہمیت نہیں رکھتیں۔ جن نوجوان لڑکیوں پر جوان لڑکوں کے ساتھ ڈانس کرنے کا اس سے زیادہ اثر نہیں ہوتا جتنا ایک دوسرے کے ساتھ ٹینس کھیلنے کا ہوتا ہے، ان پر کلاسیکس کے مطالعے کا برا اثر کیا پڑ سکتا ہے!

جذبات کو شدت سے برانگیختہ کرنے والے بہت سے حالات، بہت سے مشاغل، بہت سے محرکات ایسے ہیں جن سے ہم ہر روز بلکہ ہر وقت دوچار رہتے ہیں۔ اس شدید نشے کے عادی ہو چکنے کے بعد ہمارے لیے ان کتابوں کی حیثیت ہی کیا رہ جاتی ہے جن کے بعض ٹکڑے عریانی اور فحاشی کی زد میں آتے ہیں! پہلے بھی ایسا ہی ہوتا تھا اور آج بھی ایسا ہی ہوتا ہے۔ کتابوں کے علاوہ جذبات میں آگ لگانے والے مشاغل و عوامل کی نہ پہلے کمی تھی نہ آج ہے۔ ان کے مقابلے میں ناولوں اور افسانوں کی اثر انگیزی کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتی۔ کوئی پچیس برس ہوئے، نیویارک سٹی کے بیورو آف سوشل ہائیجین نے کالج کی دس ہزار گریجویٹ عورتوں کے پاس ایک سوال نامہ بھیجا تھا۔ بارہ سو جواب موصول ہوئے۔ ان میں سے صرف بہتر (۷۲) نے یہ لکھا کہ جنسی معلومات انھیں کتابوں سے حاصل ہوئیں لیکن کسی نے گندی کتاب کا ذکر نہیں کیا بلکہ بائبل، ڈکشنری، انسائیکلو پیڈیا، مشاہیر کے ناولوں، شیکسپیئر کے ڈراموں اور طبی کتابوں وغیرہ کے نام لیے تھے۔

اس سوال کے جواب میں کہ کون سی چیزیں سب سے زیادہ ان کے جنسی جذبات کی تحریک کا باعث ہوئیں، چار سو نو جواب دینے والیوں میں سے نو نے کہا کہ موسیقی، اٹھارہ نے کہا کہ تصویریں، انتیس نے کہا کہ ڈانس، چالیس نے کہا کہ ڈراما، پچانوے نے کہا کہ کتابیں اور دو سو اٹھارہ نے کہا کہ مرد۔ ان اعداد و شمار کی بنا پر کوئی قطعی فیصلہ بے شک نہیں کیا جا سکتا لیکن اس بات کا کسی حد تک ضرور اندازہ ہو جاتا ہے کہ لوگوں کو بدراہ کرنے میں کتابوں کا اتنا حصہ نہیں جتنا اور دوسرے عوامل کا ہے۔ ان دوسرے عوامل کی تفصیل میں غیر ضروری سمجھتا ہوں کیوں کہ وہ سب ہماری آنکھوں کے سامنے ہیں اور ان کے اثرات بھی ہم سے پوشیدہ نہیں۔ اس سے میرا یہ مقصد نہیں کہ میں فحش کتابوں کی اشاعت کا حامی ہوں بلکہ صرف یہ بتانا چاہتا ہوں کہ ایسی کتابوں کو جس حد تک مضر سمجھا جاتا ہے، عملی طور پر وہ اتنی مضر ہرگز ثابت نہیں ہوتیں۔ اگر یہ بات نہ ہوتی تو آج مشاہیر ادب کی اکثر تصانیف ہمیں جلا دینی پڑتیں۔

زمانہ بہت کچھ بدل چکا ہے اور تیزی کے ساتھ بدلتا جا رہا ہے۔ ہمیں لڑکپن میں نوجوان لڑکوں خصوصاً نوجوان لڑکیوں کو ناول پڑھنے کی عادت نہ تھی۔ احتیاط کرنے والے تو یہ بھی پسند نہیں کرتے تھے کہ ان کی لڑکیاں تفسیر سورۂ یوسف کا مطالعہ کریں۔ والدین اپنی بچیوں کو اسکول بھیجنے سے اس لیے ڈرتے تھے کہ اسکول کی تعلیم اور ماحول سے ان کے چال چلن کے بگڑ جانے کا اندیشہ تھا۔ آج یہ باتیں آپ کو مضحکہ خیز معلوم ہوں گی لیکن آج سے چالیس پچاس سال پہلے ہم میں سے اکثر لوگ یہی عقیدہ رکھتے تھے۔ آج ہم صرف ان افسانوں اور ناولوں کو قابل اعتراض سمجھتے ہیں جن کے بعض حصوں پر عریانی اور فحاشی کا الزام لگایا جاتا ہے مگر کل تک عبدالحلیم شرر کے بے ضرر ناول بھی اس قابل نہیں سمجھے جاتے تھے کہ کنواری لڑکیوں کو ان کے مطالعے کی اجازت دی جائے۔

ہماری سوسائٹی کے موجودہ ماحول اور رجحانات کو پیش نظر رکھتے ہوئے ایسی کتابوں پر پابندی لگانا جن کا مقصد فی الواقع فواحش کی تشہیر و اشاعت نہیں، فواحش کو روکنے کا کوئی کامیاب ذریعہ نہیں۔ اس لیے ہمیں فواحش کے بنیادی اسباب کا پتا لگا کر ان کا سدِّ باب کرنا چاہیے۔ کہا جا سکتا ہے کہ اگر ہر شخص صرف اسی امر کو پیشِ نظر رکھے کہ عوام الناس کس بات سے کیا اثر ڈالیں گے اور نئے خیالات کو پھیلنے کا موقع نہ دیا جائے تو سوسائٹی جامد ہو کر رہ جائے گی اور ترقی کی راہیں مسدود ہو جائیں گی۔ میرا مقصد ہرگز یہ نہیں کہ نئے خیالات کی اشاعت نہ کی جائے لیکن یہ خواہش کہ جو کچھ ہونا ہے آج ہی ہو جائے، دیوانگی سے کم نہیں۔ انتہا پسندی کبھی مفید نتائج پیدا نہیں کر سکتی اس لیے آہستہ اور تدریجاً آگے بڑھنا چاہیے ورنہ انقلاب یا تجدد کا اثر اُلٹا ہوگا۔

ہمیں آرٹ کی حمایت کی ذہن میں اس حقیقت کو کبھی فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ ہماری موجودہ سوسائٹی میں آرٹ کی حیثیت اس سے زیادہ نہیں کہ وہ ہماری اخلاق اقدار کے اظہار کا واسطہ ہے۔ حالؔی کا کمال فن یہی ہے کہ وہ اس کے ذریعے ہماری عظمت رفتہ کا ذکر کر کے ہمیں اپنے کردار اور اخلاق کی اصلاح پر آمادہ کریں اور ہمارے دلوں میں ترقی کی لگن پیدا کریں۔ اکبرؔ کا آرٹ اسی میں ہے کہ وہ اپنے طنز کے تیروں سے نئی تہذیب کا سینہ چھلنی کر دیں اور اپنی پرانی اقدار کی حفاظت کریں اور اقبالؔ کا کمال اسی میں ہے کہ وہ اپنی بہترین شاعرانہ صلاحیتوں کو اسلامی تعلیمات کے احیا کا ذریعہ بنائیں۔ اس لیے ہمارے ادیبوں اور فن کاروں میں صرف وہی لوگ آرٹ کا سہارا لے کر ناگفتنی باتیں کہہ سکتے ہیں جو اپنی موجودہ سوسائٹی کے نقطۂ نظر سے اخلاق اور آرٹ کے باہمی رشتے کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔

ماخذ (اُردو ـ ۳۲)

ادب وفن میں فحش کا مسئلہ

محمد حسن عسکری

پچھلے مہینے اپنی باتوں کے سلسلے میں فراق صاحب کے چند اشعار لیے تھے جنھیں عام طور پر فحش سمجھا جاتا ہے اور بتایا تھا کہ وہ کیوں فحش نہیں ہیں۔ ہر بحث میں اور خصوصاً اس فحش نگاری کی بحث میں کلیئے قائم کرنے اور مطلق اصولوں پر جھگڑنے سے کہیں بہتر یہ ہے کہ ٹھوس مثالیں لے کر ان کے حسن وقبح پر غور کیا جائے اور سطح کے نیچے جا کر محض لغوی مطلب کے علاوہ انھیں معنی کی دوسری قسموں (ارادہ، مزاج، لہجہ وغیرہ) کی روشنی میں بھی دیکھا جائے۔ بحث کو صاف اور واضح کرنے کے علاوہ اس میں ایک عام تعلیمی اور تہذیبی فائدہ بھی ہے۔

لیکن میں اتنا خوش یقین نہیں کہ نئے ادب پر عریانی کا الزام لگانے والوں کو بھی اس مقصد سے متاثر ہوتا ہوا سمجھوں۔ ان کے فائدے کے لیے تو مجھے ایک اور ہی روایت سنانی پڑے گی۔ جے کے، وی ماں فرانسیسی فطرت نگاروں میں سے ایک تھا اور بعضوں کے نزدیک ان میں سب سے ممتاز۔ اس کے ادبی اصولوں میں سماجی مقصد نہیں بلکہ بدی کی رزمیہ لکھنا تھا۔ اس کی کتاب 'اگینسٹ دی گرین' کو جو آسکر وائلڈ کے حلقے میں پوجی جاتی تھی، شاید جنسی تخریبات کی انسائیکلوپیڈیا کہنا بجا ہوگا۔ لیکن آخر میں اُس نے توبہ کرلی تھی اور اکثر بدی کی پرستش کرنے والے مصنفوں کی طرح رومن کیتھلک ہوگیا تھا۔ اسی زمانے میں اس نے اناتول فرانس کے پاس پیغام بھیجا کہ بس اب بہت گندگی سے کھیل چکے، توبہ کرو اور سچے عیسائی بن جاؤ۔ اناتول فرانس نے بصد ادب جواب دیا۔ 'میسو وی ماں کو میرا اسلام پہنچانا اور کہنا میسیو فرانس انھیں صلاح دیتے ہیں کہ وہ اپنے قارورے کا امتحان کرائیں۔'

فراق صاحب کی طرح میں نے بھی بحث کے لیے چند مثالیں چنی ہیں۔ ان میں سے کچھ مصوری اور مجسمہ سازی سے تعلق رکھتی ہیں۔ چاہیے تو یہ تھا کہ ان پر لکیر، سطح، تناسب اور حجم کے نقطۂ نظر سے غور کیا جاتا لیکن میں ان فنون میں کورا ہوں۔ میں نے تو صرف ورق گردانی کرتے ہوئے دو چار مثالیں ایسی چھانٹ لی ہیں جنھیں فحش سمجھا گیا ہے یا بعض پاک بیں حضرات سمجھ سکتے ہیں۔ میں نے خاص طور پر مذہبی آرٹ کی مثالیں چھانٹی ہیں۔ لیکن مذہبی آرٹ پر ہم اس وقت تک انصاف کے ساتھ غور نہیں کرسکتے جب تک کہ ہم دوسروں کے احساسات کو بھی اتنا ہی قابل وقعت نہ سمجھیں جتنا کہ اپنے

معتقدات کو۔ غالباً احساسات کا درجہ معتقدات سے بلند تر ہے، کم سے کم آرٹ کی دنیا میں۔ اور مذہب ہے کیا سوائے زندگی اور کائنات کے بارے میں ایک خاص نقطۂ نظر قائم کرنے کے؟ ممکن ہے میرے مذہبی اعتقاد کی رُو سے سانپوں کو پوجنے والے حبشی کا اعتقاد غلط ہو، لیکن اگر میں ایمان دار ہوں تو اس جذبے کی گہرائی، خلوص اور بنیادی حیثیت سے انکار نہیں کر سکتا جس نے اسے سانپ پوجنے پر مجبور کیا، بلکہ ممکن ہے اس کا جذبہ میری توحید پرستی سے زیادہ پُرزور، زیادہ سچا اور روح کائنات سے رشتہ قائم کرنے میں اس کی زیادہ مدد کرتا ہو۔ شاید میری باتیں اسلام کے خلاف ہوں لیکن میرا یقین ہے کہ میں 'قرآں در زبان پہلوی' کے الفاظ دہرا رہا ہوں: 'موسیا، آداب داناں دیگر اند'۔

تو غرضے کہ ہم کسی زمانے، کسی قوم کے مذہبی آرٹ کو اس کی وجہ سے رد نہیں کر سکتے کہ اس میں ہمارے مذہبی معتقدات نہیں پائے جاتے۔ اس بنیادی اصول کو ماننے کے بعد زمانہ قبل از تاریخ اور افریقی قوموں کی نقاشی اور مصوری (جو سو فیصدی مذہبی ہے)، سے لے کر مصری، ہندو اور عیسائی مذہبی آرٹ تک دیکھ جائیے۔ پاکیزہ ترین تصویروں اور مجسموں میں بھی جنسی اعضا کو چھپانے کی کوشش نہیں کی گئی، حالاں کہ ان موقعوں پر کسی غیر اور نامناسب جذبے کی مداخلت گوارا نہیں ہو سکتی تھی۔ ایک لمحے کے لیے بھی تصور نہیں کیا جا سکتا کہ ایسے سنجیدہ موقعے پر جہاں کائنات کے متعلق صرف ایک فرد کا نہیں بلکہ پوری جماعت کا ردعمل دکھانا منظور ہو، وہاں کوئی ایسے عناصر داخل کیے گئے ہوں گے جن کا مقصد جنسی ترغیب وتحریک یا جنسی تجسس ہو۔ جہاں فنکار کی ساری روح ستائش و نیائش یا خوف و ہیبت کے جذبوں میں سمٹ آئی ہو، وہاں اسے جنسی لذت کا خیال کیسے آ سکتا ہے! اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ کوئی فن کار اپنے فن پارے کی وحدتِ تاثر اتنی آسانی سے کیسے برباد کر سکتا ہے! اور خصوصاً جب کہ وہ محض اپنے جذبات کا اظہار نہ کر رہا ہو بلکہ پوری قوم نے ایک اہم فرض اس کے سپرد کیا ہو، جہاں ذرا سی لغزش میں اسے ابدی لعنت مول لینے کا خدشہ ہو۔ ایسے مقام پر صرف ایسے لوگوں کا ذہن جنس کی طرف جا سکتا ہے جن میں جمالیاتی احساس غائب ہو یا جن کے دل سے چھچھورے اور سستے مزے کا خیال کبھی نہ جاتا ہو۔

یہ بات بھی یاد رکھنے کے لائق ہے کہ مجسموں اور تصویروں میں جنسی اعضا اس وقت چھپائے جانے شروع ہوتے ہیں جب زمانہ انحطاط پسند ہوتا ہے، جب روحانی جذبے کی شدت باقی نہیں رہتی اور خیالات بھٹکنے لگتے ہیں۔ جو فن کار ڈرتا ہے کہ وہ اپنے ناظرین کی توجہ اصلی چیز پر مرکوز نہیں رکھ سکے گا۔ پتے اس وقت ڈھکے جانے شروع ہوتے ہیں جب فن پارے کی وحدت قوم کی نظر میں باقی نہیں رہتی اور وہ اسے مختلف ٹکڑوں کا مجموعہ سمجھنے لگتی ہے۔ ان چیزوں سے قطع نظر، بعض دفعہ تھوڑا سا پردہ تصویر کو کہیں زیادہ فحش بنا دیتا ہے اور ذہن کو لامحالہ بُرے پہلوؤں کی طرف لے جاتا ہے کیوں کہ اس میں

وہی 'چوری چھپے' کی صفت پیدا ہو جاتی ہے جس کا ذکر فراقؔ صاحب نے کیا ہے۔ اس کی درخشاں مثالیں رائل اکیڈمی کی تصویریں اور مجسمے ہیں۔ جسے انجیر کا پتا استعمال کرنا پڑے وہ صرف اخلاقی حیثیت سے ہی کمزور نہیں بلکہ شاید اچھا فن کار بھی نہیں ہے۔ وہ نہیں جانتا کہ بعض اعضا کو اپنے نقش میں کس طرح بٹھائے۔ انجیر کے پتے کے پیچھے وہ عریانی نہیں چھپاتا بلکہ اپنی فنی کمزوری۔ برہنہ جسم دیکھنے اور دکھانے کے لیے بھی بڑی قوتِ مردی، بڑی سنجیدگی اور بڑے گہرے اخلاقی اور روحانی احساس کی ضرورت ہے۔

جسم اور جنسی اعضا کو پاک سمجھنا غالباً سب سے مشکل مسئلہ ہے جو انسانی روح کے سامنے آ سکتا ہے۔ جسم کو روح کے برابر پاکیزہ اور لطیف محسوس کرنا ایک ایسا مقام ہے جو فرد اور قوم دونوں کو تہذیب کی انتہائی بلندی پر ہی پہنچ کر حاصل ہوتا ہے اور یہ دنیا کے دو بڑے تمدنوں، ہندو اور یونانی کا مابہ الامتیاز ہے اور یہ دونوں آرٹ جسمانی حقیقتوں سے آنکھیں نہیں چراتے۔ یہاں میں یونانی آرٹ کی ایک خصوصیت کا ذکر کروں گا۔ یونانی آرٹ کا اصول آدرش اور مکمل ترین نمونے کی تلاش ہے۔ وہ حقیقت کو بگاڑتا ہے' اسے حسین ترین شکل میں پیش کرنے کے لیے۔ اس نے اپنی ساری توجہ عورت کے جسم پر صرف نہیں کی بلکہ ایک زمانے میں تو مرد کا جسم ہی حسن کا آدرش تھا۔ یونانی آرٹ نے دکھایا ہے کہ مرد کے اعضائے تناسل میں بھی اتنا ہی حسن، صداقت اور نیکی ہے جتنی وینس کے سینے میں۔ اگر حُسن نام ہے توازن، تناسب اور آہنگ کا اور حُسن صداقت ہے تو ان مظاہر میں بھی اتنا ہی حُسن، صداقت اور نیکی ہے جتنا اپولو کے چہرے میں۔ یہاں پھر یہ یاد رکھیے کہ یونانی آرٹ بھی بہت حد تک مذہبی ہے، خواہ اس کی پرستش کا مرکز کوئی موہوم ہستی نہیں بلکہ انسان ہیں۔ وہ الگ الگ چیزوں کے بارے میں نہیں بلکہ پوری کائنات کے متعلق ایک نقطۂ نظر کا اظہار ہے۔ یُونان کے آخری دور میں لذت پرستی آ گئی ہے لیکن شروع کا زمانہ قطعاً معصوم ہے۔

یہ نہ سمجھیے کہ تصویر میں جنسی اعضا کی شمولیت کی وجہ جواز ہے محض حقیقت نمائی کا اصول ہے، چوں کہ وہ جسم کا حصہ ہیں اس لیے دکھانا پڑتے ہیں۔ نہیں، بلکہ اگر فن کار میں صلاحیت ہے تو یہ حصے اظہار میں اس کی اتنی ہی مدد کر سکتے ہیں جتنی کوئی گہری سے گہری روحانی کیفیتیں ان کے صحیح استعمال سے زیادہ واضح کی جا سکتی ہیں۔ فن پارہ ایک وحدت ہوتا ہے۔ اس کے ہر جزو کو مرکزی جذبے کا صرف تابع ہی نہیں ہونا پڑتا بلکہ اسے اظہار اور وضاحت میں بھی معاونت کرنی پڑتی ہے اور پھر بڑا فن کار تو ذرا سے نقطے کو بھی اپنے مقصد کے لیے استعمال کرتا ہے۔ میرے سامنے افریقہ کے ایک چوبی مجسمے کی تصویر ہے جس میں زوح کا ئنات سے خوفزدہ ہونے اور ہیبت سے جم کر رہ جانے کا نقشہ کھینچا گیا ہے۔ صرف دیکھنے ہی سے پتا چل سکتا ہے کہ مڑی ہوئی متشنج رانوں کے درمیان اور باقی جسم کے تناسب سے ایک

چھوٹے سے لکڑی کے ٹکڑے نے اثر میں کیا اضافہ کر دیا ہے۔ اگوستینو دی دوچیو کی سنگ مرمر پر ابھری ہوئی تصویر ہے، 'میڈونا اور بچہ'۔ عیسیٰ کے بچپن کی جتنی تصویریں میں نے دیکھی ہیں، ان میں سے مجھے یہ سب سے زیادہ پسند ہے کیوں کہ عام طور پر مصور سارا زور تقدس پیدا کرنے پر صرف کر دیتے ہیں لیکن یہاں ایک ایسی چیز پیش کی گئی جو تقدس اور طہارت سے کہیں بلند ہے۔ یعنی بچے میں زندگی کا ابھار، زندگی کا مچلنا۔ یہ معصوم شوخی اور تبسم کی لہریں جیسی چہرے پر نمایاں ہیں بالکل ویسی ہی رانوں کی سلوٹوں میں بھی اور جس کیفیت سے جنسی اعضا دکھائے گئے ہیں وہ چہرے کی معصومیت کو کئی گنا بڑھا دیتے ہیں۔

مائیکل اینجلو کی مشہور تصویر 'تدفین' میں عیسیٰ کو بالکل برہنہ دکھایا گیا ہے کیوں کہ موت کے اثر کو جسم کے ہر حصے سے ظاہر کرنا مقصود تھا اور خصوصاً ٹانگوں سے۔ چہرے پر انتہائی سکون اور روحانیت طاری ہے۔ مصور کو یقین تھا کہ جنسی حصے عریاں کر دینے سے روحانی جمال پر کوئی برا اثر نہیں پڑے گا۔ اگر اس کا ذرا سا بھی شائبہ ہوتا تو مائیکل اینجلو جیسا مصور کبھی بھی عریانی کی خاطر عریانی پسند نہ کرتا۔ چناں چہ روبنز نے اپنی تصویر 'مردہ مسیح' میں تھوڑا سا حصہ ڈھک دیا ہے حالاں کہ یہاں چہرے پر جمال نہیں بلکہ کسی عام مصلوب لاش کا سا ہے۔ یہ پردہ اس وجہ سے کہ سر پیچھے کی طرف ڈھکا ہوا ہے۔ اگر جنسی حصے، جن کی جگہ تصویر میں آگے ہے، کھلے ہوتے تو وہ نظروں کو وہیں روک لیتے اور بازوؤں کی قوتِ اظہار میں بھی حارج ہوتے۔ یہ فیصلہ تو فن کارانہ احساس ہی کرتا ہے کہ کس جگہ عریانی موزوں ہے اور کہاں ناموزوں۔

بلیک کی تصویر 'شیطان باغی فرشتوں کو ابھار رہا ہے' میں، جنسی حصہ پیٹ کے عضلات سے مل کر ایک مثلث بناتا ہے جس کی لکیریں ٹانگوں کو اوپر کے جسم سے الگ کرتی معلوم ہوتی ہیں۔ اس فرق سے ٹانگیں ستون بن جاتی ہیں اور مضبوطی سے اپنی جگہ گڑی ہوئی معلوم ہونے لگتی ہیں اور شیطان کو تو غالباً انجیر کا پتا بجتا بھی نہیں۔ روداں کے مجسمے 'برونز ایج' پر غور کیجیے۔ یہاں انسان کے اندر فطرت کا احساس بیدار ہوتا ہوا دکھایا گیا ہے یہ احساس پیروں سے سر تک چڑھتا چلا گیا ہے اور جذبے کی شدت سے آدمی کی ہاتھ اوپر اٹھ گئے ہیں۔ کپڑے پہنا کر تو خیر یہ خیال ظاہر ہو ہی نہیں سکتا تھا اور اگر ہوتا بھی تو قوی اور صحت ور نہ ہوتا۔ لیکن اگر بیچ میں ذرا سی دھجی ہوتی تو یہ فائدہ ضرور تھا کہ نیک لوگوں کو اسے دیکھ کر آنکھیں نیچی نہ کرنی پڑتیں مگر لائنوں کا تسلسل ٹوٹ جاتا۔ نظر بیچ میں اٹک جاتی اور ساتھ ہی اس احساس کی روانی بھی وہیں ٹوٹ جاتی اور مجسمے میں بے اختیاری اور از خود رفتگی نہ رہتی جو اب ہے۔ اب تو شدید تاثر اور ہم آہنگی کا یہ عالم ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ سارا جسم سن ہو گیا ہے اور سارا احساس کھنچ کر سر اور بندھی ہوئی مٹھی میں آ گیا ہے۔ گویا روح ایک نقطے پر یکا یک جل اٹھی ہے۔ یہاں جنسی اعضا کی سکون پذیری کیا اثر پیدا کرتی ہے؟ شاید جسم اور روح کا فرق مٹ جاتا ہے۔

عریانی کی وجہ سے ایپسٹائن جیسا مطعون و مردود رہا ہے وہ تو بجائے خود ایک داستان ہے۔ اس نے اسٹرینڈ، کی ایک عمارت کے لیے عورت اور مرد کی زندگیوں کے مختلف مدارج کے مجسمے بنائے تھے اور اپنی ساری معصومیت اور طہارتِ قلب صرف کر دی تھی۔ وہ دراصل مرد اور عورت کے تعلقات کے مثالی نمونے تھے اور نیا نشانہ جذبے سے پُر۔ مگر شریف عورتوں نے وہاں صرف عیاشانہ جذبہ دیکھا اور پھر اپنی شکایتوں کے باوجود انھیں دیکھنے بھی جوق در جوق آئیں۔ اسی طرح اس کے مجسمے 'پیدائش' کو بھی فحش اور گندا کہا گیا، لیکن پھر 'وینس دی مدیچی' کو فحش کیوں نہیں کہا جاتا؟ غالباً اس وجہ سے کہ اس کے پستان بہت شہوت انگیز ہوتے ہیں اور ایپسٹائن کا مجسمہ لوگوں کے لیے محض وحشت انگیز تھا۔ رائل اکیڈمی تو چوں کہ نارنگیوں اور سنگتروں کی روایت تازہ کرتی رہتی ہے اس لیے اس کے کارناموں سے ماؤں، بہنوں، بیٹیوں کو کوئی خطرہ نہیں، لیکن محض ایک پھولا ہوا پیٹ اور بدنما پستان دکھا کر ایپسٹائن اخلاق کا دشمن بن گیا تھا۔ حالاں کہ یہاں وہ جنسیت کی بنیادوں تک پہنچ گیا ہے۔ بعض نے تو یہاں تک کہہ دیا ہے کہ یہ کوئی حاملہ نہیں بلکہ دھرتی ماتا ہے۔ اسے دیکھنے کے بعد احساس ہوتا ہے کہ جنس کی اہمیت و عظمت کیا ہے۔

ایپسٹائن ہی کا مجسمہ ہے 'آدم' جسے دیکھ کر خاتونوں کے ہاتھوں سے عینکیں گر گر پڑی ہیں اور جس کے بارے میں کہا گیا ہے کہ مجسمہ ایک آدمی نے نہیں بنایا بلکہ پوری نسلِ انسانی نے۔ لیکن نسلِ انسانی نے بھی حیا سوزی کی انتہا کر دی ہے کہ آدمی کے ابوالآبا کے جسم میں خیزش دکھائی ہے۔ اول تو آدم کے بارے میں یہ بدگمانی اور پھر اس کیفیت میں، چھی چھی!!! لیکن اس مجسمے کے لیے مبالغہ آمیز اسم صفت گنوانے کی بجائے میں اس جسارت کی فنی اہمیت دریافت کرنے کی کوشش کروں گا۔ یونانی اور دوسرے قدیم مجسمہ ساز حرکت دکھاتے ہوں یا نہ دکھاتے ہوں مگر جس دن سے لیسینگ نے فتویٰ دیا ہے کہ مجسمہ حرکت کا اظہار نہیں کر سکتا، صرف سکون کا یا حرکت کو ایک جگہ ٹھہرا کر اس کا مجسمہ بنایا جا سکتا ہے اس دن سے مجسمہ ساز اس قانون کی خلاف ورزی کرتے ہوئے ڈرتے ہیں۔ اس روایت کو توڑنے کے لیے رودین نے چلتے پھرتے آدمیوں کے مجسمے بنائے ہیں لیکن نئے مجسمہ ساز مثلاً ایپسٹائن یا ہنری مور اُس مادّے کا بہت احترام کرتے ہیں جس سے وہ مجسمہ بنا رہے ہوں۔ چناں چہ یہ لوگ پتھر کو وہ شکلیں اختیار کرنے پر مجبور نہیں کرتے جو گوشت و پوست سے مخصوص ہیں۔ حرکت کے اظہار کے لیے وہ پتھر کے اندر سے حرکت پیدا کرتے ہیں۔ اسے اوپر سے توڑتے مروڑتے نہیں۔ اس مجسمہ میں ایپسٹائن کو انسان کی ترقی کرتے رہنے کی لگن اور مشکلوں سے مقابلے کی جرات دکھانی تھی لیکن اس نے آدم کو بھاگتا ہوا نہیں دکھایا بلکہ ہاتھ تک بدن سے جڑے ہوئے ہیں۔ مجسمے کے اندر ایک ایسی اینٹھن، ایک ایسا ابھار اور قوت پیدا کی گئی کہ معلوم ہوتا ہے کہ آدمی زمین سے اُٹھ کر اوپر کھنچا چلا جا رہا ہے اور اس میں اپنی انتہائی طاقت

صرف کر رہا ہے۔ خود سوچ لیجیے، کہ وہ تھوڑی سی بدتمیزی کیا نشو و نما پاتی ہے۔ یہاں اس طرف بھی اشارہ ہے کہ جنس انسان کی ترقی میں رکاوٹ نہیں بلکہ مددگار ہے اور اس کی پرورش بھی اتنی ہی ضروری ہے جتنی ذہنی اور روحانی صلاحیتوں کی۔

ہاں، ایک سب سے زیادہ مذہبی زمانے کو تو میں بھولا ہی جا رہا تھا یعنی یورپ کا عہد وسطیٰ۔ اس زمانہ کی جنسی حقیقت پسندی اور ظرافت کی عریانی تو مشہور ہی ہے لیکن یہ چیزیں مذہبی ڈراموں تک میں داخل ہو گئی تھیں۔ یہ ڈرامے محض تفریح طبع کا ذریعہ نہیں تھے بلکہ ایک قسم کی عبادت لیکن ان میں بھی کھلے کھلے جنسی اشارے معیوب نہیں سمجھے جاتے تھے۔ نوح اور ان کی بیوی اسی ٹھاٹھ سے لڑتے تھے جیسے کوئی اور میاں بیوی اور نوح کی بیوی کی زبان کی کسی عام عورت سے پاک تر نہیں خیال کی جاتی تھی۔

عریانی سے کیا کیا کام لیے جا سکتے ہیں، دیکھنا ہو تو زولا کے یہاں چلیے۔ کسی عورت کا ذکر آ جائے تو اس کے پستانوں کا حال بیان کیے بغیر وہ مشکل ہی سے بڑھتا ہے۔ شاید کسی سائنس دان نے بھی اتنی قسمیں نہ بیان کی ہوں گی جتنی زولا نے ایک کتاب میں، لیکن یہ لذت پرستی نہیں ہے بلکہ نفسیات اور کردار نگاری ہے۔ عورت کے سلسلے میں تیس فی صدی کردار تو وہ پستانوں کے ساتھ ہی بیان کر دیتا ہے اور اس کی داستانِ حیات بھی۔ زولا کا شاہ کار 'جرمینل' ہے۔ یہ سرمایے اور محنت کی جنگ کا رزمیہ ہے اور اس کا درجہ اتنا بلند ہے کہ آندرے ژید کے خیال میں اسے فرانسیسی میں نہیں بلکہ کسی بین الاقوامی زبان میں لکھا جانا چاہیے تھا۔ مزدوروں نے بغاوت کی ہے اور وہ ہر چیز برباد کرتے پھر رہے ہیں۔ اسی جوش میں وہ ایک سوداگر کو جو اُن کی لڑکیوں کو خراب کیا کرتا تھا، مار ڈالتے ہیں اور اس کے عضو مخصوص کو کاٹ کر ایک سلاخ میں پرو لیتے ہیں۔ زولا کی ذہنی گندگی! لیکن یہ موقع نہایت سنجیدہ ہے اور یہاں اس کی گنجائش ہو ہی نہیں سکتی اور خصوصاً اُس کتاب میں جہاں زولا کھلم کھلا پرولتاری انقلاب کی حمایت کر رہا ہے! زولا گروہوں اور ہجوموں کی نفسیات کا ماہر ہے، اس میں ٹالسٹائے کے علاوہ مشکل ہی سے کوئی اس کی برابری کر سکتا ہے۔ مزدوروں کی یہ حرکت ایک مشتعل گروہ کے جنون کا آخری درجہ ہے اور نفسیات کے مالک کی طرح زولا اسے دکھانے میں نہیں جھجکا اور اسی سلسلے میں وہ متوسط درجے کے اخلاق پر اور نئی اقدار کے بڑھتے ہوئے حملے کے سامنے اس کی بے چارگی اور ریاکاری پر ایک بڑی سخت چوٹ بھی کر گیا ہے۔ جب مزدور اس حالت میں کارخانے کے منیجر کے مکان کے سامنے سے گزرتے ہیں تو اس کی بیٹی اپنے باپ (یا ماں) سے پوچھتی ہے کہ یہ کیا ہے! اسے کوئی جواب نہیں ملتا اور آخر دونوں جھینپ کر کھڑکی سے ہٹ آتے ہیں۔ نفسیات کے سلسلے میں شیکسپیئر کی مثال لیجیے۔ اس کے مزاحیہ کرداروں اور بہت سے مردوں کی زبانوں سے تو خیر بڑے تر و تازہ پھول جھڑتے ہیں لیکن یہ گمان بھی نہیں ہو سکتا کہ وہ اپنی کسی ہیروئن کو مبتذل بنا سکتا ہے اور پھر المیہ کی ہیروئن کلوپیٹرا کو اُس نے محض شہوت

پرست نہیں دکھایا بلکہ بلند نظر اور پُر جلال بھی۔ بری سے بری چیزیں بھی اس کے اندر بھلی معلوم ہونے لگتی ہیں۔ لیکن اس کی گفتگو جنسی علامتوں سے بھری پڑی ہے اور اینٹنی کے روم چلے جانے کے بعد تو یہ عنصر اور بھی بڑھ جاتا ہے اور ہر ہر بات میں اس کی جنسی بے قراری چھلکتی ہوئی نظر آتی ہے۔

کلوپیٹرا سے یہ باتیں کہلوا کر شیکسپیئر اسے شورڈچ کی رنڈی نہیں بنا رہا تھا بلکہ اس کی نفسیاتی بصیرت وہ چیز پیش کر رہی تھی جس کا تجزیہ اب آ کر فرائڈ نے کیا ہے۔ اور نہ اس سے کردار کی بلندی میں کوئی فرق پڑتا ہے بلکہ کلوپیٹرا کی انسانیت اور بڑھ جاتی ہے۔ جنسی جذبے کی شدت اس کی قربانی کو اور بھی پُر وقعت بنا دیتی ہے۔ شیکسپیئر مقابلے سے بڑے کام لیتا ہے۔ 'اوتھیلو' میں ایک طرف تو ڈیسڈی مونا کی انتہائی معصومیت اور بھولپن ہے، اس کی زبان سے لفظ رنڈی بھی نہیں نکلتا۔ دوسری طرف ایاگو کی دریدہ ذہنی ہے جو کسی وقت فحاشی سے باز نہیں آتا اور آخر اس کا اثر اوتھیلو پر بھی پڑتا ہے اور اس کے دماغ پر جنسی ہولناکیاں مسلط ہو جاتی ہیں۔ یقیناً یہ فحش برائے فحش نہیں نہ چونی والوں کی تسکین کا سامان۔ یہ شدید اور بعض وقت اعصاب زدہ فحش گوئی کی فضا جو اس ڈرامے پر چھائی ہوئی ہے، ڈیسڈی مونا کی شرافت نفس اور سادگی میں چار چاند لگا دیتی ہے اور وہ شیطانوں کے درمیان گھری ہوئی فرشتہ نظر آنے لگتی ہے۔

اس قسم کے مقابلے کو اگر پُرکاری سے استعمال کیا جائے تو وہ کیا اثر پیدا کرتا ہے، اس کی مثال میں، میں ڈے لوئیس کی ایک نظم پیش کروں گا جو انھوں نے موجودہ جنگ کے متعلق لکھی ہے۔ یہ ایک بہت چھوٹی نظم ہے، جس میں توپوں کو عضوِ تناسل سے تشبیہ دی ہے وہ دنیا کے رحم میں بربادی کا بیج بونے کے لیے تنی کھڑی ہیں۔ غالباً شاعر کی ذہنی گندگی، مگر کیا دنیا میں کوئی دوسری تشبیہ رہ ہی نہیں گئی تھی! لیکن غور کیجیے کہ جو زور اس تشبیہ سے پیدا ہوتا ہے وہ کسی اور سے ممکن نہیں تھا۔ محض تناؤ کا زور نہیں بلکہ یہاں اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ جو چیزیں انسان کے لیے رحمت ہو سکتی تھیں وہ آج لعنت بنی ہوئی ہیں۔ عضوِ تناسل افزائش اور برکت کا نشان ہے لیکن یہاں اسے بربادی کی علامت کی صورت میں پیش کیا گیا ہے۔ توپ سائنس اور علمی ترقیوں کی نمائندگی بھی کرتی ہے، ان چیزوں کا مقصد تھا کہ فطرت سے انسان کی لڑائی میں اس کی مدد کریں لیکن آج وہ خود انسان کی ہلاکت کے درپے ہیں۔ اس خیال کو کسی اور علامت کی مدد سے اتنی ہی چھوٹی نظم میں ادا کرنے کی کوشش کیجیے، لیکن یہ خیال رُہے کہ وعظ کا عنصر نہ آنے پائے جس طرح یہ نظم اس سے پاک ہے۔ تو یہ قطعاً انفرادی طور سے فن کار پر منحصر ہے کہ وہ عریانی سے کیا کام لیتا ہے۔ اور اسے پاکیزہ ترین جذبات کے اظہار کی خدمت لی جا سکتی ہے اور لی گئی ہے۔ رسکن نے کہہ رکھا ہے کہ آرٹ کا مقصد تعریف کرنا ہے لیکن ہمارے زمانے میں تعریف کرنا کوئی ایسا آسان کام نہیں ہے۔

اگر رلکے خود تعریف کر سکا ہے تو زندگی سے بھاگ کر، اپنے آپ کو مداخلت سے محفوظ کرنے کے بعد، خاص قسم کے عارفانہ اور مابعد الطبیعاتی جذبے کو اپنے اوپر طاری کر کے۔ لارنس نے تعریف کی ہے مگر زندگی کے ایک خاص مظہر کی، ایک مخصوص شعلے کی جو آدمی کو ایسے لپیٹ لیتا ہے کہ بے اختیار منہ سے تعریف نکل ہی آتی ہے لیکن عامیہ زندگی کی سطح پر اتر کر، اس کی ظاہری کیفیت کو قبول کر کے۔ ناک بھوں چڑھائے بغیر اس میں رہبانیت یا خدا کے جلوے یا کسی آفاقی اصول کی تلاش کیے بغیر، تعریف کرنا ہر آدمی کا کام نہیں ہے۔ اور پھر ہمارے زمانے میں کہ جب فرد اور سماج میں اتنی مغائرت اور مخالفت ہو لیکن جوئس نے اسی طرح تعریف کی ہے اور 'یولی سیز' کے اس حصے میں جس کی وجہ سے کتاب کو ضبط کر لیا گیا تھا۔ میرین بلوم ایک معمولی عورت ہے اور ایسی ہی شہوت پرست۔ اس میں کوئی بات بھی بلند یا پاک نہیں اور ایسی ہی ایمان داری اس کی خود کلامی میں برتی گئی ہے لیکن اس کی عریاں خیالی اسے ٹھوس بنا دیتی ہے۔ اس کا رشتہ ہماری دنیا، ہماری زمین سے مضبوط ہوتا چلا جاتا ہے اور آخر میں اس کی جنسیت زمین اور زندگی کی حمد کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ اور یہ جذبہ اتنا ہی اعلیٰ و ارفع ہے جتنا کوئی اور۔ بالکل ایسا ہی ٹھوس کردار چوسر نے اپنے 'باتھ کی خاتون' کی شکل میں پیش کیا ہے۔ دونوں عورتیں زندگی سے بے اندازہ لطف لیتی ہیں، دونوں زندہ رہنے کی بے پایاں خواہش رکھتی ہیں مگر 'باتھ کی خاتون' میں ایک بات زیادہ ہے، وہ مرنے سے بھی نہیں ڈرتی۔ زندگی نے اس کو جو کچھ دیا ہے وہ اس سے پوری طرح مطمئن ہے۔ حالاں کہ ہمارے زمانے کے کردار زندگی سے بیزار ہوتے ہوئے بھی موت اور وقت سے لرزتے ہیں۔ اپنی جوانی کے گزر جانے کے خیال سے وہ افسردہ تو ضرور ہوتی ہے مگر باقی عمر سے زیادہ فائدہ اٹھانے کی طرف متوجہ ہو جاتی ہے۔ وہ اپنی جنسیت کی مدد سے وقت پر فتح حاصل کرتی ہے۔ اس کا خیال ہے کہ خدا نے انسان کو حکم دیا ہے کہ وہ اپنی نسل کو بڑھاتا رہے۔ اسی وجہ سے وہ خدا کا شکر ادا کرتی ہے کہ اسے پانچ شوہر ملے ہیں اور وہ چھٹے کا استقبال کرنے کے لیے بھی تیار ہے۔ وہ اپنے کو عفیفہ بنا کر نہیں رکھنا چاہتی بلکہ شادی کے کاروبار میں اپنی ساری زندگی کے پھول کو پیش کرے گی وہ اصلاح ادب کانفرنس سے پوچھتی ہے:

'مجھے یہ بھی تو بتائیے کہ اعضائے تناسل بنانے کا مقصد کیا تھا! یہ لوگوں نے اپنی کتابوں میں کیوں لکھ رکھا ہے کہ مرد کو اپنی بیوی کا قرض ادا کرنا چاہیے۔ اب وہ اپنی ادائیگی کیسے کرے گا، اگر اپنا نفیس آلہ استعمال نہ کرے؟ بیوی کی حیثیت سے میں تو اپنے آلے کو ایسی ہی آزادی سے استعمال کروں گی جیسے میرے خالق نے مجھے عنایت کیا ہے۔ اگر میں روک ٹوک کروں تو مجھ پر خدا کی مار ہو۔ میرا شوہر اسے صبح و شام دونوں وقت لے سکتا ہے۔ جب اس کا دل چاہے آئے اور اپنا قرض چکائے۔ لیکن افسوس! عمر نے جو سب چیزوں میں زہر ملا دے گی، میری خوبصورتی اور میرا زور چھین لیا ہے۔ خیر،

جانے دو، چلو رخصت۔ شیطان بھی اسی کے ساتھ جائے۔ آنا تو ہو ہی چکا، اس کا کیا ذکر، اب تو جیسے بھی ممکن ہوگا مجھے بھوسی ہی پھنکنی پڑے گی لیکن اب میں بھی پوری زندہ دلی سے رہوں گی'۔ ورجینیا وُلف بڑی حسرت اور رنج کے ساتھ کہتی ہیں: 'اب یہ قہقہہ کرۂ زمین پر دوبارہ نہیں' سنا جائے گا' جو پیٹ کی تہوں سے اٹھتا تھا'

چوسر کے ایک عالم نے ان تمام حصوں کو اپنی کتاب سے نکال دیا ہے۔ اسی طرح مڈلٹن مرے' (جن کی رائے کا میں ہر جگہ بہت احترام کرتا ہوں) فرماتے ہیں کہ: 'لارنس نے 'لیڈی چیٹرلی کا عاشق' میں جو ناقابل تحریر الفاظ استعمال کیے ہیں وہ نفسِ مضمون کو کوئی فائدہ نہیں پہنچاتے، صرف گالی برائے گالی ہیں۔' شاید۔ لیکن میرا ذاتی ردِ عمل تو یہ ہے کہ ان گالیوں اور بعض عامیانہ حرکتوں کی وجہ سے میلرز اور لیڈی چیٹرلی عام انسانوں سے بہت قریب آ گئے ہیں اور یہ بات لارنس کی کتاب میں ذرا کم ہی ہوتی ہے۔ اس سے صرف کتاب کے ٹھوس پن اور انسانیت ہی میں اضافہ نہیں ہوتا بلکہ لارنس کے پیغام کی اشاعت میں بھی مدد ملتی ہے۔ اس کی حقیقت ہم سے قریب ہو جاتی ہے اور وہ ایسی چیز نہیں رہتی جس تک پہنچنے کی ہم خواہش بھی نہیں کر سکتے۔ اسی طرح بکرے اور بکری پر لارنس کی نظموں کی حقیقت نگاری، جنسی جذبے کی تندی، وحشت اور ایک حد تک مضحکہ خیزی کا اظہار ہے بلکہ اس حقیقت نگاری میں 'جنس کے پیغمبر' کی، جنس سے جھجک، ڈر اور نفرت جھلکتی ہے۔

لارنس کے ذکر سے مجھے ایک اور سوال یاد آتا ہے۔ عریانی کے معذرت خواہوں کی طرف سے بعض دفعہ فحش اور غیر فحش کا فرق بتانے کی کوشش کی گئی ہے۔ سفید رومال سے چہرہ صاف کر کے کہا جاتا ہے کہ جنس کے ذکر میں لذت کا اظہار نہ ہونا چاہیے اور نہ ترغیب کا عنصر۔ مگر مجھے اس سے اختلاف ہے کیوں کہ حقائق کو بھی اس سے اختلاف ہے، آخر لذت سے اتنی گھبراہٹ کیوں! جب ہم کسی پیڑ کو، کسی کردار کے چہرے کو، اس کے کپڑے کو، کسی سیاسی جلسے کو مزے لے لے کر بیان کر سکتے ہیں اور تنقید اسے ایک اچھی صفت سمجھ سکتی ہے تو پھر عورت کے جسم کو یا کسی جنسی فعل کو لذت کے ساتھ بیان کرنے میں کیا بنیادی نقص ہے! دراصل اس اعتراض کی بنیاد وہ روایتی احساس ہے جو جسم کے بعض حصوں اور بعض جسمانی افعال سے جھجکتا ہے اور انھیں بنفسہٖ گندہ اور پلید سمجھتا ہے اور ان کے وجود کو ابدی لعنت کا داغ۔ یہی ذہنیت جو ایک طرف تو ادب اور آرٹ پر پابندیاں عائد کر دیتی ہے، لیکن دوسری طرف لاتعداد فحش کتابوں کو جنم دیتی ہے۔ لذت بجائے خود کسی فن پارے کو مردود نہیں بنا سکتی بلکہ اس کے مقبول یا مردود ہونے کا دار و مدار ہے لذت کی قسم، اس کی سطح پر، فن کار کے مزاج اور نقطۂ نظر پر۔ کیا شیکسپیئر کی 'وینس اور ایڈونس' ٹیشین کی برہنہ عورتیں، رودین کے دو مجسمے، 'دائمی بہار' 'بوسہ' اور 'ہم آغوشی' لذت اور ترغیب سے بالکل خالی ہیں! اس سے بھی زیادہ اہم سوال یہ ہے، کیا ہم انھیں فحش کہہ کر چھوڑ سکتے ہیں!

فحش کی یہ ترغیب والی تعریف غالباً ترقی پسندوں کی طرف سے ہوئی ہے، لیکن یہ مسئلہ بہت پھیل جاتا ہے۔ فحش کے سوال سے کہیں آگے یہ فیصلہ ہو جائے کہ جنس قطعاً گندی اور غیر شریفانہ چیز ہے اس لیے اس سے لذت کا اظہار اور اس کی ترغیب بھی نامناسب ہے۔ میں ماننے کو تیار ہوں لیکن اگر تاکید جنس پر نہیں بلکہ ترغیب پر ہے تو ادب کے ذریعے سے انقلاب یا سماجی تبدیلی کی ترغیب دلانا بھی اتنی ہی نامناسب چیز ہے۔ ترغیب کا مسئلہ چھیڑ کر ترقی پسند ایک پڑوس میں جا پہنچتے ہیں جس کے سائے سے بھی وہ بھاگتے ہیں یعنی جیمز جوئس۔ جوئس کا نظریہ یہ ہے کہ جمالیاتی جذبے میں 'حرکت' نہیں ہوتی بلکہ 'قرار'۔ آرٹ نہ تو کسی چیز کی خواہش ہمارے دل میں پیدا کرتا ہے اور نہ کسی چیز سے نفرت، جو آرٹ اس اصول کا پابند ہے وہ مناسب آرٹ ہے اور جو خواہش یا نفرت پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے، غیر مناسب آرٹ ہے، خواہ وہ فحش ہو یا اخلاقیات۔ اس سلسلے میں جوئس نے وینس کے مجسمے کی مثال دی ہے۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ ہمیں وینس کی رانیں اس وجہ سے پسند آتی ہیں کہ وہ بڑا تندرست بچہ پیدا کر سکتی ہیں اور پستان اس لیے کہ ان میں بچے کو دودھ پلا کر توانا رکھنے کی بڑی صلاحیت دکھائی دیتی ہے۔ اس طرح وینس عورت اور ماں کے فرائض کا مثالی نمونہ بن جاتی ہے اور اسی وجہ سے وہ ایک بڑا فن پارہ ہے لیکن جوئس کے نزدیک یہ احساسات جمالیات کی طرف نہیں لے جاتے بلکہ علمِ اصلاحِ نسل کی طرف۔ وینس ہمیں صرف اس وجہ سے پسند آتی ہے کہ اس میں حُسن اور آہنگ ہے۔

جوئس کا یہ بیان بنیادی طور پر بہت صحیح اور کم سے کم مفید ضرور ہے مگر اس نے انتہا پسندی کی بھی حد کر دی ہے۔ شاید کوئی فوق الانسان ہوا ہو جس نے ایسا فن پارہ پیش کیا ہو یا جس کا ردِعمل اتنا جچا تلا ہو۔ کم سے کم میرے اندر تو فن پارہ ضرور حرکت پیدا کرتا ہے، حالاں کہ یہ حرکت وہ نہیں ہوتی جو فحش یا اخلاقیات سے پیدا ہوتی۔ خود جوئس کے یہاں کافی نفرت اور بیزاری پائی جاتی ہے اور میرین بلوم کا کردار کسی طرح ترغیب سے خالی نہیں اور لارنس کے یہاں ترغیب کے کیا معنی وہ تو جنسی تعلقات کے ایک عنصر کا پرچار کرتا ہی ہے، اگر کسی جگہ صحت مند مباشرت کی ترغیب پائی جائے تو میں اسے فاحشی کہنے کے لیے تیار نہیں ہوں۔ آپ فوراً اعتراض کریں گے کہ پھر تو شاید کوک شاستر بھی ادب بن گیا۔ لیکن یہاں میں فحش کو آرٹ ثابت کرنے پر اپنا زورِ قلم صرف نہیں کر رہا ہوں بلکہ صرف آرٹ کو فحش سمجھے جانے سے بچانا چاہتا ہوں۔

سوال دراصل ترغیب کا نہیں بلکہ آرٹ اور غیر آرٹ کا۔ غیر آرٹ کے لیے ایک نام تجویز کرتا ہوں، جذباتیت۔ یہ جذباتیت کسی طرح کی بھی ہو سکتی ہے۔ نفس پرستی، انقلاب پرستی، اخلاق پرستی، ساری گڑبڑ یہاں سے چلتی ہے کہ عموماً فن پارے کو بڑی سادہ چیز سمجھا جاتا ہے اور اس کی پیچیدگی کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ ہم اس کے صرف ایک رخ، ایک احساس کو لے لیتے ہیں اور اسی کو سارا فن

پارہ سمجھتے ہیں اور اسی غلط فہمی پر اپنے فیصلے کی بنیاد رکھتے ہیں۔ یہیں سے جذباتیت شروع ہوتی ہے۔ اگر یہ جذباتیت فن کار میں ہو تو وہ سرے سے فن پارہ پیدا کر ہی نہیں سکے گا۔ اسے اخلاقی وعظ بنا دے گا یا فحش۔ اور جب یہ جذباتیت پڑھنے والے یا دیکھنے والے میں ہو تو وہ اچھے خاصے فن پارے کو توڑ مروڑ کر غیر آرٹ بنا دیتی ہے مثال کے طور پر اصلاحِ ادب کانفرنس۔

اس الجھن کا ایک مخرج اور بھی ہے۔ ہماری تنقید کے نزدیک آرٹ نام ہے اپنے جذبات کے اظہار اور اسے دوسروں تک پہنچانے کا۔ یہ سن کر ہربرٹ ریڈ سے تو اپنا قہقہہ نہیں رُک سکا لیکن مجھ میں ابھی اس سے انکار کی جرات نہیں پیدا ہوئی۔ بہر حال آرٹ کوئی انجکشن کی پچکاری نہیں ہے جس کے ذریعے سے نئے نئے جذبے ہمارے اندر داخل کیے جاتے ہوں۔ زیادہ بک بک کیوں کروں، آپ ارسطو کا 'کیتھارسز' والا نظریہ جانتے ہیں۔ آرٹ میں ایک جُلابی کیفیت ہوتی ہے جو ہمارے جذبات سے زوائد کو خارج کر کے ہمارے اندر توازن اور سکون قائم کرتی ہے۔ جذباتیت اور آرٹ میں یہی فرق ہے۔ دونوں ہمارے گھٹے ہوئے جذبات کو راستہ دیتے ہیں لیکن جذباتیت میں روک نہیں ہوتی۔ وہ جذبات پر کوئی حد نہیں قائم کر سکتی۔ آرٹ جذبات کی حد بندی کرتا ہے ان کی تنظیم کرتا ہے اور انھیں ایک خاص نقش کی شکل میں ترتیب دیتا ہے۔ ٹیشین کی برہنہ تصویر دیکھنے کے بعد ہم بازار میں کود کر راستہ چلتی عورتوں کے کپڑے پھاڑنا نہیں شروع کر دیتے بلکہ اپنے جنسی جذبات میں ایک بہتر توازن اور ارتقا پاتے ہیں۔ شاید فحش سے پہلا والا اثر پیدا ہوتا ہے۔ اگر آرٹ ہمارے اندر کوئی جذبہ پیدا کرتا ہے تو وہ بقول ہربرٹ ریڈ، تحیر کا جذبہ ہے۔ اگر آرٹ صحیح قسم کا ہے اور پڑھنے والا اس سے کوئی غلط نتیجہ مرتب کرتا ہے یا اس کے اندر فاسد مادہ بھڑک اٹھتا ہے تو اس کے لیے اس فن پارے کو ملزم نہیں گردانا جا سکتا۔ آرٹ شہوت پرستی یا دنیا کے گناہوں پر زار و قطار رونا یا لال جھنڈا لے کر دو دو گز اونچے اچھلنے لگنا نہیں سکھاتا بلکہ حسن، ترتیب اور آہنگ کو تحیر کی نظروں سے دیکھنا۔

اگر موجودہ ادب میں فحش موجود ہے تو اسے ہوا بنانے کی کوئی معقول وجہ نہیں۔ اگر آپ لوگوں کو فحش کی مضرتوں سے بچانا چاہتے ہیں تو انھیں یہ سمجھنے کا موقع دیجیے کہ کیا چیز آرٹ ہے اور کیا نہیں ہے، اور آرٹ کیوں فحش، اخلاقیات، سیاست اور اقتصادیات سے بہتر اور بلند تر ہے۔ جو شخص آرٹ کے مزے سے واقف ہو جائے گا اس کے لیے فحش اپنے آپ پھسپھسا ہو کر رہ جائے گا۔ کم سے کم اپنی ذہنی تندرستی کے دوران میں تو وہ فحش کو چھونا بھی نہیں چاہے گا۔ سب سے نفیس پہچان فحش اور آرٹ کی یہی ہے کہ فحش سے دوبارہ وہی لطف نہیں لے سکتے جو پہلی مرتبہ حاصل کیا تھا۔ آرٹ ہر مرتبہ نیا لطف دیتا ہے۔ اس توازن اور ارتفاع کی مثال کے طور پر مجھے فراقؔ صاحب کا شعر یاد آتا ہے۔

ملے دیر تک، ساتھ سو بھی چکے　　　بہت وقت ہے، آؤ باتیں کریں

اردو کی جنسی شاعری میں بہت کم ایسی شعر ہوں گے جن میں یہ معصومیت، یہ ذہنی لطافت، آرٹ کا یہ تحیر پایا جاتا ہو۔ میں اس شعر کو دہرانے سے کبھی نہیں تھک سکتا۔

فن کا تناسب بذات خود ایسی چیز ہے جو گندی سے گندی بات کو بے ضرر بنا دیتا ہے اور فنون میں یہ تناسب لکیروں، رنگوں وغیرہ کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے۔ ادب میں بیانیہ انداز کے لوازمات بھی اس کی ایک قسم ہیں، مثلاً شیخ سعدی کا مشہور مصرعہ 'ہمیں بہ جملۂ اوّل عصائے شیخ بخفت' اور پھر قہقہہ تو بڑی سے بڑی غلاظت کو دھو دیتا ہے اور عقل! ایسے لوگوں کے نام یاد کیجیے جن کی عقل واقعی خوفناک قسم کی تھی اور پھر یہ غور کیجئے کہ انھوں نے کتنی عریانی برتی ہے۔ دو چار نام تو مجھ سے سنیے۔ رابیلے، چوسر، شیکسپیئر، سوئفٹ، والٹیر، جوئس۔

ماخذ (اردو۔۲۵)

بات عریانی کی

محمد حسن

آج کل ادب میں عریانی اور فحش نگاری کی باتیں اس طرح ہونے لگی ہیں جیسے بالکل نئی بات ہو۔ اگلے زمانے کے لوگ فحش ہوتے تھے اور نہ عریانی پسند، جوانی دیوانی کے جنسی تقاضوں کو قہر الٰہی اور پھوٹتے ہوئے نسوانی شباب کو اپنی عفت کا قزاق سمجھ کر اگلے زمانے کے لوگ منہ چھپے پھرتے تھے کہ کہیں موقعہ ملتے ہی ان کی آبرو ریزی نہ کر دی جائے۔ کہا جاتا ہے مغربی ادب و فنون اور معاشرتی قدروں کا جو ایک سیلاب امڈ آیا ہے، یہ سب کچھ اسی کا کیا دھرا ہے ورنہ مشرق کی عفت مآب قدروں پر ابلیسِ جنس کا کبھی سایہ بھی نہ پڑا تھا۔ اس طرح سوچنے والوں کے ساتھ ہمدردی کے سوا کچھ اور نہیں کیا جا سکتا۔ اس لیے کہ یہ علامت ہے انسان کی فطرت سے ان کی کمال لاعلمی کی۔ ہر زمانے میں انسان جنسی مسائل سے دوچار رہا ہے۔ ہر زمانے میں عریانی کو پسند کرنے والے بھی رہے ہیں اور ناپسند کرنے والے بھی۔ معاشرے میں مہذب اور غیر مہذب کی تفریق کی ایک وجہ یہ بھی رہی ہے۔

جب بھی عریانی یا فحش نگاری کی بات ہوتی ہے تو مطلب جنس ہوتا ہے۔ دیومالائی دور میں جنس کہیں کیوپڈ سائیکی بن گیا ہے، کہیں شیو پاربتی۔ جنس ایلورہ کے غار ۱۶ میں مورتیوں کی شکل میں موجود ہے۔ شیو لنگ کی پوجا فلسفہ حیات بنی ہوئی ہے۔ کہیں روما کے کھنڈرات میں مجسمے اب بھی سیاحوں کو لطیف جنسی احساسات سے سرشار کر دیتے ہیں۔ جنس کے بغیر انسان زندگی کا مکمل لطف اٹھا ہی نہیں سکتا۔

قبل از اسلام جو کچھ ہوا اس کی بات سردست نہیں کروں گا، لیکن اس کے بعد کیا ہوا دلچسپی سے خالی نہیں۔ الف لیلیٰ کی داستان سراسر جنسیت سے تعلق رکھتی ہے۔ اولاً ان کہانیوں کے وجود میں آنے کا سبب ہی جنس تھا۔ ہر رات ایک نئی عورت کے ساتھ لذت گزاری کے بعد صبح سویرے اس کو قتل کروا دینا جنس کے معاملے میں مردوں کی خود غرضی کا ثبوت تو ہے ہی، عورتوں کی بے اعتباری کا چیختا، چنگھاڑتا اعتراف بھی۔ ایک ایک حکمراں کے حرم میں سینکڑوں کیا، ہزاروں عورتوں کا محض ایک مرد کے تصرف کے لیے رکھ دیا جانا خالص جنس کی بات ہے۔ ایسی انتہا پسندیوں کو معمول کے خلاف سمجھنے کے بعد بھی اصل غور کرنے کی چیز یہ ہے کہ کسی کا یہ کہنا کہ انسان جنس کی بھرپور لذت کے بغیر بھی معمول کے مطابق زندگی گزار سکتا ہے، غلط ہے۔ اور یہ بھی کہ متشرع زندگی گزارنے والے زن و شوئی تعلقات میں

یقینی طور پر جنس کی بھرپور لذت نہیں اٹھاتے، محض افزائش نسل کو برقرار رکھنے کی فطری مجبوری کو انتہائی ادب اور سلیقہ شعاری سے منہ پھیر کر طوعاً و کرہاً بھگت لیتے ہیں، سراسر جھوٹ ہے۔ بنیادی طور پر تمام حیوانی اور انسانی مخلوق کی فطرت میں جنس کوٹ کوٹ کے بھر دی گئی ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ اس معاملے میں انسان حیوانوں سے بھی بدتر ہوتا ہے۔

اصل بات یہ ہے کہ آج کل جس طرح کھل کر عام طور سے جنس کی باتیں لذتیت کے انداز میں ہونے لگی ہیں وہ صحیح ہے یا غلط، اس نقطۂ نظر سے بات کی جائے تو کوئی مفید نتیجہ نکل سکتا ہے۔ اگر عریانی نقصان دہ ہے تو بری ہے، اگر نہیں تو واویلہ تضیعِ اوقات کے سوا کچھ بھی نہیں۔ میں اس بات کو نظر انداز نہیں کر سکتا کہ عریانی کے معنی ہی نقصان رساں جنسیات کے ہیں۔ تو پھر ایسی صورت میں صرف جنس کی بات ہونی چاہیے، لیکن خیر۔

عریاں ادب صرف دو عمر کے لوگوں میں زیادہ مقبول ہے۔ جوانی کی دہلیز پر قدم رکھنے والوں میں اور بڈھوں میں۔ بڈھوں میں یا تو اس لیے مقبول ہوتا ہے کہ ـــ

گو ہاتھ میں جنبش نہیں آنکھوں میں دم تو ہے   رہنے دو ابھی ساغر و مینا میرے آگے!

یا پھر احساسِ جنس کے لیے بطور آلہ محرک، لیکن پھر بھی بڈھوں پر فحش نگاری کا کوئی خاص اثر ہوتا ہے اور نہ عریاں ادب سے کوئی نقصان۔ صرف ذہن لطف اٹھاتا ہے، اعضا بے سدھ ہی رہتے ہیں۔ ان کی عمریں نفع نقصان کی منزلوں سے گزر چکی ہوتی ہیں۔ چناں چہ اصل مسئلہ وہ گروہ ہے جو عنفوان شباب کے دور میں ہوتا ہے، جس پر چڑھتی جوانی کا خمار ہر وقت سوار رہتا ہے۔ عریانی ان کے جذبات بھڑکاتی ہے، ان کی آرزوئیں ابال کھانے لگتی ہیں۔ اگر ان کے برانگیختہ جذبات کی نکاس کے مواقع مل جاتے ہیں تو ان کا بھی کچھ نقصان نہیں ہوتا لیکن اگر نکاس کے مواقع نہ ملیں اور بار بار ناکامی سے دوچار ہونا پڑے تو نفسیاتی ردعمل بڑا خطرناک ہوتا ہے۔ اس لئے عریاں اور فحش ادب انھی کے لیے خطرناک ہوتا ہے۔ اصل مسئلہ انھی کی ذہنی تربیت کا ہے اس لیے کہ قوم کیا' انسانیت کا مستقبل نئی پود پر منحصر ہے۔ معاشرہ اچھی نئی پود تیار کرنے میں کامیاب ہے تو انسانیت بھی محفوظ و مامون ہے، ورنہ اتھاہ اندھیرے کے سوا کچھ بھی نہیں۔

عریانی یا فحش نگاری ہے کیا! اس کے پرکھنے کا معیار ہر قوم و ملت میں قریب قریب ایک سا ہے۔ اگر کوئی یہ سمجھے بیٹھا ہے کہ مسلمانوں کی اخلاقیات دوسروں کے مقابلے میں ارفع و اعلیٰ ہیں تو یہ اس کا حُسن ظن ہے۔ میں کتابوں میں لکھی باتوں یا جزدانوں ہیں محفوظ اقدار کا ذکر نہیں کر رہا، روزمرہ کی زندگی کی بات کر رہا ہوں۔ وہی باتیں اور اعمال جو ہم آپ روزانہ دیکھتے ہیں، ہمارے بزرگ دیکھتے ہوئے گزر گئے، اور جو تاریخ کی کتابوں میں بھی محفوظ و مدون ہوتے جا رہے ہیں۔ لیکن

انسان کی زندگی کے معاشرتی حالات، احساسات پوری شدت کے ساتھ محفوظ نہیں ہو پاتے، یہ تو شب و روز کے ہنگاموں میں پھلتے پھولتے ہیں اور ارتقا کے اثرات مستقبل کے حوالے غیر شعوری طور پر ہوتے رہتے ہیں۔

چناں چہ عریانی اور فحش نگاری کو سمجھنے کے لیے عرض ہے کہ 'ٹراپک آف کینسر' جس کے بارے میں سنا ہے فرانس کے علاوہ ساری دنیا میں اس کی اشاعت ممنوع ہے، سرتا پا فحش ہے۔ کتاب 'لولیتا' عریاں بھی اور چھچھوری ذہنیت کی غماز بھی۔ کتاب 'مادام بواری' جس کا وہ باب جس میں مادام بواری کی ذہنی حالت بدل جانے کے اسباب محرک اور حوصلے بڑھ جانے کے ذرائع بیان کیے گئے ہیں کہ وہ کس طرح بالآخر اپنے کو محض لذت جنس کے لیے بے ستر کر دینے کا فیصلہ کر لیتی ہے، عریانی ہے نہ فحش نگاری۔ معاشرتی قدروں کا نفسیاتی جائزہ ہے اور افراد پر اس کے اثر و تاثیر کی صراحت۔ ادب میں اس کی گنجائش ہونی چاہیے۔ اگر ادب زندگی کی نمائندگی کا دعوے دار ہے، ورنہ لوگ کہہ سکتے ہیں 'قدوری کے ابواب جو طہارت سے تعلق رکھتے ہیں اور جنھیں مسلمان لڑکے لڑکیوں کو بھی دینی لحاظ سے پڑھایا جاتا ہے، نہ پڑھایا جائے' اس لئے کہ جس صراحت و وضاحت سے ان میں باتیں لکھی ہیں، جنس کو بیدار کرنے کی محرک بنتی ہیں۔ اور برصغیر کے مسلمان گھرانوں میں لڑکیوں کے جہیز میں جزدان میں رکھ کر 'بہشتی زیور' بھی نہیں دینا چاہیے۔ وجہ یہ ہے کہ درس و تدریس کی غرض سے جن باتوں کا اس کتاب میں ذکر ہے ان میں خوابیدہ جنس کے اچانک جاگ اٹھنے کے امکانات موجود ہیں۔

اسی سلسلے میں 'لیڈی چیٹرلیز لوز' کا نام بھی لیا جا سکتا ہے۔ لیکن ایک زمانے بعد جب اس کتاب کا مکمل متن شائع ہوا تو پتا چلا کہ عام اشاعت کے لیے اصل متن سے جو ٹکڑے حذف کر دیے گئے تھے وہ محض تکلف تھا۔ حذف شدہ ٹکڑوں کے بغیر بھی ناول انھی تاثرات کا حامل ہے جو مکمل صورت میں اس کی خصوصیت سمجھی جاتی ہے۔ میرا خیال ہے کہ اگر اس ناول کے نام میں لفظ 'لیڈی' نہ ہوتا تو شاید اس کی اشاعت پر پابندی نہیں لگائی جاتی۔ ڈی ایچ لارنس کا یہ ناول عریانی سے تعلق نہیں رکھتا۔ انگلستان کے اونچے طبقہ کی درپردہ جنسی زندگی کی بدہیتی کی عکاسی کرتا ہے۔ اسے ہم 'مسٹریز آف دی کورٹ آف لندن' کا عوامی سستا ایڈیشن کہہ سکتے ہیں۔ اس کا مقابلہ ہم شرر کے 'دربار حرم پور' سے اس احتیاط کے ساتھ کر سکتے ہیں کہ 'لیڈی چیٹرلز لوز' ناول ہے، 'دربار حرام پور' ناول کے انداز میں لکھی ہوئی داستان جو ناول کے فنی معیار پر پوری نہیں اترتی۔ دونوں مصنفین میں قدر مشترک یہ ہے کہ خاص طبقے یا فرد کے بارے میں شدید ذاتی ردعمل کو افسانوی رنگ دے دیا گیا ہے۔ میں نے قدر مشترک اور ذاتی ردعمل کی بات اس لیے کی ہے کہ برٹینڈ رسل نے اپنے چند ہم عصروں پر جو مضامین لکھے ہیں ان میں ایک مضمون لارنس پر بھی ہے۔ اس میں رسل نے اسی لحاظ سے بحث کی ہے کہ لارنس کا ذہن کیا تھا۔ گو

کہ رسل کا انداز ذکا حیہ ہے اور وہ لارنس کو ہر مسلمہ قدر کا باغی قرار دیتا ہے پھر بھی مضمون میں اس بات کی گنجائش ہے کہ رسل اپنے طبقہ روسا جس سے وہ خود بھی بڑی حد تک باغی تھا اس کی دفاع میں لارنس پر ہلکی پھلکی تنقید کر رہا ہے کہ اس میں برطانیہ کے اونچے لوگوں کے خلاف سخت نفرت وحقارت کا جذبہ تھا۔ چناں چہ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو 'لیڈی چیٹر لیز لوز' کچھ اصلاحی مقصد رکھتا ہے لیکن اصل بات ہر قدم پر خود پڑھنے والے کی ذہنی تربیت پر منحصر ہوتی ہے۔ لذتیت کا مارا ذہنی تعیش کے مزے لوٹتا ہے حساس دل رو پڑتا ہے۔

ان مختصر تصریحات کی روشنی میں اگر جنس کے معنی پنڈت کوکا کا' کام شاشتر' ہے تو ادب اس کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ جو بھی اس کو جائز سمجھتا ہے دنیا کا سنجیدہ طبقہ اس کو کہیں بھی پسند نہیں کرتا۔ اصل بات یہ ہے کہ جنسی ادب محض لذتیت ہو تو مضر ہوتا ہے لیکن زندگی کے ایک پہلو کے طور پر جنس کے چٹخارے روا کیے جا سکتے ہیں۔ جہاں تک اس کی مقبولیت کا تعلق ہے تو اس کا دارومدار مزاج معاشرہ پر ہوتا ہے ٹونے ٹوٹکے سے پہلے کام چلا ہے نہ اب چل سکتا ہے۔ جوانی کی دہلیز پر قدم رکھنے والے بچوں کی اصل تربیت گھروں میں ہوتی ہے۔ ادیبوں کو مورد الزام ٹھہرانے والوں کو اپنے گریبان میں منہ ڈال کر دیکھنا چاہیے کہ وہ گھروں میں بچوں کو کس ماحول میں پروان چڑھاتے ہیں۔ میں ایسے امریکیوں کو ذاتی طور پر جانتا ہوں جو نہ شراب پیتے ہیں نہ سگریٹ اور نہ عریاں ادب یا رسالہ' پلے بوائے' پسند کرتے ہیں۔ تو کہنے کی بات یہ ہے کہ اچھائی خدانخواستہ محض مشرق والوں کی میراث نہیں، مغرب میں بھی اچھائیاں ہیں اور قابل رشک اچھائیاں۔ اور یہ بھی کہ اگلے زمانے میں افسانوی ادب کی وہ معاشرتی اہمیت نہ تھی جو اب ہے اس لئے کہ جب ادب پوری زندگی کی عکاسی کرتا ہے تو اس میں جنس کا ہونا بھی ضروری ہے۔

ماخذ (اُردو۔ ٦٠)

ادبیات میں اِبتذال

ن م راشد

ادبیات میں علم کا مفہوم وجذباتی تجربات ہیں جو ادیب زندگی سے حاصل کرتا ہے۔ لیکن جب ان جذباتی تجربات کے علاوہ اپنی علمی واقفیت کی نمائش کے ذریعے قارئین کے دلوں میں خوف پیدا کرنے کی کوشش کی جائے تو ابتذال نمودار ہونے لگتا ہے۔ ادبیات میں شائستگی کا بہترین ثبوت یہی ہے کہ جذباتی تجربات اور علمیت میں توازن پیدا کیا جائے۔

جب ہم کسی ادبی نگارش کو مبتذل کہتے ہیں تو یہ ابدا اس نفرت کا اظہار ہوتا ہے جو ہمارے دل میں اپنے شائستہ ذوق کی وجہ سے پست تر تخلیقات کے لیے پیدا ہوتی ہے۔ مدت العمر ادبیات کا مطالعہ کرنے سے ہمارے اندر اس بات کا یقین پیدا ہو جاتا ہے کہ ہم ادبی نگارشات کی جمالی حیثیت سے اس حد تک آگاہ ہیں کہ جو شخص اس بارے میں ہمارے ساتھ اتفاق نہ کرے وہ مبتذل ہے۔ جو بات ہم سالہا سال سے سنتے آرہے ہوں، وہ خواہ کتنے ہی نئے انداز میں پیش کی جائے ہمارے لیے مبتذل ہے بلکہ جتنے نئے انداز میں پیش کی جائے وہ اتنی ہی زیادہ مبتذل ہوگی کیوں کہ خود ابتذال کو چھپانا اور عام باتوں کو زیادہ فصاحت وبلاغت سے بیان کرنا بہت بڑا ابتذال ہے۔

لیکن اکثر ادیب درحقیقت ایسی باتیں کیوں کہتے ہیں جن میں عوام سالہا سال سے دلچسپی لیتے آرہے ہیں! اس کا جواب یہ ہے کہ جس ادیب میں زیادہ 'قوتِ اظہار' ہو، عوام کے نزدیک وہی بلند پایہ ادیب ہے۔ عوام کسی کی ذہنی حیثیت کا احترام کرنا نہیں جانتے۔ ان کی نظر میں ضروری اور غیر ضروری موضوعاتِ سخن میں کوئی فرق نہیں۔ جو ادیب زیادہ شد و مد کے ساتھ اور زیادہ فصیح و بلیغ انداز میں عامیانہ خیالات کا اظہار کر سکے۔ اس کو عوام میں زیادہ شہرت اور مقبولیت حاصل ہوتی ہے۔ عوام کے نزدیک ولولہ انگیزی اور ہیجان آفرینی، تخیل اور احساس سے بھی زیادہ اہم ہیں۔ چناں چہ ابتذال کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ جذبات اور احساسات کا فقدان ہو لیکن اس کی تلافی پر زور جوشیلے اور ہیجان پرور الفاظ کے ذریعے کی جائے۔ جو ادیب واویلا کرنا جانتا ہے وہ ادبی نقاد کی نگاہوں میں بے شک پست ذہن کا مالک ہے لیکن عوام کے لیے جن کے قویٰ نشو یافتہ نہیں ہوتے یا جو طباعی کے نایاب جوہر سے عاری ہوتے ہیں، وہ پیغمبر ہیں کیوں کہ وہ انھیں کے خیالات اور احساسات پیغمبرانہ طریقے میں بیان کرتا

ہے۔ وہ اس کے مقالات پڑھ کر مبہوت ہو جاتے ہیں، وہ اس کی پرستش کرتے ہیں لیکن وہ اس مہیب عفریت کی موجودگی سے واقف نہیں ہوتے جو ادیب نے لا کھڑا کیا ہے۔ ان کے لیے اس کا زرق برق لباس تسلی بخش ہے۔

اس مقام پر ابتذال اور عریانی میں فرق کرنا مناسب ہوگا۔ دراصل عریانی کا براہ راست تعلق اخلاقیات سے ہے، ادبیات سے نہیں۔ ادبیات میں عریانی کوئی اہمیت نہیں رکھتی بشرطے کہ ادیب نے اپنے تصورات کے اظہار میں خلوص سے کام لیا ہو۔ ہر قسم کے تصورات قلم بند کر دینے کی ترغیب بھی ادیب کے لیے تباہی کا باعث ہے کیوں کہ جب کوئی ادیب محض اس مسرت کی تلاش میں نکل پڑتا ہے جو ہر تصور اور ہر تمثیل کے سامنے سرِ خم کرنے سے حاصل ہوتی ہے تو اس کی تحریروں میں ابتذال رونما ہونے لگتا ہے۔ چناں چہ ادبیات میں عریانی صرف اس حد تک قابلِ جواز ہے جس حد تک اس کا مقصد خالص فن کارانہ ہو۔ جب ادیب ایسے عریاں تصورات پیش کرنے لگے جن کے پس پشت جذبات کی مناسب فراوانی نہ ہو یا جذبات کی نمائش سے کام لے یا اس کے جذبات اور اس کے ذہن میں باہم توازن نہ ہو تو وہ مبتذل ہونے لگتا ہے۔ عریانی لازمی طور پر ابتذال کی دلیل نہیں اور صرف اس صورت میں ابتذال کی مظہر ہے جس صورت میں فن اس کا جواز پیدا کرنے سے عاری ہو جائے۔ ادبیات میں عریانی کے بغیر بھی ابتذال موجود ہو سکتا ہے بلکہ بیش تر ابتذال عریانی کے بغیر ہی لایا جاتا ہے۔ کیوں کہ ابتذال تو محض اس بات میں بھی ہے کہ صحیح ادبی اہلیت اور صحیح تخلیقی قوت کے بغیر ارادی طور پر اپنے جذبات کی (خواہ وہ پاکیزہ ترین کیوں نہ ہوں) نمائش کی جائے، یا عوام کی ستائش حاصل کرنے کے خیال سے نثر میں اس قسم کی مصوری اور نظم میں اس قسم کی موسیقی پیدا کی جائے، جو عوام کو خیالات، جذبات اور احساسات کی ضرورت ہی سے محروم کر دے۔ مثال کے طور پر اس قسم کی نثر ہمارے اکثر ناولوں میں ملتی ہے اور قسم کی شاعری پنجاب کے ایک نوجوان نے رائج کی ہے۔ اس نے اس حیثیت سے کافی ناموری حاصل کر لی ہے جس کا سبب یہ ہے کہ ان لوگوں کی تعداد بہت ہے جن کی ذہنی حیثیت خود اس شاعر سے بلند نہیں اور جو تخیل اور ندرتِ فکر سے محروم ہیں۔ عوام کے لیے اس میں انتہا درجے اطمینان ہے کہ وہ اس کی نظموں کو گا کر پڑھ سکتے ہیں کیوں کہ عوام اس ذہانت اور نکتہ شناسی سے محروم ہوتے ہیں جو 'موسیقیت' کے بغیر بھی ترنم کا شور پیدا کر سکتی ہے۔ شاعری لامحالہ موسیقی پر مبنی ہے اور اس سے قطعی طور پر مفر نہیں۔ لیکن جب تک یہ موسیقی شاعر کی روح کی گہرائیوں سے پیدا نہ ہو اور جب تک اس میں اور شاعر کے تخیلات میں ہم آہنگی نہ ہو، یہ ایک لہر کے مانند ہے جو شاعر کے خیالات کے کمزور خس ریزوں کو اٹھائے پھرتی ہے۔

جذبات کا پیدا ہونا مبتذل نہیں۔ شاید سائنسدان اور فلسفی کے لیے بھی یہ ابتذال اور کم ذوقی کی دلیل ہو لیکن ادبیات کا کاروبار ہی جذبات سے ہے۔” جذبات کا طریقہ اظہار غیر فطری ہو یعنی خالص ادبی خلوص سے عاری تو جذبات مبتذل ہو جاتے ہیں۔ عوام ایسی چیزیں پسند کرتے ہیں جن میں جذبات کی بے پناہ فراوانی ہو اور فراست اور ادراک کا شائبہ تک نہ ہو کیوں کہ ان کے لیے ادراک جذبات کے مقابلے میں سنگِ گراں ہے جس کے ماوراان کے احساسات نہیں جاسکتے۔ لیکن اعلیٰ ادبی نقطۂ نظر سے یہ بات ضروری ہے کہ ادیب ‘جنون’ اور ‘خرد’ یا جذبات اور ذہانت میں توازن قائم رکھے۔

اکثر لوگ بہت تھوڑے عمل کے باوجود یا بہت تھوڑی مدت میں انتہا درجے کی شہرت اور مقبولیت پیدا کر لیتے ہیں۔ اس کا سبب یہ ہے کہ ادبیات میں جذبات کا مظاہرہ خواہ یہ جنسی خواہشات او رجسمانی لذت انگیزی کی صورت میں نمودار ہو یا نہ ہو اور علمیت کی نمائش خواہ فلسفہ اور سائنس کے علم کی کیوں نہ ہو، عوام کو پسند ہے کیوں کہ وہ انھیں مبہوت و مرعوب کرتی ہے۔ جب جذبات کا مظاہرہ ہو تو خرد پس پشت جا پڑتی ہے اور جب خرد کی نمائش ہو تو جذبات اپنی ادبی قدر سے محروم ہو جاتے ہیں۔ ادبیات میں محض بے روح تصویر کشی ہی مبتذل نہیں بلکہ علمیت فروشی کی ترغیب کو نہ روک سکنے کا نام بھی ابتذال ہے۔

اکثر لوگوں کو یہ بات سن کر حیرت اور حیرت سے زیادہ صدمہ ہوگا کہ ڈاکٹر بجنوری مرحوم کی ‘محاسنِ کلامِ غالب’ کو بھی مبتذل کہا جا سکتا ہے۔ ابتذال کا راز اسی بات میں مضمر نہیں کہ عوام پسند کلمات کہے جائیں بلکہ ابتذال کی کلید بے جا خود آرائی اور نمائش ہے۔ بعید نہیں کہ بجنوری مرحوم مشرق و مغرب کے آثار ادب پر پوری طرح حاوی ہوں لیکن جس انداز میں بے موقع اور غیر ضروری طور پر اپنی علمیت کی نمائش انھوں نے کی ہے، وہی ان کی مذکورہ تصنیف کے ابتذال کی پورے طور پر ضامن ہے۔ ڈاکٹر بجنوری مرحوم کا ابتذال اس سبب سے ہے کہ انھوں نے پیغمبرانہ انداز میں اپنے قارئین کو مرعوب کرنے کی کوشش کی ہے۔ مثلاً ان کی کتاب کا پہلا فقرہ ہی بیک وقت لغت فروشی اور اشتہار بازی کی دلیل ہے جو ادبی نقاد کے لیے بے حد ضرر رساں ہیں۔ ان میں ایسی جدت کی خواہش نمایاں ہے جس کا مقصد ادبی معیاروں میں نئے سرے سے توازن پیدا کرنا نہیں بلکہ خود نقاد کی ذات کو آشکار کرنا ہے اور یہ کام بہرحال ایک ادبی نقاد کا نہیں بلکہ ایک خالص اشتہار باز کا ہے۔

ماخذ (اُردو۔۲۱)

رنگینی اور شوخ نگاری

ن م راشد

ہمارا ذاتی خیال یہ ہے کہ ادبیات میں رنگینی اور شوخ نگاری کو جہاں تک ان کا تعلق خالص فن اور جذبات سے ہے، گوارا کر لینا چاہیے۔ لیکن ابتذال یقیناً کسی طرح برداشت نہیں ہو سکتا کیوں کہ ابتذال درحقیقت دماغی عریانی کا نام ہے۔ درآں حالیکہ بدنی عریانی بھی ہمارے ملک، ہماری قومی روایات ہمارے مذہب اور ہمارے اخلاق کے بموجب قابل فخر بات نہیں۔ مزید برآں عریاں، جذبات اور عریاں تصاویر خواہ مبتذل نہ ہوں کسی قوم کے کلچر پر معاندانہ اثر ڈالے بغیر نہیں رہتیں۔ ان کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ قوم سے اس کے مردانہ خصائل چھن جاتے ہیں اور وہ نسائیت یعنی اپنے دور انحطاط کی طرف مائل ہو جاتی ہے۔

ہماری دلی خواہش ہے کہ ہم "شاہ کار" کے ذریعے صرف ایسا ادب اور ایسا فن پیدا کریں جو ہمارے نوجوانوں کی جمالی تشنگی کی تسکین کا باعث ہو۔ لیکن اپنی اس خواہش کو فروغ دیتے ہوئے ہم اپنے ملک کی تعلیمی اور معاشرتی ضروریات کو نہیں بھلا سکتے اور نہ ادبیات کے اصلی مقصد، ضرورت اور اثر کو فراموش کر سکتے ہیں۔ اگرچہ وہ ادب بھی جسے مقصود بالذات کہا جاتا ہے، ہماری نظر میں اتنا ہی ضروری ہے۔ ہم حسن و عشق کے افسانوں کو حوصلہ فرسا نقطۂ نظر سے نہیں دیکھتے کیوں کہ ہم جانتے ہیں کہ ان کے بغیر زندگی تشنہ اور بے کیف ہے۔ لیکن یہ ضرور پسند کرتے ہیں کہ افسانوں میں حسن و عشق کے خارجی مظاہرات کے ذکر پر جو اس قدر عام اور مبتذل ہو چکا ہے زور نہ دیا جائے اور اس کی بجائے افسانوں کے نفسی مطالعے کو پیش نظر رکھا جائے۔ اس امر کے لیے انگریزی کے رائج الوقت بالخصوص مجلاتی افسانے ہمارے زیادہ رہنما ثابت نہیں ہو سکتے۔ البتہ مشرقی یورپ کی ادبی تخلیقات میں داخلی عنصر زیادہ ہے۔ اور ہم اپنے قارئین اور مضمون نگار حضرات سے ان تخلیقات کے بیش تر مطالعے کی سفارش کرتے ہیں اور ان سے چیدہ افسانوں کے ترجمے کا مشورہ دیتے ہیں۔ خود ہمارے ملک میں نفسی اور غیر نفسی افسانوں کے لیے مواد کی اتنی فراوانی ہے کہ ابھی اس کا ذرہ بھر بھی لاعلمی کے غاروں سے کھود کر نہیں نکالا گیا۔ ہماری دیہاتی زندگی، ہماری اقتصادی اور سیاسی کش مکش، ہمارے نوجوانوں کی بے اطمینانی اور جدوجہد وغیرہ ایسے مناظر ہیں جو افسانوں کے لیے کردار اور پلاٹ مہیا کر سکتے ہیں۔

ماخذ (اُردو۔۲۱)

ادب، فحاشی اور سماجی قدریں

سید محمد تقی

ادب اور فحاشی یا ادب میں فحاشی کا عنوان یوں تو کافی پٹا ہوا نظر آتا ہے، کافی پیش پا افتادہ مبحث معلوم ہوتا ہے لیکن اس کے متعدد اور اہم پہلو اب بھی ایسے ہیں جن پر اختراعی انداز میں سوچا جاسکتا ہے۔ لیکن یہ بحث جس انداز میں بھی کی جائے تاہم اتنا صاف ہے کہ ادب میں فحش نگاری کا مسئلہ انسانی عمر کی بہت ہی مختصر مدت سے تعلق رکھتا ہے۔ انسان کی عمر کم سے کم دس لاکھ سال ہے اس دس لاکھ سال کی مدت میں دس ہزار کے لگ بھگ وہ مدت ہے جسے تاریخِ معلومہ کی مدت قرار دیا جاتا ہے اور تین ہزار سال کا عرصہ وہ عرصہ ہے جسے منظم فکر کا زمانہ کہا جاتا ہے ادب اور آرٹ میں فحاشی کی عمر زیادہ سے زیادہ دس ہزار سال پرانی ہے یا اگر مان لیا جائے کہ فحاشی اور عریاں نگاری کا تصور منظم مذاہب سے پیدا ہوا ہے تو کہا جاسکتا ہے کہ اس کی عمر ۸۰ ہزار سال ہے اس لیے کہ منظم مذاہب کی عمر ۸۰ ہزار سال اور ۶۰ ہزار سال باور کی جاتی ہے۔ اس انسانی قبیلے کے آرٹ اور فنون کے نشان ملتے ہیں جن میں ایسے متعدد نقوش موجود ہیں جو ہماری آج کی اقدار کی رو سے عریاں ہیں لیکن ایسی کوئی شہادت موجود نہیں جس کے پیش نظر یہ کہا جائے کہ ان نقوش کا سلسلہ تہذیب کے ارتقا کے ساتھ کم ہوتا چلا گیا۔ اس لیے بظاہر حالات سے یہی کہا جاسکتا ہے کہ ثقافت کی ان اقدار کا عہد مُتقابل تاریخ میں موجود نہ تھا جنھیں ہم آج معیار بنا کر عریانیت و عدم عریانیت کا فیصلہ کرتے ہیں۔ پھر قدیم قبائل کے رسوم و رواج میں بھی عریانیت کی ثقافتی قدر یا تو سرے سے موجود نہیں ہے یا موجود ہے تو بالکل ابتدائی شکل میں۔

اب مثلاً کپتان کک نے تاہیتی میں ستارۂ زہرہ سے متعلق جو عجیب اور حیرت انگیز رواسم دیکھے، انھیں نہ تو میں یہاں بیان کرسکتا ہوں اور نہ آپ سننے کے لیے تیار ہوں گے۔ صحیح تو یہ ہے کہ عریانیت کی ثقافتی قدر بڑی حد تک عہد تہذیب کی پیدا کردہ ہے اور اس لیے اس نظریہ کی حمایت میں کہ شرم وحیا انسان کے فطری تقاضوں میں شامل ہیں، انسان کی طویل تاریخ سے جواز ڈھونڈ نکالنا بڑا مشکل ہے۔ قدرتاً اس سے شرم وحیا کی عدم افادیت نہیں ہوتی لیکن سوال افادیت و عدم افادیت کا نہیں ہے بلکہ بحث مسئلہ کے تاریخی پس منظر اور تہذیبی مقام سے ہے۔ پھر اس سلسلے میں ایک اور نقطۂ نظر بھی سنتے چلیے جو ریمف دی لا بریتون اور ڈی مون تان کا ہے۔ ریمف نے شرم وحیا کے عنوان پر طویل بحث کے

بعد یہ فیصلہ دے دیا ہے کہ سب سے زیادہ شرم وحیا کرنے والی عورت ہی وہ عورت ہوتی ہے جو سب سے زیادہ جری ہوتی ہے۔

اس طرح ریتھ نے مسئلے کے سارے پہلوؤں پر بحث کرنے کے بعد رائے دی کہ جو عورت سب سے زیادہ جھینپتی ہے وہی محبت کی لذتوں سے زیادہ آگہی رکھتی ہے۔ حد ہے، ویلز میں تو یہ مثل ہے کہ جو عورت اپنے آپ کو جتنی زیادہ حیادار ظاہر کرے گی وہ اسی قدر عفت شکن ہوگی۔ شیکسپیئر نے اس بات کو بالکل اُلٹ کر رکھ دیا۔ شیکسپیئر کا انجلو جو کہ برائی کی ترغیبات سے ہمیشہ لڑتا رہتا تھا، مآل کار یہ عجیب حقیقت دریافت کرتا ہے کہ شرم وحیا ہوسکتا ہے کہ ہمارے اپنے احساسِ قدر کو ظاہر کرے نہ یہ کہ اس سے عورت کی بے حیائی ظاہر ہوتی ہے۔ گویا عورت کی بے حیائی فی الواقع ہمارے ثقافتی احساس کی نمائندگی کرتی ہے اس کی اپنی بے حیائی کو ظاہر نہیں کرتی اور یہی کچھ ڈی مون تان نے اپنے مضامین کی جلد دوم، باب ۱۵ میں کہا ہے۔ اب اس نقطہ نظر کی روشنی میں، جس کی صحت پر میں اصرار نہیں کرتا، یہ نظریہ کہ شرم و حیا ایک مخصوص فطری جذبہ ہے، سخت مشکلات کا شکار ہوجاتا ہے اور اس کے لیے انسانی نفسیات کی کوئی غیر ثقافتی، نا سماجی اساس ڈھونڈ نکالنا تقریباً ناممکن ہے۔ فحاشی کی اس قدر کے تعین کے بعد کہ وہ ثقافت اور اس کے مخصوص حالات سے تعلق رکھتی ہے، اب آیئے ذرا ادب پر کچھ سوچیں۔ ادب اساسی طور پر الفاظ سے تعلق رکھتا ہے۔ الفاظ اپنی ذات میں نہ گندے ہوتے ہیں اور نہ مبتذل اور نہ عریاں، اس لیے کہ الفاظ حروف پر مشتمل ہوتے ہیں اور ان حروف میں نہ بذاتہ ابتذال ہوتا ہے نہ گندگی۔ ایک لفظ 'منی' کو لیجیے۔ انگریزی میں یہ آواز گندی نہیں لگتی۔ خود اردو میں بھی سائنسی، طبی اور فقہی مباحث میں آپ اسے گندہ قرار نہیں دے سکتے جس کے صاف معنی یہ ہیں کہ لفظ م۔ ن۔ ی میں یا اس آواز میں جو انگریزی میں ادا کی جاتی ہے، کوئی گندگی نہیں ہے۔ لفظ بذاتہ گندہ نہیں ہوتا۔ گندگی صرف اُن ذہنی تعلقات سے پیدا ہوتی ہے جو الفاظ پیدا کرتے ہیں اور کسی ثقافتی قدر سے متصادم ہوجاتے ہیں۔ ادب فوری طور پر محض الفاظ ہی سے پیدا نہیں ہوتا بلکہ وہ الفاظ کی ایک متعین نوعیت اور ترتیب سے پیدا ہوتا ہے ایک مصرعہ لیجیے۔ ع ہر ہوسنا کے نداند جام وسندان باختن۔ اب اگر آپ اس مصرعے کی ترتیب اس طرح بدل دیں کہ، ع ہوسنا کہ سندان بر باختن جام نداند، تو پورا مفہوم بے معنی اور مضحکہ خیز بن کر رہ جائے گا۔

اس طرح یہ بات صاف ہوجاتی ہے کہ نہ آوازیں گندی ہوتی ہیں نہ حروف اور نہ الفاظ۔ گندگی الفاظ کی ترتیب سے پیدا شدہ مفہوم کی ایک خاص ثقافتی قدر سے نسبت کے بعد پیدا ہوتی ہے۔ ادب اور عریانیت کے باہمی تعلق کے سلسلے میں اس نتیجے تک پہنچنے سے پہلے ایک پہلو پر اور توجہ کرلیجیے۔ ادب فرد کے اپنے تاثر سے پیدا ہوتا ہے جس میں شعور تحتی کا پارٹ ادا کرتا ہے۔ انسانی کلام یا عبارت کی دوسری اقسام جن کا تعلق فلسفہ، سائنس اور فکر سے ہوتا ہے شعور سے براہ راست تعلق رکھتی ہیں۔ فکر کا

کمال وارتقا منحصر ہے اس امر پر کہ وہ فرد کے اپنے تاثر سے زیادہ سے زیادہ بے تعلق ہو۔ فکر، حقائق جیسے کہ وہ ہیں، پر بحث کرتی ہے فرد کے اپنے احساسات کو ان حقائق کی بحث سے جتنا زیادہ جدا کر دیا جاتا ہے اسی قدر فکر میں پختگی پیدا ہو جاتی ہے جب کہ ادب میں تاثر کا غموض و پختگی، گہرائی اور گیرائی، فن کا فوری موضوع بنتا ہے۔ فرد کا یہ تاثر یا تجربہ جو ادب اور آرٹ کی تمام اقسام کا جوہری نقطہ ہوتا ہے، بذاتہ نہ گندہ ہوتا ہے نہ عریاں، اس کی گندگی ثقافتی پیمانوں سے پیدا ہوتی ہے۔

گندگی ونفاست دو اخلاقی قدریں ہیں جو مؤثر یعنی فن کار اور متاثر یعنی وہ شخص جو فن پارے کو دیکھ کر لذت حاصل کرتا ہے، کی نسبت سے بدلتی ہیں۔ فن پارہ اپنی جگہ نہ گندہ ہوتا ہے نہ عریاں۔ اس کی عریانی اور گندگی متاثر ہونے والے کی اپنی نفسیات سے تعلق رکھتی ہے۔ ایک فن پارہ ایک بوڑھے بیمار پر وہ اثر نہیں ڈالتا جو ایک جوان وصحت مند پر اثر ڈالتا ہے۔ کسی شہر پر بمباری کے دوران فن پارے کا تاثر ایک گلستان میں اس کے تاثر سے مختلف ہوتا ہے۔ اس کے معنے یہ ہیں کہ فن پارے کا تاثر حالات اور فرد کی نفسیات سے تعلق رکھتا ہے، گویا فن پارہ اپنی جگہ نہ گندہ ہوتا ہے نہ عریاں۔

پھر جہاں تک موضوع کا تعلق ہے، یہ ثابت کرنا بھی مشکل ہے کہ جنس کا موضوع جس سے گندگی پیدا ہوتی ہے بذاتہ گندہ ہوتا ہے۔ جنس کا موضوع آسمانی کتابوں، تورات، انجیل اربعہ، تالمود، ژندو پاژند، وید، اُپنشید اور قرآن مجید سے لے کر پاکیزہ ادبی شہ پاروں میں ملتا ہے لیکن یہاں یہ مضمون استعارات اور تشبیہات کے پردوں میں آتا ہے جب کہ طب، نفسیات اور فقہ وحدیث میں یہ ذکر پوری تفصیل سے ہوتا ہے لیکن اسے عریاں کہنے کی ثقہ حضرات نے بھی ضرورت محسوس نہیں کی جس کے معنی یہ ہیں کہ خود جنس کا موضوع بھی بذاتہ عریاں موضوع نہیں ہے اور اس کی عریانی بھی ثقافتی قدروں، حالات اور فرد یا افراد کے اپنے تاثر کی نوعیت سے پیدا ہوتی ہے جو تمام کار جنسی مسائل ہی سے متعلق ہو سکتی ہے۔ یہ سوال کہ جنسی مسائل یا جنس کس حد تک فحش ہوتی ہے یا نہیں، بجائے خود ایک سماجی وثقافتی مسئلہ ہے، گندگی فرد کے تاثرات اور ثقافتی قدروں سے پیدا ہوتی ہے۔ ایک ہی فنکار فن کار تاریخ کے ایک عہد میں 'عریاں' اور دوسرے عہد میں 'شاہ کار' ہو سکتا ہے اور اس کا انحصار افراد اور ان کے ثقافتی پیمانوں سے ہے۔ لندن کے جج سر چارلس ہال کے خیال میں، ہیولاک ایلس کی معرکۃ الآرا تصنیف 'نفسیاتِ جنس سے متعلقہ چند مطالعے' ایک یکسر گندی اور فحش تصنیف ہے اور اس کے بہت سے حصے آج بھی پاکستان کے بہت سے جج صاحبان کے خیال میں فحاشی کی زد میں آتے ہیں جن پر باآسانی سزا دی جا سکتی ہے۔ بلکہ مجھے تو خطرہ ہے کہ رُوسو کے 'اعترافات' بھی بعض ثقہ جج صاحبان کی رائے میں قابل دار وگیر قرار دیئے جائیں گے جب کہ آج کا کوئی متوازن الفکر اور باخبر شخص ان دونوں کتابوں کی کلاسیکی نوعیت اور عظیم ادبی درجے سے انکار کی جسارت نہیں کر سکتا۔ جنس کے مطالعے میں پروفیسر برٹینڈ رسل جو نقطہ نظر رکھتے ہیں، امریکی پادریوں کے خیال میں وہ پست فطرتی کی واضح مثال ہے اور اس لیے

'شادی اور اخلاقیات' کا مصنف رسل اس کا مستحق نہیں ہے کہ وہ امریکا میں رہ سکے، وہاں طلبا کو درس دے سکے۔ چنانچہ ان خیالات کی بنا پر انھیں اپنی پروفیسری تک سے محروم ہونا پڑا۔

میں یہاں جنس سے متعلق کسی نقطہ نظر کی وکالت نہیں کر رہا ہوں۔ دکھانا صرف یہ ہے کہ جنسی مسائل سے متعلق گفتگو کے فحاشی ہونے نہ ہونے کا مسئلہ بھی سماجی و ثقافتی اور انفرادی قدروں سے تعلق رکھتا ہے۔ اس کے لیے کوئی ہمہ گیر پیمانہ بنانا صحیح نہ ہوگا۔ اوپر جو بحث کی گئی اگر وہ صحیح بنیادوں پر خیال کی جائے تو اس سے ایک ہی نتیجہ برآمد ہوگا وہ نتیجہ یہ ہے کہ ادب کا کوئی شہ پارہ خواہ اپنی ادبی خوبی میں کسی قدر بھی بلند تر، کسی قدر بھی فروتر کیوں نہ ہو، محض اس حیثیت سے کہ وہ ایک ادب پارہ ہے' گندہ یا فحش نہیں ہوتا، اس کی گندگی یا پاکیزگی کا تعین ان سماجی و ثقافتی قدروں سے ہوتا ہے جو ادیب یا قاری کے ذہن میں ہوتی ہیں۔

ادب پارہ ادیب سے جدا ہو کر اور قاری تک پہنچنے سے پہلے کی منزل میں محض ادب پارہ ہوتا ہے، نہ گندہ ہوتا ہے اور نہ پاکیزہ۔ ادب تین منزلوں سے گزرتا ہے۔ ادیب، قاری اور تیسری وہ درمیانی منزل جب وہ ادیب سے گزرنے اور قاری تک پہنچنے کی حالت میں ہوتا ہے۔ ان تین اکائیوں میں سب سے اہم اکائی ادیب ہوتا ہے جس کا نقطہ نظر بھی ادب پارے کو گندہ نہیں بنا سکتا، اگر وہ ماحول جس میں اس کا ادب پارہ پہنچے گا اور زندہ رہے گا، ادیب سے مختلف نقطہ نظر کا حامل ہو۔

اردو کا کوئی گندے سے گندہ افسانہ اور شعر و نظم بھی وسطی برازیل کے قبیلے بکارائی کی زبان میں ترجمہ ہو کر ایک پاکیزہ اور ثقہ ادبی شاہ کار کی حیثیت حاصل کر لے گا جب کہ اردو کے تمام ساقی نامے ملایا کے اورانگ لاٹ قبیلے میں گندے ترین ادب پارے خیال کیے جائیں گے جن پر مرد و عورت شرم و ندامت سے سر جھکالیں گے اس لیے کہ ان میں صرف شراب نہیں، پانی پینے کا علی الاعلان ذکر کیوں کیا گیا ہے جو اس قبیلے کے رواج کی رو سے بدترین فحاشی اور عریانی ہے تو بہر حال، اس تمام بحث سے ہم جو نتیجہ نکال سکتے ہیں وہ یہ ہے کہ ادب پارہ کا ادب پارہ ہونے کی حیثیت میں فحاشی سے کوئی تعلق نہیں ہوتا اور اس لیے کسی ادب پارے پر فحاشی کا الزام لگانا غلط ہے۔ گو اس کے اپنے اثرات کی رو سے جو کسی مخصوص سماجی در و بست میں یہ پیدا کرے گا، اس نوع کا الزام لگانا البتہ صحیح ہوگا۔ اس تشنہ بحث کو ختم کرنے سے پہلے ایک اور چیز کا یہاں ذکر کرنا ضروری ہے۔ اوپر کے مباحث سے آپ نے یہ اندازہ لگایا ہوگا کہ ان سطور کا لکھنے والا قدروں کی اضافیت کا قائل ہے یہ خیال جزوی طور پر تو صحیح ضرور ہے لیکن کلی طور پر صحیح نہیں ہے یہاں قدروں یا حسن و قبح کی اضافیت اور قطعیت پر بحث کرنا مقصود نہیں ہے لیکن چوں کہ مذکور بحث سے یہ خیال پیدا ہونا ممکن تھا کہ اس مضمون کا لکھنے والا ساری کی ساری قدروں کو اضافی سمجھتا ہے اس لیے مناسب معلوم ہوا کہ اس پہلو کی وضاحت کر دی جائے تا کہ بعض زیادہ دقت پسند اور عمیق نظر رکھنے والے قارئین کو غلط فہمی پیدا نہ ہو۔

ماخذ (اردو۔۸۹)

ادب میں عریانی کا سوال

ڈاکٹر محمد احسن فاروقی

جب بھی ادب میں عریانی کا سوال آتا ہے تو مجھے گورنمنٹ ٹریننگ کالج الہ آباد میں اپنی ٹریننگ کا زمانہ ضرور یاد آ جاتا ہے۔ ہم لوگوں کو علاوہ اور مضامین کے ایک مضمون پڑھایا جاتا تھا جس کو 'مارل ہائجین' کہا جاتا تھا۔ اخلاقی علمِ صحت اور فرسٹ ایڈ وغیرہ کا الگ درس ہوتا تھا۔ اس مضمون کا جب میں پہلا لیکچر سننے گیا تو اس میں مرد اور عورت کے ان حصوں کی تصویریں دکھائی گئیں جو پوشیدہ رکھے جاتے ہیں اور جن کی طرف اشارہ تک کرنا ہمارے ماحول میں بدتمیزی سمجھی جاتی تھی' چہ جائیکہ ہم ان کے نام لیتے یا ان کو دیکھنے کی کوشش کرتے۔ میں اس سلسلے میں اور بھی زیادہ حساس تھا کیوں کہ جس گھر میں، میں پلا اور بڑھا تھا اس کے اثر سے گالی سن کر مجھے گھن آتی تھی اور اگر کبھی دیہات کے لڑکے یا لڑکیاں ننگے پن میں مشغول نظر آتیں تو شرافت کے غرور میں، میں ان کو توہین کی نظر سے دیکھتا۔ یہ عقیدہ میرے خون میں شامل ہو گیا تھا کہ عریانی کی طرف رجحان، پستی اور بہیمیت کی دلیل ہے۔ اس ذہنیت کے ساتھ بھلا ان ننگی تصویروں اور ان کی ساتھ پروفیسر کی وضاحت پر میرا جو بھی عالم نہ ہوتا کم تھا' میں نے بگڑ کر کہا: 'اسے آپ مارل ہائجین کہتے ہیں' یہ تو ایبسولیوٹلی اِمّ مارل ہائجین' ہے۔ میں ہر مسلمان عالم اور ہر ہندو پنڈت کا فتویٰ لا سکتا ہوں کہ یہ سب مخربِ اخلاق (اِمّ مارل) ہے۔' میری اس بات کو پروفیسر نے ہنس کر ٹال دیا اور پھر میں نے یہ بھی محسوس کیا کہ میرے تمام ہم جماعت اور میں بھی عریاں باتوں سے وہ اثر نہیں لے رہے تھے جس کو میں پست 'ذوقی' یا 'ولگر' سمجھتا تھا۔ ہم سب نہایت سنجیدگی سے ہر تصویر کو دیکھتے اور اس کے سلسلے میں معلومات حاصل کرنے میں مصروف ہو جاتے۔ یہ بڑا ہی خاص علم تھا۔

کچھ ہی عرصے کے بعد مجھے محسوس ہوا کہ عریانی 'ولگر' نہیں رہ جاتی اگر اس کی طرف سنجیدگی سے توجہ کی جائے۔ میں نے اس سلسلے میں بہت سی کتابیں پڑھیں اور مجھے محسوس ہوا کہ میں قدیم دینیاتی اور منطقی نقطۂ نظر پر پالا گیا تھا۔ جدید دور نفسیات کے غلبے کا دور ہے۔ ماہرین نفسیات نے یہ دریافت کر لیا ہے کہ جنس کے سلسلے میں زیادہ تر بے راہ روی، بد اخلاقی اور ذہنی بگاڑ کی وجہ یہ ہے کہ لوگ 'جنس' 'جنسی اعضا' اور 'جنسی تعلقات' کے بابت صاف اور واضح خیالات رکھنے سے روکے جاتے ہیں۔ اگر

ان کو صاف صاف باتیں بتادی جائیں تو وہ چیز جسے 'جنسی تجسس' کہتے ہیں، کم ہوجاتا ہے اور وہ خواہشیں مٹ جاتی ہیں جو بداخلاقیوں کی بنیاد بنتی ہیں۔ زیادہ تر عشق کے قصے اور ان میں گوناگوں جھگڑے اسی بنا پر ہوتے ہیں کہ عاشق معشوق کی محض ایک جھلک دیکھ کر دیوانہ ہوجاتا ہے۔ اگر وہ معشوق کو پورے طور پر دیکھ لے اور اس کے حسن کے ساتھ اس کی خرابیوں سے بھی واقف ہوجائے تو جذبات کا ہیجان جاتا رہتا ہے اور یا تو محبت بالکل ختم ہوجاتی ہے اور اگر رہتی ہے تو متوازن اور پختہ ہوجاتی ہے جس میں رخنے پڑنے اور بداخلاقیوں کے نمایاں ہونے کا امکان کم رہ جاتا ہے۔ اب میری سمجھ میں آیا کہ میرے گھر کے ماحول میں 'عریانی' سے دور رکھنے کی کوشش اور ایسا مزاج بنانا کہ عریانی سے دلی نفرت ہو، پرانے ڈگر پر چلنے چلانے کا ایک مخصوص عمل تھا جس میں رچ کر میرے اندر عریانی کے خلاف ایک غلط تعصب پیدا ہوگیا تھا۔ اصل میں 'جنس' کی بابت مجھے معلومات نہ ہونا ہی تمام بداخلاقی کی جڑ تھی۔

یہ وہی زمانہ تھا جب ماہرِ نفسیات فرائڈ کے نظریات عام ہو رہے تھے اور ان کے مطابق لکھی ہوئی ڈی ایچ لارنس کی ناول 'لیڈی چیٹر لیز لوور' پر بڑا شور مچا تھا اور برطانیہ میں اس پر پابندی لگادی گئی تھی۔ اس ناول کا ایک پہلا ایڈیشن میرے ایک دوست چھپا کر انگلستان سے لائے تھے اس میں لیڈی چیٹر لی کے اپنے گھر کے باغ بان سے جنسی تعلق کا ایسی جزویات کے ساتھ نقشہ کھینچا گیا تھا کہ کوئی ننگی بات باقی ہی نہیں رہ گئی تھی۔ لیڈی چیٹر لی شروع میں جنس سے بالکل ناواقف ہے، اس کا شوہر جنگ میں نچلے آدھے دھڑ سے معذور ہوگیا ہے اور وہ اسے گاڑی میں بٹھا کر باغ کی سیر کراتی ہے۔ رفتہ رفتہ باغبان کے جسم کے ان حصوں کی طرف متوجہ ہوتی جاتی ہے جو اس کا شوہر جنگ میں کھو چکا ہے اور پھر وہ مناظر سامنے آتے ہیں جن میں رفتہ رفتہ جنسی تعلق پوری عریانی کے ساتھ سامنے لایا جاتا ہے۔ باوجود اس کے کہ میرے اندر عریانی کے خلاف سخت تعصب تھا، میں نے تمام عریاں بیانات کو ایک عجیب سنجیدگی سے پڑھا اور وہ پست گدگدی جس کی بنا پر عریانی کو 'ولگر یا سوقی کہا جاتا ہے' مجھے مطلق محسوس نہیں ہوئی۔ پھر مجھے یہ بھی احساس ہوا کہ باوجود 'با اخلاق' ہونے کے میرے اندر ایک شوق ضرور تھا جس کو میں زبردستی چھپانا چاہتا تھا اور جس کو چھپانے کا ایک طریقہ یہ بھی تھا کہ عریانی کو پست کہوں، مخربِ اخلاق کہوں اور اِمّارل کہتا پھروں۔ چناں چہ جو لوگ عریانی پر جھٹ سے اعتراض جڑ دیتے ہیں وہ اگر اپنے گریبان میں منھ ڈال کر دیکھیں تو محسوس کریں گے کہ دل ہی دل میں وہ عام بدتمیزیوں سے کسی طرح بہتر نہیں ہیں۔ عریانی سے یک لخت نفرت اور اس کے خلاف بے تحاشا شور مچانے لگنا جیسا کہ میں نے 'مارل ہائجین' کے درس کے سلسلے میں کیا تھا، ایک قسم کی ذہنی 'ماربیڈیٹی' ہے۔

اب میں نے یہ بھی دیکھا اور میری سمجھ میں آیا کہ دنیا کی اعلیٰ ترین کتابیں بھی کبھی نہ کبھی عریاں نگاری پر ضرور آجاتی ہیں۔ قرآنِ حکیم ہی کی کچھ آیتیں ہیں جن کا ترجمہ کرنے میں مولوی نذیر

احمد نے ایک نوٹ لگایا ہے کہ عربی کے لفظ سے عریاں چیز مراد ہے اس لیے انھوں نے دوسرا لفظ استعمال کیا جو با اخلاق لوگوں میں رائج ہے۔ صحیح بخاری شریف میں بہت سے ایسے واقعات لکھے گئے ہیں جو جدید عریاں نگاروں کے دانت کھٹے کردیں۔ ان تمام کتابوں میں جن کو آسمانی اور مذہبی مانا جاتا ہے' جیسے 'بھگوت گیتا' 'توریت' 'انجیل' یا 'ژند اوستا' میں ایسے حصے ضرور ہیں جن کو عریاں کہا جائے۔ شیخ سعدی جیسے مصلحین اخلاق 'گلستاں' کے باب پنجم میں ایک حکایت بالکل عریانی کے ساتھ رقم کرتے ہیں۔ حد ہوگئی کہ مولانا روم بھی اپنی اس مثنوی جس کو 'ہست قرآن در زبانِ پہلوی' کہا گیا ہے، کچھ ایسے عریاں قصے بیان کرتے ہیں جو تمام عریاں نگاری کو مات کردیتے ہیں۔ شیکسپیر تو خیر ناٹک دکھانے والا تھا اور اس کے ڈراموں میں ایسے حصے کافی ہیں جن کو نکال کر ڈراموں کو درس میں شامل کیا جاتا ہے، مگر زاہد خشک ملٹن بھی حوا کی تصویر کھینچنے میں عریانی سے پرہیز نہیں کرپاتا۔ مخصوص مقصد کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے عریانی قدیم ادبا کا عام مسلک رہا۔ جدید دور میں بھی وہی روایت چلی آرہی ہے اور صرف اس فرق کے ساتھ کہ فرائڈ کے نظریۂ نفسیات نے اس کو زیادہ اہم کردیا ہے اور اس کے ذریعے درسِ اخلاق آج کل کی نفسیاتی الجھنوں کی وجہ سے زیادہ مفید معلوم ہو رہا ہے۔

اردو ادب میں عریاں نگاری کو ترقی پسند تحریک سے وابستہ کیا گیا۔ 'انگارے' وہ پہلی تصنیف تھی جس کے خلاف غلغلہ اُٹھا اور اسے 'بین' کردیا گیا۔ عصمت چغتائی کا 'لحاف'، حسن عسکری کا 'پھسلن' اور پھر کثیر تعداد میں عریاں افسانوں نے اور میرا جی اور راشد کی نظموں نے یہ رائے عام کردی کہ ترقی پسند ادب عریاں ہے اور ترقی پسندی کے معنی عریاں نگاری ہیں۔ اس پر ترقی پسندوں نے اپنی مخصوص تحریک کے خلاف عام رائے پھیلتی ہوئی دیکھ کر اپنی انجمن کا خاص اجلاس کیا جس میں یہ ریزولیوشن لائے کہ عریاں نگاری ترقی پسندی نہیں ہے۔ احتشام حسین صاحب نے بڑے تعجب سے بیان کیا کہ یہ ریزولیوشن آنے پر جس شخص نے اس کی سخت ترین مخالفت کی' وہ حسرت موہانی مرحوم تھے اور کیوں کہ مولانا بڑی اہم ہستی تھے ان کی ایما سے ریزولیوشن کی نوعیت بدل دی گئی۔ غور کرنے کی بات یہ ہے کہ مولانا سے زیادہ متقی شاید ان لوگوں میں کوئی نہیں ہے جو آج عریاں نگاری پر اعتراض جڑ دیتے ہیں۔ تو آخر بات کیا تھی کہ مولانا اس کی اس قدر موافقت میں تھے! ان کی شاعری کا کافی حصہ ایسا ہے جو داغ وغیرہ کی عریاں نگاری کے دائرے میں لایا جاسکتا ہے۔ ترقی پسندوں یا نئے ادیبوں کی عریاں نگاری اس سے کہیں زیادہ صاف اور کھلی ہوئی ہے مگر مولانا اپنی اس تختی سے اس کے طرف دار ہوئے جس کی بنا پر وہ ہر سیاسی معاملے میں سب سے الگ اور زوردار اور مخلص گنے جاتے رہے۔ اصل بات یہ ہے کہ عریاں نگاری کی مختلف قسمیں ہیں یا یوں کہیے کہ وہ حصے اور وہ حرکات جن کو عموماً عریانی سے متعلق کرتے ہیں، مختلف نظروں سے اور مختلف قسم کے جذبات سے وابستہ کر کے دیکھے جاسکتے ہیں۔ قرآن شریف میں

جو 'عریاں' الفاظ ہیں ان کے ذریعے ایسی ہدایت منظور ہے جس سے آدمی بھٹک نہ سکے، حدیثوں میں جو 'عریانی' ہے، اس کو ہم عصمتِ رسول کا خیال رکھتے ہوئے دیکھتے ہیں۔ ایک معالج بالکل سائنسی نقطۂ نظر سے عریاں حصوں کو دیکھتا ہے اور اس کے دل میں انھیں دیکھ کر وہ جذبات نہیں پیدا ہوتے جو عام 'ولگر' آدمی کے دل میں لازمی طور پر پیدا ہوتے ہیں۔ لہٰذا عریاں نگاری میں دیکھنا یہ ہے کہ یہ کس مقصد سے کی گئی ہے اور اس کا اثر کیا ہے۔ عام طور پر عریاں نگاری کو ایک دم سے برا کہہ دینے والے اس بات پر دھیان نہیں رکھتے۔ مثال کے لیے مجھے ایک صاحب یاد آتے ہیں جو بڑی اعلیٰ اسناد رکھتے ہیں اور بڑے اونچے عہدے پر بھی ہیں۔ میں ان کے ساتھ ڈی ایچ لارنس کی ناول 'سنز اینڈ لورز' کی فلم دیکھنے گیا۔ ڈی ایچ لارنس عریاں نگاری کے سلسلے میں بدنام ہوا مگر ساتھ ہی اس کی اس ناول کے بارے میں جس پر پابندی لگائی گئی پاپائے اعظم نے کہا کہ درسِ اخلاق کے لیے اس سے بہتر کتاب ممکن نہیں اور برنارڈ شا نے کہا 'اگر میرے کوئی لڑکی ہوتی تو یہ کتاب اسے ضرور پڑھواتا۔' اس فلم میں ایک لڑکے کی جنسی الجھن کا نقشہ کھینچا گیا ہے جو عورتوں سے تعلقات تو پیدا کرتا ہے مگر کسی سے مطمئن نہیں ہوتا اور آخر میں اکیلا ہی رہ جاتا ہے۔ میرے ساتھ جو موصوف فلم دیکھنے گئے تھے انھوں نے اس تمام نفسیاتی جائزے کو جو فلم والوں نے بھی ایک حد تک کامیابی سے پیش کیا ہے، بالکل نظر انداز کر دیا اور بولے 'وہ (یعنی ہیرو) دونوں لڑکیوں سے اپنا مطلب نکال کر چل دیا۔'

اس بات پر میں نے فوراً نتیجہ نکالا کہ موصوف باوجود تمام تعلیم کے عریانی کے سلسلے میں اسی پست درجے پر ہیں جس پر ہمارے عام غنڈے ہوتے ہیں اور اس مقصد کو سمجھنے کے اہل ہی نہیں ہیں جو ڈی ایچ لارنس نے اپنے ہیرو کو تمام تجربوں کے بعد زیادہ سے زیادہ پریشان دکھا کر واضح کیا ہے۔ ہمارے یہاں لوگ عریاں نگاری پر بغیر سمجھے بوجھے دھڑ سے اعتراض جھاڑ دیتے ہیں اور قانون عائد کرانے لگ جاتے ہیں وہ بھی مجھے اپنے موصوف دوست سے آگے جاتے ہوئے نہیں نظر آتے۔ اس وضاحت سے میرا یہ مطلب نہ سمجھا جائے کہ میں ہر قسم کی عریاں نگاری کو اخلاقی گردانتا ہوں اور الزام ان لوگوں کے سر رکھ رہا ہوں جو اس کا اخلاقی اثر نہیں لیتے یا لینے کے اہل نہیں ہیں۔ میں اپنے کو پہلے ہی ایک مضمون جو 'ساقی' کے کسی نمبر میں چھپا تھا، عریاں نگاری کا سخت مخالف گنوا چکا ہوں اور یہ بھی کہہ چکا ہوں کہ عریاں امور کا ذکر کرتے ہی میرا دھیان دیہات کے ان پست لونڈوں کی طرف جاتا ہے جو اپنے جنسی جذبات کو ادا کرنے کے لیے ننگے ہو جانے کے سوا اور کچھ جانتے ہی نہیں۔ اس وقت ہر ملک میں ادب میں کافی تعداد میں لکھنے والے ایسے ہیں جو عریاں نگاری کے سوا کچھ کرتے ہی نہیں اور ان کے پڑھنے والے ان کی تصانیف سے وہی پست لذت لیتے ہیں جو وہ ہم پہنچاتے ہیں۔ اس درجے کی عریاں نگاری کو میں جرم سمجھتا ہوں اور اسے روکنے کے لیے حکومت جو کچھ کرے اسے حق بجانب مانتا ہوں۔

پست درجے کے ادب کا مقصد محض سنسنی پیدا کرنا ہوتا ہے اور پست شخص اسی کی وجہ سے اس کا مربی بنتا ہے۔ ہر معاشرے کا جو اپنے کو تہذیب یافتہ بنانا چاہتا ہے اور ہر حکومت کا جو اپنے ملک کے لوگوں کو شائستگی سکھانا چاہتی ہے، یہ فرض ہے کہ ادب کو 'سنسنی' کے دائرے سے نکالنے کی کوشش کرے مگر یہ جان لینا بھی ضروری ہے کہ سنسنی کا مخرج محض جنس ہی نہیں بلکہ سیاست اور مذہب بھی ہو سکتے ہیں۔ اور پھر جاسوسی افسانے جو اس وقت سب سے زیادہ عام ہیں، قوم کو سنسنی کے درجے پر رکھنے میں سب سے زیادہ ممد ہوتے ہیں۔ حکومت کو انھیں ایک سرے سے قلم زد کر دینا چاہیے تاکہ جنس کے سلسلے ہی کا نہیں بلکہ ہر سلسلے کا صالح ادب وجود میں آئے اور قوم کے مذاق ادب کو ترقی ملے۔ فی الحال میں اس پوری تحریک کی طرف اشارہ ہی کر دینا کافی سمجھتا ہوں کیوں کہ اس وقت سوال صرف عریاں نگاری کا ہے اور اس سلسلے میں مصلحین اور حکومت سے جو بات عرض کرنا ہے وہ یہ کہ جدید ادب میں جہاں عریاں نگاری نظر آئے، اس کو قلم زد کرنے سے پہلے اس میں امتیاز برتنا ضروری ہے۔ وہ رسالے بالکل بند کر دیے جائیں جو پست لذت کے لیے عریاں نگاری کرتے ہیں مگر جن سنجیدہ مضامین اور افسانوں میں اعلیٰ مقصد کے لیے عریانی لانا ہی پڑی ہے، ان کو اپنا کام کرنے دیا جائے۔

عریانی کے سلسلے میں ایک بڑی اہم بات ہے جو ہمارے مصلحین بالکل نظر انداز کر دیتے ہیں۔ اگر انسان کے ارتقا کی تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ایک زمانے میں مرد اور عورت بالکل برہنہ پھرتے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے درمیان جنسی اشتعال کم ہوتے ہوتے وقت آیا کہ وہ پورے طور پر غیر جنسی ہونے لگے اور انسانی نسل کے بالکل ختم ہو جانے کا امکان سامنے آ گیا۔ اس لیے کپڑے ایجاد کیے گئے اور ان حصوں کو چھپایا گیا جن کا جنس سے براہ راست تعلق ہے۔ اس سے نتیجہ یہ نکلا کہ جب اتفاق سے پوشیدہ حصے پر نظر پڑ گئی تو جنسی اشتعال ہونے لگا۔ اس پر بھی یہ دیکھا گیا کہ اگر پوشیدہ حصوں کو بار بار اور بڑے غور سے دیکھا جائے تو ان سے نفرت ہونے لگتی ہے اس لیے ایسا انتظام کیا گیا کہ عورت اور مرد خاص خاص وقت ہی آمنے سامنے آئیں اور ان اوقات میں بھی اگر پوشیدہ حصوں کو دیکھنے کی ضرورت پڑے تو وقت رات کا ہو یا پھر ایسا ہو کہ رومانی دھوکا قائم رہے۔ تہذیب یافتہ عشق بازی کے جو طریقے ہمیں دنیا بھر میں رائج نظر آتے ہیں، ان میں کوشش یہی ہے کہ مرد اور عورت، کم سے کم ایک دوسرے کو عریاں دیکھ سکیں۔ یہ عالم انیسویں صدی تک چلتا رہا اور اس کی وجہ سے عریانی اخلاقی عیوب میں داخل ہو گئی۔ مگر بیسویں صدی کی تیز زندگی میں کپڑوں کے سلسلے میں بڑی کفایت برتی گئی اور مصروفیات میں عورتیں اور مرد ہر وقت ساتھ ساتھ رہنے لگے جس کا نتیجہ فرانس اور انگلستان میں اس وقت یوں ظاہر ہو رہا ہے کہ زیادہ تر لوگ 'غیر جنسی' ہوتے جا رہے ہیں۔ ہمارے یہاں اب بھی عورت ایک حد تک عجیب چیز ہے اور مرد اس کو گھورتے نظر آتے ہیں۔

یورپ کی عورتیں اس گھورنے پر تعجب کرتی ہیں۔ ہمارے یہاں اگر کسی مرد کا کسی عورت سے جسم اتفاق سے چھو جائے تو قیامت برپا ہو جاتی ہے جب کہ یورپ میں عورتیں بسوں میں مردوں کی گود میں بیٹھ جاتی ہیں۔ اکثر ہوٹلوں میں اجنبی مرد و عورت ایک ہی بستر پر سو جاتے ہیں اور صبح کو بالکل انجان ہی اٹھ کر چلے جاتے ہیں۔ ہمارے مصلحین اخلاق کے لیے عریانی اشتعال انگیز ہے کیوں کہ وہ اب تک انیسویں صدی سے پہلے کے دور میں ہیں۔ جن خاندانوں میں یا اداروں میں مرد اور عورت بہت زیادہ خلط ملط ہیں وہاں جنسی اشتعال بھی بہت کم نظر آتا ہے۔ جدید دور پردہ ختم کر رہا ہے اور پرانے لوگ کتنا ہی روکنا چاہیں ان کے روکے نہیں رُکتا۔ اکبرالہ آبادی پردے کے طرف دار تھے مگر سچے مبصر حیات ہونے کی بنا پر کہہ گئے ـ

جناب حضرت اکبر ہیں حامیٔ پردہ مگر یہ کب تک اور ان کی رباعیاں کب تک!

پردہ توڑنے سے ایک زمانے میں اشتعال ضرور بڑھا مگر اب یہ دیکھا گیا ہے کہ کھل کر آمنے سامنے آجانے سے عشق کے امکانات بہت کم ہوتے جا رہے ہیں۔ ہوا یہ کرتا تھا کہ ایک جھلک دیکھ کر عاشق اپنے تصور میں معشوق سے ہر خوبی وابستہ کر دیا کرتا تھا مگر اب روز دیکھنے پر اس کی نگاہ خوبیوں کے ساتھ خامیوں پر بھی پڑتی ہے اور یا تو وہ چکر میں رہتا ہے اور یا پھر نفرت کرنے لگتا ہے۔ اسی طرح یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ عریانی اس قدر مخدوش چیز نہیں ہے جتنی کہ پرانے معاشرے اور پرانے خیالات کے لوگ اسے سمجھتے ہیں۔ ہم آج کل دیکھتے ہیں کہ بہت سی لڑکیاں ٹیڈی لباس میں نکلتی ہیں اور پرانے زمانے والے ان کو دیکھ کر لاحول پڑھتے ہیں مگر ان کی حقیقت تک پہنچیے تو معلوم ہوگا کہ زیادہ تر لڑکوں کے اُنھیں یوں عریاں دیکھ کر دل بھر جاتے ہیں اور ان کے اثر انداز ہونے کے امکانات کم ہو جاتے ہیں۔ اس لیے جب پرانے لوگ بے پردگی اور عریانی پر جھلا کر کوئی سخت بات کہتے ہیں تو میں کہتا ہوں اس کا رواج بڑھنا بہتر ہے تا کہ معاشرے میں پردے وغیرہ کی وجہ سے جو خرابیاں آ گئی ہیں وہ دور ہو جائیں۔

ہر نظام شروع ہونے کے کچھ ہی بعد سے اسی طرح بگڑنے لگتا ہے کہ لوگ اس کے خلاف چلنے کے نئے نئے طریقے نکال لیتے ہیں جس سے اس کا نام تو قائم رہتا ہے مگر کام ختم ہوتا جاتا ہے۔ 'پردہ' جس کو وسیع معنوں میں ہر قسم کی زبانی اور اخلاقی پردہ داری پر بھی محیط کر سکتے ہیں، اب اس عالم پر آ گیا ہے کہ اس کا پردہ رکھتے ہوئے اس کے پیچھے ہر قسم کی بداخلاقی فراوانی سے چلنے لگی ہے۔ معلوم یہ ہوتا ہے کہ پردہ ایک ٹیومر سا ہے جس کو آپریشن سے نکالے بغیر معاشرے کی تندرستی خطرے میں ہے۔ عریاں نگاری بھی ایک قسم کی بے پردگی ہے اور اس کا برتنا بھی ایک قسم کا آپریشن ہے جو ایک ظاہری اور سڑے ہوئے اخلاق کو جڑ سے نکالنے کی کوشش کرتا ہے ان معنوں میں اس کا برتنا ایک قسم کی ضروری اصلاح ہے۔

آخر میں عریاں نگاری اور خاندانی منصوبہ بندی کا جسے حکومت نے لازمی سی چیز قرار دے کر تنظیم میں لانے کی کوشش کی ہے مقابلہ کروں گا۔ ہمارے نظامِ پردہ داری کا خاص مقصد یہ تھا کہ آبادی میں اضافہ ہو۔ میں نے بتایا کہ کپڑوں کی ایجاد وغیرہ کی وجہ بھی یہی تھی۔ اسلام کو شروع شروع میں اپنے پیروؤں کی تعداد ہر طرح بڑھانی تھی اس لیے ہمارے یہاں عورت مرد کے تعلقات کے سلسلے میں جتنے اصول، جتنے طریقے رائج کیے گئے، وہ جنسی اشتعال کو بڑھانے اور اس کو کثرتِ اولاد کی طرف لے جانے میں ممد ہوئے ہیں۔ شادی کی رسمیں جو بھی ہمارے یہاں ہیں وہ سب اس طرح تنظیم دی گئی ہیں کہ اشتعال بڑھتا رہے اور جب مرد و زن ملیں تو تولید کے امکانات زیادہ سے زیادہ ہو جائیں۔ اس لیے یہ مسلم ہے کہ مسلمانوں کی آبادی بمقابلہ اور قوموں کے زیادہ بڑھ رہی ہے اور خاص طور سے اس برصغیر کے مسلمانوں کی جن کی جنسی زندگی میں اسلامی اصول کے علاوہ ہندوستان کی سرزمین کے وہ اصول بھی شامل ہیں جو آبادی بڑھانے کا رجحان رکھتے ہیں۔

اب یہ مسلم ہو چکا ہے اور حکومت اس پر بڑی خاص توجہ دے رہی ہے کہ آبادی کم کی جائے ورنہ ایک ایسا قحط پڑے گا کہ سب ختم ہو جائیں گے۔ اس بات کا خیال رکھتے ہوئے اگر ایک نظم و ضبط کے ساتھ پردہ داری کو ختم کر دیا جائے تو ہمارے یہاں بھی آبادی کا وہ توازن آ جائے گا جو اس وقت فرانس اور انگلستان میں ہے۔ اس سلسلے میں ادب یہ مدد کر سکتا ہے کہ وہ 'جنسی اخلاق' کے اس ڈھونگ پر ضرب لگائے جو ہر طرح مضر ثابت ہو رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر وہ 'سنسنی' والی عریاں نگاری پر آئے گا تو ادب نہیں رہ جائے گا مگر قاعدے کے اندر اور مقصد کے ماتحت عریاں نگاری کر کے وہ اس جنسی اشتعال کو کم کر سکتا ہے جو آبادی بڑھا کر ہمارے لیے ایک خطرہ سامنے لا رہا ہے اور نفسیاتی الجھنیں پیدا کر کے ہمیں اخلاق کی راہ سے الگ ہٹا رہا ہے۔

اصل میں سارا معاملہ نقطۂ نظر کا ہے یعنی ہم زندگی کو کس کس نظر سے دیکھتے ہیں۔ مولانا روم، شیخ سعدی، ملٹن، ٹی ایس ایلیٹ جس نقطۂ نظر سے زندگی کو دیکھتے ہیں اس کے دائرے میں عریانی خاص طریقے پر معنی خیز ہو جاتی ہے۔ مثنوی مولانا روم میں اور گدھے کے تعلق والا قصہ اور اس پر مولانا کا حسبِ دستور وعظ ہمیں مجبور کرتا ہے کہ ہم عریانی کی پست لذت میں پھنسنے کے بجائے اس سے وہ سبق لیں جو مولانا دینا چاہتے ہیں۔ 'پیراڈائز لاسٹ' میں ایک اشارہ یہ واضح کرتا ہے کہ خطرے کا مقام یہ ہے کہ جس کی وجہ سے آدم فردوس کھوئیں گے اور جو آدم کی تمام اولاد کے لیے شدید خطرہ رہے گا۔ بہت سے لوگ پست ہونے کی بنا پر اس علی نقطہ نظر تک نہیں پہنچتے اور اس پر بھی اسی طرح کا اعتراض کر دیتے ہیں جیسا کہ کسی 'ڈگر' عریاں نگار پر ہونا چاہیے اور جوان دیہاتی غنڈوں کے درجے پر ہوتا۔ بہ جن کو اپنے

جذبات ادا کرنے کے لیے ننگے ہو جانے کے سوا کچھ آتا ہی نہیں۔ اس طرح جیسے کسی تصنیف میں عریاں نگاری مصنف کے اعلیٰ یا سفلی نقطۂ نظر کا اظہار ہو سکتی ہے‘ ویسے ہی اس کی بابت رائے قارئین کے اعلیٰ اور سفلی درجے کا اندازہ دے سکتی ہے۔ یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ ہمارے قارئین اس نقطۂ نظر تک پہنچتے ہیں جو عریاں نگار کا ہوتا ہے اور اس لیے صحیح اور غلط دونوں قسم کے عریاں نگاروں کو ایک ہی لاٹھی سے ہانک دیتے ہیں۔

ذاتی طور پر میں عریاں نگاری کا کبھی طرف دار نہیں ہوں اور اس تعصب سے بالاتر نہیں ہوا ہوں جو بچپن کے ماحول نے اس کے خلاف پیدا کر دیا ہے۔ میرے لیے ننگے ہو جانے یا ننگی باتیں کرنے کے یہ معنی ہیں کہ ایسا کرنے والا ذہنی اور اخلاقی لحاظ سے اتنا پست ہے کہ اپنے جذبات کے اظہار کے زیادہ لطیف طریقے جانتا ہی نہیں اور یہ بھی نہیں سمجھتا کہ عریانی کی لذت سے بالاتر ایک اور عظیم لذت ہے جو اسے ترک کرنے سے حاصل ہوتی ہے مگر پردہ داری کی ایک مضحک حد وہ بھی تھی جو قرون وسطیٰ کے گرجوں میں کچھ ننیں برتا کرتی تھیں یعنی وہ حمام کے اندر بھی کپڑے نہیں اُتارتی تھیں کہ کہیں خدا اُنھیں ننگا دیکھ کر اُن پر عذاب نازل نہ کر دے۔ دوسری حد ہمارے مصلحین کے یہاں ہے کہ اگر کسی افسانے میں اندرونی تاثرات کی طرف اشارہ بھی ہو تو اسے عریاں نگاری کہہ کر گھیر لیتے ہیں۔

مجھے اس قسم کے ایک صاحب یاد آتے ہیں جنھوں نے میرے ناول ’شامِ اودھ‘ کو پڑھنے کے بعد ایک کلب میں کہا: ’مگر عریاں ہے۔‘ اس وقت وہ سب نقاد جو اس کی بابت رائے دے چکے ہیں‘ موجود تھے، میں نے ان کی طرف رُخ کر کے پوچھا۔ ’عریانی کہاں ہے!‘ سب نے ان صاحب کو دیکھا اور مسکرائے۔ وہ صاحب عربی کے پروفیسر ہیں ان کے لیے زندگی کی ترجمانی ویسی ہی ہونا چاہیے، جیسی غزل اور قصیدے میں ہوتی ہے یعنی بالکل مبالغہ آمیز باتیں کہی جائیں۔ اگر کوئی شخص واقعیت اور ڈرامائی اثر کے دائرے میں آ گیا تو اُنھیں اسے برا کہنے کے لیے کوئی اور لفظ نہیں ملتا، سوائے اس کے کہ ’عریاں‘ کہہ دیں۔ ایسی تنقید میں کوئی ذاتی جلن، کسی کی شہرت دیکھ کر اس پر رشک کرنا بھی شامل ہوتا ہے۔ بہرحال یہ ’جلاہٹ‘ ہوتی ہے ’تنقید‘ نہیں اور اس پر مجھے پہلے غصہ آ جایا کرتا تھا مگر اب ہنسی آ جاتی ہے۔ مگر مشکل یہ ہے کہ میں ہنس کر کہاں جاؤں گا جب کہ ایسے لوگوں نے جتھے بنا رکھے ہیں اور بات کا جواب بات سے دینے کے بجائے بزدلوں کی طرح اپنے تمام ذرائع ذاتی نقصان پہنچانے پر لگا دیتے ہیں۔ اگر حکومت مجھ سے کہے ’مانگ کیا مانگتا ہے‘ تو یہی عرض کروں گا ’ایسے لوگوں کو کٹہرے میں رکھنے کا انتظام کر دیجیے۔‘

ماخذ (اُردو۔۸۶)

فحاشی کی تعبیریں

سلیم اختر

فحاشی کی خوابِ جوانی کی مانند بہت سی تعبیریں کی جا چکی ہیں اس لیے کہ اپنی انفرادی حیثیت میں کوئی تحریر بھی فحش قرار نہیں دی جا سکتی بلکہ سماجی تحریمات‘ مذہب، اوامر و نواہی اور قانونِ تعزیرات کے تناظر میں دیکھنے پر ہی کسی تخلیق کو فحش قرار دیا جاتا ہے اور پھر اس کے بعد احتساب کا مسئلہ سامنے آتا ہے قطع نظر اس سے کہ احتساب سے ممکنہ فوائد حاصل ہوتے بھی ہیں یا اس ’فحش‘ تحریر کی مزید تشہیر ہی ہوتی ہے۔ اس ضمن میں یہ امر بھی اساسی اہمیت کا حامل ہے کہ سماجی تحریمات اور قانون تعزیرات کوئی قوانین فطرت نہیں کہ نا قابلِ شکست ہوں بلکہ تغیر پذیر ہوں اور اسی لئے اضافی۔ جب کہ ادب پارہ تخلیق کی بنا پر دیگر تخلیقات کی مانند انفرادیت ہی کا حامل نہیں بلکہ زمان و امکان میں اپنا جداگانہ وجود بھی رکھتا ہے۔ علاوہ ازیں ادبی یا فنی تخلیقات کے اصول معاشرے، مذہب اور قانون ایسی ہی جداگانہ حیثیت رکھتے ہیں وہ ان کے تابع نہیں بلکہ ان سے ماورا اور بے نیاز بھی ہیں اس لیے تخلیق مطلق ہے لہٰذا مطلق کی پرکھ کے لئے اضافی کا معیار بنانا غیر منطقی ہے اور اسی لیے گمراہ کن بھی۔

اگر قدیم داستانوں‘ مثنویوں‘ ریختی اور بعض لکھنوی شعرا کے اشعار کا جائزہ لیا جائے تو ان میں سے ایسا مواد نکل آئے گا جو آج کے معیار کے لحاظ سے یقیناً فحش قرار دیا جا سکتا ہے بلکہ اسی بنا پر ’باغ و بہار‘ کے تو بعض حصے ہی حذف کرا دیئے گئے تھے۔ جب ڈنکن فاربس نے ۱۸۶۰ء میں لندن سے ’باغ و بہار‘ کا چوتھا ایڈیشن طبع کیا تو اس کے پیش لفظ میں یہ بھی لکھا: ’یہ واضح رہے کہ میر امن کے اصل متن اور بعد ازاں اشاعت پذیر ہونے والے ایڈیشنوں میں کچھ ایسے قابلِ اعتراض حصے بھی تھے جو مشرقی تحریروں میں عموماً پائے جاتے ہیں اُنھیں میں نے کیپٹن ڈبلیو این ایس، ڈائریکٹر آف پبلک انسٹرکشن اور پرنسپل کلکتہ یونی ورسٹی کے ایما پر یا تو حذف کر دیا یا قدرے مختلف الفاظ میں بیان کر دیا۔‘ ڈنکن فاربس کے پیش لفظ میں اصل چٹھی کی نقل بھی درج ہے جس میں ’باغ و بہار‘ کے ضمن میں یہ لکھا ہے کہ ’آئندہ طباعتوں سے ایسے تمام حصے حذف کر دیں جو ممتحن حضرات کے لئے باعثِ شرم اور طلبا کے لئے مخرب الاخلاق بن سکتے ہوں۔‘ آج بھی ’باغ و بہار‘ نصاب میں ہے اور وہ ’مخرب الاخلاق‘ حصے بھی موجود ہیں!

منٹو تو یوں ہی بدنام ہوا، ہمارے قدیم ادب میں ایسی مثالوں کی کمی نہیں اور پھر ان پر مستزاد

مولانا روی کی بعض حکایات، مذہبی صحائف کے بعض قصص، احادیث میں جماع اور غسل کے مسائل اور عورتوں کے لیے مثالی تالیف 'بہشتی زیور' کے بعض بیانات، کہاں تک گنواؤں! فہرست طویل سے طویل تر ہوتی جائے گی۔ مثالیں پیش کرنے کی یوں جرات نہیں کی کہ ع ڈرتا ہوں آسمان سے بجلی نہ گر پڑے!

ادب اور فحاشی کے باہمی رابطے کے فن میں یہ اساسی حقیقت ملحوظ ذہنی چاہیے کہ فحش سے مراد جنس کا بیان ہے، جنس سماجی تحریمات کے کانٹوں میں کھلا پھول ہے۔ اس لیے اخلاقی معیاروں کے ساتھ ساتھ جنس اور پھر اس کے نتیجے میں فحاشی کے بارے میں تصورات تبدیل ہوتے رہتے ہیں۔ ہم جب اپنے ماحول کو دیکھتے ہیں تو مصنوعی شرم کا جواز سمجھ میں نہیں آتا۔ اسلام نے چار شادیوں کی اجازت ہی نہیں دی بلکہ جنس کو زندگی کی اہم حقیقت سمجھتے ہوئے تجرد کی ممانعت کی۔ اسی طرح قرآن مجید میں عورت کو 'مرد کی کھیتی' قرار دیا گیا ہے نہ کہ تجرد پسند سینٹ پال کی طرح یہ اعلان کیا: 'پس میں بے بیاہوں اور بیواؤں کے حق میں یہ کہتا ہوں کہ ان کے لیے ایسا ہی رہنا اچھا ہے جیسا میں ہوں۔ لیکن اگر وہ ضبط نہ کر سکیں تو بیاہ کر لیں کیوں کہ بیاہ کر لینا مست ہونے سے بہتر ہے۔'

ادب اور فحاشی کی بحث میں نامناسب اصطلاحات کی وجہ سے بھی بڑی الجھنیں پیدا ہوتی ہیں۔ انگریزی میں اس لحاظ سے زیادہ سہولت ہے وہاں 'اوبسینٹی' اور 'پورنوگرافی' دو اصطلاحات ہیں یہ ادبی ہی نہیں بلکہ ان کی قانونی حیثیت بھی ہے چناں چہ 'یولیسیس' پر سے امریکا میں پابندی ختم کرنے والے جسٹس جان ایم وولزلے نے ۶ ستمبر ۱۹۳۳ء کو اپنے فیصلہ میں یہ لکھا: 'عدالتوں نے 'اوبسین' کی یہ قانونی تعریف متعین کی ہے: 'جنسی خواہشات کی بیداری یا جنسی لحاظ سے گندے خیالات اور پرشہوت جذبات کا بھڑکانا'۔ اپنے فیصلے کے ابتدائی حصے میں جسٹس وولزلے نے یہ بھی تحریر کیا: 'کسی بھی کتاب کو 'اوبسین' قرار دیے جانے والے ہر مقدمہ میں اس امر کا تعین کرنا ہوگا کہ کیا باعثِ تحریر پورنوگرافی ہی تھا یعنی تحریر کے ذریعے جنس کا استحصال۔'

مگر ہمارے ہاں ابھی تک باقاعدہ مفہوم کی حامل اصطلاحات نہیں۔ بس عریانی اور فحاشی ایسے غیر واضح مفہوم کے حامل الفاظ سے کام چلایا جاتا ہے۔ عریانی کو اگر 'اوبسین' کا مترادف قرار دے بھی دیا جائے، انگریزی اصطلاح کے درست مفہوم کا ابلاغ پھر بھی نہیں ہو پاتا۔ میرے خیال میں اگر 'اوبسینٹی' کے لئے 'جنس نگاری' استعمال کیا جائے اور جنس کی تجارتی مقاصد کے لئے بروئے کاری یعنی 'پورنوگرافی' کے لئے 'فحاشی' تو اس مسئلے پر زیادہ قطعیت سے بات کی جا سکتی ہے۔ اس صورت میں تحریمات کی بنا پر 'ناقابل بیان' بات کا بیان کرنا 'عریانی' قرار دیا جا سکتا ہے۔ ہمارے ہاں کھلے بندوں بوسہ بازی معیوب ہے۔ ادب پارہ میں بوسہ بازی 'عریانی' ہوگی، جب کہ مغربی ادب میں

نہیں۔ منٹو کے افسانے 'ٹھنڈا گوشت' میں 'جنس نگاری' اور وہی وہانوی قسم کی کتابوں میں 'فحاشی'!

تخلیق کار زندگی کا نباض ہے اس لیے جب سماجی تحریمات انسانی سوچ کے خزانے پر افعی بن کر پہرہ دے رہی ہوں تو تخلیقات سے چارہ سازی لازم ہو جاتی ہے اور وہ کسی ماہر جراح کی مانند سماجی عوارض کے ان پکے ہوئے پھوڑوں پر قلم کے نشتر سے حملہ آور ہوتا ہے جن کے تعفن اور زہرناکی سے سماج کی صحت مندی کو خطرہ لاحق ہوتا ہے کیوں کہ سب سے زیادہ پابندیاں جنس پر ہی عائد ہیں۔ ادھر انسانی زندگی میں اس کا بالواسطہ اظہار بھی سب سے زیادہ ملتا ہے اس لیے سماجی تطہیر کے لیے بعض اوقات جنس نگاری لازم ہو جاتی ہے۔ اسی لئے منٹو اور ڈی ایچ لارنس کی طرح بہت سے تخلیق کاروں کے لئے جنس نگاری سماجی اظہار کا ایک ذریعہ بنی۔

نارمن میلر نے ایک مرتبہ اس خیال کا اظہار کیا تھا کہ جنگِ کوریا ایسی صورتِ حال سے نفرت کے اظہار کے لئے 'نیکیڈ اینڈ دی ڈیڈ' میں 'چوحرفی' الفاظ کی ضرورت تھی اور ناول میں اس سے کام چلا لیا گیا مگر آج ویت نام کی جنگ میں پژمردگی اور مایوسی کی جس فضا کو جنم دیا اور اس کی شدت بیان کرنے کے لیے تو اب 'چوحرفی' لفظ اور گالیاں بھی ناکافی ثابت ہو رہی ہیں۔ شاید اسی لئے وہاں کی نئی نسل اور 'ہپی لوگ' تو بطور احتجاج چوراہوں پر کپڑے اتار کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ بقول جسٹس وولزلے یاب اگر جوئس، یولیسس کے لکھنے میں ایمانداری سے کام نہ لیتے ہوئے اظہار کے لئے یہ تکنیک وضع نہ کرتا تو نفسیاتی لحاظ سے گمراہ کن ہوتا اور یوں وہ اپنے ہی طریقِ اظہار کی عدم پیروی کا مرتکب قرار دیا جاتا اور اس کا یہ طرزِ عمل فن کارانہ نقطۂ نگاہ سے ناقابلِ معافی ہوتا'۔

جب انفعالیت، ذہنی پژمردگی اور یاسیت قومی سطح پر فروغ پا رہی ہوں اور فرد میں خارج سے فرار حاصل کر کے اپنی ذات میں پناہ گزینی کا رجحان بڑھ رہا ہو تو معاشرے کے سمندر میں ذات ایک جزیرہ بن جاتی ہے۔ اس مریضانہ صورتِ حالات کی شناخت کے لئے جنس سے دلچسپی اور جنس نگاری کو سب سے اہم علامت قرار دیا جا سکتا ہے۔ اسی لیے تو ۱۹۲۰ء کے بعد سے سیاسی اور سماجی سطح پر احتجاج میں جنس اور جنس نگاری نے بھی اہم کردار ادا کیا۔ اس لیے 'انگارے' سے لے کر منٹو تک اور پھر منٹو کے مقدمات سے لے کر اب تک معاشرہ نیچے ہی جا رہا ہے اور ادب میں جنس کا سکہ چل رہا ہے۔

ان حالات میں تخلیق کار کے لیے اس کے سوا اور کوئی چارۂ کار نہیں رہتا کہ وہ داخلی خلا کا سفر طے کرتے ہوئے ذات کی بھول بھلیوں میں سے گزر کر زندگی کے اس حسن کو اجاگر کرے جسے امرونہی نے گندگی قرار دے رکھا ہے۔ ایک نام نہاد مذہبی تشخص کے لیے چار بیویوں کے باوجود بھی جنس گندگی ہو سکتی ہے مگر ایک بالغ نظر اور باشعور تخلیق کار کے لئے نہیں اور ان حالات میں تو جنس نگاری کی اہمیت اور بھی بڑھ جاتی ہے جب معاشرہ دورِ انتشار سے گزر رہا ہو اور قومی مقصد اور ملی نصب العین کے

فقدان کی بنا پر فرد کو تذبذب اور عدم مفاہمت کی بنا پر معاشرہ سے کٹ کر رہ جانے کا اندیشہ لاحق ہو۔ ان حالات میں جب کہ صراط مستقیم نہ ہو اور نگاہ بھی دھندلا چکی ہو تو تخلیق کار کے ’کلیڈ وسکوپک وژن‘ کی بناء پر صرف جنس ہی آخری پناہ گاہ رہ جاتی ہے کہ حیاتِ انسانی میں صحت مندی کی ایک انتہا سے لے کر مریضانہ کج روی کی دوسری انتہا تک صرف جنس ہی ایک ایسا وقوعہ ہے جو اس وژن کے حامل تخلیق کار کے لئے تنوع کے لامحدود مناظر پیش کرسکتا ہے۔

ادب کے کسی بھی مسئلے پر قارئین کو فراموش کر کے بحث نہیں کی جاسکتی اس لیے کہ عریانی، جنس نگاری یا فحاشی جہاں موضوع اور اسلوب کے مسائل ہیں وہاں یہ قارئین کے بھی ہیں۔ کتاب لکھتے اور چھاپتے وقت تخلیق کار اور ناشر نے یہ نہیں طے کیا ہوتا کہ اسے کس عمر، ذہنی سطح اور طبقاتی حیثیت کے قاری خریدیں اور پڑھیں گے۔ جس طرح ریڈیو اسٹیشن سے پروگرام نشر کر دیا جاتا ہے اور اسے سننے کے لیے اسی مخصوص فریکونسی کے مطابق ہی اپنے ریڈیو کو سیٹ کرنا ہوتا ہے، اسی طرح تخلیقات کا معاملہ ہے لکھنے والا وقتِ تخلیق، ذہنی کیفیات اور نفسی واردات کے بعد جو ہفت خوان طے کرتا ہے ان کا درست ابلاغ اسی صورت میں ہوسکتا ہے جب قاری کا ذہن تعصبات، تحریمات، امر و نہی اور اسی قسم کے منفی عناصر سے پاک ہو۔ کیوں کہ تحسین ادب میں یہ منفی عناصر ہی سب سے بڑی رکاوٹ بنتے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ انھی کی بنا پر غلط بحث سے مسائل الجھتے ہیں۔ ادب کا مخاطب انسان ہوتا ہے نہ کہ کوئی عقیدہ، قاعدہ یا نظریہ۔

جذباتی لگاؤ کی بنا پر جب کسی نظریے یا جزو ایمان عقیدہ کی مخالفت نہ برداشت کرتے ہوئے اس کے خلاف آواز بلند کی جائے تو اسے سمجھا جاسکتا ہے۔ لیکن جنس کے خلاف صدائے احتجاج کی تک سمجھ میں نہیں آتی کہ یہ حیاتیاتی وقوعہ ہی نہیں بلکہ کسی حد تک انسانی جذبات کی اساس بھی ہے۔ کیا یہ محض تمدن کی مصنوعی شرم کی بنا پر ہے یا ’خاموشی کی سازش‘ کے باعث، تخلیق کار کو اس سے غرض نہیں۔ تخلیقات سماج میں انقلاب برپا کرسکتی ہیں لیکن اس کے ابوجود بھی ان کا ’سماجی‘ ہونا ضروری نہیں۔ اس طرح جنس نگاری معاشرہ میں ہلچل پیدا کرسکتی ہے اور اندازِ نظر بھی تبدیل کرسکتی ہے لیکن اس کا معاشرتی قواعد کے تابع ہونا ضروری نہیں۔ اس سے جنس نگاری کے خلاف سماجی احتجاج کی وجہ بھی سمجھ میں آتی ہے کہ تمدنی لبادوں میں لپٹا ہوا فرد خود کو ننگا محسوس کرتا ہے۔ جو کج روی، شائستگی نے چھپا رکھی تھی ادب میں برسرِعام اس کا ڈھنڈورا پیٹ دیا جاتا ہے۔ شاید اسی لئے جنس کے خلاف احتجاج میں مذہبی یا پھر متوسط طبقے کے افراد پیش پیش ہوتے ہیں اس لئے کہ مذہبی لوگوں کے پاس حقائق کو دیکھنے والی آنکھ نہیں جب کہ متوسط طبقہ حقائق کی تاب نہیں لاسکتا۔

متوسط طبقہ سے مراد ایک خاص حد تک آمدنی رکھنے والے لوگ نہیں بلکہ متوسط طبقے سے مراد مخصوص ذہنیت کے حامل افراد ہیں یعنی وہ لوگ جو کولہو کے بیل بنے اپنی زندگی کے معمولات میں

نباتات سے مماثل معلوم ہوتے ہیں اس لئے یہ ہر اس شے، حالت، وقوعہ یا نظریے کے مخالف ہوتے ہیں جو کسی نہ کسی طرح کی تبدیلی پر منتج ہو سکتا ہے۔ اسی انداز سے جو ایک خاص طرح کی انفعالیت جنم لیتی ہے اسی کا رنگ چوکھا نسبتاً کم آمدنی کی بناپر، عدم تحفظ کے احساس سے ہوتا ہے۔ ان کی منزل زندگی میں ایسا مقام حاصل کرنا ہے جو ان میں احساس تحفظ پیدا کر سکے تاکہ موجودہ حیثیت سے لڑھک کر نچلے طبقے میں جا گرنے کا خدشہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے مٹ جائے اسی لئے اقدار، ضوابط، تحریمات وغیرہ ان کے لئے اتنی پابندیاں نہیں جتنی معاشرے میں اپنی حیثیت مستحکم کرنے کے ذرائع۔ وہ جنس سمیت کسی بھی ایسی بات کے تذکرے سے زندگی کے ان سہاروں کو متزلزل محسوس کرتے ہیں تو اخلاق اور شائستگی کے نام پر ان کے خلاف صف آرا ہو جاتے ہیں، لیکن نتیجہ؟

انسانی فطرت کا یہ خاص وصف ہے کہ 'پاتے نہیں جب راہ تو چڑھ جاتے ہیں نالے' کے مصداق جنس اور اس کے صحت مندانہ اظہار پر عائد کردہ پابندیاں بالواسطہ اظہار یا تسکین کے ذرائع کبھی بھی مسدود نہیں کر سکیں۔ فرانس، اٹلی اور اسپین وغیرہ کے مقابلے میں انگلستان میں تحریمات وغیرہ کی بنا پر بظاہر تو جنسی شرم کا راج تھا لیکن حقیقت یہ تھی کہ اُس کے گلی کوچے طوائفوں سے اٹے پڑے تھے اور آبادی کا کثیر حصہ آتشک میں مبتلا تھا۔ بلکہ ڈی ایچ لارنس کے خیال میں تو جنس کا خوف آتشک ہی کا پیدا کردہ ہے۔ وکٹورین انگلستان کے متوسط طبقے کی اخلاقیات کے لئے اب ایک مثال کی حیثیت اختیار کر چکا ہے لیکن ان 'پرانے وکٹوریاؤں' کی نجی زندگی کچھ اور ہی تھی۔ اس ضمن میں جیمز گراہم مرے کا نظریہ بھی قابل غور ہے۔ ان کے بقول 'آج ہم، 'ہم جنسی تناؤ' کج روی اور تحت الشعور میں احساسِ گناہ کے باہمی روابط خوب سمجھتے ہیں، وکٹورین علمی سطح پر اس سے آگاہ نہ تھے، لیکن ان روابط کا اظہار ان کے پسندیدہ فحش ادب سے ہو جاتا ہے جس کی نمایاں خصوصیت کج روی اور آزاد پسندی تھی۔

اسی طرح بہت سے مشہور اور ثقہ ادیبوں نے اپنے تناؤ کو ہلکا کرنے کے لئے شوقیہ بھی بہت کچھ لکھ ڈالا۔ اس سلسلے میں مارک ٹوائن، سوئفٹ، اور بائرن وغیرہ صرف چند ہی نام ہیں۔ ہمارے یہاں بھی 'الہیات' کے نام سے بڑے بڑے شعراء سے منسوب فحش اشعار نجی محفلوں میں سنائے جاتے ہیں جب کہ عصمت چغتائی نے تو جوش کا نام بھی لے ڈالا۔ یہ سب مصنوعی شرم کے لبادے کو سرکا کر ذرا انسانوں کی طرح سانس لینے کی نجی کوششیں قرار دی جاسکتی ہیں۔ جوفرے گورر نے اس وقوعہ کا اجتماعی سطح پر جائزہ لیتے ہوئے اس خیال کا اظہار کیا کہ 'فحاشی اور مصنوعی شرم کا جام و مینا ایک ساتھ ہوتا ہے کیوں کہ جس زمانے میں مصنوعی شرم کا جتنا زیادہ چرچا ہوتا ہے' فحاشی اتنی ہی مقبول نظر آتی ہے۔ جنس نگاری کسی خاص واقعے کا بیان ہے جب کہ مصنوعی شرم جنسی موضوعات پر پابندی عائد کرتی ہے۔ تجربہ کا برملا اظہار ممنوعات میں سے ہوتا ہے۔ اس لیے اس کے بارے میں حقیقت سے قریب تر تصورات کی اساس

پر ایک جہانِ خیال کی تشکیل کی جاتی ہے جس کی سب سے بڑی خصوصیت احساسِ جرم پر مبنی لذّت یا لذّت پر مبنی احساسِ جرم ہوتا ہے۔ چناں چہ جن افراد میں تصورات کی قوت کمزور ہو یا جن کی جنسی قوت ناقابلِ تسکین ہوتی ہے' وہی فحش کے سب سے بڑے قدردان ثابت ہوتے ہیں'۔

احتجاج کا احتساب سے گہرا تعلق ہے اور احتساب کیونکہ قانونی فعل ہے اس لئے جنس نگاری کی قانونی حیثیت کی تفہیم بھی لازمی ہو جاتی ہے۔ ۱۷۲۷ء تک انگلستان میں جنس نگاری کا 'ناپاک فعل' مذہبی عدالتوں کے دائرہ اختیار میں رہا۔ ۱۸۵۷ء میں پہلی مرتبہ 'اوبسین پبلی کیشن ایکٹ' پاس کیا گیا جس میں اس کی حدود وغیرہ متعین کی گئیں۔ یہ قانون ۱۹۵۹ء تک مروج رہا اور اسی سال ایک نیا قانون بنایا گیا۔ انگریزی قانون کی پیروی میں امریکہ میں ۱۷۲۷ء میں اسے تعزیراتی جرم قرار دیا گیا۔ امریکی آئین کی پہلی اور چودھویں ترامیم تحریر و تقریر اور نشر و اشاعت کی آزادی کی ضامن ہیں لیکن اس کے باوجود فحاشی کے الزام میں کتابیں' رسالے اور فلمیں ضبط ہوتی رہتی تھیں۔ تعزیراتی قوانین تو تھے لیکن ان سے کسی معیار کی تشکیل نہ ہو سکی۔ علاوہ ازیں ہر اسٹیٹ کے اپنے اپنے قوانین بھی تھے۔ یوں وضاحت' قطعیت اور ایک معیار کے فقدان کی بنا پر ایک کتاب ایک اسٹیٹ میں تو ضبط ہو جاتی لیکن دوسرے میں کھلے بندوں بکتی رہتی۔

انگلستان میں 'ریجینا بمقابلہ ہیکلن' کے مقدمے میں فیصلہ صادر کرتے وقت ۱۸۶۸ء میں تاثر پذیر طبائع پر ادب پارہ کے جداگانہ حصوں کے جنسی اثرات کو فحش کا معیار قرار دیا گیا۔ بعد ازاں بالعموم اسی مثال کے پیش نظر فیصلے ہوتے رہے۔ لیکن اس معیار میں بھی کوئی قطعیت نہ تھی کیوں کہ چند لفظ بھی مجرم بنا سکتے تھے۔ اسی طرح 'تاثر پذیر طبع' کی بناء پر بچے اور بوڑھے' بالغ اور نابالغ کا امتیاز بھی نہیں رہ سکتا تھا یہ خامی امریکا کے مشہور مقدمے 'روتھ (Ruth) بمقابلہ یو ایس' کے فیصلے سے دور ہوئی۔ امریکی عدالتِ عالیہ نے (اب سابق) چیف جسٹس ارل وارن کی سرکردگی میں ۱۹۵۷ء میں ان تین نکات پر مشتمل معیار قائم کیا: (۱) مواد کی کسی طرح کی بھی سماجی اہمیت نہ ہو۔ (۲) معاشرے کے عام معیار کو مدنظر رکھتے ہوئے مواد کی بحیثیتِ مجموعی، تمام کشش کا باعث محض جنسی لذتیت ہی بنتی ہو۔ (۳) مواد کی ترتیب اور پیشکش میں عام معاشرتی آزادی سے پیدا ہونے والی حدود کی بھی خلاف ورزی کی گئی ہو۔

عدالتِ عالیہ کے دو اور ججوں' جسٹس بلیک اور جسٹس ڈگلس کے خیال میں خالص فحاشی 'ہارڈ کور پورنوگرافی' کی پہچان کا سب سے بڑا معیار کسی تحریر میں غیر شہوانی مناظر سے وقفے پیدا کئے بغیر شہوت خیز مناظر کا تسلسل سے بیان کرنا ہے۔ (بمبئی ہائی کورٹ نے بھی اس معیار کے پیشِ نگاہ 'لیڈی

چیٹر لیز لورز پر سے پابندیاں دور کی تھیں) چیف جسٹس ارل وارن کی خیال میں کسی مسلمہ قومی معیار کی عدم موجودگی کی بنا پر کسی مواد کو فحش قرار دے کر اس پر پابندی عائد کرنے کے لیے مقامی معیار کو بھی ملحوظ رکھنا چاہئے جب کہ جسٹس بلیک کے خیال میں احتساب سراسر غیر آئینی ہے۔ ان کے خیال میں اس مقصد کے لئے حکومت کو فن کارانہ اظہار اور واضح عریانی میں امتیاز کرنا چاہیے۔ مثلاً سرِ عام ننگا ہو جانا قابلِ مواخذہ جرم ہو سکتا ہے لیکن ادب کو ہر حالت میں اس سے ماورا ہونا چاہیے۔ اس لیے جنس نگاری کو آئینی تحفظ حاصل ہونا چاہیے چناں چہ ۸۰ سالہ جسٹس بلیک کے بقول ’جنس زندگی کی حقیقت ہے اور میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ یہ عدالت جنس کے بارے میں تحریر تقریر پر جس طور سے احتساب عائد کر رہی ہے یہ کیسے برقرار رہ سکتا ہے بلکہ اس کے لئے تو ہمارے معاشرے کو آج کے مقابلے میں مزید خطرات سے دوچار ہونا پڑے گا۔‘ اسی طرح جسٹس اسٹوارٹ کے خیال میں احتساب معاشرے کی خود اعتمادی کے فقدان کا غماز ہوتا ہے۔ آئین نے ثقہ اور غیر ثقہ تحریر اور شائستگی کے ابتذال دونوں ہی کو تحفظ دے رکھا ہے۔ وہ کتاب جو میرے لئے بے سود ہے میرے پڑوسی کے لیے کارآمد ثابت ہو سکتی ہے۔ ہمارے آئین کے تحت جس آزاد معاشرے نے جنم لیا ہے اس میں ہر فرد کو آزادانہ انتخاب کی اجازت ہونی چاہئے۔ فحش کے تعین میں اب ایک اور عنصر نے بھی اہمیت اختیار کر لی ہے اور وہ ہے طریقِ تقسیم اور پبلسٹی۔ چناں چہ مارچ ۱۹۶۶ء میں عدالت عالیہ نے ۱۴۴ مطبوعات و جرائد کو ضبط کرتے ہوئے ان کے ناشرین کی سزائیں اس بنا پر بحال رکھیں کہ بقول جسٹس ولیم جے برنین ’ان مطبوعات کا مواد اتنا تحریک خیز نہیں جتنا کہ اشتہارات کا گدگدانے والا انداز۔‘ چناں چہ عدالت کے فیصلے کی رو سے جب فروخت کنندہ کا اساسی مقصد ہی مطبوعات کے شہوانی پہلوؤں کو ابھارنا ہو تو یہ امر مواد کے فحش قرار دیئے جانے میں بنیادی اہمیت حاصل کر لیتا ہے۔‘

آخر میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا احتساب سے کوئی فائدہ بھی ہو سکتا ہے کہ محض چوری کے گڑ والی بات بن جاتی ہے۔ برطانیہ میں ۱۹۳۷ء میں لارڈ چیمبرلین یعنی شاہی محتسب کا عہدہ وزیر اعظم رابرٹ وال پول کے زمانے میں قائم کیا گیا اور اس وقت سے لے کر جولائی ۱۹۶۸ء یعنی اس کے ختم کر دیئے جانے تک لارڈ چیمبرلین ہر ڈرامے میں سے کانٹ چھانٹ یا پابندی کا اختیار رکھتا تھا۔ ماضی میں ’گھوسٹس‘ (ابسن)، ’مسز وارنز پروفیشن‘ (برنارڈ شا)، ’ہنکس کیکٹرز ان سرچ آف این اوتھر‘ (پیری آندیلو)، ’اے ویو فرام دی برج‘ (آرتھر ملر) اور ’کیٹ آن اے ہاٹ ٹن روف‘ (ٹینیسی ولیمز) ایسے شاہ کار ڈراموں پر بھی پابندی عائد کی گئی۔ اس سے احتساب کے ادبی فوائد کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

سویڈن اور ڈنمارک ادب اور فن کے ضمن میں بہت آزاد خیال ممالک سمجھے جاتے ہیں۔ وہاں جون ۱۹۶۸ء میں ۷۶ اراکین پر مشتمل ڈنمارک کی پارلیمنٹ نے ۱۳ کے مقابلہ میں ۱۵۹ سے ادب میں فحاشی کی قانونی اور تعزیراتی حیثیت ختم کردی تو نتیجہ عریانی اور فحاشی کے سیلاب کی صورت میں نہ نکلا بلکہ ٹائم (۲۶ جنوری ۱۹۶۸ء) کے جائزے کے مطابق فحش کتابوں کی فروخت میں ۷۵ فیصد کمی ہوگئی۔ قانون کے نفاذ سے چھ ماہ قبل ایک نئی فحش کتاب کے ۲۰ اور ۲۵ ہزار کے درمیان نسخے فروخت ہوسکتے تھے لیکن قانون کے نفاذ کے بعد ان کی اشاعت اور فروخت نصف بھی نہ رہی۔ اس کے ساتھ ہی جب جرائم کا تقابلی جائزہ لیا گیا تو جنسی جرائم، غیر قانونی عمل، جنسیت، جنسی امراض کی تعداد میں بھی کوئی اضافہ نہیں پایا گیا۔ کیا تتلی سے ڈرنے والے ہمارے یاران اتنے بھی نکتہ دان نہیں بن سکتے!

ماخذ (اُردو۔۳۳)

فحش ادب کیا ہے!

شہزاد منظر

فحش ادب کیا ہے، فحش نگاری کسے کہتے ہیں، فحش کس قسم کی تحریر کو کہا جاتا ہے اور کسے نہیں، کیا ادب میں جنس کا تذکرہ فحش نگاری ہے، یہ وہ سوالات ہیں جن کا آج تک متفقہ جواب دینا ممکن نہیں ہوا اس لیے کہ فحاشی یا فحش نگاری کی آج تک کوئی ایسی جامع ومانع تعریف نہیں کی جا سکی، جس پر ہر ملک اور ہر دور کے لوگوں کا اتفاق ہو۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ فحاشی ایک اضافی تصور ہے، جس کا مختلف ادوار اور مختلف معاشروں میں مختلف مفہوم ہوتا ہے۔ ایک دور میں جو بات فحش تصور کی جاتی ہے وہ دوسرے دور میں فحش تصور نہیں کی جاتی۔

دنیا کے کلاسیکی ادب میں بعض ایسی تصانیف ہیں جو آج کے دور کے نقطہ نظر سے بہت فحش اور مخرب الاخلاق ہیں۔ مثلاً الف لیلہ، بوکاچیو کی ڈیکا میرون، کازنووا کی 'یادداشتیں'، روسو کے 'اعترافات'، مرزا شوق کی مثنوی، 'زہر عشق' اور دنیائے اسلام کی نہایت معتبر اور قابل احترام شخصیتیں مثلاً سعدی شیرازی کی 'گلستان' اور مولانا روم کی 'مثنوی معنوی' وغیرہ۔ کلاسیکی ادب کی یہ چند تصانیف ہیں جن کا میں نے حوالہ دیا ہے، ورنہ قدیم دور کی ہر زبان کے ادب میں سینکڑوں نہیں ہزاروں ایسی کتابیں ہیں جو اگر آج اصل صورت میں شائع کردی جائیں تو انھیں فحش نگاری کے جرم میں فوراً ضبط کرلیا جائے گا۔ یہ عجیب بات ہے کہ بعض قدیم تصانیف، جن کا شمار دنیا کی اہم ترین کتابوں میں ہوتا ہے بعض نہایت ماڈرن اور ترقی یافتہ ملکوں میں فحش تصور کی جاتی رہی ہیں مثلاً ڈی ایچ لارنس کے 'لیڈی چیٹر لیز لوز' جس کی اشاعت اور فروخت پر عرصے تک برطانیہ اور امریکا میں پابندی عائد رہی۔ صرف اتنا ہی نہیں، سنسکرت زبان کی شہرہ آفاق تصنیف 'کام شاشتر' پر آج بھی آئرلینڈ اور دوسرے کئی مغربی ملکوں میں پابندی عائد ہے۔

'کام شاشتر' آج سے ڈھائی ہزار سال قبل کی تصنیف ہے جسے چندر گپت موریہ کے عہد میں واتسیاین نے تحریر کیا تھا، جس کا دنیا کی تقریباً تمام بڑی زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے اور جسے ماہرین نے متفقہ طور پر سنسکرت زبان کی بے مثل تصنیف تسلیم کرلیا ہے۔ لیکن جن ملکوں میں ادب، فلم، ٹی وی، اسٹیج،

رقص، مصوری اور ابلاغ عامہ کے دوسرے ذرائع میں مرد و عورت کے جنسی تعلقات کا کھلے عام اظہار ہوتا ہے، جہاں پورنوگرافی کی اشاعت و فروخت نقطۂ عروج پر پہنچ چکی ہے اور جن ملکوں میں سنجیدہ ادب اور پورنوگرافی کے مابین فرق کرنا دشوار ہوتا جا رہا ہے، وہاں واتسیاین کی تصنیف 'کام شاستر' پر پابندی عائد ہونا، کیا ستم ظریفی نہیں ہے؟

کچھ دن ہوئے 'لندن ٹائمز' میں ایک مختصر سی خبر شائع ہوئی تھی، جس میں کہا گیا تھا کہ نیپلز کے عجائب گھر کی انتظامیہ نے صدیوں پرانے ایسے تمام مجسموں، فریسکو، موزائیک، کانسی کی پلیٹ کے، گلدان، جگ اور دوسرے فنی نمونوں کی نمائش کرنے کا فیصلہ کیا ہے جن میں انسان کی جنسی زندگی کی بڑی خوب صورت عکاسی کی گئی ہے۔ ان فن پاروں کو آج تک فحاشی کے الزام میں عوام کی نظروں سے پوشیدہ رکھا گیا تھا۔ انیسویں صدی میں نیپلز کے بوربون حکم رانوں نے جب پہلی بار ان فن پاروں کو دیکھا تو انھیں بڑا صدمہ پہنچا تھا، کیوں کہ ان کے خیال میں مجسمے اور ظروف انتہائی فحش اور مخرب الاخلاق تھے۔ چناں چہ ان کے حکم سے یہ تمام فن پارے عام لوگوں کی نظروں سے ہٹا دیے گئے تھے لیکن آج کے عہد کے فنون لطیفہ کے ماہرین کا یہ خیال ہے کہ یہ تمام نادر فن پارے نہ صرف زمانہ قدیم کے انمول رتن ہیں بلکہ فنی اعتبار سے شاہ کاروں کا درجہ رکھتے ہیں اس لیے ان فن پاروں کی ضرور نمائش ہونی چاہیے۔

ماضی میں یہ سارے شاہ کار نپولین کے شاہی خاندان کی ملکیت تھے جو بعد میں ان کے ورثا کو نسل در نسل منتقل ہوتے ہوئے فرانسیس اوّل تک پہنچے جو مزاجاً خشک اور 'پیوریٹن' واقع ہوا تھا، چناں چہ وہ ایک دفعہ جب نیپلز کا مذکورہ عجائب خانہ دیکھنے کے لیے آیا تو وہ یہ تمام فن پارے دیکھ کر حیرت زدہ رہ گیا اور اس نے ان فن پاروں کو ایک خاص کمرے میں رکھنے کا حکم دیا جہاں صرف 'بااخلاق' اور پختہ عمر کے لوگوں کو ہی جانے کی اجازت تھی۔ ان شاہ کاروں کو دیکھنے کی اجازت صرف بادشاہِ وقت ہی دیکھ سکتا تھا۔ ۱۸۵۲ء میں بادشاہ کے حکم سے شاہی عجائب خانے کے اس کمرے سے دروازہ نکال کر اس کی جگہ دیوار چن دی گئی اور دیوار کے نشانات کو اس طرح مٹا دیا گیا کہ کسی کو گمان بھی نہ ہو کہ یہاں کبھی دروازہ بھی تھا۔ طویل مدت کے بعد اس کمرے کو دوبارہ کھولا گیا اور اس میں باقاعدہ دروازہ لگایا گیا، لیکن یہ پابندی عائد کر دی گئی کہ اس میں صرف اسکالروں کو داخلے کی اجازت ہوگی۔ یہ پابندی ۱۹۴۰ء تک جاری رہی۔ اگر ان پابندیوں کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ صدیاں گزر جانے کے بعد ان فنی نوادرات کی عام نمائش کی وجہ یہ ہے کہ زمانے کا مزاج اور عہد کا مذاق بدل چکا ہے۔ اب جنس کا تذکرہ نہ معیوب ہے نہ فحش، بلکہ یہ زندگی کی تصدیق شدہ حقیقت تسلیم کر لی گئی ہے لیکن آج کے عہد میں ہی آئرلینڈ میں 'کام شاستر' پر پابندی عائد ہے۔

یہ بات بھی بڑی دل چسپ ہے کہ ایک بار آں جہانی گاندھی جی نے 'پیوریٹن' خیالات سے متاثر ہو کر 'کھجوراہو' کے قدیم مندروں کی مورتیوں پر پلاسٹر چڑھا دینے کا مشورہ دیا تھا جن میں مباشرت کے مختلف آسن دکھائے گئے تھے حالاں کہ آرٹ کے ناقدین کے نزدیک تو الورا اور اجنتا کے فریسکو قدیم ہندوستان کی سنگ تراشی اور مصوری کے ان مول اور لازوال نمونے ہیں جن پر جتنا بھی فخر کیا جائے کم ہے بلکہ اب تو حکومت ہند کا محکمۂ سیاحت بڑے فخر کے ساتھ ان کی نمائش کراتا ہے۔ جو لوگ فحش نگاری کے تصور کو جامد تصور کرتے ہیں، صرف وہی اس کے غیر متغیر تصور پر اصرار کرتے ہیں۔

فحش نگاری کے سوال پر بحث کرنے سے قبل اس کے سماجی اور اخلاقی پہلوؤں پر غور کرنا ضروری ہے۔ دراصل کوئی قدر دائمی اور مستقل نہیں ہوتی۔ وقت اور معاشرے کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ سماجی اور اخلاقی قدریں بدلتی رہتی ہیں اور یہ قدریں اقتصادی نظام، خصوصاً طریقۂ پیداوار میں تبدیلی کے ساتھ بدل جاتی ہیں اسی لیے ہر دور کا سماجی اور اخلاقی تصور ایک دوسرے سے مختلف ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر جاگیردارانہ معاشرے کا تصورِ اخلاق، سرمایہ دارانہ نظام کے تصورِ اخلاق سے مختلف ہوتا ہے۔ اسی طرح مختلف مذاہب کا تصورِ اخلاق بھی ایک دوسرے سے مختلف ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر ہندومت، اسلام اور مسیحی تصورِ اخلاق ایک دوسرے سے قطعی مختلف ہیں۔ اس کا اندازہ ان مذاہب کے تصورِ جنس سے لگایا جا سکتا ہے۔ ہندومت اور اسلام میں جنس انسانی زندگی کا نہایت اہم اور ناقابل فراموش حصہ ہے۔ ان دونوں مذاہب میں اس کی اہمیت اور حقیقت کو تسلیم کیا گیا ہے جب کہ مسیحیت میں جنس ایک ناپاک اور قبیح جذبہ تصور کیا جاتا ہے۔ جنس کے بارے میں عیسائیت خاص طور پر بعد کے 'پیوریٹن' دور کی مسیحیت کا رویہ قطعی غیر سائنسی اور غیر فطری ہے۔ ان تمام تصورات کا اثر تصورِ اخلاق، خصوصاً فحاشی کے تصور پر پڑا ہے۔ یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ مسیحیت کے اس تصور کے اثرات صرف مسیحی ممالک تک محدود نہیں۔ اس کے اثرات ہندو اور اسلامی ممالک کے تصورِ اخلاق پر بھی مرتب ہوئے ہیں، ورنہ کیا وجہ ہے کہ 'کھجوراہو' اور کونارک کے مندروں کی تعمیر کے وقت تو لوگوں کو ان مورتیوں میں فحاشی نظر نہیں آئی اور آج کے دور میں گاندھی جی کو فحاشی نظر آ گئی۔

فحاشی کے تصور کی ابتدا بھی بڑی دلچسپ ہے۔ یہ تو ہر باشعور شخص تسلیم کرے گا کہ انسان فحاشی کا تصور یا احساس قدرتی اور جبلتی طور پر لے کر پیدا نہیں ہوا۔ ہم اگر انسان کے سماجی ارتقا کا مطالعہ کریں تو اس نتیجے پر پہنچیں گے کہ انسان ابتدا میں برہنہ زندگی بسر کرتا تھا۔ اس وقت کے شعور میں فحاشی کا کوئی تصور موجود نہیں تھا لیکن جوں جوں انسان ارتقائی منازل طے کرتا ہوا تہذیب کے دائرے میں داخل ہوا، ماحول اور قدرتی حالات کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ گفتگو، تصویر کشی، سنگ تراشی حتیٰ کہ حرکات و سکنات اور اشارے کنایے سے فحاشی ظاہر ہونے لگی۔ ہم اگر سماجی ارتقا کے تسلسل کو سمجھنے کے لیے انسانی

معاشرے کے بالکل ابتدائی دور کا مطالعہ کریں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ دورِ وحشت میں جب عورت نے زنا بالجبر کے خوف سے اپنے جنسی اعضا کی ستر پوشی (یا جب سے مرد نے عورت کو اور عورت نے مرد کو اپنی جانب مائل کرنے کے لیے بناؤ سنگھار اور سجاوٹ کا طریقہ اختیار کیا)، اس وقت سے انسان میں جنسی شعور پیدا ہوا۔ اس سے قبل انسان کا جنسی شعور حیوانی سطح پر تھا اور جنسی فعل محض جبلی تقاضے کا حصہ۔ اس طرح دیکھا جائے تو انسانی ارتقا کے ایک خاص مرحلے میں انسان کے جنسی شعور اور احساس نے آگے چل کر فحاشی کے تصور کو جنم دیا۔ یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ انسان کے سوا کسی بھی مخلوق میں اس قسم کا کوئی احساس موجود نہیں ہے۔

اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ حیاتیاتی ضرورت کے ساتھ اس احساس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ سوشل سائنس دانوں کا خیال ہے کہ فحاشی کا احساس دراصل سماجی ارتقا، خصوصاً تہذیب کی پیداوار ہے۔ اگر ہم یہ تسلیم کرلیں کہ فحاشی کے احساس کی بنیاد رواج، ریت یا رسم پر ہے اور یہ تصور ماحول کے مطابق تشکیل پاتا ہے تو ہمیں یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ انسان کے سماجی تصورات اور اخلاقی اقدار کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ فحاشی کا تصور بھی بدل جاتا ہے، اس لیے ضروری نہیں کہ ایک دور کی فحش بات کو دوسرے دور میں فحاشی تصور کیا جائے، مثلاً ایک دور میں عورتوں کا ٹخنے سے اوپر کپڑا پہننا فحش تصور کیا جاتا تھا لیکن آج کے دور میں یہ فحش نہیں سمجھا جاتا۔ چنانچہ یورپ میں عورتوں کا 'بکنی' پہننا کوئی عیب نہیں بلکہ بعض ساحلی مقامات پر بالشت بھر کی دھجیوں کی بھی ضرورت محسوس نہیں کی جاتی۔ قدیم ہند کے ویدک عہد میں اور اس کے بعد بھی بہت عرصے تک عورتیں 'بریزیز' کے طرز کی انگیا پہنتی تھیں، جس پر قدیم ہندوستان میں کسی کو کوئی اعتراض نہیں تھا اس لیے کہ اسے فحش تصور نہیں کیا جاتا تھا۔ دور جانے کی ضرورت نہیں، خود ہمارے معاشرے میں نوجوان لڑکیوں کا دوپٹہ پہننا اور سر اور سینے کو دوپٹے سے چھپائے رکھنا شرافت کی اوّلین شرط سمجھی جاتی تھی لیکن دیکھتے ہی دیکھتے ہمارے معاشرے سے دوپٹے کا رواج نہایت تیزی سے اٹھتا جارہا ہے اور اس پر کسی کو اعتراض بھی نہیں۔

کون سی ادبی تخلیق فحش ہے اور کون سی نہیں، اس پر غور کرتے وقت جمالیاتی قدروں کو بھی سامنے رکھنا ضروری ہے۔ جو لوگ قدیم ہندوستان کے فلسفۂ جمالیات اور فنی نظریات سے واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ سنسکرت ادب میں 'رَسوں' کو کتنی زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ سنسکرت کے نقاد انسانی جذبوں کو سامنے رکھ کر ادب کی قدر و قیمت متعین کرتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ انسان نو بنیادی رَسوں (جذبوں) کا مرکب ہے۔ یہی جذبے اس کی روزمرہ زندگی کو کسی نہ کسی شکل میں متاثر کرتے ہیں۔ ان رسوں میں سب سے اہم اور بنیادی 'رس' شرنگار رس ہے' جسے آدی رس یعنی بنیادی جذبہ بھی کہا گیا ہے۔ اس کا تعلق دراصل مرد و عورت کے جنسی جذبے سے ہوتا ہے۔ اس کا بنیادی عنصر احساسِ جمال

ہے۔ شعروادب میں شیر نگار رس کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہوتی ہے کیونکہ جو تلذذ شیر نگار رس پیدا کرتا ہے وہ کوئی دوسرا رس پیدا نہیں کرتا۔ اس رس کے بغیر شعروادب کم تر درجے کا ہوتا ہے۔ اس نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو قدیم ہندوستان کے فلسفۂ جمالیات میں رس کے نظریے کو بنیادی اہمیت حاصل ہے، جب کہ مغربی فلسفۂ جمالیات میں رس کا کوئی تصور موجود نہیں ہے۔ قدیم ہند کے ماہرینِ جمالیات کا خیال ہے کہ جس ادبی تخلیق میں مرد اور عورت کے جنسی تعلق کا ذکر نہ ہو، وہ ادب ہی نہیں ہے اسی لیے سنسکرت ادب کی شاہکار تصانیف مثلاً شکنتلا وغیرہ میں جنسی جذبات کا برملا اظہار ملتا ہے اور جسے کوئی عیب تصور نہیں کیا جاتا بلکہ ان ناقدین کا تو یہاں تک کہنا ہے کہ ادب میں اگر دوسرے رس نہ ہوں تو کوئی ہرج نہیں ہے، البتہ پہلا رس یعنی رتی رس کا ہونا لازمی ہے۔ ان کا تو یہاں تک دعویٰ تھا کہ ایسا ادب کبھی غیر شائستہ ہو ہی نہیں سکتا۔

کسی ادبی تصنیف کو فحش یا مخرب الاخلاق قرار دیتے وقت عموماً سب سے بڑی غلطی یہ کی جاتی ہے کہ جج صاحبان عریانی (اُوبسی نیٹی) اور فحش تحریروں (پورنوگرافی) کے درمیان امتیاز نہیں کرتے۔ خصوصاً رس آتمک ('ایروٹک') تحریروں اور پورنوگرافک تحریروں کو وہ باہم خلط ملط کر دیتے ہیں جس کے باعث وہ غلط نتیجے پر پہنچتے ہیں حالاں کہ جنسی جذبات کا اظہار کرنے والے ادب اور پورنوگرافک تحریروں میں بنیادی فرق ہے اور یہ دونوں مختلف اصطلاحات ہیں جن کے مفاہیم میں کافی فرق ہے۔ پورنوگرافک کا عام مفہوم یہ ہے کہ یہ وہ تحریریں ہیں جو طوائفوں اور کسبیوں نے مردوں کو شہوانی ترغیب دینے کے لیے لکھیں۔ بعد میں اس کے معنی میں مزید توسیع ہوتی گئی اور اس کا مفہوم بدل کر مخرب الاخلاق ادب بن گیا۔

وہ کون سا مقام ہے جہاں تک پہنچ کر عریانیت اور جنس نگاری، فحش نگاری کی سرحدوں کو چھو لیتی ہے یا بالفاظ دیگر 'ایروٹیزم' 'پورنوگرافی' میں بدل جاتی ہے، اس کی آج تک کسی بھی ملک یا عہد کے ماہرینِ قانون، سوشل سائنس دانوں اور ناقدوں نے نشاندہی نہیں کی اور نہ اس کی نشان دہی شاید ممکن ہے، چناں چہ جب بھی کسی کتاب کو فحش نگاری کے جرم میں ضبط کیا جاتا ہے، قانون دانوں اور قانون نافذ کرنے والوں کو الجھنوں اور مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ پاکستان اور ہندوستان جیسے پس ماندہ ممالک کی انتظامیہ (خصوصاً پولیس) کسی زیرِ عتاب ادبی تخلیق کو اس کی فنی خوبیوں کو پرکھے بغیر صرف اس لیے قابلِ تعزیر تصور کر لیتی ہے کہ اس میں 'ایروٹک' معاملات کا تذکرہ قدرے کھلے طور پر کیا گیا ہے۔

برصغیر کے ادب میں فحش نگاری کا کوئی تصور موجود نہیں تھا اور نہ فحش نگاری قابلِ تعزیر تھی۔ اردو ہو، بنگلہ ہو، ہندی ہو یا کوئی دوسری علاقائی زبان، ہر زبان کا ادیب و شاعر بڑی بے باکی کے ساتھ

شعر و ادب میں جنسی جذبات و احساسات کا اظہار کرتا تھا اور اس پر نہ حکومتِ وقت کو اعتراض ہوتا اور نہ معاشرے کو۔ اگر اعتراض ہوتا یا معاشرہ تنگ نظر اور متعصب ہوتا تو اردو میں نہ ریختی کی صنف ہوتی اور نہ دبستان لکھنؤ کے شعرا کا وجود۔ فن طباعت (پرنٹنگ ٹیکنالوجی) کی ایجاد سے قبل کتابوں کی اشاعت بہت محدود ہوتی تھی، لہٰذا اس کا حلقہ اثر بھی محدود تھا۔ کتابیں ہاتھ سے لکھی جاتی تھیں اور کتابوں کی نقل بہت ہی مشکل کام ہوتا تھا۔ لہٰذا سوائے مذہبی کتابوں کے عام کتابوں کی اشاعت بہت محدود تھی، چناں چہ قارئین کی تعداد بھی بہت محدود تھی البتہ لوگ کتابیں پڑھنے کے بجائے دوسروں سے پڑھوا کے سنتے تھے۔ فنِ طباعت سے قبل دنیا کے ہر ملک میں ایسی کتابوں کی بہتات تھی جن میں جنسی معاملات کا کھلا ذکر ہوتا تھا۔ یہ قدیم کتابیں اگر آج بھی پڑھی جارہی ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ان میں سے بعض مذہبی اور ادبی اعتبار سے کلاسیکس کی حیثیت رکھتی ہیں۔

فن طباعت کی ایجاد سے جہاں بہت سے فائدے ہوئے، وہاں بہت سے نقصانات بھی ہوئے یعنی اچھی اور مفید کتابوں کے ساتھ ساتھ بہت سی ایسی کتابیں بھی شائع ہونے لگیں جن کی اشاعت سے معاشرے، خصوصاً نوجوان طبقے پر بُرے اثرات مرتب ہونے لگے۔ اس سے قبل یعنی قرونِ وسطیٰ تک دنیا کے مختلف ملکوں میں صرف مذہبی اور سیاسی کتابوں پر حکومت کا احتساب تھا اس لیے کہ کلیسا اور بادشاہ وقت کو معترضین کے اعتراضات کا خدشہ تھا۔ اس دور میں کسی کو فکر نہیں تھی کہ شعر و ادب میں کس قسم کے احساسات و جذبات کا اظہار کیا جارہا ہے اس لیے کہ اس دور میں اخلاقی قدریں کچھ اور تھیں۔ اس دور میں سیاسی یا مذہبی گروہ پر ضرب لگانے کے لیے دو چار کتابوں کی اشاعت کو ہی کافی تصور کیا جاتا تھا۔ ان کتابوں کے پیچھے عموماً کوئی نہ کوئی نظریہ ہوتا تھا۔ اس دور میں اگرچہ جنسی کتابیں کسی نیک اور صالح جذبے سے نہیں لکھی جاتی تھیں، لیکن اس دور میں فحش نگاری کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ فنِ طباعت کے فروغ سے قبل مصلحین اور مبلغین نے اس جانب کوئی توجہ نہیں دی تھی۔

برصغیر ہندوستان میں فحش نگاری کی روک تھام سے قبل یورپ کے تھیٹروں میں فحش حرکات کی روک تھام کی کوشش کی گئی تھی اور اس کے لیے قانون وضع کیا گیا تھا جس کے تحت ’کین کین‘ اور دوسرے کئی ایسے رقصوں پر پابندی عائد کردی گئی تھی جن سے شہوانی جذبات کے مشتعل ہونے کا اندیشہ تھا۔ برطانیہ میں فحش کتابوں کی اشاعت کے خلاف قانون ۱۸۵۷ء میں منظور کیا گیا۔ اس سے قبل یورپ یا امریکا میں فحاشی یا فحش نگاری کا کوئی قانون نافذ نہیں تھا۔ فحش تحریروں کے خلاف صرف کلیسا تادیبی کارروائی کرتا تھا، لیکن معاشرے میں کلیسا کا اثر کم ہوجانے کے باعث فحش تحریروں کے خلاف اس کی کارروائی بے اثر ہوکر رہ گئی۔ ادبیات کی تاریخ کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ فحش نگاری کے خلاف دنیا میں سب سے پہلے برصغیر ہندوستان میں قانون منظور کیا گیا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت نے

۱۸۵۶ء میں 'ادبسین بکس اینڈ پکچرز ایکٹ' منظور کیا جب کہ برطانیہ میں انسدادِ فحش نگاری ایکٹ ایک سال تاخیر سے منظور کیا گیا۔ انیسویں صدی کے وسط میں فحش نگاری قطعی مختلف نوعیت رکھتی تھی یعنی اس کا مقصد تخلیقِ فن کے بجائے صرف حصولِ زر تھا۔

اس قانون کے نفاذ سے قبل اردو، بنگلہ، ہندی اور دوسری زبانوں میں ایسے قصے کہانیاں عام تھیں جن میں مرد وعورت کے تعلقات کا برملا ذکر ہوتا تھا اور ہندوستان کی تمام زبانوں میں فارسی ادب سے ایسی داستانوں کے تراجم شائع ہو رہے تھے جن میں جنسی معاملات کا کھلا اظہار کیا جاتا تھا۔ اس ضمن میں فورٹ ولیم کالج سے شائع ہونے والی مشہور داستان 'توتا کہانی' کی مثال دی جاسکتی ہے جس میں بہت سی ایسی کہانیاں شامل ہیں جنھیں آج کے دور میں آسانی سے مخرب الاخلاق کہا جاسکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب ڈاکٹر وحید قریشی نے اسے مرتب کر کے شائع کیا تو اس سے بہت سی عبارتیں یا تو بدل دیں یا حذف کر دیں۔ اس ضمن میں بنگلہ زبان کے قدیم مصنف بھارت چندر کی تحریروں کی بھی مثال پیش کی جاسکتی ہے۔ اس دور میں بعض بھکاری گاؤں گاؤں گشت لگا کر بھارت چندر کی ایسی نظمیں گایا کرتے تھے جن میں رادھا اور کرشن کے ناجائز تعلقات کا نہایت رومانی بلکہ فحش انداز میں ذکر ہوتا تھا۔ ایسے مغنی بھکاریوں کو 'پانچالک' یا 'کویال' کہا جاتا تھا۔ ہندوستان میں پریس کی آمد کے بعد بعض تاجرانہ ذہن کے مالک ناشروں نے سوچا کہ اگر بھارت چندر کی نظموں کو کتابی صورت میں شائع کیا جائے تو کافی آمدنی ہوسکتی ہے، چناں چہ ان کا خیال درست ثابت ہوا۔

اس وقت تک کلکتے کے ہر محلے میں پریس نصب ہو چکا تھا اور اُس کی سڑکوں اور شاہ راہوں پر پھیری والے گشت کرتے ہوئے مخرب الاخلاق نظمیں اور کہانیاں فروخت کرنے لگے تھے۔ اس دور کے جو واقعات قلم بند کیے گئے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ اس دور میں مخرب الاخلاق کتابوں کے کم سے کم آٹھ دس ہزار نسخے شائع کیے جاتے تھے اور ہر نسخے کی قیمت عام طور پر چار آنے ہوتی تھی۔ اس دور میں چار آنہ بہت بڑی رقم تصور کیا جاتا تھا، اس کے باوجود دس ہزار کتابیں چند دنوں میں فروخت ہو جاتی تھیں۔ اس دور میں ناشر خود طابع بھی ہوتا تھا اس لیے ان کتابوں کی فروخت سے اسے اچھا خاصا منافع ہوتا تھا۔ یہ کتابیں یا تو براہِ راست پریس سے فروخت ہوتی تھیں یا پھر اُنھیں پھیری والا فروخت کرتا تھا۔ اس وقت تک کتابوں کی دوکان کھولنے کا رواج عام نہیں ہوا تھا۔ مخرب الاخلاق کتابوں کی فروخت سے راتوں رات امیر بننے کا گُر جب عام ہو گیا اور ہر شخص یہ منافع بخش کاروبار کرنے لگا تو ان کتابوں کی تعداد میں بھی بے انتہا اضافہ ہو گیا۔ یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ اس دور میں اس قسم کی کتابیں زیادہ تر بنگلہ زبان میں شائع ہوتی تھیں اس لیے کہ بنگال میں تعلیم کی شرح دوسرے علاقوں سے زیادہ تھی۔ عیسائی مشنریوں کے ذریعے پریس سب سے پہلے وہاں پہنچا

تھا۔ اس دور میں پانچ انواع کی کتابیں بہت زیادہ فروخت ہوتی تھیں جو یہ ہیں: (۱) کام شاستر قسم کی سنسکرت کتابوں کے تراجم، (۲) ودیا سندر کی کہانیاں (۳) رادھا اور کرشن کی رومانی داستان جن میں ان کے جنسی تعلقات کی تفاصیل ہوتی تھیں، (۴) فارسی ادب سے جنسی کہانیوں اور نظموں کے ترجمے، (۵) طبع زاد مخرب الاخلاق کتابیں۔

۱۸۵۵ء کے وسط سے کلکتہ کے اخبارات و جرائد نے اس قسم کے قابل اعتراض مواد کی اشاعت پر احتجاج کرنا شروع کیا۔ اس دور میں اس نوع کی مطبوعات اور تصاویر کی فروخت پر چوں کہ کوئی پابندی نہیں تھی اس لیے ناشرین اور پھیری والے ان اعتراضات کو خاطر میں لائے بغیر اپنے کاروبار میں مصروف رہتے تھے۔ پھیری والے ہندوستان میں شائع ہونے والی فحش کتابوں کے علاوہ برطانیہ اور فرانس میں شائع ہونے والی مخرب الاخلاق تصاویر بھی بڑی آزادی سے فروخت کرتے تھے جن کی وجہ سے اخبارات نے اپنے ادارتی کالموں میں حکومت سے اس قسم کے مواد کی فوراً روک تھام کا مطالبہ شروع کر دیا تھا۔ انھوں نے لکھا کہ اگر حکومت کی جانب سے اس قسم کا مواد بیچنے والوں کو کڑی سزائیں دی جائیں تو اس کاروبار میں کافی کمی ہو سکتی ہے۔ لیکن اس کے لیے ایک واضح اور غیر مبہم قانون بنانے کی ضرورت ہے۔ اس مطالبے میں شدت پیدا ہو جانے کے باعث کونسل کے ممبران پہلی بار صورت حال سے واقف ہوئے۔ اس کے باوجود انھوں نے مسئلے کی سنگینی کو تسلیم نہیں کیا۔ ان کی منطق یہ تھی کہ اگر مسئلہ اتنا ہی سنگین ہے تو حکومت کی توجہ پہلے کیوں اس جانب مبذول نہیں ہوئی! 'کلکتہ اسکول بکس سوسائٹی' کی جانب سے پہلی بار اس کی تیسری سالانہ رپورٹ بابت ۲۰-۱۸۱۹ء میں گزشتہ پندرہ برسوں کے دوران شائع ہونے والی مخرب الاخلاق کتابوں کی تفصیل شائع ہوئی جس کے نتیجے میں کلکتے کے اٹھارہ برہمنوں اور گیارہ کائستھوں کی جانب سے ایک مشترکہ بیان میں مخرب الاخلاق کتابوں کی اشاعت پر شدید احتجاج کیا گیا اور تقریباً ۳۵ سال کی طویل جدوجہد کے بعد برطانوی حکومت کی توجہ اس مسئلے کی جانب مبذول ہوئی۔ اس کے باوجود حکومت کے ارباب حل وعقد میں سے اکثر ارکان اس بارے میں قانون بنانے میں تذبذب کا اظہار کرتے رہے، کیوں کہ برطانیہ میں خود اس نوع کا کوئی قانون موجود نہیں تھا جس کی وہ تقلید کرتے۔ علاوہ ازیں، دنیا کے دوسرے ممالک میں بھی اس وقت تک مخرب الاخلاق لٹریچر اور تصاویر کی اشاعت اور فروخت پر پابندی کے حق میں آواز بلند نہیں ہوئی تھی۔ چناں چہ اس دور کے قانون سازوں میں اس کی ضرورت کے بارے میں کافی شک وشبہ موجود تھا۔ صائب الرائے حلقوں کی جانب سے اس بارے میں مسلسل دباؤ کی وجہ سے ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت نے مجبوراً ۲۶ر جنوری ۱۸۵۶ء کو 'اوبسین بکس اینڈ پکچرز ایکٹ' منظور کیا۔ دنیا کی تاریخ قانون سازی میں یہ اپنی نوعیت کا پہلا قانون تھا۔

تاریخی اعتبار سے قانونِ انسدادِ فحش نگاری کے اس پہلے قانون کی بڑی اہمیت ہے، لیکن اب اس کی کوئی علاحدہ حیثیت نہیں رہی کیوں کہ مذکورہ قانون کی تمام دفعات ترمیم و اضافے کے بعد 'انڈین پینل کوڈ' میں شامل کردی گئی ہیں۔ مذکورہ قانون کی منظوری کے بعد مخربِ الاخلاق کتابوں اور تصاویر کی اشاعت و فروخت کاروبار بند نہیں ہوا چناں چہ بنگال کے ریورینڈ لانگ کے بیان سے مطابق، مذکورہ قانون کے نفاذ کے بعد ۱۸۵۷ء میں بنگلہ زبان میں اس قسم کی ۱۴۲۵۰ کتابیں شائع ہو گئیں۔ لانگ نے اپنی رپورٹ میں اس نوع کی ایک ایسی کتاب کا ذکر کیا ہے جو ایک سال کے عرصے میں تیس ہزار کی تعداد میں فروخت ہوئی۔ ۱۸۵۵ء میں پہلی بار تین ناشروں کو فحش کتابیں شائع کرنے کے جرم میں آزمائشی طور پر گرفتار کر کے سپریم کورٹ کے سامنے حاضر کیا گیا، چناں چہ سپریم کورٹ نے ملزموں کو مقدمے کے اخراجات اور جرمانے کے طور پر ۱۳۰۰ روپے ادا کرنے کا حکم دیا۔ اس دور میں اتنی خطیر رقم ادا کرنا معمولی بات نہیں تھی۔ چناں چہ مخرب الاخلاق کتابوں کے ناشروں میں خوف و ہراس پھیل گیا اور اس نوع کی کتابوں کی اشاعت اچانک کم ہوگئی لیکن اس کے بعد چوری چھپے ایسی کتابوں کی اشاعت جاری رہی۔

فحاشی یا فحش نگاری صرف برِصغیر کا ہی نہیں، ہر ملک کا مسئلہ رہا ہے اس لیے کہ حقِ طباعت اور ذرائع ابلاغ کے عام ہونے کے بعد فحش نگاری نے ایک وبائی صورت اختیار کرلی۔ چناں چہ دوسری جنگ عظیم کے قبل ۱۹۲۹ء میں 'لیگ آف نیشنز' کے تحت 'فحش نگاری کی روک تھام کے لیے ۱۳۵ اقوام پر مشتمل عالمی کنونشن' طلب کیا گیا تاکہ ساری دنیا میں فحش اور مخرب الاخلاق لٹریچر کی روک تھام کے لیے کوئی متفقہ قانون وضع کیا جاسکے لیکن طویل بحث مباحثے کے باوجود مندوبین فحش نگاری کی کوئی متفقہ تعریف متعین کرنے میں کامیاب نہیں ہوئے۔ تاہم اس کنونشن کی سفارشات کو ایک دستاویز کی شکل دی گئی، جس پر ہندوستان نے ۱۹۲۵ء میں دستخط کیے اور جس کا نام 'اوبسین پبلی کیشنز ایکٹ' رکھا گیا۔

۱۸۵۶ء کے 'اوبسین بکس اینڈ پکچرز ایکٹ' نے اگرچہ ۱۹۰۵ء میں 'انڈین پینل کوڈ' اور قیامِ پاکستان کے بعد 'تعزیراتِ پاکستان' کی صورت اختیار کرلی ہے لیکن ان دونوں میں بھی فحاشی یا فحش نگاری کی کوئی واضح تعریف بیان نہیں کی گئی ہے۔ 'تعزیراتِ پاکستان' کی دفعہ ۲۹۲ میں کہا گیا ہے کہ: '(الف) جو کوئی فحش کتاب، رسالہ، خاکہ، تصویر، نقشہ، شبیہ یا کسی بھی قسم کی دیگر فحش شے فروخت کرے، کرائے پر دے، تقسیم کرے، بر سرِ عام نمائش کرے یا کسی طریق سے بھی اس کی اشاعت کرے یا بنائے، تیار کرے یا اپنے قبضے میں رکھے، اسے تین ماہ قید یا جرمانہ یا دونوں سزائیں دی جاسکیں گی'۔ اس قانون کی چند ذیلی دفعات میں فحش اشیا کی درآمد، برآمد، کاروبار، تعارف، اشتہار یا ان تمام اعمال کی اعانت کی کوشش یا پیشکش بھی جرم قرار دی گئی ہے۔ ایک ذیلی دفعہ میں جو مذہبی فرائض کی ادائیگی پر

مشتمل ہیں، فحش ہونے کے باوصف قانون کی گرفت سے خارج کیے گئے ہیں۔ تعزیرات پاکستان میں فحش کے تصور کی کہیں تعریف نہیں کی گئی ہے۔

کراچی کے سابق ایڈیشنل ڈسٹرکٹ اور سیشن جج جناب مہدی علی صدیقی اس بارے میں اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں: 'عدالت کو فحش تحریر کے ہر پہلو پر غور کرنا پڑتا ہے۔ متن کے علاوہ پس منظر، تحریر کی غرض، مصنف کا منشا، معاشرے کا مذاق مروجہ اخلاقی معیار، سب پیش نظر رہنا چاہئیں ورنہ انصاف کا خون ہوسکتا ہے۔ اس تفصیل کے بعد آپ خود محسوس کریں گے کہ فاضل چیف جسٹس کا طے کردہ وہ معیار غلط نہ سہی، سطحی ضرور ہے۔ میں ایک مثال سے معاملے کی نزاکت واضح کردوں۔ فرض کیجئے کہ ایک مجسمہ ساز حسین عورت کا عریاں مجسمہ تیار کرتا ہے جس میں اعضائے جنسی پوری صفائی سے نظر آتے ہیں یا کوئی ڈاکٹر اپنے طلبا کے لیے درسی کتاب میں اعضائے جنسی اور جنسی اختلاط کی تفصیلات درج کرتا ہے۔ کیا یہ چیزیں قانون کی زد میں آجائیں گی! مذہبی کتب بھی جنسی اعضا یا افعال کے تذکرے سے خالی نہیں۔ اب خیال فرمایئے کہ آپ ناپختہ یا ماؤف ذہنیت رکھنے والے اشخاص کو جنسی ہیجان سے کیسے بچاتے پھریں! میری رائے میں بذات خود ایسے مجسمے اور تحریریں فحش نہیں ہیں۔ ہاں، جو صاحب محض فطری یا غیر فطری جنسی تسکین کی خاطر مجسمے کے اعضائے جنسی سے لذت حاصل کریں یا محولہ بالا تحریریں اس غرض سے پڑھیں کہ جنسی ہیجان کو سکون پہنچائیں تو اُن کی حرکات یقیناً فحش ہوں گی نہ کہ ایسا مجسمہ اور تحریریں۔' (بحوالہ 'فحش نگاری اور قانون' سہ ماہی 'غالب' کراچی شمارہ نمبر ۱)

عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ اگر ماتحت عدالت کسی مصنف کو فحش نگاری کے جرم میں سزاوار قرار دیتی ہے تو عدالت عالیہ اسے بری قرار دے دیتی ہے۔ قدرتاً سوال پیدا ہوتا ہے کہ عدالت ماتحت اور عدالت بالا کے فیصلوں میں تضاد کیوں پیدا ہوتا ہے؟ کیا ابتدائی عدالت کے مجسٹریٹ فحش اور غیر فحش میں امتیاز نہیں کرسکتے؟ کسی مخصوص کیس میں تو یہ صورت ممکن ہے لیکن ہر بار ایسا ہونا حیرت کی بات ہے۔ اس کی اصل وجہ فحش نگاری کے بارے میں ججوں کے نقطۂ نظر کا اختلاف ہے۔ ماتحت عدالت عموماً عوام کی ذہنی سطح کو پیش نظر رکھ کر فیصلہ کرتی ہے اور عدالتِ عالیہ، کتاب کے ادبی اور فنی حسن و قبح کو سامنے رکھ کر فیصلہ صادر کرتی ہے۔

کتاب کی درآمد کی صورت میں کوئی بھی کلکٹر آف کسٹم یا اگر ایک ہی محکمے کے دو اعلیٰ افسران کے درمیان کسی کتاب کو فحش قرار دینے کے سوال پر اختلاف پیدا ہو تو ایسی صورت میں معاملہ سینٹرل بورڈ آف ریونیو کے سامنے پیش کیا جاتا ہے۔ اگر وہاں بھی اس بارے میں اتفاق رائے نہ ہو اور 'دی انڈین پینل کوڈ' اور 'سی کسٹم ایکٹ مجریہ ۱۹۷۸ء' کے تحت بھی فیصلہ کرنا ممکن نہ ہو تو معاملہ ملک کی سب سے بڑی اتھارٹی (وزیر اعظم) کے سامنے پیش کیا جاتا ہے۔ مثلاً امریکی ناول نویس نوبوکوف کے

ناول 'لولیتا' کو ہندوستان کے محکمہ کسٹم نے انڈین سی کسٹم ایکٹ کے تحت ضبط کرلیا تھا لیکن جب متذکرہ ناول کا معاملہ وزیرِ اعظم ہند پنڈت جواہر لعل نہرو تک پہنچا تو انھوں نے ذاتی اختیارات سے کام لیتے ہوئے اس پر سے پابندی اٹھالینے کا حکم جاری کیا، لیکن ڈی ایچ لارنس کا ناول 'لیڈی چیٹر لیز لور' پنڈت نہرو کی نگاہِ التفات حاصل کرنے میں ناکام رہا۔

پاکستان میں صورتِ حال اور بھی دگرگوں ہے۔ یہاں اس قانون کے تحت کسی کتاب پر پابندی عائد کرنے یا مصنف پر اس ضمن میں مقدمہ چلانے کے لیے زیادہ غور و خوض کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی جاتی۔ یہاں محکمہ اطلاعات و مطبوعات یا محکمہ پولیس کا کوئی بھی کلرک (خواہ اس کی تعلیمی صلاحیت کچھ بھی کیوں نہ ہو)، کسی بھی ادبی تصنیف کو فحش قرار دے کر اسے ضبط کرنے کی سفارش کرسکتا ہے۔ لطف کی بات یہ ہے کہ 'حکامِ بالا' خود اس کتاب کو پڑھ کر کوئی نتیجہ اخذ کرنے کے بجائے ماتحت کلرک کی سفارش پر آنکھ بند کرکے عمل کرنے میں اپنی عافیت سمجھتے ہیں۔ یہ پابندی عام طور پر کتاب کے کسی ایک فحش یا قابلِ اعتراض حصے کی وجہ سے لگائی جاتی ہے۔ پوری کتاب پر بحیثیت مجموعی غور کرنے اور اس کی ادبی اور فنی قدر و قیمت کو پرکھنے کے بجائے کتاب کے کسی ایک حصے کو سامنے رکھ کر ادبی تخلیق کو فحش قرار دینے کی یہ روایت اس وقت قائم ہوئی جب الٰہ آباد کے جسٹس اسٹریٹ نے ۳؍جون ۱۸۸۱ء کو 'حملہ ہند' نامی ایک کتاب کے بارے میں اپنے فیصلے میں لکھا کہ 'میں اس بات کو ماننے کے لیے تیار نہیں کہ کسی کتاب کو اس لیے فحش قرار نہیں دیا جاسکتا کہ اس میں صرف ایک ٹکڑا فحش ہے۔ فحش سے فحش چیزیں بھی کسی کتاب میں شائع کی جاسکتی ہیں، بشرطے کہ انھیں ایک معینہ حد کے اندر محدود رکھا جائے، مگر میں اس رائے سے شدید اختلاف کرتا ہوں۔ میری رائے میں 'حملہ ہند' کے صفحہ ۹۴ پر جو عبارت ہے وہ کتاب کو فحش قرار دینے کے لیے بہت کافی ہے اور اس بنا پر ملزم پر مقدمہ چلایا جاسکتا ہے۔' بہر حال کسی ادب پارے کی ادبی اور فنی خوبیوں اور اس کی قدر و قیمت کو پرکھے بغیر کسی ادبی تخلیق کے فحش یا غیر فحش ہونے کے بارے میں فیصلہ کرنے کا حق جج کو دے دینا ادب و فن کے لیے خطرے کی بات ہے، خصوصاً ایسی صورت میں جب کہ فحش نگاری کی کوئی واضح تعریف بھی نہ کی گئی ہو۔

بہت زمانے تک برطانیہ اور متحدہ ہندوستان میں لارڈ کاک برن کے مقرر کیے ہوئے معیار کے مطابق فیصلے ہوتے رہے، چناں چہ الٰہ آباد ہائی کورٹ کے جسٹس بینرجی نے بھی ۸ جولائی ۱۹۰۵ء کو 'عطرِ قرآن' نامی ایک کتاب کے متعلق اپنے فیصلے میں لکھا کہ 'اگر کسی کتاب کے مطالعے سے پڑھنے والوں پر ایسا اثر پڑے کہ ان کے اخلاق خراب ہوں تو اس بات کو قطعاً نظر انداز کردینا پڑے گا کہ لکھنے والے کا مقصد کیا تھا۔' ان فیصلوں سے دو نتائج برآمد ہوتے ہیں: اول یہ کہ فحش نگاری کے ضمن میں لکھنے والے کی نیت زیرِ بحث نہیں آسکتی ہے، صرف الزام زدہ مواد یا اقتباس کو دیکھنا کافی ہوگا۔ دوم یہ کہ کوئی کتاب کسی ایک فحش ٹکڑے کی بنیاد پر بھی فحش قرار دی جاسکتی ہے۔

کازنووا کی یادداشت 'ہوم کمنگ' کو اپنی تحویل میں رکھنے کے جرم میں جب ایک شخص کو سزا دی گئی تو جسٹس واگنر نے اس کی ادبی اور فنی خوبیوں کو پرشکوہ الفاظ میں سراہا مگر اس کے باوجود کتاب پر سے پابندی نہیں اٹھائی۔ انھوں نے ماتحت عدالت کے فیصلے کو برقرار رکھتے ہوئے کہا کہ 'زبان کا حسن، خیالات کی ندرت، طرزِ بیان کی دل کشی، حتیٰ کہ مصنف کی عظمت و شہرت، یہ تمام چیزیں ادب کے نقاد کے لیے بہت اہم ہو سکتی ہیں لیکن ان خوبیوں کے موجود ہوتے ہوئے بھی ممکن ہے کہ کوئی کتاب اس قابل نہ ہو کہ عامۃ الناس کو اس کے مطالعہ کا موقع دیا جائے'۔ یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ ریڈ کلف ہال کے ناول 'ویل آف لون لی نیس' کے ادبی محاسن مسلم ہیں لیکن اس کتاب کو بھی عدالت نے ایک مدت تک فحش ہونے کے الزام میں ممنوع قرار دیے رکھا تھا لیکن وقت کے ساتھ ساتھ معیارِ اخلاق اور ذوقِ سلیم بدل جانے کے باعث ان کتابوں پر سے پابندی ہٹالی گئی ہے۔

امریکا میں کسی کتاب کے فحش یا غیر فحش ہونے کے بارے میں غور کرتے وقت ایک اور امر کا خاص خیال رکھا جاتا ہے اور وہ یہ کہ زیرِ عتاب کتاب کا نوعمروں پر بحیثیت مجموعی کیا اثر پڑے گا! یہ وہ معیار تھا جس پر نیویارک کے ججوں نے برسوں عمل کیا، لیکن ۱۹۳۳ء میں جب جیمز جوائس کے ناول 'یولی سیز' کو فحش قرار دینے کے لیے مقدمہ دائر کیا گیا تو یہ معیار بدل گیا اور فیڈرل کورٹ نے مذکورہ روایتی معیار کو مسترد کرتے ہوئے صرف ایسی چیز کو فحش قرار دیا جو محض عیاشی اور بدچلنی کی ترغیب دیتی ہو۔ جو کتابیں صحیح معنوں میں ادب پارے کی حیثیت رکھتی ہیں، وہ فحش نگاری کے الزام سے مبرّا قرار دی گئیں۔ فیڈرل کورٹ کے اس تاریخ ساز فیصلے کا نیویارک کی ماتحت عدالتوں پر بہت اثر پڑا۔ کوئی کتاب صحیح معنوں میں ادب پارہ ہے یا نہیں، اس کا فیصلہ اس بات سے کیا گیا کہ کسی ادبی تخلیق کو عوام میں کس حد تک پذیرائی ہوئی اور ناقدوں اور ادیبوں کی نظر میں اس کی کیا قدر و قیمت ہے، اور وہ کس حد تک صداقت پر مبنی ہے۔ آیا وہ کسی خاص دور، کسی خاص معاشرے اور خاص کرداروں کی صحیح عکاسی کرتی ہے یا نہیں اور جن ٹکڑوں پر فحش ہونے کا الزام عائد کیا گیا ہے، ان کا کتاب کے مرکزی اور بنیادی موضوع سے کیا تعلق ہے! مقدمے میں اس امر کو بھی پیشِ نظر رکھا گیا ہے کہ عوام الناس کو اس کے مطالعے سے جو فائدہ پہنچے گا، وہ اس نقصان کے مقابلے میں تھوڑا ہے یا زیادہ، جو تھوڑے سے لوگوں کو پہنچ سکتا ہے۔

جسٹس جون، اے وولزے نے اس مقدمے کے ضمن میں جو بہت اہم بات کہی وہ یہ کہ عدالت کو یہ دیکھنا چاہیے کہ افسانے یا ناول کا مطالعہ کرنے والے بالغوں کی اکثریت پر اس کا کیا اثر ہوگا نہ کہ نوعمروں اور جذباتی طور پر ناپختہ لوگوں نے اس سے کیا اثر لیا۔ اگر اس افسانے یا ناول کے مطالعے سے پڑھنے والوں کو کچھ ایسی باتیں معلوم ہو سکتی ہیں جن سے انہیں بعض معاشرتی مسائل کو حل کرنے میں مدد مل سکتی ہے تو اُن ناپختہ عمر کے لوگوں کو پہنچنے والے امکانی نقصان کو نظر انداز کر دینا چاہیے۔

جیسا کہ اس سے قبل کہا جا چکا ہے دوسرے ممالک کی طرح برصغیر ہندوستان میں بھی انگریزوں کی آمد سے قبل فحاشی کا کوئی تصور موجود نہیں تھا۔ طوائفیت باقاعدہ معاشرے کا حصہ تھی اور ایک انسٹی ٹیوشن کے طور پر تسلیم شدہ تھی۔ چناں چہ طوائف کے کوٹھے پر جانا اور رقص و سرور کے ساتھ شراب و شباب سے محظوظ ہونا شرفا کے معمولات کا حصہ تصور کیا جاتا تھا۔ شرفا بعض اوقات اپنے بچوں کو آداب محفل سیکھنے کے لیے طوائفوں کے پاس بھیجا کرتے تھے۔ اس وقت تک، آج کی طرح، طوائفوں کے کوٹھے کو فحاشی کا اڈہ تصور نہیں کیا جاتا تھا۔ جہاں تک اردو شعر و ادب میں شہوانی جذبات اور جنسی واردات کے اظہار کا تعلق ہے، یہ بھی معمول کا حصہ تھا، چناں چہ آپ میر، غالب، درد، ذوق، انشاء جرات، رنگین اور داغ سے لے کر نظیر اکبرآبادی تک کے دواوین پڑھ جایئے، آپ کو سینکڑوں نہیں ہزاروں ایسے اشعار ملیں گے جو آج کے نقطۂ نظر سے بہ آسانی فحش اور مخرب الاخلاق قرار دیے جا سکتے ہیں جب کہ صرف دو ڈھائی سو سال قبل تک ان اشعار کو مبتذل تصور نہیں کیا جاتا تھا۔ ہمارا اخلاقی معیار انگریزوں کی آمد کے بعد کس قدر بدل چکا ہے اس کا اندازہ اس امر سے کیجئے کہ جب منشی نول کشور نے نظیر اکبرآبادی کے دیوان کا پہلا ایڈیشن شائع کیا تو اس میں جنسی واردات سے متعلق تمام اشعار موجود تھے، لیکن دوسرے ایڈیشن میں ان تمام اشعار اور نظموں سے فحش الفاظ حذف کر کے خالی جگہوں میں نکتے ڈال دیئے گئے، جو ناشر کے خیال میں قانون کی گرفت سے بچنے کا آسان طریقہ تھا۔

اردو ادب میں سرسید احمد خاں اور حالی کے زیرِ اثر جو اصلاحی تحریک شروع ہوئی اس نے مغرب کے 'پیوریٹنزم' کے تحت اخلاقی ادب کو تو خوب پروان چڑھایا لیکن اس نے شعر و ادب سے انسان کی جنسی زندگی کو خارج کر دیا۔ شاید ایسا لکھنؤ اسکول کی زوال آمادہ شاعری کے ردِعمل میں بھی ہوا جب ریختی کے نام پر رنگین اور جرکین جیسے شاعر پیدا ہوئے۔ اس وقت تک مغرب کی عیسائی تعلیمات کے تحت ہمارے ہاں اخلاقیات کا نیا مغربی تصور رائج ہو چکا تھا جس میں جنس کو ایک بُری شے تصور کیا جاتا تھا، لہٰذا ان تمام باتوں کا یہ اثر ہوا کہ اردو میں عرصے تک رومانی اور جنسی شاعری کا فقدان رہا۔ یہ رومانی تحریک کا اعجاز تھا کہ یلدرم جیسے افسانہ نگار اور اختر شیرانی جیسے شاعر پیدا ہوئے اور اردو افسانے اور شاعری میں عرصے کے بعد گوشت پوست کی عورت نظر آئی۔ لیکن اس ادب میں بھی جنس خارج رہی، اس لیے سلیم احمد نے اس عہد کی شاعری کو 'ادھوری' شاعری یا آدھے آدمی کی شاعری قرار دیا تھا۔ اردو ادب میں جنس کا باقاعدہ ذکر ۳۰ء کے عشرے میں اس وقت شروع ہوا جب احمد علی، منٹو، عصمت چغتائی، محمد حسن عسکری اور اوپندر ناتھ اشک وغیرہ نے افسانے میں اور میرا جی، ن م راشد اور مخمور جالندھری وغیرہ نے شاعری میں اس موضوع کو چھیڑا۔

جیسا کہ میں نے اس سے قبل لکھا ہے، برطانیہ میں فحش نگاری کے خلاف قانون ہندوستان میں قانون بننے کے ایک سال بعد ۱۸۵۷ء میں بنا تھا۔ ظاہر ہے برطانیہ کے بدلے ہوئے معاشرے میں یہ قانون فرسودہ اور پیش پا افتادہ ہو چکا تھا اور عصری تقاضوں کو پورا نہیں کرتا تھا۔ چناں چہ ۱۹۵۹ء میں برطانوی پارلیمنٹ نے ایک نیا قانون 'نیو اوبسین ایکٹ' منظور کیا۔ یہ ایکٹ ۱۹۵۴ء میں دارالعلوم میں پیش کیا گیا تھا جس کی حمایت ومخالفت میں بڑی زوردار بحثیں ہوئیں۔ قدامت پسندوں کی مخالفت کے باعث اس میں کئی ترامیم کی گئیں اور اسے منظور کرنے میں پارلیمنٹ کو پانچ سال کا عرصہ لگا۔ اس قانون کو پیش کرنے والے رکن پارلیمنٹ مسٹر جینکنس نے اپنے ایک مضمون میں لکھا کہ ایکٹ میں ترامیم کے باعث اگرچہ اس کے مقاصد کو جزوی طور پر نقصان پہنچا ہے، تاہم اُسے لبرل خیال کی جیت قرار دیا جاسکتا ہے، مثلاً اس ایکٹ میں واضح طور پر کہا گیا ہے کہ کسی کتاب پر مقدمہ چلاتے وقت اس پر مجموعی طور پر غور کیا جائے گا، اور کتاب کے کسی ایک حصے یا چند اقتباسات پر کوئی کتاب غیر قانونی قرار نہیں دی جائے گی۔ علاوہ ازیں اس بات پر بھی غور کرنا ضروری ہوگا کہ جس کتاب پر مقدمہ دائر کیا گیا ہے، اسے کس قسم اور کس طبقے کے لوگ پڑھ سکتے ہیں۔ اس بنیاد پر کوئی فیصلہ نہیں کیا جائے گا کہ کتاب کن کے ہاتھ لگ سکتی ہے۔ ماضی میں کسی کتاب کو صرف اس دلیل کی بنا پر غیر قانونی قرار دیا جاتا تھا کہ اس کے ناپختہ ذہنوں کے پڑھنے کا امکان ہے، خواہ کتاب سائنس کی ہو نفسیات کی یا جنسیات کی۔ اسی منطق کے تحت ہیولاک ایلس کی تصنیف 'سائیکولوجی آف سیکس' کو برطانیہ اور دیگر کئی ممالک میں ممنوع قرار دیا گیا تھا۔ اب سوال 'امکان' کا نہیں 'ممکن' کا تھا۔

اس ایکٹ کی تیسری خوبی یہ تھی کہ اگر مقدمے کے دوران یہ ثابت ہوجائے کہ علم وفن اور آرٹ اور کلچر کے، فائدے کے لیے، متذکرہ کتاب کی ضرورت ہے تو اس کتاب پر کوئی پابندی عائد نہیں کی جائے گی لیکن اسے ثابت کرنے کے لیے مدعی اور مدعا علیہ دونوں کو، ماہروں اور عالموں کو بطور گواہ پیش کرنا ہوگا، جو متذکرہ کتاب کی ادبیانہ اور دیگر خوبیوں کے بارے میں اپنی رائے دیں گے۔ اس ایکٹ کی چوتھی خوبی یہ ہے کہ اگر کسی کتاب کو ضائع کردینے کے حق میں فیصلہ کیا گیا تو مصنف یا ناشر کو عدالت میں حاضر ہوکر اپنی شہرت یا جائیداد کی حفاظت کے لیے دلائل پیش کرنے کا حق ہوگا۔ پانچویں خوبی یہ ہے کہ جرم کے ارتکاب کے دو برس گزر جانے کے بعد کسی قسم کا مقدمہ نہیں چلایا جائے گا۔ چھٹی خوبی یہ ہے کہ مصنف کی کتاب پر غیر ذمے دارانہ طور پر مقدمہ دائر کرنے کی صورت میں مدعا علیہ کو الزام عائد کرنے والے سے ہرجانہ وصول کرنے کا حق ہوگا۔ جینکنس نے اس ایکٹ کے بارے میں لکھا کہ، نئے قانون کے تحت، کم از کم کاغذ پر، ادیبوں کی آزادی تحریر محفوظ ہوگئی ہے۔ لیکن اس قانون پر عمل کس طرح ہوگا، اس کا انحصار اس بات پر ہے کہ عدالت اس قانون کی تشریح کس طرح کرتی ہے۔

آج سے نصف صدی قبل ریڈکلف ہال کے ناول 'دی ویل آف لون لی نیس' پر فحش نگاری کے برسوں پرانے اور فرسودہ قانون کے تحت مقدمہ چلا کر ممنوع قرار دیا گیا تھا جس پر اس دور کے مشاہیر اہل قلم نے سخت احتجاج کرتے ہوئے اپنے ایک مشترکہ بیان میں عدالت سے اس پر سے پابندی اٹھالینے کی درخواست کی جس میں اس ناول کی ادبی اور فنی خوبیوں پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی تھی۔ اس کے باوجود عدالت نے ان کی درخواست کو مسترد کردیا تھا اس لیے کہ اس وقت تک برطانوی رائے عامہ اتنی لبرل نہیں ہوئی تھی۔ لطف کی بات یہ ہے کہ برطانیہ میں 'لیڈی چیٹر لیز لوز' پر اس وقت پابندی عائد تھی جب پورنوگرافی کی کتابیں اور رسائل برطانیہ میں برسرعام اور آزادانہ طور پر فروخت ہورہے تھے۔ بلیوفلموں کی عام نمائش جاری تھی اور گھٹیا قسم کے جاسوسی اور سنسنی خیز ناولوں کے ساتھ ساتھ البرٹو موراویا، ولیم فاکنر، ہیمنگوے، ارسکائن کولڈویل اور نوبوکوف جیسے معروف ادیبوں کے ناولوں میں لارنس سے زیادہ جنسی ہیجانات کا مظاہرہ کیا جارہا تھا۔ دو عالمی جنگوں نے یورپی عوام کے دل و دماغ، انداز فکر اور تصور حیات کو تہہ و بالا کر کے رکھ دیا تھا۔ اسی کے ساتھ انسان کے خیالات و تصورات، رہن سہن اور اخلاقی اور سماجی قدروں اور ذوق جمال میں بھی بڑے تغیرات رونما ہوگئے تھے۔ انھوں نے محسوس کرلیا تھا کہ لارنس کے ناول کو عہد وکٹوریہ کے معیار اخلاق پر جانچنا درست نہیں ہے، اس سے لارنس کے فن کے ساتھ ناانصافی ہوگی۔ برطانوی عوام کو فحش نگاری کے ضمن میں اپنے دوغلے پن اور دوہرے معیار کا بہت جلد احساس ہوگیا اور انھوں نے فحش ادب کے بارے میں ایک نیا اور لبرل نقطہ نظر اختیار کیا۔

لارنس کا المیہ یہ رہا کہ وہ اپنی زندگی میں اپنے ناول 'لیڈی چیٹر لیز لوز' کو مکمل صورت (یعنی غیر تخفیف شدہ صورت) میں برطانیہ میں شائع ہوتے ہوئے نہ دیکھ سکا۔ اس کی موت کے تیس سال بعد یہ ناول پہلی بار مکمل صورت میں شائع ہوا مگر اس ناول کی ادبی اہمیت کے بارے میں خود مغربی مصنفین اور ناقدین آج تک متفق نہیں ہوئے۔ اگر ایڈمنڈ ولسن اور آرچ بولڈ میک لیش جیسے نقاد اس کی تعریف کرتے ہوئے نہیں تھکتے گھتے تو کیتھرین این پورٹر اور سامرسیٹ مام جیسے ادیبوں کے خیال میں یہ ایک انتہائی بور اور اکتا دینے والا ناول ہے۔ اس ناول کی ادبی قدر و قیمت خواہ کچھ بھی ہو، برطانوی عدالت نے اس پر پابندی اٹھا کر برطانیہ کی دستوری تاریخ میں ایک عہد آفریں مثال قائم کی۔ لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی واضح رہے کہ فحش نگاری کے بارے میں برطانیہ سے بہت قبل امریکا نے معقول رویہ اختیار کیا تھا جہاں زیر عتاب کتاب پر مجموعی طور پر غور کرنا اور کتاب کی ادبی قدر و قیمت پر سوچ بچار کرنا ضروری قرار دیا گیا۔ اس اعتبار سے لبرل نقطہ نظر اختیار کرنے کا سہرا برطانیہ کے نہیں بلکہ امریکا کے سر بندھتا ہے۔

دل چسپ بات یہ ہے کہ برطانیہ میں اس ناول پر سے پابندی ہٹا لینے کے باوجود دنیا کے مختلف ممالک میں اس پر بہت دنوں تک پابندی عائد رہی جن میں امریکا اور بھارت شامل ہیں۔ لندن سے جب اس ناول کا غیر تخفیف شدہ ایڈیشن شائع ہو کر ہندوستان پہنچا تو بمبئی پولیس نے ایک کتاب فروش رنجیت ڈی۔ اوریشی کو تعزیراتِ ہند کی دفعہ ۲۹۲ کے تحت مذکورہ ناول فروخت کرنے کے جرم میں گرفتار کر لیا اور اس پر مقدمہ دائر کر دیا۔ ملزم نے صحت جرم سے انکار کرتے ہوئے اس الزام سے بھی انکار کیا کہ ناول فحش ہے۔ اس نے دعویٰ کیا کہ یہ دنیائے ادب کا ایک شاہ کار ناول ہے اس لیے اس پر فحش ہونے کا الزام نہیں لگایا جا سکتا۔ ملزم نے اپنی صفائی میں انگریزی زبان کے معروف ادیب اور ناقد ملک راج آنند اور دوسرے معروف مصنفین کے بیانات کا حوالہ دیا، جن میں انھوں نے اس ناول کی ادبی خوبیوں سے بحث کرتے ہوئے اسے 'کلاسک' قرار دیا تھا۔ ملزم نے اپنے بیان میں کہا کہ ناول اگرچہ جنس کے موضوع پر ہے لیکن اسے فحش نہیں کہا جا سکتا لوئر کورٹ نے دلائل سننے کے باوجود ناول کو فحش قرار دیتے ہوئے ملزم کو سزا سنائی۔ ملزم نے بمبئی ہائی کورٹ میں اپیل داخل کی، لیکن بمبئی ہائی کورٹ نے بھی ماتحت عدالت کے فیصلے کو برقرار رکھا جس پر ملزم نے سپریم کورٹ کے دروازے پر دستک دی۔ بھارت کی حکم راں جماعت انڈین نیشنل کانگریس بھی اس ناول پر پابندی کے حق میں تھی، چناں چہ اس مقدمے سے بہت پہلے جب لوک سبھا میں اس بارے میں سوال کیا گیا تو نائب وزیر داخلہ نے صاف الفاظ میں اعلان کیا کہ حکومتِ ہند لارنس کے اس ناول کے غیر تخفیف شدہ ایڈیشن پر سے پابندی نہیں اٹھائے گی اور جو بھی شخص اس ناول کو انفرادی طور پر لانے کی کوشش کرے گا، سی کسٹم ایکٹ مجریہ ۱۸۷۸ء کی دفعہ ۱۷ (سی) کے تحت ضبط کر لیا جائے گا لیکن سپریم کورٹ نے اس اعلان کی پروا کیے بغیر اپنا فیصلہ دیا۔

سپریم کورٹ کے جسٹس ہدایت اللہ نے سب سے پہلے حکم جاری کیا کہ سماعت کے دوران اس ناول کے خاص خاص حصوں کے بجائے پورے ناول کو زیرِ بحث لایا جائے اور بحث کے دوران اس کی ادبی قدر و قیمت کو بھی پرکھا جائے۔ انھوں نے ہر قسم کے شواہد کو پیش کرنے اور فحش نگاری کے بارے میں ماضی کے فیصلوں پر تکیہ کرنے کے بجائے کتاب کے بارے میں آزادانہ غور و خوض کرنے کی ہدایت کی۔ آج تک ہندوستان (اور صرف ہندوستان ہی کیوں پاکستان میں بھی) جج صاحبان ۱۸۶۸ء میں فحش نگاری کے بارے میں جسٹس کاک برن کی رائے کو سامنے رکھ کر ہی فیصلے سناتے آئے تھے۔ لیکن جسٹس ہدایت اللہ نے بدلے ہوئے سماجی حالات کے پیشِ نظر اس ناول پر غور کرنے کا حکم دیا اور ساتھ ہی یہ بھی اعلان کیا کہ اس بارے میں صرف زبانی شواہد پر انحصار نہ کیا جائے بلکہ ہر قسم کے دستاویزی ثبوت پیش کیے جائیں۔ مدعا علیہ نے اپنی اپیل میں عدالتِ عظمیٰ سے درخواست کی کہ نام نہاد فحش نگاری کے بجائے ناول کی مجموعی ادبی اور فنی خوبیوں کو بھی مدِنظر رکھا جائے اور ناول پر غور کرتے وقت یہ معیار نہ

بنایا جائے کہ ایک ناپختہ ذہن، کمسن لڑکا یا ابنارمل شخص پر مذکورہ ناول پڑھنے سے کیا اثر پڑے گا بلکہ معیار نارمل شخص کو بنایا جائے اور یہ معلوم کیا جائے کہ ایک نارمل شخص اس ناول کے پڑھنے سے مشتعل یا گمراہ ہوتا ہے یا نہیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ مصنف کا اس ناول کو لکھنے کا اصل مقصد کیا ہے کیا اس تحریر کا مقصد حصولِ زر ہے، جیسا کہ عام طور پر فحش کتابیں لکھنے والوں کا ہوتا ہے یا اس کا مقصد ادب کی تخلیق اور معاشرے کی عکاسی ہے اس میں شبہ نہیں کہ مصنف کے سامنے دو مقاصد تھے۔ اوّل، اپنے وطن کے طبقہ اشرافیہ کو دھچکا پہنچانا اور دوم، مثالی جنسی تعلقات کی عکاسی جو مصنف کی ہر تصنیف میں موجود ہے اس لیے مصنف کے عقیدے اور اس کی مشنری جذبے کے خلوص میں کسی قسم کے شبے کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ جسٹس ہدایت اللہ نے اپنے تاریخی فیصلے میں نہ صرف لیڈی چیٹر لیز لور کو فحش نگاری کے الزام سے بری قرار دیا بلکہ ناول کے متن اور مصنف کے فلسفہ حیات سے بھی تفصیلی بحث کی۔ انہوں نے ناول کی کہانی کا خلاصہ بیان کرتے ہوئے کہا کہ:

’ایک بیرونٹ (مسٹر چیٹر لے) کے جنگ میں خطرناک زخمی ہونے کے باعث اس کے جسم کا نچلا حصہ بالکل مفلوج ہو چکا تھا۔ اس نے فوج میں بھرتی ہونے سے چند روز قبل کاؤنٹیس (لیڈی چیٹر لی) سے شادی کی تھی اور اس کی ازدواجی زندگی بہت ہی مختصر رہی تھی۔ اسے (مسٹر چیٹر لے کو) اس بات کا شدید احساس تھا کہ اس کے جنسی طور پر ناکارہ ہو جانے کے باعث اس کی بیوی کی جنسی زندگی بالکل بے کیف ہو کر رہ گئی ہے۔ چناں چہ وہ اپنی بیوی کو دوسرے مردوں سے ملنے جلنے کے لیے آزاد چھوڑ دیتا ہے۔ کاؤنٹیس کا پہلی بار سابقہ مائیکل سے اور دوسری بار اس کی زمین کے نگراں ملر سے پڑتا ہے۔ اس کا پہلا عاشق جنسی اعتبار سے خود غرض تھا جب کہ دوسرا عاشق ایک قسم کا فنکار جو کاؤنٹیس کو عملی طور پر جنسی تلذذ کے اسرار سے واقف کراتا ہے۔ مصنف نے ناول میں ایک درجن مقامات پر جنسی اختلاط کی تفصیل بیان کی ہے۔ ناول میں گیم کیپر ملر جس انداز میں گفتگو کرتا ہے یا گفتگو کے دوران جو الفاظ استعمال کرتا ہے، وہ قطعی شائستہ نہیں۔ ناول میں جسم کے مختلف حصوں کا بڑی تفصیل اور بے باکی سے ذکر کیا گیا ہے اور مصنف نے جسم کے مختلف حصوں کے بیان کے لیے مختلف نام استعمال کیے ہیں۔ ناول کے دوسرے حصے میں مصنف نے جدید مشینی تہذیب اور مرد و عورت کی آزادانہ جنسی زندگی پر اس کے مضر اثرات کے بارے میں کڑی تنقید کی ہے۔ لارنس کے خیال میں مرد و عورت کے جنسی زندگی میں جو ناہمواری پائی جاتی ہے اور جس کی وجہ سے ان کی زندگی ناخوش گوار ہو جاتی ہے، اس کا اصل سبب جدید مشینی تہذیب ہے۔‘

جسٹس ہدایت اللہ نے مزید لکھا کہ یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ، ’دنیا‘ ’پامیلا‘، ’مول فلینڈرس‘ اور ’مسز وارینز پروفیشن‘ کے دور سے بہت آگے نکل چکی ہے۔ یہ وہ تصانیف ہیں، جنھیں فحش اور ناشائستہ تصور کیا جاتا تھا۔ آج یہ ساری تصانیف اور ارسٹوفینس سے لے کر زولا سمیت تمام مصنفوں کا وسیع

پیانے پر مطالعہ کیا جارہا ہے، ان میں سے بمشکل کسی کی فحاشی کا نوٹس لیا گیا ہے۔ اگر آرٹ اور فحش نگاری کے بارے میں ہمارے روّیے میں بنیادی تبدیلی رونما ہوئی تو ارکسائن کالڈویل کے ناول 'گوڈز لٹل ایکر' اور آندرے ژید کے ناول 'اِف اٹ ڈائی' کا وجود محال ہو جائے گا۔ تمام انگریزی ناولوں کو ڈرائنگ روموں سے نکال دینا پڑے گا۔ خود ٹامس ہارڈی کے ناول 'ٹیس' کو اس کے عہد میں سخت ناپسند کیا گیا حالاں کہ آج کے عہد میں یہ ناول دوسری کتابوں کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں ہے۔ آج کی دنیا میں گزشتہ عہد سے زیادہ قوتِ برداشت موجود ہے اور وہ مختلف قسم کے ادب کو برداشت کرنے پر آمادہ ہے، چناں چہ عدلیہ کو ہر کتاب کے بارے میں اس کی اہمیت کے پیش نظر الگ الگ غور کرنا ہوگا۔ اگر ادب اور فن کے سلسلے میں ایسا رویہ اختیار نہ کیا گیا تو عدالت ایک قسم کا بورڈ آف سنسر بن کر رہ جائے گی۔

کوئی تصنیف فحش ہے یا نہیں اس بارے میں فیصلے کا انحصار زیادہ تر منصفوں کے صوابدید پر ہوتا ہے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر مُنصف ادب پارے اور ادب وفن کے تقاضوں سے بے خبر ہے اور صرف قانونی موشگافیوں سے دلچسپی رکھتا ہے، یا مذہبی معاملات میں متعصب، تنگ نظر اور سخت گیر ہے، اُسے ادب وفن سے کوئی شغف نہیں، وہ 'پیوریٹن' مزاج کا حامل ہے، تو ظاہر ہے وہ جنس کا شائبہ پاتے ہی اسے ممنوع قرار دے گا۔ اس کے برعکس، اگر منصف نہایت کلچرڈ، آزاد خیال اور وسیع النظر ہے اور ادب وفن کے تقاضوں کو سمجھتا ہے تو وہ اس کے بارے میں انصاف کے متقاضی رویہ اختیار کرے گا۔

سب سے پہلے دیکھا یہ جانا چاہیے کہ مصنف نے تصنیف کو کس مقصد اور نیت سے لکھا ہے، اس دور کا معیار اخلاق اور ذوق سلیم کیا ہے اور اس کے مطالعے سے پڑھنے والے پر مجموعی طور پر کیا تاثر ثبت ہونے کا امکان ہے! آخری الذکر دونوں چیزیں یعنی معیار اخلاق اور ذوق سلیم چوں کہ وقت اور ماحول کے ساتھ بدلتی رہتی ہیں، اس لیے ماہرین قانون اور ناقدین کے خیال کے مطابق فحش نگاری سے متعلق قانون کی تعبیر وتشریح کو بھی وقت کے ساتھ بدلتے رہنا چاہیے۔ ان تمام باتوں کے باوجود فحش نگاری سے متعلق قانون میں چونکہ فحاشی کی کوئی واضح تعریف نہیں کی گئی ہے اس لیے بات گھوم پھر کر عدالت کے رویّے اور صوابدید پر آجاتی ہے کہ وہ جسے چاہے فحش نگاری کا مرتکب قرار دے اور جسے چاہے اس الزام سے بری کر دے۔ اس ضمن میں ایک اور بات بھی قابل غور ہے وہ یہ کہ ان تمام باتوں کا تعلق معاشرے کے مجموعی روّیے سے بھی ہے۔ مثال کے طور پر اگر معاشرہ جمہوری، ترقی یافتہ اور روشن خیال ہے تو اس کا اخلاقیات، ادب وفن اور عمومی طور پر زندگی کے بارے میں رویہ مختلف ہوگا۔ (جیسا کہ مغربی ملکوں اور بہت حد تک ہندوستان اور جاپان میں ہے) اور اگر معاشرہ نہایت رجعت پسند، دقیانوسی اور قرون وسطیٰ کے خیالات ورجحانات کا حامل ہے تو وہاں ادب وفن اور پوری زندگی کے بارے میں اس کا طرز فکر مختلف ہوگا۔ فحش نگاری کے سوال سے بحث کرتے ہوئے ان باتوں کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔

(زیر اشاعت کتاب سے ماخوذ)

ادب اور فحاشی

اے بی اشرف

ادب نہ تو سائنس ہے نہ علم نجوم، نہ فلسفہ ہے نہ منطق، نہ تاریخ ہے نہ مذہب، لیکن وہ یہ سب کچھ بھی ہے یعنی فلسفہ ہو یا تاریخ یا اخلاق، سائنس ہو یا تاریخ سب اس کا موضوع ہیں۔ پوری زندگی اور اس کے متعلقات اس کا موضوع ہیں کیوں کہ ادب زندگی کا ترجمان ہے۔ تہذیب و معاشرت کے اظہار کا ذریعہ ہے۔ وہ 'ہمہ دان' ہمہ پہلو اور ہمہ گیر ہے۔

فرائڈ کی ہم نوائی میں ہم جنس کو مرکزی اہمیت نہ بھی دیں تب بھی یہ حقیقت اپنی جگہ مسلم ہے کہ جنس زندگی کا ایک اہم پہلو ضرور ہے اور ظاہر ہے اس اہم پہلو کو ادب میں بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا جنس کی کارفرمائی اگر ہماری زندگی میں موجود ہے تو ادیب کی آنکھ اس پر ضرور پڑے گی اور اس کی تصویر بھی کھینچے گی، اس لیے یہ تو تسلیم شدہ بات ہے کہ جنس ادب کا موضوع ہے۔ رہا سوال اس کی پیش کش کا۔ ادیب کا کام یہ ہے کہ زندگی جیسے ہے اس کو پیش کرے لیکن اس کے ساتھ اگر وہ یہ بھی بتا دے کہ اس کے خیال میں اسے کیسا ہونا چاہیے تو گویا اس نے فرض ایمان داری سے ادا کر دیا۔ اس فرض کی تکمیل پر ادیب کو فحش نگاری کا الزام اس وقت دیا جا سکتا ہے جب یہ ثابت کر دیا جائے کہ زندگی جیسی اس نے پیش کی ہے ویسی نہیں۔

ہماری سوسائٹی میں ایسے کلب بھی ہیں جہاں سوشل تعلقات کے نام پر عریاں رقص ہوتے ہیں جہاں شراب، افیون اور بھنگ کے ٹھیکے دیئے جاتے ہیں جہاں طوائفیں لائسنس لے کر کوٹھے سجاتی ہیں اور خانقاہوں پر چڑھاوے چڑھا کر دکان چمکنے کی دعائیں مانگتی ہیں۔ جہاں 'شرفا' کے بنگلوں پر 'بلیو پرنٹس' جسم کو پکارتے ہیں وہاں ادب کو اس کی تصویر پیش کرنے سے روکنا کہاں تک جائز ہے! اخبار میں پانچ کالمی سرخی لگا کر، سنسنی خیزی میں اضافہ کرنا، نیم برہنہ تصاویر شائع کرنا اور مارکیٹ بڑھانا برحق، مگر ادیب کا معاشرے کے چہرے سے منافقت کی نقاب نوچ پھینکنا قابل تعزیر! احتساب کی گرفت صرف ادیب پر کیوں! جرم و تعزیر کے ان قوانین پر کیوں نہیں جو بے اثر ہیں۔

احتساب اس غلط معاشی نظام پر کیوں نہیں جو ان برائیوں کو پھیلانے میں مدد دیتا ہے! دولت کی اس غیر منصفانہ تقسیم پر کیوں نہیں جو معاشرے میں تمام تر خباثتوں کی جڑ ہے! ادیب تو

معاشرے اور اس کی اقدار کا ترجمان ہے۔ ادب کی اچھائی برائی کا انحصار تو معاشرے اور سماج کی اچھائی برائی پر ہے۔ ادب کے مقاصد کا تعین خود اس دور کا سماجی اور معاشی ڈھانچہ کرتا ہے اس لیے سوال ادب کی اصلاح کا نہیں، معاشرے کی تہذیب و تنقیح کا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اب تو فحاشی یا جنس ایک معاشرتی مسئلہ بن گیا ہے یہ ادب کا مسئلہ تو رہا نہیں کیوں کہ بقول کسی مغربی ادیب کے ’آج کل معاشرہ ادب سے اتنا بے نیاز ہو گیا ہے کہ اگر بہت سے شاعروں (ادیبوں پر بھی یہ بات صادق آتی ہے) کو نفسیاتی الجھنیں تنگ نہ کیا کرتیں تو وہ شعر ہی نہ کہتے۔‘ (بحوالہ ’ستارہ اور بادبان‘ از محمد حسن عسکری، ص ۳۷)

ہمارے معاشرے میں قدم قدم پر تضاد دکھائی دیتا ہے گویا اب ہمارے سماجی روابط کی بنیاد ہی تضاد پر رکھ دی گئی ہے۔ ایک طرف تو دعوتِ گناہ کا سامان فراواں صورت میں ہے دوسری طرف تعزیر کی جکڑ بندیاں ہیں۔ ایک طرف نت نئے فیشن کی نمود و نمائش اور لباس کے سانچے میں ڈھلے ڈھلائے بدن دعوتِ نظارہ کا سامان ہیں تو دوسری طرف اخلاقی بندشیں۔ معاشی بدحالی کے سبب شادی کے مسائل، جنسی گھٹن اور جنسی تعلیم کے فقدان کے سبب بے راہ روی عام ہے۔ ایک طرف گناہ حسین صورت میں موجود ہے تو دوسری طرف موت کا سایہ تعزیر کا روپ دھارے ہوئے موجود ہے۔ گویا ہم مقامِ برزخ پر ہیں لیکن انسان کی بنیاد لغزش پر ہے۔ فاؤسٹ کے الفاظ میں ’گناہ کی تعزیر موت ہے اور اگر ہم یہ کہیں کہ ہم گناہ کے ارتکاب کے اہل نہیں تو گویا ہم اپنے آپ کو فریب دے رہے ہیں اور حقائق سے چشم پوشی کر رہے ہیں۔ اس کا نتیجہ کیا ہے کہ ہم گناہ کریں گے اور اس کے بدلے میں یقیناً موت سے ہم کنار ہوں گے۔‘

ڈی ایچ لارنس، منٹو یا عصمت پر مقدمے کھڑے کر کے ان کو پرورش لوح و قلم کرنے سے اس وقت تک باز نہیں رکھا جا سکتا جب تک معاشرے میں جنسی گھٹن، بے راہ روی اور ذہنی بیماریوں کا وجود ختم نہیں ہو جاتا۔ ’لیڈی چیٹرلیز لور‘ لکھنے پر ڈی ایچ لارنس کو معتوب قرار دینے والے یہ بھول جاتے ہیں کہ لیڈی چیٹرلے کوئی فرشتہ نہیں۔ اس کے خاوند کا نچلا دھڑ بے کار ہے۔ اب اس کا خاوند ’جسم کی پکار‘ کا ساتھ نہیں دے سکتا محض ’ذہن‘ کا ساتھ دے سکتا ہے۔ چیٹرلے کو ذہن کے ساتھ جسم کی بھی ضرورت ہے۔ ’گیم کیپر‘ بھی پوری طرح شیطان نہیں ہے۔ شیطان ہوتا تو اپنی شہوت پرست بیوی سے علاحدگی اختیار نہ کرتا۔ اس کی بیوی محض ’جسم‘ ہے اور انسان کو دماغ اور جسم دونوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایک ذہن کی خشک آنچ سے بیزار ہے، دوسرا جسم کی گرم آگ سے خائف اور جلا ہوا ہے۔ دونوں ایک صحت مند زندگی کے خواہاں ہیں، دونوں مل جاتے ہیں اور دونوں کو جسم اور ذہن کا امتزاج نصیب ہوتا ہے۔ یہی وہ نقطۂ نظر ہے جس کو مصنف پیش کرنا چاہتا ہے۔ صحت مند ازدواجی زندگی کے اس تصور کو لوگوں نے فحاشی کا نام دے دیا۔

سارے ناول میں دو ایک صفحوں پر پھیلے ہوئے اس جنسی فعل کی تفصیل کو جس میں جسم اور ذہن کو صحت مند ماحول میسر ہے، فحاشی کا سرٹیفکیٹ دے دینا زیادتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ رچرڈ ہوگرٹ نے 'لیڈی چیٹر لیز لوز' کو خراج تحسین ادا کرتے ہوئے اسے 'صاف ستھری سنجیدہ اور خوب صورت کتاب' قرار دیا اور حصولِ لذت کے لیے دوسری بہت سی کتابوں کی طرف رجوع کرنے کا مشورہ دیا اور یہاں تک کہہ دیا کہ 'اگر ہم اس کتاب میں سے فحش چیزیں پڑھنے پر ہی مصر ہیں تو ہم ہی وہ ہیں جو فحش ہیں۔ اس طرح ہم لارنس کو نہیں، اپنے آپ کو فحش ثابت کر رہے ہیں۔'

ہمارے معاشرے میں کتنے ہی جوڑے ہیں جو اُس صحت مند ماحول کے متلاشی ہیں جو لیڈی چیٹر لے اور گیم کیپر کو ایک دوسرے کو پا کر حاصل ہوا! اس صحت مند ماحول سے محرومی کا احساس ان لوگوں میں جھنجھلاہٹ پیدا کرتا ہے اور وہ اس قسم کے لٹریچر کو نشانہ احتساب بناتے ہیں حالاں کہ خود یہ بے جا احتساب خطرناک نتائج کا حامل ہوتا ہے۔ لیڈی چیٹر لے اور گیم کیپر کے جنسی تعلقات کی بنیاد دونوں کی جسمانی اور ذہنی مطابقت پر ہے، ایک دوسرے کے جذبات کا احترام ہے۔ خود غرضی یا نفس پرستی ان کے جنسی تعلقات کی محرک نہیں ہے۔ یہی وہ صحیح جنسی معلومات ہیں جو جنسی زندگی کو بھٹکاتی نہیں بلکہ سیدھی راہ پر چلاتی ہیں۔

اصل مسئلہ یہ نہیں کہ ادیب پر پابندی عائد کر دی جائے کہ وہ کس قسم کا ادب تخلیق کرے اور کس قسم کا نہ کرے بلکہ اصل مسئلہ یہ ہے کہ وہ ذہن کیسا ہے جو اس قسم کے ادب کو قبول کرتا ہے اور اس سے اثر لیتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں ادیب کے ذہن اور قلم پر پابندی لگانا درست نہیں۔ قاری کے ذہن کی تربیت اہم ہے بیمار ذہنیت کی اثر پذیری ایک صحت مند ذہن کی اثر پذیری کی صلاحیت سے مختلف ہوگی۔ منٹو کا افسانہ 'ٹھنڈا گوشت' ایک بیمار ذہن کے لیے گرم و نرم اور تھرکتا مچلتا گوشت ثابت ہو سکتا ہے، وہ اس سے مشتعل ہو جاتا ہے لیکن وہی افسانہ ایک صحت مند ذہن رکھنے والے آدمی کو 'انسان' بنا سکتا ہے کیوں کہ اس نے ایشر سنگھ کی حیوانیت کو انسانیت میں تبدیل کر دیا بلکہ میں تو یہاں تک کہوں گا کہ کبھی کبھی فحش ادب بھی معاشرے کے لیے ایک ضروری عنصر بن جاتا ہے۔ خصوصاً اس معاشرے کے لیے جہاں قدم قدم پر اخلاقی اور جنسی گھٹن ہو، جہاں انسان غیر صحت مند اور فرسودہ اخلاقی روایات سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہتا ہو، وہاں فحش ادب 'کیتھارسیز' یعنی تنقیح کا کام کرتا ہے۔ ہیولاک ایلس نے کہا ہے کہ 'فحاشی انسان کی معاشرتی زندگی کی ایک مستقل شاخ ہے اور انسان کے ذہن کی اہم ضرورت کے مطابق ہے۔ فحاشی ہر نظام میں برقرار رہے گی کیوں کہ اس کی بنیاد جائز اور فطرت کے مطابق ہے۔' (بحوالہ 'ادب اور فحاشی' دیویندر اسر، صحیفہ ۶)

ادیب کو معاشرے کی اس ضرورت کا احساس ہوتا ہے کیونکہ وہ قاری کے لیے مسرت کی بہم رسائی اور اس کی تنقیح کا بھی ذمے دار ہوتا ہے۔ دراصل بات یہ ہے کہ حقیقت نگار قلم فحاشی کو مقصد بنا کر تو پیش نہیں کر رہا ہوتا۔ اگر ایسا ہے تو یہ فحاشی کے زمرے میں آئے گا لیکن اگر فحاشی کو کسی بڑے مقصد کا ذریعہ بنایا ہے تو یہ ناجائز نہیں ہے کیوں کہ ہمیں مقصد کو پیش نظر رکھنا ہے ذریعے کو نہیں۔ مولانا جلال الدین رومی کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ ان کی مثنوی میں ایسی بہت سی حکایتیں بھی موجود ہیں جن میں عورتیں جانوروں تک سے جنسی فعل کراتی دکھائی دیتی ہیں لیکن رومی کی مثنوی کو ‘قرآن در زبان پہلوی’ کا درجہ دیا گیا ہے اس لیے کہ ان کا مقصد معاشرے کی عکاسی اور اصلاح تھا، اس کو بگاڑنا نہیں۔ یوں تو آسمانی اور مذہبی کتابوں میں بھی جنس کو بڑے کھلے اور واضح انداز میں پیش کیا گیا ہے لیکن ان پر فحاشی کا الزام نہیں لگایا جاتا اس لیے کہ وہ ایک صحیح تعلیم ہے اور صحیح جنسی تعلیم معاشرے کے لیے لازمی ہے۔ پھر ادیب کو مورد الزام کیوں ٹھہرایا جائے؟ کیا اس لیے کہ وہ حقیقت نگار ہے، معاشرے کا عکاس ہے!

نظامِ اخلاق کوئی جامد شے نہیں جو ہر زمانے کے لیے ایک ہی دفعہ وضع کر لیا جائے اور پھر اسی کسوٹی پر ہر زمانے کے عمل کو پرکھا جائے۔ ہر زمانے کے نئے تقاضے ہوتے ہیں۔ اخلاق کے پیمانے بھی بدلتے رہتے ہیں۔ اخلاق کا تعلق معاشی اور سماجی اقدار کے ساتھ بڑا گہرا ہوتا ہے چناں چہ اقتصادی اور سماجی تعلقات کی نوعیت کے مطابق اخلاقی اقدار بھی تبدیل ہوتی رہتی ہیں۔ کچھ لوگ ان تبدیلیوں کو روحِ عصر سمجھتے ہوئے قبول کر لیتے ہیں لیکن قدامت پرست لوگ جو جذباتی طور پر ماضی کی فرسودہ اور جامد روایات سے وابستہ ہوتے ہیں زمانے کے بدلتے ہوئے تقاضوں کا ساتھ نہیں دے سکتے بلکہ وہ تشکیل کا شکار ہو کر نئی چیز سے خائف نظر آتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ہر نئی آواز اور ترقی پسند کے ہر رجحان کو خطرناک تصور کرتے ہوئے اس کے احتساب پر تل جاتے ہیں۔ یہ احتساب کبھی سرسیّد پر ‘نیچری’ ہونے کے فتوے کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے، کبھی اقبال پر کفر کے فتوے کی شکل میں اور کبھی وہ ڈی ایچ لارنس اور منٹو کے خلاف مقدمے کھڑے کرنے کا ذریعہ بنتا ہے تو کبھی اس کا اظہار ‘خالہ تاج’ کی اشاعت کی پاداش میں ‘سیپ’ کی ضبطی کی صورت میں ہوتا ہے۔ حالاں کہ اگر آج ہمیں ادیب کو اخلاق کی تعلیم دینی ہے اور اسے فحش اور عریاں ایسے الزامات سے پاک کرنا ہے تو ہمیں ادیب کی نہیں معاشرے کی اصلاح کرنی ہوگی۔

جنس ہمیشہ ادب کا موضوع رہا ہے لیکن اس کی صحت مندی یا بیماری کا سرٹیفکیٹ معاشرہ دے سکتا ہے کیوں کہ ادیب معاشرے کا عکاس ہے کسی دور کے جنسی روابط، رجحانات، اصول و ضوابط، آزادی اور پابندی کے قوانین اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والے صحت مند جنسی نقطہ ہائے نظر یا ناآسودگی اور بے راہ روی کے جذبات ادب کا موضوع بنتے ہیں۔ ادب زمانے کی تہذیبی اقدار کی تصویر

پیش کرتا ہے اگر منظر کریہہ اور بدہیت ہے تصویر بھی ویسی ہی ہوگی خواہ اس کے لیے پس منظر کتنا ہی دل کش اور حسین کیوں نہ بنایا جائے۔ ادب کیمرے کی آنکھ ہے، جس طرح کیمرے کے ماسکہ کی درستی، فاصلے کے تعین، دھوپ اور سائے کے توازن اور رنگ آمیزی سے تھوڑی تبدیلی پیدا کر لینے کے باوجود بدصورت کو بدصورت اور حسین کو حسین دکھاتا ہے اسی طرح ادیب بھی نگاہ کے زاویے، موضوع کی اہمیت، حقیقت و تخیل کے توازن اور الفاظ کے پیچ وخم سے تہذیبی اقدار کو جیسی وہ ہیں تھوڑی سی تبدیلی کے ساتھ پیش کر دیتا ہے کیوں کہ ادب انفرادی فعل نہیں ہے بلکہ اس کی جڑیں سماجی اور معاشی روابط اور اقدار میں پیوست ہوتی ہیں۔

ماخذ (اُردو۔۳۴)

rekhta

ادبی فحاشی

طاہر جاوید مغل

یہ ان دنوں کی بات ہے جب آسٹریلیا میں فحش لٹریچر کا دور دورہ تھا اور یہ کوئی آسٹریلیا کے ساتھ ہی مخصوص نہ تھا دنیا کے تمام ترقی یافتہ ممالک میں بُکس سٹورز ہوش رُبا قسم کی کتابوں سے بھرے ہوئے تھے۔ فحش لٹریچر کا کاروبار تو آج بھی ہر جگہ ہوتا ہے لیکن اس وقت یہ کاروبار پر پابندی سے آزاد تھا۔ پبلشرز حضرات ایک سے بڑھ کر ایک تحریر چھاپ رہے تھے اور دُکان دار کھلے بندوں اشتعال انگیز کتابیں اور رسالے فروخت کرنے میں مصروف تھے۔ دوسرے ممالک کی طرح آسٹریلیا کی حکومت بھی اس روز افزوں خرابی سے سخت پریشان تھی۔ آخر فحش مواد چھاپنے اور فروخت کرنے پر مکمل پابندی لگا دی گئی۔ جیسا کہ عموماً ہوتا ہے شروع شروع میں اس قانون پر نہایت سختی سے عمل کروایا گیا۔ اشاعتی اداروں اور دکانوں پر چھاپے مارے گئے، متعلقہ لوگوں کو گرفتار کیا گیا، بے شمار کتابیں اور رسالے جلائے گئے۔ لوگوں کو اس کام سے باز رکھنے کے لیے کڑی سزائیں مقرر کی گئیں۔ ان دنوں سختی کا یہ عالم تھا کہ ردّی خریدنے والے لوگ بھی یہ دیکھ کر ردّی خریدتے تھے کہ کہیں وہ 'فحش ردّی' نہ خرید لیں۔ فحش لٹریچر کے ساتھ ساتھ 'تجریدی فن' بھی پولیس کی دست بُرد سے نہ بچ سکا۔ کئی بک اسٹالوں سے 'مائیکل انجلو کے بنائے ہوئے' مجسموں کی تصاویر تک اتار لی گئیں۔ ایک موقع ایسا آیا کہ آسٹریلیا میں پانچ ہزار کتابوں کی اشاعت اور فروخت پر مکمل پابندی عائد کر دی گئی۔ جن کتابوں پر پابندی لگی ان میں 'بریو نیو ورلڈ' 'فیر ویل ٹو آرمز' اور 'مول فلینڈرز' جیسی کتابیں بھی شامل تھیں۔ اُن دنوں پبلشر حضرات خواتین کی سیدھی سادھی تصاویر چھاپنے سے بھی گریز کرنے لگے تھے۔ بہت سے لوگوں نے اشاعت کا کام چھوڑ کر دوسرے شعبوں کا رُخ کیا اور بے شمار بک اسٹالوں پر تالے پڑ گئے۔ پھر ایک موقع پر ایسی کتابوں اور رسالوں کی بھی جانچ پڑتال شروع کی گئی جنھیں اس سے پہلے اشاعت کی اجازت مل چکی تھی۔ ایسا ایک شرارت کی وجہ سے ہوا۔

یہ واقعہ ۱۹۴۴ء کا ہے۔ ان دنوں سنسر اپنی تمام سختیوں کے ساتھ نافذ تھا۔ اس سال کے شروع میں جس رسالے نے پولیس کو اپنی جانب متوجہ کیا وہ ایک نیم ادبی رسالہ اینگری پینگوئنز (Angry Penguins) تھا۔ یہ رسالہ 'ایڈی لیڈ' سے نکلتا تھا۔ ایک روز اس کے مدیران میکس ہریس اور جون

ریڈ کو ایک منفرد طرز کا آرٹیکل موصول ہوا۔ ایک پلندہ تھا جس کے بارے میں بھیجنے والے نے لکھا تھا کہ اس کی مرحوم بھائی ایرن کی جدید نظمیں ہیں اس نے لکھا تھا کہ ایرن ۲۵ برس کی عمر میں نہایت کسمپرسی کے عالم میں انتقال کر گیا تھا۔ شاعر کا پس منظر خاصا اثر انگیز تھا۔ نظمیں بھی ٹھیک ٹھاک تھیں۔ ہریس اور ریڈ اپنی اس دریافت پر اتنے خوش ہوئے کہ انھوں نے فوراً ایک خاص شمارہ نکالنے کا فیصلہ کر لیا۔ جواں مرگ شاعر کی نظمیں بڑے اہتمام اور رازداری کے ساتھ اشاعتی مراحل سے گزریں۔ آخر شمارہ مارکیٹ میں آ ہی گیا۔ لوگ نوجوان آسٹریلوی شاعر کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملا رہے تھے 'سڈنی' کے دونو آموز شاعر ہنس ہنس کر بے حال ہو رہے تھے۔ دراصل ان نظموں کے خالق وہ خود تھے۔ انھوں نے بالکل بے معنی لفظوں اور فقروں کو مربوط کر کے جدید نظموں کا نام دے دیا تھا۔ اُنھیں خود بھی معلوم نہیں تھا کہ انھوں نے کیا کہا اور کیوں کہا۔ انھوں نے صرف ایک بات کا خیال رکھا تھا کہ لفظوں میں موسیقیت ہو۔ لفظ کیا ہوں یہ انہوں نے نہ سوچا تھا اور نہ اُنھیں سوچنے کی ضرورت تھی۔ سوچنے کا کام انہوں نے ناقدین پر چھوڑ دیا تھا۔

ہر روز نت نئے تبصرے اخباروں کی زینت بننے لگے۔ بے معنی نظموں کی نہایت پر مغز تشریحات سامنے آنے لگیں۔ کسی نے کہا شاعر اندرونی خلفشار کا شکار تھا، کسی نے کہا وہ موجودہ معاشرے کا ایک ناراض نوجوان تھا، کسی نے کچھ قرار دیا کسی نے کچھ۔ دونوں نوجوان نہایت خاموشی سے صورتِ حال کا مشاہدہ کرتے رہے۔ دوسری طرف ایڈیٹر حضرات کو اس وقت شامتِ اعمال نے آ گھیرا جب ان کی شائع کردہ نظمیں فحاشی کے زمرے میں آ گئیں۔ ہیرس اور ریڈ کے ایک حریف پبلشر نے جب یہ دیکھا کہ یہ نظمیں ہر کسی کی سمجھ سے بالاتر ہیں اور ان کی مقبولیت کی وجہ بھی یہی ہے کہ وہ کسی کے پلے نہیں پڑتیں تو اس نے ایک نیا شوشہ چھوڑا۔ اس نے ایک دھماکے سے یہ دعویٰ کیا کہ یہ نظمیں دراصل فحاشی کا بدترین نمونہ ہیں، شاعر نے علامتوں کے ذریعے زبردست فحش نگاری کی ہے۔ اس طرف اشارہ ہونے کی دیر تھی کہ بہت سے لوگوں کو ان نظموں میں گندگی کے ڈھیر نظر آنے لگے۔ ان نقادوں نے اُن کی تشریحات شروع کر دیں۔ یہ تبصرے خود بھی فحش نگاری کا عمدہ نمونہ تھے لیکن ارباب اختیار نے ان تبصروں کو تو نظرانداز کر دیا لیکن نظموں پر پابندی لگا دی۔ جنوبی آسٹریلیا کی پولیس نے رسالے کی تمام کاپیاں ضبط کر لیں اور ہیرس پر ان نظموں کا ایڈیٹر ہونے اور فحش مواد چھاپنے کے الزام میں مقدمہ کر دیا۔ اس اثنا میں ان نظموں کی شہرت آسٹریلیا کے طول و عرض میں پھیل گئی۔ لوگ ردی کے ڈھیروں سے اس شمارے کی کاپیاں ڈھونڈنے لگے۔ جو لوگ نظموں سے 'مستفید' ہو چکے تھے انہوں نے مرچ مسالا لگا کر دوسروں کو فیض یاب کرنا شروع کر دیا جن لوگوں کو یہ شرف حاصل نہیں ہوا تھا وہ حسرت سے ہاتھ ملنے لگے۔ اس سلسلے میں کئی دل چسپ باتیں بھی سننے میں آئیں۔ 'لیول پول' کے ایک مضافاتی

پولیس اسٹیشن پر رات کے وقت چوروں نے نقب لگائی۔ اُنھیں رنگے ہاتھوں گرفتار کرلیا گیا، یہ مقامی کالج کے نوجوان تھے۔ شک تھا کہ انھوں نے تھانے کے گودام سے اسلحہ وغیرہ چرانے کا پروگرام بنایا تھا۔ بعدازاں وہ کوئی بڑا ڈاکہ ڈالنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ لیکن تفتیش کے بعد یہ پتا چلا کہ وہ رسالے کی ضبط شدہ کاپیوں کے حصول کے لیے گودام میں داخل ہوئے تھے۔ اُنھیں کسی نے بتایا تھا کہ وہ کاپیاں فلاں تھانے کے گودام میں رکھی ہیں۔ اسی طرح ڈروتھی نامی خاتون نے اپنے شوہر کے خلاف طلاق کی درخواست دی۔ اس نے کہا کہ وہ اس بداخلاق شخص کے ساتھ گزارا نہیں کرسکتی۔ پتا چلا کہ خاوند نے اپنی بیوی کی چھوٹی بہن کو ’جدید نظموں‘ والا شمارہ پڑھنے کو دیا تھا۔ وہ شریف آدمی نہیں جانتا تھا کہ ’ادب پروری‘ کی اتنی بھاری قیمت ادا کرنا پڑے گی۔ اسے کیا خبر تھی کہ چندروز بعد یہ نظمیں انتہائی فحش ثابت ہوجائیں گی۔ بیوی نے گمان کیا کہ شوہر نامدار اس کی نوعمر بہن پر بری نظر رکھتا ہے۔ اس نے جھٹ عدالت میں طلاق کی درخواست دے دی۔ شوہر کو وہ بیسیوں رسالے ڈھونڈھ کر بیوی کے سامنے ڈھیر کرنے پڑے جن میں مبصرین ان نظموں کو ’صاف ستھری نظمیں‘ قرار دے چکے تھے۔

رسالے کو نظمیں بھیجنے والے دونوں لڑکے جلد منظر عام پر آ گئے۔ ان کے خلاف کوئی کارروائی ممکن نہیں تھی انھوں نے تو نظمیں ایڈیٹر کو بھیج دی تھیں اب یہ فیصلہ کرنا ایڈیٹر کا کام تھا کہ نظمیں شائع ہونی چاہئیں یا نہیں۔ عدالت میں جرح کے دوران اس جاسوس کو طلب کیا گیا جس نے سب سے پہلے ان نظموں کو فحش ہونے کا الزام دیا تھا۔ وہ کوئی زیادہ پڑھا لکھا شخص نہیں تھا۔ اس نے اپنے طویل بیان میں بعض دل چسپ انکشافات کیے ایک جگہ اس نے کہا ’جناب! اس نظم میں شاعر ایک ایسے آدمی کا ذکر کرتا ہے جو ٹارچ لے کر رات کے اندھیرے میں پارک کی سیر کو نکلتا ہے۔ میں اپنے تجربے کی بنا پر یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ رات کے وقت ٹارچ لے کر باغ کی سیر کو نکلنے والے نہایت خطرناک ہوتے ہیں۔ وہ مجرمانہ ارادوں سے نکلتے ہیں۔ اس لحاظ سے یہ ساری نظم بلکہ پورا باب فحش ہے۔ پھر اس نے کہا ’نظموں میں ایک جگہ لفظ ’ناجائز تعلقات‘ استعمال کیا گیا کہ دو متضاد الفاظ کا ساتھ ساتھ آنا بھی فحش نگاری ہے۔ مثلاً سختی نرمی، بلندی پستی، تیزی سستی وغیرہ وغیرہ۔ اس نے کہا کہ ان نظموں کے ایک ایک لفظ میں فحاشی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔‘

ان نظموں کے لیے فحاشی کا لفظ اتنے تسلسل اور اتنی شدت کے ساتھ استعمال کیا گیا کہ واقعی یہ نظمیں فحش محسوس ہونے لگیں۔ لوگ خیال ظاہر کرنے لگے کہ پابندی کے اس دور میں ہیرس نے یوں ہی بے معنی نظمیں نہیں چھاپیں۔ یقیناً ان میں کوئی بات ہے۔ عدالت نے تمام بیانات بڑے غور سے سنے اور ہیرس کرس کو مجرم قرار دے دیا۔ اسے بھاری جرمانہ کیا گیا جب کہ سرکاری جاسوس کی فرض شناسی پر اس کی تعریف کی گئی۔

ماخذ (اُردو۔۸۳)

فحشیات اور جنسیات

رئیس امروہوی

سب سے پہلے اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ فحشیات اور جنسیات میں وہی فرق ہے جو غزل اور ہزل میں۔ مولانا عبدالمجید سالک مرحوم نے فحش لٹریچر پر گفتگو کرتے ہوئے ایک مضمون میں لکھا تھا کہ: پاکستان میں ہمیں جو بڑے بڑے کام درپیش ہیں ان میں ایک یہ بھی ہے کہ ہم اپنی مطبوعات پر کڑی نظر رکھیں اور انھیں فحش اور جنسی عنصر سے پاک کرنے کی کوشش کریں۔ یہ صرف اخلاقِ عامہ کا ہی تقاضا نہیں ہے بلکہ ہمارے ادب کی پاکیزگی اور ہمارے معاشرت کی بلند معیاری بھی اس کی متقاضی ہے۔ جب شرافت، حیاداری اور اخلاق کا کوئی حامی آج کل کے فحش لٹریچر پر اعتراض کرتا ہے تو بعض جدید ادیب یہ الزام لگاتے ہیں کہ آخر پرانے شعرا اور انشا پردازوں نے بھی فحش اور ہزل لکھا ہے۔ اس کے باوجود ادب میں ان کا مقام بلند ہے حالاں کہ پرانے فحش نگاروں کو فحش نگاری سے غرض تھی اور وہ محض اپنے نجی حلقوں میں خوش طبعی کی غرض سے کبھی کبھی ہزلیات لکھ لیا کرتے تھے۔'

لیکن آج کل جو بعض انشا پرداز ڈرامے، افسانے اور نظمیں لکھتے ہیں وہ ان کو 'آرٹ' قرار دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ادب کا وظیفہ 'انعکاسِ حیات' ہے۔ لہٰذا انسانی زندگی میں جو حرکات و افعال موجود ہیں ان کا نقشہ کھینچنا زندگی کو اس کی اصل شکل میں پیش کرنا ہے اور یہ ادب کے فنِ لطیف کا اہم وظیفہ ہے۔ پرانے اپنے فحش پر شرماتے تھے اور اس کو پوشیدہ رکھنے کی کوشش کرتے تھے لیکن نئے انشا پرداز اس کو اپنی خیرہ چشمی سے شائع کرتے ہیں اور اس پر ناز و فخر فرماتے ہیں۔ اس کے علاوہ پرانوں کی عظمت ان کے بعض فحش اشعار سے نہیں بلکہ ان کے عظیم الشان ادبی کارناموں سے ہے۔ شیخ سعدی کی 'گلستان و بوستان' سات سو سال سے دنیا بھر کے لیے حرزِ جاں بنی ہوئی ہے۔ لیکن مضحکات و مطائباتِ سعدی کو کون جانتا ہے! ہمارے فحش نگار ادیبوں کا تو سارا سرمایہ زندگی ہی فحش ہے۔ ان کے نتائجِ افکار کے سرمائے میں کوئی صحت مند اور مفید عنصر موجود ہی نہیں۔ وہ تو صرف یہ جانتے ہیں کہ نہایت پست قسم کی جنسیت کو ابھارنے والے ادب پارے لکھیں، جن کو آج کل کے جنس زدہ نوجوان ذوق و شوق سے پڑھیں اور پبلشروں کی تجوریاں بھری جائیں۔ اس جنسی اور فحش لٹریچر کی کئی قسمیں ہیں: گندے اور قابلِ نفرت اور شہوت انگیز اضافے، جو بعض جدید رسالوں میں چھپ کر شائع ہوتے ہیں اور ادبِ جدید

کہلاتے ہیں۔ جب یہ کہا جاتا ہے کہ یہ بیماری ترقی پسندوں نے پھیلائی ہے تو وہ حاشاوکلا پڑھ کر کہتے ہیں کہ نہیں صاحب، ترقی پسندوں کو فحش تحریر سے کوئی واسطہ نہیں، حالاں کہ ان کا آغاز انہیں سے ہوا ہے جو مذہب و اخلاق کے تمام قدیم تصورات کو ختم کر دینا چاہتے ہیں۔

کیمونسٹ مفکرین کی کتابیں اس نقطۂ نگاہ کی وضاحت کر رہی ہیں اور ہندوستان و پاکستان میں کیمونسٹ لڑکوں اور لڑکیوں نے اپنی مخلوط اور بے پرواہ زندگی سے اس کا عملی ثبوت بھی مہیا کر دیا ہے۔ بارہا بعض ادبی رسائل کے خلاف اشاعت فحش کی بنا پر مقدمات چلائے گئے۔ بعض حالات میں سزا بھی دی گئی۔ لیکن اس بارے میں ہمارا قانون اس قدر ناقص ہے کہ اس کی تعزیر کوئی عبرت آموز اثر پیدا نہیں کرتی، بلکہ اکثر مجرم قانونی موشگافیوں کے زور سے صاف بری ہو جاتے ہیں۔ یہی صورت حال ہے جس میں بعض مخصوص قوانین اور پبلک سیفٹی ایکٹ جیسے ضابطوں کی ضرورت ہے، کیوں کہ عدالتوں میں وکیل حضرات قانون کی کھینچ تان کر کے اکثر اُسے غیر موثر بنا دیتے ہیں۔

دوسری قسم ان رسالوں سے متعلق ہے جو نفسیات، تحلیلِ جنسی یا جنسی طب کے بہانے سے جنسی تفصیلات اس قدر واشگاف طریقے سے بیان کرتے ہیں کہ ان کے مطالعے سے کسی علمی یا تحقیقی رجحان کا سراغ نہیں ملتا بلکہ صاف معلوم ہوتا ہے کہ لکھنے والے کا حقیقی مقصد صرف پڑھنے والے کے جنسی جذبات کو ابھارنا اور ان سے پیسے بٹورنا ہے اس قسم کے رسالے صرف اردو ہی میں نہیں چھپتے بلکہ بعض گھٹیا قسم کے انگریزی قسم کے رسالے بھی پاکستان میں فروخت ہو رہے ہیں اور بے شمار انگریزی کتابیں ہمارے کتب فروشوں کے یہاں دھڑادھڑ بک رہی ہیں جو کسی اعتبار سے بھی نوجوانوں کے پڑھے جانے کے قابل نہیں اور جن کو پڑھ کر معلومات میں اضافہ ہونے کے بجائے جنس کے متعلق غلط اور بے بنیاد خیالات کو تقویت حاصل ہوتی ہے اور نوجوان طبائع میں ایسا ہیجان پیدا ہوتا ہے جو اخلاق و معاشرتی صحت مندی کے علاوہ جسمانی تندرستی کے لیے بھی سخت نقصان دہ ہے۔

میں اس قسم کا قدیم الخیال آدمی نہیں ہوں کہ جنسی معلومات کو بالکل ہی شجرِ ممنوعہ قرار دوں۔ میرے نزدیک جنس کے متعلق صحیح معلومات کی اشاعت بے حد مفید ہے اور لڑکوں، لڑکیوں کو باقاعدگی اور متانت کے ساتھ جنسی حقائق سے روشناس کرا دینا چاہیے۔ اگر تشریح الاعضا اور افعال الاعضا کی تعلیم دیتے وقت کوئی معلم کسی چیز کو نہیں چھپاتا تو پھر کیا وجہ ہے کہ انسانی زندگی کے اہم تقاضے (یعنی جنس) کے متعلق لڑکوں اور لڑکیوں کو بے خبر رکھا جائے اور انھیں نامکمل علم اور ناقص معلومات، قابل اعتراض ذرائع سے حاصل کرنے کے لیے آزاد چھوڑ دیا جائے۔ اسلام کے معلمین و فقہا نے مرد و عورت کے تعلقات، ان کی اعضائی خصوصیتوں، ان کی حیات ازدواجی کے مختلف احوال و کوائف اور ان کے متعلق شرعی احکام بیان کرنے میں کبھی شرم سے کام نہیں لیا اور ان کی صریح بیانی کا اثر

ہمیشہ اچھا رہا۔ اصل شے صرف نیت ہے۔ اگر نیت نیک ہے اور مقصد یہ ہے کہ صحیح معلومات ابتدائی عمر ہی میں مہیا کر دی جائیں تاکہ آئندہ چل کر لاعلمی گمراہی کا سبب نہ ہو تو کسی قسم کا اخلاقی فتنہ پیدا ہونے کا اندیشہ نہیں ہو سکتا۔

اب سوال یہ ہے کہ فحش ادبیات اور فحش عملیات کی معترتوں کا سدباب کیوں کر ہو! حکومت کا فرض تو واضح ہے کہ وہ ایسی مطبوعات پر پابندی کے لیے موجودہ قانون کو کافی نہ سمجھے بلکہ کوئی نیا اور ہمہ گیر قانون باقاعدہ اسمبلی میں منظور کرا کے نافذ کرے اور صوبہ جات کے حکام کو خاص ہدایت دی جائے کہ وہ اپنی اپنی حدود میں اس بیماری کا علاج توجہ سے کریں۔ لیکن اس کے ساتھ سب سے بڑی ذمے داری جمہور پر عائد ہوتی ہے۔ اُنھیں ایسی مطبوعات پڑھنے سے انکار کر دینا چاہیے اور جو بدوضع نوجوان ایسے لٹریچر کو ذوق وشوق سے پڑھتے ہیں ان کو دین اور اخلاق کا واسطہ دے کر اس حرکت سے روکا جائے۔ جس طرح فحش کاری کے انسداد کے غرض سے بعض مقامات پر انجمنیں قائم ہو جاتی ہیں جو حصول مقصد کے لیے تبلیغ، ترغیب بلکہ پیکیٹنگ تک سے کام لیتی ہیں، اس طرح فحش لٹریچر کے تدارک کے لیے بھی انجمنیں ہونی چاہئیں جو غور وفکر کے بعد موثر تدابیر اختیار کر کے اس بڑھتے ہوئے اور رستے ہوئے ناسور کا علاج کریں اور اسے معاشرے کے جسم میں پھیلانے سے روک دیں۔ رائے عامہ سب سے بڑی قوت ہے۔ اگر فحش مطبوعات کے خلاف رائے عامہ منظم ہو گئی تو دنیا کی کوئی طاقت ان مطبوعات کو محفوظ نہ رکھ سکے گی۔

ماخذ (اُردو۔ ۶۹)

افسانوی ادب اور فحش نگاری

خالد ارمان

اردو افسانہ نگاری کے تیز رفتار فروغ کے اسباب اگر داستان گوئی، ڈرامے اور ناول کی ہندوستانی روایت میں تلاش کریں تو بحث کا آغاز بیسویں کی بجائے انیسویں صدی کے ادبی منظرنامے سے ہوگا لیکن موضوع کی مناسبت کے باعث ہم بیسویں صدی تک ہی محدود رہیں گے۔ عموماً یہی کہا جاتا ہے کہ ناول کی طرح افسانہ بھی ہمارے ہاں مغرب سے درآمد ہوا اور گزشتہ صدی کے ابتدائی برس اس کا نقطۂ آغاز ہیں۔ ڈاکٹر مرزا حامد بیگ اردو افسانے کی تاریخ کا آغاز ۱۹۰۳ء سے کرتے ہیں جب کہ ڈاکٹر فرمان فتح پوری افسانوی ادب کا اولین دور ۱۹۰۰ء سے ۱۹۳۰ء تک قرار دیتے ہیں۔ اردو افسانے نے سیاسی غلامی، معاشرتی جبر، معاشی پس ماندگی اور ذہنی وجذباتی زلزلوں سے معمور دنیا میں آنکھ کھولی اور اپنے مجموعی خدوخال تشکیل دینے میں زیادہ عرصہ گزارے بغیر اپنی ابتدائی مگر قدرے واضح شکل میں سامنے آیا۔ اگر جنسیت کے کسی طے شدہ مخصوص مفہوم کو مدنظر نہ رکھا جائے تو بلا خوف تردید یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ مرد اور عورت کے باہمی تعلقات اور ان سے متعلقہ متنوع موضوعات کو ابتدا ہی سے افسانے کی مقامی روایت میں قابلِ ذکر مقام حاصل رہا۔

اردو کے پہلے افسانہ نگار تسلیم کیے جانے والے راشد الخیری بھی پیدائش سے لے کر موت تک عورت کے استحصال کا ذکر کرتے ہیں، خواہ اس کی کوئی بھی صورت ہو۔ تھوڑا سا آگے بڑھیں تو عورت کے استحصال کی کئی شکلیں سجاد حیدر یلدرم بھی پیش کرتے ہیں۔ بعدازاں سلطان حیدر جوش نے گو بے پردگی اور مغربی طرز تمدن کے خلاف ضرورت سے زیادہ پُرجوش ہو کر لکھا لیکن ان کے افسانوں میں مغربیت اور بے پردگی کے دلدادگان کی حرکات ناپسندیدہ کے بیانیے وہ ماحول پیدا کرتے ہیں، کہ افسانہ نگاری کی شدید مُبلغانہ روش بھی اس کا توڑ کرنے سے قاصر رہتی ہے۔ اس روایت میں اگلے پڑاؤ کا نام ہے: پریم چند۔ زچگی اور متعلقہ معاملات، طوائف اور نمائشیت پسندی جنس ہی کے مختلف پہلو ہیں اور یہ پہلو پریم چند کے افسانوں میں محض جھانکتے ہی سے نظر آتے ہیں۔ ترقی پسند تحریک کے زیر اثر لکھے جانے والے افسانوں میں جنس کے متعدد پہلوؤں کو اجاگر کیا گیا اور انسانی جنسی رویوں کو معاشرتی اور معاشی پس منظر کے ساتھ تخلیقی عمل کا حصہ بنانے کی شعوری کوشش کی گئی۔ پریم چند کی اہمیت اس حوالے

سے بھی مسلمہ ہے کہ بقول ڈاکٹر انور سدید: ترقی پسند افسانے کی روایت کا رشتہ براہ راست پریم چند کی حقیقت نگاری سے وابستہ ہے۔ پریم چند نے اردو افسانے کو داستانی ماحول سے نکال کر اس کا رشتہ زندگی کے ساتھ قائم کر دیا تھا۔

اردو افسانے کے اگلے موڑ کا نام ہے ’انگارے‘۔ دسمبر ۱۹۳۲ء میں ’دس مختصر کہانیوں کا مجموعہ‘ نظامی پریس وکٹوریہ اسٹریٹ لکھنو سے ایک ہزار کی تعداد میں چھپ کر منظر عام پر آیا۔ ۱۳۴ صفحات پر مشتمل یہ کتاب چار افراد کی مشترکہ تخلیقی کاوش تھی جن میں سجاد ظہیر، احمد علی، رشید جہاں اور محمود الظفر شامل تھے۔ یہ نوجوان ادیب جانتے تھے کہ ’انگارے‘ کی اشاعت پر ادبی میدان میں ہی نہیں، سیاسی وسماجی بالخصوص مذہبی حلقوں میں شدید ردعمل ہوگا مگر جس پیمانے پر انھیں گالیاں پڑیں اور دھمکیاں ملیں، انھیں شاید اس کا اندازہ نہیں تھا۔ بہر طور تعزیراتِ ہند کی دفعہ ۲۹۵ الف کے تحت اسے ضبط کر لیا گیا اور اس ضبطی کا باضابطہ اعلان ۲۵ مارچ ۱۹۹۳ء کے سرکاری گزٹ میں ہوا۔

’انگارے‘ میں پانچ افسانے سید سجاد ظہیر کے تھے، دو دو احمد علی اور رشید جہاں کے اور ایک افسانہ محمود الظفر کا تھا۔ افسانہ نگاروں نے ایک طرف مسلمانوں کے بنیادی معتقدات (خدا، رسول، فرشتے) کو تضحیک کا نشانہ بنایا تھا اور دوسری طرف جنت کی حوروں کے برہنہ اعضا ملاؤں کی جنسی بھوک اور زن ومرد کے باہمی جذباتی افعال کے غیر ضروری اور طویل بیانیے تشکیل دیئے تھے۔ ان شدید قسم کی گستاخیوں اور بے باکیوں کی مثالیں ’نیند نہیں آتی‘ (سجاد ظہیر) ’جنت کی بشارت‘ (سجاد ظہیر) ’دلاری‘ (سجادہ ظہیر) ’پردے کے پیچھے‘ (رشید جہاں) اور ’جواں مردی‘ (محمود الظفر) ہیں۔

شدید قسم کی جذباتیت اور جھنجھلاہٹ کے تحت جس کی بہت سی نفسیاتی، سماجی، معاشرتی اور معاشی وجوہات بیان کی جا سکتی ہیں، احمد علی نے خصوصاً اور ’انگارے‘ کے دیگر افسانہ نگاروں نے عموماً، مذہبی امور پر اپنی تضحیک آمیز رائے کا اظہار کیا۔ اس کی مثالیں مذکورہ کتاب کے دیگر افسانے ہیں لیکن حقیقت میں مذکورہ بالا پانچ افسانے ہی وہ ’انگارے‘ تھے جو رشید جہاں، سجاد ظہیر اور محمود الظفر نے جنس کے حوالے سے بظاہر محتاط مگر بباطن آزاد سماج کی پیشانی پر رکھ دیئے تھے۔ ان انگاروں نے برصغیر کا پورا ادبی منظرنامہ ہلا کر رکھ دیا۔ ان کی جلن اخلاقی اور اصلاحی داستانیں رقم کرنے والے نہ برداشت کر سکتے تھے اور نہ انھوں نے کی۔ وہ بھی میدان میں اترے اور قلم کی بجائے دشنام طرازی اور عملی خوف وہراس اور جارحانہ پن کا خوب مظاہرہ کر کے اپنا کردار ادا کرنے کے بعد چلتے بنے۔ لیکن اس کتاب کی آمد سے وہ موڑ شاید وقت سے پہلے آ گیا جس سے گزر کر اردو افسانہ نگاری کی روایت، ترقی پسندی کی شاہ راہ پر چل نکلی۔ اردو کے افسانوی ادب پر ’انگارے‘ کے ہمہ گیر اثرات کا اندازہ محض اس امر سے بخوبی ہو جاتا ہے کہ منٹو، عصمت چغتائی، عزیز احمد، حسن عسکری، قرۃ العین حیدر، ممتاز شیریں، کرشن چندر، راجندر سنگھ

بیدی، احمد ندیم قاسمی اور اختر حسین رائے پوری جیسے مشاہیر 'انگارے' کے موضوعات اور تکنیک کے حوالے سے متاثر ہوئے۔ 'انگارے' میں پہلی بار انسان کی جنسی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو نئے انداز سے سمجھنے کی کوشش کی گئی اور جنسی امور و مسائل کے حوالے سے اس قدر بے باکانہ انداز اپنایا گیا کہ ایک مدت تک کسی کو اس کی پیروی کی ہمت نہ ہو سکی...... بہت دیر بعد واجدہ تبسم اس ڈگر پر چلی اور ایسی چلی کہ شاید سب سے آگے جا کھڑی ہوئی۔ صلاح الدین درویش کے بقول 'انگارے' کی اشاعت کے ساتھ ہی (اردو افسانے میں) اس صحت مند جنس نگاری کا باقاعدہ آغاز بھی ہو جاتا ہے جس میں جنس کے موضوع کو بطور ایک سماجی مسئلے کے پیش کیا گیا۔

اردو افسانے کی وہ روایت جو ترقی پسند تحریک کے زیر اثر چلی، بہت سے بڑے ناموں کو پیدا کرنے اور عروج تک لے جانے کا باعث بنی۔ اس روایت کے ایک درخشندہ ستارے محمد حسن عسکری بھی ہیں کیوں کہ موصوف اپنے ذہنی و تخلیقی سفر کے آغاز میں ترقی پسند تھے۔ جنسی کج روی، ناآسودگی، بلوغت، ہم جنسی میلان اور جنسی تشنگی کے حوالے سے ان کے کئی افسانوں کو بطور مثال پیش کیا جا سکتا ہے مثلاً 'حرام جادی'، 'چائے کی پیالی' اور 'پھسلن' وغیرہ۔ اصل میں اردو افسانے کی خوش قسمتی ہے کہ اس نے بھرپور آغاز کے ساتھ ہی ترقی پسند تحریک کے زیر اثر داستانوں اور مثنویوں میں پائی جانے والی ماورائیت کے سحر کو توڑ دیا اور باقاعدہ طور پر پہلی بار اس تحریک کی حقیقت نگاری نے افسانے میں جنس کے موضوع کو اس حقیقی زندگی کے ساتھ متعارف کرایا جسے ہندوستان اور مشرق کی نام نہاد اور جاگیردارانہ اقدار و روایات نے داستانوں اور مثنویوں میں محض جنسی تلذذ کی حد تک پابند کر رکھا تھا۔ اس صورت حال نے بہت سے لکھنے والوں کو وہ کاٹ، تیزی اور بے باکی عطا کی کہ اس سے قبل جس کا تصور بھی محال تھا۔ ترقی پسند تحریک رفتہ رفتہ اس مقامِ عروج تک جا پہنچی کہ اُدبا خود اُس کی طرف راغب ہونے لگے۔ اس مرحلے پر تحریک کی توجہ ان ادیبوں کی طرف گئی جن کی تخلیقات ترقی پسند مقاصد کی ترجمانی نہیں کرتی تھیں۔ انھی ایام میں سید سجاد ظہیر کی طرف سے کہا گیا کہ ترقی پسند ادب کے مخالفین ہر نئے ادب کو اور اگر وہ خراب ادب ہے تو اور زیادہ بہ اصرار ترقی پسند ادب کا نام دے کر پوری تحریک کو بدنام کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ چناں چہ اس ضمن میں حسن عسکری، ن م راشد، میرا جی، ممتاز مفتی اور سعادت حسن منٹو کی تخلیقات کو بالخصوص ہدفِ ملامت بنایا گیا۔

سعادت حسن منٹو اردو کا وہ عظیم اور منفرد افسانہ نویس ہے کہ جس کا بدل اردو کی پوری افسانوی تاریخ بھی پیش نہیں کر سکتی۔ منٹو نے جنس کے جتنے پہلوؤں پر لکھا، شاید ہی کسی اور اردو ادیب نے لکھا ہو۔ بلوغت، اس سے متعلقہ تجسس، طوائف، جنسی اذیت پسندی، ہم جنس پرستی اور مرد اور عورت کے باہمی تعلقات کے بہت سے دیگر گوشوں کو نام نہاد شرم وحیا، ہچکچاہٹ کی تاریکیوں سے نکال کر

جگمگاتے ہوئے پُر معنی لفظوں کی صورت بخشنے والا منٹو ہی ہے۔ وہ شاید اردو ادب کی تاریخ کا معتوب ترین افسانہ نگار ہے جس کے کئی افسانوں کو فحش نگاری کے الزامات لگا کر ناپسندیدہ قرار دلوانے کی بھرپور کوششیں ہوئیں۔ بُو، کالی شلوار، دھواں، ٹھنڈا گوشت، پھاہا اور بلاؤز منٹو کے بدنام ترین افسانے ہیں۔ مخالفین کے بقول ان کہانیوں میں منٹو فحش نگاری اور انسان دشمنی کی تمام سرحدوں سے گزر گیا ہے اس نے تہذیب کو ننگا کر دیا ہے اور نوجوان نسل کو گمراہی کی جانب لے جانے پر تلا ہوا ہے۔

سعادت حسن منٹو کے افسانوں میں ہر قسم کی بے باکی پائی جاتی ہے۔ انھوں نے تہذیب و ثقافت کے منافقانہ رویوں پر بھرپور وار کیا اور انسان کی فطری صلاحیتوں اور جبلتوں کو ظاہر کیا۔ مختلف جذبات و احساسات خصوصاً جنس کی حرارت سے انھوں نے اپنی تخلیقات کو زندگی بخشی۔ منٹو نے تہذیب و معاشرت کے کریہہ چہرے کا عکس ایک ردِ عمل کے طور پر پیش کیا۔ ان کا باغیانہ انداز معاشرے کی ناہمواریوں اور آلودگیوں کے باعث پیدا ہوا۔ انھوں نے بدکار عورت یا طوائف میں چھپی ہوئی عورت کا انکشاف بڑے ہی نفسیاتی انداز سے کیا ہے اور حقیقت نگاری کی منفرد مثال قائم کی۔ اردو ادب میں عریانی و فحاشی کے تذکروں اور خاص طور پر افسانے کے ان سے آلودہ ہو جانے کے مسئلے پر منٹو کی ایک اپنی رائے تھی۔

ڈاکٹر سلیم اختر نے لکھا تھا کہ آج کا افسانہ نگار عہدِ غلامی کے افسانہ نگار سے زیادہ خوف زدہ نظر آ رہا ہے۔ وہ اسلامی جماعتوں سے لے کر ناقدین بلکہ تبصرہ نگاروں تک سے سہما رہتا ہے۔ چناں چہ آج کے افسانہ نگار کو مہمیز کرنے کے لیے ایک منٹو کی ضرورت ہے۔ پروفیسر ڈاکٹر نعیم تقوی کا کہنا ہے کہ منٹو کی ایک جھلک کافی حد تک ہم عصمت چغتائی کے افسانوں میں دیکھتے ہیں۔

عصمت چغتائی پہلی خاتون ہیں جنھوں نے کھل کر اس طرح کے افسانے لکھے ورنہ اس سے قبل خواتین ادیبوں نے اکثر اصلاحی اور اخلاقی کہانیاں ہی تراشی تھیں، اُن میں عصمت کے ہاں پائی جانے والی بے باکی اور خطرناکی مفقود تھی۔ عصمت نے عورتوں کی جنسی گھٹن اور بے راہ روی کا نقشہ نہایت ہی بے تکلفی سے کھینچا ہے۔ 'چوتھی کا جوڑا'، 'دو ہاتھ'، 'بے کار'، 'ضدی'، 'عشق پر زور نہیں'، 'نفرت'، 'بیمار'، 'کیڈل کورٹ'، 'یار اور خدمت گار' جیسے افسانے لکھ کر عصمت نے معاشرے کی کج روی کی عکاسی کی ہے۔ 'لحاف'، 'کنواری' اور 'ننھی سی جان' جنس کے حوالے سے انتہائی گھناؤنے ماحول کے عکاس ہیں۔ 'لحاف' تو اتنا بدنام ہوا کہ فحش نگاری کی مثال کے طور پر ہر شخص کی زبان پر آ گیا۔ یہ افسانہ عورتوں کے ہم جنسی میلان پر ایک یادگار کہانی ہے۔

فحش نگاری میں واجدہ تبسم عصمت سے بھی دو ہاتھ آگے ہیں۔ دو ہاتھ تو محاورتاً لکھا ہے،

دراصل واجدہ بہت سے ہندوستانی ادیبوں سے زیادہ بہادری اور مہلک جرأت کا مظاہرہ کرتی رہی ہیں۔ اسی باعث بعض لوگ اُنھیں خواتین ادیبوں کی 'منٹو' قرار دیتے ہیں۔ ان کے افسانوں کا حیدرآباد دکن اپنی دیواروں کے پیچھے چھپے ہوئے تمام کالے کرتوتوں کو سامنے لاتا ہے۔ واجدہ پر بھی بے شمار الزامات عائد ہوئے۔ ان کے افسانوں کو شریف عورت کے لیے ممنوع قرار دیا گیا، مگر اُن کے بدنام افسانوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا رہا اور جنتی'، 'نتھ'، 'توبہ توبہ'، 'نولکھا ہار'، 'سستا گوشت'، 'ذرا ہور اوپر' جیسے افسانے سامنے آتے گئے۔ واجدہ کو کبھی زندہ جلا دینے اور کبھی تمام گھر مع مکینوں کے نذرِ آتش کر دیے جانے کی دھمکیاں ملیں۔ کبھی اس کے افسانوں کے باعث عام ہڑتالیں ہوئیں اور کبھی احتجاجی مظاہرے، لیکن وہ لکھتی رہیں۔

علاوہ ازیں، مختلف ادوار میں کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، بلونت سنگھ، غلام عباس، خواجہ احمد عباس، عزیز احمد، احمد ندیم قاسمی، ممتاز شیریں، انتظار حسین، میرزا ادیب، ممتاز مفتی، اشفاق احمد اور رحمان مذنب وغیرہ نے بھی جنسیات کے مختلف پہلوؤں پر بہت سے شان دار اور جان دار افسانے تخلیق کیے۔ ان تمام فن کاروں کے ہاں ہمیں طوائف، بلوغت، ہم جنس پرستی، نامردی، حد سے بڑھی ہوئی جنسی خواہش اور دیگر جنسی رویوں کی عکاس کہانیاں ملتی ہیں۔

عزیز مراد آبادی، خالد سہیل، ضمیر الدین احمد، برچرن چاولہ اور شاہد پرویز جیسے افسانہ نگار بھی اس روایت کا حصہ ہیں۔ انھوں نے جنس کے بہت سے نئے پہلوؤں کو اردو افسانہ نگاری کے جزوِ اعظم کے طور پر اہمیت دے کر اپنی تخلیقات کی فکری فضا تشکیل دی۔ اردو کے افسانوی ادب میں جنسیت تلاش کی جائے تو شاید ہر افسانہ نگار کے ہاں مل جائے گی لیکن اس کے بڑے نمائندے ترقی پسند تحریک کے دورِ عروج میں سامنے آئے۔ جہاں تک آج کے ادبی منظر نامے کا تعلق ہے تو اس حوالے سے ہم دیکھ رہے ہیں کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ جہاں معروف جنسی موضوعات کو اردو افسانے میں لیا جا رہا ہے وہاں نئے' نئے جنسی موضوعات بھی اردو افسانے میں داخل ہو رہے ہیں۔ اردو کے جنسی افسانوں کا مستقبل ماضی سے شاید اچھا ہی ہو۔

ماخذ (اُردو_۵۲)

زبان کے زخم

زاہدہ حنا

یہ ایک المناک مطالعہ ہے کہ اردو کے کلاسیکی ادب میں عورت کو ابتذال اور فحش نگاری کا مرکز بنا کر سرِ بازار رسوا کیا گیا، اس کا عزّ و وقار ختم ہوا، اس کے سماجی اور تہذیبی ارتقا میں رخنے پڑے۔ گھر میں وہ پاؤں کی جوتی اور گھر سے باہر زنِ بازاری بنا کر رکھ دی گئی۔ اس کا سماجی منصب بحال کرنے کی کوششوں میں صدیاں صرف ہو چکی ہیں لیکن سچ یہ ہے کہ وہ اب تک اپنے انسانی منصب پر بحال نہیں ہو سکی ہے، زبان کے زخم سے وہ آج بھی گھائل ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ برصغیر کے سیاسی زوال کا زمانہ، اردو کے آغاز عروج کا فسانہ ہے یہ وہ دور ہے جب شہنشاہی کا سورج غروب ہو رہا تھا اور اقتدار کی شفق قلعوں اور محلوں کی دیواروں پر اپنی آخری چھب دکھا رہی تھی۔ دیو زاد اجداد کی نسلیں بونوں اور بونیلوں میں بدل چکی تھیں۔ بابر، اکبر اور جہاں گیر کا دور خواب و خیال ہو چکا تھا اور اس کے ساتھ ہی تہذیب و ادب اور علم و فن میں طاق اشرافیہ کی عورتوں کے تذکرے طاقِ نسیاں ہو چکے تھے۔ پندرہویں، سولھویں اور سترھویں صدی کی طبقۂ اعلیٰ سے تعلق رکھنے والی یہ وہ عورتیں تھیں جو تہذیبِ نفس، شائستگی اور علم و ادب کے لیے اپنی شیفتگی میں بے مثال تھیں۔ متوسط اور نچلے طبقے کی عورت جو زندگی گزارتی تھی اس سے ہم واقف نہیں اس لیے اس کا ذکر اذکار یہاں ممکن نہیں۔

مغلوں کے دورِ عروج میں بابر کی ماں تغلق نگار خانم، ہمایوں کی ماں ماہم بیگم، اکبر کی ماں حمیدہ بیگم اور اس کی رضاعی ماں ماہم انگہ، جہانگیر کی ماں مریم زمانی، شاہ جہاں کی ماں جودھا بائی، عالمگیر کی ماں ممتاز محل، وہ عورتیں تھیں جو کاروبارِ سلطنت میں صائب مشورے دیتیں اور بعض حالات میں دخل بھی دیتی تھیں۔ اُس عہد کے بادشاہ اور شہنشاہ ننگے سر ان کی پیش قدمی کو آتے، ان کے حکم پر سرِ تسلیم خم کرتے، علمی، ادبی اور مذہبی معاملات میں ان سے مشورے لیتے اور ان میں سے بعض ایسے بھی تھے جو لشکر اور دربار کی نگاہوں کے سامنے اپنی ماؤں یا بڑی بہنوں کو رہوار پر سوار کراتے ہوئے ان کی قدم بوسی کرتے تھے۔ اس عہد کے بادشاہوں کی بیویاں اور بیٹیاں نور جہاں بانو، بیگم گلبدن بانو بیگم، جہاں آرا بیگم، روشن آرا بیگم اور زیب النسا مخفی تھیں۔ یہ وہ چند نام ہیں جو برصغیر کے سماجی اور سیاسی

عروج کے زمانے میں ہمیں مردوں کے دوش بہ دوش شمشیر چلاتے، شعر کہتے، توزک تحریر کرتے، امورِ سلطنت میں اپنے حکمران رشتوں کی یاوری کرتے نظر آتے ہیں۔ یہ وہ عورتیں ہیں جو جنگ میں حصہ لینے یا سیر وتفریح کے لیے ہندوستان کے طول وعرض میں سفر کرتیں، یہ عورتیں افغانستان، ایران اور سرزمینِ عرب کے دور دراز علاقوں میں حج اور زیارات کے لیے جاتی نظر آتی ہیں ہند ایرانی اشرافیہ سے تعلق رکھنے والی یہ عورتیں بادشاہِ وقت اور شہزادوں کے ساتھ علمی بحثیں کرتی، ادبی معاملات میں انہیں زچ کرتی، رقص وسرود اور شراب وشباب کی محفلوں میں متانت کے ساتھ شریک ہوتی دکھائی دیتی ہیں۔ شکار پر ساتھ جاتی ہیں، نور جہاں بانو بیگم کے شکار اور نشانے کی دادا جہاں گیر اپنی توزک میں دیتا ہے اور اس بات پر اش اش کرتا ہے کہ کس طرح ہاتھی پر بیٹھ کر اس نے ایک ہلّے میں چار شیر شکار کیے، دو شیروں کو ایک گولی اور دو کو دو دو گولیوں سے مارا۔ یہ وہ عورتیں ہیں جو اپنی نگرانی میں محلات تعمیر کراتی ہیں، باغ لگواتی ہیں، نہریں نکلواتی ہیں، مسجدیں اور مدرسے، مسافر خانے اور کتب خانے بنواتی ہیں۔ ان میں سے بعض کی لکھی ہوئی کتابیں آج بھی اس عہد کی وقائع نگاری کے اہم ترین حوالے ہیں۔ نور جہاں بانو بیگم کے نام کا سکہ ٹکسال میں ضرب ہوتا ہے اور جہانگیر کے پردے میں وہ سالہا سال ہندوستان پر حکمرانی کرتی ہے۔ یہی وہ زمانہ ہے جس کے بارے میں ہیرلڈ لیمب نے لکھا ہے کہ "یہ عورتیں اپنے مردوں کے ساتھ لڑائیوں پر جاتیں اور فتح اور شکست دونوں میں برابر کی شریک ہوتیں"۔

اس دور کے بادشاہ اور شہنشاہ ہرگز تارک الدنیا نہیں، وہ بھی نازنینوں اور حسینوں کے ہجوم میں ہیں، ان کے محلوں میں سمرقند وبخارا اور چین وماچین کی کنیزوں کے پرے ہیں، جنس اس دور کی اشرافیہ کے لہو میں بھی ایک برقی رو کی طرح دوڑ رہی ہے لیکن اس جنس اور جنسیت کا اظہار اپنے وقار اور اپنے منصب سے نیچے نہیں گرتا۔ وارفتگی اور شیفتگی شہوت کا رنگ اختیار نہیں کرتی۔ اس عہد کے شاہوں، شہزادوں، شہزادیوں، ملکاؤں، راجاؤں، رانیوں اور ان کی کنیزوں کے متعدد فقرے تاریخ میں محفوظ ہیں جن سے تیکھا پن اور طنازی دونوں ہی جھلکتے ہیں لیکن برجستگی کہیں بازاری رنگ اختیار نہیں کرتی۔

یہ سب زرّیں عہد اور بادشاہی کے دورِ عروج کے قصے ہیں۔ زوال آیا تو کنیزوں اور غلاموں سے کیا شکایت کہ بادشاہ امرا اور متشرع شعرا کی زبان اور چٹکلے، بازاری ہوئے۔ وہ جنس اور جنسیت جو تہذیب کے تن بدن میں کسی برقی رو کی طرح دوڑتی تھی، ایک بدرو میں بدل گئی جس میں کیا امیر اور کیا غریب، کیا شیخ اور کیا شہدے، سب ہی ڈوب ڈوب گئے۔ تب ہی یہ ممکن ہوا کہ صاحبانِ اقتدار ان کے اشارۂ ابرو پر چلنے لگے جنھیں ایک دو نسل پہلے تک بہ نظرِ تحقیر دیکھا جاتا تھا۔

اٹھارویں صدی کے نصف آخر میں "مہذب انسان وہ سمجھا جاتا تھا جو رقص وموسیقی سے گہری دلچسپی رکھتا ہو، عشق پیشہ ہو، شاعر، حاضر جواب اور لطیفہ باز ہو، چست فقروں سے محفل کو گرمائے اور جس

کی تلوار کی بجائے زبان پر سان رکھی ہو۔ اسی عہد کے ایک امیر اور مقرب دربار نواب عمدۃ الملک امیر خان انجام کا ایک واقعہ 'طبقات الشعرا' میں یوں بیان ہوا ہے کہ 'نور بائی ڈومنی' امیر خان انجام کی نور نظر تھی اور فقرہ بازی میں طاق تھی۔ ایک دن نور بائی آئی تو نواب کم خواب کا پاجامہ پہنے ہوئے تھے اس نے نواب صاحب کو دیکھ کر بے ساختہ کہا 'نواب صاحب، آج کیا کافر پاجامہ پہنا ہے'۔ انجام نے فوراً جملہ چست کیا کہ 'لیکن اس کے اندر تھوڑی سی مسلمانی بھی ہے'۔

یہ وہی نواب عمدۃ الملک امیر خان انجام ہے جس نے ریختہ کے وزن پر 'ریختی' ایجاد کی۔ وہی ریختی جسے جان صاحب، چرکیں، سعادت یار خان رنگین اور بعض دوسرے شعرا نے اپنی انتہا کو پہنچایا اور جس میں عورت فحش نگاری اور جنس زدگی کے اظہار کا محور تھی۔

عالمگیر نے تخت نشینی کی ایک خونیں جنگ لڑی تھی اور کوئی بھائی جیتا نہیں چھوڑا تھا۔ اس کے انتقال کے وقت خزانہ دکن کی ریاستوں پر سالہا سال کی لشکر کشی کے دوران خالی ہو چکا تھا۔ اکیاون برس کی بادشاہی کے بعد جب عالم گیر کی آنکھیں بند ہوئیں تو سلطنت اور نظم حکمرانی کو خالی خزانے کے ساتھ ساتھ مرہٹہ گردی، نئی یورپی طاقتوں کا ابھار اور تخت نشینی کی جنگ جھیلنی پڑی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ زوال نے آن کی آن میں سماج کے ہر طبقے اور ہر ادارے کو چھاپ لیا۔ ایک عظیم سلطنت اڑا اڑا دھم ہوئی تو بڑے بڑوں کے اوسان خطا ہو گئے۔ سارے کس بل نکل گئے، کہاں عروج در دولت پر بجرائی تھا اور کہاں زوال مرہٹوں اور نادر شاہ کی صورت دلّی کے دروازے پر دستک دے رہا تھا، اشرافیہ کی عورتیں در بہ در تھیں اور عوام گھاس کھانے سے بھی محروم ہو چکے تھے۔ ایسے میں بابر و اکبر کے جانشینوں نے یکے بعد دیگرے شراب و شباب اور بھنگ اور افیون میں ایسی پناہ ڈھونڈی کہ تمام اخلاقی اقدار کا جنازہ نکل گیا۔ اسی زوال کے زمانے میں محمد شاہ رنگیلا کے دربار کا ذکر کرتے ہوئے 'مرقع دہلی' کا مصنف ہمیں اُدّ بیگم کی کہانی یوں سناتا ہے کہ:

'دہلی کی مشہور بیگم ہیں جو پائجامہ نہیں پہنتیں بلکہ اپنی بدن کے نچلے حصے پر پائجامے کی طرح گل بوٹے بنا لیتی ہیں۔ بعینہ ایسے گل بوٹے بناتی ہیں جو رومی کم خواب کے تھان میں ہوتے ہیں۔ اس طرح وہ اُمراء کی محفلوں میں جاتی ہیں اور کمال یہ ہے کہ پائجامہ اور اس نقاشی میں کوئی امتیاز نہیں کر پاتا جب تک اس راز سے پردہ نہ اٹھے کوئی ان کی کاریگری کو نہیں بھانپ سکتا'۔

محمد شاہ رنگیلا کے عہد کی اُدّ بیگم پر حیران نہیں ہونا چاہیے کہ اس سے پہلے محمد شاہ رنگیلا کے والد ماجد عیش و طرب کی نئی داستانیں رقم کر چکے تھے۔ میری مراد اورنگ زیب عالمگیر کے پوتے معزالدین سے ہے جو تخت نشینی کی جنگ میں اپنے بھائیوں کو شکست دے کر اور ان کے سر تڑوا کر لاہور میں تخت نشین ہوا تو اس نے خود جہاں دار شاہ کا لقب اختیار کیا اور تان سین کے خاندان کی لال کنور

کو 'امتیاز محل' کا خطاب ملا۔ اسے شاہی چتر اور شاہی نوبت کے ساتھ کوچ کرنے کی اجازت عطا ہوئی۔ دو کروڑ روپے سالانہ کا وظیفہ مقرر کیا۔ لال کنور کے نام کے سکے جاری ہوئے جواب نایاب ہیں۔ یہ وہی لال کنور ہے جو شہنشاہ ہند جہاں دار شاہ کو ساتھ لیے ساقی خانوں میں پھرتی تھی اور شہنشاہ اپنے ہوش و حواس سے بیگانہ اُن درباریوں کی معیت میں رہتا تھا جن کی زندگی کا مقصد و محور شراب اور شباب اور معیار سے گرے ہوئے سب کام کرتا تھا'۔

سامنے کی بات ہے کہ جب بادشاہ اس رنگ میں رنگا ہو تو پھر اس کے حضور قصیدے گزارنے والے شعرا کس طرح کھل نہ کھیلے ہوں گے۔ جہاں دار شاہ کے قتل کے بعد اس کا بیٹا روشن اختر، محمد شاہ کے لقب سے ۱۷۱۹ء میں تخت پر بیٹھا اور تاریخ میں محمد شاہ رنگیلا کے نام سے مشہور ہوا۔ یہ زوال اور ابتذال اورنگ زیب عالم گیر کے انتقال کے صرف بارہ برس کے اندر اپنی انتہاؤں کو چھونے لگا تھا۔ اٹھارویں صدی کے ہندوستان میں سیاسی افراتفری اور بادشاہت کی بے توقیری کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ اورنگ زیب عالمگیر کی آنکھیں ۱۷۰۷ء میں بند ہوئیں، اس کی موت کے بعد بارہ برس کے عرصے میں دلی کے تخت پر آٹھ بادشاہ جلوہ افروز ہوئے ان میں سے چار 'بادشاہ' ایسے بھی تھے جن کی 'بادشاہی' کا کل دورانیہ ۱۸؍فروری ۱۷۱۹ء سے ۲۷؍اگست ۱۷۱۹ء ہے۔ یعنی چھ مہینے کی مدت میں تختِ طاؤس نے چار بادشاہوں کا عروج و زوال دیکھا۔ ان میں سے سات تخت نشینی کی جنگ میں مارے گئے، ان کے بیٹے، بھائی، بھتیجے تخت کی آرزو رکھنے والوں کے ہاتھوں قتل یا قید ہوئے، آنکھوں میں سلائیاں پھریں۔ ان بارہ برسوں میں تختِ طاؤس اور لال قلعے کا جو دعوے دار سر پر اقتدار کا ہما بٹھائے دلی میں داخل ہوا، اس کے جلوس کے آگے آگے مقتول بادشاہ کا سر نیزے پر علم ہو کر یہ پکارتا چلتا تھا کہ 'دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو'۔

ایک ایسے زوال آمادہ زمانے اور پُر آشوب سماج میں علم و ادب اور فن و ہنر پر جو گزری اسے خورشید الاسلام نے ایک جملے میں یوں بیان کیا ہے کہ 'جوں جوں زمانے کا خمیر بگڑتا جاتا ہے، شاعری پست تر ہوتی جاتی ہے'۔ وہ شعرا جو دربار میں بار پاتے تھے اور جن میں سے بیش تر کا روزگار ہی سلاطین، نوابین اور اُمرا سے وابستہ تھا، انھوں نے اَمرد پرستی، طوائف گردی اور جنس پرستی کے معاملات کو بلا کم و کاست بیان کرنا اپنا ہنر جانا، نتیجے کے طور پر زبان کے خنجر سے براعلیٰ اور شائستہ قدر ذبح ہوئی اور بوالہوسی کو عشق کا نام دیا گیا۔ ایک ایسے زمانے میں کسے فرصت تھی کہ وہ زنان خانے میں سانس لیتی ہوئی عورت پر اس ابتذال کے اثرات جاننے کی کوشش کرتا۔ وہ جنھیں تختِ طاؤس کے چھننے اور سیاسی اقتدار کے چلے جانے کا صدمہ نہ تھا، اُنھیں متوسط طبقے کی عورتوں کی محرومیوں اور ذلتوں کا بھلا کیا غم ہوتا! سو ہوا یوں کہ شعر و ادب کی اقلیم کے بیش تر سربرآوردہ شاعروں نے عورت کے بدن سے قصائیوں

کا سا سلوک کیا۔ اردو ادب کے بعض نقادوں کا خیال ہے کہ ابتذال اور فحش نگاری دبستانِ لکھنو سے تعلق رکھنے والے شعرا کا خاصہ ہے لیکن یہ نقطۂ نظر اس لیے غلط ہے کہ ’اردو میں اس کے بانی مبانی آبرو اور تاجی جیسے دہلوی شاعر تھے اور ان کے دواوین میں ابتذال کی مثالیں جا بجا ملتی ہیں۔‘

اردو کے جو کلاسیکی شعرا اس وقت زیرِ بحث ہیں وہ ’فعالیت سے محروم، بحران و جمود کے مارے ہوئے سماج‘ میں سانس لیتے تھے۔ ایک ایسے سماج میں ان میں سے بیش تر شاعروں سے فلسفیانہ معاملات پر بحث، تاریخ پر گہری نظر اور انسان کا وقت اور کائنات سے رشتہ متعین کرنے کی توقع کیوں کی جائے۔ اس فحش نگاری اور ابتذال کو اختیار کرتے ہوئے بڑے بڑے دین دار اور عبادت گزار، قاضی و مفتی شعرا کی پیشانی پر ندامت کا پسینہ نہیں آتا تھا۔ لال قلعہ جو ہندوستان کے اقتدار کا مرکز تھا وہاں سے بھی ان مریضانہ رویوں کی سرپرستی کی جاتی تھی۔ یہ اسی سرپرستی کا ایک مظہر ہے کہ ’دربارِ شاہی سے شہرت دہلوی کو مسخرۃ الدولہ، قرم ساق خاں بہادر اور پھکڑہ جنگ کے خطابات عطا ہوئے۔‘

عشق ایک ایسا پُر شور اور پُر معنی جذبہ ہے جس نے شعر و ادب، تعمیرات اور فنونِ لطیفہ کے میدان میں انسان سے کیسے کمالات نہیں کروائے! یہ ممکن نہیں کہ عشق کا دامن جنس کے جھالے سے نم نہ ہو لیکن جب ہوس کے تنور سے جنس زدگی، طوفانِ نوح کی طرح ابل پڑے تو عشق کی اعلیٰ اقدار کو غرقاب ہوتے ہی بنتی ہے۔ یہی وہ صورتِ حال ہے کہ میر تقی میر، جو خود بھی کئی مرتبہ ابتذال کے گڑھے میں گرے ہیں، جرأت کی شاعری کو ’چوما چاٹی‘ کا نام دیتے ہیں۔

جیسے جیسے ہندوستانی سماج کے زوال سے اس دور کی اشرافیہ کے افراد زمانے کے ہاتھوں ذلیل ہوئے، بادشاہوں نے طوائفوں کے ازار میں سلطنت گروی رکھ دی۔ وہ توازن درہم برہم ہو گیا جو ایک زندہ سماج رزم اور بزم میں، عیش اور جیش میں قائم رکھتا ہے۔ زوال کے ساتھ ابتذال اور مفلسی کے ساتھ گراوٹ بندھی چلی آتی ہے سو یہاں بھی یہی ہوا اور اس کا افسوس ناک عکس ہمیں جعفر زٹلی کے کلام میں نظر آتا ہے۔ یہ وہی جعفر زٹلی ہے جس کی فحش نگاری سے نہ کسی مرد کو پناہ ملی اور نہ کسی عورت کو۔ جعفر کا بیشتر کلام فارسی میں اور کچھ اردو اور فارسی کا مرکب ہے۔ ’اختلالِ تہذیب‘ کی انتہا دیکھنی ہو تو ’قوتِ باہ نامہ‘ ’دو پھڑکی نامہ‘ ’گ نامہ‘ ’بھ نامہ‘ ’چپٹی نامہ‘ ’قصیدہ عشقیہ در بابِ شہوت‘ وہ کلام منظوم ہے جس میں ہر قدر کے بخیے ادھیڑے گئے ہیں اور ہر رشتے کو پامال کیا گیا ہے۔ جعفر کے فالنامے ابتذال اور فحش گوئی کا کمال ہیں جن میں پیاز، دھنیا، زیرہ، لونگ اور ہینگ، مرچ، ہلدی، کھانڈ کو بھی نہیں بخشا گیا ہے۔ ’در شرحِ نسبت کدخدائی خود‘ کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

چار پانچ دن بیاہ کوں بیتے بی بی نے تک توڑے کیتے
جھگڑا رگڑا لاگی آن پیارا ہونے لاگی مارک مارا

دئی دھادھم، ایدھر، اودھر   اب میں مولا جاؤں کیدھر
دھکم دھکا ۔ تھکم تھکا   دھاس دھوس ۔ گھوسم گھاسا
سن رے بھائی ۔ میرے بیتا   جوئی کہوں یا جنگلی چیتا
انجر پنجر ٹوٹن لاگے   مردے زندے سوتے جاگے

میر جعفرزٹلی نے ان اشعار میں اپنے عقد اور اس کے بعد کی راتوں کا احوال اس تفصیل سے بیان کیا ہے جسے پڑھنے کے بعد پہلا خیال یہی آتا ہے کہ اگر جائز رشتوں کے بکھان کا یہ عالم ہے تو غیر منکوحہ کی تضحیک میں بات کہاں تک نہیں گئی ہوگی۔ جعفرزٹلی نے عورتوں کے وہ نام ایجاد کیے کہ جنھیں پڑھیے اور کانوں کو ہاتھ لگائیے۔ ان میں خصیہ خانم، اچھل بانو، پھللن النسا سامنے کے چند نام ہیں۔ خانہ دار عورتوں کا نقشہ کچھ یوں کھینچا ہے:

خصم کو جورو اٹھ مارے، گریباں باپ کا پھاڑے   زنوں سے مرد بھی ہارے، عجب یہ دور آیا ہے

انشاء اللہ خان انشا ہیں تو وہ یہ کہتے سنائی دیتے ہیں کہ:

رات بھر اپنا ترستا ہی رہا جی، باجی   اب تو نوبت بجی، اٹھو اجی، باجی، باجی
اے لو اس کوٹھری میں میرے ڈرانے کے لیے   اک عبا اوڑھ کے بن بیٹھی ہیں حاجی، باجی

انشا کا ہی ایک اور شعر ملاحظہ ہو:

بڑھی داڑھیوں پہ نہ جا ولا ، یہ سب آہوؤں کے ہیں جلا
یہ شکار کھیلے ہیں برملا، اُنھیں ٹٹیوں کی تو آڑ میں

مصحفی ہیں تو وہ بھی کچھ کم نہیں:

پانی بھرے ہے یا رو یاں قرمزی دوشالا   لنگی کی جھج دکھا کر سقنی نے مار ڈالا
دریائے خوں میں کیوں کر ہم نیم قد نہ ڈوبیں   لنگی کے رنگ سے جب واں تک کر ہولالا

سعادت یار خان رنگین نے عورت کو شہوت کی ماری ثابت کرنے میں کیا زور نہیں مارا!

رات باتوں میں یہاں تُو نے گزاری اتا   صدقے تیرے، کسی ڈھب سے اُسے لا ری اتا
سوچ اس کا نہ ہو گر مجھ کو، تو پھر کس کا ہو   جانتی تو نہیں کیا، پاؤں ہے بھاری اتا
ہونی جو ہوئے، سو ہو، بندی ملے گی شرطی   وصل کی اس بے زباں اب تو میں ہاری اتا

پیر خان کمترین کہتے ہیں:

نو خصم گن کر مکھین نے کیے   تو بھی نہیں رجتی، دوشاخہ بن دیے
دیکھو پکوان والی کی مزاخیں   خصم کے روبرو دیتی ہے شاخیں

شاکر ناجی بھی شہوت پرستی کا ایک رخ دکھاتے ہیں:

اگر ہو وہ بتِ کافر، کبھی اشنان کو ننگا   بھنور میں دیکھ کر جمنا، اسے غوطے میں جا گنگا

ریختی کے ایک معروف شاعر امجد علی خاں عصمت گزرے ہیں۔ ان کی گل افشانیاں ملاحظہ ہوں:

نتیجہ اے بوا اچھا نہیں مردوں کی صحبت کا   کھلے گا نو مہینے بعد گل اِس عیش و عشرت کا

فقیر کہنے کو فقیر ہیں، مسجد کے پھیرے بھی لگاتے ہیں لیکن مذہب کا جس قدر احترام اور عورت کی جتنی تکریم دل میں ہے، اس کا اندازہ اس کے اس شعر سے لگایا جا سکتا ہے کہ:

مجھ کو شہوت ہوئی تیمم سے   تھی یہ بے شک کسی چھنال کی خاک

حافظ جلیل حسن جلیل مانک پوری کا کہنا ہے:

مدت ہوئی وصال کو اب تک یہ خیال ہے   بیٹھا ہے کوئی گود میں ناز و ادا کے ساتھ
غضب تھا چوسنا لب کا شب وصل   زباں سے وہ زبان گھڑیوں لڑی ہے

تصویروں میں ریاض خیرآبادی کی ریشِ دراز دیکھیے اور ان اشعار کو ملاحظہ کیجیے:

قابو کا تُمھارے بھی نہیں جوشِ جوانی   بے چھیڑے ہوئے ٹوٹتے ہیں بندِ قبا آپ
یہ گوارا کہ مرا دستِ تمنا باندھے   اپنے محرم کو نہ کس کر کوئی اتنا باندھے

سید محمد خاں رند ہیں تو وہ یوں کُھل کھیلتے ہیں:

وصل کی شب دے کے دم، عریاں کریں گے اس کو رندؔ
ایک دن وا عقدۂ ناف و کمر ہو جائے گا

'بہارِ عشق' میں مرزا شوق نے دل کی تمام حسرتیں نکالی ہیں، بقول ابواللیث صدیقی 'یہ ان کی مثنویوں میں سب سے بدنام ہے'۔

سینے پہ دونوں چھاتیاں انمول   اونچی، چکنی، کڑی، کراری، گول
آستینوں میں وہ پھنسی کُرتی   جسم میں وہ شباب کی پُھرتی
آڑی ہیکل گلے میں ڈالے ہوئے   پیاری پیاری کچیں نکالے ہوئے

سعادت یار خان کا دیوان ریختی ہو یا دیوان آمیختہ و دیوان انگیختہ 'کسی کوک شاستر کا حصہ معلوم ہوتا ہے'۔ ان میں آپ کو مختلف اُمرا کے لیے کہی ہوئی ہجو ملتی ہے۔ اس کے علاوہ 'قطعات ہیں جن میں ۱۳۹ مختلف طوائفوں اور کسبیوں کے نام اور ان کے کارنامے نظم کیے ہیں'۔ 'دیوان انگیختہ' کے دیباچے میں رنگین لکھتے ہیں: 'میں اکثر عرسِ شیطان، جس سے مراد تماش بینی خانگیوں کی ہے، کیا کرتا تھا اور اس قوم کی ہر ایک تقریر پر دھیان دیتا تھا، کچھ دن اسی طرح گزارے تب ان خانگیوں (طوائفوں) کی بہت سی اصطلاحوں اور محاوروں کا علم ہوا۔ ان کی زبان میں یہ چوتھا دیوان جو انگیختہ کے نام سے مشہور ہے،

ترتیب دیا لیکن اس دیوان میں ان خانگیوں کی ایجاد لغات، محاورے اور اصطلاحات اکثر ایسے نظم ہوئے تھے جن کو دوست سمجھنے سے قاصر تھے، اس لیے میں نے دقیق الفاظ یعنی محاورات وغیرہ کو اس دیباچے میں بہ ترتیب حروف تہجی شرح کر کے لکھ دیا ہے'۔

جس زوال پذیر سماج نے ایک برتر غیر ملکی طاقت سے فوجی شکست کھائی ہو، جس کی معاشرت تہ و بالا ہوگئی ہو، جسے ایک نئی اور ابھرتی ہوئی اقتصادی قوت کا سامنا ہو، جہاں 'گورے نواب' ڈیرہ دار طوائفوں کو ملازم رکھتے ہوں جس کا نقشہ ہمیں دوسو برس پرانے ناول 'نشتر' میں نظر آتا ہے، ان میں سے بعض گورے افسر طوائفوں سے نکاح پڑھواتے ہوں اور ان کے بچے پہلے ایسٹ انڈیا کمپنی اور بعد میں برٹش راج کے سرکاری محکموں میں ملازمت پاتے ہوں، وہ سماج اپنے زنان خانے کے بارے میں کس قدر حساس ہوگا، اس کا اندازہ لگانا مشکل نہیں۔ طرفہ تماشہ یہ کہ شعری اور ادبی ذوق کا محور ہی طوائفیں اور ان سے معاملات وصل و وصال کا بیان تھا۔ اس سماجی اختلال کی مار سماج کے سب سے پسے ہوئے اور کمزور طبقے یعنی مسلمان عورت کو سہنا پڑی۔ اس پر زمانے کی بدلتی ہوئی اقدار کے دروازے یوں بند کیے گئے کہ انھیں کھولنے میں صدی ڈیڑھ صدی کی شعوری کوششیں صرف ہوئیں۔ وہ نئی روشنی اور جدید تعلیم جس کو مسلمان اشراف کے ہر گھر میں پہنچانے کے لیے سرسید احمد خان بے تاب تھے، اس روشنی سے اپنی لڑکیوں اور عورتوں کو آشنا نہ کرنے پر وہ مُصر رہے۔

اردو کی سب سے مشہور اور مقبول مثنوی نواب مرزا شوق کی 'زہرِ عشق' ہے جس میں معاملات وصل و قرب، دوسری تمام مثنویوں کی نسبت نہایت اختصار اور سلیقے سے بیان کیے گئے ہیں۔ اس کی ہیروئن ستارہ کا جو نقشہ کھینچا گیا ہے، اور اس کی جو خوبیاں بیان کی گئی ہیں، وہ کچھ یوں ہیں:

تھی زمانے میں بے عدیل و نظیر   خوش گلو، خوش جمال، خوش تقریر
شعر گوئی سے ذوق رہتا تھا   لکھنے پڑھنے کا شوق رہتا تھا

اس زمانے میں ہندوستان کے مسلم گھرانوں کی جو معاشرت تھی، اس میں کسی لڑکی کا 'خوش تقریر' ہونا یا 'شعر گوئی کا ذوق' اور 'لکھنے پڑھنے کا شوق' رکھنا جس قدر معیوب تھا، اس کا اندازہ اس بات سے کیجیے کہ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی ۱۹۳۸ء سے ۱۹۴۲ء کے درمیان ڈاکٹریٹ کے لیے اپنا مقالہ لکھتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

> 'زہر عشق ایک طرح اپنے زمانے کی معاشرت کا سچا نقشہ پیش کرتی ہے۔ اُس زمانے میں بلکہ اب بھی ہندوستانی مسلمانوں کے ایک وضع دار طبقے میں لڑکیوں کا پڑھنا لکھنا موجب ننگ و عار سمجھا جاتا ہے اور شاعری تو ان کے لیے قطعاً باعث شرم کہی جاتی ہے۔ خیال یہ ہے کہ لکھنے پڑھنے سے جو آزادیِ خیال، لڑکیوں میں پیدا ہو جاتی ہے وہ ان کے لیے اخلاق سوز ثابت ہوتی ہے'۔

اگر بیسویں صدی کی چوتھی دہائی میں ’لڑکیوں کا پڑھنا لکھنا موجب ننگ وعار‘ سمجھا جاتا ہو، تو غور کرنے کی بات ہے کہ اٹھارہویں اور انیسویں صدی میں کیا عالم رہا ہوگا! یہی وجہ ہے کہ اس زمانے میں ہمیں جن چند پڑھی لکھی اور شعر و شاعری کا ذوق رکھنے والی عورتوں کا نام نظر آتا ہے ان میں سے گنی چنی کا تعلق اشراف سے ہے، ورنہ بیش تر بازارِ حسن کی رہنے والیاں ہیں۔ ایک ایسے زمانے میں جب کہ نہ صرف تعلیم بلکہ انگریزی تعلیم برصغیر کے ہندو گھرانوں میں نفوذ کر رہی تھی، تعلیم نسواں کی طرف مسلمانوں کے اس رویے کی بہت بڑی ذمّے داری ہمارے اس کلاسیکی ادب پر عائد ہوتی ہے جس کے ابتذال سے گھبرا کر متوسط طبقے کے مسلمانوں نے علم و ادب کے سیکھنے کو فحاشی میں مبتلا ہونے کا سبب سمجھ لیا تھا چناں چہ شریف اور گھریلو عورت پر تعلیم حرام کر دی گئی۔ جب کہ طوائف جو مجلسی زندگی کی ناگزیر ضرورت تھی اس کا پڑھا لکھا ہونا، علمی و ادبی معاملات میں طاق، شعر فہم، حاضر جواب اور موسیقی کے رموز و نکات سے آگاہ ہونا اس کی قیمت میں اضافہ کرتا تھا۔ اُس سماج کا تضاد ملاحظہ کیجیے کہ وہ اُمرا، شعرا جو طوائف کی علمیت اور سخن سازی پر نثار ہوتے تھے، انھوں نے اپنے زنان خانے پر علم و ادب کے تمام دروازے بند کر رکھے تھے۔ یہ فرض کر لیا گیا تھا کہ زنان خانے کو آباد کرنے اور صحیح النسب اولاد پیدا کرنے کی ذمّے دار عورت اگر پڑھ لکھ لے گی تو عشق و عاشقی سے اور فسق و فجور سے کسی طرح دامن نہیں بچا سکے گی۔ یہی وجہ تھی کہ مہ لقا چندا بائی، مولا جان شوخ، ملکہ جان ملکہ یا منی بائی حجاب ہوں، کسی کو ان کی شاعری اور ان کے صاحبِ علم ہونے پر اعتراض نہ تھا لیکن زنان خانے میں زندگی گزارنے والی عورت پر تعلیم اس طرح حرام تھی کہ وہ پردیس سے آنے والے باپ، بھائی یا شوہر کا خط پڑھوانے کے لیے بھی مردوں کی محتاج تھی اور اسی کو شرافت کا اعلیٰ معیار سمجھا جاتا تھا۔

اس وقت بھی شاہی خاندان کی شہزادیوں کا تعلیمی معیار یقیناً بلند تھا لیکن اشراف کی کم ہی عورتیں علم سے بہرہ ور ہوتی تھیں اور ان کے لیے بھی ہزاروں رکاوٹیں تھیں۔ اسی بارے میں عندلیب شادانی ’تذکرۂ شاعرات اردو‘ کے تعارف میں لکھتے ہیں کہ ’میر صاحب نے شعرا کا تذکرہ لکھا لیکن کسی شاعرہ کا ذکر کرنا یا اس کا کوئی شعر نقل کرنا ایک زبردست اخلاقی گناہ سمجھا، حالانکہ خود ان کی صاحب زادی شعر کہتی تھیں اور اچھا کہتی تھیں‘۔

یہ میر کی بیٹی بیگم کی طرف اشارہ ہے جس کے بہ مشکل چار یا پانچ شعر مختلف تذکروں میں ملتے ہیں۔ وہ سماج جس میں میر کی بیٹی اپنی شاعری پر ناز نہ کر سکتی ہو، عورتوں کے بارے میں اس کے شدید تعصبات اور تنگ دلی کا اندازہ لگانا مشکل نہیں۔ ’تذکرۂ شاعرات اردو‘ میں ’تذکرۂ خواتین‘ کے حوالے سے سونی پت کی ایک شاعرہ احمدی بیگم کا ذکر ملتا ہے جنھوں نے اپنا پورا دیوان مرتب کر لیا تھا لیکن ’شوہر کو شاعری کی طرف میلان نہ تھا‘ اور ’اُس زمانے میں شریف مستورات کی شاعری کچھ استحسان

کی نظر سے نہ دیکھی جاتی تھی اُس لیے احمدی بیگم کا 'دیوان غائب کردیا گیا' اسی غم میں احمدی بیگم نے گھل گھل کر جان دے دی۔ اس ستم کا شکار ہونے والی احمدی بیگم کے صرف دو شعر باقی رہ گئے ہیں۔ مولانا فضلِ حق خیرآبادی ایسے جید عالم اور انقلابی کی بیٹی شاعرہ تھی، حرماں تخلص کرتی تھی، اس حرماں نصیب کا صرف ایک شعر تاریخ میں محفوظ ہے۔

وہ سماج جس میں میر، مصحفی، سودا اور انشا ایسے شعرا نے اپنی شاعری میں ابتذال کی انتہاؤں کو (کسی نے کم کسی نے زیادہ) چھولیا تھا اور جس نے زبان کے خنجر سے عورت کے بخیے اُدھیڑنے میں کوئی شرم محسوس نہیں کی تھی وہ بیگم بنتِ میر کے یہ اشعار ہضم نہ کرسکا کہ:

برسوں خمِ گیسو میں گرفتار تو رکھا   اب کہتے ہو کیا، تم نے مجھے مار تو رکھا
کچھ بے ادبی اور شبِ وصل نہیں کی   ہاں یار کے رخسار پہ رخسار تو رکھا
وہ ذبح کرے یا نہ کرے، غم نہیں اس کا   سر ہم نے تہِ خنجرِ خوں خوار تو رکھا

شعر کہنا تو دور کی بات ہے شریف گھرانوں کی ان پڑھی لکھی عورتوں کے لیے یہ ممکن نہ تھا کہ وہ مردوں یا طوائفوں کے زیرِ مطالعہ رہنے والی ہر ادبی کتاب پڑھ سکیں۔ 'خوش معرکۂ زیبا' میں ناصر خان مثنوی سحرالبیان کے بارے میں یہ عجیب دعویٰ کرتے ہیں کہ 'میر حسن کی مثنوی سے ہزارہا عورات فاحشہ ہوگئیں۔'

کس قدر دلچسپ بات ہے کہ ناصر خان اپنی کتاب میں میر حسن پر تنقید نہیں کرتے جن کے قلم سے ایک ایسی مثنوی نکلی، نہ وہ مردوں کو اس نوعیت کی شاعری پڑھنے سے ٹوکتے ہیں لیکن زنان خانے میں رہنے والی عورتوں کے بارے میں ایک افسوس ناک مفروضہ قائم کرنے سے نہیں چوکتے۔

وہ سماج جس میں ثقہ شعرا کھل کھیل رہے ہوں، جہاں طوائفوں، کسبیوں اور خانگیوں کا دور دورہ ہو، وہاں گھر میں زندگی کرنے والی عورت پر کیا نہیں گزری ہوگی! علی جواد زیدی نے اسی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ 'اس زمانے کی سوسائٹی میں غیر عورتوں سے اختلاط اتنا بڑھ گیا تھا کہ اس کا اثر خانگی زندگی پر بھی پڑ رہا تھا'۔ یہ لکھتے ہوئے انھوں نے مرزا علی بیگ نازنین کے ریختی کے دو شعر نقل کیے ہیں:

صحبت اب مردوں کو ہے اُن شوخ دیدوں سے مُوا   چھوڑنا، گھر والیوں کو، کیا ہی آساں ہوگیا!
کیا جانیے کیا کسبیوں میں شہد گھلا ہے   گھر والیوں سے خوش کوئی شوہر نہیں ہوتا

علی جواد زیدی نے اس عہد کا نقشہ یوں کھینچا ہے:

'اس زمانے میں گھر والیاں بے زبان تھیں اور چوں کہ طوائف پرستی کو عمائد و اُمرا برا نہیں سمجھتے تھے اور سماج سے بھی کوئی زوردار آواز نہیں اٹھ رہی تھی اس لیے یہ وبا بڑھ رہی تھی اور گھریلو عورتوں

کی زندگی اجیرن ہوتی جا رہی تھی، وہ بالکل ہی بے زبان تھیں اور سوسائٹی میں ان کا درد و کرب سمجھنے والے کم تھے۔

اُس دور میں اُمرا یا منصب داروں سے چشمک یا ذاتی انتقام کے لیے ہجو لکھنا ایک روزمرہ تھا اور اس میں ہمیں جعفر زٹلی، ضاحک اور سودا پیش پیش نظر آتے ہیں۔ ان لوگوں نے اپنے حریفوں کو ذلیل و رسوا کرنے کے لیے ان کی مخدرات کو موضوع سخن بنانے میں کسی قسم کی الجھن محسوس نہ کی۔ اس کی بہترین مثال جعفر زٹلی کی ہے جس نے ’ہجوِ رحمت بانو‘ اور ’ہجو دختر مرزا ذوالفقار بیگ کوتوال دہلی‘ لکھی۔ اسی طرح سودا کی ’ہجو اہلیہ ضاحک‘ اور ’ہجو دختر ندرت کشمیری‘ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ مرزا سودا ’ہجو اہلیہ میر ضاحک‘ کا آغاز دھوم دھڑکے سے کرتے ہیں:

ضاحک کی اہلیہ نے جب ڈھول گھر دھرایا
بے وجہ رات ساری ہمسایوں کو جگایا
بیٹھک میں بیٹھ بوڑھے چونڈے کو جب ہلایا
تب شیخ سدو اُن پر اساک کھا کے آیا
بولا کہ کیوں بے ضاحک، بکرا کوئی منگایا؟

یہ مخمس جس میں سودا نے میر ضاحک سے اپنا جھگڑا اُن کی بیوی کو نشانہ بنا کر چکایا ہے، اسے پڑھ جایئے تو یہی اندازہ ہوتا ہے کہ ابتذال اُس حد کو پہنچ چکا تھا جہاں مرد اپنے جھگڑے، زنان خانوں میں بیٹھی ہوئی بے زبان عورتوں سے چکاتے تھے اور اس میں کسی قسم کی جھجک محسوس نہیں کی جاتی تھی۔

ڈاکٹر جمیل جالبی سودا کی ان ہجویات کے بارے میں لکھتے ہیں کہ ’ان میں سودا نے حریف کو ذلیل و خوار کرنے کے لیے نہایت درجہ فحش باتیں لکھی ہیں۔ ان ہجووں کو پڑھ کر محسوس ہوتا ہے کہ سودا نے غصے میں ذہنی توازن کھو دیا ہے‘۔

’آب حیات‘ میں مولانا محمد حسین آزاد، مصحفی، جرأت اور مرزا قتیل کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ’جی چاہتا تھا کہ ان کی باتوں سے گلزار کھلا دوں مگر اکثر پھول ایسے فحش کانٹوں میں الجھے ہوئے ہیں کہ کاغذ کے پُرزے ہوئے جاتے ہیں اس لیے صفحہ پھیلاتے ہوئے ڈر لگتا ہے‘۔ اسی طرح انشاء اللہ خاں انشا کی ہجویات اور فحش گوئی پر مصحفی اعتراض کرتے ہیں تو خود ابتذال کا شکار ہو جاتے ہیں اور یہ کہنے میں عار محسوس نہیں کرتے کہ:

واللہ کہ شاعر نہیں تو ، بھانڈ ہے، بھڑوے

سودا، مولوی ندرت لکھنوی سے انتقام لینے کے لیے اس کی بیٹی کی ہجو لکھنے میں کوئی عار محسوس نہیں کرتے۔ اس مسدس میں دخترِ مولوی ندرت کشمیری کی ہجو لکھتے ہوئے وہ طنزاً اُسے ’علامۂ وقت‘ ’شعر فہیم‘ ’فنِ طبابت‘ میں طاق اور ’فنِ شاعری میں قابل‘ بتاتے ہیں یہ وہ خوبیاں ہیں جن میں اس دور کی نامی گرامی طوائفیں طاق ہوتی تھیں۔ ان شعبوں میں مہارت کے سبب ہی وہ بادشاہ کے دربار اور اُمرا کی

سرکار میں بار پاتی تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہمیں ادبی تاریخ کے صفحوں پر رجو نزاکت، زینت ماہ، امۃ الفاطمہ صاحب جی، فرح بخش فرح جیسے متعدد نام ملتے ہیں جن کے دم سے دربار و سرکار کی رونق تھی اور جو شاعری بھی کرتی تھیں۔ بقول کے 'لوگ ان کسبیوں سے زبان سیکھتے تھے۔' اسی بارے میں انشا اللہ خاں انشا 'دریائے لطافت' میں لکھتے ہیں: 'جو لفظ اس نے استعمال کرلیا، اردو ہوگیا'۔ ان کے اس جملے سے ان زنان بازاری کی علمی اور ادبی صلاحیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

اس تناظر میں سودا کی 'ہجو دختر مولوی ندرت کشمیری' کو پڑھیے تو اندازہ ہوتا ہے کہ وہ دختر مولوی کو طوائفوں جیسی خوبیوں سے مرصع بتاتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہہ لیجیے کہ 'علامۂ وقت' اور 'شعر فہم' کہہ کر دراصل وہ اسے طوائف ثابت کررہے ہیں۔ گویا علم و ہنر اور سخن فہمی جو زنان بازاری کا وصف ٹھہرتی تھی وہی زنان خانے کی عورتوں کے لیے باعث شرم تھی۔ اوپر دی جانے والی جستہ جستہ مثالوں سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ زبان کا ہتھیار صرف طوائفوں، خانگیوں اور کسبیوں کے خلاف ہی استعمال نہیں ہورہا تھا بلکہ اس کی دھار سے گھروں میں بیٹھی ہوئی عورتیں بھی محفوظ نہیں تھیں اور ہجو کی صورت ان مخدرات کو اس 'جرم' میں ابتذال کی مار، ماری جاتی تھی کہ ان کے مردوں سے ہجو لکھنے والوں کی چشمک اور چخ تھی۔

اشراف کی عورتوں کا صاحب علم و فن ہونا اس قدر 'باعث شرم' تھا کہ میر تقی میر اپنی بیٹی کے شاعر ہونے کو چھپاتے ہیں، وہ اپنے زنان خانے کی عورتوں کے لیے یہ معیار قائم کرتے ہیں لیکن جب بلاس رائے کی ہجو لکھنے بیٹھتے ہیں تو چند بند کے بعد اس کی بیوی تک جا پہنچتے ہیں اور ہندی کی چندی کرگزرتے ہیں۔ مخمس کے تین بند ملاحظہ کیجیے:

نے حیا ہے، نہ کچھ مروت ہے   نے کچھ اُس خر میں آدمیت ہے
کیا خدا جانے بھڑوے کی مت ہے   گالی ہے، دھول ہے، نہ عزت ہے
کہیں غیرت کا سر میں کچھ ہے خیال!

......

بھڑوہ گھر میں رکھے ہے اک شتاہ   کہیں چشمک کرے، کہیں وہ نگاہ
آتے جاتے ہر ایک اُس سے راہ   واہ رے، رائے جی کی غیرت واہ
طرفہ دیوث، زنجلب، چنڈال

......

یہ کمر باندھ کر گئے دربار   وہ ہوئی گرم جستجوئے یار
آنے دروازے پہ لگی سو بار   سر پہ رکھ بانکی پگڑی کھڑکی دار
پھر ہوئی چہرہ بند بوڑھی چھنال

سیاسی، سماجی اور تہذیبی زوال کے ساتھ اردو کی کلاسیکی شاعری میں ابتذال بہت تیزی سے آیا اور مشرق و مغرب اور شمال وجنوب اس کی گونج سنی گئی۔ زبان وادب کے اس کریہہ استعمال نے عورتوں پر دو انتہاؤں کے اثرات مرتب کیے۔ ایک اثر تو یہ ہوا کہ عوام وخواص نے اپنی عورتوں کی عزت و عصمت کو محفوظ رکھنے کی خاطر انھیں زنان خانوں کی کوٹھریوں میں بند کر دیا، ان پر تعلیم اور سفر کے تمام دروازے بند کر دیے گئے۔ اس کا سبب یہ خوف تھا کہ نئے سماج کا ابھار اور پرانے سماج میں افتراق و انتشار کی لہریں کہیں انہیں چھو کر نہ گزر جائیں۔ یہ عین وہ زمانہ ہے جب ایسٹ انڈیا کمپنی اور بعد میں برطانوی راج کے زیرِ اثر سماج میں لڑکیوں کی تعلیم کا چرچا ہو رہا تھا، لیکن مسلمان لڑکیوں کی اکثریت اس تعلیمی انقلاب سے یک سر محروم رکھی گئی۔ اس کا دائرہ کار اچھی بیٹی، اچھی بیوی اور اچھی ماں تک ہی محدود رہا۔ یوں عورت کا بدن صحیح النسب نسل کو جنم دینے اور تمام صلاحیتیں اسے پروان چڑھانے کے لیے مخصوص ہو کر رہ گئیں۔ دوسری طرف فحش نگاری اور ابتذال نے عورت کو محض استعمال کی شے بنا کر رکھ دیا۔ اس کو شہوت کی پڑیا اور ڈال ڈال اڑتی ہوئی چڑیا بنا کر پیش کیا گیا۔ اس حوالے سے میر کی مثنویاں ہوں یا خواجہ میر اثر کی، مرزا شوق کے اشہب قلم کا کمال ہو یا میر حسن کی جولانیِ طبع، عورت ہو یا پری ہو، سب ہی عشق کے نام پر ہوس، معاملہ بندی اور چوما چاٹی کے دائرے میں قید ہیں۔

میر حسن 'مثنوی سحرالبیان' میں یہ رنگ ہمیں اس طرح دکھاتے ہیں:

کبھی منہ کے تئیں پھیر لینا اُدھر　کبھی چوری چوری سے کرنا نظر
کبھی دل کو پاؤں سے مسل ڈالنا　نظر سے کبھی دیکھنا بھالنا
دکھانا کبھی اپنی چھب مسکرا　کبھی اپنی انگیا کو لینا چھپا

مرزا شوق کی مثنوی 'بہارِ عشق' میں ہوس کی یہ بہار کچھ اس رنگ میں نظر آتی ہے:

کبھی باتوں میں ہوش کھو دینا　کبھی کھسیانی ہو کے رو دینا
کبھی منہ سے دیا چبا کر پان　کبھی مل کر لڑی زباں سے زبان
زور سے لی ران میں چٹکی　پڑے اس اختلاط پہ پچکی

مثنوی 'فریبِ عشق' میں مرزا شوق دل کی حسرتیں یوں نکالتے ہیں:

دوپہر رات جب گزرتی تھی　ڈولی پہ پھر اترتی تھی
صحبت عشق گرم رہتی تھی　کچھ نہ آپس میں شرم رہتی تھی
رات ہنس بول کر گزارتے تھے　صبح کو اپنے گھر سدھارتے تھے

'بہارِ عشق' کا بھی یہی عالم ہے۔ ہر طرف عیش کوشی اور حسن پرستی ہے۔ کبھی اس بہانے، کبھی اُس بہانے مہ لقا کو گھیر کر خلوت میں لاتے ہیں اور پھر وہی ۔

شرم سے سب بدن چرائے ہوئے　آپ ہی آپ کو چھپائے ہوئے

والا عالم ہے۔ ہاتھا پائی کے مناظر ہیں۔ مقصد صرف آتش بدن کو سرد کرنا ہے۔ یہ وہ عہد ہے جب اودھ کی سلطنت خواب وخیال ہو چکی تھی اور راوی انگریزی راج مقدر میں لکھ چکا تھا۔ ایک ایسے سیاسی زوال اور بے مقصد و بے حال سماج میں غم غلط کرنے اور اپنے نکمے پن کو بھلانے کے لیے عورت کو صرف استعمال کی شے کے طور پر برتا گیا اور ریختی کے ہر شعر، مثنوی کے ہر بند نے اسے انسان کی بجائے 'شے' بنا دیا، اس کی آزادانہ پرواز کے پر قینچ دیے، یہ برصغیر کی عورت کا ناقابل تلافی نقصان تھا۔

یہاں میں خواجہ میر اثر کی مثنوی 'خواب وخیال' کا بہ طور خاص ذکر کروں گی۔ میر اثر، میر درد کے چھوٹے بھائی تھے اور ان ہی کی طرح درویش صفت ہونے کی شہرت رکھتے تھے۔ ان مرد درویش صفت اور پیر فقیر نے عورت کو مرکز نگاہ بنا کر جس نقش نگاری سے کام لیا ہے، اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ انیسویں صدی میں ابتذال کس انتہا کو پہنچ چکا تھا اور عورت کی توقیر کس طرح اپنا مقام کھو چکی تھی۔ میر اثر نے جس معشوق کا بیان کیا ہے وہ مثنوی میں بیان ہونے والے احوال کے مطابق خود میر اثر کی عاشقی کا دم بھرتی تھی، وقت کے وقت ڈرتی تھی اور ہاتھا پائی پر آمادہ ہو جاتی تھی۔ مثنوی کے اشعار میں وہ ہمیں روٹھ کے بات نہ کرتی، چھاتی پر لات مارتی، جھنکتی، بلکتی اور آہ و زاری کرتی، گلو خلاصی کے لیے منتیں کرتی، پاؤں پڑتی، رانوں پر ہاتھ رکھ کر چوٹ بچاتی، ڈھیلے ہاتھوں سے مارتی، ہولے ہولے پکارتی، لڑتی بھڑتی اور کسی کو پکار بیٹھنے کی دھمکی دیتی نظر آتی ہے۔ خدا رسیدہ بزرگ میر اثر نے اس مثنوی میں ناف اور زیر ناف کے بیان پر ۲۸؍ اشعار قلم بند کیے ہیں سوچنے کی بات ہے کہ جب معاملات تن و بدن بیان کرنے میں ایک زاہد و عابد کا یہ حال ہے تو جعفر زٹلی، رنگین، جان صاحب یا میرزا شوق سے کیا شکایت!

اردو کے کلاسیکی شعرا نے عورت کو محض ایک بازاری شے ثابت کرنے کے لیے زبان کو کن کن زاویوں سے استعمال نہیں کیا، عورت کے لباس کے ایک جزو کو کس کس طور برتا گیا، اس سے جنس زدگی اور شہوت پرستی کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ بحر کہتے ہیں:

اپنی انگیا کی کٹوری نہ دکھاؤ مجھ کو   کہیں تھرے کی ہوس میں نہ یہ بے خوار بندھے

امانت اپنی جولانی طبع یوں دکھاتے ہیں:۔

گھاٹ انگیا کا کم و بیش جو پایا اُس نے   جس کے خیاط کو چڑیا کا بنایا اُس نے

رند مقامات آہ و فغاں کو زیادہ ہی رندی و سرمستی سے طے کرتے ہیں:

کھولیے شوق سے بند انگیا کے لپٹ کر ساتھ، نہ شرمایئے آپ

سحر فرماتے ہیں:

بوسہ لیا ہے یار کی انگیا کے پان کا   کھایا ہے پان، آج نئے خاص دان کا

اور تو اور، ناسخ جیسا شاعر یہ کہتے نہیں چوکتا کہ:

مار ڈالا ہے تری انگیا کی چڑیا نے صنم   مرغ دل کو کم نہیں، کنجشک بھی شہباز سے

یہاں صرف پانچ اشعار نقل کیے گئے ہیں جب کہ اس موضوع پر پچاس سے زیادہ اشعار کسی کدوکاوش کے بغیر مل جائیں گے۔ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اس عہد کے افراد کی مریضانہ جنسیت نے عورت کو سان پر رکھ لیا تھا اور اسے توہین اور تذلیل کے اندھے کنویں میں دھکیل دیا گیا تھا اس کے لیے ایک انسان کے طور پر سوچنے، جینے اور رہنے سہنے کی کوئی راہ نہیں چھوڑی گئی تھی۔ عیش پرست سماج میں وہ مرزا ہادی رسوا کی امراؤ جان ادا تھی اور جب ڈپٹی نذیر احمد نے زنان خانے کی کوٹھری سے نکال کر اسے پیش دالان میں لانے کی کوشش کی تو 'مراۃ العروس' کی تمیزدار بہو بن جانا اس کی معراج ٹھہرا۔

عورت کو فحش نگاری کا محور و مقصد بنا کر اس کے منصب سے گرانے کا کام اردو کے صرف کلاسیکی شعرا نے ہی انجام نہیں دیا۔ الحمد للہ کہ اس فرض سے داستان نویس بھی خوب سے خوب سبک دوش ہوئے۔ میر امن کی 'باغ و بہار' ہو یا سرور کی 'فسانۂ عجائب' تقی خیال کی 'بوستانِ خیال' ہو یا 'طلسم ہوشربا' اور 'داستانِ امیر حمزہ' کا بیان کرنے والے احمد حسین قمر، محمد حسین جاہ، شیخ تصدق حسین، اسمٰعیل اثر یا پیارے مرزا ہوں، عورت کی ذات ان میں سے کسی کے کلکِ جادو اثر اور اس کے شر سے محفوظ نہیں رہی۔ 'بوستان خیال' میں عورت کے حوالے سے فحش نگاری جس انتہا کو پہنچی ہوئی ہے، اس تک طلسم ہوشربا کی گرد بھی نہیں پہنچتی۔ اس داستان کے ہر طلسم میں کافر شہزادیاں ہیں جو شہوت کی ماری اور ہوس کے ہاتھوں ہاری ہوئی ہیں۔ یہ وہ عورتیں ہیں جن کے روز و شب کی تفصیل پڑھیے تو خیال آتا ہے کہ انھیں اس کام کے سوا کبھی کوئی اور کام بھی درپیش ہوتا تھا یا نہیں! جی چاہتا ہے کہ ان کی طرف نگاہ بھر کر بھی نہ دیکھیے کہ یہ عورت نہیں، نا عورت ہیں۔ انسان نہیں، شے ہیں۔ سچ پوچھیے تو ان شاعروں اور داستان نویسوں نے زبان کے ہتھیار سے برصغیر کی عورت کا وقار اور اس کی شائستگی کو زخم لگائے وہ آج بھی مندمل نہیں ہوئے ہیں۔

شعر و ادب کی اقلیم سے اٹھ کر روزمرہ کی زندگی میں آئیے تو ننانوے فی صد گالیوں کا تعلق عورت سے ہے۔ ہر گالی عورت کے سینے میں تیغ کی طرح اترتی ہے۔ ماں، بہن، بیٹی کے رشتے ان گالیوں کے ذریعے بے توقیر ہوئے۔ آج بھی بازار میں پھرتا ہوا آٹھ برس کا بچہ اور اسّی برس کا باریش بوڑھا دوسرے کے محترم ترین رشتوں کے ساتھ تعلق قائم کرنے کا اعلان کر کے اپنے غصے کا اظہار کرتا ہے اور دوسرے سے بھی جواب میں وہی مسجع مقفّیٰ سنتا ہے۔ گالیوں کے ذریعے عورت کی تذلیل ہمارے بعض نوابوں کو اتنی محبوب رہی کہ غیر منقسم ہندوستان میں ایک ریاست کے نواب صاحب نے نئی

گالیاں تصنیف کرانے کے لیے محکمہ قائم کیا تھا۔ نواب صاحب کو وہی گالیاں پسند آتی تھیں جن میں عورت کے حوالے سے فحش گفتاری کی انتہا کی گئی ہو۔ اردو کے حروف تہجی کو دیکھیے تو ان میں سب سے زیادہ نزلہ چ، پ، گ، بھ اور ل پر گرا۔ ان حروف سے بہ طور خاص عورتوں سے متعلق وہ گالیاں ایجاد ہوئیں کہ جنہیں سننے والے کی عاقبت خراب ہو جائے۔

بات پھیلتی ہی چلی جائے گی ورنہ شادی بیاہ کے گیت، محاورے، ضرب الامثال، بارہ ماسے، کہہ مکرنیاں اور اظہار کے دوسرے بہت سے انداز ایسے ہیں جن کی تفصیل میں جائیے تو حیرت ہوتی ہے کہ زبان کی چھری عورت کی حرمت و عصمت کے گلے پر کس کس طرح چلی ہے اور وہ چھری صرف خراباتیوں کے ہی نہیں، بڑے بڑے متدین اور متشرع بزرگوں کے ہاتھ میں رہی ہے۔

اس تناظر میں دیکھیے تو سید اسماعیل حسین منیر شکوہ آبادی (۱۸۱۳تا۱۸۸۱ء) اپنے ہم عصر شعرا سے مختلف نظر آتے ہیں۔ انھوں نے 'حجاب زناں' کے نام سے ایک مثنوی لکھی جس میں ایک شریف، سلیقہ شعار اور ہنرمند لڑکی کا بیان ہے جو امور خانہ داری میں ماہر، بہ قدر ضرورت تعلیم یافتہ خیال کی جاتی ہے'۔ اس کی شادی ایک علم سے بے بہرہ اور افیون کے نشے میں سرشار رہنے والے نوجوان سے ہو جاتی ہے جو دھیلا کمانے کا روادار نہیں۔ اس مثنوی میں منیر شکوہ آبادی اپنے زمانے سے کہیں آگے کی بات کرتے ہیں اور 'بہ قدر ضرورت تعلیم یافتہ' شریف زادی کو نواب نصیرالدین حیدر کے محل میں داروغہ توشہ خانہ ہوتے اور عزت کی روٹی کماتے ہوئے دکھاتے ہیں۔

'حجاب زناں' میں منیر نے 'بہ قدر ضرورت تعلیم یافتہ' کی تشریح یوں کی ہے۔

شرع کی حد سے کب وہ بڑھتی ہیں   مسئلوں کی کتابیں پڑھتی ہیں
نہیں قصّے کہانیوں سے کام   نوج، پڑھ کر وہ اُن کو ہوں بدنام

منیر اپنی اس مثنوی میں لڑکیوں اور عورتوں کی تعلیم کی بات کرتے ہوئے یہ کہنا نہیں بھولتے کہ

رہے اک بات اور تم کو یاد   لکھنے پڑھنے سے یہ نہیں ہے مراد
پڑھ کے قصّے کہانیوں کا حال   سیکھیے یار بازیوں کی چال
خوب گھر کھوج کھوچکی ہیں یہاں   اس طرح کی نگوڑی مثنویاں
نظم ہی میں نہیں ہیں، یہ قصّے   نثر میں ہر کہیں ہیں، یہ قصّے
نہیں، یہ نیک بختوں کی باتیں   سیکھیں، بدکاریوں کی یہ گھاتیں
لکھیں چھپ چھپ کے رقعہ یاروں کو   کریں بدنام رشتے داروں کو
فعل مختاری پہ ہو خدا کی مار   کہ تمنکاریاں ہوں خود مختار
ناک چوٹی کا بھی اگر ہو ڈر   لکھنے پڑھنے میں، پھر نہیں ہے ضرر

یہ مثنوی جس میں لڑکیوں اور عورتوں کی تعلیم کی بات کی گئی ہے، اس میں بھی 'قصے کہانیاں' اور 'بکوڑی مثنویاں' پڑھنے پر شدید قدغن ہے اور 'شرع' کی حد سے نہ بڑھنے' اور 'ناک چوٹی کا ڈر رکھتے ہوئے لکھنے پڑھنے کی بات کی گئی ہے۔ عورت کے منصب میں اضافہ تعلیم نسواں کے بغیر نہیں ہو سکتا تھا، یہ بات شاعروں میں حالی (۱۸۳۷ء تا ۱۹۱۴ء) نے سمجھی اور انھوں نے تعلیم نسواں کا مقدمہ زور شور سے لڑا۔ وہ سرسید کے مرید اور معتقد تھے لیکن اس بارے میں ان کے خیالات سرسید احمد خاں سے مختلف تھے۔ ان کی نظم 'چپ کی داد' نے 'قوم کی عورتوں کا ایک دردناک مرقع' پیش کیا۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ 'حامیانِ تعلیم نسواں کو حالی کی اس نظم سے بہت مدد ملی'۔ 'چپ کی داد' کا ایک بند ملاحظہ ہو ۔

گو نیک مرد اکثر تمھارے نام کے عاشق رہے   پر نیک ہوں یا بد، رہے سب متفق اس رائے پر
جب تک جیو تم علم و دانش سے رہو محروم یاں   آئی تھیں جیسی بے خبر، ویسی ہی جاؤ بے خبر
تم اس طرح مجہول اور گم نام دنیا میں رہو   ہو تم کو دنیا کی، نہ دنیا کو تمھاری ہو خبر
جو علم مردوں کے لیے سمجھا گیا آبِ حیات   ٹھہرا تمھارے حق میں وہ زہرِ ہلاہل سر بسر

علم کو مردوں کے لیے 'آب حیات' اور عورتوں کے لیے 'سر بہ سر زہر ہلاہل' سمجھنے والے مسلم سماج نے یہ رائے اس لیے قائم کی کہ اس کی سیاسی، تہذیبی، تمدنی اور تاریخی ہوا اکھڑ چکی تھی۔ زنان خانے سے باہر کی دنیا شہرآشوب در شہر کے مناظر پیش کرتی تھی۔ زبان جو کسی سماج کی تہذیب و تعمیر میں بنیادی کردار ادا کرتی ہے، وہ تخریب اور تضحیک کے ہتھیار کے طور پر دربار اور بازار میں یکساں طور پر استعمال ہو رہی تھی۔ مردانہ محفلوں، بالاخانوں اور بازاروں میں جعفر زٹلی، ضاحک اور سودا کی ہجویات کی بادِ سموم چلتی تھی۔ مثنوی 'سحرالبیان'' مثنوی خواب و خیال'، 'فریب عشق' اور 'بہار عشق' کی دھول اڑتی تھی۔ دواوین اور داستانوں میں اَمرد پرستی، شراب نوشی اور عیش کوشی کے ذکر اذکار کی دھوم تھی۔ ہمارے جید شعرا، اُدبا اور علما ملکہ وکٹوریہ کے تائبین کو نذریں گزارتے تھے، کتے کا نام ٹیپو رکھ کر اس کی شان میں شعر کہتے تھے اور انگریز افسران سے داد پاتے تھے۔ ستم بالائے ستم یہ کہ ہندو جو ہزار برس مفتوح رہے تھے وہ نئے فاتحین سے ربط ضبط بڑھا رہے تھے اور انگریز کی سرکار میں اپنے سابق آقاؤں کی نسبت کچھ زیادہ بار پا رہے تھے۔

ایسے میں یہ سمجھ لیا گیا کہ صرف زنان خانہ ہی مسلمانوں کا وہ آخری قلعہ ہے جس کی دیواروں کو تازہ ہوا کا جھونکا چھو کر نہ گزرے اور جس کے تاریک تہ خانوں میں جدید علوم کی روشنی کا عکس بھی نہ جھلکے تب ہی مسلم سماج سربلند رہے گا۔ یہ طے کر لیا گیا کہ مذہبی اور اخلاقی اقدار کا تحفظ اسی وقت ممکن ہے جب عورتوں کو 'علم کے زہر' سے محفوظ رکھا جا سکے۔ اسی حکمت عملی کے تحت سرسید، وقارالملک، اکبر الہ آبادی، مولانا اشرف علی تھانوی اور دوسرے بہت سے افراد کمربستہ ہو گئے۔

سرسید (۱۸۱۷ء تا ۱۸۹۸ء) نے ۱۸۵۸ء میں جب اپنی مشہور کتاب 'اسباب بغاوت ہند' لکھی تو ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی جسے وہ 'بغاوت' قرار دیتے ہیں، کے اسباب میں سے ایک تعلیم نسواں میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی دلچسپی کو بھی قرار دیا اور لکھا: 'بعض اضلاع میں اس کا نمونہ قائم ہوگیا تھا۔ پرگنہ وزیٹر اور ڈپٹی انسپکٹر یہ سمجھتے تھے کہ اگر ہم سعی کر کر لڑکیوں کے لیے مکتب قائم کردیں گے تو ہماری بڑی نیک نامی گورنمنٹ میں ہوگی۔ اسی سبب سے وہ ہر طرح پر، طریق جائز و ناجائز، لوگوں کو واسطے قائم کرنے، لڑکیوں کے مکتبوں کی فہمائش کرتے تھے اور اس سبب سے زیادہ تر لوگوں کو ناراضی اور اپنے غلط خیالات کا ان کو یقین ہو جاتا ہے۔' سرسید اسی پر نہیں رُکتے بلکہ ایک سبب 'عورتوں کی فعل مختاری' کو بھی قرار دیتے ہیں اور اس بارے میں لکھتے ہیں: 'ضابطہ عورتوں کی فعل مختاری کا جو فوج داری سے عدالتوں میں جاری تھا، کس قدر ہندوستانیوں کی عزت اور آبرو اور رسم و رواج میں نقصان پہنچاتا تھا۔ منکوحہ عورتیں تک فوجداری سے فعل مختار ہوگئیں۔ ولیوں کی ولایت عورتوں پر سے اٹھ گئی اور یہ باتیں صریح مذہب میں نقصان پہنچاتی تھیں۔' یہ وہی 'فعل مختاری' ہے جس کے بارے میں منیر شکوہ آبادی کہتے ہیں:۔

فعل مختاری پہ ہو خدا کی مار

اس بارے میں تفصیلات اوما چکرورتی اور پریتی گل کی مرتب کردہ کتاب 'Shadow Lives' میں پڑھی جاسکتی ہیں۔ عورتوں کی تعلیم کے بارے میں سرسید جس قدر 'حساس' تھے اس کا اندازہ اس بات سے لگائیے کہ 'اسباب بغاوت ہند' لکھنے کے ۲۶ برس بعد بھی ان کی رائے میں کوئی خاص فرق نہیں آتا اور ۱۸۸۴ء میں وہ لکھتے ہیں۔ 'میری یہ خواہش نہیں کہ تم ان مقدس کتابوں کے بدلے جو تمھاری دادیاں اور نانیاں پڑھتی آئی ہیں، اس زمانے کی مروجہ نامبارک کتابوں کا پڑھنا اختیار کرو جو اس زمانے میں پھیلتی جاتی ہیں۔ مردوں کو جو تمھارے لیے روٹی کما کر لانے والے ہیں، زمانے کی ضرورت کے مناسب کچھ ہی علم یا کوئی سی زبان سیکھنے اور کیسی ہی نئی چال چلنے کی ضرورت پیش آئی ہو، مگر ان تبدیلیوں سے جو ضرورت تعلیم سے متعلق تم کو پہلے تھی اس میں کچھ تبدیلی نہ ہوگی...... ممکن ہے کہ (یورپ میں) عورتیں پوسٹ ماسٹر یا پارلیمنٹ کی ممبر ہوسکیں لیکن ہندوستان میں نہ اب وہ زمانہ ہے اور نہ سینکڑوں برس میں آنے والا ہے۔'

لڑکیوں اور عورتوں کی تعلیم کے بارے میں ان کی یہ تحریر اس زمانے کی ہے جب وہ انگلستان کا سفر کرچکے تھے، وہاں کی عورتوں کے تعلیمی اداروں سے بے حد متاثر تھے اور علی گڑھ میں مسلمان لڑکوں کی جدید تعلیم کے لیے بے پناہ استقامت اور محنت سے ایک شان دار ادارہ قائم کرچکے تھے، اس کے

بارے میں ہم سب جانتے ہیں۔ ان تمام باتوں کے باوجود جب تعلیم نسواں کا نام آتا ہے تو وہ عورتوں کے لیے محض مذہبی تعلیم کو ہی کافی سمجھتے ہیں۔ وہ برٹش راج کو ہندوستان کے لیے ایک نعمت خیال کرتے ہیں لیکن ۱۸۱۹ء سے تعلیم نسواں کے لیے برطانوی کوششوں کی طرف نظر بھی نہیں کرتے بلکہ اسے ’۱۸۵۷ء کی بغاوت کے اسباب میں سے ایک سبب‘ ٹھہراتے ہیں۔

سترھویں صدی کے آخر اور پھر اٹھارویں اور انیسویں صدی کے دوران زبان کا جس قدر غلط اور ناجائز استعمال ہوا، اس نے عورتوں کی ترقی کی راہیں روکیں۔ سارے ملک میں ’نئی روشنی‘ پھیل رہی تھی، اس سے کیا اشراف اور کیا اجلاف سب ہی مستفید ہو رہے تھے لیکن مسلمان عورت پر تعلیم حرام سمجھی جا رہی تھی۔ ۱۸۶۸ء میں ’مدراس ٹائمز‘ میں ایک مضمون شائع ہوا جس میں یہ کہا گیا کہ ’اگر عورتوں کو مغربی تعلیم دی گئی تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ ہندوستانی لوگوں کی خاندانی زندگی کا خاتمہ ہو جائے گا‘۔ ۱۸۸۹ء میں لاہور کے ایک جلسے میں تعلیم نسواں کے مسئلے پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے سرسید نے کہا: ’جو جدید انتظام عورتوں کی تعلیم کا اس زمانے میں کیا جاتا ہے، خواہ وہ انتظام گورنمنٹ کا ہو اور خواہ اسی طرز کا انتظام کوئی مسلمان یا کوئی انجمن اسلامی اختیار کرے، اس کو میں پسند نہیں کر سکتا۔ عورتوں کی تعلیم کے لیے مدرسوں کا قائم کرنا اور یورپ کے زنانہ مدرسوں کی تقلید کرنا، ہندوستان کی موجودہ حالت کے لیے کسی طرح مناسب نہیں ہے اور میں اس کا سخت مخالف ہوں۔‘ اسی تقریر میں وہ آگے چل کر کہتے ہیں:

’عورتوں کو جس قسم کے علوم پڑھائے جانے کا خیال پیدا ہوا ہے، اس کو بھی میں پسند نہیں کرتا کیوں کہ نہ وہ (علوم) ہماری حالت کے مناسب ہیں اور نہ سینکڑوں برس تک ہماری عورتوں کو ان کی ضرورت ہے۔ بغیر معنی سمجھائے قرآن مجید پڑھانا جس کو ایک حقارت سے دیکھا جاتا ہے، میری دانست میں کوئی ذریعہ اس سے زیادہ روحانی تربیت، روحانی نیکی اور توجہ ذات باری کے لیے نہیں ہو سکتا۔‘ سرسید کو جانے کبھی اپنے ان شاعروں اور نثر نگاروں کی ’روحانی تربیت‘ اور ’روحانی نیکی‘ کو اختیار کرنے کی ترغیب دینے کا خیال بھی آیا یا نہیں جنھوں نے ان کی زندگی میں زبان و بیان کے ذریعے عورتوں کی بے توقیری میں کوئی دقیقہ نہیں اٹھا رکھا تھا۔ ہمیں یہ بھی نہیں معلوم کہ جن کتابوں اور علوم کو وہ عورتوں کے لیے ’زہر ہلاہل‘ سمجھتے تھے، انھیں انھوں نے علی گڑھ کے نصاب میں کیوں شامل کر رکھا تھا۔ لیکن ہم یہ ضرور جانتے ہیں کہ ۱۸۹۱ء میں بھی تعلیم نسواں کے بارے میں ان کا موقف تبدیل نہیں ہوا تھا۔

اکبرالٰہ آبادی (۱۸۴۶ء تا ۱۹۲۱ء) ایک عمدہ شاعر اور کٹر ماضی پرست تھے۔ انھیں مسلمان مردوں کی جدید تعلیم پر بھی اعتراض تھا لیکن آہستہ آہستہ وہ اس کی افادیت کے قائل ہو گئے تھے۔ مگر تعلیم

نسواں اور پردہ وہ معاملات تھے جن کے بارے میں انھوں نے آخری سانس تک اپنی رائے نہ بدلی اور ہندوستانی عورت کی راہ میں زبان کی کدال سے خندقیں کھودتے رہے۔ ان کے یہ اشعار ضرب المثل کی حیثیت اختیار کر گئے ہیں کہ ۔

بے پردہ کل جو آئیں نظر چند بی بیاں   اکبر زمیں میں غیرت قومی سے گڑ گیا
پوچھا جو اُن سے آپ کا پردہ وہ کیا ہوا   کہنے لگیں کہ عقل پہ مردوں کی پڑ گیا

یاد رہے کہ ان کے یہ شعر اس وقت کی یادگار ہیں جب دس لاکھ میں سے شاید ایک ہندوستانی عورت نے پردہ ترک کیا تھا۔ تعلیم نسواں کے بارے میں کہتے ہیں ۔

ہمارے ملک میں ہوتا ہے کیا تعلیم نسواں سے   بجز اس کے کہ باوا اور بھی گھبرائیں اماں سے

ایک اور شعر میں یہ بیان کرتے ہیں کہ پردہ ترک کرنے والی لڑکی کا گھر سے فرار لازمی ٹھہرا ۔

حسرت بہت ترقی دختر کی تھی انھیں   پردہ جو اٹھ گیا تو وہ آخر نکل گئی

ایک دوسرے شعر میں تعلیم نسواں کے 'نتائج' یوں بیان کرتے ہیں:

تعلیم دختراں سے یہ امید ہے ضرور   ناچے دلہن خوشی سے خود اپنی برات میں

اکبرالہ آبادی کا خیال تھا کہ تعلیم نسواں کا ایک نتیجہ یہ نکلے گا کہ باورچی خانوں میں تالا پڑ جائے گا اور عورتوں کو کھانے پکانے سے کوئی دلچسپی نہیں رہے گی، چناں چہ تعلیم نسواں پر شعر کی چھری یوں چلاتے ہیں ۔

اُن سے بی بی نے فقط اسکول ہی کی بات کی   یہ نہ بتلایا کہاں رکھی ہے روٹی رات کی

سرسید سے شدید اختلافات کے باوجود عورتوں کی تعلیم کے بارے میں ان کے اور سرسید کے درمیان کوئی بنیادی اختلاف نہیں تھا ۔

تعلیم لڑکیوں کی ضروری تو ہے مگر   خاتونِ خانہ ہوں، وہ سبھا کی پری نہ ہوں

یہی بات ایک جگہ اس طور کہتے ہیں:

دو اُسے شوہر و اطفال کی خاطر تعلیم   قوم کے واسطے تعلیم نہ دو عورت کو

اکبر برٹش راج کے ملازم رہے، جج ہوئے، سرکار سے خان بہادر کا خطاب پایا، بیٹے کو ولایت بھیج کر پڑھوایا، وہ ڈپٹی کلکٹر ہوا، ذاتی زندگی میں مغربی اثرات کو قبول کرنے کے باوجود انہوں نے انیسویں صدی کی آخری دہائیوں اور بیسویں صدی کی پہلی دہائی میں بھی اس زندان میں نئی روشنی کا اجالا پسند نہیں کیا جس میں ان کی ہم قوم عورت صدیوں سے رہتی آئی تھی۔ انہوں نے عورت کو ابتذال نہیں تو طنز کے خنجر سے ذبح کیا۔

اپنے زمانے کی نہایت اہم دینی کتاب بہشتی زیور کے دسویں حصے میں عورتوں کی تعلیم کے بارے میں مولانا اشرف علی تھانوی (۱۸۶۳ء تا ۱۹۴۳ء) لکھتے ہیں کہ 'بعض کتابوں کا اثر دلوں میں اچھا نہیں پیدا ہوتا اور جو کتابیں دین ہی کی نہیں ہیں وہ ہر طرح سے نقصان ہی پہنچاتی ہیں لیکن لڑکیاں اور عورتیں اس بات کو بالکل نہیں دیکھتیں جس کتاب کو دل چاہا خرید کر پڑھنے لگیں پھر ان سے بجائے نفع کے نقصان ہوتا ہے، عادتیں بگڑ جاتی ہیں، خیال گندے ہو جاتے ہیں، بے تمیزی، بے شرمی، شیطانی قصے سے پیدا ہوتے ہیں، ناحق کو علم بدنام ہوتا ہے کہ صاحب عورتوں کا پڑھانا اچھا نہیں۔ اصل یہ ہے کہ دین کا علم تو ہر طرح اچھی ہی چیز ہے مگر جو دین ہی کا علم نہ ہو یا طریقے سے حاصل نہ کیا جائے اس پر عمل نہ ہو تو اس میں علم دین پر کیا الزام ہو سکتا ہے۔ اس بے احتیاطی سے بچنے کی ترکیب یہ ہے کہ جو کتاب مول لینا یا دیکھنا ہو اول کسی عالم کو دکھلا لو، اگر وہ فائدے کی بتلائیں تو دیکھو، اگر نقصان کی بتلائیں، مت دیکھو بلکہ گھر میں بھی مت رکھو'۔ آگے چل کر ایک ضمنی سرخی قائم کرتے ہیں: 'بعضی کتابوں کے نام جن کے دیکھنے سے نقصان ہے'، اس کے ذیل میں لکھتے ہیں:

'دیوان اور غزلوں کی کتابیں: اندر سبھا، قصہ بدر منیر، شاہ یمن، داستان امیر حمزہ، گل بکاؤلی، الف لیلہ، نقش سلیمانی، فالنامہ، قصہ ماہ رمضان، معجزہ آل نبی، چہل رسالہ جس میں بعضی کتابیں محض جھوٹی ہیں۔ وفات نامہ، جس میں بعضی روایتیں بالکل بے اصل ہیں۔ 'آرائش محفل'، 'جنگ نامہ حضرت علیؓ، جنگ نامہؓ محمد حنیف'، 'تفسیر سورۂ یوسف'، اس میں ایک تو بعضی روایتیں کچی ہیں دوسرے عشق و معشوقی کی باتیں عورتوں کو سننا پڑھنا بہت نقصان کی بات ہے...... 'مراۃ العروس'، 'بنات النعش'، محصنات، ایامی، یہ چاروں کتابیں ایسی ہیں کہ ان میں بعض جگہ تمیز اور سلیقے کی باتیں ہیں اور بعضی جگہ ایسی باتیں ہیں کہ اس سے دین کمزور ہوتا ہے۔ ناول کی کتابیں طرح طرح کی ان سب کا ایسا برا اثر ہوتا ہے کہ زہر سے بدتر، اخبار شہر شہر کے ان میں بھی بہت وقت بے فائدہ خراب ہو جاتا ہے اور بعضے مضمون بھی نقصان کے ہوتے ہیں'۔ اس طویل اقتباس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ مولانا اشرف علی کن کتابوں کو عورتوں کے لیے نقصان دہ سمجھتے تھے اور عورتوں کے اخبار پڑھنے کے حق میں بھی نہ تھے۔ یہاں میں نے ان مذہبی کتابوں کی طویل فہرست نکال دی ہے جنھیں پڑھنے سے انہوں نے منع کیا ہے۔ ویسے یہ ایک دلچسپ بات ہے کہ بہت سے لوگ 'بہشتی زیور' کے متعدد ابواب کو 'مخرب اخلاق' سمجھتے ہیں۔

ایک سرسید، محسن الملک اور ان کے دوسرے ہم خیالوں کا ہندوستان تھا جو ۱۸۹۱ء تک لڑکیوں کو صرف دینی اور اخلاقی تعلیم دینے کو ہی وقت کی ضرورت سمجھتا تھا۔ جس کے خیال میں ریاضی، جغرافیہ، سائنس یا دوسرے سماجی علوم کی مسلمان لڑکیوں کو ضرورت نہ تھی۔ یہ ہندوستان کی مسلم اشرافیہ کے وہ نامور لوگ تھے جو تعلیم نسواں کی حمایت کرنے اور جسٹس امیر علی، وقار الملک، سید کرامت علی، مولوی ممتاز علی اور ایسے ہی دوسرے بہت سے ماہرین تعلیم اور دانشوروں پر نکتہ چینی میں پیش پیش تھے۔ ایک دوسرا

ہندوستان رادھا کانتا دیب اور پنڈتا راما بائی کا تھا۔ اور ان سے بھی بہت پہلے جنوبی ہندوستان کے شہر تیرونلویلی میں لڑکیوں کا اسکول قائم ہو چکا تھا۔ ۱۸۴۰ء میں اسکاٹش چرچ سوسائٹی کا اسکول کھل چکی تھی جس میں ۲۰۰ ہندو لڑکیاں ہندو دھرم کے ساتھ ساتھ جدید تعلیم حاصل کر رہی تھیں۔ اس دوسرے ہندوستان میں پنڈتا راما بائی ۱۶ر برس کی عمر میں تعلیم نسواں کی حمایت میں کتاب لکھ رہی تھی، شہر شہر گھوم کر ہندوستانی لڑکیوں کو جدید تعلیم کی طرف راغب کر رہی تھی۔ کم عمری میں بیوہ ہو کر اپنی بچی کے ساتھ اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے ۱۸۸۳ء میں انگلستان کا رُخ کر رہی تھی اور ۱۸۸۶ء میں امریکا جا پہنچی تھی تاکہ رشتہ کی ایک بہن آنندی بائی جوشی کی گریجویشن تقریب میں شرکت کر سکے۔ ۱۸۸۳ء میں ہی کلکتہ کے بیتھون کالج سے کدم بنی باسو اور چندر مکھی باسو، اولین ہندوستانی گریجویٹ لڑکیاں ہونے کا اعزاز حاصل کر رہی تھیں۔

وہ ہندوستان جہاں جنگ آزادی کے بے مثل رہنما مولانا فضل حق خیرآبادی کی شاعر بیٹی حرماں کا تاریخ میں صرف ایک شعر محفوظ رہ سکے، جہاں ولایت پلٹ مشہور زمانہ قانون داں سر علی امام اور حسن امام کی سگی پھوپھی، نواب امداد امام اثر کی بہن اور ہندوستان کی پہلی ناول نگار خاتون رشید النساء کا ناول 'اصلاح النسا' ۱۸۸۱ء سے ۱۹۸۴ء تک اس لیے شائع نہ ہو کہ اشراف کی مستورات کا کام اور نام 'پردۂ اخفا میں رہنا ضرور تھا'۔ اسی ہندوستان میں ۱۸۵۰ء سے ۱۹۱۴ء کے درمیان بنگالی خواتین کے ۴۰۰ سے زیادہ ناول، نظموں کے مجموعے، خودنوشت اور دوسری اصناف ادب پر مشتمل کتابیں شائع ہو چکی تھیں اور وہ ۲۱ سے زیادہ ادبی رسالے نکال رہی تھیں۔ ان بنگالی خواتین میں ہمیں ٹیگور خاندان کی خواتین پیش پیش نظر آتی ہیں۔ اس نوعیت کی جدید تعلیم مسلمانوں میں سہروردی اور طیب جی گھرانوں کی لڑکیوں نے دوسری مسلمان عورتوں سے پہلے حاصل کی۔

اٹھارویں اور انیسویں صدی کی ہندو عورت بھی دھرم اور رسم و رواج کی شدید جکڑ بندیوں میں تھی۔ اس کے یہاں بھی پردے کی سختیاں تھیں۔ ستی کا خوف اس کے ذہن پر کابوس کی طرح سوار رہتا تھا۔ وہ جو ستی ہونے سے بچ جاتی تھیں انھیں بیوہ کے طور پر عمر بھر اچھوتوں کی زندگی گزارنی ہوتی تھی۔ برہمن اور کھشتری عورتوں میں سے کچھ کو مذہبی کتابیں پڑھائی جاتی تھیں۔ شودر یعنی اچھوت عورتوں کو اس کی بھی اجازت نہیں تھی۔ یوں سمجھ لیجیے کہ خواندگی اور تعلیم کے میدان میں ہندو اور مسلمان عورتیں ایک دوسرے سے کچھ زیادہ مختلف نہیں تھیں۔ یہ سوچنے کی بات ہے کہ جب لارڈ ڈلہوزی اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے دوسرے افسران نے عورتوں میں تعلیم پھیلانے کا بیڑا اٹھایا تو ہندو سماج نے اس جدید تعلیم کی مخالفت اس شدومد سے کیوں نہیں کی جس کا سامنا ان کی مسلمان بہنوں کو کرنا پڑا۔

اس مسئلے پر غور کیجیے تو یہ محسوس ہوتا ہے کہ ان کے شاعروں اور نثر نگاروں نے عورت کے بدن کو زبان کے ہتھیار سے اس طرح ذبح نہیں کیا تھا جو ہمارے یہاں روزمرہ تھا۔ ان کے یہاں 'کام

شاستر' 'انگ رنگ' اور کھجرا ہو یا بھونیشور کی سنگ تراشی ماضی کا حصہ بن چکی تھی۔ بنگالی، مدراسی، مرہٹی اور ہندی ادیبوں کا رجحان جدید تعلیم کی طرف بہت جلد ہو گیا تھا اور انہوں نے جدید علوم وفنون کی طرف سنجیدگی سے توجہ دینی شروع کر دی تھی۔ وہ اس خوف میں مبتلا نہیں تھے کہ اگر ان کی لڑکیاں یا عورتیں جدید تعلیم سے آشنا ہو گئیں تو ان کی 'دینی اور اخلاقی اقدار' کا قلعہ زمیں بوس ہو جائے گا۔ وہ ایک ہزار برس کی شاہانہ محکومی جھیل چکے تھے، وہ برطانوی طرز جمہوریت کو کتابوں میں پڑھ رہے تھے، انگریزی اخباروں میں برطانوی دارالعلوم کی جو بحثیں ان کی نظر سے گزر رہی تھیں، وہ انھیں مستقبل کے نئے خواب دکھا رہی تھیں۔ آزادی خواہ وہ 'ہوم رول' کی صورت میں ملے، اسے حاصل کرنے کے لیے ووٹ سب سے بڑا ہتھیار ثابت ہونے والا تھا اور یہ تو سامنے کی بات تھی کہ ہندوستان میں وہ اکثریت میں تھے۔

ایسی ہی اور بھی کئی وجوہ تھیں جن کی بنا پر ہندوستان کی ہندو عورتیں اپنی مسلمان بہنوں سے بہت پہلے آزاد ہوئیں اور تعلیم کے علاوہ اپنی زندگی کو نئے خطوط پر استوار کرنے کے معاملے میں ان سے بہت آگے نکل گئیں۔ انھوں نے تعلیم حاصل کی اور زبان کے ہتھیار کو اپنی آزادی کے حصول میں بہت مہارت سے استعمال کیا۔ برصغیر کی مسلمان عورت جس کی بھاری اکثریت انیسویں صدی کے آخر آخر تک ناخواندہ، کم فہم، کوکھ مزدور اور جنسی غلام رکھی گئی تھی، زبان کو ایک ہتھیار کے طور پر استعمال کرنے سے ناآشنا تھی۔

یہاں پہنچ کر منشی سید احمد دہلوی مولف فرہنگِ آصفیہ کے سامنے ہمارے سر جھک جاتے ہیں جنھوں نے متوسط طبقے کی عام عورت کو یہ سکھایا کہ زبان کو اوزار کے طور پر کس طرح استعمال کیا جاتا ہے۔ اس مقصد کے لیے انھوں نے 'ہادی النساء' لکھی جس کا پہلا ایڈیشن ۱۸۷۵ء اور چھٹا ایڈیشن ۱۹۱۰ء میں شائع ہوا۔ 'ہادی النسا' ان خواندہ لڑکیوں اور عورتوں کے لیے تھی جو اردو پڑھنا جانتی تھیں لیکن بامحاورہ زبان لکھنا جس کے لیے محنت طلب کام تھا۔ منشی سید احمد نے اس کتاب میں عورتوں کو ان کے محاورے اور ان کی زبان میں خط لکھنے کی تعلیم دی۔ 'تہذیب نسواں' کے مالک سید ممتاز علی کے مطابق: 'یہ کتاب ظاہر میں صرف انشا یا خطوط نویسی کی کتاب ہے لیکن درحقیقت وہ بڑی قدر و قیمت کی چیز ہے۔ اس کتاب سے عورتوں کے خانہ داری کے کُل معاملات، ان کے دلی مطالب وخیالات، روزمرہ کے برتاؤ اور باہمی معاملات، ملنے جلنے اور رسم و رواج، بچوں کے کھلانے کے ڈھنگ، کہاوتیں، پہیلیاں، غرض ہندوستانی زنانہ زندگی کا ہر پہلو بہ خوبی ظاہر ہوتا ہے'۔

مولوی سید احمد نے اس عہد کی عورتوں کو زبان کے اوزار کے ذریعے یہ سکھایا کہ وہ کس طرح بڑی بوڑھیوں، ہم جولیوں، باپ، بھائی اور شوہر کو کسی دوسرے کی مدد کے بغیر خط لکھ سکتی ہیں۔ مولوی سید احمد نے اُس عہد کی روایات سے رُوگردانی کرتے ہوئے عورتوں کو یہ بھی بتایا کہ محلے کے کسی مولوی یا منشی کو پیسے

دو پیسے دے کر حکام اعلیٰ کے نام عرضی لکھوانے کی بجائے وہ خود بھی عرض داشت لکھ سکتی ہیں۔ اپنی فریاد یا اپنی ضرورت براہ راست متعلقہ افسر کے نام تحریر کر سکتی ہیں۔ انھوں نے کاروباری خطوط لکھنے کی تربیت بھی دی اور یہ سکھایا کہ کسی دلال کے ذریعے زمین بیچنی ہو تو اسے کس طرح خط لکھا جائے اور اگر کسی پنساری، حکیم یا جوہری سے کام ہو تو اس سے کس طور معاملت کی جائے۔ ۱۸۷۷ء میں انہوں نے 'تحریر النسا' لکھی جس میں سارے خطوط مردوں کے نام ہیں۔ وہ سماج جس کے عام گھرانوں میں عورت کے خط لکھنے کا مطلب 'رقعہ بازی' اور 'عشق بازی' تھی، اس میں مولوی سید احمد دہلوی کی یہ دونوں کتابیں کتنا بڑا 'واقعہ' تھیں، اس کا اندازہ سوا صدی بعد ہم نہیں لگا سکتے، یہ کتابیں جس طرح مقبول ہوئیں اس کا اندازہ ان کی بار بار کی اشاعت سے لگایا جا سکتا ہے۔ سید احمد دہلوی نے یکم اگست ۱۸۸۴ء کو دلی سے عورتوں کے لیے ایک دس روزہ اخبار 'اخبار النسا' جاری کیا۔ لاہور سے مولوی ممتاز علی نے ۱۸۹۸ء میں ہفت روزہ 'تہذیب نسواں' جاری کیا۔ دلی سے ہی ۱۹۰۸ء میں علامہ راشد الخیری نے ماہنامہ 'عصمت' جاری کیا جو ہندوستان کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک ہر تعلیم یافتہ اور شریف گھرانے کی ضرورت بن گیا اور جس نے بلا مبالغہ سینکڑوں نہیں ہزاروں لکھنے والیوں کی فوج ظفر موج پیدا کی۔ زبان جو مولوی سید احمد دہلوی کے زمانے تک عورتوں کے لیے ایک اوزار کی حیثیت رکھتی تھی؛ 'عصمت' تک آتے آتے ان کے ہاتھوں میں وہ ہتھیار بن گئی جس سے وہ ایک مخصوص دائرے میں ہی سہی لیکن اپنے حقوق کی جنگ لڑتی رہیں۔

آج ہم مشنری پادریوں اور ننوں، برٹش راج کی تعلیم نسواں میں دلچسپی، روشن خیال اور ترقی پسند خیالات رکھنے والے جسٹس سید امیر علی، نواب محسن الملک، مولوی سید کرامت حسین، منشی سید احمد دہلوی، مولوی ممتاز علی، مولانا الطاف حسین حالی، مولانا شبلی نعمانی، علامہ راشد الخیری اور نیاز فتح پوری، سجاد حیدر یلدرم، منشی پریم چند، سدرشن، مرزا عظیم بیگ چغتائی اور اُن جیسے دوسرے مرد ماہرینِ تعلیم، ادیبوں، شاعروں اور دانشوروں کے ممنونِ احسان ہیں جنہوں نے مسلمان عورت کو ذلت کے اندھے کنوئیں سے باہر نکالنے کی جدوجہد کی۔ یہ وہ تھے جنھوں نے اپنی عورتوں کے نیم جاں وجود پر اپنی تحریروں کا مرہم رکھا۔ اسے زبان کو پہلے اوزار اور پھر ہتھیار کے طور پر استعمال کرنا سکھایا۔

ذلت اور زیردستی کی اندھی سرنگ سے رینگ کر باہر نکلنے کی کوششوں کا نتیجہ ہے کہ عورت فحش نگاری کے آنکڑے میں لٹکی ہوئی بکری نہیں رہی کہ جس کی ناف اور زیرِ ناف کے قصے مثنویوں کی زیب و زینت بنیں اور جس کے بدن کی قوسوں اور زاویوں پر ریختی کے ماہر فن شعرا مشق سخن کریں۔ وہ زبان جو عورت کو 'کم تر' شے ثابت کرنے کے لیے استعمال ہوئی، اب ایک ہتھیار کے طور پر عورت کے ہاتھ آ چکی ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ عورت اب زبان کو محض غصے اور ردِ عمل کے اظہار کا ذریعہ بناتی ہے یا وہ اسے اپنے انسانی حقوق کے حصول کی جدوجہد میں ایک موثر ہتھیار کے طور پر استعمال کرتی ہے!

ماخذ (اُردو۔ ۸۸)

جنس اَور ادب وفن

علی عباس جلال پوری

تخلیقِ فن کے عمل سے بحث کرتے ہوئے فرائڈ نے اپنے ایک لیکچر میں کہا ہے کہ فن وادب اُس خیال آرائی سے جنم لیتا ہے جس میں فن کار اپنی محرومیوں کا مداوا تلاش کرتے ہیں۔ یوں تو 'جاگتے خواب' اور خیال آرائی کی صورت میں بھی لوگ اپنی تشنہ آرزوؤں کی تلافی کر لیتے ہیں لیکن فن کار اور عام آدمی میں یہ فرق ہے کہ عام آدمی خیال آرائی ہی پر اکتفا کرتا ہے جب کہ فن کار اپنی تخلیقی صلاحیت کے طفیل خیال آرائی میں کھو کر نہیں رہ جاتا بلکہ مسرت بخش آرٹ کی صورت میں ہمارے لیے اپنی خیال آرائیوں کو محفوظ بھی کر لیتا ہے۔ اپنے آرٹ کے باعث اُسے وہ شہرت، عزت اور حسین عورتوں کا پیار میسّر آ جاتا ہے جس کے لیے وہ روزمرّہ کی زندگی میں ترستا رہتا ہے۔ فرائڈ نے آرٹ کو ایک قسم کا نشہ قرار دیا ہے جو لوگوں کو زندگی کے تلخ حقائق سے فرار کا سامان فراہم کرتا ہے۔ آلڈس ہکسلے فرائڈ کے اِس نظریے کی وضاحت کرتے ہوئے 'اولائیوٹری' میں لکھتا ہے:

'اکثر وبیش تر قارئین کتابوں سے کردار مستعار لے کر اپنے آپ کو اُن پر منطبق کر لیتے ہیں لیکن وہ اِس عمل کو اُلٹ بھی دیتے ہیں اور اپنے آپ کو حقیقی زندگی سے بے تعلق کر کے ادبیات میں پناہ لیتے ہیں اور عالمِ خیال میں اپنی کوتاہیوں کی تلافی کر لیتے ہیں۔ مقبولِ عام قصوں، تمثیلوں اور فلموں کا ایک کام یہ بھی ہے کہ لوگ اپنی نا آسودہ اور تشنہ آرزوؤں کی تسکین ان نفسیاتی محرکات میں تلاش کرتے ہیں۔ اِس قسم کی ادبیات کے عادی نشہ کرنے والے عالمِ کیف میں زندگی کے پست ترین حقائق اور تلخیوں کو بھی قبول کر لیتے ہیں۔ اِس کا سبب یہ ہے کہ حقیقی زندگی اِن چیزوں سے یک سر عاری ہوتی ہے۔ قصہ نویس اور اُن کے قارئین اپنے افلاس اور معاشرتی کم مائیگی کا مداوا عالمِ خیال میں تلاش کرتے ہیں اور اُسے پا لیتے ہیں۔ افلاس اور بے قدری سے قصہ نویسوں اور اُن کے قارئین کے مسائل نہیں ہوتے۔ عام طور سے وہ حُسن و جمال اور وجاہت سے بھی محروم ہوتے ہیں اور اُن کی زندگیاں رومان سے عاری ہوتی ہیں۔ اگر وہ شادی شدہ ہوں تو اُن کی خواہش ہوتی ہے کہ کاش ہم مجرّد ہوتے، مجرّد ہیں تو شادی کے لئے ترستے رہتے ہیں، بوڑھے ہیں تو کھوئی ہوئی جوانی کے لیے آہیں بھرتے ہیں اور کم عمر ہیں تو شباب کے انتظار میں بیٹھے ہیں۔ مختصراً اُن کا مسئلہ یہ ہے کہ وہ ایسے کیوں ہیں جیسے کہ وہ

ہیں، دوسروں کی طرح کیوں نہیں ہیں چناں چہ قصے کہانیوں اور فلموں میں ہمیں ہرجائی عاشق، مست و بے خود حسینائیں، نوخیز معصوم دوشیزائیں، خوب صورت، بے رحم نوجوان اور نفس پرست مبہم عورتیں دکھائی دیتی ہیں۔ ہالی وڈ اور حسیناؤں کی منڈیوں کے قبول عام کی تہ میں یہی چیز کارفرما ہے۔ آج کل عوام کے لیے مذہب کی نسبت سینما زیادہ موثر افیون ثابت ہو رہا ہے"۔ علمائے جنسیات نے جنسی جبلت کو فنون لطیفہ کا سرچشمہ قرار دیا ہے۔ سٹینلے ہال اور ایلین کہتے ہیں کہ: "مذہب، آرٹ اور زندگی کے بہترین عناصر کی کشش کا راز جنسی جذبے کی ہمہ جہت کارفرمائی اور توسیع پر منحصر ہے۔"

معاشرۂ انسانی کی ابتدا سے شعرا، مُغنّی، مصور وغیرہ عشق و محبت کی ترجمانی کرتے رہے ہیں عشق جنسی جبلت کا زائیدہ ہے اس لیے آرٹ اور ادب بالواسطہ جنسی جبلت ہی سے سیراب ہوتے ہیں رومانی اور کلاسیکی آرٹ کا فرق بیان کرتے ہوئے ول ڈیوراں نے لکھا ہے کہ: "احیاالعلوم کی مقدس ترین تصویروں میں عہد بت پرستی کی نفس پروری نے نفوذ کیا۔ مریم عذرا کے نقوش میں حُسن کی دیوی وینس کے بدن کی گدراہٹ نمایاں ہے" ولی جان کے مجسموں میں اڈونس موجود ہے اور ولی سباتیسن کے مجسمے عریاں نگاری کے واشگاف نمونے ہیں۔ جب احیاالعلوم کی تحریک روم سے وینس پہنچی تو قدیم بُت پرستی کے عناصر غالب آ گئے۔ عشق حقیقی کی جگہ عشق مجازی نے لے لی، یوں لگا جیسے مذہبی آرٹ اپنی بقا کے لیے عشق کے دیوتا کا دست نگر ہے۔ جنسی جبلت کی توانائی کا زمین دوز دریا فن کار کے تخلیقی جذبے کو سیراب کرتا ہے۔ بعض طبائع میں ان دونوں کا تعلق جنس اور آرٹ کی فوری ترقی کا باعث ہوا۔ اس ربط و تعلق سے رومانی قسم کا غیر معمولی تخلیقی ذہن جنم لیتا ہے سیفو، الگونڈر، لکریشیس، بائرن، شیلی، کیٹس، سوِن برن، ہیوگو، روسو، ورلین، پیٹرارک، برونو، گیورگونی، شلر، ہائنے، پو، شومان، شوبرٹ، شوپاں، سٹرنڈ برگ، آرتی باشر اور چیکوفسکی: یہ وہ ٹائپ ہے جس میں تخیل تعقل پر غالب آ جاتا ہے اور جس میں جنس اور آرٹ ایک ہی سرچشمے سے فیض یاب ہو کر فن کار کو نڈھال کر دیتے ہیں۔ یہی لوگ ہیں جو شاعری، مصوری، موسیقی اور فلسفۂ عشق کی تدوین و تخلیق کرتے ہیں۔ ہر عاشق انھیں عزیز رکھتا ہے لیکن دوسرے فن کاروں میں جنس کے اظہار کے آگے بند باندھ دیا جاتا ہے اور وہ کلی طور پر تخلیق ہی کی راہوں پر بہہ نکلتا ہے۔ عشق کا تصرف ٹوٹ جاتا ہے، جذبے پر قابو پا لیا جاتا ہے، عقل و خرد پھولتی پھلتی ہے اور ہر چیز پر متصرف ہو جاتی ہے۔ اس عظیم ارتقا میں غیر معمولی کلاسیکی ذہن پیدا ہوتے ہیں۔ سقراط، سوفوکلیز، ارسطو، ارشمیدس، سیزر، گلیلیو، گائٹو، لیونارڈو، تیشیانے، بیکن، ملٹن، ہابس، باخ، کانٹ، گوئٹے، ہیگل، ترگینیف، فلابیر، رینان، اناطول فرانس، مائیکل انجلو، بیٹ ہوون، نپولین۔ ان میں ہر دو قسم کے غیر معمولی ذہنوں کا امتزاج عمل میں آیا اور فوق البشر اکائی کی صورت اختیار کر گیا۔"

تحلیل نفسی اور جنسیات کے طلبا نے اِس اَمر کی جانب بار بار توجہ دلائی ہے کہ عظیم فن کار

غیر معمولی جنسی توانائی کے مالک ہوتے ہیں اور اُن کا آرٹ تند و تیز جنسی ہیجان سے ذوقی فیضان حاصل کرتا ہے۔ ہم جنسیت اور تخلیقِ فن کے قریبی تعلق کو بھی معرضِ بحث میں لایا جاتا ہے اور یہ نتیجہ اخذ کیا جاتا ہے کہ جن مردوں اور عورتوں میں ہم جنسی میلان خلقی طور پر موجود ہوتا ہے وہ ادبی ذوق اور تخلیقِ فن کی صلاحیت سے بدرجۂ اولٰے بہرہ ور ہوتے ہیں۔ عظیم فن کاروں کی سوانحِ حیات کے مطالعے سے بھی اِس بات کی تصدیق ہوتی ہے کہ یا تو وہ غیر معمولی قوتِ رجولیت کے مالک تھے یا نمایاں ہم جنسی میلان رکھتے تھے۔ یُونان کے نام ور تمثیل نگار سوفوکلیز کی زندگی عشق بازی اور کامجوئی میں گزری۔ لزباس کی شاعرہ سیفو اپنی شاگرد لڑکیوں سے پر جوش عشق کرتی تھی۔ اُس کی نظموں کے جو پارے ہم تک پہنچے ہیں وہ شاعری کے اعلٰے نمونے ہیں، ورجل ہم جنسی تھا۔ اُس نے عُمر بھر شادی نہیں کی اور اَمردوں سے جی بہلاتا رہا، احیا العلوم کے دَور کا عالم ایرامس ہم جنسی تھا، اطالیہ کے معروف سنگ تراش لیونارڈو ڈا ونچی اور مائکل آنجلو ہم جنسی تھے۔ مشہور مُصور رفائیل جنسی عفریت تھا اُس کی راتیں فسق و فجور میں کٹتی تھیں، نطشے نے کہا ہے کہ ’جنسی نظام کی حِدّت کے بغیر رفائیل پیدا نہ ہو سکتا‘۔ چیلینی کو جس کی خود نوشت سوانحِ حیات کلاسیک کا درجہ رکھتی ہے سدومیت کے جرم میں قید کیا گیا، شیکسپیر اور مارلو ہم جنسی تھے۔ شیکسپیر نے اپنے محبوب لڑکوں سے ایک سو سے زائد سانیٹوں میں اظہارِ عشق کیا ہے۔ ہمارے ہاں شیخ سعدی اور میر تقی میرؔ اَمرد پرست تھے۔ اِس ضمن میں گلستان کا باب پنجم قابلِ مطالعہ ہے۔ شیخ شیراز خوب صورت حمامی لونڈوں کو گھورنے کے لیے کئی کئی میل پیدل سفر کر کے جایا کرتے تھے۔ میر تقی میر کے دواوین دلّی کے لونڈوں سے بھرے ہوئے ہیں جس سے وہ نہایت بازاری انداز میں اظہارِ عشق کرتا ہے۔ گوئٹے غیر معمولی جنسی توانائی کا مالک تھا اُس نے بھی بے شمار عورتوں سے عشق کیا۔ بڑھاپے میں ایک نو عمر حسینہ جینا فان آرنم سے اُس کا معاشقہ ہوا۔ ونکل مان، والٹر پیٹر، فلنز جیرلڈ اور آسکر وائلڈ ہم جنسی تھے۔ آسکر وائلڈ پر سدومیت کا جُرم ثابت ہو گیا اور اُسے قید کاٹنا پڑی۔ آندرے ژید خود اپنی سدومیت کا ذکر مزے لے لے کر کرتا ہے۔ وہ عُمر بھر اَمردوں سے معاشقے کرتا رہا۔ عربی کا شاعر ابونواس ایک بدنام سدومی تھا۔ اُس نے آہو چشم اَمردوں کی تعریف میں پُر جوش قصائد لکھے تھے۔ جدرہ کا شاعر ملیاگر اَمرد پرست تھا۔ اپنی ایک نظم میں اُس نے سات حسین اَمردوں کا ذکر کیا ہے، ایک کو سوسن کا نام دیا، دوسروں کو سفید بنفشہ، گلاب، انگور، شگوفہ، سُنہرا از عفران اور سدا بہار زیتون کی کلی کہا ہے۔ پٹرارک نے اپنی محبوبہ لارا کے فراق میں پُر جوش سانیٹ لکھے۔ وہ اُسے ’تھیشعلا‘ کہا کرتا تھا۔ اُس کا شمار رومانیت کے اولین ترجمانوں میں ہوتا ہے۔ فرانسیسی شعرا، ورلین اور راں بوں کا آپس میں ہم جنسی معاشقہ تھا۔ ایک دن ورلین نے حسد کے مارے راں بو پر طمنچہ داغ دیا جس سے وہ زخمی ہو گیا اور ورلین کو دو سال کی قید سُنائی گئی۔ شعرا ایلن گنس برگ اور پیٹر اوسلوفسکی چودہ برس تک ہم جنسی رشتہ

ازدواج میں منسلک رہے۔ وکٹر ہیوگو، دوجا کیر، موپاساں اور لیوٹالسٹائے جنسی عفریت تھے۔ وکٹر ہیوگو، بالزاک اور بائرن پر عورتیں پروانوں کی طرح گرتی تھیں۔ عورت کے لیے اُس مرد سے زیادہ پُرکشش کوئی ہستی نہیں ہوتی جو زندگی کے کسی شعبے میں ممتاز ہو اور غیر معمولی قوت رجولیت کی شہرت بھی رکھتا ہو۔ وکٹر ہیوگو اسّی برس کی عُمر سے متجاوز ہو کر بھی جنسی ملاپ کرتا رہا۔ اُس کی موت ۲۲ر مئی ۱۸۸۵ء کو ہوئی تھی۔ اپنے روزنامچے میں لکھتا ہے کہ یکم جنوری سے لے کر ۵راپریل ۱۸۸۵ء تک اس نے آٹھ بار جنسی ملاپ کیا تھا۔ گاتیے کی بیٹی جیوڈتھ بوڑھے ہیوگو پر دل و جان سے فدا تھی۔ ڈوما کبیر ۶۶ر برس کی عمر میں ایک نوعمر ایکٹرس آڈا سے فیض یاب ہوتا رہا۔ لیوٹالسٹائے عُمر بھر اپنے طوفان پرور جنسی میلانات کے خلاف کش مکش کرتا رہا اور شکست پر شکست کھاتا رہا۔ وہ ستر برس سے متجاوز تھا کہ ایک دن بیس میل فی گھنٹہ کی رفتار سے گھوڑے پر سفر کرنے کے بعد رات کو اپنی بیوی کی خلوت میں گیا اور وہ اُس کی توانائی پر ششدر رہ گئی۔ موپاساں قحبہ خانوں میں جا کر ایک ہی تخلیے میں کئی کئی کسبیوں سے تمتع کیا کرتا تھا، آخر آتشک میں مبتلا ہو کر ناوقت کی موت مر گیا۔

بائرن جنسی پاجی تھا۔ وہ سولہ برس کا تھا جب اس کا معاشقہ اپنی بڑی سوتیلی بہن آگسٹا سے شروع ہوا جسے وہ پیار سے ’بطخ‘ کہا کرتا تھا اطالیہ کے دوران قیام میں وہ فسق و فجور کی دلدل میں غرق رہا۔ فرانس کا مشہور مورخ اور تمثیل نگار والٹیر بڑھاپے میں اپنی بھانجی مادام ڈینی سے معاشقہ کرتا رہا۔ ناول نویس جارج ساں مرد شکن عورت تھی۔ وہ ’ہلاکت آفریں‘ اور ’مردانہ عورت‘ کا ایک اچھوتا نمونہ تھی۔ اُس کا اصل نام آرور سے دودے واں تھا لیکن اُس نے اپنا نام مردانہ رکھ لیا۔ وہ مردانہ لباس پہنتی تھی اور سگار پیا کرتی تھی۔ اُس نے بے شمار معاشقے کیے۔ اُس کے ہاں بچے بھی پیدا ہوئے لیکن اسے عمر بھر جنسی آسودگی میسر نہ آسکی۔ اس کا معاشقہ شاعر اور قصہ نویس دمستے سے مشہور ہے۔ ایک دفعہ وہ اس کے ساتھ وینس کی سیر کو گئی جہاں دمستے بیمار پڑ گیا۔ وہ شدید بخار میں تڑپ رہا تھا اور اُس پر ہذیانی کیفیت طاری تھی کہ ڈاکٹر کو طلب کیا گیا۔ جارج ساں نے باتوں باتوں میں نوجوان ڈاکٹر کو ورغلا لیا اور ساتھ کے کمرے میں اُس کے ساتھ خلوت میں چلی گئی۔ موسیقار شوپن سے دس برس تک اُس کا معاشقہ رہا حتی کہ شوپن کی صحت تباہ ہو گئی۔ اُس کی موت کے بعد وہ ایک اور موسیقار فرانز لسٹ پر فریفتہ ہو گئی۔ وہ کہا کرتی تھی میرا جی چاہتا ہے کہ جب لسٹ زور زور سے پیانو بجا رہا ہو تو میں اُس کے پیانو کے نیچے لیٹ جایا کروں۔ وہ کہتی تھی کہ حمل کی حالت میں اُس کا ادبی تخلیق کا سرچشمہ خشک ہو جاتا تھا اور وہ ایک لفظ نہیں لکھ سکتی تھی۔ بادیلفیئر بقول، آلڈس ہکسلے ’مسیحی ابلیس‘ تھا اور حبشی اور یہودی کسبیوں کی صحبت میں خوش رہتا تھا۔ آخر آتشک میں مبتلا ہو کر اِس جہانِ فانی سے رخصت ہوا۔ مشہور مصور وین گوغ گھٹیا درجے کی نکبائیوں کے پاس جایا کرتا تھا۔ ایک دن وہ ایک کسبی کے ساتھ خلوت میں گیا کسبی نے

خرچی طلب کی تو گوغ نے کہا میرے پاس تو پھوٹی کوڑی بھی نہیں ہے۔ کسبی غضبناک ہو کر بولی اچھا تو اپنا کان کاٹ کر مجھے دیتے جاؤ۔ وین گوغ نے بلا تامّل اُسترے سے اپنا کان کاٹا اور اُس کے سامنے پھینک دیا۔ اُس نے اپنی بہترین تصویریں پاگل خانے میں تخلیق کی تھیں۔ آخر ۳۷ برس کی عمر میں خود کشی کر لی۔ ان مثالوں سے یہ قاعدہ کلّیہ تو نہیں بنایا جا سکتا کہ ہر عظیم فن کار نمایاں ہم جنسی میلان رکھتا ہے۔ مُتنبّی، عمر خیام، فردوسی، غالب، اقبال، خواجہ غلام فرید، وارث شاہ، ملٹن، دانتے، سروانتیز وغیرہ میں ہم جنسیت کا کوئی کھوج نہیں ملتا البتہ غیر معمولی جنسی توانائی اور تخلیقِ فن کے ربط باہم سے انکار کرنا مشکل ہے۔ جو فن کار اور ادیب جنسی لحاظ سے کوتاہ ہمت اور سرد مہر ہوں اُن کی فنّی و ادبی تخلیقات بھی سوز وگداز سے عاری ہوتی ہیں مثلاً کہا جاتا ہے کہ کارلائل اور رسکن مرد نہیں تھے اس لیے اُن کی تحریریں بھی پھیکی سی ہیں۔

شاعری، تمثیل نگاری، موسیقی، مُصوری اور بُت تراشی میں جنسی محرکات و عوامل شروع سے کارفرما رہے ہیں۔ اقوامِ عالم کے عظیم شعراء نے جذبۂ عشق کی پُر جوش ترجمانی کی ہے اور جیسا کہ ہم ذکر کر چکے ہیں جذبۂ عشق جنسی جبلّت ہی کا پروردہ ہے۔ جغرافیائی ماحول اور تمدنی روایات کے اختلاف کے باوجود شعرا نے یکساں جوش و خروش سے عشق و محبت کے گیت گائے ہیں بلا شبہ ہر شخص اپنی مادری زبان کی عشقیہ شاعری ہی سے کما حقہ لطف اندوز ہو سکتا ہے لیکن یہ جذبۂ عشق کی ہمہ گیری کا اعجاز ہے کہ دوسری زبانوں کی عشقیہ نظموں کے ترجمے بھی اثر انگیز ہوتے ہیں۔ مثال کے بطور غزل الغزلات، سیفو کی نظمیں، غلام فرید کی کافیاں اور میراں کے گیت جادو کا اثر کرتے ہیں کیوں کہ قاری خواہ کسی ملک کا باشندہ ہو بہر صورت دل رکھتا ہے، جو دھڑکتا ہے اور احساس رکھتا ہے جو مرتعش ہوتا ہے۔ شاعری کے علاوہ دُنیا کی بعض بہترین تمثیلوں، داستانوں اور قصّوں کے موضوعات عشق و محبت کے مرہونِ منت ہیں۔ فردوسی کے شاہ نامے میں زال اور رودابہ کا افسانہ، ایلیڈ میں پیرس اور ہیلن کا عشق، کالیداس کے ناٹک میں وکرم اور اُروسی کا پیار، طربیۂ خداوندی میں دانتے کا بیاطریچے سے پاکیزہ عشق، فاؤسٹ میں فاؤسٹ اور گریتچن کا رُومان، رومیو جولیٹ میں دو دشمن خانوادوں سے تعلق رکھنے والوں کا الم ناک پیار، 'ہیر' میں ہیر اور رانجھا کا عشقِ بلا خیز، ٹالسٹائے کی 'جنگ اور امن'، میں آندرے اور نتاشا کی محبت، ہیوگو کے 'نوتر ادم کا کبڑا' میں کواسیڈو کی خانہ بدوش لڑکی سے بے پناہ محبت وغیرہ' پڑھنے والوں کو روح کی گہرائیوں متاثر کرتی ہے۔ ان کے مطالعے سے قارئین کے ذہن و قلب پر جمی ہوئی خود غرضی کی پھپھوندی دور ہو جاتی ہے اور وہ خود فراموشی اور بے نفسی کے جذبات سے سرشار ہو جاتے ہیں۔ اس طرح ادب و فن میں جنسی جبلّت مرتفع ہو کر عشق و محبت کی صورت میں انسان کے تزکیۂ نفس اور رفعتِ احساس کا سبب بن جاتی ہے۔

موسیقی اور رقص بھی جنسی جبلت کے اظہار کی صورتیں ہیں۔ سُریلے پرندے نر ہوتے ہیں جو اپنی دل کش آواز سے مادہ کو اپنی جانب ملتفت کرتے ہیں سب سے سُریلا پرندہ بُلبل ہے جو مادہ بُلبل کو لبھانے کے لیے گاتا ہے۔ دیہات کے لوک گیتوں سے لے کر پیچیدہ نغماتی تمثیلوں اور خیالوں میں جنسی جبلت کی تحریک کے مختلف مدارج کی ترجمانی کی جاتی ہے۔ بیٹ، ہوون، واگز، موتسارت، فیاض خاں، عبدالکریم خاں، وغیرہ اُستادوں کے نغمات میں کومل سُر جنسی خواہش کی خفتگی اور بیداری کو ظاہر کرتے ہیں۔ آہستہ آہستہ بلند ہوتے ہوئے سُر عشق و محبت کی وارفتگی کی نشان دہی کرتے ہیں اور آخر نقطۂ عروج پر جا پہنچتے ہیں جو جنسی مواصلت کی از خود رفتگی کی علامت ہے۔ خیال کی گائیکی میں الاپ ابتدائی کشش اور دلوں میں اُبھرتے ہوئے پیار کی عکاسی کرتی ہے۔ ولمبت عشق کی گوناگوں کیفیات، سوزِ ہجر اور حسرتِ دید کی آئینہ دار ہے۔ اقوامِ عالم کے ناچوں میں بھی جنسی ترغیبات اور عشقیہ واردات اپنی تمام لطافت اور رعنائی کے ساتھ منعکس ہوگئی ہیں، افریقہ کے قبائلی ناچ واضح طور پر جنسی مواصلت کو ظاہر کرتے ہیں۔ مہذب اقوام کے ناچوں میں والز، کتھک، بیلی ڈانسنگ، ٹانگو، نوسٹ، راک اینڈ رول واضح طور پر جنسی ہیں۔ ہسپانیہ کے مشہور رقص خان دانگو میں ناچنے والے مرد' عورت اپنے اعضا کی حرکات سے عشق و محبت کی جملہ منازل کی ترجمانی کرتے ہیں۔ آخری مرحلے میں عورت کامل سپردگی کی تصویر بن جاتی ہے۔ یہ ناچ اِس قدر نفس پرور ہے کہ ناچنے والوں کے ساتھ دیکھنے والوں کی ہوا و ہوس بھی بے پناہ مشتعل ہونے لگتی ہے۔ کسانووا اپنی سوانح میں لکھتا ہے:

'فان والگو ناچ نہایت ہوس پرور ہے اس میں ناچنے والے مرد اور عورت نہایت نفس پرور اشارے کرتے ہیں اور اس میں عشق کے آغاز سے لے کر وصل کی انتہا تک تمام مراحل کی ترجمانی کی جاتی ہے، گویا یہ ناچ عشق کی مکمل تاریخ ہے۔ میرا خیال ہے کہ کوئی بھی عورت اِس ناچ میں حصہ لینے کے بعد اپنے ساتھی سے انکار نہیں کر سکتی کیوں کہ ناچ کے دوران میں جنسی خواہش تیزی سے بھڑک اٹھتی ہے۔' مشرقِ وسطیٰ کے عرب ممالک کا بیلی ڈانس واضح طور پر جنسی ہے اِس میں رقاصہ اپنے کولھوں کو نہایت ہوس پرور انداز میں تیزی سے مٹکاتی ہے اور صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ حرکات کس بات کی غمازی کر رہی ہیں، مصر کی بعض ناچنے والیاں جنھیں عالمہ اور غازیہ کہتے ہیں' بے تکلفی کی محفلوں میں برہنہ بھی ناچتی ہیں۔ یہ ناچ قدیم مصر کے فراعنہ سے یادگار ہے۔ ہندوؤں کے ناچ کتھک میں محبت کی متنوع کیفیات اور جنسی خواہش کے آغاز و ارتقا کو انگلیوں، ابروؤں، آنکھوں، بازوؤں اور کولھوں کی جنبش و حرکت سے دکھایا جاتا ہے۔ ہیولاک ایلس 'سائیکولوجی آف سیکس' میں لکھتے ہیں:

'وحوش اور پرندے ناچ کر جنسی جذبے کا اظہار کرتے ہیں۔ انسانوں میں بھی ناچ اِس جذبے کی انگیخت کا باعث ہوتا ہے۔ وحشی قبائل سے لے کر آج کل کے مہذب معاشرے تک میں

مختلف قسموں کے ناچوں کا آغاز و ارتقا جنسی جذبے کے اظہار و بیان سے وابستہ رہا ہے۔ والز کے ناچ میں ابتدائے عشق سے لے کر ملاعبت اور مواصلت تک کے جُملہ مراحل کی ترجمانی کی جاتی ہے۔ مرد عورت کے تعاقب میں ہوتا ہے، وہ گریز کرتی ہے، پھر قریب آتی ہے، پھر دور ہٹ جاتی ہے، گریزاں بھی ہوتی ہے اور دعوت بھی دیتی ہے حتی کہ جوش و خروش کا آخری مرحلہ آجاتا ہے جو مواصلت کے نقطۂ عروج کی نشان دہی کرتا ہے۔ وحشیوں کے ناچ صاف صاف جنسی ہوتے ہیں اُن کے اعضا کی حرکات وسکنات سے مواصلت کے عمل تک کی ترجمانی کی جاتی ہے۔

شاعروں اور موسیقاروں کی طرح مُصوّر بھی جنسی جبلّت سے فیضان حاصل کرتے رہے ہیں۔ حسین و جمیل عورتوں کے نقوش میں محبت کے جذبے اور جنسی ترغیب نے رنگ بھرا ہے۔ احیاء العلوم کے اطالوی مُصوروں نے نہایت خوب صورت نسوانی پیکر تراشے ہیں۔ تشیائے، بوشے اور ویلا کرائے کی حسین برہنہ عورتوں کی تصویریں ہوا و ہوس کے اُبھار کا باعث نہیں ہوتیں بلکہ ذوقِ حُسن کی تربیت کرتی ہیں۔ اقوامِ عالم کے مصور صبحِ تاریخ سے حُسنِ نسوانی کے مُرقعے پیش کرتے رہے ہیں۔ اربابِ بصیرت کے خیال میں، حُسنِ نسوانی کا شعور و ادراک ہی جنسی خواہش کا مرہونِ منت ہے۔ جنسی خواہش کے فطرتی اظہار میں رکاوٹ پیدا ہو تو وہ مرتفع ہو کر فنونِ لطیفہ کی آبیاری کرتی ہے۔ الیورا، اجنتا اور پومپیائی کے دیواری نقوش اس کی معروف مثالیں ہیں۔ اجنتا کے غاروں میں بودھ بھکشو تجرد اور زاویہ نشینی کی زندگی گزارتے تھے اور بستیوں سے عمداً گریز کرتے تھے تاکہ عورت کی کشش سے محفوظ رہ سکیں۔ لیکن جنسی جذبے کو کُچلا نہیں جا سکتا۔ اس لیے اُن کے دبائے ہوئے جنسی جذبے نے مُرتفع ہو کر تخلیقِ فن کی صورت میں اظہار بیان کی راہ تلاش کی اور وہ فراغت کے اوقات میں تصویر کشی سے دل بہلاتے رہے۔ ان نقوش میں ہندو عورت کے حسن و جمال کے بے مثل نمونے ملتے ہیں۔ بعض نقوش میں ملاعبت اور اختلاط کے مناظر بھی دکھائے گئے ہیں۔ نیم برہنہ عورتوں کے گدرائے ہوئے بدن اور سانچے میں ڈھلے ہوئے اعضا اپنے جنسی مآخذ کی طرف واضح اشارے کرتے ہیں۔

مُصوّروں کی طرح سنگ تراش بھی مثالی حُسنِ نسوانی کی تعبیر و تشکیل میں کوشاں رہے ہیں۔ یونانِ قدیم کے سنگ تراشوں نے دُنیا بھر کے حسین ترین مجسمے پیش کیے ہیں۔ وینس دمائیلہ اُن کے کمالِ فن کی ایک خوب صورت یادگار ہے۔ احیاالعلوم کے دور کے سنگ تراشوں نے اس یونانی روایت کا احیا کیا۔ فلورنس، میلان نیپلز وغیرہ کے نگار خانوں میں اُن کے شاہ کار محفوظ ہیں۔ اُن کے تراشے ہوئے حسین عریاں نسوانی مجسمے رفعتِ احساس کا سامان وافر رکھتے ہیں۔ مائکل آنجلو نے قدمائے یونان کی طرح مردانہ حُسن کی ترجمانی کی۔ اُس کا مجسمہ 'داؤد' اپولو کی یاد تازہ کرتا ہے۔ جنوبی ہند کے مندروں میں میتھن کا علامتی محرک خالصتاً جنسی ہے۔ اس میں جنسی مواصلت کے مختلف پہلوؤں اور آسنوں کو بے

محابا دکھایا گیا ہے کونارک، کھجو راہو، بیلور وغیرہ کے مندروں کے در و دیوار پر اس قسم کے نقوش کثرت سے تراشے گئے ہیں بعض ناقدین فن انھیں جین سنگ تراشی کی روایت قرار دیتے ہیں لیکن ظاہراً یہ تحسن کا علامتی محرک ماقبل آریائی دور کا دراوڑوں سے یادگار ہے جو لنگ اور یونی کی پوجا بڑے انہماک سے کرتے تھے۔ فن تعمیر میں بھی جنسیاتی عوامل کا کھوج ملتا ہے ہندوستان میں آج بھی شو لنگ کے نمونے پر تعمیرات کی جاتی ہیں۔

جنسیات کے طلبا کہتے ہیں کہ مذہب اور ادب و فن میں ہر قسم کی کج رویاں دکھائی دیتی ہیں۔ یہ ادعا شائبہ صداقت سے خالی نہیں ہے بعض شاعروں، تمثیل نگاروں اور قصہ نویسوں نے جنسی غلامی، ایذا کوشی، ایذا طلبی، جنسی منفرتوں، مرد افگن عورتوں، حیوانیت، ہم جنسیت، معاشقۂ محرمات، نرگسیت، زنانے مردوں، مردانہ عورتوں، نوخیزوں کے ساتھ بڑوں اور بڑوں کے ساتھ نوخیزوں کے معاشقوں سے موضوع لئے ہیں۔ یوری پیڈیز کی تمثیل محرمات کے معاشقے پر مبنی ہے۔ شیکسپئر کی تمثیل اینٹونی کلیوپیٹرا کا مرکزی خیال جنسی غلامی ہے۔ اینٹونی کوشش کے باوجود اپنے آپ کو کلوپیٹرا کی جنسی غلامی سے آزاد نہیں کرا سکتا۔ وہ کہتا ہے "میں ایک کسبی کی آتش ہوس کو بھڑکانے کے لیے دھونکنی اور پنکھا بن کر نہیں رہوں گا"۔ لیکن آخر تک وہ اس غلامی کا جوا اپنی گردن سے نہ اُتار سکا۔ ہیملٹ کی ماں اُس کے باپ کے قتل کے بعد اپنے دیور سے شادی کر لیتی ہے جسے ہیملٹ 'معاشقۂ محرمات' کہہ کر سخت نفرت کا اظہار کرتا ہے۔ سیفو اور اووِڈ کی شاعری میں ہم جنسی عشق کی پُر جوش ترجمانی کی گئی ہے۔ ۱۸ویں صدی کے مشہور فرانسیسی قاموسی دیدیرو نے اپنے ناول 'راہبہ کی سرگذشت' میں عشقِ ہم جنسی کا اُستادانہ تجزیہ کیا ہے۔ ایک حسین و جمیل لڑکی کو اُس کی مرضی کے خلاف راہبہ بنا دیا گیا ہے خانقاہ کی منتظمہ جو لزبائی ہے نووارد راہبہ پر فریفتہ ہو جاتی ہے اور مردوں کی طرح اُس سے اظہار مدعا کرتی ہے۔ نوجوان راہبہ اعتراف سننے والے پادری کو سب کچھ بتا دیتی ہے وہ اُسے منع کرتا ہے کہ منتظمہ کے پاس خلوت میں کبھی نہ جانا۔ لڑکی اس حکم کی تعمیل کرتی ہے منتظمہ آشوب فراق کی تاب نہ لا کر پاگل ہو جاتی ہے اور آخر مر جاتی ہے۔ لزبائی عشق پر اس ناول کو کلاسیک کا درجہ حاصل ہے خلوت کے مناظر حقیقت نگاری کے دلآویز نمونے ہیں۔ سوفوکلیز کی تمثیل فیڈرا اور ریسین کی اسی نام کی تمثیل کا موضوع بھی عشق محرمات ہے۔ لکھنو کی ریختی کی تہ میں زنانہ پن ہے جو اس معاشرے کی زوال پذیری کی علامت بھی ہے اور پیداوار بھی۔ سعادت یار خاں رنگین اور انشا اللہ خاں اِس کے مخترع تھے۔ صاحبقران، جان صاحب، نازنین اور عصمت ریختی گو تھے۔ عصمت لکھنوی زنانہ لباس پہن کر مشاعروں میں شرکت کرتا تھا۔ لاطینی شاعر اووِڈ کی نظم 'فن عشق بازی' میں ایک جنسی پاپی کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ قدیم داستانوں میں بھی ہر نوع کی کج رویاں دیکھنے میں آتی ہیں مثلاً الف لیلہ و لیلہ کی بطرہ کے عشاق کی داستان میں دو لزبائی عورتوں کا

معاشقہ بیان کیا گیا ہے۔ اسی کہانی میں ایک عورت ذات الدواحی مساحقے کی عادی ہے اور نوجوان لڑکیوں کو دامِ فریب میں پھانس لیتی ہے۔ بائرن نے اپنی جنسی کج رویوں کی سرگذشت لکھی تھی جسے اُس کے دوست ہاب ہوث نے نذرِ آتش کر دیا، بائرن کہتا ہے: 'میں نے ہوث کے تمام سرچشمے خشک کر دیئے ہیں میں ہوں ایک بوڑھا جوان آدمی'!

ایک نقاد نے کہا ہے کہ ڈان یوان کی نظم ایک خبیث شیطان (بائرن) ہی لکھ سکتا تھا بائرن کو ابلیسانہ شاعری کا بانی سمجھا جاتا ہے۔ جے دیو کی گیتا گووندا میں کرشن کو ایک جنسی عفریت کی صورت میں پیش کیا گیا ہے جو بے پناہ قوتِ رجولیت کا مالک ہے اور ہر دم گوپیوں کے تعاقب میں بھاگتا پھرتا ہے۔ وائنز یو، کامیو، سارتر اور موریاک کے قصوں میں معاصر اہلِ مغرب کی عورت دشمنی، جنسی کلبیت اور نابکاری کی جھلکیاں دکھائی دیتی ہیں مغرب میں ایذا کوشی اور جنس کے امتزاج سے فلموں کے موضوع لیے جاتے ہیں۔ ان میں خون خوار قاتل اور نیم برہنہ عورتیں دوش بدوش دکھائی دیتے ہیں۔ فلم سازوں کے خیال میں قتل وغارت کے مناظر اور بہتا ہوا خون دیکھ کر ناظرین جنسی حظ محسوس کرتے ہیں جس کی پرورش خوش شکل عورتوں کے گدرائے ہوئے سیمیں بدن کی نمائش سے کی جاتی ہے۔ برہنگی شبانہ مجالس تک محدود نہیں ہی بلکہ اسکرین اور اسٹیج پر بھی آ گئی ہے لندن کے 'مرمیڈ' تھیٹر میں اوتھیلو کی تمثیل دکھائی گئی تو آخری منظر میں ڈیسڈے مونا کو بستر پر برہنہ دکھایا گیا تھا تا کہ وہ اپنے بدن کی رعنائی سے اپنے غضب ناک شوہر کو لبھا سکے۔

ازدواجی زندگی کے عقدے معاشرۂ انسانی کے اہم مسائل میں شمار ہوتے ہیں بہت ہی کم خوش نصیب میاں بیوی ایسے ہوں گے کہ جنھیں بھرپور ازدواجی مسرت ارزانی ہوئی ہو اور جو اس جسمانی، ذہنی اور ذوقی موافقت سے بہرہ یاب ہوئے ہوں۔ اکثر گھرانوں میں ازدواجی زندگی بڑے یا چھوٹے المیے کی صورت اختیار کر لیتی ہے اور میاں بیوی ایک دوسرے سے بے زاری اور بدمزگی کی زندگی گزارتے ہیں۔ مشاہیر تمثیل نگاروں اور قصہ نویسوں نے ازدواجی زندگی کے اس پہلو کو موضوعِ سخن بنایا ہے اور اس کے المناک پہلوؤں کی طرف توجہ دلائی ہے مثلاً لیونالسٹائے کے ناولوں آنا کیرے نینا اور کرائٹزر سوناٹا اور فلابیر کے ناول 'مادام بواری' کا موضوع یہی ہے جن میں ازدواجی زندگی کے عذاب کا ذکر کیا گیا ہے۔ کرائٹزر سوناٹا کا مرکزی کردار پوزنی شیف صدمے کے مارے اپنی بیوی کو قتل کر دیتا ہے۔ وہ اپنی ازدواجی زندگی کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے: 'ہماری حالت اُن مجرموں جیسی تھی جو کالے پانی کی سزا کاٹ رہے ہوں اور اس قیدِ بامشقت میں اُنھیں ایک ہی زنجیر میں جکڑ دیا گیا ہو۔ ہم ایک دوسرے سے نفرت کرتے تھے، ہم نے ایک دوسرے کی زندگی کو جہنم کا نمونہ بنا رکھا تھا لیکن بظاہر ہماری کوشش یہی تھی کہ یہ عذاب ہماری آنکھوں سے اوجھل رہے۔ اُس وقت مجھے اس بات کا علم نہیں تھا کہ

ننانوے فی صد لوگ اسی جہنم میں عذاب بھگت رہے ہیں۔‘ یہ حالات تھے جب ایک موسیقار اُن کے گھر آیا اور اُس نے پیانو پر بیٹ ہوون کا نغمہ کراتزر سوناتا بجایا۔ پوزنی شیف کی بیوی مسحور ہوگئی اور دل و جان سے اُس پر فریفتہ ہوگئی۔ ایک دن پوزنی شیف اچانک گھر آیا تو اُس نے دونوں کو اکٹھا دیکھا۔ اُس نے تاؤ کھا کر بیوی کو قتل کر دیا۔ یہ کہانی بڑی حد تک سوانحی ہے۔ لیو ٹالسٹائے کے اپنی بیوی سونیا سے آئے دن کے جھگڑے اذیت ناک صورت اختیار کر گئے تھے۔ اُن کے یہاں گیارہ برسوں میں آٹھ بچے پیدا ہوئے۔ سونیا نے ایک دن جل کر ٹالسٹائے سے کہا: ’تم نے تو مجھے نسل افزا گھوڑی بنا رکھا ہے۔‘ ٹالسٹائے اپنی بیوی سے سخت متنفر تھا لیکن کوشش کے باوجود ضبط نہیں کر سکتا تھا، اپنے روزنامچے میں لکھتا ہے: ’میں ایک غلیظ شہوت پرست بڈھا ہوں۔‘

اواخرِ عمر میں ٹالسٹائے ازدواجی زندگی کو ’قانونی عصمت فروشی‘ کہا کرتا تھا۔ اُس کے عظیم ناول آنا کیرے نینا کا موضوع بھی یہی ہے۔ آنا اپنے عمر رسیدہ شوہر سے بیزار ہے۔ اُس کی ملاقات ایک نوجوان فوجی افسر ورونسکی سے ہوتی ہے اور وہ اُس کی مردانہ وجاہت پر فریفتہ ہو جاتی ہے شوہر کے طعن و طنز سے تنگ آ کر وہ اپنے محبوب کے ساتھ بھاگ جاتی ہے کچھ عرصے کے بعد ورونسکی اُسے دھتکار دیتا ہے اور آنا مایوسی کے عالم میں ریل کے انجن کے آگے چھلانگ لگا کر خودکشی کر لیتی ہے۔

مادام بوواری میں بھی متاہل زندگی کے المناک پہلو کو موضوع بنایا گیا ہے۔ مادام بوواری اپنے سیدھے سادے شوہر سے مطمئن نہیں ہے اور اُٹھتے بیٹھتے رومانی تخیلات میں کھوئی رہتی ہے آخر ایک اوباش اُسے اغوا کر لیتا ہے اور اُس سے فیض یاب ہو کر قطع تعلق کر لیتا ہے۔

گاتیے کے ناول میڈموزیل ماپاں کی ہیروئن مردانہ لباس پہنتی ہے۔ وہ کہتی ہے ’تمام مرد بدصورت ہوتے ہیں۔ میرا گھوڑا ان مردوں سے زیادہ خوب صورت ہے۔ مجھے اس کے چومنے سے اتنی کراہت محسوس نہیں ہوتی جتنی کہ مرد کے بوسے سے ہوتی ہے۔‘ فرانس کے شاعر پائرے لوئی نے ہم جنسی عشق پر پُرجوش نظمیں لکھیں تھیں جن کے مجموعے کا نام تھا ’سونگس آف بلائٹس‘۔ آج کل یورپ اور امریکہ میں ’بلائٹس کی بیٹیاں‘ کے نام سے عورتوں نے انجمنیں قائم کر رکھی ہیں جن میں آزادیٔ نسواں اور لزبائی عشق کے حق میں پرچار کیا جاتا ہے۔ امریکی شاعر والٹ وٹمین نے بھی ہم جنسی محبت کی تعریف کے گیت گائے ہیں۔ ۱۹۶۰ء سے پہلے جنسی ملاعبت و مواصلت کے مناظر نیلی فلموں تک محدود تھے، اب وہ عام فلموں اور ناٹکوں میں دکھائے جاتے ہیں جس سے ہوسِ دید کی تسکین مقصود ہوتی ہے۔ ’برنائن‘ اسی نوع کی ایک فلم ہے اور ’اوہ! کلکوتا‘ اسی قسم کا ایک ناٹک ہے اس میں مادرزاد برہنہ عورتوں کو گروہی رقص کرتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔ خود لذتی کی خیال آرائیوں پر ژین ژنیے کا ناول ’پھول والی خاتون‘ قابلِ ذکر ہے جو قید خانے میں لکھا گیا تھا۔ یاد رہے کہ دی ساد کے ناول بھی قید خانے ہی میں لکھے گئے تھے اور

اُنھیں بھی اِسی قسم کی خیال آرائی کی تخلیق سمجھا جاتا ہے۔

آخر میں ہم فحش نگاری کا ذکر کریں گے جو ادبیات کا ایک اہم مسئلہ ہے۔ فحش نگاری کی روایت قدمائے یونان و رُوم سے یادگار ہے۔ یُونان قدیم میں فحاشی کی دیوی تھی جس کے سالانہ تہوار پر مرد عورتوں کا اور عورتیں مرد کا لباس پہنتی تھیں اور ہر قسم کے کج روی کے مظاہرے کیے جاتے تھے۔ ہومر نے الیڈ میں خداوند خدا ازلیس اور اُس کی زوجہ ہیرا کی مواصلت ساٹھ مصرعوں میں بیان کی ہے جو نہایت ہوس پرور ہے۔ وہ اوڈیسی میں لکھتا ہے کہ ایک دن دیوتا ہیفے سٹس نے اپنی زوجہ افروڈائٹی کو دیوتا ایروز کے ساتھ ناگفتہ بہ حالت میں دیکھا تو وہ تمام دیوتاؤں کو بلا لایا اور انھیں یہ منظر دکھایا۔ ہومر نے اس منظر کی وصف نگاری میں خُوب خُوب پیر پھیلائے ہیں۔ قدیم روم میں فحش نظمیں لکھی جاتی تھیں اور جوان لڑکے لڑکیاں اُنہیں چُھپ لُک کر پڑھا کرتے تھے۔ ایک باقاعدہ تحریک کی صورت میں فحش نگاری کا آغاز، ۱۷ویں صدی عیسوی میں ہوا اور ۱۸ویں صدی میں فحش تحریریں تمام مغربی ممالک میں رواج پا گئیں۔ وکٹوریہ کے عہدِ حکومت میں فحش نگاری کے وہ تمام اسالیب مُعیّن ہو گئے جو آج تک باقی ہیں مثلاً سائنسی مقصد کے لیے جنسی فعل کا تفصیلی تذکرہ، علم الانسان اور تقابلی مذہب کے نام پر قدیم اقوام و مذاہب کی عجیب و غریب جنسی رسُوم کا ذکر، لوک گیتوں کے حوالے سے فحش نگاری، شادی کے ہدایت نامے، وغیرہ۔ ہنری سپنسر ایش بی نے اپنی تالیف 'اِنڈکس' کی تین ضخیم جلدوں میں اِن جملہ فحش تحریروں کو جمع کر دیا۔ وہ کہتا ہے کہ کسی قوم کے فحش ادب میں اُس کے اخلاق کا عکس پڑتا ہے جیسا کہ مثلاً میرابو، دی ساد، نرسیا، لے کلو وغیرہ کے قصوں میں ۱۸ویں صدی کے فرانسیسی اُمرا کی فاسقانہ زندگی کی جھلکیاں دکھائی دیتی ہیں۔ اِن مصنفین نے معاصر معاشرے ہی کی تصویر کشی کی ہے۔

ایش بی کہتا ہے کہ کسی عہد کے اخلاقی محاسن کو بھی اُس زمانے کے معائب کے بغیر سمجھا نہیں جا سکتا۔ اُس کا یہ خیال محلِ نظر ہے کیوں کہ فحش قِصّوں میں کسی معاشرے کی قدروں یا کسی فرد کے احوال کی حقیقی ترجمانی نہیں کی جاتی بلکہ وہ سراسر مریضانہ خیال آرائی پر مبنی ہوتے ہیں لہٰذا فحش قِصّوں کا اس خیال سے مطالعہ کرنا کہ ان سے کسی معاشرے کی قدروں کا اِدراک ہوگا، سعی بے مصرف ہوگی۔ فحش تحریروں میں زندگی کے تلخ حقائق سے گریز کر کے ایک ایسی خیالی دنیا میں پناہ لی جاتی ہے جس میں سوائے جنسی مواصلت کے کچھ بھی نہیں ہوتا اور یہ وہ دنیا ہے جس میں مرد عورتیں ہمہ وقت ہمہ تن جنسی مواصلت میں غرق رہتے ہیں۔ یہ خیالی دنیا وہ لوگ بساتے ہیں جو جنسی محرومی اور کمزوری کے شکار ہوتے ہیں اور اپنی واماندگی اور کوتاہ ہمتی کی تلافی شہوانی خیال آرائی سے کرتے ہیں۔ اس خیال آرائی میں شہوت رانی کی مجالس برپا کی جاتی ہیں جن کی وصف نگاری واضح طور پر لکھنے والے کی جنسی فاقہ زدگی کی غمازی کرتی ہے۔ اس تفصیل نگاری میں اُکتا دینے والی تکرار ہوتی ہے اور وہ سراسر میکانکی ہوتی ہے۔

'پورنوٹوپیا' میں تمام مرد غیر معمولی رجولیت کے مالک ہوتے ہیں اور تمام عورتیں دن رات جنسی ہیجان میں مُبتلا ہوتی ہیں۔ اس میں عشق و محبت یا حسد و رقابت کا کوئی وجود نہیں ہوتا، کہانی کا اُتار چڑھاؤ نہیں ہوتا، ڈرامائی صورت اِحوال نہیں ہوتی، جذبات کا تصادم نہیں ہوتا، فطری مناظر اور معاشرتی عقدوں سے اِعتنا نہیں کیا جاتا۔ اِس کے کردار میکانکی انداز میں جنسی مواصلت کئے جاتے ہیں اور اِس سے کبھی سیر نہیں ہوتے۔ ایک مرد اور دوسرے مرد میں کچھ بھی فرق نہیں ہوتا، عورتیں بھی سبھی ایک جیسی ہوتی ہیں۔ غرضے کہ مرد' عورتیں پلاسٹک کے کھلونے ہوتے ہیں اور کھلونوں ہی کی طرح ایک عمل کو بار بار دُہراتے رہتے ہیں۔ فحش قصّے میں وقت کے گزرنے کا احساس نہیں ہوتا۔ اِس کا آغاز پہلے جنسی تجربے سے ہوتا ہے۔ جب تک آدمی زندہ رہتا ہے اُس کی رجولیت بحال رہتی ہے۔ فحش ناول کے کردار ہر عنوان سے، ہر بہانے سے جنسی مواصلت پر کمربستہ رہتے ہیں۔ اُن کا مذہب لِنگ اور یونی کی پرستش کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ فحش ناول نگار عالمِ خیال میں اپنے آپ کو 'جنسی پہلوان' تصوّر کر لیتے ہیں۔ راقم الحروف کو ایک نوجوان کی تحریریں دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے جو جبری خودلذتی میں مُبتلا تھا اور اپنی کم ہمّتی اور احساسِ کمتری کی تلافی فحش نگاری سے کیا کرتا تھا وہ ایک سوکھا، سہا ہوا، مریل سا لڑکا تھا لیکن اپنی تحریروں میں وہ ایک قوی ہیکل شہ زور جوان دکھائی دیتا ہے جس کے پیچھے عورتیں دیوانہ وار بھاگتی پھرتی ہیں۔

راقم الحروف کے خیال میں سچّا ادب اور سچّا فن فحش ہو ہی نہیں سکتا کیوں کہ وہ محض خیال آرائی پر مبنی نہیں ہوتا بلکہ اُس کا ذہنی اور ذوقی رشتہ روزمرّہ کی زندگی اور اُس کے مسائل سے بلا واسطہ استوار ہوتا ہے اور وہ زندگی ہی سے اپنے موضوع تلاش کرتا ہے۔ اِس کے ہاں جنسی جبلت میں عشق و محبت کا پاکیزہ جذبہ مشمول ہوتا ہے اور عشق وہ قوت ہے جس سے جنسی خواہش ذوقِ جمال کا زرِ خالص بن کر نکھر آتی ہے۔ چنانچہ وہ تحریریں قطعی طور پر فحش ہیں جن میں جنسی مواصلت کا ذکر سرد مہری سے کیا جائے اور اُس کی وصف نگاری میکانکی بن کر رہ جائے اِس نوع کی مواصلت انسان کو حیوان سے بھی پست تر کر دیتی ہے۔ فحش قصّوں میں ایذا کوشی کا عنصر غالب ہوتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ فحش نگار ہمیشہ مرد ہی ہوتے ہیں اور یہ بات قابلِ غور ہے کہ کسی بھی عورت نے فحش ناول نہیں لکھے۔ اِس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ جنسی کوتاہ ہمّتی کے شکار اکثر و بیش تر مرد ہی ہوتے ہیں۔

'فحش ادب' کی ترکیب مغالطہ آفرین ہے فحش تحریروں پر ادب کا اطلاق نہیں ہو سکتا کسی فاتر العقل کی خیال آرائی کو حیطۂ تحریر میں لایا جائے تو وہ ادب نہیں کہلائے گی۔ اس طرح ایک کوتاہ ہمت کی مریضانہ شہوانی خیال آرائی کو ادبیات میں شمار نہیں کیا جائے گا کیوں کہ ایک تو وہ روزمرّہ کی زندگی سے ذوقی فیضان حاصل نہیں کرتا، دوسرے جمالیاتی قدر کی ترجمانی سے قاصر رہتا ہے۔ فحش تحریریں پڑھتے

ہوئے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے انسانی زندگی کی کوئی اساس نہیں ہے۔ نہ اس میں کسی نوع کی قدر یا معنویت پائی جاتی ہے۔ دی ساد کے ناول 'جسٹن' کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ ۱۸ ویں اور ۱۹ ویں صدیوں کے فحش نگاروں نے اسی کو اپنے لیے نمونہ بنایا ہے۔ جسٹن ایک حسین دوشیزہ ہے جو ماں باپ کی وفات کے بعد بے یار و مددگار رہ جاتی ہے اور مصائب و آلام اُسے چاروں طرف سے گھیر لیتے ہیں۔ اُسے کچھ عرصے کے لیے ایک ڈاکٹر کے یہاں قیام کرنا پڑتا ہے یہ ڈاکٹر ایک جنسی عفریت ہے جس کی بدعنوانیوں میں ایذا کوشی اور عشق محرمات مشمول ہیں جسٹن ڈاکٹر سے چھٹکارا پاتی ہے تو چند فاسق و فاجر راہبوں کے ہتھے چڑھ جاتی ہے۔ خانقاہ کے دوران قیام میں جو کچھ اُس پر گزرتی ہے وہ ہوسناکی اور ایذا کوشی کی بدترین مثال ہے۔ اِس قصّے کے مطالعے سے دی ساد کی ابلیسیت مکمل کر سامنے آجاتی ہے اور قاری کے پست ترین جذبات بھڑک اٹھتے ہیں جب کہ سچّا اَدب وفن جذبات کی تنقیح کا باعث ہوتا ہے اور اِنسان کے تعمیری اور مثبت میلانات کی پرورش کرتا ہے۔ جنوبی ہند کے مندروں کے دیواری نقوش اور آرٹینو کی کتاب کی رُسوائے زمانہ تصویریں بھی فحش ہیں۔ ہندو روحانیت کے حوالے میتھن کی توجیہہ و تقدیس کرتے ہیں لیکن یہ محض جواز جوئی اور تاویل آرائی ہے۔

ڈاکٹر ایبر ہارڈ اور فلس کردن ہاسن نے فحش نگاری اور نفسیاتی حقیقت نگاری میں فرق پیدا کیا ہے، نفسیاتی حقیقت نگاری کا مقصد معروضی اور غیر جذباتی انداز میں جنس سے متعلق حقائق کھول کر بیان کرنا ہوتا ہے جب کہ ایک فحش نگار کا مقصدِ واحد ہوس انگیزی ہوتا ہے۔ فحش قصّوں اور نظموں کو بھی دو حصّوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے، ایک تو سراسر فحش ہیں اور دوسروں کے بعض مقامات کو فحش کہا جاسکتا ہے۔ سراسر فحش قصّوں سے ہم طوالت کے خوف سے دو مثالیں دیں گے 'ہوس پرست ترک' اور 'ہندوستان میں زہرہ'۔ 'ہوس پرست ترک' خطوط کی شکل میں ہے۔ ایک انگریز لڑکی ایمیلی بارلو کو بحری قزاق اغوا کر کے الجیریا کے حاکم کے ہاتھ بیچ دیتے ہیں۔ حاکم کے حرم میں جو کچھ ایمیلی پر گزرتی ہے وہ اُن واردات کو خطوط کی شکل میں اپنی سہیلی سلویا کیری کو لکھ بھیجتی ہے حرم کی دوسری لڑکیاں جو ترک حاکم کی ہوس کا نشانہ بنتی ہیں' ایمیلی کو باری باری اپنی آپ بیتی سناتی ہیں۔ قصّے میں ہر عنوان سے ترک حاکم کی جنسی فتوحات کا ذکر نہایت نفس پرور انداز میں کیا گیا ہے۔ ناول کا بیش تر حصہ اسی قسم کی وصف نگاری پر مشتمل ہے۔ اس میں معاصر انگریزی یا الجزائری معاشرے کی کوئی جھلک دکھائی نہیں دیتی۔ جنسی مواصلت کے مناظر ہیجان انگیز ہیں۔ انداز بیاں میکانکی اور نخس ہیں۔

دوسرا ناول انگریزی فوج کے ایک افسر کی خودنوشت سوانح ہے جس میں اُس نے ہندوستان کے دورانِ قیام میں اپنی جنسی مہمات کا ذکر کیا ہے۔ مُصنف کیپٹن ڈیورو فوجی خدمات انجام دینے کے لیے ہندوستان آتا ہے اور صوبہ سرحد کی جھڑپوں میں حصّہ لیتا ہے۔ اپنی رجمنٹ کے کیمپ کی طرف

جاتے ہوئے راستے میں وہ ایک سرائے میں ٹھہرتا ہے جہاں اُس کی ملاقات ایک حسین انگریز عورت سے ہوتی ہے۔ عورت اُسے اپنے کمرے میں بلا لیتی ہے اور پھر جنسی مواصلت کی وصف نگاری کا وہی چکر چلتا ہے جس میں حقیقت کم اور خیال آرائی اور آرزو پروری زیادہ ہوتی ہے۔ ہر بار خلوت میں نئے نئے اسالیب اختراع کئے جاتے ہیں اور دونوں بے پناہ جنسی توانائی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ اس کے بعد یہی کپتان اپنے میجر کی تین جوان کنواری لڑکیوں فینی، ایمی اور میبل سے اسی انداز میں تمتع کرتا ہے۔ تینوں بہنیں یکے بعد دیگرے اُس پر فریفتہ ہوجاتی ہیں اور باری باری سپردگی پر آمادہ ہوجاتی ہیں۔ دوسرے فحش قصوں کی طرح اس ناول کا مقصد واحد عالم خیال میں اُس جنسی لذت اور آسودگی کا حصول ہے جن سے مُصنف اپنی حقیقی زندگی میں محروم رہا ہے۔ یہ نام نہاد خودنوشت سوانح عمری سراسر دروغ وجعل ہے۔ اس میں ہندوستانی معاشرے کی جھلکیاں دکھائی دیتی ہیں وہ محض چند الفاظ وتراکیب اور سُنی سنائی باتوں تک محدود ہیں۔ صاف معلوم ہوتا کہ مُصنف نے ہندوستان میں قدم تک نہیں رکھا۔

آج کل یورپ اور امریکا کے شہروں میں فحش قصے برملا فروخت ہوتے ہیں جو عورتیں مرد بوجوہ جنسی آسودگی سے محروم رہتے ہیں اور اُس مسرت کے لیے ترستے رہتے ہیں جو جنسی خواہش کی بھرپور تسکین ہی سے میسّر آ سکتی ہے وہ فحش قصوں کے مطالعے سے اپنی محرومیوں کی تلافی کر لیتے ہیں۔ مغرب میں فحش قصوں، نیلی فلموں اور ستر کشائی کے رقص، اور شبانہ مجالس کی مقبولیت اس کی غمازی کرتی ہے کہ جنسی آزادی کے باوجود مغرب کی بے شمار عورتیں اور مرد، بیزاری اور اُکتاہٹ کی زندگی گزار رہے ہیں اور اس کے مداوا کے لیے فحاشی اور عریانی سے رجوع پر مجبور ہیں۔ یہ امر قابل غور ہے کہ اشتراکی ممالک میں فحش نگاری کا کوئی کھوج نہیں ملتا۔ اشتراکی معاشرے میں لوگ اس قدر مصروفیت کی زندگی گزارتے ہیں اور اُنھیں معاشی آسودگی کے ساتھ ساتھ جذباتی تشفی کے اتنے سامان میسّر ہیں کہ وہ مریضانہ خیال آرائی سے رُجوع نہیں لاتے۔ جو شخص محنت مشقت کی صاف ستھری سیدھی سادی زندگی گزار رہا ہو اُس کی جنسی جبلت میں بھی ہمواری اور اعتدال کی کیفیت پیدا ہوجاتی ہے چناں چہ اشتراکی معاشرے میں ذہنی و جذباتی آسودگی کے باعث شہوانی خیال آرائی بلکہ کسی قسم کی مریضانہ خیال آرائی یا ذہنی فرار کا کوئی عنوان ہی باقی نہیں رہتا۔

ماخذ (اُردو۔ ۷۰)

ادب اور جنس

وزیر آغا

ادب اور جنس کا موضوع اس قدر متنوع اور ہشت پہلو ہے کہ ایک مختصر سے مضمون میں اس کا پوری طرح احاطہ کرنا ممکن نہیں، لہذا میں اس موضوع کے صرف دو پہلوؤں کے بارے میں کچھ گزارشات پیش کروں گا اول یہ کہ ادب کی تخلیق میں جنسی جذبہ کس طرح اور کس حد تک صرف ہوتا ہے! دوم یہ کہ ادب میں ‘جنس’ کی بطور موضوع کس حد تک گنجائش ہے؟

پہلے سوال کے جواب میں مجھے یہ کہنا ہے کہ جنسی جذبہ زندگی کے تنوع اور تسلسل کے لیے ناگزیر ہے اور کسی نہ کسی صورت میں پودوں، حیوانوں، پرندوں اور انسانوں میں ہمیشہ موجود ہوتا ہے اگر یہ جذبہ موجود نہ ہوتا تو زندگی اپنی ابتدائی سادہ صورت سے آگے بڑھ ہی نہ سکتی مگر دلچسپ بات یہ ہے کہ جب سے جنسی جذبہ معرض وجود میں آیا ہے وہ محض ایک ہی مخصوص ڈیزائن کا حامل نہیں رہا بلکہ زندگی کے مختلف مظاہر میں مختلف انداز اختیار کرتا چلا گیا ہے۔ مثلاً پودوں میں جنس زیادہ تر لامسہ کو بروئے کار لاتی ہے اور حیوانوں میں لامسہ کے علاوہ شامہ اور سامعہ کو بھی۔ انسان کے ہاں اس نے باقی حسیات سے بھی فائدہ اٹھایا ہے مگر اس کا زیادہ جھکاؤ باصرہ کی طرف ہے۔

اب اسی مسئلے کو ایک اور زاویے سے دیکھیے، لامسہ کا میدانِ عمل بہت محدود ہے یہاں تک کہ وہ طالب و مطلوب کی درمیانی خلیج کی بھی متحمل نہیں ہو سکتی، شامہ کا دائرہ کار اس سے زیادہ وسیع ہے کہ اس کو بروئے کار لانے کے بعد جنسی جذبے کا دائرہ بھی وسیع ہوتا ہے، سامعہ کا میدان عملاً اس سے بھی زیادہ وسیع ہے، باصرہ کی لپک نہ صرف جنسی جذبے کی زد کو مزید بڑھا دیتی ہے بلکہ اس کی نوعیت تبدیل کرنے پر بھی قادر ہے وہ یوں کہ باصرہ کے ذریعے جنسی جذبہ لذت کے فوری حصول سے صرف نظر کر کے حسن کے ادراک کی طرف مائل ہو جاتا ہے۔ یہ حسن محض محبوب کے سراپا میں فطرت کے حسن ہی کا عکس نہیں، مثلاً محبوب کی چال میں غزال کا خرام اور اس کے عارض کی دمک میں گلاب کا رنگ وغیرہ بلکہ فطرت کے حسن میں محبوب کے جسم کے خطوط کا پرتو بھی ہے، مثلاً وادی کی بانہیں، شفق کا عارض، سبزے کا گداز، بادل کا آنچل اور چاند کا چہرہ، وغیرہ۔ محبوب کے جسم کو فطرت کے حوالے سے جانچنے یا فطرت کو محبوب کے جسم کے حوالے سے پہچاننے کی یہ روش جنسی جذبے کی قلب ماہیت ہی کی ایک صورت ہے۔

مگر جنسی جذبہ اپنی کثیف' بوجھل' دم روکنے والی حیثیت میں ادب کا جزو نہیں بن سکتا' ایسی صورت میں یہ جذبہ اس قدر اندھا' بہرہ اور براہ راست ہوتا ہے کہ جسم کے بندی خانے سے باہر آ کر خیال کی کائنات میں داخل ہونے کی صلاحیت ہی اس میں موجود نہیں ہوتی۔ ادب میں صَرف ہونے کے لیے جنسی جذبے کا لطیف اور سبک بار ہونا نہایت ضروری ہے اور یہ بات جبھی ممکن ہے کہ طالب اور مطلوب کا درمیانی فاصلہ کم از کم اتنا ضرور ہو کہ اسے طے کرنے کے لیے جذبے کو زقند لگانی پڑے۔ اگر یہ فاصلہ موجود ہی نہیں تو جنسی جذبہ برقی رو کی طرح با آسانی ایک تار سے دوسرے تار میں منتقل ہو جائے گا اور اسے زقند لگانے کے لئے اپنے بوجھ سے دست کش ہونے کی ضرورت ہی نہیں پڑے گی۔ مگر جب درمیان میں فاصلہ حائل ہو تو پھر جنسی جذبہ مجبور ہے کہ باصرہ ایسی حس کو بروئے کار لائے جس کی زد نہایت وسیع ہے اور یوں خود کو کثافت اور بوجھ سے نجات دلانے میں کامیابی حاصل کرے۔

چناں چہ حسن کا ادراک بجائے خود فاصلے کا رہینِ منت ہے۔ زیادہ قریب سے تو اپنا چہرہ بھی بھیانک نظر آتا ہے یا شاید نظر ہی نہیں آتا۔ واقعہ یہ ہے کہ انسان کے ہاں حسن کا شعور صرف اس لیے ممکن ہوا کہ اس نے جنسی جذبے کو بصری علامتوں میں ڈھال کر اس کی زد کو وسیع کر دیا۔ چناں چہ اب محبوب کا جسم پوری فطرت پر حاوی ہو گیا اور خود محبوب کے جسم میں فطرت کی جملہ قوسین' خطوط اور رنگ سمٹ آئے۔ مراد یہ نہیں کہ جنسی جذبہ ادبی تخلیق میں صرف ہونے کی صورت میں خود کو لمس یا خوش بُو وغیرہ سے بیگانہ کر دیتا ہے بلکہ یہ حقیقت ہے کہ وہ اس ترسیل میں جملہ حسیات کو بروئے کار لاتا ہے چناں چہ اُس پارے میں لمس' خوش بو اور آواز وغیرہ کی بھی قلب ماہیت ہو جاتی ہے۔ تاہم چوں کہ انسان کے ہاں باصرہ کا عمل دخل نسبتاً زیادہ ہے اس لئے جب کوئی ادب پارہ حسن کا احاطہ کرتا ہے تو اس میں محبوب کے نین نقش کی تصویر' لمس' خوش بو اور آواز کے مقابلے میں نسبتاً زیادہ اجاگر ہوتی ہے شاید اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ انسان کے ہاں آنکھ اور دماغ کی نمو اور ترقی نے اس کے جنسی جذبے کی بصری صلاحیت کو زیادہ توانا کر دیا ہے۔

چنانچہ جب یہ جذبہ ادب میں منتقل ہوتا ہے تو زیادہ تر بصری علامات ہی میں خود کو ڈھال کر ایسا کرتا ہے مگر چوں کہ ادب تخلیق کار کی پوری ذات کا عکس ہے لہٰذا جس ادیب کے ہاں جنسی جذبہ محض بصری نہ ہو بلکہ جُملہ حسیات سے وابستہ نظر آئے اس کی تخلیق میں دوسروں کی نسبت زیادہ توانائی اور کاٹ نظر آئے گی مگر میں اس بات پر زور دوں گا کہ جنسی جذبہ اپنی کثیف صورت میں تخلیق کا جزو نہیں بنتا بلکہ ارفع اور سبک سار ہو کر ایسا کرتا ہے اور اپنے اس عمل میں بوجھل' دم روکنے والے عناصر کو لطیف کیفیات میں ڈھال دیتا ہے۔ مثلاً جسم برناب یا انگارے میں اور اس کی خوش بُو نافے یا گلاب کی خوش بو

میں تبدیل ہو جاتی ہے اور اس کے خطوط اور زاویے فطرت کے ان گنت مظاہر میں اپنی مماثلت تلاش کرنے لگتے ہیں۔

فن کی تفریح کے سلسلے میں لن یو تانگ نے ایک مزیدار بات کہی ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ جب کوئی فاختہ اپنی ترنگ میں درخت کی شاخ سے اڑ کر آسمان کی طرف جاتی ہے اور پھر اپنے پروں کو پھیلا کر ایک قوس سی بناتی ہوئی واپس کسی دوسرے درخت پر آ بیٹھتی ہے تو دراصل فن کے طریق کار کا مظاہرہ کرتی ہے کیوں کہ جو قوس فاختہ کی پرواز میں ہے وہی فن پارے کی لچک میں بھی ہے۔ اس میں مجھے صرف یہ اضافہ کرنا ہے کہ فاختہ جس قوس کو وجود میں لاتی ہے یا فن پارہ جس قوس کو جنم دیتا ہے وہ ہمیں اس لیے بھی اچھی لگتی ہے کہ اس کا نہایت گہرا تعلق جنسی جذبے سے ہے۔ یہ جنسی جذبہ فن پارے کی تکمیل یافتہ صورت ہی میں نہیں بلکہ اس کے اجزا میں بھی خود کو سمو دیتا ہے چناں چہ فن پارے میں جو تشبیہیں یا استعارے ہوتے ہیں ان کی توانائی اور زرخیزی بھی زیادہ تر اس بات کے تابع ہوتی ہے کہ وہ کس حد تک ایسی تصویریں بناتے ہیں جن کا تعلق بالواسطہ یا بلا واسطہ جنسی جذبے کی سیرابی سے ہے۔ ویسے دل چسپ بات یہ ہے کہ ایسی جو تصویر جنسی جذبہ کو براہ راست مس کرتی ہے' فنی طور پر اس تصویر سے کم تر ہوتی ہے جو جنسی جذبے کو سبک 'سار' لطیف اور ارفع ہونے پر مائل کرتی ہے اور جس کا بظاہر جنسی جذبے سے کوئی تعلق دکھائی نہیں دیتا۔

واضح رہے کہ میں اس بات کا موئد ہرگز نہیں ہوں کہ ادب محض جنسی جذبے کے اظہار کی ایک صورت ہے کیوں کہ ادب میں جنسی جذبے کے علاوہ بھی بہت کچھ شامل ہوتا ہے مثلاً اس میں ایک ایسی پراسرار قوت کا جز رومد بھی موجود ہے' جسے نشان زد تو نہیں کیا جا سکتا مگر جس کی موجودگی کا احساس بہت سے مفکرین کو بار بار ہوا ہے۔ برگساں نے اُسے 'قوت حیات' کا نام دیا ہے۔ البتہ یہ کہنا غلط نہیں کہ جہاں تک 'تخلیق' کے جسم کا تعلق ہے' اس پر ہمیشہ جنسی جذبے کا تسلط نسبتاً زیادہ رہا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ جنسی جذبہ کا نہایت گہرا تعلق ہماری پانچوں حسیات سے ہے اور یہی حسیات ادب کی تخلیق میں بھی استعمال ہوتی ہیں۔ لہٰذا جب وہ ادب کی تخلیق میں کام کر رہی ہوتی ہیں تو جنسی جذبہ انھیں کے ذریعے ادب میں بھی منتقل ہو جاتا ہے اور ادب کے جسم کی تعمیر کرنے لگتا ہے۔ مگر میں پھر یہ عرض کروں گا کہ اگر ادبی تخلیق کا جسم جنسی جذبے کی گراں بار اور کثیف صورت کو خود میں سمونے کا اہتمام کرے تو اس کا فنی معیار بلند نہیں ہو سکے گا۔ دوسری طرف جب جنسی جذبہ علامتی روپ اختیار کر کے تخلیق میں حلول کرے گا تو تخلیق کی جاذبیت اور توانائی میں اضافے کا باعث ہوگا۔

اور اب دوسرا سوال یعنی یہ کہ ادب میں جنس کی بطور موضوع کس حد تک گنجائش ہے! یہ ایک نہایت نزاعی سوال ہے اور اس کے جملہ پہلوؤں کو متعدد بار زیر بحث لایا جا چکا ہے۔ ایک طبقہ ادب میں

جنس کو بطور موضوع شامل کرنے پر بضد ہے اور اس سلسلے میں ہر قسم کی نکتہ چینی یا احتساب کو آزادیٔ اظہار پر قدغن لگانے کے مترادف قرار دیتا ہے، دوسرا طبقہ اخلاقی قدروں کو بے راہ روی اور جنسی اشتعال انگیزی سے محفوظ رکھنے کا داعی ہے اور اس سلسلے میں احتساب کو ضروری سمجھتا ہے۔ غرضے کہ ادب میں جنس کو بطور موضوع شامل کرنے کے سوال پر ایک عجیب سا ہنگامہ جاری ہے۔

اس بحث کو آگے بڑھانے سے پہلے یہ ضروری ہے کہ عریانی اور فحاشی میں حد فاصل قائم کرلی جائے۔ عریانی فطرت کا عطیہ ہے جب کہ فحاشی انسان کی اپنی پیدا کردہ ہے۔ عریانی، باغِ بہشت کے مکینوں کو بطور تحفہ عطا ہوئی، لیکن فحاشی کے شجرِ ممنوعہ کو انھوں نے اپنی مرضی سے منتخب کیا۔ عجیب بات ہے کہ بیش تر جانوروں اور پرندوں کو فطرت نے لباس سے نوازا ہے جب کہ انسان کو ننگا رکھنے پر اصرار کیا ہے۔ مگر یہ ننگا پن انسان کے لئے ایک نعمت خداوندی ثابت ہوا ہے کیوں کہ علم الانسان کے ماہرین کے مطابق اگر انسان ننگا نہ ہوتا تو اس کا دماغ کبھی اس قدر ترقی کر کے جانوروں کے دماغ پر سبقت حاصل نہ کرسکتا۔ وجہ انہوں نے یہ بیان کی ہے کہ ننگا جسم زیادہ حساس ہوتا ہے اور معمولی سی خارجی تحریک یا لمس بھی اسے متاثر کردیتا ہے۔ پھر جب جسم کا کوئی حصہ متاثر ہوتا ہے تو عصبی نظام اس کی خبر فی الفور دماغ کو بھجوا دیتا ہے چناں چہ جب انسان کے ننگے جسم نے لاکھوں برس تک اپنی زود حسی کے باعث دماغ کو خبروں کے ایک لامتناہی سلسلے کی آماجگاہ بنائے رکھا تو قدرتی طور پر انسانی دماغ کے سیکریٹریٹ میں بھی توسیع کی ضرورت محسوس ہوئی اور یوں لاتعداد شعبے بالخصوص یادداشتوں کو تصویری فائلوں کی صورت میں محفوظ کرنے کے شعبے معرض وجود میں آگئے جن کے باعث دماغ میں ماضی اور مستقبل کے ابعاد بھی شامل ہوتے چلے گئے۔

مگر یہ تو ایک جملۂ معترضہ تھا۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ عریانی فطرت کا عطیہ ہے اور اس لئے جب فن اس عطیے کو سمیٹتا ہے تو فنی ارتقا کے عمل کو سامنے لاتا ہے۔ اجنتا، ایلورا کی تصویریں یا مغربی مصوروں اور مجسمہ سازوں کے فن کے نمونے اس کے ثبوت میں پیش کیے جاسکتے ہیں، جب کہ دوسری طرف ہندوؤں کے ہاں متھن کی روایت کا وہ حصہ جس کے تحت جنوبی ہندوستان کے مندروں کی دیواروں پر جنسی اتصال کے مناظر پیش ہوئے ہیں، فحاشی کے تحت آتا ہے عریانی جب فن میں ڈھل کر ایک انوکھی لطافت اور ملائمت کی حامل بنتی ہے تو جنسی جذبے کو تہذیب کے عمل کو یقیناً دوچند کردیتی ہے۔ دوسری طرف فحاشی ہزار بہاروں کے باوجود جنسی جذبے کو مشتعل کرتی ہے اور اسے زقند لگانے یا فاختہ کی طرح قوس میں پرواز کرنے کے عمل سے منع کر کے براہ راست جسم سے لطف اندوز ہونے کے عمل پر اکساتی ہے۔ عام زندگی میں دیکھیے کہ کسی دریا کے کنارے غسل کرتی ہوئی دوشیزہ عریاں تو کہلا سکتی ہے، فحش ہرگز نہیں۔ مگر بھرے بازار سے گزرتی ہوئی کوئی چلبلی حسینہ اپنے بھاری لبادے کے باوجود فحاشی کا نمونہ ثابت ہوسکتی ہے۔ لہٰذا فن کے ضمن میں اس بات کو ملحوظ

رکھنا نہایت ضروری ہے کہ کسی فن پارے میں عریانی کا عنصر کہاں تک اپنی لطافت اور رفعت کو قائم رکھ سکا ہے اور کس مقام پر عریانی نے اپنی معصومیت اور تقدس کو تج کر فحاشی کے میدان قدم رکھ لیا ہے۔

یہ سوال کہ فحاشی، اخلاق اور قانون کے نقطۂ نظر سے، کس حد تک گردن زدنی ہے، میرا موضوع ہرگز نہیں۔ وجہ یہ کہ اخلاقی قدریں اور قوانین، زمان و مکان کی تبدیلیوں کے ساتھ بدلتے رہتے ہیں۔ مجھے فحاشی پر یا فحاشی کی زد میں آئی ہوئی عریانی پر اعتراض فن کے نقطۂ نظر سے ہے کیوں کہ جب کوئی ادب پارہ جنسی جذبے کی براہ راست سیرابی کا اہتمام کرتا ہے تو دراصل جنسی جذبے کی تہذیب کے عمل کو روکتا ہے اور فن سے قوس کو منہا کر دیتا ہے۔ اس بات کی توضیح اردو افسانے کے حوالے سے باآسانی ہو سکتی ہے۔ آج سے کافی عرصہ پہلے عصمت چغتائی نے 'لحاف' اور منٹو نے 'ٹھنڈا گوشت' لکھا۔ دونوں پر فحاشی کے الزام میں مقدمے چلائے گئے۔ اس زمانے میں ابھی اردو افسانے میں فحاشی کی ابتدا ہی ہوئی تھی اس لیے نوجوان طبقے کو ان افسانوں نے چونکا دیا۔ دوسری طرف ہمارے ناقدین نے ان افسانوں کے مصنفین کو آزادیٔ اظہار کے نام پر مبارک باد تک پیش کر دی۔

مگر آج پل کے نیچے سے بہت سا پانی بہہ چکا ہے۔ فحاشی کے جس عنصر نے آج سے کافی عرصہ پہلے ہمارے قارئین کو چونکا دیا تھا وہ آج کی بے پناہ جنسی اشتعال انگیزی کے موسم میں محض بچوں کا کھیل نظر آتا ہے۔ مراد یہ کہ آج مغرب سے آنے والی اخلاق باختگی کی رو نے فلم، بلیو فلم، ناول اور افسانے وغیرہ کے ذریعے فحاشی کی حدود کو اس قدر پھیلا دیا ہے اور اس میں اتنی تیزی اور تندی پیدا کر دی ہے کہ اب 'لحاف' یا 'ٹھنڈا گوشت' ایسے افسانے اس سلسلے کی محض چند مبتدیانہ کاوشیں دکھائی دیتے ہیں۔ لہٰذا اب حل طلب سوال صرف یہ رہ جاتا ہے کہ یہ افسانے فن کے میزان پر کس حد تک پورا اترتے ہیں۔ مگر جب فن کے نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو یہاں بھی ہمیں مایوسی کا سامنا کرنا پڑتا ہے کیوں کہ یہ افسانے کسی طور بھی فن کے اعلیٰ نمونوں میں شامل نہیں کیے جا سکتے۔ یہ مثال میرے اس موقف کو سہارا دیتی ہے کہ عام لوگوں کے لیے افسانے میں فحاشی کا عنصر اس وقت تک ہی جاذبِ نگاہ ہے جب تک فحاشی کا فیشن تبدیل نہیں ہو جاتا یا فحاشی مزید فحش نہیں ہو جاتی۔ لہٰذا کیا افسانے کو کسی ایسی اساس (مثلاً فحش) پر استوار کرنا جو ریت کی دیوار سے زیادہ اہمیت نہ رکھتی ہو، خطرہ مول لینے کے مترادف نہیں، کیوں کہ آخری فیصلہ تو بہر حال فن کے نقطۂ نظر ہی سے صادر ہوتا ہے۔

آج اردو ادب ہی نہیں دنیا کی دوسری زبانوں کے ادب میں بھی جنس کو بطور موضوع پیش کرنے کی روش عام ہو چکی ہے۔ جہاں تک ادب کا تعلق ہے اس کے لئے کوئی موضوع بھی نامناسب نہیں، مگر ادب اس بات کا تقاضا ضرور کرتا ہے کہ جب کوئی موضوع ادب میں داخل ہو تو اپنا پرانا بوجھل لبادہ اتار کر آئے ورنہ فن پارہ اسے قبول کرنے کے لیے تیار نہ ہوگا۔ بالکل جیسے انسانی جسم میں جب غلط قسم کا خون داخل کیا جائے تو

وہ اسے قبول نہیں کرتا۔ مگر دوسری طرف صورت یہ ہے کہ بیسویں صدی نے انسان کو جنسی طور پر مشتعل کر دیا ہے اور اس اشتعال انگیزی میں اس کی بصری صلاحیت بیک وقت ایک نعمت بھی ہے اور المیہ بھی، نعمت یوں کہ بصری قوت اسے نہ صرف اشیا کو فاصلے سے گرفت میں لینے اور یوں ایک وسیع تناظر کا احاطہ کرنے کے قابل بناتی ہے بلکہ انسان کے تخیل کو مہمیز لگا کر اس کی زد کو وسیع بھی کر دیتی ہے، اس حد تک کہ وہ پوری کائنات کا احاطہ کرنے کی طرف مائل ہو جاتا ہے۔

المیہ یوں کہ باصرہ کی فوری تسکین کے ذرائع میسر ہونے کے بعد انسانی تخیل کی کارکردگی کم ہونے لگتی ہے۔ مثال کے طور پر فلم کی آمد نے انسان کے تخیل کے راستے میں رکاوٹ سی کھڑی کر دی ہے، جب پردہ فلم پر کوئی متحرک تصویر آتی ہے تو ناظر کو اس بات کی فرصت ہی نہیں دیتی کہ وہ اس سے پیدا ہونے والے تلازمات کا ساتھ دے سکے بلکہ یا کہنا چاہیے کہ فلم ناظر کو اس طور اپنی گرفت میں لے لیتی ہے جیسے شمع پروانے کو اور وہ اس کے گرد ایک پابہ جولاں قیدی کی طرح طواف کرنے لگتا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ فلم خود ہی فلم بین کو ساری تفاصیل دکھانے کا اہتمام کرتی ہے اور اس کے تخیل کو متحرک ہونے کی اجازت تک نہیں دیتی۔ جنسی موضوعات کے سلسلے میں اس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ فلم بینی تخیل آفرینی کے بجائے ذہنی لذت کوشی کی صورت اختیار کر گئی ہے اور یوں جنسی جذبے کی براہ راست تسکین کے مواقع مہیا کر رہی ہے۔

اگر کوئی ادب پارہ خود کو فلم کی اس سطح تک محدود کرے اور اس اشاراتی یا علاماتی انداز کو اختیار کرنے کے بجائے جو تخیل سے ہمیشہ وابستہ رہا ہے جنسی واقعے کو اس کی صاف اور سپاٹ صورت میں پیش کرنے لگے تو اس کی حیثیت بھی ذہنی لذت کوشی سے مختلف نہ ہوتی۔ آج آزادیٔ اظہار کے نام پر ادب میں جنس کا موضوع جس سپاٹ اور براہ راست انداز میں داخل ہوا ہے، وہ فن کے تقاضوں کی صریحاً نفی ہے۔

مگر چوں کہ بیسویں صدی میں جنسی موضوعات سے بصری طور پر لطف اندوز ہونے کا رجحان روز افزوں ہے اس لیے ادب نے بھی (فلم کی طرح) جنسی مناظر کی فوٹوگرافی کا منصب اپنا لیا ہے نہ کہ تخیل آفرینی کا جو اس کا اصل منصب تھا۔ اس کا ایک کاروباری پہلو بھی ہے۔ جس شے کی طلب ہوگی، اس کی رسد بھی اس نسبت سے ہوگی۔ بصری لذت کی طلب نے ادیب کو بھی فحش تصویریں پیش کرنے پر مائل کر دیا ہے تاکہ فوری طور پر لوگوں کو ان کی طرف متوجہ بھی کیا جا سکے۔ مالی فائدہ بھی ہو اور خود اس کے لیے ذہنی لذت نوشی کا سامان بھی مہیا ہو جائے۔ لہٰذا جب میں یہ کہتا ہوں کہ عریانی اور فحاشی میں حد فاصل قائم کرنی چاہیے، نیز یہ کہ ادب کے لیے جنس بطور موضوع 'ٹابو' نہیں، وہاں مجھے اس بات پر بھی اصرار ہے کہ جب ادب، فلم یا فوٹوگرافی کی سطح پر اتر کر حقیقت نگاری اور آزادی اظہار کے نام پر محض جنسی لذت کے حصول کی طرف مائل ہوتا ہے تو اپنے اس منصب سے دست بردار ہوتا ہے جو تخیل آفرینی اور معنی خیزی کی بنیاد پر ہمیشہ سے قائم رہا ہے۔

ماخذ (اُردو۔۲۹)

ادب، جنس اور زندگی

سلیم اختر

ادب میں جنس اور اس کے مظاہر سے بیش تر اس اہم ترین حقیقت کا ذہن میں رکھنا لازم ہے کہ گو جنس ایک جبلت ہے لیکن یہ اپنی اثر آفرینی میں بوقلمونی کی بنا پر غدود کی کارکردگی اور اعضا کی فعالیت سے ماورا ہو کر قلب و ذہن اور روح و نظر کو بھی ایک خاص انداز میں متاثر کرتی ہے۔ ہر چند کہ جنس انسان کی زندگی اور کاروبار حیات کے کل میں ایک جزو ہے لیکن کارکردگی، اظہار اور تسکین کے لیے کسی جنسی مقصود کی بھی ضرورت ہے اس لئے یہ محض ذات سے بڑھ کر سماج کا مسئلہ بھی بن جاتا ہے پھر اس سے وابستہ آسودگی کے احساسات اس قدر شدید اور گھمبیر ہوتے ہیں کہ تمام انسانی شخصیت (مثبت یا منفی لحاظ سے) نہ صرف اس کے عمل میں شریک ہوتی ہے بلکہ اس کے نتیجے میں دیرپا نوعیت کے اثرات بھی اخذ کرتی ہے اس لیے جنس سے وابستہ امتناعات، تحریمات اور مذاہب کے اوامر و نہی کی فہرست کافی طویل ہی نہیں بلکہ بدلتے ہوئے تمدنی معاشرے، سماجی تقاضوں اور مذہبی تعلیمات کی روشنی میں اس میں کمی بیشی بھی ہوتی رہی ہے۔

ادب میں جنس کے اظہار کے ضمن میں بنیادی الجھن اس وقت جنم لیتی ہے جب ادب میں جنس نگاری اور فحش نگاری کو خلط ملط کر دیا جاتا ہے۔ جنس دونوں طرح کی تحریروں میں ہوتی ہے لیکن لکھنے والے کے مقاصد جداگانہ ہوتے ہیں جنس انسانی زندگی کے اہم ترین وقوعات میں سے ہے اس لیے زندگی کی ترجمانی کرتے وقت مصنف جنس اور اس سے وابستہ مختلف مظاہر کی تصویر کشی، لذت کے لیے نہیں بلکہ حقیقت نگاری اور واقعیت نگاری کی خاطر کرتا ہے، تو کیا اس سے یہ توقع بے جا نہ ہوگی کہ وہ جنس سے آنکھیں بند کر لے! یہ اس کی اپنے فن کے ساتھ غداری والی بات ہوگی۔ اس نوع کی تحریروں میں معیار ادبی حسن اور جمالیاتی حظ بنتا ہے۔ اگر اس معیار پر تخلیق اپنی پرکھ کرا لیتی ہے تو جنس نگاری کو عیب قرار نہیں دیا جا سکتا۔

فحش نگاری کے ساتھ ساتھ اگر ہم فحش لکھنے والوں کا جائزہ بھی لیں تو یہ دلچسپ حقیقت سامنے آتی ہے کہ ہمارے ہاں کے بعض معروف اہل قلم نے شوقیہ یا پیسے کی خاطر اس نوع کی تحریریں

لکھی ہیں۔ 'وہی وہانوی' اور اس کے پردے میں مشہور شخصیت سے تو سب ہی آگاہ ہیں۔ لیکن ایک مشہور شاعر نے مینا کماری کے نام سے 'سالگرہ' لکھی جس میں پاکستان کی تین معروف فلمی ممثلاؤں کے حوالے سے جنسی جذبات ابھارے گئے تھے۔ اس طرح سینہ بسینہ چلنے والی شاعری کے ضمن میں تو ایک سے بڑے ایک شاعر کا نام ملوث ہے' ان کا نام میں نہیں لیتا کہ بعض ناموں سے تو 'کتاب' کے صفحات جل اٹھیں گے۔

عالم صحرائی نے فحش نگاری کے سلسلے میں فرائڈ کے حوالے سے جو کچھ لکھا ہے وہ عام ادب سے وابستہ تخلیقی عمل کی تفہیم کے لئے لکھا تھا مگر انھوں نے ادب کی اساس نا آسودہ جنسی خواہشات پر استوار کی۔ لیکن ان کے پیش نظر بطور خاص فحش تحریریں نہ تھیں اس طرح یہ انداز نظر بھی کلیتاً درست نہیں کہ فحش تحریریں صرف معاشرتی دباؤ کے نتیجے میں جنسی گھٹن کی بنا پر معرض وجود میں آئی ہیں۔ اس میں جزوی صداقت ملتی ہے کہ 'پاتے نہیں جب راہ تو چڑھ جاتے ہیں نالے' کے مصداق انسانی شخصیت جنسی یا غیر جنسی ہر نوع کے دباؤ کے خلاف ردعمل کا اظہار کرتی ہے۔ یہی ردعمل فن کارانہ انداز میں ارتفاع کی صورت میں صحت مندی کے لئے ایک طرح سے سیفٹی والو کی حیثیت اختیار کر جاتا ہے۔ سویڈن' ڈنمارک' فرانس وغیرہ اور ان کے ساتھ ساتھ امریکا میں ہر طرح کی جنسی آزادی ملتی ہے لیکن اس ضمن میں یہی ممالک سب سے آگے بھی ہیں اور سویڈن اور ڈنمارک میں تو وہ کچھ لکھا جا رہا ہے اور ایسی ایسی فلمیں بن رہی ہیں کہ امریکا تک میں ان پر پابندی عائد کی جاتی ہے اس لیے فحش نگاری کو صرف جنسی گھٹن کے ساتھ مشروط نہیں کیا جا سکتا' گو یہ بھی اہم ترین وجوہات میں سے ایک ہے۔

فحش نگاری کے فروغ کا ایک اہم سبب کاروباری مقاصد کے لیے جنس کا استحصال ہے۔ سویڈن میں جب حکومت نے ہر نوع کا سنسر ختم کر دیا تو ملک میں فحش کتابوں' رسالوں' تصویروں اور فلموں کا جیسے سیلاب آ گیا لیکن جلد ہی لوگ سیر ہو گئے اور ان کی فروخت میں وہ تیزی نہ رہی۔ اب بھی وہاں یہ کاروبار وسیع پیمانے پر ہوتا ہے لیکن اب وہ تمام دنیا کو برآمد کرتے ہیں۔ جہاں تک پڑھنے والوں کا تعلق ہے تو مختلف طبائع کے لئے مختلف محرکات ہوتے ہیں اگر کچھ کے لیے ناکردہ گناہی کی تسکین پنہاں ہے تو کچھ اس سے عمر رفتہ کو آواز دیتے ہیں۔ بعض ان سے تہیج کا کام لے کر بیوی کے بستر میں جا گھستے ہیں تو بعض انھیں ہدایت نامہ سمجھتے ہیں۔ اخلاقی نقطہ نگاہ سے یہ سب برا ہو سکتا ہے لیکن نفسیاتی لحاظ سے یہ کوئی ایسا قبیح فعل نہیں ہے۔ ان کتابوں پر تیخ پا ہونے کی ضرورت نہیں کیوں کہ بیشتر صورتوں میں یہ محض تسکین کا ایک بے ضرر سا انداز ہے اور اگر ضرور کچھ ہوتا بھی ہے تو قہر درویش برجان درویش والی بات ہوتی ہے۔

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ قدغنیں عائد کرنے اور پہرہ بٹھانے سے معاشرہ میں کسی بھی رجحان، برائی، گناہ یا عادت کا خاتمہ نہیں کیا جا سکتا البتہ پابندیوں کی بناء پر چوری کا گڑ کچھ زیادہ ہی میٹھا معلوم ہوتا ہے اور نوجوان نسل گم راہ ہوتی ہے تو یہ محض ایک بے معنی مفروضہ ہے۔ انسانی اخلاق خراب ہونے کی چیز ہے، کیا فحش تحریروں سے قبل معاشرہ میں فرشتے بستے تھے! نہ جنس کو ختم کیا جا سکتا ہے اور نہ اس کی تسکین سے محروم رہ کر صحت مند زندگی بسر کی جا سکتی ہے۔ جس بے چارے کے پاس اور کچھ نہیں، اس کے ہاتھ سے کتاب تو نہ چھینو۔

ماخذ (اُردو ـ ۳۳)

ادب اور جبلی خواہشات

عالم صحرائی

فحش نگاری کے زمرے میں کون سی تحریر آتی ہے اور کون سی نہیں آتی' اس سوال کا جواب خاصا مشکل ہے۔ ادب اور نفسیات کے مطالعے کے بعد یہ بات پورے وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ 'فحاشی' یا 'عریانی' کی حیثیت محض اضافی ہے۔ ممکن ہے ایک شے کسی شخص کے لیے فحش ہو تو وہی شے کسی دوسرے شخص کے لیے فحش نہ ہو۔ اگر اس بات کو نفسیاتی طریقے سے دیکھا جائے تو یوں کہا جاسکتا ہے کہ کوئی تحریر اگر کسی شخص میں جنسی تہیج پیدا کرے اور اس کے لئے انگیخت کا باعث بنے تو وہ شے اس کے لیے فحش ہے' بصورت دیگر نہیں۔ اس بات کو اور جامع الفاظ میں یوں کہا جاسکتا ہے کہ ہر وہ تحریر جو جنسی جبلتوں میں ہیجان برپا کردے اور ان کے لئے انگیخت کا باعث بنے وہ فحش ہے۔ ایک بار ایک جج نے اپنے ایک فیصلے میں لکھا: 'فحش ادب وہ ہے جس سے جنسی خواہشات بیدار ہوں اور معاشرتی سطح پر ناقابل قبول خیالات اور جذبات میں انگیخت پیدا ہو'۔ اصل میں فحش ادب ایک قسم کا جنسی استحصال ہے۔ ایک بار ایک مصنف سے پوچھا گیا کہ فحاشی کیا ہے؟ تو اس نے برجستہ جواب دیا: 'اگر مصنف برائی کی تبلیغ کرے یا اس کی ہمدردیاں برے کرداروں کے ساتھ ہوں تو یہ فحاشی ہے لیکن اگر وہ برائی کو بے تعلقی کے ساتھ بیان کرے تو یہ فحاشی نہیں ہے'۔

'فحش ادب' ایک طویل بحث ہے۔ اس بحث سے قطع نظر ہم نے یہ دیکھنا ہے کہ فحش ادب ہماری کون سی جبلی خواہشات کی تسکین کرتا ہے! مصنف جب کچھ لکھتا ہے تو وہ حقیقتاً اپنے تخیلات کو صفحۂ قرطاس پر منتقل کر رہا ہوتا ہے۔ بالفاظ دیگر جس طرح ایک شخص ہوائی قلعہ تعمیر کرتا ہے یا خیالی پلاؤ پکاتا ہے بعینہٖ مصنف بھی اپنی تحریروں میں اپنے تخیلات میں کھویا ہوتا ہے۔ جنسی ادب یا فحش ادب کے سلسلے میں یوں کہا جاسکتا ہے کہ یہ ایسی جبلتیں ہیں جن کے اظہار کی کھلے بندوں اجازت نہیں۔ معاشرہ ہمیشہ ان کی حوصلہ شکنی کرتا ہے ہماری یہ جبلتیں اکثر وبیش تر ناآسودہ رہتی ہیں۔ اس زاویے سے اگر دیکھا جائے تو مصنف اپنی ان ناآسودہ خواہشات کو لکھ کر ایک قسم کا سکون حاصل کرتا ہے۔ تخیلات ہماری زندگی کا جزو لاینفک ہیں۔ ہم ہر خواہش کی تکمیل نہیں کرسکتے چنانچہ ناآسودہ خواہشات کی تسکین کے لئے ہم تخیلات کا سہارا لیتے ہیں ان خواہشات میں سرفہرست جنسی خواہشات ہیں۔

فرائڈ کا کہنا ہے کہ تخیلات کی کثرت ان لوگوں میں زیادہ ہوتی ہے جو معاشی، سماجی یا جنسی لحاظ سے نا آسودہ ہوتے ہیں یا سماجی مقام حاصل کرنے میں ناکام رہتے ہیں۔ چناں چہ مصنف انہی جبلتوں کی تسکین کرتا ہے۔ اس کی تحریروں کے تجزیے کے بعد ہم بخوبی یہ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ اس کی شخصیت کے کون سے پہلو زیادہ تشنہ ہیں۔ تحریروں میں تخیلات کی کثرت، 'دن سپنوں' کی بہتات اور جنسی جبلت کا واضح اظہار اعصابیت کو ظاہر کرتا ہے اگر یہ حالت بہت زیادہ بڑھ جائے تو فرد حقائق کی دنیا سے کٹ جاتا ہے اور محض تصوراتی دنیا کا ہو کر رہ جاتا ہے۔ تصوراتی دنیا' تخیل نگاری میں تو شاید مدد ہو' لیکن حقائق کے ساتھ مطابقت میں کوئی مدد نہیں دے سکتی۔ مشاہدے کے بعد یہ بات ہمارے سامنے آئی ہے کہ ایسا فرد جو خود کو حالات سے نبرد آزمانہ کر سکے وہ یا تو اپنی خواہشات کو خوابوں کی شکل میں پورا کرتا ہے یا پھر دن سپنوں یا تخیلات میں کھو جاتا ہے۔ تخیلات کی طرح دن سپنے بھی حقیقت سے فرار ہی کی ایک شکل ہیں۔ دن سپنوں کی واضح مثال ہمیں شیخ چلی کے کردار میں ملتی ہے۔

بھوک اور جنس دونوں انسان کی بنیادی جبلتوں میں سے ہیں۔ انسان ان کی ہر رنگ میں تسکین چاہتا ہے مگر تسکین کے ذریعے مختلف ہو سکتے ہیں۔ ادب جہاں ہماری جمالیاتی حسیات کی تسکین کرتا ہے وہاں ہماری جنسی جبلت کی تسکین بھی کرتا ہے۔ جنسی یا ہیجانی جبلت کی تسکین کے بارے میں نظریات مختلف ہو سکتے ہیں لیکن ان میں ایک قدر مشترک ضرور ہے اور وہ یہ کہ جنسی یا فحش ادب کے مطالعے سے جنسی تسکین ہوتی ہے خواہ وہ کتنی ہی کم کیوں نہ ہو۔ حال ہی میں امریکا میں ایک نئی تحقیق ہوئی ہے۔ جس میں جنسی ادب کا مطالعہ کرنے والوں سے پوچھا گیا تھا کہ اس سلسلے میں ان کی کس حد تک تسکین ہوتی ہے۔ جن لوگوں سے یہ سوال کیا گیا ان کی اکثریت پہلے تو جواب دینے سے کتراتی رہی لیکن جب انھیں مجبور کیا گیا تو ان میں سے صرف تیس فی صد لوگوں نے بتایا کہ ان کی معمولی سی تسکین ہوتی ہے۔ ستر فی صد نے کہا کہ جنسی ادب کے مطالعے سے تسکین تو نہیں ہوتی البتہ انگیخت ضرور ہوتی ہے۔ اس سلسلے میں مجھے بذاتِ خود متعدد ایسے لوگوں سے ملنے کا اتفاق ہوا ہے جو جنسی ادب کے بہت زیادہ دلدادہ ہیں اور فحش لٹریچر بلیک مارکیٹ میں خرید کر پڑھتے ہیں۔ ان لوگوں نے ملاقات کے دوران بتایا کہ ان کی جنسی تسکین قطعاً نہیں ہوتی' البتہ انگیخت ضرور ملتی ہے بعد ازاں یہی انگیخت جلق کا باعث بنتی ہے انھوں نے بتایا کہ جلق کا انحصار انگیخت کی شدت پر ہے یعنی جتنی زیاہ انگیخت ہوگی اتنی زیادہ تسکین ہوگی۔

نفسیات دانوں نے جنسی یا فحش ادب کی تخلیق کے محرکات پر بحث کرتے ہوئے جو نتائج اخذ کیے ہیں ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ فحش ادب ہمیشہ جنسی گھٹن کے دور میں پیدا ہوتا ہے۔ جنسی ملاپ کے مواقع جتنے کم ہوتے ہیں یا ان کا حصول جتنا مشکل ہوتا ہے فحش ادب اسی کثرت سے پیدا ہوگا۔ فحش

ادب کی پیداوار اور اس کے مطالعے کا ایک ہی مقصد ہے اور وہ ہے جنسی گھٹن کا اخراج۔ تخلیق کار اپنی دبی ہوئی جنسی خواہشات کا اخراج تو کرتا ہی ہے، قاری بھی خود کو مصنف کے ساتھ ذہنی طور پر وابستہ کر کے اس عمل میں شریک ہو جاتا ہے۔ فحش ادب ایک قسم کا اظلال ہوتا ہے یعنی تخلیق کار اپنی دبی خواہشات کو کسی اور کے سر منڈھ دیتا ہے اور اس طرح وہ جو خود کرنا چاہتا ہے، ناول یا افسانے میں کسی اور کردار سے کرواتا ہے۔ ادب میں جو کردار پیش کیے جاتے ہیں ان کی مثال تو ان کٹھ پتلیوں کی ہوتی ہے جن کی تاریں مصنف کے اپنے ہاتھ میں ہوتی ہیں اور وہ انھیں اپنی مرضی کے مطابق جنبش دیتا ہے۔

فحش نگاری یا جنسی ادب کی تخلیق میں مصنف تنہا ذمے دار نہیں۔ کوئی لفظ یا تحریر فی ذاتہ نہ تو فحش ہوتی ہے اور نہ اس پر عریانی کا لیبل چسپاں کیا جا سکتا ہے۔ اصل میں جنسی یا ہیجانی انگیخت میں تحریر یا الفاظ کی بجائے ہمارے ماضی کے تجربات اور تلازمے زیادہ اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ ہم تحریر کو اپنے تجربات کی روشنی میں دیکھتے ہیں اور پھر اس پر فحش یا غیر فحش کا لیبل لگاتے ہیں۔ پچھلے دنوں ایک مختصر افسانہ نظر سے گزرا۔ اسے یہاں مثال کے طور پر پیش کرتا ہوں۔ 'لڑکی نے کپڑے پہنتے ہوئے کہا' جاوید! تم نے اچھا نہیں کیا'۔ یہ مختصر سا افسانہ اس کے لئے جنسی تہیج کا کام دے سکتا ہے، لیکن اس کے برعکس اگر وہ اس عمل سے نہیں گزرا تو اس کے لیے اس افسانے میں کوئی جنسی محرک یا ہیجانی انگیخت نہیں ہوگی۔

فحش ادب یا جنس نگاری میں ایک اور شے بہت اہم کردار ادا کرتی ہے۔ یونگ اس تعقل کو 'تصویر زن' کا نام دیتا ہے۔ تصویر زن سے اس کی مراد یہ ہے کہ ہر مرد کے ذہن میں عورت کے بارے میں ایک تصویر ہوتی ہے۔ وہ زندگی بھر اس عورت کی تلاش میں رہتا ہے۔ اس نے تصویر زن کے چار پہلو بتائے ہیں۔ ماں، بہن، بیوی اور ایک اور۔ تصویر زن کے پہلے تین مراحل تو آسانی سے طے ہو جاتے ہیں لیکن آخری مرحلہ زندگی بھر طے نہیں ہوتا کیوں کہ اس کا چوتھا پہلو نہایت مبہم ہوتا ہے ایک دھندلی سے تصویر تو ہمہ وقت ذہن کے آنگن میں بھٹکتی رہتی ہے لیکن چوں کہ اس کا کوئی واضح تصور نہیں ہوتا اس لئے فرد زندگی بھر اضطرابی کیفیت سے دوچار رہتا ہے۔ یہی وہ دھندلی سی تصویر ہے جو ہمارے ادب، شاعری، موسیقی اور دیگر فنون لطیفہ میں قلانچیں بھرتی رہتی ہے لیکن اگر اس اضطرابی کیفیت میں شدت آ جائے تو فرد کج رو ہو جاتا ہے اور ادب میں حسن و لطافت کی بجائے کثافت اور جنسی پراگندگی شروع ہو جاتی ہے۔ اگر بہ نظر غائر دیکھا جائے تو فحش ادب ہمارے کثیف جذبوں کی نکاس کرتا ہے اور بقول منٹو ہماری بہتری اسی میں ہے کہ ہم ان بدروؤں کو بند نہ کریں کیوں کہ اگر انھیں بند کر دیا گیا تو جنسی تعفن سے پورا معاشرہ کثیف ہو جائے گا۔

ماخذ (اُردو۔۹۵،

نیا ادب

رشید احمد صدیقی

ابوالاعلیٰ مودودی

ماہر القادری

جسٹس (ریٹائرڈ) ڈاکٹر جاوید اقبال

عزیز احمد

ممتاز شیریں

اُوپندر ناتھ اشک

سید سجاد ظہیر

سردار جعفری

سید احتشام حسین

ممتاز حسین

دین محمد تاثیر

آل احمد سرور

فیض احمد فیض

سعادت حسن منٹو

عصمت چغتائی

احمد ندیم قاسمی

rekhta

rekhta

‘نئے’ ادب کے تار و پود

رشید احمد صدیقی

‘نئے’ ادب کے تار و پود کو مدِ نظر رکھ کر ان مضامین کا جائزہ لیا جائے جو نیا ادب پیش کرتا ہے تو پہلی بات یہ نظر آئے گی کہ نوجوان مرد یا عورت کے سامنے زندگی بحیثیت مجموعی نہیں ہوتی بلکہ اس کا صرف ایک پہلو ہوتا ہے یعنی جنسی اشتہا کی تسکین کیوں کر ہو! بقولِ غالب کہ ‘اگر نہ ہو تو کہاں جائیں’ ہو تو کیوں کر ہو! آخر شعر و ادب کا مستقل موضوع جنسی جذبے کی تسکین یا نمائش کیوں ہو! اس جذبے کا میں قائل ہوں لیکن اس حد تک نہیں کہ اس کو زندگی اور زندگی کی اعلیٰ سرگرمیوں کا بجائے خود ماحصل قرار دے دیا جائے۔ اس جذبے کو ضرورت سے زیادہ اہمیت دینے سے انسان کے اعلیٰ فضائل اور اس کی کارکردگی ماند پڑ جاتی ہے۔ نوجوانوں میں جو اس وقت ایک طرح کی درماندگی اور بیزاری ملتی ہے اس کا سبب بڑی حد تک یہی ہے کہ انھوں نے جنسی جذبے کو بہت اہمیت دے رکھی ہے اور جوانی کو صرف جنسی میلانات و مطالبات کا مترادف سمجھ لیا ہے۔ اسی نشے میں وہ اپنی ہر طرح کی الجھنوں اور کلفتوں کو بھلاتے رہتے ہیں۔ اس کا ردِ عمل زندگی کے اعلیٰ مقاصد کو ان کی نظروں میں بے نور بنا دیتا ہے۔ وہ زندگی کی ذمے داریوں اور صعوبتوں کا سامنا کرنے کے قابل نہیں رہ جاتے اور زندگی کی اعلیٰ قدروں کا احترام کرنے سے معذور ہو جاتے ہیں۔ جوانی کا نوحہ جس طرح اور جس شدت سے اردو شعرا بالعموم اور ‘نئے’ ادب کے پیرو بالخصوص کرتے ہیں، اس کی مثال کسی دوسری قوم یا کسی دوسرے شعر و ادب میں نہ ملے گی۔ جوانی کا یہ تصور اور جوانی کے ساتھ یہ سلوک میرے نزدیک سفاکی اور بزدلی ہے۔

نئے ادب میں جنسی ترغیبات آخر اس درجہ دخیل کیوں ہو گئی ہیں! غالباً اس کا سبب یہ ہے کہ اس جذبے کی تسکین میں خواہ وہ کسی نوعیت کی ہو بڑی لذت ہے اور یہ لذت آسانی سے سستے داموں مل جاتی ہے۔ اس سے شعر و ادب میں شہرت پانے کے مواقع جلد اور آسانی سے مل جاتے ہیں، ایسی شہرت جس کا مدار تمام تر گاہک کی کمزوری پر ہے، مال کی خوبی پر نہیں۔ اس کی مثال ایک چالاک باورچی کی ہے جو کھانے میں مرچیں تیز کر دیتا ہے اور برف کا پانی مہیا کر دیتا ہے تاکہ مرچ کی تیزی سے کھانے کے بھلے برے ہونے کی تمیز نہ ہو سکے اور مرچ کی تیزی رفع کرنے کی خاطر بار بار پانی زیادہ پیا جائے تو کھانا کم کھایا جائے۔

جس طرح اخبارات میں ہم قتل کی خبر سنتے ہیں تو معاً خیال آتا ہے کہ عورت تو بیچ میں نہیں ہے اور اکثر و بیشتر یہ اندیشہ صحیح ثابت ہوتا ہے، اسی طرح نئے ادب کا کوئی افسانہ یا نظم آپ پڑھنا شروع کریں تو آپ کو عورت کہیں نہ کہیں، کسی نہ کسی شکل میں ضرور نظر آ جائے گی۔ عورت ہی کے گرد افلاس، انقلاب، دہریت، بیزاری اور بدتوفیقی کی داستانیں پھیلی ہوں گی یا افلاس و انقلاب وغیرہ میں عورت پیوست ملے گی۔ بجائے خود یہ مضامین ایسے ہیں جن میں بیزار، مایوس الحال اور کم پڑھے لکھے ادیبوں، شاعروں اور ان سے زیادہ گئے گزرے سامعین یا قارئین کے لیے بڑی کشش ہے۔

آپ نے گلیوں اور سڑکوں پر عطائیوں کو دوائیں بیچتے دیکھا ہوگا، تفریحاً ان کا خطبۂ صدارت بھی ناگفتنی امراض و ناشدنی تجربات پر تھوڑی دیر تک ضرور سنا ہوگا۔ ظاہر ہے یہ بزرگ کیا ہیں، کیسے ہیں اور ان کے تجربات کی کیا حیثیت ہے، لیکن وہ جن امراض کے نام سے اپیل کرتے ہیں یا جن طاقتوں کے عود کر آنے کی بشارت دیتے ہیں، ان میں کوہ ندا جیسی کشش ہے، اس لیے کہ بقول ایک ستم ظریف "ہم ہوئے، تم ہوئے کہ میر ہوئے۔ انھیں مرضوں کے سب اسیر ہوئے۔"

لکھنے والے انھیں باتوں پر اکتفا نہیں کرتے، وہ اپنی ناگفتنی کو بھی بڑے شوق سے اور مزے لے لے کر بیان کرتے ہیں۔ بتایا یہ جاتا ہے کہ اس سے مصنف خود اپنی تحلیل نفسی پیش کرتا ہے۔ اس تحلیل نفسی کے شوق میں وہ ایسی ایسی مکروہ باتیں خود اپنے بارے میں لکھ جاتا ہے جن کو سن کر طبیعت مالش کرنے لگتی ہے۔ یہ بات بھی بڑے لوگوں سے لیکن مسخ ہو کر ان تک پہنچی ہے، جس طرح یورپ کے مطلق العنانوں نے ہمارے چھوٹے بڑوں میں فرعونیت پیدا کر دی ہے، اسی طرح بعض بڑے لوگوں نے جو اپنی خودنوشت سوانح حیات لکھی ہیں، ان کی ریس میں یہ نوجوان ان گھناؤنے واقعات کو پیش کرتے ہیں جو کبھی یا اوائل عمر میں ان کو پیش آئے تھے۔ اس کا اثر ہمارے ادب اور سوسائٹی دونوں پر بہت برا پڑ رہا ہے۔ اسے نفسیاتی تحلیل نہیں، ماؤف و متعفن ذہنیت کی نمائش کہتے ہیں۔ یہ محض اپنی شخصیت اور انشا پردازی کا پروپیگنڈا ہے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے کوئی فقیر، تضرع اور لجاجت میں اثر نہ پا کر، اپنے پوشیدہ سڑے گلے زخموں کی نمائش کرے اور لوگ ترس کھا کر نہیں تو بدحواس و بدحظ ہو کر اسے کچھ دے دلا دیں۔ یہاں بھی یہ عذر پیش کیا جائے گا کہ سوسائٹی میں یہ گھناؤنی باتیں ملتی ہیں اس لیے ان کے جتانے بتانے کی ضرورت ہے۔ مگر کوڑھی اور اس طرح کے لوگوں کے لیے میونسپل قوانین اور میونسپل انتظامات بھی ہیں، یعنی یہ آبادی سے دور رکھے جائیں اور گلی کوچوں میں گھومنے پھرنے نہ دیے جائیں۔

اس لیے میرا خیال ہے کہ اس طرح کے مضامین شعر و ادب میں نہیں بلکہ اسپتالوں کی فائلوں میں رکھے جائیں جن سے ڈاکٹرز کو فائدہ پہنچے، ہندوستان کو نقصان نہ پہنچے۔ اعتراف گناہ بالعموم گناہ سے تائب ہونے کے لیے کیا جاتا ہے نہ یہ کہ گناہ کو گناہ کا عذر بتایا جائے۔

فحاشی اور عریاں نگاری میرے نزدیک فن نہیں، بدکرداری ہے۔ اس عیب سے قدیم اردو شعرا کا دامن بھی پاک نہیں ہے۔ عربی فارسی کا بھی یہی حال ہے، لیکن گزشتہ اور موجودہ میں ایک فرق بھی ہے۔ پرانے شعرا فحاشی کو فحاشی ہی سمجھتے تھے، ادب زندگی یا آرٹ نہیں سمجھتے تھے۔ پھر یہ کیا ضرور ہے کہ جو بات نامعقول ہو، وہ اس لیے معقول ہو جائے کہ اس کے مرتکب پہلے بھی گزرے ہیں!۔ فحاشی کو کبھی نہیں سراہا گیا ہے۔ یورپ میں بعض مشہور مصنف ایسے گزرے ہیں جنھوں نے جنسیات پر مستقل تصانیف شائع کی ہیں۔ بعضوں نے اپنا نقطۂ نظر طبی (فنی) رکھا ہے، اور بعضوں نے ناول اور افسانے کے پیرائے میں جنسیاتی مسائل پر بحث کی ہے۔ لیکن یہ بات اپنی جگہ پر مسلم ہے کہ ان لوگوں کا نقطۂ نظر وہ نہیں ہوتا جو ہمارے ادیبوں کا ہے اور نہ وہ ان مسائل کو اس بے ہودگی اور بھونڈے پن سے پیش کرتے ہیں جیسا ہمارے ہاں دیکھنے میں آتا ہے۔

انشا پردازی میں یورپ کے مصنفین یقیناً ہم سے بہت بلند ہیں، ان کے ہاں بڑا سخت مقابلہ ہے۔ دوسرے درجے کا مصنف وہاں تمام عمر نہیں پنپتا۔ یورپ میں ہر فن کے باکمال سوسائٹی میں موجود ہوتے ہیں۔ چناں چہ ہر شخص کوئی چیز پبلک میں پیش کرتا ہے وہ پوری تیاری سے پیش کرتا ہے اور سمجھتا ہے کہ اس پر 'پہنچے ہوؤں' کی ایکسرے جیسی نگاہیں پڑیں گی۔ 'کاتا اور لے دوڑے' کا وہاں گزر نہیں۔ یورپ والوں پر زندگی کے ہر سمت سے حملے ہوئے ہیں اور انھوں نے زندگی کا ہر حربے سے مقابلہ کیا ہے۔ اس حملے اور مقابلے سے ان کی زندگی کا کوئی پہلو خالی نہیں ہے۔ اس سے ان کی نظر میں گہرائی، شعر و ادب میں صلابت اور شائستگی اور فن میں پختگی اور معنویت آ گئی ہے۔ انھوں نے زندگی کو کسی واسطے سے دیکھا یا پرکھا نہیں ہے بلکہ زندگی کے آشوب سے ان کا براہ راست سابقہ رہا ہے۔ اس لئے میرا خیال ہے کہ سہل، سطحی اور تفریحی امور میں یورپ کی پیروی کرنا اور اس کی ریاضتوں سے منہ موڑنا ہمارے لیے کسی طرح جائز نہیں۔ یہ ہمارے لیے نہایت درجہ خطرناک ہے۔

جو لوگ لکھنے کے ہنر سے واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ ایک ہی بات کو اول درجے کا انشا پرداز لکھے گا تو وہ کیا چیز ہوگی اور اسی چیز کو دوسرے اور تیسرے درجے کے انشا پرداز لکھیں گے تو وہ کیا ہو جائے گی، نہ صرف پرداخت کے اعتبار سے بلکہ اثر کے اعتبار سے بھی۔ یورپ کی ہر قسم کی تصانیف کا تھوڑا بہت حصہ میری نظر سے گزرا ہے۔ اردو تصانیف کا تھوڑا ہی حصہ ایسا ہوگا جو میری نظر سے نہ گزرا ہو۔ بحیثیتِ مجموعی دونوں میں بڑا فرق ہے، دونوں کی ذہنی سطح میں بیّن تفاوت ہے۔ ہر ملک کے آئین کا مدار اس ملک کے باشندوں کے آئینی احساس یا شعور پر ہوتا ہے، مثلاً وحشیوں کو پارلیمنٹری اداروں کی اہمیت کا اندازہ نہیں ہو سکتا۔ یہی اصول شعر و ادب کا ہے۔ ایسے لوگوں کو جو اپنے نفس یا قلم پر قابو نہیں رکھ سکتے، سوشل ذمے داریوں کا احساس نہیں رکھتے، ان کو کچھ اور نہیں تو جنسیات جیسے نازک اور پرخطر

مضامین و مسائل پر اظہار خیال کی اجازت نہیں ہونی چاہیے۔ درندوں یا جراثیم کو انھیں لوگوں کی نگرانی میں دینا چاہیے جو ان پر اور اپنے آپ دونوں پر قابو پانے یا رکھنے کے اہل ہوں۔

ہندوستانی سینما اور تھیٹرز کے بارے میں عام طور پر کہا جاتا ہے کہ ادب اور معاشرت کی ترقی میں یوں مفید نہیں ہیں کہ یہ کمپنیاں خدمت نہیں کرنا چاہتیں، روپے کمانا چاہتی ہیں۔ عوام کی سیرت اور ذوق کو سدھارنے، سنوارنے سے ان کو کوئی سروکار نہیں، جو مصنف ان کمپنیوں کے لیے کوئی چیز تصنیف کرتے ہیں، وہ عوام کی سطح پر اترنے کے لیے مجبور ہوتے ہیں اور چار و ناچار وہی کرتے ہیں جو سینما تھیٹرز کے منیجر چاہتے ہیں۔ بے تکے قصے، مہمل زبان، چٹ پٹے اشعار مطربی و مسخرگی، بوس و کنار، دھول دھپا، توڑ پھوڑ، گالی گلوچ، غرض اسی قسم کی خرافات، کہیں کم کہیں زیادہ۔ اکثر نئے شاعر اور ادیب بھی اسی پر اتر آئے ہیں اس لیے کہ اس میں نفع ہے۔ چوں کہ عوام اسی قسم کی چیزوں سے خوش ہوتے ہیں، اس لیے ان سے اسی طور پر نفع کمایا جا سکتا ہے۔ عوام سستی اور کافی مسکرات چاہتے ہیں، ادیب سستی اور کافی شہرت چاہتا ہے، ’ما بخیر شما بسلامت‘۔

’کوئی حرف گیری کرے تو کہتے ہیں، ہم جمہور کے آدمی ہیں، جمہور کے لیے ہیں اور جمہور ہی کی تفریح یا تعلیم کا سامان بہم پہنچاتے ہیں، ’بورژوا‘ سے ہم کو کوئی سروکار نہیں بلکہ ہم اس کا قلع قمع کر دینا سب سے بڑی خدمت سمجھتے ہیں۔ اگر اصلاحِ عوام اسی کو کہتے ہیں تو پھر بڑے بڑے صنعتی شہروں میں کیا برائی ہے جہاں کارخانوں ہی سے قریب شراب خانے اور قحبہ خانے ہوتے ہیں، جہاں شام کو تھکے ہارے مزدور دن بھر کی مزدوری شاہد و شراب کی نذر کر دیتے ہیں، اور دنیا مافیہا سے بے خبر ہو جاتے ہیں۔ ان معصوم یا مریض ادیبوں کو کون بتائے کہ عوام آپ کی نفسیاتی تحلیل کو نہیں سمجھ سکتے‘ وہ نفسیاتی ترغیب کی زد میں ہوتے ہیں۔ مزدور اور اہلِ حرفہ کو نہ اتنی فرصت ہوتی ہے اور نہ اتنی استعداد کہ وہ آپ کے افسانوں یا نظموں کے چھپے ہوئے کمالات پر غور کر سکیں یا بقول غالب ع ’آستین میں دشنہ پنہاں، ہاتھ میں نشتر کھلا‘ کے رمز سے کبھی واقف ہو سکیں۔ وہ تو صرف شراب اور عورت کو دیکھتے ہیں جن سے آپ کا کلام ملوث یا مزین ہوتا ہے۔

انقلاب دوستی یا ترقی پسندی کے یہ معنی کب ہوئے اور کیوں کر ہوئے کہ فسق و فواحش اور قتل و غارت گری ہی زندگی کا حاصل ہے! یہ کیسا آرٹ ہے، کون سا ادب ہے اور کس قماش کی زندگی ہے جس کا مرکزی اور بنیادی تصور، فساد و فحاشی ہو! لکھنے کا کام میں نے بھی کیا ہے اور اس وادی کے بہت سارے نیچ اونچ اور پیچ و خم سے گزرا ہوں اور اب بھی گزر سکتا ہوں۔ میرے جیسے اور مجھ سے بہتر لوگ بھی موجود ہیں۔ میں نے انشا پردازی کی پیغمبری اور پتّے بازی دونوں دیکھی ہیں اور دونوں کو سمجھتا

ہوں۔ فحاشی اور عریاں طرازی نہ کوئی ادب ہے نہ کوئی آرٹ، اور نہ کوئی زندگی۔ میں ادب، آرٹ اور زندگی سب کو علاحدہ علاحدہ اور بحیثیت مجموعی بھی صرف سلیقہ، شرافت اور سرفروشی سمجھتا ہوں، حسن بن صباحیت نہیں قرار دیتا، (حسن بن صباحیت کی ترکیب پر نہ جائیے، حسن بن صباح سے ڈریے) کہ آپ نوجوانوں کو سستا اور تیز نشہ پلا کر مصنوعی جنت کی سیر کرائیں اور چن چن کر بھلے مانسوں کا قلع قمع کرادیں۔ صوفیائے کرام ہی نہیں، انشا پرداز اور شاعر کے ہاں بھی شریعت اور طریقت کی کارفرمائی ہے۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ جس طرح نام نہاد صوفیہ نے 'شریعت' کو نظرانداز کر کے 'طریقت' کو فروغ دیا ہے اور اس طرح تصوف کو رسوا کیا، اسی طرح جدید ادب کے اکثر حامیوں نے انشا پردازی کی شریعت سے منہ موڑ کر صرف طریقت کو فروغ دیا اور انشا پردازی کی آبروریزی کی۔

میرا عقیدہ ہے کہ فحش ہی نہیں، ہر بات اس طور پر کہی جاسکتی ہے کہ مذاق سلیم پر بار نہ ہو اور کسی کے دل پر ٹھیس نہ لگے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں شاعر اور غیر شاعر، ادیب اور غیر ادیب ایک دوسرے سے علاحدہ اور ایک دوسرے سے ممتاز ہوجاتے ہیں۔ شاعر کا کمال یہی نہیں ہے کہ وہ ایسی بات کہے جہاں دوسروں کا ذہن نہ پہنچ سکا ہو، اس کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ وہ اس بات کو اس انداز سے اور ایسے موقع پر کہے کہ وہ بات اس سے بہتر طور پر کہی یا پیش نہ کی جاسکتی ہو۔ یہ بات نہ ہوتی تو سوسائٹی میں شاعر کو وہ درجہ نصیب نہ ہوتا جس پر بجا طور پر وہ ہمیشہ سے فائز رہا ہے۔

محض بر بنائے مثال قاضی عبدالغفار کی مشہور تصنیف 'لیلیٰ کے خطوط' اور سعادت حسن منٹو کے افسانے لے لیجیے۔ میں دونوں کو ترقی پسند ادیبوں کے زمرے میں رکھتا ہوں۔ سوسائٹی میں جنسی اشتہا کی تسکین کا جو وسیلہ عورت کو قرار دیا گیا ہے، اس کو دونوں بیان کرتے ہیں۔ قاضی عبدالغفار عورت کی روح کا کرب اور اس کی بغاوت بن کر ہمارے سامنے آتے ہیں اور جو چیز پیش کرتے ہیں اس میں آرٹسٹ کا 'لہو ترنگ' یا 'رنگ' جھلکتا ہے۔ منٹو عورت کے بیان میں لذت محسوس کرتے ہیں۔ وہ عورت کی زبونی اور درماندگی سے اپنی انشا پردازی کی دکان سجاتے ہیں۔ کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے وہ مشتبہ متاع 'چور بازار میں بیچنا بھی چاہتے ہیں اور اسی نوعیت کا مال چور بازار سے خرید کر اصلی بازار میں لانا چاہتے ہیں۔ آپ نے بعض بزرگوں کو دیکھا ہوگا، وہ ایک فرضی یتیم خانے کے نام سے چھوٹے چھوٹے بچوں کو پھٹے پرانے کپڑے پہنا کر اور فلاکت و بے بسی کا سوانگ رچا کر، کوچہ و بازار میں لیے پھرتے ہیں، کہیں خود روتے گاتے ہیں اور کہیں ان بچوں کو رلاتے گواتے ہیں۔ یتیم اور یتیمی کی اس نمائش کا مقصد صرف نفع کمانا ہوتا ہے نہ یہ کہ ان غریبوں کی حالت کو بہتر بنایا جائے۔

ماخذ (اردو۔ ۳۲)

نام نہاد ادب

ابو الاعلیٰ مودودی

سب سے پہلے (ترقی پسندوں کے) لٹریچر کو لیجیے جو دماغوں کو تیار کرنے والی سب سے بڑی طاقت ہے۔ اس نام نہاد ادب ’دراصل بے ادبی‘ میں پوری کوشش اس امر کی جارہی ہے کہ نئی نسلوں کے سامنے اس نئے اخلاقی فلسفے کو مزیدار بنا کر پیش کیا جائے اور پرانی اخلاقی قدروں کو دل اور دماغ کے ایک ایک ریشے سے کھینچ کر نکال ڈالا جائے۔ مثال کے طور پر میں یہاں اردو کے نئے ادب سے چند نمونے پیش کروں گا۔ ایک مشہور ماہ نامے میں ’جس کو ادبی حیثیت سے اس ملک میں کافی وقعت حاصل ہے‘ ایک مضمون شائع ہوا ہے ’جس کا عنوان ہے‘ ’شیریں کا سبق‘۔ صاحب مضمون ایک ایسے صاحب ہیں جو اعلیٰ تعلیم یافتہ‘ ادبی حلقوں میں مشہور اور ایک بڑے عہدے پر فائز ہیں۔ مضمون کا خلاصہ یہ ہے کہ نوجوان صاحب زادی اپنے استاد سے سبق پڑھنے بیٹھی ہیں اور درس کے دوران میں اپنے ایک نوجوان دوست کا نامہ محبت استاد کے سامنے بغرض مطالعہ و مشورہ پیش فرماتی ہیں۔ اس ’دوست‘ سے ان کی ملاقات کسی ’چائے پارٹی‘ میں ہوگئی تھی۔ وہاں کسی لیڈی نے تعارف کی رسم ادا کردی، اس دن سے میل جول اور مراسلت کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ اب صاحب زادی یہ چاہتی ہیں کہ استاد جی ان کو اس دوست کے محبت ناموں کا ’اخلاقی جواب‘ لکھنا سکھا دیں۔ استاد کوشش کرتا ہے کہ لڑکی کو ان بے ہودگیوں سے ہٹا کر پڑھنے کی طرف راغب کرے۔

لڑکی جواب دیتی ہے کہ ’پڑھنا میں چاہتی ہوں مگر ایسا پڑھنا جو میرے جاگتے خوابوں کی آرزوؤں میں کامیاب ہونے میں مدد دے۔ نہ ایسا پڑھنا جو مجھے ابھی سے بڑھیا بنا دے‘۔ استاد پوچھتا ہے، ’کیا ان حضرت کے علاوہ تمھارے اور بھی کچھ نوجوان دوست ہیں!‘، لائق شاگرد جواب دیتی ہے، ’کئی ہیں‘ مگر اس نوجوان میں یہ خصوصیت ہے کہ بڑے مزے سے جھڑک دیتا ہے۔‘، استاد کہتا ہے کہ، ’اگر تمھارے ابا کو تمھاری اس خط و کتابت کا پتا چل جائے تو کیا ہو!‘ صاحب زادی جواب دیتی ہے، ’کیا ابا نے شباب میں اس قسم کے خط نہ لکھے ہوں گے، اچھے خاصے فیشن ایبل ہیں۔ کیا تعجب ہے اب بھی لکھتے ہوں، خدانہ خواستہ بوڑھے تو نہیں ہوگئے ہیں۔‘ استاد کہتا ہے۔ ’اب سے پچاس برس پہلے تو یہ خیال بھی ناممکن تھا کہ کسی شریف زادی کو محبت کا خط لکھا جائے۔‘ شریف زادی صاحبہ جواب میں فرماتی ہیں،

'تو کیا اس زمانہ کے لوگ صرف بدذاتوں سے ہی محبت کرتے تھے! بڑے مزے میں تھے اس زمانے کے بدذات اور بڑے بدمعاش تھے اس زمانے کے شریف۔' 'شیریں' کے آخری الفاظ' جن پر مضمون نگار نے گویا اپنے ادیبانہ تفلسف کی تان توڑی ہے' یہ ہیں: 'ہم لوگوں (یعنی نوجوانوں) کی دہری ذمے داری ہے' وہ مسرتیں جو ہمارے بزرگ کھو چکے ہیں زندہ کریں' اور وہ غصہ اور جھوٹ کی عادتیں جو زندہ ہیں انھیں دفن کردیں۔'

ایک اور نام ور ادبی رسالے میں اب سے ڈیڑھ سال پہلے ایک مختصر افسانہ 'پشیمانی' کے عنوان سے شائع ہوا تھا جس کا خلاصہ سیدھے سادھے الفاظ میں یہ تھا کہ ایک شریف خاندان کی بن بیاہی لڑکی ایک شخص سے آنکھ لڑاتی ہے' اپنے باپ کی غیر موجودگی' اور ماں کی لاعلمی میں اس کو چپکے سے بلا لیتی ہے۔ ناجائز تعلقات کے نتیجے میں حمل قرار پا جاتا ہے۔ اس کے بعد وہ اپنے اس ناپاک فعل کو حق بجانب ٹھہرانے کے لیے دل ہی دل میں یوں استدلال کرتی ہے: 'میں پریشان کیوں ہوں، میرا دل دھڑکتا کیوں ہے، کیا میرا ضمیر مجھے ملامت کرتا ہے، کیا میں اپنی کمزوری پر نادم ہوں! شاید ہاں۔ لیکن اس رومانی چاندنی رات کی داستان تو میری کتابِ زندگی میں سنہری الفاظ سے لکھی ہوئی ہے۔ شباب کے مست لمحات کی اس یاد کو تو اب بھی میں اپنا سب سے زیادہ عزیز خزانہ سمجھتی ہوں۔ کیا میں ان لمحات کو واپس لانے کے لیے اپنا سب کچھ دینے کے لیے تیار نہیں! پھر کیوں میرا دل دھڑکتا ہے، کیا گناہ کے خوف سے! کیا میں نے گناہ کیا! نہیں میں نے گناہ نہیں کیا۔ میں نے کس کا گناہ کیا میرے گناہ سے کسی کو نقصان پہنچا! میں نے تو قربانی کی' قربانی اس کے لیے۔ کاش کہ میں اس کے لیے اور بھی قربانی کرتی! گناہ سے میں نہیں ڈرتی۔ لیکن ہاں' شاید میں اس چڑیل سوسائٹی سے ڈرتی ہوں' اُس کی کیسی کیسی معنی خیز اشتباہ آمیز نظریں مجھ پر پڑتی ہیں۔ آخر میں اس سے کیوں ڈرتی ہوں، اپنے گناہ کے باعث! لیکن میرا گناہ ہی کیا ہے؟ کیا جیسا میں نے کیا' ایسا ہی سوسائٹی کی کوئی اور لڑکی نہ کرتی! وہ سہانی رات اور وہ تنہائی' وہ کتنا خوب صورت تھا! ۔ اس نے کیسے میرے منھ پر اپنا منھ رکھ دیا' اور اپنی آغوش میں مجھے کھینچ لیا' بھینچ لیا۔ اُف! اس کے گرم اور خوش بودار سینے سے میں کس اطمینان کے ساتھ چمٹ گئی! میں نے ساری دنیا ٹھکرا دی اور اپنا سب کچھ ان لمحاتِ عیش پر تج دیا' پھر کیا ہوا! کوئی اور کیا کرتا! کیا دنیا کی کوئی عورت اس وقت اس کو ٹھکرا سکتی تھی! گناہ! میں نے ہرگز گناہ نہیں کیا' میں ہرگز نادم نہیں ہوں۔ میں پھر وہی کرنے کو تیار ہوں...... عصمت! عصمت ہے کیا! صرف کنوارپن! یا خیالات کی پاکیزگی! میں کنواری نہیں رہی' لیکن کیا میں نے اپنی عصمت کھودی! فسادی چڑیل سوسائٹی کو جو کچھ کرنا ہو کرلے۔ وہ میرا کیا کرسکتی ہے! کچھ نہیں۔ میں اس کی پُرحماقت انگشت نمائی سے کیوں جھینپوں! میں اس کی کانا پھوسی سے کیوں ڈروں! کیوں اپنا چہرہ زرد کرلوں؟ میں اس کے بے معنی تمسخر سے کیوں منہ چھپاؤں! میرا دل کہتا ہے کہ

میں نے ٹھیک کیا، اچھا کیا، خوب کیا، پھر میں کیوں چور بنوں! کیوں نہ بابنگ دہل اعلان کردوں کہ میں نے ایسا کیا اور خوب کیا۔‘

یہ طرزِ استدلال اور یہ طرزِ فکر ہے جو ہمارے زمانے کا نیا ادیب ہر لڑکی، شاید خود اپنی بہن اور اپنی بیٹی کو بھی، سکھانا چاہتا ہے۔ اس کی تعلیم یہ ہے کہ ایک جوان لڑکی کو چاندنی رات میں جو گرم سینہ بھی مل جائے، اس سے اس کو چمٹ جانا چاہیے کیوں کہ اس صورتِ حال میں یہی ایک طریق کار ممکن ہے اور جو عورت بھی ایسی حالت میں ہو وہ اس کے سوا کچھ کر ہی نہیں سکتی۔ یہ فعل گناہ نہیں بلکہ قربانی ہے۔ اور اس سے عصمت پر بھی کوئی حرف نہیں آتا۔ بھلا خیالات کی پاکیزگی کے ساتھ کنوار پن قربان کر دینے سے بھی کہیں عصمت جاتی ہوگی! اس سے تو عصمت میں اور اضافہ ہوتا ہے، بلکہ یہ ایک ایسا شان دار کارنامہ ہے کہ ایک عورت کی زندگی میں سنہری الفاظ سے لکھا جانا چاہیے، اور اس کی کوشش یہ ہونی چاہیے کہ اس کی ساری کتابِ زندگی ایسے ہی سنہرے الفاظ میں لکھی ہوئی ہو۔ رہی سوسائٹی، تو وہ اگر ایسی عصمت مآب خواتین پر حرف رکھتی ہے تو وہ فسادی اور چڑیل ہے۔ قصوروار وہ خود ہے کہ ایسی ایثار پیشہ لڑکیوں پر حرف رکھتی ہے، نہ کہ وہ صاحب زادی جو ایک رومانی رات میں کسی کھلی ہوئی آغوش کے اندر کھینچے جانے سے انکار نہ فرمائیں۔ ایسی ظالم سوسائٹی جو اتنے اچھے کام کو برا کہتی ہے، ہرگز اس کی مستحق نہیں کہ اس سے ڈرا جائے، اور یہ کارِ خیر انجام دے کر اس سے منہ چھپایا جائے۔ نہیں، ہر لڑکی کو اعلانیہ اور بے باکانہ اس فضیلتِ اخلاق کا مظاہرہ کرنا چاہیے اور خود شرمندہ ہونے کے بجائے، ہو سکے تو الٹا سوسائٹی کو شرمندہ کرنا چاہیے۔ یہ جرات و جسارت کبھی بازار میں بیٹھنے والی بیسواؤں کو بھی نصیب نہ تھی، کیوں کہ ان بدنصیبوں کے پاس ایسا فلسفۂ اخلاق نہ تھا جو گناہ کو ثواب اور ثواب کو گناہ کر دیتا۔ اس وقت کی بیسوا عصمت تو بیچتی تھی مگر اپنے آپ کو خود ذلیل اور گناہ گار سمجھتی تھی۔ مگر اب نیا ادب ہر گھر کی بہو اور بیٹی کو پہلے زمانے کی بیسواؤں سے بھی دس قدم آگے پہنچا دینا چاہتا ہے کیوں کہ یہ بدمعاشی و فحش کاری کی پشت بانی کے لیے ایک نیا فلسفۂ اخلاق پیدا کر رہا ہے۔

ایک اور رسالے میں، جس کو ہمارے ملک کے ادبی حلقوں میں کافی مقبولیت حاصل ہے، ایک افسانہ 'دیور' کے عنوان سے شائع ہوا ہے۔ مصنف ایک ایسے صاحب ہیں جن کے والد مرحوم کو عورتوں کے لیے بہترین اخلاقی لٹریچر پیدا کرنے کا شرف حاصل تھا، اور اسی خدمت کی وجہ سے غالباً وہ ہندوستان کی اردو خواں عورتوں میں مقبول ترین بزرگ تھے۔ اس افسانے میں نوجوان ادیب صاحب ایک ایسی لڑکی کے کیریکٹر کو خوش نما بنا کر اپنی بہنوں کے لیے نمونے کے طور پر پیش کرتے ہیں جو شادی سے پہلے ہی اپنے 'دیور' کی بھرپور جوانی اور شباب کے ہنگاموں کا خیال کر کے، اپنے جسم میں تھرتھری پیدا کر لیا کرتی تھی، اور کنوار پنے ہی میں جس کا مستقل نظریہ یہ تھا کہ 'جو جوانی خاموش اور پرسکون گزر جائے'

اس میں اور ضعیفی میں کوئی فرق نہیں۔ میرے نزدیک نوجوانی کے ہنگامے ضروری ہیں جن کا ماٰخذ کشمکش حسن وعشق ہے، اس نظریے اور ان ارادوں کو لیے ہوئے جب یہ صاحب زادی بیاہی گئیں تو اپنے داڑھی والے شوہر کو دیکھ کر ان کے جذبات پر اوس پڑ گئی، اور انھوں نے پہلے سے سوچے ہوئے نقشے کے مطابق فیصلہ کرلیا کہ اپنے شوہر کے حقیقی بھائی سے دل لگائیں گی۔ چناں چہ بہت جلد ہی اس کا موقع آ گیا۔ شوہر صاحب حصول تعلیم کے لیے ولایت چلے گئے اور ان کے پیچھے بیوی نے شوہر کی اور بھائی نے بھائی کی خوب دل کھول کر اور مزے لے لے کر خیانت کی۔ مصنف نے اس کارنامے کو خود اس مجرمہ کے قلم سے لکھا ہے۔ وہ اپنی ایک سہیلی کو جس کی ابھی شادی نہیں ہوئی ہے، اپنے تمام کرتوت آپ اپنے قلم سے لکھ کر بھیجتی ہے، اور وہ تمام مراحل پوری تفصیل کے ساتھ بیان کرتی ہے جن سے گزر کر دیور اور بھاوج کی یہ آشنائی آخری مرحلے تک پہنچی۔ قلب اور جسم کی جتنی کیفیات صنفی اختلاط کی حالت میں واقع ہو سکتی ہیں، ان میں سے کسی ایک کو بھی بیان کرنے سے وہ نہیں چوکتی۔ بس اتنی کسر رہ گئی ہے کہ فعلِ مباشرت کی تصویر نہیں کھینچی گئی۔ شاید اس کوتاہی میں بھی یہ بات مد نظر ہوگی کہ ناظرین و ناظرات کا تخیل تھوڑی سی زحمت اٹھا کر خود ہی اس کی خانہ پری کر لے۔

اس نئے ادب کا اگر فرانس کے اس ادب سے مقابلہ کیا جائے جس کے چند نمونے ہم نے اس سے پہلے پیش کیے ہیں تو صاف نظر آئے گا کہ یہ قافلہ اسی راستے سے اسی منزل کی طرف جا رہا ہے، اسی نظامِ زندگی کے لیے ذہنوں کو نظری اور اخلاقی حیثیت سے تیار کیا جا رہا ہے اور عنانِ توجہ خاص طور پر عورتوں کی طرف منعطف ہے تاکہ ان کے اندر حیا کی ایک رمق بھی نہ چھوڑی جائے۔

ماخذ (اُردو۔۷۵)

رنگینیٔ عبارت

ماہر القادری

رنگینی اور نزاکت، شعر و ادب کی جان ہے۔ اسی نقطے سے تو شعر اور فلسفے کی حدیں جدا ہو جاتی ہیں۔ مگر رنگینی اور عریانیت میں بہت فرق ہے اور جو شخص اس فرق کو نہیں سمجھ سکتا اسے شعر کہنے اور افسانہ لکھنے کا کوئی حق حاصل نہیں ہے۔ شاعر اور ادیب تو عقیدت و پرستش، رحم و بزدلی، درگذر و انتقام، خوف اور کمزوری، رنگینی اور عریانیت کے فرق کو سب سے زیادہ سمجھتا ہے، ’نئے ادب‘ میں اس فرق کو نظر انداز کر دیا گیا ہے اور ’نفسیاتی تحلیل‘ کی آڑ میں ہر وہ بات بیان کی جا رہی ہے جو بیان کرنے کے قابل نہیں ہے۔

واقعہ نگاری بہت اچھی چیز ہے بلکہ شعر و افسانے کی جان ہے مگر بہت سے واقعات کھول کھول کر بیان نہیں کیے جاتے کہ تفصیل اور تشریح سے ان کا لطف جاتا رہتا ہے۔ بہت سے شاعرانہ کنایے اور افسانوی اشارے تحلیل اور تفصیل کے عملِ جراحی کو برداشت نہیں کر سکتے۔ دولہا دلہن کی شب خوابی کا اگر افسانے کے بنیادی تخیل سے خاص تعلق ہے تو مسہری کی شکنوں، ٹوٹے ہوئے گجروں اور آنکھوں کے خمار جیسے اشاروں میں سب کچھ بیان کیا جا سکتا ہے۔ لیکن آپ ان اشاروں کو چھوڑ کر تفصیل و واقعہ نگاری پر اتر آئیں تو پھر رنگینی بے حیائی بن جائے گی۔ اور جس طرح کتے اور بندر بازاروں اور راستوں پر سب کچھ کرتے ہیں اور ان کی حیوانیت حجاب و بے حجابی میں امتیاز نہیں کرتی اسی طرح آپ بھی کاغذ پر کتوں اور بندروں کی طرح انسانوں کو پیش کرنا چاہتے ہیں۔

حجاب، اشارہ، کنایہ اور اجمال حقیقت، شعر، ادب، انسانیت، اخلاق اور پاکیزگیِ حیات کی لطیف اور فطری ترجمانی ہے۔ آپ کہتے ہیں، ’میں صبح کو حوائج ضروری سے فارغ ہو کر باہر چلا گیا۔‘ اب کوئی ’حوائج ضروری‘ کے اجمال کی تفصیل کرنا شروع کر دے اور مخصوص اعضا کے قبض و بسط سے لے کر بیت الخلا کے قدمچوں تک کا حال بیان کرے تو آپ ہی انصاف سے بتائیے کہ اس ’واقعہ نگاری‘ کو ذوقِ سلیم کس طرح برداشت کر سکے گا! ’نیا ادب‘ واقعہ نگاری اور حقیقت کی ترجمانی کی رو میں وہاں پہنچ گیا ہے، جہاں ’ادب‘ اور ’بے ادبی‘ میں کوئی امتیاز باقی نہیں رہتا” ’لحاف‘ اور ’پھسلن‘ جیسے افسانوں پر فخر کیا جاتا ہے، اور کوئی اس بے حیائی پر معترض ہوتا ہے تو بارگاہِ ترقی و جدت سے فرمان صادر ہوتا ہے: ’ان برائیوں کی

تفصیل اور واقعات کو اصلی، ٹھیک ٹھیک ظاہر کرنے سے ہمارا مقصد یہ ہے کہ لوگ ان برائیوں سے نفرت کرنے لگیں’۔ حالاں کہ برائیوں اور بے اعتدالیوں کو چٹخارے لے لے کر بیان کرنے سے برائی کی تبلیغ ہوتی ہے اور پڑھنے اور سننے والے نفسی ہیجان کا شکار ہو جاتے ہیں۔

صبح کے وقت مکانوں کی کھڑکیوں کو دیکھ کر کوئی شخص ان الفاظ میں تفصیل بیان کرتا ہے۔ ’میں نے صبح کے وقت مکانوں کی کھڑکیوں سے تاک جھانک شروع کی، میری نگاہیں کھلے ہوئے سینوں کے اُبھار اور افتادگی پر جم کر رہ گئیں’ گردن سے لے کر ناف کی گہرائی تک جسم کے بعض حصے کھلے ہوئے تھے’ میری بے باک نگاہیں اترتی ہی چلی گئیں’۔ لیکن اس کیفیت اور مشاہدے کو دوسرا شخص ان الفاظ میں پیش کرتا ہے ۔

صبح کے وقت وہ ماحول شبستانوں کا　　　وہ مکانوں کے دریچوں کا نظارہ، اے دوست!

اس اجمال اور اس تفصیل کا موازنہ کر کے دیکھیے اور انصاف سے بتائیے کہ دونوں عبارتوں کو پڑھ کر آپ کا وجدان کس چیز کا بہتر اثر قبول کرتا ہے اور شعر و ادب کا حسن کس کے بیان میں ہے!

ماخذ (اُردو۔۴۲)

نصب العین کا مسئلہ

جسٹس (ریٹائرڈ) جاوید اقبال

پچھلے دنوں چند ماہناموں کی اشاعت پر پابندی لگ جانے کی وجہ سے جس دقت کا سامنا ہمارے ادیب اس وقت کر رہے ہیں وہ یہ ہے کہ آئندہ لکھا کس موضوع پر جائے۔ کیوں کہ پابندی اٹھ جانے کے بعد اگر پھر 'کھول دو' 'شیخ عبداللہ کے مکتوب کا جواب' 'ایک اڑان میں' اور 'بغیر عنوان کے' جیسے مضمون لکھے گئے تو ظاہر ہے کہ حکومت مزید چھ ماہ کی پابندی لگانے کی بجائے ہمیشہ کی پابندی لگادے گی۔ بہرحال یہ اعلان بھی کر چکے ہیں کہ ہم مسلمان ہیں اور ہمارا وطن پاکستان ہے اور ہمارا مدعا قوم کی خدمت ہے۔ اگر حکومت یہ سمجھتی ہے کہ ہم اپنے فرائض کو پوری طرح سرانجام نہیں دے رہے ہیں تو ہم سے کہا جائے کہ ہم میں یہ خامیاں ہیں اور ان خامیوں کا ازالہ یوں کیا جاسکتا ہے۔ حکومت مہر سکوت توڑے ہمیں اپنے اعتماد میں لے تاکہ ہمیں بھی خدمت کرنے کا موقع مل سکے۔

میرے خیال میں حکومت سے تعاون کی امید رکھنا بے وقوفی ہے اس لیے نہیں کہ حکومت نے ان لوگوں کو قصوروار تصور کرتے ہوئے ان پر بخشش کے دروازے بند کردیے ہیں بلکہ اس لیے کہ وزارتیں گردشِ ایام کی طرح بدلتی رہتی ہیں۔ انھیں عوام کی فلاح و بہبود سے زیادہ اپنی اپنی جماعتوں کو مستحکم کرنے کی فکر دامن گیر رہتی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ ہماری حکومت کے اربابِ بست و کشاد میں سے بیش تر نے ان رسالوں کے نام اپنی زندگی میں پہلی بار پڑھے ہوں گے۔ انھیں تو صرف یہ معلوم ہے کہ اردو وہ زبان ہے جس میں تقریریں کی جاتی ہیں۔ اور اسلام وہ لفظ ہے جو بار بار استعمال کرنے سے ذاتی فائدے کا موجب بن سکتا ہے۔ اس سے زیادہ جاننا ان کے سیاسی مذہب میں گناہ تصور کیا جاتا ہے سو حکومت سے تعاون کا مطلب کیا کسی ایک وزارت سے تعاون کرنا ہے۔ جو ان ادیبوں کو اپنے مقاصد کی تکمیل کے لیے آلۂ کار بنا سکتی ہے۔ اگر ادیب ہر بار چڑھتے سورج کی پرستش کرنے لگے تو نہ صرف ادب اپنی اخلاقی قدر کھو بیٹھے گا بلکہ اس کا حشر بھی ان اخباروں کی طرح عبرت ناک ہوگا جنھوں نے خضر کی وزارت کے عہد میں یہ پیشہ اختیار کیا اور جن کے نقشِ قدم پر اب بھی چند اخبار چل رہے ہیں۔

ہمارے ادیب جواں سال ہیں، جذباتی ہیں اور چوں کہ عقل پختگیٔ عمر کے بعد ہی جذبات پر غالب آتی ہے اس لیے جب وہ جذبات کی رو میں بہتے ہیں، تو اپنے آپ کو فراموش کردیتے ہیں۔ اب

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ہمارے نام نہاد نقاد اس سلسلے میں ان کی رہنمائی کر سکتے ہیں! مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ فی الحال ہماری تنقید تعمیری نہیں۔ تعمیری تنقید سے مراد یہ نہیں کہ ہماری تنقید تخریبی ہے۔ فنِ تنقید ہمارے ہاں بلاشبہ نیا ہے۔ وہ شاعروں کے کلام اور افسانہ نگاروں کے افسانوں پر تو تنقید ضرور ہے مگر اپنے آپ پر نہیں۔ پیش تر اس کے کہ نقاد ادیبوں کی رہنمائی کر سکیں ان کے لیے اپنے فن کے اصول مرتب کرنا لازمی ہے۔ پھر میری نظر میں تو ہمارے بالغ عمر نقادوں میں سے ایسا ایک بھی نہیں جو صحیح معنوں میں خیر اندیش ہو۔ ان کی چار قسمیں ہیں: پہلی قسم تو ایسے نقادوں کی ہے جو روزناموں میں عرضیوں کی صورت میں وزارت کے حق میں مضامین لکھ لکھ کر معاش حاصل کرنے کے درپے ہیں۔ دوسری قسم ایسوں کی ہے جو اس نظام کو بے ہودہ سمجھتے ہوئے بے نیازی کا رویہ اختیار کیے ہوئے ہیں۔ (ایسے نقاد اصل میں خود پریشان ہیں)، تیسری قسم ان نقادوں کی ہے جو صرف و نحو کی بحث میں الجھ کر یہ سمجھ بیٹھے ہیں کہ انھوں نے اردو ادب پر بڑا احسان کیا ہے۔ اور چوتھی قسم میں وہ نقاد آتے ہیں جو ادب کو سیاسیات کا اکھاڑا بنا کر اپنی ذاتی اغراض پوری کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ ان حالات میں ادیبوں کو اپنی رہنمائی آپ کرنے کی اشد ضرورت ہے۔ پچھلے چند سالوں میں جو تخیلی، سیاسی اور معاشرتی انقلاب رونما ہو چکا ہے اس کا تقاضا بھی یہی ہے کہ ادیب اپنے نصب العین (اگر کوئی نصب العین ہے) پر نظرِ ثانی کر کے کسی نتیجے تک پہنچیں۔

نیا ادب ترقی پسند کیوں کہلاتا ہے! اس کی وجہ یہ ہرگز نہیں کہ ہر اصطلاح جس کے پہلے لفظ ‘نیا’ لگا دیا جائے اس سے مراد اشتراکی تبلیغ ہے۔ اصل میں ہر ادبی تغیر تخیلی، سیاسی، معاشرتی یا اقتصادی انقلاب کا رہینِ منت ہوتا ہے۔ پھر جب اس میں تنزلی کے آثار نمودار ہونے لگیں تو ردِ عمل شروع ہو جاتا ہے۔ اور اس کی بنیادوں سے نیا ادب اٹھتا ہے۔ اسے غیر شعوری ارتقا کہہ لیجیے، تنزل کہہ لیجیے لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ قدرت کے کارخانے میں سکون بہر صورت محال ہے۔ ہر فلسفی، شاعر یا صحافی جب اپنے گزشتہ دور پر نکتہ چینی کرتا ہے تو باغی کہلاتا ہے۔ تعجب ہے، آج کل لفظ ‘باغی’ کا مطلب اشتراکی سمجھا جاتا ہے۔ یہ اصطلاح لفظ ‘مولوی’ کی طرح بے حد بدنام ہو چکی ہے۔ ایک وقت تھا جب علامہ اقبال نے اردو شاعری کو پستی سے ابھارنے کی کوشش میں اپنی نئی راہ اختیار کی اور کہا:

آئینِ نو سے ڈرنا، طرزِ کہن پر اڑنا   منزل یہی کٹھن ہے قوموں کی زندگی میں

تو اکبر الہ آبادی جیسے بزرگ چیخ اٹھے: ”سنا ہے کہ لاہور میں ایک لونڈا اقبال پیدا ہوا ہے جو اسلام پر کیچڑ اچھالنے سے گریز نہیں کرتا۔“ اگر مولانا کے طنزیہ کلام سے ان کا ذہنی تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہو جائے گا کہ وہ نیت کے برے نہ تھے البتہ انھیں اپنی ذلت کا احساس ضرور تھا کیوں کہ ان کی ساری عمر انگریز کی غلامی کرتے گزری تھی۔

موجودہ ادب میں تین نمایاں خصوصیات ہیں۔ پہلی خصوصیت عریانی ہے جسے عام لفظوں میں نقش نگاری کہا جاسکتا ہے۔ دوسری خصوصیت اشتراکی تبلیغ ہے اور تیسری تخریبی رجحان۔ ان خصوصیتوں کی نفسیاتی وجوہات ہیں۔ مثلاً عریانی کی وجہ آپ کی قدامت پسندی کے خلاف بغاوت ہے۔ آپ کی تہذیب کے کڑے اصول آپ کو عورتوں سے صحت مندانہ تعلقات کی اجازت نہیں دیتے۔ اسی لے سڑک پر چلتے ہوئی ہر کوئی عورت غیر محفوظ ہے۔ اکثر اوقات برقعے میں چلتی عورتوں کو دیکھ کر جنسی الجھن پیدا ہوتی ہے۔ کہ اس کے اندر کوئی ہے بھی یا یوں ہی یہ خیمہ ہوا میں اڑتا چلا جارہا ہے۔ اس قدامت پسندی کے برقعے کے نیچے کیا ہے: ادب میں عریانی تو یہی دکھانے کی کوشش میں ہے۔ میں سمجھتا ہوں' ادب میں عریانی بری نہیں بشرطے کہ اس کا مقصد متعفن قسم کی لذتیت نہ ہو۔

جہاں تک دوسری خصوصیت یعنی اشتراکی تبلیغ کا تعلق ہے میں صرف اتنا کہنا چاہتا ہوں کہ ہمارا ماحول ہی اس قسم کا ہے۔ ادیب جب اپنے گردونواح میں غربت اور افلاس کے سوا کچھ نہیں دیکھتا تو وہ آپ کو وہ کیوں نہ دکھائے جو اُسے دکھائی دے رہا ہے۔ ادیب کا مقصد زندگی کی عکاسی ہے۔ اس کے لیے اشتراکی مبلغ ہونا ضروری نہیں اس کا مقصد آپ کی توجہ کچلے ہوئے عوام کی طرف مبذول کرانا ہے تا کہ ان کی فلاح اور بہبود کے لیے کچھ کیا جائے۔ جب رُوسو نے فرانسیسی عوام کو آزادی کا تصور دیا تو اس کا ارادہ اشتراکیت کی تبلیغ نہ تھا۔ اسی طرح جب انگلستان کے شاعروں اور صحافیوں نے سرمایہ داروں کی مزدوروں پر سختی کے خلاف آواز اٹھائی تو وہ اشتراکیت کی تبلیغ نہیں کر رہے تھے۔ البتہ میں اس بات سے انکار نہیں کرتا کہ ہمارے ترقی پسند ادیبوں میں سے بعض اشتراکیت پسند ضرور ہیں۔ اس قسم کے لوگوں کا مقصد واقعیت کی عکاسی کرتے وقت ایک مخصوص سیاسی نظام کو آپ کے حلق میں انڈیلنا ہوتا ہے۔ یہ میلان ہمارے لیے بے حد خطرناک ہے۔ کیوں خطرناک ہے، اس کی وجہ آگے جا کر بیان کروں گا۔ ہمارے ادیبوں کا اپنا تمدنی پسِ منظر کوئی نہیں، اگر ہے تو وہ اس سے آگاہ نہیں ہیں۔ تعلیم مغربی طریق پر ہوئی' بیمار ماحول میں پلے' اس میں کوئی شک نہیں' وہ اچھے کاری گر ہونے کی حیثیت سے بدعتی ضرور کہلا سکتے ہیں، لیکن وہ محض بدعتی ہیں' خالص تخلیقی صلاحیت کسی ایک میں بھی نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آج وہ نصب العین کے بارے میں مشکوک ہیں۔ اپنے گردونواح کی زندگی کی عکاسی کرنا واقعیت نگاری ہے، مگر جہاں اس کے پس پشت اشتراکی جذبہ کارفرما ہو اسے جائز قرار نہیں دیا جاسکتا۔

اب میں موجودہ ادب کی تیسری خصوصیت' تخریبی رجحان کی طرف رجوع کرتا ہوں۔ گزشتہ دس سالوں میں سے کسی تاریخ کا رسالہ اٹھا کر دیکھیے آپ کو قریباً ہر نظم' افسانے یا مضمون میں سوائے تخریب کے کچھ نظر نہیں پڑے گا۔ اس کی اہم وجہ صحیح نصب العین کی غیر موجودگی کا احساس ہے۔ جتنی دیر انگریز کی حکومت رہی یہ رجحان ایک لحاظ سے قابلِ اعتراض نہیں سمجھا جاسکتا۔ اب جب کہ

ہمارے یہاں تخیلی اور سیاسی انقلاب رونما ہو چکا ہے۔ ادب میں یہ میلان تغیر کا طالب ہے۔ آج تک ہمارے شاعر یا صحافی جراحوں کی طرح مریض کے زخموں کو چیر پھاڑ کر ناسور بننے کے لیے کھلا چھوڑ دینا ہی اپنا فرض سمجھتے رہے ہیں، اب ہم کو مرہم رکھنے والوں کی ضرورت ہے۔ افسوس اس بات کا ہے کہ ہمارے ادیب ابھی تک بوکھلائے سے ہیں، وہ نہیں سمجھتے کہ ہندوستان بٹ چکا ہے۔ اس میں سے پاکستان ہمارا حصہ ہے اور اس کی تعمیر ابھی باقی ہے۔ وہ نہیں سمجھتے کہ سعادت حسن منٹو حقیقت میں ادیب ہونے سے پیش تر مسلمان ہے اور اسی وجہ سے اسے ہندوستان چھوڑ کر پاکستان آنا پڑا یا فکری تونسوی اور راجندر سنگھ بیدی شاعر اور تمثیل نگار ہونے کے ناطے سے پیش تر ہندو اور سکھ ہیں جس کی وجہ سے انھیں پاکستان چھوڑ کر ہندوستان جانا پڑا۔ ترقی پسند ادیبوں کا یہ گروہ ابھی تک اسی نیم خوابی کے عالم میں اپنا وقت کاٹ رہا ہے گو ہمارے ہم وطنوں کے نظریوں میں اختلاف آ چکا ہے مگر ہم بھی ایک ہیں اور ایک ہی رہیں گے مثلاً:

ساتھیوں، ہاتھ بڑھاؤ کہ ہیں ہم آج بھی ایک　　کون کر سکتا ہے تقسیم ادب کی جاگیر!
کون افکار کی قندیل بجھا سکتا ہے!　　کون کر سکتا ہے احساس کی شدت کو اسیر!

میں سمجھتا ہوں اس لحاظ سے سب خود غرض ہیں۔ ان پر ملک اور قوم کی طرف سے جو فرائض عاید ہوتے ہیں وہ ان سے عہدہ برآ ہونے کی اہلیت نہیں رکھتے۔ جہاں تک مسلمان ادیبوں کا تعلق ہے وہ خود غرض ہونے کے علاوہ سادہ لوح بھی ہیں کیوں کہ ابھی تک وہ ہندو اور سکھ ادیبوں کو اپنے 'ساتھی' تصور کر رہے ہیں۔

ادھر کرشن چندر نے تو کشمیر میں مجاہدین کے خلاف افسانے لکھے، راجندر سنگھ بیدی اسے ہندوستان کے ساتھ ملانے کی فکر میں سری نگر جا بیٹھے، ادھر ساحر لدھیانوی صاحب کی سحر طرازیاں ملاحظہ ہوں۔ شیخ عبداللہ کے مکتوب کے جواب میں تحریر فرماتے ہیں کہ 'کشمیر کے زعفران زاروں پر قبائلیوں کے بوٹوں کی گرد جمی ہوئی ہے۔' یہ قبائلی وہی مجاہدین تو ہیں جو اپنی جانیں ہتھیلیوں پر رکھ کر آپ کی جنگ لڑ رہے ہیں۔ فرماتے ہیں: 'جس دن کشمیر فی الواقع آزاد ہو جائے گا اس دن میں کشمیر کی سرزمین پر حاضر ہوں گا۔' یہ دھن بالکل وہی ہے جو ہندوؤں کی طاقت کے بل بوتے پر خان عبدالغفار خان نے صوبۂ سرحد کے پٹھانستان بنائے جانے کے سلسلے میں الاپی تھی اور انھیں گرفتار کر لیا گیا تھا۔ یہ تخریب کا ایک پہلو تھا۔ اب میں سعادت حسن منٹو (جس کے افسانوں نے اچھے اچھوں کو بُری طرح چونکا دیا ہے) کے افسانہ 'کھول دو' پر ایک نظر ڈالتا ہوں۔ سعادت حسن منٹو مسلمان ہیں 'وطن پاکستان ہے اور پیشہ خدمتِ ملک و قوم۔ افسانے کا پلاٹ مختصراً یہ ہے کہ سکینہ نام کی ایک لڑکی ہندوستان میں سکھوں سے محفوظ رہی لیکن پاکستان میں آتے ہی اسے جو مسلمان بھی ملا، اس نے اس کی آبروریزی کی۔

افسانہ پڑھ کر مجموعی طور پر محسوس ہوتا ہے کہ مغویہ لڑکیاں جب پاکستان لائی جاتی ہیں تو ان سے پاکستان میں مسلمان یہ سلوک کرتے ہیں۔

ایک محفل میں اتفاق سے سعادت حسن منٹو موجود تھے۔ میں نے ان سے دریافت کیا کہ اس افسانے کا پلاٹ کسی حقیقی واقعے پر مبنی' ہے یا محض آپ کے تخیل کی اختراع ہے! بولے۔ 'اس کا پلاٹ میرے تخیل کی اختراع ہے۔' میں نے پھر پوچھا۔ یہ افسانہ لکھ کر آپ نے قوم کی کیا خدمت کی ہے! کہنے لگے۔ میرا مقصد یہ ہے کہ اگر ہم میں ایسے مسلمان موجود ہیں جو مغویہ لڑکیوں پر یوں ہاتھ صاف کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں تو وہ اس افسانے کو پڑھ کر شرمندہ ہوں اور اپنے ارادوں کو عملی جامہ پہنانے سے باز رہیں۔ خیر، میں یہاں یہ بتا دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ میرے علم میں ہے کہ یہ افسانہ ایک حقیقی واقعے پر مبنی ہے۔ امرت سر سے ایک مسلمان لڑکی پندرہ دنوں کے بعد سکھوں کے نرغے سے نکال کر پاکستان لائی گئی، اس بے چاری کی کیفیت یہ تھی کہ بیان نہیں کی جا سکتی۔ لیکن جو واقعات افسانے میں مسلمانوں سے منسوب کیے گئے ہیں، وہ سکھوں کے ہاتھ سے اس پر گزرے تھے۔ یہ لڑکی عرصہ دراز تک ہسپتال میں زیر علاج رہی اور حیرت کی بات یہ ہے کہ اب تک زندہ ہے۔ نیشنل گارڈ کے وہ نوجوان بھی لاہور ہی میں موجود ہیں جو اسے سکھوں کے پنجے سے چھڑا کر لائے تھے۔ میرے علم میں وہ شخص بھی موجود ہے جس نے ایک دعوت پر سعادت حسن منٹو کو یہ داستان سنائی۔

مگر یہ بات غیر اہم ہے کہ منٹو نے کسی سے سن کر افسانہ لکھا۔ سعادت حسن منٹو کہتے ہیں کہ اس افسانے کا پلاٹ صرف ان کے اپنے تخیل کی اختراع ہے تو چلیے اس بحث کو انھیں حدود تک محدود رکھیں جو سعادت حسین منٹو نے خود مقرر کر دی ہیں۔ ہاں تو 'کھول دو' لکھ کر سعادت حسن منٹو کا مقصد یہ ہے کہ اگر ہم میں ایسے مسلمان موجود ہیں جو مغویہ لڑکیوں پر ہاتھ صاف کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں تو وہ اس افسانے کو پڑھ کر شرمندہ ہوں اور اپنے ارادوں کو عملی جامہ پہنانے سے باز رہیں۔ میں نے سوال کیا ہم میں ایسے مسلمان بھی تو ہو سکتے ہیں جو یہ ارادہ نہ رکھتے ہوں لیکن جب وہ آپ کا افسانہ پڑھیں تو سوچ میں پڑ جائیں کہ مغویہ لڑکیوں پر یوں ہاتھ صاف کرنے میں حرج ہی کیا ہے۔ بھلا کون جانتا ہے کیا ہو رہا ہے! اس پر انھوں نے جواب دیا اس میں میرا کوئی قصور نہیں، جس شخص کا ذہن ناپاک ہو وہ ممکن ہے اس افسانے سے یہی نتیجہ اخذ کرے۔

میں نے سعادت حسن منٹو سے پوچھا۔ 'آپ کا وطن پاکستان ہے' کیا آپ کو اپنے وطن سے محبت ہے؟' بولے 'یقیناً ہے'۔ میں نے کہا۔ 'آپ حب الوطنی سے کیا مراد لیتے ہیں؟' کہنے لگے، 'حب الوطنی سے میری مراد یہ ہے کہ میری فٹ بال کی ٹیم کسی مخالف ٹیم سے میچ کھیلنے والی ہے۔ میرا فرض ہے کہ میری ٹیم میں جو برے کھلاڑی ہیں انھیں باہر نکال دوں'۔ میں نے پھر پوچھا۔ 'کیا آپ ان برے

کھلاڑیوں کی جگہ اچھے کھلاڑی نہیں رکھیں گے؟' بولے' ضرور رکھوں گا۔' میں نے کہا لیکن آپ نے اپنے افسانے 'کھول دو' میں تو کہیں ذکر نہیں کیا کہ برے رضاکاروں کے بجائے آپ کے نظریے کے مطابق اچھے رضاکار متعین کیے جائیں؟ اس پر انھوں نے جواب دیا۔ 'اگر میں یوں کرتا تو میرے افسانے کا پلاٹ بگڑ جاتا۔' یعنی انھیں اپنے نصب العین کو تو نظر انداز کر دینا منظور ہے مگر وہ افسانے کے پلاٹ کو کسی حالت میں بگاڑنے پر تیار نہیں۔ کیا آپ اسے تعمیری ادب کہیں گے؟

جہاں منٹو کا افسانہ چھپا ہے وہیں ہاجرہ مسرور تحریر فرماتی ہیں: 'ترقی پسند ادیب کمیونسٹ ہیں اور اس لیے پاکستان کے دشمن...... انھیں جیلوں میں ٹھونس دو۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔' میں اعتراف کرتا ہوں کہ ترقی پسند ادیب سب کے سب اشتراکیت پسند نہیں ہیں اور جو ہیں وہ اپنے آپ کو اعلامیہ اشتراکیت پسند ظاہر کرنے میں مصلحت نہیں سمجھتے۔ حال ہی میں پاکستان کی کسی نامور ادیبہ کا دستی خط جو بمبئی کے ایک اشتراکی ادیب کے نام تھا۔ منٹگمری میں پکڑا گیا۔ ایک رسالے کے سرورق کی اشاریت کا بنظر غور مطالعہ کیجیے، آپ کو درانتی میں سے سنہری شعاعیں نکلتی دکھائی دیں گی۔ ان شعاعوں کے اوپر سرخ قلم سے رسالے کا نام لکھا ہے۔ اب آیئے ایک جشن آزادی منانے والے رسالے کی ورق گردانی کریں۔ پہلی نظر میں آپ کو یہ شمارہ بے حد پسند آئے گا جیسے مجھے پسند آیا اور میں نے ہاجرہ مسرور صاحبہ کو لکھا کہ آپ سب مستحق مبارک باد ہیں۔ رسالہ اردو ادب کی خدمت کر رہا ہے۔ مگر جب میں نے اس شمارے کے مضامین اور نظمیں دوبارہ پڑھیں تو مجھے اس کے برعکس حقیقت کا احساس ہوا۔ وہ یہ کہ 'یہ رسالہ پاکستان کے جشن آزادی کی تقریب نہیں منا رہا بلکہ اول سے لے کر آخر تک جشن آزادی پر طنز سے اٹا پڑا ہے۔ احتشام حسین کا مضمون 'ادیب' حب الوطنی اور وفاداری' کا مطالعہ کیجیے۔ آپ ادیب کی حکومت سے وفاداری کے خلاف لکھتے ہیں۔ اخلاقیات کی حدوں سے نکل کر اب یہ (وفاداری اور حب وطن) خالص سیاسی مسئلہ بن گیا ہے جسے ضرورت کے وقت مذہب اور اخلاق کی شکل بھی دی جاتی ہے۔ جوش ملیح آبادی کی نظم 'ہندوستان اور پاکستان کا نعرہ' پڑھیے۔ مجیب الرحمن کی 'روحیں' پڑھیے ۔

ہم نے دانستہ اسی جرم کا اقدام کیا
جس سے لازم تھا گریز
نفرتیں بوئی گئیں ..
کھوٹ ڈالا گیا معصوم دلوں کے اندر
شک وشبہات کی دیواریں اٹھائی گئیں ہر سینے میں

یہ سب اشارے پاکستان کی ہندوستان سے علاحدگی کے متعلق ہیں۔ مقصد آپ کو آپ کے سیاسی نصب العین سے متنفر کرنا ہے۔ ایک نظم 'چراغ روشن ہیں' سے مراد آپ کو ذہنی طور پر اپنے دین سے

منحرف کرتا ہے۔ ادا جعفری بدایونی کی نظم 'اجنبی دیس میں' یہاں اجنبی دیس سے مراد پاکستان ہے۔ مقبول حسین احمد پوری کی 'اے ساتھی' ...... کامریڈوں سے خطاب ہے۔ 'میراث آدم' میں محلات کے ساتھ معابد (یعنی عبادت گاہوں) کی بھی تذلیل کی گئی ہے۔ مثلاً:

یہ معابد، یہ محلات کے زریں در و بام   مجھ کو اجداد سے ورثے میں ملے ہیں لیکن
میرے پندارِ شرافت کو ہوں کس طرح قبول   ان میں انساں کے لہو کی مجھے بو آتی ہے

مثالیہ 'ایک اذان میں' پڑھیے۔ یہ مثالیہ گو بڑی احتیاط سے لکھا گیا ہے لیکن سمجھنے والے سمجھتے ہیں۔ لاکھوں پرندوں کی بستی تقسیم سے پہلے ہندوستان ہے۔ آبی پرندے یعنی بگلے وغیرہ قوم پرست ہیں۔ ان پرندوں میں سے چمگادڑ جس سے مسلم لیگ کے لیڈر مراد ہیں' الو (ماسٹر تارا سنگھ) کو آبی پرندوں کے خلاف اکساتا ہے۔ پرامن فضا چیخوں سے گونج اٹھتی ہے۔ تباہی نازل ہوتی ہے۔ آخرکار الو تو اپنی غلطی کا اعتراف کرتے ہوئے پرندوں سے جاملتا ہے۔ مگر چمگادڑ خرگوش (یعنی انگریز) کی مدد سے چوپایوں میں شریک ہوجاتا ہے۔ اس مثالیہ کا مطلب آپ کو پاکستان سے متنفر کرنا ہے۔ اب آئیے سعادت حسن منٹو کے 'بغیر عنوان' کے افسانے کی طرف جس کے متعلق ادارہ رقم طراز ہے: 'جب منٹو صاحب سے یہ افسانہ حاصل کیا تو یہ عنوان کے بغیر تھا اور اب تک وہ باوجود انتہائی کوشش کے کوئی عنوان مقرر نہیں کرسکے۔ مجبوراً یہ افسانہ بغیر عنوان ہی کے شائع کیا جارہا ہے۔ اگر کوئی صاحب موزوں عنوان تحریر فرمائیں تو ان کی خدمت میں رسالہ ایک سال کے لیے مفت روانہ کیا جائے گا۔ اس بارے میں منٹو صاحب آخری فیصلہ کریں گے۔ سعادت حسن منٹو نے گزشتہ شمارے میں 'کھول دو' لکھ کر آپ کو یہ بتایا تھا کہ مسلمان مغویہ لڑکیوں سے جو پاکستان لائی جاتی ہیں' کیا سلوک کرتے ہیں۔ اب اس بغیر عنوان کے افسانے میں یہ بتایا گیا ہے کہ مسلمان پاکستان کی اقلیتوں سے کس طرح کا برتاؤ روا رکھتے ہیں'۔ میری سمجھ میں تو یہ آتا ہے کہ پاکستان کے موجودہ ادب میں جو رجحان نظر آتا ہے وہ کسی خاص پلان کے ماتحت عمل میں لایا جارہا ہے۔ ممکن ہے اس کی ذمے داری رسالوں کے مالکان پر عائد نہ ہوتی ہو۔ مگر ادیب اس سے بری الذمہ نہیں ہوسکتے۔ پاکستان سے جو ترقی پسند شاعر بھاگتے ہیں' انھیں ہندوستان میں پناہ ملتی ہے۔ رسالوں میں' مضامین میں' افسانوں اور نظموں کے ذریعے آپ کو اپنے ہم وطنوں' آپ کے قائدوں' آپ کے دینی اور سیاسی نصب العین سے متنفر کرایا جاتا ہے۔ ان سب کوششوں کا مقصد یہ ہے کہ پاکستان ہندوستان میں مدغم ہوجائے۔ بین الاقوامی صورتِ حال دن بدن بگڑ رہی ہے۔ خودبخود اشتراکیت پھیل جائے گی۔ لیکن اس کے باوجود پاکستان کے ترقی پسند ادیب یہ کہتے ہیں کہ کارل مارکس ہمارا خدا نہیں' فرائڈ ہمارا رسول نہیں' ماسکو ہمارا قبلہ نہیں' تخریب ہمارا ایمان نہیں' بلکہ ہم تو مسلمان ہیں۔ ہمارا وطن پاکستان ہے۔ ہمارا مقصد ملک و قوم کی خدمت ہے۔ اور دوسری طرف ہم یہ سمجھے بیٹھے ہیں کہ

ترقی پسند ادیب تو واقعیت نگار ہیں، زندگی کے عکاس ہیں، وہ تو اپنے خیالات کا سچائی کے ساتھ اظہار کرتے ہیں۔ ان کے لیے ضروری نہیں کہ وہ کسی حکومت کے وفادار ہوں۔

میری اس تنقید کا مقصد ان ترقی پسند ادیبوں کو جو اشتراکی نظام کے علمبردار نہیں یہ بتانا ہے کہ ہمیں کس قسم کا ادب درکار ہے۔ تعمیر چوں کہ پاکستان کا مقصود ہے۔ اس لیے ادیب کی حکومت کے ساتھ وفاداری کا مطلب کسی وزارت کے ساتھ وفاداری نہیں بلکہ ہم اپنے ہم وطنوں کے ساتھ وفاداری اور یگانگت ہے۔ میں کہہ چکا ہوں، پاکستان ابھی نوخیز ہے۔ اس لیے ادب میں کوئی بھی رجحان جو کسی قسم کی بھی تخریب پر مبنی ہو۔ ہمارے لیے زہر کے برابر ہے۔ پس ہماری بقا کے لیے تعمیری ادب ضروری ہے۔

ادب تعمیری کیوں کر ہو سکتا ہے یا پاکستان میں ادب میں تعمیری موضوع کیا ہونے چاہئیں! اگر پاکستان میں ترقی پسند ادیبوں کی ایک کانفرنس بلائی جائے جیسے حال ہی میں پنجاب یونیورسٹی کے زیر اہتمام اردو کانفرنس منعقد کی گئی تھی، تو یہ مسئلہ بڑی آسانی سے حل کیا جا سکتا ہے۔ جہاں تک میری ذاتی رائے کا تعلق ہے میں اس سلسلے میں فرانسیسی ادیب موپساں کے ایک افسانے کی مثال نقل کرتا ہوں۔ اس افسانے کا پلاٹ یہ ہے:

۱۸۷۰ء کی جنگ میں فرانس کے کچھ حصے پر جرمن قابض ہو چکے ہیں۔ چند فرانسیسی مہاجروں کا قافلہ جو ایک پادری، دو نوجوان ننوں، ایک رئیس، اس کی بیوی اور جوان بیٹی، ایک انقلابی، ایک طوائف وغیرہ پر مشتمل ہے۔ شام کے وقت کسی ایسے قصبے کی سرائے میں اترتے ہیں جس پر جرمنوں کا قبضہ ہو چکا ہے۔ اسی سرائے میں ایک جرمن میجر بھی مقیم ہے جو اس قصبے کا فوجی کمان دار ہے۔ وہ ان لوگوں سے کہتا ہے کہ میں عرصے سے اپنی بیوی بچوں سے دور بیٹھا اپنے ملک کے لیے لڑ رہا ہوں اور ہر رات مجھے یہ خواہش تنگ کرتی ہے کہ کوئی عورت میرے ساتھ آ کر سوئے۔ لیکن میری خواہش پوری نہیں ہو سکی۔ اب آپ اس سرائے میں اترے ہیں۔ میری تمنا ہے کہ آپ میں سے کوئی عورت میرے کمرے میں آ کر میرے ساتھ رات گزارے۔ میں اگر چاہوں تو جس عورت کو پسند کروں، اسے زبردستی اٹھوا کر بھی اپنے ساتھ لے جا سکتا ہوں مگر میں یوں نہ کروں گا۔ کیوں کہ زبردستی کرنا جرمن قوم کے اصول کے خلاف ہے۔ اس لیے میں چاہتا ہوں کہ آپ خود آپس میں فیصلہ کر کے کوئی ایک عورت میری طرف بھیج دیں۔ مجھے بڑھیا یا جوان کی پروا نہیں۔ مجھے صرف عورت درکار ہے۔ اگر آپ کو منظور نہ ہو تو میں صبح آپ کو اس قصبے سے آگے جانے کی اجازت نہ دوں گا۔ یہ کہہ کر جرمن میجر تو اپنے کمرے میں چلا جاتا ہے لیکن فرانسیسی مہاجروں کے چہرے زرد پڑ جاتے ہیں۔ سب دیر تک خاموش ایک دوسرے کا منہ تکتے رہتے ہیں۔ پھر انھیں احساس ہوتا ہے کہ ان کے ہمراہ ایک طوائف بھی ہے۔ وہ اس کی منت کرتے ہیں:

'تمھارے لیے کسی نامحرم کی ساتھ ایک رات گزارنا کوئی بڑی بات نہیں۔ خدارا تم اس کی خواہش پوری کر آؤ۔ تاکہ ہم صبح اس قصبے سے نکلنے کے قابل ہوسکیں'۔ طوائف 'طوائف ہونے سے پہلے فرانسیسی ہے لہٰذا وہ کسی جرمن کے ساتھ رات گزارنے میں اپنی قوم کی توہین سمجھتی ہے۔ مگر پھر بھی التجا کرتے ہیں۔' کیا تمھیں فرانس سے محبت نہیں ہے؟ کیوں تم فرانس کے لیے قربانی نہیں دے سکتیں! ہم میں تمھارے علاوہ باقی سب عورتیں شریف زادیاں ہیں۔ وہ جرمن میجر کی خواہش پوری نہیں کرسکتیں۔ تم اپنے طریقے سے فرانس کی خدمت کرسکتی ہو'۔ طوائف چپ چاپ ان کی باتیں سنتی رہتی ہے۔ نہ جانے اسے کیا خیال آتا ہے۔ وہ اٹھتی ہے اور جرمن میجر کے کمرے میں چلی جاتی ہے۔ اس کے چلے جانے کے بعد بھی مزے سے رات کا کھانا کھاتے ہیں۔ شراب پیتے ہیں اور گاتے گاتے سوجاتے ہیں۔ ادھر طوائف کو رات کا کھانا نصیب نہیں ہوتا۔ اس کی ساری رات آنکھوں میں کٹتی ہے۔ ساری رات جرمن میجر اس سے چمٹا رہتا ہے۔

صبح انھیں قصبے سے آگے بڑھنے کی اجازت مل جاتی ہے۔ طوائف بھی ان کی ہم سفر ہے لیکن اس سے کوئی کلام نہیں کرتا۔ سب حقارت سے منہ پھیر لیتے ہیں۔ یا چہ میگوئیاں کرتے ہیں۔' اس کا کیا ہے یہ تو ہے طوائف۔ اس نے رات اپنی خوشی سے جرمن میجر کے ساتھ گزاری ہے۔ ضرور اس سے کچھ نہ کچھ بٹور کر لائی ہوگی'۔ قافلہ چلتے چلتے دور نکل جاتا ہے۔ دوپہر کے کھانے کا وقت آتا ہے تو سب اپنا اپنا کھانا نکال کر کھاتے ہیں۔ مگر طوائف کو کوئی مدعو نہیں کرتا۔ وہ گزشتہ رات سے بھوکی ہے۔ تھکان سے چور ہے۔

میں اس افسانے کو فرانس کے تعمیری ادب کا ایک نادر نمونہ سمجھتا ہوں۔ اسے پڑھ کر پڑھنے والے پر فرانسیسی قوم کے ذلیل سے ذلیل فرد کے عزم و اخلاق کی بلندی کا احساس ہوتا ہے۔ اب پاکستان کے ادب میں تعمیری موضوع کیا ہونے چاہئیں؟ اس سلسلے میں موپساں کی اس مثال کو سامنے رکھیے۔ ایسے موضوع تلاش کیجیے جس میں سکھوں کے مظالم کا مقابلہ مسلمان مہاجروں نے استقلال سے کے ساتھ کیا ہو۔ ایسے موضوع تلاش کیجیے جو پاکستان کے مسلمانوں میں نفرت و حقارت پھیلانے کی بجائے باہمی محبت اور یگانگت کے جذبات پیدا کریں۔ مسلمانوں نے جس ہمت اور حوصلہ سے موجودہ دور کے مصائب میں کام کیا ہے۔ اس کی بیسیوں زندہ مثالیں موجود ہیں۔ کیا ان مثالوں کو دہرا کر قومی استقلال بلند نہیں کیا جاسکتا۔ اس لیے ایسے موضوع تلاش کیجیے جو ہماری قبیح رسومات کا قلع قمع کرسکیں۔ ایسے موضوع تلاش کیجیے جو پاکستان کے عوام کی فلاح و بہبود کے لئے حکام کو بیدار کرسکیں۔ غرض ایسے موضوع تلاش کیجیے جن سے پاکستان بحیثیت ایک سلطنت ہر لحاظ سے مستحکم ہوسکے۔ چوں کہ ہمارا ایک مخصوص تمدن ہے' ایک مخصوص معاشرت ہے' جو ہندوستان سے بالکل الگ ہے۔ ادیبوں کے لیے ضروری ہے کہ ہماری اس مخصوص تمدنی

اور معاشرتی زندگی کی قدریں متعین کریں۔ جو موضوع تعمیری ادب کے لیے مناسب ہیں وہی موضوع بر تعمیری فن خواہ وہ مصوری ہو نقاشی ہو یا سنگ تراشی ہو کے لیے بھی منتخب کیے جا سکتے ہیں۔

اب تک میں نے پاکستان کے تعمیری ادب کے مسئلے کی طرف آپ کی توجہ مبذول کرائی ہے۔ شاید آپ سمجھتے ہوں کہ جو کچھ میں نے کہنا تھا کہہ دیا مگر نہیں...... تعمیر کا ایک پہلو ابھی باقی ہے۔ ہم نے پاکستان اس لیے حاصل کیا ہے کہ ہم بحیثیت ایک قوم ہندوستان کی باقی قوموں سے علاحدہ ہیں۔ یہ علاحدگی جرمن قوم کی فرانسیسی قوم سے علاحدگی نہیں بلکہ مسلمانوں کی ہندوؤں یا سکھوں سے علاحدگی ہے۔ ہم مسلمان ہیں اس لیے پاکستان میں ہمارا ادب تعمیری ہونے کے ساتھ ساتھ اسلامی بھی ہونا چاہیے۔

جو قوم روحانی طور پر تنزل پذیر ہو چکی ہو وہ مختلف جماعتوں میں بٹ جایا کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج ہم مسلمانوں میں مولوی ایک جماعت بن کر رہ گئے ہیں۔ اس جماعت کا مقصد نکاح خوانی، امامت کرانا یا جنازے پڑھانا ہے۔ یہ جماعت سیاسی اقتدار حاصل کرے وہاں اس کا کام بجائے اجتماعِ امت کا ماحول پیدا کرنے کے قوم میں تفرقہ اندازی ہے۔ چناں چہ یہ جماعت بھی مسلمانوں کے لیے اتنی ہی نقصان دہ ہے جتنے اشتراکی مبلغ۔ علامہ اقبال ان کے متعلق درست فرما گئے ہیں:

دینِ کافر فکرِ تدبیر و جہاد دینِ مُلّا فی سبیل اللہ فساد
زاں سوئے گردوں دلش بیگانہ اے نزدِ او اُم الکتاب افسانہ اے

جس طرح اشتراکی ادیب دعویٰ کرتے ہیں کہ فن کار صرف اپنے فن کے ساتھ ہی وفادار رہ سکتا ہے، حکومت، ملک یا سلطنت کے ساتھ اس کی وفاداری لازمی نہیں۔ اسی طرح مولویت کے یہ علم بردار بھی کہتے ہیں کہ مسلمان صرف اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ وفادار رہ سکتا ہے۔ باقی کسی کے ساتھ اس کا وفادار رہنا ضروری نہیں۔ حالاں کہ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے صاف صاف کہہ دیا ہے۔ 'اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول واولی الامر منکم' ترقی پسند ادیبوں کا فرض ہے کہ ایسی خطرناک مولویت کا خاتمہ کریں۔ اس فرقہ بندی کے بت کو توڑیں۔ کیونکہ تمام مسلمان اللہ کی نگاہ میں یکساں ہیں۔

میں اس بحث کی تفصیل میں پڑنا نہیں چاہتا۔ میرا مقصد صرف یہ ہے کہ اسلامی فلسفہ اور فقہ کی کتابوں کا اردو میں ترجمہ کیا جائے۔ ادیب کندی، فارابی، ابن سینا، ابنِ رشد، ابنِ طفیل، غزالی، ابنِ عربی اور شیخ سرہندی کو پڑھیں۔ عقلیت یا تصوف کی برائیوں پر انگلی رکھیں اور اچھائیوں کو سراہیں۔ ادیب امام ابو حنیفہ، امام حنبل، امام مالک، امام شافعی، شاہ ولی اللہ ایسے فقیہوں کے فتاویٰ کا مطالعہ کریں تاکہ ہمارا تمدنی پس منظر جس سے ہم فی الحال آگاہ نہیں ہیں۔ ہماری نگاہوں کے سامنے روشن ہو جائے۔ ہمیں پاکستان میں فلسفۂ اسلام کے ارتقا اور فقہ کی اصلاح درکار ہے۔ ہمیں اجتہاد کی ضرورت درپیش ہے۔ میں سمجھتا

ہوں کہ یہ فرض ترقی پسند ادیبوں کے فرائض میں سب سے اہم ہے۔ 'مرقع چغتائی' کے دیباچے میں علامہ اقبال تحریر فرماتے ہیں۔ جہاں تک اسلام کی تمدنی تاریخ کا تعلق ہے، میرا یقین ہے کہ فنِ عمارت سازی کے علاوہ اسلامی فنونِ لطیفہ (موسیقی، مصوری بلکہ شاعری تک) کی نمود ابھی باقی ہے۔ فنونِ لطیفہ جن کا مقصد تخلقوا باخلاق اللہ ہے۔ انسان کو اجرِ غیر ممنون سے نوازتے ہیں اور بالآخر اس کے لیے اللہ کے نائب کا مقام پیدا کر دیتے ہیں:

مقامِ آدم خاکی نہاد دریا بند
مسافرانِ حرم را خدا دہد توفیق

ہمیں اپنی تاریخ ازسرِ نو مرتب کرنے کے علاوہ مغربی سائنس، انجینئری کی کتب، ریاضی، نفسیات اور اقتصادیات کی کتابوں کے ترجمے بھی کرنے ہیں۔ ادیب کا مقصد صرف شعر کہنا یا افسانہ لکھنا ہی نہیں بلکہ زندہ قوم کے مجموعی ارتقا کے لیے اسباب بہم پہنچانا ہے۔ ہمارے ترقی پسند ادیب یہ سمجھ جائیں گے تو ہر کوئی اپنے لیے الگ الگ نصب العین متعین کرنے کے قابل ہو سکے گا۔

میرا عقیدہ ہے کہ انسان کی اجتماعی قوتِ ارادی اور وقت کی ضرورت کے مطابق قدرت کوئی ایسی ہستی پیدا کر دیتی ہے جو انسانیت کو وقتی مصائب سے نجات دلا سکنے کی اہل ہوتی ہے۔ انھی اوقات میں دنیا میں پیغمبروں اور مجددوں کی نمود ہوتی ہے۔ ہمارے ملک میں علامہ اقبالؒ کے کلام نے مسلمانوں کی اجتماعی قوتِ ارادی اور وقت کی ضرورت کو منعکس کرنے میں نمایاں حصہ ادا کیا۔ علامہ اقبالؒ کے دیدۂ تر کی بے خوابیوں، ان کے دل کی پوشیدہ بے تابیوں نے فطرت سے کسی صحیح قائد کی تمنا کی۔ حتیٰ کہ ان کی رجائیت پسندی رنگ لائی اور قدرت نے ایک ایسی ہستی پیدا کر دی جس نے ہمیں ریاست پاکستان لے کر دی۔ کیا اب ہمارے تمام مسلمان ادیب اردو ادب کو مسلمانانِ پاکستان کی ان مخلص خواہشات کا آئینہ دار بنا کر فطرت کو کسی ایسی شخصیت کی نمود کے لیے مجبور نہیں کر سکتے جو اس ریاست کی تعمیر بھی کر دے؟ میرے خیال میں ایسا ہو سکتا ہے بلکہ ایسا عنقریب ہونے والا ہے کیوں کہ:

ذرا نم ہو تو یہ مٹی بڑی زرخیز ہے ساقی

ماخذ (اردو۔۵۳)

جنسی موضوع

عزیز احمد

حقیقت نگاری سے ایک اور بڑے اہم مسئلہ کا بہت گہرا تعلق رکھتا ہے اور یہ جنسی موضوع کا مسئلہ ہے۔ یورپ کے جدید ادب میں بھی اس مسئلے کی بڑھتی ہوئی اہمیت کو بار بار محسوس کیا گیا ہے اور اگر چہ کہ دنیا بھر کے ہزاروں برس کے ادب کا ایک لمحہ بھی عشق اور عاشقی کے افسانوں یا چرچوں سے خالی نہیں رہا، لیکن اب پھر یورپ کے جدید ادب میں جنس کے مسئلہ کو وہ اوّلین معاشرتی اہمیت حاصل ہوگئی ہے جو اس سے پہلے اُسے صرف قرونِ وسطیٰ میں حاصل تھی۔ ابسن اور تحریکِ حمایتِ نسواں کے دوسرے سرگرم رہنماؤں نے اس مسئلے کو ادب میں زور وشور سے اٹھایا ہے۔ جنس کے متعلق اتنی چھان بین اور اتنی سائنٹیفک تحقیق ہوئی ہے جو اس سے پہلے کبھی نہ ہوئی تھی۔ فرائڈ نے نفسیاتِ تحلیلی کو دریافت کیا، گزشتہ جنگِ عظیم نے بھی جنس کے مسئلے کی اہمیت کو اور زیادہ واضح کردیا۔ الغرض ان تمام حالات کے یک جا ہونے کی وجہ سے اور یورپ کی اس روز افزوں جنسی آزادی کی وجہ سے، جس کی شکایت حروبِ صلیبیہ کے زمانے کے عرب سوانح میں بھی ہے، بلکہ اس جنسی آزادی کے بہت زیادہ بڑھ جانے اور عورتوں کے دعوئ مساوات کی وجہ سے مرد اور عورت کے جنسی تعلقات کا پرانا معیار بڑی حد تک متزلزل سا ہوگیا ہے۔ ہندوستان میں پردے، عورتوں سے دوری اور دبی ہوئی جنسی خواہشات کی وجہ سے کسی نہ کسی پیرایہ میں نقطۂ نظر رجعت پسندانہ ہو یا ترقی پسندانہ، جنس ہمیشہ دل و دماغ پر حاوی رہی ہے اور اب جب کہ یورپ سے جواز کا فتویٰ مل گیا تو پھر کیا پوچھنا! اقبال کا یہ شعر کبھی پرانا نہ ہوگا ـ

ہند کے شاعر و صورت گر و افسانہ نویس   آہ! بیچاروں کے اعصاب پہ عورت ہے سوار

جنسی مسئلوں کی پیچیدگیوں پر ادب میں ٹھنڈے دل سے غور کرنا اور ان پر بحث کرنا یا ان کا مطالعہ کرنا تو بے شک اس عہد اور خصوصاً ہندوستان میں ایک بہت مفید اور اہم کام ہے، لیکن جنسی موضوع کے طلسم میں گرفتار رہنا، جنس کو آرٹ یا ادب کے لیے مقصود بالذات سمجھنا، ترقی پسندی کی نہیں بلکہ انتہا درجے کے تنزل کی نشانی ہے اور ہمارے ترقی پسند ادب میں ایک ہی قسم کے جنسی موضوعات جس تکرار کے ساتھ ساتھ بار بار دہرائے جارہے ہیں، ان سے یہ اندیشہ پیدا ہو چلا ہے کہ شاید ہم پھر پرانی داستانوں کے عشقیہ ماحول کی طرف واپس جارہے ہیں۔ کبھی کبھی تو پڑھنے والے کو شک ہوتا ہے

کہ خود مصنف کے نفسیاتی تجزیے کی بڑی سخت ضرورت ہے۔ اردو ترقی پسند ادب میں یہ جنس پرستی غالباً ڈی ایچ لارنس کے اثر سے آئی ہے جو سعادت حسن منٹو اور عصمت چغتائی کے افسانوں میں ابتذال کی حد تک بڑھ گئی ہے۔ انگریزی تنقید نگار ڈی ایچ لارنس کی تصانیف کو وہ اہمیت نہیں دیتا جو اب سے چند سال قبل انھیں حاصل تھی کیوں کہ اب نفسیاتِ تحلیلی کا علم بھی ترقی کر چکا ہے۔ اب یورپی ادب کی جدید ترین تحریکوں کا رجحان کھلم کھلا جنس پرستی کے بجائے رمزیت کے ایسے اسالیب کی طرف ہے جن میں جنسی مسئلوں کو پوری واجبی اہمیت تو حاصل ہے، مگر جنس کا سوال حد سے زیادہ تجاوز نہیں ہونے پاتا۔

یہاں ترقی پسند ادیب (یا ان میں سے وہ دو یا تین ادیب جو جنسی عریاں نگاری کے بڑے حامی ہیں) یہ کہیں گے کہ اردو ادب کا دامن جنسی مضامین سے خالی کب تھا! 'داستانِ امیر حمزہ' اور 'باغ و بہار' پڑھیے، سودا کی مثنویاں، 'گلزارِ نسیم'، 'زہرِ عشق'، 'بہارِ عشق' اور مومن کا کلام پڑھیے آپ کو جنسی ابتذال بھی ملے گا اور جنسی موضوع مقصودِ بالذات حیثیت سے بھی، پھر ہم نے کیا قصور کیا ہے! اس کا جواب یہ ہے کہ اسی وجہ سے تو ترقی پسند ادب کو جنسی موضوعوں کی غلامی توڑنے کی اور بھی زیادہ کوشش کرنی چاہیے۔ جس طرح ترقی پسند ادیب بہت سی پرانی قدروں کو سرمایہ داری کا 'افیون' قرار دیتے ہیں، انھیں یہ سمجھنا چاہیے کہ جنس میں ہمہ وقتی آلودگی سب سے تیز افیون ہے۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ وہ جنسی موضوعوں کو بالکل ترک کر دیں، نہ اس کا یہ مطلب ہے کہ وہ جنسی اصلاح کی کوشش نہ کریں۔ لیکن میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ 'لحاف' اور 'پھسلن' جیسے افسانوں سے سوسائٹی کی جنسی اصلاح نہیں ہو سکتی، جنسی تخریب ہوتی ہے۔ ناتجربہ کار لڑکوں اور لڑکیوں کے لیے اس قسم کے افسانوں کا اثر بُرا ہی ہوگا اور اُن کے لیے یہ افسانے تخریبی ترغیب کا باعث ہو سکتے ہیں۔ ان کی روحِ عمل اور غالباً ان کی نیت بھی ترقی پسندی کے مقاصد کے عین خلاف ہے۔ جنسی مضامین میں تفصیلی حقیقت نگاری نہ سائنسی اہمیت رکھتی ہے نہ ادبی، جنس کی تفصیلی حقیقت نگاری کا مقصد محض شہوانی ہو سکتا ہے۔ شہوانیت کا تجاوز قوم کے قوائے عمل پر بُرا اثر کرتا ہے۔ اوّل ہی رکاوٹوں اور پابندیوں کی وجہ سے ہندوستان میں جنسی رجحان ضرورت سے زیادہ ہے، شہوانی ادب سے یہ رجحان اور زیادہ پستی اور زیادہ رجعت کی طرف مائل ہو جاتا ہے۔

میں مانتا ہوں کہ خاندان یا گھریلو زندگی کا تصور پرانے سرمایہ دار دَور کی قدور کا نتیجہ ہے، لیکن ہمارے ادیبوں کو یہ یاد رکھنا چاہیے کہ وہ سویٹ روس یا جدید انگلستان میں نہیں بلکہ موجودہ ہندوستان میں لکھ رہے ہیں۔ ہندوستان میں تعلیمِ نسواں کی کمی کی وجہ سے جنس پرستی کے افسانوں کا خطرہ اور زیادہ ہے۔ وہ لڑکیاں جو ابھی اسکولوں ہی میں پڑھتی ہیں لیکن جو اردو اچھی خاصی پڑھ لیتی ہیں، تعداد میں کالج کی پختہ لڑکیوں سے، جو ایسے افسانوں کو بہ حیثیت ادب، یا بہ حیثیت فلسفۂ زندگی زیادہ تنقیدی

نظروں سے دیکھتی ہیں، بہت زیادہ ہیں۔ یہ نوعمر لڑکیاں ان افسانوں کے نام نہاد 'ترقی پسند' عنصر کو تو خاک بھی نہیں سمجھ سکتیں، لیکن شہوانی اور جذباتی عناصر ان پر براہ راست فوراً اثر کرتے ہیں اور یوں بھی سچ پوچھیے تو اگر آزادیٔ رائے اور جنسی آزادی اور انفرادیت کے عناصر نکال لیجیے تو ان سب افسانوں میں بجز مریضانہ شہوانیت اور سستی، گندی جذبات پرستی کے اور رہ ہی کیا جاتا ہے!

بعض اردو افسانوں میں یورپ کی بعض ممنوعہ کتب کی تقلید کی وجہ سے، جنسی غلط کاریوں اور جنسی اصل کی دماغی بیماریوں کا موضوع اختیار کیا گیا ہے۔ کبھی تو ان افسانوں کے لکھنے والے اپنا بہانہ جواز حقیقت نگاری کو قرار دیتے ہیں اور کبھی معاشرت کی اُن سخت گیر پابندیوں کو جن کی وجہ سے یہ غلط کاریاں پھیلی ہیں۔ اگر نقطۂ نظر اصلاحی ہو تو شاید ان موضوعوں میں کوئی ہرج نہ ہوتا مگر ان موضوعوں پر افسانے کچھ ایسا مزہ لے لے کر لکھے جاتے ہیں، مثلاً سعادت حسن منٹو کا 'دھواں' اور 'بلاؤز'، عصمت چغتائی کا 'لحاف'، اور 'جال'، محمد حسن عسکری کا 'پھسلن' اور ممتاز مفتی صاحب کے افسانے (جو کم و بیش کہیں نہ کہیں سے ماخوذ ہوتے ہیں)، کہ نوجوان اور نا تجربہ کار ناظر یا ناظرہ پر ان کا اثر جذبات انگیزی ہی ہو سکتا ہے نہ کہ اصلاحی۔ ایسے افسانوں سے جنسی جذبات اور زیادہ مریضانہ ہونے لگتے ہیں۔ ایسی حقیقت نگاری جو زندگی کو مرض میں تبدیل کر دے کس کام کی اور اس پر حقیقت نگاری کا اطلاق ہی کیسے ہو سکتا ہے! ممکن ہے کوئی ادیب یا ادیبہ یہ فرمائیں کہ یہ معاشرے کے ناسور ہیں اور ہم ان ناسوروں کو دکھا رہے ہیں۔ میں پوچھتا ہوں کہ ناسور کا کوئی علاج آپ کے پاس ہو تو ایک بات بھی ہے، علاج بتائیے۔ ناسور دکھا کے کیا کیجیے گا اور چوں کہ آپ کو علاج کرنا نہیں آتا تو کیوں آپ ان ناسوروں کو ہوشیار اور ماہر ڈاکٹروں کے علاج کے لیے نہیں چھوڑتے! زیادہ چھیڑنے سے ممکن ہے کہ معاشرے کے ناسور بڑھ ہی جائیں۔

حقیقت نگاری اور جنسی موضوع کی بحث کے سلسلے میں آخر میں مجھے یہ کہنا ہے کہ اگرچہ اعلیٰ ترین ادب کا موضوع بھی کبھی جنس کا کوئی مسئلہ ہو سکتا ہے (جیسے 'اوتھیلو' میں)، لیکن بالعموم اعلیٰ ترین ادب اور اعلیٰ ترین حقیقت نگاری کے موضوع اکثر مسائلِ جنس (جن کا اہم ترین پہلو مسئلہ افزائش و تعلیم نسل ہے) سے ماورا اور بالاتر ہوتے ہیں۔ یہ اب سے نہیں، ہمیشہ سے ہوتا آیا ہے۔ زندگی کی بہت سی قدور ہیں، ایسی قدور جو انسان کو جنس کی محض حیوانی حدوں سے پرے لے جاتی ہیں۔ جنس کو بھی اس کی واجبی جگہ بے شک حاصل ہے۔ ہومر کا اصل موضوع ہیلن کا اغوا نہیں بلکہ دو تمدنوں، دو طرزِ خیال، دیوتاؤں کے دو تصوراتی گروہوں، مسئلہ جبر و قدر کے عمل اور ردِ عمل، انسان کی خارجی اور داخلی شجاعت کی آویزش ہے۔ دانتے کا موضوع جنس نہیں، جنس سے بہت بلند ہے، اگرچہ بیاترچے فردوس میں بھی اس

کی رہنمائی کرتی ہے اور وہ شعلہ پوش جہنم میں پاؤلو اور فرانچسکا کو ہم آغوش دیکھتا ہے۔ شیکسپیئر کے ڈراموں میں 'اوتھیلو'، 'انتونی اور' 'کلوپیٹرا اور' 'رومیو اور' 'جولیٹ' کے سوا کسی اور ڈرامے کا مرکزی موضوع جنس نہیں۔ ان تینوں ڈراموں سے یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ کسی اور چیز کی طرح عشق کا حد سے زیادہ تجاوز کس قدر خطرناک ہوتا ہے۔ دنیا بھر کے اعلیٰ ترین شعرا نے جس عشق کو سراہا ہے' اس میں جذباتِ جنسی کو صرف ایک مناسب جگہ حاصل رہی ہے اور جس قوم پر جذباتِ جنسی اور جنسی مصروفیتیں ضرورت سے زیادہ حاوی ہیں اس کا زوال یقینی ہے۔ رومۃ الکبریٰ اور بغداد اور خود اپنے زمانے میں فرانس کی تباہی ہماری نظروں کے سامنے ہے۔

ماخذ (اُردو۔۴۰)

جنسی حقیقت نگاری

ممتاز شیریں

ہمارے ہاں جنس پر بہت لکھا جا رہا ہے، جنس زندگی کا ایک بہت اہم جزو ضرور ہے، لیکن اس پر ضرورت سے زیادہ توجہ دی جا رہی ہے۔ شاید مغربی ادب کی ۱۹۲۵ء کے بعد کی جنسی حقیقت نگاری کی تقلید اب ہو رہی ہے۔ ہم تقلید بھی بیس برس بعد کرتے ہیں، جنسی بھوک، جنسی آسودگی، جنسی بے راہ روی بس انھیں کے ذکر سے ہمارا ادب بھرا پڑا ہے۔ مرد کی تصویر بھی سیاہ ہے اور عورت کی بھی۔ افسوس تو یہ ہے کہ عورت کے قلم سے کھینچی ہوئی عورت کی تصویر بھی سیاہ ہے۔ 'سوگندھیاں' (ہتک: منٹو) اور 'جینائیں' ('چپ' / ممتاز مفتی) کتنی زیادہ ہیں، شمی ('گرم کوٹ') صفیہ (نیلی) اور 'آپا' کتنی کم! حالاں کہ ہندوستان میں انھیں کی تعداد زیادہ ہے۔ شاید ترقی پسند یہ کہیں کہ ہمیشہ جنسی برائیوں کا ہی ذکر اس لیے کیا جاتا ہے کہ برائیاں محض سماجی حالات کا نتیجہ ہیں اور سماجی حالات کو بدلنا ہو تو برائیوں کو اپنی کریہہ صورت میں پیش کرنا ہوگا۔ لیکن پورے جنسی ادب کا ہم جائزہ لیں تو اس میں بہت کم سماجی مسائل ملیں گے۔ لے دے کر طوائف کا ایک موضوع ہے، یا ایک بوڑھے مرد اور جوان لڑکی کی بے جوڑ شادی کا۔ ان موضوعوں پر بیسیوں افسانے لکھے گئے ہیں اور لکھے جا رہے ہیں، لیکن کتنے اہم مسائل چھوئے تک نہیں گئے۔

زیادہ تعداد میں ایسے افسانے ہیں جن میں منفرد کرداروں کی جنسی بے راہ روی یا عیاشی کا ذکر ہوتا ہے۔ ان افسانوں کے انفرادی ہونے سے کوئی گلہ نہیں۔ آخر ایک فرد کے احساسات، اس پر گزرے ہوئے واقعات بھی اہم ہیں، گلہ اس بات سے ہے کہ آخر انسان کو ہمیشہ حیوان کے روپ میں کیوں پیش کیا جائے! جدید افسانہ نگاروں کو جنسی بدعنوانیوں کا ذکر کرنے کا خبط ہے۔ ترقی پسند ادب میں عریانی اور فحاشی پر آئے دن بحثیں ہوتی ہی رہتی ہیں! اس لیے یہ الزام بھی بے بنیاد نہیں ہے۔ ممکن ہے بعض ادیبوں کے ارادوں میں واقعی خلوص ہو اور گناہوں کو اپنی کریہہ صورت میں پیش کرنے سے ان کا مقصد ان سب سے نفرت دلانا ہو۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بعض لوگ تو 'سیکس' کو فیشن سمجھ کر خواہ مخواہ عریاں حقیقتوں کو اجاگر کرتے ہیں جب کہ بعض عریاں نگاری کو اپنی جرات کا اظہار سمجھتے ہیں یا محض ضد اور بغاوت۔

مخصوص باتوں کو کھلے طور پر بیان کرنا بجائے خود فحاشی ہرگز نہیں، اس کا انحصار پیش کرنے کے انداز اور مواقع پر ہے۔ ہم اس سے انکار نہیں کر سکتے کہ ایسے افسانے بھی لکھے گئے ہیں، اور لکھے جا رہے ہیں، جو کہ گناہ آمیز غلاظت میں ڈوبے ہوئے معلوم ہوتے ہیں اور ایسے افسانوں میں یوں اضافہ ہوتا جا رہا ہے کہ نئے لکھنے والے پہلے کی چند مثالیں دیکھ کر تقلید کرتے ہیں۔ پھر ان کے بعد جو آتے ہیں ان کی تحریروں میں عریانی اور بڑھ جاتی ہے، یہاں تک کہ مبتدی اور معمولی لکھنے والے، عریانی کو اپنے افسانے کے اچھے اور ترقی پسند ہونے کی سند میں پیش کرتے ہیں۔ ترقی پسند ادب پر فحاشی کے الزام کے جواب میں ترقی پسند اکثر یہ کہتے ہیں کہ لوگ ایسے افسانے پڑھ کر اس لیے جھنجلا اٹھتے ہیں کہ یہ اُن کا پول کھولتے ہیں۔ یہ محض 'چور کی داڑھی میں تنکا' والا معاملہ نہیں ہے۔ ممکن ہے بعض لوگوں کی طبیعت پر ایسے افسانے اس لیے گراں گزرتے ہوں کہ یہ ان کی جمالیاتی حس کو ٹھیس پہنچاتے ہیں، اور پڑھنے والوں میں ایسے بھی ہیں، جنھیں ایسے افسانوں سے، اکتاہٹ ہوتی ہے، اس لیے نہیں کہ یہ ان کا پول کھولتے ہیں بلکہ اس کے برخلاف اس لیے کہ ایسا جنسی ادب ان کی زندگی کو نظرانداز کر رہا ہے......

آپ ہی کا 'لحاف' گندہ ہے، آپ ہی کے جسم سے یہ 'بو' آتی ہے، کہہ کر چپ ہونے کی بجائے، ہمیں چاہیے کہ اس شکایت پر غور کریں، اس معاملے پر توجہ دیں اور جنسی ادب میں سنجیدگی، توازن اور اعتدال پیدا کریں۔ جنس میں لتھڑے ہوئے افسانے کی بجائے، جنس میں زندگی کو پیش کریں۔

ماخذ (اُردو۔۲۸)

مزاج اور طبیعت کا میل

اوپندر ناتھ اشک

اُن دنوں عریاں نگاری کو ترقی پسندی سمجھا جاتا تھا۔ احمد علی، عصمت اور منٹو اس کے علم بردار تھے۔ کرشن کھل کر نہ کھیلتے تھے لیکن انھوں نے بھی اپنی کہانیوں کا ایک فارمولا بنا رکھا تھا جس میں وہ رومان انگیزی اور ترقی پسندانہ طنز میں تھوڑی سی عریانی بھی ملا دیتے تھے۔ میرا کہنا تھا کہ عورتوں کی عصمت فروشی اور آبرو ریزی کے علاوہ بھی بیسیوں مسائل ہیں جو اتنے ہی اہم ہیں لیکن نہ جانے کیوں اُس وقت ترقی پسندوں کو عریاں نگاری اور گھٹیا درجے کی طوائفوں کے چوباروں میں تعلیم یافتہ نوجوانوں کا مارے مارے پھرنا ہی واحد موضوع سوجھتا تھا۔ جب میں کرشن سے کہتا کہ یہ ترقی پسندی نہیں تو کرشن کہتا کہ چوں کہ تم یہ سب لکھ نہیں سکتے اس لیے تمھیں منٹو اور کرشن (وہ اپنے کو بھی شامل کر لیتا) سے حسد ہوتا ہے۔ ایک دن منٹو نے بھی کچھ ایسی ہی بڑ ہانکی تو میں نے طے کیا کہ میں بھی ایک ایسا ہی افسانہ لکھوں گا۔ یہ یاد نہیں کہ کسی نے موضوع تجویز کیا یا میں نے اپنے آپ لکھا، لیکن ہم دونوں ایک ہی موضوع یعنی 'نوکروں کے سامنے مالکوں کی جنسی بے پروائی' پر افسانے لکھے، منٹو نے 'بلاؤز' اور میں نے 'اُبال'۔ دونوں افسانے 'ساقی' دہلی کے ایک ہی نمبر میں (غالباً کسی سالنامے میں) چھپے۔ 'اُبال' کو دوستوں نے بہت پسند کیا۔ کرشن نے اُسے اس وقت تک کے میرے افسانوں میں بہترین مانا۔ بعد میں اس کا انگریزی ترجمہ شائع ہوا تو وہ بھی کافی پسند کیا گیا۔ 'بلاؤز' اور 'ابال' اس وقت کے میرے اور منٹو کے آرٹ کی نمائندگی کرتے ہیں۔ عریانی دونوں افسانوں میں ایک جیسی ہے۔ مالکوں کی جنسی بے پروائی کا ذکر دونوں افسانوں کے نوکروں پر ایک جیسا ہوتا ہے لیکن جہاں 'بلاؤز' کے انجام کی حقیقت کوری حقیقت ہے وہاں 'اُبال' کے انجام میں نوکر کی ٹریجیڈی کے ساتھ سماجی ٹریجیڈی بھی پنہاں ہے اور افسانہ سماجی حقیقت پسندی کا نمونہ پیش کرتا ہے۔ افسانہ نگار کو حقیقت، جیسی بھی ہے اس کا خاکہ کھینچنے تک ہی اپنے قلم کو محدود رکھنا چاہیے یا اس حقیقت کے پس منظر میں سماج کا بھی جائزہ لینا چاہیے، یہ بحث طویل ہے اور 'فن برائے فن' اور 'فن برائے زندگی' کے پیرو اس موضوع پر ہمیشہ بحث کرتے رہیں گے۔ بہر حال منٹو کے ساتھ ہونے والی چشمک میں میں نے ویسا ہی ایک افسانہ لکھا اور اگرچہ اس کی بڑی تعریف ہوئی لیکن پھر میں نے اس طرف کا رخ نہیں کیا۔ اس لیے نہیں کہ ویسے افسانے لکھنا میں کچھ معیوب سمجھتا ہوں بلکہ اس لیے کہ وہ میرے مزاج اور طبیعت سے میل نہیں کھاتے۔

ماخذ (اُردو۔ ۵۹)

ترقی پسندوں کی نمائندگی

سید سجاد ظہیر

ایک عالم دین کے لیے ترقی پسند تحریک کا ذکر کرتے وقت میراجی وغیرہ کو ترقی پسندوں کا نمائندہ بنا کر پیش کرنا کہاں کی دیانت داری ہے، یہ لوگ ہماری تحریک کے کھلے مخالفین میں سے ہیں۔ پھر اعتراض کرنے والے ان کے ساتھ بھی انصاف نہیں کرتے۔ ان کا ایک مصرعہ، ایک شعر، ایک سب سے خراب نظم یا افسانہ لے کر ان کی ساری نگارشات کو معتوب کر دیتے ہیں۔ کیا میر، سودا، سعدی اور حافظ وغیرہ کے ادب کا جائزہ لیتے وقت ہم ایسا کرتے ہیں، کیا ہم میر کو فحش گو کہتے ہیں چوں کہ انھوں نے 'پاس ہے رنڈی، و لے بے ضعف باہ' قسم کے بھی شعر لکھے ہیں! ترقی پسندوں نے سنجیدہ ادیب ہونے کی حیثیت سے فحاشی کو کبھی نہیں سراہا۔ اور اگر ترقی پسند ادب کی مثال پیش کرنا ہے تو ہمیں پریم چند، جوش، فراق، کرشن چندر، مجاز، ندیم، جذبی، سردار جعفری وغیرہ کے یہاں سے ان کی بہترین چیزیں لے کر پیش کرنا چاہیے۔

رجعت پرستوں کو ہم سے اصل غصہ اس پر نہیں ہے کہ ہم لادین ہیں، فحاشی کرتے ہیں یا بداخلاق ہیں۔ وہ خوب جانتے ہیں کہ ہماری ایمان داری، ہمارا اخلاق اور ہماری حقیقت پسندی اپنی قوم کی بہترین روایات کے مطابق ہے، جس کے ہم خادم ہیں اور پروردہ ہیں۔ خود رجعت پرست خلوت میں 'کار دیگر' کے مرتکب ہوتے ہیں۔ اصل غصہ انھیں اس پر ہے کہ ہم عوام کے دشمنوں کے دشمن ہیں۔ اور ان کے چہروں سے جھوٹے اخلاق اور جھوٹی روحانیت کی نقاب کو اتار دیتے ہیں۔ ایک بہتر زندگی کی تعمیر میں محنت کش عوام کی مدد کرتے ہیں۔ چوں کہ اس بات کی مخالفت عوام کے سامنے نہیں کی جا سکتی، اس لیے ہم پر جھوٹے اور بے بنیاد الزام لگائے جاتے ہیں۔

ماخذ (اُردو۔ ۳۸)

قدامت پرستوں کے حملے

سردار جعفری

دوسرا حملہ قدامت پرست حلقوں کی طرف سے ہوا‘ جو جاگیردارانہ انحطاط کی قدروں کے حامی تھے۔ ان میں پیش پیش وہ لوگ تھے جو روایتی انداز کی غزل پر جان چھڑکتے تھے اور ادب برائے ادب کے قائل تھے۔ انھوں نے ترقی پسند ادیبوں پر اخلاق بگاڑنے اور ادب کو خراب کرنے کا الزام لگایا۔ ان کی پھیلائی غلط فہمیاں بہت دنوں کام کرتی رہیں اور بعض ایسے حضرات بھی جو ابتدا میں تحریک کے ساتھ آئے تھے‘ ان غلط فہمیوں کا شکار ہو گئے اور یہ کہنے لگے کہ ترقی پسند ادیب یا تو مزدوروں اور کسانوں کی باتیں کرتے ہیں یا بہو بیٹیوں کی چادریں اُچھالتے ہیں۔ آگے چل کر اس نے شدید صورت اختیار کرلی اور اب ترقی پسند ادیبوں پر فحش نگاری اور عریانی کا الزام لگ گیا اور لطف یہ ہے کہ یہ الزام لگانے والے اُس سماج کے نمائندے تھے جو امانت اور جان صاحب اور چرکیں کو پیدا کر چکا تھا اور جس کے انحطاطی اثرات سے ہمارے اکثر اساتذہ بھی نہیں بچ سکے تھے۔

ماخذ (اُردو۔ ۳۹)

مختلف آوازیں

احتشام حسین

ادھر کچھ دنوں سے یکا یک جیسے لوگ سوتے سے چونک پڑے ہیں اور انھیں اس کا احساس ہوا کہ ادب کے ذریعے سے ان کی زندگی میں زہر گھولا جا رہا ہے، ان کا اخلاق خراب کیا جا رہا ہے، انھیں ہر مسلمہ اصول زندگی سے دور ہٹنے کی تلقین کی جا رہی ہے۔ مختصر یہ کہ ان کے خیال میں لوگوں نے یہ طے کر لیا ہے کہ وہ ہندوستان کے سارے بسنے والوں کی انفرادی، خاندانی اور قومی زندگی کا شیرازہ درہم برہم کر کے دم لیں گے، تہذیب اور اخلاق کا جنازہ نکال دیں گے۔ انجمنیں بن رہی ہیں، جلسے ہو رہے ہیں، کمیٹیاں تحقیقات کرنے اور فرد جرم تیار کرنے کے لیے بنائی جا رہی ہیں، کانفرنسوں کے پلیٹ فارم سے لوگ چیخ رہے ہیں، رسالوں میں مضامین اور نظمیں شائع ہو رہی ہیں: ''مذہب خطرے میں ہے''، ''اخلاق تباہ ہو رہا ہے''۔ راستوں پر یہی باتیں ہو رہی ہیں لیکن مخالفت کرنے والے کہیں بھی کھل کر، صاف صاف یہ نہیں بتاتے کہ واقعی ان چیزوں کا وجود ہے کہاں، ان سے کن لوگوں کو نقصان پہنچا، اس مزعومہ بداخلاقی نے تہذیب کے کتنے ستون ڈھائے!

مختلف سمتوں سے یہی آواز آ رہی ہے، لیکن پتا نہیں چلتا کہ کہنے والے کیا کہہ رہے ہیں۔ معترضین میں سے بعض نے نئے ادب اور جدید شاعری کو نہیں پڑھا ہے، اسے سمجھنے کی کوشش نہیں کی ہے، اس لیے ان سے یہ مطالبہ تو صدا بہ صحرا ثابت ہوگا کہ وہ مہربانی کر کے نئے ادب سے ایسی مثالیں پیش کریں، جنھوں نے واقعی زندگی کو تباہی کے گرداب میں ڈال دیا ہے۔ انھوں نے پڑھا نہیں ہے اس لیے بتا نہ سکیں گے اور اگر بتائیں گے تو اس ادب سے جسے دنیا کا کوئی باشعور ادب تسلیم نہیں کر سکتا، اس لیے ان سے وضاحت چاہنا یا مثالیں مانگنا عبث ہے۔ لیکن افسوس تو یہ ہے کہ وہ ان لوگوں کی باتیں بھی اس مسئلے پر سننے کے لیے تیار نہیں جنھوں نے کچھ وقت اس کے سمجھنے پر صرف کیا ہے۔ ایک طرح کا جنون جس میں غیر شعوری خیالات کے بہت سے اجزا شامل ہیں جو اُن سے مخالفت کی آواز بلند کراتا ہے لیکن اگر ان خیالات کا تجزیہ کیا جائے اور تحت شعور کی وہ باتیں جو مذہب، اخلاق اور شائستگی کے نام سے کی جاتی ہیں، شعور کی سطح پر لائی جائیں تو آسانی سے پتا چل سکے گا کہ یہ خیالات پیدا کیسے ہوتے ہیں۔

جب تک ادب اور اخلاق کے مفہوم کا تعین کسی اجتماعی نقطۂ نظر سے نہ ہو جائے، ان مسائل

کا سمجھنا ممکن نہیں۔ ان میں پہلی ضروری بات تو یہی ہے کہ ہم ادب کے مقصد کو سمجھیں، یہ جانیں کہ شاعر شاعری کیوں کرتا ہے، افسانہ نگار افسانہ کیوں لکھتا ہے! یقیناً اس کا جواب آسان نہیں ہے۔ اگر آسان ہوتا تو پھر 'ادب برائے ادب' اور 'ادب برائے زندگی' کے نظریے مختلف شکلوں میں نہ پیش کیے جاتے۔ پھر بھی جہاں تک مطالعے، تبادلۂ خیال اور غور و فکر سے پتا چل سکا ہے، وہ یہ ہے کہ عام طور پر قدیم نقاد اور شاعر ادب کا مقصد ادب ہی بتاتے رہے ہیں۔ کبھی کبھی یوں بھی کہا گیا ہے کہ ادب کا مقصد تفریح ہے، کبھی بعض کہنے والوں نے یہ کہا ہے کہ ادیب اور شاعر اپنی تسکین کے لیے یا اپنے لیے لکھتا ہے، ممکن ہے یہی صحیح ہو۔ لیکن حیرت تو اس وقت ہوتی ہے، جب وہی قدیم نقاد روایتی ادب سے دلچسپی لینے والے حضرات اور ان کے ہم دردِ ادب میں اخلاق، شائستگی، مذہب وغیرہ تلاش کرنے لگتے ہیں۔ ہم ہر شاعر سے تو نہیں پوچھتے کہ اسے کھانے کی کون سی چیزیں پسند ہیں، وہ مخصوص قسم کا لباس کیوں پہنتا ہے، اس نے ایک سے زیادہ شادیاں کیوں کیں، اس نے اپنے بھائی کو جائیداد سے محروم کیوں کر دیا، اس نے جھوٹی گواہی کیوں دی، اس نے باوجود مقدرت کے بھوکوں کو کھانا کیوں نہیں کھلایا، وہ شراب کیوں پیتا ہے، رہ چلتی عورتوں کو کیوں گھورتا ہے، وہ مسلمان کیوں ہے، ہندو کیوں ہے۔ اور اس طرح کی تمام دوسری باتیں کسی شاعر سے نہیں پوچھی جاتیں۔ ہم ان کے عیوب جانتے ہیں اور خاموش رہتے ہیں اس لیے کہ ہم کسی کے انفرادی اور ذاتی مسئلے میں ہاتھ ڈالنے یا بولنے والے کون ہوتے ہیں!

لیکن اس خیال سے ہم شعر و ادب کا جائزہ کیوں نہیں لیتے کہ وہ ایک شخص کے خیالات ہیں، اس کے جی میں جس طرح باتیں آئیں اس نے بیان کر دیں، اس نے اپنے لیے کہا ہے، اس کا جی چاہا کہ ایسی ہی باتیں کہے۔ لیکن ایسا ہوتا نہیں۔ وہی لوگ جو ادب اور شاعری کو شخصی اور ذاتی سمجھتے ہیں اسے 'دوسروں' کے لیے مضر سمجھنے لگتے ہیں۔ اگر وہ یہ کہیں کہ صاحب اسے دیکھ کر، سن کر، آخر ہماری بیوی بچوں پر بھی تو خراب اثر پڑتا ہے، اس لیے ہم اس کو پسند نہیں کر سکتے۔ ان کہنے والوں سے پوچھنے کو جی چاہتا ہے کیا انھوں نے کبھی اپنے شہر میں تاڑی خانے، شراب خانے اور چکلے نہیں دیکھے!' کیا انھوں نے لوگوں کو قمار بازی میں مصروف نہیں دیکھا، کیا انھوں نے سڑک پر لوگوں کو فحش گالیاں بکتے نہیں سنا!' کیا انھوں نے میاں بیوی کے خراب تعلقات خود اپنے خاندان میں یا اپنے جاننے والوں میں نہیں سنے یا نہیں دیکھے۔ کیا انھیں اس کا علم نہیں کہ باپ نے بیٹوں کے ساتھ اور بیٹوں نے باپ کے ساتھ بُرے برتاؤ کیے ہیں۔ اگر انھوں نے یہ باتیں دیکھی اور سنی ہیں تو اس جگہ وہ اس شدت کے ساتھ اختلاف کی ضرورت کیوں نہیں محسوس کرتے! اگر وہ ہندو ہیں تو سارے مسلمانوں کو کیوں نہیں مار ڈالتے، اگر مسلمان ہیں تو سارے ہندوؤں کا خاتمہ کیوں نہیں کر دیتے! یہ کیا غضب ہے کہ ان کے ہوتے کچھ ایسے لوگ بھی موجود ہیں جو ان کے مذہب کے خلاف آوازیں بلند کرتے ہیں۔ کیا ان کی بیویوں اور ان کے بچوں کو علم

نہیں کہ شہر میں طوائفیں بستی ہیں جو چند سکوں میں اپنا جسم فروخت کرتی ہیں؟ کیا انھیں اس کی خبر نہیں کہ ان کے نصاب میں جو غزلیں داخل ہیں ان میں لیلیٰ اور مجنوں' شیریں اور فرہاد کے نام برابر آتے ہیں' خودکشی اور مرنے کی تمنا کا ذکر آتا ہے' مے کدہ اور مے خانہ کا تذکرہ ملتا ہے' گناہ کی خواہش سے شعرا کے دیوان بھرے پڑے ہیں' وصل کی لذت اور ہجرت کی مصیبت سے اُن کا کوئی صفحہ خالی نہیں۔

اس لیے یہ بات طے کیے بغیر چارہ نہیں کہ شاعر کیا کہے اور کیا نہ کہے' افسانہ نگار کیا لکھے' اسے یہ اچھا اور برا مواد کہاں سے ملتا ہے' کون فیصلہ کرے کہ یہ موضوع اچھا ہے یا برا! اگر شاعر کی انفرادیت پر یہ چھوڑ دیا جائے گا تو پھر کسی کو احتساب کا حق نہ رہے گا اور اگر احتساب ہی کرنا ضروری ہوگا تو ان چیزوں کے خلاف سب سے پہلے علمِ جہاد بلند کرنا ہوگا! جو ہر وقت ہمیں برائیوں کی طرف کھینچتی ہیں' ہر وقت ہمارے اعصاب پر اثر انداز ہوتی ہیں اور ہر لمحہ ہمارے دل و دماغ میں ایک نئی لہر پیدا کر کے اسے ہمارے شعور کا جزو بنا دیتی ہیں۔ یہ تضاد کیسا ہے! ادیب اور شاعر کی انفرادی آزادی کی اہمیت کے اقرار کے ساتھ ساتھ یہ کہنا کہ اسے کچھ باتیں نہ کہنے دی جائیں کیوں کہ وہ اجتماعی اخلاق کو خراب کرتی ہیں' ایک عجیب سی بات ہے۔ اسی بات پر غور کرنے سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ادب کا مقصد اجتماعی ہے' 'ادب برائے ادب' نہیں ہے ورنہ یہ اخلاق اور بداخلاقی کا سوال نہ پیدا ہوتا۔ اس سلسلے میں ایک بات اور سمجھ لینے کی ہے' اگر ہم 'ادب برائے ادب' کو صحیح ادبی نظریہ مانیں گے تو ہمیں لازمی طور پر یہ بھی ماننا پڑے گا کہ شاعر اور ادیب کو کامل آزادی ہے' وہ جو چاہے لکھے اور اس مزاج کی حالت میں ہم اسے بداخلاقی کے مظاہرے پر ٹوک بھی نہ سکیں گے۔ وہ آپ کے لیے کچھ نہیں کہتا' وہ آپ کے بچوں کی پروا بھی نہیں کرتا' وہ تو اپنے لیے لکھ رہا ہے' وہ تو ادب کے لیے لکھ رہا ہے' اس کا اخلاق خراب ہو رہا ہے' آپ کی بلا سے اور ادب تو خیر سے بے جان چیز ہی ہے۔ ان مسائل کو دوسرے لفظوں میں یوں بھی بیان کر سکتے ہیں کہ اگر شعر یا افسانہ ادیب کی انفرادیت کا نتیجہ ہے تو اسے آپ کی پرواہ نہیں۔ اگر وہ آپ کی پرواہ کرتا ہے تو پھر ادب کا کچھ مقصد ہے جسے وہ بھی جانتا ہے اور آپ بھی' یا آپ کو اور اس کو دونوں کو جاننا چاہیے۔ اگر ادب کا کوئی مقصد ہے تو اس کا تعین کون کرے گا' یہ کس طرح ہوگا اور اسے کن لوگوں کے لیے متعین کیا جائے گا!

لیکن اگر اوپر لکھی ہوئی باتیں ذہن نشین ہو جائیں تو پھر صرف ایک ہی نتیجہ نکل سکتا ہے۔ ادب کو انفرادی نہیں اجتماعی خواہشات اور صحت بخش تصورات کا آئینہ ہونا چاہیے۔ اگر ہم نے ادب کو تفریح کی چیز سمجھا تو ہم کو اس بات کا اختیار نہیں کہ ادیب سے اس کی پسند اور اس کی انفرادیت کے علاوہ کسی اور چیز کا مطالبہ کر سکیں' اسے انتشار اور پراگندگی کے عالم میں چھوڑ دینا پڑے گا کہ اس کا جو جی چاہے کہے۔ ایسے ہی لوگ اخلاق اور تمدن کو اپنی ذاتی چیز سمجھ کر جس طرح چاہتے ہیں، استعمال کرتے

ہیں۔ عریاں نگاری اور فحاشی کو بغیر کسی مقصد کے تفریح کی چیز بنانا چاہتے ہیں اور اپنی انانیت کے سامنے کسی چیز کی وقعت، کسی تصور کے تقدس اور کسی خیال کی اجتماعی اہمیت کو ماننے کے لیے آمادہ نہیں ہوتے۔ لیکن چوں کہ سماج کی عملی زندگی میں ایسی بے مہار انفرادیت ممکن نہیں ہے اور کسی نہ کسی نظامِ اخلاق کے سامنے سر جھکانا پڑتا ہے، اس لیے 'ادب برائے ادب' اور 'ادب برائے تفریح' کے ماننے والوں نے ایک دوسری کروٹ لی، حالاں کہ ضرورت کے وقت وہ بھی دوسری طرح کام میں لائی جاتی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم شاعر سے فلسفی اور مفکر ہونے کا مطالبہ نہیں کر سکتے، اس کے یہاں تو لازمی طور پر تضاد ہوگا، وہ نظامِ حیات بنانے کا مدعی نہیں اس لیے اس کا جو جی چاہے کہے۔ اس طرح پھر شاعر بالکل آزاد چھوڑ دیا جاتا ہے۔ لیکن وقت پڑنے پر یہی لوگ شاعر کا کردار اور اخلاق اس کی شاعری سے متعین کرنے لگتے ہیں۔ شاعر کو بھی اس تضاد سے فائدہ اٹھانے کا موقع ملتا ہے، اور وہ اپنی حقیقت کو ظاہر کر کے بھی ظاہر نہیں ہوتا۔ اگر ادب کا مقصد واقعی کچھ نہیں ہے تو پھر علاوہ حُسنِ بیان پر غور کرنے کے نقاد کے پاس اور کیا رہ جائے گا!

ایک شخص کی بہت سی شخصیتیں نہیں ہو سکتیں، کم سے کم اس کی ذمّے دارانہ شخصیت ایک ہی ہوگی۔ شاعر ہو یا ادیب، فلسفی اور مفکر نہ سہی، سماج کا ایک ذمّے دار فرد تو ہے، وہ ایک عام پڑھا لکھا انسان تو ہے! پھر جو مطالبہ ہم ایک عام شہری سے کرتے ہیں وہ شاعر سے کیوں نہیں کر سکتے اور جس وقت ہم یہ امید رکھتے ہیں کہ شاعر چند مطالبات پورے کرے گا، اسی وقت اس کی وہ نراجی شخصیت ختم ہو جاتی ہے۔ تفصیلات میں جانے سے یہ مضمون اپنی حدوں سے بڑھ جائے گا، اتنی بحث سے بھی یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ شاعر یا ادیب اس وقت تک کچھ نہیں کہتا جب تک اس کے پاس کچھ کہنے کو نہ ہو۔ وہ کاغذ قلم لے کر بیٹھ نہیں جاتا کہ لکیریں بناتے بناتے وہ کوئی تصویر بنا لے گا، کوئی شعر یا نظم تیار کر لے گا، کوئی افسانہ یا ڈرامہ لکھ ڈالے گا۔ یہ ادیب کے شعور کی توہین ہے کہ اُسے پراگندہ دماغ سمجھ کر چھوڑ دیا جائے۔ وہ سوچ کر لکھتا ہے، وہ کسی مقصد کے تحت لکھتا ہے، وہ کچھ لوگوں کے لیے لکھتا ہے اور اس طرح اس کا تعلق سماج کے مقصد، وجدان اور تقاضوں سے ہو جاتا ہے اور یہی بات اس کے اندر ذمّے داری کا احساس پیدا کرتی ہے۔ کیا جس وقت وہ اس بات کا خاص خیال رکھتا ہے کہ وہ کوئی لفظ غلط نہ استعمال کرے، کوئی محاورہ غلط نہ لکھ جائے، کوئی فنی غلطی نہ کر جائے، اس وقت اس کے دل میں یہ خیال نہ ہونا چاہیے کہ وہ کوئی بات ایسی نہ کہے جو اس کی ذمّے دار حیثیت کے منافی ہو! یقیناً وہ اس کا خیال کرتا ہے کیوں کہ ہر حال میں خیال لفظوں سے زیادہ اہم ہے۔ اس کے نقادوں نے اسے یقین دلا دیا ہے کہ خیال کے معاملے میں وہ آزاد ہے اس لیے اس کا جو جی چاہے وہ لکھ دے، یہ طریق کار درست نہیں ہو سکتا۔ یہی بات اسے مطالعے سے بھی دور کرتی ہے، وہ سوچتا ہے کہ جب اس کی کوئی ذمّے داری نہیں تو وہ خیال اور مواد کے پیچھے کیوں اپنا

وقت صرف کرے' اس کے جی میں جو آئے گا وہی کہے گا۔ پڑھ کر کیا کرے گا! نقاد کا پھیلایا ہوا زہر فن کار کی رگ میں سرایت کر جاتا ہے اور اسے اس میں آسانی نظر آتی ہے کہ وہ خیال کی یکسانی' توازن وغیرہ کی پرواہ نہ کرے۔

اگر اس چیز کو پوری طرح سمجھنا ہو تو نقاد اور فن کار دونوں کے شعور کا جائزہ لینا ضروری ہو جاتا ہے کیوں کہ جو نقاد یہ کہتا ہے کہ شاعر سب کچھ کہنے کے لیے آزاد ہے اور جو فن کار یا نقاد اپنی انفرادی خواہشات کے سامنے کسی نظامِ حیات کی پرواہ نہیں کرتے وہ دونوں در پردہ حالات کو اسی طرح رہنے دینا چاہتے ہیں' جیسے وہ ہیں' وہ کسی طرح کی تبدیلی کی خواہش نہیں رکھتے۔ بلکہ تبدیلی کی خواہش رکھنے والوں کو ادب اور فن کا دشمن جانتے ہیں۔ یہ تاریخ اور عقل سے لڑائی ہے۔ یہ لوگ اس بات پر غور نہیں کرتے کہ جس سطح پر آج وہ ہیں، وہ ازلی اور دائمی نہیں بلکہ انسانوں کی ہزارہا سال کی کش مکش کا نتیجہ ہے۔ کوئی ادیب یا شاعر بغیر عقل اور ذہن کو کام میں لائے ہوئے کیوں کر کوئی ایسی چیز لکھ سکتا ہے' جسے پڑھے لکھے لوگ پسند کریں' اور جب وہ عقل سے کام لے گا تو ضرور اس کے پاس سوچنے کا کوئی طریقہ ہوگا۔ اس لیے شعور کا سوال پیدا ہوتا ہے کہ شعور کیا ہے! اس پر زیادہ لکھنا اس وقت ممکن نہیں' یہ فلسفے کا ایک اہم مسئلہ ہے' تاہم اس مقصد کو واضح کرنے کے لیے سیدھے سادے الفاظ میں اسے یوں کہہ سکتے ہیں کہ انسان کا شعور ان سیاسی' معاشی اور معاشرتی حالات کا نتیجہ ہوتا ہے جن میں ایک شخص حرکت کرتا ہے۔ طبقات اپنے اپنے فائدے اور نقصان کے نقطۂ نظر سے ایک ہی نظام کو مختلف جگہوں سے دیکھتے ہیں' اس لیے ایک طبقے کا شعور دوسرے طبقے کے شعور سے مختلف ہوتا ہے۔ پھر یہ شعور جب ایک دفعہ پیدا ہو کر اپنے گردوپیش تہذیب وتمدن کا ڈھانچہ بنالیتا ہے تو انسانی ذہن بدلتے ہوئے حالات میں بھی اپنے ہی بنائے ہوئے نظامِ تخیل کو بدلنا نہیں چاہتا۔ بڑے پُرخلوص طریقے پر وہ یہی محسوس کرتا ہے کہ اگر یہ نظامِ اخلاق بدل گیا تو اقدار کی دنیا میں عظیم الشان انتشار پیدا ہو جائے گا۔ یہی ذہنی رکاوٹ بعض لوگوں کو تغیر کے تصور کے بالکل خلاف کر دیتی ہے اور بعض لوگ تغیرات سے اس لیے خوف زدہ ہوتے ہیں کہ ان کی اقتصادی بنیادیں ہل جائیں گی۔ وہ تغیرات کی اس لیے مخالفت کرتے ہیں کہ ان کی ذہنی آسودگی کی دنیا تباہ ہو جائے گی' ان کا جذباتی سہارا مٹ جائے گا اور ایک جذباتی سہارے کو توڑ کر دوسرا جذباتی سہارا ڈھونڈ نکالنا آسان نہیں۔

بات کہاں سے کہاں تک پہنچ گئی! ذکر اس کا تھا کہ ادیب یا شاعر اپنے شعور کو کام میں لاتا ہے تو اسے بے مہار نہیں چھوڑا جا سکتا کہ اس کا جو جی چاہے کہے' اور اگر اسے کسی مقصد کا پابند بنایا جائے تو ظاہر ہے کہ اس مقصد کو اجتماعی ہونا چاہیے اور اس کا تعین خالص ادبی نقطہ نظر سے نہیں ہونا چاہیے۔ حقیقت یہ ہے کہ خالص ادبی نقطۂ نظر کا وجود ہی نہیں ہے۔ اگر خالص ادبی نقطۂ نظر ہوتا تو پھر یہ سوال

پیدا نہ ہوتا کہ کوئی نظم یا کوئی افسانہ بعض لوگوں کے مقرر کیے ہوئے نظامِ اخلاق کے معیار پر پورا اترتا ہے یا نہیں۔ یعنی اگر خالص ادبی نقطۂ نظر ہوتا تو عریاں نگاری، فحاشی، لامذہبیت وغیرہ کا ذکر نقادوں کی زبان پر نہ آتا۔ مگر یہ عجیب بات ہے کہ وہی لوگ جو خالص ادبی نقطۂ نظر کے حامی ہیں، جو لکھنے والے کو کامل آزادی دینا چاہتے ہیں، ہر تحریر کو کسی نہ کسی نظامِ اخلاق و معاشرت کی کسوٹی پر ضرور پرکھتے ہیں۔ وہ ایک جانب تو غیر افادیت اور عدم مقصدیت کی آواز بلند کرتے ہیں، دوسری طرف افادیت اور مقصدیت کا نام لیتے ہیں۔ یہ تضاد فلسفۂ عینیت کی خصوصیت ہے اور ایسے لوگ نظریہ اور عمل، قول اور فعل میں مطابقت کی ضرورت نہیں محسوس کرتے۔ یعنی وہ اپنے مضامین اور اشعار میں شراب پینے کی خواہش کے اظہار کو اچھا سمجھتے ہیں لیکن شراب پینے کو بُرا جانتے ہیں، وہ گناہ کی خواہش کے اظہار کو لطیف جانتے ہیں لیکن گناہ کو برا کہتے ہیں وہ اشعار میں خدا اور مذہب کی توہین کو صرف شاعری بتاتے ہیں اور دوسری صورت میں ویسے ہی ذکر کو غیر مذہبی کہتے ہیں۔ مثالیں ہر ملک، ہر زمانے، ہر قوم اور تقریباً ہر ادیب یا شاعر کے یہاں سے نکالی جاسکتی ہیں مگر اس مقالے کا یہ مقصد نہیں، اس مضمون میں تو صرف یہ سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے کہ آج جن لوگوں کی جانب سے ترقی پسندوں یا نئے ادب پر (اگرچہ یہ بات بھی یاد رکھنے کی ہے کہ ہر نیا ادب ترقی پسند نہیں ہے، ہر نئے ادیب کو اس کے مخصوص ذہنی اور معاشرتی روابط کے ساتھ جانچنا چاہیے)۔ اس طرح کے الزام لگائے جارہے ہیں کہ وہ کسی نظامِ اخلاق کی پرواہ نہیں کرتے، وہ نہ تو ادب کے تغیر پذیر مفہوم سے واقف ہیں اور نہ اخلاق کے، وہ چند جامد اور فرسودہ روایتی خیالات کے پابند ہیں جو کسی مخصوص ماحول میں ادب اور اخلاق کے بارے میں قائم کیے گئے تھے۔ انھیں اس کا اندازہ نہیں کہ ادب اور اخلاق دونوں تغیر کی رو سے گزرے ہیں، گزر رہے ہیں اور گزریں گے۔

اخلاق کیا ہے! کیا ساری دنیا میں ایک ہی نظامِ اخلاق رائج ہے! کیا ہر زمانے میں ایک ہی قسم کا اخلاق رہا ہے! اخلاق پیدا کن حالات میں ہوا! کیا ہر طبقے کے لوگ اخلاق کے ایک ہی مرتبے پر فائز ہیں! کیا کوئی ایسا نظامِ اخلاق بنایا جاسکتا ہے جسے سب اپنے لیے مفید جانیں! سچ تو یہ ہے کہ ان سوالات کا جواب دینے سے پہلے تمدن کی تاریخ پر نظر ڈالنا ضروری ہوگا، جس کا یہ موقع نہیں۔ ہاں نتائج سے فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے، ان بدیہیات پر نظر ڈالی جاسکتی ہے جن سے انکار ممکن نہیں ہے۔ زیادہ گہرے، فلسفیانہ مباحث میں پڑنے کی بجائے، مثالوں سے اخلاق کے مسئلے کو سمجھنا چاہیے۔ آقا کا اخلاق یہ ہے کہ وہ اپنے نوکر کو معمولی خطا پر جوتے لگائے اور نوکر کا اخلاق یہ ہے کہ وہ سر نہ اٹھائے۔ سرمایہ دار کا اخلاق یہ ہے کہ وہ تو مزدوروں کو ان کی محنت کا پھل نہ دے اور ان کی گاڑھی کمائی سے نفع اٹھائے، اپنے ہی بنائے ہوئے ایک نظامِ اخلاق کے مطابق دنیا کو لوٹے مگر مزدوروں کو چاہیے کہ وہ اس کے خلاف

بغاوت نہ کریں۔ سخاوت ایک اچھا فعل ہے، مہمان نوازی کا کیا کہنا، مدرسوں اور اسپتالوں کی امداد کرنا بھی خوب ہے لیکن کیا ان باتوں پر عمل پیرا ہو کر، خوش خلق بننے کا حق اس غریب کو بھی ہے جس کے پاس اپنے بچوں کا پیٹ بھرنے کے لیے کچھ نہیں ہے! اگر وہ فقیروں کو بھیک نہیں دیتا، اگر وہ مہمان نوازی کے فرائض انجام نہیں دیتا تو کیا ہمیں حق ہے کہ اسے کج خلق کہیں! کل تک جب اس کے پاس دولت تھی وہ بھی ان اخلاقی فرائض سے غافل نہیں تھا، اس لیے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اخلاق کے ان اصولوں کے برتنے کا تعلق معاشی اور معاشرتی حالت سے ہے جنھیں کھاتے پیتے لوگوں نے بنایا ہے۔ پھر کوئی یہ بھی نہیں کہہ سکتا کہ کیوں نہ غریب بھی اپنی حالت درست کرے کیوں کہ اس کا سیدھا جواب یہی ہے کہ اونچے طبقات اور حکومت نے اسے اس کا موقعہ نہیں دیا۔

آج بنگال میں جوان لڑکیاں اپنی عصمت ایک وقت کی خوراک کے لیے بیچ رہی ہیں، مائیں اپنے جگر کے ٹکڑوں کو چند پیسوں میں اپنے پاس سے جدا کر رہی ہیں، کیا ہم کو حق ہے کہ ہم ایسی عورتوں کو بداخلاق کہیں؟ کیا پردے کا رواج جو پہلے تھا وہی اب بھی ہے! کیا پہلے جو خلوص لوگوں میں تھا اب بھی وہی ہے! کیا امرا جس طرح بہت سے شاعروں اور ہنرمندوں کا پیٹ پالتے تھے، اب بھی وہی صورت ہے! اگر ایسا نہیں ہے تو ہمیں سمجھنا پڑے گا کہ بعض حالات کے بدل جانے کی وجہ سے یہ تبدیلیاں ہو رہی ہیں۔ جنھیں بنیادی جذبات کہا جاتا ہے آج ہمیں ان کی پیدائش کا حال بھی معلوم ہو چکا ہے، اور جنھیں تمدن کے نہ بدلنے والے مظاہر سے تعبیر کیا جا رہا تھا، وہ بدل گئے ہیں۔ علم الحیات، نفسیات، تجزیہ نفس، تشریح الاعضا، صنفیات ہر ایک میں تحقیقات کا سلسلہ جاری ہے، ہمارے لیے مفید نتائج برآمد ہو رہے ہیں، ہمارے آباؤ اجداد کے پاس یہ علوم نہ تھے۔ جو علوم ان کے پاس تھے، انھوں نے ان سے فائدہ اٹھایا تھا، جنھیں ہم نے حاصل کیا ہے، ان سے ہم فائدہ اٹھائیں گے۔ ممکن ہے یہ نتائج غلط ہوں لیکن آج تو وہی ہمارے مسائل حل کر رہے ہیں، ہماری تشکیل کے لیے یقین کے دروازے کھول رہے ہیں، ہمارے انتشار اور پریشان طبعی کو سکون اور آسودگی میں تبدیل کر رہے ہیں۔ تو کیا ہم ان سے منہ موڑ کر گزر جائیں! ان علوم نے ایک نیا انسان پیدا کیا ہے جو خارجی حالات کی مدد لے کر اپنے اندر ایک نئی داخلیت، ایک نیا وجدان، ایک نیا ذوق سلیم پیدا کر رہا ہے۔ اس نے نئے علوم کی عینک لگائی ہے اور وہ ہر چیز کا تجزیہ کرتا ہے، وہ کسی چیز کو صرف اس لیے ترک بھی نہیں کرتا کہ اس کے بزرگوں نے اس کے لیے کوئی روایت نہیں چھوڑی۔ ظاہر ہے کہ یہ دور خالص کش مکش کا ہے، خارجی زندگی کی کش مکش، باطنی زندگی پر بھی اثر انداز ہو رہی ہے اور نئی نسل کے ٹکڑے ٹکڑے ہوئے جا رہے ہیں۔ اس طرح ان کی ذہنی ساخت ان لوگوں سے بالکل مختلف ہے جو ان سے پہلے گزر چکے ہیں۔

اسی قسم کے لوگ افسانے اور ڈرامے لکھ رہے ہیں اور شاعری کی جانب متوجہ ہیں، اسی نسل

کے لوگ تنقیدیں لکھتے ہیں اور علمی مضامین کے لیے قلم اٹھاتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ وہ کن لوگوں کے جذبات لکھیں، کن لوگوں کے تجربات بیان کریں، اپنے اور اپنی نسل کے یا ان کے جن کے خیالات سے وہ متفق نہیں ہے یا جن کے بارے میں ان کا خیال ہے کہ ان کا بدلنا ہی اچھا ہے۔ ایسی حالت میں دیکھنا یہ باقی رہ جاتا ہے کہ لکھنے والا کس طبقے سے تعلق رکھتا ہے کیوں کہ اس کے طبقے کا جماعتی شعور اس کی نقطہ نظر میں ضرور دخل پائے گا اور یہ کوئی ایسی بات نہیں ہے جو سمجھ میں نہ آسکے۔ روزانہ زندگی میں اس کے مشاہدے ہوتے رہتے ہیں۔ چوں کہ ادب ہوائی قلعہ بنانے کا نام نہیں ہے اس لیے ادیب اور شاعر کا کام یہیں ختم نہیں ہو جاتا کہ وہ ایک حقیقت پسند کی حیثیت سے جو کچھ دیکھتا ہے وہی لکھ دے بلکہ وہ جس طرح محسوس کرتا ہے کہ ایسا ہونا چاہیے اس کا اظہار بھی کرے۔ پڑھے لکھے ہوشیار اور معمولی ادیب میں یہی فرق ہوتا ہے کہ اول الذکر زندگی کی نئی تخلیق کے پہلو پر بھی روشنی ڈال سکتا ہے، بہتر زندگی بسر کرنے کے اصول بھی بیان کرسکتا ہے، ظلم و جور کے خلاف آواز بھی بلند کرسکتا ہے، ناانصافی اور بے اعتدالی پر بھی احتجاج کرسکتا ہے، غلامی اور اقتصادی تاراجی، جنگ اور منافرت کے خلاف علم بغاوت بھی بلند کرسکتا ہے۔ لیکن آخر الذکر چند عام، فرسودہ خیالات کی مصوری ہی کو کافی سمجھتا ہے۔ اچھا ادیب اسے نظر انداز نہیں کرسکتا کہ آقا اور غلام کے، عالم اور جاہل کے، امیر اور غریب کے، حاکم اور محکوم کے اخلاق میں بڑا فرق ہے۔ قوانین اخلاق بھی اونچے طبقے نے بنائے ہیں اور اپنے ہی نقطہ نظر سے بنائے ہیں۔ کچھ لوگ سمجھتے ہیں کہ اسے ایسا ہی ہونا چاہیے اور کچھ لوگ خیال کرتے ہیں کہ ایسا نہیں ہونا چاہیے۔

جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ ہماری اس سلسلے میں کوئی رائے نہیں ہے وہ درپردہ حالات کے بدلنے کے حامی نہیں ہیں، اس لیے ان کا شمار بھی انھیں لوگوں میں ہوگا جو موجودہ نظام زندگی کے خلاف کچھ نہیں کہتے۔ جو لوگ پہلی بات چاہتے ہیں ان کے نقطۂ نظر اور جو دوسری بات کو پسند کرتے ہیں ان کے اندازِ فکر میں فرق ہونا لازمی ہے۔ اگر ادیب یا شاعر اخلاق کو اپنا موضوع بناتا ہے تو اس کے لیے اس کے سوا اور چارہ ہی کیا ہے کہ وہ یا تو تبدیلی چاہے یا نہ چاہے اور جیسے ہی وہ تبدیلی چاہے گا ان لوگوں کی جانب سے اختلاف شروع ہوگا جو تبدیلی نہیں چاہتے۔ مگر جو ادیب مطالعے کے بعد اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ تاریخی حالات تغیر کا مطالبہ کر رہے ہیں، انھیں تاریخ کا ساتھ دینا چاہیے، ان کے خلوص میں شک نہیں کرنا چاہیے۔ ہاں ایک صورت ہے کہ اگر اخلاق کا ایک عام اور یکساں معیار بن جائے اور جب اس کی خلاف ورزی ہو تو لوگ نکتہ چینی کریں۔ یہ صورت آسان بھی ہے اور مشکل بھی۔ اگر ہر شخص کو رہنے سہنے، حالات سے فائدہ اٹھانے اور ترقی کرنے کا یکساں موقع دیا جائے اور طبقاتی تقسیم ختم کر کے ایک انسانی نظامِ حیات بنایا جائے تو اس کا امکان ہے کہ کوئی عام نظامِ اخلاق بھی پیدا ہو جائے اور چوں کہ یہ بات ممکن بھی ہے اس لیے آج بہت سے لکھنے والے کبھی واضح طور پر اور کبھی بالکل مبہم انداز میں، کبھی صرف

وقت کے تقاضے سے متاثر ہو کر اور کبھی شعور کی مدد سے اس کا ذکر بھی کرنے لگتے ہیں۔ جب یہ ذکر سنی سنائی باتوں کا نتیجہ ہوتا ہے تو اس میں بہت سی خامیاں ہوتی ہیں اور یہ جب شعور کا نتیجہ ہوتا ہے تو اس کی بنیاد مضبوط ہوتی ہے جسے آسانی سے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

اس طرح اخلاق جب ادب کا موضوع بنتا ہے تو اس کا اظہار اس شخص کے شعور کی مدد سے ہوتا ہے' جو اس کے بارے میں لکھ رہا ہے اور یہ شعور، انفرادی کم اور طبقاتی زیادہ ہوتا ہے اور یوں اختلاف کا پیدا ہونا کوئی تعجب کی بات نہیں۔ بعض اوقات یہ کہا جاتا ہے کہ پھر بھی کوئی نہ کوئی اخلاقی معیار ہونا ہی چاہیے جس کی پابندی سے سماج میں گندگی پیدا نہ ہو۔ یہ عریاں نگاری' یہ فحاشی جو رائج ہو رہی ہے اسے بند ہونا چاہیے۔ میں جو کچھ اب تک کہہ چکا ہوں اس سے آپ نے یہ نتیجہ ضرور نکالا ہوگا کہ ادیب کی وہ انفرادیت پسندی جو سماج کی خواہشات سے مخالف سمت میں جائے' نا قابلِ ستائش ہے' ضروری ہے کہ ایسے ادب کا گلا گھونٹ دیا جائے جو گندگی پھیلاتا ہے' جو عریانی کی اشاعت کرتا ہے' جو فحاشی کی جانب مائل کرتا ہے۔ عہدِ جدید کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ اچھے لکھنے والوں سے انفرادیت کی نہیں اجتماعیت کی اشاعت کراتا ہے۔ اب اگر دو چار بیمار' جنسی بھوک سے پریشان اور انفرادیت پسند ادیب غیر ذمّے دارانہ طور پر' غیر صحت مند ادب پیدا کرتے ہیں تو اس کی ذمّے داری ان باشعور ادیبوں پر کیوں کر ہو سکتی ہے جو زندگی کا مطالعہ کرنے کے بعد' ادب کو اس سے ہم آہنگ بنانا چاہتے ہیں! عریانی اور فحاشی تو وہی لوگ پسند کر سکتے ہیں جو نراج اور انتشار چاہتے ہیں' جو ادب کے بے مقصد ہونے کے قائل ہیں۔

اگر اس مقالے کا موضوع عریانی یا جنسیت ہوتا تو کسی قدر تفصیل سے اس کا جائزہ لیا جاتا لیکن یہاں بھی' چوں کہ بات آ گئی ہے اس لیے اس کا ذکر کرنا ناگزیر ہو گیا ہے چاہے وہ بہت کم ہی کیوں نہ ہو۔ انسان کی جنسی زندگی اس کی اجتماعی اور انفرادی زندگی میں بہت اہمیت رکھتی ہے۔ ساری دنیا کا ادب عشق اور محبت کی داستانوں سے بھرا پڑا ہے اور یہی ادب اس کی جنسی زندگی کا مظہر ہے۔ صرف اردو ادب کا ذکر نہیں ہر ملک اور ہر قوم کے ادب العالیہ میں جنسی مسائل نے جگہ پائی ہے اور ہر زمانے کے اخلاق نے ان کے اظہار پر پابندیاں عائد کی ہیں' لیکن اُن کا اظہار بھیس بدل بدل کر' کسی نہ کسی صورت میں ضرور ہوتا رہا ہے۔ جب بھی وہ اظہار بھونڈے اور بھدے طریقے پر ہوا ہے' اُسے اچھے ادب میں شمار نہیں کیا گیا۔ یہی بات آج بھی درست ہے۔ وہی باتیں جن کا ذکر ہم بھدے اور غیر شاعرانہ طریقے پر دیکھنا پسند نہیں کرتے' تشبیہ اور استعارے کے پردے میں' حسین اسلوب بیان کرنے کی مدد سے خوش گوار بن جاتی ہیں اور اخلاق کا محتسب ان کو پہچانے بغیر ذہن سے باہر نکلنے اور پسند کیے جانے کی اجازت دے دیتا ہے۔ جنسی مسائل کو زندگی میں جو جگہ حاصل ہے اس کی اہمیت کا تقاضا ہے کہ اسے

تخویف اور تحذیر کا آلہ نہ بنایا جائے' اسے شجرِ ممنوعہ نہ قرار دیا جائے' اس کا صحت بخش علم اس کے بارے میں حکیمانہ معلومات ہماری زندگی کو خوش گوار بنا سکتی ہیں۔ بہت سے اخلاقی عیوب' سماجی بیماریوں اور ذہنی کمزوریوں کا سبب یہ ہے کہ ہم جنسی دباؤ اور جنسی رکاوٹوں کا شکار ہو کر ان کو دعوت دے لیتے ہیں۔ بعض اوقات ہمیں اس کا پتا نہیں چلتا لیکن اب طبی نفسیات کی معلومات نے اس گھن کا پتا دے دیا ہے' جو اندر ہی اندر ہمارے جسم اور دماغ کو کھوکھلا کرتا رہتا ہے' اس لیے صحیح جنسی معلومات سے بداخلاقی کے پھیلنے کا شبہ نہیں ہو سکتا' بلکہ انسان کی جنسی زندگی کو ٹھیک راستے پر لگایا جا سکتا ہے۔ علم الاخلاق کا سب سے بڑا فریضہ یہ ہے کہ جنسی تعلقات کو منضبط کرے اور مرد و عورت کی زندگی میں ایسا توازن قائم کرے جس کی تلاش میں انسان ابتدا سے آج تک سرگرداں ہے، یہ پوشیدہ رکھنے کی بات نہیں ہے' ہاں اسے بیماری نہ بننے دینا چاہیے۔ سو اگر ہم طبی معلومات کے ذریعے سے' اور تجزیہ نفس کی مدد سے اس کا پتا لگائیں کہ جنسیت بیماری کب بنتی ہے تو یہی نتیجہ نکلے گا کہ جاننا بیمار نہیں بناتا ہے' بلکہ نہ جاننا بیمار بناتا ہے۔ اس لیے جنسی زندگی کے بارے میں ایک صاف اور واضح تصور اخلاق کا اہم جزو ہے۔

جب جنسیت ادب کا ایک خاص موضوع ٹھہرا تو ایسی حالت میں تو ہر شاعر اور ادیب کا یہ فرض ہو جاتا ہے کہ وہ اگر جنسی اور صنفی مسائل کو اپنے کلام کا موضوع بنائے تو اپنی ذمے داری کا احساس رکھے۔ اسے یہ سمجھ لینا ہوگا کہ ان مسائل کا غیر شاعرانہ اظہار اور صرف لذتیت کا تصور اسے صحیح ادبی خدمت سے دور کر دے گا۔ جو ادیب عریانی اور فحاشی کو اپنے کلام میں جگہ دیتا ہے وہ سماج میں بیماری پھیلانے کا مرتکب ہے' چاہے وہ قدیم لکھنے والوں میں ہو یا جدید، وہ ہندوستان کا رہنے والا ہو یا کسی اور ملک کا۔ یہ درست ہے کہ مختلف مذاہب اور مختلف ممالک میں جنسی تعلقات کی شکل مختلف رہی ہے' اس کا معیار زمان و مکان کے ساتھ بدلتا رہتا ہے' لیکن کسی ملک یا کسی قوم نے فحاشی یا عریانی کو ادب اور فن کا مقصد نہیں قرار دیا ہے اگرچہ ان کے ذریعے سے ادب اور فن کا اظہار برابر ہوا ہے۔ چوں کہ حقیقت نگاری اور عریانی کی سرحدیں بعض اوقات ایک دوسرے سے مل جاتی ہیں' اس لیے کبھی کبھی دونوں کو ایک سمجھ لیا جاتا ہے حالاں کہ سب سے بڑا فرق جو دونوں میں ہے وہ یہی ہے کہ حقیقت نگاری کے سلسلہ میں اگر عریانی کا اظہار ہو بھی جائے تو وہ مقصد نہیں ہوتا' ایک ذریعہ ہوتا ہے' وہ تعیش یا لذت پرستی کی چیز نہیں ہوتا۔ لیکن اگر اس کا اظہار صرف عریانی اور لذت کے لیے ہو تو وہی مقصد قرار پا جاتا ہے' وہ صرف ہیجان پیدا کر کے چھوڑ دیتا ہے اور میں عرض کر چکا ہوں کہ ایسا ادب اچھا ادب نہیں ہے' اس کا مٹا دینا ہی ہمارا فرض ہے۔

جب ہم اس خاص قسم کے ادب کو ختم کرنے کے لیے اٹھیں تو حقیقت نگاری کو عریانی سے ضرور الگ کر لیں ورنہ بہترین ادب کا بھی خاتمہ ہو جائے گا۔ حقیقت ایک بہت ہی پیچیدہ امر ہے اور جو داخلیت اور خارجیت کا ایسا نازک میل جس سے زندگی بنتی ہے۔ وہ کش مکش بھی حقیقت ہے جو ہماری

مادی زندگی میں جاری ہے اور جس کا اثر ہماری داخلی یا روحانی زندگی پر پڑتا ہے اس لیے وہی حقیقت نگاری درست ہے جو مادی کش مکش کے مظہر کے طور پر پیدا ہوتی ہے۔ انسان نہ فرشتہ ہے اور نہ شیطان حالات اسے سب کچھ بنا دیتے ہیں، مخصوص ماحول میں، مخصوص طرح کی مادی زندگی میں ہمارے افعال اور جذبات مختلف طرح کے ہوتے ہیں، اسی لیے ہر طبقہ ایک مخصوص نظامِ زندگی رکھتا ہے۔ زندگی میں خیر بھی ہے شر بھی، حسن بھی ہے بدصورتی بھی، سچ بھی ہے اور جھوٹ بھی۔ ادیب اگر زندگی کا ترجمان ہے تو شر بدصورتی اور جھوٹ سے گریز اس کے لیے ناممکن ہے۔ اب اگر کوئی ان باتوں کا نام گندگی رکھے تو اُسے کیا کہا جا سکتا ہے! اگر زندگی کو بہتر بنانے کے لیے ان چیزوں کا ذکر کیا جائے جنھیں کچھ لوگ پسند نہیں کرتے تو کچھ لوگوں کی وجہ سے ادیب اپنے فرض سے غافل نہیں ہو سکتا اس سلسلے میں اگر جنسی مسائل کا بیان بھی آ جاتا ہے تو وہ فرض کے طور پر اسے بیان کرتا ہے، کیوں کہ ہر انسان کی زندگی میں اس کی جگہ ہے، چاہے اس کا ذکر نہ کیا جائے۔

بہت سے لوگ جو ایسی باتوں سے گھبراتے ہیں مگر یہ وہی لوگ ہیں جو واقعی ان باتوں کا تذکرہ پسند کرتے ہیں۔ ہوا کی سرسراہٹ اور بادل کی گھٹا پر چونک اٹھتے ہیں، دبے دبے رہنے کی وجہ سے ظاہری طور پر ان باتوں سے نفرت کرتے ہیں لیکن چھپ کر اسی میں مزا لینا چاہتے ہیں۔ علم النفس کے ماہروں نے اس کی اچھی طرح چھان بین کی ہے کہ عریاں مضامین، عریاں تصاویر، گندی اور فحش باتوں سے وہ لوگ کم دلچسپی لیتے ہیں جو عام طور پر ان حقیقتوں سے واقف ہیں بلکہ وہ لوگ ان چیزوں کو زیادہ پسند کرتے ہیں، جو اپنے آپ کو بہت پاک باز اور خوش اخلاق ظاہر کرتے ہیں۔ میں نے عرض کیا ہے کہ حقیقت بہت پیچیدہ ہوتی ہے، ہم پر خود اپنی خواہشات کے راز آشکار نہیں ہوتے۔ ہمارے چھوٹے چھوٹے کاموں، ہماری معمولی معمولی حرکتوں میں ہماری خواہشیں، کہیں چھپ کر اور کہیں کھل کر ظاہر ہوتی ہیں۔ اب اگر لکھنے والے سے اس چھپی ہوئی خواہش کا اظہار بھی ہو جائے جو سماج کے ڈر سے سرات پردوں میں چھپی بیٹھی ہے تو کیا کیا جائے! کنواں پانی پینے کے لیے بنایا جاتا ہے، اب اگر کوئی اس میں گر کر جان دے دے تو کنویں کا کیا قصور! حُسن اور گندگی دونوں چیزیں ایک دوسرے سے اس طرح الجھی ہوئی ہیں کہ انھیں الگ کرنے میں بہت سی ناخوش گوار باتوں کا ذکر آ جاتا ہے۔ اسی لیے حقیقت نگاری کو عریانی سے الگ کر کے دیکھنا چاہیے۔

اخلاق کا ذکر جب ادب کے سلسلے میں کیا جاتا ہے تو واقعی یہ صرف ادبی مسئلہ نہیں رہ جاتا بلکہ عمرانی مسئلہ بن جاتا ہے۔ آج قدیم نظامِ اخلاق کا نام وہ لوگ بھی لے رہے ہیں جو اپنی جگہ موجودہ زندگی میں نہیں دیکھتے اور جنھیں اس بات کا احساس ہے کہ جوانوں کی رہبری ان کے ہاتھ سے نکلی جا رہی ہے، جنھیں ڈر ہے کہ عورتیں اپنے حقوق کا علم حاصل کر کے ان سے انصاف کا مطالبہ نہ کریں۔ بہت

ے لوگ جہاں تک پہنچے ہیں، اس کو نقطۂ آخر سمجھتے ہیں۔ اب اگر کوئی اس کے آگے جانا چاہے تو اسے د اخلاقی کا نام دیتے ہیں حالاں کہ سمجھنے کی بات یہ ہے کہ جہاں تک وہ پہنچے ہیں وہ جگہ بھی بڑی بغاوتوں کے بعد حاصل ہوئی ہے۔

ادب اور اخلاق کا مسئلہ اس واضح طریقے پر کبھی معرضِ بحث میں نہیں آیا تھا، قدیم فلسفہ میں ور جاگیردارانہ تمدن میں ان کی الگ الگ جگہیں تھیں۔ آج ارتقا اور حرکت اور ارتقا بالضد کے نظریوں کو روغ حاصل ہو گیا ہے اور ہم انسانی ذہن کو مختلف حصوں میں تقسیم کر کے نہیں دیکھ سکتے، اس لیے ادب ور اخلاق کو بھی ایک ساتھ دیکھا جا رہا ہے۔ ادب اور اخلاق دونوں کا مقصد یہی ہے کہ ایک ایسے نظام ندگی کی بنیاد ڈالی جائے، جس میں گندگی نہ ہو، فحاشی نہ ہو، حسد نہ ہو، نفرت نہ ہو۔ ایسا نظام، نظریہ اور عمل کے اتحاد سے قائم ہو سکتا ہے اور بہت سے ادیب آج اسی کے قیام کے متمنی ہیں۔

ماخذ (اُردو۔۸۲)

فحاشی مقصود بالذات

احتشام حسین

فحاشی اور عریانی پر ادھر کچھ دنوں میں بہت کچھ لکھا گیا ہے اور ترقی پسندوں نے اپنے نقطۂ نظر کی وضاحت اچھی طرح کر دی ہے جس کے بعد کم سے کم ترقی پسند ادب پر تو یہ الزامات لگاتے وقت ان کی تحریروں کو ضرور دیکھ لینا چاہیے۔ پروفیسر موصوف (رشید احمد صدیقی) نے سب سے زیادہ پرجوش طریقے پر اسی میلان کے متعلق لکھا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ادب کے لیے یہ کوئی نیا یا انوکھا میلان نہیں ہے، کسی دور اور کسی ملک کا ادب ایسا نہیں ہے جس میں جنسیت کا پوشیدہ یا عریاں اظہار نہ پایا گیا ہو۔ پروفیسر صاحب نے قدما کے یہاں اس 'گناہ' کا تذکرہ تو کیا ہے لیکن یہ بھی کہا ہے کہ 'ان کے ہاں فحاشی یا بدزبانی مقصود بالذات نہ تھی'۔

میں ان بزرگوں کی بے حد عزت کرتا ہوں لیکن اس کے باوجود میرا خیال ہے کہ جب شاعری کا مقصد محض شاعری اور تفریح تھا، جب اس کی بڑی خصوصیت عدمِ افادیت اور محض جمالیاتی تسکین تھی، اس وقت اس کی عریانی اور فحاشی مقصود بالذات ہونے کے سوا اور کچھ ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ میں اسے آج کی فحاشی کے لیے جواز کی حیثیت سے پیش نہیں کر رہا ہوں، فحاشی کا مقصود بالذات ہونا ہر حال میں برا ہے۔ بہرحال یہ سوالات ہیں بہت ہی پیچیدہ کہ آج کے ادب میں فحاشی کیوں زیادہ ہے اور اس کی نوعیت کیا ہے، فن میں اس کی کتنی جگہ ہے لیکن انھیں حل کیا جا سکتا ہے، قدما نے جو حدیں قائم کی ہیں ان کی روشنی میں نہیں بلکہ جدید سماجی علوم اور مقتضیات کی روشنی میں۔

علمِ طب اور علم النفس میں جنسیات کا تذکرہ برابر آیا کیا ہے اور انھیں کو سامنے رکھ کر علم الاخلاق کی تدوین کرنے والوں نے بھی کبھی سماجی ضروریات کی روشنی میں کبھی انفرادی آمریت کے جذبے سے معمور ہو کر اس کا تذکرہ کیا ہے۔ پھر عشق کے جذبے کی شدت نے اسے اتنا عام کر دیا کہ اس سے عملی دلچسپی لینے والوں نے اخلاقیات سے قدم قدم پر ٹکر لی جس کی مختلف تاویلیں اور توجیہیں پیش کی گئی ہیں۔ فحاشی کی کوئی مستند تاریخ دیکھی جائے تو انسانی فطرت کی معصوم لغزشوں کا پتا ہر صفحے پر مل جائے گا۔ بہت دنوں تک اخلاق نے ان پر کڑی نگاہ رکھی کیوں کہ علوم نے اتنی ترقی نہیں کی تھی کہ وہ ان لغزشوں کے اسباب بتا سکیں۔ پھر فرائڈ اور اس کے ساتھیوں نے جنسی محرکات کا انکشاف کیا، شعور و تحت

شعور کی تہیں کھولیں، اخلاق کی بنیادوں کی تشریح کی، جنسی دباؤ اور سماجی احتساب کے نتائج بیان کیے۔ بہت سی ذہنی بیماریوں اور جنسی خواہشوں میں رشتہ ڈھونڈھ نکالا، فنونِ لطیفہ میں لاشعور کی کارفرمائی کا تجزیہ کیا۔ گویا پہلی دفعہ بہت سے افعال و اعمال کے جنسی محرکات تک ذہن کی رسائی ہوئی۔ اس لیے نئے لکھنے والوں نے جب فطرتِ انسانی کا ذکر کیا تو اس جدید علم کی روشنی میں کیا اور لازمی طور پر جنسیت کو اہمیت حاصل ہوگئی۔

ترقی پسندوں نے فرائڈ کو کبھی اپنا امام تسلیم نہیں کیا بلکہ بہت ہی احتیاط سے اس کے نتائجِ فکر کا مطالعہ کیا کیوں کہ ترقی پسندی اجتماعی زندگی کو اصل بنیاد قرار دیتی ہے اور تحت شعور، جنسی دباؤ، ذہنی بیماریوں کو بھی وقت کے معاشی، معاشرتی حالات سے وابستہ سمجھتی ہے۔ محض تجزیۂ نفس سے دلچسپی لینے والے، فرد میں اس قدر محو ہوجاتے ہیں کہ سماجی انسان نظرانداز ہوجاتا ہے۔ وہ تحتِ شعور اور لاشعور کی دھندلی اور اندھیری دنیا میں پہنچ کر زندگی کے ان خارجی اثرات کو نظرانداز کرجاتے ہیں جن سے داخلیت ترتیب پاتی ہے۔ ترقی پسند ادیبوں اور شاعروں کے یہاں جنسی میلان کا ذکر اس حیثیت سے کم ہوتا ہے بلکہ ایک سماجی ضرورت کے طور پر انسان کی زندگی میں جنسی توازن تلاش کرنے کی کوشش ضرور کی جاتی ہے۔ جنس انسانی سماج کے اہم ترین موضوعات میں سے ہے۔ ترقی پسندی اس پر رائے دینا ضروری سمجھتی ہے اگرچہ سب کچھ ادب ہی کے ذریعے سے ممکن نہیں معلوم ہوتا۔ ترقی پسندوں کا خیال ہے کہ جنسی عدم توازن زندگی کے عام عدم توازن کا ایک حصہ ہے اور جب تک معاشی اور اقتصادی بنیادوں پر زندگی کے پورے نظام کو استوار نہ کیا جائے گا اس وقت تک اس کا صحت بخش بیان ممکن نہیں ہے۔ جنسیت کے ذکر میں اس کے مقصود بالذات ہونے اور کسی اہم سماجی نتیجے تک پہنچنے کے لیے حقیقت نگاری پر مبنی ہونے میں فرق کیا جائے تو یہ مسئلہ آسانی سے سمجھا جاسکے گا۔

تمام وہ نئے لکھنے والے جو جدید کہے جاسکتے ہیں، ترقی پسند نہیں ہیں، نہ ان کی فحاشی یا عریانی کا ذمے دار ترقی پسند ادب کو ٹھہرانا چاہیے۔ ترقی پسند ادیبوں کا رسالہ 'نیا ادب' کئی سال تک لکھنؤ سے نکلا ہے اور اب بمبئی سے سہ ماہی رسالہ کی شکل میں نکل رہا ہے، اس کی کسی سطر میں فحاشی یا عریانی کے ثبوت میں غالباً کچھ نہ نکالا جاسکے گا۔ ایک آدھ مضامین کے لیے یہ سمجھنا چاہیے کہ ایڈیٹر کا نامہ نگار کی رائے سے متفق ہونا ضروری نہیں۔ ترقی پسند جنسیت کے مسئلہ کو فن کے حدود میں اس وقت بیان کرنا چاہتا ہے جب اس سے کسی سماجی مسئلے پر روشنی پڑے اور جنسیت کا ذکر مقصود بالذات نہ ہو۔

ماخذ (اردو۔۲۴)

جنسی جذبہ کی اوّلیت

ممتاز حسین

امریکی فوجی زندگی کا اثر ہمارے معاشرے پر بھی پڑا۔ ہندوستان کے اونچے اور متوسط طبقے کی لڑکیاں ’ویکائی‘ میں بھرتی ہوئیں‘ کرسچن لڑکیاں انگریزی اور امریکی سپاہیوں کی جسمانی لذت کے لیے وقف ہوگئیں۔ جنسیاتی ہنگامہ خیزی‘ ناکامی‘ بندھی ٹکی ہوئی گھریلو زندگی کا انتشار اُن ادیبوں کو اپنی طرف خاص طور سے متوجہ کرتا ہے جو جنگ کے زمانے میں جنگ کے مقدر کے بارے متشکک تھے، جو انسانیت کے مستقبل سے آگاہ نہ تھے۔

حسن عسکری نے عیسائی لڑکیوں کے لاشعور کو پیش کرنا شروع کیا اور ممتاز مفتی نے فرائڈ کے نظریات سامنے رکھ کر کہانیاں مرتب کرنی شروع کر دیں۔ اگر اس وقت ہمارا طبقاتی شعور استوار ہوتا‘ تیز اور تند ہوتا تو ہم بہت جلدی اس انحطاطی فلسفے کو بے نقاب کر سکتے۔ چناں چہ اس کمزوری کے باعث ہمارے ترقی پسند ادیب بھی اس سیلاب میں بہہ گئے اور اس کی مخالفت اس وقت سے پہلے شروع نہیں کی جب کہ انحطاطی ادیبوں نے سماجی شعور اور مزدوروں کے فلسفے کی باقاعدہ مخالفت شروع نہیں کر دی۔

اسی زمانے میں عصمت نے ’چوٹیں‘ کی بیش تر کہانیاں اور ’ٹیڑھی لکیر‘ لکھی‘ اسی زمانے میں منٹو نے ’دھواں‘ ’پھاہا‘ اور اسی قسم کی دوسری کہانیاں لکھیں۔ اس قسم کے تمام افسانوی ادب میں اگر جزوی اختلافات کو نظر انداز کر دیا جائے تو ایک چیز مشترک ملے گی‘ وہ ہے جنسی جذبے کی اوّلیت۔ ’اندھیرے اجالے‘ ’چڑھتے اترتے‘ ہر جگہ ہاتھ پیر رینگتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ یہ جذبہ عجیب عجیب عنوان سے، چھپ چھپ کر، اپنی گوناگوں کیفیات کا مظاہرہ کرتا ہے۔ کبھی ’پتلون‘ کو سینے سے لگاتا ہے تو کبھی ’بغل‘ سونگھتا ہے‘ کبھی باریک دھوتی پر نظر ڈالتا ہے تو کبھی ’بلاؤز‘ کا ناپ لیتا ہے‘ کبھی یہ جذبہ ’ڈمبل‘ بن کر پھوٹتا ہے تو کبھی ’پھاہا‘ بن کر چپک جاتا ہے۔ بہر حال، کسی بھی عنوان سے اس جذبے کی ’ٹیڑھی لکیر‘ سمجھ میں نہیں آتی ہے کیوں کہ اس کی کج روی میں فرائیڈ کے تجرب مرکبات کام کرتے رہتے ہیں۔ اس کے ارتقا میں احساس کمتری‘ جنسی جذبے کی آسودگی‘ ہم جنسی کے جذبے کا دباؤ‘ اذیت دہی‘ اذیت پسندی‘ آزاد محبت کا تصور‘ سفید و سیاہ کے نسلی امتیازات، کام کرتے رہتے ہیں اور اگر وہ کبھی باہر کی دنیا کو بھی جھانک کر دیکھنا چاہتا ہے تو بدلے ہوئے بین الاقوامی حالات اور سیاست اُسے سمجھنے میں مدد ہی نہیں کرتے۔

اب سوال یہ ہے کہ کیا یہ تمام کوششیں بے کار ہیں! ان میں بجز رُجعت پسند فلسفے کے کچھ اور ہے ہی نہیں! اگر جنسی جذبے کی اولیت غلط ہے تو جنسی جذبے کی کارستانیاں تو باقی رہتی ہیں۔ کیا اس میں سرمایہ دارانہ نظام کے انحطاط اور ہندوستانی سماج کی دبی اور بجھی ہوئی زندگی کی تصویر نہیں ہے! کیا یہ تصویریں ہمیں گلے، سڑے ہوئے سماج کو سمجھنے میں آسانیاں بہم نہیں پہنچاتیں! یہ سوالات بہت ہی برحق ہیں لیکن قبل اس کے کہ میں ان کا جواب دوں' میں اپنے سوالات کو پیش کروں گا: کیا یہ تصویریں سماجی رشتوں اور سماجی ارتقا کے محرکات کے دریافت کرنے میں مدد کرتی ہیں! کیوں کہ ادب نہ صرف خارجی حقائق کا عکس ہے بلکہ حقیقت کو دریافت کر کے سماجی زندگی کو آگے بھی بڑھاتا ہے۔ ادب ایک خلاّقانہ قوت ہے جو سماجی رشتوں پر اثر انداز ہوتی ہے اور جو زندگی کی اقتصادی اور مادی بنیادوں پر بھی۔

ایسی صورت میں اگر یہ تصویریں حقیقت کے عکس کو گنجلک کر دیتی ہیں عوام کے ذہن کو سماجی شعور سے ہٹا کر جنسی جذبے کو گتھیوں میں لے جاتی ہیں، عورت اور مرد کی آزادی کو جنسی جذبے کی غیر امتیازی آسودگی میں اسیر کرنا چاہتی ہیں تو مجھے یہ کہنے میں جھجک نہیں کہ یہ کوششیں رُجعت پسند ہیں۔ ان تصویروں سے سماجی زندگی کے صحیح محرکات اور شخصیت کے راز سمجھنے میں آسانی نہیں ہوتی۔ لیکن جس حد تک ان تصویروں میں سماجی ماحول کے پیش کرنے میں مفروضیت سے کام لیا گیا ہے وہ ہمارے لیے معنی بھی رکھتی ہیں۔ لیکن آپ خود سوچیے کہ ان میں ایسی کہانیاں کتنی ہیں جو سماجی رشتوں کو نظر انداز نہیں کرتی ہیں، جو موجودہ جنسی دباؤ اور اس کی بے راہ روی اور کج روی کو ایک مخصوص نظام کے متعین کئے ہوئے جنسی تعلقات کا نتیجہ بتاتی ہیں۔

اس سماج دشمن نظریے کے خلاف ردِعمل کرنے میں آج خود عصمت ہی پیش پیش ہیں۔ وہ فرائڈ کے مفرضات سے نکل آئی ہیں۔ وہ دبی ہوئی جنسیات کی آزمائشوں سے چھلانگ مار کر اس وسیع زندگی کا مشاہدہ کر رہی ہیں جہاں جنسی جذبہ ایک ثانوی حیثیت رکھتا ہے۔ جہاں روح صرف جنس میں اسیر نہیں ہے جہاں زندگی کی بے شمار خصوصیتیں جنسی دباؤ پر بھاری ہیں۔ اس لیے کہ مشاہدے نے ان میں ایک نئی بصیرت پیدا کر دی ہے۔ اب وہ سماجی زندگی کو اقتصادی طبقوں میں بٹا ہوا دیکھ رہی ہیں اور بین الاقوامی سیاست کے مختلف خیموں کو پہچان چکی ہیں۔

ماخذ (اُردو ۔ ۲۶)

موضوعِ گفتگو

دین محمد تاثیر

چند دن ہوئے، میں ایک ادبی محفل میں شریک ہوا اور وہاں موضوعِ گفتگو فحش نگاری تھا۔ ایک نو بلوغت رسیدہ برخوردار بڑی اخلاص مندی اور تندی کے ساتھ کہہ رہے تھے کہ ترقی پسند مصنفین اگر فحش نگاری چھوڑ دیں تو ہم ان کی ہر بات مان لیں۔ اس پر ایک بلوغت یافتہ بزرگ زہرخند فرمانے لگے کہ فحاشی چھوڑ دیں تو ان کے پاس رہ کیا جائے گا! ایک طرح سے دونوں سچے تھے۔ بلوغت کی تندی اگر ادب کے آئینے میں روبرو ہو تو کون نیکی کا مارا اس کو پاش پاش کرنا نہ چاہے گا اور جس حسرت زدہ کو اس آئینے میں اپنا منہ نظر نہ آئے تو وہ جھنجلا کر اسے دیوار پر نہ مارے تو کیا کرے! نوجوان خفا ہوتا ہے کہ اسے اپنے دل کا چور سامنے کھڑا نظر آتا ہے، بڈھا بگڑتا ہے کہ جیسے اس کا مال کوئی چور لیے جا رہا ہو۔ ہائے ناکردہ کاری!

اس مجمعے میں جب بات سے بات نکل کر راستہ کھو گئی تو میں نے عرض کی کہ فحش نگاری سے مدعا کیا ہے؟ طرح طرح کی تعریفیں ہونے لگیں۔ ایک دہریہ قسم کے شاعر مزاج صاحب نے طنزاً کہا کہ جس تحریر میں عورت کے زینت کے مقامات کا ذکر ہو وہ فحش ہے۔ ایک مولوی صاحب نے (ہر ایسی مجلس اور بحث میں ایک مولوی صاحب ضرور ہوتے ہیں، نہ جانے کیوں) زینت کے مقامات کے تعین کے متعلق مفسرین کے اختلافات پر روشنی ڈالنا شروع کر دی۔ ایک کائستھ ادیب مجھ سے کہنے لگے کہ آپ کی کیا رائے ہے؟ کیا ترقی پسندوں کی یہ فحش نگاری جائز ہے۔ میں کیا جواب دیتا! میں نے کہا، 'میں نہ قاضی، نہ فقیہہ جواز اور تحریم کا فتویٰ کس طرح دوں؟'

وہی اخلاص مند برخوردار ذرا چمک کر بولے کہ آپ ٹالتے کیوں ہیں؟ ترقی پسندوں کا جو پہلا اعلان شائع ہوا تھا اس کے ارکان میں ایک آپ بھی تھے بلکہ ان میں اردو کے ادیب تو فقط آپ ہی تھے، باقی تو اور زبانوں والے تھے۔ میں نے پھر طرح دی اور کہا کہ یہ تو کرتے کی ودیا ہے، ادب میں اول و آخر کی بحث غلط ہے وغیرہ وغیرہ۔ مگر میرے انکسار پر ایک دو نے میری رسمی تعریف تو مبالغے کے ساتھ کر دی لیکن تمام مجمع مجھ پر برس پڑا۔ مولوی صاحب اور دوسرے بلوغت یافتہ بزرگ تو گویا برسوں سے اس موقع کی تلاش میں تھے، ایک کہنے لگے۔ 'اچھا ڈاکٹر تاثیر آپ ہی ہیں!' دوسرا بولا۔ 'بھس میں

چنگاری انھوں ہی نے لگائی ہے۔ غرض چند منٹوں میں مجھ پر وہ پتھراؤ ہوا کہ اگر صاحب صدر آڑے نہ آتے تو شاید میں بھی کچھ زیادتی کر بیٹھتا۔

یہ دو تھے بھی کچھ چپت گاہ قسم کے لوگ، ایسے جنھیں دیکھ کر ہاتھ کھجلانے لگے۔ ان کی زبان درازی سے آہستہ آہستہ مجمع میری طرف ہوتا گیا اور میں نے اس کا پورا فائدہ اٹھایا۔ آخر نوبت یہاں تک پہنچی کہ میں تقریر کر رہا تھا اور لوگ توجہ سے سن رہے تھے، اور مولوی صاحب اور دوسرے بزرگ غائب ہو گئے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ ان میں سے ایک صاحب خفیہ پولیس میں ملازم ہیں اور ایک سیاسی لیڈر۔ ایک کا کسب قید کرانا اور ایک کا قید ہونا۔ یہ اجتماع ضدین پُر معنی ہے۔ ترقی پسندی کے خلاف یہ دونوں گروہ متفق ہیں اور جب کسی کے درپے ہوتے ہیں تو عموماً لوگوں کو اخلاق اور مذہب کا واسطہ دے کر بھڑکاتے ہیں۔

عام لوگ جو ترقی پسندوں پر اعتراض کرتے ہیں ان میں اخلاص بھی ہوتا ہے اور صداقت بھی۔ ایک بڑی مصیبت یہ ہے کہ ترقی پسندی ایک فیشن بن گئی ہے، سوشلزم کی طرح۔ جس کو پوچھو، تم کون ہو، کہتا ہے ترقی پسند ہوں، سوشلسٹ ہوں۔ اور یہ کہا اور ادب کے اجارہ دار بن گئے۔ پھر جس پرانے ادیب کا ذکر ہوا اسے رجعتی نہ جانے کون کون سی نئی قسم کی گالیاں نہیں سناتے اور خصوصاً وہ نوجوان جن کے اندر بلوغت پھوٹ رہی ہے اور انھیں اس کا صحیح مخرج زندگی میں نظر نہیں آتا، انھوں نے افسانہ نگاری میں وہ بھڑاس نکالی ہے کہ توبہ ہی بھلی۔

آج سے کئی سال پہلے روس میں یہی حال تھا۔ سفید پوش طبقے کے لوگ نفس پرستی کو ہی اصل آزادی سمجھتے تھے، اور یہ تھا بھی آسان طریقہ۔ زندگی کے حقائق اس قدر سخت تھے، زار کی حکومت اتنی جابر تھی کہ ان کے خلاف بغاوت کرنا سہل نہ تھا، تو انھوں نے آزاد مشربی کو آزادی قرار دے لیا اور خوب گل چھرے اڑائے۔ ضمیر کو بھی تسلی دے لی اور جان کو بھی آزار سے بچا لیا۔ اور جب سوشلزم کا دور آیا تو اس طبقے کے لوگوں کو بھی ہوش آ گیا، شروع شروع میں نوجوانوں نے ان پرانی روایات کے مطابق بہت بے اعتدالیاں کیں۔ لینن سے جب اس روش کا ذکر کیا گیا تو اس پیر دانا نے کہا کہ یہ سوشلسٹ نوجوانوں کا طریقہ کار نہیں، یہ تو پرانی بندشوں کا ردعمل ہے، آہستہ آہستہ لوگ سنبھل جائیں گے۔ جب صحیح آزادی ان میں رچ جائے گی اور ملک کو سنوارنے کا کام اور اس کی اہمیت ان پر اچھی طرح ظاہر ہو جائے گی تو یہ صحیح راستے پر آ جائیں گے، ان کو قانون کی سختی سے روکنا درست نہیں کہ یہ زار کے قانون کے سختی کے زخمی ہیں، یہ انھی پرانے زخموں کی تڑپ ہے۔

ہندوستان کے نوجوان ادیب بھی اسی قسم کے مرحلوں میں سے گزر رہے ہیں۔ جو لوگ ان پر سختی کرنا چاہتے ہیں وہ یا تو خود سفلی جذبات کے غلام ہیں اور یا مصلحتِ وقت سے ناواقف۔ اور پھر

ہماری سماجی حالت پر بھی تو غور کیجیے۔ کوئی زنجیریں ہیں! کوئی تنگیاں ہیں! تو جوانوں کو کال کوٹھڑی میں قید کر رکھا ہے، ذرا حیاداری اور غیرت کے مظاہر تو دیکھو۔ والدین نے سنا کہ لڑکا لڑکی خود شادی کرنا چاہتے ہیں، انھیں ایک دوسرے سے عشق ہے، بس قیامت آ گئی، ناک کٹ گئی۔ ان دونوں کی شادی نہیں ہو سکتی۔ اور کسی کی کسی سے ہو تو، کالے چور سے ہو اور جو ماں باپ لڑکی چُن لائے یا لڑکا تلاش کر لیا ہے، بس ٹھیک ہے۔ اب اگر یہ بے روزگاری کے مارے ہوئے، سیاسی ادبار کے ستائے ہوئے نوجوان، جن کو سماج نے فاقے اور غلامی کے سوا اور کوئی تحفہ نہیں دیا، اس سماج کے ہر قانون کو توڑنے پر برانگیختہ ہوں تو کیا سارے کا سارا قصور انھی کا ہے اور ذرا اپنے ادب پر بھی تو غور فرمایئے۔ اردو شاعری کا معشوق کون ہے ایک لونڈا۔ غالب، جسے ہم اپنا سب سے بڑا، سب سے زیادہ سچا اور اصلی شاعر بھی کہتے ہیں، وہ بھی کہتا ہے تو یہ کہ یار کے چہرے پر داڑھی اُگ آئی ہے، اس لیے اُس کے حُسن کا بازار سرد پڑ گیا ہے۔ اب اگر اس ہم جنسانہ محبت کا چرچا جائز ہے تو پھر ہمارے نئے ادیبوں کے افسانوں کی فحش نگاری کیوں ناجائز ہے؟ آخر یہ لوگ جو نقشے باندھتے ہیں، کیا ان کا تصور داغ کے ان اشعار سے زیادہ اشتعال انگیز ہے!

زلف برہم، عرق آلودہ جبیں، دامن چاک کس کی آغوش سے تو جان چھڑا کر نکلا!
تم کو ہے وصل غیر سے انکار اور جو ہم نے آکے دیکھ لیا!

اگر آپ ہر دو پر لعنت کہتے ہیں تو پھر نئے ادب پر یہ خصوصی غصہ کیوں نکالا جاتا ہے! جنسی خواہش ایک فطری حقیقت ہے، اس کو دبانا بھی عجیب ہے اور اس کو جا و بے جا ننگا کر کے دکھانا بھی۔ مگر یہ عیب کوئی ایسا عیب نہیں کہ جس سے اس کا ارتکاب ہو جائے، اسے پھانسی پر لٹکا دیا جائے۔ اگر بعض ادیب کبھی کبھار اعتدال کی حد سے گزر جاتے ہیں تو کیا ہوا! میرزا شوق کی مثنویاں، داغ کے بعض اشعار، سعدی کی گلستان کا باب پنجم، مولوی رومؒ کی مثنوی کی بعض کہانیاں، کچھ کم ہیں؟ اور ہم سے ایک دو نسلیں پہلے ہمارے سب بزرگ دانش میں "تریا چرتر" کی جو کہانیاں درساً پڑھا کرتے تھے، ان کے مقابلے میں نئے ادیبوں کے ان افسانوں کی کیا حیثیت ہے! مجھے تو آج کل کے افسانوں میں کوئی بھی ایسا نظر نہیں آیا جس سے کسی صحت مند انسان کی طبیعت میں ہیجان پیدا ہوا ہو یا جس میں مولانا روم کے کنیز والے قصے سے زیادہ جنسی تفصیلات کا تذکرہ ہو، یا جس میں کسی قسم کی ناجائز ترغیب دلائی گئی ہو۔ تو پھر نئے ادیب کو کیوں اس قدر سوختنی، کشتنی قرار دیا جا رہا ہے! ع

ایں گناہیست کہ در شہر شما نیز کنند

غرض کچھ اسی قسم کی تقریر تھی جو میں نے اس وقت کر ڈالی۔ مجھے خود اس تقریر سے پورا اتفاق نہیں، مگر اس مجمعے میں خیال افروز ثابت ہوئی۔ بعد میں کچھ لوگوں نے مجھ سے خطوں میں چند ایک باتوں کے متعلق رائے طلب کی اور نئے نئے سوال اٹھائے۔ ایک صاحب نے لکھا کہ یہ نئے ادب پر جو فحش نگاری کا الزام لگایا جاتا ہے، اس کا اتنا چرچا اس لیے ہو رہا ہے کہ ترقی پسند ادیب، جو اقتصادی اور

سیاسی غلامی کے مظالم نمایاں کر رہے ہیں، ان کو ایسا بدنام کر دیا جائے کہ لوگ ان کی باتیں نہ سنیں۔ ایک اور صاحب نے اس خیال کی تائید یُوں کی کہ مدتوں تک ہندوستان میں پرچار کیا گیا کہ سوشلسٹ روس میں عورتیں شاملات کی طرح ہر کسی کی جائیداد ہیں، حالاں کہ وہاں عورتوں کو مردوں کی طرح اقتصادی اور سیاسی آزادی حاصل ہے۔

ایک خط میں چند ایسے ادیبوں کے متعلق رائے پوچھی گئی جو کہلاتے تو ترقی پسند ہیں مگر افسانے وہی بلی چوہے کے متعلق لکھتے رہتے ہیں، غرض جتنے منہ اتنی باتیں۔ اس ادبی محفل میں زیادہ اعتراضات عسکری کی 'پھسلن' اور عصمت کے 'لحاف' پر ہوئے۔ 'پھسلن' میں نے پڑھی نہیں۔ کہا گیا 'لحاف' اس کا جواب ہے۔ اور 'لحاف' جو ہے اس میں تو ہمیں کسی قسم کی ترغیب نظر نہیں آئی اور ہمیں کیا، اس محفل میں ایک چھوڑ تین مستورات 'غیر مستور' بیٹھی تھیں۔ میں نے جو سب سے زیادہ مرد عورت دکھائی دی اس سے پوچھا تو اس نے باقی دو کی تائید کے ساتھ کہا کہ 'لحاف' کا طرزِ بیاں ایسا نہیں کہ اس سے کوئی للچانے لگے۔ بلکہ اس افسانے کی 'میں' جو ہے وہ تو بھاگ بھاگ اٹھتی ہے، خوف زدہ ہے۔ مگر لوگ ہیں کہ بے چاری عصمت پر، برعکس نہند نام زنگی کافور، کی پھبتی کہے جاتے ہیں۔

اس محفل میں ایک بات خاص طور پر قابلِ غور تھی کہ عام ارکان تو محض 'ہوں ہوں' کر رہے تھے اور معلوم ہوتا تھا کہ یا تو میری طرح انھوں نے زیرِ بحث افسانے پڑھے نہیں اور جو پڑھے ہیں تو بھول گئے ہیں، مگر وہ اخلاص مند بلوغت رسیدہ برخوردار اور بلوغت یافتہ بزرگ اور وہ مولوی صاحب، جو کروٹیں لے لے کر اعتراض کرتے تھے، انھیں یہ افسانے ازبر تھے، اول سے آخر تک حفظ تھے اور وہ ایک ایک تفصیل یوں بیان کرتے تھے جس طرح ہم اسکول میں جان صاحب اور عبید زاکانی کے اشعار پڑھا کرتے تھے، اُسی تندی اور انہماک کی ساتھ۔

اور پھر آج کل تو جدید فلسفے نے رات کے معصوم خوابوں تک کو ناپاک قرار دے دیا ہے، اور وہ خوابیں جو معصوم نہیں ہوتیں ان کا کیا علاج۔ اور اس کا کیا جواب کہ جس قدر معصوم زندگی ہوتی ہے، اتنی ہی خوابیں ناپاک ہوتی ہیں۔ ہمارا بہت سا ادب خواب و خیال کی سی حقیقت رکھتا ہے، اس پر عمل کر کے عملی تعزیریں قائم کرنا کہاں کا انصاف ہے! مدعا یہ ہے کہ فحاشی کے پیچھے یوں لٹھ لیے پھرنا بھی (بلکہ یہی) فحاشی ہے۔ ہم نے مانا کہ آپ ذرا بزرگ قسم کے آدمی ہیں اور آپ کو اس قسم کی تحریروں میں چھپا چھپا مزا آتا ہے، تو آتا رہے، اور لوگوں کو بھی آتا ہوگا آپ بھی انسان ہیں۔ اس شدت کے ساتھ مذمت کرنا الٹا کسی اور امر کی چغلی کھاتا ہے۔ اور یہ چسکا اس طرح بھی نہیں۔ بڑے تنقیدی انداز سے فرمانے لگے کہ کوئی فن کی خوبی ہو تو بھی کوئی بات ہے، یہ کہانیاں تو کچھ بھی نہیں۔ اور پڑھی حضور نے سب کی سب ہیں، اور گالیاں ترقی پسندوں کو پڑ رہی ہیں، جن کا نام لے کر چند نوجوان اپنی بلوغت نمائی کی

پردہ پوشی کر رہے ہیں۔

تو اس لیے اے میرے بھائی! جب قیامت کا دن آئے گا تو اس وقت دیکھا جائے گا کہ
ایک کے بائیں ہاتھ میں ایک کالا فردِ عمل ہوگا اور جس کے ہاتھ نہ ہوگا وہ اپنے احباب سے ان گتوں کو یا
کر کے شرمائے گا جو اس نے بے صرفہ زندگی کی بے بضاعتی کو چھپانے کے لیے ایجاد فرمائی تھیں۔ اور ج
آج مکر و دنیا کے جامے میں اپنی مخفی خواہشوں کو مستور کر رہا ہے' وہ محض شرمائے گا ہی نہیں بلکہ دوزخ می
ڈالا جائے گا' واللہ اعلم بالصواب۔ اور جو یہ نہیں تو پھر ڈرکا ہے کا! یوں پنجوں سے آنکھیں ڈھانپ کر
رخنوں سے کیوں دیدار بازی کر رہے ہو اور اس طرح ہونٹوں پر دو انگلیاں رکھ کر ہنسی کا گلا کیوں گھونٹ
رہے ہو! کھل کر ہنسو اور فلک شگاف قہقہوں سے فضا کی اس گندگی کو پاک کر دو۔

(ب)

ردِ عمل

(ڈاکٹر تاثیر کا ایک خط بنام احمد ندیم قاسمی)

حضرت ندیم کو تسلیم!

آپ کا معذرت کرنا (اور بہانے بنانا) ایک ایسا حسین فعل ہے کہ اس کے ہوتے ہوئے نیک و بد اور راست و غلط کی قدریں بے معنی ہو جاتی ہیں' یعنی اگر آپ نے جو کچھ کہا ہے وہ غلط ہوتا تو بھی مجھے شکایت نہ ہوتی۔ اور اب تو یہ حال ہے کہ آپ نے جو کچھ کہا ہے وہ راست ہے تو جب راستی کو اس خوبی سے نبابا جائے (اور عموماً دنیادار غیر ادیب لوگ جھوٹ کو حسین جامہ پہناتے ہیں مگر راستی کو نہیں' جیسے مبروص بڑھیا کو حریری ملبوس اور ایک حسین دوشیزہ کو غلیظ ٹاٹ پہنایا جائے!) تو پھر فقیہانِ شہر کچھ کہیں' بندہ ایمان لے آتا ہے۔ واقعات بذات خود کوئی حیثیت نہیں رکھتے' یہ تو لکھنے والے کا اندازِ تحریر یعنی ردِ عمل ہے جو وقیع ہوتا ہے۔ 'ادب برائے ادب' کی یہاں تک تو حدیں واضح ہیں مگر جب یہ کہا جائے کہ ہر باہر کی قدر پر سماجی معیار غیر ضروری ہے' بس 'حدائق البلاغت' کی فنی پیمائش سے ادب' ادب بنتا ہے تو میں اس قدیم کہلانے والی نقادی سے گھبرانے لگتا ہوں۔ کیا یہی وہ نظریہ نہیں تھا جس نے جان صاحب اور چرکین کو لکھنؤ میں شہرت بخشی! مضمون اور مواد بے معنی' ردِ عمل اور اندازِ فکر باہر کی فلسفیانہ قدریں' من قال' عبث' ' ما قال' بے سود' فقط' کما قال' درخور اعتنا' تو پھر چرکین استادِ کامل نہیں تو کس کا قصور ہے! محاورہ' تشبیہ' استعارہ اور جملہ اصنافِ سخن پر قدرت: 'لہٰذا' بل کھا کر ہلال چرخ گردوں ہو گیا' میں کیا نقص ہے! تشبیہ کے لیے ایک وجہِ شبیہ کافی ہے۔ یہ ذہنِ سامع کا تعفن ہے کہ وہ دوسری صفات کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔

غرض یہ 'ادب برائے ادب' کا نظریہ ہی جسمانی یا دماغی غلاظت کو پناہ دے سکتا ہے۔ اسی نظریے کے خلاف 'ترقی پسند ادب' کی تحریک چلی۔ مدعا یہ تھا کہ بالغ نظر ادیب جس سماج کی ذمے داریوں کے حامل ہیں، اس کے بنیادی اور اہم مسائل کی طرف توجہ دیں۔ توجہ دیں کیا، توجہ دے رہے ہیں۔ زیادہ منظم ہو کر ادبی محاذ قائم کریں۔ اپنی قدر کریں، اپنی قدر کرائیں۔ حالی وغیرہ نے یہی کیا، مگر وہ 'واویلے' کا وقت تھا۔ اقبال یہی کر رہے تھے، مگر ان کی توجہ بٹی ہوئی تھی۔ کچھ ادیب ایسے تھے جن کی نظر زیادہ نزدیکی حالات پر تھی۔ انھوں نے سوچا کہ ان کے ہم خیال اور بھی ہوں گے، انھوں نے مل کر اعلان کیا اور یہ اعلان ادبی حکم نامہ نہیں تھا، محض ایک طرز خیال کا اظہار تھا۔ ہم یوں محسوس کرتے اور سوچتے ہیں، بس اتنی بات تھی۔ جمہوریت پر یقین، مستقبل کی طرف نظر، انسانی اخوت کا عقیدہ، موٹے موٹے اصول تھے۔ ترقی پسندی اس کے سوا اور کچھ نہ تھی، جس طرح پچھلے سال فسطائیت کے خلاف جنگ کرنے میں روس پیش از پیش رہا ہے، مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ دوسرے اتحادی ملک صرفہ کر رہے ہیں۔ اسی طرح اس تحریک میں بہت سے ایسے نوجوان سامنے آئے جو اشتراکی اصول کے قائل تھے۔ جس طرح وائسرائے ہند نے اسمبلی میں کہا ہے کہ ہندوستان کے مسئلے کا حل سوچتے ہوئے روس کے موجودہ وفاقی نظام کو پیشِ نظر رکھنا چاہیے، یہ نوجوان بھی کہتے تھے کہ روس کا کامیاب تجربہ ہمارے لیے سنگ میل ہے، مگر یہ ان کا سیاسی مسلک تھا۔ چوں کہ ان کے نزدیک مضمون اہم اور طرزِ تحریر محض مضمون ہی کی تخلیق ہے، اس لیے ان کا اور دوسرے غیر اشتراکی مگر جمہوریت دوست ادیبوں کا گٹھ بندھن ہو گیا۔ فسطائیت سانجھا دشمن تھا۔ ادبی تجربات اور چالاکیوں کے نہ یہ کچھ ایسے مخالف تھے، نہ زیادہ دوست۔ پرانے ادب کو اپنا ورثہ سمجھتے تھے اور نئے کو اپنی کمائی، بہت اچھا نباہ رہا۔ اور چوں کہ باتیں دل کو لگتی تھیں اور وقتی ضرورت کا اقتضا بھی یہی تھا، پبلک نے خیر مقدم کیا۔ اس مانگ کو دیکھ کئی تاجر بھی شریک ہو گئے اور کئی جمہوریت دشمن لوگ، جو اس تحریک کی کھلی مخالفت کرتے ہوئے گھبراتے تھے، سرنگیں لگانے لگے، یہ شب خونی حملے کئی طرح سے ہوئے۔

ترقی پسند ادب پر یہ اعتراض تو کیا جا سکتا ہے کہ اس میں تفریح کا پہلو کم ہوتا ہے مگر یہ کہنا کہ ترقی پسند ادیب فحش نگار ہیں، کھلی بددیانتی ہے، یا بے بصری۔ ترقی پسند ادیبوں سے یہ شکایت تو کی جا سکتی ہے کہ ان میں سے کئی مارکس کی تعلیمات کو درست سمجھتے ہیں، مگر یہ کہنا کہ وہ ساتھ ہی فرائیڈ کی جنسیات کے پیرو ہیں، دانستہ دروغ بافی ہے یا بے عقلی۔ ترقی پسند ادب (اور یہ عالمگیر تحریک) فحاشی کو دماغی بیماری سمجھتے ہیں اور فحش نگاروں کو قابلِ معالجہ سمجھتے ہیں۔ اور مارکسیوں کے نزدیک فرائیڈ کا فلسفہ (بخلاف اس طبی معمول کے) ایک بیمار ذہن کی پیداوار ہے۔ بہر صورت، فرائڈ اور مارکس کا تتبع نہیں

ہو سکتا۔ اور بہ ایں حالات، اگر کوئی پڑھا لکھا آدمی ہر نئی تحریک کو اس لیے ترقی پسند کہتا ہے کہ ترقی پسندی بھی ایک نئی تحریک ہے تو اس شخص کو چڑیا گھر میں جگہ تلاش کرنی چاہیے کیوں کہ اس کی منطق کے مطابق وہ حیوان ہے، کیوں کہ وہ انسان ہے۔ ترقی پسند ایک نئی تحریک سہی مگر ہر نئی تحریک ترقی پسند نہیں۔ یہ محض منطقی بحث نہیں، واقعات ہیں۔ راشد اور میراجی، عسکری اور عصمت نئے لکھنے والے ہیں۔ مگر راشد نے ہمیشہ کھلم کھلا ترقی پسند کی تحریک سے براءت کا اظہار کیا ہے، میراجی نے اس کی مخالفت میں لکھا ہے، عسکری کو اس سے اختلافات ہیں، عصمت اس سے پاک صاف ہے۔ قولاً و فعلاً یہی حال بیدی اور منٹو کا ہے۔ تنقید نگار حضرات کا یہ حال ہے کہ راشد پر فحاشی کا الزام لگایا تو اسے ترقی پسند کہہ دیا اور چوں کہ فیض ترقی پسند ہے اس لیے اس پر بھی فحش گوئی کا فتویٰ لگا دیا۔ اور میراجی کی نظم کے معنی سمجھ میں نہ آئے تو اسے ترقی پسند کہہ دیا اور اس لیے احمد ندیم قاسمی کو مہمل گو کہنے لگے۔ یہ نقادی نہیں، ہذیان ہے۔ ہذیان کا لفظ بھی بڑے ادب کے ساتھ استعمال کیا گیا ہے، ورنہ جو شخص فحاشی، مہمل گوئی اور ترقی پسندی تین الزامات اکٹھے جوڑ کر فقط، پنجاب کے اہل علم، کو ان کا ہدف گردانتا ہے، وہ کچھ اور ہے، ہذیانی نہیں۔ ترقی پسند ادیب مضمون کو اہم قرار دیتا ہے اور سماجی، سیاسی، اقتصادی معاملات، جن کا جمہور کی زندگی سے گہرا تعلق ہے، ان پر غور کرتا ہے اور ان سے متاثر ہو کر کہتا ہے۔ فحاشی اس کے معمول سے باہر اور مشکل گوئی یا مہمل گوئی اس کے مدعا کے مخالف ہے۔

ترقی پسندی ایک روشن خیالی ہے، واضح اور معین۔ اس کی جھلک دانستہ طور پر ہر جگہ نظر آتی ہے اور ضروری نہیں کہ اس کا نام لیوا غیر وادیوں میں نہ بھٹکے۔ حفیظ جالندھری نے کامیاب ترقی پسند نظمیں لکھی ہیں اور جوش نے ترقی پسندی کے مسلک کے خلاف بھی لکھا ہے۔ مثلاً اس سالنامے کی نظم 'بڑھاپے کی پہچان'۔ میراجی سرتاسر ترقی پسند نہیں اور آزاد نظم لکھنے والوں میں بہت کم ترقی پسندی کے حامی ہیں اور پھر آزاد نظم لکھنے والوں میں راشد قافیے کی پابندی کرتا ہے اور اثر جیسے لکھنوی استاد کامل نے بے قافیہ نظم کامیابی سے لکھی ہے۔ بے قافیہ اور ترقی پسند نظم (ترجمہ ہی سہی) مگر ہمارے نقاد حضرات نظم معرا کا تعلق قافیے سے اور آزاد کا بحر سے ہے۔ یہ نہیں تو اصطلاحات وضع کرنا بے سود ہے۔ واضح رہے کہ ترقی پسند محض 'پنجابی' نہیں ہیں۔ آزاد نظم لکھنے والے ترقی پسندی کے خلاف بھی ہیں۔ کئی بے قافیہ لکھنے والے آزاد نظم نہیں لکھتے۔ کوئی ترقی پسند فحش نویس نہیں ہو سکتا۔ کوئی ترقی پسند ابہام کو خوبی نہیں سمجھتا۔ مشکل گوئی محض آزاد نظم کا خاصہ نہیں اور کئی فحش گو قافیہ کے پابند اور آزاد نظم سے معصوم ہیں۔

فحاشی پرانی بیماری ہے، اس لیے اس کے علیل بھی پرانے ہیں۔ اور جو شخص اسے نئی تحریک سمجھتا ہے وہ اس بیماری کے علاج کے لیے مناسب نہیں کیوں کہ اس کی تشخیص ناقص ہے۔ فحاشی شعر و ادب ہی کی بیماری نہیں، اس کا اظہار محض ان اصناف میں ہی نہیں ہوتا، دیگر فنون لطیفہ کو بھی اس میں دخل ہے اور

فنونِ لطیفہ سے باہر بھی اس کا عمل ہے۔ سماج کی عام حرکتوں میں اس کا مظاہرہ ہوتا ہے۔ شادی بیاہ کے موقعے پر بڑے بڑے شریف خاندانوں میں پاکیزہ منش عورتیں اب بھی کھلے بندوں، ٹھٹھوں، منظم گالیوں سے ایک دوسری کی خاطر تواضع کرتی ہیں، اور غیر شعوری زندگی میں رات کے وقت خوابوں میں بڑے بڑے زاہد اس کے مرتکب ہوتے ہیں۔ درحقیقت فحاشی کا خواب سے بہت تعلق ہے اور محض وہ ادیب جو خواب کی زندگی کو تحریر کرتے ہیں، جو حقائق سے گریز کرتے ہیں، جن کے ادب کو ’فراری‘، ’غیر ترقی پسند‘ کہا جاتا ہے، وہی فحش نویسی کرتے ہیں، سب نہیں۔

فحش نویسی کیا ہے؟ اس کی تعریف کے لیے ایک مستقل مضمون درکار ہے اور میں آپ کے ارشاد کے مطابق آپ کو ایک خط لکھنے بیٹھا تھا اور ارادہ تھا کہ خط مختصر ہو، لیکن اب بحث ایسی چھڑ گئی ہے کہ کچھ نہ کچھ توضیح ضروری ہے۔ فحاشی ذہنی حالت کا نام ہے۔ اشیا فحش نہیں ہوتیں، یہ بدیہی اصول ہے کہ مگر اس کی ضمنیات وضاحت طلب ہیں۔ اشیاء کے ساتھ افعال و واقعات بھی شامل ہیں۔ وہ شے جسے عورت کہتے ہیں، فحش نہیں، نہ وہ فعل جسے مباشرت کہتے ہیں۔ لیکن اعلانیہ مباشرت فحش کہی جاتی ہے، جیسے فحش کے لغوی معنوں سے ظاہر ہے۔ یہ ’حد سے گزرنے‘ کا نام ہے اور حد کا تعین سماجی عمل ہے۔ سماج کی حدیں مختلف ہیں تو گویا فحش ایک مطلق قدر نہیں۔ سماج کی سہولت کے مطابق زماناً و مکاناً یہ حد بندی بدلتی رہتی ہے۔ اور یہ حد بندی جنسی معاملات کے متعلق ہے، اس سے تجاوز کرنا فحش ہے۔ اب ہندوستان کی حالت دیکھیے یہاں طرح طرح کے سماجی نظام ہیں۔ جنگلوں میں رہنے والے ٹوڈے بھی ہیں، جو ننگے پھرتے ہیں اور اب تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ یوریشین، اینگلو انڈین اور پارسی بھی ہیں، ہندو اور مسلمان بھی ہیں، ننگے سادھو اور عضو تناسل کے پرستار بھی ہیں۔ بعض طلاق کو جائز اور بعض ناروا سمجھتے ہیں۔ ماموں کی لڑکی سے شادی روا اور ماموں زاد کو سگی بہن کی طرح سمجھ کر اس سے شادی کرنا حرام مطلق سمجھتے ہیں۔

اردو ادب مسلمانوں کی واحد ملکیت نہیں، اس لیے مسلم سماج کی جنسی حد بندیاں اس پر عائد نہیں کی جاسکتیں۔ بہن سے عشق کا واقعہ ہندو مسلم دونوں کو مردود معلوم ہوگا مگر بنتِ عم کی وہ رنگین وارداتیں، جو اردو اور عربی ادب کی جان ہیں، ہندوستان کے لیے خوف ناک گناہ ہیں۔ آپ نے دیکھا کہ اردو کیا، ہندوستان کی شاید ہر زبان میں ’بنتِ عم‘ کو بہن ہی کہتے ہیں۔ ’کزن‘ کی طرح کا مستقل لفظ معدوم ہے۔ آپ نیوگ کو قبیح کہتے رہیں، آریہ سماجی اسے پوتر سمجھتے ہیں۔ اور خود مسلمانوں میں شیعہ سنی میں متعہ کا عمل کس قدر نازک ہے۔ سنی اسے بدکاری کہتا ہے، شیعہ اسے جائز گردانتا ہے۔ اب اردو کا ادیب کیا کرے! اور آپ ہیں کہ اردو کو سب کی ساجھی، ہندوستان گیر اور نجانے کیا کچھ نہیں کہہ رہے ہیں۔

میرے نزدیک اس کا حل اس اصول کو تسلیم کرنے میں ہے کہ اشیا اور اعمال فحش نہیں؛ محض دماغی حالت فحش ہوتی ہے اور جو مجھ سے پوچھیے تو فحش کیا، اخلاقیات کی ہر قدر، نیک و بد کے سب معیار فقط ذہنی حالت پر وارد ہوتے ہیں۔ قولِ رسول پاک ﷺ ہے: 'انما الاعمال بالنیات'، عمل نہیں بلکہ وہ ذہنی حالت، جس کی وجہ سے ارتکاب عمل ہوتا ہے، نیک و بد قرار دی جا سکتی ہے۔ جیسی نیت ویسا عمل۔ سماج اور قانون کے دائرے میں اس کے اطلاق میں کچھ مشکلات ہیں۔ ذہنی حالت کا صحیح اندازہ لگانا مشکل ہو جاتا ہے، مگر ادب میں اس مسئلے کا حل نسبتاً آسان ہے کیوں کہ ادب تو نام ہی ذہنی حالت کا ہے، وہ ذہنی حالت جو ہم پر لفظوں میں ظاہر ہوتی ہے۔ مگر ذہنی حالت کو نیک یا بد قرار دینا بھی ایک سماجی امر ہے۔ اور یہاں 'ادب برائے ادب' اور 'ادب برائے حیات' والوں کا اختلاف شروع ہو جاتا ہے۔ 'ادب برائے ادب' والا کہے گا کہ اگر ذہنی حالت کی کیفیت منتقل ہو گئی تو ادب کا منتہائے کمال حاصل ہو گیا، اس لیے فحش اور بد کی بحث نامعقول اور 'ادب برائے حیات' والا کہے گا کہ جو ذہنی حالت سماج کی ترقی میں مدد نہیں کرتی، وہ فضول ہے۔ اور سماج کی ترقی کیا ہوتی ہے؟ اس کا فیصلہ آپ کے اس رجحان سے ہوگا، جو آپ کو سماج کے طبقات سے ملے۔ اگر آپ یہ سمجھتے ہیں کہ چند زیرک اور طاقت ور لوگوں کی رہنمائی سماج کو بچا سکتی ہے تو آپ فسطائی ہیں اور اگر آپ عوام کی بہبودی اور طاقت میں سماج کی ترقی دیکھتے ہیں کہ سماج چند سے بیش اور بیش سے بیش تر افراد کی طاقت پذیری سے ترقی حاصل کرتی رہی ہے اور تاریخِ عالم کا بہاؤ اسی طرف ہے تو آپ ترقی پسند ہیں، جمہوریت دوست ہیں۔ اور چوں کہ آپ کے نزدیک زندگی اور سماج کے اہم پہلو یہی ہیں اس لیے آپ کو افراد کی جنسی قلابازیاں فحش نہیں بلکہ غیر دلچسپ معلوم ہوں گی۔ اور ان میں انہماک ایک فضول حرکت۔ ضیاعِ وقت، تو فحاشی کی حمایت یا جواز فقط 'ادب برائے ادب' کے نظریئے سے مل سکتا ہے۔ ایک شخص نے مجھ سے کہا کہ ترقی پسند ادب پر حملہ کرنے والے جاگیردار قسم کے جمہور دشمن لوگ ہیں، جنھوں نے چند غوغائیوں کو فحاشی اور پنجابیت اور اس قسم کے ڈھکوسلوں سے اڈے لگا کر بہکا دیا ہے، ورنہ یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے کہ کوئی خواندہ شخص حملہ کرے فحاشی پر اور اس امر میں اپنے سب سے قوی حامی 'ترقی پسند ادب' کو گالی دے یا اسے صوبہ جاتی مسئلہ بنالے۔ چناں چہ لکھنؤ کے پرچوں میں محض پنجابیوں کو نام لے لے کر کوسا گیا ہے، اور مزہ یہ ہے کہ وہ جوش (ملیح آبادی) جو کبھی زندیق اور بدمذہب اور بداخلاق تھا، اور اب بھی وہی ہے جو پہلے تھا، اسے استادِ کامل کہا گیا ہے۔ یہ ایک دہلی کے ادیب نے مجھ سے کہا، لیکن یہ پھر نیتوں کا معاملہ ہے۔ ایک بات ظاہر ہے کہ یہ آپ کے نقاد کچھ پریشان خیال ہیں۔ انھیں الفاظ یاد ہیں، معانی نہیں آتے۔ اصطلاحات پر غور نہیں فرماتے۔ کبھی ان حضرات سے یہ تو کہیے کہ وہ کون ہوتے ہیں فحاشی کو برا کہنے والے۔ اپنے

ادبی نظریے کی بنا پر وہ اسے کس طرح مطعون کر سکتے ہیں! لیکن آپ نے تو کہا تھا کہ میاں سالنامے کے متعلق 'رہنمائی' فرماؤ، اور میں نے وعظ شروع کر دیا۔ عزیزِ محترم! میں رہنمائی کا قائل نہیں ہوں، ادب میں بالخصوص!

سفر کا لطف نہیں ہے بسطوت سالک   وہ راہ راہ نہیں ہے جو پیشِ پا آئی

یہاں سالک سے عبدالمجید سالک مراد نہیں۔ گو مجھے ان کا نئے ادب کے خلاف ایک پیغام پڑھ کر شک گزرا کہ وہ بھی 'سالکیت' کی طرف لڑھکنے لگے ہیں، لیکن نہیں، انھوں نے کچھ اور کہا ہے اور ان کے رفیق کار کچھ اور کر گزرے ہیں۔ 'ادب لطیف' کے سالنامے میں مجھے کوئی ایسی تحریر نظر نہیں آئی جو حد سے متجاوز ہو گو میں نے ابھی سارے افسانے ختم نہیں کیے۔......

عام افسانے، عام رسالے پڑھ کر، عام تاثر یہی عبث کاری کا ہوتا ہے، خصوصاً جب عام دنیا کے حالات پر نظر ڈالی جائے، روم جل رہا ہے اور ہمارے ادبی نیرو بے سُری سارنگی بجا رہے ہیں۔ نا ترقی پسند ادب! فحش نہیں، عیاش ادب! لیکن اس سالنامے میں کچھ وقیع چیزیں ایسی ہیں جو آپ کو اس الزام سے بچا سکتی ہیں۔ میں نے فحاشی کی مثالیں ڈھونڈنے کی کوشش کی لیکن میرا دماغ فطری طور پر ان معاملات میں دلچسپی نہیں لیتا۔ مجھے ناکردہ گناہوں کی حسرت کم ہے، اس لیے اس جستجو میں کامیابی نہیں ہوئی۔ ابھی منٹو کا افسانہ پڑھنا ہے۔ شاید وہاں کچھ مل جائے۔ کیوں کہ اسے محراب و منبر پر جولہ آرائیاں کرنے والے واعظوں کی خلوتی خواہشوں کو رسوا کر کے چڑانے میں مزا آتا ہے۔ شریر ہے، گالی بکنے سے بھی گریز نہیں کرتا، لیکن فحاشی کے لیے جو شدت اور انہماک درکار ہے، وہ اس کی طبیعت میں موجود نہیں۔ اس کی صحت مند ہنسی اور شرارت اسے فحاشی کی بیماری میں مبتلا نہیں ہونے دیتی۔ آج کل ذرا فرصت کم ہے، ایک آدھ ضروری کتاب پہلے ختم کرنی ہے، اور پھر میری عادت ہے کہ لذیز لقمے بعد میں کھاتا ہوں، منٹو کا افسانہ اسی لیے اٹھا رکھا ہے۔ ندیم قاسمی کا افسانہ محض اس کی گل پوشی تحریر کے زور سے پڑھ کر ختم کر لیا ورنہ اسے بھی اٹھا رکھتا۔ ایسی رنگین نثر امتیاز، عبدالغفار اور ندیم کے علاوہ اور کون لکھ سکتا ہے؟

عصمت کے ہاں وہی نوبلوغتی اضطراب، ممتاز مفتی کی وہی کتابی نکتہ پروری موجود ہے۔ البتہ بیدی نے افراد کے ذریعے ایک طبقے کی اور اسی طرح انسانیت کی ترجمانی کی ہے اور فحاشی کے مرض کی تشخیص بھی کر دی ہے، 'ٹی' 'بدماش' 'ٹیڑھی لکیر' 'برف' چاروں میں جنسی بے چینی موجود ہے، لیکن 'ٹیڑھی لکیر' اور 'برف' میں غیر روحانی اور محض بدنی جنسی تعلق سے بیزاری کے تاثرات نظر آتے ہیں۔ غالباً یہ کہانیاں واعظانہ حیثیت رکھتی ہیں۔ جنسی گناہ کے خلاف موثر وعظ ان میں اینگلو انڈین طبقے کی

'ذلت' اور ہندوستان کی 'عظمت' کا پہلو بھی موجود ہے۔ بہرصورت اس میں ایک ایسے سماج کے حالات ہیں جس کی جنسی اقدار ان معاملات میں عام ہندو مسلمانوں سے مختلف ہیں اور کہانی میں کہیں بھی کوئی 'شرم ناک' تفصیل نہیں۔ بس ایک آخری فقرہ ہے جس کے معنی آپ اپنی حیثیت کے مطابق سمجھ سکتے ہیں۔ البتہ ممتاز مفتی کا وار او چھا پڑا ہے اور خواجہ احمد عباس نے انقلابی جماعت کے خلاف ایسا زہریلا حملہ کیا ہے کہ شاید اس وجہ سے اس افسانے کی 'فحاشی' نظرانداز کردی جائے گی۔ آخر ان انقلابی لوگوں سے اور کیا توقع ہوسکتی ہے! مگر یہ افسانہ 'بارہ گھنٹے' ایسا ناممکن سا ہے کہ اس پر کسی قسم کا الزام رکھنا بے سود ہے۔ احمد عباس کی ہندوستان گیر شہرت مسلم مگر یہاں ناکامی ہوئی ہے۔ مضمون کی سطح بہت بلند تھی۔ بات سنبھلی نہیں۔ انقلابیوں کے سب سے بڑے لیڈر کی زندگی کی سطح مختلف ہونی چاہیے۔ وہ تو ہمارے آپ کے سے سفید پوش طبقے کی کچلی ہوئی امنگوں کی نمود ہے۔ منٹو نے ٹھیک لکھا ہے کہ اس قسم کا ادب بیمار سماج کے بیمار افراد کے بیمار خیالات کا عکس ہے۔ یہ ادیب 'طبیب نہیں' 'مریض ہیں' مگر عباس میں فحاشی نہیں۔ اس نے ایک مسئلہ پیدا کیا ہے' ایک خیال افزا واردات مہیا کی ہے' لذت افزائی اور کوک شاستری نہیں کی وہ ان اسفل بیماریوں سے بہت بالا ہے۔

بہرصورت مجھے اس نمبر میں کوئی 'ننگی' کہانی نظر نہیں آئی۔ ممتاز مفتی شاید ایک خاص طبقے کو تکلیف دہ معلوم ہو' مگر عریاں وہ بھی نہیں۔ یہ ادیب 'عبث کار' اور 'نا ترقی پسند' سہی مگر فحش نویس نہیں۔ بات یہ ہے کہ فحاشی کی تعریف ہونی چاہیے۔ یہ ہوجائے تو بحث باقاعدگی سے ہو اور نتیجہ خیز ہو۔ ورنہ ہوسکتا ہے کہ ہم سب ہم خیال ہوں مگر الفاظ کے پھیر میں آکر یوں ہی باہم دست و گریباں ہو رہے ہوں۔ اور یہ تو آپ نے بتایا ہی نہیں کہ یہ آپ کے ہم عصر کیا لکھ رہے ہیں۔ کہیں ان کا تجارتی حسد تو کارفرما نہیں! یہ اقتصادی محرکات بہت گہرے ہوتے ہیں۔ ایک دلچسپ بات بھی پیش نظر رہے جو نفسیاتی حقیقت ہے۔ یہ لوگ جو فحاشی کے خلاف پرچار کرتے پھرتے ہیں' انھیں ہر فحش تحریر زبانی یاد ہوتی ہے۔ میں نے حال ہی میں ایک کتاب دیکھی جس میں چند شعرا نے حالؔی کے کلام کی پیروڈی کی ہے۔ اور یہ نقلی نظمیں ایسی فحش ہیں کہ اردو میں شاید ہی چھپی ہوں اور ساتھ ساتھ فحاشی کی مذمت بھی ہے۔ غرض اس فحش دشمنی میں ایک خاص لذت ہے:

یہ بار بار جو کرتا تھا ذکر مے واعظ   پیے ہوئے تو کہیں خانماں خراب نہ تھا!

یہ لوگ فحش نوش ہیں' پیے ہوئے ہیں' بیمار ہیں۔ آئینے میں اپنی مکروہ صورت دیکھ کر آئینے کو توڑ دینا چاہتے ہیں۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ فحاشی معدوم ہے۔ فحش نویسی پرانی بیماری ہے بلکہ پرانی بیماری کی علامت ہے۔ اس کا علاج محض اصلاحی یا تادیبی اقدام نہیں۔ اور یہ لوگ اخباروں میں شور برپا

کر رہے ہیں یہ اپنا اور فحش نویسی کا اشتہار کر رہے ہیں، آپ بے خطر آگے بڑھتے جائیے اس سالنامے کی عام ادبی سطح بہت بلند ہے۔ 'پست او بسیار پست و بلند او بسیار بلند' والا معاملہ نہیں۔ ایک اچھا ایڈیٹر یہی کر سکتا ہے کہ رسالے کی ادبی سطح کو بلند کرتا جائے۔ مگر خدارا اس نئے ادب کے انتخاب میں تنقیدی احتساب سے کام لیجیے۔ مہمل گوئی اور ہذیان سرائی عبث کاری اور سطحیت لفظی قلابازیوں سے ادب نہیں بن جاتی۔ ایک آدھ تنقید آپ کی تنقیدی چھلنی میں سے نہ جانے کیسے نکل گئی ہے۔ اور یہ بھی یاد رہے کہ مخالفوں کی ضد میں آ کر غلط بات پر اصرار نہ کیجیے۔ مخالف کی تنقید سے فائدہ اٹھانا فتح مندی ہے! اس 'چند پند' کے بعد رخصت چاہتا ہوں۔ والسلام

مخلص،

تاثیر

ماخذ (اُردو۔۲۰)

حقیقت نگاری اور عریانی

آل احمد سرور

ترقی پسند تحریک کے اثرات اس وقت سب سے زیادہ نمایاں افسانوں میں ہیں، یہ اچھی بات بھی ہے اور بری بھی۔ اس وجہ سے افسانوں میں بڑی وسعت، بلندی اور گہرائی پیدا ہوتی ہے اور اس وجہ سے کچھ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ افسانے ہی ادب ہیں اور اس طرح سے اس تحریک کے سنجیدہ اور وقیع اور گہرے مقاصد کو نقصان پہنچتا ہے۔ افسانوں کی غیر معمولی مقبولیت اور کثیر پیداوار سنجیدہ تہذیبی مزاج کے لیے خطرہ ضرور ہے۔ میں یہ ماننے کے لیے تیار نہیں ہوں کہ افسانوں کی مقبولیت ترقی پسند تحریک کا نتیجہ ہے، کیوں کہ اس کا راز ہماری تخلیقی قوتوں کے شعلۂ مستعجل ہونے میں ہے۔ کچھ غزل کے آرٹ نے ہمارے مزاج میں جو دخل کر لیا ہے اس کا بھی یہ نتیجہ ہے، کچھ سنجیدہ، تعمیری، علمی اور فنی کاوشوں سے بچنے اور سستی شہرت حاصل کرنے کا جذبہ بھی اس میں شامل ہے۔ مگر افسانوں کے موجودہ سرمائے کو دیکھیے تو اس میں ترقی پسندی کے تمام اثرات ملتے ہیں اور یہ اس تحریک کے بڑے اچھے آئینے ہیں۔ ان افسانوں کے ذریعے سے حقیقت نگاری، نفسیاتی تخیل، سماجی تنقید، سیاسی مصوری، جنسی مسائل کی عکاسی، انسانیت کا حسن اور انسانیت کے زخموں کا حسن، کچلے ہوئے درماندہ لوگوں کی بلندی اور اونچی اناریوں کی ذہنی پستی سب کا ثبوت دیا گیا ہے۔ حقیقت نگاری نے جابجا، عریانی اور عریانی نے کہیں کہیں جنسی کج روی کی جگہ لے لی ہے۔ عریانی اور لذتیت اس بچے کی سی ہے جسے سخت پابندیوں کے بعد کھل کھیلنے کی اجازت مل گئی ہو، لیکن عصمت اور منٹو کے یہاں جو عریانی ملتی ہے وہ سستی عریانی نہیں ہے۔ یہ حیرت انگیز فنی پختگی اور حقیقت نگاری کے اعجاز کی دلیل ہے۔ عصمت کا 'لحاف' ایک اچھا افسانہ ہے، منٹو کا افسانہ 'بو' تو نہیں، 'کالی شلوار' بھی ایک شاہ کار ہے۔ ان افسانوں کی مخالفت غلط کی مخالفت ہو سکتی ہے۔ اس عریانی کے باوجود عصمت اور منٹو اردو کے بہترین افسانہ نگاروں میں ہیں۔ جو لوگ اس رجحان کی وجہ سے ان افسانہ نگاروں کی تمام خوبیوں سے انکار کر دیتے ہیں، ان کا ادبی شعور مرتب نہیں اور نہ ان کا ذہن حقائق سے آنکھیں چار کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ جنسی مسائل کی عکاسی بھی زندگی کے ایک بنیادی مسئلے کی عکاسی ہے۔ یہ ادب بھی ہے اور زندگی بھی لیکن اس میں شک نہیں کہ یہ ساری زندگی نہیں ہے،

یہ بڑی زندگی بھی نہیں ہے۔ اور بڑی زندگی اور صالح زندگی کے ہر تصور میں جنسی میلانات کی تہذیب ضروری ہے۔ اس لیے افسانوں کی کثرت اور اس قسم کے افسانوں کی کثرت جو فنی نقطۂ نظر سے بلند سہی، دراصل ادبی اور تہذیبی نقطۂ نظر سے ایک خطرہ ضرور ہیں، خصوصاً اُس ملک میں جہاں قید و بند ٹوٹتے ہیں تو ہر قید و بند سے انکار ضروری ہو جاتا ہے، جہاں عورت دُور ہے اور جنسی ہیجان کو بڑھانے والی کتاب قریب اور جہاں سخت جنسی پابندیوں نے لاشعور میں عجیب و غریب الجھنیں پیدا کر دی ہیں، وہاں ایک صحیح و صالح تہذیبی تحریک کے علم برداروں کو بعض پابندیاں خوشی سے قبول کر لینی چاہئیں تا کہ یہ بڑی تہذیبی تحریک جنسیات کی دلدل اور انفرادی لذتوں کے طلسم میں گھر کر نہ رہ جائے۔

میرے خیال میں بیدی، کرشن چندر، عصمت، منٹو، اختر انصاری، اختر اورینوی، حیات اللہ حسینی اور عسکری اردو کے بہترین افسانہ نگار ہیں۔ بیدی سب سے اچھا فنی احساس رکھتا ہے۔ اس کے افسانے ہیرے کی طرح ترشے ہوئے ہوتے ہیں، کرشن چندر اپنی خطابت اور جذباتیت کے باوجود فضا پیدا کرنے میں جواب نہیں رکھتا، عصمت کے یہاں حیرت انگیز قوت، قدرت اور شدت ہے، نوجوان لڑکیوں اور لڑکوں کی نفسیات اور متوسط طبقے کے خاندانوں کی بظاہر پُر سکون زندگی کے ہنگاموں کی عصمت سے پہلے کسی کو خبر نہ تھی کہ اس دنیا میں کیا کچھ نہیں ہوتا۔ اور منٹو کے کئی افسانے باوجود ایک خطرناک میلان کے اردو کے بہترین افسانوں میں شمار ہوں گے۔ ان میں 'نیا قانون' "ہتک" "کالی شلوار" 'دھواں' ضرور ہوں گے۔ اختر انصاری کا 'ایک واقعہ' اختر اورینوی کی 'کلیاں اور کانٹے'، حیات اللہ کی 'آخری کوشش' حسینی کی 'میلہ گھومنی' اور عسکری کی 'چائے کی پیالی' کے ذکر کے بغیر یہ جائزہ مکمل نہیں ہوگا۔ اس کے علاوہ اور بھی بہت سے نوجوان لکھنے والے ہیں، خصوصاً پنجاب میں جنھوں نے ترقی پسند افسانے کو تقویت پہنچائی ہے۔ اردو کے بیش تر افسانہ نگار اس تحریک سے متاثر ہیں۔ لیکن عسکری کے بعض افسانوں میں اور ممتاز مفتی کے آخری مجموعے میں ہمیں جو مینا کاری اور لاشعور کی مصوری ملتی ہے وہ ترکستان کی طرف لے جاتی ہے۔ لاشعور کی مصوری نشان راہ ہو سکتی ہے، منزلِ مقصود کبھی نہ ہونی چاہیے۔ اردو میں افسانہ اب بھی کم ہے، مضمون یا مرقع یا وعظ زیادہ، افسانہ نگار اب بھی افسانوں میں ضرورت سے زیادہ جھانکتا ہے، تقلید اب بھی عام ہے۔ انشا پردازی کے جوہر دکھانے کا شوق اب بھی مرض کی حد تک ہے، لیکن افسانے نے اس سال کے اندر اس تحریک کے زیر اثر جو حیرت انگیز ترقی کی ہے وہ مسلّم ہے۔

ترقی پسند ادب کی مخالفت مختلف حلقوں میں کی گئی۔ جو لوگ اتنے پرانے خیال کے ہیں کہ ہر نئی چیز انھیں زہر نظر آتی ہے، انھیں نظر انداز کرنا ہی بہتر ہے۔ جو لوگ اخلاق اور مذہب کے اجارے

دار بن کر اس ادب کی بداخلاقی پر اعتراض کرتے ہیں وہ مس میو کی طرح ہندوستان کے تاریک گوشے تلاش کر رہے ہیں جو یقیناً وہاں ہیں لیکن جو سب کچھ نہیں ہیں۔ بعض ترقی پسندوں کے یہاں عریانی بلکہ فحاشی ملتی ہے لیکن اس گناہ میں شہر کے بہت سے لوگ شریک ہیں، اور یہ گناہ بعض اور گناہوں کے مقابلے میں اتنا سنگین نہیں رہتا۔ پھر ترقی پسندی اور عریانی مترادف الفاظ نہیں ہیں، نہ ترقی پسندی ادبی بے راہ روی کی طرف لے جاتی ہے۔

ماخذ (اُردو۔٢٣)

اس نوع کی تنقید

فیض احمد فیض

میری نظر میں ادب کی صرف دو قسمیں ہیں اچھا ادب اور برا ادب۔ یہ دونوں قسمیں ہر دور اور ہر زمانے میں موجود تھیں اور آج بھی موجود ہیں۔ پرانے زمانے میں اگر نصف درجن ایسے اساتذہ تھے جن کا کلام آج تک مقبول ہے تو ان گنت ایسے یاوہ گو بھی تھے جنھیں گم نامی نگل چکی ہے۔ یہی صورت آج کل بھی ہے، گنتی کے اچھے لکھنے والے بھی ہیں اور ان گنت پوچ نویس بھی۔ پھر یہی نہیں کہ ہر دور میں تمام لکھنے والے یکساں طور پر اچھے نہیں ہوتے، بلکہ ہر لکھنے والے کی تمام تحریریں بھی ایک جیسی نہیں ہوتیں۔ کچھ اونچ نیچ ان میں بھی پائی جاتی ہے، مثلاً غالب کے دیوان میں (اور یہ دیوان غالب کا سارا کلام نہیں، انتخاب ہے) ایسے شعر بھی ملتے ہیں۔

اسد خوشی سے میرے ہاتھ پاؤں پھول گئے
کہا جو اس نے، ذرا میرے پاؤں داب تو دے

لیکن جس طرح ہم کسی ادیب کا رتبہ طے کرتے وقت اس کی بدترین تحریریں نہیں بلکہ اس کی بہترین تحریریں سامنے رکھتے ہیں، اسی طرح کسی دور یا کسی تحریک کی خوبیاں اور برائیاں جانچنے کے لیے اس کے بدترین تحریری نمونے نہیں، بہترین نمونے سامنے رکھنے چاہئیں۔ یہ کوئی عالمانہ نکتہ نہیں بالکل مبتدیانہ بات ہے۔ حیرانی ہے کہ نئے ادب کے نکتہ چیں تنقید کے اس بالکل ابتدائی کلیے سے بھی آگاہ نہیں۔ یا آگاہ ہیں اور عمداً اس پر عمل نہیں کرتے، شکایت ان ادبی لال بجھکڑوں سے نہیں جو راشد کے کلام کو، میرا جی یا مجاز کے کلام کو، مخمور جالندھری کے کلام سے تمیز نہیں کر سکتے۔ شکایت ان ثقہ نقادوں سے ہے جو چند اچھے لکھنے والوں کے معترف بھی ہیں لیکن اس کے باوجود جب بھی نئے ادب کے بارے میں کچھ لکھیں گے ان اچھے لکھنے والوں کو ایک آدھ جملے میں ٹال کر اپنا سارے کا سارا زور قلم گھٹیا لکھنے والوں کی خدمت میں صرف کر دیں گے۔ ان کے تنقیدی مضامین کا خلاصہ کچھ یوں بنتا ہے، "نیا ادب فحش ہے، عریاں ہے، ہذیانی ہے، اس میں خلوص اور حسن کی کمی ہے، اغلاط اور خامیوں کی افراط ہے، ہاں اکا دکا اچھے لکھنے والے بھی ہیں لیکن اس سے کیا ہوتا ہے!"۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے ہم کہیں کہ میر کا کلام پست ہے، غیر دلچسپ ہے، اس میں تک بندی اور افراط اور خالص شاعری کی کمی ہے، ہاں اس میں کہیں کہیں نشتر بھی

ہیں لیکن اس سے کیا ہوتا ہے!' یا یہ کہ 'پرانی غزلیہ شاعری فحش ہے' مبتذل ہے تصنع اور تکلف سے بھرپور ہے' ہاں اس میں غالب اور میر ایسے بھی ہیں لیکن اس سے کیا ہوتا ہے!'

اس نوع کی تنقید کو تنقید نہیں کہتے، اسے جہالت کہتے ہیں یا بددیانتی۔ اس میں شک نہیں کہ فحش اشعار اور قصے کہانیاں آج کل بھی لکھی جاتی ہیں' پہلے بھی لکھی جاتی تھیں۔ نئے ادب کے نقادوں نے ان بزرگوں کی فحاشی کا عجیب جواز نکالا ہے، فرماتے ہیں کہ 'یہ اگلے وقتوں کے لوگ فحش لکھتے تو تھے لیکن اچھا سمجھ کر نہیں' برا سمجھ کر لکھتے تھے۔ خوب، 'برا سمجھتے تھے تو لکھتے ہی کیوں تھے' بہرحال ان کے بعد ان کے معاصرین کے برا سمجھنے سے ان کی تحریروں کی عریانی کم ہو جاتی ہے' یا انگیا اور محرم کے معنی کچھ اور ہو جاتے ہیں! پوچ اور بے نمک نظم ونثر پہلے بھی لکھی جاتی تھی اب بھی لکھی جاتی ہے، لیکن ایسی تحریریں نہ پرانے ادب کی نمائندہ ہیں نہ نئے ادب کی' یوں کہنا چاہیے کہ ادب میں ان کا شمار ہی نہیں ہوتا۔ چناں چہ اگر آج کل کے زمانے میں محض ایک اچھی نظم یا ایک ہی کامیاب افسانہ لکھا گیا ہے تو نئے ادب کی نمائندہ وہی واحد نظم یا وہی واحد افسانہ ہے۔ اور نئے ادب کا جائزہ لیتے وقت باقی تمام تحریروں کو خارج از بحث سمجھنا چاہیے۔ شاید اس کے جواب میں کوئی صاحب یہ کہیں کہ ادب کو مجموعی حیثیت سے دیکھنا چاہیے' اگر کسی ادبی دور میں اچھی تحریریں کم ہیں اور بری' نسبتاً بہت زیادہ تو ہم اس دور کو کامیاب نہیں کہہ سکتے۔ لیکن یہ قطعاً مہمل بات ہے' تنقید بنیا پن نہیں کہ آپ ترازو لے کر بیٹھ جائیے اور یہ جانچنے کی کوشش کیجیے کہ اچھی تحریروں کا پلہ بھاری ہے یا بری تحریروں کا۔ اس ضابطے سے آپ کسی نتیجہ پر پہنچ ہی نہیں سکتے مثلاً اگر آپ نے ایک پلڑے میں حافظ یا غالب کا دیوان ڈال دیا تو دوسرے پلڑے میں خواہ جہان بھر کی خرافات ڈال دیجیے، پہلا پلڑا بھاری ہی رہے گا۔ دوسری بات یہ ہے کہ جب تک بری تحریروں پر کوئی ڈیفنس آرڈر یا زول عائد نہیں ہوتا، گھٹیا لکھنے والوں کی تعداد اور گھٹیا ادب کی مقدار اچھے لکھنے والوں اور اچھے ادب سے کئی گنا زیادہ ہی رہے گی۔ اور ہمیشہ رہی ہے۔ بڑے بڑے مطلق العنان بادشاہ شاعروں کی زبان پر قفل نہیں ڈال سکے تو آج کل جمہوریت کے دور میں اس فتنے کی اصلاح کیا ہوگی! خاص طور سے جب بہت سے مصلحین اچھے اور برے میں تمیز بھی نہیں کر پاتے' مختصر یہ کہ اگر ہم نئے ادب کو سمجھنا چاہتے ہیں' اگر ہم یہ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ اس ادب میں امتیازی بات کیا ہے' اس میں کون سے نئے مضامین' نئے تجربات یا نئے اسالیب قابل اعتنا ہیں تو ہمیں اس ادب کے بہترین اور پاکیزہ ترین نمونوں پر توجہ دینی چاہیے۔ خرافات کا کھوج لگانے اور لغویات کا تجزیہ کرنے میں اپنا اور دوسروں کا وقت ضائع نہیں کرنا چاہیے۔

ماخذ (اردو۔۴۲)

ادبِ جدید

سعادت حسن منٹو

میرے مضمون کا عنوان 'ادبِ جدید' ہے۔ لطف کی بات یہ ہے کہ میں اس کا مطلب ہی نہیں سمجھتا۔ لیکن یہ زمانہ ہی کچھ ایسا ہے کہ لوگ ایسی چیز کے متعلق باتیں کرتے ہیں، جن کا مطلب ان کی سمجھ میں نہیں آتا۔ پچھلے دنوں گاندھی جی نے آغا خان کے محل میں مرن برت رکھا۔ جب لوگوں کی سمجھ میں نہ آیا وہ کس طرح زندہ رہ سکتے ہیں تو ایک نارنگی پیدا کر دی گئی، یہ نارنگی بھی کچھ دنوں کے بعد ناقابل فہم ہو گئی۔ بعض آدمیوں نے کہا کہ نارنگی نہیں تھی، موسمی تھی۔ بعض نے کہا نہیں، موسمی نارنگی ہرگز نہیں تھی، مالٹا تھا۔ بات بڑھ گئی، چناں چہ اس پھل کی ساری ذاتیں گنوا دی گئیں: نارنگی، سنگترہ، موسمی، مالٹا، چکوترہ، سویٹ لائم، کھٹا لیموں، میٹھا لیموں، وغیرہ وغیرہ۔ پھر ڈاکٹروں نے ان میں سے ہر ایک کی وٹامنز گنوائیں۔ غذائیت کو کیلوریز میں تقسیم کیا گیا۔ ایک برس میں بہتر برس کے بڈھے کو کتنے کیلوریز کی ضرورت ہوتی ہے، اس پر بحث کی گئی اور صاحب گاندھی جی کی یہ نارنگی یا موسمی جو کچھ بھی تھی، سعادت حسن منٹو بن گئی۔ یہ میرا نام ہے، لیکن بعض لوگ ادب جدید المعروف نئے ادب یعنی ترقی پسند ادب کو سعادت حسن منٹو بھی کہتے ہیں اور جنھیں صنفِ کرخت پسند نہیں وہ اسے عصمت چغتائی بھی کہہ لیتے ہیں۔

جس طرح میں یعنی سعادت حسن منٹو اپنے آپ کو نہیں سمجھتا، اسی طرح ادبِ جدید المعروف نیا ادب یعنی ترقی پسند لٹریچر بھی میری فہم سے بالاتر ہے اور جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں، ان لوگوں کی سمجھ سے بھی اونچا ہے، جو اس کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر چند مضمونوں میں اس ادب کو جس کے کئی نام ہیں اور زیادہ نام دینے کے لیے فحش نگاری اور مزدور پرستی سے منسوب کیا گیا ہے۔ میں چیزوں کے نام رکھنے کو برا نہیں سمجھتا۔ میرا اپنا نام اگر نہ ہوتا تو وہ گالیاں کسے دی جاتیں جو اب تک میں ہزاروں اور لاکھوں کی تعداد میں اپنے نقادوں سے وصول کر چکا ہوں۔ نام ہو تو گالیاں اور شاباشیاں دینے اور لینے میں بہت سہولت پیدا ہو جاتی ہے، لیکن اگر ایک ہی چیز کے بہت سے نام ہوں تو الجھاؤ پیدا ہونا ضروری ہے۔

سب سے بڑا الجھاؤ اس ترقی پسند ادب کے بارے میں پیدا ہوتا ہے، حالاں کہ پیدا نہیں ہونا چاہیے تھا۔ ادب یا تو ادب ہے، ورنہ ادب نہیں ہے۔ آدمی یا تو آدمی ہے ورنہ آدمی نہیں ہے، گدھا

ہے' مکان ہے' میز ہے' یا کوئی اور چیز ہے۔ کہا جاتا ہے کہ سعادت حسن منٹو ترقی پسند انسان ہے' یہ کیا بیہودگی ہے! سعادت حسن منٹو انسان ہے اور ہر انسان کو ترقی پسند ہونا چاہیے۔ ترقی پسند کہہ کر لوگ میری صفت بیان نہیں کرتے بلکہ اپنی برائی کا ثبوت دیتے ہیں' جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ خود ترقی پسند نہیں ہیں' یعنی وہ ترقی نہیں چاہتے۔ میں زندگی کے ہر شعبے میں ترقی کا خواہش مند رہا ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ سب ترقی کریں۔ آج آپ طالب علم ہیں' ترقی کرتے ہوئے آپ بھی اپنے آئیڈیل تک پہنچ جائیں۔

ہر آدمی ترقی پسند ہے۔ وہ لوگ جنھیں تخریبی یا رجعت پسند کہا جاتا ہے' خود کو ترقی پسند ہی سمجھتے ہیں۔ اور پھر ہر زمانے میں قریب قریب ہر آدمی گزری ہوئی نسل کے مقابلے میں اپنے کو زیادہ ذہین' طباع اور ترقی یافتہ انسان ہی سمجھتا ہے۔ یہی حال ادب کا ہے۔ شرر کے ناول اور راشد الخیری کے قصے آج کل کے اکثر مصنفین کو بالکل بے جان معلوم ہوتے ہیں۔ پڑھنے والوں کی بھی یہی کیفیت ہے۔ مارکیٹ میں چلے جائیے۔ آج سے دس بیس برس پہلے کے لکھنے والوں کی کتابیں اسٹالوں پر بہت کم دکھائی دیتی ہیں۔ کرشن چندر' راجندر سنگھ بیدی' عصمت چغتائی اور سعادت حسن منٹو کی کتابیں ایم اسلم' تیرتھ رام فیروز پوری' سید امتیاز علی تاج اور عابد علی عابد کے مقابلے میں زیادہ پڑھی جاتی ہیں' اس لیے کہ کرشن چندر اور اس کے ہم عصر نوجوانوں نے زندگی کے نئے تجربے بیان کیے ہیں۔

آج سے بیس پچیس برس پہلے ملک کی سیاسی اور مجلسی حالت بالکل مختلف تھی۔ اسی طرح آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ پچاس ساٹھ برس اور پہلے کیسی ہوگی۔ اگر مغلیٔ حکومت کا دور دورہ ہوتا تو بہت ممکن ہے میرے گھر میں ایک حرم سرائے ہوتی' حرم سرائے نہ ہوتی تو کم از کم ایک بیوی گھر میں ہوتی اور دو تین طوائفیں میری ملازمت میں ہوتیں۔ مجھے بٹیریں لڑانے کا شوق ہوتا' یہ مضمون پڑھنے کے بجائے میں پرنسپل صاحب بالقابہ کی شان میں ایک قصیدہ سناتا جو خوش ہو کر یا تو میرا منھ موتیوں سے بھر دیتے یا جوگیشوری کالج مجھے بخش دیتے تاکہ میں اسے اپنا طویلہ بنا سکوں۔ مگر جیسا کہ آپ جانتے ہیں' حالت بہت مختلف ہے۔ مجھے یہاں سے پیدل اسٹیشن جانا پڑے گا اور فلمستان میں اپنے آقاؤں کو جواب دینا پڑے گا کہ میں اتنی دیر ڈاکٹر کے پاس کیا کرتا رہا۔ میں ان سے جھوٹ بول کے آیا ہوں کہ ڈاکٹر سے ٹیکہ لگوانے جا رہا ہوں۔

ہاں تو میں عرض کر رہا تھا کہ حالات بہت مختلف ہیں اور یہ اختلاف ہی ادب میں مختلف رنگ پیدا کرتا ہے۔ پہلے فارغ البالی تھی۔ لوگ آرام پسند اور عیش پرست تھے۔ اس زمانے میں ادب میں آپ کو بہت سی دماغی عیاشیاں نظر آ سکتی ہیں۔ وہ غنودگی بھی آپ محسوس کر سکتے ہیں' جو اس زمانے کے ادیبوں پر طاری تھی۔ اس زمانے میں شاعر اپنی اصیل مرغ کی جواں مرگی پر زوردار نوحہ لکھتا تھا اور بہت

بڑا شاعر تسلیم کیا جاتا تھا۔ آج کا شاعر اپنی جواں مرگی کے نوحے لکھتا ہے۔ اس عہد کا قصہ نویس جنوں اور پریوں کی داستانیں لکھ کر نام پیدا کرتا تھا، آج کا افسانہ نویس ان مردوں اور عورتوں کی کہانیاں لکھتا ہے جو جنوں اور پریوں سے کہیں زیادہ دلچسپ ہیں۔ اس دور کا ادیب مطمئن انسان تھا، آج کا ادیب ایک غیر مطمئن انسان ہے، اپنے ماحول، اپنے نظام، اپنی معاشرت، اپنے ادب، حتیٰ کہ اپنے آپ سے بھی۔

اس کی بے اطمینانی کو لوگوں نے غلط نام دے رکھے ہیں۔ کوئی اسے ترقی پسندی کہتا ہے، کوئی فحش نگاری اور کوئی مزدور پرستی! یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ان ادیبوں کے اعصاب پر عورت سوار ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ جبوط آدم سے لے کر اب تک ہر مرد کے اعصاب پر عورت سوار رہی ہے اور کیوں نہ رہے! مرد کے اعصاب پر کیا ہاتھی گھوڑوں کو سوار ہونا چاہیے! جب کبوتر کبوتریوں کو دیکھ کر گٹکتے ہیں تو مرد عورتوں کو دیکھ کر ایک غزل یا افسانہ کیوں نہ لکھیں! عورتیں کبوتریوں سے کہیں زیادہ دلچسپ، خوب صورت اور فکر خیز ہیں۔ کیا میں جھوٹ کہتا ہوں! آج سے کچھ عرصہ پہلے شاعری میں عورت کو ایک خوب صورت لڑکا بنا دیا گیا تھا۔ ظاہر ہے کہ اس زمانے کے شاعروں نے اس میں کوئی مصلحت دیکھی ہوگی، مگر آج کے شاعر اس مصلحت کے خلاف ہیں۔ وہ عورت کے چہرے پر سبزے یا خط کے آغاز کو بہت ہی مکروہ اور خلافِ فطرت سمجھتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ دوسرے بھی اس کو اس کی اصلی شکل ہی میں دیکھیں۔ خدا لگتی کہیے، کیا آپ اپنی محبوبہ کے گالوں پر داڑھی پسند کریں گے!

میں عرض کر رہا تھا کہ زمانے کی کروٹوں کے ساتھ ادب بھی کروٹیں بدلتا رہتا ہے۔ آج اس نے جو کروٹ بدلی ہے، اس کے خلاف اخباروں میں مضمون لکھنا یا جلسوں میں زہر اگلنا بالکل بے کار ہے۔ وہ لوگ جو ادبِ جدید کا، ترقی پسند ادب کا، فحش ادب کا یا جو کچھ بھی یہ ہے، خاتمہ کر دینا چاہتے ہیں تو صحیح راستہ یہ ہے کہ ان حالات کا خاتمہ کر دیا جائے جو اس ادب کے محرک ہیں۔ محمود آباد کے راجہ صاحب کا، حیدر آباد کے شاعر ماہر القادری صاحب کا، یا بمبئی کے دوا فروش حکیم حیدر بیگ صاحب کا اس لٹریچر کے خلاف ریزولیشن پاس کرنا بالکل بے کار ہے۔ جب تک عورتوں اور مردوں کے جذبات کے درمیان ایک موٹی دیوار حائل رہے گی، عصمت چغتائی اس کے چونے کو اپنے تیز ناخنوں سے کریدتی رہے گی۔ جب تک کشمیر کے حسین دیہاتوں میں، شہروں کی گندگی پھیلی رہے گی، غریب کرشن چندر ہولے ہولے روتا رہے گا۔ جب تک انسانوں میں اور خاص طور پر سعادت حسن منٹو میں کمزوریاں موجود ہیں، وہ خورد بین سے دیکھ کر باہر نکالتا اور دوسروں کو دکھاتا رہے گا۔ راجہ صاحب محمود آباد اور ان کے ہم خیال کہتے ہیں، یہ سراسر بیہودگی ہے، تم جو کچھ لکھتے ہو خرافات ہے۔ میں کہتا ہوں، بالکل درست ہے اس لیے کہ میں بیہودگیوں اور خرافات ہی کے متعلق لکھتا ہوں۔ راجہ صاحب محمود آباد ایک

کانفرنس کے صدر بن جائیں یا حکیم حیدر بیگ صاحب کھانسی دور کرنے کا مجرب شربت ایجاد کردیں' مجھے ان کی صدارت اور ان کے شربت سے کوئی دلچسپی نہیں۔

البتہ جب میں ٹرین میں بیٹھا بیٹھا اپنا نیا خریدا ہوا قیمتی پین نکالتا ہوں' صرف اس غرض سے کہ لوگ دیکھیں اور مرعوب ہوں تو مجھے اپنا سفلہ پن بہت دلچسپ معلوم ہوتا ہے۔ میرے پڑوس میں اگر کوئی عورت ہر روز خاوند سے مار کھاتی ہے اور پھر اس کے جوتے صاف کرتی ہے تو میرے دل میں اس کے لیے ذرہ برابر ہمدردی پیدا نہیں ہوتی۔ لیکن جب میرے پڑوس میں کوئی عورت اپنے خاوند سے لڑ کر اور خودکشی کی دھمکی دے کر سینما دیکھنے چلی جاتی ہے اور میں خاوند کو دو گھنٹے سخت پریشانی کی حالت میں دیکھتا ہوں تو مجھے دونوں سے ایک عجیب و غریب قسم کی ہمدردی پیدا ہو جاتی ہے۔ کسی لڑکے کو لڑکی سے عشق ہو جائے تو میں اسے زکام کے برابر اہمیت نہیں دیتا' مگر وہ لڑکا میری توجہ کو اپنی طرف ضرور کھینچے گا جو ظاہر کرے کہ اس پر سینکڑوں لڑکیاں جان دیتی ہیں لیکن درحقیقت وہ محبت کا اتنا ہی بھوکا ہے جتنا بنگال کا فاقہ زدہ باشندہ۔ اس بظاہر کامیاب عاشق کی رنگین باتوں میں جو ٹریجڈی سسکیاں بھرتی ہوگی' اس کو میں اپنے دل کے کانوں سے سنوں گا اور دوسروں کو سناؤں گا۔ چکی پیسنے والی عورت جو دن بھر کام کرتی ہے اور رات کو اطمینان سے سو جاتی ہے' میرے افسانوں کی ہیروئن نہیں ہو سکتی۔ میری چکلے کی ایک ٹکھیائی رنڈی ہو سکتی ہے جو رات کو جاگتی ہے اور دن کو سوتے میں کبھی کبھی یہ ڈراؤنا خواب دیکھ کر اٹھ بیٹھتی ہے کہ بڑھاپا اس کے دروازے پر دستک دینے آ رہا ہے۔ اس کے بھاری بھاری پپوٹے جن پر برسوں کی اُچٹتی ہوئی نیندیں منجمد ہوگئی ہیں' میرے افسانوں کا موضوع بن سکتی ہیں۔ اس کی غلاظت' اس کی بیماریاں اس کا چڑچڑاپن' اس کی گالیاں' یہ سب مجھے بھاتی ہیں۔ میں ان کے متعلق لکھتا ہوں اور گھریلو عورتوں کی شستہ کلامیوں' ان کی صحت اور ان کی نفاست پسندی کو نظرانداز کر جاتا ہوں۔

اعتراض کیا جاتا ہے کہ نئے لکھنے والوں نے عورت اور مرد کے جنسی تعلقات ہی کو اپنا موضوع بنالیا ہے۔ میں سب کی طرف سے جواب نہیں دوں گا' اپنے متعلق اتنا کہوں گا کہ یہ موضوع مجھے پسند ہے۔ کیوں ہے؟ بس ہے۔ سمجھ لیجیے کہ مجھ میں 'پرورژن' ہے، اور اگر آپ عقل مند ہیں' چیزوں کے عواقب و عواطف اچھی طرح جانچ سکتے ہیں تو سمجھ لیں گے کہ یہ بیماری مجھے کیوں لگی ہے۔

زمانے کے جس دور سے ہم اس وقت گزر رہے ہیں' اگر آپ اس سے ناواقف ہیں' تو میرے افسانے پڑھیے' اگر آپ ان افسانوں کو برداشت نہیں کر سکتے تو اس کا مطلب ہے کہ یہ زمانہ ناقابلِ برداشت ہے۔ مجھ میں جو برائیاں ہیں' وہ اس عہد کی برائیاں ہیں۔ میری تحریر میں کوئی نقص نہیں' جس نقص کو میرے نام سے منسوب کیا جاتا ہے' دراصل موجودہ نظام کا نقص ہے۔ میں ہنگامہ پسند نہیں۔ میں لوگوں کے خیالات و جذبات میں ہیجان پیدا کرنا نہیں چاہتا۔ میں تہذیب و تمدن اور سوسائٹی کی چولی کیا اتاروں گا جو ہے ہی ننگی! میں اسے کپڑے پہنانے کی کوشش بھی نہیں کرتا۔ اس لیے کہ یہ میرا کام نہیں'

درزیوں کا ہے۔ لوگ مجھے سیاہ قلم کہتے ہیں لیکن میں تختہ سیاہ پر کالی چاک سے نہیں لکھتا، سفید چاک کا استعمال کرتا ہوں کہ تختہ سیاہ کی سیاہی اور بھی زیادہ نمایاں ہو جائے۔ یہ میرا خاص انداز، میرا خاص طرز ہے جسے فحش نگاری، ترقی پسندی اور خدا معلوم کیا کچھ کہا جاتا ہے۔ لعنت ہو سعادت حسن منٹو پر، کم بخت کو گالی بھی سلیقے سے نہیں دی جاتی۔

جب میں نے لکھنا شروع کیا تھا تو گھر والے سب بیزار تھے۔ باہر کے لوگوں کو بھی میرے ساتھ دلچسپی پیدا ہو گئی تھی۔ چناں چہ وہ کہا کرتے تھے "بھئی کوئی نوکری تلاش کرو، کب تک بے کار پڑے افسانے لکھتے رہو گے۔" آٹھ دس برس پہلے افسانہ نگاری بے کاری کا دوسرا نام تھا، آج اسے ادبِ جدید کہا جاتا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ لوگوں کے ذہن نے کافی ترقی کر لی ہے۔ وہ وقت بھی آ جائے گا، جب اس جدید ادب کا صحیح مطلب واضح ہو جائے گا اور حکیم حیدر بیگ صاحب دہلوی کو اپنے شفا خانے سے اٹھ کر نئے لکھنے والوں کے روگ کی تشخیص نہیں کرنا پڑے گی۔

جب سے جنگ شروع ہوئی ہے، ادبِ جدید پر ایک نئے زاویے سے حملہ کیا جا رہا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ جب ساری دنیا جنگ کے شعلوں میں لپٹی ہے، ہر روز ہزاروں انسانوں کا خون مٹی میں مل رہا ہے، فنا بادۂ ہر جام بنی ہے، دوسری اجناس کی طرح انسان کے گوشت پوست کی دکانیں بھی کھلی ہیں، یہ نئے لکھنے والے کیوں خاموش ہیں! کیا ان کے قلم صرف جنسیات کی روشنائی ہی میں ڈوبتے ہیں؟ دنیا کا نقشہ بدل رہا ہے، ہر لحظہ، ہر گھڑی ایک نئے طوفان کا پیغام لا رہی ہے، مگر ان کے دل و دماغ پر ایسا جمود طاری ہے کہ دور ہی نہیں ہوتا۔

میں پھر دوسروں کی طرف جواب نہیں دوں گا، اپنے متعلق عرض کرنا چاہتا ہوں کہ دنیا کا نقشہ واقعی بدل رہا ہے۔ لیکن اگر میں نے اس کے متعلق کچھ لکھ دیا، تو میرا حلیہ بھی بدل جائے گا۔ ڈرپوک آدمی ہوں، جیل سے بہت ڈر لگتا ہے، یہ زندگی جو بسر کر رہا ہوں، جیل سے کم تکلیف دہ نہیں۔ اگر اس جیل کے اندر ایک اور جیل پیدا ہو جائے اور مجھے اس میں ٹھونس دیا جائے تو چٹکیوں میں میرا دم گھٹ جائے۔ زندگی سے مجھے پیار ہے، حرکت کا دلدادہ ہوں۔ چلتے پھرتے سینے میں گولی کھا سکتا ہوں، لیکن جیل میں کھٹمل کی موت نہیں مرنا چاہتا۔ یہاں اس پلیٹ فارم پر یہ مضمون سناتے سناتے آپ سب سے مار کھا لوں گا اور اُف تک نہیں کروں گا لیکن ہندو مسلم فساد میں اگر کوئی میرا سر پھوڑ دے تو میرے خون کی ہر بوند روتی رہے گی۔ میں آرٹسٹ ہوں، اوچھے زخم اور بھدے گھاؤ مجھے پسند نہیں۔

جنگ کے بارے میں کچھ لکھوں اور دل میں پستول دیکھنے اور اس کو چھونے کی حسرت دبائے کسی تنگ و تاریک کوٹھڑی میں مر جاؤں، ایسی موت سے تو یہی بہتر ہے کہ لکھنا وکھنا چھوڑ کر ڈیری فارم کھول لوں اور پانی ملا دودھ بیچنا شروع کر دوں۔ میں اس جنگ کے بارے میں کچھ نہیں لکھوں گا۔ گولے اور تارپیڈو ایک طرف رہے، میں نے آج تک ہوائی بندوق بھی نہیں چلائی۔ بچپن کی بات ہے

ہمارے پڑوس میں ایک تھانیدار رہتے تھے، ان کے پاس ایک پستول تھا۔ پیٹی اتار کر جب پلنگ پر رکھتے تو سب بچوں سے کہہ دیا جاتا: ’دیکھو اس کمرے میں مت جانا، وہاں پستول پڑا ہے۔‘ کبھی کبھی ہم ڈرتے ڈرتے اس کمرے میں چلے جاتے، دور کھڑے رہ کر اس خطرناک آلے کی طرف دیکھتے تو دل دھک دھک کرنے لگتا، ایسا محسوس ہوتا کہ پڑے پڑے وہ پستول درغ جائے گا۔ اب بتائیے میں اور میرے دوست ٹینکوں کے بارے میں کیا لکھیں گے! مجھے چست وردی پہننے کا شوق نہیں ہے۔ پیتل اور تانبے کے تمغوں اور کپڑے کے رنگین بلّوں سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں۔ ہوٹلوں میں ڈانس کر کے، کلبوں میں شراب پی کر اور ٹیکسیوں میں چونا کتھا لگی لڑکیوں کے ساتھ گھوم کر میں وار الیفرٹ کی مدد کرنا نہیں چاہتا، اس سے کہیں زیادہ دلچسپ مشاغل مجھے میسّر ہیں۔ مثال کے طور پر یہ مشغلہ کیا برا ہے کہ میں ہر روز بمبئے سینٹرل سے گورے گاؤں اور گورے گاؤں سے بمبئے سینٹرل تک برقی ٹرین میں سینکڑوں وردی پوش فوجیوں کو دیکھتا ہوں جو فتح و نصرت کو اور زیادہ قریب لانے کے لیے شراب کے نشے میں مدہوش یا تو ٹانگیں پسارے سو رہے ہوتے ہیں، یا نہایت ہی بدنما عورتوں سے میری موجودگی سے غافل نہایت ہی واہیات قسم کا رومانس لڑانے میں مصروف ہوتے ہیں۔

میں اس جنگ کے بارے میں کچھ نہیں لکھوں گا، لیکن جب میرے ہاتھ میں پستول ہوگا اور دل میں یہ دھڑکا نہیں رہے گا کہ یہ خود بخود چل پڑے گا تو میں اسے لہراتا ہوا باہر نکل جاؤں گا اور اپنے اصلی دشمن کو پہچان کر یا تو ساری گولیاں اس کے سینے میں خالی کر دوں گا یا خود چھلنی ہو جاؤں گا۔ اس موت پر جب میرا کوئی نقاد یہ کہے گا کہ پاگل تھا تو میری روح ان لفظوں ہی کو سب سے بڑا تمغہ سمجھ کر اٹھا لے گی اور اپنے سینے پر آویزاں کر لے گی۔

(یہ مضمون دراصل منٹو کی ایک تقریر ہے جو اس نے جوگیشوری کالج بمبئے میں طالب علموں کو پڑھ کر سنائی تھی۔ اس تقریر یا مضمون پر حکومت پنجاب نے زیر دفعہ ۳۸ ڈیفنس آف انڈیا رولز مقدمہ چلایا تھا۔ الزام یہ تھا کہ اس میں حضور ملک معظم کی ’فورسز‘ کے متعلق ایسی غلط باتیں موجود ہیں، جن سے ان کو ضعف پہنچ سکتا ہے)۔

ماخذ (اُردو۔۳۶)

یہ فحش نگاری کیا ہوتی ہے!

عصمت چغتائی

کہتے ہیں ایک آدمی تھا، اس کی تین چار بیویاں تھیں، کم بختیں، سب کی سب تو تلی۔ ایک دن چند دوستوں کی دعوت کی، میاں نے سختی سے بولنے سے منع کر دیا کہ سنیں گے تو ہنسی اڑائیں گے۔ پر جب انھوں نے کھانے کی تعریف کی تو بیویوں کا جی نہ مانا اور بول ہی اٹھیں۔ تینوں تو خیر اپنی اپنی تعریف میں بولیں، پر چوتھی نے کہا: 'بھلا ہوا ہے جو ہم نہ بولے، میاں آئیں گے تو جوتے لگیں گے'۔ تو صاحب وہ جوتے لگے مگر سب سے زیادہ ان آخری بولنے والی کے۔ تو آج کل 'ساقی' سب کی باتیں سن رہا ہے، تو ہم کیوں چپ رہیں، آخر ہم بھی منہ میں زبان رکھتے ہیں۔ عام موضوع نیا ادب ہے۔ ہم درد لوگ انسانیت، اخلاق، ادب اور تہذیب کو گم راہی سے بچانے کے لیے اس شتر بے مہار یعنی نئے ادب کے پیچھے ہر قسم کے ہتھیار لے کر حملہ آور ہوئے ہیں اور قبلہ اونٹ صاحب کچھ بوکھلائے نظر آ رہے ہیں۔ اللہ جانے کس کروٹ بیٹھتے ہیں یا اور بدحواس ہونے کا ارادہ ہے! سنا ہے کہ جب اونٹ کو غصہ آتا ہے تو دشمن کی کھوپڑی اتار لیتا ہے۔ کیا معلوم بھئی! اور ذرا ہتھیار ملاحظہ ہو اور بدکانے والے! 'نیا ادب سوائے جنسی الجھنوں کے کچھ نہیں'!! 'نیا ادب گر رہا ہے'!

یا اللہ، یہ فحش نگاری کیا ہوتی ہے! ہماری ایک خالہ تھیں جو کمسن لڑکیوں کو ہر وقت ڈھنگ سے دو پٹہ اوڑھنے کی تلقین کیا کرتی تھیں، ذرا شانے سے دو پٹہ ڈھلکا اور ان کی آنکھوں میں خون اترا۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ اس خاص حصۂ جسم سے کیوں جلتی تھیں! معلوم ہوا کہ محترمہ خود چوں کہ نہایت مرجھائی ہوئی، کھٹائی کی شکل کی تھیں، اور لڑکیوں کے جسم کو دیکھ کر کوئلہ ہو جاتی تھیں۔ بے چاری خالہ! نہ جانے کتنی خالائیں، نانیاں جوانی کھو کر لڑکیوں کی سوتیں بن جاتی ہیں۔ یہی حال نئے ادب نے پرانے ادب کا کر دیا ہے اور وہ اس کے شباب کی تپش سے پگھلا جا رہا ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا، آخر اگر عریانی نظر آتی ہے تو لوگ بلبلا کیوں اٹھتے ہیں۔ یہ مانا کہ یورپ کے لڑکیوں اور لڑکوں کی تعلیم و تربیت بچپنے سے ہی کچھ اس انداز سے ہوتی ہے کہ ان کے نزدیک صنفی چیزوں کی کچھ اہمیت نہیں رہ جاتی۔ وہ جب اس کے متعلق کچھ پڑھتے ہیں تو ان کے کانوں پر جوں تک بھی نہیں رینگتی اور یہاں تو سانپ پھنپھنانے لگتا ہے۔ کیوں صاحب، کیا ضروری ہے کہ اس مقدس سانپ کو ہم اپنی آئندہ نسل کا خون چوسنے کے لیے

زندہ چھوڑ دیں! کیوں نہ اُس کا پھن جلد از جلد کچل کر قصہ پاک کر دیا جائے۔ نئے ادیب جو چن چن کر سانپوں کو کچلنے کی فکر میں ہیں، دشمنِ دین و دنیا کیوں سمجھے جا رہے ہیں!

مگر یہ بھی تو غلط ہے کہ نئے ادب میں صرف عریانی ہی ہے۔ وہ مثل ہے نا کہ جیسی روح ویسے فرشتے۔ چند اصحاب نے صرف عریانی کو پڑھا اور ان کے دل و دماغ پر نقش کر گئی، باقی باتیں مطلب کی معلوم نہ ہوئیں، لہٰذا نظر انداز کر دیں۔ مگر عریاں جملے یقیناً سو سو بار رٹے۔ ذرا غور کیجیے، عریانی پڑھنے کے شوقین تو معصوم بن کر چھوٹ جائیں، اور لکھنے والا بُرا۔ یہ ضروری نہیں کہ ہر گندگی فضول میں دکھائی جائے اور سڑکوں پر بے کار ننگے گھومنے لگیں، لیکن غسلِ آفتابی کے لیے کسی ضروری حصہ جسم کو کھولنے کا موقع آئے تو اس میں کیا شرم! اگر پٹی کھولنے سے زخم خشک ہو جائے تو یہ عریانی نہیں ہوتی بلکہ اسے علاج کہتے ہیں اور وہ بزرگ جو اس سے چڑ جائیں، قابل رحم ہیں۔ یہ تو ٹھیک ہے کہ عریانی تکلیف دہ ہوتی ہے، اور اس عریاں ادب کے آئینے میں نہ جانے لوگوں کو کیا نظر آتا ہے کہ وہ اینٹ لے کر غریب آئینے پر دانت پیس کر دوڑتے ہیں۔ بھلا سوچیے تو اس میں آئینے کا قصور ہی کیا!

شاید افسانوں اور کہانیوں میں عریانی دیکھ کر لوگوں کے رکیک جذبات میں ہیجان پیدا ہو جاتا ہے۔ ایک صاحب کو زہرہ کا مرمریں مجسمہ دیکھ کر مرگی کا دورہ پڑ جاتا ہے، اب اس کا علاج کسی ادیب کے پاس تو نہیں۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ واقعے کو واقعہ سمجھ کر پڑھیے۔ ارے صاحب، یہ تو زندگی کی تصویر ہے، کھلی بھی ہے، ڈھکی بھی ہے۔ اگر عریانی ہے تو بھی تو کیا ضرور کہ مرگی کا دورہ ضرور ڈالا جائے، ضبط اور جذبات پر قابو بھی تو کوئی چیز ہے۔ اور ایسا عریانی میں عیب ہی کیا ہے جو آپ ادب کی عریانی سے لرزے جاتے ہیں! یہ نہیں دیکھتے کہ ادیب خود دنیا کی عریانی سے لرز اٹھا ہے، اور دہشت کے مارے کانپ رہا ہے۔ وہ تو صرف حروف میں انھی باتوں کو منتقل کر رہا ہے جو دنیا میں ہو رہی ہیں۔ نیا ادب موجودہ زمانہ کی تاریخ ہے۔ برسوں بعد جب یہ نیا ادب نیا نہ رہے گا، تب بھی اسی طرح سیاسی، اقتصادی اور معاشرتی حالات کے متعلق تاریخی مواد پہنچاتا رہے گا۔ یہی کہانیاں اور نظمیں تاریخ کے صفحات میں تبدیل ہو جائیں گی۔ اگر نیا ادب گندہ ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ دنیا گندی ہے جس کی یہ تصویر ہے، مصور کا کیا قصور؟

تاریخ اور ادب ساتھ ساتھ رہیں ہیں اور رہیں گے۔ اقتصادیات جدا نہیں کی جا سکتی، خواہ سیاسی مجبوریاں ادب کو سیاست سے دور رکھیں، پھر بھی چھپا رنگ پھوٹ ہی نکلے گا۔ اس نئے ادب سے پہلے، رومان اور مزاح کا زور تھا۔ پطرس، عظیم بیگ، رشید احمد، شوکت تھانوی، امتیاز علی تاج، فرحت اللہ بیگ سب ہی تو کم و بیش ایک ہی سا لکھتے تھے۔ ذرا غور سے پڑھیے وہی بیوی کے مظالم، دوستوں کی خوش مزاقیاں، گھریلو جھگڑے سب کے سب ایک ہی بات لکھتے تھے، ہاں یہ بات اور تھی کہ سب کا رنگ جدا

تھا۔ اور اب نئے ادیب کیا لکھ رہے ہیں، جنسی الجھنیں، امیر و غریب کے جھگڑے، زندگی سے جنگ اور جملہ دنیا کی تلخیاں، یہ تو ہمیشہ ہی ہوتا ہے، پھر نئے ادیبوں سے کیوں شکایت ہے کہ وہ سب ایک رنگ میں رنگے ہوئے ہیں۔ کس قدر فضول نقص ہے! ارے صاحب ملیریا پھیلتا ہے تو سب کو کونین ہی دیتے ہیں، دکھ درد میں سب انسان ایک ہی طرح روتے پیٹتے ہیں، کوئی گاتا تو ہو نہیں رہا جو سُر تال میں ہو، پرانا ادب بھی زندگی کی تصویر تھی اور نیا ادب بھی۔

یہ مانا کہ جب پرانا ادب لکھا گیا تو یہ دنیا اتنی گندی اور عریاں نہیں تھی، اور اب آپ جدھر نظر اٹھا کر دیکھیے، دنیا ننگی، بھوکی، چور اچکی اور مکار نظر آتی ہے۔ نئے ادیب کیا کریں، کیسے آنکھوں پر پٹی باندھ کر گل بکاؤلی اور مثنوی گلزار نسیم لکھنے لگیں! 'فسانۂ آزاد' اور مذاقیہ کہانی لکھتے چلے جائیں، نئے ادیب زیادہ تر ننگے بھوکے اور حساس ہیں۔ ان کے دل و دماغ زیادہ تیزی سے کام کر رہے ہیں اور ذرا سی چوٹ سے بھنا اٹھتے ہیں۔ ان کے بھیانک خواب جن کی اور بھی بھیانک تعبیریں، یہ ہماری دنیا کا نقشہ ہے۔ برا ہے یا اچھا، یہ فیصلہ آئندہ پود کے ہاتھوں میں ہوگا کہ وہ اسے سینہ سے لگائے یا ٹھکرائے، ہم اور آپ کبھی انصاف سے کچھ نہیں کہہ سکتے اور آپ کا فیصلہ بیکار ہے، جو چوٹ کھایا ہوا سانپ ہے وہ دب نہیں سکتا، آپ کے اعتراض اور طعنے اسے خاموش دبک جانے پر مجبور نہیں کر سکتے۔ وہ چیخے گا۔ دکھ ہوگا تو روئے گا۔

یہ جنسی بھوک ہے جس پر مہذب لوگوں کو اعتراض ہے، اسی طرح کہانیوں میں جھلکے جائے گی جب بھوک ہی ٹھہری تو پھر ہائے ہائے کیوں نہ ہو۔ نئے ادیب اتنے شرمیلے اور بزدل نہیں جو طعنوں تشنوں سے ڈر جائیں گے۔ یہ جنسی پکار جو افسانوں میں نظر آرہی ہے، کیا ان کا تعلق اقتصادی اور معاشرتی حالت سے کچھ بھی نہیں! کیا اس میں آپ کو سیاست کی چاشنی نظر نہیں آتی! آپ نے ڈیمانڈ اور سپلائی کے متعلق اکنامکس میں پڑھا ہوگا۔ ذرا اس نکتے کو ہماری موجودہ زندگی پر پرکھیے جنسی ڈیمانڈ بھی ہے اور سپلائی بھی۔ مگر مارکیٹ نہیں، یعنی عورتیں بھی ہیں اور مرد بھی اور خواہشات بھی، مگر ان کا ذکر بے شرمی! ہندوستان کے لوگ غریب ہیں، اکثر نادار ہیں، ناداری میں شادی مصیبت، ناداری میں عیاشی گناہ، ناداری میں جینا منع، کیوں؟ ہمارے نوجوان باوجود تعلیم اور جسمانی قابلیت رکھنے کے دنیا کی دلچسپیوں سے محروم۔ علم تو الٹا ہمارے لیے مصیبت ہو گیا کہ نہ پڑھتے نہ یہ معلوم ہوتا کہ دنیا کے دوسرے انسان کیا مزے اڑا رہے ہیں۔ مزے سے اپنی چمڑی میں مگن رہتے ہیں مگر اب ہم جانتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ اور ملکوں میں زندہ رہنا جرم نہیں اور یہاں کے نوجوانوں کو کچھ بھی نصیب نہیں۔ یہاں ہر بات عجیب، ہر بات گندگی، عریاں اور مخرب اخلاق، وہاں عیش کے ہزاروں اسباب، یہاں زندگی کے خواب دیکھنا جرم، خیر اگر یہ مصیبتیں تھیں تو کم از کم احساس ہی کند ہوتا! کاش مٹی کے تودے ہوتے جو نہ سنتے، نہ

دیکھتے، نہ دیکھ کے چلاتے، زمانے کی ٹھوکروں میں لڑھکتے، فنا کی طرف چلے جاتے۔

مگر نئی دنیا کا نیا بنیا، ضدی، بدمزاج اور اکھڑ ہے، وہ موجودہ نظام کو پسند نہیں کرتا، وہ ایک نئے نظام کے لیے بےکل ہے، وہ اسے بدل ڈالنا چاہتا ہے، مگر ابھی تو بدنظمی سے تنفر، غصہ ہو ہو کر اپنی بوٹیاں چبا رہا ہے، خود اپنا ہی جسم اور روح چیر کر پھینک رہا ہے اور کل وہ اس نظام کو توڑ پھوڑ کر دوسرا نظام بنائے گا۔ مگر نظام کو توڑنے سے پہلے اسے نہ جانے کس کس کو کچلنا پڑے گا، کس کس کے پیروں سے روندا جائے گا، اور جو باقی رہے گا وہ نئے نظام کی تکمیل کرے گا، یہ نظام کیا ہوگا، یہ ابھی کسی کو نہیں معلوم۔ نئے ادب کے پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس نئے نظام میں دکھ، بھوک اور افلاس تو نہ ہوگا۔ فاقے، جنسی اور روحانی، نہ ہوں گے، بدمعاشی نہ ہوگی، طوائفوں کے اڈے نہ ہوں گے۔ اگر ہوں گے تو صرف انسانوں کے گھر ہوں گے، جہاں انسان رہے گا۔ عورتوں کو بھوکی کتیوں کی طرح غلیظ مورچوں میں عذاب دوزخ بن کر نہیں بیٹھنا پڑے گا، مرد حیوانیت سے دور ہوں گے۔ قدرت کے اصول کے مطابق جو انسان پیدا ہوں گے، وہ انسان مانے جائیں گے، اور شادی بیاہ صرف پیسے ہی والوں کے نہ ہوں گے بلکہ ہر تندرست انسان کو مکمل زندگی گزارنے کا حق ہوگا۔

نیا ادب پکار پکار کر انسان کو جینے کا حق دلانا چاہتا ہے۔ زندگی اور اس کے سارے لوازمات جو باپ دادا کی وراثت بن گئے ہیں، انسان کا حق ہو جائیں گے۔ نئی دنیا کے دکھ بہت بڑھ گئے ہیں اور نیا ادب اسی دنیا کے دکھوں کی آہ ہے جو دنیا کے ہر نوجوان کے پور پور جسم سے نکل رہی ہے۔ طعنے دینے سے کچھ نہیں ہوتا، بڑھیائیں طعنے دیتی مر گئیں، بوڑھے لاحول بھیجتے چل دیے، مگر نوجوان زندگی کی کش مکش میں پھنسا ہوا ہے۔ وہ مٹنے کے لیے تیار نہیں، وہ بزدل نہیں اور اسے بےشرمی کے خطاب سے ذرا بھی شرم نہیں آتی۔ جب ادب کا سوال آتا ہے، تو اس میں زنانے، مردانے ادب کا کیا سوال! جو نظام لڑکوں کو پسند نہیں، وہ لڑکیوں کو کب پسند آ سکتا ہے! مرد اگر چیخ سکتا ہے تو عورت کو بھی کراہنے کی اجازت ہونی چاہیے۔

نئے ادب کا مقابلہ ایک بزرگ جنسی کتاب سے کرتے ہیں۔ بالکل ٹھیک، لیکن معلوم ہوتا ہے کہ جیسے ہمارے ملک کے لوگ جنسی معلومات پر لکھی ہوئی کتابوں کو صرف لذت کے لیے پڑھتے ہیں، اسی طرح وہ نئے ادب سے لطف اندوز ہونا چاہتے ہیں۔ جنسی معلومات پر کتابیں طبعی اصول واضح کرنے کو لکھی گئی تھیں، لیکن لوگ ان سے ادبی ذوق فرمانے لگے اور اسی طرح نئے ادب کو ناول اور افسانہ سمجھ کر مزہ لینا چاہتے ہیں۔ مگر بجائے اس میں چٹخارے دار مسالے کے جب کونین نکلتی ہے، تو غریب ادیب کے جنم پر تھوکتے ہیں۔

آخر میں ایک بات نئے ادیبوں سے۔ ان فضول طعنوں کی پرواہ نہ کیجیے، یہ اعتراض کب

نہیں ہوئے! کس نے نہیں کیے! سوائے دادی اماں کے لاڈلے بیٹوں کے کون ایسا ہے جس نے کبھی بزرگوں سے شاباشی وصول کی ہو! نوجوانی سے بزرگوں کو ہمیشہ نفرت رہی ہے اور رہے گی، سچ تو یہ ہے کہ آپ جو کچھ لکھتے ہیں، یہ بزرگوں کے لئے ہے بھی نہیں، کچھ کہیں تو ادب سے سر جھکا کر مسکرا دیجیے، لکھیے ضرور۔ لکھیے جو کچھ آپ دیکھتے ہیں، سنتے ہیں، سوچتے ہیں، وہ ضرور لکھیے۔ نہ زبان کی غلطیوں سے ڈریے، نہ اس بات سے ڈریے کہ کوئی آپ کو ادیب نہیں مانتا۔ اگر آپ جس دنیا میں رہتے ہیں اس میں کچھ مسموم کانٹے ہیں، کچھ بھیانک درندے ہیں، کچھ خوف ناک کیڑے مکوڑے ہیں تو آئندہ نسل کے لیے اسے لکھ جائیے، اس کا سبق آپ ہی کے تجربے ہوں گے، آپ کے ہی مشاہدے ان کے ذہنی مشاہدات ہوں گے۔ اچھا، بُرا، کڑوا، کسیلا، سب کچھ لکھ دیجیے اور وہ خوراکیں جو ہمارے شریر مریض پینے سے انکار کر رہے ہیں اور بے طرح مچلتے ہیں، آئندہ نسلیں انھیں فخریہ احترام سے لیں گی، کیوں کہ آئندہ نسل زیادہ سمجھ دار، روشن دماغ اور اچھے بُرے کو پرکھنے والی ہوگی، اس کے لیے یہ خوراکیں بھاری نہیں ہوں گی، وہ نسل واقعے کو واقعہ سمجھ کر پرکھے گی، اس کے جذبات اس قدر بودے نہ ہوں گے جو عریانی اور سچی بات سے پھڑ پھڑا جائیں، جیسے شیر کی بُو پا کر گھوڑا بدکنے لگتا ہے۔ لکھیے اور اتنا لکھیے کہ یہ ان کے لیے بالکل معمولی بات ہو جائے، اور ان جراثیم کو اپنے تیزاب جیسے ادبی مادے سے تباہ کر دیجیے اور یہی روئی کے گالے جن میں ایک چنگاری بھی پڑ جائے تو بھک سے اڑ جاتے ہیں، برف کے گالے بنا دیجیے جن سے انگارے بھی سرد پڑ جائیں۔

اور چلتے چلتے ایک بات ان بزرگانِ قوم سے کہ یہ نوجوانوں پر اعتراض تو اب پرانا فیشن ہو گیا، اور پرانی چیز کو دفن ہی کر دیا جائے تو بہتر ہے، بے شک آپ کو برا لگتا ہے، اور آئندہ ادب ان موجودہ ادیبوں کو بُرا لگے گا۔ موت کسی کو اچھی نہیں لگتی۔ ان اصحاب کو کیوں کر بھول جاؤں جو خود تو خوب لکھ چکے ہیں اور اب تائب ہو گئے ہیں، نصیحت پر تل گئے ہیں۔ ایک صاحب تو بہت ہی بگڑ گئے اور انھوں نے چند لاجواب اشعار بھی گنہ گاروں کو راہ راست پر لانے کے لیے لکھے، جن کی داد دیے بغیر رہا نہیں جاتا۔ مجھے بدقسمتی سے ان کا قافیہ اور ردیف اس وقت یاد نہیں رہا، مگر معنی جو دل پر نقش ہیں وہ یہ ہیں کہ ادیب ایسی فحش نگاری کرتے ہیں تو کیا ان کی ماں بہن نہیں ہوتیں!۔ علاوہ شاعری کے، یہ نرالا اور گالی دینے کا مہذب طریقہ ہے اور مجھے از حد خوشی ہوئی کہ اور باتوں میں پیچھے سہی لیکن اس ہنر میں ہر ملک سے بہت ترقی کر چکے ہیں۔ ان حضرات سے دست بستہ عرض ہے کہ قبلہ، اگر ماں بہن نہ ہوتیں تو پھر مشاہدہ کہاں ہوتا؟ یہ ادب ہے، گپ اور خرافات تو ہے نہیں کہ نشہ پی کر لکھ ڈالا۔ آپ کہیں گے شرم نہیں آتی!'' جی سچ کی تو نہیں آتی، اگر آپ کہیں تو رعایتاً شرمانے کو تیار ہیں۔ اگر مصور شرمانا ہی شروع کر دیتے تو آج آپ کو آرٹ نظر نہ آتا۔ نئے ادیب آئینہ ساز ہیں، ہر شخص اس آئینے میں دیکھ کر

شرما سکتا ہے۔ اوہ۔ ہاں، بس ایک بات اور، اچھے فرماں بردار بچوں سے جو اخلاق اور تہذیب کے حامی ہیں، وہ ہرگز ہرگز نہ نیا ادب لکھیں اور نہ پڑھیں، کیوں کہ نیا ادب 'اخلاق' اور 'تہذیب' کی دھجیاں بکھیرتا ہے، یہ تو صرف ان لوگوں کے لیے ہے جو بے خوف اور بے جگرے ہیں، جن کا ہاتھ بھی سڑ جائے تو اسے کاٹ کر پھینک سکتے ہیں گجا جھوٹی اور بناوٹی سوسائٹی، جو اس بات کی پروا نہیں کرتی کہ اخباروں نے بائیکاٹ کر دیا اور ادیب روٹھ گئے۔ اور وہ دن دور نہیں جب اس ادب کا ریزہ ریزہ لوگ پلکوں سے چن لیں گے۔ مورخین، اکونومسٹ اور محکمہ تعلیم والے اس کو جمع کر لیں گے۔ اگر یہ موجودہ زمانے کی سچی تصویر ہے تو خود بخود عجائب خانے کی زینت بن جائے گا، اور اگر کوڑا کرکٹ ہے تو اپنے راستے لگ جائے گا۔

ماخذ (؟)

ادیبوں کا نصب العین

احمد ندیم قاسمی

فرض کیجیے راول پنڈی جانے والی گاڑی میں بیٹھے ہوئے ایک مسافر سے دوسرا مسافر پوچھتا ہے آپ کو کہاں جانا ہے اور پہلا مسافر جواب دیتا ہے۔ راول پنڈی۔ تو دوسرے مسافر کے اس مسلسل اصرار کے لیے آپ اردو لغت میں سے کون سا لفظ تجویز کریں گے۔ 'نہیں آپ بکتے ہیں' آپ تو امرت سر جا رہے ہیں۔' مجھے افسوس ہے کہ جاوید اقبال ایسے معقول نوجوان نے اس حکایت کے دوسرے مسافر کا پارٹ مندرجہ صدر عنوان سے ایک مقالہ لکھ کر کچھ اس شدت سے اور کچھ ایسے افسوس ناک بھولپن سے ادا کیا ہے کہ دکھ بھی ہوتا ہے اور رحم بھی آتا ہے۔

جاوید اقبال نے اپنے مضمون میں پاکستان کے ادیبوں کو ایک نصب العین متعین کر کے تعمیری ادب تخلیق کرنے کی دعوت دی ہے۔ لیکن خود ان کا نصب العین محلِ نظر ہے اور تعمیری ادب کے سلسلے میں مثال دیتے ہوئے موپساں کے ایک افسانے کا غلط مطلب نکال کر انھوں نے بورژوائی ذہنیت کا کچھ ایسا مظاہرہ کیا ہے کہ سارے کا سارا مضمون جاوید اقبال کے بجائے کسی ایسے ادارے اور کسی ایسے مدرسہ فکر کا ترجمان معلوم ہوتا ہے جو تعمیر کے متعلق صرف اس نظریے کا قائل ہے کہ محل کے گرتے ہوئے ستونوں کو بدلنے یا ان کی مرمت کرنے کے بجائے انھیں دونوں بانہوں میں جکڑے رکھنا چاہیے۔ میں نے اس مضمون کے بارے میں یہ اندازہ اس لیے لگایا ہے کہ اس میں جگہ جگہ دو شخصیتیں نمایاں ہو جاتی ہیں۔ ایک وہ جاوید اقبال جو نوجوان ہے 'نئی زندگی کے تقاضوں کو کسی حد تک سمجھتا ہے اور روایتی نظاموں سے اُکتایا ہوا ہے۔ دوسرا وہ جاوید اقبال جسے ایک خاص خود غرض طبقے نے ایک قطعی مختلف نظریے کے اظہار کی خاطر وقتی طور پر منتخب کیا ہے۔

اس نصب العین کے مسئلے کا پس منظر مجھ پر بھی واضح ہے لیکن میں اس قسم کی تفصیلوں میں نہیں جاؤں گا جنھیں جاوید اقبال نے فاش کر دیا ہے اور اس طرح اپنی ذمے دار حیثیت کو ایسی ٹھیس لگائی ہے کہ وہ مدتوں تک اپنے نظریاتی آئینے کی کرچیاں ہی چنتے رہ جائیں گے اور وہ کارنامے سرانجام نہیں دے سکیں گے جن کی ان سے مجھے بہت زیادہ توقع تھی۔ بات یوں ہوئی کہ ایک محفل میں سعادت حسن منٹو بھی شامل تھے اور میں بھی' اور چند دوسرے بزرگ بھی' باتیں ادیبوں کے نصب العین کے بارے میں

ہوئیں، خوب بحثیں چلیں، رکیں پھر سے بڑھیں اور جانے کہاں کہاں تک نکل گئیں، مگر ساری بحث و تمحیص کی ابتدا میں اور اس کے درمیان اس کے انجام پر بھی متفقہ فیصلہ ہوا کہ اس محفل کا ذکر تحریر میں قطعی نہیں آنا چاہیے کیوں کہ اجتماع کی نوعیت بالکل غیر سرکاری تھی۔ جاوید اقبال نے منٹو کی قلعی کھولتے ہوئے شاید جوش میں آ کر اس محفل کا بھی ذکر کر دیا ہے اور ان باتوں کا بھی جنھیں ایک واجب الاحترام بزرگ کے خیال کے مطابق راز میں رہنا چاہیے تھا۔ بہر کیف اس محفل میں جو باتیں ہوئیں، وہ جاوید اقبال کے اس مضمون کا سبب بنیں اور دوسری بے شمار غلط فہمیوں کے علاوہ جاوید اقبال کو اس غلط فہمی میں بھی مبتلا کر گئیں کہ رسالہ 'نقوش' کا جشن آزادی نمبر جشن آزادی پر ایک طنز ہے۔ اور اس کے تمام مندرجات پاکستان کو ہندوستان میں مدغم کرنے یا مسلمانوں کو ان کے محبوب سیاسی نصب العین سے متنفر کرنے کی ناپاک کوششیں ہیں۔ میں نے اس محفل کے بے کار مباحثوں میں بہت کم حصہ لیا کیوں کہ اول تو جو نصب العین مجھ پر واضح کیا جا رہا تھا اس کا اعلان میں نے نقوش نمبر ۳ کے اداریے میں بالکل غیر مبہم الفاظ میں کر دیا تھا، دوسرے نصب العین کی وضاحت میں ادب کم تھا اور مصلحت زیادہ تھی۔ تیسرے سعادت حسن منٹو کے بیش تر دلائل سے یا دلائل پیش کرنے کے انداز سے مجھے اختلاف تھا، مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ یہ محفل ایک مقالے کا مواد حاصل کرنے کے لیے منعقد ہوئی ہے اور عنقریب ہم پر واضح کیا جائے گا کہ زمانہ چاہے کتنی ہی کروٹیں بدل جائے، پرنالہ وہیں کا وہیں رہے گا۔

اپنے مضمون میں جاوید اقبال نے بار بار لکھا ہے کہ ادیبوں کا کوئی نصب العین مقرر نہیں؛ تین مشہور رسالوں پر پابندی کے بعد ادیبوں کو اس وقت کا سامنا ہے کہ آئندہ لکھا کس موضوع پر جائے؟...... وہ (ادیب) اپنے نصب العین کے بارے میں مشکوک ہیں...... ایک جگہ انھوں نے ترقی پسند ادیبوں کو اپنے نصب العین پر (اگر کوئی نصب العین ہے تو) نظرثانی کا مشورہ دیا ہے۔ تعجب ہے کہ ایک پڑھا لکھا باخبر نوجوان ترقی پسند ادیبوں کے نصب العین سے اب تک بے خبر کیوں ہے۔ یہ ترقی پسندوں کا نصب العین ہی تو تھا جس نے اردو ادب کی کایا پلٹ دی اور آج جس کے دم سے ہماری زبان پر بہار آئی ہوئی ہے اور یہ نصب العین وہی تو ہے جس کے دم سے انسانیت نے اپنے آپ کو پہچانا ہے اور جس نے بتایا ہے کہ جغرافیائی حدیں بدلتی رہتی ہیں لیکن حقیقت کبھی نہیں بدل سکتی کہ ہم سب کے جد امجد آدم ہیں اور ہم سب کا وطن کرۂ ارض، ترقی پسندوں کا ابھی بہت سا کام باقی ہے اس لیے یہ نصب العین برابر قائم ہے اور اس پر نظرثانی صرف تب ہو سکتی ہے، جب انسان ہر دور میں اپنے مصائب کے حل کے لیے کسی 'نئی شخصیت کی نمود' کا منتظر نہیں رہے گا اور مزاج آدمیت اس قدر گداز ہو جائے گا کہ کسی ایک شخص کی زباں بندی پر مشرق و مغرب چیخ اٹھیں گے اور جب نہ رسالے بند ہوں گے نہ 'مصلحت آلودہ' محفلیں منعقد ہوں گی اور نہ جاوید اقبال کے مضمون کے سے اور مضامین لکھے جائیں گے۔

ترقی پسندوں کے نصب العین کا ایک لفظ بھی تو مبہم نہیں اور پاکستان کے ترقی پسند ادیبوں نے بار بار اس امر کا اعتراف کیا ہے کہ ہم پاکستان کے سات کروڑ عوام کی معاشرتی اور معاشی اصلاح چاہتے ہیں، ہم چاہتے ہیں کہ پاکستان سے جاگیرداری کی لاش اٹھا دی جائے اور اس نو دمیدہ ملک میں نئے نئے۔ برلاؤں اور ڈالمیاؤں کو پھلنے پھولنے کا موقع نہ دیا جائے۔ ہم جانتے ہیں کہ سرمایہ قومی معیشت کا جزو اعظم ہے، مگر ہم چاہتے ہیں کہ یہ سرمایہ ساری قوم کی ملکیت ہو اور اس میں سے ایک کوڑی کے ناجائز استعمال پر جاوید اقبال بھی احتجاج کر سکے اور احمد ندیم بھی۔ ہمیں پاکستان سے محبت ہے۔ اپنے وطن سے کسے محبت نہیں ہوتی وہ ادیب جو اپنے ماحول سے بلند ہو کر کہیں تحت الثریٰ میں جا کر ادب تخلیق کرتا ہے، جن ہو سکتا ہے، انسان نہیں کہلا سکتا۔ ہم مذہب کا بھی احترام کرتے ہیں، کیوں کہ سچا مذہب اخلاقی ضبط اور انسان کی جبلی ذہنی آوارگی کی روک تھام کا دوسرا نام ہے لیکن ہمیں وہ روایتی مذہب نہیں چاہیے جو اپنے پیرو کار کو ایک وقت کا کھانا بہم پہنچانے کے بجائے چالیس دن کی چلہ کشی کی ہدایت دیتا ہے اور چٹکتی ہوئی کلی میں خدا کو دیکھ لیتا ہے مگر فاقہ زدہ کی ابھری ہوئی پسلیوں پر صرف چھو کر آگے گزر جاتا ہے ترقی پسندوں کا نصب العین تو دن کی طرح واضح اور آفتاب کی طرح روشن ہے، اس میں اشتراکیت اور الحاد اور تخریب کی مین میخ نکالنا اور اسے مردود قرار دینا صرف خدا واسطے کے بیر کا نتیجہ ہے، خدا لگتی کا اس میں شائبہ تک نہیں۔

رہا حکومت سے وفاداری کا مسئلہ تو اس ضمن میں جاوید اقبال نے ہمارے دل کی بات کہی ہے ادیب پر ہر چڑھتے سورج کی پرستش فرض نہیں یہ درست ہے۔ لیکن ترقی پسند ادیب تو اس چڑھتے سورج کا احترام کرنے کو بھی تیار ہیں، جس کی شعاعیں ایوان اور جھونپڑے میں امتیاز نہ کر سکیں اور جس کا سیلابِ نور پست و بلند کو ہموار کر دے، میں خوش ہوں کہ جاوید اقبال نے حکومت اور وطن کو آپس میں مدغم نہیں کیا، لیکن مجھے افسوس ہے کہ وہ اعتراف کرنے کے بعد جب اس موضوع کی تفصیل میں گئے، تو سارے کھیل کو گڈ مڈ کر کے چھوڑ دیا ہے اور سید احتشام حسین کے مضمون 'ادیب حب الوطنی اور وفاداری' پر اعتراض کر دیا ہے حالاں کہ وہ بھی تو یہی کہتے ہیں جو جاوید اقبال نے مضمون کی ابتدا میں کہا ہے۔

دراصل جاوید اقبال نے واضح نقطۂ نظر کے بغیر ترقی پسند ادیبوں پر اعتراضات کی بوچھاڑ کر دی ہے، مگر ان کا کوئی قطعی نظریہ ہوتا اور اس کی روشنی میں وہ منٹو کے افسانوں اور نقوش کے جشن آزادی نمبر کو پڑھتے اور پرکھتے، تو اخلاقی نکتہ بھی صاف ہو جاتا اور کسی نتیجہ تک پہنچنے کے لیے بحث خط مستقیم میں چل سکتی۔

انھوں نے موجودہ ادب کی تین خصوصیتیں گنوائی ہیں (۱) عریانی، (۲) اشتراکی تبلیغ، (۳) تخریبی رجحان۔ افسوس ہے کہ وہ نئے ادب کی ایک نمایاں ترین خصوصیت بھول گئے ہیں اور وہ ہے

’تطہیرِ حیات‘ بہرکیف ان تینوں فرضی خصوصیتوں کو انھوں نے الگ الگ موضوعِ بحث بنایا ہے۔ وہ ادب میں عریانی جائز سمجھتے ہیں اور متعفن قسم کی لذتیت کو خارج کرنے کے بعد باقی ہر قسم کی فحش نگاری کو برا نہیں سمجھتے۔ اول تو انھوں نے بنیادی غلطی یہ کی کہ حسب دستور روایت عریانی اور فحش نگاری کو ترقی پسندوں کے نام سے منسوب کر دیا ہے۔ فحش نگار ادیب ’جدید‘ ہوں تو ہوں ’ترقی پسند‘ قطعی نہیں کہلا سکتے اور ہم پہلے بھی کہہ چکے ہیں اور آج پھر اعلان کرتے ہیں کہ وہ ادیب یا شاعر جس کا مقصد عریانی اور فحاشی کے سوا کچھ نہیں، ہم میں سے نہیں ہیں‘ عموماً فحاشی ایک فرد کی داخلی الجھنوں کی ذہنی یا جسمانی تشکیل ہوتی ہے اور ترقی پسند ادیب فرائڈ کے نفسِ لاشعور کو اتنی اہمیت نہیں دیتے‘ جتنی مکئی کے ایک بھٹے یا گندم کی ایک بال کو! اس وقت ان کا واحد مقصد خارجی حالات کا انقلاب ہے اور یہ خارجی حالات عورت کے جسم سے چمٹے ہوئے نہیں ہیں‘ بلکہ تاریخ کے پاتال اور معاشرت کی گہرائیوں سے وابستہ ہیں۔

اشتراکی تبلیغ کے بارے میں جاوید اقبال کے خیالات بالکل دودھ کے جلے کے سے ہیں جو چھاچھ کو مارے پھونکوں کے جھاگ بنائے جا رہا ہے‘ وہ اعتراف کرتے ہیں کہ ہمارا ماحول ہی اس قسم کا ہے۔ ادیب جب اپنے گرد و نواح میں غربت اور افلاس کے سوا کچھ نہیں دیکھتا ہے تو وہ آپ کو کیوں نہ دکھائے جو اسے دکھائی دے رہا ہے یہاں انھوں نے روسو کی مثال دی ہے کہ اس نے فرانسیسی عوام کو آزادی کا تصور دیا۔ مگر اس کا ارادہ اشتراکی تبلیغ نہیں تھا...... اور اگر پاکستان کے ترقی پسند ادیب عوام کو آزادی کا تصور دینا چاہتے ہیں‘ تو ان کے ارادوں میں اشتراکیت (یا غیر ترقی پسندانہ نقطۂ نظر سے اشتراکیت کی چڑیل) کیوں بٹھا دی جاتی ہے اور اگر ان کے ارادوں میں ایسی اشتراکیت ہی ہے‘ جو عوام کو آزادی کا تصور دیتی ہے‘ تو وہ مردود کیوں قرار دیے جائیں! آخر یہ نرالی منطق ہمیں کہاں لے جا سکے گی کہ مارکس سے پہلے کے سب عوام دوست ادیب سچ مچ کے ادیب کہلائیں اور مارکس کے بعد عوام دوستی کا جذبہ ایک غیر ملکی گالی بن کر رہ جائے۔ اگر ترقی پسندوں کی عوام دوستی کو کوئی سیاسی چال سمجھتا ہے اور اس کے پردے میں لوگوں کو کسی غیر ملکی اقتدار کی تمنا کارفرما نظر آتی ہی‘ تو انھوں نے ترقی پسندی کو سمجھا ہی نہیں‘ کیوں کہ ترقی پسند تحریک تو جماعتی اقتدار کی دشمن اور غیر ملکی استبداد کی مخالف ہے‘ اس نے تو انسان کی راکھ سے نئے انسانوں کو جنم لیتے دیکھا ہے اور اسی لیے وہ ایک صاف ستھری نئی نویلی پاک و صاف انسانیت کی نوید ہے‘ اس ضمن میں صاحبِ مضمون نے ادیبوں پر الزام بھی دھرا ہے کہ ان کا اپنا تمدنی پس منظر کوئی نہیں‘ مگر یہ تمدنی پس منظر کا فقدان کچھ ایسا ہمہ گیر ثابت ہوا ہے کہ جاوید اقبال اس کو مضمون کے آخر تک گھسیٹتے لے گئے ہیں۔ اس لیے اس پر آگے چل کر بحث ہوگی‘ اس کے ساتھ ہی انھیں یہ بھی گلہ ہے کہ نئے ادیبوں میں سے کسی ایک میں بھی خاص تخلیقی صلاحیت نہیں یہاں انھوں نے قصہ ہی پاک کر دیا ہے‘ نہ جانے جدید ادبی تنقید کی لنکا میں ہر نقاد باون گزا کیوں ہو رہا ہے اور ترقی پسند ادیبوں

کو قطب مینار پر چڑھ کر کیوں دیکھا جاتا ہے، یہ درست ہے کہ ہر شخص غالب اور اقبال نہیں بن سکتا لیکن ترقی پسند شعرا میں چند ایسے بھی تو ہیں، جن کے کلام کی گونج مستقبل کی وسعتوں میں پھیل رہی ہے اور پھر اگر ترقی پسندوں میں تخلیقی صلاحیت ہے نہیں تو نصب العین مُعین کرنے کی اپیل بھی بے کار ہے۔ یاوہ گوئی پہ اترے ہوئے ہیں، اترنے دیجیے، وقت انھیں آپ ہی چبا لے گا، آپ کو تکلیف اور تکلف کی ضرورت ہی نہیں۔

نئے ادب کے تخریبی رجحان پر جاوید اقبال نے بہت کچھ کہا ہے لیکن مجھے اس کے بارے میں بہت کم کہنا ہے۔ یہاں پہنچ کر یہ معلوم ہوتا ہے کہ جاوید اقبال نے مولانا رومؒ کے بعد کسی شاعر کو اب تک نہیں پڑھا، جاوید اقبال کے سن کا تقاضا تو یہ تھا کہ وہ ہر ادب پارے کو پوری طرح سمجھ کر اس کی گہرائی میں جاتے، مگر یہاں تو انھوں نے ان عرب بددوں کا سا انداز اختیار کیا ہے، جنھوں نے ٹیلی فون کو غیر اسلامی قرار دیا تھا اور سلطان ابن سعود کو انھیں قائل کرنے میں بے شمار دقتیں پیش آئی تھیں۔

جس شخص کو گزشتہ دس برس کے اردو ادب میں سوائے تخریب کے کچھ نظر نہیں آتا، اس سے اگر یہ کہا جائے کہ فیض احمد فیض کی تازہ غزل، ہم پرورشِ لوح و قلم کرتے رہیں گے، ہی پڑھ لیجیے، تو میرے خیال میں اس پر زیادتی ہوگی، ارے صاحب ہم جانتے ہیں کہ ہندوستان بٹ چکا ہے اور ہم میں سے کئی ایسے ہیں، جنھوں نے پاکستان کے قیام کی کوشش میں پولیس کی لاٹھیاں کھائی ہیں اور جاگیرداروں کے ظلم سہے ہیں، ان کے رشتے دار ملازموں کو میانوالی سے رہتک اور رہتک سے ڈیرہ غازی خاں تبدیل کیا جاتا رہا ہے، ان پر فرضی مقدمے چلے ہیں، وہ حوالاتوں اور جیل خانوں میں رہے ہیں، انھیں گالیاں دی گئی ہیں اور زدوکوب کیا گیا ہے، خود میرے دوستوں کو شکوہ ہے کہ مجھے ۱۹۴۶ء اور ۱۹۴۷ء میں 'لیگ خولیا' ہو گیا تھا اور اگر وہ کہتے ہیں ہم پاکستانی ہیں، ہم پاکستان کو قائم رکھنے کے لیے سردھڑ کی بازی لگا دیں گے اور ہم پاکستان کے وفادار ہیں، تو جواب ملتا ہے کہ سچے دل سے کہو، اب اگر سچا دل کہیں بازار میں بکاؤ ہو تو اس کی طرف رجوع کیا جائے، جو کچھ ہماری پسلیوں کے ادھر دھڑک رہا ہے وہ تو یہی کہتا ہے، ہمیں اپنے یادن گزرے...... نقادوں سے زیادہ وضاحت سے معلوم ہے کہ ہندوستان بٹ چکا ہے، ہم جانتے ہیں کہ منٹو اور عسکری مسلمان ہونے کی حیثیت میں پاکستان آئے اور بیدی اور فکر سکھ اور ہندو ہونے کی حیثیت میں ہندوستان چلے گئے لیکن صرف اس بات سے نظریے مرتب کرنا تو کچھ ایسا ہی ہے جیسے اُلو کو رات کا شہباز کہہ دینا، ۔ حضرتِ قائداعظمؒ نے تو غیر مسلموں کو پاکستان میں روکے رکھنے اور انھیں ہر قسم کا اطمینان دلانے کی مہم شروع کر رکھی تھی اور ادھر گاندھی جی نے بھی یہی کہا تھا۔ منٹو اور عسکری پاکستان میں آ گئے تو اس پر ہندوستان فخر نہیں کر سکتا اور بیدی اور فکر یہاں سے چلے گئے تو پاکستان کو ناز نہیں کرنا چاہیے۔ مسلمان اتنا تنگ نظر تو کبھی نہیں تھا، پاکستان مسلمانوں نے اپنی ملّی بقا کے لیے حاصل کیا تھا،

اقلیتوں کا استیصال نہ ہمارے مذہب کے نزدیک جائز تھا' نہ قائداعظم کا یہ ارشاد تھا۔ پھر آپ اس سے نتیجہ کیوں مرتب فرمانے لگے' اب جو مسلمان ہندوستان میں مقیم ہیں' انھیں ہم صرف اس لیے فرزندانِ توحید کی صفوں سے خارج نہیں کر سکتے کہ وہ پاکستان میں نہیں آئے۔ حقیقتیں اکثر اتنی کھردری ہوتی ہیں کہ حلق سے نہیں اترتیں اور انسان انھیں تھوک کر ٹھکرا دیتا ہے' شاید اسی لیے آپ نے ہمیں 'خود غرض' اور 'ملک و قوم کی طرف سے عائد شدہ فرائض سے عہدہ برآ نہ ہو سکنے والے' اور سادہ لوح (یعنی بے وقوف) کہا ہے' ان کے بارے میں سوائے اس کے کیا عرض کیا جائے کہ دو ڈونگرے تو خیر کیا برسیں گے' گالیوں کے طومار تو نہ باندھیے۔

تخریبی رجحان کی مثالیں دیتے ہوئے جاوید اقبال نے منٹو کے افسانے 'کھول دو' پر اعتراض کیا ہے اور اس ضمن میں متذکرہ صدر محفل کی بحث کی۔ روداد لکھتے ہوئے کہا ہے کہ 'یہ افسانہ پڑھ کر مجموعی طور پر محسوس ہوتا ہے کہ مغویہ لڑکیاں جب پاکستان لائی جاتی ہیں تو ان سے پاکستان کے مسلمان یہ سلوک کرتے ہیں'۔ منٹو کہتا ہے کہ میرا مقصد یہ ہے کہ اگر ہم میں ایسے مسلمان موجود ہیں جو مغویہ لڑکیوں پر یوں ہاتھ صاف کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں تو وہ افسانے کو پڑھ کر شرمندہ ہوں اور اپنے اردوں کو عملی جامہ پہنانے سے باز رہیں اور جب جاوید اقبال نے کہا کہ ہم میں ایسے مسلمان بھی تو ہو سکتے ہیں جو یہ ارادہ نہ رکھتے ہوں لیکن جب وہ آپ کا افسانہ پڑھیں تو سوچ میں پڑ جائیں۔ کہ مغویہ لڑکیوں پر ہاتھ صاف کرنے میں ہرج ہی کیا ہے۔ تو منٹو جواب دیتا ہے' اس میں میرا کوئی قصور نہیں۔ جس شخص کا ذہن ناپاک ہو وہ ممکن ہے اس افسانے سے یہی نتیجہ اخذ کرے اور سعادت حسن منٹو کو یہ پڑھ کر حیرت ہوئی ہوگی کہ جاوید اقبال نے اس افسانے سے یہی نتیجہ اخذ کیا ہے۔ اب اگر' یوں بھی ہو سکتا ہے' کہ امکانات ایسے وسیع ہو جائیں تو ادب میں جنوں اور پریوں کی کہانیاں تک نہ سما سکیں۔ یہ درست ہے کہ آپ نے بچوں کو خوش کرنے کے لیے یہ کہانیاں لکھی ہیں لیکن اگر کچھ بچے ڈر جائیں! غالب نے اس شعر میں رشک کی انتہا دکھائی ہے! ؎

قیامت ہے کہ ہووے مدعی کا ہم سفر غالب
وہ کافر جو خدا کو بھی نہ سونپا جائے ہے مجھ سے

لیکن اگر کوئی اس شعر کو حضورِ حق میں گستاخی کا ارتکاب کہہ دے۔ اقبال نے روایتی ملا کے بارے میں کہا ہے ع

بحث و تکرار اس اللہ کے بندے کی سرشت

لیکن اگر کوئی اُسے دنیا اسلام کے ہر عالمِ دین کے خلاف استعمال کرنے لگے۔ 'کھول دو' پر جاوید اقبال اور ان کے دوسرے ہم خیالوں کا یہ اعتراض بالکل دست و پا بریدہ قسم کا ہے۔ اس کے ساتھ ہی وہ کہتے ہیں کہ 'کھول دو' میں اچھے رضاکاروں کا ذکر بھی تو لازمی ہے۔ حیرت ہے کہ بُرے رضاکاروں کا ذکر نہ کر یہ کیوں نہیں سوچا جاتا کہ اس میں اچھوں کے لیے اُمنگ موجود ہے۔ اگر 'کھول

وہ' تعمیری ادب نہیں ہے تو یقین رکھیے کہ اردو ادب کے ماضی و حال میں تو کیا مستقبل میں بھی آپ کو تعمیری ادب کا ایک ذرا سا نمونہ بھی میسر نہ آ سکے گا۔

تخریبی رجحان کے سلسلے میں جاوید اقبال نے صاف طور پر رسالہ 'سویرا' کے سرورق پر بھی اعتراض کیا ہے جس پر انھیں درانتی میں سے سنہری شعاعیں نکلتی دکھائی دیتی ہیں اور ان شاعوں کے اوپر سرخ رنگ میں سویرا لکھا ہوا ہے۔ لیجیے اب سرخ رنگ بھی غیر ملکی قرار دیا گیا لیکن اگر جاوید اقبال صاحب سویرا کے پہلے ایشو بھی دیکھ لیتے تو انھیں معلوم ہو جاتا کہ سرورق کا رنگ ہر ایشو میں بدلا گیا ہے اور اب کا سروق سرخ چھپا ہے تو آئندہ شاید سبز چھپ جاتا۔ اور وہ شعاعوں کے نیچے درانتی نہیں' طلوع آفتاب کی اندرونی دھڑکنیں ہیں۔ محض اطلاع کے لیے لکھ رہا ہوں۔

اس کے بعد جاوید اقبال 'نقوش' کے جشنِ آزادی نمبر پر گھر کر آئے ہیں اور ٹوٹ کر برسے ہیں۔ میں جاوید اقبال کے اس خط کے اقتباسات شائع کر کے بد دیانتی نہیں کروں گا جو انھوں نے جشنِ آزادی نمبر کی پسندیدگی اور کراچی وغیرہ میں اس کی بے پناہ مقبولیت کے سلسلے میں لکھا تھا اور جشنِ آزادی نمبر پر ان کی قطعی طفلانہ اور بھولی بھالی تنقید کا جواب محض چند اطلاعات سے دوں گا تاکہ وہ ان مضامین کو دوبارہ پڑھیں تو وہ اخذ نہ کریں جو ان میں نہیں ہے۔ بلکہ وہ حاصل کریں جو اُن میں ہے۔

(۱) احتشام حسین کے مضمون سے تو جاوید اقبال غیر ارادی طور پر متفق ہیں۔ پھر اس پر بحث بے معنی ہے اور ان کا اعتراض شاید برق گامی پر مبنی ہے۔

(۲) جوش ملیح آبادی کی نظم 'ہندوستان اور پاکستان کا نعرہ پڑھیے' ان الفاظ سے آگے یا پیچھے صاحبِ مضمون نے کچھ نہیں کہا۔ اس لیے تعمیلِ ارشاد کے بعد آگے بڑھنا چاہیے۔

(۳) خیب الرحمٰن کی نظم 'روحیں' 'میں ہم نے دانستہ اُسی جرم کا اقدام کیا جس سے لازم تھا گریز، سے پاکستان کی مخالفت مراد نہیں بلکہ فسادات کی مذمت ہے' جرم فسادات ہیں نہ کہ تقسیم' یہ نظم ذرا غور طلب ہے۔

(۴) 'چراغ روشن ہیں' سے معابد کی بے حرمتی مقصود نہیں' بلکہ معابد کی صفائی ستھرائی اور ہر قسم کی آلودگی سے نجات مدِ نظر ہے۔

(۵) 'اجنبی دیس میں' بدایوں کی ایک خاتون کی نظم ہے۔ اگر کراچی میں آ کر اسے ذرا بدایوں یاد آنے لگا ہے تو اس سے مواخذہ کرنے کا کسے حق پہنچتا ہے!

(۶) مقبول حسین پوری صرف اس 'قصور' سے کمیونسٹ قرار دیے گئے ہیں کہ ان کے ہلکے پھلکے پریم رس سے چھلکتے ہوئے گیت کا عنوان 'اے ساتھی' ہے اور 'اے ساتھی' کا لفظ سرخ رنگ کی طرح مردود قرار دیا جا چکا ہے۔

(۷) 'میراثِ آدم' میں اگر جاوید اقبال کو معابد کی بے حرمتی نظر آئی ہے تو وہ سنگ میل نمبر ۳ میں اپنا ہی لکھا ہوا ڈرامہ 'مگر مچھ کا بوٹ' بھی پڑھ لیں جس کا ایک ہی سین ہے اور وہ ہے مسجد کا اندرونی حصہ (جہاں نماز پڑھی جاتی ہے)

(۸) 'ایک اذان میں' میں مسلمان 'لال سر' ہیں۔ اور چمگادڑ 'راشٹریہ سیوک سنگھ یا ہندو مہا سبھا' ہے جو بار بار 'بوم' یعنی اکالیوں کو تباہی اور بربادی پر اُکساتی ہے۔ اس افسانے میں آخرکار دونوں قانونوں کو الگ الگ حیثیتوں سے مانا گیا ہے یعنی پاکستان اور ہندوستان کی تقسیم تسلیم کی گئی ہے۔

(۹) منٹو کے 'بغیر عنوان کے' افسانے میں یہ بتانے کی کوشش نہیں کی گئی کہ مسلمان پاکستان کی اقلیتوں سے کس قسم کا برتاؤ روا رکھتے ہیں بلکہ یہ کہا گیا ہے کہ ایسا برتاؤ نہیں کرنا چاہیے۔ یہ افسانہ بھی ذرا غور طلب ہے۔

مجھے امید ہے کہ ان مختصر اطلاعات کے بعد جاوید اقبال کی غلط فہمی دور ہو چکی ہوگی کہ پاکستان کے موجودہ ادب میں جو رجحان نظر آتا ہے وہ کسی خاص پلان کے ماتحت عمل میں لایا جا رہا ہے۔ جاوید اقبال کے ذہن پر اشتراکیت اور روس کا خوف خواہ مخواہ سوار ہے۔ یہ خوف اس لیے خطرناک ہے کہ اس کی موجودگی میں سماج سدھار کے سلسلے میں کوئی آواز بلند نہیں کی جا سکتی اور ہر وہ شخص جو عوام کی خیر خواہی کا دم بھرتا ہے اس نعرے کے ساتھ گردن زدنی قرار پا سکتا ہے کہ تم اشتراکی ہو۔ تم غریبی کو دور کرنے کے پردے میں روس کو دعوت دے رہے ہو۔ تم بدایونی ہو کر بھی کراچی میں بیٹھ کر بدایوں کو یاد نہیں کر سکتے اس طرح پاکستان اچھل کر ہندوستان کے کنوئیں میں گر پڑے گا۔ (نعوذ باللہ)

ہر چیز میں کیڑے ڈالنے کے بعد جاوید اقبال نے پاکستان کے ادیبوں کے سامنے تعمیری پروگرام پیش کیا ہے اور تعمیری ادب کی مثال دیتے ہوئے موپساں کے ایک ایسے افسانے کا ذکر کیا ہے جس میں فرانسیسیوں کی بورژوا ذہنیت کی قلعی کھول دی گئی ہے اور ثابت کیا گیا ہے کہ یہ لوگ اتنے خود غرض ہوتے ہیں کہ اپنا اُلّو سیدھا ہو جائے تو اپنی جان بچانے والے کو روٹی کا ایک ٹکڑا تک دینا گوارا نہیں کر سکتے۔ اس افسانے کا مرکزی کردار طوائف سہی مگر مرکزی تاثر طوائف کی قربانی نہیں، فرانسیسیوں کی غیر انسانی بورژوا ذہنیت ہے۔ جاوید اقبال اس افسانے کو بھی ذرا پھر سے پڑھ لیں اور اپنے تعمیری پروگرام کو پھر سے مرتب کریں۔ شاید جشن آزادی نمبر ہی میں انھیں کوئی خالص پاکستانی افسانہ مل جائے۔

'ہمارا تمدنی پس منظر غائب ہے۔" ہمارا ایک مخصوص تمدن ہے" ہم اپنے تمدن کے پس منظر سے آگاہ نہیں۔' یہ جاوید اقبال کے الفاظ ہیں۔ تمدنی پس منظر پیدا کرنے کے لیے انھوں نے پُرانے مسلمان فلسفیوں اور ادیبوں کے نام گنوائے ہیں کہ ان کی کتابوں کے ترجمے کیے جائیں یعنی تمدن کی بنیاد...... طبقاتی تقسیم...... کو برقرار رکھا جائے۔ صرف اس پر چونا پھیر دینا چاہیے۔ پس منظر اجاگر

ہو جائے گا۔

مجھے افسوس ہے کہ یہاں تفصیل میں جانے کی گنجائش نہیں۔ جاوید اقبال کے اس مضمون میں اتنے بہت سے نظریے اور ان نظریوں کے اتنے بے پناہ تصادم گونج رہے ہیں کہ بے شمار بحثیں ہو سکتی ہیں۔ مجھے امید ہے کہ جاوید اقبال میری ان معروضات پر غور کریں گے اور لمبی بحثوں کو چھیڑنے کی ضرورت ہی پیش نہیں آئی گی۔ لیکن اگر وہ نصب العین کے تعین کو نصب العین کی افراتفری ہی میں ڈھونڈتے ہیں تو میں کوشش کروں گا کہ 'ہمارا نصب العین' کے عنوان سے انھیں ترقی پسند تحریک کے بارے میں عنقریب بے شمار معلومات بہم پہنچا دوں۔ مقصد یہ ہے کہ نوجوان طبقہ اور بزرگ افراد ترقی پسندوں کو متعصبانہ انداز سے نہ دیکھیں اور ان لوگوں کے ہاتھوں میں نہ کھیلیں جو تاریخ کے ہر دور میں آنکھوں پر سبز عینک چڑھا کر خزاں کو بہار بنانے کے دعوے کرتے آئے ہیں۔ آخر میں مجھے جاوید اقبال سے صرف یہ کہنا ہے ۔

نالہ ہے بلبلِ شوریدہ ترا خام ابھی   اپنے سینے میں ذرا اور اسے تھام ابھی

ماخذ (اُردو۔۵۳)

چوں کفر از کعبہ برخیزد...

شبلی نعمانی

عطاءاللہ پالوی

ن م راشد

علی عباس جلالپوری

سلیم احمد

عنایت اللہ المشرقی

ڈاکٹر مبین اختر

عباس ناصر مرزا

rekhta

شیخ سعدی کی حُسن پسندی

شبلی نعمانی

(شیخ سعدی) کی حُسن پسندی اَمرد پرستی تک پہنچ گئی ہے اور ایسے کُھل کھیلتے ہیں کہ اس کا ذکر تک نہیں کیا جا سکتا۔ بے شک یہ باتیں اُن کے عارضِ کمال کا داغ ہیں لیکن ایک رفارمر اور مصلح کے لیے ان تمام مراحل سے گزرنا ضرور تھا۔

ماخذ (اُردو ـ ۳)

ایشیائی شعرا

شبلی نعمانی

ایشیائی شعرا کا عام قاعدہ ہے کہ کسی داستان کے بیان کرنے میں حُسن و عشق کا کہیں اتفاقاً موقع آ جاتا ہے تو اس قدر پھیلتے ہیں کہ تہذیب و ثقافت کی حد سے کوسوں آگے نکل جاتے ہیں۔ نظامی اور جامی جیسے مقدس لوگ اس حمام میں آ کر ننگے ہو جاتے ہیں۔

ماخذ (اُردو ـ ۲)

قُلقُلِ مینا

غور فرمایئے حافظ کے نزدیک قرآن سے بہتر ان کے اشعار ہیں اور جامی کے نزدیک قرآن کے چاروں قل سے بہتر قلقل شراب ہے۔

ماخذ (اُردو ـ ۷۷)

rekhta

اسلامی شاعری پر بہتان

سلیم احمد

اگر آپ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ (متنازعہ شاعری) اسلامی نقطہ نظر سے کوئی غلط چیز ہے تو میں اس کو بالکل درست نہیں سمجھتا۔ یہ ایک بہتان ہے اسلامی شاعری کے تصور پر، کیوں کہ یہ شاعری ہمیں بڑے سے بڑے مسلمان شعرا کے ہاں ملتی ہے۔

شیخ سعدی جیسا مصلحِ اخلاق، مشرق نے پیدا نہیں کیا، لیکن اُن کے ہاں آپ کو یہ شاعری ملے گی۔ مولانا رُومؒ کی مثنوی جسے 'ہست قرآں در زبان پہلوی' کہا جاتا ہے وہ آپ نے پڑھی ہوگی، اس میں یہ باتیں آپ کو ملیں گی۔ کوئی اُردو کا شاعر لے لیجیے...... مومنؔ کو دیکھیے وہ سید احمد بریلوی کے خلفا میں سے ہیں اور تحریک جہاد انھوں نے لکھی ہے، تحریک میں وہ خود شامل رہے ہیں، آپ اُن کی مثنویاں دیکھ لیجیے۔ تو میرے خیال میں یہ مفروضہ غلط ہے۔

ماخذ (اُردو۔۳۱)

مُطائباتِ مولانا روم

علی عباس جلالپوری

ایرانی اپنی بذلہ سنجی اور زندہ دلی کے لیے دنیا بھر میں مشہور ہیں۔ ایران کے مشاہیر ادبا کی کتابوں اور شاعروں کی کلیات میں شستہ مزاح سے لے کر زہریلی طنز اور تضحیک و تمسخر سے لے کر ہزلیات تک، ہر قسم کے مطائبات دیکھنے میں آتے ہیں۔ سوزنی، انوری، عُبید زاکانی، قاآنی وغیرہ تو خیر دنیادار تھے، بڑے بڑے مُقدس صوفیہ بھی ہنسنے ہنسانے میں فرد تھے۔ سعدی شیرازی، گلستان کے باب پنجم کے لیے بدنام ہیں، لیکن مولانا روم کی مثنوی معنوی میں کئی مطائبات ایسے بھی ملتے ہیں، جن کے سامنے یہ باب بالکل بے کیف اور بے رنگ دکھائی دیتا ہے۔ مثنویٔ رومی کو پہلوی کا قرآن کہا جاتا ہے اور تصوف و سلوک کے حلقوں میں اس کے مؤلف کا نام بڑے احترام سے لیا جاتا ہے۔ ہمارے زمانے میں اقبال مرحوم نے انھیں پیرِ رومی کہہ کر اپنا مرشد قرار دیا ہے اور ان کے سامنے زانوئے ادب تہ کیا ہے۔ مثنوی میں تصوف و عرفاں کے علاوہ الہیات، کلام، فلسفہ اور اخلاق کے دقیق مطالب زیرِ بحث آئے ہیں اور ان کی تصریح میں مولانا روم نے معارف کے دریا بہائے ہیں۔ مولانا ایک صاحبِ حال صوفی تھے اور منازلِ سلوک کے طے کرنے میں انھوں نے کٹھن ریاضتیں کی تھیں۔ اُن کا شمار بلاشبہ تصوف کے ائمہ اور اکابر میں ہوتا ہے۔ مورخین نے ان کی ذات پر تقدس کے ایسے دبیز پردے ڈال دیے ہیں کہ ان کی شخصیت کے بہت سے انسانی پہلو نظروں سے اوجھل ہو گئے ہیں۔ چناں چہ بہت کم لوگوں کو معلوم ہوگا کہ مولانا بحرِ معرفت کے شناور ہونے کے ساتھ ساتھ ایک نہایت شگفتہ مزاج باغ و بہار آدمی بھی تھے اور جب کبھی ان کی رگِ ظرافت پھڑک اٹھتی تھی تو ہزل و تمسخر سے بھی نہیں چوکتے تھے۔

مولانا روم کا زمانہ سیاسی اور اخلاقی پہلوؤں سے دنیائے اسلام کا دورِ تنزل سمجھا جاسکتا ہے۔ بنو عباس عیش و عشرت میں غرق ہو کر اپنے آبا کی اولوالعزمی، بیدار مغزی اور شہامت سے محروم ہو چکے تھے۔ حرم سرائیں پری چہرہ کنیزوں اور سادہ عذار امردوں سے بھری پڑی تھیں۔ بغداد، سامرا، حلب اور دمشق بردہ فروشی کے مرکز بن گئے تھے۔ کنیزوں کی کثرت کے باوجود اُمرد پرستی کی وبا ہر کہیں پھیل گئی تھی۔ اور تو اور صوفیہ کی خانقاہوں میں سُدومیت کا میلا بار پاچکا تھا اور پیرانِ سالوس مشتری چہرہ ارادت مندوں پر عشق مجازی کی مشق و مہارت فرمایا کرتے تھے۔ شیخ سعدی جیسے بزرگ بقول خود، مدرسوں اور حماموں میں حسین اُمردوں کو گھورنے جاتے تھے۔ یہ تنزل پذیر معاشرہ صحرائے گوبی سے اٹھتے ہوئے تاتاری دل بادلوں کے سامنے خس و خاشاک کی طرح اڑ گیا۔ خروجِ تاتار کے وقت مولانا روم کے والد اور دوسرے شرفا مغرب کی

جانب ہجرت کرنے پر مجبور ہو گئے۔ مولانا روم نے بالآخر ترکی کے شہر قونیہ میں مستقل اقامت اختیار کی۔ مطائبات میں معاصر معاشرے کی زبوں حالی کی سچی تصویریں دکھائی دیتی ہیں اور معلوم ہوتا ہے کہ علما اور صوفیہ کا طبقہ بھی ہمہ گیر اخلاقی پستی سے محفوظ نہ رہ سکا۔ مولانا روم سے بڑھ کر اس طبقے کا محرم حال اور کون ہو سکتا تھا! انھوں نے مزے لے لے کر اس طائفے کی زہد فروشی اور دکان آرائی کے پردے چاک کیے ہیں۔ ان میں سے بعض مطائبات کو بلند ابرو لوگ فحاشی پر محمول کرتے ہیں۔ فحاشی کا مسئلہ بڑا نازک ہے۔ ایک آدمی کسی بیان پر فحش کا اطلاق کرتا ہے جب کہ دوسرے کو اس میں فحاشی کا شائبہ تک دکھائی نہیں دیتا۔ 'بوستان خیال' کے بعض مقامات کو گیان چند جین نے فحش کہا ہے لیکن کلیم الدین احمد نے ان کی معذرت خواہی کرتے ہوئے لکھا ہے کہ: "اگلے مصنفین دماغی صحت سے بہرہ ور تھے۔ وہ جنسی تعلقات کے بیان میں مبالغہ، زیادتی، ناموزونیت اور اس قسم کے نقائص کے مرتکب نہیں ہوئے۔ وہ محض قصوں کے ذریعے سے اپنے غیر صحت مند میلانات کا نکاس نہیں چاہتے۔ انھیں میلانات کے لیے کسی مصنوعی نکاس کی ضرورت نہیں۔ وہ جنسی تعلقات، واقعات اور میلانات کا ذکر نہایت ہوش مندانہ اور صحت مندانہ طور پر کرتے ہیں۔ عریانی کی وجہ سے کسی بھی جگہ فحش کا شائبہ نہیں۔ وجہ یہ ہے کہ یہاں مقصد محض تفریح ہے۔ نہ کہ کسی ناموزوں میلان کو برانگیختہ کرنا۔ نتیجہ فحاشی نہیں بلکہ قہقہہ ہے، روح کا پھیلاؤ ہے۔"

اس نقطۂ نظر سے مولانا روم کے اس نوع کے مطائبات کو دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ وہ عریاں ضرور ہیں لیکن فحش نہیں۔ مولانا روم بوکاچیو، چاسر، امراؤ القیس، ابونواس وغیرہ کی طرح جنسی تعلقات کا ذکر اس بے ساختگی اور روا روی میں کر جاتے ہیں کہ ان کے مطائبات میں آج کل کے 'سوفسٹی کیٹیڈ' فحش نویسوں کی تحریروں کی طرح مریضانہ رنگ پیدا نہیں ہوتا، نہ یہ شبہ گزرتا ہے کہ یہ قصے محض جنسی محرومی، کوتاہ ہمتی اور کج روی کی تلافی کے لیے بیان کیے گئے ہیں۔ سیاق و سباق سے بھی اس قیاس کو تقویت ہوتی ہے کہ ان کا مقصد ذہنی عیاشی نہیں بلکہ بالفاظ کلیم الدین احمد 'روح کا پھیلاؤ' ہے۔ ایک بات البتہ کھٹکتی ہے کہ مولانا روم نے بعض مقامات پر نہایت اہم مذہبی اور متصوفانہ مسائل کی شرح کرتے ہوئے بے محابا ایسی عریاں امثال سے استدلال کیا ہے جن سے موضوع کی ثقافت مجروح ہو گئی ہے۔ اور اس ضمن میں مولانا کی عذر خواہی قابل قبول نہیں، جیسا کہ وہ فرماتے ہیں:

ہزل تعلیم است آنرا جد شنو   تو مشو بر ظاہرش ہزلش گرو
(اس ہزل میں ایک تعلیم مخفی ہے   تو ظاہری ہزل پر نہ جا)

ہم نے خواجہ و غلام، شاہ و ملا، امیر و کنیز، واعظ و جوحی، کنیز و خر جیسی حکایات قلم زد کر دی ہیں کیوں کہ ریاکاری اور ظاہر داری کے موجودہ ماحول میں یہ احکامات 'روح کے پھیلاؤ' کے بجائے تنگ دلوں کی مزید گھٹن کا باعث ہوں گی۔

ماخذ (اُردو۔ ۱۲۸)

خسرو

ن م راشد

خسروؔ کی غزلوں میں انسانی جسم کے اعضا کی طرف اشارات کی فراوانی ہے۔ وہ خاص طور پر محبوب کے چشم و ابرو، لب و رخسار، زلف و گیسو، میان و کنار بلکہ پستانوں کا ذکر بڑی تکرار کے ساتھ اور بڑی بے حجابی سے کرتا ہے۔ اس قسم کے اشارات اِس سے پہلے کی فارسی شاعری میں بھی عام تھے۔ لیکن اُن پر اتنی تاکید فارسی کے کسی ایک شاعر میں اس سے پہلے کم ملتی ہے۔ اس کے ہاں انسانی اعضا کا ذکر حسن کی تجلیل کا عمل بن گیا ہے۔ زلف و گیسو کا وہ خاص طور پر دلدادہ ہے اور اس قسم کے شعر کہہ جاتا ہے۔

جعدت کہ کشیدہ است و بست راکہ گزیدہ است   پیش کہ نشستی شب و مہمان کہ بودی؟

اس شعر میں ایک طرف وہ رشک پایا جاتا ہے جو محبوب کے زلف و گیسو کو بلاشرکت غیرے اپنانا چاہتا ہو اور دوسری طرف لذت انگیزی کا وہ سامان بھی جو اس بہانے سے فراہم کرلیا ہے۔ اس کی شاعری میں 'چینِ سرِ زلف'، 'سلسلۂ مشک سا'، 'بے قراری زلف'، 'فتراک گیسو'، 'خم طرّہ' (جس کے اندر سینکڑوں دل پھنس کر رہ گئے ہوں) اس کے محبوب موضوع ہیں۔ اسی طرح محبوب کی مست، پُر خمار آنکھیں اسے دیوانہ کیے دیتی ہیں (تو سپیدی نمائی بہ برکہ بودی امشب؟ کہ ہنوز چشم مستت اثرِ خمار دارد)۔ زلفوں یا آنکھوں کے لیے اکثر تشبیہات روایتی ہیں۔ لیکن جب وہ 'جاڑے کی رات کی سی سیاہ آنکھیں' لکھتا ہے تو اس کی جدت چونکا دیتی ہے۔ کبھی اُنھیں 'دلوں کا خون بہانے والی آنکھیں' کہتا ہے جو اُن کے جمال کی توصیف سے زیادہ اُن کی تاثیر کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ جب اپنی (یا عاشق کی) آنکھوں کا ذکر کرتا ہے تو وہ ہمیشہ 'جمالِ دوست کو ترسنے والی'، 'روتی ہوئی'، 'بے خواب' آنکھیں ہوتی ہیں۔ محبوب کے چہرے کو کبھی 'رُخِ گل رنگ'، کبھی 'گلِ صد برگ' اور کبھی 'خورشیدِ قیامت' کے نام سے یاد کرتا ہے۔ اور کبھی اسے ذاتی (اور خالص ہندوستانی) تشبیہ کے ذریعے 'بامدار تابستان' کہتا ہے۔ اسی طرح جسم کے کئی اور حصے مثلاً (خطِ سبز، خط پر بلا، خط بالب نہفتہ، خطِ مشکین اور خط نو رمیدہ)۔ خالِ سیاہ، گلو، نرمہ گوش، ناوک مژہ، چاہِ زنخدان وغیرہ اُس کے لیے روایتی اور ذاتی کشش رکھتے ہیں۔ محبوب کے لب و دہن تو اس پر وجد سا طاری کر دیتے ہیں۔

جانا اگر شبیت دہن بر دہن نہم   خود را بجواب ساز مگو کین دہان کیست؟

جان بار فدات آن دم کز بعد دو سہ بوسہ　　گویم کہ یکے دیگر گوئی تو کہ نتوانم
سخن می گفتم از لبہاش درکام زبان گم شد　　گرفتم نام او تا کہ حدیثم در دہاں گم شد

بوسہ ملتا ہو تو 'کف پائے سفید' اور 'پائے خم' کا بوسہ بھی کافی ہے۔ اور جب میان و کنار تک پہنچتا ہے تو 'بسے خواہم میافت را بگیرم' کی آرزو اُسے تڑپا دیتی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ خسرو شہوانی انگیخت کے سرچشموں سے کسی سے کم واقف نہ تھا۔ ہو سکتا ہے کہ سنسکرت کا علم رکھتے ہوئے وہ ہندوؤں کی جنسی تحقیقات کے علم سے بھی بہرہ مند ہوا ہو۔

خسرو کی طلب کا ایک پہلو تو یہی انسانی جمال ہے۔ جسمانی اعضا الگ الگ بھی اور یک جا ایک خوب صورت ہستی کی صورت میں بھی اس کے لیے الہام کے دفینے کھول دیتے ہیں۔ دوسرا پہلو انسان کی شخصیت کی وہ شکست و ریخت ہے جو دیدِ جمال اس کے اندر شروع کر دیتی ہے یا کسی کے حسن میں کسی کی کامل گمشدگی سے نمودار ہوتی ہے۔ انسانی جمال کی کشش اور اُس اندوہ کے ذکر سے جو یہ کشش چھوڑ جاتی ہے اس کی ہر غزل دہک رہی ہے۔ اُس کا شعور جمال انسانی جسم کے اعضا کے شعور کے ساتھ ساتھ بڑھتا چلا جاتا ہے۔ شاعر کی حیثیت سے وہ محض انسانی اعضا کی ساخت کا ذکر کر کے نہیں رہ جاتا بلکہ تشبیہ اور استعارے کے ذریعے اُن کا تعلق مشابہ اور ان سے الگ اشیا کے ساتھ پیوند کرتا چلا جاتا ہے۔ اس شعور جمال کے ساتھ ساتھ شاعر کا شعور ذات بھی نمایاں ہو جاتا ہے۔ یعنی جیسے جیسے وہ ان اعضا کی منفرد کشش سے آگاہ ہوتا جاتا ہے جو اس کے اپنے وجود سے 'آرام دہ فاصلے' پر ہیں، وہ اپنے وجود کی آگاہی بھی حاصل کرتا چلا جاتا ہے۔ اور آخر یہی آگاہی اسے تجربے کے اُس مرحلے پر پہنچاتی ہے جہاں وہ اپنے آپ کو 'حقیر' اور 'رسوا' سمجھنے لگتا ہے۔ وہ جہاں اپنا ذکر کرتا ہے اپنے آپ کو 'ناچیز'، 'من سر گشتہ'، 'من سوختہ'، 'غریب و بے نوا'، 'غریبے زبر دیوارش'، 'مستمند سرگرداں' وغیرہ قسم کے الفاظ سے یاد کرتا ہے اور اپنی حالت بیان کرتے ہوئے ہمیں یاد دلاتا ہے۔ (پست شو خسرو مسکین زلگد کوب فراق)، (من زگریہ چون نمک بگداختم)، (خسرو ز تشنگی بہ بیابان ہجر سوخت)، (سرے دارم کہ سامان نیست اورا)، (نہ روید از گل من جز گیاہ ناکامی)، (چون من زخونِ دل سوختہ سیہ رویم)۔ وغیرہ وغیرہ۔ خسرو کے دل کا ہر نقش یہی ہے اور یہی اپنی وہ تصویر ہے جو وہ متواتر اپنی ذات کے آئینے میں دیکھتا رہتا ہے اور اسے دیکھنے میں گونہ لذت بھی محسوس کرتا ہے۔ یہ کسرِ ذات اور یہ اپنے درد اور اپنی محرومیوں کی حکایت تراشی اکثر فارسی شاعروں کو نصیب ہوئی لیکن خسرو کو اس سے کچھ وافر ہی حصہ بخشا گیا ہے۔ حیرت ہوتی ہے کہ وہ شخص جسے سلاطین کی مصاحبت حاصل رہی ہو جو اس زمانے میں یقیناً انسان کا اوجِ کمال سمجھی جاتی ہوگی جسے نظام الدین اولیا جیسے روحانی بزرگوں کی صحبت اور اُس صحبت میں یگانہ محبت نصیب ہوئی ہو جو روحانی تسکین کے لیے کافی ہونی چاہیے جس نے بڑی حد تک تنعم کی زندگی

بسر کی ہو اور جو یہ دیکھتے ہوئے کہ اس کا محبوب (اگر وہ تنہا خواجہ حسن دہلوی ہی تھے) سالہا سال اس کے پہلو میں یا اس کے قرب میں رہا وہی اپنے آپ کو ’حقیر‘ اور ’رسوا‘ جانتا ہو اور اپنی ’حالتِ زار‘ کا اعلان کر کے لوگوں سے ترس کھانے کی تمنا رکھتا ہو۔ آخر کیوں کیا یہ سب روایتی طرزِ فکر سے آلودہ طرزِ بیان ہے یا واقعی کوئی ایسے حوادث بھی اس پر گزر گئے تھے جو ابھی تک ہماری آگاہی سے پوشیدہ چلے آتے ہیں؟ کیا یہ اس فقر کا اثر ہے جو خسرو نے خود اپنے لیے انتخاب کیا تھا! اگر یہ اس کا اپنا ہی انتخاب تھا اور باہر سے اس پر نازل نہیں ہوا تھا تو پھر گلہ کس سے اور شکایت کیسی! فارسی شاعری کی روایت بھی اور فقر کی شان بھی اس کسرِ ذات میں ضرور ہوگی۔ لیکن شاید یہ کسرِ ذات اُس کے لیے ’حقیقت‘ کا ایک نیا بُعد بن گیا ہو۔ اور یہی اس کے اندر حسن کی ناقابلِ رسائی بلندی کا تعین کرتا ہو جو اس کی ذات سے بہت دور تھی۔ شاید اگر یہ کسرِ ذات نہ ہوتا تو اُس بلندی کا حصول یا اس تک رسائی خسرو کا مقصد نہ بن سکتا۔ اس کے علاوہ اس کی ذات میں اس کی اکائی کے کئی عناصر یک جا ہو گئے تھے۔ جو مختلف اور بیک وقت مختلف تجربات کی پیداوار تھے۔ ان میں سے کچھ حیاتی اور کچھ تخیلی بھی تھے جنھوں نے اس ذات کے اندر ایک جال سا پھیلا رکھا تھا۔ بعض حسیات عارضی اور فوری ہیں اور بعض نسبتاً پائیدار۔ جو عارضی اور فوری ہیں وہ اس کی ذاتی لذت کی خواہش کو تیز تر کرتے رہتے ہیں اور جو پائیدار ہیں وہ اس کے اندر ایک اخلاقی یا فلسفیانہ رویہ تخلیق کرتے چلے جاتے ہیں۔ اور پھر یہی رویہ خود اس کے عارضی اور فوری حسیات پر اثر انداز ہونے لگتا ہے، ان کو ایک خاص سمت بخشنے لگتا ہے، اور انھیں ایک غیر معین عشق کی صورت میں ڈھالنے لگتا ہے……

چناں چہ جب وہ انسانی اعضا کو ایک ایک کر کے گنواتا ہے یا اپنے اشتیاقِ وصال یا اپنی محرومیوں یا محروم ہو جانے کے خوف یا آرزوئے مرگ کا اظہار کرتا ہے تو یہ جذبات ایک طرح سے اپنا مادی لباس نہیں اتارتے اور یہ واقعات کے ساتھ پرانی معین یادوں کے ساتھ یا مقام کے ساتھ بدستور وابستہ رہتے ہیں۔ لیکن وہ ان کو وہیں تک نہیں رہنے دیتا بلکہ اپنے تخیل کی مدد سے وہ ان کو یوں مجموعی طور پر بھانپتا ہے اور ان کا گہرا باہمی ربط یوں معین کرتا ہے کہ وہ ایک ہی ’تخیلی فکر‘ میں مکمل مل کر ایک ہو جاتے ہیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ اس کی شاعری کسی پڑھنے والے کے اندر براہِ راست کوئی جذبہ تو نہیں اُبھارتی اور نہ اُسے کسی رویّے کی طرف آمادہ کرتی ہے لیکن وہ اس تک ایک ’تخیلی فکر‘ منتقل کر دیتی ہے۔ جس میں جذبہ شامل ہوتا ہے اور پڑھنے والے کو وہی ذوق و شوق اور وہی سرخوشی مہیا ہو جاتی ہے جو شاعر نے شعر کہتے ہوئے محسوس کی تھی۔ اس سے ہٹ کر خسرو کا کوئی ذاتی رویہ نہیں ہے۔ اگرچہ اس کی آرزومندی اور اس کا اخلاقی محاکمہ جس پر یقیناً ہندوستانی فلسفے اور طرزِ زندگی نے بھی اثر ڈالا ہوگا جو ایرانی شاعری کی آرزومندی اور اخلاقی محکمے سے مختلف ہے۔ اور یہی بات خسرو کو منفرد کرتی ہے۔ اس کے عشق میں تو

کہیں کہیں وہ رویہ دریافت کرنا بھی مشکل نہیں جو ہندوستان کی بدنصیب برہمن کی فریادوں میں پایا جاتا ہے، ایران کے امرد پرست عاشق کی ہوس میں نہیں۔ البتہ خسرو کے اخلاقی نظریے یا رویے اپنے منطقی ربط میں ایرانی شاعروں سے دور نہیں ہیں۔ یہ منطقی رابطہ سعدی اور خاقانی میں زیادہ اور رومی اور حافظ میں کم دکھائی دیتا ہے۔ لیکن جہاں سعدی کے ہاں یہ رابطہ معین افکار کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے خسرو کے کلام میں مجرد احساسات اس کا آلۂ اظہار ہیں۔ خسرو کی غزل میں فارسی غزل کی وہ عام مفاہمت موجود ہے جو سرِ دلبران' کو 'حدیث دیگران' میں بیان کرتی تھی۔ اور جو شعر کو شاعر کے سوانح حیات بننے سے روک لیتی تھی یا جس کی مدد سے ہر شعر ڈرامائی خود کلامی کا حاصل بن جاتا تھا۔ اور وہ خود کلامی زندگی کے جانے پہچانے الباد کو توڑ کر انسان کو ایک تازہ تر اور عمیق تر بینش بخشتی تھی۔ خسرو کی اکثر غزلوں میں ایک وجد کی سی کیفیت پائی جاتی ہے جو خاقانی کے ہاں بالکل مفقود اور سعدی کے ہاں کم ہے۔ ابھی زمانے کو ایک اور بڑے شاعر حافظ کا انتظار کرنا تھا جو اس وجد کی تکمیل ایسے نہج پر کر دے کہ وہ ہر انسان کے اندر ایک نہیں کئی بگولے اُتار دے……

ماخذ (اُردو۔۲۱)

فحاشی کا سرچشمہ

ہمارے ہاں کا قدامت پرست طبقہ اٹھتے بیٹھتے اس مقدس وعظ کو دہراتا رہتا ہے کہ ’ملک میں فحاشی کا سیلاب بڑھتا جا رہا ہے، قوم کا نوجوان طبقہ جو اسکولوں اور کالجوں میں تعلیم پاتا، یا تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد باہر نکلتا ہے، وہ فحش نگاری، فحش گوئی، فحش بینی اور فحش جوئی کا رسیا ہوتا ہے۔ اس کی وجہ اُن کی غلط تعلیم، بیرون ملک سے درآمد ہونے والا عریاں لٹریچر اور ریڈیو ٹیلی ویژن اور سینما کے جنسی محرکات ہیں‘۔ چناں چہ وہ ان کے خلاف آئے دن جہاد کا اعلان کرتا رہتا ہے۔

اس میں شبہ نہیں کہ فحاشی بڑی مخربِ اخلاق شے ہے اور ہر وہ حرف وصوت یا نقش وتمثال جو جذبات میں تحریک وارتعاش پیدا کرنے کا موجب ہو، قابلِ احتراز ہے۔ لیکن ہمارا مذہب پرست طبقہ جس انداز سے فحاشی کی مخالفت کرتا ہے اس سے وہ یہ تاثر پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ فحاشی کا سرچشمہ ’دنیاوی‘ تعلیم اور اس کے تضمنات ہیں۔ جو تعلیم ان کے مکاتب اور دارالعلوموں میں دی جاتی ہے، اس سے عفتِ فکر ونظر کے پیکر اور عصمتِ قلب ونگاہ کے مجسمے تیار ہوتے ہیں، اُن کے خیالات نہایت پاکیزہ اور تصورات انتہائی مقدس ہوتے ہیں۔ لیکن آیئے اور ذرا دیکھئے کہ ان دینی مدارس میں جو کچھ پڑھایا جاتا ہے اس کی کیفیت کیا ہے! اور یہ کیفیت کسی ’مسٹر‘ کی زبان سے نہ سُنیے۔ اس کے بیان کرنے والے، مولانا عبدالغفار حسن ہیں جو (جماعت اسلامی سے اعتزال کے بعد) مدینہ یونیورسٹی میں قیام پذیر ہیں۔ ان کا ایک مضمون (یا خط) ہفتہ وار المنبر کی ۲۶ راگست کی اشاعت میں شائع ہوا ہے، اُس میں وہ تحریر فرماتے ہیں: ’گزشتہ ماہ المنبر کا شمارہ ملا جس میں حضرت عبداللہ غزنویؒ کی سوانح عمری کی دوسری قسط شائع ہوئی ہے۔ حضرت موصوف کے یہ الفاظ کتنے بصیرت افروز ہیں: ’ازخواندن ابیات وشنیدن آں پرہیز کلی باید کرد کہ محققین نوشتہ اند کہ زنا زبان است‘۔

ایک طرف یہ پاکیزہ نقطۂ نظر ہے، دوسری طرف ہمارے ہاں ’درسِ نظامی‘ ’سبعہ مُعلّقہ‘ اور متنبی جیسے فحش اور عشقیہ اشعار وقصاید پر مشتمل کتابیں بڑے ذوق وشوق سے پڑھائی جاتی ہیں۔ عام طور پر چوں کہ دینی مدارس کا انتظام مساجد میں ہوتا ہے، اس لیے بارہا ایسا بھی ہوتا ہے کہ محراب ومنبر بھی ان اشعار وقصاید کی شرح وتفسیر سے گونج اٹھتے ہیں اور طلبا بھی اپنی جلوت وخلوت میں مزے لے لے کر جھوم جھوم کر ان کو پڑھتے ہیں اور اپنی دبی آگ کو بھڑکانے کا سامان فراہم کرتے ہیں۔ تماشہ یہ ہے کہ

استاد اگر دینی غیرت اور شرم و حیا کی بنا پر ان کتابوں کے فحش اشعار کو نظر انداز کرنے کی کوشش کرتا ہے تو طلبا بضد ہوتے ہیں کہ وہ ان اشعار کے ترجمے اور شرح و تفصیل سے محظوظ ہو کر ہی رہیں گے۔ ع چوں فسق از کعبہ برخیزد کجا ماند مسلمانی!

غور طلب امر یہ ہے کہ یہی اشعار یا ان کا منظوم ترجمہ ریڈیو پر ترنم کے ساتھ کوئی مغنیہ پڑھ کر سنا دے تو کس بنا پر اُسے مخربِ اخلاق اور شرم و حیا کے منافی قرار دیا جا سکتا ہے! فرق صرف اتنا ہے کہ ریڈیو کی اس قسم کی نشریات اپنا وسیع حلقہ رکھتی ہیں اور شرابِ دو آتشہ سہ آتشہ کی شکل میں معاشرے کے فساد کا ذریعہ بنتی ہیں جبکہ عربی مدارس کی فضا میں حلقۂ سامعین انتہائی محدود ہوتا ہے۔ لیکن افسوس ناک صورتِ حال یہ ہے کہ یہ زہر ان کو پلایا جاتا ہے جو آئندہ قوم کے مرشد اور دینی رہنما بننے والے ہیں اور ساقی کا منصب ان کو حاصل ہے جو تقویٰ اور دینی علم سے بہرہ ور ہیں۔ اس قسم کی کتابوں کو جزو نصاب بنانے کے بارے میں عذر یہ پیش کیا جاتا ہے کہ عربی زبان اور قرآن و حدیث کو سمجھنے کے لیے ان کتابوں کا پڑھنا پڑھانا ناگزیر ہے:

یہ جواب چند وجوہ سے قابلِ غور ہے: 'دیوانِ متنبی کوئی ایسی کتاب نہیں ہے جس کے اشعار بطور سند پیش کیے جا سکیں۔ یہ تو اس دور کی یادگار ہے' جب کہ عجمی تخیلات اور اسالیب کلام' عربی ادب میں سمو دیے گئے تھے۔ اس سے انکار نہیں کہ اس میں بعض حکیمانہ اشعار بھی ہیں۔ اُن سے استفادہ اگر ضروری خیال کیا جاتا ہے تو اس کتاب کے منتخب اشعار پڑھا دینے مناسب ہوں گے۔ باقی رہی 'سبعہ معلقہ' تو اس کے ہر قصیدے سے موزوں اشعار کا انتخاب کیا جا سکتا ہے۔ زیادہ مُناسب یہ ہے کہ درجہ تخصص میں اسے مطالعہ میں رکھا جائے تاکہ جاہلی ادب اور اسلامی ادب کا فرق واضح ہو سکے۔ افسوس ہے کہ ہمارے مدارس میں یہ کتاب عام طور پر تیسرے یا چوتھے سال میں پڑھائی جاتی ہے۔ ان درجات میں اکثر طلبا نوعمر ہوتے ہیں اور ان اشعار سے ان کے اخلاق کردار پر انتہائی بُرا اثر پڑتا ہے۔

ایک صاحب کا واقعہ ہے کہ انھوں نے دو نوعمر طالبات کو 'عالم عربی' کی تیاری کی غرض سے 'سبعہ معلقہ' پڑھانا شروع کی۔ جب 'امرؤ القیس' کے فحش اشعار کے پڑھانے کی نوبت آئی تو شرم و حیا کی بنا پر زبان اُن کا ساتھ نہ دے سکی۔ آخرکار انھوں نے اس مشغلے کو خیرباد کہا اور اپنے گھر کی راہ لی۔ بعد میں ان طالبات نے 'عالم عربی' کے امتحان کے لیے مدرسۃ البنات لاہور (سابق جالندھر) میں داخلہ لیا۔ سنا ہے کہ وہاں من ورا حجاب (پس پردہ) مرد اساتذہ طالبات کو درس دیتے ہیں۔ نہ معلوم وہ کس طرح ان اشعار کو نکلواتے ہوں گے!

مولانا صاحب آگے چل کر لکھتے ہیں: 'یہ تفصیل حصۂ نظم کے بارے میں عرض کی گئی ہے۔ اب حصۂ نثر کا حال ملاحظہ ہو۔ ہمارے ہاں پاک و ہند کے مدارس میں حصۂ نثر کے لئے 'نفحۃ الیمن' اور

'مقاماتِ حریری' تجویز کی گئی ہیں۔ ان میں جو حکایات اور افسانے درج ہیں ان سے انتہائی گھٹیا کردار سامنے آتا ہے۔ حریری کی افسانے زیادہ تر گداگر وعظ کا پارٹ ادا کرتے ہیں۔ کیا اس قسم کی تحریروں سے طلبا اچھا تاثر لے سکتے ہیں!

مولانا صاحب نے اپنی تنقید کو صرف عربی ادب کی دو چار کتابوں تک محدود رکھا ہے۔ اگر یہ جرات سے کام لے کر کُتب فقہ کے متعلق بھی کچھ ارشاد فرما دیتے اور مزید ہمت کر کے' ان کے کچھ اقتباسات پیش کرتے' تو پھر اس کا صحیح اندازہ ہوتا کہ ان مکتبوں اور مدرسوں میں کس قسم کی تعلیم دی جاتی ہے اور اس سے کس قسم کے ذہن تیار ہوتے ہیں! ہم ان سے عرض کریں گے کہ زیادہ نہیں تو عالمگیری' ہدایہ' شرح وقایہ' دُرِ مختار وغیرہ سے' وضو غسل' روزہ یا نکاح سے متعلق ابواب کے دو دو' چار چار مسائل سامنے لاکر بتائیں کہ ان سے نوجوان (اور بالعموم تجرد) طالب علموں کے دل میں کس قسم کے جذبات انگڑائیاں لیتے ہیں۔ یا کوئی اور صاحب ہمت بزرگ ایسا کر سکیں تو یہ قوم کی بہت بڑی خدمت ہوگی۔

ماخذ (اُردو۔ ۱۲۷)

وعظ یا میڈیکل لیکچر!

عنایت اللہ المشرقی

ادھر مسلمان کی تمدن کی کل اس طرح بگڑی ہے اور اُدھر مولوی اور ملا کے بنائے ہوئے دین کی اپنے زعم میں 'صحت' اس قدر پیچیدہ اور وضاحت اس قدر مکمل ہے کہ الامان!

عورتوں کے حیض و نفاس کے مسئلے اس باریکی اور لطف سے سرِ عام دہرائے جاتے ہیں کہ پورا میڈیکل کالج کا لیکچر معلوم ہوتا ہے۔ استنجا کے ایسے مکمل طریقے' ڈھیلوں کو آر پار کرنے کے لطیف ڈھنگ' پیشاب کے آخری قطروں کو نچوڑنے کے کرتب' غسل کے امتناعی آداب' برتن اور کنوئیں پاک کرنے کے بے شمار اسالیب' مرد و زن کی شہوتوں کے تناسب کا 'صحیح' حساب' نطفہ' منی کی قسمیں' عورتوں کے آپس میں زنا کرنے کے حیا سوز طریقوں کی پوری توضیح اور پھر نرمی سے ان کی ممانعت، بیوی کو شریعت کی طرف سے ہدایت کہ اگر خاوند کو شہوتِ نفسانی اونٹ کی پیٹھ پر نمایاں ہو جائے تو اس پر لازم ہے کہ پُورا کرے۔ الغرض مسلمانوں کا یہ چھتیس ہزار شہروں کو بارہ برس میں سر کرنے والا دین مُلائے محترم کی مہربانی سے آج ایک خاصا بھلا کوک شاستر معلوم ہوتا ہے۔

ماخذ (اُردو ۔ ۷۶)

یہ پورنوگرافی نہیں ہے

ڈاکٹر سید مُبین اختر

میرے خیال میں، بنیادی طور پر ہمارے معاشرے میں جنس کے بارے میں کسی حد تک غیر اسلامی روّیہ موجود ہے۔ جس بے باکی سے قرآن و حدیث میں جنسی موضوعات کا ذکر ہے، اُس کے برعکس ہم، جنسی معاملات کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے بہت زیادہ ہچکچاتے، بلکہ شرماتے ہیں میں ایک فہرست تیار کرنا چاہتا ہوں تاکہ لوگوں میں یہ احساس پیدا ہو کہ قرآن و حدیث میں کس قسم کے موضوعات پر گفتگو ہوئی ہے۔

ہم نے اپنے پرچے میں ابتدا میں جنسی معاملات کے بارے میں حدیثیں شائع کیں تو کچھ

بزرگوں نے اعتراض کیے۔ میں نے عرض کیا کہ یہ تمام مواد حدیث و قرآن سے لیا گیا ہے، پھر بھی وہ مطمئن نہیں ہوئے اور کہا یہ گیا کہ آخر یہی حدیثیں کیوں شائع کی جائیں! گویا (نعوذ باللہ) حدیث و قرآن کو بھی سنسر شپ کی ضرورت ہے یعنی یہ جائزہ لیا جائے کہ حدیث و قرآن سے کون سی بات شائع کی جائے اور کس بات کو خفیہ رکھا جائے!

ماخذ (اُردو۔ ۱۳۱)

rekht

ناپاک حالتیں

ناصر عباس مرزا

ایک متعلقہ باپ نے مجھے ایک خط لکھ کر اس پر تبصرہ چاہا ہے۔ خط کے ساتھ ایک نصابی کتاب کے ایک صفحے کی فوٹو کاپی بھی شامل ہے جو چھٹے درجے کے طلبا کو پڑھائی جاتی ہے یعنی کوئی گیارہ سال کی عمر کے لڑکوں کو، اور اس اسکول میں جو لاہور کے اعلیٰ اسکولوں میں سے ایک ہے۔

جو کتابیں بچے اسکول میں پڑھتے ہیں، عام طور پر ان کو اچھا ہی سمجھا جاتا ہے اور والدین، خاص کر متمول اور مصروف قسم کے والدین تو ان کتابوں کو ایک نظر دیکھتے بھی نہیں۔ یہاں جس اسکول کا ذکر ہو رہا ہے وہ یقیناً دولت مندوں کے لڑکوں کے لیے ہے مگر غیر متوقع طور پر، جس باپ نے مجھے یہ خط بھیجا ہے، وہ غیر معمولی نوعیت کے آدمی ہیں۔

کتابِ مذکور کے اس مخصوص صفحے کا مافیہ یقیناً قابلِ اعتراض تھا۔ اس لیے کہ اس میں جو کچھ معلومات درج تھیں وہ اپنے مقام اور سیاق و سباق کے حوالے سے سراسر غیر ضروری تھیں۔ اور پھر وہ جن الفاظ میں تحریر تھیں وہ بھی شائستگی کے تمام اصولوں کے منافی تھے۔ یہ سوچ کر تو یہ معلومات اور بھی قابلِ نفرت معلوم ہو رہی تھیں کہ جن تک وہ پہنچائی جا رہی ہیں وہ چھٹے درجے کے اثر پذیر ذہن ہیں۔

اس سے پہلے کہ میں اس بارے میں کچھ لکھتا، میرے لیے یہ ضروری تھا کہ میں حقائق کی تصدیق کر لوں۔ اس کے معنی یہ نہیں کہ مجھے مراسلہ نگار کی راست بازی پر کوئی شک تھا۔ مگر چوں کہ میرا ردِعمل عدم یقینی کا تھا، اس لیے میں اس بات کی دوبارہ تصدیق کرنا چاہتا تھا کہ جو کچھ بھی خط میں لکھا گیا ہے وہ صحیح ہے۔ یہ کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ میرے دو دوستوں کے بیٹے بھی وہاں چھٹے درجے میں پڑھتے تھے جنھوں نے اس بات کی تصدیق کر دی کہ وہ کتاب ان کے نصاب میں شامل ہے۔ بہرحال، میرے لیے ایک مسئلہ اور ہے۔ اگر اس میں مافیہ کو بعینہٖ نقل کرتا ہوں تو میری تحریر بھی نہیں چھپ سکتی اور بالکل بجا طور پر۔ اس لیے کہ کوئی مدیر بھی یہ نہیں چاہے گا کہ اس طرح کی زبان پر وہ اپنی قینچی نہ چلائے۔ مگر کیا یہ واقعی ایک حیرت انگیز بات نہیں کہ چھٹی کلاس کے نصاب میں وہ کچھ بھی شامل ہے جسے ایک اخبار میں بھی شائع نہیں کیا جا سکتا!

اب چوں کہ یہ معاملہ خاصا اہم ہے اور اسے پسِ پشت بھی نہیں ڈالا جا سکتا اس لیے کہ ہمیں یہ بھی معلوم ہونا چاہیے کہ ہمارے لڑکے کیا پڑھ رہے ہیں، میں متعلقہ عبارت کو مروجہ اور طبی زبان میں

پیش کر رہا ہوں۔ اس کتاب کا صفحہ ۴۴ میرے سامنے ہے۔ جہاں سے ایک نیا باب شروع ہوتا ہے جس کا عنوان ہے ’غسل‘۔ صرف دو سطروں میں ’غسل کے معنی اور اہمیت بتانے کے بعد‘ مصنف فوری طور پر اپنے مطلب کی طرف آتا ہے: ’بہرحال ’بعض حالات میں‘ بدن ناپاک رہتا ہے۔ تاوقتے کہ صحیح معنوں میں غسل نہ کیا جائے۔ غسل (۱) مجامعت (۲) احتلام (۳) خودلذتی (۴) حیض اور (۵) بعد از حیض‘ ضروری ہوجاتا ہے‘۔ صفحے کے آخر میں ’ایک تشریحی نوٹ میں اس بات کی وضاحت کی گئی ہے کہ حیض اور بعد از حیض کے کیا معنی ہیں۔ باقی سارا کا سارا باب ایک طویل فہرست سے بھرا ہوا ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ غسل کے دوران کیا کیا جائے اور کیا نہ کیا جائے۔

خالصتا دینی نکتہ نظر سے یہ معلومات اپنی جگہ صحیح ہیں مگر یہاں یہ سارا زور ہی رسوم‘ طور طریق اور انجام دہی پر صرف کر دیا گیا ہے اور وہ بھی اس طرح کہ مذہب تمام لطیف احساسات سے عاری ہو گیا۔ کیا یہاں اتنی اور ایسی تفصیل کی ضرورت تھی! کیا یہ طہارت کے بارے میں کوئی سبق ہے یا پھر کسی پر جنسی غلبے کا اظہار! جنسی تعلیم بھی برحق‘ مگر یہاں تو جنسی تعلیم نہیں دی جا رہی نا! اور اگر دی بھی جا رہی ہو تو اس سے زیادہ بھونڈے اور غلیظ تر انداز میں سوچی بھی نہیں جا سکتی۔ اس سے بہتر تو وہ غلیظ چیزوں کا مارا موٹا لڑکا بہتر رہا جس نے پرندوں اور مکھیوں کے بارے میں ایک سوال داغ دیا۔

اوپر ذکر شدہ قسم کے سبق میں صحت وصفائی کے بارے میں کچھ نہیں کہا گیا۔ میرا خیال ہے کہ اس کے لیے تو ان لڑکوں کو علم حفظان صحت اور فعلیات کا مطالعہ کرنا ہوگا۔ مگر پھر ہمیں یہ بھی کبھی نہیں بھولنا چاہیے کہ ہم انھی لوگوں کے بارے میں گفتگو کر رہے ہیں جنھوں نے ایک زمانے میں گرے کی ’اناٹومی‘ پر فحش نگاری کا الزام دھر کر اسے نذر آتش کر دیا تھا۔ ذرا سوچیے تو سہی‘ یہاں تو لڑکوں کو بدن کی طہارت کے بارے میں کچھ اس طرح بتایا جا رہا ہے کہ ان کے اذہان ہی گندگی سے بھر جائیں۔ ممکن ہے کہ میں کسی اور پود کا ہوں مگر یہ بھی تو بتائیں کہ آخر آج کے گیارہ سالہ بچے کتنے بڑے ہوتے ہیں! میری نظر میں تو یہ سب کچھ بچے کے ذہن کی بداستعمالی سے کم بات نہیں۔

مراسلہ نگار نے مجھے یہ بھی لکھا ہے کہ ان مذکورہ ’ناپاک‘ حالتوں میں سے ہر ایک کے بارے میں‘ کلاس ٹیچر نے سب کچھ، خوش ہو ہو کر سمجھایا اور اس دوران لڑکے دبی دبی ہنسی ہنستے رہے اور آپس میں سرگوشیاں کرتے رہے۔ جب کہ ذہین لڑکوں نے پریشان ہونا شروع کر دیا ہوگا کہ دیکھیں امتحان کے دوران یہ ٹیچر کس قسم کے سوالات پوچھے گا! کیا پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ کو یہ علم ہے کہ دینیات کی ایک شامل نصاب کتاب کے علاوہ کتاب مذکور بھی چھٹی کلاس میں پڑھائی جا رہی ہے! کیا متعلقہ حکام بھی اس بارے میں جانتے ہیں! کیا دوسرے والدین کو بھی یہ بات معلوم ہے! کیا خود پرنسپل کو یہ بات معلوم ہے! ہر صورت میں جواب نفی میں ہوگا۔

یہ مت بھولیں کہ لڑکوں کے لیے لاہور میں' یہ اسکول ایک بہترین اور قدیم ترین اسکول سمجھا جاتا ہے۔ کیا آپ ذرا یہ سوچنے کی زحمت فرمائیں گے کہ دینی مدارس میں کیا پڑھایا جا رہا ہے! پھر اس میں حیرت کی کیا بات ہے کہ اس طرح کے مواد کو' جوان دینی مراکز میں پڑھایا جا رہا ہے' اسے دیکھ کر اپنی برہمی کا اظہار فرمایا تھا! آپ مجھے 'گورنر پنجاب' اس اسکول کے پرنسپل اور اس اخبار کے مدیر سے یہ سوال پوچھنے کی اجازت دیں کہ 'اگر آپ کا گیارہ سالہ لڑکا آپ سے مذکورہ کتاب کے پیراگراف کی وضاحت چاہے تو آپ کا کیا جواب ہوگا'...... ظاہر ہے' جواب یہ نہیں ہوگا کہ جاؤ' اپنے استاد سے پوچھو' اور یہ جواب تو ہو ہی نہیں سکتا کہ 'جاؤ' اپنی ماں سے پوچھو'۔

ماخذ (انگریزی۔33)

کتابیں

ستار طاہر

محمد بدر منیر

مولانا صلاح الدین احمد

زاہدہ حنا

مصطفٰے زیدی

rekhta

گفتنی، ناگفتنی

ستار طاہر

فحاشی کے انسداد اور رجحان کے خاتمے کی ذمے داری ان لوگوں پر بھی عائد ہوتی ہے جو جنسی، انسانی اور سماجی مسائل کو نظر انداز کر کے کسی تخلیق کی پرکھ کرتے ہیں، اور سیاق و سباق کی پرواہ کیے بغیر ’جلد بازی‘ میں کوئی فیصلہ صادر کرتے ہیں۔ عالمی اور برصغیر پاک و ہند کی ادبی تاریخ ایسے کئی مقدموں سے بھری پڑی ہے جو کتابوں پر اس الزام میں چلائے گئے کہ یہ کتابیں فحش تھیں مگر بعد میں یہ کتابیں نہ صرف فحاشی کے الزام سے بری کر دی گئیں بلکہ ان کو معاشرے کی سچی اور حقیقی تخلیقی تصویر اور عکاسی قرار دیا گیا۔ ڈی ایچ لارنس کی تصنیف ’لیڈی چیٹر لیز لوز‘ پر فحاشی کے الزام میں جو مقدمہ چلا، وہ عالمی ادب کی تاریخ میں بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ منصفوں نے اس کتاب کو ’اعلیٰ تخلیقی ادب‘ قرار دیا۔ بعد میں جیمس جوائس کے ناول ’یولیسز‘، ارسکن کالڈویل کے ناول ’دی گوڈز لیٹل ایکڑ‘ اور پھر نوبوکوف کے ناول ’لولیتا‘ پر فحاشی کے مقدمات قائم کیے گئے۔

خود ہمارے ہاں برصغیر پاک و ہند میں بعض لوگ ابھی تک ’مثنوی زہر عشق‘ کو عریاں اور فحش قرار دیتے ہیں۔ ’انگارے‘ کی ضبطگی کے عوامل میں جہاں سماجی اور جرأت مندانہ سیاسی احتجاج شامل تھا، وہاں اس کی بعض کہانیوں پر فحش ہونے کا الزام بھی تھا۔ سعادت حسن منٹو کی زندگی کا بڑا حصہ فحاشی کے الزام کو برداشت کرتے ہوئے اور اپنی لکھی ہوئی کہانیوں پر اسی الزام کے تحت چلنے والے مقدموں کی پیروی میں گزرا۔ ’دھواں‘، ’بُو‘، ’ٹھنڈا گوشت‘ پر فحاشی کے الزام میں مقدمے چلے مگر عدالت نے ان کہانیوں کو اس الزام سے بری کر دیا۔

ظاہر ہے کہ اگر ان کتابوں پر فحاشی کا الزام لگانے والے صحیح ادبی ذوق کے مالک ہوتے تو ان کہانیوں پر مقدمہ چلانے کی ضرورت ہی محسوس نہ ہوتی۔ اسی طرح عصمت چغتائی جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ بڑی منہ پھٹ اور ’بے حیا‘ ہیں ان کی ایک کہانی ’لحاف‘ پر فحاشی کے الزام میں مقدمہ بھی قائم ہوا۔ اس مقدمے کا انجام بھی منٹو کی کہانیوں پر چلائے جانے والے مقدموں سے مختلف نہ تھا۔ خان فضل الرحمٰن خان کی کتاب ’آفت کا ٹکڑا‘ بھی فحاشی کے الزام میں ضبط کر لی گئی۔ اس کتاب کے ساتھ کچھ ایسے واقعات پیش آئے کہ ناشر اور اس کا مصنف اس الزام سے بریت کے لیے مقدمہ نہ

لڑ سکے۔ اب اردو کی ایک معروف شاعرہ فہمیدہ ریاض پر بھی یہ الزام لگایا جارہا ہے کہ وہ فحش شعر کہتی ہیں۔

پاکستان میں جہاں ایک طرف یہ رجحانات پائے جاتے ہیں، وہاں وہ رسائل اور جرائد سر عام بکتے ہیں جن میں سوائے عریاں اور فحش تصویروں اور مغلظات کے اور کچھ نہیں ہوتا۔ حکومت نے کچھ عرصہ پہلے ان رسالوں کا نوٹس لیا تھا مگر اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ یہ رسالے اب اپنے پرانے سائز اور حجم میں ہی کتابوں کی صورت میں شائع ہو رہے ہیں اور پہلے کی طرح بکتے ہیں۔ ان رسالوں اور کتابوں میں چھپنے والی ایک ایک تصویر اور ایک ایک سطر خود پکارتی ہے کہ 'ہم عریاں ہیں، فحش ہیں'۔

چند برس پہلے صرف ایک 'وہی وہانوی' تھا۔ اردو زبان کا ایک مقبول مزاح نگار اس فرضی نام سے لکھتا تھا، وہ بے چارہ تو اپنے دوست احباب کی سرزنش کے بعد تائب ہو گیا، مگر اپنے پیچھے نہ جانے کتنے وہی وہانوی چھوڑ گیا۔ اس کے نام سے چھپنے والی کتابیں باقاعدہ چھاپی بیچی اور تقسیم کی جاتی ہیں۔ ایک آنہ 'لائبریریوں' والے ان کتابوں کو چھپا کر رکھتے ہیں اور شائقین سے دگنا تگنا کرایہ لے کر ان کتابوں کو دیتے ہیں۔ یوں یہ فحش اور گھناؤنی تصانیف گلی کوچوں میں پھیلتی رہتی ہیں۔ میں نے خود فحش کتابیں خرید کر، مانگ کر پڑھی ہیں اور کافی کتابیں پڑھنے کی وجہ سے میں اس حقیقت کو پا گیا ہوں کہ ایک تو زمانہ پہلے سے بہت زیادہ ترقی کر چکا ہے اور دوسرے فحش کتابیں لکھنا چھاپنا اور بیچنا اور پڑھنا ایک معاشرتی ضرورت بن گیا ہے۔

مجھے یہاں فوری طور پر اس امر کی وضاحت کر دینی چاہیے کہ میں فحاشی کا حمایتی نہیں ہوں اور فحش کو کبھی ادب کے خانے میں نہیں رکھتا خواہ وہ، اس 'خواہ وہ' میں کئی گفتنی ناگفتنی باتیں بھی آتی ہیں۔ اس لیے میں یہاں نام لیے بغیر اشارے میں گفتگو کرنا پسند کروں گا۔ اس لیے نہیں کہ میں بزدل ہوں بلکہ زمانے کی ترقی کی رفتار اور ذہنی پیمانوں کے بدلنے کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ میں جنھیں آج فحش سمجھتا ہوں، ہو سکتا ہے لوگ انھیں فحش نہ سمجھتے ہوں اور پھر یہ بھی تو ممکن ہے کہ آنے والا زمانہ انھیں فحاشی کے الزام سے آزاد کر دے۔

میں یہاں یہ عرض کرنے کی جسارت کروں گا کہ ایک زمانے میں ایسی مثنویوں، حکایات اور تصانیف کو مدرسوں، خانقاہوں اور تعلیمی اداروں میں شامل نصاب کیا جاتا تھا اور اب وہ ہمارے کلاسیکی ادب کا نہایت اہم حصہ ہیں۔ آج بھی بعض اداروں میں یہ کتابیں نصاب کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ان کتابوں کے بارے میں ہمارے بزرگوں کا یہ رویہ بھی اہم تھا کہ ان کتابوں کے بعض حصوں کو نوعمر نسل سے دور رکھا جائے کیوں کہ نوعمری میں ان کا پڑھنا نقصان دہ ثابت ہو سکتا ہے۔ یوں میرے خیال میں، بالواسطہ یا بلاواسطہ یہ ترغیب دی جاتی رہی کہ ان حصوں کو ضرور پڑھو، نتائج وہی اخذ کرنا جو ہم نے پہلے سے بتا دیے ہیں۔ مگر ہر ایک ذہن ایک سا نہیں ہوتا۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے انگریزی میں ترجمہ ہو کر چھپنے

والے فحش قدیم چینی ناول ‘دی لیٹ نائٹ اسکالرز’ کو میں کسی دوست کو اس سفارش کے ساتھ پڑھنے کے لیے دوں کہ دیکھو جو دوسروں کی بیویوں کو ورغلاتا ہے، اس کی اپنی بیوی بھی نہیں بچتی۔ اس ‘حکمت’ تک پہنچنے کے لیے میں اپنے دوست کو ‘ہارڈ کور پورنوگرافی’ پڑھنے کی ترغیب دیتا ہوں۔ یقیناً یہ ناول ہی فحش ہے ان قصص اور حکایات کی طرح جن کی طرف میں نے اشارہ کیا ہے۔ یہ کتاب ایک مدت تک لاہور کے بک سیلرز بیچتے رہے ہیں۔ جوں جوں انھیں اس ناول کی ‘افادیت’ کا احساس ہوتا گیا، اس کی قیمت بھی بڑھاتے چلے گئے۔ اب یہ ناول ‘زیرِ زمین’ جا چکا ہے اور دگنی تگنی قیمت ادا کیے بغیر حاصل نہیں کیا جا سکتا۔

میں نے یہ کہنے کی کوشش کی ہے کہ فحش کے ساتھ انسان کی دل چسپی بہت پرانی ہے۔ انسان کے اندر یہ ایک ڈھکی چھپی (منفی!) خواہش اس کے اجتماعی لاشعور میں (فرائڈ کی ‘اڈ’) سوئی رہتی ہے۔ پھر انسانی اعمال میں جنس جو اہم کردار ادا کرتی ہے وہ اس ‘ہفت رنگ’ چھپی ہوئی خواہش کے اظہار کو ‘صد رنگ پیراہن’ بخشتی ہے اور ان میں سے ایک پیراہن یا ایک رنگ ایسا ہوتا ہے جو ‘فحش’ ہوتا ہے اور اس ایک ‘رنگ’ کو ضرورت کی چیز بنا لیا جاتا ہے۔ ایک بکنے، فروخت کرنے اور خریدی جانے والی چیز، کمرشل ایج کے تقاضوں کے مطابق۔ اب تو ارل اسٹینلے گارڈنر کے پیری میسن کے ناولوں کی سیریز کے سرورق بھی ‘عریاں’ ہونے لگے، حالاں کہ یہ ناول خالی خولی جاسوسی ہوتے ہیں، اور وہ بے چارے جو صرف ‘ٹائٹلوں کی بہار’ کو دیکھ کر ناول خریدتے ہیں، بعد میں پچھتاتے ہیں۔

پچھلے چند برسوں میں کتابوں کی عالمی صنعت کے ساتھ ہماری ملکی صنعت میں بھی ایک انقلاب آیا ہے۔ نام نہاد وہی وہانوی کے ناول لکھنے اور چھاپنے والے اب ایسے ڈائجسٹ پرچے شائع کرتے ہیں جن میں جسموں کی عریاں تصاویر کے ساتھ ساتھ کہانیاں شائع کی جاتی ہیں، جن کو میں فحاشی کی ‘ارزاں ترین صنف’ کہوں گا۔ یہ اصطلاح میرے ذہن میں کیتھرائن بریلٹ کے ناول ‘اے مین فار آسکنگ’ کے مطالعے کے بعد آئی جس کے سرورق پر یہ سطریں جلی حروف میں شائع کی گئی ہیں: ‘یورپ میں ممنوع قرار دے دی گئی۔ سولہ سالہ فرانسیسی دوشیزہ کا لکھا ہوا ایک سنسنی خیز ناول’۔ اب آپ ہی بتایئے کہ کون ایسا زاہد ہوگا جو ان سطروں کو پڑھ کر کتاب پڑھنے کی آرزو نہ کرے! وہ ناول جسے یورپ میں بھی ممنوع قرار دیا گیا ہو، جسے سولہ برس کی ایک فرانسیسی لڑکی نے لکھا ہو، اس میں کتنی کشش ہوگی! کتاب کو چھوتے اور ان سطروں کو پڑھتے ہی انگلیاں جل اٹھتی ہیں۔ اس کے ٹائٹل کی تحریر اور تصویر کو دیکھ کر، اس کے بیک ٹائٹل پر نظریں پڑتی ہیں: ‘وہ ناول جس نے فرانس کا سر شرم سے جھکا دیا۔ جو اٹلی میں ممنوع قرار دے دیا گیا، اور جرمن جریدے ‘سٹرن’ نے جسے سال کا ‘فحش ترین’ ناول قرار دیا، ان ترغیبات کے بعد آدمی یا تو کتاب چوری کرنے کے بارے میں سوچتا ہے یا اپنا بٹوہ کھول کر دیکھتا ہے۔

وہ کتب فروش کے پاس جاتا ہے جو اس کی طرف دزدیدہ نظروں سے دیکھتا ہے، مسکراتا ہے۔ بارہ روپے قیمت بتاتا ہے۔ گاہک ایک نظر کتاب کو دیکھتا ہے، پیپر بیک ایڈیشن میں ۱۲۸ صفحات کی کتاب بارہ روپے میں! دکان دار مسکرا کر کہتا ہے، ’ایک سو دس کا پیاں فروخت کر چکا ہوں، چند ’دانے‘ پڑے رہ گئے ہیں۔‘ اب گاہک کو فوری طور پر فیصلہ کرنا ہوتا ہے کہ وہ بارہ روپے میں یہ کتاب خریدے یا کسی انگریزی سینما میں چار روپے والی گیلری میں بیٹھ کر کوئی ایسی انگریزی فلم دیکھے جس میں اس کی تسکین کے لیے بہت کچھ ہوتا ہے۔ خریدنے والے میں تھوڑا سا لکھنے پڑھنے کا ذوق بھی ضرور ہوتا ہے۔

میرے جیسا قاری اشتیاق کے ہاتھوں بارہ روپے دے کر کتاب خرید لیتا ہے۔ کیوں کہ میں اپنے دور کے عالمی ادب کو پڑھنا چاہتا ہوں اپنے عہد کے رجحانات سے آگاہ ہونا چاہتا ہوں۔ انسان ہونے کی حد تک میرے اندر تھوڑی سی، صحت مند لذت پسندی بھی پائی جاتی ہے جس سے مجھے گھن بھی نہیں آتی۔ وہ کتاب جسے یورپ میں ممنوع قرار دیا گیا، جسے سولہ برس کی ایک فرانسیسی لڑکی نے لکھا، اس نے میرے لیے ایک نئی دلچسپی پیدا کر دی ہے۔ میں نے فرانسوا ساگان کو پڑھا ہے۔ اور جب میں یہ ناول پڑھ لیتا ہوں تو مجھے اپنے آپ پر غصہ آجاتا ہے۔ میری حالت اس شخص جیسی ہوتی ہے جو صرف اپنے کرتوت کی وجہ سے ٹھگ لیا گیا ہو۔ یہ ناول جسے میں نے پڑھا ہے۔ اس کے لیے میں ایک اصطلاح گھڑ کر اپنے آپ کو تسلی دیتا ہوں۔ یہ فحاشی کی ارزاں ترین صورت ہے۔ اس ’گالی‘ سے بھی میری تسلی نہیں ہوتی، تو میں حقیقت پسند بننے کی کوشش کرتا ہوں۔ یہ کمرشل اسٹیج ہے اور کتابیں بھی کھلا دھوکہ دینے لگی ہیں، جب کہ اصل بات ایک ہی ہے، آدمی ترغیب کے ہاتھوں مارا جاتا ہے۔ مگر اس ’موت‘ سے بچا کس طرح جا سکتا ہے جب کہ یہ صرف میری ہی ’موت‘ واقع نہیں ہوئی بلکہ مجھ سے پہلے اور بھی تو کتنے ہی یہ جام پی چکے ہوں گے!

اس ’موت‘ سے بچاؤ کا ایک ہی راستہ ہے، یعنی ایسا سنسر شپ، ایسی احتیاطی تدابیر، جو صرف ادب کی کتابوں کو فروغ دے اور فحش کا قلع قمع کر دے۔ میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ ہمارے ملک میں باہر سے جو کچھ کتابیں آتی ہیں، ان کا کڑا احتساب کیا جائے تو ملک میں فحش کتابوں کا کاروبار خاصی حد تک ٹھپ ہو سکتا ہے۔ فحش کتابوں کی درآمد و برآمد کے بارے میں واضح قانون ہونے کے باوجود ہمارے ہاں غیر ملکی عریاں کتابیں عام فروخت ہوتی ہیں۔ لاہور کے مال اور گلبرگ کے انگریزی کتب فروشوں نے ان کتابوں کو سینکڑوں کی تعداد میں بیچا ہے۔ رسوائے زمانہ اور بدنام ترین کتاب ’فینی ہل المعروف دی میموئرز آف اے وومن آف پلیژرز‘ (مکمل) آپ کو کتب فروشوں کے ہاں مل جائے گی جب کہ ایک زمانے میں اس کا شمار ممنوع کتب میں ہوتا تھا اور ایک ناول ’کینڈی‘ بھی لاہور میں پیپر بیک میں کھلے عام فروخت ہوئی۔ اس کتاب کے سرورق پر بھی ’مکمل‘ اور ’غیر حذف شدہ‘

کے الفاظ لکھے ہیں، انگلستان میں اس کتاب کو جب پبلشر نے سب سے پہلے شائع کیا، اس نے اس کے کچھ حصے حذف کر دیئے تھے۔ خود پبلشر کو یہ احساس تھا کہ یہ کتاب ’خالص فحش نگاری‘ ہے۔ یہ سنسرڈ ایڈیشن پاکستان میں نہیں آیا۔ اس کا موجودہ ایڈیشن جو پاکستان میں فروخت ہو رہا ہے اُسے ایک دوسرے پبلشر نے شائع کیا ہے اور اس میں وہ تمام حصے شامل کر لیے گئے ہیں جنھیں پہلے پبلشرز نے حذف کر دیا تھا۔ ان حقائق کا انکشاف کتاب کے موجودہ ایڈیشن کے ابتدا میں ’پبلشرز انٹروڈکشن‘ میں بڑے فخر سے کیا گیا ہے۔

فحش کتابوں میں ’کلاسکس‘ بھی ہوتی ہیں اگرچہ ان کا معیار بھی ’فحش‘ کے حوالے سے طے کیا جاتا ہے۔ فحش کلاسکس میں ایک کتاب ’مائی سیکرٹ لائف‘ ہے۔ اس کتاب کے سرورق پر دو جملے لکھے ہیں جن میں سے ایک کا مفہوم ہے ’وکٹورین عہد کے ایک دولت مند کی گم نام خودنوشت، جو صرف جنس کے لیے زندہ رہا‘۔ یہ ایک ’ایور گرین بلیک کیٹ بک‘ ہے۔ اسے ایک ’طویل عرصہ تک مدفون رہنے والا کلاسک‘ بھی کہا جاتا ہے۔ وہ ایڈیشن جو ’عام شائقین کے لیے‘ پیپر بیک میں تلخیص کی صورت میں شائع کیا گیا اس کی ضخامت ۷۰۰ صفحات ہے۔ یہ کتاب ’محدود تعداد‘ میں لاہور آئی۔ بک سیلروں کے قول کے مطابق، اس کا ایک ایک نسخہ پچاس روپے سے سو روپے تک بکا اور سرِ بازار بکا۔ ’مائی سیکرٹ لائف‘ فحاشی سے بھی آگے کی چیز ہے۔ اس کے لیے میں کوئی اصطلاح وضع نہیں کر سکتا۔ اس کتاب کے حوالے کی ضرورت مجھے اس لیے محسوس ہوئی کہ ایسی کتابیں بھی ہمارے ہاں جائز ذریعے سے بکنے کے لیے آئیں مگر کسی کے کان پر جوں تک نہ رینگی۔

ملکی سطح پر بھی فحش کتابوں کا کاروبار کھلے عام ہوتا ہے اور زیرِ زمین بھی۔ شائقین کے لیے الف لیلیٰ کے مصور ایڈیشن بھی موجود ہیں اور ’کاما سوترا‘ اور ’پلے بوائے‘ کے شمارے بھی۔ ان کتابوں تک صاحب ثروت کی ہی رسائی ہوتی ہے۔ عوام الناس گھٹیا، فحش اور وہی واہانوی ٹائپ کی کتابوں پر گزارہ کر لیتے ہیں۔ مناسب سنسر شپ نہ ہونے کی وجہ سے ان کتابوں کا کاروبار چمکا ہے۔ ملک کی حدود کے اندر کتابوں کے آنے سے پہلے ہی کتابوں کے بارے میں تسلی کر لینا ضروری ہے، مگر یہ کام ان لوگوں کے کرنے کا نہیں جو ملک میں منٹو کو فحش سمجھتے ہیں اور ’گنتھر گراس کے عظیم شہہ پارے ’دی ٹن ڈرم‘ کو فحش قرار دیتے ہیں اور ’کیلو‘ کو سرِ عام فروخت ہوتا دیکھ کر کوئی نوٹس نہیں لیتے۔

میں فحش کتابوں کے کاروبار کو کسی غیر ملکی یا صیہونی تحریک کا حصہ تسلیم نہیں کرتا۔ ساری دنیا میں فحش کتابیں شائع ہو رہی ہیں۔ انسانی ضرورت اور منفعت کے جذبے کو کچلا نہیں جا سکتا۔ ان کی صحیح سمت تلاش کرنے کی ضرورت ہے۔ جنس کی صحت مندانہ تعلیم اور جائز طریقے سے منافع حاصل کرنے کی راہ پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔ دوسری صورت میں عریاں تصویروں سے بھرے ہوئے ناول غیر ممالک

سے یہاں آتے رہیں گے، لوگ انھیں پڑھتے رہیں گے۔ اپنے ملک میں کوئی نہ کوئی دولت مند یا سرپھرا لکھنے والا وہی وہانوی کے مختلف روپ دھارتا رہے گا، مغرب پرستی، سماجی انارکی، ذہنی بے چینی، معاشی ناآسودگی کے طفیل اچھے سے اچھا ذہن فرار کی راہ اختیار کر کے فطری اور بے ضرر لذت پسندی کو انتہا تک لے جاتا رہے گا۔ سردست اس کا ایک ہی حل ہے۔ حکومت کو غیر ملکی کتابوں کا کڑا سنسر شپ کرنا چاہیے۔ ایسا سنسر شپ جو نہ تو آزادی اظہار کا گلا گھونٹے اور نہ اعلیٰ ادب پر ہی قدغن لگائے بلکہ جو فحش کتابوں کی درآمد و برآمد، اشاعت و طباعت اور خرید و فروخت کو روکے۔ مگر اس کے لیے ان لوگوں کی ضرورت ہے جو اعلیٰ ادبی ذوق رکھتے ہوں۔

'فحش' کی واضح تعریف کو سامنے رکھ کر جب تک کتابوں کی درآمد و برآمد، طباعت و اشاعت اور فروخت پر کڑی پابندی عائد نہ کی گئی تب تک یہ کاروبار جاری رہے گا۔ اور اس ضمن میں یہ باتیں ذہن نشین کرنے کی ضرورت ہے۔ ایک تو یہ کہ ادب جس طرح کبھی اخلاقیات کا کھلا ڈھلا درس نہیں دیتا، اسی طرح کبھی فحش بھی نہیں ہوتا۔ فحش فحش ہوتا ہے، ادب نہیں۔ اور دوسری بات۔ کچھ کتابیں، واقعی 'بالغوں کے لیے' ہوتی ہیں۔ اب یہ فیصلہ کرنا بھی ارباب اختیار و اقتدار کا ہے کہ کیا 'ایڈلٹ بکس' ہمارے ملک میں آنی چاہئیں یا نہیں! اور اگر آئیں تو ان کی تقسیم و فروخت کس طرح سے ہو گی۔ اور کیا ہمارے ملک میں 'بالغ' رہتے بھی ہیں یا نہیں! اور اگر رہتے ہیں تو ان کی تعریف اور شناخت کیا ہے! یہاں اس نازک مقام پر کیا کوئی سیدھا سادا اعتراف نہیں کرسکتا!

ماخذ (اُردو۔ ۹۴)

مُطالعے کا چسکا

محمد بدر منیر

گلبرگ میں واقع ایک بہت بڑی دکان پر ایک بزرگ بڑی دل چسپی کے ساتھ ایک کتاب کے اوراق الٹ پلٹ رہے تھے۔ صحت کے لحاظ سے اگرچہ وہ قبر میں پاؤں لٹکائے نہیں بیٹھے تھے لیکن قبرستان کے دروازے پر ضرور تھے۔ انھیں اس انہماک سے کتاب میں مشغول دیکھ کر مجھے ان پر رشک آیا کہ اس پیرانہ سالی میں بھی کتابوں سے ان کی محبت کا یہ عالم ہے کہ دنیا و مافیہا سے بے خبر ورق پر ورق الٹے جا رہے ہیں۔ انھیں کچھ قریب سے دیکھا تو ان کی صورت کچھ جانی پہچانی سی محسوس ہوئی۔ چند لمحے دماغ پر زور دیا تو اخبارات کے متعدد کالم نگاہ میں آ گئے جن میں ان کی تقاریر اور تصاویر بڑے اہتمام سے شائع کی جاتی تھیں۔ ایک اعلیٰ سرکاری عہدے سے ریٹائر ہونے کے بعد انھوں نے سیاست کی وادیٔ خارزار میں چہل قدمی کی اور ان دنوں 'ہر چند کہیں ہے، نہیں ہے' کی تفسیر بنے ہوئے تھے۔ ان کی طویل زندگی کا یہ مختصر خاکہ اتنی ہی دیر میں میرے نہاں خانۂ دماغ میں گشت کر گیا، جتنی دیر میں یہ سطور آپ کی نگاہوں سے گزری ہیں۔ پھر میں نے اس کتاب کی طرف دیکھا جو بزرگ موصوف کے ہاتھوں اور نگاہوں کی گرفت میں تھی۔ میرا خیال تھا کہ وہ خریدنے کی نیت سے کسی مذہبی کتاب کا جائزہ لے رہے ہیں۔ لیکن میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب میں نے انھیں فحش ترین کتاب 'فینی ہل' کے مطالعے میں مشغول پایا۔ ان بزرگ کو اعتماد میں لینے کے لیے میں نے ایک نیم فحش رسالے 'کنفیشنز' کو الٹنا پلٹنا شروع کیا اور پھر اس کا نتیجہ جلد ہی برآمد ہوا جب مجھے انھوں نے ایک قریبی ریستوران میں چائے کی دعوت دی۔

ڈیڑھ گھنٹے کی بے تکلفانہ گپ شپ کے دوران مجھے فحش لٹریچر اور اس کے قارئین کے متعلق ایسی معلومات حاصل ہوئیں جنھیں انکشافات کا درجہ بھی دیا جا سکتا ہے۔ موصوف نے اپنے بارے میں بتایا کہ انھیں اپنے سرکاری فرائض کی انجام دہی کے لیے اکثر غیر ممالک جانے کا اتفاق ہوا اور وہیں پر اس قسم کے ناولوں کے مطالعے کا چسکا پڑا جو اب تک برقرار ہے۔ اس کے علاوہ ریٹائرمنٹ اور بڑھاپے کی تنہائی کی شدت رفع کرنے اور گزرے ہوئے خوش گوار دنوں کی یادیں تازہ کرنے کا اس کے علاوہ کوئی اور علاج نہیں اور جب تک بصارت کی رفاقت حاصل ہے، یہ سلسلہ جاری رہے گا۔ پھر موت کے انتظار میں نزع کی کیفیت طاری کرنے کے بجائے زندگی کے باقی ماندہ لمحات کو بے فکری سے کیوں نہ

بسر کیا جائے! اور موصوف کے خیال میں اس کا ایک ہی ذریعہ ہے اور وہ ہے ’ہاٹ‘ ناولوں کا مطالعہ۔ انھوں نے مزید کہا کہ ان کے علاوہ ایسے بہت سے ہیں جو اس طرح ’خوش گوار بڑھاپا‘ گزار رہے ہیں۔

موصوف نے یہ بھی انکشاف کیا کہ گلبرگ میں سینئر حضرات کا ایک کلب ہے، جہاں وہ شام گزارتے ہیں اور اس ضمن میں اپنی معلومات کا تبادلہ کرتے ہیں۔ اس کلب میں کبھی کبھار بلیو فلمز بھی دکھائی جاتی ہیں۔ ان کے بقول گلبرگ ہی کے ایک ہوٹل میں فحش کتابوں کے ’باجماعت‘ مطالعے کا بھی اہتمام ہے اور چوں کہ اس میں بااثر افراد شامل ہیں اس لیے یہ ہوٹل مسلسل ترقی کر رہا ہے۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ سویڈن اور ڈنمارک میں طبع شدہ البم بھی ان کے زیر مشاہدہ رہتے ہیں۔ میرے ایک سوال کے جواب میں موصوف نے بتایا کہ ان کے گھر میں بھی ہر سطح پر یہ زہر پھیل رہا ہے اور وہ اس کی روک تھام کے لیے کچھ نہیں کر سکتے، کیوں کہ ان کے گھر والوں کو خود ان کے اس ’شوقِ مطالعہ‘ کا بخوبی علم ہو چکا ہے۔ ’موت کی طرح زندگی بھی ان گنت مجبوریوں کا مجموعہ ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ برائیاں اور کمزوریاں ہم سب کے لئے ایک ناگزیر مجبوری بن چکی ہیں‘۔ موصوف نے ایک افسردہ مسکراہٹ بکھیرتے ہوئے کہا۔

فحش کتابوں میں ایک قسم تو ان کتابوں کی ہے جو قانونی طریقے سے درآمد کی جاتی ہیں اور انھیں عام کتابوں کی طرح دکانوں اور بک اسٹالوں پر فروخت کیا جاتا ہے۔ گلبرگ اور شارع قائد اعظم پر واقع کتابوں کی اکثر دکانیں اس قسم کے لٹریچر سے بھری پڑی ہیں۔ جو زیادہ تر امریکا سے درآمد کی جاتی ہیں۔ فحش کتابوں کے ناشرین میں ’کورگی‘ اور ’ڈیل‘ بدنامی کی حد تک مشہور ہیں۔ گزشتہ دو اڑھائی سال کے دوران دونوں اداروں کی شائع کردہ اس قسم کی کتابیں بھاری تعداد میں فروخت ہوئیں۔ ’نیکڈ لنچ‘، ’لو مشین‘، ’ویلی آف ڈالز‘، ’دی ڈائری آف اے پروسٹی ٹیوٹ‘ وغیرہ وغیرہ۔ ان کے علاوہ ایک غیر ملکی ادارے نے ’وینس سیریز‘ کے تحت دو درجن کتابیں شائع کیں جن میں ’وینس ان بیروت‘ اور ’وینس ان انڈیا‘ زیادہ مشہور ہیں۔ ان کتابوں میں ان ممالک کے جنسی طور طریقوں اور روایات کو واضح الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔ ان طریقوں اور روایات کا کتاب کی ہیروئن ’وینس‘ خود مشاہدہ و تجربہ کرتی ہے اور انھیں بیان کرتے وقت ان اصطلاحات کا فیاضی سے استعمال کیا گیا ہے جن کا استعمال لغت تک ہی محدود ہے۔

یہ کتابیں زیادہ تر فیشن ایبل آبادیوں کے لوگ خریدتے ہیں جو بعد میں ردی فروشوں کے ہاتھ اخبارات کی ردی کے ساتھ ہی فروخت کر دی جاتی ہیں۔ ایسے ناول ایسے گھروں کی خواتین بھی پڑھتی ہیں اور پھر ان سے ان کی سہیلیاں بھی استفادہ کرتی ہیں۔ چوں کہ فیشن ایبل گھرانوں کے بچے انگلش میڈیم اسکولوں میں تعلیم حاصل کرتے ہیں، ان کے لیے بھی یہ ناول قابلِ فہم ہوتے ہیں۔ اور پھر

ان کے مطالعے سے کچے ذہنوں پر جو اثرات مرتب ہوتے ہیں، اردو میں اس کے لیے کم سے کم 'ہولناک' کی اصطلاح ضرور استعمال کی جاسکتی ہے۔ ہوسکتا ہے چند گھرانے اس سے مستثنٰی ہوں، لیکن آخر کب تک! گلبرگ اور شارع قائداعظم پر واقع بعض دکانوں کے سروے سے یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ فحش اور نیم فحش کتابوں کی فروخت کی رفتار کتنی تیز ہے۔ گلبرگ کی دکان کے ایک سیلز مین نے بتایا کہ اس کی دکان کا دارومدار ہی فحش کتابوں کی فروخت پر ہے۔ دو سو روپے یومیہ سے تیرہ سو روپیہ یومیہ تک کی فحش کتابیں اور رسالے فروخت ہوتے ہیں اور ایک کتاب کی کم سے کم قیمت دس روپے ہے۔ جب کہ باتصویر البم پچاس روپے تک آسانی سے بک جاتے ہیں۔ ان میں مختلف پوزز کی سولہ تا بیس تصاویر ہوتی ہیں اور یہ ڈنمارک میں چھپے ہوئے ہوتے ہیں۔

ڈنمارک اور سویڈن میں چھپے ہوئے رسالے مختلف ذرائع سے پاکستان لائے جارہے ہیں۔ بعض حلقوں کا یہ خیال ہے کہ صیہونی تنظیمیں ان کتابوں، جرائد اور بلیو فلمز کو اسلامی ملکوں میں وسیع پیمانے پر پھیلا رہی ہیں تاکہ پورا معاشرہ بد اخلاقی اور جنسی انارکی کے گرداب میں پھنس کر تباہ و برباد ہوجائے۔ یہ ناول اور رسالے ترکی اور ایران کے علاوہ افغانستان میں بھی عام ملتے ہیں۔ اور وہیں سے ہی اور غیر ملکی سیاح بلکہ پاکستانی خرید کر پاکستان لاتے ہیں اور یہاں منہ مانگے داموں فروخت کردیتے ہیں۔ صوبائی دارالحکومت میں اٹلی، امریکا اور جاپان میں طبع شدہ فحش تصاویر اور کتابیں تاش کے پتوں کے علاوہ قلم تراش، بال پوائنٹ وغیرہ بھی فروخت ہوجاتے ہیں۔ بعض فوٹوگرافروں نے بلیو فلمز کے پرنٹ نکال کر گراں قیمت پر فروخت کرنے کا کاروبار کیا ہوا ہے۔ اگرچہ بعض سینماؤں میں بھی بلیو فلمیں دکھائی جاتی ہیں، لیکن گلبرگ اور شادمان کالونی کے چند شوقین مزاج حضرات اپنے قریبی دوستوں کو مدعو کر کے اپنے پروجیکٹر پر یہ چلاتے ہیں اور یہ حضرات وہ ہیں جنھیں بیرونی ممالک جانے کی سہولت حاصل ہے اور وہ واپسی پر اپنے ساتھ نئی فلمیں لے کر آتے ہیں۔

ایف سی کالج کے سال دوم کے ایک طالب علم سے میں نے پوچھا کہ وہ اپنی نصاب کی کتابوں پر توجہ دینے کے بجائے گندے ناول کیوں پڑھتا ہے، تو اس نے جواب دیا کہ یہ اس کی مجبوری ہے۔ اسے بچپن ہی سے اس کا چسکا پڑ گیا کیوں کہ اس کے والدین بڑی باقاعدگی سے ایسے ناولوں کا مطالعہ کرتے تھے۔ اور ان کے والدین کے پاس ایسی کتابوں کی باقاعدہ لائبریری ہے جس میں دو ڈھائی ہزار منتخب فحش کتابیں اور کم وبیش ایک سو فلمیں ہیں۔ اس نے بتایا کہ اس نے پہلے تو چوری چھپے ان کتابوں کا مطالعہ کیا، پھر جب والدین کو پتا چلا تو انھوں نے نصیحت کی کہ یہ گندی کتابیں ہیں انھیں مت پڑھا کرو۔ جب اس نے جواب میں یہ پوچھا کہ اگر یہ گندی کتابیں ہیں تو پھر آپ کیوں پڑھتے ہیں! اب اس کے اور والدین کے درمیان ایک 'انڈر اسٹینڈنگ' ہوچکی ہے۔ اس نوجوان کے بقول اس کے محلے میں بہت کم ایسے گھرانے ہیں جہاں 'ہاٹ' کتابوں کا داخلہ ممنوع ہو۔

شارع قائداعظم پر ایک سینما کے اندر واقع ایک بک اسٹال کے نوجوان پروپرائٹر نے اس ضمن میں اپنے چھ سالہ تجربے کا نچوڑ یہ بتایا کہ 'ہاٹ' ناول کا مطالعہ اور تصاویر کا مشاہدہ کرنے والوں کو مختلف گروپوں میں تقسیم کیا جاتا ہے: (۱) طلبا وطالبات (۲) معاشرے کے موثر ارکان (۳) ضعیف العمر افراد۔ اس کے مطابق اس کے مستقل گاہکوں کی تعداد ۳۰۰ سے زائد ہے۔ ان میں کتابوں اور رسالوں کے مطالعے کی عادت اتنی راسخ ہوچکی ہے کہ وہ ہر قیمت پر نئی کتابوں کے حصول کی کوشش کرتے ہیں اور اگر نئی کتاب نہ ملے تو پھر پرانی کتاب ہی لے جاتے ہیں۔ یہ صاحب مستقل ممبروں سے پچاس سے پچھتر روپے ماہوار کرایہ لیتے ہیں اور پچاس روپے بطور ضمانت لیتے ہیں۔ زرضمانت واپس لینے والے بہت کم ہوتے ہیں۔ ان کے بقول ایک ممبر مہینے میں اوسطاً پندرہ کتابوں کا مطالعہ کرتا ہے۔

انجینئرنگ یونیورسٹی کے ایک طالب علم نے انکشاف کیا کہ اسے جنسی ناولوں کا چسکا کراچی کے ایک ڈائجسٹ رسالے کی سلسلے وار کہانی کے مطالعے کے بعد پڑا، جس میں ایران کے ایک ہم جنس پرست درندے کی 'آپ بیتی' بڑے ترغیب آمیز انداز میں بیان کی گئی تھی۔' اس کہانی میں اس درندے مجرم کو 'ہیرو' بنا کر پیش کیا گیا تھا۔ یہاں تک کہ موت کے دروازے پر بھی اس نے قانون اور اخلاق کا جس 'بے خوفی' سے مذاق اڑایا، اس نے اس کے ذہن کو بہت متاثر کیا۔ پھر جب کہانی ختم ہوگئی تو اس نے اسی نوعیت کی دوسری کہانیوں کی تلاش شروع کی۔ یہاں تک کہ اس پر انگریزی کے 'ہاٹ' ناولوں کا بند دروازہ کھل گیا اور اب اس نہ ختم ہونے والی سڑک پر چل رہا ہے۔' اس طالب علم نے یہ بھی بتایا کہ وہ کراچی سے شائع ہونے والے دوسرے ڈائجسٹ رسالے بھی وقت گزارنے کے لیے پڑھتا ہے، جن میں جنسی واردات کو بارہ مصالے کی چاٹ بنا کر پیش کیا جاتا ہے۔ اس طالب علم سے میں نے پوچھا کہ آخر وہ انگریزی ناولوں کا ہی مطالعہ کیوں کرتا ہے تو اس نے بتایا کہ اردو ناول تو سراسر بکواس ہوتے ہیں کیوں کہ ان میں سوائے گالیوں کے کچھ نہیں ہوتا اور سب کے پلاٹ یکساں ہوتے ہیں۔ البتہ انگریزی کے ناولوں کا انداز بیان دل کش ہوتا ہے' ان میں زبان کی چاشنی بھی ہوتی ہے اور ہر ناول کا پلاٹ ایک دوسرے سے مختلف ہوتا ہے۔ اس طالب علم نے یہ بھی کہا کہ اس کے محدود مطالعے کے مطابق ان ناولوں کے مصنفین ادب کی دنیا میں کوئی مقام نہیں رکھتے لیکن ان کے قلم میں ذہنوں کو متاثر کرنے کی بھرپور صلاحیت ہوتی ہے شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ برائی ہمیشہ پرکشش ہوتی ہے۔

پاکستان میں فحش کتب وجرائد کی درآمد کے تین بڑے ذرائع ہیں۔ تعلیمی کتابوں کے نام پر درآمد، غیر ملکی سیاحوں کے ذریعے اور ایک منظم گروہ کے ذریعے جس کا کاروبار یہی ہے۔ ناجائز کتابیں اور باتصویر جرائد زیادہ تر کابل کے راستے پاکستان میں درآمد کیے جاتے ہیں کیوں کہ ایران وترکی میں ان کتابوں اور جرائد پر کوئی پابندی نہیں، اس لیے مشاق سیاح اور بزنس مین اسے باآسانی پاکستان لے آتے ہیں۔

کسٹم کے ایک اعلیٰ افسر نے بتایا کہ فحش کتابوں کا کاروبار اتنا منظم اور ہمارے وسائل اتنے محدود ہیں کہ ہم اس پر قابو نہیں پا سکتے حالاں کہ فحش کتابوں پر خاص نظر رکھی جاتی ہے، روزانہ ان گنت کتابیں نذر آتش کی جاتی ہیں۔ اس افسر اعلیٰ نے جو پاک ایران اور پاک افغان سرحد پر کافی عرصے تک اپنے فرائض انجام دے چکے ہیں اور ان دنوں اسلام آباد میں ایک سینئر عہدے پر فائز ہیں یہ اعتراف کی کہ جانچ پڑتال کا نظام غیر موثر ہے سرحدوں پر متعین کسٹمز کا عملہ زیادہ تعلیم یافتہ نہیں ہوتا۔ چناں چہ وہ تصاویر وغیرہ تو فوراً پکڑ لیتا ہے لیکن کتابیں اس احتساب سے محفوظ رہتی ہیں۔ پھر ایسے واقعات بھی پیش آئے کہ کتابیں نہیں جلائی گئیں بلکہ کسٹمز کے بعض افراد نے انھیں اپنے مطالعے کے لیے رکھ لیا اور پھر ان کے ذریعے یہ کتابیں ان کے دوستوں تک پہنچیں اور پھر رفتہ رفتہ مارکیٹ تک بھی پہنچ گئیں۔ اس افسر کے بقول سرحدوں پر کسٹمز نے اتفاقاً مائیکروفلمیں بھی پکڑ لیں جن لوگوں کے قبضے سے یہ برآمد ہوئی تھیں، انھوں نے بتایا کہ وہ یہ فلمیں بعض پبلشروں کے آرڈر پر پاکستان لائے تھے اور انھیں یہ آرڈر سویڈن میں ملا تھا، لیکن انھوں نے جن پبلشروں کے نام بتائے وہ کراچی کے 'فٹ پاتھیے' ثابت ہوئے، انھیں گرفتار کر لیا گیا لیکن ان سے کوئی معلومات نہ مل سکیں، سوائے اس کے کہ وہ یہ کتابیں خود چھاپتے ہیں۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ 'اصل ہاتھ' اب بھی محفوظ ہیں کیوں کہ فٹ پاتھ کے یہ سوداگر اتنے وسائل نہیں رکھتے کہ وہ سویڈن میں ان کتابوں کی مائیکروفلموں کے آرڈر دے سکیں اور نہ بظاہر ان کے پاس اتنا سرمایہ ہے کہ وہ کئی رنگوں پر مشتمل ان کتابوں کو چھاپ سکیں۔ ان کے خیال میں گندی کتابیں اور رسالے خشکی کے راستے ہی نہیں لائے جاتے بلکہ فضائی اور بحری راستوں سے بھی اسمگل کیے جاتے ہیں۔

غیر ملکی جرائد اور کتابوں کی پاکستان میں مقامی طور پر بھی طباعت کا سلسلہ وسیع پیمانے پر جاری ہے، اس لیے ممکن ہے کہ آئندہ بیرونی ممالک سے کتب و رسائل کی اسمگلنگ کا سلسلہ ہی بند ہو جائے۔ یہاں یہ امر قابل ذکر ہے کہ غیر ملکی فحش کتابوں کی سب سے بڑی مارکیٹ کراچی ہے اور وہیں ان کی 'صحیح قیمت' بھی لگتی ہے۔ مثال کے طور پر ایک کتاب کی قیمت ایران و ترکی میں دس روپے ہے تو اس کتاب کی قیمت پشاور میں سو روپے، لاہور میں ڈیڑھ سو روپے اور کراچی میں چار سو روپے فی جلد تک ہوتی ہے۔ بحری اور فضائی راستوں سے لائی جانے والی کتابوں کے متعلق بھی یہی ظاہر کیا جاتا ہے کہ انھیں کوئٹہ یا پشاور کے راستے لایا گیا ہے، لیکن اگر انھی کتابوں کو پاکستان میں شائع کیا جائے تو باآسانی پچاس روپے میں بھی فروخت کی جا سکتی ہیں۔ لاہور میں کئی پبلشروں نے رسوائے زمانہ ناول 'فینی ہل' کو متعدد بار شائع کیا۔ اور لاہور اور اس کے نواحی شہروں میں صرف ایک سال کی مدت میں اس کی تیس ہزار جلدیں فروخت کی گئیں، جب کہ اس کی قیمت بیس روپے تھی۔ 'پلے بوائے' اور دوسرے فحش رسالوں کو بھی پاکستان میں طبع کیا جا رہا ہے اور ان کا معیار طباعت غیر ممالک سے کسی طرح کم نہیں۔

اردو میں فحش لٹریچر کی ابتدا کب ہوئی، اس کے بارے میں مختلف روایات ہیں۔ بعض محققین کے خیال میں 'کوک شاستر' اردو کی پہلی فحش کتاب ہے جسے کسی نام نہاد پنڈت کوکا کی تصنیف بتایا جاتا ہے جو مہاراجہ کشمیر کے دربار سے وابستہ تھا۔ کچھ لوگوں کی رائے میں 'شوخ دلہن کی پہلی رات' یا 'سہاگ رات کی آپ بیتی' جیسی کتابوں نے اردو میں فحش نگاروں کے لیے راہ ہموار کی۔ امانت کی واسوخت اور سینہ بہ سینہ چلنے والے اشعار کو بھی فحش نگاری کے ذیل میں لیا جاسکتا ہے۔ لیکن اردو میں فحش نگاری کا باقاعدہ دور ایک نقاب پوش مصنف 'وہی وہانوی' سے شروع ہے۔ جو ایک فرضی نام ہے اور مستند روایات کے مطابق اس کے پیچھے اردو کے ایک نامور مزاح نویس اور شاعر کی شخصیت تھی۔ جن کے ناول 'گندم'، 'رخسار'، 'شرمناک افسانے' خاصے مشہور ہوئے اور جنھیں لکھنو کے مکتبہ شباب نے بڑے اہتمام سے شائع کیا تھا۔ اسی ادارے نے وہی وہانوی کے اور بھی ناول شائع کیے۔ زبان و بیان کے لحاظ سے بھی یہ کتابیں معیاری تھیں اور کہیں بھی گھٹیاں انداز اختیار نہیں کیا گیا۔ کراچی کے بعض ڈائجسٹوں نے بھی اسی قسم کی جنسی کہانیوں کے لیے وہی وہانوی اول کا طرز بیان اختیار کیا ہوا ہے۔

آج کل وہی وہانوی کے نام سے بے شمار کتابیں منظرِ عام پر آرہی ہیں جو باتصویر بھی ہیں اور بے تصویر بھی۔ یہ کتابیں بالعموم لیتھو طریق طباعت پر چھاپی جاتی ہیں، اور ان کی کتابت کا معیار بھی گھٹیا ہوتا ہے لیکن ۲۰×۳۰/۱۶ سائز سو صفحات پر مشتمل کتاب کی قیمت دس روپے ہوتی ہے۔ مصنف کو ایک سو روپے معاوضہ دیا جاتا ہے اور اس کا مسودہ بالعموم ایک دن میں مکمل ہو جاتا ہے۔ کیوں کہ اس میں محض گالیوں اور جسمانی حرکتوں کو مختلف مقامات پر فٹ کرنا ہوتا ہے اور بس۔ ان ناولوں کے پلاٹ اور واقعات بھی یکساں ہوتے ہیں۔ صرف کرداروں کے نام اور مقام تبدیل کر دیے جاتے ہیں۔ جس طرح ان کتابوں کا معیار پست ہے اسی طرح ان کے قارئین بھی حروف کی شناخت تک محدود ہیں۔ میرے جائزے کے مطابق لاہور میں وہی وہانوی کے پبلشروں کی تعداد چھ کے لگ بھگ ہے جو ہر پانچویں دن ایک کتاب چھاپتے ہیں۔ باتصویر کتابوں کا معیار کتابت و طباعت نسبتاً بہتر ہے۔ انھیں ونڈانگ پر لکھوایا اور چھپوایا جاتا ہے اور ان کی تصاویر انگریزی رسالوں سے کاٹ کر چسپاں کی جاتی ہیں۔ پبلشر اور پریس دونوں کے نام فرضی ہوتے ہیں اور بالعموم ہندوستان کے کسی شہر سے منسوب ہوتے ہیں اس لیے ان کے خلاف کوئی کارروائی ممکن نہیں سوائے اس کے کہ انھیں موقع پر پکڑا جائے۔ برسبیل تذکرہ یہ واقعہ دل چسپی سے خالی نہ ہوگا کہ ہندوستان میں اس قسم کی کتابیں پاکستانی شہروں کے حوالے سے چھاپی جا رہی ہیں۔

جیسا کہ پہلے عرض کر چکا ہوں کہ مواد تقریباً یکساں ہوتا ہے۔ البتہ دو سال پہلے جو کتابیں چھپی تھیں، ان کے آخر میں 'ہیرو اور ہیروئن' کا انجام عبرت ناک دکھایا جاتا تھا اور مصنف صاحب

قارئین کرام کو نصیحت بھی کیا کرتے تھے لیکن اب یہ تکلف ختم کر دیا گیا ہے۔ کتابوں کی ترتیب و تصنیف سے لے کر اشاعت تک کے جملہ مراحل لاہور میں ہوتے ہیں اور یہیں سے پورے ملک میں اس کی تقسیم عمل میں لائی جاتی ہے۔ لاہور سے بڑی مارکیٹ کراچی ہے جہاں کم و بیش اٹھارہ ہزار 'آنہ لائبریریاں' ہیں۔ لاہور میں ان لائبریریوں کی تعداد چار اور ساڑھے چار ہزار کے درمیان ہے۔ ان لائبریریوں کو 'پارٹ ٹائم لائبریریاں' بھی کہا جا سکتا ہے کیوں کہ لائبریریوں کے مالکان ملازمت کے بعد سہ پہر کو یہ کام شروع کرتے ہیں یا کسی پان سگریٹ کی دکان میں بھی کتابوں کی الماری لگا دی جاتی ہے جس میں جاسوسی اور رومانی قسم کے ناول ہوتے ہیں اور جنسی ناول یا دکان کے اندر رکھی ہوتی ہیں اور پھر یہاں سے گھروں میں جاتی ہیں۔ مجھے اندرون بھاٹی دروازہ، باغبان پورہ، شاد باغ اور رنگ محل کی 'آنہ لائبریریوں' کو دیکھنے کا موقع ملا ہے۔ ایک اخبار نویس کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک گاہک کی حیثیت سے۔ میں ان لائبریری والوں سے ملا اور بطور ضمانت اپنے دوستوں کو ان کے پاس لے گیا۔ پھر مجھے گپ شپ کے دوران ان باتوں کا پتا چلا، یا یوں کہنا چاہیے کہ ان باتوں کی تصدیق ہو گئی۔

اصولی طور پر میں آنہ لائبریریوں کے حق میں ہوں کیوں کہ ان کے ذریعے کتابوں کی توسیع اشاعت کا کام لیا جا سکتا ہے۔ اور یہ علم کی روشنی پھیلانے میں نمایاں کردار انجام دیتے ہیں۔ لیکن فحش ناولوں اور فحش تصاویر کے سلسلے میں ان کا کردار انتہائی تباہ کن ہے۔ 'آنہ لائبریریوں والے بالعموم کتاب کی دو دو جلدیں رکھتے ہیں۔ اور ان کا کرایہ پچاس روپے مقرر ہے، جب کہ تصویری البم پانچ روپے تا دس روپے روز کے حساب سے دیے جاتے ہیں۔ کتابوں کا زر ضمانت تین روپے اور پچاس روپے ہے۔ آنہ لائبریریوں کی گاہک زیادہ تر گھریلو خواتین ہیں جو اپنے چھوٹے بھائیوں یا بہنوں سے دکان دار سے کتابیں منگواتی ہیں۔ بلاشبہ ان میں بعض مستثنیات بھی ہیں۔ باغبان پورہ اور آرے بازار کے تین حکیموں نے مجھے بتایا کہ گزشتہ دو ڈھائی سال کے دوران انھوں نے ایک سو اٹھارہ کمسن بچوں کا علاج کیا ہے جو مہلک امراض میں مبتلا تھے اور جو جنسی ناولوں کے کثرت مطالعہ کے جذباتی ردعمل کا نتیجہ تھا۔ انھیں جنسی ناولوں کے مطالعے کی عادت اس طرح پڑی کہ ان سے ان کے گھر والے وہی وہانوی کے ناول منگوایا کرتے تھے، پھر انھوں نے خود بھی یہ ناول پڑھنے شروع کر دیے۔ ایک دس سالہ بچے نے بتایا کہ وہ اپنی باجی کے لیے کتاب لینے آیا ہے اور وہ ہر دوسرے تیسرے دن اپنی کتابوں کے بستے میں چھپا کر کتاب لے جاتا ہے کیوں کہ ان کی باجی نے تاکید کی ہے کہ یہ کتاب کسی اور کی نظر میں نہ آئے۔ کبھی کبھار وہ بھی چھپ کر ان کتابوں کو پڑھ لیتا ہے۔ میں نے اس سے پوچھا کہ ان کتابوں کو پڑھنے کے بعد وہ کیا محسوس کرتا ہے! لڑکے نے جواب دیا کہ ان کتابوں کی بہت سی باتیں میری سمجھ میں نہیں آتیں لیکن ان کے پڑھنے کے بعد اس کا اپنے اسکول کی کتابوں میں دل نہیں لگتا بلکہ اس کا جی چاہتا ہے کہ کچھ نہ کرے۔

باغ بان پورہ کی اسی دکان پر کھڑے ہوئے ایک نوجوان نے کہا کہ 'میاں جی، فحاشی کہاں نہیں ہے! کتابوں میں، رسالوں میں، ڈائجسٹوں میں، سینماؤں کے اندر، سینماؤں کے باہر لگے ہوئے پوسٹروں میں اور بڑے اہتمام کے ساتھ اسلامی کالم چھاپنے والے اخباروں میں بھی۔ آپ کیا سمجھتے ہیں کہ ہم اخبارات کی چالاکیوں کو نہیں سمجھتے! ہم سب سمجھتے ہیں اور جب آپ معلم اخلاق ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں اور لوگوں کو اسلام اور اخلاق کی پیروی کرنے کی تلقین کرتے ہیں تو ہم فوراً اخبار کا وہ صفحہ پلٹ دیتے ہیں جس پر کچھ زیادہ ہی ترغیب انگیز طور پر 'جوانی کے مزے'، 'شوخ حسینہ' اور 'جوبن کے نظارے' جیسی فلموں کے باتصویر اشتہار چھپے ہوئے ہوتے ہیں۔ تب ہم یہ سوچنے لگتے ہیں کہ آخر ان اخبارات کی کس بات پر اعتبار کیا جائے! میں ایمان سے عرض کرتا ہوں کہ جب اخباروں میں عریانی کے خلاف خبریں چھپتی ہیں اور وہ ہمیں نصیحت کرتے ہیں، تو ہمیں ان پر ہنسی آنے لگتی ہے'۔ میں نے گزارش کی 'کیا صرف اخبارات پر! جواب ملا نہیں، میاں جی، ہنسی ان سب پر آتی ہے جو فحاشی کے خلاف تقریریں کرتے ہیں اور مضامین لکھتے ہیں، لیکن عملی طور پر فحاشی کو ختم کرنے کے لیے کچھ نہیں کرتے بلکہ ان کے رویے کی وجہ سے فحاشی کو تقویت ملتی ہے۔

ماخذ (اُردو۔۹۴)

عورتیں کیا پڑھتی ہیں!

مولانا صلاح الدین احمد

س: خوب کا بہت خوب، اچھا مس الف، اب آپ کی پسند کی کتابوں کی بات ہو جائے۔ کیا مجھے بلا تکلف بتا سکتی ہیں کہ آپ کو کس قسم کی کتابیں پسند ہیں؟

ج: جی ہاں میں آپ کو بلا تکلف بتاتی ہوں کہ مجھے ناول، خصوصا رومانی ناول سب سے زیادہ پسند ہیں۔

س: آپ کا مطلب ہے کہ ایسے ناول جو جذبات کو اکسائیں!

ج: میرا خیال ہے جی ہاں۔ میں نہیں جانتی جذبات کو اکسانا کیا ہوتا ہے، لیکن میرا خیال ہے کہ آپ کا کہنا صحیح ہے۔

س: میرا مطلب ایسے ناول جن میں ایک خوب صورت، بہادر ہیرو ہو، اور ایک حسین مگر بے بس لڑکی۔ وہ ناول جو آپ کے دل پر اثر کریں اور انھیں پڑھ کر آپ گھنٹوں خلا میں تکتی رہیں!

ج: جی ہاں، جی ہاں، بالکل یہی۔

س: اچھا تو آپ کو رومانی ناول پسند ہیں۔ مس الف، کیا آپ مجھے یہ بتانا پسند کریں گی کہ آپ نے پچھلے دو تین سال میں اندازاً کتنی کتابیں پڑھی ہیں، اور وہ کس قسم کی تھیں؟

ج: میں نے سبھی قسم کی کتابیں پڑھی ہیں۔ اور مجھے یہ یاد تو نہیں کہ کتنی۔ شاید سو یا اس سے بھی زیادہ۔ میں اور میری سہیلیاں اپنے گھر کے ایک کمرے میں مقفل ہو کر جاسوسی کہانیاں، سنسنی خیز ناول اور بہت ساری مزاحیہ کتابیں، ہم سب ہی کچھ پڑھ ڈالتے تھے۔ مجھے اقرار ہے کہ ان میں ایسی بھی کتابیں تھیں جنھیں ہم سب کے سامنے کھلم کھلا نہیں پڑھ سکتے تھے۔

(عاداتِ مطالعہ کے سلسلے میں ایک غیر شادی شدہ، 18 سالہ سال دوم کی طالبہ کے انٹرویو سے اقتباس)

ماخذ (اُردو۔۷۳)

لڑکیاں اور فحش بینی

زاہدہ حنا

یہ فطرت انسانی ہے کہ انسان کو جس کام سے منع کیا جائے اسے وہ ضرور کرتا ہے اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اس ممنوع کام کے کرنے سے اسے جو لذت حاصل ہوتی ہے، وہ ناقابل بیان ہے۔ یہ بات انسانی سرشت میں داخل ہے اور اس کا اندازہ ہم اس سے لگا سکتے ہیں کہ جب آدم و حوا کو دانۂ گندم سے اجتناب کی تلقین کی گئی تو انھوں نے اس تلقین کو فراموش کر دیا اور دانہ گندم کے شجرِ ممنوع کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

ہمارے معاشرے میں دانۂ گندم کی طرح جنس اور جنسی مسائل بھی شجرِ ممنوع کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بلوغ کو پہنچنے کے بعد جب لڑکے اور لڑکی کے دل میں جنس کے بارے میں سب کچھ جاننے کی شدید خواہش پیدا ہوتی ہے تو اس خواہش کو مذہب اور اخلاقی اصولوں کی آڑ میں بُری طرح کچل دیا جاتا ہے اور پھر کچلے جانے کے بعد یہ فطری خواہش ایک طرف 'بے راہ روی' کی شکل اختیار کرتی ہے اور دوسری طرف شدید جنسی گھٹن کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے۔

'جنس' ہماری زندگی میں ایک حقیقتِ ثابتہ کی حیثیت رکھتی ہے، لیکن ہمارے آبا و اجداد نے جو معاشرہ ہمارے حوالے کیا ہے اس میں جنس جیسی روزمرہ کی چیز 'گناہِ عظیم' ہے تو دوسری طرف اسی معاشرے میں سانس لیتی ہوئی شاعری اور ادب میں جنس، رومانی دھندلکوں میں چھپی ہوئی ایک ایسی آسمانی چیز ہے جس کا ذائقہ ناقابل بیان اور جس کا نشہ ناقابل یقین ہے۔ غرض افراط و تفریط کے اس ہنگامے میں جنس، گناہ، لذت اور شدید رومانیت کا ایک خوب صورت اور دل آمیز مرکب بن گئی ہے۔ اب آپ خود انصاف کریں کہ اس شجرِ ممنوع کی طرف کون سا ہاتھ ہے جو نہیں بڑھے گا اور کون سی آنکھ ہے جو نہیں اٹھے گی!

جنس کے اسی رومانوی اور گناہ آمیز تصور نے فحش ادب کو جنم دیا اور یہ ادب دنیا کے ہر ملک میں اپنا وجود رکھتا ہے۔ سوئیڈن، امریکا، فرانس اور انگلستان جیسے مادر پدر آزاد ملکوں نے تو فحش ادب کی طباعت و اشاعت کو ایک منافع بخش صنعت کی شکل دے دی ہے۔ لیکن چوں کہ وہاں کے عوام و خواص کے لیے جنس نہ تو کوئی انوکھی چیز ہے اور نہ ہی فحش ادب وہاں عنقا ہے، اس لیے ان ممالک میں اس

نوعیت کی کتابیں پڑھنے والوں کے ذہن میں نہ کسی قسم کا تصور گناہ ہوتا ہے اور نہ ہی وہ ایسی کتابیں خریدتے یا پڑھتے ہوئے شرمندگی محسوس کرتے ہیں۔ بلکہ وہاں تو اب 'جنس' اسکولوں اور کالجوں کے نصاب میں شامل کرنے کی مہم جاری ہے تاکہ اگر کچھ لوگوں کے ذہن میں جنس کی طرف سے کوئی رہی سہی جھجک موجود ہو تو وہ بھی نکل جائے۔

یورپ اور امریکا میں جو بھی صورت حال ہے وہ ان کے معاشرے سے لگا کھاتی ہے لیکن اگر میں آپ کو سلطنتِ خداداد پاکستان کے عروس البلاد اور سابقہ دارالخلافہ کراچی میں پڑھے جانے والے فحش ادب کے بارے میں کچھ بتاؤں تو شاید آپ میری بات پر یقین نہ کر سکیں گے۔ مجھے اس بات سے غرض نہیں کہ اس شہر کے نوجوان لڑکے اور پختہ کار مرد اپنی تنہائیوں میں کیا پڑھتے ہیں لیکن ہاں میں اس شہر کی نوجوان لڑکیوں کے زیر مطالعہ رہنے والی کتابوں کے بارے میں ضرور جاننا چاہتی تھی، کیوں کہ مجھے اچھی طرح اندازہ ہے کہ گزشتہ آٹھ دس سال میں ان 'مشرقی' لڑکیوں کا ذوق مطالعہ بہت تیزی سے بدلا ہے۔

آپ یقین کریں یا نہ کریں لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ شہر کراچی کی پڑھی لکھی لڑکیوں کا ایک بڑا حلقہ 'فحش ادب' بہت ذوق و شوق سے پڑھتا ہے اور اس کی بھاری قیمت بھی ادا کرتا ہے۔ یہ جملہ پڑھ کر آپ کا ذہن یقینا خواتین اور لڑکیوں کے اس طبقے کی طرف گیا ہوگا جو امریکی لٹریچر پڑھنے میں طاق ہے۔ لیکن آپ یقین کریں، اس حلقے میں وہ لڑکیاں بھی شامل ہیں جنھیں دیکھ کر آپ ان کی معصومیت کی قسم کھا سکتے ہیں۔

ان لڑکیوں کو 'آنہ' لائبریریاں وہی وہانوی، پیارے لعل آوارہ، لطیف گل، دت بھارتی، سعید امرت، گلشن نندہ اور ریاض ارشد کے ناول فراہم کرتی ہیں۔ ان میں خاص طور پر وہی وہانوی اور پیارے لعل آوارہ بہت مشہور ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہی وہانوی اور پیارے لعل آوارہ کے ناولوں کا کرایہ ایک روپے سے دو اور تین روپے روز تک وصول کیا جاتا ہے۔ یہ ناول ان ہی لڑکیوں کو دیے جاتے ہیں جو خود قابل اعتماد ہوں یا پھر کسی دوسری قابل اعتماد لڑکی نے ان کی ضمانت لی ہو۔ عام طور پر ان ناولوں کا زر ضمانت بھی رکھوایا جاتا ہے، جو پانچ سے لے کر دس روپے تک ہوتا ہے۔ لیکن مستقل اور خاص گاہکوں سے زر ضمانت لینے کی ضرورت نہیں محسوس کی جاتی۔ اور صرف وہی وہانوی یا پیارے لعل آوارہ پر کیا منحصر ہے، آپ کو یہ لڑکیاں دوسرے بہت سے لکھنے والوں کے ناول بھی پڑھتی ہوئی ملیں گی۔ اس قسم کے ناول پڑھنے والیوں کو مصنف کے نام سے کوئی غرض نہیں ہوتی، اصل غرض تو انھیں چٹپٹے اور گرما گرم مواد سے ہوتی ہے۔ ان میں بیش تر ناولوں کے نام اور سرورق عام طور پر ایسے ہوتے ہیں کہ نام اور سرورق سے ہی نفس مضمون کا اندازہ ہو جائے اور طلب گار کو زیادہ بھٹکنا اور پریشان نہ ہونا پڑے۔ ان ناولوں کی تلاش

کے لیے کسی قسم کی تگ و دو کی ضرورت نہیں۔ آپ کسی بھی دن اردو بازار کی طرف نکل جائیں، درسی کتابوں کے علاوہ وہاں کی بیشتر دکانوں پر آپ کو اس قسم کے ناولوں کی بھرمار نظر آئے گی۔ یا پھر کبھی ٹہلتے ہوئے ریگل کے بس اسٹاپ کے سامنے اور فریڈرک کیفے ٹیریا کے قریب جگہ جگہ فٹ پاتھ پر بچھی ہوئی کتابوں کے اسمائے گرامی پر نظر دوڑائیں تو آپ کو خود ہی نفسِ مضمون کا اندازہ ہو جائے گا۔ بلکہ یہ بھی ممکن ہے کہ آپ بھی 'جنسی بلی' یا 'مچلتی جوانی' قسم کی کوئی ناول خرید لائیں گے۔

اور ہاں، ان 'ٹھیلے والوں' کو بھی فراموش نہ کیجیے گا جو گلی گلی گھوم کر 'حیادار' لڑکیوں اور خانہ نشین خواتین کے لیے ان ناولوں کا حصول بہت سہل بنا دیتے ہیں۔ اردو کا فحش ادب پڑھنے والی لڑکیوں کے حلقے میں وہی وہانوی اور پیارے لعل آوارہ کے ناولوں کے علاوہ 'ستارہ'، 'گندم'، 'بیلا'، 'پہلا گناہ' اور 'تنہا راتیں' جو سرگوشیوں سے شروع ہو کر سسکیوں پر ختم ہوتی ہیں، اور لطیف گل کے ناول 'بند کواٹر'، 'رات کی دلہن'، 'بھیگی جوانی'، 'جب جوانی آئی'، ریاض ارشد کی 'آوارہ لڑکی'، دت بھارتی کی 'سوسائٹی گرل' اور گلشن نندہ کے ناول' میں 'آبیلی' مقبول ہیں۔

وہی وہانوی اور پیارے لعل آوارہ کے نام نہاد ناولوں میں خاص طور پر اور بعض دوسرے مصنفین کی کتابوں میں بھی آپ کو جنسی چٹخارے اور بدن کے ذائقے کے سوا کچھ اور ڈھونڈھے سے نہیں ملے گا۔ ان کے یہاں کہانی کا پلاٹ نام کوئی چیز نہیں پائی جاتی۔ ہاں اگر آپ 'جنس' کو ناول کا پلاٹ، مرکزی خیال اور سب کچھ ہی تصور کر لیں تو بات علیحدہ ہے، جنس ان ناولوں میں کوڑیوں کے دام بکتی ہے۔ ان ناولوں کے ہیرو اور ہیروئن دوسرے ناولوں کے مرکزی کرداروں کی طرح عشق نہیں کرتے کیوں کہ عشق شاید ان دو حضرات کے نزدیک ایک بہت ہی مبتذل اور گھٹیا جذبہ ہے۔ ان کے مرکزی کرداروں کو انسانی بدن کے مختلف عضو کے نام گنانے اور جنسی عمل سے ہی فرصت نہیں ملتی کہ وہ اردگرد ہونے والے واقعات سے اثر پذیر ہو سکیں۔ ان ناولوں کو بدن کی شمع سے روشن کیا جاتا ہے۔ لیکن اس کوشش میں بے چارہ ناول نگار جنس زدگی کے اندھیروں اور جسم کے پاتال میں گم ہو جاتا ہے۔ آپ یقین کریں کہ وہی وہانوی اور پیارے لعل آوارہ کے بعض ناولوں کے نام تک اس قدر فحش ہیں کہ وہ یہاں تحریر نہیں کیے جا سکتے۔ اور اب تو ان کتابوں کے بہت 'نفیس، عمدہ' اور 'باتصویر ایڈیشن' بھی بازار میں دستیاب ہیں۔ آفسٹ کی طباعت اور رنگین تصویروں سے مزین یہ ناول بہت مہنگے ہیں لیکن یہ خوب بکتے ہیں اور بہت جی لگا کر پڑھے جاتے ہیں۔ فحش اردو ادب پڑھنے والی لڑکیوں کی بڑی تعداد اسکول اور کالج کی طالبات پر مشتمل ہے۔

فحش اردو ادب پڑھنے کا مجھے کوئی خاص موقع نہیں ملا۔ ایک آدھ کتاب پڑھی بھی تو اُسے پڑھ کر اتنی گھن آئی کہ پھر طبیعت ادھر گئی ہی نہیں۔ ہاں انگریزی کا فحش ادب یقیناً پڑھا۔ سب سے پہلے میں

نے جس 'چیپٹے' انگریزی ناول کا نام سنا وہ 'لیڈی چیٹر لیز لوز' تھا۔ یہ ناول ممنوع تھا اس لیے بہت جدوجہد کے بعد مل سکا۔ یہ انگریزی کا پہلا فحش ناول تھا جو میری نظر سے گزرا۔ اس زمانے میں ذہن کی اڑان جہاں تک تھی اس کے مطابق میرے خیال میں اس سے زیادہ 'عریاں' کوئی ناول ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ 'لیڈی چیٹر لیز لوز' کی ادبی اہمیت تو بہت دنوں بعد سمجھ میں آئی لیکن جب دوسرے بہت سے امریکی ناول اور رسالے پڑھنے کا موقع ملا تو چودہ طبق روشن ہو گئے اور اس بات کا بھی اندازہ ہو گیا کہ ڈی ایچ لارنس تو فرینک ہیرس یا ہیرالڈ رابنز وغیرہ کے مقابلے میں بہت ہی شریف اور پاک باز لکھنے والا ہے۔

اس شہر میں فحش انگریزی کتابوں کا جو سیلاب آیا ہے وہ ناقابلِ تصور ہے۔ آپ کسی بھی بک اسٹال پر چلے جائیں، سامنے لگی ہوئی کتابوں کے سرورق دیکھتے ہی آپ کو اندازہ ہو جائے گا کہ ان کتابوں میں کیا کچھ ہو سکتا ہے۔ اس شہر کی انگریزی داں لڑکیوں اور خواتین کا بہت بڑا طبقہ یورپ اور امریکا سے شائع ہونے والی فحش کتابیں پڑھتا ہے۔ شاید آپ یقین نہ کریں لیکن 'رازہائے درون خانہ' سے واقف حضرات جانتے ہیں کہ اس شہر میں سوئیڈن اور امریکا سے آنے والے 'ایکشن میگزین' کا یومیہ کرایہ دس سے بیس روپے تک ادا کیا جاتا ہے۔ یہ رسائل خواتین اور لڑکیاں بھی لے جاتی ہیں اور انھیں بڑے ذوق و شوق سے پڑھتی ہیں۔ ان رسائل میں کیا ہوتا ہے! اگر میں وہ سب کچھ ضابطۂ تحریر میں لے آؤں تو مجھ پر بھی فحش نگاری کا الزام عائد ہو جائے گا۔ یہ رسائل تو خیر بہت خفیہ طور پر ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ تک منتقل ہوتے ہیں لیکن دوسرے بے شمار رسائل تو آپ کو کھلے بندوں ہر بک اسٹال پر مل جائیں گے۔ ان میں شائع ہونے والی تصویریں بھی دل چسپ ہوتی ہیں اور جو 'آپ بیتیاں' اور سرگزشتیں چھپتی ہیں ان کے کیا کہنے!

اب جہاں تک انگریزی کے فحش ناولوں کا سوال ہے تو یقین کریں اس میدان میں یاروں نے ایسے ایسے کارہائے نمایاں سرانجام دیے ہیں کہ پڑھ کر عقل حیران رہ جاتی ہے۔ اردو کے مقابلے میں انگریزی کے فحش ناول زیادہ پڑھے اور پسند کیے جاتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کانوینٹ میں پڑھنے والی کوئی بھی لڑکی اردو کے فحش ناول نہیں پڑھتی، جب کہ اردو کے ناول پڑھنے والی لڑکیوں کی ایک بڑی تعداد انگریزی ناول بھی پڑھتی ہے۔ اور اس کا بنیادی سبب یہ ہے کہ انگریزی ناولوں میں فحاشی کے ساتھ ساتھ ہی کہانی کی دل چسپی اور تسلسل بھی برقرار رہتا ہے جب کہ اردو کے ناولوں میں کہانی بہت کھوکھلی ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ انگریزی کے ناولوں کی طباعت اور گیٹ اپ بہت عمدہ ہوتا ہے اور ان ناولوں کے زیادہ بکنے اور پڑھے جانے کا ایک سبب یہ بھی ہے یعنی وہ لڑکیاں جو اردو کے ساتھ ساتھ انگریزی سے بھی واقف ہیں وہ کہانی کے تسلسل اور گیٹ اپ کی وجہ سے انگریزی ناولوں کو اردو پر ترجیح دیتی ہیں۔

آج کل ہیرالڈ رابنز انگریزی فحش ناولوں کا بادشاہ ہے۔ اس کا نام ہی کتاب کے چھپنے ہونے کی ضمانت ہے۔ اس کی دو کتابیں 'ایڈونچررز' اور 'کارپیٹ بیگرز' بہت مشہور ہوئیں۔ موخرالذکر ابھی تک 'ممنوع' ہے۔ 'ایڈونچررز' فحش ادب کی اعلیٰ ترین مثال ہے لیکن وہ ممنوع نہیں ہے اور کھلے بندوں بکتی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ اب سے کچھ دنوں پہلے بعض کتاب فروشوں نے 'شائقین' کو بے وقوف بنانے کے لیے اس کتاب کے 'ممنوع' ہونے کی افواہ اڑادی تھی اور پھر اٹھارہ انیس روپے کی یہ کتاب پچاس اور ساٹھ روپے میں فروخت ہوئی۔

ہیرالڈ رابنز لڑکیوں میں بہت مقبول ہے۔ کتب فروش اور لائبریرین حضرات نے بتایا کہ لڑکیاں اس کے ناول بہت شوق سے پڑھتی اور خریدتی ہیں۔ اگر کسی دکان پر ایک ماہ میں 'ایڈونچررز' کی ۲۰ جلدیں فروخت ہوتی ہیں تو اس میں سے تقریباً ۱۲ یا ۱۴ جلدوں کی خریدار لڑکیاں ہوتی ہیں۔ ہیرالڈ رابنز کے بعد جیکولین سوزان کی 'ویلی آف ڈولز' اور سیگل کی 'لو اسٹوری' بہت مقبول کتابیں ہیں۔ 'انجلیک' مکمل طور پر فحش تو نہیں کہی جاسکتی لیکن اس کے بعض حصے یقیناً بہت عریاں ہیں۔ 'انجلیک' اور 'فار ایور ایمبر' یہ دونوں کتابیں دل چسپی کے اعتبار سے ہیرالڈ رابنز کی کتابوں سے کہیں آگے ہیں اور دونوں کتابوں کو پندرہ سولہ سال کی لڑکیاں بھی پڑھتی ہیں۔ بلکہ دونوں کتابیں پندرہ سے بیس برس عمر کی لڑکیوں میں ہی بہت زیادہ مقبول ہیں۔

ایک صاحب نے مجھے بتایا کہ وہ کتابیں جو ممنوع ہیں، مثلاً 'کارپٹ بیگرز' یا اور کئی دوسری ایسی کتابیں تو یہ ناول بہت زیادہ کرائے پر دی جاتی ہیں۔ بعض حالات میں یومیہ کرایا پانچ روپے ہوتا ہے۔ جب کہ عام طور پر ایسی ناولیں ڈیڑھ روپے یا دو روپے روز پر دستیاب ہوجاتی ہیں۔ ان صاحب سے جب میں نے سوال کیا کہ فحش ناول پڑھنے کے سلسلے میں لڑکیوں کا تناسب کیا ہے، تو انھوں نے میرے سامنے اپنے لائبریری کارڈز رکھ دیئے۔ ان میں بیش تر کارڈ لڑکیوں کے ہی تھے۔ ان کارڈوں پر ان ناولوں کے نام درج تھے جو لڑکیاں یا خواتین لے کر جاتی ہیں۔ ظاہر ہے ان پر 'ممنوع' کتابیں تو درج نہیں کی جاتیں، وہ حساب ہی الگ ہوتا ہے، لیکن جو کتابیں ممنوع نہیں ہیں مگر فحاشی کے ذیل میں آتی ہیں۔ ان میں بیش تر کتابوں کے نام ان کارڈوں پر درج تھے۔

آج کل ایک کتاب جو خواتین اور لڑکیوں میں بے پناہ مقبول ہورہی ہے وہ ہے کسی نامعلوم خاتون 'ج' کی لکھی کتاب 'جنسی طور پر پرکشش بننے کے طریقے'۔ یہ کتاب امریکا میں بھی کئی مہینوں تک 'مہینے میں سب سے زیادہ بکنے والی کتاب' کی فہرست میں سب سے اوپر ہی رہی ہے اور یہاں بھی اس کی فروخت خاصی تیز ہے۔ ناولوں کے علاوہ جنس پر طبی اور علمی نقطۂ نظر سے لکھی جانے والی کتابیں بھی بازار میں بھری پڑی ہیں اور ایسی کتابوں کی خواتین اور لڑکیاں خاصی خریدار ہیں۔ شاید اس کی وجہ یہ ہے

کہ لڑکیاں اپنے بارے میں اور اپنے جنسی مسائل سے اتنی ناواقف رکھی جاتی ہیں کہ آخر میں ان کے پاس اس کے علاوہ اور کوئی چارۂ کار نہیں ہوتا کہ وہ ایسی کتابیں خرید کر انھیں پڑھیں اور اپنے مسائل کے حل ان کتابوں میں تلاش کریں۔

ایک بہت محتاط اندازے کے مطابق اس شہر کی انگریزی داں لڑکیوں اور خواتین میں پندرہ سے بیس برس کی ۴۰ فیصد لڑکیاں فحش ناول پڑھتی ہیں۔ بیس سے پچیس برس کی عمر کی لڑکیوں میں یہ تناسب ۴۰ سے بڑھ کر ۶۰ فیصد تک پہنچ جاتا ہے۔ پچیس سے پینتیس برس کی عمر تک یہ تناسب ۴۵ فیصد رہتا ہے اور پھر پینتیس برس سے زیادہ عمر کی خواتین میں بہت نمایاں کمی ہو جاتی ہے اور یہ تناسب ۱۰ سے ۲۰ فیصد رہ جاتا ہے۔

شہر کراچی پر ہی کیا منحصر ہے، یہ کتابیں پاکستان کے دور دراز علاقوں میں پھیلی ہوئی ہیں۔ ان کتابوں نے جنسی محرومیوں اور گمراہیوں کو فروغ دیا ہے لیکن اس کا سبب صرف یہ کتابیں نہیں ہیں بلکہ اس کے ذمے دار وہ افراد بھی ہیں جنھوں نے ان کتابوں کو ممنوع قرار دیا اور اس طرح ان کتابوں سے احساسِ گناہ کو وابستہ کر دیا اور یہ بات ان کتابوں کی لذت میں اضافے کا سبب بنی۔ میں نے بہت سی ایسی لڑکیاں اور لڑکے بھی دیکھے ہیں جو اس نوعیت کے ناول یا دوسری کتابیں کھلے بندوں پڑھتے ہیں۔ وہ ان کتابوں پر نہ تو درسی کتابوں کا غلاف چڑھاتے ہیں اور نہ ہی انھیں چھپا کر رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ہوسکتا ہے آپ میری بات سے اتفاق نہ کریں لیکن میرا ذاتی مشاہدہ یہی ہے کہ ایسے لڑکے اور لڑکیاں نہ شدید نوعیت کی محرومی کا شکار ہوتی ہیں اور نہ ہی ان کے اندر جنسی گھٹن پرورش پاتی ہے۔ اور اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ وہ ان ناولوں کو سرسری طور پر پڑھتی ہوئی گزر جاتی ہیں اور ہیرالڈ رابنز یا باربرا کارٹ لینڈ کے ناولوں میں کچھ بہت زیادہ فرق محسوس نہیں کرتیں۔

جنسی جذبہ دراصل کسی منہ بند برتن میں ابلتے اور کھولتے ہوئے پانی سے مشابہ ہے۔ اگر ابلتے ہوئے پانی کے ساتھ چیختی چنگھاڑتی ہوئی بھاپ کو باہر نکلنے کی ذرا سی بھی راہ مل جائے تو برتن کے پھٹ پڑنے کا اندیشہ بھی ختم ہو جاتا ہے اور بھاپ کا زور بھی ٹوٹ جاتا ہے۔ جنس کے باب میں ہمارے بزرگوں کا رویہ اس حقیقت کے بالکل برعکس ہے۔ وہ جنس کے باب میں نہ ایک لفظ کہنا چاہتے ہیں اور نہ ہی یہ چاہتے ہیں کہ ان کی اولاد بلوغ کی عمر کو پہنچنے کے بعد صحت مند اور خالص علمی سطح پر جنس کے بارے میں چند ضروری باتیں بھی جان سکے تاکہ بہت سے دھوکے نہ کھائے اور نادانی کے سبب عمر بھر کے لیے کسی پچھتاوے کا شکار نہ ہو۔

یورپ و امریکا میں جہاں ان کتابوں کی صنعت قائم ہے وہاں اب یہ کتابیں روزمرہ میں

شامل ہو چکی ہیں۔ ان کے لیے یہ تسلیم شدہ حقیقت ہے کہ ایک کتاب ماں بھی پڑھے اور بیٹی بھی یا باپ اور بیٹے ایک دوسرے کے علم میں ایک ہی کتاب کا مطالعہ کریں۔ سچ تو یہ ہے کہ یہ کتابیں ان ممالک کے پڑھنے والوں کے لیے کوئی خاص کشش نہیں رکھتیں۔ یہ وہاں چھپتی ہیں اور بکتی بھی ہیں لیکن ان کتابوں کی اصل کھپت ایشیا (بالخصوص برصغیر) اور افریقہ کے ان ممالک میں ہے جہاں قدیم و جدید کی کش مکش جاری ہے۔ جہاں پرانی قدریں ٹوٹ رہی ہیں اور نئی اقدار جنم لے رہی ہیں۔

ماخذ (اُردو۔۹۰)

ایک اقرار

مصطفیٰ زیدی

پچھلے کئی برسوں میں اگر میں نے کوئی مطالعہ بالاستیعاب کیا ہے تو وہ دنیا بھر کی پورنوگرافی کا ہے۔ اب سال بھر سے اس نوع کی کتابیں پڑھنے سے بھی طبیعت اکتا گئی ہے۔

ماخذ (اُردو۔۱۲)

فنونِ لطیفہ

مرتضٰی رضوی

rekhta

عُریاں آرٹ اور بُرا آرٹ

مرتضیٰ رضوی

ہمارے یہاں فنونِ لطیفہ کی حیثیت کسی لطیفے سے بڑھ کر نہیں ہے۔ اس پر عذاب یہ کہ فنونِ لطیفہ کو یہاں بھی ایک پڑھی لکھی اقلیت مغرب میں رائج جدید علوم کے بٹواروں میں بانٹ کر دیکھنے کی قائل ہے۔ قصور اس اقلیت کا بھی نہیں کیوں کہ جدید علوم اور ان کے ضمنی بٹوارے ہم نے مغربی تعلیم ہی کے ذریعے سیکھے ہیں۔ جہاں تک فنون کی جانچ کا مسئلہ ہے تو ہمارے یہاں دیگر علوم کی طرح اس میدان میں بھی مخلص تنقید اور مقامی تحقیق کا فقدان رہا ہے۔ اس صورت حال میں فنون لطیفہ میں ذیلی بٹوارے کرنا شاید مناسب نہیں۔ اصل مواد ہی کتنا ہے جسے پورٹریٹ، لینڈ اسکیپ، تجریدی آرٹ وغیرہ وغیرہ کے خانوں میں بانٹ کر دیکھا جائے چہ جائے کہ خالصتاً حسی یا عریاں آرٹ کی بات کی جائے۔ ہمارے یہاں تو بحث کا آغاز اس سوال سے ہونا چاہیے کہ آیا ہم نے پاکستان بننے کے بعد کوئی ایسا آرٹ تخلیق کیا ہے جسے پاکستانی آرٹ کا نام دیا جا سکے! یہ سوال اس امر سے سوا ہے کہ پاکستانی فن کاروں نے پاکستانی بننے کے بعد بہت سا آرٹ تخلیق کیا جسے نئے نقاد مغربی تقسیم کے اصولوں کے تحت ماڈرن، تجریدی اور نہ جانے کیا کیا نام دیتے رہے لیکن کسی ایک محقق یا نقاد نے اسے کوئی ایسا نام نہیں دیا جو خالصتاً ہمارے یہاں تخلیق کیے جانے والے آرٹ یا اس کی کسی انفرادی قسم کو دیا جا سکے۔

خطاطی، پورٹریٹ، خاکہ کشی اور ایسی ہی بہت سی قسم کا آرٹ اتنا ہی قدیم ہے جتنا کہ عریاں آرٹ۔ شاید آرٹ کی ابتدا ہی عریاں آرٹ سے ہوئی تھی اس لیے بہت سے صاحبان صدق وصفا اس پورے موضوع ہی سے خفا دکھائی دیتے ہیں۔ تو جہاں پاکستانی فن کاروں نے آرٹ کی مروجہ نام نہاد قسموں میں طبع آزمائی کی، وہیں عریاں آرٹ کی تخلیق بھی۔ اسی بڑی کینوس پر تصویر کشی میں شامل ہے۔ جس طرح خطاطی کی صنف کی بنیادیں خط کوفی و شکستہ میں تلاش کی جاتی ہیں اسی طرح عریاں آرٹ کی تاریخ بھی ہمارے خطے میں کھاجوراہو، اجنتا اور الورا کے مندروں اور غاروں اور شاید اس سے پیش تر تخلیقات میں بھی کھوجی جا سکتی ہے۔

ہمارے وہ ممتاز فائن آرٹسٹ جنھوں نے اپنا انفرادی اسٹائل تراشا، خالصتاً ٹوول کے اصولوں کے تحت کام کرتے تھے۔ استاد اللہ بخش نے دیہی لینڈ اسکیپ بنائے تو اس لیے کہ وہ یہی بناتا

چاہتے تھے۔ چغتائی نے اپنا منفرد اسلوب مسلمانانِ ہند کے فن کارانہ اثاثے سے مرصع کیا۔ صادقین نے اپنا خاص محاورہ کسی سے سیکھ پوچھ کر نہیں بلکہ اپنے جبلی فن کارانہ تقاضوں کے تحت مرتب کیا۔ اس لحاظ سے شاکر علی، علی امام، احمد پرویز اور زبیدہ آغا ممیز ہیں کیوں کہ ان کے برش سے نکلے ہوئے اسٹروک جدید آرٹ اور جدیدیت کی تھیوری کے تحت پرکھے جاسکتے ہیں۔ ان کے فوراً بعد آنے والے ہم عصر مثلاً بشیر مرزا، اور جمیل نقش اسی جدیدیت کو آگے بڑھاتے دکھائی دیتے ہیں اگرچہ ہر ایک کا اپنا مخصوص انداز اُس کے کام میں نمایاں ہے۔

جہاں تک عریاں آرٹ کا سوال ہے تو متذکرہ بالا فن کاروں میں سے بیش تر نے اس میں طبع آزمائی کی ہے۔ کچھ کا کام باقی رہا، کچھ نے خود ضائع کردیا اور کچھ کا کام پاکستانی تمدن کے نام نہاد دعوے داروں نے اپنی تنگ نظری کے تحت نذرِ آتش کیا۔ آرٹ میں عریانی کیا ہے، یہ ایک الگ بحث طلب سوال ہے۔ ابھی تک مغرب اس کا ایک جملے میں دوٹوک جواب پیش نہیں کرسکا۔ ہمارے یہاں مصیبت یہ ہے کہ ملا بھی خود کو ایک اتھارٹی منوانے پر بضد ہے۔ وہ ہر شے کو خاص طور پر تخلیقی کاوش کو اسلامی اور غیر اسلامی کے لیبل کے تحت تقسیم کرنا چاہتا ہے اور کرتا ہے۔ تو کیا یہ تعجب کی بات ہے کہ ایک ساڑھی میں ملبوس عورت کی تصویر جس کے بلاؤز کے نیچے اس کا پیٹ دکھائی دے اور وہ سر پر پلو رکھ کرتی ساوتری کا روپ نہ دھارے، عریاں قرار دی جائے؟ اس طرح ہمارے یہاں عریانی کا تعلق خود دیکھنے والے کی نگاہ میں شرارت سے تو جوڑا جاسکتا ہے عریانی کو ایک متفق علیہ قدر تصور نہیں کیا جاسکتا۔ عریاں آرٹ کی اصطلاح کو اسی سیاق وسباق میں سمجھنے کی ضرورت ہے۔

اگر رومانوی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو عریاں آرٹ وہ آرٹ ہے جسے لباسِ مجاز کی ضرورت نہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ عریاں آرٹ ہمارے یہاں ایک 'حقیقتِ منتظر' ہی رہی۔ بہت سے رندنما آرٹسٹ جو رومانویت کے زیرِ اثر درویشی اور صدق وصفا کے دعوے دار بھی رہے۔ گو عریاں آرٹ تخلیق کرتے رہے لیکن ساتھ ہی ساتھ اسے منظرِ عام پر نہ لانے کی تدبیر بھی کرتے رہے۔ بہت سوں نے تو یہ تدبیر خاصے جتن اور اہتمام کے ساتھ کی۔ اگر ایسا نہ کرتے تو شاید آج پاکستانی عریاں آرٹ کے بیسیوں شاہ کار ہمارے سامنے ہوتے جو کہیں بند کمروں میں ڈھیروں دھول کے نیچے اپنی برہنگی پر منہ چھپائے سو رہے ہیں۔ افسوس کہ آرٹ کی ہماری چھوٹی سی دنیا میں ایک بھی منٹو پیدا نہ ہوسکا ورنہ دو ایک مقدمے تو اس ضمن میں ہو رہتے۔ ہمارے نام نہاد ماڈرن آرٹسٹ اندر سے جھوٹے نکلے۔ ورنہ کیا وجہ تھی کہ جب آرٹ ان کا lucrative ذریعہ معاش بھی نہ تھا (جو عریاں تحریریں منٹو کے لیے lucrative نہ سہی لیکن اپنے زمانے کے اعتبار سے اس کا ذریعہ معاش بہرحال تھیں)، کیوں کہ آرٹ کا مہنگے داموں بکنا شروع ہونا ابھی کل ہی کی بات ہے۔ انھوں نے اپنے اندر کی اس سچائی سے دامن کشی کیوں کی!

بقول جوش ملیح آبادی کے یہ حضرات شاید اندر سے 'بورژوا' ہی تھے۔ اور جن چیدہ چیدہ آرٹسٹوں پر یہ طعنہ صادق نہیں آتا وہ اس قابل نہیں کہ اُن کے آرٹ کا بطور آرٹ ذکر کیا جائے۔ آرٹ تھیوری پڑھے ہوئے آرٹسٹوں کو بھلا کہاں یہ گوارا ہوگا کہ احمد سعید ناگی کو کسی بھی قسم کا کوئی کریڈٹ دیا جائے۔

دراصل تالاب ہی اتنا چھوٹا ہے کہ اس میں اوّل تو گنتی کی مچھلیاں ہیں دوسرے یہ کہ جن مچھلیوں سے بڑھنے اور پھولنے کی امید کی جاسکتی تھی انھیں تالاب کی تہی دامانی نے اس کا موقع ہی نہیں دیا۔ تیسری اور آخری وجہ یہ سمجھ میں آتی ہے کہ شاید اگر ہمارے آرٹسٹوں کو مندرجہ بالا الزامات سے بری بھی کر کے دیکھا جائے تو ان میں سے کسی ایک میں بھی یہ وژن نہیں تھا کہ بالآخر اسلامی جمہوریہ پاکستان میں بھی ایک دن کوئی نہ کوئی سرپھرا عریاں آرٹ کی تاریخ لکھنے بیٹھ جائے گا اور اسے اُس اور اُس جیسے دوسروں کے نام گنوانا ہی پڑیں گے۔ اس لیے مناسب یہی ہے کہ جس طرح ان حضرات اور شاید ایک آدھ خاتون نے عریاں آرٹ تخلیق کرنے کا کام ایک برائی سمجھ کر، چھپ چھپا کر کیا ان کے ناموں کا تذکرہ بھی چھپا ہی رہے گا۔ یہ اس لیے بھی ضروری ہے کہ جب ان کے کام کا ابلاغ ہی نہ ہوا تو کیا لازم ہے کہ انھیں اس کا کریڈٹ، ستائش یا ملامت کسی بھی شکل میں دیا جائے! جنگل میں مور تو ناچا تھا، لیکن سوال یہ ہے کہ کس نے دیکھا؟ اور جس نے دیکھا یا چھپ چھپا کر بند کمروں میں آج بھی دیکھ رہا ہے، کیا وہ ذمے داری سے اس کا اعتراف کرے گا؟

اس طرح پاکستان میں عریاں آرٹ کی تخلیق کی کہانی بھی اتنی ہی پیچیدہ ہے جتنی کہ ہماری بقیہ تاریخ۔ نئے کام کرنے والے البتہ آرٹ تھیوری کے لبادے میں لپیٹ کر آج بھی عریاں آرٹ تخلیق کر رہے ہیں لیکن اتنا دم کسی میں کہاں کہ ان سے الجھ کر دیکھے۔ یہ تو تھیوری پڑھے ہوئے ہیں۔ تربیت یافتہ نقادوں کے نہ ہونے کے باعث خود ہی اپنے کام کے سب سے بڑے نقاد بھی ہیں اور اس کی عظمت کے دعوے دار بھی۔ یہاں یہ بات واضح کرنے کی اشد ضرورت ہے کہ آرٹ صرف اچھا یا برا ہی ہو سکتا ہے اور یہ کہ تمام عریاں آرٹ بُرے آرٹ کے زمرے میں نہیں آتا۔ اگر عریانی دکھانے کے پیچھے جو مقصد ہے آرٹسٹ اپنی تخلیق میں اس کا ابلاغ کر دے تو یہ عریاں ہونے کے باوجود اچھا آرٹ تصور کیا جائے گا۔ مثلاً جمیل نقش، کولن ڈیوڈ، ناہید رضا، انور سعید اور شازیہ زبیری کی تخلیقات میں عریانی ان فن کاروں کے خیالات کے ابلاغ کا موثر ذریعہ ہیں۔ ان فن کاروں کی تخلیقات کو دیکھ کر چونک جانا یا ان پر وقتی طور پر پریشان ہو جانا اس بات کی دلیل ہے کہ وہ اپنے پریشان کن خیالات کا ابلاغ کرنے میں کامیاب رہے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان مچھلیوں نے تالاب کے پانی سے باہر رہ کر بھی جینا سیکھ لیا ہے یہ چھوٹے تالاب سے نکل کر گھنٹوں ساحل پر ستانے لگی ہیں اور پھر ضرورت پڑنے پر پانی میں لوٹ کر خود کو تازہ دم کرنے کا ہنر سیکھ چکی ہیں۔ امید ہے کہ یہ نئی پود صحیح معنوں میں پاکستانی عریاں آرٹ

کی بنیاد رکھنے میں کامیاب ہو جائے گی بشرطے کہ یہ لوگ خود اپنے کام کے ابطال پر نہ تل آئیں۔

عریاں آرٹ ہمارے گڈمڈ ثقافتی اقدار کے زیر اثر عرفِ عام میں ایک بُرا آرٹ ہی تصور کیا جاتا رہے گا اور یہی امر مانع رہے گا کہ اس کی کسی حد تک ترویج جاری رہے۔ لیکن اندرونِ ملک آرٹ کی کسی حد تک بڑھتی اور پھیلتی ہوئی منڈی اور گلوبلائزیشن کے زیرِ اثر تھوڑی پڑھے ہوئے آرٹسٹوں میں جو ایک نئی آزاد خیالی کی لہر آئی ہے وہ آگے چل کر عریاں آرٹ کو شاید ایک قابلِ قبول آرٹ کا درجہ دلوا سکے۔ جب تک ایسا نہیں ہوتا، عریاں آرٹ پاکستان میں پسِ پردہ ہی رہے گا اور خود اسے تخلیق کرنے والے بھی اس ندامت کا اظہار کرتے ہوئے اپنے فن پاروں کو کسی نہ کسی طرح اس ضمن میں نہ گردانے جانے پر اصرار کرتے رہیں گے۔ یہ وہ قیمت ہے جو عوامی سطح پر منافقت کو فروغ دینے والی قوموں کو بہرصورت ادا کرنا ہی ہوگی۔

(غیر مطبوعہ)

تھیٹر

مدیحہ گوہر

خالد احمد

rekhta

تماشہ جاری ہے

مدیحہ گوہر

۱۹۸۰ء میں ہمارے تھیٹر کی دنیا میں ایک حیرت انگیز نئی لہر پیدا ہوئی۔ ہر قسم کے ناٹک دو بڑے خانوں میں منقسم ہیں یعنی 'کاروباری' اور 'مقصدی' یا 'متوازی ناٹک' دونوں میں یہ واقعی کچھ متضاد سی بات ہے کہ ناٹک کو سب زیادہ چوٹ ایک ایسے سیاہ دور میں لگی جب تقریباً اور تمام سرگرمیاں ایک مبہم پالیسی کے تحت دم توڑ رہی تھیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ قوموں کی تاریخ میں سیاہ دور وہی ہوتا ہے جب تمام تخلیقی سرگرمیوں پر تعصبات اور کٹر پن کے سائے گہرے ہو جاتے ہیں اور جب رقص ایک گالی، مصوری ایک بے حرمتی اور صداقت ایک گستاخانہ فعل کے نام بن جاتے ہیں۔

حُسن و جمال، ثقافت اور فن کی علامات کو فنا کرنے کی اتنی مجنونانہ کوششیں کم ہی دیکھی گئی ہیں اور انھی کوششوں نے بھی کچھ متاثر کیا ہے اور ثقافتی یا تفریحی سرگرمیوں کو ختم کر دینے کے اس جنون کی زد میں معاشرے کا ہر طبقہ آیا۔ دولت مند طبقے سے ان کا کیبرے، ان کا 'ڈسکو' اور ان کی رقص گاہیں چھن گئیں۔ غریبوں سے ان کے میلے ٹھیلوں میں ہونے والے ناٹک چھین لیے گئے۔ میلے جو کسی زمانے میں روایتی تفریح مہیا کرتے تھے، بالکل خشک اور بدمزہ ہو کر رہ گئے اس لیے کہ ان میں ہونے والے ناٹک ختم کر دیے گئے۔ ان کی جگہ زنخوں کی گندی اُچھل کود نے لے لی جو تماش بینوں کو سرکس اور موت کے کنوئیں کی طرف بلانے لگے۔

مقامی فلمی صنعت ایک کڑے احتساب اور 'وڈیو بوم' کی نذر ہو گئی۔ ٹیلی ویژن نہایت بے رحمانہ طور پر سرکاری راگ الاپنے کے لیے استعمال ہونے لگا اور اشفاق احمد کے پیچ دار ڈرامے بھی اپنی کشش کھو بیٹھے کیوں کہ وہ ممبر کی بجائے ٹی وی سے وہی کام لینا چاہتے تھے۔ لوگ کچھ زیادہ ہی سمجھ دار نکلے۔ وہ اس 'مُلّا باکس' کے سامنے بیٹھنے کی بجائے اس کا سوئچ بند کر دیتے۔ رفتہ رفتہ تمام تفریحات کے دروازے بند ہوتے چلے گئے اور بتدریج اور بادلِ نخواستہ ایک ایسی کٹر نظریاتی جنگ کے شکار بنے رہنے کے بعد ہم لوگوں کو اپنی ثقافت اور روایات سے نفرت سی ہو گئی۔ یہ ایک نہایت عجیب و غریب بات تھی کہ پوری ایک نسل اس ماحول میں پروان چڑھتی رہی۔ اور یہ خلا جانتے بوجھتے پیدا کیا گیا جسے بعد ازاں بد صورتی، بھدے پن اور بانجھ پن سے پاٹا گیا۔ بس یوں سمجھئے کہ لوگوں سے ان کی ثقافتی زندگی چھیننے کی کوششوں کا دور شروع ہو چکا تھا۔

یہ کوئی آٹھ نو سال پہلے کی بات ہے کہ سارے شہر میں ہر طرف ہوٹلوں اور ریستورانوں میں، مال روڈ پر، موڑ تک کی تاریک اور بدبور عمارات کی نہایت نچلی منزلوں میں حتیٰ کہ الحمرا کی شان دار عمارت میں، غرض یہ کہ ہر جگہ تھیٹر ہی تھیٹر نظر آنے لگے۔ بہر حال کبھی یہ ہمت تو نہ ہوئی کہ جا کر دیکھا جائے کہ ان ’بدنام‘ جگہوں پر آخر ہوتا کیا ہے لیکن ہم ’متوازی‘ ناٹک والوں کے حلقوں میں جس قسم کے چند ایک چٹکلے سننے میں آئے، پھر تو ہمیں اُن مقامات سے ایک طویل عرصے تک دور ہی رہنا پڑا۔ مثلاً ایک بڑے ہال میں کام کرنے والی نہایت بھرے بدن اور سینے پر گہرے چاک کی قمیض پسند کرنے والی فن کارہ کے بارے میں معلوم ہوا کہ ایک بار وہ فرش سے کوئی چیز اُٹھانے کے لیے نادانستگی میں کچھ اس طرح جھکی کہ دیکھنے والوں کی نظریں اس کے گریبان کے اندر تک پہنچ گئیں اور سارا ہال ’ایک بار اور‘ کی صداؤں سے گونج اٹھا۔ اس نے بھی نہایت پروقار انداز میں یہ فرمائش پوری کی۔ پھر تو یہ حرکت ہر نئی اداکارہ کے ’خزینۂ فن‘ کا ایک حصہ بن گئی۔

پھر اس قسم کی عجیب باتیں بھی سننے میں آئیں کہ ناظرین میں سے بعض گاہکوں کے ساتھ ایک لفظ بھی ادا کیے بغیر صرف آنکھ ملتے ہی کس طرح سودا طے ہو جاتا ہے اور کس طرح فن کارہ کا ایجنٹ اس کے چاہنے والے کے پاس پہنچ جاتا اور یہ سب کچھ ناٹک کے دوران ہوتا ہے اور آخر میں کس طرح چمکیلی کاروں کی روانگی سے پہلے ان کی سواریوں میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ پھر ان گندے جملوں، اشارے بازیوں اور ذو معنی جملوں کے بارے میں بھی بہت کچھ سنا۔ اتنا کچھ سننے کے بعد وہاں جانے کی خواہش کو مزید نہیں روکا جا سکتا تھا۔ بدقسمتی سے اس وقت تک حکام تھیٹر والوں پر عریانی و فحاشی کا سنگین جرم عائد کر چکے تھے جو خود اپنی جگہ ایک اتنی وسیع اصطلاح ہے جس میں ہر وہ چیز شامل تھی جو حکام کو ناپسند تھی۔ پھر ایک ہی رات میں تمام ہال ویران ہو گئے۔ ان پر پیسہ لگانے والے پریشان اور فن کار اپنے بوریے بستر سمیٹ کر وہاں سے چل دیے۔ اور اس طرح دھوؤں کے مرغولوں سے بھرے ہوئے ان ہالوں کو جو ہر وقت ’ایک بار اور‘ کی آوازوں سے گونجتے رہتے تھے، جانے کا سارا مزا ہی غارت ہو کر رہ گیا۔

بہر حال بات یہیں تک ختم نہیں ہوئی۔ آرٹس کونسل کا الحمرا اور اوپن ایئر تھیٹر صرف دو ایسے مقامات تھے جہاں تھیٹر کرنے کی قانونی اجازت تھی۔ اسی دوران ’متوازی‘ تھیٹر بھی جنم لے چکا تھا مگر وہ ابھی تک اپنے کرم فرماؤں کے آگے پیچھے کے لانوں تک محدود تھا۔ حالاں کہ یہ ایک اور کہانی ہے۔ کئی ایک ایسے افسران جو ان ثقافتی مراکز کو چلا رہے تھے، انھوں نے ’کاروباری‘ ناٹک پر قبضہ جما لیا کیوں کہ اب وہ اس منزل پر پہنچ چکا تھا جہاں اسے صرف اس کے پروڈیوسرز کے رحم و کرم پر نہیں چھوڑا جا سکتا تھا۔ افسران کو اپنا حصہ بھی چاہیے تھا۔ یوں بھی ان تمام ڈراموں کی جانچ پڑتال تو انھی افسران کے ذمے تھی

اس لیے وہ کسی ایسی بات کی اجازت دینے کے لیے تیار نہ تھے۔ جس سے مروجہ اخلاقی نظام کو خطرہ لاحق ہو۔ یہاں پر سارا زور اخلاق پر تھا نہ کہ سیاسی بیان بازیوں پر۔ اس لیے اس قسم کا ناٹک رچانے والے ممنوعہ علاقوں میں جانے کی ہمت ہی نہیں کر سکتے تھے، نہ انھیں اس طرح کی ضرورت تھی۔ ان کا مقصد تو خالص تفریح مہیا کرنا تھا، البتہ نہایت ہی گھٹیا درجے کی تفریح۔

مختلف کمپنیوں کی جن میں ہوم ڈپارٹمنٹ کے کلرک سے لے کر کمشنر تک بھی شامل ہوتے، سخت جانچ پڑتال کے علاوہ خود ناٹک کی ادائیگی کا بھی احتساب ہوتا۔ اخلاق کے ان نگہبانوں کے لیے ایک 'خاص شو' منعقد کیا جاتا۔ تاکید اس بات کی ہوتی کہ مکالمات وہی ادا کیے جائیں جو اسکرپٹ میں ہوں اس لیے کہ فن کاروں میں اپنی طرف سے من مانے مکالمے بولنے کا رجحان تیزی سے بڑھ رہا تھا۔ یہیں پر بس نہ کی جاتی۔ پھر کوئی گم نام سا کلرک اصل متن ہاتھ میں تھام کر ناظرین کے ساتھ آ بیٹھتا اور اسٹیج پر ادا کیے جانے والے مکالمات کو غور سے سننے لگتا۔ کھیل ختم ہونے پر اعلیٰ حکام کو ایک رپورٹ بھیجی جاتی جس کے ساتھ اکثر کھیل کی ادائیگی کا ایک ٹیپ بھی شامل ہوتا۔

مگر ان تمام اقدامات کے باوجود من پسند اور ذو معنی مکالمات بولے جاتے رہے کیوں کہ ناظرین یہی کچھ چاہتے تھے۔ کسی کو کہانی سے کوئی دلچسپی نہ تھی اور اس لیے اسکرپٹ کا لکھا جانا تو ختم ہی ہو گیا۔ اداکار ایک دوسرے سے اس بات پر مقابلہ کرنے لگے کہ دیکھیں کس کے جملے سامعین کو زیادہ ہنسنے اور قہقہے لگانے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ اور کسی فن کار کی مقبولیت کا معیار یہی ٹھہرا کہ وہ سامعین کو کتنا ہنسا سکتا ہے۔ اور کتنے مکالمات ذو معنی لفظوں سے بھرے ہوئے۔ ان میں سے کبھی کبھی کوئی فن کار اونچی سوسائٹی کی بداخلاقیوں پر بھی طنز کر دیتا۔ مگر ساری کوششیں پھر بھی مکالموں اور بدن کے بھاؤ کو زیادہ سے زیادہ گھٹیا انداز میں پیش کرنے پر صرف ہوتیں۔

اس طرح تھیٹر کا کام کسی باقاعدہ اسکرپٹ اور ہدایات کے بغیر ہی چلتا ہے۔ نہ سیٹ ڈیزائن میں کسی جدت کی ضرورت محسوس ہوتی ہے نہ روشنی کے سلسلے میں۔ 'بلاکنگ' کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اس لیے تمام فن کار اسٹیج پر ایک خطِ مستقیم کی صورت میں کھڑے ہوئے اپنے اپنے مکالمات ادا کرتے ہیں، بھڑکیلے ملبوسات اور ڈرائنگ رومز کے صوفہ سیٹ اور رنگی ہوئی دیواریں سب کچھ نودولت مندی کی چغلی کھاتے ہیں۔ مختصراً یوں سمجھیے کہ ہر چیز نہایت بے تخیل سی لگتی ہے۔ مگر وہاں جمالیات سے سروکار ہی کسے ہوتا ہے! وہاں تو سننے والوں کے کان بے ہودہ برجستہ گوئی اور دیکھنے والوں کی آنکھیں ان خواتین اداکاراؤں کے بدن کی گولائیوں پر چپکی ہوئی ہوتی ہیں جو انوکھے لباس پہنے روشنیوں میں نہائے ہوئے اسٹیج کو پُر رونق بنائے رہتی ہیں۔ وہی لکیر کے فقیر کردار ہوتے ہیں، سب کچھ صورت حال وہی ہوتی ہے اور پلاٹ اور کرداروں کی نشوونما بالکل نہیں ہوتی۔

جب میں پہلی بار ہمت کر کے اس قسم کے کھیل کو دیکھنے کے لیے الحمرا گئی (کھیل کا نام تو یاد نہیں آ رہا، اس لیے کہ ان کے نام اکثر ایک جیسے ہوتے ہیں) تو ناظرین میں خواتین کی اتنی بڑی تعداد دیکھ کر حیران ہو کر رہ گئی۔ دراصل الحمرا نے اس قسم کے تھیٹر کو معزز بنا دیا تھا اور اب وہ خاندانی تفریح کا ذریعہ بن گیا۔ زیادہ تر دبئی سے لوٹنے والے متوسط گھرانوں کے ناظرین کے لیے سماعت گھر کی ٹکٹ اور اس کے اندر عیاشانہ ماحول میں انھیں اپنی توقیر دکھائی دیتی تھی۔ سب سے نچلی منزلوں کے دھندلے نیم تاریک اور مشتبہ ہوٹلوں کے کمرے تو اب پرانی باتیں تھیں، الحمرا کی تو ہر چیز پر تعظیم کا لیبل چسپاں تھا۔ کھیلوں کا مافیہ نہیں بدلا تھا۔ اسکرپٹس وہی تھے، ہر چیز وہی تھی (اپنی طرف سے جملوں کی ادائیگی)، غلیظ جنسی اشارے، عریانی و فحاشی کے خلاف تازہ ترین احکامات کے باوجود کچھ بھی تو نہیں بدلا تھا۔

ایک بار پھر حکومت کے تحت چلنے والی ان عمارتوں میں ہونے والی عجیب حرکتیں سننے میں آ رہی ہیں۔ مثلاً ان دو اداکاراؤں کے بارے میں جنھوں نے لڑائی کے دوران کھلکھلاتے ناظرین کے بالکل سامنے ایک دوسرے کے کپڑے اتار دیے اور نتیجے کے طور پر کچھ عرصے کے لیے ان دونوں کو اسٹیج پر پیش ہونے سے روک دیا گیا۔ مگر ابھی آگے بھی سنیے۔ ان میں سے ایک محترمہ فلاں جو ایک ایم پی اے کی داشتہ تھی، متعلقہ افسر تک پہنچ گئی۔ عین اس وقت جب وہ اپنا کیس پیش کر رہی تھی، ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ یہ اسی ایم پی اے کی کال تھی جس نے افسر کو محترمہ سے تعاون کے بدلے محترمہ کی عنایات میں شرکت کی پیش کش کی۔ اور پھر اس وقت ہر کسی کی خوشی کی انتہا نہ تھی جب فوری طور پر محترمہ دوبارہ اسٹیج پر پہنچ گئیں۔

'کاروباری' ناٹک یا اسے مقبول تھیٹر کہہ لیں، دنیا بھر میں شروع سے موجود رہا ہے۔ اس لیے کہ وہ ایک بڑی اکثریت کی ضرورت ہے۔ لندن کے ویسٹ اینڈ میں جو کہ دنیا کے تھیٹر کا مرکز ہے، اس طرح کے مزاحیہ خاکے ان ناظرین کو خوش کرتے ہیں جنھیں اس کا ذرا سا بھی تصور نہیں ہوتا کہ خیال انگیز تھیٹر ہوتا کیا ہے۔ لہٰذا اگر ہم ایک آزاد معاشرے میں جینے کے دعوے دار ہیں تو ہمیں اس قسم کے کھیلوں کو اسٹیج کرنے کی پوری اجازت دینا چاہیے۔ آخر اپنی ہی برادری کے اداکاروں اور اداکاراؤں کو جمالیات اور اعلیٰ قدروں کی آڑ میں ذلیل کرنے والی میں کون ہوتی ہوں! میں کسی کی تذلیل نہیں کروں گی نہ ان اداکاروں اور اداکاراؤں کی جن کے لیے یہ ایک منفعت بخش کاروبار ہے، نہ ہی ان نیم پڑھے لکھے پروڈیوسروں کی جو تھیٹر سے پیسہ کما رہے ہیں۔ میں تو حکومت کے ان اداروں کی مذمت کرتی ہوں جو اس قسم کے کھیلوں کی سرپرستی کرتے ہیں۔ کاروباری ناٹک نجی عمارتوں میں ہونے چاہئیں چوں کہ جتنا پیسہ ان سے کمایا جاتا ہے، اس سے تھیٹر بن سکتے ہیں۔ آرٹس کونسلوں کی عمارتوں میں اس قسم کی ثقافتی سرگرمیوں کی اجازت نہیں ہونی چاہیے۔

صورتِ حال واقعی افسوس ناک ہے کیوں کہ اب اس قسم کے کھیلوں کو سرکاری سرپرستی حاصل ہے۔ ضابطہ پرستی کی جہاں تک بات ہے، تو الحمرا کے چار ہال اگلے دو سالوں تک بک ہو چکے ہیں۔ اگر آپ کو اس عرصے سے پہلے ہی کسی ہال کی ضرورت ہے تو سرکاری افسران سے رابطہ کریں۔ تاریخ آپ کو بھیج دی جائے گی۔ قذافی اسٹیڈیم کی نچلی منزل کی تعمیر کے بعد اس بات کی امید ہو چلی تھی کہ وہاں پر زیادہ بہتر قسم کے کھیلوں کی حوصلہ افزائی ہو گی مگر کاروباری تھیٹر کے مافیا نے وہاں بھی اپنا قبضہ جمالیا ہے۔ کیا بتاؤں، اتنے خوب صورت اور تمام سہولتوں سے آراستہ آڈیٹوریم کو اتنی بے دردی کے ساتھ غلط طور پر استعمال ہوتا دیکھ کر میرے دل پر کیا گزرتی ہے! روشنی کے سلسلے میں ان جدید اور پیچیدہ آلات کی وہاں ضرورت ہی کیا تھی جب انھیں کوئی استعمال ہی نہیں کرتا! اتنے بڑے اسٹیج بنانے کی ضرورت ہی کیا تھی جب کہ ساری ادائیگی تو اس چھوٹی سی جگہ میں ہو چکتی ہے جو فارمولہ ڈرائنگ روم سے بڑی نہیں! اور آخر اتنے دقیق صوتی نظام کی ضرورت ہی کیا ہے جب آپ کو سننا تو صرف قومی ترانہ ہے!

کاروباری ناٹک اس لیے پھل پھول رہا ہے کہ اسے ہمارے نام نہاد ثقافتی اداروں کا عملی تعاون حاصل ہے۔ یہ حقیقت کہ ان عمارات کو بے معنی تفریح کے فروغ کے لیے استعمال کیا جا رہا ہے، یہ محض حادثہ نہیں۔ بلکہ یہ تو ثقافت دشمنی اور ہر حسین شے کو عامیانہ رنگ دینے کا نام ہے۔ اس قسم کے ناٹکوں سے نظام کو کوئی خطرہ لاحق نہیں۔ یہ تو کچلے ہوئے جذبات کی نکاسی کا ایک ذریعہ ہے جس سے کئی افسران کی تجوریاں بھی بھر جاتی ہیں۔

ماخذ (انگریزی۔ 45)

اور پھر بغلیں بجائی گئیں

منافقت کے ایک اور حقارت آمیز مظاہرے کے دوران، حال ہی میں پنجاب پولیس نے بعض تھیٹروں پر چھاپے مارے اور کئی فن کاروں کو گرفتار کرلیا۔ ‘گواہی’ پولیس افسران نے (جنھیں ہائی کورٹ کے پاس کردہ اکثر تلخ قسم کے ضمنی اظہارات کے مطابق ‘مہذب ترین’ سرکاری افسران میں شامل نہیں کیا جاتا) نبھا کی۔ کھچا کھچ بھرے ہوئے ہال میں یہ پولیس والے بھی بیٹھ گئے تا کہ وہ یہ طے کریں کہ ان مزاحیہ فن کاروں کے منہ سے نکلے ہوئے ‘ذو معنی’ الفاظ اتنے ‘عریاں’ ہیں کہ یہ پاک ملک اُن کا متحمل نہیں ہوسکتا۔ اور پھر وہیں بیٹھے بیٹھے انھوں نے فوراً ہی یہ بھی دریافت کرلیا کہ ‘فحاشی’ کا جرم سرزد ہوچکا ہے، خصوصاً اسی تواتر میں دکھائی جانے والے ‘بالٹی’ ڈانس کی وجہ سے جسے دیکھ کر (پولیس والوں) کے جذبات بھڑک اُٹھے تھے۔ پھر پولیس نے ان اداکاروں کو اپنے مخصوص بے رحمانہ انداز میں پکڑنا شروع کردیا۔ خوف کے مارے اور پریشان ناظرین چلاتے ہوئے، پناہ کے لیے ادھر سے اُدھر بھاگنے لگے۔ اداکارائیں کچھ زیادہ ہی کرب میں تھیں کیوں کہ انھیں معلوم تھا کہ پولیس جو ہمارے ناموس کی نگہ بان ہوتی ہے، ان مواقع پر انھیں کس بُری طرح باہوں میں لے کر پکڑتی ہے!

بعدازاں، حکومتِ پنجاب نے اُردو محاورے کے مطابق اپنی بغلیں بجاتے ہوئے شہریوں کو مطلع کیا کہ کٹر قسم کے مُلّا حضرات کی طرف سے اس کے ماتھے پر لگایا جانے والا ‘آزاد خیالی’ کا ٹیکا بالکل نامناسب ہے۔ بلکہ حقیقتاً پیغام تو یہ تھا کہ جنرل پرویز مشرف کی حکومت ان معاملات میں اتنی ہی سخت گیر ہے جتنی جنرل ضیا الحق کی اور بعد میں آنے والی وہ حکومتیں جنھوں نے اپنی آنکھوں پر نظریاتی اندھیریاں باندھ رکھی تھیں……

تفریحی صنعت پر ان کڑی پابندیوں کو، توقع کے مطابق اُردو کی ‘جی حضوری’ صحافت میں بڑے زور و شور سے سراہا گیا۔ مگر کچھ اُردو اخبارات میں اس طرح کے تبصرے آئے کہ لاہور کے تھیٹروں میں برپا ہونے والی یہ ‘عریانی’ دراصل جنرل پرویز مشرف کی ‘رواداری’ کا کارنامہ ہے، حالاں کہ یہ بات درست نہیں۔ لاہور کا کامیڈی تھیٹر تو جنرل ضیاء الحق کے دور میں وجود میں آیا تھا اور پھر اُسے ان شہریوں نے زندہ رکھا جو پاکستان کی پارسا مملکت میں اپنی زندگی کی بوریت سے تنگ آچکے تھے۔ لاہور کے یہ فی البدیہہ کھیل تماشے تو پچھلے بیس برسوں سے سامعین کو اپنے ذومعنی مکالموں کی وجہ

سے اپنی طرف کھینچتے رہے تھے اور پھر یہ کہ ساری دنیا میں ہی، ذو معنی جملوں کا استعمال تو نہ جانے کب سے چلا آرہا ہے۔

شُکر ہے کہ اس بات پر نہ کوئی خوش ہوا اور نہ کسی کو غم ہوا کہ پاکستان کے شاعر، فلسفی علامہ اقبال کے صاحب زادے جسٹس (ریٹائرڈ) جاوید اقبال نے لاہور کے ایک اخبار کو بتایا کہ تفریح مہیا کرنے والوں کی یہ بے رحمانہ گرفتاری، دراصل لوگوں کی ثقافتی آزادی پر ایک نامناسب حملہ ہے۔ انھوں نے فرمایا کہ رقص و موسیقی کے خلاف کوئی نصِ قرآنی موجود نہیں۔ اور اگر پاکستان میں حکومتیں تفریحی صنعت کے ساتھ یہی برتاؤ کرتی رہیں تو معاشرے میں صرف طفلِ دماغ پیدا ہوں گے۔

پولیس کی زیادتیوں کا شکار ہونے والیوں نے کچھ کہنا چاہا مگر ان کی بالکل نہیں سنی گئی۔ حالاں کہ ان کا جرم تو صرف یہ ہے کہ انھوں نے مسرّت کے ایسے متلاشیوں کو تفریح مہیا کی جو اپنی بے رونق اور تکلیف دہ زندگیاں اُن تشدد آمیز جرائم کے خوف میں بسر کرتے ہیں جن کے بارے میں پولیس کچھ نہیں کرتی۔ امرِ واقعہ یہ ہے کہ کچھ اداکار پولیس کی ان بدسلوکیوں سے اتنے بددل ہوئے کہ وہ اپنے پیشے سے ہی سبک دوش ہو گئے۔ 'بھارتی' تفریحات پر پابندی کے سلسلے میں حکومت کے آمرانہ احکامات کے بعد تو ویسے بھی کیبل چینلو میں کمی آگئی مگر انھیں بھی تھیٹر والوں کی وڈیو فامیں دکھانے سے منع کر دیا گیا۔ اور یہ سب کچھ اس کے باوجود ہو رہا ہے کہ ناظرین ان مزاحیہ کھیلوں کو فحش بالکل نہیں سمجھتے کیوں ہماری دنیا میں تو کئی صدیوں سے اس طرح 'بازاری' جملوں کا تبادلہ ایک عام سی بات رہی ہے۔

پاکستان میں پائی جانے والی 'آزادانہ روی' کی علامت، اُس کے معنی سمجھے بغیر یا اس کا کوئی متبادل چنے بغیر ایک فیشن بن کر رہ گئی ہے۔ انتہا پسندی اور آزادانہ روی کی بجائے 'اعتدال' کی درمیانہ راہ کے بارے میں سنی جانے والی بھنبھناہٹ، ایک نامناسب سی بات ہے کیوں کہ میانہ روی کچھ بھی نہیں وہ صرف آزادانہ روی ہے جس طرح انتہا پسندی کچھ بھی نہیں سوائے بنیاد پرستی اور دہشت پسندی کے۔

اب حکومت کیا کرنا چاہتی ہے! سینما ہالوں پر قانون کا سختی سے نفاذ! نجی محفلوں پر چھاپے! نوجوانوں کو گھروں میں رہنے کا حکم! یا پھر اس سے بھی بدتر بات یہ کہ 'بداخلاقی' اور 'عریانی' کو صرف اونچے اور طاقت ور لوگوں کی چار دیواری کے اندر دھکا تا کہ وہ امتیازی نظام مضبوط تر ہو سکے جس نے ایک نظریے کے نام پر عوام کی صلاحیتوں کا گلا گھونٹ رکھا ہے! آخر، اس وقت کیا ہوگا جب ان شہریوں نے جن کو ان لعنتوں سے بچانا مقصود ہے، جبر اور تشدد کی راہ اپنالی!......

ماخذ (انگریزی-15)

پارسی سے 'پارسا' تھیئٹر تک

خالد احمد

تھیئٹر نام کی کوئی نہ کوئی چیز پاکستان میں موجود رہی ہے، مگر جنرل ضیا کی 'پاکیزہ' آمریت کے دور میں ایک نئی قسم کے 'فحش' تھیئٹر نے طرّارے بھرنا شروع کر دیے۔ بیماری تو یہی غیر لچک دار پارسائی تھی جس کی وجہ سے آج بھی مختلف فرقوں کے لوگ ایک دوسرے کو قتل کر رہے ہیں نہ کہ جدید تھیئٹر کی عُریانی جو زہریلی نہیں بلکہ قوت بخش تھی۔ لیکن آج کل جب ہم تھیئٹر پر گفتگو کرتے ہیں تو وہ ریاکارانہ پارسائی کے بوجھ تلے اتنی دبی ہوئی ہوتی ہے کہ ہم اپنے تھیئٹر کو 'پارسا' تھیئٹر بھی کہہ سکتے ہیں۔

٩ر اپریل ٢٠٠٥ء کو 'جیو' نے پاکستان میں تھیئٹر کی صورتِ حال پر ایک پروگرام نشر کیا جس میں تھیئٹر والوں کی بھی اچھی خاصی نمائندگی ہوئی۔ اس موقعے پر پروفیسر رؤف نے میزبان کے طور پر مختلف خیالات رکھنے والے اُن سامعین سے بھی بات چیت کی جن میں خالد عباس ڈار، کمال احمد رضوی، اطہر شاہ خان جیدی، ببّو اور البیلا جیسے مشہور لوگ شامل تھے۔ اخلاق پرستوں کی اس رائے کہ تھیئٹر کے کئی روایتی پہلوؤں پر پابندی عائد کی جائے کے ساتھ ہی ان لوگوں کی رائے بھی سامنے آئی جنھوں نے پارسائی کا دم بھرنے والوں کو وہ بات یاد دلائی جسے پاکستان میں کیبل ٹیلی ویژن اور سینما کا ہر دیکھنے والا جانتا ہے۔

تنقید کرنے والے متن پر اصرار کرتے رہے جو کسی نہ کسی طرح بعد میں ایک اچھے تھیئٹر کے لیے واحد معیار بن کر رہ گیا۔ کچھ لوگ اس بات کو بُرا بھلا کہتے رہے جو اُن کے خیال میں نظریۂ پاکستان سے وفاداری کے فرض سے کوتاہی برتنا تھا مگر کمال احمد رضوی نے یہ کہہ کر نبض پر ہاتھ رکھ دیا کہ تھیئٹر سب سے پہلے ایک (قسم کی) تفریح ہے۔ اس پر 'پارسا' قسم کے لوگوں نے تھیئٹر میں بولے جانے والے ایسے مکالموں پر جو اُن کے نزدیک فحش تھے، لمبے چوڑے اور نہایت سخت اعتراضات کرنا شروع کر دیئے۔ جو بات اُبھر کر سامنے آئی وہ یہ تھی کہ ماضی میں سنجیدہ ڈرامے دکھائے جاتے تھے مگر اب صرف کامیڈی کی مانگ ہے۔ بعض لوگوں نے پوچھا کہ کیا صرف تھیئٹر ہی کے ذریعے پیسہ کمایا جاسکتا ہے! ایک صاحب کو جو کراچی تھیئٹر سے متعلق تھے، شکایت کی تھی کہ لاہور میں تو کئی ایک تھیئٹر ہیں مگر کراچی میں حکومت نے ایک بھی تھیئٹر بنا کر نہیں دیا اور نجی شعبے کو اس میں دلچسپی نہیں جب کہ تھیئٹر تفریح کا سامان بھی مہیا کرتا ہے۔ ایک غصیلی خاتون نے تو یہ سوال کر لیا کہ کیا بیویاں اپنے گھروں میں

شوہروں کو مناتے وقت ان کے سامنے ناچتی ہیں!

بہت سارے لوگوں نے وہی فرسودہ قسم کی باتیں دہرائیں، مثلاً یہ کہ کیا خاندان کے لوگوں کے سامنے ایسی باتیں بتانا چاہئیں! (ان کے خیال میں) جو باتیں گھر میں نہیں ہو سکتیں، انھیں تھیٹر میں بھی نہیں ہونا چاہیے۔ پھر کسی نے پوچھا کہ کیا تھیٹر میں ہر وہ بات دکھانی چاہیے جو عوام چاہتے ہیں! پتا چلا کہ سنسر ابھی تک برقرار ہے کیوں کہ سرکاری افسران تو اس کو دیکھتے ہیں۔ پنجاب میں ہر سال پچاس لاکھ لوگ تھیٹر دیکھتے ہیں جن کو بس ’جگت‘ (ذو معنی بات) اور کامیڈی چاہیے۔

پارسی تھیٹر جسے آغا حشر کشمیری بمبئی سے لائے تھے، ۱۹۲۰ء میں لاہور میں آ کر پھلا پھولا۔ آغا جی نے شیکسپیئر کے کچھ ڈراموں میں بھی حصہ لیا تھا جن کا بمبئی اسٹیج کے لیے باقاعدہ ترجمہ کروایا گیا تھا۔ ان پارسی حضرات کو اُردو ڈرامے بنانے کا ایک جنون سا تھا۔ بمبئی میں اس سب کچھ کی شروعات ۱۸۴۰ء میں اس وقت ہوئی جب کچھ معتبر شہریوں نے (وہاں کے) گورنر سر جیمز کارنیک کو ایک باقاعدہ درخواست کی کہ وہ تفریحی ڈرامے مہیا کرنے کے لیے ایک تھیٹر کی تعمیر میں ان کی مدد کریں۔ ان درخواست گزاروں میں دو بڑے نام جگن ناتھ شنکر سیٹھ اور فرامجی کاؤس جی کے تھے۔ حکومت نے مالی امداد کا وعدہ تو کر لیا مگر پیسے کبھی نہیں دیے۔ پھر یہ ہوا کہ جگن ناتھ نے گرانٹ روڈ پر واقع اپنی زمین اس مقصد کے لیے عطیہ کر دی جب کہ کم پڑنے والی رقم مشہور جام سیٹھ جی، جی جی بھوئے نے اپنے طرف سے ادا کر دی۔

اس طرح ۱۸۵۳ء میں گرانٹ روڈ پر تھیٹر رائل کے نام سے ایک عمارت بنی جہاں مہا بھارت سے ماخوذ ڈرامے دکھائے جانے لگے۔ مگر پھر جلد ہی پارسیوں نے غیر مذہبی ڈرامے پیش کرنا شروع کر دیے اور اس طرح آنے والے تیس (۳۰) سالوں تک اس تھیٹر پر ان کا تسلط قائم رہا۔ جب آغا حشر اس پارسی تھیٹر کو لاہور لے کر آئے تو یہ سب باتیں ہمیں ہمارے بڑوں نے بتائیں۔ ان ڈراموں میں ناچ اور گانا دونوں شامل تھے۔ پھر جب سینما آیا تو ناچ اور گانے کی یہی روایت اُسے ورثے میں مل گئی۔

ہماری ملکۂ ترنم بننے سے پہلے نور جہاں یہی ناچ اور گانا کیا کرتی تھیں جسے ہم ’مجرا‘ بھی کہتے ہیں اور جو آج بھی موجود ہے۔ اب تو ہمارے پاس اپنا تھیٹر موجود ہے جو پاکستان ہی میں پلا بڑھا ہے اور جس کی بنیاد کامیڈی پر رکھی گئی ہے۔ یہ اُسی قسم کی کامیڈی ہے جو شیکسپیئر کا مشہور گوز زدہ کردار فالسٹاف کیا کرتا تھا اور جس میں انگلستان کی جھوٹی پارسائی پر مخول جھڑیاں چھوڑی جاتی تھیں۔ (انگلستان کے جنرل ضیاء، اور مارشل لا ایڈمنسٹریٹر اولیور کرام ویل کا کاسۂ سر پورے پچیس سال تک ویسٹ منسٹر کے شاہی دروازے کی رونق بنا رہا۔ پھر اس کی لاش کھدوائی گئی اور اس کا سر تن سے جدا کر دیا

گیا)۔ اگر ہمارا اعتراض انگلستان کے قدیم سماجی معیاروں پر ہے تو یہ سوچ لیں کہ متن سے ہٹ کر اپنی طرف سے فی البدیہہ اضافے کی روایت ہماری اپنی ہے اور ہماری روایت میں ناچ گانا اور فی البدیہہ 'جگت' بھی کچھ شامل ہے۔

۱۹۹۰ء میں جب مؤرخ پیچھے مڑ کر ہماری طرف دیکھتا ہے تو اُسے صرف ایک چیز جو اچھی نظر آتی ہے وہ مزاحیہ کامیڈی اور فی البدیہہ تھیٹر ہے جسے اب ہم اسلامی جامہ پہنانا چاہتے ہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ہم ترقیٔ معکوس کر کے اور ایک نظریہ کے ٹھیکے دار بن کر دوبارہ قبائلی زندگی کی طرف لوٹنا چاہتے ہیں یعنی پارسی تھیٹر سے پارسا تھیٹر کی طرف، ہے نا یہی بات!

ماخذ (انگریزی۔28)

تھیٹروں پر پولیس کے چھاپے

خالد احمد

یہ حقیقت اب کسی تبصرے کی محتاج نہیں کہ گجرات کی پولیس ایک عام آدمی کو کس طرح ذلیل اور فن کاروں کے ساتھ کس بُری طرح پیش آتی ہے۔ افغانستان کے طالبان کے بعد، گجراں والا، پاکستان کا وہ مقام ہے جو فنون کے لیے انتہائی خطرناک ہے۔ ۱۷؍اگست ۲۰۰۵ء کو جیو ٹی وی نے گجرات کی ثقافت دشمن پولیس کے ایک حالیہ چھاپے پر نہایت ہی بروقت مباحثے کا اہتمام کیا۔ پروگرام کے میزبان، انجم رشید نے اُن تینوں فریقوں کو مدعو کیا تھا جو اس واقعے میں ملوث تھے۔ یعنی گجرانوالا آرٹس کونسل کے سربراہ جناب لکھ ویرا جو ڈراما ایکٹ ۱۹۷۶ء کے تحت مختلف مقامی تھیٹروں کی نگرانی کرتے ہیں، گجرات پولیس کے سربراہ راجہ منور حسن اور وقار حسین جو اُس تھیٹر کے مالک ہیں جس پر حملہ کیا گیا تھا۔

پولیس کے حملے کے وقت کوئی چھ سو افراد تھیٹر میں شو کو دیکھنے میں معروف تھے جب کہ پولیس کی جس جماعت نے حملہ کیا اس میں پورے تین سو جوان شامل تھے۔ چھاپہ پڑتے ہی ایک بڑی بھگدڑ مچ گئی اور یہ تمام شہری صرف ایک تھیٹر شو دیکھنے کی پاداش میں پولیس کی مار اور اُن کے ہاتھوں ذلیل ہونے سے بچنے کی خاطر اِدھر اُدھر بھاگ نکلے۔ ان میں سے ۲۹۰ افراد جو پکڑ لیے گئے پولیس اُن کو تھانے لے گئی جہاں ان کے خلاف مقدمہ قائم کیا گیا۔ پولیس نے تمام فن کاروں کو جن میں اداکارائیں بھی شامل تھیں، ان سب کو نہ صرف ذلیل کیا گیا بلکہ اُن کے ساتھ زبردستی بھی ہوئی۔

وقار حسین صاحب نے بتایا کہ تھیٹر پر حملہ، پہلے سے طے شدہ ایک منصوبے کے تحت کیا گیا جس میں پولیس سربراہ شامل نہ تھے۔ انہوں نے فرمایا کہ حالاں کہ وہ پچھلے تین سالوں سے اس تھیٹر کو چلا رہے ہیں مگر وہاں کے کسی شہری نے ان کے خلاف کبھی کوئی شکایت نہیں کی۔ آرٹس کونس کے سربراہ جناب لکھ ویرا نے تو کھلم کھلا یہ الزام عائد کیا کہ پولیس کے سربراہ نے بغیر کسی قانونی جواز کے یہ حملہ کروایا۔ اور پھر یہ بھی کہ یہ حملہ پولیس کے کچھ اعلیٰ افسروں کے حکم کے تحت ہوا تھا تاکہ اسے تباہ کر دیا جائے۔ لیکن حقیقت میں تو اس حملے کے پیچھے جو نیت تھی وہ یہ تھی کہ ایک اور تھیٹر کو بچا لیا جائے جس کے خلاف عریانی کے الزام کی بنا پر ہوم ڈیپارٹمنٹ کو شکایت بھی ملی تھی۔

جناب لکھ ویرا نے اس بات کی وضاحت کی کہ تمام تھیئٹر آرٹس کونسل کی نگرانی میں چلائے جاتے ہیں اور ان سب کے بارے میں رپورٹیں براہ راست ہوم ڈیپارٹمنٹ کو بھیجی جاتی ہیں۔ اور پھر کوئی شکایت ملنے پر یہ محکمہ اُن کے خلاف براہِ راست اقدام کرتا ہے جس میں پولیس شامل نہیں ہوتی۔ انھوں نے فرمایا کہ حیرت کی بات تو یہ تھی کہ جس تھیئٹر کے بارے میں شکایت موصول ہوئی تھی اور جس پر ہوم ڈیپارٹمنٹ کی طرف سے کاروائی متوقع تھی اس کی بجائے ایک اور ہی تھیئٹر پر بھر پور حملہ کر دیا گیا جس کے خلاف کوئی شکایت نہ تھی۔

پولیس کے سربراہ منور حسن نے تو صرف اخلاقی دلیل کا سہارا لیا اور بولے کہ جوان خراب ہو رہے ہیں، معاشرہ خراب ہو رہا ہے، کیا ہم مسلمان نہیں ہیں! جن دیکھنے والوں کی پٹائی ہوئی اُن پر 'اہلِ ذوق' کی پھبتی کستے ہوئے وہ بولے کہ یہ فن کارائیں اُن کے سامنے 'ننگے' ناچ پیش کر رہی تھیں۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ وہ تو تمام کے تمام چھ سو ناظرین کو گرفتار کرنا چاہتے تھے مگر اُن میں سے بہت سارے لوگ بھگدڑ کی وجہ سے بھاگ نکلے۔ انھوں نے کہا کہ ١٤٠ ملین کی آبادی میں چھ سو افراد کی کوئی حیثیت نہیں۔

ٹیلی ویژن پر پولیس حملے کا منظر بھی دکھایا گیا جس سے پولیس سربراہ پر لگائے جانے والے الزام کی تائید بھی ہو رہی تھی۔ اور تھیئٹر کے ملازمین اور اداکاراؤں کو دیکھ کر یہ بات صاف ظاہر ہو رہی تھی کہ یہ سب کچھ ان غریبوں کے لیے ایک روزگار سا تھا۔ پروگرام کے دوران پولیس کے سربراہ بار بار گجرات میں پائی جانے والی مبینہ بدکاری کا حوالہ دیتے رہے، جب کہ آرٹس کونسل کے سربراہ اس بات پر اصرار کرتے رہے کہ اس ساری کاروائی کو قانون کے دائرے میں ہونا چاہیے تھا اور سب سے پہلے تھیئٹر کے مالک کو ہوم ڈیپارٹمنٹ کی طرف سے ایک نوٹس جاری ہونا چاہئے تھا۔ اس تمام تفصیل کے بعد کسی اور تبصرے کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ ثقافت دشمن پولیس افسر زندہ باد!

ماخذ (انگریزی-30)

کیا تفریح گناہ ہے!

خالد احمد

ناکامیابی کے طعنے سے بچنے کے لیے مذہب کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ وہ ثقافت کا خاتمہ کردے اور چوں کہ ثقافت مذہب کا مقابلہ نہیں کر سکتی اس لیے وہ یا تو ختم ہو جاتی ہے یا زیرِ زمین چلی جاتی ہے۔ مسلمان، ثقافت کو اسی وقت تک برداشت کرتے رہتے ہیں جب تک کہ وہ خود 'بُرے' رہیں۔ ثقافت کے ختم ہوتے ہی وہ 'اچھے' مسلمان بن جاتے ہیں۔ دراصل ثقافت مملکت کے خلاف مزاحمت سے پیدا ہوتی ہے۔ پھر' خدا کے اصولوں پر مبنی ایک اسلامی حکومت میں' ان اصولوں کے خلاف ثقافت کیسے پنپ سکتی ہے! پاکستان میں صوبے ثقافت کو ختم کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔ دو صوبے تو اس کا شکار ہو ہی چکے' باقی ماندہ ملک میں' ثقافت صرف اس دس فیصد رقبے میں پنپ سکتی ہے جہاں کی غالب اکثریت کا تعلق ایک مخصوص سیاسی پارٹی سے ہے۔

نومبر ۲۰۰۴ء کو' جیو ٹی وی کے ایک پروگرام 'چھوٹی خبر بڑی بات' میں دیگر موضوعات کے علاوہ گجراں والا کے تھیٹروں کی مبینہ عریانی بھی زیرِ بحث آئی جس میں شرکت کرتے ہوئے ان امور کے انچارج ایک سول سرونٹ جناب لکھ ویرا نے بتایا کہ ناچنے والیوں پر پابندی اس لیے لگائی گئی ہے کہ وہ 'فحش' ملبوسات زین تن کرتی ہیں۔

پروفیسر مہدی حسن صاحب نے یہ نقطہ اٹھایا کہ آخر یہ فیصلہ کون کرے گا کہ کون سا ملبوس فحش اور کون سا نہیں' خصوصاً ان حالات میں جب کہ تھیٹر کے ساتھ ساتھ' ملک میں فلمیں بھی دیکھی جا رہی ہیں۔ اداکارہ لشانہ نے یہ بتایا کہ تھیٹر پر ان لوگوں کے کہنے پر چھاپہ مارا گیا جو خود ہر قسم کی فحش حرکتوں میں ملوث ہیں۔ وفاقی وزیر برائے ثقافت جناب درانی نے کہا کہ نجی شعبے میں چلنے والے تھیٹر مسئلہ کھڑا کر رہے ہیں اور اب مملکت کے لیے ضروری ہو گیا ہے کہ وہ نئی قانون سازی کرے تاکہ ان منافقوں کے خلاف کارروائی کی جا سکے جو فحاشی کے خلاف مزاحمت کی آڑ میں لوگوں کے شہری حقوق پر ڈاکہ ڈال رہے ہیں کیوں کہ ہر معاشرے میں بہرحال 'تفریح' کی ضرورت ہوتی ہے۔

ماخذ (انگریزی۔ 27)

فلم

فوزیہ رفیق

ثاقب ملک

(ب)

حسن منظر

rekhta

اُردو، پنجابی فلمیں

فوزیہ رفیق

اُردو، انگریزی اور پنجابی فلمیں، انگریزی فلموں کو تو چھوڑیے کہ ہم یہاں فقط ان فلموں کو لفٹ کروانے کا ارادہ رکھتے ہیں جنھوں نے اگر پلاٹینیم جوبلی نہیں تو گولڈن جوبلی ضروری منائی ہو۔ اور انگریزی فلمیں! مردِ مومن کی طرح اِدھر ڈوبی تو ہیں لیکن اُدھر نکلتی کسی نے نہ دیکھیں۔ ویسے جب سے 'ضدی' ریلیز ہوئی ہے اور ہنوز 'ڈی ریلیز' ہونے کا امکان نہیں، ہمیں تو پورا یقین ہے کہ اگر راکویل ویلش میکسی پہن کر 'چھڈ میری وینی نہ مروڑ' پر ناچ دے تو اردو پنجابی فلموں کا مستقبل اور مؤثر کباڑہ ہو سکتا ہے کہ پنجابی فلموں کی کامیابی کی سب سے بڑی وجہ ان کا بلند سے بلند تر آہنگ ہے۔ پنجابی فلم میں ناچ ہوتا ہے کھل کر بات ہوتی ہے، گرج گرجا کر، عشق ہوتا ہے، دندنا کر، دشمنی ہوتی ہے، سر چڑھ کر۔ اگر پنجابی فلم ساز ایکٹرس کو نچاتے ہیں تو انھیں پتا ہوتا ہے کہ اس ناچ سے لوگ کیا چاہتے ہیں! دراصل بالی وڈ کی فلموں کی آزادانہ آمد و رفت کے بعد سے لوگوں کا شعور در مسلۂ سیکس بہت بلند ہو گیا ہے۔ باپردہ، ڈھکی چھپی بیبیاں تو وہ اکثر دیکھتے رہتے ہیں۔ دو ڈھائی روپے خرچ کر کے بھی اگر انھیں سے پالا پڑنا ہے تو پھر لعنت ہے ایسی فلم پر۔ اس سے تو بہتر ہے کہ وہ بانو بازار کا ایک چکر لگا آئیں۔ انھیں تو تھرتھراتی، چم چماتی، خیالوں کی پری چاہیے۔ ان خیالوں کی پریوں سے عشق ان کو خواب دیتا ہے جو زندہ رہنے کا بہانہ بن جاتا ہے۔

لیکن وہ عشق کی انتہا نہیں چاہتے۔ اس لیے معاملہ بس اتنا ہو کہ باریک سا خوش رنگ، نرم لباس ہو کہ وہ خیال کی آنکھ سے اس کے اندر تک دیکھ لینے پر قادر رہیں۔ اور پھر ایک جان لیوا سا سسپنس جو عشق کی انتہا تک پہنچ کر شاید بہت عام سا لگے۔ نہ کوئی پُراسراریت نہ انہونی بات، نہ سسپنس! نارنجی شامہ میں لپٹی، پھوٹ پھوٹ کر باہر آتی، کھل کر مچلتی ممتاز۔ بس ایسی ہے کہ لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے۔ اور اسی کا ڈپلی کیٹ، 'انکھ لڑی بدو بدی' بنارسی ٹھگ کو لے اڑا کہ اکثر لوگ ممتاز کو دیکھنے پہنچتے ہیں اور جھونگے میں منور ظریف کی گھسی پٹی مسخریوں اور صدیوں پرانی اپنی کہانی قسم کے ڈرامے کا گھونٹ بھی بھر جاتے ہیں۔ دراصل اب تک پنجابی فلموں کا ایک ہی پرنٹ چلا آ رہا ہے: پنجاب کے جوشیلے جوان کی غیرت کا للکارا جانا، ہاتھوں ایک جاگیردار کے، اس کا بندوق اٹھا کر جانے کی کوشش کرنا۔ غیرت مند ماں کا غلط فہمی میں مبتلا ہو کر راستے میں آ جانا، اور دوپٹہ دہلیز پر رکھ دینا۔ 'وے جے توں

دہلیزوں باہر پیر پایا، تے میں تینوں دودھ نہ بخشاں گی۔' ماں کا شدتِ غم سے بندوق کو بھینچ لینا۔ 'ابھی کہہ کہہ دتا ای، تیرے غیرتاں والے پتر دی عزتاں والی بہن نوں اج جاگیردار نے بھیڑی اکھ نال دیکھیا اے، میں اوہدیاں اکھاں کڈھ کے تیرے قدماں میں بیٹھ رکھ دیاں گا، تے فیر تینوں کوئی ایہہ طعنہ نہ دے گا کہ تیرا پتر تیری عزت دا راکھا نہیں بن سکیا، مینو جان دے ماں، پر دیکھیں میری بہن دے سروں چادر نہ ہلے۔ نیئں تے میں سمجھاں گا میری کوئی ماں نیئں سی۔' بہن کے سر پر دوپٹہ دیتا ہے، جو اگلے سین میں نیلا لاچا پہن' دوپٹہ اُتار کسی شہری بابو کے کندھے پر سوار' دے میں دل تیرے قدماں اچ رکھیا توں پیرا تے پاتے' سمی' گانے لگ پڑتی ہے۔ غیرتاں دا راکھا' جاگیردار کے پاس پہنچتا ہے: 'جاگیردارا' میں تیریاں زمیناں دے چپے چپے تے تیرا لہو نچوڑ دیاں گا۔ اوئے۔' وغیرہ وغیرہ۔ 'اوئے کیا! تیرے ساہ مک جاں میریاں زمیناں نہ مٹن۔ او جاگیرداراں بن کے نیئں، جوان دھی دا بھرا بن کے سوچ۔' اور یُوں وہ آدھا گھنٹہ ڈائیلاگ کے تسلی بخش تبادلے اور مسلسل ڈیڑھ گھنٹہ کی کوشش کے بعد جاگیردار سے انتقام لے کر سرخ رو ہو جاتا ہے۔ اس دوران آٹھ نو بھنگڑے ہوتے ہیں۔ رنگیلا اور منور ظریف کا عشق اور رقابت سائیڈ بزنس کے طور پر جاری رہتے ہیں۔ عزت، غیرت، ماں، پتر، بہن وغیرہ کے رشتوں کا جذباتیت سے بھرپور اظہار ہوتا ہے، خوب دھما کہ چوکڑی کے بعد بالآخر دو تین موتیں ہوتی ہیں۔ ہیرو اور ہیروئن مل جاتے ہیں اور بس۔

اس ڈھائی گھنٹے کے ہر سین میں دو تین کلائمکس آتے ہیں، اور یوں دیکھنے والا نفسیاتی طور پر شور و غوغا کا اس حد تک شکار ہوتا ہے کہ اس کے پورے دن کے جبر کا مکمل طور پر 'کیتھارسز' ہو جاتا ہے۔ یہ پلاٹ اچھا ہے، لیکن دس پندرہ سال مسلسل دیکھتے رہنے کے بعد طبقہ فلم بین کو مکمل طور پر ازبر ہو گیا ہے۔ نیک ہی قسم کی 'سچوئشن' ایک ہی طرح کے مسلسل آئے ہوئے کلائمکس، ایک ہی قبیل کے ڈائیلاگ کب تک؟ آخر پنجابی فلمیں دھڑا دھڑ فیل ہونے لگیں تو فلم سازوں نے ٹھمکے کا سہارا لیا، رنگین پنجابی فلمیں۔ اس سے کام پوری طرح نہ بن سکا تو ممتاز مارکہ ڈانس۔ لیکن یہ بھی زیادہ دیر تک تو چلنے سے رہے۔ اب ان لوگوں کے بچنے کا ایک ہی راستہ ہے۔ کوئی نیا فارمولا پھر شاید تین' چار سال تک چل جائے، ورنہ تو معاملہ سخت ٹریجک ہے۔ بھنے خان' 'ملنگی' 'ہیر رانجھا' 'کومک ری لیف' کی طرح آئیں اور گزر گئیں۔

پنجابی فلموں کے اس عروج اور تازہ بہ تازہ مائل بہ زوال ہونے کی وجہ سے اردو فلموں کو ذرا دم لینے کی مہلت ملی ہے کہ اردو میں ڈھیلی ڈھالی نامرد فلموں کی بھرمار۔ کچھ ناکام قسم کے تجربات کے ساتھ ساتھ چند مقابلتاً نئے فارمولوں پر کامیابی حاصل کی گئی ہے۔ معاشرتی مسائل پر بننے والی ان فلموں میں اکثریت کی بنیاد شادی کا ہنگامہ ہوتی ہے۔ سماج کی دیوار ہیروئن کے درمیان کبھی غریبی امیری بن کر

حائل ہوجاتی ہے، کبھی محبت کی تکون' بے چاروں کو گھیرے میں لے لیتی ہے اور کبھی خاندان کی ناک آڑے آتی ہے۔ اور پنجابی معیار کے قطعاً برعکس، اردو ہیروئن بے چاری پہلے تو ہیرو سے ٹکراتی ہے، گالی گلوچ کے پردے میں دل کی دھڑکنیں چھپاتی ہے، اور پھر تنگ آ کر گرفتارِ محبت ہو جاتی ہے۔ اب جو سب سے اہم تضاد بنتا ہے وہ یہ کہ ہیرو کو کیسے پتا چلے کہ اس کی کوششیں کامیاب ٹھہریں! وہ جھجکتے جھجکاتے، بہانے بہانے سے اسے سمجھانے کی کوشش کرتا ہے۔ اور اسی کوشش میں انٹرویل ہونے کے قریب ہو جاتا ہے تو وہ گھبرا کر کوئی کلیر کٹ اشارہ مارتی ہے جو صحیح نشانے پر بیٹھتا ہے۔ ہیرو ریشہ خطمی ہو کر اس کا آنچل تھام لیتا ہے۔ ٹریاؤں ٹئوں وہ آنچل چھڑا، دشتِ وفا کی ہرنی کی طرح چوکڑی بھر کر کسی فوارے زدہ باغ میں پہنچ جاتی ہے۔ جانِ من! اتنا بتا دو محبت' محبت' محبت' ہے کیا، اور اس دوران اظہار عشق کے طور پر وہ آگے پیچھے بھاگتے رہتے ہیں۔ بیچ میں ایک آدھ دفعہ ہیرو کو اتنے قریب آ جانے کا موقع دیتی ہے کہ کیمرے کا چہرہ گھبرا کر آسمان کی جانب اٹھ جاتا ہے اور جب تک اُدھر رہتا ہے، ناظرین زبردست قسم کی مینٹل ماسٹربیشن میں سرتاپا غرق رہتے ہیں۔ خدا خدا کر کے کیمرہ واپس آتا ہے تو پھر بھاگ دوڑ شروع۔ ہمیں اس بھاگ دوڑ پر قطعاً اعتراض نہیں۔ لیکن ہماری ہیروئن کو چاہیے کہ ہیرو کو ابتدائے عشق ہی میں اتنے بڑے امتحان سے نہ گزارے۔ توند سے نجات پانے کے کچھ اور طریقے بھی تو ہو سکتے ہیں۔ ویسے بھی یہ طریقہ کافی ناکام رہا ہے کیوں کہ ۹۰ فیصد فلموں میں ہیرو کے ساتھ اس کی توند موجود رہتی ہے۔ خیر تو اظہارِ محبت کے بعد تین' چار طربیہ گانے ہوتے ہیں۔ اب طربیہ کے بعد کسی المیہ گانے کی ضرورت بھی بے شک پڑتی ہے، چناں چہ بمشکل تمام کوئی غلط فہمی پیدا کی جاتی ہے یا سماج کی دیوار کھڑی کی جاتی ہے۔ ہیروئن سیاہ لباس میں المیہ گانا گاتی ہے اور اپنی کسی دوست یا بہن یا والدین یا روایات کے حق میں ہیرو سے دست بردار ہوتے ہوئے قربانی دیتی ہے جو اکثر ناکام جاتی ہے کہ ڈائریکٹر کی خوشی محبت کی فتح ہی میں ہے۔ یوں جو اردو فلمیں کامیاب ہوئیں ان کی بنیاد سیدھی سادھی محبتوں پر تھی خاموشی سے آگ میں جلتے رہنے والی۔ دراصل اردو فلم کا ہر کردار اپنے اندر 'مارٹائر کومپلکس' میں مبتلا ہوتا ہے اور رہنا چاہتا ہے' علاوہ ولن کے۔

دراصل کسی بھی فلم کی کامیابی میں بعض چیزوں کا ہونا بہت ضروری بن گیا ہے۔ ایک یہ کہ پلاٹ ایسا ہو کہ جو ناظرین کو جذباتی سطح پر ملوث کر سکے۔ ایسی سچویشنز ہوں کہ وہ کسی نہ کسی کردار کے مصائب کے ساتھ خود کو آئیڈینٹی فائے کر سکیں، اور ان کے ہمدردی کے جذبات ابھر آئیں۔ مثلاً 'ارمان' میں زیبا کی مظلومیت' امراؤ جان ادا' اور 'انجمن' میں رانی کا صعوبتیں برداشت کر کے ناچتے گاتے جانا' قربانیاں دینا۔ 'انسان اور آدمی'، 'آگ کا دریا' اور 'خاموش رہو' میں محمد علی کے جیتے جاگتے کردار۔ 'زرقا' اور 'یہ امن' میں آزادی کے حصول کی بے پناہ خواہش' یہ سب چیزیں دیکھنے والے کے ذہن کے

ہی کسی نہ کسی گوشے میں دبی ہوتی ہیں جن کو کسی بھی صورت میں باہر آتے دیکھ کر وہ کہانی میں خود ملوث ہو جاتا ہے۔ پھر ایسی کہانی جس میں کچھ نہ کچھ دخل ناظرین کی یا ان کے آس پاس کے لوگوں کی زندگیوں کا بھی ہو یا ان کے آئیڈیلز کا بھی۔ مثلاً خوش حال ہیرو، اس کی آسائشیں' رومینس اور صرف ایسی مشکلات جو نفسیاتی ہوں۔ دیکھنے والوں کے لیے جو زیادہ تر نچلے اور متوسط طبقے سے ہوتے ہیں' ایک امید اور سکون کا باعث بن جاتا ہے۔ کسی بھی بہتر پلاٹ کا بے حد ڈرامینک اختتام دیکھنے والے کو متاثر کر دے تو فلم کی کامیابی کی کافی حد تک ضمانت ہو جاتی ہے' مثلاً 'انسان اور آدمی'، 'انجمن'، 'امراؤ جان ادا'، 'زرقا'، 'یہ امن'، 'عندلیب'، 'خاموش رہو' اور 'آگ کا دریا' کا اختتام۔ اور پھر سیکس اور اس کی دلچسپ پیش کش اور موسیقی کوئی بھی ایسی فلم جس کے گانے بوگس ہوں آج تک باکس آفس ہٹ نہیں ہوئی۔ اچھے میوزک کے بغیر کسی بھی فلم کی کامیابی کی امید محض خوش فہمی ہو سکتی ہے۔

ماخذ (اُردو۔۱۰۱)

۱۹۹۶ء کی سیکسی فلمیں

ثاقب ملک

کیا پاکستانی فلم بین واقعی ایسی صاف ستھری فلمیں چاہتے ہیں جو وہ بطور تفریح اپنے گھر والوں کے ساتھ بھی دیکھ سکیں! یا پھر حقیقت یہ ہے کہ ریشماں کی رانوں، صائمہ کی دھڑکتی چھاتیوں اور جان ریمبو کے بازو کی مضبوط مچھلیوں کا خیال آتے ہی ان کی ریڑھ کی ہڈی جھنجھنانے، دلوں کی دھڑکن تیز ہونے اور پسلیوں میں ایک گدگدی مچنا شروع ہو جاتی ہے! کھلے بدنوں کی اچھی خاصی نمائشوں اور جنسیت کے بارے میں بے فکرانہ رویّوں کو دیکھ کر اور 1996ء کے اکثریتی سینما کو سامنے رکھتے ہوئے تو یوں لگتا ہے کہ دیکھنے والوں کو فکر انگیز کہانیوں یا شان دار ہدایت کاری کی بجائے، ملٹی فوم والے بے داغ گدے، منی اسکرٹس اور بجلی کے طوفان دیکھنے کی ہوس کچھ زیادہ ہی ہے۔ اب جب کہ فلم دیکھنے والوں کی عرصے سے دبی ہوئی خواہشات ایک حقیقت کا روپ دھارنے لگی ہیں ایک بات جو بالکل واضح ہو گئی ہے وہ یہ ہے کہ اگر تمھارے پاس کچھ ہے تو بلا تکلف اُس کی نمائش کرو اور اگر نہیں ہے تو پھر 'پیڈنگ' سے کام چلاؤ اور دعا کرو۔

لیکن اب اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ پاکستانی فلموں کے لیے پیڈنگ، شہوت خیزی یا ٹٹولنے اور چھیڑ چھاڑ کی حرکتیں کوئی نئی بات ہیں۔ ذرا پشتو فلموں کے کسی رسیا یا پھر مسرت شاہین کے کسی کٹر قسم کے حامی سے اُردو فلموں کی اس جنسی بازیافت کے بارے میں تو پوچھ کر دیکھیے۔ وہ تمام تر دھڑ دھڑاہٹ اور ہونٹوں کی ٹھکن کا ذکر کرتے ہوئے جمائیاں لینے لگے گا یا پھر ان تمام لوگوں پر ناک بھوں چڑھانا شروع کر دے گا جنھوں نے اس قسم کی تمام باتوں کو ایک خاردار مسئلہ بنا کر رکھ دیا ہے۔ مگر یہ بات بھی اپنی جگہ ایک حقیقت ہے کہ پشتو فلموں کی اپنی سرحدیں ہیں، اس کا اپنا ضابطۂ اقدار اور اپنی بھی ایک ذیلی ثقافت ہے۔ پشتو فلموں کی سطح تک نیچے آنے کے لیے تو اکثریتی سینما کو ابھی کچھ اور لچک دکھانا ہوگی مگر پھر بھی مارشل لا کے دور میں نافذ کی جانے والی 'بدن کو نہ چھونے' والی ایک پالیسی، بھارتی فلموں کی نمائش اور سیارہ ڈشوں کو دیکھنے والے ناظرین کی بڑھتی ہوئی تعداد کی بنا پر اب ہماری فلموں میں خاصی ڈھیل دی جا رہی ہے اور ان تمام باتوں کے نتائج بھی خاصے بھرپور نکلے ہیں۔ کامیاب فلموں کی تعداد کی طرح فلموں میں جنسیت کا عنصر بھی ڈرامائی طور پر بڑھ گیا ہے۔ جذباتی مکالموں کی جگہ اب سنسناتے ہوئے اور بولتے ہوئے بدنوں نے لے لی ہے۔ دیکھتے ہی دیکھتے ہمارے سامنے ایسی

اداکاراؤں کی ایک پوری پود آ گئی ہے جن کی وجۂ شہرت صرف 'سیکس' ہے۔ لگتا ہے کہ ناٹے قد کی بابرہ شریف اور ندیم جیسے نرم و نازک فلمی اداکاروں کا دور ہمیشہ کے لیے ختم ہو گیا ہے۔ اگر آج سلطان راہی زندہ ہوتا اور انجمن بھی فلموں میں کام کر رہی ہوتی تو وہ اس نئے پھسلواں دور میں ریما، میرا، لیلیٰ، صاحبہ، ریشم، بابر علی، سعود، معمر رانا اور جان ریمبو جیسے مضبوط اور پرکشش بدنوں کے بیچ وہ بالکل ڈائناسار ہی لگتے۔

یوں تو ہر نئی اداکارہ نے دوسری کو مات دینے کی کوشش کی مگر اس سال کی فلم بینوں کی پسندیدہ ترین اداکارائیں بلاشبہ ریشم اور میرا ہی ہیں۔ دونوں اپنے اپنے بدن پر نازاں ہیں جو اُن کے روزں سے ظاہر ہے اور یہ دونوں کی دونوں فلمی دنیا میں اپنے قدم جما چکی ہیں۔ 'چیف صاحب' میں میرا ایک شوخ گانا گاتے ہوئے نظر آتی ہے کہ اتنی دیر میں سلیم شیخ اس کے ساتھ شرارتیں کرتے ہوئے اس کا پیٹ سہلانے لگتا ہے اور پھر وہ دونوں اودھم مچاتے ہوئے تالاب میں کود پڑتے ہیں۔ اس منظر نے تھوڑی بہت لرزہ براندامی کی کیفیت پیدا کی۔ حالاں کہ اس فلم میں میرا کی اداکاری نہایت بے ڈھنگی اور بوجھل سی رہی مگر فلم کے ریلیز ہوتے ہی اس کا ستارہ چمکنے لگا۔

اس بات کو ثابت کرتے ہوئے کہ اُس کی ڈرامائی صلاحتیں اس کے بدن کے تناسب ہی سے ہیں، میرا نے 'چیف صاحب' کے بعد سنگیتا کی بنائی ہوئی فلم 'کھلونا' میں اپنی اداکاری کے ایسے جوہر دکھائے کہ اس کا فلمی کیریئر بن گیا۔ میرا نے ایک الگ تھلگ سی روندی ہوئی اور محبت کی بھوکی 'دوسری عورت' کا کردار کچھ ایسی مہارت سے ادا کیا کہ منجھے ہوئے نقاد بھی حیران سے ہو کر رہ گئے۔ یہ ضرور ہے کہ فلم کی کامیابی کا راز میرا کی نہایت ہی بے باکانہ اور جنسیت سے بھرپور اداکاری، اُس کے زیب تن کیے ہوئے نیم عریاں ملبوسات' اس کے گرما گرم ناچ' اور اس کے اور سعود کے بیچ پائی جانے والی جنسی کھنچا تانی تھی۔ اس فلم میں بات 'چیف صاحب' کے گرما گرم گانوں سے بھی آگے کی تھی۔ اس میں تو صرف زیر جاموں میں ملبوس میرا، برستی بارش میں ناچتے ہوئے اپنے کندھوں کے علاوہ بہت کچھ سعود کے ساتھ رگڑتی نظر آ رہی تھی جس کا اوپری سارا بدن کھلا ہوا تھا۔

'کڑیوں کو ڈالے دانہ' میں ریشم اور معمر رانا بھی اسی طرح جذبات میں بھیگے نظر آ رہے تھے۔

اگر 'کھلونا' میں میرا نے کیمرے کے سامنے حد کر دی تو یہی کچھ ریشم نے اپنی فلم میں کیا۔ اب تو موسلا دھار بارش یا اوپر سے نہری طرح برستا ہوا پانی پاکستانی فلموں کا سب سے معتبر جنسی استعارہ بن کر رہ گیا ہے۔ اسی لیے اس فلم میں ایک نہیں بلکہ دو ایسے ہی گانے شامل ہیں جو تھرتھرا دینے والے مناظر سے بھرپور ہیں۔ پھر یہی دو گانے اس فلم کی بے پناہ مقبولیت کا باعث بنے، ورنہ تو جان محمد کی یہ فلم ناقابل برداشت حد تک ایک ایسی فلم ہے جو صرف مالی فائدے کی خاطر بنائی گئی تھی۔ اس جوڑے کا وہ 'تن جلے' گانا جس میں ریشم ایک ٹنی ٹاپ اور لہنگا پہنے نظر آتی ہے اور رانا بلا قمیص کے، پھر وہ دونوں ساحل پر

لڑھکتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں، دیکھتے ہی دیکھتے ہٹ ہوگیا۔ اس گانے نے قومی سطح پر ایک سنسنی پھیلا دی کیوں کہ ریشم نے جو کچھ اپنی فلم 'جیوا' میں اتنے سارے کپڑوں میں چھپا رکھا تھا وہ سب کچھ اس فلم میں دکھا دیا۔ اسی لیے لاہور میں اس فلم کے خلاف خاصا شور و غل بھی ہوا جس کے نتیجے میں وہ دونوں سینما گھر جن میں اس فلم کی نمائش ہو رہی تھی اور سنسر بورڈ کا دفتر بھی بھاری توڑ پھوڑ کا نشانہ بنے۔

اس فلم کے بعد، بالآخر ضابطوں کی بندش سخت کر دی گئی اور سنسر بورڈ کے چیئرمین جمال خان جوگزئی کو بھی ایک متنازعہ مقدمے میں ملوث ہونا پڑا۔ پھر ریشم کو ٹی وی کے پردے پر آ کر اپنے پرستاروں سے معافی مانگنا پڑی، حالاں کہ سچی بات تو یہ تھی کہ اس کے اکثر پرستار اُس کے 'قومی اثاثوں' کی نمائش پر اس سے ناخوش نہیں تھے۔ ہاں، البتہ اُن دوسری اداکاراؤں کی بات اور تھی جو ریشم کی اس قسم کی شہرت سے جلتی تھیں۔ اُن میں سے ایک تو قسمیں کھا کھا کر ہر ایک کو یہ بتاتی پھرتی تھی کہ ریشم نے جو کچھ دکھایا وہ اصلی نہیں تھا۔ اس سب کچھ کا یہ نتیجہ نکلا کہ لاہور میں سینما گھروں میں نمائش کے وقت اس فلم کا یہی گانا نکال دیا گیا مگر اسی دوران یہ بات اتنی پھیل چکی تھی کہ لوگ جوق در جوق سینماؤں کے گرد منڈلاتے نظر آئے صرف اس لیے کہ وہ پابندی لگنے سے پہلے اس گانے کو ایک بار اور ضرور دیکھ لیں۔ کراچی میں اس فلم کی نمائش کے وقت اس پر ایک ہلکی سی نظر ثانی کر لی گئی اور فلم کے تقسیم کنندہ کی خواہش پر یہ گانا جو تیسرے نمبر پر تھا اُسے آخری نمبر پر لایا گیا تا کہ وہ شائقین جو بار بار فلم دیکھنے کو آئیں وہ بھی فلم کو بیچ میں چھوڑ کر نہ جا سکیں۔ 'کڑیوں کو ڈالے دانہ' کا یہ گانا ممکن ہے بارش کے منظر کے حوالے سے ٹاپ پر ہو مگر پھر دوسرے فلم سازوں کو ایسے مناظر فلمانے کی دوڑ میں آگے چلے جانے سے کون روک سکتا ہے!

صائمہ جیسی شاہانہ اداکارہ نے سید نور کی فلم 'گھونگھٹ' میں اپنے برابر کے مدمقابل محسن خاں کے ساتھ ایک مدہوشانہ اور جذباتی انداز میں اپنی اکڑفوں کی نمائش کی۔ اور پھر اپنی پنجابی فلم 'نو جا' میں وہ بارش میں ایک گدگدی مچانے والا گانا گاتے ہوئے نرگس کے ساتھ ہم جنس پرستانہ اٹکھیلیاں کرتی سامنے آئی۔ 'نور ۹۵' میں جھوٹی شرم و حیا دکھانے والی صاحبہ اپنی جھالر دار فراک کو اوپر اٹھانے سے انکار کر دیتی ہے مگر پھر اُسے نہانے کے تالاب کے ارد گرد رقص کرتے ہوئے اُن درجن بھرٹڑ کی اضافی اداکاراؤں کے درمیان گھرے رہنے پر بالکل اعتراض نہیں ہوتا جو صرف بکنی پہنے ہوئے تھیں۔ اس بات کی حکمت کو سمجھتے ہوئے کہ جب تمام اور ہتھکنڈے ناکام ہو جائیں تو اپنے پیشے میں کچھ رنگ بھرنے کا بہترین نسخہ یہ ہے کہ سیاہ چولی اور زیر جامہ پہنے بارش میں بھیگتی نظر آؤ۔ تو ثمری خانم اور لیلیٰ نے بھی تمام احتیاط کو بالائے طاق رکھ کر 'موروں کے گھر چور' میں اسی نسخے پر عمل کیا۔ پھر اس بات کو یقینی بنانے کے لیے کہ سینما گھر میں کوئی بھی بھیگنے سے نہ بچے' فلم میں یہاں تک دکھایا گیا کہ باتھ ٹب میں اُترنے سے پہلے ثمری

خانم کا تولیہ گرا دیا جاتا ہے اور اس کی رانیں نظر آنے لگتی ہیں۔ فلم بنانے والوں نے اسی پر بس نہیں کی ایک سوزوکی پک اپ میں شان کو لوٹ پوٹ ہوتی ہوئی شاہدہ منی کے پاؤں چومتے ہوئے دکھایا گیا، جو گارٹر پہنے ہوئے ہے جب کہ دیکھنے والوں کی اپنی حالت خراب تھی۔

اسی دوران جب کہ مختلف ہیروئنیں کم سے کم لباس پہنے شور مچائے ہوئے تھیں پاکستانی فلمی صنعت کو یکا یک اس بات کا احساس ہوا کہ خود مردوں کے بھی اپنے بدن ہوا کرتے ہیں۔ مگر پھر یہ بھی ایک حقیقت تھی کہ ان فلم سازوں کے پاس کسی انتخاب کی گنجائش ہی نہ تھی اور وہ صرف سلطان راہی کا باہر نکلا ہوا پیٹ، یا غلام محی الدین کا ڈھلکا ہوا سینہ دکھانے پر مجبور تھے۔ مگر جب موزوں تر اور قدرے فٹ فاٹ قسم کی نئی نسل کے لڑکوں کی پوری کھیپ سامنے آ گئی تو مضبوط چھاتی والے کسی ہیرو کو بغیر کسی قمیص دکھایا جانا فلم کی کامیابی کے لیے اہم بات بن کر رہ گئی۔ اس سلسلے میں بابر علی، فلم سازوں کے لیے دیواری پوسٹروں کا ایک من پسند ہیرو بن گیا۔ جب کہ جان ریمبو کی اپنی قسم کی کم لباسی بھی اپنی جگہ مقبول رہی۔ سید نور نے اُسے اپنی فلم 'چور مچائے شور' میں ایک باتھ ٹب میں دکھایا اور پھر اپنی ایک اور فلم 'راجہ بن گیا جینٹل مین' میں یا تو اُسے چھوٹی سی بنیان یا پھر چست جینز پہنے پیش کیا گیا۔ شمیم آرا کو جسے عام طور سے پرانے خیالات کی مالک سمجھا جاتا ہے، اس نے اپنی فلم 'لَو ر ۹۵' میں بابر علی اور ریمبو دونوں کو اخباری ردّی کی بنی ہوئی لنگوٹ پہنے دکھایا اور فلم کی ریلیز سے پہلے ہی اس منظر کی بڑی تشہیر کی گئی۔

کیمرے کے سامنے پیش ہونے والے ان اداکاروں کو اگر ہم تھوڑی دیر کے لیے ایک طرف بھی کر دیں تو یوں بھی پاکستانی فلموں میں جنسی نوعیت کے مناظر کو جس بے تکلفی سے پیش کیا جانے لگا ہے اُس سے ایک نئے آزادانہ رویے کا اظہار ہوتا ہے۔ ایک طرف تو فلم ساز سنجیدہ موضوعات سے دور ہی رہتے ہیں دوسری جانب وہ اپنی فلموں میں جسمانی قربت کے مناظر پیش کرتے ہوئے ذرا بھی نہیں شرماتے۔ بلکہ وہ مختلف جذباتی لمحات کی پیش کش کو بالکل قدرتی سمجھتے ہیں۔ اب ہماری فلموں میں 'باڈی لینگویج' بڑی صفائی کے ساتھ پیش کی جانے لگی ہے۔ یوں لگتا ہے کہ جنسیت کے بارے میں گناہ کے سارے خیالات معدوم ہو چکے ہیں بلکہ ۱۹۹۶ء کی بنی ہوئی فلموں کا ایجنڈا دیکھ کر یوں لگتا ہے کہ لوگوں کو سیکس کی ضرورت ہے، اور اگر ضرورت نہیں تو ہونا چاہیے۔

عورتوں اور مردوں کی ایک دوسرے کے بدن سے بے تکلفی کے سلسلے میں فلم سازوں کی ایک بڑی سی چھلانگ لگانے کے علاوہ بھی بہت کچھ ہوا ہے۔ مذاق ہی مذاق میں سہی مگر ان فلموں میں اب ہمیں مردانہ ہم جنسیت کی طرف کھلے اشارے ملنے لگے ہیں۔ مثلاً 'لَو ر ۹۵' میں اگر پلاٹ نامی چیز ہے تب بھی ساری کی ساری فلم بابر علی اور ریمبو کے آپس کے بندھن کے گرد گھومتی ہے اور فلم کی ساری اُٹھان، چیختے، چلاتے، مخنث شفقت چیمہ اور اس کی بابر علی سے چاہت پر ہے۔ اپنے دبلے پتلے

دوست سعود سے مل کر چیمہ اپنی ساری طاقت اس بات پر صرف کرتا نظر آتا ہے کہ وہ کسی نہ کسی طرح اس نوجوان کو اپنی گرفت میں لے لے۔ فلم کے آخری مگر مزاحیہ قسم کے منظر میں چیمہ، بابر علی کو اپنے کندھوں پر اٹھائے اپنی خفیہ رہائش گاہ کی طرف جاتے ہوئے دکھائی دیتا ہے اس لیے کہ اسے اپنے یار ریمبو کو کسی لڑکی سے نہیں بلکہ نہایت ہی بدکردار ولن سے بچانا تھا۔ یہ کہنے کہ ضرورت نہیں کہ وہ اور اس کا یار بعد میں مزے کی زندگی گزارتے ہیں۔ اسی طرح 'چور مچائے شور' کا سب سے مزاحیہ حصہ وہ ہے جس دوران ریمبو اپنی بیگم کے گھر پر ایک ملازم کے بھیس میں چھپا رہتا ہے صرف اس خوف کے مارے کہ اُس کا سُسر اس کے پیچھے پڑا ہوا ہے۔ کئی ایک جنسی نوعیت کے اشارے، کنایوں اور نیم برہنہ حالت میں اپنے بدن کی کئی بار مالش کروانے کے بعد ریمبو کو پتا چلتا ہے کہ وہ ایک بڑی غلط فہمی میں مبتلا ہے مگر اس نہایت جذباتی منظر کے آنے تک ناظرین کئی بار ہنس پڑتے ہیں۔

ممکن ہے کہ ۱۹۹۶ء کے دوران فلمی صنعت کو اچھی خاصی چھوٹ مل گئی ہو مگر دیکھنا تو اب یہ ہے کہ حکومت کی تبدیلی اور طاقت ور قسم کے قدامت پرست گروہوں کی موجودگی میں مستقبل میں یہ آزادی ملتی ہے کہ نہیں۔ نتیجہ جو بھی نکلے، پاکستان کی فلمی صنعت اب اس سے کم آزادی پر سمجھوتا نہیں کرسکتی۔ جہاں تک ناظرین کا تعلق ہے، شاید دل ہی دل میں وہ اس دن کے منتظر ہیں جب بابر علی کے ہونٹ ریما کے ہونٹوں پر ہوں گے اور کوئی شور وغل نہیں مچے گا۔ اب وہ ان دونوں کو ایک دوسرے کے ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے اونچی نیچی پہاڑیوں پر آوارہ خرامی کرتے دیکھ دیکھ کر تھک گئے ہیں۔

ماخذ (انگریزی۔13)

فلمیں اور موسیقی

سماعت اور شہوت کے درمیان کیا تعلق ہے یہ تو اپنی جگہ ایک الگ مسئلہ ہے مگر ماہرِ بشریات جافری گارر نے جسے وی ساد کی تحریروں سے اس کے سیاسی اور سماجی افکار کو ایک نئے پس منظر میں پیش کرنے کا اعزاز حاصل ہے' امریکیوں کے بارے میں یہ دعویٰ ضرور کیا ہے کہ امریکی حضرات جنسی حظ حاصل کرنے کے لیے اپنی بصارت سے کام لیتے ہیں جب کہ خواتین اسی مقصد کے لیے اپنے کان استعمال کرتی ہیں۔ مغربی دنیا میں 'جاز' کی بے پناہ مقبولیت کا ایک راز یہ بھی ہے۔

ماضی میں تو موسیقی کی حیثیت بڑی حد تک ایک انفرادی مشغلے کی سی تھی لیکن گراما فون اور بعد میں ٹیپ ریکارڈ، کیسٹس اور واک مین اور اب موبائل کی ایجادات کی وجہ سے، موسیقی بازار میں آ گئی ہے۔ چلتے پھرتے بلکہ سوتے جاگتے، اور اب ہر وقت ہمارے کان مختلف قسم کی موسیقی سے آشنا ہوتے رہتے ہیں۔ آپ کسی بس یا کوچ میں سفر کر رہے ہوں، خود اپنی کار میں ہوں یا آسمان کی بلندیوں پر پرواز کر رہے ہوں، موسیقی آپ کا پیچھا چھوڑنے پر ہرگز تیار نہیں۔ اخبارات میں آئے دن چھپنے والے خطوط میں، محلے اور ہوٹلوں میں بجنے والے 'فحش' گانوں کی شکایتیں عام ہیں۔ اب تو کسان بھی اپنے کھیت میں ٹریکٹر چلاتے ہوئے موسیقی سے لطف اندوز ہوتے ہوئے نظر آتا ہے۔

آواز کا جادو اپنی جگہ ایک مسلّم حقیقت ہے اور شاید یہی وجہ ہے کہ بعض انتہائی قدامت پرست حضرات نہیں چاہتے کہ اُن کی خواتین تو رہیں ایک طرف، ان کی خواتین کی آواز بھی گھر سے باہر نہ نکلے۔ مگر دوسری جانب ہمارے نشریاتی ادارے (خصوصا ریڈیو) اور فلم ساز حضرات اسی قسم کے جادو جگانے والی آوازوں سے کام لیتے ہیں۔ ذرا کسی ریڈیو اسٹیشن سے نشر ہونے والے کمرشل پروگرام یا 'آپ کی فرمائش' جیسا کوئی پروگرام سنیے تو آپ کو ہوگا کہ بعض دفعہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایسے پروگرام کا اعلان کرنے والی کی پرکشش، چہکتی، مترنم اور کھنکتی ہوئی آواز خود گانے والیوں کی آواز کو کوسوں پیچھے چھوڑ جاتی ہے۔ جہاں تک فلمی گلوکاروں کا تعلق ہے اُن میں کچھ کی آوازیں نہایت سریلی اور نازک سی ہوتی ہیں اور بعض کی آوازوں میں ایک جھنکار سی سنائی دیتی ہے۔ چند آوازیں ایسی بھی ہیں جن میں شوخی بلکہ سیکس صاف جھلکتی ہے اور مارکیٹ میں وہی گلوکارائیں مقبول ہیں جن کی آوازیں مدبھری اور مخملیں ہوں۔

آج کل پاکستان کی 'گولڈن وائس' ناہید اختر ہے جس نے بڑی سے بڑی گانے والیوں کو

پیچھے چھوڑ دیا ہے۔ کچھ لوگوں نے اُس کے گانے کے مخصوص انداز کو سماعت کی دنیا میں ’شوخیوں سے بھرپور پھول کھلانے والی آواز بھی کہا ہے۔ کسی کیسٹ فروش کی دکان پر جا کر اُس سے ناہید اختر کے اس قسم کے گانوں کی مقبولیت پوچھیے جس میں اس نے ایک بہکے ہوئے لہجے میں ’ترا خانہ خراب‘ یا اپنی مدہوشی سے لب ریز آواز میں ’یہ انگڑائیاں، میری توبہ‘ کے بول ادا کیے ہیں۔ یا پھر جس طرح وہ اپنے دانت بھینچ کر ’ہائے اللہ‘ کی معنی خیز آواز نکالتی ہے، جس کا تاثر کسی ایک مکمل ’فحش‘ افسانے سے کم نہیں۔

فلمی گانوں کے زیادہ تر موضوعات، شراب و شباب، حسن و عشق، ہجر و وصال، شوخی و حجاب اور انکار و اقرار پر مشتمل ہوتے ہیں ان گانوں میں منہ بند کلیوں کی باتیں، بہکتی ہوئی جوانیوں کا ذکر، ، آنکھ لڑنے، دل دھڑکنے، گھونگھٹ اُٹھانے، مہندی رچے ہاتھوں، گوری رنگت اور قیامت کی چال کا ذکر ہوتا ہے۔ جوش ملیح آبادی کا ’من کی جیت‘ کے لیے لکھا ہوا مشہور گانا ’مرے خبنا کا دیکھو اُبھار‘ اسی قسم کا ایک فلمی گانا تھا جسے شاید وینا نے گایا تھا۔

مگر حقیقت تو یہ ہے کہ آج کل کی گلوکاراؤں نے اپنے گلے میں وہ مہارت پیدا کر لی ہے کہ گانے کے بول چاہے اتنے کھلے نہ ہوں، تب بھی وہ صرف ’اُف‘ اور ’ہائے اللہ‘ جیسے عام فجائیہ کلمے اس طرح ادا کرتی ہیں کہ اکثر سننے والوں کے بدن میں تھرتھری سی دوڑنے لگ جاتی ہے۔ اس قسم کی گانے والیاں بڑی مہارت سے پھنسی پھنسی اور لمبی سانسوں والی آوازیں، شرابیوں کے انداز میں ہچکیاں بھرنے، شرارت بھرے انداز میں سسکاریاں لینے اور قلقاریاں مارنے میں ایک خاص مہارت رکھتی ہیں۔ اگر آپ کو یقین نہ آئے تو تصدیق کے لیے فلم ’دھڑکن‘ کا وہ گانا سن لیجیے جو ہیرو، ہیروئن نشو کو اپنے گیلے کپڑے بدلتے ہوئے دیکھ کر گاتا ہے اور ہیروئن وقفے وقفے سے صرف ’اُف اللہ‘ آوازیں نکالتی ہے جو دراصل رُوبینہ بدر کی آواز ہے۔

ماخذ (اُردو۔ ۱۰۹)

فلمیں اور رقص

رقص جسے 'اُمّ الفنون' کہا گیا، اس کی ابتدا کیسے ہوئی، رقص نے موسیقی کو جنم دیا یا موسیقی نے رقص کو! یہ ایک بڑی طویل بحث ہے جبکہ رقص کے ذریعے کن جذبات کا اظہار جائز اور کن جذبات کا اظہار سراسر ممنوع ہے، یہ بھی ایک متنازعہ مسئلہ ہے جسے کسی مخصوص سماج کے پس منظر ہی میں سمجھا جا سکتا ہے۔ رقص کی تاریخ اتنی ہی قدیم ہے جتنی حضرتِ انسان کی۔ سلوی رومۃ الکبری کے دور کی ایک رقاصہ ہی تھی جس نے ہیروڈیاس کے دربار میں اپنا سات نقابوں والا رقص پیش کر کے انعام کے طور پر یوحنا کا سر مانگا تھا۔ اپنے مسحور کن رقص کے پردے میں سراغ رسانی کے کارنامے انجام دینے والی ماتا ہری کا نام بھی تاریخ میں درج ہے۔ اور آئی سوڈورا ڈنکن بھی ایک رقاصہ ہی تھی جس کے ناچوں نے یورپ کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ یہ وہی رقاصہ تھی جس نے جارج برنارڈ شا سے شادی کی خواہش ظاہر کرتے ہوئے کہا تھا کہ ان دونوں کی اولاد کو ماں کا حسن اور باپ کی ذہانت ورثے ملے گی جس کی بنا پر وہ بے مثال ہوگی مگر شا بھی اپنے دور کا ایک بہت بڑا بذلہ سنج تھا جس نے یہ کہہ کر بات ہی ٹال دی کہ اگر اولاد کو ورثے میں ماں کی ذہانت اور باپ کا حسن ملا تو کیا ہوگا!

رقص کے بغیر آج کے مغرب میں تو زندگی کا تصور ہی محال ہے مگر کپل ڈانس اور چند ایک معیاری ناچوں کے علاوہ وہاں بہت کم ایسے رقص ملتے ہیں جو رقص برائے رقص کے معیار پر پورے اترتے ہوں کیوں کہ وہاں کے زیادہ تر ناچوں کا مقصد بدن کی نمائش اور جذبات میں کھلبلی مچانا ہی ہوتا ہے۔ 'بیلی ڈانس' اور 'فین ڈانس' اسی قسم کے رقص ہیں۔ مگر آج کل وہاں، رقص کی مقبول ترین صورت 'اسٹرپ ٹیز' یعنی ستر کشائی ہے جسے عام طور سے نائٹ کلبوں میں پیش کیا جاتا ہے۔

انھی نائٹ کلبوں میں پیش کیا جانے والا ایک مقبول رقص بیلی ڈانسنگ ہے یعنی شکمی رقص جس کی ایجاد کا سہرا وادیٔ نیل کے سر باندھا جاتا ہے کیوں کہ آج بھی اس رقص کی عالمی شہرت یافتہ رقاصاؤں کا زیادہ تر تعلق مصر لیبیا اور ترکی جیسے اسلامی ممالک سے ہوا کرتا ہے۔ یہ رقص بیروت، قاہرہ اور استنبول سے نکلا مگر اب دنیا بھر کی نائٹ کلبوں میں سرِ فہرست ہے۔ مادام آزوری، ماہنامہ 'احساس' کے رقص و موسیقی نمبر میں 'رقص اور پاکستانی فلمیں' کے عنوان سے اپنے ایک مضمون میں لکھتی ہیں کہ 'مشرق وسطیٰ کی بیلی ڈانسروں میں بازاری پن صرف بازاری ذہنوں کو ہی نظر آتا ہے۔ اگر آپ اس

رقص کو خالص فن کارانہ نظر سے دیکھیں تو آپ جلد ہی حیران ہو جائیں گے کہ ناچنے والی کو اپنے بدن کے مختلف اعضا پر کتنا کنٹرول حاصل ہے۔ صحت مند ذہن کے حامل افراد اس رقص کو نہ صرف قدیم ترین بلکہ مشکل ترین بھی تسلیم کرتے ہیں‘

ترکی کی بیلی ڈانسر ثریا نے جب ۳۱ گھنٹے مسلسل اس رقص کو کر کے ۲۷ گھنٹوں کا عالمی ریکارڈ توڑا تو ’ایوننگ نیوز‘ کراچی نے ۴ر مئی ۱۹۷۶ء کو جی ایم میکھری کا یہ مراسلہ شائع کیا: ’میں ثریا کو اس عالمی ریکارڈ کے توڑنے پر اپنی طرف سے مبارک باد پیش کرتا ہوں۔ ہمارا برادر ملک ترکی بھی مبارک باد کا مستحق ہے جس نے اپنی ثریا کے ذریعے یہ نمایاں کامیابی حاصل کی۔ ہمارے ترکی اور مصری بھائیوں میں بیلی ڈانسنگ بہت زیادہ مقبول ہے جو خاصی مشقت طلب ہونے کے ساتھ ساتھ ایک تفریح بھی ہے جس سے بدن پھرتیلا اور لچک دار رہتا ہے اور جس کے ذریعہ دل اور پھیپھڑوں کی ورزش ہوتی ہے۔ ہماری لڑکیاں بھی آسانی سے یہ دل کش فن سیکھ سکتی ہیں۔ ہمیں اپنے ترکی اور مصری بھائیوں سے درخواست کرنا ہوگی کہ وہ اپنی چند بہترین بیلی ڈانسرز کو یہاں بھیجیں تاکہ ہماری لڑکیاں اس فن کو سیکھ لیں اور وہ بھی بیلی ڈانسنگ کے عالمی مقابلوں میں شرکت کر سکیں۔ ترکی، مصر اور دیگر ممالک کی طرح ہمیں بھی وقت کے ساتھ ساتھ چلنا چاہیے۔ آخر کیوں نہیں! مجھے اُمید ہے کہ مصر اور ترکی اس معاملے میں ہماری معاونت کریں گے۔‘

اس خط کی تائید اور مخالفت میں کئی مراسلے شائع ہوئے جن میں سے ایک مراسلہ نگار نے تو ذاتیات پر اُترتے ہوئے جناب میکھری کو یہاں تک کہہ دیا کہ اگر انھیں بیلی ڈانسنگ سے اتنی ہی دلچسپی ہے تو وہ خود اپنی یا اپنی برادری کی کسی لڑکی کا نام پیش کرے جو ملک کے لیے زرِمبادلہ بھی کمائے گی۔ ان حملوں کے جواب میں جناب میکھری کا اور مراسلہ ۲۲ر مئی کو شائع ہوا جس میں انھوں نے کہا: ’سماجیات کے ایک طالب علم کی حیثیت سے کسی بھی سماجی تبدیلی کے خلاف مزاحمت کا ہونا میرے لیے کوئی غیر متوقع بات نہیں کیوں کہ اس مزاحمت کی بنیادی وجہ ہماری ثقافتی پس ماندگی رہی ہے۔ بتایئے نا، آخر وہ کون سی چیز ہے جس کی شروع شروع میں مزاحمت نہیں ہوئی، کیا یورپ تک میں دوربین کے استعمال کے خلاف مزاحمت نہیں ہوئی، کیا جب بھاپ کا انجن ایجاد ہوا تب انگلستان میں اُس کی مخالفت نہیں ہوئی اور کیا یہ ایک حقیقت نہیں کہ انگلستان ہی کے ایک ڈاکٹر نے اُس وقت یہ اعلان نہیں کیا تھا کہ انسانی بدن کی ساخت ہی کچھ ایسی ہے کہ وہ دو گھنٹے فی میل سے زائد کی رفتار سفر برداشت نہیں کر سکتا۔‘ کیا یہ ایک حقیقت نہیں کہ اس برصغیر کے برہمن نل کے پانی سے صرف اس لیے پریشان ہو کر رہ گئے تھے کہ اُسی نل سے اچھوتوں کو پانی ملنے لگا تھا اور کیا برہمنوں کو اس بات پر بھی اعتراض نہیں ہوا کہ وہ بھی ریل کے اسی ڈبے میں سفر کریں جس میں اچھوت بھی بیٹھے ہوں! کیا سرسید“ کو ممبر سے صرف اس لئے کافر

نہیں کہا گیا کہ انھوں نے انگریزی کو مقبول بنانے کے لیے باقاعدہ ایک تحریک شروع کی! کیا جاگیردارانہ سماج کی پیدا کردہ رسم 'پردہ' کو ختم کرنے کے سلسلے میں مزاحمت نہیں ہوئی! کیا اس وقت بھی مزاحمت نہیں ہوئی جب مسلمان لڑکیوں نے اسکول اور خواتین نے ملازمت کی غرض سے پہلی بار اپنا قدم باہر نکالا! اور کیا یہ بھی حقیقت نہیں کہ ہر ملک کی تاریخ دراصل اس ملک میں رونما ہونے والی مزاحمتوں کا قبرستان ثابت ہوتی ہے اس لیے اگر آج اس خیال کی مخالفت ہو رہی ہے کہ ہماری لڑکیاں بھی ہمارے برادر ممالک ترکی اور مصر کی لڑکیوں کی طرح بیلی ڈانسنگ سیکھیں تو اس میں اچنبھے کی کوئی بات نہیں۔ لیکن یہ بھی یاد رکھیے کہ لشکروں کے لشکر بھی ایک خیال کا راستہ روک نہیں سکتے'۔

کچھ ہی دنوں پہلے جب کراچی ٹیلی ویژن اسٹیشن نے کلاسیکی رقص پروگرام 'پائل' شروع کیا تو رقص کے بارے میں ایک بار پھر بحث شروع ہو گئی۔ ایک صاحب کا تو فنی اعتراض یہ تھا کہ ناہید صدیقی کا بدن کتھک کے لیے موزوں نہیں۔ مگر دوسرے معترضین کا لب و لہجہ انتہائی پست رہا۔ مثلاً ایک نیم مذہبی اور نیم سیاسی جماعت کے حامی ہفتہ وار اخبار میں ناہید صدیقی کو طوائف کہا گیا اس لیے کہ مضمون نگار کی رائے میں وہ رقص کی آڑ میں اپنے انگ کا بھاؤ دکھاتی ہے'۔ دوسرے معترضین کا کہنا تھا کہ اگر یہ پروگرام اتنا ہی اچھا ہے تو ٹی وی کارپوریشن کے اعلیٰ عہدے داران اور پروڈیوسر حضرات خود اپنی بیگمات، بہنوں، بیٹیوں اور بہوؤں کو اس میں کیوں نہیں دکھاتے!

ناہید صدیقی نے تو اپنے طور پر ان تمام تر ذاتی حملوں کے جواب میں خاموشی اختیار کر لی مگر اُن کی طرف سے جواب اُستاد غلام حسین نے دیا جو خود ایک مولوی کے صاحب زادے ہیں مگر رقص کو ایک عبادت سمجھتے ہیں۔ انگریزی ماہنامہ 'دی ہیرالڈ' کے ایک انٹرویو میں جو اگست ۱۹۷۸ء میں شائع ہوا، اُستاد نے فرمایا: 'آج کل بارش کا موسم ہے اور ہر طرف برساتی مینڈک نکل آئے ہیں۔ رقص و موسیقی کے خلاف جس کے جی میں جو کچھ آتا ہے وہ ٹرٹراتا ہے۔ ہمیں اُن کی پروا نہیں، جیسے ہی بارش کا موسم ختم ہوگا، یہ مینڈک بھی اپنی موت آپ مر جائیں گے'۔ اسی انٹرویو میں استاد غلام حسین نے اس بات کی بھی وضاحت کی کہ وہ لوگ جو کتھک کو صرف ہندو دھرم کی میراث سمجھتے ہیں، سخت غلطی پر ہیں کیوں کہ اس رقص کی نشوونما میں مسلمانوں، خصوصاً مغلوں کا بھی خاصا حصہ رہا ہے۔

دیگر امور کی طرح رقص و موسیقی کے سلسلے میں بھی ہمارا رویہ دوغلے پن کا رہا ہے۔ ہم ایک طرف تو ان فنون کو 'مجرے' اور 'بالا خانے' کی پیداوار کہہ کر یہ دعویٰ کر بیٹھتے ہیں کہ 'صرف رنڈیاں ناچتی ہیں' مگر دوسری طرف ہمارے معاشرے میں مجروں کی مقبولیت کم نہیں ہو پاتی۔ اسی دوغلے پن کی جھلک ہمیں اُن آوازوں میں ملتی ہے جو اس وقت بلند ہوتی تھیں جب زوالِ ڈھاکہ سے پہلے پی آئی اے آرٹس اکیڈمی اپنے ثقافتی طائفے تیار کرنے میں لگی ہوئی تھی۔ وہ آوازیں مطالبہ یہ کر رہی تھیں کہ: 'ناچنے

والیاں مغربی پاکستان سے نہیں، صرف مشرقی پاکستان سے بھیجی جائیں۔ رقص و موسیقی کی ثقافتی پیچیدگیاں ان فنون کے ماہرین کے لیے خواہ کتنی ہی حل طلب کیوں نہ ہوں مگر اسلامی نظریاتی کونسل نے تو اپنی سالانہ رپورٹ برائے ۱۹۷۴ء میں تمام ناچوں کو 'جائز' اور 'ناجائز' خانوں میں منقسم کر کے اپنے تئیں مسئلے کو فوری طور پر حل کر دیا۔

رقص و موسیقی کے حوالے جب ہم پاکستانی فلموں میں پیش کیے جانے والے ناچوں کا جائزہ لیتے ہیں تو ہمارے سامنے ایک مختلف ہی دنیا آ جاتی ہے۔ ان ناچوں کو جو خصوصاً پنجابی اور پشتو فلموں میں دکھائے جاتے ہیں، اشتہارات میں 'ایکشن سے بھرپور'، 'ہلچل مچا دینے والے'، 'مست کر دینے والے'، 'ہوش رُبا'، 'ہنگامہ خیز'، 'تہلکہ خیز'، 'طوفانی'، اور 'خطرناک' قسم کے الفاظ سے یاد کیا جاتا ہے۔ مگر مادام آذوری نے تو اپنے اس مضمون میں جس کا حوالہ پہلے دیا جا چکا ہے، انھی ناچوں کے پیش نظر یہاں تک لکھ دیا کہ جس فلم میں ایسا رقص پیش کیا جائے اُسے سوائے 'بلیو فلم' کے اور کوئی نام نہیں دیا جا سکتا۔

آخر ان فلمی ناچوں میں جو 'فلور شو' کے علاوہ کھیتوں اور کھلیانوں میں بھی کرتے ہوئے دکھائے جاتے ہیں، ہوتا ہی کیا ہے سوائے ٹھمکے لگانے، پاؤں پر تال جما کر بدن کے کسی ایک حصے کو ساکت رکھ کر دوسرا پرشور انداز میں تھرکانے، گھنگھروؤں اور چوڑیاں چھنکانے، تھرکنے، مچلنے، آنکھیں مٹکانے، پلکیں جھپکانے، ادائیں دکھانے، بوٹی بوٹی پھڑکانے، چھاتیاں ہلانے، کولہے مٹکانے، بازو اٹھا کر بغلیں اور ناف دکھانے، پوری کی پوری ریڑھ کی ہڈی کو کیمرے کے سامنے لا کر ٹانگوں کے پیچھے تیز روشنی والے بلب سے رانیں دکھانے، ذرا سی کرتی یا چھوٹا سا بلاؤز پہن کر گھٹنوں کے بل چلنے، رانیں رگڑنے، گھسّے لگانے، باہیں اور ٹانگیں پھیلا کر، زور زور سے آگے ہچکولے لینے، رانیں اچھالنے، چھلانگیں لگانے اور الٹا سیدھا لیٹ جانے کے! کسی فلمی تبصرہ نگار کے مطابق کسی ناچنے والی کو دیکھ کر اُسے یوں لگا جیسے ناچنے والی امرود توڑنے کے لیے امرود کے درخت کو زور زور سے ہلانے میں لگی ہوئی ہے۔

بہر حال فلم کے سنسر ہوتے وقت اس بات کا خاص خیال رکھا جاتا ہے کہ ناچنے والی کا کوئی 'فرنٹ جرک' سنسر ہونے سے بچنے نہ پائے۔ البتہ ان ناچوں میں 'سائیڈ جرکس' کو، عوام کے سامنے پیش کر دیا جاتا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ یہ فلمی رقاصائیں اپنے ناچ کے دوران ایسی ایسی حرکتیں کر گزرتی ہیں جن کو دیکھ کر ایک بیلی ڈانسر بھی یقیناً شرما جائے گی۔ فلموں میں ایسے ناچ پیش کرتے وقت، فلم سازوں کا کیا رویّہ ہوتا ہے اس کا کھرا کھرا جواب ہمیں پنجابی فلموں کے ایک مشہور فلم ساز کے انٹرویو میں ملتا ہے جو ۲۴ رمارچ ۱۹۷۸ء کو ایک فلمی رسالے میں شائع ہوا۔ ایک سوال کے جواب میں اس فلم ساز نے کہا 'جناب عوام کا ذوق بدلنا ہمارا کام نہیں۔ یہ کام تو مولویوں کا ہے۔ ہم تو روپیہ لگاتے ہیں اور روپیہ کماتے ہیں۔'

مگر دیکھا جائے تو اپنی جگہ یہ فلم ساز بھی اتنے قصوروار نہیں جتنی خود اس قسم کی رقاصائیں جو آخری حد تک جانا چاہتی ہیں۔ اور اس بات کی صداقت کا اندازہ 'پرائیویٹ پروگرام' نامی ایک ویڈیو کیسٹ دیکھ کر لگایا جا سکتا ہے۔ یہ ویڈیو ریکارڈنگ، اکتوبر ۱۹۹۱ء کو لندن کے ایک کھچا کھچ بھرے ہوئے حال میں ہوئی تھی جہاں دو ملتانی لڑکیوں، ایک بیرسٹر کی بیٹی، چوبیس (۲۴) سالہ زرینہ رمضان اور اُنیس سالہ قمر اشرف نے اپنے فن کے مظاہرے کے دوران 'ٹاپ لیس' اور 'سٹرپ ٹیز' کے کارنامے دکھائے۔

ماخذ (اُردو ۔ ۱۱۵)

rekhta

بلیو فلمیں

حسن منظر

یہ مضمون تقریباً اٹھارہ سال کے اَن گنت، بے ترتیب انٹرویوز پر مشتمل ہے اور ان سے برآمد ہونے والے نتائج کی روشنی میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ دوسری برائیوں کے ساتھ ساتھ ننگی فلمیں دیکھنے کی عادت بھی سوسائٹی میں مستحکم ہوچکی ہے اور یہ عادات دیگر جنسی بے راہ رویوں (رشتۂ ازدواج سے باہر جنسی فعل، ایک ہی جنس کے دو افراد کے مابین فعل اور غیر از انسان مخلوق سے جنسی فعل) کی نسبت کہیں عام ہے۔ حتیٰ کہ ایک دوسری بے راہ روی کی سطح پر اگر جائزہ لیا جائے تو ننگی فلمیں دیکھنے کی عادت نشہ لانے والی اشیا کے استعمال سے بھی زیادہ سوسائٹی کے اعصاب اور دماغ میں راہ پیدا کرچکی ہے۔ ننگی فلموں کے اثرات کے لحاظ سے سوسائٹی کے افراد کو چار خانوں میں رکھا جاسکتا ہے: (۱) وہ جنھوں نے کبھی کوئی خالصتاً ننگی فلم نہیں دیکھی۔ (۲) وہ جنھوں نے کبھی کبھار ہی ننگی فلم دیکھی ہے یا صرف ایک بار۔ (۳) وہ جو باقاعدگی سے ننگی فلمیں دیکھتے ہیں لیکن انھیں دیکھے بغیر بھی رہ سکتے ہیں۔ (۴) وہ جو ننگی فلمیں دیکھنے کی عادت کو ترک نہیں کرسکتے۔

لوگ ننگی فلمیں اکیلے بھی دیکھتے ہیں اور اپنی جنس والوں یا غیر جنس والوں کی معیت میں بھی۔ اکثر ان فلموں کو ایک گروپ کی شکل میں بیٹھ کر بھی دیکھا جاتا ہے اور یہ برائی اکیلے اور سنگت دونوں ہی صورتوں میں دوسری کسی برائی کے ساتھ انجام دی جاسکتی ہے۔ ننگی فلموں سے پہلا واسطہ حادثاتی طور سے بھی ہوسکتا ہے جیسے کسی کے اوطاق یا ڈرائنگ روم میں یا کسی سینما ہال میں جہاں کوئی فیچر فلم دکھائی جارہی ہے اور اچانک ننگی فلموں کی ایک یا دو ریلیں نارمل ریلز کے درمیان داخل کردی جائیں۔ یہ ایک طرح سے ہر شہر میں سینما ہالوں کی اپنی شناخت بن چکی ہے وہ جن میں سب جانا پسند نہیں کرتے اور وہ جن میں سب جاسکتے ہیں۔ اور یہ بھی ہوتا ہے کہ اصل فلم کے درمیان جسے ’تمام عمروں کے ناظرین کے لیے مناسب‘ کا سرٹیفیکیٹ سینسر بورڈ سے ملا ہے، مکمل برہنہ جسموں کی فلموں کے ہزار بارہ سو فٹ آجائیں۔ ایسے میں اگر کوئی اپنے بچوں کو یہ فلم دکھانے کے لیے ساتھ لایا ہے، اُس کا بس نہیں چلتا کہ وہ کس طرح سینما ہال کے فرش میں سما جائے اور بچوں کے دیکھے کو اَن دیکھا کرسکے۔ چھوٹے شہروں میں تقریباً تمام ہی سینما ہال پُرخطر بن چکے ہیں جن میں لوگ اپنی بیویوں بچوں کو لے جانا پسند نہیں کرتے۔

ننگی فلموں سے دوسری طرح کا واسطہ ان نوجوانوں کو بخوشی ہوتا ہے جنھوں نے ان کے بارے میں سن رکھا ہے اور جو اپنے دوستوں سے فرمائش کر کے دیکھتے ہیں اور فخر سے کہتے ہیں کہ ہم پر کوئی اثر نہیں ہوا، یعنی اپنے لذت گیری سے بالا ہونے کا اعلان۔ اس اعلان کی وہی نوعیت ہے جو پہلا سگریٹ سلگا کر لڑکے خود کو اپنے بڑے ہونے کا یقین دلاتے ہیں اور اپنے ہم عمروں کو بھی کہ ہم کسی سے پیچھے نہیں ہیں۔ شراب کی دنیا میں ایک اصطلاح ہے ’سوشل ڈرنکر‘ یعنی وہ فرد، عورت یا مرد، جو مناسب ماحول پیدا ہونے پر پی لیتا ہے۔ ایسوں کو ’کیزول ڈرنکر‘ بھی کہا جاتا ہے، یعنی کبھی کبھار پینے والا۔ ہمارے یہاں اس کے لیے مروجہ اصطلاح ہے ’سنگت میں‘ اور سنگت بہم ہو جانے پر لوگ ہر قسم کا نشہ بھی کرتے ہیں، ہر قسم کی جسمانی عیاشی بھی اور ننگی فلمیں بھی دیکھتے ہیں۔ اکثریت سنگت نہ ملنے پر تنہائی میں یہی عمل جاری رکھتی ہے اور پھر ایسے فرد میں اور اُس فرد میں کوئی فرق نہیں رہتا جو صبح سے پینا شروع کرتا ہے تو شام کر دیتا ہے اور سورج چھپے پینا شروع کرتا ہے تو بھور ہونے تک۔ لڑکوں اور لڑکیوں دونوں ہی کی تعلیمی قیام گاہوں میں جہاں سپر وژن ناکافی ہوتا ہے اور ہر صورت میں امتحانات میں کامیابی یقینی، ٹیلی وژن اور وڈیو کیسٹ چلانے والی مشینیں چوبیس گھنٹے چلتی ہیں، اور ان میں نیم برہنہ اور برہنہ بلیو فلمیں سب ہی ہوتی ہیں، لیکن ایسا تمام ہوسٹلوں میں نہیں ہے اور جہاں ہے وہاں بھی چند کمروں تک محدود رہتا ہے ورنہ بھانڈا پھوٹ جانے کا خطرہ لگا رہتا ہے۔

گھروں میں جہاں نگرانی نہ ہو لڑکیاں بھی مختلف ریٹنگ کی بلیو فلمیں، چھوٹی عمر کے لڑکے لڑکیوں سے، محلے کی دکانوں سے منگاتی رہتی ہیں جو جا کر، انھیں جو بتایا گیا ہے من و عن، دکان دار کے سامنے دہرا دیتے ہیں۔ ان بچوں کی ذہنی تربیت میں اتفاق اور تجسس کا بڑا ہاتھ رہتا ہے۔ دکان دار کاؤنٹر کے نیچے رکھے ہوئے وڈیو سیٹ پر کیا دیکھ رہا ہے، گھر میں چھپا کر کیا دیکھا جا رہا ہے، اتفاق سے اس پر نظر پڑ سکتی ہے اور تجسس بھی بچے سے یہی کام کروا سکتا ہے۔ برہنہ فلموں کا بنانا، عوام کو دکھانا اور ان میں ان فلموں کو دیکھنے کا شوق پیدا کرنا فاشی کی ایک قسم ہے۔ فاشی یعنی پورنوگرافی کی تعریف یوں بیان کی جا سکتی ہے کہ: جنسی عمل کے اظہار کا ایسا واضح اور غیر مبہم، بصری یا بیانیہ طریقہ جو جمالیاتی کی جگہ شہوانی جذبات کو تصاویر، سنگ تراشی یا تحریر میں تحرک دیتا ہے۔ اس میں ہم موجودہ دور میں لمس، صوت اور بُو کو بھی شامل کر سکتے ہیں، کیوں کہ جدید پورنوگرافر یہ تین لذتیں بھی اپنی تخلیقات میں فراہم کر سکتے ہیں۔ برہنہ فلموں کو عرفِ عام میں بلیو فلمیں کہا جاتا ہے، یعنی نامہذب فلمیں، ان کے دوسرے نام ہیں: ’ننگی فلمیں‘، ’اُگھاڑی فلمیں‘: یہ وہ فلمیں ہیں جو ایک خاص مقصد کے لیے بنائی جاتی ہیں (۱) ان کے لیے جن کے ذوق پہلے ہی سے برگشتۂ اخلاق ہیں (۲) نئے لوگوں کو اس شوق میں شامل کرنے کے لیے۔

جنسی اعضا اور فعل کے فطری اور غیر فطری اظہار کے جو عکس گھپاؤں، عبادت گاہوں اور رنگ شالاؤں کی دیواروں، چھتوں، فرشوں سے لے کر پینٹنگز اور پبلک مقامات، بیت الخلاؤں جیسی جگہوں پر دیکھنے میں آتے تھے اپنی جگہ پر اس حد تک محدود تھے کہ عام گھر، دکانیں اور تعلیم گاہیں اس کی لپیٹ میں نہ تھیں۔ غاروں میں پتھروں پر مرتسم ان تصاویر اور مناظر کو زندگی میں ایک دو بار ہی دیکھا جاسکتا تھا۔ محدود تعداد میں چھپنے والی کتابوں تک بس چند ہی کی رسائی تھی۔ چھاپے خانوں کی ترقی کا ایک حاصل یہ ہوا کہ یہ تصویریں اپنی بھدی شکل میں گھر گھر پہنچنے لگیں، اور بے حرکت فوٹوگرافی اور پھر متحرک فوٹوگرافی نے انھیں اپنی پوری سحرانگیزی کے ساتھ پوری سوسائٹی کے لیے عام کردیا۔ یہ عمل بیسویں صدی کے شروع میں قدرے سست تھا، تیسری چوتھائی میں اس نے ایک پھیلتی ہوئی صنعت کی جگہ لے لی اور آخری چوتھائی میں اس صنعت نے عوام میں اپنی ضرورت پیدا کرالی۔ بالکل ویسے ہی جیسے ہیروئن کی کسی سوسائٹی کو ضرورت نہیں ہوتی لیکن ایک بار اگر اُس میں اُس کی اجازت دے دی جائے تو کتنے ہی اُس کے ضرورت مند پیدا ہوجاتے ہیں۔

جنس صوتی کیسٹوں کی شکل میں بھی بکتی ہے، ٹیلی فون پر بھی اُس تک پہنچا جاسکتا ہے کہ 'جنس طلب' ایک نمبر گھمائے اور جنس کو مہمیز کرنے والی آوازیں سنے۔ اس کے لیے اسے ٹیلی فون کلب کا ممبر بننا پڑتا ہے، لیکن بلیو فلموں کے آنے تک بلیک اینڈ وھائٹ ننگی تصویروں کے کارڈ اور رنگین رسائل عام ہوچکے تھے مشہور عبادت گاہوں کے دروازوں پر جنسی صوتی کیسٹیں بکنے لگے تھے اور جب یہ چیز اثر پذیر، بلکہ اثر کے جُویا دماغوں میں اپنی جگہ پیدا کرچکی تھی اور وہ ایک نشے کے بعد دوسری قسم کے نشے کے طلب گار کی طرح مزید کے منتظر تھے، تو ننگی جنسی مُووِیز کا ہماری زندگی میں سیلاب آگیا۔ پہلے یہ فلمیں ۸، ۱۶ اور ۳۵ ملی میٹر کی ریلوں تک محدود تھیں اور انھیں دیکھنے کے لیے پروجیکٹرز اور سینما ہالوں کا سہارا لینا پڑتا تھا۔ پروجیکٹرز اور اسکرین کے مالکان پیسے والے ہوتے تھے اور اپنے اوطاقوں بیٹھکوں اور گھر کے مردانہ حصوں میں انھیں دیکھتے اور دوستوں کو دکھاتے تھے، جن سے کبھی کبھی گھر کے نوکر اور بچے بھی چوری چھپے لطف اندوز ہولیتے تھے۔ وڈیو سسٹم نے جہاں کھوئی ہوئی آرٹ فلموں کو دُوسری زندگی دی اور مثبت کردار ادا کیا وہاں اس کی چھپی ہوئی صلاحیت سب سے پہلے اُن اداروں پر عیاں ہوئی جو سوسائٹی میں بے مہار جنس کی کبھی ختم نہ ہونے والی مانگ سے آگاہ تھے۔ یہ فلمیں کتنے ہی سینما ہالوں میں خصوصی شوز کی طرح دکھلائی جانے لگیں اور ان شوز کا ٹکٹ عام فلم شو کے ٹکٹ سے زیادہ رکھا گیا۔ پھر دوسرے سینما ہاؤسز نے تماش بینوں کی تعداد بڑھانے کے لیے عام فلم شو کے درمیان 'پورنو' فلموں کے حصے دکھانا شروع کردیے۔

زیادہ سے زیادہ بکنے والوں تک پہنچانے کے لیے چھاپے خانوں، ریستورانوں اور ہوٹلوں

نے ٹیلی ویژن اسکرین پر ویڈیو پلیئر سے یہ فلمیں دکھانی شروع کیں اور رفتہ رفتہ یہ فلمیں قصبوں اور دیہاتوں کے آٹھ آٹھ دس دس سال کے لڑکوں تک بھی پہنچ گئیں۔ جو چیز سینما ہال کے 'صرف سیکس شو' میں اس وقت بھاری قیمت ادا کر کے دیکھی جاسکتی تھی، اب وہ ان تام چینی کی نیلی کیتلی کے چائے خانوں اور آسمان تلے گھرے کھانوں کے ہوٹلوں میں اس سے ۱/۵ قیمت میں دیکھی جاسکتی ہے۔ ان مُوویز کی طلب اتنی بڑھ چکی ہے کہ جنس نا آسودہ عورتیں اور جوانی کی دہلیز پر کھڑی لڑکیاں انھیں گھر اور محلّے کے بچّوں سے ویڈیو کیسٹ کی دکانوں سے منگواتی ہیں جس طرح ایک زمانے میں پرائیویٹ لائبریریوں سے وہی وہانوی قسم کی کتابیں منگوا کر پڑھی جاتی تھیں، لیکن ان کی تعداد بہت کم ہوتی تھی۔

ننگی فلموں سے ایک قدم پیچھے ہٹ کر دیکھا جائے تو پتا چلتا ہے، یہی حشر فیچر فلمیں بھی بپا کر چکی ہیں اور کر رہی ہیں۔ اُردو ہندی، انگریزی، عربی اور ہماری صوبائی زبانوں میں بننے والی فلموں میں اب اس طرح کے مناظر عام ہیں۔ جس گھر میں بچے وڈیو دیکھ رہے ہوں، وہاں اگر اُن کے بڑے آجائیں اور کوئی نیم برہنہ یا برہنہ سین شروع ہو جائے (یورپین اور امریکی فلموں میں مع اپنی تمام تفصیل کے) یا پردے پر ہو تو بچے فلم کو فاسٹ فورورڈ، یا فریز کر دیتے ہیں یا بڑے جھینپ کر خود ہی وہاں سے اٹھ جاتے ہیں۔ بڑے چھوٹوں میں اتنا لحاظ بھی کتنے دنوں کا مہمان ہے، بس دیکھا چاہیے۔ جن گھرانوں میں آج سے پچاس سال پہلے بچوں کے فلم دیکھنے پر پابندی تھی، وہاں بچے تھوڑے بڑے ہوتے ہی چھپ کر سینما ہال پہنچنے لگتے، بات کھل جانے پر پٹتے، ان کی سرزنش ہوتی اور ان میں سے اکثر ڈھیٹ بن کر زیادہ پابندی سے فلمیں دیکھنے لگتے۔ آج جن گھروں میں ویڈیو سسٹم یا ڈش پر پابندی ہے وہاں کے بچے دوسرے 'آزاد' گھرانوں میں جا کر اپنی یہ لت پوری کرتے ہیں۔ میرے علم میں مریض لڑکیوں کے انٹرویوز پر مشتمل ایسے انکشافات بھی شامل ہیں کہ اس قسم کی دعوتیں اعلیٰ عہدوں پر فائز افسروں، تاجروں، جاگیرداروں، بڑے زمیں داروں اور سیاسی کرداروں کے گھروں میں دی جاتی ہیں، جن میں وہ لڑکیاں بھی اکثر شامل ہوتی ہیں جن کے گھروں نہ ڈش (کیبل) ہیں نہ وڈیو سسٹم۔ چھوٹے گھروں میں ایسی دعوتیں ناممکن ہیں۔ لڑکیوں کے اعلیٰ ہوسٹلوں میں بھی وقت گزاری کا یہ مشغلہ جاری رہتا ہے جن میں ہوسٹل کی نگراں اور بعض معلمائیں بھی شریک ہوسکتی ہیں۔

ایسے تجربے سے پہلی بار گزرنے والی لڑکی، یعنی وہ جسے گھر دعوت کے لیے بلایا گیا ہو اور جسے اچانک اپنی ہم عمروں میں ایسے نظارے کا سامنا کرنا پڑ جائے، اکثر شدید ذہنی پریشانی کا شکار ہو جاتی ہے۔ اُسے گناہ کا سانپ ڈسنے لگتا ہے کہ میں وہاں گئی ہی کیوں تھی، وہاں سے اُٹھ کیوں نہیں گئی، کیوں ڈٹی رہی! بس اس لیے کہ اٹھ کھڑی ہونے پر پاس والیاں ہنسیں گی کہ بڑی پارسا بنتی ہے، اور جب وہ برہنہ جسم اور ان کی حرکات اُس کے دماغ سے نہیں ہٹتے بلکہ ہٹانے کی کوشش میں اور بڑھتے

جاتے ہیں تو وہ کبھی ختم نہ ہونے والی دعاؤں کا سہارا لیتی ہے، نیند کھو بیٹھتی ہے اور کبھی کبھی عارضی طور سے ذہنی توازن بھی۔ یہ اس کا پہلا بصری جنسی تجربہ ہوتا ہے اور یوں فطرت سے وہ غیر فطری طریقے سے روشناس ہو جاتی ہے۔ لڑکوں اور مردوں کے ہوسٹلوں میں (خصوصاً جو سیاسی پارٹیوں کی لپیٹ میں ہوں) یہ شو ٹیلی وژن اسکرین تک ہی محدود نہیں رہتے، ان کے ساتھ دوسری رنگ رلیوں کا انتظام بھی کیا جاتا ہے۔ یوں بھی زیادہ کم عمری سے سینما ہالوں چائے، خانوں، بیت الخلاؤں اور سوکھی ندیوں پر بنے ہوئے پلوں کے ستونوں پر بنے ہوئے آرٹ کے نمونوں کو دیکھنے کے عادی ہونے کی وجہ سے ان کو پہلی بار وڈیوں پر مکمل برہنہ فلم دیکھنے سے وہ ذہنی جھٹکا نہیں لگتا جو لڑکیوں میں دیکھنے میں آتا ہے۔ آرٹ کی یہ قسم زنانہ بیت الخلاؤں میں کم دیکھنے میں آتی ہے۔

جن گھروں میں وڈیو سسٹم نہیں ہے یا اگر ہے تو منتخب فلموں کی ذاتی لائبریری نہیں ہے اور گھر کے بڑے ایسے نہیں ہیں کہ بچے ان کے ڈر سے تھر تھر کانپیں، وہاں بچے کبھی کبھی اس وقت کی کوئی مشہور انگریزی، بھارتی یا مقامی زبان کی فلم کو وڈیو شاپ سے منگا کر دیکھنے کی فرمائش کرتے ہوئے اپنے بڑوں کو مکمل معصومیت سے یقین دلاتے ہوئے کہتے ہیں، 'بالکل صاف فلم ہے آپ بھی دیکھ سکتے ہیں' یہ وہ جملہ ہے جو ان کے ماحول کی فضا میں رچا ہوا ہے۔ ان فلموں کا جہاں بڑوں کی جنسی اور ذہنی زندگی پر اثر ہوا ہے، وہیں بچوں اور نوجوانی میں داخل ہونے والوں پر بھی یہ اثر واضح ہے جو ان کی قبل از وقت نشوونما کا باعث ہیں۔ ایک سات آٹھ سال کا لڑکا (یا لڑکی) ان جنسی تفاصیل سے آناً فاناً، بغیر تدریجی بلوغت کے واقف ہو جاتا ہے جو گھریلو اور ماحول کی معصوم سچائیوں کی عمارت کو ڈھا دیتی ہے۔ وہ جو کچھ دیکھتا ہے تصور میں اس کے کردار اور اس کے ماں باپ، عزیز رشتے دار سب ہی بن جاتے ہیں اور وہ اپنی عمر کے دوسرے تقاضوں، دوسری دل چسپیوں کو بھلا کر عملی جنسی زندگی کا آغاز کر لیتا ہے۔ یہ سب پہلے بھی تھا، لیکن اس کے محرکات نہایت محدود تھے۔ بچوں کا ذہن نسبتاً ایک بڑی عمر تک زندگی کے دوسرے چیلنجوں کا مقابلہ کرنے کے لیے آزاد رہتا تھا۔ جنسی زندگی اپنی فطری شکل میں آہستہ آہستہ اس پر تعلیم اور کائنات سے آگاہی کے ساتھ ساتھ کھلتی جاتی تھی، نہ کم نہ زیادہ اور وقت آنے پر اس کا جنس کے بارے میں ایک صحت مند نظریہ ہوتا تھا، ہوس ناکی کا نہیں۔

۱۹۷۳ء سے (اب ۱۹۹۶ء ہے)، میں نے اپنی پریکٹس کے شروع ہی میں، توقع کے مطابق، مریضوں کی ایک خاصی بڑی تعداد کو اس کا منتظر پایا کہ اُس کے جنسی مسائل پر بات کی جائے۔ ان میں سے بعض اپنی مشکل کا اظہار صاف الفاظ میں کرتے ہیں، بعض بازاری زبان میں، زیادہ تر چھپے الفاظ میں۔ عورتوں اور لڑکیوں کے ان مسائل کو بیان کرنے کی اپنی زبان ہوتی ہے۔ بر سائیکیا ٹرسٹ اپنے مریض سے انٹرویو کو اپنے دور اور ماحول کے مطابق شعوری یا غیر شعوری طور سے ڈھالتا جاتا

ہے۔ جو سوالات نیو یارک یا لندن میں کیے جا سکتے ہیں، بہ آسانی کراچی یا دہلی میں نہیں کیے جا سکتے۔ نہ شکاگو یا برمنگھم کا مریض جو پہلے ہی انٹرویو میں کہہ ڈالتا ہے، وہ لاڑکانہ یا سوات کا مریض دوسرے انٹرویو تک میں کہہ نہیں پاتا۔

شروع شروع میں ضرورت کے مطابق، اپنے وقت پر جنسی مسائل کے بوجھ کی وجہ سے میں مردوں اور لڑکوں سے ان کے صرف مخالف جنس سے تجربات کے بارے میں معلومات حاصل کرتا تھا جن میں سے ان کی مشکلات سر نکالے باہر جھانک رہی ہوتی تھیں۔ درونِ ازدواج یا بیرونِ ازدواج دونوں ہی مشکلات کا بحیثیت معالج مجھے سامنا کرنا پڑتا تھا۔ بیرونِ ازدواج جنسی مشکلات کا رونا رونے والوں کی روحوں کو میں نے بہت ہی کم گھائل پایا، یعنی وہ اپنے طور طریقے بدلنے کے بارے میں غور نہیں کر رہے تھے۔ بہت جلد ایک دوسری متوقع جہت سے مریضوں نے مجھے اپنی مشکلات سے آگاہ کرنا شروع کیا، جنھیں خوش فہم مشرق کی روحانیت کے حامی صرف مغرب تک محدود سمجھتے ہیں، یعنی دو ایک ہی جنس والوں کے مابین جنسی مشکلات اور ناکامیاں اور ساتھ کھو بیٹھنے پر اُداسی۔ عورتیں اس کی بہت کم شکار نظر آئیں۔ پھر معاشرے میں پائی جانے والی تیسری جنسی خرابی آہستہ آہستہ کُھل کر میرے سامنے آنے لگی، یعنی وہ چیز جس کا ذکر پرانی 'جورس پروڈنس' کی کتابوں میں بطور عجوبے کے قابلِ تعزیر یا قابلِ سزا واقعات کے ذیل میں آتی تھیں اور جنس اور نفسیات کی کتابوں میں بھی۔ میرا اشارہ اُس جنسی فعل کی طرف ہے جس کا ذکر ادب کا نوبل انعام پانے والے مصنف گابرئیل گارسیا مارکیز کے ناول 'تنہائی کے سو سال' میں یوں آیا ہے: 'ایک لڑکے نے جو دیکھا ہے، اس پر وہ متعجب ہے اور پادری اُس کی بات سن کر سرسری طور سے کہتا ہے، ہاں، کچھ لوگ مادۂ خر سے بھی اپنا کام نکال لیتے ہیں'۔

پہلے اس فعل کو صرف کم عقل چرواہوں تک محدود سمجھا جاتا تھا اور میں بھی یہی سمجھتا تھا لیکن بعد میں اس سے متعلق سوالات، جہاں ضروری ہوں، میرے انٹرویو کا حصہ بن گئے اور میں نے اس جنسی علت کا، قصبوں اور چھوٹے بڑے شہروں کے پڑھے، بے پڑھے افراد کو بھی شکار پایا گیا۔ ان میں وہ بھی تھے جو شادی شدہ تھے۔ مادۂ خر اس کی سب سے زیادہ شکار ہوتی ہے۔ مادۂ سگ دوسرے نمبر پر آتی ہے۔ نمبر ایک اور نمبر دو کی طرح اس فعل کے مرتکب مردوں کے ضمیر کو بھی میں نے کبھی کلبلاتے نہیں پایا (سوائے کوالالمپور میں ایک ملائے نوجوان کے، کیوں کہ وہاں یہ شغل بہت کم ہے)۔ ایک چیز تھی جو ہو گئی یا ہو جاتی ہے۔ پچھتاوے سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ تجربے کار ہو جانے پر بڑی عمر والے تنِ تنہا یہ کام کر گزرتے ہیں۔ پرانی داستانوں اور مثنویوں میں جو پڑھنے میں آتا ہے، یہ عمل عورتوں میں میرے سننے میں بہت کم آیا، لیکن اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ میرے انٹرویو میں اس سوال کی بالعموم ضرورت نہیں ہوتی ہے۔ مردوں میں فی الفور اخراج کی ذمے داری اس فعل پر بھی آتی ہے۔ بلیو فلموں میں عورتوں کو

بھی اس بے راہ روی میں شریک کار دکھایا جاتا ہے (یہ تمام تفاصیل انٹرویوز پر مبنی ہیں)۔

جنسی زندگی سے متعلق جو چوتھی حقیقت پہلے کبھی کبھی، پھر تواتر سے میرے سامنے آنے لگی وہ تھی برہنہ فلموں کا لوگوں کی ذہنی اور جنسی زندگی پر اثر۔ ان میں سے اکثر نے بلیو فلموں کو دیکھتے ہوئے آنکھیں کھولی ہیں اور جو بہت سرعت سے جنسی زندگی کے حقائق سے وقت سے پہلے آگاہ ہو گئے۔ اکثر میں اس شوق کی جڑیں اتنی مضبوط ہوتی ہیں جتنی ہیروئن کی عادت جسے ترک کرنے کے بعد اس کا عادی بار بار اس قعر میں گرتا ہے۔ ایک طرح کی مجبوری جیسے پاکستانی تناظر میں پیروں اور کپڑوں پر چھینٹے پڑ جانے کا وہم، جس کی شکار ہونے والی عہد کرتی ہے کہ اب میں کپڑے اور پیر نہیں دھوؤں گی لیکن خیالات سے تھوڑی دیر جنگ کرنے کے بعد پھر پیر اور پائنچوں کو دھونے بیٹھ جاتی ہے۔ برہنہ فلموں کو دیکھنے کے کمپلشن کے شکار مریض اکثر نہیں جانتے کہ ان کی جنسی تشنگی میں ان فلموں کا کتنا دخل ہے اور یہ چیز صرف عمیق انٹرویوز ہی سے کھل کر سامنے آتی ہے۔ جس کے لیے سائکیاٹرسٹ کو وقت صرف کرنا پڑتا ہے، جس میں جنسی ناکافیت کے ارتقا کو وہ مریض کے تعاون سے پرسکون گفتگو کی ٹھک ٹھک سے جو آثار قدیمہ کو کھود کر نکالنے والے نازک آلات کی طرح کام کرتی ہے، دریافت کر پاتا ہے۔ کھود کر نکالنے والا اوزار خواہ لوہے اور لکڑی کا ہو، خواہ عدالت میں کیے جانے والے براہ راست اوکھڑ سوالات کا، زمین اور ذہن میں پوشیدہ آثار کو تباہ کر سکتا ہے۔

ننگی فلموں کو دیکھنے کی پختہ عادت اکثر دوسری ناپسندیدہ عادات کی ہم سفر ہوتی ہے۔ اس کے مریض (باقاعدہ انٹرویوز پر مبنی نتائج کے پیش نظر) یا تو نشہ آور اشیا کے تجربات بھی ساتھ ساتھ کر رہے ہوتے ہیں یا ان کے عادی ہوتے ہیں، لیکن جو چیز زیادہ دیکھنے میں آتی ہے وہ یہ ہے کہ پابندی سے 'نیلی' ننگی یا اگھاڑی فلمیں دیکھنا، دوسری جنسی کج رویوں میں سے ایک ہے اور اس کے شکار اگر وہ نہیں ہوتے جنھوں نے ان فلموں کو دن رات دیکھ کر خود کو جنسی طور سے ناکافی بنا لیا ہے، تو وہ ہوتے ہیں جو کسی بھی وجہ سے پہلے ہی سے جنسی طور سے ناآسودگی کا شکار ہیں۔ مؤخر الذکر کے لیے یہ فلمیں لذت آسودگی کا ایک بڑا ذریعہ بنتی ہیں۔ ان انٹرویوز سے یہ بات بھی سامنے آتی ہے کہ برہنہ فلموں کو دیکھنے کی عادت ان طلبا میں زیادہ ہے جن کے سامنے زندگی کا کوئی اعلیٰ مقصد نہیں ہے۔ نہ پڑھنے والے، نقل کر کے پاس ہونے والے، سیاسی تنظیموں سے وابستہ نوجوان اور وہ جنھیں اُن کے دانشوروں نے اخلاقی جھنجھٹوں سے آزاد کر دیا ہے، زیادہ تعداد میں اس عادت کے شکار نظر آتے ہیں۔ ایسے نوجوان بھی تجربے کر چکے ہوتے ہیں اور بالعموم دو باتوں کا رونا روتے نظر آتے ہیں 'احساسِ محرومی' (مجھے محبت نہیں ملی) اور 'احساس کمتری'۔ خود دوسروں کے لیے انھوں نے کیا کیا ہے، دوسروں کو کتنی محبت دی، اس سے انھیں کوئی سروکار نہیں ہوتا۔ یہ کبھی مطمئن نہ ہونے والی محرومی، جو کہ غیر حقیقی ہوتی ہے اس کی آسودگی کے

لیے غیر حقیقی ذرائع بھی ڈھونڈتے ہیں ان میں نشہ آور اشیا کا استعمال، جوا، جنسی بے راہ رویاں، دوسروں پر جبر اور ظلم، موٹر سائیکلوں اور کاروں کو برق رفتاری سے دوڑانا، جرائم میں شمولیت کا لطف اور بھی کچھ شامل ہے۔

جو دلچسپی نوجوانوں اور طلبا کو برہنہ فلموں سے ہے وہی زندگی کے اوپر کے ڈانڈوں پر بیٹھے ہوئے، بڑے بڑوں کو بھی ہے۔ ان کی زندگیاں بھی اتنی ہی بے مقصد ہیں اور انھیں نہیں معلوم کہ ان کے بچے کیا کر رہے ہیں، ان کے صحرا جیسے لق دق مکانوں کے کن کمروں میں کون سی فلمیں دیکھی جا رہی ہیں، کیا پھونکا جا رہا ہے، کیا پیا جا رہا ہے۔ ایسے گھرانوں میں بڑوں کا تعلق بچوں سے بس اتنا رہ گیا ہے کہ وہ انھیں امتحانوں میں پاس کرا دیں، حقیقت میں پڑھنے والوں پر سبقت کی پوزیشنیں دلوا دیں اور جب یہ بھی ہو جائے تو ان کی پسند کا عہدہ دلوا دیں۔ ایسے پیسے والے اور بارسوخ افراد اعلیٰ تعلیم کے وظیفے، جو مستحق طلبا کو ملنے چاہئیں اپنی نقل کر کے پاس کرنے والی اولاد کے لئے وقف سمجھتے ہیں اور اولاد سمجھتی ہے کہ عیش اس کے لیے بنا ہے۔ بظاہر برہنہ فلموں کے سوسائٹی اور فرد پر اثرات کے ساتھ ہیروئن، شراب اور دوسری نشہ آور اشیا کا ذکر بے محل لگتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ زندگی بسر کرنے کی یہ تمام بے ڈھنگی چالیں آپس میں مربوط ہیں۔ ایک خاص طرح کے ماحول ہی میں یہ خرابیاں پیدا ہوتی اور پھلتی پھولتی ہیں۔

ماخذ (اُردو۔۱۷)

rekhta

انٹرنیٹ

مبین مرزا

ریحان احمد یوسفی

'ویسوی'

اُنجنا سرکار

آرٹ بُک ویلڈ

فحاشی اور نئی دنیا

(ادب، بصری فنون اور انٹرنیٹ کے تناظر میں)

مُبین مرزا

آج ہماری دُنیا اگر یکسر نہیں تو اب سے تین چار دہائی پہلے کی دُنیا سے اِس حد تک ضرور مختلف ہو چکی ہے کہ اب ہم اپنے زمانے، اُس کے رُجحانات اور مسائل کے حوالے سے جن موضوعات پر بات کرتے ہیں وہ بڑی حد تک بدل چکے ہیں۔ ان نئے موضوعات میں فحاشی آج کی انسانی دُنیا کا ایک ایسا موضوع ہے جس کی بابت تمام متمدن معاشرے سوچنے پر مجبور ہیں اور کم و بیش یکساں حالات اور بے بسی کے ایک جیسے احساسات سے دوچار ہیں۔

فحاشی کوئی نیا موضوع تو ہرگز نہیں ہے لیکن آج اس نے جس طرح کے مسئلے کی شکل اختیار کر لی ہے وہ اپنی نوعیت میں اگر یکسر نہیں تو بہر حال بڑی حد تک نیا ہے اور اس سے پہلے کی تہذیبوں اور قوموں کو اس کا تجربہ تو کجا شاید ان کے لیے اس قسم کی صورت حال کا تصور بھی محال تھا۔ اس کی وجہ یہ نہیں کہ گزشتہ ادوار میں فحاشی کا مسئلہ پیدا ہی نہیں ہوا تھا۔ نہیں، بات یہ نہیں ہے۔ انسانی تہذیب کے سفر میں بہت پہلے سے ہمیں اس مسئلے کا سراغ ملتا ہے، بلکہ تاریخ دانوں نے ماقبل تاریخ کے زمانوں اور جہانوں میں بھی اس مسئلے کی نشان دہی کی ہے۔ غاروں میں رہنے والے لوگوں تک کی چھوڑی ہوئی یادگاروں میں اُن عناصر اور رُجحانات کے واضح نشانات ملتے ہیں جنھیں ہم فحاشی سے تعبیر کرتے ہیں۔ مراد یہ ہے کہ مسئلہ تو یہ پہلے بھی انسانی معاشروں میں موجود تھا لیکن اب اس کی نوعیت اور صورت بہت کچھ بدل چکی ہے۔

جدید یعنی معاصر دُنیا اصل میں انسان کے حسی تجربے سے زیادہ سروکار رکھتی ہے اور اس کے تجربے کی ماہیت ایک پرانی اصطلاح کے مطابق بیش از بیش عین الیقین کے درجے میں آتی ہے۔ یہ عہد Information Explosion کا ہے۔ چناں چہ آج انسانوں پر اور ان کی دنیا پر سب سے بڑا قبضہ ذرائع ابلاغ کا ہے۔ اس لیے معاصر دُنیا میں فحاشی کے مسئلے کو سمجھنے کے لیے ہم اس مضمون میں ممکنہ حد تک اختصار کے ساتھ عہدِ حاضر کے جن تین اہم حوالوں سے بات کریں گے، اُن میں سے ایک تہذیبی اقدار سے موسوم ہے یعنی ادب اور دیگر دو ذرائع ابلاغ سے یعنی بصری فنون (فلم وغیرہ) اور انٹرنیٹ۔

ہمارے یہاں فحاشی کے مسئلے کی نوعیت اب تک کیا تھی اور اس کی طرف ہمارا تہذیبی اور سماجی رویہ کیا رہا ہے، یہ جاننے کے لیے ہمیں ماضی بعید میں جانے کی ضرورت نہیں ہے، محض پچاس ساٹھ برس پہلے تک کی صورتِ حال پر ایک نظر ڈالنے سے بھی ہم بہت کچھ جان سکتے ہیں۔ اب دیکھیے، ہمارے یہاں ایک زمانہ تھا کہ سعادت حسن منٹو اور عصمت چغتائی اپنی صاف گوئی، بے باکی، حقیقت نگاری یا فحاشی اور ابتذال کا خمیازہ مقدمات کی صورت میں بھگتتے تھے۔ لیکن آج جب ہم اُن کے بدنام زمانہ افسانوں (مثلاً 'ٹھنڈا گوشت'، 'اوپر، نیچے، درمیان'، 'لحاف' وغیرہ) کو پڑھتے ہیں تو کہیں کہیں ذرا سی بے باکی کا احساس ضرور ہوتا ہے مگر ایسا تو کچھ اِن افسانوں میں نظر نہیں آتا کہ جس پر مقدمہ بازی، پیشیوں، جرحوں اور جرمانوں کا طومار باندھا جائے۔ تو کیا نصف صدی قبل ہمارا معاشرہ دقیانوسی، تنگ نظر اور rigid تھا اور اگر اب اس قسم کے احتسابی واقعات پیش نہیں آرہے! تو کیا ہم ماضی کے مقابلے میں آزاد خیال، کشادہ فکر اور enlightened ہو گئے ہیں، یا پھر کوئی اور بات ہے۔!

ادب و فن میں فحاشی کا مسئلہ ایک بے حد اہم موضوع ہے۔ ہر تہذیب کسی نہ کسی موقعے پر اپنے ادب اور فنون سے اس مسئلے پر سوال کیا ہی کرتی ہے۔ ہمارے یہاں اس مسئلے کی گونج پہلے پہل چالیس کی دہائی کے اواخر میں سنائی دی تھی۔ قیامِ پاکستان کے بعد ہمیں خصوصیت سے اس نوع کے بنیادی مسائل کا سامنا تھا کہ اُس وقت ایک آزاد ریاست کو وطن کی حیثیت سے حاصل کرنے کے بعد ہم نے من حیث القوم اپنی تہذیبی شناخت کی بابت سوچنا شروع کیا تھا اور اپنی اقدار کی طرف ہمارا رویہ بے حد سنجیدہ تھا بلکہ اس سنجیدگی میں شاید ایک حد تک حساسیت بھی شامل ہو گئی تھی۔ چناں چہ بعض مواقع پر یہ بھی ہوا کہ معمولی سے مسئلے کو بھی ہماری اس حساسیت نے ضرورت سے زیادہ سنگین بنا دیا۔ خیر، جیسا کہ اس طرح کی صورتِ حال میں عام طور پر ہوا کرتا ہے، ہمارے یہاں بھی وہی ہوا، وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس شدت میں کمی آتی گئی اور اب یہ عالم ہے کہ بعض واقعی سنگین قسم کے مسائل کی طرف بھی ہمارا رویہ اتنا سنجیدہ نہیں جتنا کہ ہونا چاہیے۔ فحاشی اسی قسم کے مسائل میں سے ایک ہے۔

مثال کے طور پر دیکھیے کہ جو کچھ لکھنے پر منٹو اور عصمت نے پیشیاں بھگتیں اور جرمانے بھرے، اس سے کئی گنا زیادہ فحاشی اب ہمارے اخبارات و رسائل میں عام ہے بلکہ رنگین تصاویر کے ساتھ ہے لیکن کوئی اس پر معترض نظر نہیں آتا جیسے آج یہ کوئی بات ہی نہیں ہے۔ خیر، اخبارات و رسائل تو رہے ایک طرف، اس وقت الیکٹرونک میڈیا جو کچھ دکھا رہا ہے وہ تو کسی اور ہی دنیا، کسی الگ ہی معاشرے کا سامان ہے۔ اس کے آگے تو منٹو اور عصمت کی کہانیوں میں فحاشی کے مسائل محض بے ضرر اور بچوں کی سی تفریحی باتیں معلوم ہوتے ہیں۔ آج ہم یہ سب کچھ اطمینان سے دیکھ رہے ہیں، کسی احتجاج، جھنجلاہٹ اور خوف کے بغیر۔ ظاہر ہے، اس کا مطلب تو یہی ہوگا کہ ہمارا فحاشی کا تصور یا اخلاقی اقدار کا نظام غیر

مؤثر ہو گیا ہے یا پھر بدل گیا ہے۔

یہ بات یوں تو بہت سادہ سی معلوم ہو رہی ہے لیکن واقعتاً ہے نہیں۔ اس پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔ تسلیم کرنا چاہیے کہ جنسی حسیت اور جنسی عمل ہماری زندگی کا حصہ ہے تو ظاہر ہے کہ اس کا بیان ادب اور فن کے لیے شجرِ ممنوعہ نہیں ہو سکتا۔ اس مرحلے پر ہمارے سامنے پہلا اہم سوال یہ ہوگا کہ آخر وہ کیا چیز ہے جو اس بیان کو کہیں ادب یا فن بنا دیتی ہے اور کہیں فحاشی؟ اس کومپلیکس سوال کا جامع جواب تو اصل میں اُس تہذیب اور اُس کے نظامِ اقدار کے تناظر ہی میں دیا جا سکتا ہے جس کے سیاق و سباق میں کوئی ادب پارہ تخلیق کیا جاتا اور پیش ہوتا ہے۔ تاہم اپنے سمجھنے کے لیے اگر ہم ایک سادہ سا اور عمومی اصول وضع کرنا چاہیں تو کہا جائے گا کہ جنسی حسیت یا اس کے پہلوؤں کا ایسا بیان جس میں پڑھنے یا دیکھنے والے کے لیے اُس فن پارے میں پیش کیا گیا اصل مسئلہ ثانوی درجے کا ہو جائے اور فن پارے کے مرتب کردہ اثرات کے تحت اس پر لذتیت غالب آ جائے، فحاشی میں شمار ہوگا۔

یہ طے ہے کہ ادب اور فن جسمانی ہی نہیں بلکہ ذہنی طور پر بھی بالغ اور صحت مند رجحانات کے لوگوں کی سرگرمی ہوتی ہے۔ ظاہر ہے، ان لوگوں کا جنس کی طرف وہی رویہ ہوگا جو زندگی کے دوسرے حوائج مثلاً بھوک، پیاس، نیند وغیرہ کی طرف ہوتا ہے۔ کوئی بھی صحت مند اور نارمل آدمی چوبیس گھنٹے نہ تو کھانے میں صرف کرتا ہے اور نہ ہی اس کے تصور میں غرق رہتا ہے۔ ایسا ہی کچھ معاملہ جنس کا ہوتا ہے۔ اب اگر لکھنے والا اس شعور کا حامل ہے تو جنس اور اس کے بیان کو محض زندگی کی احتیاجات اور مسائل کے تناظر میں رکھ کر دیکھتا ہے۔ اگر وہ ایسا نہیں کرتا تو خود اپنی ابنارملیٹی کو ظاہر کرتا ہے۔ مثال کے طور پر منٹو کے افسانے 'ٹھنڈا گوشت' کو لیجیے، جب تک ہم کلونت کور کی نسائی کیفیت کو پڑھتے ہیں جو ایشر سنگھ کی مردانگی کی بیداری کی منتظر ہے اور ایشر سنگھ کو دیکھتے ہیں جو اُس لمحے مرد بننے کا شدت سے آرزومند ہے تو یہ سب پڑھنے والے کے حواسوں پر اور انداز سے اثر ڈالتا ہے لیکن یک بہ یک افسانے میں ایک موڑ آتا ہے اور گھڑی بھر میں ہم کلونت کور کو ایشر سنگھ کے گلے پر کرپان پھیرتے ہوئے دیکھتے ہیں۔ پھر ایشر سنگھ وہی جوان، گبھرو اور کلونت کور کے برابر کا جوڑ ایشر سنگھ ہمارے سامنے ٹھنڈا ہوتا چلا جاتا ہے۔ جب افسانے اور اُس کے کرداروں کا اصل مسئلہ ہمارے سامنے آتا ہے اور اس طرح آتا ہے کہ انسانی زندگی کے ایک اندوہ ناک تجربے اور ایک انسان کے اُس پر ہول ناک اثرات کا منظرنامے پر ہماری نگاہ ٹھہرتی ہے تو بھلا کیسی جنسی جبلت اور کیسا حیاتی ہیجان! یہاں ہم انسانی احساس کی ایسی متغیر ہوتی ہوئی کیفیات کو دیکھتے ہیں جو ہمارے اعصاب کو شل کر دیتی ہیں۔ اور ہمارے لیے یہ تک طے کرنا ممکن نہیں رہتا کہ ہمیں افسانے اور اس کے کردار کے اس انجام سے اتفاق ہے یا اختلاف یا پھر تاسف۔ اور یہ بھی کہ زیادہ بڑا مسئلہ ایشر سنگھ کا تھا یا کلونت کور کا، ہمیں ان میں کس سے ہمدردی ہے؟ اور پھر انسان اور اس کے

عمل اور تقدیر کے سوال ہمارے ذہن میں گونجنے لگتے ہیں۔ یہ تاثر اور کیفیت پیدا ہی نہیں ہوسکتی تھی اگر اس سے پہلے منٹو نے وہ سب بیان نہ کیا ہوتا۔

منٹو ہی کے ایک اور افسانے کو دیکھیے، 'موذیل' کا مرکزی کردار... ایک شوخ، چنچل، بے باک عورت جو کہانی کے اختتام پر برہنہ حالت میں ہمارے سامنے ہے۔ لیکن اس کردار کو افسانے کی بنت میں ہم جس طرح اور جیسے حالات کے زیرِ اثر بڑھتا ہوا دیکھتے ہیں اور پھر اختتام پر آکر جس انجام سے دوچار پاتے ہیں، اُس سب کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے کسی بھی طرح ہمارے جنسی جذبے کو تحریک نہیں ملتی۔ اس کے برعکس اس کی برہنگی کا جو جواز ہمیں ملتا ہے، وہ اتنا بڑا اور اہم ہے کہ ہماری ساری توجہ اسی پر مرکوز ہو کر رہ جاتی ہے اور موذیل کے برہنہ جسم کی طرف ہمارا دھیان جاتا ہی نہیں۔ اُس وقت موذیل نے یہ برہنگی جس انسانی صورتِ حال میں اختیار کی ہے وہ ہماری توجہ کا اصل مرکز بن جاتی ہے۔ چناں چہ موذیل کا گورا جسم ہمیں کسی لذت کی طرف مائل کرنے کی بجائے انسانی بربریت اور اس کے گھناؤنے پن پر سوچنے پر مجبور کرتا ہے اور ہم موذیل کو مسکرا کر موت کے منہ میں جاتے ہوئے دیکھ کر ایک طرف گہری افسردگی سے دوچار ہوتے ہیں اور دوسری طرف ہمارے دل میں یہ کھد بھد ہوتی ہے کہ جس کرپال کور کو بچانے کے لیے موذیل نے جان واردی، کیا ترلوچن سنگھ موذیل کے پاس سے اٹھ کر اُس کو مجمعے کے وحشیانہ جذبات کی بھینٹ چڑھنے سے بچا کر نکال لے جانے میں کامیاب ہوا کہ نہیں۔

اسی طرح سولژے نتسن کے ناول 'کینسر وارڈ' کی اس عورت کو یاد کیجیے جو سینے کے سرطان میں مبتلا ہے اور ڈاکٹر آپریشن کر کے اس کی چھاتی کاٹنے جا رہے ہیں۔ آپریشن سے پہلے اُسے خواہش ہوتی ہے کہ اس کا منگیتر آکر اسے ایک بار سر سے پاؤں تک عریاں حالت میں دیکھ لے۔ اس خواہش کو پڑھتے ہوئے ایک لمحے کے لیے ہمیں اس میں ابتذال کا احساس ہوتا ہے اور کم سے کم ایک بار تو پڑھنے والے کا دھیان ایک نوجوان عورت کے ہیجانی جذبات کی طرف ضرور جاتا ہے، اُس کے جسمانی تقاضوں کی شدت کا خیال آتا ہے لیکن اگلے ہی لمحے یہ احساس اس وقت کافور ہو جاتا ہے جب ہمیں پتا چلتا ہے کہ اُس عورت کی اس خواہش کا محرک وصال کا جذبہ یا لذت کا حصول نہیں ہے بلکہ یہ المیہ خیال ہے کہ آپریشن کے بعد وہ پورے وجود کی عورت نہیں رہے گی۔ اس لیے وہ چاہتی ہے کہ کم سے کم ایک بار تو کوئی اس کو ثابت و سالم حالت میں دیکھے، اس کے پورے وجود کی گواہی دے۔ جب ہم کردار کے اس المیے کو share کرتے ہیں تو ہمیں کسی قسم کی فاشی اپنی طرف متوجہ نہیں کرتی بلکہ انسانی وجود کی ایک ٹریجڈی ہمارے پیشِ نظر ہوتی ہے اور اس مسئلے کی سنگینی یہ تک فراموش کرا دیتی ہے کہ یہ مسئلہ عورت کا ہے یا مرد کا بلکہ ہم صرف انسانی وجود کے المیے میں کھو کر رہ جاتے ہیں۔ ہمارے ذہن سے عورت، اُس کی جوانی اور اُس کی نسوانی شناخت کے اعضا اس لیے محو ہو جاتے ہیں کہ ہم ایک انسانی وجود کی زندگی اور

موت کی حدوں کو پہنچی ہوئی بے بسی کے مسئلے میں الجھ جاتے ہیں۔ موت اپنی تمام تر ہولناکی کے ساتھ ہمارے سامنے آجاتی ہے۔ تب ہم زندگی کو سکڑتا، سمٹتا اور اپنی بقا کے لیے اپنی شناخت کی تمکنت تک سے دستبردار ہوتا دیکھتے ہیں۔ ایسی صورت میں بھلا اس بات کا دھیان کسے آئے گا کہ عورت اپنے پورے وجود کے ساتھ کیسی لگتی ہے یا اُس کے جسمانی خطوط کا نظارہ کیا معنی رکھتا ہے۔ یہاں تو سوال سیدھا اور صاف ہے یعنی زندگی یا موت!

اب ذرا میلان کنڈیرا کے ناول کا وہ نسوانی کردار یاد کیجیے جسے جبری ہجرت نے اکھاڑ پھینکا ہے۔ وہ عورت اپنے خطوط حاصل کرنا چاہتی ہے جو چھوڑے ہوئے وطن میں اُس کے گھر میں رہ گئے ہیں۔ ان خطوط کی اہمیت یہ ہے کہ یہ اُس کے شوہر نے اُسے لکھے تھے۔ اب جب کہ شوہر نہیں رہا، یہ خط اس کی زندگی کا سب سے بڑا سرمایہ ہیں۔ ایک کمینہ پروفیسر اُس کی اس جذباتی ضرورت کو exploit کرکے اختلاط کی راہ نکالتا ہے۔ وہ اُسے باور کراتا ہے کہ اُسے بخوبی احساس ہے کہ یہ خط بیوی کی حیثیت سے مرحوم شوہر کی یادگار کے طور پر اُس کے لیے کیا جذباتی وقعت رکھتے ہیں۔ وہ اُس سے وعدہ کرتا ہے کہ چاہے اُسے کتنا ہی خطرہ کیوں نہ مول لینا پڑے لیکن وہ اُس کے وطن جائے گا اور اُسے وہ خط لاکر دے گا۔ عورت جو خود اب جسمانی ضرورتوں سے ذہنی طور پر بے نیاز ہو چکی ہے، اپنی بے زبان طلب کا شعور رکھنے اور لاینحل مسئلے میں مدد کے وعدے پر کسی حیل و حجت کے بغیر اور امیدوں کے نام پر اس پروفیسر کو اپنا آپ سونپ دیتی ہے۔ کنڈیرا نے اس سارے قصے کو شرح و بسط کے ساتھ ناول کا حصہ بنایا ہے، لیکن یہ پورا واقعہ کہیں بھی فحش نہیں ہو پاتا کہ اس میں کردار کا جذباتی بحران مسلسل ہماری توجہ کا مرکز بنا رہتا ہے اور ہم باقی سب باتوں سے سرسری گزرتے چلے جاتے ہیں۔

آیئے، اب لگے ہاتھوں ایک ڈیڑھ مثال فلم کی بھی دیکھ لیجیے۔ 'رام تیری گنگا میلی' راج کپور کی فلم تھی۔ جب یہ فلم سینسر کے لیے گئی تو بورڈ نے اس کے ایک سین پر جس میں مرکزی نسوانی کردار اپنے بچے کو بھرے بازار میں دودھ پلانے بیٹھتی ہے اور کیمرہ ایک لمحے کو اس کے اس آسن کو فوکس کرتا ہوا گزر جاتا ہے، قابلِ اعتراض گردانا۔ راج کپور نے اعتراض کو تسلیم کرنے سے انکار کیا اور اس کا مقدمہ لڑتے ہوئے کہا کہ پہلی بات وہ عورت چھاتی کی نمائش نہیں کر رہی بلکہ وہ تو صرف اور صرف ایک ماں ہے جو اپنے بچے کو دودھ پلانے بیٹھی ہے۔ دوسرے یہ کہ اس پر پہلے ہی ایسی افتاد گزرتی دکھائی گئی ہے کہ اُسے کچھ ہوش ہی نہیں کہ وہ کہاں ہے اور کس حال میں ہے۔ اگر اس عورت کو اس کی بپتا کے ساتھ اور پیش آنے والے واقعات کی پوری صورتِ حال میں دیکھا جائے گا تو اس کے مسئلے کی نوعیت واضح ہو سکے گی ورنہ نہیں۔ یہ ٹھیک ہے، اگر ہم ایک عورت کو دیکھتے ہیں تو اس کے اعضا پر ہماری نگاہ کسی اور طرح پڑتی ہے لیکن جب ہم ایک ماں کو دیکھتے ہیں تو ہمارا زاویۂ نگاہ بالکل بدل جاتا ہے۔ اپنے دلائل سے راج

کپور اپنی فلم کو سینسر سے جوں کا توں پاس کرانے میں کامیاب رہا۔

ایک اور مثال دیکھیے۔ فلم کا نام ہے 'Roots'۔ یہ اصل میں ایلکس ہیلے کے ناول کی کہانی ہے جسے فلمایا گیا ہے۔ یہ ناول خود اپنی جگہ ایک بڑی مثال ہے۔ اس ناول میں ایک سے زائد مقامات پر مصنف نے کرداروں کا ماجرا بیان کرنے اور اُن کا احوالِ واقعی سنانے کے لیے بعض ایسے واقعات بھی قلم بند کیے ہیں جو ذرا سی بے احتیاطی کے باعث obscenity گردانے جاتے لیکن ایلکس ہیلے نے کرداروں کی ماجرائیت کو اس رنگ میں لکھا ہے کہ پڑھنے والے کی نگاہ اُن کے جسم سے کہیں زیادہ ان کی روح کے کرب پر مرتکز رہتی ہے۔ اس ناول پر فلم بھی بنی ہے اور ڈراما سیریئل بھی۔ فلم میں جب یہ سین آتا ہے کہ پہلے مرکزی کردار کی بیٹی کو اُس کا مالک ناراض ہو کر فروخت کر دیتا ہے اور اُس کا نیا مالک لا کر اُسے ایک اندھیرے کمرے میں ڈال دیتا ہے۔ پھر دن ڈھلے وہ اُس کے پاس آتا ہے، اور اب وہ اُس سے جسمانی لذت کے حصول کا خواہاں ہے۔ یہ واقعہ ناول میں بھی ہے اور فلم میں بھی۔ فلم کے ڈائریکٹر نے بھی اس سین کو ہنرمندی سے فلمایا ہے۔ یہ پورا سین ہمارے سامنے ایک بے بس لڑکی کی ابتلا کی صورت گزرتا چلا جاتا ہے۔ مالک کی دست درازی، لڑکی کا پسپا ہوتا ہوا احتجاج اور پھر وہ سب کچھ جس کا ایک مرد، عورت کے جسم سے متمنی ہوتا ہے۔ فلم کے ڈائریکٹر نے اس سین کو بلکہ آگے بھی جو ایسے سین آئے ہیں انھیں نہ صرف یہ کہ احتیاط سے شوٹ کیا بلکہ اُس نے اپنے فن کاروں سے جو کام لیا ہے اور سین کی ضرورت کو پورا کرنے، اُسے حقیقت بنانے کے لیے جیسے تاثرات ریکارڈ کیے ہیں، وہ اس فلم کو اوبسین نہیں ہونے دیتے۔ مثال کے طور پر جس سین کا ابھی ذکر کیا گیا اُس میں لڑکی کو جس طرح دکھایا گیا ہے وہ ہم پر ایک بے بس، مجبور اور بے آسرا لڑکی کا مکمل تاثر چھوڑتی ہے۔ اُس کا مالک اُس کے ساتھ جو سلوک کر رہا ہے اُس میں اس کی شمولیت لاچاری کے باعث ہے۔ اس کی کیفیت اور مجبوری کو دیکھتے ہوئے ہم یہ محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکتے کہ وہ وجودی طور پر تو بے شک انسان ہے لیکن اُس کے ساتھ سلوک ایسا ہی کیا جا رہا ہے جیسے خریدے ہوئے جانوروں کے ساتھ اُن کے مالک کیا کرتے ہیں، یعنی جب چاہا باندھ کر رکھا جب چاہا چرنے کو چھوڑ دیا، جب تک جی چاہا پالتے رہے اور جب جی چاہا ذبح کر لیا۔ اُس لڑکی کا کردار اور اُس پر گزرتی افتاد ہمارے اندر یہی احساسات پیدا کرتے ہیں اور یہی وہ شے ہے جو اس سین کو x rated نہیں بننے دیتی بلکہ انسانی المیے کی طرف ہمیں متوجہ رکھتی ہے۔ اور ہم اس ایک کردار کی نسبت سے انسانی تہذیب، اُس کے تمدنی سفر اور اخلاقی نظام اور اقدار کے تصور ایسے سوالوں پر سوچتے ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ ہمارا ذہن انسانی زندگی کی حقیقت اور اُس کی تقدیر پر غور کرتا ہے۔ تو اصل میں یہ بات کوئی اہمیت نہیں رکھتی کہ وہ کوئی ادیب ہے یا فلم کا ڈائریکٹر اور اُس کا میڈیم کیا ہے، پڑھنے والا یا دیکھنے والا اُس کے کام سے کیا تاثر لے رہا ہے، اہمیت حقیقتاً اس کی ہے۔

چناں چہ جو مسئلہ اپنے فن میں اُس نے پیش کیا ہے اگر وہ واقعی اتنا بڑا ہے کہ ہم اسے خالص انسانی سطح پر رکھ کر دیکھ سکیں تو باقی سب باتیں ثانوی ہو جاتی ہیں اور فن پارہ فن کے معیار پر آ جاتا ہے، بصورتِ دیگر فحاشی کے کھاتے میں جا پڑتا ہے۔

یہاں یہ بات بھی اہم ہے کہ فحاشی کا تصور ہر معاشرے میں الگ ہوتا ہے اور اس کا تعین وہ ضابطۂ اخلاق کرتا ہے جسے اس معاشرے کی تہذیبی اقدار مرتب کرتی ہیں۔ جب تک تہذیب in tact رہتی ہے، اس کی اقدار کا پورا نظام مؤثر رہتا ہے اور معاشرتی زندگی کے جملہ شعبوں اور تمام ثقافتی اوضاع میں ان کا اظہار ہوتا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ کسی قوم یا تہذیب کا نظامِ اقدار کس اصول کے تحت تشکیل پاتا ہے؟ یہ تشکیل پاتا ہے اس کے تصورِ حیات کے تحت۔ چناں چہ ہم دیکھتے ہیں کہ روایتی یا مذہبی معاشروں کی اخلاقیات سیکولر اور ماڈرن معاشروں سے مختلف ہوتی ہے۔ دونوں میں بنیادی فرق اصلِ اصول کا ہوتا ہے۔ اس وقت ہماری نئی دنیا کی تمام قوموں اور تہذیبوں کے ساتھ مسئلہ یہ ہے کہ وہ دانستہ یا نادانستہ ایک ایسی معاشرت میں مدغم ہونے جا رہی ہیں جو روایتی یا مذہبی اخلاقیات سے نہ صرف عاری ہے بلکہ اس کو مسترد کرتی ہے۔ چناں چہ ہم بھی اسی ریلے میں بہے جاتے ہیں۔ ویسے تو ہمارے یہاں وہ نظامِ اقدار جو معاشرے کو اکائی کی صورت جوڑ کر رکھتا ہے، ڈیڑھ صدی پہلے ٹوٹ گیا تھا لیکن اس کے باوجود ہم نے بہت دنوں تک، یوں کہنا چاہیے کہ صدی بھر سے اوپر کچھ برسوں تک اس نظامِ اقدار کو کسی نہ کسی درجے میں اپنے طرزِ احساس میں شامل رکھا۔ تقسیم ہند کے بعد خصوصاً یہ احساس تازہ ہوا کہ اب پھر وہی نظامِ اقدار اور اس کا تہذیبی ڈھانچا revive ہوگا اور یہی وہ زمانہ تھا جب ہم اس مسئلے کی طرف اپنی حساسیت کے زیرِ اثر منٹو اور عصمت وغیرہ پر مقدمات چلا رہے تھے۔ ظاہر ہے یہ ایک جذباتی دور بھی تھا لیکن چند ایک برس کی گرما گرمی کے بعد ایسے سارے جذبے ماند پڑنے لگے۔ گزشتہ تین دہائیاں تو خیر ایک ایسی رستا خیز سے عبارت ہیں کہ جس نے ہماری کایا کلپ کر کے رکھ دی۔ جیسا کہ پہلے عرض کیا، یہ کچھ ہماری ہی افتاد نہیں ہے بلکہ دنیا بھر میں سارے روایتی تہذیبی معاشروں کو اس عرصے میں کچھ اسی قسم کا ماجرا پیش آیا ہے۔ خیال رہے کہ یہاں روایتی اور تہذیبی معاشروں سے مراد وہ اقوام و ملل ہیں جہاں کسی نہ کسی سطح پر کوئی اخلاقی ضابطہ اور اقدار کا کوئی نظام مؤثر حیثیت میں پایا جاتا ہے۔ بہر حال خلاصہ یہ کہ انسانوں کی دنیا میں آنے والے اپنی قبیل کے اس انوکھے انقلاب میں الیکٹرونک میڈیا نے نہایت غیر معمولی کردار ادا کیا ہے۔

اس حقیقت سے انکار نہیں کہ الیکٹرونک میڈیا as such کوئی بُری شے نہیں ہے۔ انسانی معاشرے کے لیے یہ خاصا مفیدِ مطلب سامان رکھتا ہے لیکن اس کے ساتھ بھی وہی مسئلہ پیش آیا جو ایٹم بم کے ساتھ پیش آیا تھا کہ مقتدر قوموں نے اسے کم زور تہذیبوں، چھوٹے معاشروں اور غیر مستحکم قوموں

کے فکری استحصال اور ذہنی قلبِ ماہیت کے حربے کے طور پر استعمال کیا۔ چناں چہ اسے ایک ایسی انڈسٹری بنا دیا گیا ہے جو عامۃ الناس کی تفریحِ طبع کا سامان فراہم کرتی ہے۔ اس سے بھلا کسے انکار ہوسکتا ہے کہ تفریحِ طبع کا سامان بھی متمدن انسانی زندگی کی ضرورتوں میں آتا ہے۔ پرانے معاشرے بھی زندگی میں تفریح کا اہتمام کرتے تھے لیکن اس ستم ایجاد نے غضب یہ ڈھایا کہ تفریح کے تصور کو دھیرے دھیرے ابتذال سے جوڑ دیا۔ اس کارروائی میں انسانی جذبات کو تقدم حاصل ہوا جب کہ عقل، فکر اور روح کے مطالبات ثانوی چیز ہوکر رہ گئے بلکہ رفتہ رفتہ عام انسانوں کی زندگی میں ان پر توجہ کی ضرورت ختم ہوتی چلی گئی۔ نتیجہ یہ کہ نئی دنیا کا انسان بڑی حد تک impulsive انسان بن گیا۔ اس کی توجہ کا محور محض اس کی مادّی ضرورتیں ہیں اور اس کے نزدیک زندگی کی سب سے بڑی حقیقتیں صرف وجودی حقیقتیں ہیں۔ اس کے برعکس پرانی تہذیب کا انسان مادّی ضرورتوں اور وجودی حقیقتوں کے ساتھ ساتھ اپنی روح کے مطالبات کا بھی شعور رکھتا تھا اور ماورائے وجود حقائق اور روح کے مطالبات کو باقی سب چیزوں پر فوقیت دیتا تھا۔

اس ساری صورتِ حال کے پیشِ نظر ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ ماضی میں ہم دقیانوسی یا تنگ نظر نہیں تھے بلکہ اس وقت ہمیں اپنی تہذیب، اُس کی اقدار اور نظامِ اخلاق کا شعور تھا اور ہم ان پر یقین رکھتے تھے جب کہ آج نئی دنیا کی ہوا میں آکر ہم اس شعور سے عاری ہوگئے ہیں اور اپنی تہذیب اور اس کی اقدار پر سے ہمارا یقین اٹھ گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کل جن باتوں کا ہمارے یہاں تصور تک محال تھا، آج وہ ہماری زندگی کا معمول ہوگئی ہیں۔ ان پر ہمیں نہ کوئی الجھن یا تشویش ہے اور نہ ہمارے اندر ان کے خلاف کو احتجاج یا ردِ عمل ہے۔ ہم نے خود کو اِس نئی بے اقدار، بے تہذیب دنیا کے دھارے پر بہنے کے لیے چھوڑ دیا ہے۔ اس رویے کو آج آزادہ روی اور روشن خیالی کا نام دیا جا رہا ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ دنیا میں رونما ہونے والی یہ سرگرمیاں اپنے باطن میں انسانی تمدن اور تہذیبی اقدار کے اس سارے سفر کی نفی کرتی ہیں جو انسان نے صدیوں میں اپنی وحشتوں اور جبلتوں کو قابو کرتے ہوئے انسانیت کی منزل کو پانے کے لیے طے کیا ہے۔

بات یہ نہیں ہے کہ ادب میں، میڈیا اور انٹرنیٹ پر جنسی موضوعات پر پابندی عائد کی جائے اور ان کو سامنے لانے کی ممانعت ہو۔ نہیں، یہ مسئلے کا حل نہیں ہے۔ اگر جنس اور اس کے مسائل ہمارے معاشرے میں پائے جاتے ہیں تو ان کو بیان بھی ہونا چاہیے اور انھیں سامنے بھی لایا جانا چاہیے۔ اس لیے کہ اگر ہم انھیں دبا دیں گے تو وہ ختم نہیں ہوں گے بلکہ پورے معاشرے کو متعفن کردیں گے۔ ہیرا منڈیوں، شراب خانوں اور جوا اڈوں کو ہم نے ختم کرنے کی جو کوششیں اُتھلی سطح پر محض جذباتی انداز میں کی تھیں، اس کا نتیجہ ہمارے سامنے ہے۔ تیس چالیس برس پہلے ان کاموں کے مخصوص ٹھکانے ہوا

کرتے تھے اور وہاں آنے جانے والے بھی الگ کینڈے کے لوگ تھے لیکن اب یہ جراثیم ہمارے اپنے گلی محلوں تک آ گئے ہیں۔ برائی کو دبانا اس کا علاج نہیں ہے بلکہ اس کا سامنا کرنے اور معاشرے کی حقیقتوں اور ضرورتوں کے تناظر میں اسے دیکھنے کے بعد ہی اس کا سدِ باب ممکن ہے، لیکن برائی کا سامنا کرنے اور معاشرتی تناظر میں اس کی حقیقت جاننے کے لیے بڑی اخلاقی جرأت کی ضرورت ہوتی ہے۔ ہم میں آج اسی جرأت کا فقدان ہے۔ ہم اپنے الیکٹرونک میڈیا اور فلم انڈسٹری کو دوسروں کے مقابلے میں لانے کے بھی خواہاں ہیں، سو سے زیادہ چینلز، ڈش اور کیبلز کو بھی عام کر رہے ہیں اور پھر یہ بھی چاہتے ہیں کہ ہماری نئی نسل آلائشوں سے محفوظ رہے اور آزادی کے اُس تصور سے بھی دور رہے جو مغرب کا مادر پدر آزاد سماج پیش کرتا ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ ہم میڈیا میٹریل کو جو آندھی طوفان کی رفتار سے آ رہا ہے، آسانی سے نہیں روک سکتے۔ اس کے آگے بند باندھنا واقعتاً بے حد دُشوار بلکہ کم و بیش ناممکن العمل ہے، لیکن اس عفریت کا مقابلہ کرنے کی ابھی ایک صورت باقی ہے اور وہ یہ کہ ہم اپنی تہذیب اور اس کی اقدار پر اپنا یقین بحال کریں اور اپنی نئی نسل کو ان اقدار کے شعور سے بہرہ مند کرنے کی کوشش کریں۔ ہمیں چاہیے کہ ہم اپنے باطن کو اور اپنی روحوں کو عہدِ جدید اور اس کی دنیا میں طوفانی رفتار سے آتی ہوئی جبلت انگیز ہواؤں کی گزرگاہ نہ بننے دیں۔ ہمیں اپنے محسوساتی سانچے کو اپنے معاشرتی نظام سے مربوط رکھنے کی راہ نکالنی چاہیے اور اپنے اندر اس اخلاقی جرأت کو پھر سے بیدار کرنے کی تگ و دو کرنی چاہیے جو مسائل سے آنکھیں نہیں چراتی بلکہ اس کا سامنا کرتی ہے۔ اگر ہم الیکٹرونک میڈیا کی اس یلغار کو نہیں روک سکتے تو کم سے کم اتنا تو کر سکتے ہیں کہ یہ زندگی کی حقیقتوں اور تفریحات کا جو تصور پیش کر رہا ہے، ہم اسے قبول نہ کریں۔ اس لڑائی میں ہمارا ادب ایک تہذیبی قوت کا کام کر سکتا ہے اور یوں ہماری یہ کوششیں اُس بے اقدار معاشرت کے طوفان کے آگے بند باندھنے کے مترادف ہو سکتی ہیں جو اِس وقت پوری انسانیت کو بہا لے جانے کے درپے ہے۔

یہ تو ہوئی ادب اور فلم کی بات۔ ان شعبوں میں اخلاقیات اور اقدار کا جو تصور اب سے پہلے رائج رہا ہے اُس پر تو ہم ایک سرسری نظر ڈال چکے۔ اب جو تبدیلیاں ان میڈیمز پر تیزی سے آ رہی ہیں، ان کی جانب بھی اشارے کیے جا چکے علاوہ ازیں یہاں ضابطۂ اخلاق اور اقدار کا نظام کس طرح کام کرتا ہے اور کتنا مؤثر ہو سکتا ہے اور ذمہ دار، باشعور افراد اس حوالے سے خود پر جو پابندیاں عائد کرتے ہیں اُس پر بھی ہم بات کر چکے ہیں۔ تاہم اِس وقت مسئلہ ادب، آرٹ اور فلم کا نہیں ہے بلکہ آج سب سے بڑا مسئلہ ہے انٹرنیٹ کا۔ اس لیے کہ انفورمیشن ٹیکنولوجی کا یہ شعبہ حالات کی جیسی ابتری کا نقشہ پیش کر رہا ہے اُس کا تو اِس سے قبل شاید تصور بھی ممکن نہیں تھا۔

دیکھا جائے تو بیسوی صدی ٹیکنولوجی کی صدی ہے اور خصوصاً اس کی آخری تین دہائیاں تو

ٹیکنولوجی کے تیز سفر سے عبارت ہیں۔ تاریخ کے سیاق و سباق میں دیکھیے تو یہ انسان کی مادّی ترقی کا سب سے تیز رفتار زمانہ نظر آتا ہے۔ لیکن اس حقیقت سے بھی انکار ممکن نہیں ہے کہ اسی ترقی کے ساتھ ساتھ انسانی تہذیب و معاشرت کے اخلاقی نظام کا ملیامیٹ جس طوفانی رفتار اور جیسے تباہ کن انداز سے اس زمانے میں ہوا ہے اُس کی بھی کوئی اور مثال انسانی تمدن کی تاریخ کے کسی دوسرے دور میں نہیں ملتی۔ ٹیکنولوجی کی ترقی کی رفتار اکیسویں صدی کے اس اوّلین عشرے میں تو حیرت ناک ہے اور اس کے ساتھ اسی آندھی طوفان کی رفتار سے انسانی معاشرے میں اخلاقی قدریں مٹتی اور تہذیبی ضابطے ٹوٹتے جا رہے ہیں۔ اس مسئلے کی نوعیت کو سمجھنے کے لیے سب سے مؤثر اور اہم مثال انٹرنیٹ ہے۔

انٹرنیٹ، اب تک کی انفورمیشن ٹیکنولوجی کا سب سے بڑا کارنامہ ہے۔ معلومات اور اطلاعات کا جتنا بڑا ذخیرہ جس آسانی کے ساتھ اس کے ذریعے آج عام آدمی کی دسترس میں ہے، وہ اس سے قبل کبھی نہیں تھا۔ ٹیکنولوجی کے حوالے سے اگر یہ کہا جائے کہ اس نے دُنیا کی طنابیں کھینچ کر رکھ دی ہیں تو ہرگز غلط نہ ہوگا۔ آج دُنیا کے ایک سرے پر بیٹھا ہوا آدمی دوسرے سرے پر ہونے والے واقعات، مسائل اور اُن کے حقائق سے عین اُس وقت واقف ہو سکتا ہے جب وہ رونما ہو رہے ہوں۔ آج ایک شخص دوسروں کے بارے میں وہ سب کچھ جان سکتا ہے جو وہ جاننے کی خواہش کرے۔ معلومات کا عالم یہ ہے کہ وہ اب کسی ایک یا دو زاویے سے نہیں بہ یک وقت چھ چھ زاویوں سے دستیاب ہیں۔ افراد سے لے کر اقوام تک، جسم سے لے کر ذہن تک اور تفریح سے لے کر تفکر تک کون سا ایسا موضوع ہے جس پر آپ کو کام کرنا ہو، معلومات درکار ہوں اور اُس کے بارے میں یہ ٹیکنولوجی سکوت اختیار کر لے۔ نہیں، کوئی چیز ایسی نہیں ہے۔ سو اگر یوں دیکھا جائے تو مغرب جب انفورمیشن ٹیکنولوجی کو نئی دُنیا کی سب سے بڑی نعمت کہتا ہے تو کیا غلط کہتا ہے۔ لیکن یہ اس سہولت یا نعمت کا ایک رُخ ہے اور وہ جو اکبرا لہ آبادی نے کہا تھا کہ:

ہم تو سمجھے تھے کہ لائے گی فراغت تعلیم یہ نہ معلوم تھا آجائے گا الحاد بھی ساتھ

تو کچھ ایسا ہی معاملہ اس ٹیکنولوجی کا بھی ہے۔ اچھی چیزوں کے ساتھ ساتھ اس میں برائی کے بھی سات سمندر اکٹھے ٹھاٹھیں مارتے ہیں۔

عریانی یا فحاشی انٹرنیٹ کا سب سے بڑا مسئلہ ہے۔ ٹیکنولوجی کی سہولتوں کے ساتھ ۱۹۷۰ء کی دہائی کے اوائل میں اس مسئلے کی نشان دہی ہوئی تھی جب پہلے ایسے رسائل و کتب سامنے آئے جن میں رنگین عریاں تصاویر شامل ہوتی تھیں پھر وڈیو کیسیٹ میں برہنہ فلمیں آنے لگیں۔ تاہم آغاز میں ان سب اشیا تک پہلے عام آدمی کی رسائی آسانی سے ممکن نہ تھی۔ اب اس قسم کے مواد کی نہ صرف بہتات ہے بلکہ وہ اس قدر سہل الحصول ہوگیا ہے کہ معمولی سے معمولی مالی حیثیت کا آدمی بھی ان میں سے جو کچھ

چاہے، حاصل کر سکتا ہے۔ حد تو یہ ہے کہ طلبا اپنے محدود تر جیب خرچ سے بھی اس خواہش کی تکمیل کر سکتے ہیں۔ انتہائی افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اب یہ کر سکنے کا سوال نہیں رہا بلکہ کر رہے ہیں۔ دو اہم سروے رپورٹس ہمیں بتاتی ہیں کہ پاکستان میں انٹرنیٹ کیفے میں جا کر بیٹھنے والے افراد میں اٹھتر فی صد سے زائد تعداد مختلف درجے کے طلبہ کی ہوتی ہے اور اسکیننگ کرنے والے نیٹ کیفے یہ رپورٹ کرتے ہیں کہ وہاں surf کی جانے والی sites میں سے تراسی فی صد سے زائد کسی نہ کسی درجے کی pom sites ہوتی ہیں۔ ان محتاط اعداد و شمار کی روشنی میں جائزہ لیا جائے تو یہ اندازہ لگانا دشوار نہیں کہ ہمارے یہاں انٹرنیٹ نعمت کے طور پر آیا ہے یا عذاب کی صورت۔

انٹرنیٹ پر فحاشی اس وقت سب سے سنگین مسئلہ ہے۔ یہ مسئلہ صرف ہمارے لیے نہیں ہے بلکہ اُن تمام اقوام اور معاشروں کے لیے ہے جو انسانیت کے تمدنی سفر، تہذیبی اقدار اور اخلاقی ضابطوں پر یقین رکھتے ہیں اور انسانیت کی بقا اور صحت مند انسانی زندگی کے لیے انھیں ضروری گردانتے ہیں۔ دُنیا بھر کے بڑے اخبارات، ٹیبلوئڈ، رسالے اور میگزین اس موضوع پر اداریے، کالم، مضامین اور سروے رپورٹس شائع کر رہے ہیں جن میں بار بار تباہی کے اُس خطرے کی نشانی دہی کی جاتی ہے جو انٹرنیٹ کی پورنوگرافی اپنے ساتھ لائی ہے اور جسے وہ مسلسل پھیلاتی ہوئی نظر آ رہی ہے۔

غور طلب بات یہ ہے کہ اہلِ نظر اور اہلِ فکر کے یہاں انسانیت اور اُس کی اقدار کے تحفظ کے لیے خطرے کا یہ احساس آج یک بہ یک اس قدر کیوں بڑھ گیا ہے؟ بات اصل میں یہ ہے کہ انٹرنیٹ نے (جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا) فحاشی کے فروغ اور ترویج میں غیر معمولی کردار ادا کیا ہے۔ یہ مواد بے شک نیا نہیں ہے، بہت پہلے سے انسانی معاشروں میں پایا جاتا ہے لیکن اب اس کا پیداواری تناسب اگلے وقتوں کے مقابلے میں سو دو سو یا چار سو فی صد نہیں کئی ہزار فی صد زیادہ ہے۔ اور پھر یہ کہ اب سب کچھ جس آسانی سے اور جتنے کم داموں میں دستیاب ہے، پہلے اس کا تصور بھی محال تھا۔ اب تو ایسا لگتا ہے کہ باقاعدہ ایک پورنو انڈسٹری ہے جو mass production کے فارمولے کے تحت کام کرتی ہے اور اپنی پروڈکٹ ایسی 'پرکشش' (یعنی بے حد معمولی) قیمت میں اس آدمی تک بھی پہنچانے کے لیے کوشاں ہے جو کسی بھی وجہ سے اس سے دل چسپی نہیں رکھتا۔ ٹائمز میگزین ایسے رسائل کی رپورٹس بتاتی ہیں کہ یہی وجہ ہے پورنو انڈسٹری آئے دن اپنے مواد کو کسی نہ کسی عنوان پرکشش، دل چسپ، غور طلب، دل کو گرمانے والا، سنسنی خیز، تحریک بخش، ولولہ انگیز وغیرہ وغیرہ قسم کے ناموں سے پھیلانے کی ہر ممکن کوشش کرتی رہتی ہے۔ اب سے پہلے تمام معاشروں میں کسی نہ کسی سطح پر فحاشی کے بارے میں غلاظت کا تصور پایا جاتا تھا، لیکن اب ایک طرف تو اسے 'آرٹ' کے طور پر پیش کیا گیا ہے اور دوسری طرف اسے انسانی زندگی کی آزادی، خودمختاری اور مسرت کے تصورات سے اس طور وابستہ کیا گیا ہے کہ

اس سے کراہت کا احساس منہا ہو جائے اور اس کی بجائے فحاشی کو انسان کے اظہار کے فطری جذبوں اور حصول مسرت کے نا قابل رد تقاضوں میں شمار کیا جائے۔ اِس سے بھلا کون انکار کرسکتا ہے کہ جنسی احتیاج انسان کے فطری مطالبوں میں شامل ہے لیکن اس کو یوں جنسِ بازار بنانے اور اُس کا تماشا دکھانے کا کوئی تقاضا نارمل اور صحت مند انسانی فطرت ہرگز نہیں کرسکتی۔ اس لیے کہ جنسی ضرورت ایسا جبلی تقاضا ہے جس کی طرف تہذیب انسانی inhibition کا رویہ اختیار کرتی ہے۔ مہذب انسان کے یہاں اِس ضرورت کی تکمیل کا لطف پردہ دری میں نہیں بلکہ اس کے اِخفا اور پردہ پوشی میں ہوتا ہے۔

یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوتا کہ اگر انسانی تہذیب اس کو رد کرتی ہے تو آخر فحاشی اور عریانی کا یہ رُجحان مہذب اور متمدن اقوام میں فروغ کیوں پا رہا ہے؟ اصل میں اس کے پس منظر میں کئی عوامل کارفرما ہیں، ان میں اہم ترین حقیقتاً مقتدر اقوام کا سیاسی کھیل ہے۔ ممکن ہے یہ بات بعض لوگوں کے لیے استعجاب کا باعث ہو کہ بھلا فحاشی و عریانی کا کسی سیاسی کھیل سے کیا تعلق؟ دیکھیے، سیاست پہلے بھی طاقت اور اقتدار کے حصول کا کھیل تھا اور آج بھی ہے۔ لیکن آج اس کی نوعیت بہت کچھ بدل چکی ہے۔ اب علاقے اور لوگ physically فتح کر کے قبضے میں نہیں لیے جاتے۔ اب فتح اور قبضے کا نظریہ بدل چکا ہے۔ آج فتح کا مطلب ہے ذہنوں پر غلبہ پانا اور resources پر تصرف حاصل کرنا اور ترقی یافتہ اقوام اپنے مفتوحہ علاقوں میں خود جانے کی بجائے وہاں صرف اپنے ہم خیال اور ہم فکر افراد منتخب کر کے اُن کے ذریعے نظم ونسق چلاتی ہیں۔ رہی بات عامۃ الناس کی تو یہ جو تفریح کا مبتذل تصور ہے اور عریانی کی ترویج و فروغ ہے، یہ اُن کے ذہنوں کو مسخ کرنے کے ہتھکنڈے ہی تو ہیں۔ ان کا مقصد اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ انھیں سوچنے اور غور کرنے اور اپنی حیثیت جاننے اور آواز پانے کی خواہش سے بھی بے نیاز کر دیا جائے۔ انھیں ایسی چیزوں میں مبتلا کر دیا جائے جو ایک نشے اور لت کی طرح ہوں اور جن سے چھٹکارا پانا آسان نہ ہو۔

ایک رپورٹ کے مطابق انٹرنیٹ کی ہزاروں porn sites پر کروڑوں نہیں اربوں عریاں اور فحش تصاویر اور وڈیو کلپس قطعی بے قیمت اور با آسانی دستیاب ہونے کا آخر کیا مقصد ہے؟ یہ سب بے شک کاروبار بھی ہوگا۔ لیکن ذرا غور تو کیا جائے کہ یہ کیسا کاروبار ہے جس میں کھربوں ڈالر کی سرمایہ کاری ہو رہی ہے اور لوگوں کو اس کی طرف کسی معاوضے کے بغیر یا انتہائی قلیل معاوضے کے ذریعے مائل کیا جا رہا ہے۔ یہ کیسا کاروبار ہے جس میں سرمایہ کاری کرنے والے intangible نفع حاصل کر کے خوش ہیں۔ یہ میگا سائٹس جو لوگ فنانس کر رہے ہیں آخر انھیں کس طور اور کتنا سرمایہ واپس مل رہا ہے اور کہاں سے مل رہا ہے! اس بزنس کی کوئی ریگولیٹری اتھارٹی کیوں نہیں ہے! اس پر کوئی ودھ ہولڈنگ ٹیکس کیوں نہیں ہے! اس کی امپورٹ پر کوئی ڈیوٹی عائد کیوں نہیں ہوتی! اس کاروبار کے کسی بھی مرحلے پر جی

ایس ٹی کا اطلاق کیوں نہیں ہوتا! اس پورے کاروباری نظام کا کوئی چیک سسٹم کیوں نہیں ہے! اس ذیل میں غور کیا جائے تو ان گنت سوالات اٹھتے ہیں لیکن یہ چند ایک سوالات بھی اس کاروبار کو سمجھنے اور اس کے پس منظر میں کارفرما اصل محرکات کا جائزہ لینے کے لیے کافی ہیں۔ ان سوالات پر غور کرنے کے بعد یہ سمجھنا مشکل نہیں رہتا کہ اس کاروبار سے وابستہ افراد اور اقوام کے یہاں منفعت کا تصور وہ نہیں جو عام کاروبار سے ہوتا ہے بلکہ وہ کسی اور انداز سے، کسی اور شکل میں نفع وصول کر رہے ہیں۔ یہ کاروبار اصل میں کسی اور ہی مقصد کے حصول کا ذریعہ ہے۔ وہ مقصد ہے انسانی معاشروں میں اخلاقیات کا تصور تبدیل کرنا، انسانوں کو روح اور ذہن سے آزاد محض جسمانی سطح پر اور وہ بھی روبوٹ یا مشین کے سے انداز میں زندگی گزارنا سکھانا۔ سائبر اسپیس اور اُس کے مسائل پر لکھنے والے ڈینس آلٹ مین، ہاورڈ رین گولڈ اور جوناتھن زٹرین ایسے لوگ سائبر سینسر شپ کے بارے میں کسی اُمید اور کامیابی کا اظہار نہیں کرتے۔ چرچ آف اسکاٹ لینڈ کے تحت کام کرنے والے ادارے، 'سوسائٹی، ریلیجن اینڈ ٹیکنولوجی' کی رپورٹس میں کھلے بندوں اس کا اعتراف ملتا ہے کہ انٹرنیٹ پر ہونے والی عریانیت کا احتساب ممکن نہیں ہے۔ 'وکی پیڈیا دی فری انسائیکلو پیڈیا' میں یہ تو بے شک لکھا گیا ہے کہ چاہے کوئی فحش کار کسی قانونی آزادی کے مطابق ہی اپنا فحش مواد پھیلا رہا ہو تو بھی اس کا یہ کام غیر قانونی ہو سکتا ہے، اس لیے کہ ممکن ہے اُس سے استفادہ کرنے والوں میں ایک ایسا شخص بھی شامل ہو سکتا ہے جس کا مقامی قانون اُسے اس کام کی اجازت نہ دیتا ہو۔ اس اخلاقی یا قانونی نکتے کی نشان دہی کے بعد انسائیکلو پیڈیا خاموش ہو جاتا ہے۔ وہ یہ نہیں بتاتا کہ فحاشی کے فروغ کے سدِ باب کے لیے کیا اقدامات کیے جانے چاہییں۔ انھیں مؤثر اور نافذ العمل بنانے کے لیے کیا methodology اختیار کرنے کی ضرورت ہے اور اس سے کس طور کام لیا جا سکتا ہے۔

انٹرنیٹ کے ماہرین اور اس کے لیے قانون سازی کرنے والے افراد اور ادارے کم و بیش سبھی اس بات پر متفق ہیں کہ انٹرنیٹ جو کچھ اپنے جلو میں لے کر آ رہا ہے۔ وہ سب اچھا نہیں ہے۔ اس میں بہت کچھ اچھا ہے اور اس نے زندگی کے بہت سے شعبوں کے بارے میں بڑی سہولت پیدا کر دی ہے اور ترقی کی رفتار کو بڑھا دیا ہے۔ بایں ہمہ اس حقیقت سے بھی کسی طور انکار ممکن نہیں ہے کہ جتنی اس میں اچھائی ہے اگر اس سے زیادہ نہیں تو کم سے کم اس کے برابر تو لازماً اس میں برائی بھی ہے۔ ایک پرانے محاورے کے مطابق دودھ تو بے شک یہ بکری دیتی ہے لیکن مینگنیوں کے ساتھ۔ اگر آج ترقی کی رفتار بڑھی ہے تو اس کے ساتھ ہی ساتھ تباہی کے بھی کتنے ہی نئے راستے کھل گئے ہیں۔ اور سب سے زیادہ تشویش ناک بات یہ ہے کہ انٹرنیٹ کے لیے کوئی مؤثر قسم کا چیک اینڈ بیلنس نظام اب تک وضع نہیں ہو سکا ہے، بلکہ ماہرین کا کہنا ہے ایسا کوئی نظام ممکن ہی نہیں ہے۔ وہ اس کی وجہ یہ بیان کرتے ہیں

بکہ کمپیوٹر آج کی دنیا کے حقائق کی شکلیں بے شک تبدیل کر رہا ہے لیکن وہ خود اصل میں ایک virtual reality کی دُنیا ہے۔ یعنی ایک ایسی دُنیا جسے جاننے، سمجھنے یا جس کا تجربہ کرنے کے لیے بعض لوازم مطلوب ہوتے ہیں، اُن کے بغیر اس دنیا کی تصدیق یا اثبات تک نہیں ہوسکتا۔ ظاہر ہے، یہ دُنیا ان لوگوں کے لیے وجود ہی نہیں رکھتی جو مطلوبہ لوازم کے بغیر اس کا تجربہ کرنا چاہیں۔ اس domain میں داخل ہونے کے لیے ضروری ہے کہ اس کے کچھ تقاضے پورے کیے جائیں۔ چناں چہ وہ لوگ جو اس دُنیا کا تجربہ کرتے ہیں وہ اس تجربے سے قبل ہی اپنے ذہن اور اپنی روح کو اس کے سپرد کردیتے ہیں۔ ظاہر ہے ان کے اندر اس کے لیے کوئی مدافعت یا مزاحمت نہیں ہوتی۔ بہر حال، یہ ایک لمبی اور دقیق بحث ہے کہ ورچوئل رئیلیٹی آخر کیا ہے، کیا کام کرتی ہے، کیسے اور کہاں کام کرتی ہے؟ یہ الگ موضوع ہے، اس پر الگ سے اور شرح صدر کے ساتھ لکھا جانا چاہیے۔ ہم واپس اپنے موضوع کی طرف آتے ہیں۔

بات ہو رہی تھی کہ انٹرنیٹ کے ماہرین کا کہنا ہے کہ اس کے لیے کوئی چیک یا سینسر شپ ممکن ہی نہیں۔ ایک تو یہ ورچوئل رئیلیٹی کا مسئلہ ہے، دوسری بات یہ ہے کہ یہ کسی ایک آجر اور اجیر کا معاملہ نہیں ہے بلکہ اس میں ہر مقام پر ایک کمپیوٹر کوئی کردار ادا کر رہا ہے اور اس کا اندازہ لگانا آسان نہیں کہ اس وقت اگر کراچی کے کسی کیفے میں بیٹھا ہوا کوئی آدمی کسی سائیٹ کی سرفنگ کر رہا ہے تو وہ کتنے کمپیوٹرز کے سلسلوں سے ہوتا ہوا اپنے مطلوبہ ہدف تک پہنچتا ہے۔ شاید وہ درجنوں نہیں سیکڑوں کڑیوں سے جڑا ہوا ہوگا۔ تو اب سوال یہ ہے کہ ان میں سے کون کس شے کا ذمہ دار گردانا جاسکتا ہے! اگر بہ فرضِ محال گردانا بھی جائے تو آخر کس بنیاد پر؟ تیسری بات یہ کہ وہ جس شے کا تجربہ کر رہا ہے وہ تو بس ہوا میں ہے اور ایک غیر وجودی (یا غیر مرئی) وجود رکھتی ہے۔ وہ کوئی tangible reality نہیں ہے کہ اُسے جب ہم چاہیں دیکھ، پرکھ اور سمجھ سکیں۔ یہی وجہ ہے کہ اُسے روکنا یا اُس پر کوئی قدغن عائد کرنا ممکن نہیں ہے۔ تو یہ ہیں وہ مسائل جن کی بنیاد پر انٹرنیٹ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اُس کے ذریعے جو فحاشی پھیل رہی ہے اُس کا سدباب آسان نہیں ہے۔

اب رہا یہ سوال کہ مغربی معاشرے کا اخلاقی ضابطہ اور اس کا نظامِ اقدار ان مسائل کی طرف کس طرح دیکھتا ہے اور ان کی بابت کیا رویہ اختیار کرتا ہے؟ وہاں کے اہل دانش اس حوالے سے کیا سوچتے ہیں اور انسانی تہذیب و معاشرت کو درپیش اس مسئلے کے سلسلے میں کیا مغرب کوئی مثبت اور موثر کردار ادا کرسکتا ہے؟ قرائن و شواہد سے اس سوال کا جواب نفی میں ملتا ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ مغرب میں اخلاق و اقدار کا کوئی تصور ہی نہیں پایا جاتا۔ تصور تو بے شک پایا جاتا ہے لیکن اب وہ بے روح اور غیر موثر ہوچکا ہے۔ ایسا جن اسباب کی بنیاد پر ہوا ہے ان میں سے بعض کی نشان دہی گزشتہ صفحات میں کی جاچکی ہے، تاہم ایک سبب اور بھی ہے۔ وہ یہ کہ مغرب میں تہذیب و اقدار کے بنیادی تصور میں تبدیلی

آ چکی ہے۔ اور تصورات کی اسی تبدیلی کے زیرِ اثر الفاظ کے معانی و مفاہیم تک بدل گئے ہیں۔ اب اس لفظ پورنوگرافی ہی کو لے لیجیے اور دیکھیے کہ مغرب اس لفظ کو کس آزادی اور سہولت کے ساتھ استعمال کر رہا ہے کہ اب وہاں کتابوں کے نام:

(1) Pornography of Death (2) Pornography of Power

رکھے جانے لگے ہیں۔ بات یہ نہیں کہ عریانیت یا برہنگی کا تصور اس سے قبل بیان نہیں ہوتا تھا، ضرور ہوتا تھا لیکن اب مسئلہ یہ ہے کہ موت کی حقیقت یا طاقت کے کھیل کو عریانیت کے حوالوں سے بیان کرنے کا جو چلن آ رہا ہے، اس کا کیا مطلب ہے! مطلب سیدھا اور صاف ہے کہ ان الفاظ کو سنتے ہی وہ جو خاص تصورات اُجاگر ہوتے تھے اور جن کے سامنے تہذیبی معاشرے کا اخلاقی نظام پشتہ بندی کرتا تھا اب ان الفاظ کا یوں بے تکلفانہ استعمال اس پشتہ بندی کو ختم کر کے انھیں روزمرہ کی چیز بنا دے گا اور وہ جو سماجی سطح پر ان الفاظ اور ان کے ساتھ وابستہ تصورات کی طرف ایک resentment تھی وہ رفتہ رفتہ معدوم ہوتی چلی جائے گی۔ امرِ واقعہ یہ ہے کہ آج مغرب خود ایک دلدل میں دھنسا ہوا ہے۔ اس کی روشن خیالی اور مادی ترقی کی چکاچوند اپنی جگہ لیکن جاننے والوں کی نگاہ سے اس کی روح کی ابتری کا احوال پوشیدہ نہیں ہے۔ مغرب میں آج جرائم کا جو تناسب ہے اُسے دیکھ کر بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اُس کی مثال ایک ایسے جہاز کی ہے جس کا ایک حصہ ڈوب چکا ہے اور اس پر سوار افراد کو یہ معلوم تک نہیں کہ وہ ڈوبنے جا رہے ہیں۔ وہاں پر نوجوانوں میں جرائم کی شرح سب سے زیادہ ہے اور پھر ان جرائم میں جنسی جرائم سرِ فہرست ہیں اور اسی تناسب سے نتیجتاً ذہنی اور جنسی امراض بھی۔ خیر، یہ بحث ہمارے موضوع کے دائرے میں نہیں آتی، اس لیے ہم اسے یہی چھوڑتے ہیں۔ ہم بات کر رہے تھے مغرب کے اخلاقی نظام کی جو کم زور ہوتے ہوتے بالکل غیر مؤثر ہو چکا ہے۔ خود مغرب کے سوچنے اور غور و فکر کرنے والے اذہان مایوسی کے ساتھ اس کا اعتراف کرتے ہیں۔ انھیں اپنے آگے اندھیرا ہی اندھیرا نظر آتا ہے۔ خصوصاً جدید دُنیا کی اس سائنس اور ٹیکنولوجی کی ترقی کے ساتھ اخلاقی ابتری میں جس تیزی کے ساتھ وہاں اضافہ ہوا اُس کی بابت اہلِ نظر گہری تشویش کا اظہار کرتے ہیں۔ چناں چہ ایسی صورتِ حال میں ہم مغرب سے کیا توقع رکھ سکتے ہیں۔ مغرب کے تو اپنے زخموں کا اندمال ممکن نہیں، وہ کسی اور کے دُکھوں کا بھلا کیا مداوا کرے گا۔

یوں اگر دیکھا جائے تو ادب، آرٹ، بصری فنون یا انٹرنیٹ خواہ کسی بھی ذریعے سے فحاشی کا مسئلہ پیدا ہوتا ہے تو اس سوال کے مخاطب وہ تہذیبیں یا معاشرے ہیں جہاں اخلاق و اقدار کا کوئی نظام قائم اور روبہ عمل ہے۔ تو اس مسئلے کے بابت سوچنا بھی انھی کو پڑے گا اور اس مسئلے سے نمٹنے کے لیے اپنا کوئی دفاعی نظام اگر وہ بنا سکتے ہیں اور بنانا چاہتے ہیں تو انھیں خود ہی بنانا پڑے گا۔

آخری بات یہ کہ ادب، آرٹ یا فلم کے پیچھے اصلاً ایک دماغ کام کرتا ہے۔ اوّلاً وہ دماغ اپنی ایک جمالیاتی حس رکھتا ہے۔ دوم وہ چاہے ساجی ہی سہی، بہرحال کسی نہ کسی اخلاقی ضابطے میں یقین رکھتا اور اس کے زیرِ اثر اپنی حدود کا تعین کرتا ہے۔ سوم یہ کہ وہ کسی نہ کسی تہذیب، معاشرے، مقتدرہ یا مقننہ کو جواب دہ ہوتا ہے۔ چہارم یہ کہ وہ اُن لوگوں کی طرف سے کہ جن کے سامنے وہ اپنا فن پیش کر رہا ہے، اپنے ہر کام پر اچھے یا برے ردِ عمل کا سامنا کرتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ سب چیزیں اُس پر اثر انداز ہوتی ہیں اور اُس کے ذہنی رویوں کی ساخت اور فکر کی تشکیل میں ایک کردار ادا کرتی ہیں۔ تاہم ان میں سے کسی ایک بات کا بھی کمپیوٹر یا انٹرنیٹ پر اطلاق نہیں ہوتا۔ کمپیوٹر کی اپنی کوئی جمالیاتی حس ہوتی ہے اور نہ اُس کے لیے کوئی اخلاقی ضابطہ ہوتا ہے اور نہ ہی وہ کسی کو جواب دہ ہے۔ پھر یہ کہ اُس کے لیے ہر امیج محض بائٹس کا مجموعہ ہوتا ہے، وہ اچھا ہے یا برا، نیک ہے یا بد اس سے اُسے کوئی سروکار نہیں ہوتا۔ ہو بھی نہیں سکتا، اس لیے کہ اچھائی برائی میں امتیاز کرنے کا شعور ہی اُسے حاصل نہیں ہے۔ اُس سے اگر آپ نے تتلی (butterfly) کا امیج طلب کیا ہے تو وہ تتلی کے نام کے وہ سارے امیج جو اُس کے پاس ہوا میں ہیں، آپ کو لا کر پیش کر دے گا۔ وہ یہ فرق نہیں کر سکتا کہ یہ اصل تتلی ہے اور یہ طوائف ہے. جس نے اپنی برہنہ تصویر تتلی کے نام سے ہوا میں رکھ دی ہے۔ وہ ایسا اس لیے بھی نہیں کر سکتا کہ اُس کے لیے ایسا کوئی ضابطہ اب تک device ہی نہیں ہوا ہے جو اُسے غلط اور درست میں تمیز کا شعور دے سکے۔ پھر دوسرے یہ کہ کمپیوٹر کسی بھی jurisdiction میں نہیں آتا اِس لیے اُس کا ہر عمل اضافی یا پھر قیاسی ہے۔ تو یوں اِس virtual reality کی سینسر شپ یا احتساب کے لیے کوئی نظام وضع کرنا کاردارد ہے۔ اور اگر کر بھی لیا جائے تو وہ کس حد تک مؤثر ہوگا اِس کی بابت بھی ماہرین کے ہاں کوئی ایسی خوش فہمی نہیں پائی جاتی۔ علاوہ ازیں اس ضمن میں بہت سے اور مسائل پر بھی غور ضروری ہوگا۔

خیر، تو اب کیا کہا جائے، یہ کہ ہم ایک غیر اخلاقی اور ہر قسم کے ضابطے سے عاری دُنیا کی طرف جا رہے ہیں! اگر اِس سوال کا جواب ہمارے پاس اثبات میں آتا ہے تو ہمیں یقیناً سوچنا چاہیے کہ کیا ہم اور ہماری نئی دُنیا واقعی ترقی کر رہی ہے؟ اس لیے کہ یہ لباس، شائستگی، یہ قرینہ، یہ تہذیب، اخلاق اور قوانین وغیرہ سب ہم نے تاریخ کی تاریک راہوں پر طویل اور کٹھن سفر کے بعد روشنی کی شاہراہ پر آ کر حاصل کیا ہے۔ تو لارڈ نارتھ بورن کے بقول اب ہمیں پل بھر کو رُک کر عقب میں اپنی ترقی کی راہ پر ایک نگاہ ڈال کر جان لینا چاہیے کہ ہم آگے جا رہے ہیں یا پیچھے؟!

(غیر مطبوعہ)

انٹرنیٹ اور معاشرہ

ریحان احمد یوسفی

انٹرنیٹ کے ہمارے معاشرے پر جو اثرات ہو رہے ہیں اور ہو سکتے ہیں وہ بنیادی طور پر تین قسم کے ہیں: اول کچھ تبدیلیاں جو روزمرہ زندگی میں رونما ہو رہی ہیں ان کی کوئی مذہبی اخلاقی اور تہذیبی اہمیت نہیں ہے۔ تاہم انھیں اس اعتبار سے مثبت قرار دیا جا سکتا ہے کہ یہ زندگی کو تیز اور آسان بنا رہی ہیں۔ دوم، وہ مثبت امکانات ہیں جو انٹرنیٹ میں پوشیدہ ہیں، جن کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے ہمیں ایک موقع دیا ہے کہ ہم علم اور ٹیکنالوجی میں اپنی کمزوری کو بہت جلد دور کر کے کامیابی اور ترقی کی راہیں اپنی قوم کے لیے کھول سکتے ہیں۔ تیسرے، وہ منفی رجحانات ہیں جن کے تاریک سائے ہمارے معاشرے کو اپنی لپیٹ میں لے رہے ہیں۔ ذیل میں ہم ان تمام اثرات کا ایک تفصیلی جائزہ پیش کر رہے ہیں تاکہ لوگ اس معاملے میں باشعور ہوں اور اپنی ترجیحات کو شعوری طور پر متعین کریں۔

انٹرنیٹ دورِ جدید میں بے حیائی کے فروغ کا سب سے آسان اور مؤثر ذریعہ بن چکا ہے۔ یہ بات انٹرنیٹ کے آغاز کے وقت ہی بڑی صراحت کے ساتھ نمایاں ہو کر سامنے آ گئی تھی۔ نوے کی دہائی میں انٹرنیٹ امریکا اور یورپ میں غیر معمولی سرعت کے ساتھ پھیل گیا تھا۔ اس کی مقبولیت کی سب سے بڑی وجہ اس پر دستیاب فحش اور عریاں لٹریچر تھا۔ سن پچانوے میں ٹائم میگزین نے انٹرنیٹ کے بارے میں شائع ہونے والے اپنے خصوصی شمارے میں ایک رپورٹ شائع کی، جس کے مطابق انٹرنیٹ پر ان سائٹس کا تناسب جن پر فحش اور عریاں مواد دستیاب تھا محض تین فی صد تھا یعنی ۱۰۰۰ میں سے صرف ۳ سائٹس۔ تاہم انٹرنیٹ استعمال کرنے والے سو میں سے چوراسی انھیں تین فیصد سائٹس کا رخ کرتے تھے۔ اس وقت صورتِ حال یہ ہے کہ اب سیکس سائٹس کی تعداد لاکھوں تک پہنچ چکی ہے۔ نہ صرف فری سیکس سائٹس پر بڑی تعداد میں لوگ جاتے ہیں بلکہ ایک حالیہ سروے کے مطابق کاروباری اعتبار سے بھی یہ سب سے زیادہ کامیاب ہیں اور باقی تمام اقسام کی سائٹ مثلاً میوزک، گیم، اسپورٹس وغیرہ کے مقابلے میں زیادہ بزنس کرتی ہیں۔

انٹرنیٹ کے ذریعے سیکس کے فروغ کی بڑی وجہ یہ ہے کہ اس میں پرائیویسی اور سہولت کا عنصر بہت زیادہ ہے۔ چناں چہ کوئی بھی شخص کسی کے علم میں لائے بغیر ہر طرح کے مواد تک باآسانی

رسائی حاصل کرسکتا ہے۔ خدا خوفی سے خالی معاشروں میں جہاں ایسی چیزوں سے لوگ صرف معاشرتی دباؤ کی بنا پر دور رہتے ہیں، جب ایسی سہولت میسر آ جائے تو کون ہوگا جو اس محفوظ ذریعے سے مستفید نہ ہو! پاکستان میں ابھی تک اس طرح کے منظم سروے کا اہتمام تو نہیں کیا گیا تاہم غیر رسمی معلومات سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ نوجوانوں کی غالب ترین اکثریت انٹرنیٹ کو اسی مقصد کے لیے استعمال کرتی ہے۔ ہم اپنی ایک دوسری تحریر میں اس بات کی طرف توجہ دلا چکے ہیں کہ ہمارے ہاں نوجوانوں کی شادی کو غیر ضروری طور پر مؤخر کرنے کا چلن عام ہو چکا ہے۔ ان حالات میں اس مقصد کے لیے انٹرنیٹ کا استعمال کرنے والوں کی تعداد اب مغرب سے کہیں زیادہ ہوگی۔ اس صورت حال کا نتیجہ یہ نکل رہا ہے کہ نئی نسل اخلاقی طور پر دیوالیہ ہو رہی ہے۔ حیا اور شرم جیسی اقدار کمزور اور رشتوں کا تقدس مجروح ہو رہا ہے۔ فطرت کی پاکیزگی رخصت ہو رہی ہے اور ذہنی آلودگی بڑھ رہی ہے۔ ظاہری بات ہے کہ ان چیزوں کے اثرات معاشرے پر تباہ کن ہوں گے، خصوصاً ایک معاشرے میں جو ترقی کے ہر میدان میں جدید دنیا سے پیچھے ہے اور جس کا کل سرمایہ یہی اقدار ہیں۔ یہ بھی نہ رہیں تو معاشرہ اپنے استحکام کی واحد اساس بھی کھو دے گا۔

مغربی معاشرے کی کچھ روایات ہیں، کچھ اقدار اور طور طریقے ہیں، کچھ معروف و منکر ہیں جو یقیناً ہم سے مختلف ہیں۔ انٹرنیٹ کے ذریعے اہل مغرب کی یہ اقدار و روایات خاموشی سے ہمارے معاشرے میں سرایت کر رہی ہیں۔ مثال کے طور پر ویلنٹائن ڈے، ہیلوئن ڈے، مدر اور فادر ڈے وغیرہ جو کچھ خاص ایام ہی نہیں بلکہ اپنے پیچھے ایک پورا تہذیبی اور معاشرتی پس منظر لیے ہوئے ہیں اب ہمارے ہاں باہتمام منائے جاتے ہیں جس کے ساتھ آہستہ آہستہ ان کا پس منظر بھی اپنی جگہ بناتا جا رہا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ہمارے ہاں اس طرح کی روایات میں اس کیبل کلچر کا بھی بڑا عمل دخل ہے جو اب ہماری اجتماعی زندگی کا لازمی حصہ بن گیا ہے۔ تاہم انٹرنیٹ کی دو ایک ایسی خصوصیات ہیں جن کی بنا پر عام لوگوں کو ان ایام میں براہ راست شامل ہونے اور انھیں منانے کا موقع مل جاتا ہے۔ ایک یہ کہ اس کے ذریعے مفت میں کسی کو بھی بہت اچھے کارڈز بھیجے جا سکتے ہیں۔ چناں چہ ان دنوں پر انٹرنیٹ کا استعمال کرنے والے تمام لوگ کارڈز کا تبادلہ کرتے ہیں اور عملاً ان دنوں کے منانے میں حصہ لیتے ہیں۔ دوسرے، انٹرنیٹ پر 'چیٹنگ' لڑکے لڑکیوں کی دوستی کا ایک بہت موثر اور آسان ذریعہ ثابت ہوئی ہے۔

یہ بات واضح ہے کہ لڑکے لڑکیوں کی دوستی اور اس کے یوم تجدید یعنی ویلنٹائن ڈے کا ہماری تہذیب سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ مغرب کی ایک قدر ہے جہاں آزاد صنفی تعلق کوئی معیوب بات نہیں بلکہ اس کی حوصلہ افزائی کی جاتی ہے۔ ہمارے ہاں کسی مرد و عورت کے درمیان صنفی محبت کی واحد قابل قبول

شکل نکاح ہے۔ تاہم اب اس طرح کے دنوں کے ذریعے ہمارے لیے یہ بات قابلِ قبول ہوتی جارہی ہے کہ ایک مرد و عورت شادی کے بغیر بھی محبت اور اس کے نتیجے کے طور پر صنفی تعلق قائم کرسکتے ہیں۔ نوجوانی کا 'لَو افیئر' اصل میں 'لسٹ افیئر' ہوا کرتا ہے۔ 'ویلنٹائن ڈے' مناتے مناتے ایک روز ہم بھی اس بات کو قبول کر ہی لیں گے۔ اسی ہیلوئن ڈے جس پر بچے بھوتوں اور چڑیلوں کا روپ اختیار کرتے ہیں، مغربی پس منظر کا ایک تہوار ہے۔ مدر اور فادر ڈے مغرب کی دریافت ہے جہاں خاندان ٹوٹ چکے ہیں اور اس کی تلافی کے لیے لوگ سال میں ایک دفعہ بوڑھے والدین کو یاد کرلیتے ہیں۔ ہمارے ہاں تو ہر دن مدر اور فادر ڈے ہوتا ہے۔

مغربیت کا یہ عمل غیر محسوس طور پر میاں، بیوی، اولاد اور والدین کے باہمی رشتوں کو بھی کم زور کرتا چلا جائے گا کیوں کہ یہ تہوار معاشرتی رویوں کے علامتی اظہار ہوتے ہیں۔ اہلِ مغرب نے انھیں سوچ سمجھ کر، اپنے فلسفۂ زندگی کے تحت قبول کیا ہے جب کہ ہم ان کی نقل میں اپنی بنیادیں کھوکھلی کررہے ہیں۔

مغرب میں جہاں انٹرنیٹ کا استعمال ہر شعبۂ زندگی پر محیط ہوچکا ہے، انٹرنیٹ کے بعض ایسے استعمالات سامنے آئے ہیں جو بہت سنگین نوعیت کے ہیں۔ مثلاً مختلف مذاہب اور نسلوں کے خلاف نفرت پھیلانے کے لیے انٹرنیٹ کو استعمال کیا جارہا ہے۔ اسی طرح انٹرنیٹ تشدد اور جرائم کے فروغ کا ذریعہ بھی بن رہا ہے، ان کے لیے مغرب میں سائبر کرائم کی اصطلاح استعمال کی جاتی ہے۔ ہمارے ہاں بھی سائبر کرائم کی وبا آہستہ آہستہ فروغ پارہی ہے۔ خصوصاً وہ نوجوان جو اپنا زیادہ وقت انٹرنیٹ پر گزارتے ہیں بعض ویب سائٹس یا چیٹنگ کے ذریعے ان چیزوں کا شکار ہوجاتے ہیں۔ ان کے علاوہ بعض منفی عادات مثلاً جوا وغیرہ کے فروغ کا بھی یہ ایک بہت موثر ذریعہ بن گیا ہے۔ یہ ساری چیزیں جو آج مغرب میں پھیل رہی ہیں انٹرنیٹ کے استعمال کے بڑھنے کے نتیجے میں ہمارے ہاں بھی عام ہوسکتی ہیں۔

انٹرنیٹ کا بے روک ٹوک استعمال اپنے اندر وقت کے ضیاع کا پہلو بھی رکھتا ہے۔ انٹرنیٹ پر مختلف سائٹس پر بے مصرف گھومنے کا عمل جسے 'سرفنگ' کہتے ہیں، سڑکوں پر آوارہ گردی کرنے کے مترادف ہوتا ہے۔ جس طرح سڑکوں پہ بے مقصد مٹر گشت کرنے میں وقت کا پتا نہیں چلتا اسی طرح 'سرفنگ' کے عمل میں لوگ اپنا قیمتی وقت ضائع کرتے رہتے ہیں اور انھیں اس کا احساس نہیں رہتا۔ 'سرفنگ' سے زیادہ 'چیٹنگ' وقت کے ضیاع کا سبب ثابت ہوتی ہے۔ نوجوان لڑکے لڑکیاں گھنٹوں کمپیوٹر کے سامنے بیٹھے رہتے ہیں اور لایعنی گفتگو اور مشغلوں میں اپنا قیمتی وقت ضائع کرتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ کمپیوٹر کا مسلسل استعمال آنکھوں، ہاتھوں، گردن اور کمر کے پٹھوں کے لیے بھی مضر ہوتا ہے۔ باقی اخلاق مضر اثرات ہم 'سیکس سائٹس' کے حوالے سے بیان کرچکے ہیں۔

ماخذ (اُردو ـ ۷۸)

فحش ’سائٹس‘

انٹرنیٹ دورِ جدید کی ایک بہت مفید اور کارآمد ایجاد ہے۔ یہ نہ صرف معلومات کا ایک خزانہ ہے بلکہ مواصلات کے شعبے میں بھی اس نے ایک انقلاب برپا کر دیا ہے۔ انٹرنیٹ پر ہر طرح کی معلومات بہت آسانی سے دستیاب ہو جاتی ہیں۔ اس کے ذریعے سے لوگ اپنے دور دراز عزیزوں سے با آسانی رابطہ کر سکتے ہیں۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اس نے بڑی حد تک لائبریری اور ڈاک کے نظام کی جگہ لے لی ہے۔ پاکستان میں انٹرنیٹ دس سال قبل متعارف ہوا۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس کے استعمال کرنے والوں کی تعداد بڑھتی چلی گئی۔ ملک میں انٹرنیٹ فراہم کرنے والی کمپنیوں کی تنظیم ’اسپاک‘ کے اعداد و شمار کے مطابق اس وقت ملک میں انٹرنیٹ کے صارفین کی کل تعداد چوبیس لاکھ سے زائد ہو چکی ہے۔ امید ہے کہ آنے والے دنوں میں یہ تعداد کئی گنا بڑھ جائے گی۔

اس حوالے سے یہ امر بے حد تشویش ناک ہے کہ پاکستان میں انٹرنیٹ کے بیشتر صارفین اسے فحش اور عریاں ویب سائٹس تک رسائی کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ یہ محض اندازہ نہیں، مذکورہ بالا تنظیم ’اسپاک‘ کے جاری کردہ اعداد و شمار کے مطابق پاکستان میں انٹرنیٹ استعمال کرنے والے بیش تر لوگوں کا پسندیدہ شغل، فحش اور عریاں ویب سائٹ دیکھنا ہے۔

یہ صورت حال ہر باشعور شخص کے لیے باعث تشویش ہے۔ باخبر لوگ اس بات سے واقف ہیں کہ یہ تنہا پاکستان کا مسئلہ نہیں بلکہ پوری دنیا اس مسئلے سے پریشان ہے۔ دنیا بھر میں سب سے زیادہ فحش ویب سائٹس ہی دیکھی جاتی ہیں۔ ان سائٹس پر باقاعدگی سے جانے والے لوگ، دنیا کی نظر سے چھپ کر، انٹرنیٹ کی تاریک گلیوں میں آوارہ پھرتے رہتے ہیں۔ یہ آوارگی ان کی عادت بن کر قلب و نظر کو ناپاک کر دیتی ہے۔ اس کے بعد زندگی دو میں سے ایک راستے کی طرف مڑ جاتی ہے۔ یا تو انسان حلال و حرام کی تمیز کو فراموش کر کے زنا کی وادی میں قدم رکھ دیتا ہے یا پھر شادی کا جائز راستہ کھلنے کے بعد بھی تا عمر پورنوگرافی کے نشے کا عادی بنا رہتا ہے۔

ہماری سوسائٹی کا المیہ یہ ہے کہ ہم نے اپنے غلط رویوں، نظریات اور بعض حالات کی بنا پر شادی کی بنیادی ضرورت کو، نوجوانوں کے لیے ناقابل رسائی بنا دیا ہے۔ جب کہ دنیا بھر میں یا تو مناسب عمر میں نوجوانوں کی شادی ہو جاتی ہے یا پھر شادی کیے بغیر نوجوان لڑکے لڑکیوں کو ساتھ رہنے کی آزادی حاصل ہوتی ہے۔ ’اسپاک‘ کی اس رپورٹ کے ذریعے سے پوری سوسائٹی کو یہ پیغام مل گیا

ہے کہ یا تو لوگوں کے لیے نکاح کے جائز راستے کو کھول دیا جائے یا پھر سوسائٹی کی تباہی کے لیے تیار ہو جانا چاہیے۔ اس پیغام کا پس منظر یہ ہے: جن مغربی ممالک میں نکاح کے بغیر مرد و زن کا تعلق عام بات ہے، ان کے ہاں یہ کوئی اخلاقی خرابی نہیں۔ ان کے ہاں بلیو فلمیں ہوں یا فحش ویب سائٹس، اصل مسئلہ یہ ہوتا ہے کہ بچوں کو ان سے دور رکھا جائے، باقی لوگ آزاد ہیں کہ جو چاہیں کریں۔ مگر ہمارے ہاں، حیا اور عفت بنیادی اقدار ہیں۔ اسی طرح اخلاقی بحران کے اس دور میں خاندان کا ادارہ ہماری واحد معاشرتی ڈھال ہے۔ زنا اور بے حیائی کے فروغ سے یہ اقدار اور یہ ادارہ ختم ہو جائے گا۔

انٹرنیٹ پورنوگرافی کا کوئی حل ابھی تک جدید دنیا دریافت نہیں کر سکی ہے۔ سعودی عرب اور سنگاپور جیسے ممالک نے سنسرشپ کے ذریعے اس مسئلے کا حل تلاش کرنے کی کوشش کی ہے مگر تجربہ یہ بتاتا ہے کہ اس طرح کا حل بہت زیادہ موثر نہیں ہو سکا ہے۔ ہمارے ہاں بھی سنسرشپ کی کوشش کی گئی مگر اس کا بھی کوئی فائدہ نہیں ہو سکا، بلکہ جیسا کہ رپورٹ سے ظاہر ہے کہ جتنے زیادہ انٹرنیٹ کو استعمال کرنے والے بڑھیں گے اتنے ہی زیادہ فحش سائٹس پر وزٹ کرنے والوں کی تعداد بڑھتی چلی جائے گی۔ اس مسئلے کا حل یہی ہے کہ والدین اپنی ذمے داری محسوس کریں۔ وہ بچوں کی تربیت کو اپنا مسئلہ بنائیں۔ ان کو وقت کی رفتار کے حوالے نہ کریں بلکہ زندگی کے ہر سرد و گرم میں ان کی رہنمائی کریں۔ بچوں کے شعور میں حیا اور عفت کی اہمیت واضح کریں۔ ان کی سرگرمیوں پر نظر رکھیں۔ کسی غلطی کی صورت میں نرمی اور محبت سے ان پر یہ واضح کریں کہ یہ چیزیں ہماری اقدار کے خلاف ہیں۔ جب بچے بڑے ہو جائیں تو ایک مناسب عمر میں ان کی شادی کو اپنی ترجیحات میں بہت اوپر رکھیں۔ یہی وہ راستہ ہے جس پر چل کر ہم اس مسئلے کو حل کر سکتے ہیں۔

ماخذ (اُردو۔۱۳۰)

انٹرنیٹ: امکانات وخطرات

‘دیسوتی’

ایک دور وہ تھا جب فحش مواد کی حیثیت شجرِ ممنوعہ کی سی تھی۔ اوّل تو اس کا ملنا مشکل ہوتا۔ مل جاتا تو پھر اس سے استفادہ اور بھی مشکل ہوتا۔ وہی وہانوی کے افسانے ہوتے یا رفیع احمد خاں کی شاعری، لوگ انھیں چھپا کر رکھتے اور چھپ چھپ کر پڑھتے۔ تصاویر کا معاملہ تو اور بھی نازک تھا۔ انھیں تو مقفل صندوق کے اندر کپڑوں کی سب سے نچلی تہہ میں رکھا جاتا اور میدان خالی دیکھ کر نکالا جاتا اور چوکنے ہو کر دیکھا جاتا۔ پھر متحرک فلموں کا زمانہ آیا۔ ہم مذاق اور بے تکلف دوست کسی خالی گھر میں اکٹھا ہوتے جہاں بلیو فلموں کا شو ہوتا اور سب گھر والوں اور دوسروں سے چھپ کر ان سے لطف اندوز ہوتے۔ انٹرنیٹ کی آمد نے تقریباً سارا کچھ بدل دیا۔ کہنے کو تھوڑا سا حجاب باقی ہے لیکن جن گھروں میں انٹرنیٹ موجود ہے۔ وہاں سب اچھی طرح جانتے ہیں کہ موصوف جو ’علم کی تلاش‘ میں دروازہ بھیڑ کر کمپیوٹر پر ’براؤزنگ‘ کر رہے ہیں وہ دراصل کیا دیکھ رہے ہیں۔ یہاں یہ وضاحت بھی کر دی جائے کہ موصوف کی عمر دس سال سے لے کر ستر سال یا اس سے بھی زیادہ ہو سکتی ہے۔

جن گھروں میں کمپیوٹر نہیں ہے وہاں بھی سب کو پتا ہے کہ نکڑ پر واقع انٹرنیٹ کیفے میں چالیس روپے فی گھنٹہ ادا کر کے نوجوان طالب علموں کے ساتھ ساتھ ان پڑھ مزدور، ٹیکسی ڈرائیور اور کاری گر قسم کے لوگ بھی کس قسم کی ’معلومات‘ حاصل کر رہے ہیں۔ انٹرنیٹ پر فحش مواد کئی شکلوں میں دستیاب ہے۔ فحش کہانیاں، جنسی جذبے کو ابھارنے والی اور جنسی تقاضوں کو پورا کرنے کے انوکھے طریقے بتانے والی، عریاں تصاویر اور اسی طرح کے ویڈیو۔ یہ تمام مواد جو مختلف ’سائٹس‘ پر موجود ہے ماؤس کی ذرا سی جنبش کے ساتھ یا تو بالکل مفت یا چند ڈالر فیس ادا کر کے دیکھا جا سکتا ہے۔ ان ’سائٹس‘ کا پتا لگانا بھی مشکل کام نہیں۔ یہ لوگ خود انٹرنیٹ استعمال کرنے والوں کو اس طرح کی اطلاع ای۔ میل کے ذریعے فراہم کرتے رہتے ہیں۔

لیکن بات یہیں ختم نہیں ہو جاتی۔ انٹرنیٹ بے جان فحش مواد کی تقسیم سے آگے بڑھ کر جیتے جاگتے انسانوں کے درمیان تعلقات پیدا کرنے میں بھی معاون ثابت ہو رہا ہے۔ انٹرنیٹ پر اجنبیوں سے راہ و رسم پیدا کرنے کی ایک سہولت فراہم کی گئی ہے جس کو ’چیٹنگ‘ یا گپ شپ کا نام دیا گیا ہے۔

اس کے ذریعے کوئی بھی فرد اپنی پسند کی عمر، تعلیم اور دلچسپیاں رکھنے والے مرد یا عورت سے باہمی پسند کے موضوع پر تحریری گفتگو کر سکتا ہے۔ اکثر اوقات گپ شپ کا یہ سلسلہ دوستی، شادی یا ناجائز جنسی تعلقات تک پہنچتا ہے۔ پاکستان میں بھی 'چیٹنگ' کے ذریعے شادیاں عام ہوتی جارہی ہیں۔ اس کے علاوہ اور بھی بہت کچھ ہورہا ہوگا لیکن اس کی خبریں اب تک اخبارات تک نہیں پہنچ پائی ہیں۔ البتہ اسلام آباد میں ایک واقعہ ہوا جس کی رپورٹ ایک انگریزی اخبار میں شائع ہوئی ہے۔ رپورٹ کے مطابق ایک معمر بیوہ کینیڈین خاتون نے ایک پاکستانی سے انٹرنیٹ پر گپ شپ کے ذریعے دوستی کی۔ نوبت شادی کے وعدے تک پہنچی۔ جب وہ کینیڈین خاتون اپنے دوست کے دیے ہوئے پتے پر اسلام آباد میں اس کے گھر پہنچی تو معلوم ہوا کہ وہ اٹھارہ سال کا ایک طالب علم تھا۔ خاتون نے جب لڑکے کے والدین سے جو اس سارے معاملے سے بالکل بے خبر تھے ان کے بیٹے کے ساتھ شادی کا ارادہ ظاہر کیا تو وہ سخت ناراض ہوئے۔ لیکن اگلے دن ان کا بیٹا غائب ہوگیا۔ کئی دنوں بعد پتا چلا کہ لڑکا اس خاتون سے قانونی شادی رچا کر اس کے ساتھ کینیڈا چلا گیا۔

انٹرنیٹ نے فحاشی اور بے راہ روی کے جو دروازے کھول دیے ہیں وہ ہمارے معاشرے اور مذہبی قدروں کے منافی تو ہیں ہی، مغرب کے آزادی پسند معاشرے میں بھی ان کی وجہ سے خاصی تشویش پائی جاتی ہے۔ خاص طور پر بچوں پر ان کے جو اثرات پڑ رہے ہیں وہ مغربی والدین کے لیے خاصی پریشانی کا باعث بنے ہوئے ہیں۔ وہاں پر اس طرح کے واقعات بڑی تعداد میں ہوئے ہیں جن میں انٹرنیٹ پر گپ شپ کے ذریعے جنسی جنونیوں نے چھوٹے بچوں اور بچیوں کو ورغلا کر کہیں بلایا اور پھر انھیں جنسی زیادتیوں اور تشدد کا نشانہ بنایا۔ ایسے واقعات کی بنا پر مغربی ممالک، خصوصاً امریکا میں ان طریقوں پر غور کیا جارہا ہے جن کے ذریعے نامناسب 'سائٹس' کو بلاک کیا جاسکے اور بچوں اور کمسن افراد کو ان سے محفوظ رکھا جاسکے۔ اس سلسلے میں دو رکاوٹیں ہیں۔ اول تو ایسا کوئی طریقہ اب تک دریافت ہی نہیں ہوسکا ہے جو سو فیصد کامیاب ہو۔ دوئم یہ کہ آزادی اطلاعات اور آزادیِ اظہار کے حامی بعض گروپوں کی طرف سے بھی اس طرح کے اقدامات کی مخالفت کی جارہی ہے۔

(غیر مطبوعہ)

اُبوظہبی کے اسکولوں میں

انجنا سنگار

بہت سے والدین تو یہ سُن کر ہی لرز اُٹھتے ہیں کہ ثانوی جماعت میں پڑھنے والا اُن کا بچہ اپنی اسکول کی کمپیوٹر لیب یا اپنے موبائل فون پر فحش مواد بھی دیکھ سکتا ہے۔ مگر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ متحدہ عرب امارات کی اسکولوں کے کیمپسوں پر فحش فلموں اور فحش وڈیوز کی بھرمار کے ساتھ ہی ساتھ، اُن واقعات کی تعداد میں بھی تشویش ناک اضافہ ہوتا چلا جارہا ہے جن میں بچے یا تو ایسی فلموں کو دیکھتے ہوئے پکڑے جاتے ہیں یا پھر دوسروں کو دیتے ہوئے۔ کئی اسکولوں کا تدریسی اور دفتری عملہ یا تو اس مسئلے پر اپنا منہ کھولتا ہی نہیں یا پھر وہ اس مسئلے کو ٹالنے کی کوشش کرتا ہے۔ جب کہ یہاں کی مختلف اسکولوں کے بارہ سے زیادہ طلبا نے برملا اس بات کا اقرار کرلیا ہے کہ اُن کی اسکولوں میں اس قسم کی گندی اور ننگی تصویریں بڑی آسانی سے دیکھی جاسکتی ہیں۔

اس قسم کا مواد زیادہ تر ڈاؤن لوڈ کیا ہوا ہوتا ہے، پھر ورلڈ وائڈ ویب سے حاصل کیا ہوا یہ مواد تصویروں اور وڈیو کی شکل میں ہوتا ہے۔ یہ مواد یا تو موبائل فون کے ذریعے دوسروں تک پہنچتا ہے یا پھر ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں پہنچایا جاتا ہے۔ مگر دوسری طرف 'والدین تو ابھی اسی بات کو سمجھ نہیں پارہے کہ 'اتصلات' کی بند کردہ ان سائٹس کا مواد بچوں تک کیسے پہنچ جاتا ہے! ایک پرائیویٹ اسکول کے آٹھویں کے ایک طالب علم نے جسے حال ہی میں اس طرح کا عریاں مواد دیکھنے کی پاداش میں معطل کیا گیا ہے، بتایا کہ وہ اور اس کے دوسرے دوست کھیل کے پیریڈ کے دوران اپنے اپنے موبائل فونوں کے ذریعے ایسا مواد دیکھتے رہتے ہیں، جو 'صرف بالغان' کے لیے ہوتا ہے۔ اس طالب علم کے مطابق، ہر پیر کے دن، جسمانی تعلیم کا اُستاد بچوں کو لے کر اُن کو فٹبال کھلانے کے لیے مدینۃ الزید لے جاتا ہے۔ مگر ان کی جماعت کے کوئی پانچ یا چھ لڑکے اسکول ہی میں ٹھہر جاتے ہیں اور پھر اس طرح کا مواد دیکھتے ہیں۔ اسی طالب علم نے یہ بھی بتایا کہ کچھ بڑے لڑکے تو اس قسم کی فلاپیز کرائے پر بھی چلاتے ہیں، یعنی وہ اپنے ہی دوسرے ساتھیوں کو گھنٹے بھر کے لیے ایسی فلاپیز دے کر، دس سے پندرہ درہم وصول کر لیتے ہیں۔ مگر وہ احتیاط برتتے ہیں کہ صرف ایسے لڑکوں کو فلاپیز دی جائیں جن کے بارے میں اُن کو یقین ہوتا ہے کہ وہ اس بات کو پرنسپل تک نہیں پہنچائیں گے۔

ایک اور طالب علم نے جس نے اپنا نام علی بتایا اور جو ایک گورنمنٹ اسکول میں گیارہویں میں پڑھتا ہے، اُس نے بتایا کہ اُسے اس طرح کی چیزیں ایک ایسے دوست سے ملیں جس کا بڑا بھائی کالج میں پڑھتا ہے۔ اس کا دوست اپنے بھائی کی فلوپیاں اور سی ڈیز چرا کر اسکول لے آتا تھا۔ ایک بار ریاضی کے ایک اُستاد نے ان لڑکوں کو اس وقت پکڑ لیا جب وہ سب مل کر ٹائیلٹ میں چھپ کر ایسی فلمیں دیکھ رہے تھے۔ پھر یہ تمام کے تمام لڑکے ایک ہفتے کے لیے معطل کر دیے گئے۔ اس طالب علم نے بہرحال یہ بھی کہا کہ طلبا اس طرح کا مواد محض تجسس کی بنا پر دیکھتے ہیں اور ان کی نیت بُری نہیں ہوتی۔ مگر ایک دوسرا واقعہ خاصا مخدوش تھا۔ ہوا یہ کہ ایک لڑکے نے اپنے دو ساتھیوں کو اس وقت 'ٹیپ' کر لیا جب وہ ٹائلٹ میں چھپ کر جنسی حرکتیں کرنے میں مصروف تھے۔ یہی نہیں۔ پھر یہ 'ٹیپ' طلبا میں تقسیم بھی ہوئے بہرحال، پھر ان تینوں لڑکوں کو پولیس نے گرفتار کر لیا اور انھیں سزائیں بھی ہوئیں۔

اس طرح کے واقعات، گھروں میں بھی کچھ کم نہیں ہوتے۔ اُمّ خالدہ جو ایک محکمے میں ملازمت کرتی ہیں اور جن کے تین بچے زیرِ تعلیم ہیں، انھوں نے بتایا کہ وہ اس وقت حیران ہو کر رہ گئیں جب انھوں نے اپنے چودہ سالہ بھتیجے کو اُن کے کمپیوٹر پر اس طرح کی تصویریں دیکھتے ہوئے پکڑ لیا۔ ان کا یہ بھتیجہ، گرمیوں کی چھٹیوں کے دوران اُن سے ریاضی سیکھنے اُن کے گھر آیا ہوا تھا۔ اُمّ خالدہ نے مزید کہا کہ اُن کو اس بات کا بالکل اندازہ نہیں تھا کہ اُن کے بھتیجے کے پاس اس طرح کے مواد سے بھری ہوئی کئی فلاپیاں موجود ہیں۔ اپنے پکڑے جانے پر اُس نے یہ اقرار کیا کہ یہ فلاپیاں اُس نے اپنے دوستوں سے نقل کی ہیں اور اس طرح کی فلاپیاں وہ اسکول میں اپنے کمپیوٹروں پر دیکھتے رہتے ہیں۔

ماخذ (انگریزی۔ 38)

آخری قہقہہ

جامعات میں معمور کمپیوٹر کے فنی ماہرین ایک طرح کے ‘فکری’ پہرہ دار ہوتے ہیں جو ایسی تمام ویب سائٹس پر نظر رکھتے ہیں جن پر طلبا اور طالبات ‘لاگ ان’ کرتے ہیں۔ اب یہ ‘ڈاؤن لوڈنگ’ چاہے، ‘کازاز’ کی موسیقی ہو، میل آرڈر پر بکنے والی دلہنوں کی قیمتوں کے بارے میں اشتیاق ہو یا ‘ویاگرا’ کے نسخے...... یوں سمجھ لیں کہ جامعہ کا ‘بڑا بھائی’ آپ کو دیکھ رہا ہے۔

ایک ایسا ہی طالب علم، جو جامعہ کے انٹرنیٹ پر فحش نگاری کی کیفیت و کمیت معلوم کرنے میں لگا رہتا، انھی فنی ماہرین کے گھیرے میں آ گیا اور ان میں سے ایک فنی ماہر نے ڈانٹ ڈپٹ کرتے ہوئے اُسے دھمکی دی کہ ‘اگر تم نے اپنی اس گندی عادت کو نہیں چھوڑا تو ہم تمھاری پسند کی تمام ویب سائٹس کی فہرست، تمھارے نام کے ساتھ، کامن روم میں چسپاں کر دیں گے۔’ بہرحال یہ فحش پسند لڑکا اپنی حرکتوں سے باز نہیں آیا اور اسکول کی بچیوں کو انٹرنیٹ پر عجیب و غریب حرکتیں کرتا دیکھ کر خوش ہوتا رہا۔

مگر اس وقت تو ہر کوئی ششدر رہ گیا جب جامعات کے ان بڑے بھائیوں نے اپنی دھمکی کو عملی جامہ پہناتے ہوئے، اسی قسم کی تمام بہترین ویب سائٹس کی ایک مکمل فہرست، دوسرے لڑکوں کی سہولت کی خاطر بھی نوٹس بورڈ پر اس طالب علم کے نام ساتھ آویزاں کر دی۔ پتا یہ چلا کہ آکسفورڈ کے ان فکری پہرہ داروں کے ہاں بھی حسِ مزاح ضرور پائی جاتی ہے۔

ماخذ (انگریزی۔ 39)

آرٹ بک والڈ کا ایک کالم

اب ہمارے سامنے ایک نئی قسم کے کمپیوٹر چور آ گئے ہیں جن کو 'مدر ہیکرز' کہا جاتا ہے۔ یہ وہ والدین ہوتے ہیں جو اپنے بچوں کی خواب گاہوں میں چُھپے چوری جا کر یہ دیکھتے رہتے ہیں کہ اُن کے بچے کمپیوٹرز پر کس قسم کا مواد ڈاؤن لوڈ کرتے رہے ہیں۔ اور یہ بات مجھے اس وقت معلوم ہوئی جب میں جارج وین رائٹ کی ممّا مسز فرانسکا سے ملنے اُن کے گھر پہنچ گیا۔ وہ اپنے بیٹے کے کی بورڈ کے پاس بیٹھی ہوئی تھیں، مجھے دیکھتے ہی بولیں: 'میں یہ دیکھنے لگی ہوں کہ جارج نے 'میمری' میں کیا کیا ڈال رکھا ہے!'

کیا یہ بات جائز ہے!

'میں اس کی ماں ہوں۔ مجھے یہ معلوم ہونا چاہیے کہ اس کی فائلوں میں کیا ہے!'

واقعی!

فرض کریں، اُس نے 'پینٹ ہاؤس' میں پورنوگرافی جمع کر رکھی ہے تو مجھے یہ بات معلوم ہونا چاہیے۔

اگر واقعی اُس نے اس طرح کی پورنوگرافی جمع کر رکھی ہے' پھر! میں نے پوچھا

میں اس تمام پورنوگرافی کو مٹا دوں گی۔ آخر مائیں کس لیے ہوتی ہیں!

میں تو سمجھتا ہوں کہ کمپیوٹر بھی ڈاک کی طرح ہے۔ آپ کو یہ نہیں چاہیے کہ آپ اپنے بیٹے کی اسکرین پر کچھ بھی دیکھیں یا پڑھیں۔

فرض کرو، وہ ناروے کی کسی لڑکی سے خط و کتابت کر رہا ہے۔ اگر میں اسے منع نہیں کروں گی تو پھر کون کرے گا!

'میں تو سمجھتا ہوں کہ آپ کچھ مبالغہ سے کام لے رہی ہیں۔ ویسے بھی آپ کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ اپنے بیٹے کی ای۔ میل کھولیں۔ اور اگر بالفرض جارج واقعی اسکینڈے نیویا کی کسی خوب صورت لڑکی سے خط و کتابت کر بھی رہا ہے تو اس میں کیا حرج ہے!'

میں اس کی ماں ہوں اور میں جانتی ہوں کہ اس کے لیے کیا بات اچھی اور کیا بات بُری ہے۔ ویسے بھی میں اس کی وقتی فائل میں میڈونا کی تصویر دیکھ چکی ہوں۔

میں آپ کو اس بات سے روک تو نہیں سکتا لیکن اگر تمھارا بیٹا یہ بات کسی اور کو بتائے گا پھر!

ایسی بات تم تو کر سکتے ہو لیکن اگر تمھارا بھی کوئی لڑکا ہوتا جو سارا دن اپنے کمرے میں کمپیوٹر کے پاس بیٹھا رہتا تو تم بھی یہ معلوم کرنا چاہتے کہ آخر وہ کیا دیکھ رہا ہے! میں اپنے بیٹے کی حفاظت اسی وقت کر سکتی ہوں جب مجھے یہ معلوم ہو کہ وہ انٹرنیٹ پر کیا دیکھ رہا ہے! یہ کہہ کر وہ پھر کمپیوٹر کے پاس پہنچ گئی اور وہاں پہنچتے ہی چلائی: 'یہ دیکھو! یہ پیغام 'نیکڈ گیم دی اسٹرینجرز' سے آیا ہے۔'

'اس طرح کے پیغامات کسی نہ کسی طرف سے ہر بچے کو ملتے ہیں، میں نے کہا۔ 'مگر میں نے اپنے بیٹے کو کمپیوٹر اس لیے نہیں دلوایا تھا کہ وہ اس قسم کے پروگرام دیکھے'

'اگر تم نے اس کا یہ پروگرام کمپیوٹر سے ختم کر دیا تو آئندہ وہ تم پر بالکل بھروسہ نہیں کرے گا' میں بولا۔

میں نے دیکھا کہ مسز فرانسکا کچھ پریشان سی ہونے لگی ہیں، مگر پھر وہ بڑبڑائیں: اگر میں اپنے بیٹے کا کمپیوٹر نہیں کھول سکتی تو پھر کون کھول سکتا ہے!

ماخذ (انگریزی-32)

صُورتِ احوال

فریحہ الطاف

میاں اعجاز الحسان

rekhta

ملبوس کی عریانیاں

لباس کیوں پہنا جاتا ہے! مذہبی نقطہ نظر سے، آدم و حوا کا جنت سے اخراج اس وقت ہوا جب انھوں نے 'شجرِ ممنوعہ' کا پھل کھالیا اور اپنے حلۂ بہشتی سے محروم کر دیے گئے۔ تو کیا لباس پہننے کی وجہ محض انسانی شرم و حیا کا جذبہ ہے! خود شرم و حیا کا تصور مختلف تہذیبوں میں مختلف رہا ہے۔ ہند و پاک کی اکثر برقع پوش خواتین اپنا چہرہ کھلا رکھتی ہیں اس لیے کہ وہ چہرے کے پردے کی قائل نہیں۔ دوسری طرف ہیولاک ایلس کے مطابق' کئی معاشرے ایسے موجود ہیں جہاں عورتیں چھاتیوں کی بجائے اپنا چہرہ چھپانا زیادہ ضروری سمجھتی ہیں۔ ایک زمانے میں چینی عورتیں اپنے پاؤں دکھانا بدترین بے حیائی سمجھتی تھیں۔ سموآ کی عورتیں اپنی ناف کو چھپانا حیا سمجھتی ہیں اور الاسکا کی عورتیں اپنے آپ کو اس وقت تک برہنہ محسوس نہیں کرتیں جب تک ایک چوڑی نما زیور ان کے ہونٹ سے لٹکا رہے۔ اسی طرح پولی نیسیا کی عورتیں اپنی کھلی چھاتیوں کے باوجود اپنے آپ کو مشرقی خواتین کی طرح باحیا سمجھتی ہیں۔ ملبوسات کسی وجہ سے پہنے جاتے ہوں، وہ تمام کے تمام فیشن کی زد میں آتے رہتے ہیں بلکہ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ لفظِ فیشن کا اطلاق سب سے زیادہ ملبوسات پر ہی ہوتا ہے اور ہم اسی پس منظر میں آج کے زنانہ ملبوسات کا ایک مختصر جائزہ لیں گے۔

پاکستان میں خواتین کے ملبوسات میں سب سے پہلے نزلہ برقعے پر گرا۔ ایک وجہ تو یہ تھی معاشی اور سماجی عوامل کی بنا پر اُسے غیر ضروری سمجھا جانے لگا۔ اس لیے کہ اب محل سراؤں اور پالکیوں کا زمانہ تو گزر چکا ہے اور برقعے کو ہر وقت سنبھالے رہنا ایک مسئلہ، خصوصاً ان خواتین کے لیے جو کسی نہ کسی غرض سے گھر سے باہر نکلتی ہیں۔ پھر کچھ عورتوں نے برقعے کی بجائے اوور آل، اپرن اور چادریں لینا شروع کر دیں جس کی ایک وجہ یہ تھی کہ برقعہ پوش خواتین کو 'مشکوک' سمجھا جانے لگا تھا اور پولیس آئے دن ایسی عورتوں کو 'شارع عام پر دعوتِ گناہ' دینے کے الزام میں گرفتار کرنے لگی تھی۔ برقعے کے بعد دوپٹے کی باری بھی بہت جلد آگئی اور اس سلسلے میں کیا عرض کیا جائے کہ، ع جو تھا دوپٹہ، ہے اب ایک پٹی اور آج صورتِ حال کچھ ایسی ہے کہ اس پٹی کا وجود بھی خطرے سے دوچار ہے۔ اس لیے بھی اب دوپٹے سے اوڑھنے اور چھپانے کا کام تو لیا نہیں جاتا، نہ اُسے دانتوں تلے دبا کر ہنسی روکی جاتی ہے اور نہ شرماتے وقت اس سے خواہ مخواہ انگلیوں سے بل دیے جاتے ہیں۔ اب تو دوپٹہ یا پٹی، کچھ بھی کہہ

لیجیے صرف گلے میں جھولتا رہتا ہے یا پھر پیچھے رینگتا رہتا ہے۔ کیوں کہ اُسے سر پر اوڑھنے سے ہیئر اسٹائل' خراب ہونے کا ڈر لگا رہتا ہے۔

اپنے اردگرد نظر ڈالیں تو معلوم ہوگا کہ دوپٹے واقعی معدوم ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ ۱۵رمئی ۱۹۷۶ء کو روزنامہ ڈان میں ایک مراسلہ چھپا۔ مراسلہ نگار نے کراچی میں ہونے والی ایک فیشن پریڈ کے حوالے سے یہ سوال کیا تھا کہ اس میں شامل ہونے والی تمام لڑکیاں دوپٹوں سے بے نیاز کیوں تھیں! مراسلہ نگار نے خدشہ ظاہر کیا تھا کہ مغرب کی نقالی میں خواتین نے اگر آج دوپٹہ اُتار پھینکا ہے تو پھر رفتہ رفتہ لباس کے دوسرے حصوں کی بھی باری آ سکتی ہے۔ اس مراسلے کے جواب میں ۲۰ مئی کو کنی علی نامی ایک خاتون کا مراسلہ شائع ہوا جس میں انھوں نے کہا کہ یوں لگتا ہے کہ تقریب میں پیش کیے جانے والے مختلف ملبوسات کی بجائے موصوف کی نظریں ماڈل گرلز کے جسموں پر لگی ہوئی تھیں'۔ ان محترمہ نے اُس مراسلہ نگار سے یہ سوال کیا کہ 'جینز' اور 'ٹی شرٹس' پر دوپٹہ کیسے اوڑھا جاتا ہے! پھر محترمہ نے یہ بھی لکھا کہ اگر موصوف کا یہ خیال ہے کہ دوپٹہ اوڑھنے سے عورت باحیا ہو جاتی ہے تو یہ اُن کی بہت بڑی بھول ہوگی۔ کنی علی کا ایک اور مراسلہ بعد میں بھی شائع ہوا جس میں انھوں نے کہا کہ کوئی کب، کیا اور کس طرح کا لباس پہنتا ہے، یہ اس کا ذاتی مسئلہ ہے۔

یہ باتیں تو خیر سے سالوں پرانی ہو چکیں، ابھی حال ہی میں ایک روزنامے کی خاتون کالم نگار نے دوپٹے کے بارے میں ایک مضمون لکھا تو کئی ایک خواتین کے خطوط آ گئے جن میں اس خاتون کالم نگار کو مشورہ دیا گیا تھا کہ وہ دوپٹے کی باتیں چھوڑ کر، امن کے موضوع پر لکھنا شروع کرے۔ زنانہ شلوار قمیص جس تیزی سے اپنی مقبولیت کھو رہے ہیں، وہ بھی ایک عام مشاہدے کی بات ہے کیوں کہ آج کل شلواروں کی بجائے بیل باٹم' الاسٹک لگے ہوئے پائجامے، جینز نما ٹراؤزرز، فلیپرز اور سلیکس زیادہ پہنے جانے لگے ہیں۔ اور قمیصوں کی بجائے اکثر خواتین، ٹی شرٹس، بنیان نما شرٹس، اوپن فرنٹ شرٹس، ٹی شرٹس اور کالر والی مردانہ شرٹس استعمال کرنے لگی ہیں۔

۱۹۷۶ء میں کراچی میں ہونے والے اسپورٹس کے مقابلوں میں جن طالبات نے حصہ لیا، اُن میں اکثر نے اپنے انٹرویوز میں کہا کہ 'شلوار کھیل میں رکاوٹ پیدا کرتی ہے'۔ انھوں نے یہ بات بھی کہی کہ عالمی مقابلوں میں تو لڑکیوں کو نیکر پہن کر ہی شامل ہونا پڑتا ہے، اس لیے پاکستانی لڑکیوں کو بھی قومی سطح پر ہونے والے کھیل کے مقابلوں میں نیکر پہن کر شرکت کی اجازت دی جائے۔ یوں بھی، سینٹ جوزف گرلس سیکنڈری اسکول کی طالبات پی ٹی پیریڈ میں نیکر پہن کر شامل ہوتی ہیں۔ آخر کار، خواتین کھلاڑیوں نے اپنا یہ مطالبہ منوا لیا اور حال ہی میں پیکنگ (چین) میں ہونے والی تیسری بیڈمنٹن چیمپین شپ میں پہلی بار عصمت سعید اور نزہت صدیقی نے شارٹس اور بنیان استعمال کیے۔ ایک

رپورٹ کے مطابق جب یہ کھلاڑی لڑکیاں بنیان اور شارٹس پہنے ہوئے کورٹ میں داخل ہوئیں تو بھرپور تالیوں کی گونج میں اُن کا والہانہ استقبال کیا گیا۔ کراچی جیم خانہ کے سوئمنگ چیمپئن شپ کے مقابلوں میں بھی لڑکیاں سوئمنگ سُوٹ پہن کر شامل ہوتی ہیں جن میں سے بعض کی تصاویر شام کے اخبارت میں بھی چھپتی ہیں۔ بڑی لڑکیاں بھی تیراکی کا لباس پہن کر ہی ان مقابلوں میں شرکت کرتی ہیں۔ حال ہی میں سمیرا شفیع نے ان مقابلوں میں پہلی پوزیشن حاصل کی ہے۔ تنگ مہری کی شلوار اور چوڑی دار پانجامے پہننے والیاں بھی اب خال خال ہی نظر آتی ہیں البتہ ایک پائنچے والے شرارے اور 'لاچے' بڑے شوق سے پہنے جا رہے ہیں۔ 'لاچا' تو اب فلمی دنیا کا بھی مقبول پہناوا بن چکا ہے اور اکثر اونچی اداکارائیں لاچے میں نظر آتی ہیں۔

ساڑی/ساری ایک قسم کی لمبی دھوتی جو عورتیں آدھی تہ بند کی جگہ باندھتی ہیں اور باقی آدھی چادر کی طرح اوڑھ لیتی ہیں، آج بھی شادی بیاہ کے موقعوں پر ہمارے ہاں ایک مقبول پہناوا ہے، یہ اور بات ہے کہ وہ پچیس مختلف طریقوں سے باندھی جاتی ہے اور بھارتی فلمی اداکاراؤں نے اُسے نت نئے انداز سے باندھ کر اُسے کہیں سے کہیں پہنچا دیا ہے اور جس کی نقلیں ہمارے ہاں بھی نظر آتی ہیں۔ اس قسم کی 'ہپسٹر' یا 'نیچی ساریاں' 'منی چولی'، 'منی بلاؤز' یا 'لو نیک کُرتی' کے ساتھ ناف کے نیچے اور ٹھیک کولہوں کے اوپر باندھی جاتی ہے اور پیٹھ پر صرف دو ڈوریاں لٹکی نظر آتی ہیں اور بس...... 'منی ساڑی' جو ٹخنوں سے اوپر باندھی جاتی ہے، ابھی ہمارے ہاں اتنی مقبول نہیں۔ ساڑی کے ساتھ ہمارے ہاں عموماً بلاؤز اور نیچے پیٹی کوٹ پہنا جاتا ہے مگر یہ کہا جاتا ہے کہ یہ دونوں کپڑے برطانوی راج کی یادگار ہیں جو ہندوستان کی گرم آب و ہوا کے لحاظ سے مناسب نہیں۔

مختصر پوشی آج کل فیشن کا لازمہ ہے اور شمیض اور بنیان وغیرہ کم ہی استعمال ہو رہے ہیں۔

واجدہ تبسم نے حیدر آباد (دکن) کے نوابی ماحول کے حوالے سے ایک جگہ لکھا ہے کہ: حویلیوں کا ایک جان لیوا چلن یہ تھا کہ اُن دنوں لڑکیاں، کُرتوں کے اندر محرم وحرم نہیں پہنا کرتی تھیں، جو ہے بس سامنے ہے۔ اب فرق یہ پڑا ہے کہ اس قسم کے جان لیوا چلن حویلیوں سے باہر آ گئے ہیں۔ خصوصاً اونچے طبقے کی خواتین، 'چھوٹے کپڑوں' کے چکر نہیں پڑتیں۔ ساڑی، غرارے، شرارے اور میکسی کے نیچے بھی پیٹی کوٹ کی بجائے صرف زیر جامے پہننے کو ترجیح دی جا رہی ہے۔ مختصر پوشی کی طرح چُست پوشی آج کل فیشن میں شامل ہے۔ ایک زمانہ تھا کہ اگر ماں ہاتھوں میں کوئی چیز سنبھالے ہوئی ہوتی تو بچہ اُس کی قمیص کا دامن تھام لیتا۔ مگر آجکل تو قمیص ہر جگہ کسی رہتی ہے اور اس کا چاک بھی خاصا بڑا ہو گیا ہے۔ زنانہ قمیصوں کی چولیاں تنگ ہو گئی ہیں اور جمپر کولہوں سے چپکے نظر آتے ہیں۔

لمبے لمبے چاک والی قمیصوں کے گریبان بہر حال خاصے کھلے رکھے جا رہے ہیں گزشتہ دنوں

صادقین کی تصاویر کی نمائش پر بڑا ہنگامہ مچایا گیا کیوں کہ، لاہور کے ایک روزنامے کے کالم نگار کے بقول: "اس نمائش میں موجود اکثر خواتین کے گریبان تصاویر کے گریبانوں سے زیادہ کھلے اور نیچے تھے۔ مگر یار لوگوں نے تصاویر کے گریبانوں کی نچائی پر اتنا شور مچایا کہ اونچی سوسائٹی کے گریبانوں کی نچائیاں نظروں سے اوجھل ہوگئیں۔ شاید تصاویر کے گریبانوں پر اتنا شور مچایا ہی اس لیے گیا تھا کہ نمائش گاہ میں موجود نیچے گریبانوں کا ذکر نہ ہونے پائے"۔ ملبوسات اب زیادہ مہین اور زیادہ شفاف بھی بنائے جانے لگے ہیں اور یہ ملبوسات پہننے والیاں جیسے ہی روشنی یا دھوپ میں آتی ہیں، اُن کے بدن ملبوسات سے صاف جھلکتے نظر آتے ہیں۔ مثال کے طور پر ۱۹ اکتوبر ۱۹۷۶ء کے پی ٹی وی کے قومی پروگرام "منزل" ہی کو لیجیے جس میں طلباء و طالبات کی ایک بھاری تعداد کے درمیان پشاور یونیورسٹی کے وائس چانسلر بھی موجود تھے۔ اسکور بورڈ کی نشاں دہی کرنے والی محترمہ کی پشت کا جب بھی کلوز اپ، دکھایا جاتا، ناظرین کو ان کے ملبوس سے بریسیئرز کی پٹیاں اور شلوار کا نیفہ صاف نظر آنے لگتا۔

جدید ملبوسات کی تراش خراش کی طرح اُن کی بندشوں کا نظام بھی یکسر تبدیل ہو کر رہ گیا ہے۔ چولی کی ڈوریوں کی جگہ بریسیئر کے ہک اور بٹن آگئے ہیں اور کمر بند کی بجائے الاسٹک استعمال ہونے لگا ہے۔ بعض پاجامے صرف سرک پھندوں سے باندھے جاتے ہیں اور ایسے زنانہ پجامے ملنے لگے ہیں جن میں الاسٹک بھی نہیں بلکہ صرف پچ بٹن لگے ہوتے ہیں۔

ماخذ (اُردو۔۱۱۳)

زیر جاموں کی ایک نمائش

فریحہ الطاف

پہلی بار جب بیوٹ میرے پاس ایک زنانہ زیریں ملبوسات شو منعقد کرنے کے سلسلے میں آئی تو سچ تو یہ ہے کہ مجھے ایک تھرتھری سی آگئی۔ پھر کچھ ڈر بھی لگا۔ مگر یہ سب کچھ تو کسی بھی بات کو پہلی مرتبہ کرنے سے ہوتا ہی ہے۔ یہاں ایک مسئلہ اور بھی تھا کہ اگر ایسا شو کرایا جائے تو کس طرح کرایا جائے! مثلاً مجھے پاکستان میں ایسی ماڈلز کہاں ملیں گیں جو تقریباً اپنے سارے کے سارے ملبوسات اُتارنے کے لیے تیار ہوں، بھلے اُن کے سامنے صرف خواتین ہی کیوں نہ ہوں! پھر یہ کہ اس قسم کے شو کے لیے جگہ کہاں ملے گی، اور تحفظ کا کیا ہوگا! مگر میں نے محترمہ بیوٹ سے شو کے لیے حامی بھرلی اور اُسے یہ بھی بتادیا کہ مجھے ماڈلز باہر سے بلوانا ہوں گی اور شو کسی پرائیویٹ کلب یا کسی کی کوٹھی میں کرنا ہوگا کیوں کہ مجھے معلوم تھا کہ اگر یہ شو کسی ہوٹل میں ہو، تو اعتراضات ہوں گے۔

شو میں پیش کیے جانے والے زیریں ملبوسات زبردست تھے۔ انھیں دیکھ کر یہ لگا کہ اب اس طرح کے ملبوسات استعمال کرنے والیوں کو (بھلے وہ دولت مند ہی کیوں نہ ہوں)' ان ملبوسات کو خریدنے کے لیے مارکس اینڈ سپنسر (لندن) تک جانا نہیں پڑے گا بلکہ انھیں آغا کی دکان تک بھی نہیں جانا پڑے گا، اس طرح کے ملبوسات کے لیے بس انھیں صرف انٹرنیٹ کھولنا پڑے گا۔ بہرحال' سب سے پہلے دیکھنے والی بات یہ تھی کہ اس سلسلے میں ہمیں مقامی ماڈلز ملنے کی کتنی امید ہوسکتی ہے۔ میں نے صنم آغا کو اس کام پر لگایا کہ وہ یہاں کچھ لڑکیوں کو تیار کرے۔ پھر اس طرح کی ماڈلنگ کرنے والی لڑکیوں کو اُن کی شرم وحیا پر قابو پانے کے لیے یہ بات باور کرائی گئی کہ اُن کو ایسے ملبوسات کی ماڈلنگ کرنا ہوگی جن میں کسی نہ کسی حد تک اُن کے بدن ضرور ڈھک جائیں گے۔ مگر ہماری تو حیرت کی انتہا نہ رہی جب ہمارے پاس کوئی درجن بھر لڑکیوں کے نام پہنچ گئے جو ان ملبوسات کی ماڈلنگ کے لیے تیار تھیں۔ ان ناموں میں کچھ نام 'سپر' ماڈلز کے نام بھی شامل تھے۔

دوسرا مسئلہ جگہ طے کرنے کا تھا۔ سوال یہ تھا کہ اس قسم کے پروگرام کو منعقد کرنے کے لیے کون سی پرائیوٹ اور محفوظ جگہ ہوسکتی ہے۔ آخرکار ایک ہیلتھ کلب کو چن لیا گیا جس کے تالاب کے اردگرد اتنی ساری جگہ تھی کہ ہماری کوئی ۳۵۰ کے لگ بھگ مہمان خواتین آرام سے بیٹھ سکتی تھیں۔ اب مجھے

اُن ملبوسات کو چھانٹنا تھا جن کی نمائش کی جائے۔ مگر مجھے یہ دیکھ کر یک بارگی مایوسی سی ہوئی کہ یہ سارے ملبوسات صرف سفید، سیاہ اور biego کلر ہی تھے۔ میں نے سوچا، آخر گلابی رنگ کے چونکا دینے والے ملبوسات کہاں رہ گئے۔ یا پھر کم از کم تیز رنگ کے تو ہوں۔ مجھے بیوٹ نے بتایا کہ یہاں کی خواتین یہ ملبوسات انھی رنگوں میں پہنتی ہیں اور اسی لیے انھی رنگوں کے ملبوسات مہیا کیے گئے ہیں۔ مگر میرا خیال یہ تھا کہ ان رنگوں کے زیر جامے کسی دکان پر تو چل سکتے ہیں مگر ان سے کوئی شو کامیاب نہیں ہوسکتا۔ میں نے دوسرے رنگوں کے زیر جامے بھی منگوا لیے اور شو کی تاریخ بھی آگے بڑھا دی کیوں کہ ہمارے آرڈر کی تکمیل اتنی جلدی نہیں ہوسکتی تھی۔ اس طرح ہمیں دعوت نامے تیار کرنے کا بھی موقع مل گیا۔ شفاف گلابی رنگ کے دعوت نامے پر اسی رنگ کی ایک ربن لگی ہوئی تھی۔ اور پھر اسی دوران ہم نے اپنے مہمانوں کی ایک فہرست بھی تیار کرلی۔

ان تمام زیر جاموں کی فٹنگ ہمارے آفس میں ہونا تھی۔ جب سے میں ایک میرِ رقص (کوریوگرافر) بنی ہوں، میں نے اپنے ماڈلز کو ہمیشہ اپنے ملبوسات ہی میں دیکھا ہے۔ ممکن ہے میں نے ان کو کبھی کبھار بے لباس بھی دیکھا ہو مگر حقیقت یہ ہے کہ اس سے پہلے میں نے اپنی کسی بھی ماڈل کے بدن کا جائزہ نہیں لیا تھا۔ مگر اس بار میرے لیے یہ بات بڑی اہم ہوگئی تھی کہ میں یہ دیکھوں کہ یہ زیر جامہ ماڈل کے بدن پر کیسا لگتا ہے۔ فٹنگ کے وقت میں نے تھوڑی بہت تنقید سے ضرور کام لیا، مگر صرف اس نیت سے کہ سب ٹھیک ٹھاک ہی لگے۔ ہم نے ایک فیصلہ یہ بھی کیا کہ اس شو میں مختلف ٹائپ کے بدن والی ماڈلز پیش کی جائیں۔ میری ایک مددگار لڑکی تو اس وقت بالکل ہی پریشان سی ہوگئی اور مجھے بھی اُس ماڈل کا معائنہ کرنے کو کہا۔ کیوں کہ وہ ماڈل حاملہ تھیں۔ مگر میں نے یہ سوچا کہ ہم حاملہ خواتین کے لئے 'میٹرنٹی برا' کی بھی نمائش کردیں۔ یہ کوئی ایسی بات بھی نہیں کیوں کہ ہم میں سے اکثر خواتین کے بدن پر اسٹریچ مارکس تو ہوتے ہی ہیں جو بدن کے وزن کم ہونے اور اس کی رنگت میں مل جل کر ایک عام سی بات ہوجاتی ہے۔

بہر حال، دیکھتے ہی دیکھتے، آنے والے شو کی پہلے سے شہرت ہوگئی اگر ایک طرف کچھ مرد حضرات مدعو نہ کیے جانے پر جز بز سے ہو رہے تھے تو دوسری طرف خواتین فون کرکے زیادہ سے زیادہ دعوت نامے مانگ رہی تھیں۔ اور پھر ریہرسل کا دن بھی آ پہنچا۔ ایک ناقابلِ بیان تناؤ ساری فضا پر مساط تھا۔ مگر 'ناپو جویری اور ڈی آصف' کی موسیقی جو زیادہ تر کیکسی گانوں پر مشتمل تھی، اس نے فضا کے اس تناؤ کو بڑی حد تک کم کردیا۔ طارق امین کا کہنا تھا کہ ان ماڈلز سے یہ کہا جائے کہ وہ اپنی قمیص اتار کر ریہرسل کریں ورنہ ہوگا یہ کہ شو کے وقت یہ ماڈلز اعتماد کے ساتھ چلنے کی بجائے سکڑتی ہوئی نظر آئیں گی مگر میں اور فی ہارون تو اس وقت حیران ہوگئیں جب ہم نے دیکھا کہ ماڈلنگ تو رہی ایک طرف، ایسا

لگتا تھا کہ ہماری ماڈلز تو بلا خوف و خطر ستر کشائی کی مشق میں لگی ہوئی ہیں۔ اس مرحلے پر میں نے انھیں اپنی بلند آواز میں فوراً سمجھایا کہ اتنا زیادہ کچھ کرنے کی ضرورت نہیں اس لیے کہ یہ سب کچھ دیکھ کر یوں بھی بہت ساری مہمان خواتین چونک سی پڑیں گی۔

پھر سارا دن میں اسی کوشش میں لگی رہی کہ یہ ساری کی ساری جگہ پوری طرح محفوظ ہو جائے اور قناتیں اتنی ٹھیک ٹھاک لگ جائیں کہ کوئی باہر سے اندر جھانک بھی نہ سکے۔ پھر ہر مہمان خاتون کو دیکھ بھال کر اندر لایا گیا۔ حالاں کہ دعوت نامے پر یہ صاف صاف درج تھا کہ 'اپنے ساتھ سیل فون مت لائیں' صرف اس خطرے کے پیشِ نظر کہ کوئی چپکے ہی چپکے تصویریں نہ کھینچ لے، مگر پھر بھی خواتین اپنے ساتھ سیل فون لے کر آ گئیں جو سب کے سب ایک جگہ جمع کرا دیے گئے۔ خواتین ہی محافظ بنی ہوئی تھیں اور خواتین ہی ویٹرز کا کام بھی سرانجام دے رہی تھیں۔ تمام اطراف میں ایک مرد بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

جیسا کہ میں نے آپ کو پہلے بتایا، ہمارے پاس امدادی، ملبوسات بھی موجود تھے تاکہ ماڈلز کو کسی قسم کے ممکنہ خطرے کا احساس بھی نہ ہونے پائے، مثلاً جھالروں والی، شفاف پتلونوں کے ساتھ ساتھ ہمارے پاس رنگین ساڑیاں، سپرونگز اور باتھ ٹاولز بھی موجود تھے تاکہ اُن سے بدن ڈھانپا جا سکے۔ بہر حال یہ بات ضرور حیرت کی تھی کہ شو شروع ہوتے ہی لڑکیوں نے شرمانا بھی چھوڑ دیا، حالاں کہ شو کے شروع میں انھوں نے خاصی شرم سے کام لیا مگر پھر وہ سب کچھ بھول گئیں۔ اور پھر تو سارے بدن تھرکنا شروع ہو گئے اور 'امدادی' ملبوسات ایک ہی طرف پڑے رہے۔ دیکھنے والی خواتین میں سے کچھ تو محظوظ ہوئیں اور کچھ کو ایک دھچکا سا لگا، کچھ باہر بھی نکل گئیں اور کچھ نے تالیاں بھی بجائیں، مجموعی طور پر ہر ایک نے اس شو کو سراہا۔

ماخذ (انگریزی۔17)

اپنی زبان سنبھالیے، پلیز!

'اخلاق سنوارنے' کا ٹھیکہ زیادہ تر مولوی صاحبان اور سیاست دانوں کے پاس رہا ہے' مگر سوال یہ ہے کہ کیا یہ حضرات خود بھی اخلاق کے معیار پر پورا اُترتے ہیں! ایسا ہرگز نہیں ہے۔ آیئے، اس مضمون میں ہم ان دونوں گروہوں کے اراکین کا اُن کے 'قول و فعل' کی روشنی میں ایک مختصر سا جائزہ لیں اور اس قسم کے مشاہدے کے لیے ہماری قومی اسمبلی اور سینٹ بہترین مقامات ہیں جہاں ایک ساتھ بیٹھنے والے بھی ایک دوسروں کے تمام رازوں سے واقف ہوتے ہیں اور موقع ملتے ہی' پہلی فرصت میں اپنے مخالفین پر کیچڑ اُچھالنا بلکہ اُن کے بخیے اُدھیڑنا شروع کردیتے ہیں۔ پھر فریقین کے درمیان ہونے والی یہ گرما گرمی اتنی زیادہ بڑھنے لگتی ہے کہ اسپیکر حضرات کو انھیں بار بار کہنا پڑتا ہے کہ حضرت! اپنی زبان سنبھالیے، پلیز! بعض دفعہ تو بات مار کٹائی تک بھی پہنچ جاتی ہے۔ فریقین کا غصہ ٹھنڈا ہونے پر یہ تمام کاروائی حذف کردی جاتی ہے کیوں کہ استعمال میں لائے جانے والے 'ناشائستہ' الفاظ عموماً واپس لیے جاتے ہیں۔

پانچویں رمضان (۱۰ مارچ ۱۹۹۲ء) کی بات ہے، جب سینیٹ میں صدر پاکستان کی (۱۹ دسمبر ۱۹۹۱ء) کی اُس تقریر پر بحث ہونے لگی جو انھوں نے پارلیمنٹ کے مشترکہ ایوان کے سامنے کی تھی۔ وفاقی وزیرِ قانون نے جاگیرداروں کے خلاف تقریر کرتے ہوئے یہاں تک کہہ دیا کہ ان میں بعض کو جاگیریں اس لیے ملیں کہ انھوں نے اپنے انگریز آقاؤں کو عورتیں 'سپلائی' کی تھیں۔ مگر ایوان میں اصل ہنگامہ اس وقت شروع ہوا جب ایک سینیٹر نے ایک پشتون قبیلے کو اپنا نشانہ بنایا۔ جب گرما گرمی کے بعد ایوان ایک بار پھر پُرسکون ہوا اور کاروائی سے متنازعہ 'غیر پارلیمانی الفاظ' نکالے جانے کی باتیں ہونے لگیں تو ایک پشتون سینیٹر بولے 'محض ان الفاظ کا اخراج میرے لیے کافی نہیں مجھے اس وقت تک چین نہیں آئے گا جب تک میں گالی کے جواب میں گالی نہ دے دوں'۔ اسی ایوان میں ایک بار پھر ہنگامہ اس وقت ہوا جب سینیٹ کے ایک رُکن نے دوسرے رُکن پر غلیظ زبان استعمال کرنے کا الزام لگایا۔ جس رکن پر یہ الزام عائد کیا گیا وہ وہی تھے جو بعد میں وفاقی وزیرِ قانون بھی بنے۔ وہ اپنے مخالف کو مخاطب کرتے ہوئے بولے: تو کیا خوب! وہ لوگ جو خود گٹر کی پیداوار ہیں، مجھ پر غلاظت کا الزام دھرنے لگے ہیں!

اس قسم کے ذاتی اور شخصی گندے حملے، قومی اسمبلی میں آئے دن ہوتے رہتے ہیں۔ ذاتیاتی حملوں کے ایک خاص تسلسل پر تبصرہ کرتے ہوئے کالم نگار عمر قریشی نے لکھا کہ 'اگر ہم اپنے موجودہ بچے کھچے سیاسی نظام کو بچانا چاہتے ہیں تو ضرورت اس بات کی ہے کہ قومی اسمبلی میں ہونے والی تمام کاروائی کو براہ راست، بلاکم وکاست اور جوں کی توں نشر کر دیا جائے'۔ اسی پس منظر میں ایک اُردو اخبار میں ایک کارٹون شائع ہوا تھا جس میں ایک خاتون اپنے بیٹے کو قومی اسمبلی کی کاروائی دیکھنے بلکہ سننے سے بھی منع کرتی ہے کہ کہیں اس طرح وہ 'بدزبان' نہ ہو جائے۔

مگر سیاست دانوں کے بیچ اس طرح کی باتیں صرف اسمبلیوں تک محدود نہیں بلکہ عوامی سطح پر بھی وہ اس طرح کی باتیں کرتے ہوئے شرماتے نہیں۔ یہ بڑا مشہور واقعہ ہے کہ عوام کے ٹھاٹھیں مارتے ہوئے سمندر کے سامنے ایک وزیر اعظم نے گالی بک دی۔ انھی وزیر اعظم کو اُن کے ایک سیاسی حریف نے 'ولدنا معلوم' کہہ کر اُن کی مسلمانی پر شک کیا تو فار ایسٹرن ریویو میں ۱۱ر مارچ ۱۹۷۷ء کو شائع ہونے والی ایک رپورٹ کے مطابق، وزیر اعظم صاحب نے اپنے اس سیاسی حریف کو یہ دعوت دی کہ وہ اُن کے بیڈروم میں آکر اپنے شک کو دور کر لے۔ 'دی فرنٹیئر پوسٹ' کے ایک کالم میں، شعیب ہاشمی نے لکھا کہ فلاں شیخ صاحب کے تمام ذخیرۂ اقتباسات کا مخرج 'کوک شاستر' ہوتا ہے۔ یہ بھی اسی دور کی بات ہے کہ ایک مولانا وزارتِ مذہبی کے سربراہ تھے اور ان کے مخالفین اُن کی وزارت کو 'وزارتِ جنسی امور' کہہ کر یاد کیا کرتے تھے۔ اسی دور کے ایک وفاقی وزیر تعلیم کے بارے میں ان کے مخالفین کی رائے تھی کہ وہ اس محکمے کے سربراہ اسی لیے بنے ہیں کہ وہاں انھیں نوجوان استانیوں اور طالبات سے ملنے کے مواقع میسر ہیں کیوں کہ وہ 'محکمہ 'تر' ہے۔

پھر اسی دور کے ایک اور مشہور مولانا کو جو وزیر اعظم کے حامی تھے، انھیں حزبِ اختلاف سے شکوہ ہوا کہ اُن کے مخالفین 'ہیرا منڈی' کی زبان استعمال کرتے ہیں اور اُن کے اخبارات میں چھپنے والے بیانات 'دیوانِ چرکین' معلوم ہوتے ہیں۔ حکومت کے خلاف اتحاد میں شامل اکا دکا 'اچھی' پارٹی کے بارے میں ان مولانا کی رائے تھی کہ 'آبِ زم زم کے چند قطرے ایک بول دان کو پاک نہیں کر سکتے'۔ شاید یہ وہ تمام باتیں تھیں، جن کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اُس وقت کے وزیر اعظم نے عدالت عالیہ کے سامنے اپنی ایک درخواست میں اُنھیں 'پولیٹیکل پورنوگرافی' (سیاسی فحاشی) کا نام دیا تھا۔ عوام اس واقعے سے بھی واقف ہیں جب ایک بلوچ سردار نے ایک خاتون وزیر اعظم کے سلسلے میں ایک گندی اصطلاح استعمال کی اور وزیر اعظم کے حامیوں نے اُس اخبار کے دفتر پر بلّہ بول دیا جس میں یہ خبر چھپی تھی۔

ماخذ (انگریزی۔22)

’چلو جاؤ، آئندہ احتیاط برتنا‘

میاں اعجاز الحستان

لگتا ہے کہ لوگوں کے لیے ایک ایمان دارانہ اور باعزت کام صرف یہ رہ گیا ہے کہ وہ اپنے آپ کو نراج کے حوالے کر دیں۔ کیوں کہ مذہب، سیاست اور فن انسانی معقولیت کو حیران و ششدر بنانے کی سازشیں ہیں جب کہ اچھی یا بری نیتوں سمیت، منظم مذاہب، قومی مملکتیں اور حب الوطنی، دونوں طرح سے ایسی کج رویاں ہیں جو دوسروں کے زیرجامے سونگھنے سے بھی بدتر ہیں۔ سچے لوگ تو تجریدی اوصاف کا ڈھنڈورا پیٹنے کی بجائے خود اپنی بغلیں سونگھنا پسند کریں گے۔ نیکی کی بجائے ایسی بدی کی خوش بو جس میں کسی ایمان دار آدمی کے پسینے کی سڑاند بھی شامل ہو اکثر زیادہ اچھی لگتی ہے، یہ اور بات ہے کہ میری طرح کے بگڑے لوگوں کے لئے اس میں ایک خاص مٹھاس ہوتی ہے۔ بات یہ ہے کہ یہ سارا معاملہ ذاتی پسند و ناپسند کا ہے۔

گجرات میں نورقاصاؤں، چودہ اداکاراؤں اور اُن کے تین سو ناظرین کا ’ناشائستگی‘ کے الزام میں دھر لیا جانا ایک بدمذاقی ہے۔ اس لیے کہ ’ناشائستگی‘ کیا ہے، کے مسئلے پر مجھے وہ پانچ اندھے یاد آتے ہیں جنھوں نے یہ بتانے کی کوشش کی تھی کہ ہاتھی کیسا ہوتا ہے۔ اُن میں سے ایک احمق تو ہاتھی کی سونڈ کو کچھ اور ہی حیرت ناک چیز سمجھ بیٹھا تھا۔ اس لیے بہتر یہی ہے کہ ناشائستگی کے اس مسئلے کو ہم یہیں چھوڑ دیں، یہ اپنی اپنی سمجھ کی بات ہے۔ کوئی بتلائے کہ آخر، کولہے ہلانے میں اور وہ بھی اس طرح کہ کوئی جھگڑا کھڑا نہ ہو جائے، ایسی کون سی خراب بات ہے! بہرصورت، ہماری پولیس کو تو چاہیے کہ وہ ’بم‘ ہلانے والیوں کی بجائے، بم نصب کرنے والوں کے پیچھے لگ جائے۔ اس بارے میں تو کنفیوشس بھی میری تائید کرے گا کہ ساری تاریخ میں کولہے ہلانے کی وجہ سے کسی کو کوئی نقصان نہیں پہنچا، بلکہ ان لوگوں کو بھی نہیں جن کو ہلتے ہوئے کولہے دیکھنے سے بہتر کوئی اور تفریح میسر نہیں۔

ہمارے ملک میں تو ایسے لوگ موجود ہیں جو ڈھولک کی تھاپ کو بھی ’حرام‘ قرار دیتے ہیں۔ اور جن کے نزدیک (پتنگوں کا تہوار) ’بسنت‘ کفر ہے، کیونکہ وہ ایک ہندو تہوار ہے۔ خوش قسمتی تو یہ ہے کہ کرکٹ، ہاکی اور ٹینس ’غیر مسلم‘ کھیل نہیں سمجھے جاتے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو زیادہ تر تفریحی مشاغل کو ’حرام‘، ’کفر‘ ’وطن دشمن‘ اور ’ناشائستہ‘ قرار دیتے ہیں۔ مگر اُن کی اس فہرست میں، سب سے بُری چیز ’عورت‘ ہے جو تمام دشناموں، گم راہیوں، فساد اور برائی کی جڑ ہے۔ حالاں کہ نہایت ہی نیکوکار یا

جنونی حد تک سرمست قسم کے ان لوگوں میں سے اکثر، عورت کے بغیر ایک لمحے کے لیے بھی، نہ یہاں نہ جنت میں، رہنے کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ گو کہ دانۂ گندم تو صرف آدم ہی نے چکھا تھا، مگر انھوں نے ایک بار بھی خدا سے یہ التجا نہیں کی کہ سزا صرف ان کو دی جائے اور حوا کو معاف کر دیا جائے۔ اس لیے کہ آدم کو یہ معلوم تھا کہ دنیا میں، حوا کے بغیر وہ تنہائی میں گھلتے چلے جائیں گے۔ حوا کے 'بغیر' جب وہ اُس کے بارے میں سوچ رہے ہوتے، انھیں کوئی درندہ ہڑپ کر جاتا یا پھر وہ اپنے بڑھاپے کی نذر ہو جاتے۔ مگر حوا کے ساتھ رہ کر تو انھوں نے دنیا میں اپنے جیسے مرد اور حوا جیسی عورتیں پیدا کیں۔

ہزاروں برس تک، آدمی یہی سمجھتا رہا کہ اُسے عورتیں بناتی ہیں اور اُس میں اس کا اپنا کوئی ہاتھ نہیں ہوتا۔ عورت کی اس ساحرانہ قوت سے 'حیران و ششدر ہو کر' وہ اُسے 'دیوی ماں' کے طور پر پوجتا رہا۔ ذرا عورتوں کی اس چالاکی کو ملاحظہ تو کیجیے کہ وہ اس راز کو سینکڑوں سال تک چھپائے رہیں۔ اگر مرد اور عورتیں ایک دوسرے سے ملاپ نہ کرتے تو نسل انسانی کبھی وجود میں نہ آتی اس لیے میں حیران ہوتا ہوں کہ پھر آخر اس ملاپ کو برا کیوں سمجھا جاتا ہے! شاید اس لیے کہ جنسیت، جو کہ سیکس سے ایک مختلف چیز ہے، ایک ایسا قدیم ترین جذبہ ہے جس پر ذہانت کے ساتھ اور کھلے بندوں نہ کبھی بحث کی گئی اور نہ کبھی اس کی گہرائی کا اندازہ لگانے کی کوشش کی گئی۔ حالاں کہ اس بات کا اقرار نہ کرنا ایک غیر حُب الوطنی ہوگی مگر یہ حقیقت ہے کہ) جنسیت کا یہ جذبہ، حب الوطنی کے جذبے سے کہیں زیادہ طاقت ور ہے اور جذبۂ محبت کے مقابلے میں یہ جذبہ کہیں زیادہ حریص ہے، گو کہ یہ بات حاسدانہ ماحول میں بسنے والے بہت سارے میاں بیویوں کے لیے پریشان کن ہوگی۔

میرے خیال میں تو جمالیاتی باخبری کی طرح 'فزوں تر جنسیت سے معاشرہ زیادہ متمول اور دنیا رہنے کے لیے ایک بہتر مقام بن سکتی ہے۔ کیا آپ کو اس بات سے اتفاق نہیں ہے کہ حرص، خود غرضی، نفرت، یا پھر ایذا رسانی، چوری اور جھوٹ بولنے کے مقابلے میں جنسیت ایک زیادہ بہتر جذبہ ہے! مجھے تو اس بات پر تعجب ہوتا ہے کہ آخر پولیس اُس جگہ فوراً کیوں پہنچ جاتی ہے جہاں ایک عورت، کچھ لوگوں کے سامنے ایسے ویسے انداز میں ناچ رہی ہوتی ہے، جو بہر حال ایک جمالیاتی جرم ہے مگر وہ اس جگہ اُسی جلدی میں نہیں پہنچ پاتی جہاں ایک عورت کسی زیادتی کا شکار ہو رہی ہو، یا جہاں کوئی ڈاکہ ڈالا جا رہا ہو، جب کہ یہ قابل دخل اندازیٔ پولیس جرائم ہیں!

پچھلے جمعے کے دن ایک جماعت کے نوجوانوں نے ایک گیسٹ ہاؤس پر ہلّہ بول دیا جو اُن کے مطابق قحبہ خانے کے طور پر استعمال ہو رہا تھا۔ ایک اخباری اطلاع کے مطابق دو مہینے پہلے سے اس جماعت نے ایسے ریسٹ ہاؤسز کے خلاف ایک مہم شروع کر رکھی تھی تا کہ مذہبی جذبات بھڑکائے جا سکیں اور لوکل باڈیز کے انتخابات میں اُن کے نمائندے زیادہ ووٹ حاصل کر سکیں۔ بہر حال پولیس کو اس قسم کی کوئی شہادت نہیں ملی کہ وہ ریسٹ ہاؤس ایک قحبہ خانے کے بطور استعمال ہو رہا تھا۔ اسی اخباری اطلاع

کے مطابق، بجائے اس کے کہ پولیس ان بلّہ بولنے والے مجرموں کو گرفتار کرتی ' متعلقہ تھانیدار نے گیسٹ ہاؤس کے مالک کو یہ سمجھایا کہ وہ اپنے اس گیسٹ ہاؤس کو یا تو شادی ہال میں تبدیل کر دے یا پھر اُسے دفتر کے طور پر کرایے پر اُٹھا دے۔ آپ یہ دیکھیں کہ بجائے اس کے کہ اُس مالک کو ان مجرموں سے پناہ دی جاتی، وہ تھانیدار الٹا اُسے اس بات پر مجبور کر رہا ہے کہ وہ گیسٹ ہاؤس ہی چلانا بند کر دے، آخر کیوں!

گجرات میں ناشائستگی کے نام پر اور 'قحبہ خانے' کے نام پر لاہور میں ہونے والے ان واقعات سے، پنجاب میں نہایت ہی مجرمانہ طور پر نافذ کیے جانے والے 'حسبہ' بل پر روشنی پڑتی ہے۔ اس لیے کہ انفرادی اور اجتماعی دونوں سطحوں پر شخصی زندگی میں مداخلت قانونی طور پر ناقابل قبول ہے اور اُس کی حوصلہ شکنی ہونا چاہیے۔ پھر قوانین کا نفاذ بھی نہایت ایماندارنہ طور پر مگر نہایت سختی سے ہونا چاہیے اور اُسے قانون نافذ کرنے والوں کے ذاتی منچلے پن پر ہرگز نہیں چھوڑنا چاہیے۔ اکثر صورتوں میں قانون کا نفاذ کس طرح ہوتا ہے بلکہ اُسے کس طرح مسلط کیا جاتا ہے، اس پر مجھے ایک واقعہ یاد آ رہا ہے۔

۱۹۸۰ء کے اواخر میں' مجھے ایک تاریخی مقام کی پینٹنگز بنانے کے لیے کہا گیا، جو میرے لیے میرے معمولات سے ہٹ کر' ایک چیلنج تھا۔ کیوں کہ اس سے پہلے اس موضوع پر زیادہ تر سمن، بارذنج بارکورٹ، کارٹر اور دوسرے برطانوی اور یورپی فن کاروں نے پینٹنگز، تیزابی نقش کاریاں اور لیتھو گرافز بنا کر اپنے جوہر دکھائے تھے۔ میں نے اپنے آپ سے پُوچھا: کیا مجھے بھی اس موضوع پر کچھ کینوس تیار کر کے اپنی میراث کا حق ادا نہیں کرنا چاہیے! اور پھر خود ہی جواب دے دیا: اس سے بہتر موقع نہیں ملے گا۔ ان میں سے ایک پینٹنگ بنانے کے لیے مجھے جہانگیر کے مقبرے کے پاس راوی کے اس کنارے شاہدرہ جانا پڑا۔ تمام دن کام کرنے کے بعد میں نے اپنا کینوس، پینٹ بکس اور تپائی (ایزل) سمیٹے جیسے ہی واپسی کے لیے چلا، میں نے دیکھا کہ ایک نوجوان پولیس کے ایک سپاہی سے بحث کر رہا ہے۔ اور کچھ ہی قدموں کے فاصلے پر ایک جھینپی جھینپی اور خفا سی نوجوان لڑکی بھی برقعے کا نقاب اُلٹے کھڑی ہوئی ہے۔ 'یہ تمھاری بیوی ہو سکتی ہے، مگر نکاح نامہ کہاں ہے!' سپاہی اصرار کرتے ہوئے بولا، پھر مجھے قریب پا کر وہ مجھ سے بولا: 'یہ یہاں لڑکیاں لاتے ہیں اور جب پوچھا جاتا ہے کہ تو کہتے ہیں کہ وہ شادی شدہ ہیں'۔ (مگر) میں نے اُن دونوں کی وکالت کرتے ہوئے کہا: 'یار، اُن کو جانے دو، موج کرن دے' میں بڑا حیران ہوا جب سپاہی نے ان دونوں کو تنبیہ کرتے ہوئے کہا: 'جاؤ، آئندہ احتیاط برتنا'

ماخذ (انگریزی۔ 29)

ذرا سُنئے تو! (معذورات)

(ہزل گو)

رفیع احمد خان

جوش ملیح آبادی

(شعراء)

فراقؔ گورکھ پوری

ن م راشدؔ

میرا جی

سلیم احمد

(شاعرات)

فہمیدہ ریاض

پروین شاکر

(نثر نگار)

مہدی حسن افادی گورکھ پوری

عطاؤ اللہ پالوی

قاضی عبدالغفار

شورش کاشمیری

سعادت حسن منٹو

عصمت چغتائی

محمد حسن عسکری

rekhta

ممتاز مفتی

اشفاق احمد

ایم شفیق بریلوی

حاجی فضل الرحمٰن خاں

محمد احسن فاروقی

خوش ونت سنگھ

سلیم اختر

واجدہ تبسم

امریتا پریتم

ھاجرہ مسرور

رضیہ بٹ

بشرہ رحمان

کشور ناہید

پروین عاطف

(ناشرین)

مورس زیغورس

ستار طاہر

محمد عباس

سرور سکھیرا

خالد ارمان

(مصوّران)

آذر زوبی

صادقین

rekhta

(احمد سعید) ناگی

جمیل نقش

اے آر ناگوری

جمال شاہ

لیلیٰ شہزادہ

شاکرہ بادی

سنبل نذیر

رفعت علیانی

(فنکارائیں)

مدیحہ گوہر

ناہید صدیقی

نگہت چودھری

شبانہ شیخ

انیتا ایوب

(فلمی اداکارائیں)

روحی بانو

میرا

(ب)

شمع

عاشی

فردوسی

rekhta

نجمہ رومانی

نجمہ

نجمی

ننی

(ہدایت کار)

دلجیت مرزا

نعمان

اسلم ڈار

سید نور

شہزاد رائے

(سنسر بورڈ کے اراکین)

رانی

مولانا عبدالقادر

(پی ٹی وی والے)

آغا ناصر

طلعت حسین

rekhta

بات کھری کھری

رفیع احمد خاں

جس کو تم سب 'غیر سنجیدگی' کہہ رہے ہو، میرے نزدیک وہی سنجیدگی ہے۔ میں شعر میں، دل اور جگر کہہ کر جھوٹ بولنا نہیں چاہتا۔ ان پردوں کی میری رائے میں کوئی ضرورت نہیں۔ بات کھری کھری کیوں نہ کہی جائے!

ماخذ (اُردو۔۶۲)

لیاقت وصلاحیت

جوش ملیح آبادی

یاروں نے جسم انسانی کے اعضائے عورت کے نام لینے کو فحش نگاری سمجھ رکھا ہے۔ اُن کو نہیں معلوم کہ صرف گالی بک دینے یا پوشیدہ اعضا کے نام نظم کردینے سے کام نہیں چلتا۔ فحش نگاری میں بھی سنجیدہ شاعری کی سی لیاقت وصلاحیت کا موجود ہونا اشد ضروری ہے۔

ماخذ (اُردو۔۵۴)

لذّتوں کا پُرخلوص اظہار

فراق گورکھ پوری

حضرت نیاز!

مئی ۴۶ء کا نگار مجھے اب تک نہیں ملا تھا۔ آج آپ کا بھیجا ہوا تراشا ملا۔ جناب اس۔ ام اصطفیٰ نے میرے ان اشعار ؎

یہ بھیگی مسیں، رُوپ کی جگمگاہٹ   یہ مہکی ہوئی، رَسمی مُسکراہٹ
تجھے بھینچتے وقت نازک بدن پر   وہ کچھ جامۂ نرم کی سرسراہٹ
پسِ خواب پہلوئے عاشق سے اُٹھنا   ڈھلے سادہ جوڑے کی وہ ملگجاہٹ

پر یہ اعتراض کیے ہیں کہ فراق شاعری میں معصومی، نرمی و پاکیزگی کا اپنا مسلک مانتے ہوئے اور چلاتے ہوئے جذبات کے اظہار اُٹھاتے ہوئے مندرجہ بالا قسم کے اشعار لکھ کر کیا اپنی تردید آپ کر رہے ہیں، اور کیا یہ اشعار گندے اور مخربِ اخلاق نہیں ہیں!

جواب میں مجھے یہ کہنا ہے بلکہ یہ دعویٰ کرنا ہے کہ جن لوگوں نے گزشتہ کئی برسوں سے میری غزلیں یا میری نظمیں یا میرے دو چار سو اشعار بھی دیکھے ہیں، ان پر یہ بے اختیارانہ اثر پڑا ہوگا کہ معصومی، نرمی و پاکیزگی کے جو عناصر میرے یہاں نظر آتے ہیں، وہ اچھی اور کامیاب اُردو شاعری میں بھی قریب قریب مفقود ہیں اور اگر کہیں ہیں تو اردو شاعری کے اُس بہت تھوڑے حصے میں ہیں جسے ہم پاکیزہ ترین شاعری کہہ سکتے ہیں میری شاعری کے اس مجموعی اثر سے کوئی ایسا شخص انکار نہیں کر سکے گا جس نے معمولی طور پر بھی میرا کلام دیکھا ہوگا ؎

تُو یاد آئے مگر جو روستم تیرے نہ یاد آئیں   تصور میں یہ معصومی بڑی مشکل سے آتی ہے
تیرے خیال میں، تیری جفا شریک نہیں   بہت بُھلا کے تجھے کر سکا ہوں یاد تجھے

شاعری کی بحث میں اور اُردو تنقید میں 'معصومی' کا لفظ غالباً میں نے سب سے پہلے استعمال کر کے رائج کیا۔

اب رہی یہ بات مندرجہ بالا اشعار کی۔ تو اُن کے بارے میں پہلے یہ کہہ دوں کہ میں اُنھیں معصوم ترین اشعار تو نہیں سمجھتا لیکن اخلاقی طور پر گرے ہوئے اشعار میں اُنھیں نہیں مانتا۔ جنسیت،

شہوانیت اور امرد پرستانہ جذبات و محرکات کے اظہار میں ایک نرم اور مترنم وضاحت، لمسیاتی احساسات کا واضح، نازک، متوازن اور لطیف اظہار، لذتیت کے عناصر کو اشعار میں سمو دینا، مباشرت و انزال تک کی لذتوں کا نازک و پرخلوص اظہار، اخلاقیات و جمالیات کے خلاف ہرگز نہیں۔ ان کیفیات و جذبات میں والہانہ بلکہ پرستانہ عناصر ہوتے ہیں۔ شہوانیت کا خلوص، شہوانیت کی معصومی و پاکیزگی کا تنہا ضامن ہے۔ گندگی اور خرابیٔ اخلاق کے مرتکب وہ لوگ ہیں جو مجرد بھی نہیں رہتے اور شہوانیت کو پاک اور معصوم چیز بھی نہیں سمجھتے۔ ان حضرات کے دلوں میں چور ہوتا ہے۔ یہ لوگ خباثتِ نفس اور جذباتی غلاظت و کثافت کے شکار ہوتے ہیں۔ ان مردانِ خدا سے کوئی پوچھے کہ آخر آپ چاہتے کیا ہیں! کیا مباشرت کی لذتوں کو نغمۂ سرمدی بنا دینے کو گناہ، گندگی اور رذالت سمجھا جائے!

بندہ نواز! شہوانی جذبات قبیح نہیں ہوتے نہ شہوانی حرکات شنیع ہوتی ہیں ورنہ یہ ماننا پڑے گا کہ ہر اولاد اپنے والدین کے 'قبیح سے قبیح جذبات اور شنیع سے شنیع حرکات' کا پھل ہے۔ حضرت! مباشرت اور بوس و کنار کے پاک عمل اور معصوم شہوانی جذبات کے تصور سے فوراً سجدے میں گر جائیے کہ انھیں سے آپ کی ہستی عبارت ہے۔ آپ کے دل کا چور یہ ہے کہ شہوت و مباشرت سے دنیا بنی ہے اور قائم ہے، شہوت و مباشرت ناگزیر شرطِ حیات ہیں، لیکن ہیں یہ گندی چیزیں۔ یہ چیزیں گندی نہیں ہیں۔ گندے ہیں آپ۔ ایسا آدمی اگر بدقسمتی سے شاعر ہو جاتا ہے تو وہ اپنے عشقیہ اشعار میں جذبات عشق کا، معشوق کا، شہوانیت و جنسیت کا منہ چڑاتا ہے، فحش اشعار کہنے لگتا ہے اور فحش شعر کہنے سے بھی ایک زیادہ گندی حرکت کرتا ہے یعنی چھچھورے اشعار کہنے لگتا ہے۔

فحاشی عریانی کا نام نہیں ہے۔ عریانی کو اجنتا کے صناعوں نے، یونان اور روما کے بت گروں نے، مشہور عالم شعرا اور فن کاروں نے، بہت لطیف، نازک پاکیزہ جمالیاتی چیز بنا کے رکھ دیا ہے۔ عریانی فحاشی نہیں ہے۔ ہمارا جسم فحش چیز نہیں ہے۔ فحاشی نتیجہ ہے دوغلے پن کا یعنی اس حالت کا جب ہم اپنے اندر جنسی تحریکات بھی پائیں اور اس فطری تحریک پر اپنی ملامت بھی کریں، جب ہم جنسیت سے ہم آہنگ نہ ہو سکیں اور جب ہم جنسیت کو ایک لعنت سمجھیں۔ اسی داخلی تصادم کی پیداوار فحاشی ہے۔ اور اگر ایسی صورت میں کھلی فحاشی بھی نہ ہو سکی تو لوگ، چھچھورے اور کثیف لہجے میں ہوس ناک اشعار کہنے لگتے ہیں۔ فحاشی نام ہے، جنسی جذبات و محرکات میں عدم خلوص کا۔ اب میں اپنے ہی کچھ اشعار پیش کر کے چند نتائج کی طرف اشارہ کروں گا۔

یہ وصل کا ہے کرشمہ کہ حسن جاگ اٹھا تیرے بدن کی کوئی اب خود آگہی دیکھے

پرخلوص مباشرت کے بعد، جو طمانیت معشوق کے چہرے پر جھلک اٹھی ہے اور اس کے جسم میں جو خود آگہی آ گئی ہے، لذتِ مباشرت کے اسی اثر کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، مگر کتنا لطیف، نازک اور

سنگھار رس میں ڈوبا ہوا!

ذرا وصال کے بعد آئینہ تو دیکھ اے دوست! تیرے جمال کی دوشیزگی نکھر آئی

اس شعر میں بھی لذتِ مباشرت کے ایک بہت نازک اور لطیف اثر کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ اب اشعار سے بھی عریاں اشعار لیجیے جو میری اس رُباعی میں ملیں گے۔

نکھری سحر، اپنی لہلہاہٹ بھولے بیخود روحِ نمو کہ سینہ چھولے
ہنگامِ وصال، وہ سرکتا ملبوس زرّین کمر اور جگمگاتے کولے

کتنی عریاں رباعی ہے مگر کتنی نازک اور لطیف! اس پر کثافت کی پرچھائیں بھی نہیں پڑی، لیکن جو کوئی بھی اس رُباعی سے ڈر جائے اور اسے کثیف یا فحش بتائے، اُس کی جنسی زندگی وحشی اور جنگلی رہی ہے۔ ایسا آدمی اپنے آپ سے ڈرا ہوا ہے۔

پہلو کی وہ کہکشاں، وہ سینے کا اُبھار ہر عضو کی نرم لَو میں مدّھم جھنکار
ہنگامِ وصال، پینگ لیتا ہوا جسم سانسوں کی شمیم اور چہرہ گلنار

پھر یہ مصرعے بھی ملاحظہ ہوں۔

تاکر جسم، کچھ رہیں ڈھیلے اور پیڑو سے یُوں بھینچے پیڑو
سر کو سر سے ملا کے دوارنے جس طرح زور آزماتے ہوں
پھر وہ جسموں کا مل کے لہراتا کرشن کا رقص، ناگ کے پھن پر

آپ نے آخری مصرع کی جادوگری دیکھی! کثافت، کس طرح لطافت کی بان بن گئی! جو شخص اندھا بنا دینے والی مباشرت کے عالم میں بھی، حسن کے اتنے پہلوؤں کا رنگین اور لطیف احساس کر سکے، اس کی شخصیت بہت بلند ہوگی۔ لیکن میرا عشقیہ کلام تمام تر لمسیاتی نہیں ہے، پھر بھی جس طرح میں نے لمسیات کو رنگین لطیف اور بھرپور بنا دیا ہے، میں اُسے پست اور گندی چیز ماننے کو تیار نہیں ہوں۔ جس کی شہوانیت معصوم و پُرخلوص ہوگی وہ میرے اشعار میں صرف طہارت پائے گا۔ طہارت نام ہے زندگی میں ڈوب جانے کا، اور زندگی کی لذتوں میں، جنسی اور شہوانی لذتوں کا مقام بہت بڑا ہے ہاں تو شہوت بُری چیز نہیں ہے۔ البتہ شہوت چھچھلی ہوتی ہے یا جب شہوانی جذبات میں شعور کی گہرائی نہیں ہوتی، گندگی اسی وقت پیدا ہوتی ہے۔ شہوت میں شدت اور نرمی کا اتصال، اُسے عشق میں تبدیل کر دیتا ہے۔

جناب اصطفٰے پوچھتے ہیں: 'کیا ایسے اشعار کا منظرِ عام پر لانا یا یُوں کہیے کہ اس جذبے کا پرچار، قوم کے نونہالوں میں کرنا، قوم، ملک یا سوسائٹی کے لیے مفید ہے!' جواب میں عرض ہے کہ بلند ادب کا ایک حصّہ اور صرف ایک حصّہ رچائی ہوئی اور سنواری ہوئی شہوانیت کے جذبات، تجربات اور

احساسات و کیفیات کے جمالیاتی اظہار کا ہوا کرتا ہے۔ اس سے کہیں زیادہ مقدار میں بلند ادب کو وہ حصّہ ہوتا ہے جس کا تعلق دوسرے اہم انفرادی اور سماجی مسائل سے ہوتا ہے۔ قوم، مُلک اور سوسائٹی کا فرض ہے کہ بلند ادب ہر طرح کے کارناموں سے متاثر وہم آہنگ ہو۔ اگر ہمارا مُلک قوم کے نونہالوں میں صحت بخش محرّکات اور بہتر سماجی زندگی کی فضا پیدا کر سکے تو جیسے جنسی اشعار میں نے کہے ہیں، اُن کا اثر اُن کی جنسی تربیت و تعلیم ہوگی۔ لسیاتی اشعار، کچی جنسی بھوک کے مارے نونہالوں کے لیے اُتنے خطرناک نہیں ہوتے جتنے پِکّی رِقّت والے 'مہذب' عشقیہ اشعار ہوا کرتے ہیں۔

میں نے اپنی جو رُباعیاں یا اشعار پیش کیے ہیں یا میرے وہ اشعار جو جناب اصطفےٰ صاحب نے پیش کیے ہیں وہ نوجوانوں میں کمینے جنسی جذبات پیدا نہیں کریں گے۔ انسانی حسن، اس دنیا اور زندگی کے نعمتوں میں سے ایک ہے اور ہمارے لیے اتنا بڑا چیلنج کہ اگر ہم نے اُس سے آنکھ پھیری تو بچنے کی بجائے مٹنے کا احتمال ہے۔ ضرورت ہے کہ جنسیت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دی جائیں۔ یہ سطور میں نے اس لیے نہیں لکھیں کہ وہ لوگ جو کم زور اور نِکھو بڑ فاشی یا گھٹیا اور ناکامیاب عُریانی کا پروپیگنڈا کرتے ہیں وہ میرے بیانات کا حوالہ دے کر اپنی گلی سڑی شاعری کا جواز پیش کریں۔ جیسی جنسی شاعری میں نے کی ہے ویسی شاعری کرنے کا حق اسی کو ہے جس کا جسم اور جس کے دل و دماغ پچاس برس تک جنسی تاثرات کو ہضم کرتے رہے ہوں۔

ماخذ (اُردو۔۸۰)

فحاشی کے عناصر

ن م راشد

(میری) ان نظموں میں بعض تنقید نگاروں کو 'فحاشی' کے عناصر بھی دکھائی دیے ہیں، خاص طور پر ان تنقید نگاروں کو جو غزل کے موہوم اور دور دست عشق کے عادی چلے آتے تھے۔ 'ماورا' کی نظموں میں جنسیت کا ذکر ضرور ہے، کیوں کہ ان نظموں کے کردار اپنے پیش رو غزل کے عاشق کی طرح چاند کے لیے نہیں پکارتے بلکہ اپنے عشق اور اُس کا حاصل اسی خاک میں تلاش کرتے ہیں۔ ناکام عشق ان کے نزدیک اپنی روایتی عظمت کے باوجود خام عشق ہے۔ عشق کی تکمیل ان کرداروں کے اجتماعی المیے کو بڑی حد تک کم کرتی ہے۔

اس میں شک نہیں کہ فحاشی یا جنسیت اپنی حدوں سے گزرنے لگیں تو وہ فرد اور اجتماع کے رشتے کو منقطع کر دیتی ہیں اور اجتماع کو ابتری کے کنارے لا کھڑا کرتی ہیں۔ لیکن خود ان کا انسان کی زندگی سے غائب ہو جانا فرد کی اپنی تکمیل اور زندگی کے ساتھ اس کی کامل ہم آہنگی کے راستے میں بہت بڑی رکاوٹ بن جاتا ہے۔ جنسیت ان نظموں میں ایک 'عدد صحیح' کی حیثیت رکھتی ہے۔ یوں نہ ہو تو ان نظموں کے افراد بھی اسی جرم میں شریک نظر آئیں جس میں پہلی نسلوں کے لوگ شریک تھے اور جس نے ان کی زندگی کو اپنے اصلی ہدف سے دور کر دیا تھا۔ ان کی اس شرکتِ جرم کا نتیجہ تھا کہ بعد میں آنے والی نسلوں کا راستہ دشوار گزار ہو گیا۔

اسی لیے یہ کردار الوہی طاقتوں کو بھی شک کی نظر سے دیکھتے ہیں، جنھوں نے ان کے موجودہ حالات کی پیش بینی نہ کی اور اسی لیے ان طاقتوں کے خلاف بھی بغاوت کی ایک چنگاری ان کرداروں میں موجود ہے۔ یہ کردار نام نہاد معصومیت سے بھی ڈرتے ہیں تاکہ وہ کہیں انھیں دوبارہ اور شدید تر المیے سے دوچار نہ کر دے۔ ان کے اپنے اعمال ایسے تو نہیں کہ ان سے ایک بے ریب صبح پھوٹ نکلے۔ لیکن وہ اُن خوابوں کی پیروی کرنے سے بھی گھبراتے ہیں جو ان کو نامعلوم اور زیادہ خطرناک شاہراہوں کی طرف دھکیل دیں۔ ان کرداروں کو زندگی...... حقیقی اور واقعی زندگی...... سے گہری وابستگی ہے۔ اگر ان کو یہ وابستگی حاصل نہ ہو تو ان کو اپنی بے اطمینانی کے اظہار کی بھی ضرورت نہ رہے۔ یہ کردار زندگی لے کاروبار میں پوری تندہی کے ساتھ شریک ہیں، اور اسی لیے ان کا مقصد اس انا کی حدوں کو توڑنا ہے جو صرف اپنے آپ کو دیکھتی ہے اور اپنے آپ ہی لذت اخذ کرتی ہے۔

آخر میں شاید اتنا عرض کرنا مناسب ہو کہ ان نظموں میں جو تجربات بیان کیے گئے ہیں وہ عقلی تجربات نہیں، جذباتی تجربات ہیں، اور ان جذبات کے رشتے سیاست، مذہب، عشق وغیرہ سے ملتے ہیں۔ جیسا کہ آپ نے خود محسوس کیا ہوگا 'ماورا' کی شاعری کسی عقیدے کی شاعری نہیں صرف مخصوص اطوار و حرکات کی شاعری ہے، جن کے حامل ان نظموں کے کردار ہیں۔ ان نظموں کا مقصد معیّن آرا بیان کرنا یا خیر و شر اور خوب و زشت پر محاکمہ کرنا نہیں، کسی اخلاقی اصول کی ترکیبِ استعمال کے نسخے بتانا بھی نہیں۔ نہ انھیں کسی خاص عمل یا اعمال کو دوسرے اعمال پر ترجیح دینے سے غرض ہے۔ یہ نظمیں دراصل وقت کے ایک دوراہے پر انسانوں اور اشیا کے ساتھ انسانوں کے ربط اور اس ربط کی شکستگی کا ذکر کرتی ہیں۔ اس امید میں کہ شاید یہی پڑھنے والوں کے اندر اس ربط کے احیا یا تجدید کی آرزو کو دوبارہ زندہ کر دے۔ اور وہ انسان کی جدید مشترکہ جذباتی ضرورتوں اور امنگوں کا نیا شعور پا لیں۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ ان نظموں سے کوئی نقطۂ نظر نمودار نہیں ہوتا۔ بلکہ ان کے اندر ایک خاص قسم کی، شاید دوسروں سے الگ، اخلاقی حساسیت موجود ہے۔ ان کا ایک ذاتی رویا بھی ہے۔ ان میں ایک ذاتی ذمے داری اور دیانت داری بھی پائی جاتی ہے۔ اور ان کو تلاش کرنا آپ کے لئے مشکل نہیں ہونا چاہیے۔

ماخذ (أردو۔۲۱)

الزامات

ن م راشد

میری اور میرا جی کی شاعری پر کئی الزام لگائے گئے ہیں۔ ان میں سے ایک الزام 'فحاشی' ہے۔ دوسرا الزام جو پہلے الزام ہی کا ضمیمہ سمجھنا چاہیے، یہ ہے کہ ہم لوگ چوں کہ جنس کا ذکر ایک حد تک 'جسارت' کے ساتھ کرتے ہیں اس لیے ہماری شاعری 'مریضانہ شاعری' ہے۔ یہ دونوں الزام اس قدر دہرائے گئے ہیں کہ یقین جانیے خود مجھے بارہا ندامت کا احساس ہوا ہے، حالاں کہ اپنے طور پر میں نے جس قسم کے خیالات کو اپنی شاعری میں جگہ دی یا جس انداز سے ان کا اظہار کیا یہ سمجھ کر کیا کہ انسان نہ محض 'چشم و گوش' ہے اور نہ 'ہمہ تن دل'۔ قدیم شاعری میں ہمیشہ عشق و ہوس میں فرق کیا جاتا رہا۔ اگرچہ آپ نے اختر شیرانی کو قدیم روایت سے الگ کیا ہے، لیکن صحیح بات یہ ہے کہ وہ اس اعتبار سے قدیم روایت کے شاعر تھے، وہ محض اپنی رومانیت کی وجہ سے محبوبہ کی عصمت کے قائل نہیں بلکہ ان کے ذہن میں ہمارے روایتی اہل اخلاق کا یہ تصور بھی موجود تھا کہ عشق و ہوس دو الگ چیزیں ہیں، اور ان میں سے ایک انسان کو بلندی کی طرف لے جاتی ہے اور دوسری پستی کی طرف۔

اقبال نے بھی اپنی تمام ترعظمت کے باوجود عشق و ہوس تا کی میں تفاوت واضح کرنے کے لیے فرہاد اور پرویز کی باہمی آویزش کے پرانے کنائے کا سہارا لیا ہے۔ یہ قطعی طور پر اخلاقی تصور ہے، اور اس میں رومانیت کی نام نہاد جمال پرستی کو کوئی دخل نہیں۔ انگریزی اور فرانسیسی زبانوں کے رومانی شاعر جسم کی پکار سے بے پرواہ نہیں ہیں۔ ہماری قدیم شاعری پر تصوف کا جو پرتو پڑا تھا اس کا بھی یہ نتیجہ نکلا کہ مجاز میں بھی حقیقت کی تقدیس داخل ہوگئی۔ کیوں کہ اس کے بغیر مجاز حقیقت کا دوسرا رُخ نہیں بن سکتا تھا۔ قدیم شاعروں میں غالب ہی ایسا شاعر نظر آتا ہے جس کے نزدیک جسم اور روح کی آویزش نہیں بلکہ آمیزش (گو دبی دبی سی) ضروری ہے۔ داغ کے ہاں جسم کی بہت زیادہ تکرار ہے۔ جسم کی ضرورتوں کی، اور اس تکرار نے اس کو محض 'جسم کی نفسیات' کا شاعر بنا دیا ہے۔ میرا جی کی شاعری اور میری شاعری میں تفاوت کی کئی راہیں نکلتی ہیں۔ لیکن ہم دونوں نے اردو شاعری میں غالباً پہلی دفعہ اس شعور کا اظہار کیا ہے کہ جسم اور روح گویا ایک ہی شخص کے دو رُخ ہیں اور دونوں میں کامل ہم آہنگی کے بغیر انسانی شخصیت اپنے کمال کو نہیں پہنچ سکتی...... میرا یا میرا جی کا مقصد کسی نظریے کی تلقین کرنا نہ تھا بلکہ ہمارے نزدیک انسانی شخصیت کی داخلی ہم آہنگی ایک طبیعی امر تھا اور اس کا ذکر ہم نے بغیر کسی ذہنی کش مکش یا فشار کے کیا ہے۔

اور جہاں تک میرا تعلق ہے اس ہم آہنگی کا ذکر یا احساس اب تک کی نظموں میں بدستور موجود ہے۔ ’ماورا‘ میں جو نظمیں اس سعی کی بہتر مثال مہیا کر سکتی تھیں اس میں ’اتفاقات‘، ’عہد وفا‘، ’ہونٹوں کا لمس‘، ’بے کراں رات کے سناٹے میں‘، ’گناہ‘ (جس میں استمنا بالید کی گویا ’مذمت‘ اسی وجہ سے کی گئی ہے کہ یہ ہم آہنگی کے راستے میں حائل ہوتا ہے) ’رقص‘ (جس میں اس انسان کا نوحہ ہے جو زندگی پر جھپٹنے کے قابل نہیں رہا۔ بلکہ اس کے ساتھ لپٹنے کے منفی عمل پر خوش ہے) وغیرہ وغیرہ شامل ہیں۔ بعد کی نظموں میں جسم و روح کی اس ہم آہنگی کا رنگ ایک حد تک بدل گیا ہے۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ ہم آہنگی کا یہ تصور اپنے منطقی نتیجے کی طرف چل نکلا ہے۔ ان نظموں میں یہ ’حروف و معنی‘ ’’مفہوم اور گفتار‘ یا ’اجسام اور افکار‘ کی ہم آہنگی کی صورت میں نظر آتا ہے، اگر میرے طرز فکر سے بعض نظموں کو ’جنسی‘ سمجھ کر الگ کر دیا جائے اور باقی نظموں میں جو ’جنسی‘ نہیں ہیں، کسی ذہنی زوال کے آثار تلاش کیے جائیں تو یہ زیادتی ہوگی۔ کیوں کہ جنسی ہم آہنگی بنفسہ الگ چیز نہیں۔ اس کا انسان کی معاشرت، معاشی، سیاسی اور تہذیبی ہم آہنگی کے ساتھ گہرا تعلق ہے۔ جہاں تک میں اپنی شاعری کے مفہوم یا غرض و غایت تک پہنچ پایا ہوں، میں سمجھتا ہوں کہ میری شاعری اسی کامل ہم آہنگی کی تلاش میں سرگردانی کی ایک کوشش ہے، کیوں کہ اس ہم آہنگی کے بغیر نہ فرد کی آزادی قائم رہ سکتی ہے نہ سیاست میں اسے کوئی کامرانی حاصل ہو سکتی ہے نہ وہ زندگی کی فیاضی اور فراوانی سے بہرہ ور ہو سکتا ہے۔

اپنی بعض نظموں میں میں نے خیر و شر اور اہرمن و یزداں کے الگ وجودوں سے بھی انکار کیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ تصورات اپنی موجودہ شکل میں انسان کے ’مذہبی نشاط‘ کے راستے میں بھی حائل ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ خیر و شر اور اہرمن و یزداں کا کوئی امتزاج پیدا کر لیا جائے یا غالب کے الفاظ میں ’بہشت کو اُٹھا کر دوزخ میں ڈال دیا جائے‘ تا کہ ان میں تمیز کرنے کی بدی دنیا میں باقی نہ رہے۔

میری یا میرا جی کی شاعری پر فحاشی کا جو الزام لگایا جاتا ہے وہ اس لیے بھی درست نہیں کہ اس سے ادب کو ناپنے کے پیمانے بدلنے لگتے ہیں، اور ادب کے آخری جوہری ملایان مکتب رہ جاتے ہیں۔ فحاشی یا اخلاق کی اصطلاح ہے یا قانون کی، بے شک شاعر یا ادیب کی معاشرتی ذمے داریوں کے باعث فحاشی کا مقام ادب میں بھی نہیں ہونا چاہیے۔ لیکن ہم دونوں کی شاعری میں جس کو فحاشی یا بعض اوقات تلذذ پرستی کہا جاتا ہے وہ جہاں تک میں جانتا ہوں کہیں موجود نہیں۔ جسم یا جنس کا ذکر محض ضمنی ہے۔ یعنی ہم آہنگی کی اس تلاش کا محض ایک پہلو ہے جس کے بغیر انسان اپنی تقدیر تک نہیں پہنچ سکتا اس ہم آہنگی کی سعی جنسی خلوت سے لے کر دنیا کے ملکوں کی سب سے بڑی جلوت تک پہنچتی ہے جس سے مجھے گزشتہ دس برس سے واسطہ پڑ رہا ہے۔

ماخذ (اُردو۔ ۲۱)

معانی سازی

ن م راشد

سوال: آپ کی نظم 'گناہ' میں جس قسم کا جسمانی، جذباتی تجربہ گرفت میں لیا گیا ہے اُسے صرف استمنا بالید تک ہی محدود جاننا چاہیے یا آپ اس کے حوالے سے کچھ اور قسم کی معانی سازی بھی کرنا چاہتے تھے؟

راشد: بظاہر تو یہ نظم اسی موضوع پر لکھی گئی ہے جس کی طرف آپ نے اشارہ کیا ہے، لیکن اس کے پیچھے کئی اور قسم کے معانی بھی ہیں، مثلاً یہ کہ سماج میں اُس فرد کی جو تحقیر ہوئی ہے یہ اس کا ردِ عمل ہے، یا یہ کہ اس میں ایک انتہائی حساس آدمی کی تجسیم ہوئی ہے، یا یہ کہ اُسے اپنے جذبات کے اظہار کے لئے جو جسم درکار ہے وہ اسے میسر نہیں ہے، یہ اس کا کرائسس بھی ہے، یا یہ کہ میں نے بڑی شدت سے بیان کرنے کی کوشش کی ہے کہ ہمارے سماج میں ہونے والے (روحانی، جنسی یا مادی) تجربات وغیرہ نامکمل اور اُدھورے رہتے ہیں۔

ماخذ (اُردو۔۲۱)

جنسی حیثیت

میراجی

میری نظموں کا نمایاں پہلو اُن کی جنسی حیثیت ہے۔ یہ پربت کی سپاٹ تصویریں، جگہ جگہ، گرتے ہوئے دھارے، اگرچہ یہ سفید سی لکیریں ہوتے ہیں لیکن ان کی نفسیاتی اور جنسی اہمیت اب آکر مجھ پر کھلی ہے۔ بول و براز اور اس کے متعلقہ عمل کی نفسیاتی وضاحت کا علم تو اب آکر ہوا ہے مگر اُس زمانے میں نہ صرف ان باتوں میں ایک غیر شعوری نوعی دل کشی تھی بلکہ فطرت سے ہم آہنگی کا احساس بھی تھا۔ پربت پر دُور سے نظر آتا ٹھہرا، ایک لٹکا ہوا دامن تھا جس نے نسائی پیکر سے متعلق ہو کر، آئندہ زندگی میں دبی ہوئی خواہشات کے اثر سے ایک ایسی حیثیت اختیار کر لی جس سے رہائی حاصل کرنے کو شعر کا سہارا لینا پڑا۔ یوں لباس میں دل چسپی، ابتدا ہی سے طبیعت کا خاصہ رہی۔

گجرات (کاٹھیاواڑ) میں جو لنگے پہنے جاتے ہیں، اُن کی کیفیت راجپوتانے یا ہندوستان

کے دوسرے علاقوں کے لہنگوں سے مختلف ہے۔ اُس لہنگے کی ساخت سیدھی ہے، کمر تک ایک جھول سا، ہلکی ہلکی لہروں کا ایک نازک سا، جُھرمٹ جسے دیکھ کر میری نگاہوں میں پہننے والی خاتون تو ایک لچکتی ہوئی ٹہنی بن جاتی ہے اور لباس جھیل یا دریا کی سطح جس پر ہلکی ہلکی لہریں، کبھی جھوم اُٹھتی ہوں، کبھی ٹھہر جاتی ہوں۔ اس کے خلاف، راجپوتانے کا لہنگا ایک سمندر کی کیفیت رکھتا ہے، ایک طوفانی شے ہے جس میں جنگل کا گھنا، گرم جادو موجود ہوتا ہے۔

دوسرا پسندیدہ لباس ساری ہے، لیکن اس میں حرکت نظر نہیں آتی۔ اس میں ایک ٹھہراؤ ہی ٹھہراؤ ہے، ایک ایسا ٹھہراؤ جو کسی بگولے کی شکل میں جو کسی ستون کا سا تعین موجود ہے، وہی تعین ساری میں بھی دکھائی دیتا ہے۔ ساری پہنے ہوئے کوئی نسائی پیکر، میرے ذہن پر لٹکے ہوئے پردے یا چھائے ہوئے دھندلکے کا تصور لاتا ہے۔ نسائی لباس کا یہ بیان، زندگی کے ایک اور پہلو پر بھی روشنی ڈالتا ہے، یعنی عورت سے دوری۔

ماخذ (اُردو۔۹)

مجھے کبھی تائب نہیں ہونا پڑا

سلیم احمد

محمود صدیقی: میرا سوال یہ ہے کہ سلیم بھائی نے کہا کہ ۱۰۔۱۵ کی عمر سے ہی انھیں اسلام کی فکر ہے، الحمدللہ، بہت اچھی بات ہے۔ ہر مسلمان کے اندر یہ چیز ہونی چاہیے۔ تو اس حوالے سے، اُن کی شاعری کے وہ حصے جن سے انھیں تائب نہیں ہونا پڑا، وہ کس ضمن میں شمار کیے جائیں گے!

سلیم احمد: بہت اچھا سوال ہے مگر اس کے اندر دو غلطیاں ہیں۔ پہلی غلطی یہ کہ آپ نے کہا کہ مجھے تائب ہونا پڑا لیکن الحمدللہ، مجھے کبھی تائب نہیں ہونا پڑا۔ وہ شاعری میرے مجموعے میں چھپی ہوئی موجود ہے۔ بلکہ ایسی شاعری کرنے کا اب بھی ارادہ اور استطاعت، دونوں رکھتا ہوں (قہقہہ)۔ یہ میرے لیے کوئی مسئلہ نہیں۔

دوسری چیز یہ کہ، اگر آپ یہ سمجھتے ہیں کہ اسلامی نقطۂ نظر سے یہ کوئی غلط چیز ہے تو میں اس بات کو بالکل درست نہیں سمجھتا یہ ایک بہتان ہے اسلامی شاعری کے تصور پر، کیوں کہ یہ شاعری ہمیں بڑے سے بڑے مسلمان شعرا کے ہاں ملتی ہے۔۔۔۔۔ میرے خیال میں آپ کے یہ دونوں مفروضے غلط ہیں۔

ماخذ (اُردو۔۳۱)

عُریانی اور فحاشی میں فرق

آصف فرخی: اچھا تحریکِ نسواں پر آپ کے خیالات کی طرح، آپ کے جو خیالات عُریانی اور فحاشی کے بارے میں ہیں، وہ بھی بحث و ہنگامے کا سبب بنے رہے ہیں، بلکہ کچھ لوگوں نے تو ان دونوں مسائل پر آپ کے رویّوں کو باہم منسلک قرار دیا۔ تو اس بارے میں آپ کیا کہتے ہیں!

سلیم احمد: دیکھیے، میں نے یہ کہیں نہیں کہا اور جن لوگوں نے یہ اعتراض کیا انھوں نے غلط بیانی سے کام لیا یا دانستہ بہتان طرازی سے کام لیا کہ میں فحش کو جائز سمجھتا ہوں۔ میں کہتا ہوں کہ اپنے الفاظ کو واضح کرو۔ اپنی Terms کو Define کرو۔ فحش کہتے کس کو ہیں، یہ تم مجھے بتاؤ، جنس کا بیان ہر حالت میں فحش نہیں ہوتا۔ نہیں ہوتا نا!

آصف فرخی: ٹھیک ہے۔

سلیم احمد: ورنہ طب اور فقہ اور مختلف علوم میں جو جنس کا بیان ہے، وہ سب فحش ہو جاتا۔ اب فحش کیا چیز ہے، اس کی تعریف مجھے بتائیے، اور جن چیزوں کو آپ فحش کہتے ہیں، ان میں بتائیے کہ اس میں یہ چیز فحش ہے۔ میرا کہنا ہے کہ آرٹ اپنی فطرت کے اعتبار سے فحش نہیں ہو سکتا، کیوں کہ آرٹ کا کام جذبات کو بھڑکانا نہیں، جذبات کی تہذیب کرنا ہے۔ فن فحش ہو ہی نہیں سکتا، جس وقت تک وہ فن ہے۔ جس وقت وہ آرٹ کے منصب سے گر جائے گا، وہ فحش بھی ہو سکتا ہے، وہ کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ یہ میرا مسلک تھا اس کے بارے میں، اور اس کے سوا کوئی مسلک نہیں تھا۔ دوسری بات یہ ہے کہ میں عُریانی اور فحاشی میں فرق کرتا ہوں۔ مثلاً میں ایک ایسے معاشرے کے بارے میں جانتا ہوں جہاں عورتیں اپنے جسم کے بالائی حصے کو برہنہ رکھتی ہیں لیکن ان کے اندر کوئی احساسِ شرم و برہنگی نہیں ہوتا، وہ بالکل ایسے ہوتی ہیں جیسے معصوم بچے آپ کے سامنے ننگے ہوں۔ جی! اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ آپ سر سے پاؤں تک جسم ڈھک کے فحش کام کریں۔

آصف فرخی: نہیں، میرا سوال بالکل ادبی پس منظر میں تھا۔ جیسے منٹو ہیں جنھیں بعض فحش نویس لکھتے ہیں، یا پھر عصمت چغتائی ہیں یا وہ لوگ ہیں جن کے یہاں جنس کا بیان نہ سہی تو خیالات کی بے باکی ضرور ہے۔ تو کیا آپ کے خیال میں ان موضوعات پر لکھنے والے افسانہ نگار اور ادیب کسی بھی صحت مند معاشرے کے لیے ضروری نہیں ہیں!

سلیم احمد: بالکل نہیں۔

آصف فرخی: اور اگر ڈی ایچ لارنس جیسا فن کار پیدا نہ ہوا ہوتا اور اُس نے ان موضوعات کو نہ چھیڑا ہوتا تو ایک کمی اور ایک فقدان کا احساس ہوتا تو پھر......

سلیم احمد: بالکل، بالکل۔ لارنس کو میں کتنا پسند کرتا ہوں، یہ تو تمھیں معلوم ہے اور تم نے ڑھا ہوگا کہ میں نے اس موضوع پر تفصیل سے لکھا بھی ہے۔ اور اسی مسئلے پر 'جسارت' والوں سے میرا تلاف چلا تھا اور اسی پر سارا جھگڑا کھڑا ہوا تھا۔ 'نئی نظم اور پورا آدمی' میں، میں نے میرا جی کو اور راشدؔ کو ر منٹو کو اور عصمتؔ کو کافی support کیا اور سب سے کہا کہ یوں نہیں ہے جس طرح آپ سوچتے ہیں ہ یہ لوگ صحیح ہیں۔ یہ الگ چیز ہے کہ آپ کے اعصاب اتنے اشتعال زدہ ہو جائیں کہ کوئی چیز بھی آپ ے لیے فحش بن جائے۔

ماخذ (اُردو۔۳۱)

فحش نظمیں

فہمیدہ ریاض

اس (مجموعے) کی بعض (نظموں) پر چند لوگوں کو بہت اعتراض ہے، اُن کے خیال میں یہ فحش ہیں یا چونکا دینے کے لیے لکھی گئی ہیں۔ میری نظمیں جو آپ کے سامنے ہیں، ایک رجز ہیں جسے بلند آواز سے پڑھتی ہوئی میں مقتل سے گذری۔ اس لحاظ سے 'بدن دریدہ' ایک رزمیہ ہے اسے پڑھ کر اگر لوگ چونکیں، تو کیا برا ہوا!!

ماخذ (اُردو۔۱۳)

میری نظمیں فحش نہیں ہیں

میں نے ایسی نظموں سے ہٹ کر بھی نظمیں لکھیں ہیں جن کو 'جنسی نظموں' کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ میرے قارئین، میری نظموں کو اس مغالطے کے تحت نہ پڑھیں کہ وہ جنس سے متعلق ہیں، کیوں کہ ایسا نہیں ہے۔ بہ حیثیت ایک خالص جسمانی عمل کے، جنسی فعل اس لائق نہیں کہ وہ کسی فنی تخلیق کا موضوع بن سکے۔ اس لیے کہ وہ کسی فرد واحد کے حوالے ہی سے، مکروہ، مسرّت آگیں اور نفرت انگیز ہوسکتا ہے۔ بالفاظ دیگر، اس میں معنی اسی وقت پیدا ہوتے ہیں جب ہم خود لفظ 'معنی' کے مفہوم کو صحیح طور پر سمجھنے لگیں۔

محبت ایک قدرِ انسانی ہے۔ اور میری نظم 'بدن دریدہ' اس کی بے مثال عظمت کی تصدیق کرتی ہے۔ وہ خالی محبت، جنسیت سے متعلق ہے جس سے نفس مجروح ہوتا ہے اور بدن ناپاک۔ پھر بھی کرب قائم رہتا ہے۔ اور یہ کرب، تمام مشکلات کے باوجود، انسانی رُوح کی ناقابل تسخیر قوت کی علامت ہے۔ اور اس قسم کی محبت سے عاری جسمانی رشتے، ہمارے مادہ پرست معاشرے میں کم یاب نہیں ہے

اُن بیا بتاؤں کے نام جن کے بدن،
بے محبت، ریا کار سیجوں پہ سج سج کے اُکتا گئے ہیں۔

ماخذ (انگریزی۔9)

راہ کے پتھر

پروین شاکر

سوال: لڑکیاں جب شعر کہتی ہیں تو ایک جھجک سی اپنائے رکھتی ہیں۔ آپ کے یہاں اظہار کی بے باکی کیوں کر نظر آئی!

جواب: میں اسٹوڈنٹ ہوں لٹریچر کی۔ میں جانتی ہوں کہ جب اظہار پر بند باندھ دیے جائیں تو شاعری نہیں ہوتی ہے۔ اس لیے، جب تک جھجک دور نہیں ہوگی، لکھا ہی نہیں جائے گا۔ اور جہاں تک اظہار کی بات ہے تو میرا کام فہمیدہ ریاض نے بہت آسان کر دیا ہے۔ راہ کے پتھر تو اُس نے سمیٹے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ اُس کے اور میرے پیرایۂ اظہار میں فرق ہے۔

ماخذ (اُردو۔۱۱۲)

نخچریت کا نام سنجیدگی

مہدی حسن افادی گورکھ پوری

مجھ کو اصرار ہے کہ عورت کے ذکر کے ساتھ اس کے لطیف متعلقات کی تصریح ناگزیر ہے۔ 'محرم' کی جگہ 'قبا' کفر ہی نہیں، زبان کا خون کرتا ہے۔ مجھ کو معلوم ہے ایشیائی شاعری اپنے جذبات میں 'مخنث' ہوتی ہے، لیکن جس زبان کی شاعری 'بند قبا' کو جائز رکھتی ہو، جس کے لائق فخر شعرا کسی 'معشوقہ' پر نہیں 'معشوق سبزہ آغاز' (یعنی ڈاڑھی مونچھ والے) پر فرضی اور غیر طبعی اظہارِ عشق کے عادی ہوں' جہاں عورت کے لیے' اس کی خصوصیات کے اظہار کے ساتھ بھی فعلِ مذکر کے استعمال کا رواج ہو' اس زبان کے پھوہڑ پن کا کیا ٹھکانا ہے! اس پر ستم ظریفی یہ ہے کہ اس 'نخچریت' کا نام 'سنجیدگی' ہے۔

لیکن اس معیار لطافت سے علاحدہ ہو کر اگر مغربی رنگ میں دادِ سخن دی جائے تو بے سمجھے بوجھے کوے کی کائیں کائیں صرف ثقیل مذاق کا ثبوت ہے۔ ہمارے دوست اگر مغربی لٹریچر اور فلسفے سے بیگانہ ہیں' اگر وہ نہیں جانتے کہ فلسفۂ حسن کا ماخذ اصلی کیا ہے' اگر ان کے دماغ میں یہ مناسبت نہیں ہے کہ وہ نازک مسائل کو جذب کر سکیں' اگر وہ لطائف ادبی اور غیر سنجیدہ خیالات کے حدود میں تمیز نہیں کر سکتے، مختصر یہ کہ اگر وہ نہیں جانتے کہ مغربی نزاکتِ خیال کیا چیز ہے' تو ہم ان کو ایک کافی حد تک معذور سمجھنے کے لیے تیار تھے، افسوس یہ ہے کہ وہ اپنے چھچھورے اور ذلیل اظہارِ خیال اور بے باکانہ اظہار رائے سے' جس کو خیر سے آپ تنقید سمجھتے ہیں' صرف اپنا جہلِ مرکب ثابت کر سکے۔

عورت سے متعلق نازک خیالی اگر 'فحش بیانی' ہے تو فلسفے کی یہ ڈانٹ سن رکھیے کہ خود عورت فحش ہے اور اس سے زیادہ وہ ترکیب فحش ہے جو انسان کے عالمِ وجود میں آنے کا سبب ہوئی' جسے اخلاقاً میں صرف 'سنجیدگی' کہوں گا......

ماخذ (اُردو۔۱۵)

عریانیات کوئی عیب نہیں

عطاؤاللہ پالوی

'بیسویں صدی' کے سالنامے ۱۹۲۹ء میں میرے مضمون 'افسانہ مہر محبت' کی اشاعت کے بعد اس سلسلے میں میرے پاس جو خطوط آئے ہیں' ان میں دو خط ایسے دو ادیب و شاعر حضرات کے لکھے

ہوئے ہیں جو نہ صرف اپنی بلند پایہ ادبی صلاحیتوں اور قابلِ رشک انفرادی خصوصیتوں کی وجہ سے میدانِ صحافت میں ایک مرتبہ رکھتے ہیں' بلکہ ذاتی حیثیت سے میرے بہت ہی خاص مہربانوں اور مخلص دوستوں میں سے بھی ہیں۔ یہ دونوں خط اپنی اپنی جگہ ایک خاص طرح کی خصوصیت رکھتے ہیں۔ نیز میرے اس مضمون سے ان کو خاص لگاؤ ہے۔ لہٰذا چاہتا ہوں ہوں کہ ان دونوں خطوں کو نشر کردوں اور ساتھ ہی اپنے خیالات بھی ظاہر کردوں۔ سب سے پہلے میرے قابل قدر ادیب دوست کا خط ملاحظہ ہو جو افسانہ نگاری میں بہت مشہور ہیں' فرماتے ہیں: 'رات 'بیسویں صدی' میں آپ کا شاعرانہ مضمون پڑھ رہا تھا۔ بھائی جان' معاف کیجیے' آپ کی طرز نگارش کو میں پسند نہیں کرتا۔ آخر آپ نے اس موضوع کو کیوں منتخب کیا ہے! صاحب 'بیسویں صدی' فرما رہے تھے کہ پہلے بھی اس قسم کے مقالات (آپ کے قلم سے) 'بیسوی صدی' میں نکل چکے ہیں'۔

میرے ان ادیب دوست نے جس پہلے مضمون کا اپنے خط کے متذکرہ اقتباس میں حوالہ دیا ہے وہ 'افسانہ مہر محبت' سے قبل 'مقیاس الشباب' کے عنوان سے شائع ہوا تھا' جس میں دنیا کی سب سے لطیف و صبیح شے (عورت) کے ایک خاص مرکزِ کشش اور جاذبِ نظر حصۂ جسم پر اظہار خیال کیا گیا تھا۔ وہ مضمون کیسا تھا اور ملک نے اسے کس نظر سے دیکھا' اس کا پتا ایڈیٹر صاحب کے اُس نوٹ سے چلتا ہے جو مضمون کی دوسری قسط میں دیا گیا تھا لہٰذا مجھے اس بارے میں کچھ کہنا مناسب نہیں معلوم ہوتا۔ البتہ میرے دوست کا جو یہ کہنا ہے کہ مجھے سنجیدہ موضوعات کو چھوڑ کر ایسے عنوانات پر کچھ نہ لکھنا چاہیے تھا جو 'عریانیات' سے متعلق ہیں' اس کے متعلق عرض ہے کہ میں نے ان عنوانوں سے 'عورت' کے متعلق جو کچھ لکھا ہے وہ ادب میں کوئی ایسی انوکھی اور نئی چیز نہیں جس پر لوگ چونک پڑیں۔ اور نہ اس کا شمار 'عریانیات' میں ہے۔ اگرچہ میرے نزدیک 'عریانیات' بھی کوئی عیب نہیں' کیوں کہ اس کے خلاف آواز بلند کرنا فطرت سے جنگ کرنا ہے۔ بلکہ وہ موضوع ہیں جو موشگافیٔ 'فلسفہ حسن' اور ادبی نازک خیالیوں کے لیے خاص طور سے وضع اور منتخب ہوئے ہیں۔

اردو زبان میں مجھ سے قبل دہلی کے مشہور باکمال ادیب میر ناصر علی مرحوم اس موضوع پر بے شمار موتی لٹا چکے ہیں اور عرصہ ہوا کہ گورکھ پور کے نامور انشا پرداز مہدی افادی مرحوم کا یہ خاص موضوع تحریر رہ چکا ہے۔ بلکہ میرا مضمون 'مقیاس الشباب' تو صرف مہدی مرحوم ہی کے ایک مضمون 'فلسفہ حسن و عشق' کے مطالعے کا مرہون منت تھا۔ مگر اس کا کیا جواب کہ خود مہدی مرحوم بھی اس اعتراض سے نہ بچ سکے تھے۔ چناں چہ 'نقاد' (آگرہ) میں جب ان کا مضمون شائع ہوا تو جناب مولانا حسن مارہروی نے 'الناظر' (لکھنو) میں انھیں اس تحریر پر سختی سے ٹوکا تھا۔ یہاں تک کہ مہدی مرحوم کو اس کا جواب بھی دینا پڑا تھا۔ چوں کہ اس سلسلے میں ایک حد تک میں مہدی مرحوم ہی کا متبع ہوں' لہٰذا میں اپنے دوست

کے اطمینان کے لیے مرحوم ہی کا جواب پیش کیے دیتا ہوں جس میں کہا گیا تھا کہ' عورت سے متعلق نازک خیالی' بری بات نہیں'۔ امید ہے کہ اس کو پڑھ لینے کے بعد میرے ادیب دوست کو مجھ سے کوئی شکایت نہ رہے گی۔

ماخذ (اُردو۔۱۶)

طرزِ بیان کی بے حجابی

قاضی عبدالغفار

'جس زمانہ میں 'لیلیٰ کے خطوط' شائع ہو رہے تھے اور پڑھنے والے دلچسپی کے ساتھ ان کو پڑھ رہے تھے' میرے اکثر احباب نے مجھے اس امر پر متنبہ کرنا ضروری سمجھا کہ 'لیلیٰ' کا طرز بیان بہت بے حجاب ہے اور اعتدال کی حد سے گزرا ہوا۔ بعض نے تو یہ بھی کہا کہ 'لیلیٰ' کی یہ حرکت کہ وہ مذہب اور انسانیت کے بہترین مسلمات کے ساتھ کھیلتی ہے اور شوخیاں کرتی ہے' قطعاً ناروا ہے۔ میں نے اس وقت ان احباب سے جو عرض کیا تھا وہی اب عرض کرتا ہوں یعنی

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

'لیلیٰ' کے خطوط میں جو داستان میں بیان کرنا چاہتا تھا اس کے لئے موزوں طرز بیان وہی تھا جو لیلیٰ نے اختیار کیا۔ عورت کی مظلومیت کا افسانہ ہندوستان کے ماحول میں کسی شریف گھر کی بیٹی یا بہو کی زبان سے بیان ہونا ممکن نہ تھا۔ لامحالہ ایک بازاری عورت کے قلم سے وہ عبرت انگیز حقائق بیان کرانے پڑے جن کو ذرا کم بے حجاب اور زیادہ سنجیدہ طرز بیان بے اثر اور بے معنی کر دیتا۔

جو نوک خار میں چاہتا تھا کہ ان موٹی کھالوں میں چبھے جن پر معمولی چٹکیوں کا کبھی کوئی اثر نہیں ہوتا' وہ نوک خار سنجیدگی اور اعتدال کی حدود میں اکثر بے اثر رہتی ہے۔ درحقیقت میں مجبور تھا کہ 'لیلیٰ' کے قلم کی نوک سے ان موٹی اور سخت کھالوں میں سوراخ کراؤں۔ اپنے مقصد میں کس حد تک مجھے کامیابی ہوئی اس کا اندازہ تو وہی لوگ کرسکیں گے جنہوں نے 'لیلیٰ کے خطوط' کو محض اس کی ادبی چاشنی کی خاطر نہیں بلکہ اس مقصد اعلیٰ کو پیش نظر رکھ کر پڑھا ہے کہ جو 'لیلیٰ' کے قلم کی روانی میں میری ساری داستان گوئی کی روح رواں ہے' وہ ایک عورت کے چونچکاں کفن کے چند دھبے ہیں جن کا عکس ان 'خطوط' میں پیش کیا گیا۔

ماخذ (اُردو۔۶۶)

جنسِ کاسد

شورش کاشمیری

کوئی شخص اس کتاب کے مطالعے سے گم راہ ہوتا ہے تو میں سمجھوں گا کہ اُس نے میری کتاب کا مقصد کھودیا ہے۔ کوئی راہ پر آتا ہے تو مجھے خوشی ہوگی کہ اس کے نفس کی نیکی جاگ اُٹھی ہے۔ اس کے علاوہ نہ مجھے دادِ تحسین کی ضرورت ہے کہ اس جنسِ کاسد سے میرا جی بھر چکا ہے، نہ فقیہوں کی ملامت، معلموں کے قہر اور راہنماؤں کی خشونت سے ڈرتا ہوں کہ اس کرۂ ارضی پر ان سے زیادہ بے مایہ کوئی چیز نہیں ہے۔

ماخذ (اُردو۔ ٦٨)

افسانہ نگار اور جنسی مسائل

سعادت حسن منٹو

کوئی حقیر سے حقیر چیز ہی کیوں نہ ہو، مسائل پیدا کرنے کا باعث ہو سکتی ہے۔ مسہری کے اندر ایک مچھر گھس آئے تو اس کو باہر نکالنے، مارنے اور آئندہ کے لیے دوسرے مچھروں کی روک تھام کرنے کے مسائل پیدا ہو جاتے ہیں۔ لیکن دنیا کا سب سے بڑا مسئلہ یعنی تمام مسئلوں کا باپ اس وقت پیدا ہوا تھا جب آدم نے بھوک محسوس کی تھی۔ اور اس سے چھوٹا مگر دل چسپ مسئلہ اس وقت پردۂ ظہور پر آیا تھا جب دنیا کے اس سب سے پہلے مرد کی دنیا کی سب سے پہلی عورت سے ملاقات ہوئی تھی۔

یہ دونوں مسئلے جیسا کہ آپ جانتے ہیں، دو مختلف قسم کی بھوکیں ہیں جن کا آپس میں بہت گہرا تعلق ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمیں اس وقت جتنے معاشرتی، مجلسی، سیاسی اور جنگی مسائل نظر آتے ہیں ان کے عقب میں یہی دو بھوکیں جلوہ گر ہیں۔ موجودہ جنگ کا خونیں پردہ اگر اٹھا دیا جائے تو لاشوں کے انبار کے پیچھے آپ کو ملک گیری کی بھوک کے سوا اور کچھ نظر نہیں آئے گا۔

بھوک کسی قسم کی بھی ہو، بہت خطرناک ہے۔ آزادی کے بھوکوں کو اگر غلامی کی زنجیریں پیش کی جاتی رہیں تو انقلاب ضرور برپا ہوگا۔ روٹی کے بھوکے اگر فاقے ہی کھینچتے رہے تو وہ تنگ آ کر دوسرے کا نوالہ ضرور چھینیں گے۔ مرد کی نظروں کو اگر عورت کے دیدار کا بھوکا رکھا گیا تو شاید وہ اپنے ہم جنسوں اور حیوانوں ہی میں اس کا عکس دیکھنے کی کوشش کریں۔ دنیا میں جتنی لعنتیں ہیں، بھوک ان کی ماں ہے۔ بھوک گداگری سکھاتی ہے، بھوک جرائم کی ترغیب دیتی ہے، بھوک عصمت فروشی پر مجبور کرتی ہے۔ بھوک انتہا پسندی کا سبق دیتی ہے۔ اس کا حملہ بہت شدید، اس کا وار بہت بھرپور اور اس کا زخم بہت گہرا ہوتا ہے۔ بھوک دیوانے پیدا کرتی ہے۔ دیوانگی بھوک پیدا نہیں کرتی۔

دنیا کے کسی کونے کا مصنف ہو، ترقی پسند ہو یا تنزل پسند، بوڑھا ہو یا جوان، اس کے پیش نظر دنیا کے تمام بکھرے ہوئے مسائل رہتے ہیں۔ چن چن کر وہ ان پر لکھتا رہتا ہے۔ کبھی کسی کے حق میں کبھی کسی کے خلاف! آج کا ادیب بنیادی طور پر آج سے پانچ سو سال پہلے کے ادیب سے کوئی زیادہ مختلف نہیں۔ ہر چیز پر نئے پرانے کا لیبل وقت لگاتا ہے، انسان نہیں لگاتا۔ ہم آج نئے ادیب کہلاتے ہیں۔ آنے والی کل ہمیں پرانا کر کے الماریوں میں بند کر دے گی لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہم بے کار جیے۔ ہم نے مفت کی مغز وردی کی۔ گھڑی کی سوئی جب ایک سے گزر کر دو کی طرف رینگتی ہے تو ایک کا

ہندسہ بے مصرف نہیں ہو جاتا۔ پورا سفر طے کر کے سوئی پھر اسی ہندسے کی طرف لوٹتی ہے۔ یہ گھڑی کا اصول بھی ہے اور دنیا کا بھی۔ آج کے نئے مسائل بھی گزری ہوئی کل کے پرانے مسائل سے بنیادی طور پر مختلف نہیں۔ جو آج کی برائیاں ہیں، گزری ہوئی کل ہی نے ان کے بیج بوئے تھے۔

جنسی مسائل جس طرح آج کے نئے ادیبوں کے پیشِ نظر ہیں، اسی طرح پرانے ادیبوں کے پیشِ نظر بھی تھے۔ انھوں نے ان پر اپنے رنگ میں لکھا۔ ہم آج اپنے رنگ میں لکھ رہے ہیں۔ مجھے معلوم نہیں، مجھ سے جنسی مسائل کے متعلق بار بار کیوں پوچھا جاتا ہے۔ شاید اس لیے کہ لوگ مجھے ترقی پسند کہتے ہیں یا شاید اس لیے کہ میرے چند افسانے جنسی مسائل کے متعلق ہیں۔ یا پھر اس لیے کہ آج کے نئے ادیبوں کو بعض حضرات 'جنس زدہ' قرار دے کر انھیں ادب، مذہب اور سماج سے یک قلم خارج کر دینا چاہتے ہیں۔ وجہ کچھ بھی ہو، میں اپنا نقطۂ نظر بیان کیے دیتا ہوں۔

روٹی اور پیٹ، عورت اور مرد۔ یہ دو بہت پرانے رشتے ہیں۔ ازلی و ابدی۔ روٹی زیادہ اہم ہے یا پیٹ! عورت زیادہ ضروری ہے کہ مرد! میں اس کے متعلق کچھ نہیں کہ سکتا، اس لئے کہ میرا پیٹ روٹی مانگتا ہے۔ لیکن مجھے نہیں معلوم کہ گیہوں بھی میرے پیٹ کے لیے اتنا ہی ترستا ہے جتنا کہ میرا پیٹ! پھر بھی جب میں سوچتا ہوں کہ زمین نے گیہوں کے خوشوں کو بے کار جنم نہیں دیا ہوگا تو مجھے خوش فہمی ہوتی ہے کہ میرے پیٹ ہی کے لیے وسیع و عریض کھیتوں میں سنہری بالیاں جھومتی ہیں۔ اور پھر ہو سکتا ہے کہ میرا پیٹ پہلے پیدا ہوا ہو اور گیہوں کی یہ بالیاں کچھ دیر بعد۔ کچھ بھی ہو لیکن یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہے کہ دنیا کا ادب صرف ان دو رشتوں ہی سے متعلق ہے۔ الہامی کتابیں بھی جن کو آسمانی ادب کہنا چاہیے، روٹی اور پیٹ، عورت اور مرد کے تذکروں سے خالی نہیں۔

مگر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب یہ مسائل اتنے پرانے ہیں کہ ان کا ذکر الہامی کتابوں میں بھی آ چکا ہے تو پھر آج کے ادیب ان پر کیوں خامہ فرسائی کرتے ہیں! عورت اور مرد کے تعلقات کو بار بار کیوں کریدا جاتا ہے اور بقول شخصے عریانی پھیلائی جاتی ہے! جواب اس سوال کا یہ ہے کہ اگر ایک ہی بار، جھوٹ نہ بولنے اور چوری نہ کرنے کی تلقین کرنے پر ساری دنیا جھوٹ اور چوری سے پرہیز کرتی تو شاید ایک ہی پیغمبر کافی ہوتا۔ لیکن جیسا کہ آپ جانتے ہیں پیغمبروں کی فہرست خاصی لمبی ہے۔

ہم لکھنے والے پیغمبر نہیں۔ ہم ایک ہی چیز کو، ایک ہی مسئلے کو مختلف حالات میں مختلف زاویوں سے دیکھتے ہیں اور جو کچھ ہماری سمجھ میں آتا ہے، دنیا کے سامنے پیش کر دیتے ہیں اور کبھی مجبور نہیں کرتے کہ وہ اسے قبول ہی کرے۔ ہم قانون ساز نہیں۔ محتسب بھی نہیں۔ احتساب اور قانون سازی دوسروں کا کام ہے۔ ہم حکومتوں پر نکتہ چینی کرتے ہیں لیکن خود حاکم نہیں بنتے۔ ہم عمارتوں کے نقشے بناتے ہیں، لیکن معمار نہیں۔ ہم مرض بتاتے ہیں لیکن دواخانوں کے مہتمم نہیں ہیں۔ ہم جنسیات پر

نہیں لکھتے، جو سمجھتے ہیں کہ ہم ایسا کرتے ہیں، یہ ان کی غلطی ہے۔ ہم اپنے افسانوں میں خاص عورتوں اور خاص مردوں کے حالات پر روشنی ڈالتے ہیں۔ ہمارے کسی افسانے کی ہیروئن سے اگر اس کا مرد صرف اس لیے متنفر ہوجاتا ہے کہ وہ سفید کپڑے پسند کرتی ہے اور سادگی پسند ہے تو دوسری عورتوں کو اسے اصول نہیں سمجھ لینا چاہیے۔ یہ نفرت کیوں پیدا ہوئی اور کن حالات میں پیدا ہوئی؟ اس استفہام کا جواب آپ کو ہمارے افسانے میں ضرور مل جائے گا۔ جو لوگ ہمارے افسانوں میں لذت حاصل کرنے کے طریقے دیکھنا چاہتے ہیں، انھیں یقیناً ناامیدی ہوگی۔ ہم داؤ پیچ بتانے والے خلیفے نہیں۔ ہم جب اکھاڑے میں کسی کو گرتا دیکھتے ہیں تو اپنی سمجھ کے مطابق آپ کو سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں کہ وہ کیوں گرا تھا؟

ہم رجائی ہیں، دنیا کی سیاہیوں میں بھی ہم اجالے کی لکیریں دیکھ لیتے ہیں۔ ہم کسی کو حقارت کی نظر سے نہیں دیکھتے۔ چکلوں میں جب کوئی ٹکھیائی اپنے کوٹھے پر سے کسی راہ گزر پر پان کی پیک تھوکتی ہے تو ہم دوسرے تماشائیوں کی طرح نہ تو کبھی اُس رہ گزر پر ہنستے ہیں اور نہ کبھی ٹکھیائی کو گالیاں دیتے ہیں۔ ہم یہ واقعہ دیکھ کر رک جائیں گے۔ ہماری نگاہیں اس غلیظ پیشہ ور عورت کے نیم عریاں لباس کو چیرتی ہوئی، اس کے سیاہ عصیاں بھرے جسم کے اندر داخل ہوکر اس کے دل تک پہنچ جائیں گی۔ اس کو ٹٹولیں گی اور ٹٹولتے ٹٹولتے ہم خود کچھ عرصے کے لیے تصور میں وہی کریہہ اور متعفن رنڈی بن جائیں گے۔ صرف اس لیے کہ ہم اس واقعے کی تصویر ہی نہیں بلکہ اس کے اصل محرک کی وجہ بھی پیش کرسکیں۔ جب کسی اچھے خاندان کی جوان، صحت مند اور خوب صورت لڑکی کسی مریل، بدصورت اور قلاش لڑکے کے ساتھ بھاگ جاتی ہے تو ہم سب اسے ملعون قرار نہیں دیں گے۔ دوسرے، اس لڑکی کا ماضی، حال اور مستقبل اخلاق کی پھانسی میں لٹکا دیں گے۔ لیکن ہم وہ چھوٹی سی گرہ کھولنے کی کوشش کریں گے جس نے اس لڑکی کے ادراک کو بے حس کیا۔

انسان ایک دوسرے سے کوئی زیادہ مختلف نہیں۔ جو غلطی ایک مرد کرتا ہے، دوسرا بھی کرسکتا ہے۔ جب ایک عورت بازار میں دکان سجا کر اپنا جسم بیچ سکتی ہے تو دنیا کی سب عورتیں ایسا کرسکتی ہیں۔ لیکن غلط کار انسان نہیں، وہ حالات ہیں جن کی کھیتیوں میں انسان اپنی غلطیاں پیدا کرتا ہے اور ان کی فصلیں کاٹتا ہے۔

زیادہ تر جنسی مسائل ہی آج کے نئے ادیبوں کی توجہ کا مرکز کیوں بنے ہیں! اس کا جواب معلوم کرنا کوئی زیادہ مشکل نہیں۔ یہ زمانہ عجیب وغریب قسم کی اضداد کا زمانہ ہے۔ عورت قریب بھی ہے، دور بھی۔ کہیں مادر زاد برہنگی نظر آتی ہے، کہیں سر سے لے کر پیر تک ستر، کہیں عورت مرد کے بھیس میں دکھائی دیتی ہے۔ کہیں مرد عورت کے بھیس میں۔ دنیا ایک بہت بڑی کروٹ لے رہی ہے۔ ہندوستان

بھی جہاں آزادی کا ننھا بچہ غلامی کے دامن سے اپنے آنسو پونچھ رہا ہے، مٹی کا نیا گھروندا بنانے کیلیے ضد کر رہا ہے۔ مشرقی تہذیب کی چولی کے بند کبھی کھولے جاتے ہیں، کبھی بند کیے جاتے ہیں۔ مغربی تہذیب کے چہرے کا غازہ کبھی ہٹایا جاتا ہے، کبھی لگایا جاتا ہے۔ ایک افراتفری سی مچی ہے۔ نئے کھٹ بُنے پرانی کھاٹوں کی مونج ادھیڑ رہے ہیں، پرانے کھٹ بُنے چلا رہے ہیں۔ بلی ہوئی پھولوں سے کہیں کھٹمل نکل رہے ہیں کہیں پسو۔ کوئی کہتا ہے انھیں زندہ رہنے دو۔ کوئی کہتا ہے نہیں فنا کر دو۔ اس دھاندلی میں، اس شورش میں ہم نئے لکھنے والے اپنے قلم سنبھالے، کبھی اس مسئلے سے ٹکراتے ہیں کبھی اس مسئلے سے۔

اگر ہماری تحریروں میں عورت اور مرد کے تعلقات کا ذکر آپ کو زیادہ نظر آئے تو یہ ایک فطری بات ہے۔ ملک، ملک سے سیاسی طور پر جدا کیے جا سکتے ہیں۔ ایک مذہب دوسرے مذہب سے عقیدوں کی بنا پر علاحدہ کیا جا سکتا ہے۔ دو زمینوں کو ایک قانون دوسرے سے بیگانہ کر سکتا ہے۔ لیکن کوئی سیاست، کوئی عقیدہ، کوئی قانون، عورت اور مرد کو ایک دوسرے سے دور نہیں کر سکتا۔ عورت اور مرد میں جو فاصلہ ہے، اس کو عبور کرنے کی کوشش ہر زمانے میں ہوتی رہے گی۔ عورت اور مرد میں جو ایک لرزتی ہوئی دیوار حائل ہے، اسے سنبھالنے اور گرانے کی سعی ہر صدی، ہر قرن میں ہوتی رہے گی۔ جو اسے عریانی سمجھتے ہیں انھیں اپنے احساس کے ننگ پر افسوس ہونا چاہیے۔ جو اسے اخلاق کی کسوٹی پر پرکھتے ہیں، انھیں معلوم ہونا چاہیے کہ اخلاق، زنگ ہے جو سماج کے استرے پر بے احتیاطی سے جم گیا ہے۔

جو سمجھتے ہیں کہ نئے ادب نے جنسی مسائل پیدا کیے ہیں، غلطی پر ہیں۔ کیوں کہ حقیقت یہ ہے کہ جنسی مسائل نے اس نئے ادب کو پیدا کیا ہے۔ اس نئے ادب کو جس میں آپ کبھی کبھی اپنا ہی عکس دیکھتے ہیں اور جھنجھلا اُٹھتے ہیں۔ حقیقت خواہ شکر ہی میں لپیٹ کر پیش کی جائے اس کی کڑواہٹ دور نہیں ہوگی۔ ہماری تحریریں آپ کو کڑوی اور کسیلی لگتی ہیں مگر اب تک جو مٹھاسیں آپ کو پیش کی جاتی رہی ہیں، ان سے انسانیت کو کیا فائدہ ہوا ہے؟ نیم کے پتے کڑوے سہی مگر خون ضرور صاف کرتے ہیں۔

ماخذ (اُردو۔۴۶)

سفید جھوٹ

سعادت حسن منٹو

ماہوار رسالہ ’ادب لطیف‘ لاہور کے سالنامہ ۱۹۴۲ء میں ایک افسانہ بعنوان ’کالی شلوار‘ شائع ہوا تھا جسے لوگ فحش سمجھتے ہیں۔ یہ سفید جھوٹ ہے۔ افسانہ نگاری میرا پیشہ ہے۔ میں اس کے تمام آداب سے واقف ہوں۔ اس سے پیش تر اسی موضوع پر کئی افسانے لکھ چکا ہوں۔ ان میں سے کوئی بھی فحش نہیں۔ میں آئندہ بھی اس موضوع پر افسانے لکھوں گا جو فحش نہیں ہوں گے۔

قصہ گوئی ہبوط آدم سے جاری ہے اور میرا خیال ہے کہ قیامت تک جاری رہے گی۔ اس کی شکلیں بدلتی جائیں گی۔ لیکن انسان اپنے احساسات دوسرے اذہان تک پہنچانے کا سلسلہ جاری رکھے گا۔ بیسواؤں پر اب تک بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور بہت کچھ لکھا جائے گا۔ ہر اس شے کے متعلق لکھا یا کہا جاتا ہے جو سامنے موجود ہو۔ بیسوائیں اب سے نہیں ہزارہا سال سے ہمارے درمیان موجود ہیں۔ ان کا تذکرہ الہامی کتابوں میں موجود ہے۔ اب چوں کہ کسی الہامی کتاب یا کسی پیغمبر کی گنجائش نہیں رہی اس لئے موجودہ زمانے میں ان کا ذکر آپ آیات میں نہیں بلکہ ان اخباروں، رسالوں یا کتابوں میں دیکھتے ہیں، جنھیں آپ عود اور لوبان جلائے بغیر پڑھ سکتے ہیں اور پڑھنے کے بعد ردی میں بھی اٹھوا سکتے ہیں۔

میں ایک ایسا انسان ہوں جو ایسے رسالوں اور ایسی کتابوں میں لکھتا ہے اور اس لیے لکھتا ہے کہ اسے کچھ کہنا ہوتا ہے۔ جس نظر اور جس زاویے سے دیکھتا ہوں، وہی زاویہ دوسروں کے سامنے پیش کر دیتا ہوں۔ اگر تمام لکھنے والے پاگل تھے تو آپ میرا شمار بھی ان پاگلوں میں کر سکتے ہیں۔

’کالی شلوار‘ کا پس منظر ایک ویشیا کا گھر ہے۔ یہ گھر بئے کے گھر کی طرح حیرت انگیز نہیں جس کے متعلق عجیب و غریب باتیں مشہور ہیں۔ دہلی میں ایسی عورتوں کے لیے ایک مقام منتخب کر کے بے شمار گھر بنائے گئے ہیں۔ میری سلطانہ ایسے ہی ایک بنے بنائے گھر میں رہتی تھی۔ اس نے بئے کی طرح یہ گھر خود نہیں بنایا تھا۔ وہ بئے کی طرح رات کو جگنو پکڑ پکڑ کر اپنا گھر روشن نہیں کرتی تھی۔ روشنی پیدا کرنے کے لیے بجلی موجود تھی اور چوں کہ یہ بجلی مفت نہیں مل سکتی اور نہ رہنے کے لیے مکان ہی کرائے کے بغیر مل سکتا ہے، اس لیے اسے مزدوری کرنا پڑتی تھی۔ وہ اگر بیاہی ہوتی تو اسے یہ سب چیزیں مفت مل جاتیں۔ لیکن وہ بیاہی نہیں تھی۔ محض ایک عورت تھی...... اور جب عورت کو بجلی کے پیسے ادا کرنے

پڑیں، گھر کا کرایہ ادا کرنا پڑے اور جس کے پلّے خدا بخش سا آدمی پڑ جائے جو فقیروں کے پیچھے مارا مارا پھرے تو ظاہر ہے کہ وہ ایسی عورت نہیں ہوگی جو ہم اپنے گھروں میں دیکھتے ہیں۔ میری سلطانہ چکلے کی ایک عورت ہے، اس کا پیشہ وہی ہے جو چکلے کی عورتوں کا ہوتا ہے۔ چکلے کی عورتوں کو کون نہیں جانتا! قریب قریب ہر شہر میں ایک چکلہ موجود ہے۔ بدر اور موری کو کون نہیں جانتا! ہر شہر میں بدروئیں اور موریاں موجود ہیں جو شہر کی گندگی باہر لے جاتی ہیں......

ہم اگر اپنے مرمریں غسل خانوں کی باتیں کر سکتے ہیں، اگر ہم صابن اور لیونڈر کا ذکر کر سکتے ہیں تو ان موریوں اور بدروؤں کا ذکر کیوں نہیں کر سکتے جو ہمارے بدن کا میل پیتی ہیں! اگر ہم مندروں اور مسجدوں کا ذکر کر سکتے ہیں تو ان قحبہ خانوں کا ذکر کیوں نہیں کر سکتے جہاں سے لوٹ کر کئی انسان مندروں کا رخ کرتے ہیں! اگر ہم افیون، بھنگ، چرس اور شراب کے ٹھیکوں کا ذکر کر سکتے ہیں تو ان کوٹھوں کا ذکر کیوں نہیں کر سکتے جہاں ہر قسم کا نشہ استعمال کیا جاتا ہے!

بھنگیوں سے چھوت چھات کی جاتی ہے۔ اگر کوئی بھنگی ہمارے گھر سے گندگی کا ٹوکرا اٹھا کر باہر نکلے تو ہم اپنی ناک پر رومال ضرور رکھ لیں گے۔ ہمیں گھن بھی آئے گی مگر ہم بھنگیوں کے وجود سے تو منکر نہیں ہو سکتے۔ اس فضلے سے تو انکار نہیں کر سکتے جو ہر روز ہمارے جسم سے خارج ہوتا ہے۔ قبض، پیچش، اسہال وغیرہ دور کرنے کے لیے دوائیں اسی لیے موجود ہیں کہ ہمارے جسم سے فاسد مادے کا اخراج ضروری ہے۔ گندگی کے نکاس کے لیے نت نئے طریقے سوچے جاتے ہیں، اس لیے کہ گندگی ہر روز جمع ہوتی جاتی ہے۔ اگر ہمارے جسم میں ایک انقلاب برپا ہو جائے اور اس کے افعال بدل جائیں تو ہم قبض و پیچش اور اسہال کی باتیں نہیں کریں گے یا اگر گندگی کے نکاس کے لیے کوئی میکانکی طریقہ ایجاد ہو جائے تو بھنگیوں کا وجود باقی نہیں رہے گا۔ ہم اگر بھنگیوں کے متعلق بات کریں گے تو یقیناً کوڑے کرکٹ اور گندگی کا ذکر آئے گا۔ اگر ہم ویشیاؤں کے متعلق بات کریں گے تو یقیناً ان کے پیشے کا ذکر آئے گا۔

ویشیا کے کوٹھے پر ہم نماز یا درود پڑھنے نہیں جاتے۔ وہاں جس غرض سے جاتے ہیں ظاہر ہے وہاں ہم اس لیے جاتے ہیں کہ وہاں ہم جا سکتے ہیں۔ وہاں جا کر ہم اپنی مطلوبہ جنس بے روک ٹوک خرید سکتے ہیں۔ جب وہاں جانے کی ہمیں کھلی اجازت ہے، جب ہر عورت اپنی مرضی پر ویشیا بن سکتی ہے اور ایک لائسنس لے کر جسم فروشی شروع کر سکتی ہے۔ جب یہ تجارت قانون جائز تسلیم کی جاتی ہے تو اس کے متعلق ہم بات چیت کیوں نہیں کر سکتے؟ اگر ویشیا کا ذکر فخش ہے تو اس کا وجود بھی فخش ہے۔ اگر اس کا ذکر ممنوع ہے تو اس کا پیشہ بھی ممنوع ہونا چاہیے۔ ویشیا کو مٹایئے اس کا وجود خود بخود مٹ جائے گا۔

ہم وکیلوں کے متعلق کھلے بندوں باتیں کر سکتے ہیں، ہم نائیوں، دھوبیوں، کنجڑوں اور بھٹیاروں کے متعلق بات چیت کر سکتے ہیں۔ ہم چوروں، اچکوں، ٹھگوں اور راہ زنوں کے قصے سنا سکتے ہیں۔ ہم جنوں اور پریوں کی داستانیں بیٹھ کے گھڑ سکتے ہیں۔ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ جب آسمان کی طرف شیطان بڑھنے لگتا ہے تو فرشتے تارے توڑ توڑ کر اسے مارتے ہیں۔ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ایک بیل اپنے سینگوں پر ساری دنیا اٹھائے ہوئے ہے۔ ہم داستانِ امیر حمزہ اور قصہ طوطا مینا تصنیف کر سکتے ہیں۔ ہم لندھور پہلوان کے گرز کی تعریف کر سکتے ہیں۔ ہم عمرو عیار کی ٹوپی اور زنبیل کی باتیں کر سکتے ہیں۔ ہم ان طوطوں اور مینا تصنیف کر سکتے ہیں۔ ہم ان طوطوں اور میناؤں کے قصے سنا سکتے ہیں جو ہر زبان میں باتیں کرتے تھے۔ ہم جادوگروں کے منتروں اور ان کی توڑ کی باتیں کر سکتے ہیں۔ ہم عمل ہمزاد اور کیمیا گری کے متعلق جو من میں آئے کہ سکتے ہیں۔ ہم داڑھیوں، پائجاموں اور سر کے بالوں کی لمبائی پر لڑ جھگڑ سکتے ہیں۔ ہم روغن جوش، پلاؤ اور قورمہ بنانے کی نئی نئی ترکیبیں سوچ سکتے ہیں۔ ہم یہ سوچ سکتے ہیں کہ سبز رنگ کے کپڑے پر کس رنگ اور کس قسم کے بٹن سجیں گے تو ہم ویشیا کے متعلق کیوں نہیں سوچ سکتے! اس کے پیشے کے بارے میں کیوں غور نہیں کر سکتے! ان لوگوں کے متعلق کیوں کچھ نہیں کہ سکتے جو اس کے پاس جاتے ہیں!

ہم ایک نوجوان لڑکے اور ایک نوجوان لڑکی کا باہمی رشتہ معاشقہ کرا سکتے ہیں۔ ان کی پہلی ملاقات داتا گنج بخش کے مزار میں کرا سکتے ہیں۔ ایک دلال بڑھیا بیچ میں لا سکتے ہیں۔ جوان دو بچھڑی روحوں کو بار بار ملاتی رہے۔ ہم آخر میں ان کے عشق کو ناکام بنا سکتے ہیں، دونوں کو زہر پلوا سکتے ہیں۔ ان دونوں کے جنازے، ایک اس محلّے سے اور ایک اس محلّے سے نکلوا سکتے ہیں۔ پھر ان دونوں کی قبریں ایک معجزے کے ذریعے سے آپس میں ملوا سکتے ہیں...... پھر ہم ویشیا کی زندگی کیوں بیان نہیں کر سکتے۔ اسے تو فرشتوں اور ان کے پھولوں کی ضرورت نہیں ہوتی۔ وہ اگر مرتی ہے تو دوسرے محلّے سے کوئی جنازہ اس کی کی موت کا ساتھ نہیں دیتا۔ کوئی قبر اس کی قبر سے ملنے کی خواہش نہیں کرتی۔

ویشیا کا مکان خود ایک جنازہ ہے جو سماج اپنے کندھوں پر اُٹھائے ہوئے ہے۔ وہ اسے جب تک کہیں دفن نہیں کرے گا اس کے متعلق باتیں ہوتی ہی رہیں گی۔ یہ لاش، گلی سڑی سہی، بدبودار سہی، بھیانک سہی، گھناؤنی سہی، لیکن اس کا منہ دیکھنے میں کیا ہرج ہے! کیا یہ ہماری کچھ نہیں لگتی! کیا ہم اس کے عزیز و اقارب نہیں! ہم کبھی کبھی کفن اٹھا کر اس کا منہ دیکھتے رہیں گے اور دوسروں کو دکھاتے رہیں گے۔

میں نے 'کالی شلوار' میں ایسی لاش کا منہ دکھایا ہے۔ ملاحظہ ہو:

'سڑک کی دوسری طرف مال گودام تھا جو اس کونے سے اس کونے تک پھیلا ہوا تھا۔ داہنے

ہاتھ کو لوہے کی چھت کے نیچے بڑی بڑی گانٹھیں پڑی رہتی تھیں اور ہر قسم کے مال اسباب کے ڈھیر لگے رہتے تھے۔ بائیں ہاتھ کو کھلا میدان تھا۔ جس میں بے شمار ریل کی پٹریاں بچھی ہوئی تھیں۔ دھوپ میں لوہے کی یہ پٹریاں چمکتیں تو سلطانہ اپنے ہاتھوں کی طرف دیکھتی جن پر نیلی نیلی رگیں بالکل ان پٹریوں کی طرح ابھری رہتی تھیں۔ اس لمبے اور کھلے میدان میں ہر وقت انجن اور گاڑیاں چلتی رہتی تھیں، کبھی ادھر کبھی ادھر۔ ان انجنوں اور گاڑیوں کی چھک چھک پھک پھک سدا گونجتی رہتی تھی۔ صبح سویرے جب وہ اٹھ کر بالکنی میں آتی تو ایک عجیب سماں اسے نظر آتا۔ دھند لکے میں انجنوں کے منہ سے گاڑھا دھواں نکلتا تھا اور گدلے آسمان کی جانب موٹے اور بھاری آدمیوں کی طرح اُٹھتا دکھائی دیتا تھا۔ بھاپ کے بڑے بڑے بادل بھی ایک شور کے ساتھ اُٹھتے تھے اور آنکھ جھپکنے کی دیر میں ہوا کے اندر گھل مل جاتے تھے۔ پھر کبھی کبھی جب وہ گاڑی کے کسی ڈبے کو جسے انجن نے دھکا دے کر چھوڑ دیا ہو، اکیلے پٹریوں پر چلتا دیکھتی تو اسے اپنا خیال آتا۔ وہ سوچتی کہ اسے بھی کسی نے زندگی کی پٹڑی پر دھکا دے کر چھوڑ دیا ہے اور وہ خود بخود جارہی ہے۔ دوسرے لوگ کانٹے بدل رہے ہیں اور وہ چلی جارہی ہے۔ جانے کہاں؟ پھر ایک وقت ایسا آئے گا جب اس دھکے کا زور آہستہ آہستہ ختم ہوجائے گا اور وہ کہیں رک جائے گی۔ کسی ایسے مقام پر جو اس کا دیکھا بھالا نہ ہوگا'۔

ذہین پڑھنے والوں کے لیے اس سے اچھے اشارے اور کیا ہوسکتے ہیں! سلطانہ کی زندگی کا صحیح نقشہ ان اشاروں اور کنایوں سے میں نے پیش کرنے کی کامیاب سعی کی ہے۔ دہلی کی میونسپلٹی نے دہلی کی ویشیاؤں کے لیے ایک خاص جگہ مقرر کرتے وقت یہ نہ سوچا ہوگا کہ مال گودام ان کی زندگی کا صحیح نقشہ پیش کرتا ہے۔ لیکن جو صاحب نظر ہیں وہ ان مکانوں اور مال گودام کو آمنے سامنے دیکھ کر 'کالی شلوار' جیسے کئی افسانے لکھیں گے۔

اسی لاش کا ایک بار، میں نے یوں بھی منہ دکھایا تھا۔ میں اپنے مشہور افسانے 'ہتک' کا آغاز ان سطور سے کرتا ہوں: 'دن بھر کی تھکی ماندی وہ ابھی ابھی اپنے بستر پر لیٹی تھی اور لیٹتے ہی سوگئی تھی۔ میونسپل کمیٹی کا داروغۂ صفائی جسے وہ سیٹھ کے نام سے پکارتی تھی، ابھی ابھی اس کی ہڈی پسلیاں جھنجھوڑ کر شراب کے نشے میں چور گھر کو واپس گیا تھا۔ وہ رات وہیں ٹھہرتا۔ پر اسے اپنی دھرم پتنی کا بہت خیال تھا جو اس سے بے حد پریم کرتی تھی۔ وہ روپے جو اس نے اپنی جسمانی مشقت کے بدلے اس داروغے سے وصول کیے تھے۔ اس کی چست تھوک بھری چولی کے نیچے سے اوپر کو ابھرے ہوئے تھے۔ کبھی کبھی سانس کے اتار چڑھاؤ سے چاندی کے یہ سکے کھنکھنانے لگتے اور ان کی کھنکھناہٹ اس کے دل کی غیر آہنگ دھڑکنوں میں گھل مل جاتی اور ایسا معلوم ہوتا کہ ان سکوں کی چاندی پگھل کر اس کے دل کے خون میں ٹپک رہی ہے۔ اس کا سینہ اندر سے تپ رہا تھا۔ یہ گرمی کچھ اس برانڈی کا باعث تھی جس کا ادھا

داروغہ اپنے ساتھ لایا تھا اور کچھ اس 'بیوڑا' کا نتیجہ تھی جس کو سوڈا ختم ہونے پر دونوں نے پانی میں ملا کر پیا تھا۔ وہ ساگوان کے لمبے چوڑے پلنگ پر اوندھے منہ لیٹی تھی۔ اس کی باہیں جو کاندھوں تک ننگی تھیں، پتنگ کی اس کانپ کی طرح پھیلی ہوئی تھیں جو رات اوس میں بھیگ جانے کے باعث پتلے کاغذ سے جدا ہو جائے۔ دائیں بازو کی بغل میں شکن آلود گوشت ابھرا ہوا تھا جو بار بار مونڈنے کے باعث سیاہی مائل رنگت اختیار کر گیا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ نچی ہوئی مرغی کی کھال کا ایک ٹکڑا وہاں پر رکھ دیا گیا ہے۔'

یہ سلطانہ کی ایک بہن سوگندھی کی تصویر ہے۔ اس کے پاس خدا بخش کے بجائے ایک خارش زدہ کتا تھا۔ خدا بخش سلطانہ کا دل نہ بہلا سکا مگر یہ خارش زدہ کتا سوگندھی کے بہت کام آیا۔ اس افسانے کے آخر میں لکھتا ہوں: 'کتا اپنی ٹنڈ منڈ دم ہلاتا، سوگندھی کے پاس واپس آیا اور اس کے قدموں کے پاس بیٹھ کر کان پھڑ پھڑانے لگا۔ سوگندھی چونکی۔ اس نے چاروں طرف ایک ہولناک سناٹا دیکھا۔ ایسا سناٹا جو اس نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اسے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ہر شے خالی ہے۔ جیسے مسافروں سے لدی ہوئی ریل گاڑی سب اسٹیشنوں پر مسافر اتار کر اب لوہے کے شیڈ میں بالکل اکیلی کھڑی ہے۔ یہ خلا جو اچانک سوگندھی کے اندر پیدا ہو گیا تھا، اسے بہت تکلیف دے رہا تھا۔ اس نے کافی دیر تک اس خلا کو بھرنے کی کوشش کی، مگر بے سود، وہ ایک ہی وقت میں بے شمار خیالات اپنے دماغ میں ٹھونستی مگر بالکل چھلنی کا سا حساب تھا۔ ادھر وہ دماغ کو پر کرتی تھی اور ادھر وہ خالی ہو جاتا تھا۔ بہت دیر تک وہ بید کی کرسی پر بیٹھی رہی۔ سوچ بچار کے بعد بھی جب اس کو اپنا دل پرچانے کا کوئی طریقہ نہ ملا تو اس نے اپنے خارش زدہ کتے کو گود میں اٹھایا اور ساگوان کے چوڑے پلنگ پر اسے اپنے پہلو میں لٹا کر سو گئی۔'

کون ہے جو یہ تصویریں دیکھ کر لذت حاصل کرنے کے واسطے ان ویشیاؤں کے کوٹھے پر جائے گا! میری سلطانہ اور سوگندھی تنہائی میں دیکھنے والی تصویریں نہیں ہیں جن کے اشتہار آئے دن اخباروں میں چھپتے رہتے ہیں وہ کوئی نیا جوڑ دار آسن پیش نہیں کرتیں۔ وہ امساک کا کوئی خاندانی نسخہ نہیں بتاتیں۔ وہ کوئی لچھے دار آپ بیتی نہیں سناتیں کہ شہوانی جذبات ابھر آئیں۔ میرا زیر بحث افسانہ 'کالی شلوار' اگر آپ غور سے پڑھیں تو ذیل کی باتیں آپ کے ذہن میں آئیں گی:

(۱) سلطانہ ایک معمولی ویشیا ہے۔ پہلے انبالے میں پیشہ کرتی تھی۔ بعد میں دوست خدا بخش کے کہنے پر دہلی چلی آئی۔ یہاں اس کا کاروبار نہ چلا۔ (۲) خدا بخش خدا پر ناجائز بھروسہ کرنے اور فقیروں کی کرامات پر ایمان لانے والا آدمی تھا۔ (۳) سلطانہ کا کاروبار نہ چلا تو وہ بہت افسردہ ہوئی۔ اس کی افسردگی میں اور اضافہ ہو گیا جب خدا بخش فقیروں کے پیچھے مارا مارا پھرنے لگا۔ (۴) محرم سر پر آ گیا۔ سلطانہ کی دوسری سہیلیوں نے کالے کپڑے بنوا لیے مگر وہ نہ بنوا سکی۔ اس لیے کہ اس کے پاس کچھ نہیں تھا۔ (۵) اس موقع پر شنکر آتا ہے۔ ایک آوارہ گرد، ذہانت، حاضر جوابی اور خوش گفتاری کے

علاوہ جس کے پاس کچھ بھی نہیں تھا۔ وہ سلطانہ کے پاس آتا ہے اور اپنی ان خوبیوں کے معاوضے میں اس سے جنس طلب کرتا ہے جسے وہ دام لے کر فروخت کرتی ہے۔ سلطانہ یہ سودا قبول نہیں کرتی۔ (۶) دوسری مرتبہ شنکر خود نہیں آتا بلکہ اداس سلطانہ اسے خود بلاتی ہے اور اسے اپنے ٹھہرے پانی ایسی زندگی میں ایک حادثے کے طور پر قبول کر لیتی ہے۔ اس سے مل کر وہ خوش ہوتی ہے مگر یہ احساس اس کا پیچھا نہیں چھوڑتا کہ محرّم کے لیے اس کے پاس ایک کالی شلوار کی کمی ہے۔ وہ شنکر سے کہتی ہے: 'محرم آرہا ہے۔ میرے پاس اتنے پیسے نہیں کہ میں کالی شلوار بنا سکوں۔ یہاں کے سارے دکھڑے تو تم مجھ سے سن ہی چکے ہو۔ قمیض اور دوپٹہ میرے پاس موجود تھا جو میں نے آج رنگوانے کے لیے دے دیا ہے'۔ (۷) شنکر محرم کی پہلی تاریخ کو ایک کالی شلوار سلطانہ کے لیے لے آتا ہے...... خدا بخش کا خدا اور خدا رسیدہ بزرگوں پر غیر ضروری اعتقاد کام نہیں آتا۔ لیکن شنکر کی ذہانت کام آجاتی ہے۔

یہ افسانہ پڑھ کر دل و دماغ پر کیا اثر ہوتا ہے! کیا اس کا پلاٹ یا اس کا انداز بیان لوگوں کو ویشیاؤں کی طرف کھینچتا ہے؟ میں اس کے جواب میں کہوں گا، 'ہرگز نہیں' اس لئے کہ یہ اس مقصد کے لئے نہیں لکھا گیا۔ اگر اس کو پڑھ کر ایسا تاثر پیدا نہیں ہوا تو یہ اخلاقیات سے گرا ہوا نہیں ہے۔ اگر یہ اخلاقیات سے گرا ہوا نہیں تو یہ افسانہ ایسا گیت نہیں جسے حظ اٹھانے کی خاطر لوگ گائیں اور بار بار گائیں۔ کوئی گراموفون کمپنی اس کے ریکارڈ نہیں بھرے گی۔ اس لئے کہ اس میں جذبات ابھارنے والے دادرے ٹھمریاں نہیں ہیں۔

'کالی شلوار' جیسے افسانے تفریح کی خاطر نہیں لکھے جاتے۔ ان کو پڑھ کر شہوانی جذبات کی رال نہیں ٹپکنے لگتی۔ اس کو لکھ کر میں کسی شرمناک فعل کا مرتکب نہیں ہوا۔ مجھے فخر ہے کہ میں اس کا مصنف ہوں۔ میں شکر کرتا ہوں کہ میں نے کوئی ایسی مثنوی نہیں لکھی جس کے اشعار میں آپ کے خدمت میں نمونے کے طور پر پیش کرتا ہوں:

ہاتھا پائی سے ہانپتے جانا کھلتے جانے میں ڈھانپتے جانا
وہ ترا منہ سے منہ بھڑا دینا وہ ترا جیب کا لڑا دینا
وہ ترا پیار سے لپٹ جانا اور دل کھول کے چمٹ جانا
ہولے ہولے پکارنے لگنا ڈھیلے ہاتھوں سے مارنے لگنا
منہ سے کچھ کچھ بڑھے، بکے جانا چھوٹ جانے کے گوں تکے جانا
تھک کے کہنا خدا کے واسطے چھوڑو نیند آئی ہے اب مجھے نہ جھنجھوڑو
وہ ترا ڈھیلے چھوڑنا بے بس وہ تیرا ست ہوکے کہنا 'بس'
بات باقی نہیں رہی اب تو رات باقی نہیں رہی اب تو

کہیں تیری یہ بات نبڑے گی یا یونہی ساری رات نبڑے گی!
مجھ میں باقی کچھ اب تو بات نہیں صبح بھی ہوچکی ہے، رات نہیں
دیکھ اب آگے مار بیٹھوں گی یا کسو کو پکار بیٹھوں گی
آدمی کی جو ریح نکلے گی منہ سے کیونکر نہ چیخ نکلے گی!
کبھی پھر بھی تو کام ہووے گا دیکھو کون ساتھ سووے گا!

(اقتباسات از مثنوی میر درد مطبوعہ انجمن ترقی اردو)

شکر ہے کہ میں نے اپنی پیاس اور بھوکی خواہشات نفسانی کو پرچانے کے لیے ایسے اشعار نہیں لکھے:

لب سے لب مرے ملائے رکھنا   بازو سے وہ سر اٹھائے رکھنا
وہ سینے پہ لیٹ کے ستانا   مطلب کے سخن پہ روٹھ جانا
وہ منہ میں زبان کی لذتیں ہائے   ظاہر حرکت سے رغبتیں ہائے
اپنا جو ہوا کچھ اور ارادہ   جی چاہا کہ اس سے بھی زیادہ
وہ ہاتھ کو رکھ کے جوش انکار   وا کرنے نہ دینا بند شلوار
وہ ہاتھ کو دم بدم جھٹکنا   وہ تکیے پہ سر کو دے پٹکنا
آہستہ لگانی آہ لاتیں   حیلہ کی وہ کیسی کیسی باتیں!
وہ ہاتھ کو زور سے چھڑانا   وہ ہو کے تنگ کاٹ کھانا
وہ نیچے پڑے ہی تلملانا   قابو سے تڑپ کے نکل جانا
وہ چین بجبیں ہو کے کہنا   کن بے کسیوں سے رو کے کہنا
ہے تم کو یہی شغل دن رات   اچھی نہیں لگتی مجھ کو یہ بات
بھرتا ہی نہیں ہے تیرا جی بس   کرتا ہی نہیں ہے تو کبھی بس

(کلیات مومن۔ مثنوی دوئم۔ مطبوعہ نول کشور لکھنؤ)

عورت اور مرد کے جنسی رشتے کے متعلق اگر اس انداز میں کچھ کہا جائے تو میں اسے معیوب نہیں سمجھوں گا اس لیے کہ یہ ہر بالغ آدمی کو معلوم ہے۔ تنہائی میں جب مرد اور عورت ایک بستر پر اس غرض کے لئے لیٹتے ہیں تو اسی قسم کی حیوانی حرکات کرتے ہیں۔ لیکن وہ ایسی خوب صورت نہیں ہوتیں جیسا کہ ان اشعار میں ظاہر کی گئی ہیں۔ ان کی حیوانیت کو شاعری کے پردے میں چھپا دیا گیا ہے۔ یہ لکھنے والے کی شرارت ہے جو یقیناً قابلِ گرفت ہے۔

اگر مرد عورت کے اس حیوانی فعل کی فلم بنا کر پردے پر پیش کیا جائے تو مجھے یقین ہے کہ اس کو دیکھ کر تمام سلیم الدماغ آدمی نفرت سے منہ پھیر لیں گے۔ لیکن جو اشعار میں نے اوپر نمونے کے طور پر پیش کیے ہیں وہ اس حیوانی فعل کی ایک غلط تصویر پیش کرتے ہیں۔ ایسی شاعری ’دماغی جلق‘ ہے۔ لکھنے اور پڑھنے والوں دونوں کے لیے میں اسے مضر سمجھتا ہوں۔ میرے افسانے ’کالی شلوار‘ میں ایسا کوئی عیب نہیں ہے۔ میں نے اس میں کہیں بھی مرد اور عورت کے جنسی ملاپ کو لذیذ انداز میں بیان نہیں کیا۔ میری سلطانہ سے جو اپنے گاہک گوروں کو اپنی زبان میں گالیاں دیا کرتی تھی، اور ان کو الو کے پٹھے سمجھتی تھی، کس قسم کی لذت یا کس قسم کی حظ کی توقع کی جا سکتی ہے! وہ ایک دکان دار تھی۔ ٹھیٹ قسم کی دکان دار اگر ہم شراب کی دکان پر شراب کی بوتل لینے جائیں تو یہ توقع نہیں کریں گے کہ وہ عمر خیام بنا بیٹھا ہوگا، یا اس کو حافظ کا سارا دیوان از بر یاد ہوگا۔ شراب کے ٹھیکے دار شراب بیچتے ہیں، عمر خیام کی رباعیاں اور حافظ شیرازی کے شعر نہیں بیچتے۔

میری سلطانہ عورت بعد میں ہے، ویشیا سب سے پہلے ہے۔ کیوں کہ انسان کی زندگی میں اس کا پیٹ سب سے زیادہ اہم ہے۔ شنکر اس سے پوچھتا ہے: ’تم بھی کچھ نہ کچھ ضرور کرتی ہوگی؟‘ سلطانہ جواب دیتی ہے: ’جھک مارتی ہوں‘ وہ یہ نہیں کہتی کہ میں گندم کا بیوپار کرتی ہوں یا سونے چاندی کی تجارت کرتی ہوں۔ اسے معلوم ہے کہ وہ کیا کرتی ہے۔ اگر کسی ٹائپسٹ سے پوچھا جائے کہ تم کیا کرتے ہو تو وہ یہی جواب دے گا، ’ٹائپ کرتا ہوں‘۔ میری سلطانہ اور ایک ٹائپسٹ میں کیا فرق ہے، غور کیجیے!

ماخذ (اُردو ـ ۳۶)

’دھواں‘ اور ’کالی شلوار‘ کے بارے میں

سعادت حسن منٹو

میں ساقی بک ڈپو دہلی کی مطبوعہ کتاب بعنوان ’دھواں‘ کا مصنف ہوں۔ یہ کتاب میں نے ۱۹۴۱ء میں جبکہ میں آل انڈیا ریڈیو دہلی میں ملازم تھا، ساقی بک ڈپو کے مالک میاں شاہد احمد صاحب کے پاس غالباً تین یا ساڑھے تین سو روپے میں فروخت کی تھی۔ اس کے جملہ حقوق اشاعت اب ساقی بک ڈپو کے پاس ہیں۔ اس کتاب کے جو نسخے میں نے عدالت میں دیکھے ہیں ان کے ملاحظہ سے پتا چلتا ہے کہ یہ کتاب کا دوسرا ایڈیشن ہے۔ چوبیس افسانوں کے اس مجموعے میں جو انسانی زندگی کے مختلف شعبوں سے متعلق ہیں، دو افسانے بعنوان ’دھواں‘ اور ’کالی شلوار‘ استغاثے کے نزدیک عریاں اور فحش ہیں۔ مجھے اس سے اختلاف ہے کیونکہ یہ دونوں کہانیاں عریاں اور فحش نہیں ہیں۔

کسی ادب پارے کے متعلق ایک روزانہ اخبار کے ایڈیٹر، ایک اشتہار فراہم کرنے والے اور ایک سرکاری مترجم کا فیصلہ صائب نہیں ہوسکتا۔ بہت ممکن ہے کہ یہ تینوں کسی خاص اثر، کسی خاص غرض کے ماتحت اپنی رائے قائم کر رہے ہوں اور پھر یہ بھی ممکن ہے کہ تینوں حضرات ایسی رائے دینے کے اہل ہی نہ ہوں۔ کیونکہ کسی بڑے شاعر کسی بڑے افسانہ نگار کے افسانوں پر صرف وہی آدمی تنقید کرسکتا ہے جو تنقید نگاری کے فن کے تمام عواقب و عواطف سے آگاہ ہو۔

استغاثے نے میرے دو افسانوں پر کوئی بصیرت افروز تنقید نہیں کی۔ صرف اتنا کہہ دینے سے کہ یہ دونوں افسانے فحش ہیں، اس آدمی کی جو روشنی کا خواہشمند ہیں جو اپنے عیوب و محاسن جاننا چاہتا ہے اور ان کی اصلاح کرنا چاہتا ہے، ہرگز ہرگز تسکین نہیں ہوتی۔ میں اگر جواب میں صرف اتنا کہہ کر خاموش ہوجاؤں کہ یہ دونوں افسانے فحش نہیں ہیں تو ظاہر ہے کہ میں اندھیرے میں اور بھی اضافہ کردوں گا۔ مگر میں ایسا نہیں کروں گا اور جہاں تک مجھ سے ہوسکے گا، اپنا مافی الضمیر بیان کرنے کی کوشش کروں گا۔

زبان میں بہت کم لفظ فحش ہوتے ہیں۔ طریق استعمال ہی ایک ایسی چیز ہے جو پاکیزہ سے پاکیزہ الفاظ کو بھی فحش بنادیتا ہے۔ میرا خیال ہے، کوئی بھی چیز فحش نہیں۔ لیکن گھر کی کرسی اور ہانڈی بھی فحش ہوسکتی ہے، اگر ان کو فحش طریقے پر پیش کیا جائے۔ چیزیں فحش بنائی جاتی ہیں، کسی خاص غرض کے ماتحت عورت اور عورت کا رشتہ فحش نہیں، لیکن جب اس رشتے کو چوراسی آسنوں یا جوڑ دار خفیہ تصویروں

میں تبدیل کر دیا جائے اور لوگوں کو ترغیب دی جائے کہ وہ تخلیے میں اس رشتے کو غلط زاویے سے دیکھیں تو میں اس فعل کو صرف فحش ہی نہیں بلکہ نہایت گھناؤنا، مکروہ اور غیر صحت مند کہوں گا۔

فحش اور غیر فحش میں تمیز کرنے کے لئے شاید یہ مثال کام دے سکے۔ ایک آرٹ گیلری میں نمائش کے لئے ننگی عورتوں کی بہت سی تصویریں پیش ہوئیں۔ ان میں سے کسی نے بھی جیسا کہ ظاہر ہے، دیکھنے والوں کا اخلاق خراب نہ کیا اور نہ ان کے شہوانی جذبات ہی کو ابھارا۔ البتہ ایک تصویر جس میں عورت کا سارا بدن کپڑوں میں مستور تھا اور ایک خاص حصہ اس ترکیب سے نیم عریاں چھوڑ دیا گیا تھا کہ دیکھنے والوں کے جذبات میں گدگدی سی ہوتی تھی، فحش قرار دی گئی۔ کیوں؟ اس لئے کہ آرٹسٹ کی نیت میں فرق تھا اور اس نے جان بوجھ کر لباس کو کچھ اس طرح اوپر اٹھا دیا تھا کہ دیکھنے والوں کے دل و دماغ میں ہلچل سی مچ جائے اور وہ اپنے تصور سے مدد لے کر اس نیم عریاں حصے کو عریاں دیکھنے کی کوشش کریں۔

بنگال کی وہ ستم رسیدہ عورت جس کے پاس تن ڈھانپنے کو صرف چند چیتھڑے میسر ہیں ہرگز عریاں قرار نہیں دی جا سکتی۔ مگر کسی کلب کی وہ تیتری یقیناً فحش اور عریاں ہے جو نمائش کی خاطر بلاؤز میں سے اپنے پیٹ اور اپنی چھاتیوں کو باہر جھانکنے کی اجازت دیتی ہے۔ تحریر و تقریر میں، شعر و شاعری میں، سنگ سازی و صنم تراشی میں، فحاشی تلاش کرنے کے لئے سب سے پہلے اس کی ترغیب ٹٹولنی چاہئے۔ اگر یہ ترغیب موجود ہے، اگر اس کی نیت کا ایک شائبہ بھی نظر آ رہا ہے تو وہ تحریر، وہ تقریر، وہ شعر، وہ بت، قطعی طور پر فحش ہے۔ اب ہمیں دیکھنا ہے کہ یہ ترغیب 'دھواں' میں موجود ہے یا نہیں۔ آیئے ہم اس افسانے کا تجزیہ کرتے ہیں۔

مسعود ایک کمسن لڑکا ہے غالباً دس بارہ برس کا، اس کے جسم میں جنسی بیداری کی پہلی لہر کس طرح پیدا ہوتی ہے، یہ اس افسانے کا موضوع ہے۔ ایک خاص فضا اور چند خاص چیزوں کا اثر بیان کیا گیا ہے جو مسعود کے جسم میں دھندلے دھندلے خیالات پیدا کرتا ہے، ایسے خیالات جن کا رجحان جنسی بیداری کی طرف ہے۔ یہ بیداری وہ سمجھ نہیں سکتا۔ لیکن نیم شعوری طور پر محسوس ضرور کرتا ہے۔ بے کھال کا بکرا جس میں سے دھواں اٹھتا ہے' سردیوں کا ایک دن جب بادل گھرے ہوتے ہیں اور آدمی سردی کے باوجود ایک میٹھی میٹھی حرارت محسوس کرتا ہے، ہانڈی جس میں سے بھاپ اٹھ رہی ہے، بہن جس کی ٹانگیں وہ دباتا ہے، یہ سب عناصر مل کر مسعود کے بدن میں جنسی بیداری پیدا کرتے ہیں۔ جوانی کی اس پہلی انگڑائی کو وہ غریب سمجھ نہیں سکتا اور انجام کار اپنی ہاکی اسٹک توڑنے کی ناکام سعی کرتا تھک جاتا ہے۔ یہ تھکاوٹ اس بے نام سی چنگاری کو 'اس' کچھ کرنے' کی تحریک کو دبا دیتی ہے۔

'دھواں' میں شروع سے لے آخر تک ایک کیفیت، ایک جذبے، ایک تحریک کا نہایت ہی ہموار نفسیاتی بیان ہے۔ اصل موضوع سے ہٹ کر اس میں دور از کار باتیں نہیں کی گئیں۔ اس میں ہمیں

کہیں بھی ایسی ترغیب نظر آتی جو قارئین کو شہوانی لذتوں کے دائرے میں لے جائے۔ اس لئے کہ افسانے کا موضوع 'شہوت' نہیں ہے۔ استغاثہ اگر ایسا سمجھتا ہے تو یہ اس کی کم نظری ہے۔ خشخاش کے دانے افیم کی گولی بننے تک کافی مرحلے طے کرتے ہیں۔

میں نے اس کہانی میں کوئی سبق نہیں دیا۔ اخلاقیات پر یہ کوئی لیکچر بھی نہیں۔ کیوں کہ میں خود کو نام نہاد ناصح یا معلم اخلاق نہیں سمجھتا۔ البتہ اتنا ضرور سمجھتا ہوں کہ اس لڑکے کو مضطرب کرنے والی چیزیں خارجی تھیں۔ انسان اپنے اندر کوئی برائی لے کر پیدا نہیں ہوتا۔ خوبیاں اور برائیاں اس کے دل و دماغ میں باہر سے داخل ہوتی ہیں۔ بعض ان کی پرورش کرتے ہیں، بعض نہیں کرتے۔ میرے نزدیک قصائیوں کی دکانیں فحش ہیں، کیوں کہ ان میں ننگے گوشت کی بہت بدنما اور کھلے طور پر نمائش کی جاتی ہے۔ میرے نزدیک وہ ماں باپ اپنی اولاد کو جنسی بیداری کا موقعہ دیتے ہیں، جو دن کو بند کمروں میں کئی کئی گھنٹے اپنی بیوی سے سر دبوانے کا بہانہ لگا کر اس سے ہم بستری کرتے ہیں۔

ہندوستان میں بچوں کے اندر بہت کمسنی ہی میں جنسی بیداری پیدا ہو جاتی ہے۔ اس کی وجہ کسی حد تک آپ کو میرے افسانے کے مطالعے سے معلوم ہو سکتی ہے۔ اتنی چھوٹی عمر میں جنسی بیداری کا پیدا ہونا میرے نزدیک بہت ہی بھونڈی چیز ہے یعنی اگر میں کسی چھوٹے بچے کو جنسیات کی طرف راغب دیکھوں تو مجھے کوفت ہوگی۔ میرے صناعانہ جذبات کو صدمہ پہنچے گا۔ افسانہ نگار اس وقت اپنا قلم اٹھاتا ہے، جب اس کے جذبات کو صدمہ پہنچتا ہے۔ مجھے یاد نہیں کیوں کہ بہت عرصہ گذر چکا ہے، لیکن 'دھواں' لکھنے سے پہلے مجھے کوئی منظر، کوئی اشارہ یا کوئی واقعہ دیکھ کر ضرور ایسا صدمہ پہنچا ہوگا جو افسانہ نگار کے قلم کو حرکت بخشتا ہے۔

افسانے کا مطالعہ کرنے سے یہ امر اچھی طرح واضح ہو سکتا ہے کہ میں نے اس بے نام سی لذت میں، جو مسعود کو محسوس ہو رہی تھی، خود کو یا قارئین کو کہیں شریک نہیں کیا۔ یہ ایک اچھے فن کار کے قلم کی خوبی ہے۔ اس افسانے میں سے میں چند سطور پیش کرتا ہوں۔ جن سے افسانہ نگار کے غایت درجہ محتاط ہونے کا پتا چلتا ہے۔ اس نے کہیں بھی مسعود کے دماغ میں شہوانی خیالات کی موجودگی کا ذکر نہیں کیا، ایسی لغزش افسانے کا ستیاناس کر دیتی:

(۱) مسعود کے وزن کے نیچے کلثوم کی چوڑی چکلی کمر میں خفیف سا جھکاؤ پیدا ہوا، جب اس نے پیروں سے دبانا شروع کیا' ٹھیک اسی طرح جس طرح مزدور مٹی گوندھتے ہیں تو کلثوم نے مزا لینے کی خاطر ہولے ہولے ہائے ہائے کرنا شروع کیا۔ (۲) کلثوم کی رانوں میں اکڑی ہوئی مچھلیاں اس کے پیروں کے نیچے دب کر ادھر ادھر پھسلنے لگیں۔ مسعود نے ایک بار اسکول میں تنے ہوئے رسے پر ایک بازی گر کو چلتے دیکھا تھا۔ اس نے سوچا کہ بازی گر کے پیروں کے نیچے تنا ہوا رسا بھی اسی طرح پھسلتا

ہوگا۔ (۳) بکرے کے گرم گرم گوشت کا اسے بار بار خیال آتا تھا۔ ایک دو مرتبہ اس نے سوچا، کلثوم کو اگر ذبح کیا جائے تو کھال اترنے پر کیا اس کے گوشت میں سے دھواں نکلے گا'۔ لیکن ایسی بے ہودہ باتیں سوچنے: پر اس نے اپنے آپ کو مجرم محسوس کیا اور دماغ کو اسی طرح صاف کر دیا، جس طرح وہ سلیٹ کو اسفنج سے صاف کیا کرتا تھا'۔

خط کشیدہ الفاظ اس بات کے ضامن ہیں کہ مسعود کا ذہن کہیں بھی شہوت میں ملوث نہیں ہوا۔ وہ اپنی بہن کی کمر دباتا ہے جس طرح مزدور مٹی گوندھتے ہیں۔ ٹانگیں دباتا ہے تو اس کا خیال بازی گر کی طرف چلا جاتا ہے جس کا تماشا اس نے ایک بار اپنے اسکول میں دیکھا تھا اور جب سوچتا ہے کہ اس کی بہن ذبح کر دی جائے تو کیا اس کے گوشت میں سے دھواں نکلے گا تو فوراً اسے بری بات سمجھ کر اپنے دماغ سے نکال دیتا ہے اور خود کو مجرم سمجھتا ہے۔

خدا جانے استغاثہ اس افسانے کو فحش کیوں کہتا ہے جس میں فحاشی کا شائبہ تک موجود نہیں۔ اگر میں کسی عورت کے سینے کا ذکر کرنا چاہوں گا تو اسے عورت کا سینہ ہی کہوں گا، عورت کی چھاتیوں کو آپ مونگ پھلی، میز یا اُسترہ نہیں کہہ سکتے۔ یوں تو بعض حضرات کے نزدیک عورت کا وجود ہی فحش ہے مگر اس کا کیا علاج ہو سکتا ہے! میں ایسے لوگوں کو بھی جانتا ہوں جن کو بکری کا ایک معصوم بچہ ہی معصیت کی طرف لے جاتا ہے۔ دنیا میں ایسے اشخاص بھی موجود ہیں جو مقدس کتابوں سے شہوانی لذت حاصل کرتے ہیں اور ایسے انسان بھی آپ کو مل جائیں گے، لوہے کی مشینیں جن کے جسم میں شہوت کی حرارت پیدا کر دیتی ہیں۔ مگر لوہے کی ان مشینوں کا جیسا کہ آپ سمجھ سکتے ہیں کوئی قصور نہیں۔ اسی طرح نہ بکری کے معصوم بچے کا اور نہ مقدس کتابوں کا۔ ایک مریض جسم، ایک بیمار ذہن ہی ایسا غلط اثر لے سکتا ہے۔ جو لوگ روحانی، ذہنی اور جسمانی لحاظ سے تندرست ہیں، اصل میں انھی کے لئے شاعر شعر کہتا ہے، افسانہ نگار افسانہ لکھتا ہے اور مصور تصویر بناتا ہے۔

میرے افسانے تندرست اور صحت مند لوگوں کے لئے ہیں۔ نارمل انسانوں کے لئے جو عورت کے سینے کو عورت کا سینہ ہی سمجھتے ہیں اور اس سے زیادہ آگے نہیں بڑھتے۔ جو عورت اور مرد کے رشتے کو استعجاب کی نظر سے نہیں دیکھتے۔ جو کسی ادب پارے کو ایک ہی دفعہ میں نگل نہیں جاتے۔ روٹی کھانے کے متعلق ایک موٹا سا اصول ہے کہ ہر لقمے اچھی طرح چبا کر کھاؤ۔ لعاب دہن میں اسے خوب حل ہونے دو تاکہ معدے پر زیادہ بوجھ نہ پڑے اور اس کی غذائیت برقرار رہے۔ پڑھنے کے لئے بھی یہ اصول ہے کہ ہر لفظ کو، ہر سطر کو، ہر خیال کو اچھی طرح ذہن میں چباؤ۔ اس لعاب کو جو پڑھنے سے تمھارے دماغ میں پیدا ہوگا، اچھی طرح حل کرو تاکہ جو کچھ تم نے پڑھا ہے، اچھی طرح ہضم ہو سکے۔ اگر ہم نے ایسا نہ کیا تو اس کے نتائج برے ہوں گے۔ جس کے لئے تم لکھنے والے کو ذمے دار نہ ٹھہرا سکو گے۔ وہ روٹی

جو اچھی طرح چبا کر نہیں کھائی گئی، تمھاری بدہضمی کی ذمے دار کیسے ہو سکتی ہے!

میں ایک مثال سے اس کی وضاحت کرنا چاہتا ہوں۔ فرانس میں ایک بہت بڑا افسانہ نگار موپساں گزرا ہے، جنسیات اس کا محبوب موضوع تھا۔ بڑے بڑے ڈاکٹروں اور ماہرینِ نفسیات نے اس کے افسانوں کا اپنی علمی کتابوں میں حوالہ دیا ہے۔ اپنے ایک افسانے میں وہ ایک لڑکے اور لڑکی کی داستان بیان کرتا ہے جو بے حد الہڑ تھے۔ پہلی رات کے متعلق دونوں نے سنی سنائی باتوں سے ایک عجیب و غریب تصویر اپنے ذہن میں کھینچ رکھی تھی۔ دونوں اس خیال سے کپکپا رہے تھے کہ خدا معلوم کتنی بڑی لذت ان کو پہلی رات کے ملاپ سے ملے گی۔ دونوں کی شادی ہوگئی۔ دولہا ماہ عسل منانے کی خاطر دلہن کو ایک ہوٹل میں لے گیا۔ وہاں پہلی رات کو 'اس رات کو' جس میں دونوں کے خیال میں شاید فرشتے اتر کر ان کو لوریاں دینے والے تھے۔ دولہا اور دلہن ہم بستر ہوگئے۔ دونوں لیٹے تھے اور بس۔ دلہن نے شامتِ اعمال سے اتنا کہہ دیا: 'بس۔ کیا یہی ہماری پہلی رات تھی' جس کے ہم دونوں اتنے شیریں خواب دیکھا کرتے تھے!' دولہا کو یہ بات کھا گئی، آخر مرد ہی تو تھا۔ اس نے سوچا یہ میری مردانگی پر حملہ ہے۔ چناں چہ اس کی مرادنگی بالکل ہی ختم ہوگئی۔ عرق ندامت میں غرق وہ حجرۂ عروسی سے باہر نکل گیا۔ اس غرض سے کہ اپنی زندگی کسی دریا کے سپرد کر دے۔ عین اس وقت جب یہ نیا نویلا دولہا اس خطرناک فیصلے پر پہنچا، فرانس کی ایک کسبی، ویشیا پاس سے گزری جو غالباً گاہک تلاش کر رہی تھی۔ اس عصمت باختہ عورت نے اس کو اشارہ کیا۔ دولہا نے محض انتقام لینے کے لئے، ساری عورت ذات سے بدلہ لینے کے لئے اس کو اشارے کا جواب دیا، کہ ہاں میں تیار ہوں۔ وہ نکھیائی اسے اپنے گھر میں لے گئی۔ اس کے غلیظ گھر میں دولہا وہ کام کرنے میں کامیاب ہوگیا جو وہ اپنے نفیس ہوٹل کے حجرۂ عروسی میں نہ کر سکا تھا۔ اب وہ ویشیا کو بھول گیا۔ دوڑا دوڑا اپنی نئی بیاہتا بیوی کے پاس پہنچا، جیسے اسے اپنی کھوئی ہوئی دولت مل گئی ہو۔ دونوں پاس پاس لیٹے تھے مگر اب اس کی بیوی کو وہ شیریں خواب دیکھنے کی خواہش باقی نہیں تھی جس کا اس نے پہلے گلہ کیا تھا۔

یہ افسانہ پڑھ کر اگر کوئی شخص جو پہلی رات کا ناکام رہا ہو، سیدھا ویشیا کے کوٹھے کا رخ کرے تو میں سمجھتا ہوں اس جیسا چغد اور کوئی نہیں ہوگا۔ میرے ایک دوست نے یہی بے وقوفی کی اور اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اسے اپنا کھویا ہوا وقار تو مل گیا۔ پر اس کے ساتھ ہی ایک مکروہ مرض چمٹ گیا جس کے علاج کے لئے اسے کافی سے زیادہ زحمت اٹھانا پڑی۔

پچھلے دنوں میں نے آل انڈیا ریڈیو بمبئی سے ایک تقریر نشر کی تھی۔ جس میں، میں نے کہا تھا: 'ادب ایک فرد کی اپنی زندگی کی تصویر نہیں۔ جب کوئی ادیب قلم اٹھاتا ہے تو وہ اپنے گھریلو معاملات کا روزنامچہ پیش نہیں کرتا۔ اپنی ذاتی خواہشوں، خوشیوں، رنجشوں، بیماریوں اور تندرستیوں کا ذکر نہیں کرتا۔

اس کی قلمی تصویروں میں بہت ممکن ہے، آنسو اس کی دکھی بہن کے ہوں، مسکراہٹیں آپ کی ہوں' قہقہے ایک خستہ حال مزدور کے۔ اس لئے اپنی مسکراہٹوں، اپنے آنسوؤں اور اپنے قہقہوں کی ترازو میں ان تصویروں کو تولنا بہت بڑی غلطی ہے۔ ہر ادب پارہ ایک خاص فضا، ایک خاص اثر، ایک خاص مقصد کے لئے پیدا ہوتا ہے۔ اگر اس میں یہ خاص فضا، یہ خاص اثر اور یہ خاص مقصد محسوس نہ کیا جائے تو یہ ایک بے جان لاش رہ جائے گی'۔

میں ایک زمانے سے لکھ رہا ہوں۔ گیارہ کتابوں کا مصنف و مؤلف ہوں۔ آل انڈیا ریڈیو کے تقریباً ہر اسٹیشن سے میرے ڈرامے اور فیچر براڈکاسٹ ہوتے رہتے ہیں۔ ان کی تعداد سو سے اوپر ہے۔ میں تحریر و تصنیف کے جملہ آداب سے واقف ہوں۔ میرے قلم سے بے ادبی شاذ و نادر ہو سکتی ہے۔ میں فحش نگار نہیں ہوں۔ افسانہ نگار ہوں۔

دوسرے افسانے 'کالی شلوار' کے متعلق میں نے اس لئے کچھ نہیں کہا کہ وہ لاہور کی سیشن کورٹ میں فحاشی سے بری قرار دیا جا چکا ہے۔

ماخذ (اُردو۔۳۶)

پانچواں مقدمہ

سعادت حسن منٹو

اپنے افسانوں کے سلسلے میں مجھ پر چار مقدمے چل چکے ہیں' پانچواں اب چلا ہے جس کی روداد میں بیان کرنا چاہتا ہوں۔ پہلے چار افسانے جن پر مقدمہ چلا' ان کے نام حسب ذیل ہیں۔ 'کالی شلوار' دھواں' 'بو' ٹھنڈا گوشت' اور پانچواں 'اوپر، نیچے اور درمیان'۔

پہلے تین افسانوں میں تو میری خلاصی ہوگئی۔ 'کالی شلوار' کے سلسلے میں تو مجھے دلی سے دو تین بار لاہور آنا پڑا' دھواں' اور 'بو' نے مجھے بہت تنگ کیا' اس لئے کہ مجھے بمبئی سے لاہور آنا پڑتا تھا لیکن 'ٹھنڈا گوشت' کا مقدمہ سب سے بازی لے گیا۔ اس نے میرا بھرکس نکال دیا۔ یہ مقدمہ گو یہاں پاکستان ہی میں ہوا، مگر عدالتوں کے چکر کچھ ایسے تھے جو مجھ ایسا حساس آدمی برداشت نہیں کر سکتا تھا' کہ عدالت ایسی جگہ ہے جہاں ہر توہین برداشت کرنا پڑتی ہے۔ خدا کرے' کسی کو جس کا نام 'عدالت' ہے سے واسطہ نہ پڑے...... ان لوگوں نے میرے ساتھ ہمیشہ ایسا سلوک کیا جو گھٹیا قسم کے اخلاقی ملزموں سے کیا جاتا ہے۔ پچھلے دنوں جب کراچی کے پرچے 'پیام مشرق' نے میری اجازت کے بغیر میرا مضمون 'اوپر' نیچے اور درمیان' لاہور کے اخبار 'احسان' سے نقل کیا تو کراچی کی حکومت نے میرا وارنٹ جاری کر دیا۔ میں گھر پر نہیں تھا۔ پولیس کے دو سب انسپکٹر' چار سپاہیوں کے ساتھ آئے اور میرے گھر کا محاصرہ کر لیا۔ میری بیوی نے ان سے کہا کہ منٹو باہر گیا ہے۔ اگر آپ چاہیں تو میں اسے بلا لیتی ہوں...... وہ مصر تھے کہ منٹو گھر ہی میں ہے اور میری بیوی جھوٹ بول رہی ہے۔

جب پولیس آئی تھی میں اس وقت چوہدری نذیر احمد کی دکان 'نیا ادارہ' میں جو 'سویرا' کا دفتر بھی ہے' بیٹھا تھا اور میں نے ایک افسانہ لکھنا شروع کیا تھا۔ اس افسانے کی میں نے بمشکل دس سطریں لکھی ہوں گی کہ چوہدری رشید احمد صاحب جو چوہدری نذیر احمد کے چھوٹے بھائی ہیں اور 'مکتبہ جدید' کے مالک ہیں۔ تشریف لائے۔ انھوں نے کچھ توقف کے بعد پوچھا: 'یہ آپ کیا لکھ رہے ہیں!' میں نے جواب دیا: 'ایک افسانہ شروع کیا ہے...... اور یہ بہت لمبا ہوگا'۔ چوہدری رشید صاحب نے بڑے تشویش ناک لہجے میں کہا: 'میں آپ کو ایک بری خبر سنانے آیا ہوں'۔ ظاہر ہے کہ میرا ردِعمل کیا ہوگا۔ چند منٹ تو میں سوچتا رہا کہ 'بہت بری خبر' کیا ہو سکتی ہے۔ کئی خیال دماغ میں آئے۔ میں 'اوپر' نیچے اور درمیان، ہوتا

رہا مگر کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ آخر میں نے چودہری رشید صاحب سے پوچھا کہ بھائی، قصہ کیا ہے! انھوں نے کہا: قصہ یہ ہے کہ پولیس آپ کے گھر کے دروازے کے باہر کھڑی ہے۔ وہ مصر ہے کہ آپ گھر میں موجود ہیں، اس لئے وہ زبردستی اندر داخل ہونے کی کوشش کر رہی ہے۔‘

میرے پاس احمد راہی اور حمید اختر بیٹھے تھے۔ جب انھوں نے یہ سنا تو وہ بہت مضطرب ہوئے۔ چناں چہ وہ بھی میرے ساتھ ہو لیے۔ ہم نے تانگہ لیا اور گھر روانہ ہو گئے۔ جب وہاں پہنچے تو دیکھا کہ فلیٹ کے دروازے کے پاس پولیس کھڑی ہے۔ میرا بھانجا (حامد جلال) اور برادر نسبتی (ظہیر الدین) اپنی موٹروں کے پاس کھڑے پولیس والوں سے محو گفتگو تھے اور ان سے کہہ رہے تھے کہ اگر آپ تلاشی لینا چاہتے ہیں تو لے سکتے ہیں۔ آپ یقین مانیے کہ منٹو گھر میں نہیں ہے۔ وہ یہ باتیں کر ہی رہے تھے کہ میں، احمد راہی اور حمید اختر تانگے میں گھر پہنچ گئے۔ میں نے راستے میں چودہری رشید صاحب سے کہہ دیا تھا کہ وہ مختلف اخباروں کو ٹیلی فون کر دیں تاکہ دوسرے روز جو کچھ میرے ساتھ گزرے، اخباروں میں چھپ جائے۔ میں حمید اختر اور احمد راہی جب گھر پہنچے تو دیکھا کہ عبداللہ ملک کھڑا پولیس کے افسروں سے گفتگو میں مصروف ہے۔ عبداللہ ملک کمیونسٹ ہے۔ اس کی تحریر ہمیشہ سرخ ہوتی ہے حالاں کہ میں نے اس میں کبھی وہ سرخی نہیں دیکھی جو اصل سرخی ہے۔ عبداللہ کمیونسٹ میرے مکان کے باہر کھڑا تھا اور سب انسپکٹروں اور سپاہیوں سے گفتگو کر رہا تھا کہ میں، احمد راہی اور حمید اختر تانگے میں پہنچے۔

سب انسپکٹروں اور سپاہیوں نے میری بیوی اور میری بہن کو یہ دھمکی دی تھی کہ وہ تلاشی لینا چاہتے ہیں اور اگر دروازے نہ کھولے گئے تو وہ زبردستی اندر گھس آئیں گے۔ میں جب پہنچا اور باہر کمپاؤنڈ میں ان پولیس افسروں سے ملاقات ہوئی تو میرا خیال ہے کہ انھیں بقدر کفایت ندامت ہوئی...... میں نے انھیں اندر مکان میں تشریف لانے کے لیے کہا۔ یہ دعوت انھوں نے قبول فرمائی اور اندر تشریف لے آئے۔ مجھے بڑی حیرت ہوئی، میں کوئی خفیہ فروش نہیں ہوں۔ افیون نہیں بیچتا، شراب کا غیر قانونی کاروبار نہیں کرتا۔ میرے پاس کوکین بھی نہیں ہے، پھر یہ پولیس والے جو کراچی سے وارنٹ لے کر آئے ہیں، میری خانہ تلاشی کیوں لے رہے ہیں!

پولیس افسر جب اندر تشریف لائے تو انھوں نے مجھ سے پہلے یہ سوال کیا کہ تمھاری لائبریری کہاں ہے؟ میں ان سے کیا کہتا! میری لائبریری یہاں پاکستان میں چند کتابوں پر مشتمل ہے۔ ان میں تین ڈکشنریاں یا لغت ہیں۔ میں نے ان سے عرض کی: ’میری جتنی کتابیں تھیں، وہ تو بمبئی میں رہ گئیں۔ آپ کو اگر کسی پرچے یا پرزے کی تلاش ہے تو آپ بمبئی تشریف لے جائیں۔ ایڈریس حاضر ہے۔‘ وہ افسر ایسے بدذوق تھے کہ انھوں نے اس بذلہ سنجی کی داد نہ دی اور میری خانہ تلاشی شروع کر دی...... خانہ، میخانہ

نہیں۔ بیئر کی آٹھ دس خالی بوتلیں ضرور تھیں لیکن پولیس افسروں نے ان کو دیکھنے کی زحمت نہ کی۔ الماریوں میں چینی کے پیالے تھے۔ ایک تپائی پر چھوٹا سا بکس تھا جس میں کچھ کاغذات تھے …… پولیس افسروں نے ایک ایک پرزہ دیکھا۔ اخباروں کے تراشے تھے، وہ انھوں نے اپنے قبضے میں لے لیے۔ اس کے بعد میں نے ان افسروں سے کہا کہ اب براہ کرم تلاشی کے وارنٹ جو دارالحکومت کراچی سے آئے ہیں، مجھے دکھا دیجیے، مگر انھوں نے انکار کر دیا۔

وارنٹ کا کاغذ ایک حوالدار کے ہاتھ میں تھا، اس نے مجھے دور سے دکھاتے ہوئے کہا: 'یہ ہے……' میں نے اس سے پوچھا: 'یہ کیا ہے؟' اس نے جواب دیا: 'یہ وہی چیز ہے جس کے ذریعے ہم یہاں پہنچے ہیں۔' جب میں نے اصرار کیا کہ میں یہ کاغذ دیکھے بغیر نہیں ٹلوں گا تو انھوں نے وارنٹ کا کاغذ دونوں ہاتھوں میں مضبوطی سے پکڑے رکھا اور کہنے لگے: 'آپ پڑھ لیجیے'۔ میں نے سرسری طور پر پڑھا تو مجھے معلوم ہوا کہ خانہ تلاشی کے علاوہ یہ کاغذ میری گرفتاری کا وارنٹ بھی ہے۔ اب ضمانت کا مرحلہ درپیش آیا۔ پولیس افسر کچھ اتنے خودسر تھے کہ انھوں نے کسی کی ضمانت قبول نہ کی۔ میرا بھانجا گیزیٹیڈ افسر، میرا برادر نسبتی، وہ بھی گیزیٹیڈ افسر مگر پولیس والوں نے ان کی ضمانت قبول نہ کی۔ ان سے یہ کہہ کر کہ آپ حکومت کے ملازم ہیں، ہو سکتا ہے کہ آپ کل برطرف کر دیے جائیں۔

قصہ مختصر یہ ہے کہ میں نے دو مرتبہ اپنی علالت کے باعث کراچی کی عدالت کو معذرت نامہ معہ ڈاکٹری سرٹیفکیٹ پیش کیا کہ میں حاضر عدالت نہیں ہو سکتا۔ لیکن بکرے کی ماں کب تک خیر منائے گی۔ مجھے بالآخر کراچی جانا ہی پڑا۔ ایک دلچسپ لطیفہ: یہاں جب آخری وارنٹ آئے تو ضمانت دینے کے لئے گھر میں کوئی موجود نہیں تھا۔ میں اپنے دوستوں کے پاس گیا مگر ان میں سے کوئی بھی نہ ملا …… آخر محمد طفیل صاحب کے پاس گیا۔ وہ بڑے شریف آدمی ہیں، میرے ساتھ بادل ناخواستہ ہو لئے۔ ضمانت ہو گئی، اس لئے کہ ان کا ایک ادبی ادارہ ہے (وہ 'نقوش' کے مالک بھی ہیں اور مدیر بھی) اور ان کی دکان میں جتنی کتابیں ہیں، وہ اس کی ضمانت ہیں کہ وہ پانچ ہزار روپے کی ضمانت دے سکتے ہیں۔

ایک اور لطیفہ سنیے۔ طفیل صاحب نے ضمانت تو دے دی مگر انھیں یہ خطرہ پیدا ہو گیا کہ شاید میں تاریخ مقررہ پر حاضر عدالت نہیں ہوں گا۔ خدا گواہ ہے کہ میرے پاس زہر کھانے کو بھی ایک پیسہ نہ تھا…… طفیل صاحب صبح پانچ بجے میرے غریب خانے پر تشریف لائے۔ ان کی جیب میں سیکنڈ کلاس کے دو ٹکٹ تھے…… تانگے کا خرچ بھی انھوں نے دیا۔ اسٹیشن تک چھوڑنے گئے اور جب تک گاڑی کراچی روانہ نہ ہوئی، وہ میرے ساتھ رہے…… میرے ساتھ انھوں نے میرا ایک دوست نصیر انور کر دیا تھا، تاکہ میں کراچی یقینی طور پر پہنچ جاؤں۔ کراچی میں جو کچھ مجھ پر بیتی۔ اس کا حال آپ کو پھر کبھی سناؤں گا، اس لئے کہ سخت بیمار ہوں۔

پانچواں مقدمہ 'نقوش' کے کسی پچھلے شمارے میں (شمارہ: ۳۰-۲۹، فروری ۱۹۵۳ء) اس عنوان سے میں نے ایک مضمون لکھنا شروع کیا تھا لیکن مکمل نہ کر سکا تھا، اس لئے کہ میں سخت بیمار تھا...... بیمار تو اب بھی ہوں، اور میرا خیال ہے کہ سدا بیمار رہوں گا، بعض احباب کہتے ہیں کہ تمھاری یہ بیماری ہی سب کچھ ہے، یعنی میری مضمون نگاری اور افسانہ نویسی۔ طفیل صاحب جو اس پرچے کے مالک اور ایڈیٹر ہیں، انھوں نے میرے متعلق ایک مضمون بھی 'منٹو صاحب' کے عنوان سے لکھا ہے۔ اس مضمون پر برادر احمد ندیم قاسمی نے جو بدقسمتی سے 'امروز' کے قائم مقام ایڈیٹر مقرر ہو گئے ہیں، درج ذیل تبصرہ کیا ہے، 'نقاد' کے نام سے۔ محمد طفیل صاحب 'منٹو صاحب' شخصی اور بہت حد تک نجی حیثیت رکھتا ہے، اور ہمارے خیال میں طفیل صاحب کو ان 'راز ہائے درون پردہ' کو درون پردہ ہی رکھنا چاہیے تھا جو منٹو صاحب کے اور ان کے مراسم سے متعلق ہیں۔ ناشر اور ادیب نیز ایڈیٹر اور ادیب کے تعلقات کا یوں سر بازار اعلان ہونے لگے تو نہ ناشروں کو کہیں ٹھکانہ ملے گا اور نہ ادیبوں کو۔ کمزوریاں اور خامیاں کس میں نہیں ہوتیں، لیکن اُن کو چھاپے کے حوالے کر دینا کم از کم ہماری نظر میں حدِ اعتدال سے تجاوز کرنا ہے۔ یہ درست ہے کہ ادیبوں اور فن کاروں کی ننھی ننھی خامیوں پر سے نقاب کشائی ان کی شخصیت کو زیادہ اجاگر کرنے میں مدد دیتی ہے، مگر ایسی نقاب کشائی بھی کیا کہ دوسرا آدمی نکو بن کر رہ جائے...... مضمون کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ طفیل صاحب کی نیت بری نہیں، جذبات کی رو میں آ کر وہ چند باتیں ایسی کہہ گئے ہیں جو نہ کہی جاتیں یا یوں نہ کہی جاتیں تو بہتر تھا۔ میں نے اس تبصرے سے پہلے طفیل صاحب کو یہ خط لکھا تھا:

برادرم، السلام علیکم۔

کل رات مجھے صفیہ نے بتایا کہ آپ نے مجھ پر 'نقوش' میں مضمون لکھا ہے...... زیادہ پینے کی وجہ سے مجھے ٹھیک پڑھا نہیں جا رہا تھا، چوں کہ صفیہ کو مضمون بہت پسند تھا، اس لئے اس نے میرے کہنے پر اِدھر اُدھر سے سنایا جو مجھے قطعاً پسند نہ آیا۔ یہی سبب ہے کہ میں نے آپ کو آدھی درجن کے قریب گالیاں دیں، اور اس کے بعد مجھے نیند آ گئی۔

صبح اٹھ کر اپنی آنکھوں سے مضمون پڑھا تو مجھے پسند آ گیا...... آپ نے جو کچھ لکھا ہے، اس سے مجھے انکار نہیں: اپنی کمزوریوں کے باوجود (میں) بہت خوش ہوں کہ آپ نے جو کچھ لکھا ہے، اس میں ہچکچاہٹ کا شائبہ تک نہیں، جو کچھ میں ہوں، وہ اس مضمون میں موجود ہے، بلکہ وافر مقدار میں موجود ہے...... اس (مضمون) میں بعض باتیں ایسی (موجود) ہیں جو مجھ میں موجود تھیں مگر میرے لئے محسوس کی حد سے باہر تھیں۔

خاکسار
سعادت حسن منٹو

میں اب اس (مضمون) کے متعلق کچھ اور کہنا نہیں چاہتا جو حقیقت ہے' اس سے مجھے کبھی کار نہیں ہوگا' میں اگر شراب پیتا ہوں تو میں اس سے کیوں انکار کروں' میں نے اگر کسی سے ادھار لیا ہے تو مجھے اس سے بھی انکار نہیں ہونا چاہئے' اگر مجھے دنیا اس لحاظ سے برا سمجھتی ہے تو سمجھا کرے میں اگر نیا کی ایسی باتوں کے متعلق ہی سوچتا رہتا تو میرا خیال ہے کہ سو سے زیادہ افسانوں کا مصنف نہ ہوتا۔ صاحب نقد و بصر (احمد ندیم قاسمی) فرماتے ہیں: 'یہ درست ہے کہ ادیبوں اور فنکاروں کی ننھی ننھی خامیوں پر سے' نقاب کشائی ان کی شخصیت کو زیادہ اجاگر کرنے میں مدد دیتی ہے' مگر ایسی نقاب کشائی بھی کیا کہ دوسرا آدمی نکو بن کر رہ جائے'...... مجھے معلوم نہیں کہ طفیل صاحب کے مضمون کے بعد میں نکو بن کے رہ گیا ہوں یا نہیں' اس کا فیصلہ ہوتا رہے گا۔

مجھے طفیل صاحب کے اس مضمون کے متعلق صرف اتنا عرض کرنا ہے کہ انھوں نے اپنے بیمار بھائی کے دوادارو کو محض اس لئے پس پشت رکھا اور میری مدد فرمائی کہ انھیں اپنے بزرگوں کا قول یاد آ گیا تھا کہ کسی کی ضمانت ہرگز نہیں دینی چاہیئے' جس کا مجھے بہت افسوس ہے: اگر مجھے ان کی اس کمزوری کا علم ہوتا تو میں عدالت میں حاضر نہ ہوتا' وہ گرفتار ہوتے اور جب وہ کسی ضامن کو تلاش کرتے تو میں ان سے کہتا کہ بزرگوں کی اس نصیحت کو پیش نظر رکھئے جس کو آپ محض مروت کی خاطر بھول گئے۔ ضمانت کو چھوڑیئے اور چلئے میرے ساتھ جی میں......

جیسا کہ آپ نے اس مضمون کی پہلی قسط میں پڑھا ہوگا' یہ میرے پانچویں مقدمے کی روداد ہے۔ میں اور میرا دوست نصیر انور اسٹیشن پہنچے' ٹکٹ طفیل صاحب نے لے ہی دیے تھے مگر اب سوال یہ تھا کہ جگہ کیسے ملے...... (پھر) ہمارے پاس بیئر کی بوتلیں (بھی) تھیں اور گاڑی میں ان کے لئے جگہ نہ تھی۔ مجھے معا یاد آیا کہ میرا ایک ہم جماعت یعقوب توفیق لاہور اسٹیشن پر اسسٹنٹ اسٹیشن ماسٹر ہے' اتفاق کی بات ہے کہ وہ اس وقت ڈیوٹی پر تھے' میں ان سے ملا تو انھوں نے فورا سیٹوں کا بندوبست کر دیا...... چناں چہ ہم کراچی روانہ ہو گئے۔ جس ڈبے میں ہمیں جگہ دی گئی (تھی)' اس میں ایک مولوی صاحب بھی سوار تھے۔ وہ تسبیح کے دانے پھیر رہے تھے۔ میں نے سوچا کہ یہ تو وبال جان ہو جائیں گے۔ چناں چہ (مجھے) ایک ترکیب سوجھی۔ میں نے نصیر انور سے کہا کہ بھئی ایک بیئر کی بوتل تو کھولو۔ اس نے فورا سیٹ کے نیچے سے ایک بوتل نکالی اور کھول کر میرے حوالے کر دی۔ مولوی صاحب اپنی تسبیح کے دانے پھیرتے ہوئے دوسرے اسٹیشن پر اتر گئے۔ مجھے یہاں ایک اور لطیفہ یاد آ گیا ہے۔ لاہور اسٹیشن پر ہمارے کمپارٹمنٹ میں ایک صاحب اپنی اہلیہ کے ساتھ تشریف لائے...... صاحب کو تو خیر میں اور نصیر برداشت کر لیتے' مگر صاحبہ کو برداشت کرنا بہت مشکل تھا' اصل میں وہ ہمیں برداشت نہ کر سکتی تھیں......

چناں چہ جب وہ دونوں کمپارٹمنٹ میں داخل ہوئے تو میں نے صاحب سے کہا: دیکھیے حضرت، ہم شرابی آدمی ہیں۔ بیئر کی پندرہ بوتلیں ہمارے پاس ہیں۔ ہم پئیں گے اور واہی تباہی بکیں گے، آپ شریف آدمی ہیں اور غالباً اپنی بیوی کے ساتھ ہیں، اس لیے بہتر ہے کہ آپ کسی اور کمپارٹمنٹ میں جگہ تلاش کرلیں۔ اب کہ یہ مضمون لکھ رہا ہوں تو مجھے طفیل صاحب بتاتے ہیں کہ ان صاحب نے جو اپنی برقع پوش اہلیہ کے ہم راہ تھے، اسٹیشن ماسٹر سے کہا فلاں فلاں ڈبے میں انھیں جگہ دی گئی ہے، دو بدمعاش بیٹھے ہیں۔ اسٹیشن ماسٹر نے تعجب کا اظہار کیا اور کہا کہ اس ڈبے میں تو سعادت حسن منٹو ہے جو کہ بے حد شریف آدمی ہے، مگر ان صاحب نے کہا: 'جی نہیں، اس نے مجھ سے خود کہا ہے کہ وہ شرابی ہے'۔ بہر حال بلا ٹل گئی، وہ یوں ان صاحب کو کسی اور کمپارٹمنٹ میں جگہ دے دی گئی اور ہم نچنت ہوگئے۔ لاہور سے کراچی تک کا سفر نہایت ذلیل ہے، سیکنڈ کلاس میں بھی اتنی گرد آتی ہے، الاماں۔ بہر حال سفر بیئر کی بوتلوں کی بدولت کٹ ہی گیا۔ میرا خیال تھا کہ کسی ہوٹل میں ٹھہرا جائے، مگر جیب اجازت نہ دیتی تھی...... میں نے فیصلہ کیا کہ خواجہ نصیرالدین کے ہاں ٹھہرا جائے، اس لیے بھی کہ بیوی نے تاکید کی تھی: 'دیکھو، میرے بھائی کے پاس جانا'۔ میں نے سوچا، ساری خدائی ایک طرف، جورو کا بھائی ایک طرف میں نے ساری خدائی کو ایک طرف کیا اور جورو کے بھائی کے پاس چلا گیا۔

خواجہ نصیرالدین بڑا شریف آدمی ہے، ماشا اللہ اچھی ملازمت پر ہے، معقول تنخواہ ملتی ہے، بہت بڑے فلیٹ میں رہتا ہے۔ اس نے ہماری بڑی آؤ بھگت کی۔ اتفاق سے اس کے ساتھ والا فلیٹ خالی تھا، وہ مجھے اور نصیر انور کو دے دیا گیا۔ مجھے کوئی خواہش نہیں تھی کہ میں وہاں کراچی میں زیادہ دن رہوں، اس لئے کہ بمبئی میں پندرہ برس رہنے کے بعد کراچی میں کوئی کشش نظر نہیں آتی تھی۔ دوسرے دن ہم مجسٹریٹ صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ معمولی سی عمارت تھی۔ ایک چھوٹا سا کمرہ تھا جس میں اڈیشنل ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ تشریف فرما تھے۔ مجھ پر لاہور میں کئی مقدمے چل چکے تھے، میں ضلع کچہری کے آداب سے واقف تھا یعنی (وہ جگہ) جہاں ادب آداب کا کوئی واسطہ نہیں۔ میں مجسٹریٹ صاحب کے حضور سر تا پا بندگی بن کے کھڑا ہوگیا۔ انھوں نے میری طرف دیکھا اور پوچھا: 'آپ کیا چاہتے ہیں؟'

مجسٹریٹ صاحب کے لہجے کی ملائمی میرے لئے بڑی تعجب خیز تھی۔ میں نے عرض کی۔ 'جناب میرا نام سعادت حسن منٹو ہے۔ آج آپ نے مجھے میرے مضمون 'اُوپر، نیچے اور درمیان' کے سلسلے میں فحش نگاری کی دفعہ ۲۹۲ کے ماتحت طلب فرمایا ہے'۔ آپ نے مجھے بڑے غور سے دیکھا اور کہا: 'تشریف رکھیے!' میں نے خیال کیا کہ معلوم نہیں، انھوں نے کس سے تشریف رکھنے کو کہا ہے، کیوں کہ لاہرکی عدالتوں میں تو ایسا رواج نہیں۔ میں کھڑا رہا۔ جب مجسٹریٹ صاحب نے دیکھا کہ میں تے

تشریف نہیں رکھی تو انھوں نے دوبارہ کہا: 'تشریف رکھئے منٹو صاحب!' میں ان کی میز کے پار رکھی ہوئی بنچ پر بیٹھ گیا۔ مجسٹریٹ صاحب تھوڑی دیر کے بعد مجھ سے مخاطب ہوئے: 'آپ اتنے دن تشریف کیوں نہیں لائے؟' میں نے عرض کی: 'جناب! میری طبیعت ناساز تھی'۔ مجسٹریٹ صاحب نے فرمایا: 'آپ نے میڈیکل سرٹفکیٹ بھیج دیا ہوتا!' میں نے جھوٹ بولا: 'میں اس قدر بیمار تھا کہ میڈیکل سرٹیفکیٹ بھیجنے کے متعلق سوچ ہی نہیں سکتا تھا۔' مجسٹریٹ صاحب نے میرا جھوٹ سنا اور خاموش رہے۔ پھر کہا: 'آپ کیا چاہتے ہیں؟'

میں سوچنے لگا کہ میں کیا چاہتا ہوں! اصل میں تو میں اپنا چھٹکارا چاہتا تھا۔ مجھے بار بار طفیل صاحب کا خیال آتا تھا جنھوں نے میری ضمانت دی تھی اور بعد میں ان کو میری لاابالی طبیعت کے باعث صبح سویرے سیکنڈ کلاس کے دو ٹکٹوں کے ساتھ آنا پڑا تھا۔ میں نے کچھ دیر سوچا اور مجسٹریٹ صاحب سے کہا: 'مجھے آپ فارغ کر دیجیے' میں جلدی میں واپس جانا چاہتا ہوں۔' آپ نے فرمایا: 'اتنی جلدی تو یہ کام نہیں ہو سکتا۔ میں نے آپ کا مضمون ابھی تک نہیں پڑھا ہے۔ انشاء اللہ آج پڑھ لوں گا اور کل صبح فیصلہ سنا دوں گا'۔

میں نے اور نصیر انور نے ان کو آداب عرض کی اور موٹر سائیکل رکشا میں بیٹھ کر بیئر پینے چلے گئے...... یہ رکشا مجھے کراچی میں بہت پسند آیا' فٹ فٹ کرتی چلتی ہے' گھنٹوں کا فاصلہ منٹوں میں طے ہوتا ہے' اور کرایہ بھی کچھ زیادہ نہیں ہوتا۔ دوسرے روز عدالت میں حاضر ہوئے۔ مجسٹریٹ صاحب نے میرے سلام کا جواب دیا اور فرمایا: 'تشریف رکھئے!' میں نے بنچ پر تشریف رکھ دی۔ آپ نے ایک چھوٹا سا کاغذ نکالا اور فرمایا: 'میں نے فیصلہ لکھ لیا ہے' اس کے بعد انھوں نے ریڈر کی طرف دیکھا اور اس سے کہا: 'آج کیا تاریخ ہے؟' اس نے جواب دیا: 'پچیس' میں ذرا اونچا سنتا ہوں، میرے کان ایک عرصے سے خراب ہیں۔ میں سمجھا کہ مجھے پچیس روپے جرمانہ ہوا ہے، چناں چہ میں نے مجسٹریٹ صاحب سے کہا: 'جناب پچیس روپے جرمانہ' پچیس روپے جرمانے کا یہ مطلب تھا کہ میں اپیل نہیں کر سکتا تھا' اس صورت میں سزا بحال رہتی۔

مجسٹریٹ صاحب نے غالباً مجھے پانچ سو روپے جرمانہ کیا تھا' مگر جب انھوں نے یہ سنا۔ 'پچیس روپے جرمانہ' تو وہ مسکرائے' قلم لیا اور جرمانہ پچیس روپے میں تبدیل کر دیا۔ (یہ صحیح یاد نہیں' میں نے ریڈر سے تاریخ سنتے ہی پچیس روپے جُرمانہ لکھوایا تھا)۔ نصیر انور نے فوراً جیب سے پچیس روپے نکالے اور ادا کر دیئے' اور ساتھ ہی مجھ سے کہا: 'سستے چھوٹے ہو' اپیل وپیل کا جھنجھٹ غلط ہوتا' کب تک یہاں عدالتوں کی ٹھوکریں کھاتے رہتے۔ کیا تمھیں 'ٹھنڈا گوشت' کا مقدمہ یاد نہیں!' میں نے خدا کا شکر ادا کیا اس نے اتنی جلدی میری خلاصی کر دی۔ میں مجسٹریٹ صاحب کو آداب عرض کر کے جانے

والا ہی تھا کہ انھوں نے مجھ سے کہا: 'آپ کب واپس جا رہے ہیں!' میں نے جواب دیا: 'غالباً آج ہی چلا جاؤں گا۔' انھوں نے کہا: 'آج نہ جایئے...... میں آپ سے ملنا چاہتا ہوں۔' مجھے بہت حیرت ہوئی کہ وہ مجھ سے کیوں ملنا چاہتے ہیں! بہرحال میں نے ان سے کہا: 'میں کل تک ٹھہر جاؤں گا۔' انھوں نے مجھ سے پوچھا: 'کل چار بجے آپ سے کہاں ملاقات ہو سکتی ہے!'

میں جن جن باروں میں جا کر بیئر پیتا رہا تھا' میں نے ان کا نام لے دیا وہ پرہیزگار قسم کے آدمی تھے' فیصلہ کافی ہاؤس پر ہوا۔ وقت چار بجے طے ہوا تھا مگر ہم پندرہ منٹ دیر سے پہنچے۔ مجسٹریٹ موجود تھے، آپ سے رسمی سی گفتگو ہوتی رہی۔ تھوڑی دیر کے بعد انہوں نے مجھ سے بڑے پیار سے کہا: 'منٹو صاحب' میں آپ کو اس دور کا بہت بڑا افسانہ نگار مانتا ہوں آپ سے ملنے کا مقصد صرف یہ تھا کہ آپ یہ خیال دل میں لے کر نہ جائیں کہ میں آپ کا مداح نہیں۔' میں سخت متحیر ہوا: آپ میرے مداح ہیں تو جناب آپ نے مجھے جرمانہ کیوں کیا؟' وہ مسکرائے: 'اس کا جواب میں آپ کو ایک برس بعد دوں گا۔ کئی مہینے گزر چکے ہیں' باقی چندرہ گئے ہیں۔ دیکھیے' مجسٹریٹ صاحب جو اپنے وعدے کے پکے معلوم ہوتے ہیں' کیا انکشاف فرماتے ہیں!

ماخذ (اُردو۔۸۴)

غلاظت اُن کے دماغ میں ہے

عصمت چغتائی

آصف فرخی: آپ کی بعض تحریروں کو عریاں کہا گیا ہے۔ اس الزام کے بارے میں آپ کا کیا ردِ عمل ہے!

عصمت: آپ نے کبھی میری لکھی ہوئی کوئی ایسی تحریر پڑھی جو فحش ہو!

آصف: نہیں، کبھی نہیں۔

عصمت: میں نے کبھی کوئی فحش چیز لکھی ہی نہیں۔ بلکہ مجھے تو آج تک کسی نے بھی میری کسی تحریر میں عریانی کی نشان دہی نہیں کی۔ سچ بات تو یہ ہے کہ گندگی خود ایسی باتیں کرنے والوں کے اپنے دماغ میں ہے۔

'لحاف' لکھنے کے بعد میں نے اُسے اپنی ایک جوان العمر عم زاد بہن کو پڑھ کر سنایا۔ اُس کی تو سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ یہ کہانی ایک جیتی جاگتی عورت سے متعلق ہے۔ دوپہر کے وقت کھانا کھانے کے بعد، بچوں کو باہر نکال دیا جاتا اور پھر خواتین گپیں لگاتیں اور شادی کی پہلی راتوں اور بچوں کی پیدائش کے بارے میں باتیں کرتیں۔ انھی باتوں سے مجھے اس کہانی کا اشارہ ملا تھا۔

اُس وقت مجھے سحق کے بارے میں معلوم نہ تھا۔ میں مرد حضرات کی اس طرح کی حرکات کے بارے میں تو کچھ جانتی تھی مگر آخر یہ عورتیں کیا کرتی ہیں! وہ ایک دوسری کو چھونے کے علاوہ کیا کرسکتی ہیں! ۔ وہ بچے تو پیدا نہیں کرسکتیں۔ بہرحال، جب یہ کہانی چھپی تو اُسے عریاں سمجھا گیا اور لاہور کی ایک عدالت نے مجھے طلب کرلیا۔ مگر وہاں کوئی بات ثابت نہیں ہوسکی۔ یوں بھی اس کہانی میں کوئی گندے الفاظ نہیں۔ جو کچھ اُن کو ملا وہ صرف یہ تھا کہ کہانی کی کم سن ہیروئن کے منہ سے ایک جگہ 'اوں' کی آواز نکلتی ہے جس سے انھوں نے یہ اندازہ لگایا کہ وہ ضرور کچھ کر رہی ہوگی۔

یہ بات میری سمجھ میں کبھی نہیں آئی کہ آخر بدن کے کچھ حصوں کے نام ممنوع کیوں قرار دیے گئے ہیں اور ادب میں اُن کا ذکر کیوں نہیں ہوسکتا۔ پرانے لکھنے والے تو اس سلسلے میں بڑے صاف گو تھے۔ نظیر اکبرآبادی نے تو سیکس (جنس) کے بارے میں بڑے مزے لے لے کر لکھا ہے۔ پھر ہم پر یہ پابندیاں کیوں لگائی جارہی ہیں! اور یہ بھی تو دیکھیں کہ جن لوگوں نے میری تحریروں کو گندہ کہا، انھوں نے انھی گندی تحریروں کو چھاپ کر بڑے پیسے بھی کمائے۔ وہ جو میری تحریروں کو بُرا بھلا کہنے سے کبھی باز نہیں آئے، انھوں نے میری ان تحریروں کو بیچ کر، اپنی بیٹیوں کے جہیز خریدنے میں بھی کبھی کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہیں۔

ماخذ (انگریزی۔11)

شہرت نہیں بدنامی کہیے

عصمت چغتائی

سوال: آپ کی ادبی شہرت کا آغاز کس افسانے سے ہوا؟

عصمت چغتائی: شہرت نہیں بدنامی کہیے۔ اسی بدنام زمانہ افسانے 'لحاف' سے جسے لوگ آج بھی نہیں بھولے ہیں۔ میں نے اس وقت تک ہم جنس پرستی پر کوئی لٹریچر نہیں پڑھا تھا۔ میں نے کالج اور یونی ورسٹی سے تعلیم حاصل کی لیکن اس کے بارے میں میرا کتابی علم صفر تھا۔ میں سمجھتی تھی کہ یہ عورتوں کی بات ہے، اسے صرف عورتیں ہی جانتی ہیں۔ میں نے جب یہ افسانہ لکھا تو اس میں کوئی لفظ ایسا نہیں تھا جس پر گرفت کی جا سکے۔ اسی لیے میں مقدمہ جیت گئی کیوں کہ قانون کے مطابق فور لیٹر ورڈز کے بغیر وہ پکڑ نہیں سکتے تھے۔ اس سے قبل 'لیڈی چیٹر لیز لور' پر جو مقدمہ چلا تھا اس میں فور لیٹر ورڈز پکڑ لئے گئے تھے۔ حالاں کہ وہ بھی مقدمہ جیت گئے یہ ثابت کر کے کہ فور لیٹر ورڈز گندے نہیں۔ میرا پیشہ لکھنا نہیں تھا، میں تو ٹیچر تھی۔ ٹیچر سے انسپکٹر اور پھر سپرنٹنڈنٹ آف اسکول ہو گئی تھی۔ اس کے بعد شاہد لطیف سے شادی کر کے فلم لائن میں چلی گئی تھی۔ یہی میرا ذریعۂ آمدنی تھا۔ میرے اوپر لکھنے کے سلسلے میں کوئی پابندی تو تھی نہیں کہ یہ لکھو اور یہ نہ لکھو۔

سوال: سنا ہے کہ 'لحاف' کے کردار حقیقی ہیں؟

عصمت چغتائی: میں نے یہ سب کچھ دیکھا نہیں ہے۔ ایک بیگم تھیں، ان کی ایسی ہی ایک نوکرانی تھی۔ ان کے متعلق عورتیں باتیں کرتی تھیں اور ہنستی تھیں اور وہ ایسی ہی باتیں تھیں جو میں نے لکھی ہیں اور جو سمجھ میں نہیں آتی تھیں اور بہت ڈھکی چھپی ہیں۔ میں اور میرا بھائی اشیر بیگ، ہم میں بڑی دوستی تھی۔ ایک اونچا تخت تھا۔ جب بیبیاں باتیں کرتی تھیں تو ہم اس تخت کے نیچے چھپ کر یہ باتیں سنا کرتے تھے اور جوں ہی ہم پر ان کی نگاہ پڑتی تھی وہ ہمیں بھگا دیتی تھیں۔ جس سے ہمیں یہ شبہ ہوا کہ یہ ضرور گندی باتیں کرتی ہیں۔ شروع میں ان کی باتیں ہماری سمجھ میں نہیں آتی تھیں پھر بعد میں آہستہ آہستہ آنے لگیں۔ لہذا تم دیکھو گے کہ جو واحد متکلم کہانی بیان کرتا ہے اس کی عمر سات آٹھ سال ہے کیوں کہ میرے پاس جتنی معلومات تھیں، اس کے لئے مجھے اتنی ہی عمر کا بن کر لکھنا تھا۔ اس وقت اس معاملے میں میری معلومات واقعتاً اتنی ہی تھیں جتنی کہانی میں اس بچے کی ہیں۔

سوال: اس افسانے کا اختتام عجیب طریقے سے ہوا ہے کہ 'لحاف' کا جب کونا اُٹھا تو میں نے وہاں کیا دیکھا یہ مجھے کوئی لاکھ روپے بھی دے تو نہیں بتاؤں گی۔

عصمت چغتائی: بھئی میں نے لحاف کا کونا اٹھتے ہوئے دیکھا ہی نہیں تھا تو میں کیا بتاتی۔ لہٰذا کہہ دیا کہ 'نہیں بتاؤں گی!' بلکہ لوگ مجھ سے بعد میں پوچھتے تھے کہ 'خدا کے لئے بتادو کہ کیا دیکھا!' (قہقہہ)

سوال: کبھی ایسا تو محسوس نہیں ہوا کہ اب لکھنے کی کوئی چیز باقی نہیں رہی؟

عصمت چغتائی: ارے بھلا یہ کیسے ممکن ہے، جب زندگی باقی نہیں رہے گی تو پھر کچھ لکھنے کے لیے بھی باقی نہیں رہے گا۔ میں وقت کے ساتھ ساتھ چلی ہوں لیکن اب میں بوڑھی ہوگئی ہوں۔ اس کے باوجود میں خوش ہوں کیوں کہ مجھے بچوں سے بے پناہ محبت ہے، وہ میرے دوست ہیں جو اپنا ہر مسئلہ مجھے بتادیتے ہیں اور میں انھیں مشورہ دیتی ہوں۔ حتیٰ کہ وہ اپنے جنسی مسائل بھی مجھ سے نہیں چھپاتے۔

سوال: دولت مند طبقے میں بھی تضادات ہوتے ہیں۔ ان کی الجھنیں اور مسائل تو ادب کا موضوع بن سکتے ہیں؟

عصمت چغتائی: میں نے وہ بھی لکھے ہیں۔ میں نے نوابی سسٹم کے بارے میں نواب زادیوں کے ذہنی اور جنسی مسائل پر بھی قلم اٹھایا ہے۔

سوال: آپ کے جو افسانے متنازع ہیں، بعض نقادوں کا خیال ہے کہ ان میں آپ نے متوسط طبقے کے نمائندہ کرداروں کی تحلیل نفسی کی ہے؟

عصمت چغتائی: نفسیات سے مجھے ہمیشہ سے دل چسپی رہی ہے۔ میں نے اس کا مطالعہ بھی بہت کیا ہے۔ نفسیات کے مطالعے سے انسان کو سمجھنے میں بہت مدد ملتی ہے۔ اس کے علاوہ سیاسیات اور معاشیات بھی میرے پسندیدہ مضامین رہے ہیں۔ معاشرے کا جو طبقہ میرا ہمیشہ سے موضوع رہا ہے، اس کو سمجھنے کے لئے ان تینوں مضامین کا علم از حد ضروری ہے۔

سوال: آپ کے افسانوں پر ڈی ایچ لارنس اور فرائڈ کے اثرات بھی تلاش کئے گئے ہیں۔ کیا آپ اُن سے متاثر رہی ہیں؟

عصمت چغتائی: میں فرائڈ کے نظریے کو تسلیم نہیں کرتی۔ اس کا خیال ہے کہ ہر عمل منبع جنس ہے جب کہ میں سمجھتی ہوں کہ انسان اپنے ماحول کا قیدی ہے اور اس کے زیرِ اثر زندگی گزارتا ہے۔ بہت سے جنسی جذبات سچے نہیں رہتے، وہ مسخ ہوکر دوسری شکل اختیار کرلیتے ہیں۔ اس میں جنس یا جنسی اصولوں کا نہیں بلکہ سوسائٹی کا دخل ہے۔ سوسائٹی طاقت ور اور کم زور طبقوں میں بٹی ہوئی ہے اور یہی کش مکش الجھنیں پیدا کرتی ہے۔

سوال: آپ نے ایک ایسے زمانے میں لکھا جب ان موضوعات پر قلم اٹھانے کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا

تھا۔

عصمت چغتائی: اور اگر کوئی ان موضوعات پر لکھ سکتا تھا تو مرد ہی لکھ سکتے تھے لیکن میں نے ایک عورت ہو کر لکھا اور وہ بھی مسلمان عورت ہو کر۔

سوال: میں یہ پوچھنا چاہ رہا تھا کہ کس چیز نے آپ کو اس موضوع کی طرف مائل کیا؟

عصمت چغتائی: سچ بولنے کی خواہش نے۔ لیکن افسوس یہ ہے کہ پڑھنے والوں نے اس میں صرف جنس زدگی دریافت کی۔ اس کے علاوہ بھی ان افسانوں میں کچھ کہا گیا ہے' یہ جاننے کی کسی نے بھی فکر نہیں کی۔ مثلاً آپ 'لحاف' ہی کو لیجیے جس پر مجھے لعن طعن کیا گیا' اس میں جنس کہاں ہے؟ اس میں تو جنسی کج روی پر ماتم کیا گیا ہے۔ اس میں کہیں بھی دوسروں کے لیے ترغیب کا سامان موجود نہیں ہے۔

سوال: آپ کی بیش تر کہانیاں 'گھر' کے گرد گھومتی ہیں۔ گھر کے اندر کی صورتِ حال، اس میں رہنے والی عورتیں، مرد، ان کی الجھنیں، مسائل۔ یہ وہ قطعۂ اراضی ہے جس میں آپ نے اپنی اکثر کہانیوں کی فصل کاشت کی ہے۔ گھر کی فضا محدود سی ہوتی ہے۔ کیا یہ آپ کے افسانوں کے کینوس کو بھی محدود نہیں کر دیتی؟

عصمت چغتائی: آدمی کا زیادہ وقت کہاں گزرتا ہے؟ گھر میں۔ دفتر میں جا کر تو وہ مشین بن جاتا ہے۔ وہ انسان نہیں رہتا، کلرک یا افسر بن جاتا ہے اور مجھے اس کی ان حیثیتوں سے دل چسپی نہیں۔ وہاں وہ اپنے مطلب کے لیے جھوٹ بولتا ہے اور اپنے گھر میں آ کر جھوٹے کپڑے اتار دیتا ہے۔ اگر وہ غنڈہ بدمعاش ہے تو بھی گھر ہی لوٹتا ہے، خواہ وہ گھر رنڈی کا کوٹھا ہی کیوں نہ ہو۔

ماخذ (اُردو۔ ۶۵)

گندی سے گندی بات

محمد حسن عسکری

کسی لکھنے والے میں سب سے بڑی چیز دیکھنے کی یہی ہوتی ہے کہ وہ کتنی گہرائی سے بول رہا ہے۔ لیکن نہ تو میرے دماغ کو باریکیوں اور لطافتوں کی سمجھ ہے اور نہ میری روح میں گہرائی ہے اور نہ قوت۔ ممکن ہے کہ آپ کو کبھی کبھی میری آواز گہرائیوں میں سے آتی ہوئی معلوم ہوتی ہو، درست ہے۔ مگر یہ آواز ایسی ہے جیسی لحاف اوڑھ کر نکلتی ہے۔ واقعی اس تمام عرصے میں لحاف اوڑھے ہوئے تھا۔ خون کی گرمی اور جوش کا لحاف۔ اور پھر اوپر سے اس زمانے کی نیم گرم اور سیلی سیلی بھاپیں جو جسم اور آنکھوں پر چربی کی طرح چھاپی جاتی ہیں۔ (میں لحاف کا استعارہ استعمال تو کر گیا ہوں، لیکن اب مجھے خیال آتا ہے کہ کہیں اسے عصمت چغتائی کے ’لحاف‘ پر طنز نہ سمجھ لیا جائے، ایسا بالکل نہیں ہے)۔ ادب کے موجودہ جنسی ہیجان کا جواز موجود سہی، لیکن بڑی حد تک طوفان لوگوں نے خود اپنی پھونکوں سے بنایا ہے، اور اس طوفان نے درخت اور مکان نہیں اکھاڑے ہیں بلکہ مرغی کے پر۔ اس طوفان نے فائدہ بھی پہنچایا ہوگا، مگر اس شوں، شوں، نھوں، نھوں میں بہت سے نغمہ ہائے زیرِ لبی دب گئے ہیں۔

ادب میں جنس کا ذکر بذاتِ خود بری چیز نہیں، بلکہ اکثر حالتوں میں جنسی عامیانہ پن ذہنی تندرستی کا نشان ہوتا ہے۔ مثلاً یورپ کے قرونِ وسطیٰ میں چوسر جھجکے بغیر بزحتی اور چٹلی والے قصے لکھ سکتا تھا اور ساتھ ہی کنواری مریم کی تعریف میں ایک نظم بھی۔ ہم لوگ تعریف تو شاید جنسی فعل کی بھی نہیں کر سکتے۔ اس سے لطف نہیں لے سکتے۔ ہاں کوئی ’گندی بات‘ کہنے کے بعد سر پھرا پھرا کر دیکھتے ہیں کہ لوگ اس سے چونکے بھی یا نہیں! (مجھے بار بار انتباہ کی ضرورت پیش آ رہی ہے، میں کہیں بھی مخصوص افراد پر اعتراض نہیں کر رہا ہوں۔ یہاں تو صرف ایک عام ادبی فضا کی بحث ہے ورنہ موجودہ بہترین جنسی افسانوں کی اہمیت کا میں بھی اتنا ہی قائل ہوں جتنا کہ کوئی اور)۔

’گندی سے گندی بات‘ اچھے سے اچھا ادب بن سکتی ہے، مگر جنسیت سے مغلوب ہو کر بڑا ادب پیدا نہیں کیا جا سکتا۔ کیوں کہ بڑے ادب کی پیدائش کے لیے ہر قسم کا مجہول انفعال ایک رکاوٹ ہے۔ اور خصوصاً جنسی جذبے کے سامنے انفعال۔ میں نے جنسی جذبے کی مدافعت کرنے کی کوشش تو ضرور کی ہے، مگر کئی دفعہ میں اس سے دب گیا ہوں۔ اور اس پسپائی میں مقبولیت حاصل کرنے کی خواہش کا بھی تھوڑا سا دخل تھا۔ مگر ’پھسلن‘ کی تہہ میں اس قسم کی کوئی پسپائی یا خواہش نہیں تھی۔ یہ افسانہ میں نے

اس زمانے میں لکھا ہے جب میں زولا کو بہت بڑا مصنف سمجھتا تھا اور غیر مشروط حقیقت نگاری' خارجیت اور معروضیت میرا مطمحِ نظر تھیں۔ اور نہ میں نے اسے فوراً مقبول ہو جانے کی تمنا میں لکھا تھا۔ اس قسم کی آرزو تو کیا' اس وقت تو مجھے یہ بھی پتا نہ تھا کہ میں افسانہ لکھ بھی سکتا ہوں۔ لہٰذا اپنے آپ کو افسانے کا مصنف کہتے ہوئے مجھے کوئی شرم نہیں آتی۔

لیکن 'چائے کی پیالی' ضرور فحش نگاری (پورنوگرافی) کی حدود میں آجاتا ہے۔ اس کے بعض حصے پڑھتے ہوئے مجھے خود شرم آنے لگتی ہے۔ اگر افسانے کی مجموعی کیفیت کا کوئی نام ہو سکتا ہے تو 'روحانی فیل پا'۔ اسے پڑھ کر مجھے کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے چار آنے والے تھیٹر کا مسخرہ ناند پر بانس پیٹ پیٹ کر اشتہار دینے کے لیے اپنے پاس کھڑی عورت کے کپڑے اتارنا شروع کر دے' ایک کے بعد دوسرا۔ اور دونوں میں سے کوئی بھی شرم محسوس نہ کرے' بلکہ مسکراتے رہیں۔ اور اس پر بس نہیں' بلکہ قمیض کے نیچے سے کپڑے کی دو گیندیں نکلیں جو ننگی عورت سے بھی زیادہ فحش چیز ہے۔ یہ بات نہیں کہ یہ افسانہ غیر حقیقی ہو۔ ممکن ہے کہ اس قسم کی اصلی لڑکی کے خیالات اس سے بھی زیادہ جنسیت لئے ہوئے ہوتے تو نفس مضمون میں تو کوئی سقم نہیں مگر اس کے بیان میں کچھ میرے ہی قدم ڈگمگائے ہیں۔ ایسا کیوں ہوا! کچھ ہو گا۔ مگر اشارۃً کہہ سکتا ہوں کہ یہ اسی قسم کی جذباتی کیچڑ ہے جس میں گالز وردی کو لوٹتے ہوئے ڈی ایچ لارنس نے پکڑا تھا۔ یہ جنسیاتی رجحان ہی ہے جس نے اکثر جگہ میرے افسانوں میں 'جھوٹے سُر' پیدا کر دیے ہیں اور تکنیکی اور ہیئتی کوششوں کو کامیاب نہیں ہونے دیا۔ شاید رگوں میں خون ٹھنڈا پڑنے کے بعد میں فن اور ہیئت کی طرف زیادہ کامیاب توجہ کر سکوں گا۔ لیکن چوں کہ میرا ادبی سرمایہ زیادہ تر جنسی قسم کا ہی ہے' اس لیے یہ بھی اندیشہ ہے کہ خون کا دباؤ اور اعصاب کا تناؤ کم ہو جانے کے بعد میں اچھا فن کار تو ہو جاؤں گا' مگر شاید/ پھیکا' پھسپھسا بھی رہ جاؤں گا۔

آپ پوچھیں گے کہ پھر مجموعہ کیوں چھپوایا؟ لیکن اس کا جواب یا تو میرے ناشرین دیں گے جنھوں نے میرا مجموعہ خریدا یا پھر آپ خود جنھوں نے میرے افسانے پسند کیے۔ لیکن اس کے علاوہ میرے مجموعے سے ایک اور بھی فائدہ ہے۔ بھائی اسے ادب سمجھ کر گھر لے جائیں گے اور بہنیں اسے فحشیات کے طور پر پڑھیں گی۔ اور کم سے کم اتنا تو میں بھی مانتا ہوں کہ میرے افسانے آٹھ آنے والے ناولوں اور ایک روپیہ سالانہ چندے والے رسالوں سے تو بہتر ہیں۔

ماخذ (اُردو۔ ۴۷)

میں عُریانی پر کیوں اُتر آتا ہوں!

محمد احسن فاروقی

اس موضوع پر کبھی پہلے بھی کسی رسالے میں لکھ چکا ہوں اور قرآن و حدیث سے لے کر تمام دنیا کے ادب میں عُریاں نگاری کی مثالیں دے کر یہ ثابت کر چکا ہوں کہ بعض موقعوں پر عریانی لانا کتنا لازمی ہو جاتا ہے اور یہ بھی دکھا چکا ہوں کہ ان تمام عظیم تصانیف میں عریانی محض جنسی سنسنی کے لیے نہیں لائی جاتی بلکہ مخصوص علمی، اخلاقی اور نفسیاتی مقاصد پورے کرتی ہے۔ اس لیے عریاں نگاری پر دھڑ لے سے اعتراض کر دینا غلط ہے۔ ہمیں دیکھنا یہ چاہیے کہ مصنف کس پائے کا ہے اور کس جگہ پر اسے بالکل عریاں نگاری پر کیوں آ جانا پڑ گیا ہے۔ یہاں میں ان سب باتوں کی تفصیل میں نہیں جانا چاہتا۔ جن حضرات کو عریاں نگاری کے اس پہلو سے دل چسپی ہے وہ میرے مضمون کو دیکھیں جو میرے مجموعے 'تنقیدی انشائیے' میں بھی آ گیا ہے۔

اسی اثنا میں لوگوں نے میرے افسانوں میں بھی عریاں نگاری پر اعتراض کیے ہیں اور میرے لیے لازمی ہے کہ اس سلسلے میں اپنا دفاع کروں۔ اس وقت مجھے 'طلوعِ افکار' نے یہ موقع دیا ہے کہ میں اوروں کے بجائے اپنی عریاں نگاری پر مضمون لکھ ڈالوں۔ میں کیوں عریاں نگاری پر اُتر آتا ہوں اور خاص طور پر اس زمانے میں جب ساٹھ برس کا ہو چکا ہوں! یہ سوال مجھ سے بہت پوچھا گیا ہے۔ لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ جوان مصنف کا عریاں ہو جانا سمجھ میں آ سکتا ہے مگر بڈھے کا اس دائرے میں قدم رکھنا تعجب ہی ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ ادیب یا شاعر کا ہمیشہ سے موضوع عشق رہا ہے۔ ہماری غزل کا یا دنیا بھر کی 'لیرک' (غنائی) شاعری میں عشق ہی عشق کا نظر آنا کوئی اتفاقی یا زبردستی کی بات نہیں ہے۔ افسانہ بھی، وہ نثر میں ہو یا نظم میں، بنیادی طور پر عشق و محبت ہی کی داستان ہو رہا۔ افسانہ نگار کے لیے مرد و زن کے تعلق کی طرف متوجہ ہونا قدرتی ہے۔ میں نے ابتدا عشقیہ قصے ہی سے کی اور حالاں کہ ایسے قصے بھی لکھتا ہوں جس کو عشق سے کوئی سروکار نہیں ہوتا مگر بقول شاہد عشقی، میرے زیادہ مقبول افسانے وہی ہیں جن میں عشق خاص موضوع ہے۔ میرے دس افسانوں میں چھ ایسے ہیں جو جنسی کہے جا سکتے ہیں۔

میرا پہلا مقبول افسانہ 'برقع والیاں' مجھ تک اسی طرح پہنچا کہ میری بیوی کو ایک عورت اپنی مالکہ کا قصہ سنانے بیٹھی۔ میں دور پر کشادہ آنگن میں لیٹا ہوا سارا قصہ سنتا رہا۔ اس کے بعد مجھ پر کچھ ایسا

دورہ پڑا کہ میں نے اس سارے قصہ کو لکھ کر ہی دم لیا اور اسے 'ساقی' کے افسانہ نمبر میں چھپنے کے لئے بھیج دیا۔ چھپنے کے بعد ہر طرف اس کی تعریفیں ہونے لگیں اور آج پچیس برس کے بعد بھی لوگ اسے پسند کر رہے ہیں یہ افسانہ ہوا و ہوس کا قصہ ہے اور اس کو صاف طور پر عریاں نگاری کے دائرے میں لایا جا سکتا ہے۔ جب میں نے اسے سنا اور سننے کے بعد لکھ ڈالا تو مجھے بالکل خیال نہ تھا کہ میں نے عریاں نگاری کی ہے۔ اس قصے نے میرے سامنے اس قسم کے عشق کا نمونہ پیش کیا جو آج کل رائج ہے اور دل چسپ بھی ہے اور اس کے بعد سے میں خود زندگی کا مطالعہ کرنے لگا تو مجھے اسی قسم کے کئی عشق نظر آئے۔ واقعات تو حد سے زیادہ متنوع تھے مگر ان میں مشترکہ بات وہ تھی جسے عریانی کہا جاتا ہے۔

زیادہ مقبول ہونے پر میں نے دیکھا کہ بہت سارے ایسے لوگ تھے جو مجھے عریاں نگار کہتے ہیں۔ ان لوگوں کے اعتراضات پر میں نے اپنا محاسبہ کیا۔ میں تنقید نگار بھی ہوں۔ مگر پہلے تخلیق کار ہوں اور بعد میں اپنی لاشعوری تخلیق کو تنقیدی نظر سے دیکھتا ہوں۔ میں نے اپنے سے سوال کیا کہ میں کیا کر گزرا! اور پھر یہ کہ کیا ایسا کرنا جائز یا اخلاقی نقطۂ نظر سے درست تھا! مجھے احساس ہوا کہ میں نے کوئی بات زبردستی نہیں۔ کی مجھے بچپن ہی سے عریانی سے شرم سکھائی گئی تھی اور اس طرف آتے ہوئے میں ہچکچاتا تھا۔ مگر باوجود اس کے میں صاف صاف عریاں نگار ہو گیا۔ کیوں! اس کے جواب میں مجھے حافظ کا شعر یاد آیا۔

دو برس آئینہ طوطی صفتم داشتہ اند　　ہر کہ استاد ازل گفت ہمہ می گویم

استادِ ازل یعنی زندگی کے تجربے نے جو کچھ میرے ذہن پر ثبت کیا' اسے میں لاشعوری طور لکھ گیا۔ اس طرح مجھے اپنے عمل کا جو بہر حال قابل اعتراض بھی تھا، جواز مل گیا۔ میں نے جوانی میں خود بھی محبت کی تھی مگر یہ نہایت درجہ پاک اور پورے طور پر اخلاقی تھی۔ اس میں پستی یا عریانی کا کبھی شائبہ بھی نہیں بنایا جا سکتا۔ مگر دوسروں کی محبت جہاں بھی مجھے دکھائی دی وہ ویسی نظر آئی جیسے میں نے رقم کر دی ہے یعنی اس میں عریانی کا عنصر بہت زیادہ تھا۔ میں نے اسے تعجب سے دیکھا اور یہ تعجب ہی میری تخلیق کا محرک ہوا اور آج بھی ہوتا ہے۔ سیدھے سیدھے الفاظ میں اسی بات کو میں یوں کہہ دیتا ہوں کہ آج کل مجھے عشق کے جو بھی واقعات نظر آتے ہیں' ان میں خاص' قسم کی عریانی ہوتی ہے' اور اگر میں اسے رقم نہ کروں تو قصے کی ساری دل چسپی جاتی رہے گی۔

میری ناول 'شام اودھ' میں عشق کے جو حالات ہیں' ایک طرح کی آپ بیتی کہے جا سکتے ہیں یہاں عشق ایک ذوق نظر ہے۔ عاشق محویت سے دیکھنے ہی کو سب کچھ سمجھتا ہے۔ معشوق نظر جھکائے اپنے کو دکھانے کے سوا کچھ نہیں کرتی اس کے لیے وہ اشارے بھی جو عام عاشق اور معشوق کیا کرتے ہیں 'ممنوع ہیں۔ نوبہار اور حیدر نواب' کی محبت میں جنس کا بالکل سوال ہی نہیں ہے۔ کئی جگہ حیدر نواب

نوبہار کو کرسی پر بیٹھ جانے کے لئے کہتے ہیں تو وہ صاف انکار کر دیتی ہے وہ لونڈی ہے اور نواب زادے سے اپنے تعلقات میں برابری کا شائبہ بھی لانے کو تیار نہیں۔ وہ انجمن آرا اور حیدر نواب کو بلاتی ہے مگر ان کے آمنے سامنے آنے میں بھی ان کے خاندان کی روایت کے حساب سے بڑا نقص ہے۔ غرض ذاتی درجے پر میں لیلیٰ مجنوں والے روایتی عشق سے آگے بڑھنے کو تیار نہ تھا۔ مگر 'برقع والیوں' کا قصہ بیان کرنے والی عورت نے میری آنکھیں کھول دیں۔ اور جگ بیتی بیان کرنے کے سلسلے میں مجھے عریاں نگار ہونا ہی پڑا۔ اس رجحان کو دو باتوں نے خاص فروغ دیا۔ ایک طرف میں نے یہ دیکھا کہ ان افسانوں میں دل چسپی لینے والے لوگ اور زیادہ تر جوان عورتیں' اعلانیہ نہیں تو دل میں ضرور عریانی پسند کرتے تھے۔ میرے عشقیہ قصے پڑھنے والی زیادہ تر عورتیں تھیں' جدید تعلیم یافتہ عورتیں۔ اور مجھے محسوس ہوا کہ آج کل کے حالات عشق میں عریانی کا عنصر زیادہ سے زیادہ بڑھا رہے ہیں اور اگر مجھے واقعیت پسند ہونا ہے تو مجھے عریانی سے گریز نہ کرنا چاہیے بلکہ اس کو فراوانی سے لانا چاہیے۔

دوسرا یہ کہ میں نے انگریزی میں ڈی ایچ لارنس کو ایک زمانے میں خاص طور پر پڑھا تھا۔ اور اردو ناول نگاروں میں عصمت چغتائی' سعادت حسن منٹو اور عزیز احمد سے مجھے خاصی دل چسپی تھی۔ ان کے اثر سے میری سمجھ میں آیا کہ عریانی ایک مصلح چیز ہے۔ مجھے اس بات کا یوں بھی تجربہ ہوا کہ کچھ مردوں اور عورتوں نے میرے سامنے اپنی الجھنوں کا اسی طرح ذکر کیا کہ جیسے کوئی مریض کسی معالج کے سامنے کرتا ہے۔ میں اس نتیجے پر پہنچا کہ آج کل ہمارے معاشرے میں عشق عریانی کی طرف مائل ہے اور عاشق معاشرے کی پابندیوں کو توڑ نا دینا چاہتا ہے۔ مرد وزن کے تعلق میں پرانا رکھ رکھاؤ ختم ہو رہا ہے۔ عورت اور مرد دونوں آپس کے تعلقات میں مذہبی' اخلاقی اور سماجی پابندیوں کو توڑ کر نئی راہوں پر جا رہے ہیں اور جانا چاہتے ہیں۔ میں ان راہوں کو ہم دردی سے دیکھ رہا ہوں اور ان سے ہم دردی دکھا رہا ہوں اس لیے زیادہ سے زیادہ مقبول افسانہ نگار ہوتا جا رہا ہوں۔

عزیز احمد نے اپنی ناول 'گریز' میں انگلستان کی جنسی زندگی کا جو نقشہ کھینچا ہے' وہ عریاں نگاری کی حد مانی گئی۔ جب علی عباس حسینی مرحوم نے انھیں خط لکھا کہ وہ کیوں اس قدر عریاں ہو جاتے ہیں۔ انھوں نے جواب میں لکھا کہ وہ بڑی کوشش کرتے ہیں کہ عریاں نہ ہوں مگر ان کا قلم آپ سے ادھر چل نکلتا ہے۔ عزیز احمد نے جو بات کہی وہ فن کاری میں لاشعور کے حصے کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ میں بھی کچھ ایسا ہی محسوس کرتا ہوں جس کو میں تنقیدی زبان میں یوں ادا کروں گا کہ تجربے کا زور اور واقعیت نگاری میں عقیدہ مجھے عشقیہ واقعیت کی عریانی کی طرف گھسیٹ لے جاتے ہیں۔ اور پھر مجھے اس میں دو اہم فائدے بھی دکھائی دیتے ہیں، ایک نفسیاتی اور دوسرا اخلاقی۔

افسانہ اب محض دل چسپ واقعات کا تسلسل کے ساتھ بیان نہیں رہ گیا ہے۔ اس میں ادبی

دل چسپی لینے والے 'کردار کی تحلیل بھی چاہتے ہیں کردار کے شعور سے زیادہ ان کے لاشعور کی تعجب انگیز پیچیدگیاں افسانہ نگار اور افسانہ پڑھنے والے دونوں کے لئے دل چسپ ہوگئی ہیں۔ اب افسانے کی ادبیت 'زبان' میں نہیں رہی ہے بلکہ 'بدزبانی' سے نمایاں ہوتی ہے یعنی اب وہ کردار کے بجائے بد کرداری کا مظہر ہوگیا ہے۔ اس بات کو سمجھانے کے لئے میں اپنے دو افسانوں کی طرف اشارہ کروں گا جو اس وقت حد سے زیادہ مقبول ہیں۔ ایک 'بڑا تعجب' اور دوسرا 'حرام زادہ بڈھا'۔ دونوں سن رسیدہ لوگوں کے جنسی رجحانات کے نقشے ہیں۔ ایک میں ایک بڈھا اپنی چھوٹی سالی کی لڑکی سے شادی کر لیتا ہے۔ دوسرے میں ایک بڈھا جوان لڑکیوں کا شکار کرتا ہے۔ یہ دونوں معاملے معمولی ہیں اور ان میں اگر دل چسپی پیدا ہوسکتی ہے تو محض اس طرح کہ دونوں بڈھوں اور ان سے وابستہ لڑکیوں کی نفسیات بلکہ مخصوص جنسی نفسیات کی تحلیل کی جائے اور یہی ان افسانوں میں کیا گیا ہے جس کی وجہ سے وہ عریاں نگاری کے دائرے میں آجاتے ہیں۔ آج کل جنسی نفسیات میں عریانیت کا عنصر اس قدر لازمی ہوگیا ہے کہ بغیر اس کو نمایاں کیے ہوئے نفسیاتی تحلیل دل چسپ نہیں ہوسکتی۔ غرض عشقیہ افسانہ نگاری کا عریانی لازمی جزو ہے۔

پھر عریاں نگاری اخلاقی نقطہ نظر سے بھی ضروری ہوجاتی ہے۔ اول تو نفسیات کے ماہروں نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ بداخلاقی بلکہ مجرمانہ ذہنیت کی خاص وجہ جبلتوں کو دبانے کی وجہ سے پیدا ہوئی ہے اور اس کا علاج یہ ہے کہ اسے آزادی سے ادا کردیا جائے۔ ادب اس سلسلے میں اہم کام کرتا ہے۔ ڈی ایچ لارنس کی حد سے زیادہ عریاں ناول 'لیڈی چیٹر لیز لوز' پر انگلستان میں پابندی لگادی گئی مگر برنارڈ شا نے کہا کہ اگر اس کے کوئی لڑکی ہوتی تو وہ اُسے یہ کتاب ضرور پڑھواتا۔ اور پھر پاپائے اعظم نے اس کتاب کو 'نہایت درجہ اخلاقی' کہا۔ معلوم ہوا کہ اس کتاب کی ہی نہیں بلکہ ہر کتاب کی عریاں نگاری ایک اخلاقی اثر رکھ سکتی ہے اگر اس کا مصنف محض لذت کی سنسنی سے آگے بڑھ کر سنجیدہ رجحان کا مظاہرہ کرتا ہے۔ جنس انسان کی زندگی کا ایک ضروری بلکہ سب سے زیادہ ضروری حصہ ہے اور اس کی تربیت سب سے زیادہ ضروری ٹھہرتی ہے۔

اس سلسلے میں ہمارے مذہبی لوگ عیسائی مذہبی لوگوں سے زیادہ منھ بناتے ہیں۔ مگر وہ یہ نہیں دیکھتے کہ اسلام جنسی رجحان کی تربیت میں عیسائیت سے کتنا زیادہ آگے ہے۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ ایک عیسائی عالم کے یہاں جنس کی بابت باتیں چھڑیں۔ عیسائی عالم نے فرمایا صرف عیسائی جنس کو 'اوائڈ' کرسکے۔ ان کی اس بات میں ہمارے پیغمبر کی طرف چھپا ہوا طنزیہ اشارہ تھا۔ میں نے عام طور پر دیکھا ہے کہ پیغمبر اور مسلمانوں کے عوامل کی طرف عیسائی لوگ طنز کرنے سے نہیں چوکتے اور اس موقعے پر بھی وہ جنس کو 'ایوائڈ' کرنے کا ذکر کرکے اسلام کے مقابلے میں عیسائیت کی اخلاقی بڑائی جتانا چاہ رہے تھے۔ میں نے سنجیدہ ہوکر سوال کیا، کیا خدا نے جنس کو 'ایوائڈ' کرنے کے لئے بنایا ہے۔ کیا جنسی محرک ہی

کو خالق کا تخلیقی ذریعہ نہیں کہا جا سکتا؟ وہ اس سوال پر چکرائے‘ تو میں نے عرض کیا: اگر حضرت عیسیٰؑ تینتیس برس سے زیادہ کی زندگی پاتے تو وہ بھی حضرت محمد ﷺ کی طرح جنسی تعلقات کی بابت ہدایت اور عمل کے بڑے اہم پہلوؤں پر روشنی ڈالتے اور اس وقت آپ لوگ جنس کو ’ایوائڈ‘ کرنے کے بجائے اس کو صحیح طریقے پر استعمال کرنے کی بات کرتے۔

ہمارے رسول ﷺ نے صاف دیکھ لیا تھا کہ عیسائی نظام میں جنس کو ’ایوائڈ‘ یا ’سپریس‘ کرنے کی خاص کوشش تھی اور اس کی وجہ سے پادریوں اور راہباؤں کی زندگی کیا عالم اختیار کر گئی تھی۔ آپ نے جنسی تعلقات پر جو پابندی عائد کی وہ اس کے صالح استعمال کو فروغ دیتی ہے۔ چار شادیاں جس کا آپ اپنے زعم میں مذاق اڑاتے ہیں اخلاقی نقطہ نظر سے آپ کے جنسی تعلق سے بڑی اونچی چیز ہیں۔ آنحضرت ﷺ نے خود اپنے لیے گیارہ عورتیں جائز رکھیں اور زر خرید لونڈیوں سے جنسی تعلق میں کوئی حد نہیں لگائی۔ آپ ہمارے بادشاہوں کے ’حرم‘ پر اعتراض کرتے ہیں۔ مگر غور سے دیکھیے تو یہ جنسی تربیت کے ادارے تھے۔ اس تقریر سے عیسائیوں کی اور ان کے سے خیال رکھنے والوں مسلمانوں کی جنس کی بابت رائے بدل سکی یا نہیں مگر بہر حال میری اس رائے کا اظہار ہو گیا کہ اسلام جائز جنسی جذبات کے دبانے کو مضر سمجھتا ہے۔ جدید نفسیات نے بھی یہ بات تجربات سے مان لی ہے۔ لہٰذا جنس کے بابت ’کھلی کھلی‘ اور ’صاف صاف‘ باتیں رقم کرنے کو میں اسی طرح کا درس اخلاق قرار دیتا ہوں اور میری عریاں نگاری کا کچھ ایسا ہی اثر ہے۔

پھر اس معاملے میں شعوری طور پر بھی میں نے مصلح کا رخ کیا ہے۔ میرے کچھ افسانے ہیں جو اس جنسی آزادی سے کہیں آگے بڑھ کر جو اسلام نے دی ہے صاف صاف زنا کاری کی ترغیب دیتے ہیں مثلاً میرے افسانے ’نیا مثلث‘، ’کالی دیکھی اور لوٹ گئے‘ میں میں نے شادی شدہ لوگوں کو زنا پر قائم رکھا ہے جب کہ اکثر پڑھنے والوں کی رائے میں مجھے ان کو نکاح کر لیتے ہوئے دکھا دینا چاہیے تھا۔ میرے افسانے کی بابت سلمان الارشد‘ ایڈیٹر ’الشجاع‘ نے کہا: ’آخر آپ نے ان دونوں کا نکاح نہیں ہونے دیا! میں نے ان سے عرض کی کہ یہ قصہ میرا گھڑا ہوا نہیں ہے۔ میں نے جو دیکھا وہ لکھ دیا ہے۔ جن دو لوگوں کا میں نے حال لکھا ہے وہ نکاح کر لینے میں بڑی مشکلیں محسوس کرتے ہیں اور بغیر نکاح ہی کے ساتھ رہتے ہیں۔ پھر آج کل طبقاتی فرق مٹ رہے ہیں اور میں دیکھ رہا ہوں کہ وہ لوگ جو ملازمائیں رکھ سکتے ہیں وہ ملازماؤں سے چل نکلتے ہیں۔ اس سلسلے میں جو اشارے آپس میں ہوتے ہیں ان کا بالکل عریاں ہونا لازمی ہے۔ اسلام نے لونڈی سے جنسی تعلق جائز رکھا تھا کیوں کہ ایک مرد اور اس کا تمام کام کرنے والی عورت کا جنسی تعلقات پر آ جانا قدرتی ہے۔ اب بردہ فروشی غیر قانونی ہو گئی ہے۔ مگر انسانی فطرت وہی ہے۔ لہٰذا مالک اور ملازمہ میں جنسی تعلق بہت ہی عام ہے۔ میں نے اکثر لوگوں کو یہ

بحث کرتے سنا ہے کہ اب لونڈی کی جگہ نوکرانی ہے اور اسے بھی شروع سے اسی طرح جائز ہونا چاہیے جیسے پہلے تھی۔ اس بات کو بھی میں اپنے کئی افسانوں میں لایا ہوں اور ظاہر ہے کہ اس دائرے کے معاملے میں جہاں بھی دکھائے ہیں وہ لازمی طور پر عریاں ہو گئے ہیں۔

پھر آج کل عورتیں، مردوں کے دوش دوش کام کر رہی ہیں اور کام کرتے کرتے تھک کر تفریحاً جنسی اشارے اور حرکات کی طرف آ جاتی ہیں۔ مجھے ایک دفتری صاحب یاد آتے ہیں جو حافظ بھی تھے۔ وہ انگریزی نہیں جانتے تھے مگر انگریزی فلم دیکھنے ضرور جایا کرتے تھے کیوں ان فلموں میں بوس و کنار کے سین آتے ہیں اور انھیں بہت اچھے لگتے تھے۔ ایک جید عالم کی تفریح تھی کہ شام کے وقت عورتوں کو بلاتے اور ان کو بالکل برہنہ کر کے ان کے ہر عضو کو دیکھا کرتے۔ لوگوں نے ان سے پوچھا ’یہ آپ کیا کرتے ہیں؟‘ انھوں نے جواب دیا ’بالائی تمتع‘۔ وہ ہی نہیں کثرت سے لوگ ہیں جو ’بالائی تمتع‘ میں مصروف ہیں۔ اور جب افسانہ نگار ان کی نفسیاتی تحلیل پیش کرے گا تو عریانی کے سوا اور کیا رقم کر سکتا ہے۔ غرض اگر ان سب وجوہات اور رجحانات کا جائزہ لیا جائے جو جنسی زندگی کو عریاں سے عریاں تر بنا رہے ہیں تو ایک پوری کتاب ہو جائے گی۔ مصلح لوگ ان باتوں کو دیکھ کر لاحول پڑھتے ہیں۔ میں انھیں غور سے دیکھتا ہوں۔ ہمدردی سے رقم کرتا ہوں اور میرے افسانے کسی نہ کسی طرح ان کی اصلاح یعنی ان میں توازن لانے کا راستہ بتاتے ہیں۔ ہمارا معاشرہ پرانی روایتوں اور جدید ضرورتوں کے درمیان کش مکش میں مبتلا ہے جس کی وجہ جنسی بھوک ہمارے جوان لڑکوں اور جوان لڑکیوں میں بہت نمایاں ہوتی جا رہی ہے۔ زیادہ تر لوگ اس بھوک سے بے تاب ہو کر عجیب عجیب حرکتیں کرتے نظر آ رہے ہیں، جو بیش تر عریاں ہیں اور ان کی اصلاح بس اس حد تک ہو سکتی ہے کہ ان میں توازن لے آیا جائے اور یہ اسی طرح آ سکتا ہے کہ افسانوں میں انھیں جوں کا توں رقم کر دیا جائے۔

جب ہمارا معاشرہ ایک حد تک متوازن اور پر سکون تھا تو قاعدوں کی پابندی اس کی نمایاں صفت تھی اور بے قاعدگی معیوب سمجھی جاتی تھی۔ مگر اب وہ بڑی تیزی سے کروٹ بدل رہا ہے اور اس میں بے قاعدگی، جس کی ایک صورت عریانی بھی ہے، عام تر ہوتی جا رہی ہے۔ مجھے بچپن میں عریانی کی طرف سے منہ پھیر لینا سکھایا گیا تھا اور اس کا کھلے عام ذکر کرنے سے مجھے شرم آتی تھی۔ مگر اب مجھے محسوس ہوتا ہے کہ عریانی مجھے زبردستی کھینچتی ہے اور عریاں نگاری پر مجبور کرتی ہے۔ ایک ’بزم افسانہ‘ میں جناب صدر نے یہ بات کہی کہ جوان افسانہ نگاروں کے یہاں جنس موضوع ہوتا ہے جب کہ سن رسیدہ لوگوں کے یہاں اس کی جگہ سوشل امور لے لیتے ہیں۔ صدر کی تعارفی تقریر کے بعد کافی تعداد میں افسانے پڑھے گئے جو زیادہ تر جوان لڑکوں اور لڑکیوں کے تھے اور ان میں جنس کا کوئی خاص ذکر نہ تھا۔ آخر میں، میں اپنا افسانہ سنانے کے لیے ڈائس پر آیا۔ میں نے افسانہ سنانے سے پہلے کہا: ’آپ نے

جوانوں کے افسانے سنے۔ میں ان سب سے زیادہ بڈھا ہوں اور میرا افسانہ جنابِ صدر کے کلیے کی نفی کرتا دکھائی دے گا۔ میرے افسانے کی سرخی 'آنکھوں آنکھوں میں' تھی اور اس میں سارا قصہ عاشق و معشوق کی آنکھوں کے ذریعے اشاروں سے سنایا گیا تھا اور ان میں بیش تر اشارے صاف صاف عریاں تھے۔ بزم ادب کے بعد ایک صاحب نے کہا: 'آپ کا سن کچھ ہو مگر آپ کامل جوان بلکہ نوجوان ہیں بلکہ ایک صاحب نے تو یہ شعر پڑھا

بڑھاپے میں جوانی سے زیادہ جوش ہوتا ہے   بھڑکتا ہے چراغ صبح' جب خموش ہوتا ہے

لوگوں کا کچھ تاثر ہو' مجھے اپنے بڑھاپے کی پورے طور پر لاج ہے مگر میں کھل کر بات کر کے جوانوں اور بڈھوں کو بھی جنس کے معاملے میں ایک راہ اور ایک توازن پر لانے کا ہمیشہ مقصد ضرور رکھتا ہوں۔ مجھے مرزا محمد ہادی رسوا کا یہ شعر یاد آتا ہے۔

جہاں میں انقلاب آئے گا اور آنا ضروری ہے   بہانہ چاہیے منظور ہستی کے مٹانے کو

اور کبھی ان کی امراؤ جان ادا کا یہ شعر یاد آنے لگتا ہے۔

کس کو سنائیں حال دلِ زار اداؔ   آوارگی میں ہم نے زمانے کی سیر کی

اور میں آوارگی کی جگہ عریانیت کا لفظ رکھ کر محسوس کرتا ہوں کہ عریاں نگاری ہی سے میں اس دور کے مبصر حیات کا فرض پورا کر رہا ہوں اور پھر وہی رسوا اور وہی امراؤ جان ادا کا یہ شعر یاد کر کے۔

ہم نہیں ان میں جو پڑھ لیتے ہیں لڑکوں کی طرح   مکتب عشق و وفا تجربہ آموز بھی تھا

اپنے دل کو تسکین دے لیتا ہوں کہ میری عریاں نگاری تجربہ آموز ضرور ہے اور اس میں زندگی پر غور کرنے والے کے لیے کوئی نہ کوئی اصلاحی پہلو ضرور نکلتا ہے کیوں یہ میرا زبردست عقیدہ ہے کہ زندگی مائل بہ اصلاح ہے اور لڑکھڑاتی، ڈگمگاتی، گرتی پڑتی اُس تعمیر کی طرف جا رہی ہے جو کائنات کا اہم ترین مقصد ہے۔

ماخذ (اُردو ـ ۸۶)

پردہ پوشی

ممتاز مفتی

باقی رہا عریانی کا مسئلہ۔ اس بارے میں' میں سچے دل سے کہہ سکتا ہوں کہ مجھے پردہ پوشی سے کوئی دل چسپی نہیں۔ لیکن عریانی کے خلاف میری نفرت غالباً اس وجہ سے ہے کہ میں عریانی کے پَرتو کی جھلک پیدا کرنے کی اہلیت نہیں رکھتا۔ اگر میرے کردار خوہ مخواہ جامے سے باہر نکل آئیں تو یہ میری نا اہلیت کا ثبوت ہے، بد نیتی کا نہیں۔

یا اگر' میرا موضوع یا افسانے کا مرکزی خیال (جسے پیش کرنے میں' میں کبھی کامیاب نہیں ہو سکا)، یا تصویر کا دوسرا رُخ (جسے پیش کرنے کا نہ جانے مجھے کیوں خبط ہے!) کسی ایک کردار کی جامہ دری کا مطالبہ کرے تو وہ نیم عریانی میری محنت پر دال کرتی ہے، نمائش پر نہیں۔

ماخذ (اُردو۔۴۸)

میں جان بُوجھ کر نہیں کرتا

اشفاق احمد

بعض حلقوں نے کہا کہ (اشفاق احمد) نے بڑی فحش کتاب لکھی ہے! میں نے 'سفر در سفر' کے بارے میں ہی پوچھا۔

'ہاں، پتہ۔ نہیں، مجھے سمجھ میں نہیں آئی۔ گورنمنٹ میں بھی یہی بات ہوئی تو میں نے کہا کہ، جی میں جان بوجھ کر نہیں کرتا...... اب میں اُسے پھر پڑھوں گا'

وہ مچھلی والا واقعہ!

'وہ...... ہاں...... وہ تو بہت سائنٹفک چیز ہے۔ اور اگر وہ یہاں تک پہنچتے ہیں تو یہ بالکل نادانی کی بات ہے۔ پھر تو یہ سارے بچوں کو زولوجی کی کلاس سے کان پکڑ کر باہر لے آئیں گے کہ تم مچھلی کے بارے میں پوچھنا چاہ رہے ہو۔ میری تو یہ لائن ہے نہ منصب'۔

ماخذ (اُردو۔۹۹)

اظہارِ حقیقت

ایم شفیق بریلوی

ہمارے ہاں ایک طبقہ ایسا بھی ہے جس کے نزدیک اظہار حقیقت ایک گناہ اور ایک جرم ہے۔ اس لیے وہ حقائق کی سچی تصویریں بھی شاعرانہ تاویلوں اور مبہم عکسوں کی صورت میں پیش کرتا ہے۔ لیکن قرین فطرت، رُخسار کو رُخسار ہی کہتا ہے اور میں اس کا قائل ہوں۔ لہٰذا کوئی اگر ان نقوش کو بھی فحش یا عریاں کہتا ہے، تو کہے۔

ماخذ (اُردو۔۵۱)

میرا ناول فحش نہیں

حاجی فضل الرحمان خاں
(ایڈوکیٹ)

’جی‘ میرا خیال ہے کہ میرا ناول ’آفت کا ٹکڑا‘ یہ ناول فحش نہیں ہے۔ اس میں دو کردار ہیں، رومنے گارٹ اور روزبے۔ رومنے گارٹ نیکی اور خیر کا نمائندہ ہے، روزبے بدی اور شر کا پیکر ہے۔ اسپین کے ایک عظیم انسان المنصور سے میں بے حد متاثر ہوا۔ المنصور بادشاہ بھی تھا، صاحب ظرف بھی۔ رومنے کے کردار کی تشکیل میں المنصور کی شخصیت کے عناصر بھی شامل ہیں۔

اس کے برعکس روزبے شیطان ہے، میں نے اس ناول کو ’سورۃ والتین‘ کی ایک آیت کی روشنی میں دیکھا اور لکھا ہے جس میں کہا گیا کہ ’ہم نے انسان کو بہترین پیدا کیا ہے اور اگر وہ گر جائے تو اسفل السافلین میں سے ہے‘۔ رومنے گارٹ بہترین میں سے ہے اور روزبے اسفل السافلین میں سے۔

فحاشی اور عریانی کے سلسلے میں یہ دیکھنا ضروری ہے کہ مصنف کی ہمدردیاں کس کے ساتھ ہیں وہ کن اقدار کو پیش کرتا ہے۔ آپ آفت کا ٹکڑا‘ دیکھیں اور محسوس کریں گے کہ میری تمام تر ہمدردیاں رومنے گارٹ کے ساتھ ہیں۔ روزبے صرف شیطنیت ہے۔ مجھے اسلام سے بے حد محبت ہے، اسلام کے لئے میں بڑے سے بڑا ایثار کر سکتا ہوں۔ اس ناول، آفت کے ٹکڑا میں‘ میں نے اسلام کی تبلیغ کی ہے۔ رومنے گارٹ کا عیسائیت سے بدظن ہونا، ایک طویل ذہنی سفر کی ابتدا ہے۔ اس ناول کے دوسرے حصوں

میں جو شائع نہیں ہوئے' میں جس ماحول کو پیش کر رہا تھا' جس سوسائٹی کا نقشہ کھینچ رہا تھا' اس کے افراد کو میں بہت اچھی طرح جانتا تھا، اینگلو انڈین اور انگریزوں کی جنس زدگی میرے مشاہدے میں رہی ہے، میں نے کوئی ایسی چیز شامل نہیں کی جو غیر حقیقی ہو، کرداروں کی نفسیات اور ان کے نفسیاتی اور جنسی رویے میں کہیں بھی مبالغہ نہیں کیا۔ نہ ہی چسکا پیدا کرنے کی کوشش کی ہے میں قانونی، اخلاقی اور ادبی لحاظ سے فحاشی کو ادب کا نام دے ہی نہیں سکتا۔ جو چیز فحش ہے' وہ سب کچھ ہو سکتی ہے' ادب نہیں۔ اس میں جمالیاتی عنصر نمایاں ہوتا ہے، اُسے آپ جمالیاتی حظ بھی کہہ سکتے ہیں۔ تحریریں جنہیں پڑھ کر جنسی ہیجان پیدا ہو' میں اسے فحش کا نام دوں گا'۔

اگرچہ ناول ضبط ہے' لیکن میں اسے فحش نہیں کہوں گا۔ ویسے بھی میں اس میں ناول پر پابندی لگانے کے خلاف رٹ کرنے والا ہوں۔ اس لیے مجھے قانونی طور پر بھی یہ استحقاق حاصل ہے کہ میں 'آفت کا ٹکڑا' کی صفائی پیش کر سکوں۔ جہاں تک مجھے معلوم ہو سکا ہے' مذہبی حلقوں نے مجھ پر لعنتیں بھیجی ہیں۔ میرے بعض ایڈوکیٹ دوستوں اور ہائی کورٹ کے فاضل ججوں نے اس کا مطالعہ کیا تھا۔ بعض کی نظر میں یہ اعلیٰ ادب پارہ تھا اور بعض کو اس کے کچھ حصوں پر اعتراض تھا۔

ماخذ (اُردو۔۹۳)

ایک 'بدنیت' بڑے میاں

خوش ونت سنگھ

سوال: آپ کی بعض تحریروں میں عریانی بطور ایک آلۂ اظہار کے استعمال ہوئی ہے۔ اس بارے میں خود آپ کی کیا رائے ہے!

جواب: خیر میرے یہاں اتنی عریانی تو نہیں۔ ممکن ہے آپ نے میری تمام تحریریں دیکھی ہوں' جن کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ میں تمام موضوعات مثلاً مذہب، فطرت اور انسانوں یعنی کبھی کچھ پر لکھتا ہوں اور میں کسی کی ممانعت نہیں مانتا' مگر میرے لئے جذباتی محبت، کے بارے میں کچھ لکھنا ممکن نہیں۔ میرے کردار تو فوراہی بستر پر پہنچ جاتے ہیں۔ مجھے معلوم ہے کہ یہ میری کوتاہی ہے۔

بات یہ ہے کہ انسانی جذبات کا اور وہ بھی مسلمہ جسمانی آداب کے تحت ذکر کرنا میرے بس کی بات نہیں۔ میں نے بتایا کہ مجھے کسی قسم کا حجاب نہیں اور اس لئے مجھے ایک 'بدنیت بڑے میاں' سمجھ لیا گیا ہے۔ میرا ذکر بھی اسی طرح ہوتا ہے مگر مجھے اس بارے میں کوئی پریشانی نہیں۔

ماخذ (انگریزی۔46)

بے اعتدالیوں کی بے نقابی

سلیم اختر

سوال: آپ کے بدگو آپ پر الزام دھرتے ہیں کہ آپ اپنی تحریروں کو ترغیب انگیز بنانے کے لئے ‘سیکس’ سے کچھ زیادہ ہی کام لیتے ہیں۔ کیا خیال ہے!

جواب: میں نے اپنی مختصر کہانیوں اور تنقیدی مضامین کے ذریعے معاشرے میں پائی جانے والی جنسی بے اعتدالیوں کو بے نقاب کرنے کی کوشش کی ہے۔ اگر آپ کو میری کسی کہانی میں ہم جنس پرست اُستاد یا اُستانی کا ذکر ملتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ہمارے اطراف میں ایسے کردار موجود ہیں۔ میری کوشش رہی ہے کہ میں ان کرداروں کے ذریعے یہ بتا سکوں کہ ہمارے معاشرے میں جنسی انحرافات کس حد تک سرایت کر چکے ہیں۔

جہاں تک ‘سیکس’ کو حد سے زیادہ کام میں لانے کے الزام کا تعلق ہے‘ تو یہ الزام اُن تمام مصنفین پر لگایا جاتا ہے جنھوں نے اس موضوع کو صاف گوئی سے برتنا چاہا ہے۔ منٹو اور عصمت کے دور تک تو اس الزام میں کسی حد تک ایک معنویت نظر آتی تھی کیوں کہ اُس وقت ‘سیکس’ پر مبنی موضوعات ممنوع سمجھے جاتے تھے، مگر آج جب کہ ہم خود اپنی ‘بلیو’ فلمیں بنا رہے ہیں‘ اس طرح کی باتوں میں کوئی نہیں آتا۔

ماخذ (انگریزی۔ 45)

عصمت کو بھی مات دے دی

واجدہ تبسم

اُن دنوں ہمارے ہاں بہت سے رسالے آیا کرتے تھے۔ ‘شمع’ سے لے کر ‘جمالستان’، ‘آریہ ورت’ اور ‘کامیاب’ تک۔ اور اسی قسم کے اور کئی دوسرے پرچے۔ میں ہر پرچہ الف سے لے کر ے تک چاٹ جایا کرتی تھی۔ اِدھر اُدھر جو میری دو چار کہانیاں چھپیں تو گویا زلزلہ ہی آ گیا:

‘واجدہ بیگم نے تو عصمت کو بھی مات دے دی’

‘ارے یہ افسانے کہیں شریف بہو بیٹیوں کے پڑھنے کے لائق ہیں!’

‘اُس کے افسانے تو شادی شدہ عورتیں بھی نہیں پڑھ سکتیں’

'دیکھنا' ایک دن باپ کی ناک کٹوا کر رہے گی'

'میری بیٹی ایسے افسانے لکھتی تو اپنے ہاتھوں گلا گھونٹ دیتی'

یہ بڑی عجیب وغریب بات ہے کہ یہ ساری باتیں چار سال پہلے کی ہیں۔ اور جو پہلے ڈرتے ڈرتے تھے کہ واجدہ خاندان کی 'رشتہ داروں کی' ناک کٹوائے گی' اب میرے پیچھے اپنے ملنے والوں سے فخریہ کہتے پھرتے ہیں کہ' ارے واجدہ تبسم! وہ تو میری بھتیجی ہے۔ بڑی ہونہار لڑکی ہے۔...... ہاں، ہاں، وہ واجدہ نا! وہ میری عزیز ہے۔ بڑی اچھی کہانیاں لکھ رہی ہے۔ اُس کے باپ تو میرے دوست تھے۔ خاندان کا نام روشن کر دیا بٹیا نے'۔

ماخذ (اُردو۔۴۹)

فحش نگاری کی انتہا کردی

واجدہ تبسم

'اُترن'...... میری حیدر آباد کے ماحول پر لکھی گئی کہانیوں کا مجموعہ آپ کے ہاتھوں میں ہے۔...... میں پیش لفظ' لکھنے سے بہت کتراتی ہوں۔ میں نے صرف اپنی پہلی کتاب 'شہر ممنوع' میں ایک 'بہت طویل مضمون' اپنے حالات زندگی سے متعلق لکھا تھا۔ حیدر آبادی ماحول پر لکھی ہوئی میری یہ کہانیاں بیک وقت میری رسوائی کا باعث بھی بنیں اور میری قدر دانی کا بھی۔

قدر دانی کا جہاں تک سوال ہے، اُسے فی الوقت جانے دیجیے کیوں کہ اپنے منہ سے اپنی تعریف صرف مشو کرتے ہیں اور میں اپنا شمار انسانوں میں کرتی ہوں، جو صرف حقیقت کا اظہار کرنا پسند کرتے ہیں۔ رسوائی کا بھی مجھے کوئی ایسا ڈر نہیں' لیکن الزامات کی فہرست جب ضرورت سے زیادہ لمبی ہو جائے تو قلم اٹھانا ضروری ہو جاتا ہے:

'واجدہ نے ہماری تہذیب کا مذاق اڑایا ہے'

'واجدہ نے حیدر آبادی اور دکنی بولی کا غلط استعمال کیا ہے، چٹخاروں کی خاطر زیادہ، وہاں کی تہذیب اور کلچر کو اجاگر کرنے کی خاطر کم: بہت کم'

'واجدہ نے نوابوں کے کردار دل سے تراشے ہیں'

'واجدہ نے حیدر آباد کی پاکیزہ تہذیب کو آڑ بنا کر' فحش نگاری کی انتہا کردی'

یہ اور ایسے ہی کتنے الزام......

فحش نگاری کا الزام ہی مجھ پر سے سرے غلط ہے۔ میں نے جو کچھ دیکھا ہے' وہ سلیقے اور پردہ داری کے ساتھ قلم سے ادا کردیا ہے۔ مجھے نہیں معلوم فحش نگاری کسے کہتے ہیں! ایک کہانی 'نولکھا ہار' سخت مورد عتاب بنی۔ ایسی تو میری کئی کہانیاں تھیں' جن کی وجہ سے وہ پرچے جلا دیئے گئے جن میں وہ چھپی تھیں۔ احتجاجی' جلوس نکالے گئے' دفاتر کو آگ لگانے کی کوشش کی گئی۔ مزے کی بات یہ ہے کہ مجھے قتل کرنے کی دھمکیاں دی گئیں اور 'نولکھا ہار' کی بعض پہیلیوں پر سخت غصہ اور غضب کا اظہار کرتے ہوئے مقدمے تک دائر کرنے کی کارروائی کی گئی۔

حضرت امیر خسروؒ جن کا آج کے ہندوستان میں سال منایا جاتا ہے، جن کا مقدس اور مبارک نام زبان پر آتے ہی دل عقیدت سے بھر جاتا ہے، انھی کی پہیلیاں اگر میں اپنی کہانی میں پیش کردوں تو اس قدر واویلا کیوں! اور جہاں تک مجھ پر حیدرآبادی اور دکنی زبان کو توڑ مروڑ کر پیش کرنے، مذاق اڑانے کا الزام ہے تو اس سے زیادہ بے تکی بات میں نے آج تک نہیں سنی۔

ماخذ (اردو۔۵۰)

پورنوگرافی کی تلاش

امرتا پریتم

'ہاں' میری تحریروں کی پورنوگرافی والا واقعہ بھی بڑا دلچسپ ہے۔ ۱۹۷۰ء کی ایشین رائٹرز کانفرنس کے موقعے پر مجھے اُس کی استقبالیہ کمیٹی کی چیئرپرسن منتخب کیے جانے کے بعد اوپر سے دباؤ پڑا تھا جس کے باعث ایک اسکریننگ کمیٹی بنا کر میری نظموں میں پورنوگرافی تلاش کی گئی۔

......اور معلوم ہوا کہ ۱۹۶۸ء کے موقعے پر میں نے چیکوسلوویکیہ پر جو نظمیں رقم کی تھیں' وہ پورنوگرافی تھی...... پورنوگرافی کی یہ تشریح شاید دنیا کے ادب میں اور کہیں نہیں ملے گی۔

ماخذ (اُردو۔۵۶)

نفسیاتی خانہ تلاشی

امرتا پریتم

جب کبھی کوئی خاتون کسی قحبہ کے بارے میں یا 'ٹیڑھے میڑھے' جنسی تعلقات کے بارے میں کچھ لکھتی اور ذہنوں کی نفسیاتی خانہ تلاشی لیتی ہے تو قارئین بلا مبالغہ یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ یہ سب کچھ لکھنے والی کی اپنی زندگی کی عکاسی کرتا ہے۔

مجھے بعض اوقات ایسے احمقانہ اور جھنجھلا دینے والے خطوط ملے ہیں جن سے ایک مریضانہ دل چسپی ٹپکتی ہے۔ میری عشقیہ نظم پڑھنے کے بعد، لوگ پوچھتے ہیں: 'بتاؤ تم نے یہ نظم کس کے لیے لکھی ہے! کون ہے وہ خوش نصیب! ذرا سوچیے' ایک شادی شدہ خاتون (یہ سوال سن کر) کتنی جھینپ جاتی ہوگی!

ماخذ (انگریزی۔ 23)

عصمت کا اثر

ہاجرہ مسرور

میں نے عصمت کا اثر بالکل قبول نہیں کیا۔ اثر قبول کرنے والی تو کوئی بات ہی نہیں تھی، کیوں کہ جب میں نے 'ہائے اللہ' لکھی تو عصمت کو پڑھا بھی نہیں تھا۔

اس کے علاوہ، عصمت اور منٹو اور دیگر ترقی پسند مصنفین کو تو میں نے اس وقت پڑھا ہے جب خود میرے افسانے ترقی پسند پرچوں میں چھپنے لگے۔ اور پھر ان لوگوں کے مجموعے تو مجھ تک بہت بعد میں پہنچے تھے۔

ماخذ (اُردو۔ ۱۱۳)

محض الزام

رضیہ بٹ

گوہر سلطانہ عظمیٰ: آپ اور آپ جیسی دوسری لکھنے والیوں پر یہ الزام عائد کیا گیا ہے کہ انھوں نے نوجوان لڑکیوں کے اخلاق خراب کیے۔

رضیہ بٹ: یہ الزام ایک مخصوص گروہ سے بھی مجھ پر عائد کیا گیا ہے، جس میں شامل ہونے سے میں نے انکار کر دیا تھا۔ کچھ لوگوں کو شاید میری مقبولیت سے جلن ہوتی ہے۔

میں ایک آدھ بار ادبی حلقوں میں بھی گئی ہوں، اور میں نے دیکھا کہ جو موجود ہیں، اُن کی تعریف کی جا رہی ہے اور جو موجود نہیں' ان کو تنقید کا نشانہ بنایا جا رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں بہت جلد اس قسم کی محفلوں سے متنفر ہو گئی۔ اب بھلے وہ جو چاہیں' مجھ پر الزام لگاتے پھریں، میں مزے سے گھر بیٹھی لکھتی رہوں گی۔

ماخذ (انگریزی۔ 12)

معاشرے کی عکاسی

بشرہ رحمان

میری تحریریں اس معاشرے کی عکاسی کرتی ہیں۔ میں ذرا 'بولڈ' ہو کر ضرور لکھتی ہوں، لیکن آپ اسے عریانیت نہیں کہہ سکتے۔

ماخذ (اُردو۔۱۲۵)

فحاشی کا فتویٰ

کشور ناہید

سوال: ادب میں فحاشی کیا ہوتی ہے!
جواب: یہ اُنھی سے پوچھیے جو ادب میں فحاشی کا فتویٰ دیتے ہیں۔
سوال: یہ سوال اس لیے ہے کہ آپ کی 'بین' ہونے والی کتاب 'عورت' پر یہی الزام دھرا جا چکا ہے۔
جواب: 'دی سیکنڈ سیکس' دنیا کی اہم ترین یونیورسٹیوں میں، سوشل سٹڈیز، ویمن اسٹڈیز، انتھروپولوجی، شوشیالوجی اور سائیکالوجی جیسے اہم شعبوں میں درسی کتاب کے طور پر پڑھائی جاتی ہے۔ یہ کتاب، عورت کی مبادیات اور عورت کی نشوونما پر معلومات فراہم کرتی ہے۔ کیا یہ ہماری بدقسمتی اور دوغلا پن نہیں کہ ہم نے اپنی ذات سے فرار کے لیے ایک بنیادی کتاب کو فحش قرار دے دیا! ہمارا بس چلے تو ہم عورت کو مجسم زندہ درگور کر دیں۔

ماخذ (اُردو۔۱۳۵)

اے کی لکھ دِتّا اے!

پروین عاطف

میرے پاس کوئی بھی ایسا موضوع نہیں کہ اُسے چھپا کر لکھوں۔ زندگی کی عام سی چیزیں ہیں، اور اس کا ثبوت (میرے) بنکاک کے سفرنامے میں مل سکتا ہے۔ اب اگر لوگ یہ کہیں کہ 'اوئی پروین، اے کی لکھ دِتّا اے' تو میں کیا کروں! میرے پاس بیمار خیالات نہیں۔

ماخذ (اُردو۔۱۲۴)

روشنی کم، تپش زیادہ

مورس زیغورس

‘بدچلن بنانا اور اخلاق خراب کرنا، میرا کاروبار ہے۔ میرا کام ان ممنوعہ کتابوں اور شرم ناک مواد کو چھاپنا ہے، جن پر اس کتاب میں بحث کی گئی ہے۔ عیاشانہ ادب کو چھاپنے کے میرے خصوصی تجربے کی بنا پر مجھے بھی اس اجتماعی مطالعے میں شرکت کی دعوت دی گئی ہے، اور میں یہ سمجھتا ہوں کہ میں اس دعوت نامے کا حق صرف اسی صورت میں ادا کرسکتا ہوں جب آپ کو ہر بات صاف صاف بتادوں۔

بہ یک وقت اتنے سارے امتناعات کو کچل کر رکھ دینا کوئی آسان بات نہیں ہے۔ ان میں سے کچھ تو جوش دلاتے ہیں، مگر کچھ ایسے بھی ہیں جو از خود معدوم ہوتے چلے جاتے ہیں۔ ان کتابوں کی اشاعت کی بنا پر مجھے ملزم ٹھہرایا گیا، مجھ پر مقدمات چلائے گئے، مجھے سزائیں دی گئیں، میری ذلت کی گئی اور مجھ پر حملے کیے گئے۔ ان تمام باتوں نے مل کر میرے ایک فلسفے کا روپ دھار لیا ہے۔

ردِعمل کے اس بے لگام تشدد اور تعصب کی اس شدت پر میں ایک طویل عرصے تک حیران رہا ہوں۔ مطالعہ ایک نجی معاملہ ہے اور جو شخص کسی کتاب کے پڑھنے کا فیصلہ کرتا ہے، وہ گویا اس سلسلے میں، اپنی ذہانت اور اپنے تخیل کا ایک مخصوص حصہ اس بات پر صرف کرتا ہے جو مصنف کا نقطۂ نظر سمجھنے اور اس کے تخلیق کردہ افسانے کی تشکیل نو کے لیے ضروری ہے۔ ان معنوں میں، مطالعہ ایک مثبت عمل ہے اور اسے دفع الوقتی کے دیگر مشغلوں سے مختلف سمجھنا چاہیے، مثلاً فلم بینی جس کے لئے محض اثر پذیری درکار ہوتی ہے اور بس۔ اس کے برعکس، جو شخص ایک کتاب پڑھتا ہے، خواہ وہ کسی نوعیت کی کیوں نہ ہو، اسے کتاب کے انتخاب کا تھوڑا، بہت حق اور اس پر تنقید کی صلاحیت درکار ہوتی ہے، اور یہی وہ بات ہے جو اس شخص کو ایک خاص ذہنی سطح پر لاکر کھڑا کرتی ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ آخر سماج، جس کی نمائندگی، چند انجمنیں، مذہبی پیشوا اور افسران کی ایک خاص تعداد کرتی ہے، کسی قاری کی پسند و ناپسند یا عادات کا اخلاقی محاسبہ کیوں کرے!

اگر کوئی شخص اس مسئلے کی گہرائیوں میں اترے، تو معلوم ہوگا کہ اخلاقی احتساب کا اطلاق فی الحقیقت صرف جنسی موضوعات پر کیا جاتا ہے۔ جی، لیگ مین کہتا ہے کہ لوگوں کو ایسے وحشت ناک جرائم کے متعلق تو پڑھنے کی اجازت ہوتی ہے جو فطرت کے خلاف ہوں، مگر انھیں جنس کے بارے میں پڑھنے سے روکا جاتا ہے، حالاں کہ جنس تو فطرت کا عین اظہار ہے۔

اس قسم کی تفریق سے شہوانی ادب کے مسئلے پر بطور خاص روشنی پڑتی ہے۔ گو کہ یہ سوال اپنی جگہ خود اہم نہیں، تاہم اس ضمن میں ہمارا رویہ کافی اہمیت کا حامل ہے۔ اس لئے کہ تا حال کوئی یہ ثابت نہیں کر سکا کہ شہوانی ادب مضرت رساں ہے اور نہ کبھی کسی نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی۔

پھر آخر اتنے سارے لوگ، فحش ادب کے خیال ہی سے چونک کیوں اٹھتے ہیں، خوف زدہ کیوں ہو جاتے ہیں، انھیں گھِن کیوں آنے لگتی ہے! لگتا یوں ہے کہ تمام مسئلے کی جڑ یہی ایک سوال ہے۔

۱۹۵۳ء میں اولمپیا پریس کی بنیاد رکھتے وقت میرے سامنے تین اہم مقاصد تھے: پہلی بات تو یہ کہ میرے پاس پیسے بالکل نہ تھے اور میں جلد از جلد کچھ رقم بنانا چاہتا تھا۔ پھر یہ کہ میں طباعت میں اپنا کاروبار دوبارہ چمکانا چاہتا تھا جہاں سے کچھ عرصہ پہلے بعض حوصلہ شکن وجوہ کی بنا پر، میرے قدم بُری طرح اکھڑ گئے تھے اور آخری بات یہ تھی کہ میں دیکھنا یہ چاہتا تھا کہ احتساب کے اس نظام کو، جس نے ایک اخلاقی ادارے، ایک روایت اور ایک طرز حکومت کی شکل اختیار کر لی ہے، میں یک و تنہا رہ کر، جڑ سے اکھاڑ پھینکنے میں کس حد تک کامیاب ہو سکتا ہوں۔

خالص فحش نگاری کے علاوہ ابتدا ہی سے اولمپیا پریس نے اُن اچھی کتابوں کی اشاعت کا بھی انتظام کیا جن کو انگلستانی اور امریکی احتسابی ادارے غیر قانونی قرار دے چکے تھے۔ غالباً ایک نہ ایک دن مجھے اس بات پر شاباش ضرور ملے گی کہ میں نے سیموئل بیکٹ، (SAMUEL BECKETT)، ژاں ژینے (JEAN GENET)، نابا کوف (NABAKOV)، ولیم بوروغ (WILLIAM BURROUGHS)، ڈی ساد (DE SADE)، جے پی ڈان لیوی (DON LEAVY)، ری مون کیونو (RAYMOND QUENEAU) اور دیگر ایسے مصنفین کو انگریزی بولنے والے عوام سے پہلی بار روشناس کرایا جن میں سے بعض میرے برطانوی اور امریکی ہم پیشہ حضرات کی نظروں سے اوجھل تھے۔ اس نوعیت کے مصنفین کے سلسلے میں انجام کار مجھے اگر سراہا نہیں گیا تو معاف ضرور کر دیا جائے گا۔ لیکن، جہاں تک دوسروں کا تعلق ہے، یعنی ان فحش نویسوں کا جنھوں نے صرف اس قسم کے لذت پارے لکھے، مثلاً 'ہو پنشڈ پولا'، 'وہائٹ تھائز'، 'چیریٹ آف فلیش'، 'وھپ اینجلز' اور 'سیکشوئل لائف آف رابن سن کروسو'...... تو سوال یہ ہے کہ بد ذوقی کے اس طوفان کو برپا کرنے پر مجھے معاف کیسے کیا جا سکتا ہے!

مگر میں پھر بھی کسی صورت میں، اپنے ان مصنفین سے لاتعلقی کا اظہار کرنے پر تیار نہیں۔ کیا یہ مصنفین پیسے کی خاطر لکھتے ہیں! جی ہاں، یقیناً۔ مگر اس طرح تو سبھی لکھنے والے پیسے کی خاطر لکھتے ہیں۔ پھر میں یہ بات تسلیم نہیں کرتا کہ اگر کسی کتاب میں عریانی ہے تو وہ لازماً ایک بُری کتاب ہے۔ میرے خیال میں ایک ایسا گم نام ناول جو صرف پیسے کی خاطر لکھا گیا ہو اور شہوت انگیز مناظر سے لب ریز ہو، وہ

بھی ادب کے طور پر قابل قبول ہوسکتا ہے۔ اس ضمن میں' میں ان مصنفین کا ذکر کروں گا جو فرضی ناموں سے لکھتے رہتے ہیں' مثلاً ہیریٹ ڈیملر (HARRIET DAIMLER) ' پیری اونژلیک (PERRE ANGELIQUE) ' فرانسز لینگل (FRANCES LENGEL) ' اکبر پی اومبو (AKBAR PIOMBO) ' میکس ویل کینٹن (MAXWELL KENTON) ' ہنری کریانک (HENRY CRANNACH) ' پال میرو وکاریون (PALMIRO VICARION) ' فاؤسٹینو پیرز (FAUSTINO PEREZ) ' تھامس پیچم (THOMAS PEACHUM) ' ولی بے رون (WILLY BARON) ' ولیئم ٹالسمین (WILLIAM TALSMAN) وغیرہ۔

چند سال پیشتر یہ بات فیشن کے طور پر کہی جاتی تھی کہ ہنری ملر ایک ایسا بدمعاش ناول نگار ہے جو دولت بٹورنے کی خاطر اپنے ناولوں میں عریانی سے کام لیتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ میں نے مختلف موقعوں پر فرانسیسی پولیس اور عدالتوں کو بڑی شد و مد سے یہ باور کرانے کی کوشش کی ہے کہ ان کا یہ خیال لغو ہے۔ اس لئے کہ اگر ملر' فحش نگاری کے ذریعے دولت کمانا چاہتا تو وہ انگریزی بولنے والے ممالک کے لئے اپنے جنسی مناظر ذرا ہلکے رنگ میں پیش کر دیتا۔ ورنہ وہ اس بات پر ہی آمادہ ہو جاتا کہ اس کی کتابیں ان ممالک میں' حذف شدہ صورت میں شائع ہوں۔ مگر اس قسم کی مفاہمت سے انکار کر کے' ملر نے اپنی ادبی دیانت داری کا ثبوت دے دیا۔

یہ مثال اس لئے اہم ہے کہ ملر کو جن لوگوں نے اس قسم کے در پردہ مقاصد کا ملزم ٹھہرانے کی کوشش کی' وہ پیشہ ورانہ رقابت کا شکار تھے۔ جنسیت کتاب کی فروخت کی ضامن ہوتی ہے اور روایتی ناول نگار اپنی کتابوں میں اشاروں کنایوں کی مدد سے اتنی جنسیت شامل کر لیتے ہیں' جتنی اُس دور کی ادبی شائستگی انہیں اجازت دیتی ہے۔ اس صورتِ حال میں یہ بات کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ ملر جیسے 'ظالم' مدمقابل کے اچانک ظہور کو ان معزز ہنرمندوں نے اپنے لئے' جمالیاتی سے زیادہ مالی تباہی کا پیش خیمہ سمجھا۔ اس لئے کہ اس نے اپنی پہلی ہی کتاب میں تمام اصولوں کو درہم برہم کر کے رکھ دیا اور اپنے طاقت ور حملوں سے تمام خوب صورت رازوں کے پردے چاک کر دیئے۔ اور پھر وہ ایک ایسے نئے فنی عہد کے نقیب کے طور پر ابھرا جس میں فن کار کا تخلیقی مواد' فن کار کی اپنی ذات ٹھہری۔ گویا وکٹوریائی طرز کی طویل داستانوں' شہرت کے خوابوں اور اسکول کی بچیوں کے معصوم گیتوں کی بجائے' فن کار اپنا مواد اپنے ہی گوشت پوست' خون پسینے اور دھات سے حاصل کرنے لگا۔

سر ایلن ہربرٹ نے فحش اشاعتوں کے بل کی کمیٹی کے سامنے برطانوی مصنفین کی نمائندگی کرتے ہوئے اسی قسم کے خیال کا واضح اور ایماندارانہ اظہار کچھ یوں کیا: 'جب میں کوئی کتاب لکھتا ہوں تو یہ نہیں سوچتا کہ میں "اخلاق خراب نہیں کروں گا"۔ میں تو اپنی کتاب یہ سمجھ کر لکھتا ہوں کہ

مجھے اپنے عشقیہ اور جنسی مناظر سچائی اور خلوص کے ساتھ پیش کرنا ہیں، گو کہ میں اس دوران اپنے اوپر فن کارانہ قدغن عائد کیے رہتا ہوں۔ لیکن میرے سامنے یہ سوال قطعی نہیں ہوتا کہ آیا میں کسی کا اخلاق تو خراب نہیں کر رہا! یہ خیال نہ میرے دماغ میں آتا ہے اور نہ میرے ناشر کے دماغ میں۔ آپ لوگ دراصل اس آدمی کی تلاش میں ہیں جو لکھنے سے پہلے، بیٹھ کر یہ سب کچھ سوچتا ہے۔ میں نے اپنی اس یاد داشت میں انگریزی کی ایک پرانی اور بڑی اچھی ترکیب استعمال کی ہے اور مجھے یقین ہے کہ آپ مجھے اس کے لئے معاف کر دیں گے۔ اور وہ یہ ہے کہ وہ اپنے قارئین کو اتنا 'بے قابو' کرنا چاہتا ہے، جس قدر کہ وہ کر سکے۔ دراصل یہ وہی آدمی ہے جس کی آپ کو تلاش رہی ہے۔ یہ اس آدمی کا درد سر نہیں کہ آیا وہ کسی کا اخلاق تو خراب نہیں کر رہا! تکلف برطرف، وہ تو لذت کا سوداگر ہے اور اسے یہ معلوم ہے کہ جس چیز کو وہ بیچ رہا ہے، اس کی مارکیٹ میں مانگ ہے۔ اس صورت حال کے پیش نظر ہم یہ کہیں گے کہ مشق نمبر ۲ میں آپ جس مسئلے سے دوچار ہیں، وہ دراصل مجھ میں، اور اس دوسرے شخص کے مابین امتیاز کرنے ہی کا مسئلہ ہے۔

یہاں پر یہ بات اخذ کی جا سکتی ہے کہ سرایلین کا اشارہ ہنری ملر کی طرف نہیں کیوں کہ گزشتہ تیس برسوں کے دوران ملر کو ایک پرخلوص فن کار کے طور پر تسلیم کیا جا چکا ہے اور اسے مطعون کرنے کی رسم اب پرانی ہو چکی ہے۔ سرایلین کی مراد تو یقیناً ان لوگوں سے ہے جو شہوت کی تجارت کرتے ہیں۔ اس لیے کہ ان کو معلوم ہے کہ چیز بکتی ہے اور وہ اپنے اس کاروبار میں کسی 'فنی قدغن' کو آڑے نہیں آنے دیتے جسے سرایلین بہر طور ضروری سمجھتے ہیں۔ قدرتی طور پر، اس سیاق میں 'فن کارانہ ضبط' کو اس کے صحیح مفہوم میں کچھ یوں سمجھنا چاہیے کہ وہ خود احتسابی کی ایک ایسی شکل ہے، جسے برتے بغیر آپ متوسط طبقے کے درمیان کاروبار نہیں کر سکتے۔ 'فنی' صرف ان معنوں میں کہ جنسیت کی ایسی صحیح مقدار پیش کرنے میں ایک خاص مہارت جو دونوں باتوں سے ہم آہنگ ہو یعنی وہ اس صاف ستھرے ذوق پر گراں بھی نہ گزرے جو متوسط طبقے سے مخصوص ہے اور جو تجارتی کامیابی کی بھی ضامن ہو۔

روایتی ناول نگاروں کا اپنی 'اجارہ داری' قائم کرنے کا یہ فطری رجحان جسے وہ غیر متوازن مسابقت سمجھتے ہیں اور جیسے غیر قانونی ٹھہرانے میں انھیں اپنے حاشیہ بردار نقادوں اور ناشروں کا پورا تعاون حاصل ہوتا ہے، احتساب کی بنیادی وجوہ میں سے ایک اہم وجہ ہے۔

کیا کسی اچھی تحریر کی کسوٹی صرف یہ ہے کہ اس میں پیسے کا لالچ شامل نہ ہو! تو میں ڈرتے ڈرتے یہ عرض کروں گا کہ یہ محض کمی بیشی کا سوال ہے کیوں کہ بعض نہایت محترم اساتذائے فن کے یہاں تو کاروباری حس کچھ زیادہ ہی غیر معمولی ہوتی ہے۔

جہاں تک میرے گم نام مصنفین کا تعلق ہے، تو یہ بات باعث حیرت ہو سکتی ہے کہ ان کا

اولین مقصد پیسہ کمانا نہیں تھا۔ میں پورے خلوص کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ کتاب لکھنے کا موقع یا اس کا تجربہ ان کے لئے اس حقیر معاوضے سے کہیں زیادہ پرکشش تھا جو انھیں ان کی کاوشوں کے عوض ملا کرتا تھا۔ انھیں اظہار کی پوری آزادی تھی لیکن انھوں نے اس آزادی کو شاذ و نادر ہی سستے پن کے لئے استعمال کیا ہوگا۔ ان میں بعض نے تو اب تصنیف وتالیف کو اپنا جائز ذریعہ معاش بنالیا ہے اور اس سلسلے میں ان کے اپنے پرانے اور خفیہ تجربات بڑے کارآمد ثابت ہوئے ہیں۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ایک 'فحش' اور 'غیر فحش' ناول میں فرق کیا ہوتا ہے!

فنی اعتبار سے اسلوب، پلاٹ، ہیئت اور مکالمات کے مسائل ایک سے ہیں۔ موضوعات بھی وہی ہیں کیوں کہ میں سمجھتا ہوں کہ آج کل شائع ہونے والے ناولوں میں پچانوے فیصد کا موضوع انسانی جذبات ہی ہوتے ہیں۔

قدرتی طور پر ان میں کیفیت کا فرق ہوتا ہے' لیکن ہر زمرے کے ناولوں میں اقدار کے متوازی پیمانے ملتے ہیں۔ مثلاً ایک ایسا ناول جو فحش نہ ہو' گھٹیا بھی ہوسکتا ہے اور ایک فحش ناول اعلیٰ قسم کا بھی ہوسکتا ہے۔ اس آخری صفت کا انحصار سراسر لکھنے والے کی صلاحیت اور ذہانت پر منحصر ہوتا ہے۔

کیا اصل فرق اخلاقیات یا سماجی افادیت کا ہے! اگر میرا دعویٰ ہے کہ روایتی ناول 'نمونہ فحش ناولوں کے مقابلے میں کچھ کم بُرے اور سماجی اعتبار سے کم مضرت رساں نہیں ہوتے۔

ہر دو زمروں کے ناولوں کے مابین اصل فرق کسی اور بات کے علاوہ صرف زبان کے دائرۂ استعمال کا ہوتا ہے۔ گویا مصنفین کی ایک قسم تو ممنوعہ الفاظ استعمال کرتی ہے جب کہ دوسری قسم کے مصنفین ان سے قطعی گریز کرتے ہیں۔ یہ فرق جنسی جذبات و اعمال کو بیان کرتے وقت اور بھی نمایاں ہوجاتا ہے۔ اس لئے کہ پہلی قسم کے مصنفین کے ہاں یہ اظہار نہایت واشگاف الفاظ میں ہوتا ہے جب کہ دوسری قسم کے لکھنے والے ان موضوعات پر لکھتے وقت محتاط رہتے ہیں اور بات انتہائی گھما پھرا کر کرتے ہیں۔

اس طرح ہر زمرے میں کیفیات کی متعدد صورتیں ملتی ہیں اور ہمیں ان تمام صورتوں کو پیش نظر رکھنا ہوگا ورنہ ہم شدید ابہام کا شکار ہوجائیں گے جیسا کہ آج کل ہورہا ہے۔ ژان ژینے کے ناول 'اور لیڈی آف دی فلاورز اور ایک احمقانہ انداز میں لکھی ہوئی عریاں کتاب میں وہی فرق ہے جو ایک بہترین روایتی افسانے اور قتل کی ایک گھٹیا کہانی میں ہوتا ہے۔

تصانیف کے سلسلے میں جب کبھی 'عریاں' اور 'فحش' جیسے صفاتی الفاظ کی تشریح کا موقع آتا ہے تو خود احتساب کے حامی ان الفاظ کی تشریح میں ناکام ہوکر چند مزید ہم معنی الفاظ پیش کرکے رہ جاتے ہیں۔ مثلاً اشاعتوں کے بل کی منتخب کمیٹی (جس کا ذکر پہلے آچکا ہے) کے اراکین یا وہ گواہان جو

اس کمیٹی کے سامنے پیش ہوئے' ان سبھی حضرات نے 'عریانی' اور فحاشی کی وضاحت جن الفاظ کے ذریعے کرنے کی کوشش کی وہ یہ تھے: ناشائستہ' نفرت انگیز' عیاشانہ' گھناؤنا' مکروہ۔ ان کے علاوہ دوسرے الفاظ استعمال نہیں کیے گئے اس لئے کہ موجود ہی نہیں۔

سوال یہ ہے کہ کسی واضح اور سمجھ میں آنے والی بات کی بجائے اس قسم کے صفاتی الفاظ کیوں استعمال کئے جاتے ہیں! اس کمیٹی کا مقصد تو عریاں مطبوعات کے سلسلے میں برطانیہ کے نئے قانون کی وضاحت کرنا تھی اور اس طرح اس کے ذمے بنیادی کام تو یہ تھا کہ وہ عدالتوں کو بتاتی کہ 'عریاں اشاعت' کسے کہتے ہیں!۔

اس کے برعکس ہوا یہ کہ ایسے خوف ناک صفاتی الفاظ کی ایک قطار لگادی گئی جن سے ان افراد کے سراسر داخلی اور جذباتی رویے کھل کر سامنے آ گئے جنھیں احتساب کو موثر بنانے اور اس سلسلے میں رہنمائی کے لئے منتخب کیا گیا تھا۔

شہوانیت پر احتساب کے مسئلے کے عمیق اور دوررس ہونے کی اصل وجہ یہی ہے کہ یہ مسئلہ اتنے سارے لوگوں کو اس حد تک نامعقول اشتعال پر آمادہ کر دیتا ہے۔

احتساب کے جواز میں اس کے مویدین نے جو دلائل پیش کئے ہیں ان کو دو حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے: 'یہ ایک سماجی ضرورت ہے' خصوصاً تعلیم کے میدان میں' اور یہ کہ احتساب روایتی اور مذہبی نوعیت کی ایک اخلاقی ضرورت کو پورا کرتا ہے۔

جہاں تک 'سماجی ضرورت' والی دلیل کا تعلق ہے تو گزشتہ صدی میں اس کی بری طرح قلعی کھل چکی ہے۔ مگر قانون کے الفاظ اپنی جگہ موجود ہیں اور اپنے گہرے مقاصد کا اظہار نہایت واضح طور پر کرتے ہیں۔ ۱۸۶۸ء سے برطانوی عدالتوں کے نزدیک ان معنوں میں کوئی تحریر اس وقت عریاں ہوگی جب 'مواد کا رجحان جس پر عریانی کا الزام ہے' ان کو بداخلاقی کی طرف مائل کرنا ہو' جن کے اذہان اس قسم کے اثرات کو قبول کر سکتے ہیں اور اس قسم کی اشاعت جن کے ہاتھ لگ سکتی ہے'۔

بہ الفاظ دیگر 'اچھے لوگوں اور کام کاج کرنے والوں کو نہ صرف جنس کی آفاقی نوعیت بلکہ اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ انھیں شہوانیت کی جائز ماہیت سے ایک سعادت مندانہ لاعلمی میں رکھا جائے۔

آج کے دور میں یہ تمام باتیں ایک ایسی گھٹیا منافقت لگتی ہے کہ کوئی بھی شخص اس نظریے سے متعلق حرفِ تائید نہیں کہہ سکتا۔ یہ ثابت کرنا حقیقتاً مشکل ہے کہ افراد کا ایک طبقہ تو وہ ہے جس کے لئے شہوانیت ضرر رساں ہے اور ایک دوسرا طبقہ بھی ہے جس کے لئے ایسا نہیں۔ یوں بھی اب ہمارے درمیان سرجن ایکٹن جیسے مبصر حضرات موجود نہیں رہے جس نے (ہیولاک ایلس کے بقول) ایک صدی قبل جنسی مسائل پر ایک مقالہ میں کہا تھا کہ 'جنسی لذت کو خواتین سے منسوب کرنا ان پر ایک گندی تہمت لگانا ہے'۔

مگر سماجی افادے والی دلیل آج بھی کسی بدلی ہوئی شکل میں ضرور موجود ہے' یعنی بالغ حضرات جو چاہیں کر سکتے ہیں بلکہ چاہیں تو اپنے آپ کو واصل جہنم بھی کر سکتے ہیں' مگر بچّوں کو 'برے اثرات' سے بچانا ضروری ہے'

یہ کسی حد تک ایک چکرا دینے والی دلیل ہے۔ ہمیں اس بات کو ماننے پر مجبور کیا جا رہا ہے کہ اگر اخلاقی احتساب کا اطلاق بڑوں پر نہ ہو تب بھی بچوں پر اس کا اطلاق ضروری ہے اور چوں کہ اس بات کا خطرہ ہے کہ بچّے اتفاقاً یا چپکے سے بعض جنسی کتابیں پڑھ لیں گے جو بالغوں کے لئے لکھی گئی ہوں' اس لئے بچوں کے تحفظ کی خاطر ایسی تمام کتابیں ممنوع قرار دی جانی چاہئیں۔ بنا بریں 'بزرگوں' کو چاہیے کہ وہ اس قربانی کو ایک مقدس فریضہ سمجھتے ہوئے قبول کر لیں۔ اس قسم کی بحث کی تہہ میں جانا تضیع اوقات کے سوا کچھ نہیں' مگر اس کی موجودگی پر نظر رکھنا اس لئے ضروری ہے کہ معلوم ہو سکے کہ تا حال یہ بحث کس سطح پر چل رہی ہے۔

بچوں کو بالغوں کی شہوانی تفریحات سے دل چسپی نہیں ہوتی۔ نام نہاد فحش نگاری کی طرف بچوں کا تجسس محض اپنے بڑوں کے اس انتہائی مصنوعی اور رازدارانہ رویے سے پیدا ہوتا ہے جو وہ اس فرسودہ سراب کے سلسلے میں اختیار کرتے ہیں۔ ان حالات میں اگر ایک دن یہ بچے کند ذہن اور رواجوں کے مارے اور خود ساختہ اندیشوں سے سحر زدہ ہو جائیں تو ہمیں یہ بات اچھی طرح معلوم ہونا چاہیے کہ 'فحاشی' کو اس سلسلے میں کسی بھی صورت مورد الزام قرار نہیں دیا جا سکتا بلکہ اس قسم کے مہلک نتیجے کی تمام تر ذمے دار وہ مثال ہوگی جو ان والدین نے ان بچوں کے لئے قائم کی اور محرومی اور منافقت کا وہ ماحول ہوگا جس میں ان کی پرورش ہوئی۔

رجعت پرستی کی شدید لہروں کے باوجود گزشتہ جنگ کے بعد سے انگریزی بولنے والے ممالک میں ذہنی آزادی کا ارتقا قابل توجہ ہے۔ انگلستان اور امریکا میں 'لیڈی چیٹر لیز لوز' کی حالیہ اشاعت اور آخر الذکر میں ہنری ملر کی 'دی ٹروپک آف کینسر' کی اشاعت اس سلسلے میں قابل ذکر واقعات ہیں اور ان کی خاص اہمیت بھی ہے، چوں کہ یہ دونوں کتابیں ایک طویل عرصے تک ممنوعہ ادب کی علامات سمجھی جاتی رہی ہیں۔

چند ہی سال میں یہ ارتقا مکمل ہو جائے گا اور کم از کم مغربی ممالک میں اخلاقی احتساب ہمیشہ کے لئے ترک کر دیا جائے گا۔ موجودہ پیش رفت کا یہی ایک فطری' منطقی اور خوش کن نتیجہ ہے۔

اگر چہ اس قسم کا امکان صاف نظر آتا ہے تاہم یہ دور کی بات ہے اور ابھی موقع ہے کہ ہم احتساب کے اس تجربہ کا قریب سے جائزہ لیں تا کہ ہمیں یہ معلوم ہو سکے کہ آج ہمارا تجربہ کیا ہے اور آئندہ چند سال میں کیا ہونے والا ہے۔

آدمی جو کچھ ہے اور اس نے اپنے لیے جو اخلاقی مثالیہ بنا رکھا ہے' اس میں ایک ایسی وسیع خلیج حائل ہے جو آسانی سے پاٹی نہیں جا سکتی۔ ڈاکٹر کنسے نے ہمارے سامنے اس کی' جسے وہ 'بشری حیوان' کہتا ہے' ایک واضح تصویر پیش کی ہے اور ہم اس کی تحقیقات کی صحت سے انکار نہیں کر سکتے۔ ان تحقیقات کے مطابق' ہم ایک ایسی اکائی ہیں جسے مناسب حالات میں 'ایک ہفتے میں ۳.۳ بار انزال ہوتا ہے۔ ہم جنسیت اور اس سے بڑھ کر' خود لذتی ہماری ساخت میں اس حد تک شامل ہیں کہ شاید ہم اعتراف کی زحمت بھی گوارا نہ کریں۔ ہم 'بری بھلی زندگی گزارنے والے ایک ایسے ہیرو ہیں جسے سماج نے چاروں طرف سے گھیر رکھا ہو۔ ہم تعلیم اور اپنے ماحول کے دباؤ کے اس حد تک زیر اثر ہیں کہ اپنے دماغوں میں پیدا ہونے والی ہزار ہا لہروں میں کوئی بھی ایک ایسا خیال پیش نہیں کر سکتے جسے ہم خود اپنا کہہ سکیں۔

ہماری توانائی کا ایک بہت بڑا حصہ اس اخلاقی مثالیہ پر پورا اترنے کی کوشش میں صرف ہو جاتا ہے جو ہمارے لئے پہلے سے تراشا جا چکا ہے اور جس کی مقبولیت پر ہم نے کبھی شک نہیں کیا، محض اس لئے کہ خود اپنا مثالیہ تعمیر کرنے میں ہمیں اس سے بھی زیادہ توانائی صرف کرنا ہوگی۔ جان پر کھیل کر ہم وہ کچھ نظر آنے کی کوشش کرتے ہیں' جو ہم نہیں ہیں اور ایسا کرتے ہوئے ہم اپنے آپ کو جن تشنجی کیفیات سے دوچار پاتے ہیں' وہ جدید معاشرے کی خوف ناکیوں اور ناکامیوں کو سمجھنے کے لئے کافی ہیں۔

اگرچہ احتساب کے مذہبی سرچشمے واضح ہیں مگر یہ بات قابل غور ہے کہ اکثر لوگ اپنے آپ کو مکمل ملحد ظاہر کرنے کے باوجود جبلی طور پر اسی اخلاقی نظام کی پیروی کرتے ہیں جو یہودی اور مسیحی روایات کے مطابق ہے۔ یہ تمام تر وہ روایات ہیں جو کسی بنیادی تعلیم کا نتیجہ نہیں بلکہ عموماً محض ایک سماجی ڈھانچے کی علامت ہیں۔

مثال کے طور پر' جنسی اخلاق کی بنیاد جس کی تعلیم کلیسا نے دی، اس کا زیادہ تر انحصار سینٹ پال کی ان راہبانہ تعلیمات پر منحصر ہے جس کا ذکر 'کرنتھیوں کے نام پہلے عام خط' میں موجود ہے: 'پس میں بے بیاہیوں اور بیواؤں کے حق میں یہ کہتا ہوں کہ ان کے لئے ایسا ہی رہنا اچھا ہے جیسا میں ہوں۔ لیکن اگر وہ ضبط نہ کر سکیں تو بیاہ کر لیں کیوں کہ بیاہ کر لینا مست ہونے سے بہتر ہے'

اس خط پر پہلے بہت تبصرے ہو چکے ہیں اور اس کی مختلف تفسیریں کی جا چکی ہیں۔ اس خط کو رومن کیتھولک حضرات شک کی نظر سے دیکھتے ہیں کیوں کہ اس کی بنا پر ان کے تقدس نسل کے نظریہ کی تائید نہیں ہوتی جو شہوانی لذائذ کی رسوائیوں کے خلاف ہے۔ شاید اس کی وجہ اس خط کے اصل مخاطبین میں تلاش کی جا سکتی ہے۔ پال کا پیغام عوام کی کسی بڑی اکثریت یا کسی شہر یا ملک کی پوری آبادی کے لئے نہ تھا۔ یہ کرنتھی کلیسائے قبرص کے اراکین تھے اور ان کی تعداد سو (100) سے بھی کم شاگردوں پر مشتمل تھی۔ یہ اس قسم کے تارک الدنیا لوگ تھے جن کے لئے ایک ایسے مکاشفے سے مراد کسی نئی طرز کا سماجی

رویہ نہیں بلکہ ایسی روحانی تکنیک تھی جو ایک ایسے اثر آفرین تجربے کی کھلی راہ تھی جس میں بڑے ضبط اور بڑی قربانیوں کی ضرورت پیش آتی تھی۔ مگر ایسی قربانیاں جو بہ رضا و رغبت پیش کی جائیں کیوں کہ 'بیاہ کر لینا مست ہونے سے بہتر ہے' اور ہر شخص کو خدا کی طرف سے ملی ہوئی خاص توفیق کی روشنی میں اپنے لئے مناسب راہبانہ تکنیک تلاش کرنا ہے۔

حالاں کہ ویدانتی اور بدھ مت مذاہب نے رہبانیت کے اثر آفرین مفہوم کو زندہ رکھا مگر اس کے برعکس کلیسائے روم نے اس وقت خاصی گڑ بڑ کر دی جب قرونِ وسطیٰ میں اس کے پادری بڑھ چڑھ کر، معاشی اور سیاسی کردار ادا کرنے لگے۔ پروٹسٹنٹ فرقے، عیسائی تعلیمات کی اصل روح کو بحال کرنے میں ناکام رہے اور ان کی مداخلت سماجی ڈھانچے میں مذہب کے مکمل ادغام کی صورت میں ظاہر ہوئی۔

شعوری یا غیر شعوری طور پر، کردار کے جن اصولوں کی پابندی آج ہم سے کرائی جا رہی ہے اُن کا منبع ایسی تالمودی اور مسیحی تعلیمات ہیں جو دراصل کسی اور عہد کے لوگوں بلکہ کچھ مخصوص لوگوں کے لئے تھیں جو ایک صوفیانہ نصب العین کی پیروی کرتے تھے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان ضابطوں میں اس طرح تبدیلیاں لائی جاتی رہیں کہ وہ اونچے طبقے کے مفادات کا تحفظ کر سکیں۔ اور اب وہ ہمارے قوانین، ہمارے اداروں اور ہمارے اعتقادات میں ضم ہو چکی ہیں اور ہم سے کہا جا رہا ہے کہ ہم اُن ضابطوں کی کورانہ تقلید کریں اور ان کی معقولیت اور افادیت پر کسی قسم کا شک نہ کریں۔

'اعترافِ گناہ' کی رسم رائج کر کے کیتھولک کلیسا نے اپنی جڑیں مضبوط کر لی ہیں۔ ایک ضابطۂ حیات مرتب کر دیا گیا ہے اور ایک مسحور کن تاکید کے ساتھ 'نسلاً بعد نسلاً' اس کے الوہی ہونے کا اعلان کیا جاتا رہا ہے۔ نافرمانوں کو کچلنے کے لئے دہشت ناک روحانی سزاؤں کی پیش گوئی کر دی گئی ہے۔ صرف پادری کو اس بات کا اختیار حاصل ہے کہ وہ ان سزاؤں کے اندیشوں میں ہیر پھیر کر سکے اور اعترافِ گناہ کے بعد توبہ کرنے والے کے گناہ بخش دے یا اسے سزا دے۔ اپنے گناہوں پر ندامت کرنے والوں کے سلسلے میں پادری کے اختیارات بے حد و بے حساب ہیں۔

پروٹسٹنٹ ممالک میں اس طریق رہنمائی کی جگہ ایک انتہائی شدید ضابطۂ اخلاق نے لے لی ہے جسے عیب بینی کے ایک مکمل نظام کے ذریعے نافذ کیا گیا ہے۔ بچپن ہی سے ہر شخص کو یہ تعلیم دی جاتی ہے کہ اس کا کوئی بھی 'ممنوعہ' عمل معاشرے کی آنکھوں سے چھپ نہیں سکتا۔ کیتھولک حضرات جہاں بی بی مریم کو یاد کرتے ہیں، پروٹسٹنٹ فرقے کے لوگ ایسے موقعوں پر 'ذوقِ سلیم' کی دہائی دیتے ہیں۔

ان مذاہب کا سماجی اور سیاسی فریضہ اس وقت بالکل عیاں ہو جاتا ہے جب ہم ان چند بنیادی قوانین کا موازنہ کرتے ہیں جو فرمان کے طور پر پیش کئے گئے ہیں، مثلاً جنسی آزادی کو قطعاً ممنوع قرار دے دیا گیا ہے اور جنسی جذبے کو بڑی سختی سے کچلا جاتا ہے، حالاں کہ قدیم مسیحی تعلیمات کی روشنی

میں اس قسم کی سختیوں کا جواز مشکل سے ملے گا۔ اس کے برعکس قتل کی نہ صرف اجازت ہے بلکہ جنگ کے بلاوے کی صورت میں یہ ایک فرض بن جاتا ہے۔ اس قسم کی شدید بے ربطیوں سے معلوم ہوتا ہے کہ جدید مذہب کو محدود سیاسی مقاصد کے تابع کر دیا گیا ہے۔

ایک خیال تھا کہ اشتمالی انقلاب' جس نے ابتداً مذہبی روایات کا شدت سے مقابلہ کیا، دنیا کو کم از کم جنسی توہمات سے ضرور نجات دلا دے گا۔ لیکن یہ امر قابل غور ہے کہ 'بے نکاحی یارانوں' کی حمایت میں چند ایک بے معنی دکھاوؤں کے بعد نہ صرف اسے ترک کر دیا گیا بلکہ اشتراکی ممالک نے اپنی قسم کا ایک اور ضابطۂ اخلاق ایجاد کر لیا جو اصل سے بھی بدتر ہے۔ کسی بھی حکومت کے لئے اور خصوصاً آمرانہ حکومتوں کے لئے' اخلاقی احتساب' سیاسی قوت کا اصل سرچشمہ ہوتا ہے۔ فرد اور معاشرے پر تسلط کا یہ طریقہ حکومتوں کو ماضی کی مذہبی تنظیموں سے ورثے میں ملا ہے۔

ظاہر ہے کہ ہم کسی ایسے اخلاقی ضابطے کو جسے قانونی اور سماجی دباؤ کے ذریعے نافذ کیا گیا ہو' ایک فطری' اخلاقی نظام نہیں کہہ سکتے جب کہ وہ جنگ کو تو مقدس ٹھہراتا رہے مگر لذت کو حرام۔

غالباً اس کی وجہ یہ ہے کہ نیم روشن خیال لوگوں کو پرانے جنسی توہمات میں یقین رکھنے پر اس وقت تک مجبور نہیں کیا جا سکتا جب تک فوراً انھیں' یا ایسے لوگوں کی اکثریت کو اخلاقی احتساب سے یک گونہ تسکین نہ ملتی ہو۔

جنسی مسابقت نے اب ایک ایسی صورت اختیار کر لی ہے جو قدیم معاشروں سے سراسر مختلف ہے۔ آج اکثر حالات میں' بیوی کا انتخاب عشق و محبت کی بنا پر کم ہی کیا جاتا ہے اور اس انتخاب میں سماجی دکھاوے کے تقاضوں کو زیادہ مدنظر رکھا جاتا ہے۔ گویا فطری تسکین کے مقابلے میں سماجی برتری اور وضع داریوں کے مسائل زیادہ اہمیت اختیار کر گئے ہیں۔ ایک نوعمر اور دلربا عورت کے سن رسیدہ اور متمول شوہر کے لئے جنس ایک نیم فراموش کردہ وظیفہ ہے اور وہ کتابوں' فلموں وغیرہ میں اس کی موجودگی کی طرف کسی اشارے پر بھی چڑنے لگتا ہے۔ اسی طرح متوسط طبقے کے ایک باپ کے لئے اس قسم کے اشارے اور بھی زیادہ پریشان کن ہیں۔ اس کے ذہنی سکون کو صرف اس تصور ہی سے خطرہ لاحق ہونے لگتا ہے کہ اگر کسی طرح اس کی بیوی کو یہ معلوم ہو گیا کہ اس کے شوہر سے زیادہ پرکشش' ہوشیار اور باہمت لوگ بھی موجود ہیں' تو کیا ہو گا! اس کی بڑھتی ہوئی یہ بے رخی اس میں ایک نامعلوم قسم کی گمراہی بے چینی پیدا کر دیتی ہے اور نتیجتاً گرمجوشی میں مصروف ایک صحت مند جوڑے کا تصور ہی اس کے لئے ناقابل برداشت ہو جاتا ہے جسے وہ ناشائستہ' نفرت انگیز' اور غلیظ' کہتا ہے۔

احتساب کی اس حقیقت کے پیچھے رقابت' خوف' محرومی اور مذہبی لبادے میں لپٹی ہوئی معاشرتی اور سیاسی قدامت پسندی کے علاوہ ممکن ہے کچھ اور اسباب بھی ہوں مگر وہ میری فہم سے بالا ہیں۔

یہ بات واضح ہے کہ انسانی ذہن بنیادی طور پر تکرار پسند ہے۔ وہ بدن کے دوسرے اعضا کی طرح، ہمیشہ وہی حرکات، انھی وقفوں کے ساتھ دہراتا رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک غلط تصور کے قلع قمع کرنے میں یا ایک روایت کو تبدیلی کرنے میں صدیاں بلکہ ہزاروں سال لگ جاتے ہیں۔

مگر یکایک، اب یہ مسئلہ فوری اہمیت حاصل کر گیا ہے۔ گزشتہ چند سال میں ہم نے اتنی عظیم قوتیں تسخیر کر لی ہیں کہ ہم انھیں قابو میں نہیں رکھ سکتے۔ ہماری سائنسی اور فنی دریافتوں اور ان سے کام لینے والوں کی ذہنی استعداد کے درمیان زمین و آسمان کا فرق ہے۔ ایک طرف تو ہم خلابازوں کو چاند پر بھیجتے ہیں تو دوسری طرف ہم انھیں ہنری طر کے مطالعے سے روکتے ہیں۔

انسانی افق کے قطبین۔ محبت اور موت، ڈرامائی طور پر دھندلا گئے ہیں۔ انعکاس کے کسی میکانکی عمل سے، موت کے خوف نے ہمارے لئے اس یقین کا روپ دھار لیا ہے کہ جنگ اور تباہی ناگزیر ہیں۔ ان معنوں میں بم تباہی کے ایک ذریعے سے بڑھ کر خود ہمارے مابعدالطبیعیاتی تعطل کی علامت بن گیا ہے۔ جہاں تک محبت کا تعلق ہے، جس نے انقلاب فرانس اور مارکسیت جیسی بڑی تحریکات کو جنم دیا، تو اس نے بھی بہت جلد، نپولینی فتوحات اور اسٹالینیت کی شکل میں ہاتھ پاؤں مارنا شروع کر دیے ہیں۔

اگر ہم محتاط ہو کر اور ایمان داری سے اپنے اعتقادات کا جائزہ لیں تو اس ذہنی تلچھٹ میں، جو ہم نے پتھر کے زمانے سے بلکہ اس سے بھی پہلے کے عہد سے نسلاً بعد نسلاً جمع کی ہے، ہمیں حقیقت کا ایک ذرہ بھی نہیں ملے گا۔ جمہوریت ایسے چمکیلے الفاظ کسی حقیقی اہمیت کے حامل نہیں اور وہ محض ہماری جبلتوں کے دھندلائے ہوئے رجحان کی نشان دہی کرتے ہیں۔

ہم نے اپنے لئے ایک ایسی ذہنی دنیا تخلیق کی ہے، جس پر منفی اور تکلیف دہ عناصر خوف، ذمے داری، فرض اور جبر چھائے ہوئے ہیں۔ جنس اور جنسی لذتوں کے سلسلے میں ہمارا تمام تر عام رویہ، اذیت دہی اور اذیت طلبی کے ذہنی معمولات سے معین ہوتا ہے۔

عریانی و فحاشی وہ بدنما سائے ہیں جو صبح کی روشنی میں اس وقت غائب ہو جائیں گے جب ہم جنس اور شہوانیت کو بحال کر دیں گے۔ محبت اور شہوت کو ہمیں تکمیلی سرگرمیاں سمجھنا چاہیے نہ کہ دو متضاد عناصر۔ ہمیں اشتہا کو تمام مثبت افعال کے سرچشمے کے طور پر بازیافت کرنا ہوگا اور تمام فطری جبلتوں اور لذت بخش افعال کی مخالفت ترک کرنا ہوگی۔

ذہن کو مسلسل جھنجھوڑے اور جھٹکے دیے بغیر کچھ حاصل نہیں ہو سکتا۔ اس سلسلے میں، بہ حیثیت ناشر میری یہ پُرخلوص مگر بعید العقل خواہش ہے کہ میں چند ایک موانعات کا خاتمہ کر سکوں اور ابہامات کو دور کر سکوں۔

ماخذ (انگریزی۔6)

پہلا پتھر

ستار طاہر

مسیح نے کہا تھا: 'اور پہلا پتھر وہ مارے، جس نے کبھی گناہ نہ کیا ہو' 'خیالات' کا یہ شمارہ صدیوں کے منجمد، کائی زدہ، بدبُودار اور ٹھہرے ہوئے پانی میں پہلے پتھر کی مثال رکھتا ہے۔ اور ہم نے یہ پہلا پتھر مارنے کی جُرأت اِس لئے کی ہے کہ ہم نے جنس کبھی کو گناہ نہیں سمجھا۔ منٹو مرحوم نے اپنی ایک کہانی میں ایک کردار پیش کیا تھا جس کے منہ سے 'پستان' کا لفظ نکل گیا تو وہ بولا، 'لاحول ولا' میں کلّی کر آؤں، منہ گندا ہو گیا ہے'۔

جنس کے ذکر سے ہمارا منہ کبھی گندا نہیں ہوا۔ لیکن جنس کے اُس اظہار سے ہمیں ہمیشہ گھن آئی ہے جو فحش اور عریاں ہوتا ہے۔ ایک ایسے معاشرے میں جو دوعملی کا شکار ہو، جہاں واضح طور پر طبقاتی کش مکش موجود ہو، جہاں روشن خیالی، سائنسی سچائی تو ایک طرف رہی، اپنے ہی حیاتیاتی تقاضوں کو 'ناپاک' سمجھا جاتا ہو'۔ اُس توانائی اور اکائی کو نظر انداز کر دیا جاتا ہو، جس سے انسانی رشتوں کی حُرمت قائم رہتی ہو۔ وہاں وہ ادب قابلِ نفرین سمجھا جاتا ہے جس میں جنس کا اظہار تخلیقی صورت میں ہو اور اُس 'چیز' کو لوگ چُھپ چُھپ کر پڑھتے ہوں جو ادب میں نہیں ہوتا' صرف فحاشی اور عریانی ہوتی ہے۔ صحت مند معاشرے کی سب سے بڑی خوبی یہ ہوتی ہے کہ وہ حقائق کا سامنا کرنے کی سکت رکھتا ہے۔ فرد اور معاشرے کی تربیت اُن خطوط پر ہو کہ وہ ادب اور مخرب اخلاق چیز میں فرق روا رکھ سکتا ہو۔ جو جھوٹے اوہام، غیر سائنسی 'اُصولوں' اور عقلیت اور سائنسی سچائیوں میں تمیز کر سکتا ہو۔

'خیالات' کے پہلے شمارے کے حوالے سے ہم نے جو پہلا پتھر پھینکا ہے' اُس کے پس منظر میں یہ سچائی بھی کام کرتی ہے کہ ہم معاشرے پر الزام لگانے کی ہمت رکھتے ہیں۔ ہم اپنے معاشرے پر الزام لگاتے ہیں کہ وہ دوعملی کا شکار ہے۔ 'جنس' جو زندگی کی محرک توانائی اور زیست و تخلیق کا سرچشمہ ہے' اُس کو ممنوع قرار دیتا ہے۔ اور 'فحش' جو اخلاق اور تباہی کا منبع ہے، اُس میں یہ معاشرہ ڈوبا ہوا ہے۔ ہم جہاں معاشرے میں معاشی انصاف اور غیر طبقاتی معاشرے کے قیام کی جدوجہد میں شریک ہیں، وہاں اُن اقدامات کے بھی خلاف ہیں جو انسانی زندگی میں گھٹن پیدا کرنے، معاشرے کو کج روی کی راہ پر ڈالنے اور حقائق سے آنکھیں چُرانے کی تحریک دیتے ہیں۔

'خیالات'، کے پہلے چند شمارے 'ممنوعہ کتب' کے لئے وقف کر دیے گئے ہیں۔ اِن شماروں

میں ہم دنیا بھر کی اُن کتابوں کو پیش کریں گے، جن پر فحاشی کا الزام لگا۔ حالاں کہ اِن کتابوں میں زندگی کی سب سے بڑی سچائی، 'جنس' کا کھرا اور تخلیقی اظہار کیا گیا تھا۔ ہم نے بے باکی اور سچائی کے ساتھ اُن مسائل کو بھی سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی ہے جو 'جنس' سے متعلق ہیں۔

سرِ ورق پر پکاسو کی تصویر ہمارے عزائم اور مقاصد کی ترجمانی کرتی ہے۔ ایک لڑکی جو آئینے میں اپنے آپ کو دیکھ رہی ہے، اپنے جسم کی حقیقتوں کو سمجھنے کی کوشش کر رہی ہے۔ ہم بھی 'خیالات' کو ایک ایسا آئینہ بنانا چاہتے ہیں جس میں اپنا آپ دیکھ کر کسی کو گھن نہ آئے۔ باڈلیر نے بھی یہی خواہش کی تھی: 'اے خدا! مجھے ہمت دے کہ مجھے اپنے جسم سے گھن نہ آئے'۔ پکاسو نے 'مکعبیت' کا آغاز کیا تو مصوری کی دنیا میں اُس کو ایک 'پتھر' سمجھا گیا۔ مصوری کے کرم خوردہ اصول اور نازک شیشے، اس پتھر کی ایک ضرب سے پارہ پارہ ہو گئے تھے۔ اور پھر ایک نئے دور کا آغاز ہوا تھا۔

ہم بھی 'خیالات' کی صورت میں بوسیدہ روایات کے آئینہ خانوں کو توڑنا چاہتے ہیں۔ ایک نئے دور کا آغاز کرنا چاہتے ہیں جس میں انسان اپنے آپ سے گھن نہ کھائے۔ اپنا سامنا کر سکنے کی جرأت پیدا کر سکے۔ ہم پکاسو نہیں، مگر پہلا پتھر پھینکنے کی جرأت رکھتے ہیں!

ماخذ (اُردو۔۹۳)

جھوٹ کے پٹارے

محمد عباس

کہا جاتا ہے کہ 'ڈائجسٹوں' نے جو روش اختیار کی ہے اور جس نوعیت کی کہانیاں اور مضامین اُن میں شائع ہوتے ہیں وہ نہایت ہی گھٹیا اور گرے ہوئے معیار کے ہوتے ہیں اور ملک وقوم اور خاص طور پر نئی نسل کو بگاڑ رہے ہیں۔ توہم پرستی، دور از کار خیالی باتیں، لایعنی قصے، فضول سی آپ بیتیاں، لغو سرگذشتیں، غرض یہ کہ یہ رسائل کیا ہیں، جھوٹ کا پٹارا اور کذب کا طومار ہیں۔ تو ایک رائے تو ہوئی۔

دوسری رائے وہ ہے جو کلاسیکی ادبیات کے حوالے سے پیش کی جاتی ہے یعنی یہ باتیں وہ لوگ کریں جنھیں نہ دنیا اور قوموں کی دیومالا کی خبر ہے نہ اپنے گھر کی' تو بات بجا ہے مگر افسوس یہ ہے کہ اس عنوان پر گفتگو وہ لوگ کرتے نظر آتے ہیں جو صاحب نظر ہیں۔ دور کیوں جائیں' اردو ادب کو ہی لے لیجیے۔ مشتے نمونہ از خروارے کے طور پر چند کتابوں کے نام سنیے' یہ وہ کتابیں ہیں جو اردو کا اعلیٰ ادب سمجھی جاتی ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ جس نے ان کتابوں کو نہیں پڑھا وہ اردو ادب سے قطعاً بے بہرہ ہے۔ یہ ہیں وہ کتابیں: 'بوستان خیال'، 'طلسم ہوش ربا'، 'الف لیلیٰ'، 'طلسم نوخیز جمشیدی'، 'آرائشِ محفل'، 'باغ و

بار' وغیرہ۔ اُن کے سلسلے میں کیا خیال ہے؟ کیا یہ مذکورہ کتب بھی لغو ہیں! اگر یہ کتابیں پڑھنے کے قابل ین' اور یقیناً ہیں تو پھر ڈائجسٹوں کے متعلق فتویٰ بازی میں جلد بازی نہ کیجئے۔ کیا خبر کہ آنے والا وقت ن رسائل کو بھی سندِ توثیق عطا کردے! اس مسئلے میں دیومالا کی طرف بھی توجہ مبذول کی جائے۔ دیومالا کو علم کا درجہ دیا جاتا ہے۔ اس موضوع اور عنوان پر ترقی یافتہ زبانوں میں زبردست تحقیقی کتابیں تصنیف کی گئی ہیں۔ دیومالا کو جدید ادبیات اور عمرانیات کے تعلق سے دنیا کے علمی و ادبی حلقوں میں جو درجہ دیا جاتا ہے وہ معلوم ہے۔

ایک زمانے میں امریکا میں جاسوسی ادب پر بڑی لے دے ہوئی۔ بڑے جھگڑے، قصے، بحث مباحثے کے بعد آخر جاسوسی ادب کو ادب مان ہی لیا گیا۔ قصہ یہ ہے کہ جب بھی کوئی نئی بات ہوگی لوگ اُس کی مخالفت کریں گے، یہ ہماری، ہم انسانوں کی عادت سی ہے، پھر بار جھک مار کر قبول کرلیں گے۔ قصہ مختصر' ڈائجسٹوں میں جو چھپ رہا ہے اس سے زیادہ عجیب چیزیں اعلیٰ ادب کے نام سے اُردو میں پہلے سے موجود ہیں۔

ماخذ (اُردو۔ ۹۰)

بُرا آدمی

سرور شاہیرا

'دھنک' بڑا فحش، عُریاں، لچر، بے ہُودہ اور گندا رسالہ ہے جو ہمارے معاشرے کو بگاڑ رہا ہے۔ پنجاب کی صوبائی اسمبلی میں سوال اُٹھا، ٹرسٹ کے اخباروں نے تائید کی اور میرے پنجاب کی انقلابی حکومت نے فیصلہ سنا دیا۔ یکے بعد دیگرے یہ اتنے بڑے جھٹکے ہیں کہ صدمے سے میں ابھی تک بدحال ہوں۔ اگر کچھ دوستوں نے ڈھارس نہ بندھائی ہوتی تو اس ماہ تک 'دھنک' ہمیشہ کی نیند سو چکا ہوتا۔

'دھنک' میرے لئے محض کاغذوں کا ایک پُلندہ نہیں ہے بلکہ مجھے یوں پیارا ہے جیسے کسی کو آخری عمر کی اولاد عزیز ہوتی ہے۔ یا لیلیٰ مجنوں قسم کی رومانوی داستانوں میں محبوب۔ مجھے اس سے دیوانہ وار عشق ہے اور اسے سب سے خوب صورت' سب سے انوکھا دیکھنے کی دھن میں خسارے پر خسارہ برداشت کئے جا رہا ہوں۔ پر محبت میں روپے پیسے کا کون حساب رکھتا ہے! لیکن جب سے مجھ پر یہ انکشاف ہوا ہے کہ میں تو ایک معاشرتی گناہ کر رہا ہوں، ایک گھناؤنا جرم کر رہا ہوں اور اپنے معاشرے میں گندگی پھیلا رہا ہوں تو مجھے اس پھولوں ایسے 'دھنک' سے بدبو آنے لگی ہے۔ نفرت سی ہو چلی ہے۔ اور یہ اجنبی اجنبی سا لگنے لگا ہے۔ مجھے اپنے آپ سے بھی گھن آنے لگی ہے۔ میں یقیناً برا

آدمی ہوں گا ورنہ صوبائی اسمبلی والوں کو مجھ ایسے سے کیا دشمنی ہو سکتی ہے! ٹرسٹ کے اخباروں کو کیا بیر ہو سکتا ہے اور صوبائی عوامی حکومت کو مجھ ایک معمولی آدمی سے آخر کیا چڑ ہو سکتی ہے! بک اسٹالوں پر پڑے ہوئے ہزاروں ملکی و غیر ملکی کتابوں رسالوں میں پڑا 'دھنک' یقیناً عریاں اور فحش لگتا ہوگا ورنہ دوسروں کی طرف بھی توجہ جاتی۔

کئی ایسے لوگ ہیں جنھیں میں بھی بُرے لوگ سمجھتا تھا، اب سوچ رہا ہوں کہ کیا وہ بھی اندر سے میری طرح کے سیدھے سادے لوگ ہوتے ہیں جن پر ہم میلوں دور بیٹھے، بغیر جانے بُوجھے 'بُرے' کا لیبل چسپاں کر دیتے ہیں!

ماخذ (اُردو۔۱۰۰)

'جِسمانے'

خالد ارمان

انسان اور اس کی خواہش کے لاتعداد پہلوؤں کی طرح جسموں کے بھی بے شمار روپ ہیں۔ انسانوں کی طرح جسم بھی اپنی خصوصیات، مقدار اور تسکینی لوازمات کی نوعیت کے اعتبار سے مختلف ہیں۔

ایک جسم برائے فروخت ہے، ایک جسم خریدار ہے۔ ایک جسم کو وحشت سے نوچا جا رہا ہے، دوسرے کو محبت سے سوچا جا رہا ہے۔ ایک جسم سراسر گلابی ہے تو دوسرا سرتاپا عنابی۔ کوئی جسم محبوب کی چھاتی سے بچھڑ کر بکھرتا ہے، اور کوئی چاہنے والے کی بانہوں میں سمٹتا ہے۔ کسی جسم کو دیکھ کر ہی نگاہیں بھر جاتی ہیں اور کسی جسم کو کچل کر بھی نیت نہیں بھرتی۔ کسی جسم کی جذباتی ترکیب میں برف کی یخ بستگی شامل ہے تو کسی کی ہیئت میں دوزخ کی آنچیں۔ کسی جسم کو پھولوں سے لاد دیا جاتا ہے اور کسی کو سرِ راہ ڈال دیا جاتا ہے۔

کسی جسم کا مقدر ادائیں بکھیرتی ہیں اور کسی کی قسمت سزائیں۔ ایک جسم دن کی گہما گہمی میں بھی مہکتا ہے اور دوسرا رات کے سناٹے میں بھی سسکتا ہے۔ کسی جسم کے ہمسائے لاتعداد جسم بن جاتے ہیں اور کوئی جسم اکیلا پڑا اپنے آپ سے کھیلتا رہتا ہے۔ کچھ جسم دوسرے جسموں سے دوستی کر کے خوب نکھرتے ہیں اور کچھ بے چارے انھیں دیکھ دیکھ کر گھلتے ہیں۔ ایک جسم خود سپرد ہے اور دوسرا با اختیار۔ ایک جسم دوسرے جسم کا خواہش مند ہے اور ایک بے نیاز۔ آگے بڑھتے جائیں، جسم کے لاتعداد روپ ہیں......

ایک جسم منفی ہے اور دوسرا مثبت۔ مثبت منفی کو چاہتا ہے اور منفی مثبت کو۔ یہ تو فطرت ہے۔ بعض دفعہ مثبت اور منفی میں تضادات اور اختلافات اٹھ کھڑے ہوتے ہیں تو فطرت سے فرار کی خواہش

نئے راستے دکھاتی ہے۔ منفی منفی سے ٹکرا جاتا ہے اور مثبت مثبت سے ہم آغوش ہونے میں تسکین محسوس کرتا ہے۔ یہ سلسلہ آپ جتنا بھی دراز کر لیں، ہو جائے گا۔ لیکن کلام کو مختصر رکھنے کے لئے عرض ہے کہ یہ سب جسموں کی عادتیں ہیں۔

ہمارے ادیبوں میں سے تقریباً سبھی نے جسموں کی یہ عادات اور وظائف سمجھنے اور دوسروں کو سمجھانے کی کوشش کی لیکن جو کامیابی سعادت حسن منٹو، واجدہ تبسم، عصمت چغتائی، اور ان کے دیگر معاصرین کے حصے میں آئی، اس کی نظیر نہیں ملتی۔ جسموں کی عادتوں پر ان عظیم فن کاروں کے لکھے افسانے ہی ہماری زیرِ نظر کتاب کے ’جسمانے‘ ہیں۔ اس کتاب میں برصغیر پاک و ہند کے عظیم ادیبوں کے بیس سے زائد ’جسمانے‘ (افسانے) شامل ہیں، مکمل تعارف اور پس منظر کے ساتھ۔

ماخذ (اُردو۔۵۲)

دیگ کا ایک دانہ

'جناب ایڈیٹر صاحب! آپ کے رسالے کا پرانا قاری ہوں' واقعی یہ بے حد خوب صورت اور بولڈ پرچہ ہے' ہر چیز اپنی جگہ خوب ہے لیکن آپ کے لکھنے والے کبھی کبھی پٹری سے اتر جاتے ہیں' انھیں معلوم ہونا چاہیے کہ ہر گھر میں ماں' بہن بھی ہوتی ہیں'۔ ' آخر میں ایک حکم کہ اب کی مرتبہ کسی خوب صورت سی چھوٹی دی موٹی سی اداکارہ کی سیکسی تصویریں اور گرما گرم انٹرویو ضرور شائع کریں'۔ سلیم خان (کراچی)

یہ خط سماج کے چاولوں کی دیگ سے ایک دانہ ہے۔ جس بات پر اعتراض کیا جا رہا ہے اُسی کی فرمائش بھی کی جا رہی ہے۔ ہماری سیاست' صحافت اور معاشرے میں اس قسم کا کنفیوژن عام ہے۔ پیسے کی دوڑ ہے' لوگ عدم اطمینان کا شکار ہیں۔ تفریح کا کوئی صحت مند ذریعہ نہیں۔ مسائل کے بوجھ تلے دبے ہوئے ذہنوں کو جب ماحول کی منافقت' تازگی دینے میں ناکام رہتی ہے تو پھر یہ گندے رسالوں اور ننگی فلموں میں تسکین ڈھونڈتے ہیں۔ ایک طرف تو لوگ صاف ستھرے پرچوں میں جنس پر حقیقت پسندانہ تحریر بھی برداشت نہیں کرتے اور دوسری طرف انتہائی لچر قسم کے پرچے بک اسٹال پر گرم کیک کی طرح ہاتھوں ہاتھ بک جاتے ہیں۔ پچھلے دنوں لاہور میں حکومت نے بعض فحش رسالوں کے خلاف کاروائی بھی کی ہے لیکن قانونی سقم اور بعض دیگر وجوہات کی بنا پر بک اسٹالوں اور ہاکروں کے ذریعے ان کی فروخت اور اشاعت مسلسل جاری ہے۔

وہی وہانوی تو اب فرسودہ ہو چکا ہے' چوری چھپے فروخت ہونے والے رسالوں کے علاوہ جو پرچے آپ کو بازاروں میں عام دکھائی دیتے ہیں۔ ان میں سے کچھ معروف نام یہ ہیں: روشنی، چترالی، سمرن، تحفہ، بوبی، سوسائٹی، عکس، تازیانہ، دھماکہ، پروانہ، فلم فیر، آپ بیتی، شبانہ، زینت اور شہنائی۔ شہنائی کے نام سے دو پرچے شائع ہوتے ہیں جن میں سے ایک بڑے سائز پر بغیر ڈیکلریشن کے چھپتا تھا' جس کی کاپیاں پولیس نے کئی بک اسٹالوں سے اٹھائی تھیں۔ چھوٹے سائز پر شائع ہونے والا شہنائی فحش جرائد کے زمرے میں نہیں آتا' فلمی پرچہ ہے اور اس کا ڈیکلریشن کسی اور نام سے ہے۔ شہنائی پبلیکیشنز کے عنوان سے چھپتا ہے۔ اس نوعیت کے فلمی پرچوں کی بھی خاصی مانگ ہے۔ ان میں فلم نیوز' فن کار' 'شمع' اور 'شباب' جیسے رسالے شامل ہیں۔

اوپر کی فہرست میں درج شدہ تقریباً تمام پرچے اپنے ڈیکلریشن والے نام کی بجائے

بلیکیشنز کے بینر سے شائع ہوتے ہیں اور سب ہی بظاہر فلمی پرچے ہیں، ان کے ٹائٹل خاصے خوب ورت ہوتے ہیں لیکن اندر کے صفحات اتنے گندے۔ مواد کی طرح گٹ اپ اور پرنٹنگ کے اعتبار ے بھی گھٹیا ہوتے ہیں۔ غیر ملکی رسالوں سے کاٹ کر لگائی ہوئی تصاویر کے علاوہ ان میں بعض ایکسٹرا کرلز کی نیم عریاں اور فحش تصویریں شامل ہوتی ہیں۔ تھرڈ کلاس جنسی افسانے، ذومعنی مکالمے اور تصاویر کے نیچے بے ہودہ کیپشنز ان پرچوں کا لازمی جزو ہیں۔ یہ پرچے آہستہ آہستہ نئی نسل کے ذہنوں کو مسموم کر رہے ہیں۔

کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ جب تک ایسے پرچے چھاپنے والوں کی اچھی طرح سے خبر نہیں ی جاتی، اس وقت تک ان کی بولتی بند نہیں ہو سکتی۔ تو آیئے ذرا ان کے اندر باہر اوپر نیچے روشنی ڈال کر ان کی اس روش کا معائنہ کریں جس پر یہ چل نکلے ہیں۔ اس سلسلے میں ہم نے ایک فحش رسالے کے ایڈیٹر اور ایک فوٹوگرفر کے علاوہ کچھ اور متعلقہ لوگوں سے گفتگو کی ہے۔ تاثر یہی ہے کہ طویل محرومیوں کے نتیجے میں احساسِ کمتری کے مارے ہوئے چند لوگ اپنی ذات کی اہمیت منوانے کے لئے شارٹ کٹ کی تلاش میں ہیں۔ اگرچہ ان پرچوں کے ایڈیٹر ذاتی طور پر کردار کے اتنے برے نہیں ہوتے جتنے وہ اپنے رسالوں کے آئینے میں لگتے ہیں تاہم ان کے پرچے ان کے باطن کا اظہار ضرور ہیں۔ ان میں سے بعض کا ضمیر شاید ابھی زندہ ہے اور احساسِ جرم یا پھر خوفِ احتساب سے وہ اپنے اصل نام ظاہر نہیں کرتے۔

فحش فلمی رسالے تقریباً تمام کے تمام ایسے ہیں جنھیں ان کے اصل پبلیشروں نے دوسرے لوگوں کو کرائے پر دے رکھا ہے۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ پریس آرڈیننس کی وجہ سے شریف آدمیوں کو ڈیکلریشن حاصل کرنے میں بے شمار مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے جب کہ اکثر ایسے لوگوں نے ناجائز ہتھکنڈوں سے کئی کئی پرچوں کے ڈیکلریشن حاصل کر رکھے ہیں۔ جو صحافت کی اے بی سی بھی نہیں جانتے، وہ اپنی پرنٹ لائن کرائے پر دے دیتے ہیں۔ دوسری طرف جو لوگ ایسے پرچے اشاعت کے لئے حاصل کرتے ہیں وہ فوری کامیابی کے لئے عریانی کا سہارا لیتے ہیں۔ ڈیکلریشن چوں کہ ان کے اپنے نام سے نہیں ہوتا اس لئے انھیں اس کی پرواہ نہیں ہوتی کہ پرچہ بند ہو جائے گا۔ پرچے کے ٹائٹل پر ڈیکلریشن سے مختلف نام لکھنے کی ابتدا 'زندگی' اور 'اردو ڈائجسٹ' نے کی تھی۔ جب ان پر پابندی لگائی گئی تو انھوں نے دوسرے پرچوں کے ڈیکلریشن استعمال کئے۔

فحش رسالے عام طور پر چھوٹے چھاپہ خانوں میں چھپتے ہیں۔ ان میں شائع ہونے والی تصاویر عموماً 'اس بازار' سے تعلق رکھنے والی لڑکیوں کی ہوتی ہیں۔ ایک فوٹوگرافر سے گفتگو ہوئی تو اس نے بتایا کہ عام طور پر ایکسٹرا گرلز بھی عریاں تصویریں اتروانے پر آمادہ نہیں ہوتیں، سوائے چند ایک

کے جن میں مسرت شاہین سرفہرست ہے۔ باقی عورتوں کو رضامند کرنے کے لیے ایڈیٹر اور فوٹو گرافر انھیں خاصے سبز باغ دکھاتے ہیں کہ اس طرح وہ بہت مشہور اداکار ہو جائے گی اور اسے دھڑا دھڑ فلموں میں کام ملنے لگے گا۔ لاہور میں ایسے چھ سات فوٹو گرافر ہیں جو سیکسی تصویریں بنانے کا دھندا کرتے ہیں۔

جہاں تک ان پرچوں کی کھپت تعلق ہے تو وہ حیرت انگیز ہے۔ ان میں سے ہر رسالہ اوسطاً چھ ہزار کے قریب شائع ہوتا ہے اور پندرہ سولہ مختلف پرچے اس قسم کے مارکیٹ میں پائے جاتے ہیں۔ اس طرح ان کی مجموعی تعداد اشاعت ایک لاکھ کے قریب بنتی ہے ان کی فروخت میں نیوز ایجنٹوں کا بھی کافی ہاتھ ہے۔ ان پرچوں میں انھیں کمیشن زیادہ ملتی ہے اور پرچے کی مانگ پر قلت کا بہانہ بنا کر بلیک میں بھی بیچ دیتے ہیں۔ پچھلے دنوں نیوز ڈیکلریشن کے شائع ہونے والا ایک رسالے 'زینت' جس پر ۵۰/۲ روپے قیمت درج تھی' اخبار فروشوں نے پندرہ پندرہ روپے میں بیچا۔

اس قسم کے پرچوں کی مانگ میں گزشتہ چند برسوں خصوصاً پچھلے ایک سال سے خاصا اضافہ ہوا ہے۔ اس کی بڑی وجہ ملک میں تفریح کے صحت مند ذرائع کا نہ ہونا ہے۔ عوام کی اکثریت فلموں کے ذریعے تفریح حاصل کرتی ہے اور پچھلے چند سالوں سے جس قسم کی فلمیں بنائی جا رہی ہیں ان میں مقصدیت کم ہی ہوتی ہے۔ جنس و جرائم اور عشق و محبت ہی ان کا بنیادی موضوع ہوتا ہے۔ نیم عریاں مناظر' ذومعنی مکالمے' اشتعال انگیز رقص اور فحش گانے ان فلموں کی کامیابی کا ذریعہ سمجھے جاتے ہیں۔ ان فلموں کی عام سی 'سٹل' فوٹوز' بھی اچھی خاصی فحاشی کا نمونہ ہوتی ہیں' جو تقریباً تمام فلمی جرائد میں شائع ہوتی ہیں۔ یہ ایک عجیب اتفاق ہے کہ جب سے 'خطرناک' اور 'خانزادہ' جیسی فلموں کا رواج ہوا ہے تصویریں بنوانے والی اداکارائیں ان سے کوئی معاوضہ نہیں لیتی ہیں۔ لیکن الٹا بعض فوٹو گرافر ان سے پیسے لے لیتے ہیں۔ ایسی تصویروں کے لئے رسالے والے فوٹو گرافر کو عام تصویروں سے زیادہ معاوضہ نہیں دیتے۔ لیکن ان کے حلقوں میں عام تصویروں کی بجائے فحش تصویروں کی مانگ زیادہ ہے اس لئے وہ کاروباری نقطہ نظر سے ایسی تصویریں بناتے ہیں۔ ذہنی طور پر انھیں یہ احساس بھی رہتا ہے کہ وہ ایک غلط کام کر رہے ہیں۔ ان دنوں جو لڑکیاں ان کی تصویروں کے عام طور پر ماڈل بن رہی ہیں ان میں نورین' ثمینہ' مسرت شاہین اور کوثر سب سے آگے ہیں۔ فحش رسالوں کی اشاعت میں بھی اضافہ ہو رہا ہے۔ اس کا مطلب یہی ہے کہ فحش فلموں نے معاشرے میں ایسی فضا قائم کر دی ہے کہ ایک فحش شاٹ فلم کی کامیابی کا ضامن بن جاتا ہے۔ چند ننگی تصویریں، گندی تحریریں ایک پرچے کو کامیاب بنانے کے لئے کافی ہیں اس لئے لوگ اب صلاحیتوں کے بجائے وقتی رجحان کو کامیابی کی سیڑھی بنانے لگے ہیں۔

صحافت میں فحاشی کے رجحان کے خلاف سنجیدہ حلقوں کے مطالبے پر پنجاب حکومت نے

کاروائی شروع کی ہے لیکن سرحد اور سندھ میں ایسی کوئی کوشش نہیں کی گئی’ حالاں کہ فحش لٹریچر کی سب سے زیادہ کھپت انھی صوبوں میں ہوتی ہے’ کراچی اس کا سب سے بڑا مرکز ہے جہاں ایسے رسائل شائع بھی ہوتے ہیں’ بکتے بھی ہیں اور غیر ملکی لٹریچر بھی عام دستیاب ہے۔ لاہور میں رسائل کے خلاف مقدمات درج کیے گئے ہیں۔ اس سلسلے میں پولیس بک اسٹالوں پر چھاپے مارتی ہے اور بلاتمیز ایسے تمام رسالے اٹھالے جاتی ہے جس کے ٹائٹل پر عورت کی تصویر ہو۔ اکثر وہ ‘سمرن’ ‘روشنی’ اور ‘چترالی’ کے ساتھ ‘مصور’ ‘دھنک’ اور ‘طاہرہ’ کے شمارے بھی لے جاتی ہے جن میں سے اکثر بعد میں بک اسٹالوں کو واپس نہیں ملتے۔ اس طریق کار سے اس برائی کا سدباب ناممکن ہے۔ بعض بک اسٹالوں پر ایسی تختی لکھ کر لگادی جاتی ہے کہ ‘سمرن’ ‘روشنی’ اور ‘زینت’ مانگ کر شرمندہ نہ ہوں۔ جب گاہک اس سلسلے میں استفسار کرتے ہیں تو انھیں کہا جاتا ہے کہ یہ بڑے فحش رسالے ہیں جن میں بڑی زبردست سیکسی تصویریں ہیں۔ پولیس آکر خواہ مخواہ تنگ کرتی ہے۔ اس لئے صرف اپنے لئے ایک کاپی رکھی ہوئی ہے۔ گاہک کا اشتیاق بڑھتا ہے وہ پرچہ دیکھنا چاہتا ہے تو اسے تین چار روپے میں دے دیا جاتا ہے۔ فاشی کے خلاف مہم کے لئے لاہور میں ایک مجسٹریٹ صاحب مقرر ہیں لیکن صورتِ حال یہ ہے کہ پچھلے دنوں ایک فوٹو گرافر کے خلاف اس سلسلے میں مقدمہ درج کیا گیا تو پولیس نے اس سے ڈیڑھ سو روپے لے کر ضمانت کرنے تک چھٹی دے دی۔

فحش جرائد کے خلاف قانونی محاذ پر انفارمیشن ڈیپارٹمنٹ کی پریس برانچ انتہائی ناکام ثابت ہوئی ہے۔ اس کا طریق کار بے حد سست ہے اور اس کی زیادہ توجہ سیاسی پرچوں کی طرف رہتی ہے۔ ان میں ایک سطر بھی حکومت کی مخالفت میں آجائے تو انھیں فوری طور پر بند کردیا جاتا ہے لیکن فحش پرچے عوامی اخلاق اور قومی وقار کے خلاف مسلسل مواد چھاپتے رہتے ہیں مگر ان پر ہاتھ نہیں ڈالا جاتا۔ وجہ یہ ہے کہ سیاسی پرچوں کے وزیراعظم کے نوٹس میں آنے کا احتمال ہوتا ہے اس لئے ان کے معاملے میں محکمہ سرگرم رہتا ہے لیکن فلمی جرائد چوں کہ پرائم منسٹر ہاؤس تک نہیں پہنچتے اس لیے سرگرمیوں پر پریس برانچ والے افیم کھا کر غور کرتے ہیں۔ اور فیصلہ کرنے میں صدیاں بیت جاتی ہیں’ فحش جرائد کے تحت محاسبے کے ضمن میں اس بات کا بھی خیال رکھا جانا چاہیے کہ ایسا نہ ہو’ کسی سیاسی گروپ کی مخالفت کی سزا کے طور پر صحت مند رسائل پر بھی فحاشی کے الزام میں مقدمے بنادیئے جائیں۔ پریس آرڈیننس فحش ادب کی اشاعت رکوانے میں قطعی ناکام ثابت ہوا ہے۔ اس لیے بہتر یہی ہے کہ اسے منسوخ ہی کردیا جائے اور تمام پرچے شائع کرنے والوں کو ڈیکلریشن دے دیئے جائیں تاکہ انھیں ذمے داری کا احساس ہو کیوں نہ دوسروں کے ڈیکلریشن پر رسالہ چھاپتے ہوئے زیادہ فکر مند نہیں ہوتے۔ ان لوگوں کے ڈیکلریشن منسوخ کردیے جانے چاہیے جنھوں نے یہ دوسروں کو ٹھیکے پر دے رکھے ہیں۔ ان کے اس اقدام سے ثابت ہوچکا ہے کہ وہ پرچہ شائع کرنے کے لیے نااہل ہیں۔

فحاشی کے رجحان کو روکنے کے دو ہی طریقے ہیں۔ یا تو بے حد سختی سے محاسبہ کیا جائے یا انھیں کھلی چھٹی دے دی جائے، کیوں کہ یہ وقتی رجحان ہے جو بالآخر ختم ہوگا۔ ڈھیلی پابندیاں ایسی چیزوں کو اور بھی مقبول بناتی ہیں۔ ڈھیلے محاسبے کی ناکامی کی بڑی وجہ یہ ہے کہ ہماری انتظامیہ میں نچلی سطح پر کرپشن پائی جاتی ہے۔ وکلا حضرات سب ہی مجرموں کو تسلی دیتے ہیں، کیوں کہ ہر فحش رسالے پر لیگل ایڈوائزر کے طور پر کسی نہ کسی وکیل کا نام درج ہے۔ جنسی لذت پرستی کا جنون عام کرنے میں فحش فلموں کے علاوہ معاشرے کی اس منافقانہ شرافت کا بھی بڑا حصہ ہے جو لوگوں کو صحت مند تاریخی لٹریچر بھی فراہم نہیں ہونے دیتی اور کسی صاف ستھرے رسالے میں جنس کے موضوع پر کوئی حقیقت پسندانہ تحریر شائع ہو جائے تو اس کے خلاف واویلا شروع ہو جاتا ہے۔ اس طرح عدم تسکین کا جو خلا پیدا ہو جاتا ہے، اسے فحش جرائد پر کر دیتے ہیں۔

فحش تحریر کے سلسلے میں ایک لڑکی کا نام بھی کچھ عرصہ تک معمہ بنا رہا ہے۔ 'سمرن چودھری' کے نام سے کچھ عرصہ پہلے جنس کی موضوع پر دو' ایک افسانے 'دھنک' میں شائع ہوئے ہیں۔ بعد میں پتا چلا کہ دراصل یہ افسانے کسی 'سمرن چودھری' نے ارسال نہیں کیے تھے بلکہ ان کے مصنف کا نام 'ضیا ساجد' تھا جس نے بعد میں 'سمرن' نام کا رسالہ بھی شائع کر دیا جس پر ایڈیٹر کے طور پر 'سمرن چودھری' کا نام ہے۔ 'عکس' کے عنوان سے شائع ہونے والے ماہنامے 'للکار' میں بھی 'سمرن چودھری' کے فحش سوال و جواب چھپ رہے ہیں جن میں ایک ایکسٹرا گرل کی تصویر 'سمرن چودھری' کے نام سے چھپ رہی ہے۔

ضیا ساجد کے مقابلے میں ایک اور ایڈیٹر رشید انجم ہے جس کا اصل نام سعود ہے اس کا رسالہ 'روشنی' عریانی اور بے ہودگی کا کھلا گٹر ہے۔ ان دونوں حضرات سے پہلے عریاں فحش جنسی کتابوں، رسالوں کے سلسلے میں ایم اے (محمد امین) زاہد کا نام خاصا معروف تھا جس نے پندرہ روزہ 'ناخدا' کرائے پر لے رکھا ہے اور اسے 'چترالی' کے ٹائٹل سے ماہ وار شائع کرتا ہے۔ اس میں عموماً نیم عریاں تصویریں ہوتی ہیں۔

فحش پرچے شائع کرنے والے ایڈیٹرز کو اخبار نویس اور سنجیدہ طبقہ جرنلسٹوں میں شمار نہیں کرتا کیوں کہ ان کے بقول ان پرچوں میں جو کچھ چھپتا ہے اس کا جرنلزم سے کوئی تعلق نہیں بلکہ وہ صرف فوٹوگرافی ہے جب کہ ایسے میگزین چھاپنے والے بزعم خود بڑے انقلابی بنتے پھرتے ہیں۔ اپنے رسالوں کی عریانی و فحاشی کے جواز میں ان کے ایڈیٹر کہتے ہیں کہ اگر یورپ اور امریکہ سے منگوائے گئے رسالوں 'نٹ پٹ' 'ڈینکو' 'ٹائم' اور 'نیوز ویک' پر پابندی نہیں اور وہ اپنی بعض نیم عریاں تصویروں کے باوجود کھلے بندوں فروخت ہوتے ہیں تو پھر ہمارے پرچوں پر بھی پابندی کیوں! حقیقت یہ ہے کہ ایڈیٹروں نے 'ٹائم' اور 'نیوز ویک' کا صرف نام ہی سنا ہوگا۔ کبھی پڑھ کر نہیں دیکھا اور پڑھنا تو یہ جانتے بھی نہیں کہ اگر پڑھے لکھے ہوتے تو زندگی کی دوڑ میں پیچھے رہ جانے کا عمل انھیں منفی راستوں پر نہ ڈالتا۔

ان میں سے بعض پرچوں کے ایڈیٹرز خود کو منٹو ثانی سمجھتے ہیں۔ حالاں کہ منٹو کے افسانوں کا مجموعی تاثر جنسی اشتعال انگیزی کی بجائے جنس سے نفرت و کراہیت پیدا کرتا ہے، جب کہ ہمارے آج کے بناسپتی منٹو جنسی تلذذ کو اپنی منزل بنائے ہوئے ہیں۔ جہاں تک یورپی امریکی جرائد ٹائم اور نیوز ویک وغیرہ کا معاملہ ہے تو وہ غیر ملکی تہذیب کے نمائندہ ہیں، غیر زبان میں ہیں۔ وہ ہمارے معاشرے پر زیادہ اثر انداز نہیں ہوتے، محدود تعداد میں درآمد ہوتے ہیں اور ان میں جنسی تلذذ قطعاً نہیں ہوتا۔ ان میں سے فحش رسائل کا موازنہ ایسے بھی ہے جیسے کسی بے مقصد عریاں اور تصویر کو گویا کے مطالعاتی شاہ کار کا ہم پلہ قرار دے دیا جائے۔ یہ پرچے کسی نہ کسی بہانے اور کبھی بغیر بہانے کے ننگی تصویریں چھاپتے رہتے ہیں۔ بعض کا طریقہ واردات یہ ہے کہ وہ تصویر کے نیچے ایسی اصلاحی سطریں لکھ دیتے ہیں کہ فلاں ہوٹل میں کیسا عریاں رقص ہو رہا ہے۔ یعنی اس ہوٹل میں تو چند لوگوں نے عریانی رقص دیکھا ہوگا مگر ایڈیٹر صاحب نے کئی ہزار کی تعداد میں چھپنے والے رسالے میں اس کی تصویر چھاپ کر ثواب دارین حاصل کر لیا۔

بعض فحش رسائل کے ایڈیٹرز کا کہنا ہے کہ وہ یہ پرچے صرف بزنس کے طور پر شائع کرتے ہیں اور انھیں اپنے گھروں میں داخل نہیں ہونے دیتے یعنی وہ اسے جرم تسلیم کرتے ہوئے بھی اپنی معاشی مسائل حل کرنے کے لئے کر رہے ہیں۔ اس کے برعکس کچھ کا خیال ہے۔ 'بدنام اگر ہوں گے' تو کیا نام نہ ہوگا!' ان میں ایک آدھا ہی ایسا سر پھرا ہوگا جو خود کو حق پر سمجھ کر مشن کے طور پر فحاشی پھیلا رہا ہو۔ ان کے بھی کچھ مسائل اور مجبوریاں ہیں۔ انھیں پتا ہے کہ صحت مند صحافت میں وہ کھپ نہیں سکتے ہیں، دوسرا کوئی کام وہ جانتے نہیں ملازمت انھیں مل نہیں سکتی تو وہ پھر کیا کریں، آخر انھیں بھی زندہ رہنا ہے۔

ماخذ (اُردو ـ ۱۰۲)

'مجبور' مائی باپ'!

ایک طرف زمانہ قیامت کی چال دوڑ رہا ہے، ہر شے روز بروز جدید سے جدید تر ہوتی جا رہی ہے۔ کیا مصنوعات' کیا ملبوسات' کیا ایجادات' اور کیا مطبوعات۔ لکس نیا لکس کا چہرہ لگا کر سامنے آ رہا ہے، سرف، نیا سرف بن کر مارکیٹ میں اُتر رہا ہے، ٹریٹ بلیڈ، نیا ٹریٹ کے روپ میں بالوں کا قلع قمع کر رہا ہے، ادھر لباسوں کی دنیا میں بھی بھونچال آیا ہوا ہے۔ لاچوں' شلواروں' غراروں' لہنگوں کی جگہ میکسیاں' منڈیاں' جینز' فلیپرز' ٹراؤزرز، جسموں کی قوسوں، گولائیوں اور نشیبوں کے پردے فاش کر رہے ہیں۔ ایجادات میں بھی سائنس داں قدم قدم پر چونکا رہے ہیں۔ کمپیوٹر کو انسان کا سبسی ٹیوٹ بنا رہے ہیں، ٹیلی فون میں ٹیلی فون کرنے والے کی فوٹو دکھا رہے ہیں۔ انسان کو چاند پر پہنچا رہے ہیں۔ مطبوعات کا جہان بھی انسان کی تلوّن مزاجی اور رنگینی طبع کی دست بُرد میں آیا ہوا ہے...... اس وقت ایسی ایسی کتابیں، ایسے ایسے ناول، ایسے ایسے میگزین اور ایسے ایسے اخبارات طبع ہو رہے ہیں کہ جی چاہتا ہے، سب پر چیز کر لیے جائیں۔

علاوہ ازیں افراد کے خیالات میں بھی نئی نئی تبدیلیاں ہنگامہ زن ہیں، مگر دوسری طرف میرے نام نہاد محتسب مجھے کہہ رہے ہیں کہ 'کاکی کیہہ کری جارئی ایں، رسالے میں کیا چھاپی جارئی ایں!' چناں چہ میں حیران ہوں کہ ان ہپوکریٹ لوگوں کو کیا جواب دوں! انہیں کیسے سمجھاؤں کہ یہ دور پنڈت رتن ناتھ سرشار کا دور نہیں ہے' ڈپٹی نذیر احمد کا دور نہیں ہے' مولانا محمد حسین آزاد کا دور نہیں ہے۔ مولانا الطاف حسین حالی کا دور نہیں ہے' رجب علی بیگ سرور کا دور نہیں ہے' سر سید احمد خاں کا دور نہیں ہے، مولانا شبلی نعمانی کا دور نہیں ہے' خواجہ حسن نظامی کا دور نہیں حتیٰ کہ مولانا ابوالکلام آزاد کا بھی دور نہیں ہے جو مصفا و مقفا تحریریں قلم بند کی جائیں۔ یہ دور تو وہ دور ہے جس میں بدنوں پر سے پیرہن کھسکتے جا رہے ہیں، ہوٹلوں، کلبوں میں کھلے عام گل چھڑے اڑائے جا رہے ہیں فلموں میں اداکاراؤں سے فلم بینوں کے پسینے وگا دینے والے ڈانس کرائے جا رہے ہیں۔ گھر گھر کڑیوں منڈیوں کو: 'ہم تم اک کمرے میں بند ہوں اور چابی کھو جائے۔' 'آ سینے نال لگ جا ٹھاہ کر کے' ، 'یہ سانس میرا آتا جاتا ہے کبھی اندر کبھی باہر' ۔ 'جدوں دل نال دل ٹکراندا اے تے ہولی جئی آواز آندی اے ٹھاہ۔ ٹھاہ۔ ٹھاہ' جیسے تند و تیز اور انگ انگ میں موم بتیاں روشن کر دینے والے گانے بذریعہ ریڈیو سنائے جا رہے ہیں۔

لہٰذا مجھ سے یہ توقع کیوں رکھی جا رہی ہے کہ میں موجودہ زمانے کا ساتھ دینے کے بجائے اپنے قارئین کو مثنوی سحرالبیان یا فسانۂ عجائب پڑھنے پر مجبور کروں گی۔ آخر ہر دور کا ایک اپنا تقاضا، ایک

اپنی ڈیمانڈ ہوتی ہے۔ اگر میرے محتسب میری تحریروں کو پچاس ساٹھ سال پہلے لے جانا چاہتے ہیں تو میں جانے کے لیے تیار ہوں بشرطے کہ وہ زندگی کے دوسرے شعبوں میں رونما ہونے والی ترقیوں یا امپرومینٹس کو بھی واپس وہیں دھکیلیں جہتوں وہ نکلی ہیں' الیکٹرک شیور یا بلیڈ استعمال کرنے کے بجائے لوگوں سے اُسترے استعمال کرائیں، موٹر سائیکل، کار، ہوائی جہاز، سائیکل، بس وغیرہ کے ذریعے سفر کرنے کے بجائے لوگوں کو اونٹوں، گدھوں' ٹم ٹموں، خچروں وغیرہ کے ذریعے سفر کرنے پر مجبور کریں، دوسرے ممالک میں شائع ہونے والے رسائل کو پاکستان میں امپورٹ نہ ہونے دیں جن میں ہر دوسرے صفحے پر برہنہ یا نیم برہنہ عورت کھلکھلا رہی ہوتی ہے۔ انگریزی فلموں کی نمائش پر پابندی عائد کریں جن میں ہر پانچویں منٹ پر ٹھاہ کر کے لبوں سے لب بھڑ جاتے ہیں۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ اپنے ملک میں لمبے بالوں والے لڑکوں لڑکیوں کی درازوں، گہرائیوں سے جینز اور فلیپرز نکالیں اور انھیں کھلی کھلی پتلونیں اور شلواریں زیب تن کرنے کی ہدایت کریں......

اگر یہ ایسا نہیں کر سکتے تو مجھ اکیلی کو ماضی میں کیوں دھکیل رہے ہیں، کیا اس لئے کہ میں ان کے پردے تار تار کرتی ہوں، اپنے قارئین کو حقائق سے متعارف کراتی ہوں!

ماخذ (اُردو۔۱۰۶)

ہمارا قصور

عکسِ ملتان

بھئی ہم فلمی رسالے والوں کا کیا قصور! یہی نا کہ ہم فلموں میں دکھائی جانے والے ڈانسز کی تصاویر اپنے رسائل میں شائع کرتے ہیں! اگر ہمارے ہاں فلمی جرائد میں یہ بے جان تصویریں آپ کو نظر آ جاتی ہیں' تو آپ اس وقت کہاں ہوتے ہیں جب نازلی ڈانس کرتی ہے اور اس کی ٹانگوں اور ہپ کے پیچھے سے فلیش مار کر لباس غائب کر دیا جاتا ہے!

اگر ایسے سین فلمانے پر کوئی پابندی نہیں تو پھر اُسی سیٹ پر بنائی فوٹو کو فلمی جریدے میں شائع کرنے پر کیوں پابندی ہے! مثلاً 'جیلر تے قیدی' کے اس فوٹو کو شائع کر کے ہم جرم تو نہیں کر رہے کہ یہ فوٹو بھی اسی وقت لیا گیا ہے جب اس فلم کی 'شوٹنگ کے دوران رفعت نامی یہ لڑکی ڈانس کر رہی تھی۔

ماخذ (اُردو۔۱۰۷)

‘ناپاک شے‘

‘شالیمار‘ کا ذکر ایسے کیا جاتا ہے جیسے یہ کوئی ناپاک شے ہے، جس کا ذکر زبان پر آگیا تو زبان ناپاک ہو جائے گی۔ یہاں میں ذرا ‘شریف‘ جریدوں کا بھی ذکر کرلوں تا کہ ان ناقدین کی کچھ تسلی ہو جائے۔

‘خور‘ اور ‘زیب النسا‘ خواتین کے مقبول رسالے ہیں لیکن اِنھیں مرد بھی پڑھتے ہیں۔ اِن میں کچھ اِس قسم کی تحریریں اور اشتہارات چھپتے ہیں: ‘خواتین کے پوشیدہ امراض اور ان کا علاج‘۔ ‘ماہواری میں کمی کا علاج‘۔ ‘سینے کے اُبھار میں نقص‘ اور ‘کولھے بہت بھاری ہیں‘ وغیرہ وغیرہ……

‘اخبار جہاں‘ میں مولانا صاحب کے قیمتی مشوروں کو پڑھ کر قارئین کے ذہنوں کو بڑی آسودگی ملتی ہے جو اس طرح کے سوالوں پر مشتمل ہوتے ہیں: ‘بیوی کے ساتھ غیر فطری فعل کے بعد نکاح کا ٹوٹنا‘۔ ‘میاں کے لئے بیوی کے ساتھ مباشرت کب اور کیسے جائز ہے!‘۔ ‘خاوند کے منہ میں نادانستہ بیوی کا دودھ چلا جائے تو شرعی حکم‘ وغیرہ وغیرہ اس کے علاوہ اسی رسالے میں ایک مستقل کالم ‘تین عورتیں، تین کہانیاں‘ ہے جسے ایک عورت لکھتی ہے، یہ بھی جنسیت کا شکار ہوتی ہیں۔ باقی ڈائجسٹوں کا باوا آدم ہی نرالا ہے۔ اگر اُن کے ہر شمارے میں دو تین فحش کہانیاں نہ ہوں تو اُنھیں کوئی بھی نہ خریدے۔ ایسی صورت میں صرف ‘شالیمار‘ کو ہدف تنقید بنانا‘ سوائے حسد کے اور کوئی جواز نہیں۔

ماخذ (اُردو۔۱۰۸)

عُریانی نہیں، برہنگی

آذر زوبی

علی اقبال: زوبی صاحب، کچھ لوگوں کو آپ کی اکثر پینٹنگز میں عُریانی نظر آتی ہے، آپ کا کیا خیال ہے!

زوبی: ہاں، اس لیے کہ میری پینٹنگز میں عورتیں نہ صرف خوب صورت ہوتی ہیں بلکہ صحت مند بھی۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ اُن کے بدن کے بعض ایسے حصے جو عام طور پر ڈھکے رہتے ہیں، میری بنائی تصاویر میں وہ حصے بھی کھلے نظر آتے ہیں۔ مگر میری تصاویر کو سمجھنے کے لیے آپ کو عُریانی اور برہنگی میں امتیاز کرنا ہوگا۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ میری تصاویر میں آپ کو برہنگی تو ملے گی، عریانی ہرگز نہیں۔ اس سلسلے میں، میں آپ کو ایک دل چسپ بات بتاتا ہوں۔ یہ کہہ کر زوبی مجھے ایک پرانی 'گیسٹ بک' لاکر دکھاتے ہیں جس میں اُن مہمانوں کے تاثرات درج تھے جو اُن کی تصاویر دیکھنے آیا کرتے تھے۔ ان مہمانوں میں 'اے۔ ایم' سعید بھی تھے جنھوں نے ان کی تصاویر دیکھ کر اس کتاب میں ایک انگریزی کا جملہ لکھا جس کا مطلب تھا: 'یہ ملک ایسے آدمی کے لئے نہیں ہے'

زوبی نے بتایا کہ کچھ دیر بعد سعادت حسن منٹو بھی آ گئے اور سعید صاحب کے ریمارکس پڑھتے ہی بولے: یہ تو وہی مجسٹریٹ ہے جس نے مجھے سزا دی ہے، اور پھر منٹو نے اسی وقت، انگریزی کے اس جملے کے نیچے، اپنے ہاتھوں سے اُردو میں یہ عبارت لکھ دی: 'اے ایم سعید صاحب فرماتے ہیں، یہ ملک ایسے آدمی کے لئے نہیں۔ اگر زوبی جیسے آدمی کے لئے یہ ملک ٹھیک نہیں ہے تو مجھ ایسے آدمی کے لئے جسے 'ٹھنڈا گوشت' کے سلسلے میں، سعید صاحب نے تین سو روپے جرمانہ اور تین ماہ قید بامشقت کی سزا کا حکم سنایا تھا، ساری دنیا ہی غالباً ٹھیک نہیں ہے۔ اس لئے میں زوبی کو مشورہ دیتا ہوں کہ اکادمی چھوڑ دے اور ہوٹل کھول لے، میں بیرا بن جاؤں گا۔ شاید یہ ملک ہمارے لئے یا ہم اس ملک کے لئے مناسب بن جائیں'۔ اس عبارت کے نیچے منٹو کے دستخط ہیں اور 10 فروری ۱۹۵۴ء کی تاریخ پڑی ہوئی ہے۔

ماخذ (انگریزی۔ 21)

جُز نہیں، کُل

آذر زوبی

سوال: ابھی بھی آپ کی پینٹنگز میں زیادہ تر عورتیں ہی نظر آتی ہیں۔ وجہ؟

زوبی: میں یہ نہیں کہوں گا کہ عورت خوب صورت ہوتی ہے۔ میں اُسے خوب صورتی میں شمار نہیں کرتا۔ شاعر اور نام نہاد عالم جو عورت کے حسن و شباب کی بات کرتا ہے، وہ عورت سے دور ہو جاتا ہے کیوں کہ وہ صرف ایک 'ڈائمنشین' کی بات کرتا ہے۔ وہ اس کا صرف قد دیکھتا ہے۔ اس کے صرف ایک جز کو دیکھتا ہے۔ مجھے 'کُل' چاہیے، جُز نہیں۔

ماخذ (اُردو۔۸۵)

سفاکانہ مہم

صادقین

اب سے تین سال پہلے لاہور میں میری سیدھی سی تصویروں اور سادہ سے خاکوں کی نمائش ہوئی۔ جم غفیر اس نمائش کو دیکھنے آرہا تھا۔ مفاد پرستوں نے کوچۂ فن میں اپنی عالمگیر مقبولیت سے چراغ پا ہو کر، اس فقیر کے خلاف سفاکانہ مہم کا آغاز کیا۔ احتجاجی جلوس نکالے، نمائش گاہ میں آتش گیر بم رکھے اور نہ جانے کیا کچھ ہوا۔

اس کے بعد تو تخلیقِ فن مزید ضروری ہوگئی۔ منافقانہ اور باطلانہ سانچے میں ڈھلی ہوئی تہذیبی اقدار کے خلاف فن کارانہ جہاد کا سلسلہ جاری رہا۔ اس صورتِ حال میں، میدان جنگ میں استقلال کے ساتھ ثابت قدم رہنا، قلندرانِ ادا آشنا اور درویشانِ حق آگاہ کا شیوہ رہا ہے۔

ماخذ (اُردو۔۱۲۳)

ریشمی سیاہ بُرقع

(احمد سعید) ناگی

'میری بہترین 'نیوڈ' پینٹنگ یہ ہے'...... ناگی اپنی بنائی ہوئی ایک ایسی تصویر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولے جس میں ایک عورت سیاہ ریشمی برقعے میں اس طرح ملبوس ہے کہ اس کی صرف آنکھیں نظر آرہی ہیں۔ پھر بولے: 'عریانی بھی ایک حسن ہے، اظہارِ جمال ہے، ایک نغمہ ہے، مخفی

سوالات کا جواب ہے؛

انھوں نے کہا کہ انسانی حس اور حقیقت عالیہ کو ایک دوسرے سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔ میں انسانی تجربات کے بغیر روحانی حسن نہیں دیکھ سکتا۔ لیکن انسانی تجربہ محض 'نیک بو' پر منحصر نہیں، یہ تو محض ریاکاری ہے۔

ماخذ (اُردو۔۱۳۴)

ارتعاش

جمیل نقش

اس بارے میں میرا رویہ سب سے مختلف ہے۔ میں اگر اپنے ماڈل سے جنسی تعلق قائم کرلوں تو پھر اُسے کبھی مصور نہیں کرسکوں گا۔ چناں چہ میں نے اپنی کسی بھی ماڈل سے، کبھی بھی جنسی تعلق قائم نہیں کیا۔

میرے لئے ماڈل کا بدن ارتعاش پیدا کرتا ہے۔ میری انگلیاں یہ ارتعاش محسوس کرتی ہیں اور انگلیوں سے یہ ارتعاش میرے بُرش میں منتقل ہو جاتا ہے۔ اس ارتعاش کو محسوس کرنے کے لئے جنسی تعلق پیدا کرنا ضروری نہیں۔ پھول بھی تو ارتعاش پیدا کرتا ہے' کیا پھول کا ارتعاش گرفت میں لینے کے لئے پھول سے بھی جنسی تعلق پیدا کیا جائے گا!

میری ایک باقاعدہ تصویری لُغت ہے اور میں نے عورت اور کبوتر کو اپنے سمبلز بنائے ہیں۔

ماخذ (اُردو۔۹۶)

بے لباس خاکے

اے آر ناگوری

۱۹۷۲ء میں جب پہلی بار میری تصاویر کی نمائش ہوئی تو ان پر بھانت بھانت کی تنقید کی گئی۔ مجھے تو یوں لگا کہ جیسے ہی کسی تصویر میں کوئی مرد اور عورت ایک ساتھ نظر آئے' ہم اس مصور پر رومانیت پروری کا الزام جڑ دیتے ہیں۔

کینوس پر تمام بے لباس خاکے عُریاں' اور فحش قرار دئے جاتے ہیں اور انھیں شہوانی اور عامیانہ ٹھہرایا جاتا ہے۔ یہ ہے پاکستان میں فنی تنقید کا معیار!

ماخذ (انگریزی۔43)

ردِ عمل

جمال شاہ

۱۹۸۳ء میں جب میں نیشنل کالج آف آرٹس میں زیرِ تعلیم تھا، ایک جماعت کے لڑکوں نے کارٹون بنانے پر ایک لڑکے کی پٹائی کر دی۔ ہم نے شدید ردِ عمل کا مظاہرہ کرتے ہوئے ہڑتال کر دی اور کالج بند ہو گیا۔ اس دوران، الحمرا میں' میری پہلی نمائش کے دوران' وہاں کے منتظمین نے مجھ سے کہا میں اپنی بعض تخلیقات کو ڈھانپ کر رکھوں۔ میں نے نہایت شائستگی سے انکار کرتے ہوئے، اپنی تخلیقات وہاں سے ہٹا لیں۔ بہرحال، کولن ڈیوڈ کی رہائش گاہ پر حملے کی خبر پڑھ کر میں حیران رہ گیا۔ اسلام کے نام پر غنڈا گردی کی یہ انتہا تھی۔ اس حملے کے کئی پہلو ہیں، ایک طرح سے یہ حملہ ہم سب پر ہے کہ ہم خوف زدہ ہو جائیں۔

اس حملے سے حملہ آور یہ اندازہ بھی لگانا چاہتے تھے کہ اس ملک میں فن کو کس طرح ختم کیا جا سکتا ہے۔ یہ حملہ اس لیے اور بھی بھیانک لگتا ہے کہ وہ ایک عیسائی پر کیا گیا تھا کیوں کہ یہ حملہ اگر کسی مسلمان پر کیا جاتا تو وہ اس کا جواب ضرور دیتا۔ چوں کہ کسی خاص ردِ عمل کا اظہار نہیں ہوا، اس لیے اب کی بار کسی اور کو نشانہ بنایا جا سکتا ہے۔ لیکن اگر میرے ساتھ کچھ ہوا، میں اس کا جواب ضرور دوں گا یعنی میں ان میں سے کسی ایک کو قتل بھی کر سکتا ہوں۔

ماخذ (انگریزی۔ 44)

فِطری اظہار

لیلیٰ شہزادہ

سوال: عام طور پر خواتین اس قدر جرأت سے کام نہیں لیتیں۔ وہ چاہے تصویر بنائیں، شعر کہیں یا افسانے لکھیں، ہر بات کو لگے لپٹے انداز میں پیش کرنے پر اکتفا کرتی ہیں۔ پھر آپ کی یہ نیوڈ!

لیلیٰ شہزادہ: میں نے تو موہنجو ڈارو کی سیریز میں بھی 'نیوڈز' بنائی تھیں۔ اور میری یہ موجودہ 'نیوڈز' بھی کوئی غیر معمولی چیز نہیں۔ یہ تو ایک فطری اظہار ہے۔

ماخذ (اُردو۔ ۱۲۲)

شور مچانے کی ضرورت!

شاکرہ ہادی

مجھ سے جنس اور جنسی رویے اور میرے 'نیوڈز' کے 'پیوبک ہیر' اور جینیٹلو کے بارے میں پوچھا گیا ہے اور سوال کیا گیا ہے کہ آیا میں اپنے کسی کینوس (کاغذ یا ووڈ) پر کام کرنے کے بعد یا اس سے پہلے کسی قسم کی جنسی خواہش محسوس کرتی ہوں!

مگر میرا کہنا تو یہ ہے کہ مجھے جھوٹ بولنے کی ضرورت کیا ہے! میں 'جنس' کو ایک صحت مند انسانی ضرورت سمجھتی ہوں اور اُن لطیف (یا کثیف) جذبات کی عامیانہ نمائش یا اُس کے 'اوور پلے' کو ایک مریضانہ فعل سمجھتی ہوں۔ ویسے میں یہ بھی جانتی ہوں کہ 'جنس' ایک بڑی خوب صورت چیز ہے...... تو پھر اتنا شور مچانے کی ضرورت کیا ہے!

ماخذ (اُردو۔۹۶)

ہُیومن نیوڈز

سُنبل نذیر

آپ پوری آرٹ ہسٹری اُٹھالیں، ہر آرٹسٹ نے نیوڈز پینٹ کی ہیں، میں نے کوئی انوکھا کام نہیں کیا۔ یہ ضرور ہے کہ پاکستانی ہوں اور 'ایک عورت' اس لیے اس بات کو اُچھالا جا رہا ہے۔

آرٹ میں ہُیومن باڈی کی سٹڈی ہوتی ہے۔ وہ تو ایک نیچر ہے۔ ہم اگر انگلینڈ میں پڑھتے تو ہم کو نیوڈ ماڈل ملتے، اسٹڈی کرنے کے لیئے...... اب آپ خود دیکھیں کہ اگر ہم کو ہاتھ بنانا ہے تو ہم کُرتے کے اُوپر سے ہاتھ کیسے بنائیں! جب تک کہ ہمیں ہاتھ کے جوائنٹس کی صحیح شکل معلوم نہ ہوگی، اس وقت تک ہم ہاتھ صحیح نہیں بنا پائیں گے۔

'نیوڈ' بنانے کا یہ مقصد قطعی نہیں ہے کہ پورنوگرافی کر رہے ہیں،۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے ڈاکٹر ہوتے ہیں۔ اُن کو ایک ڈیڈ باڈی ملتی ہے۔ اُس وقت کسی لڑکے حصے میں ایک فیمیل ڈیڈ باڈی آجاتی ہے تو لڑکی حصے میں میل ڈیڈ باڈی۔ اس وقت یہ کمپلیکس نہیں ہوتا کہ یہ پورنوگرافی ہے۔

ماخذ (اُردو۔۹۹)

بلا جھجک تعاون

رفعت علیانی

میں تو بڑی بزدل ہوں۔ اگر مجھے اپنے شوہر کا بلا جھجک تعاون حاصل نہ ہوتا تو میں اپنی ان تصاویر کی نمائش نہ کر پاتی۔

ماخذ (انگریزی۔50)

بُری عورت

مدیحہ گوہر

حکومت اور ہمارے درمیان چند ایک جھگڑے تھے۔ مثلاً یہ کہ مجھے اپنے نام نہاد سیاسی نظریات کی وجہ سے اپنی انگریزی کی لیکچرر شپ والی ملازمت سے ہاتھ دھونا پڑے۔ پھر یہ کہ ہمیں اُس سال تک، الحمرا میں اپنے فن کی نمائش کی اجازت نہیں ملی۔ اور پھر جب صرف ایک بار ہمیں 'ٹکے دا تماشا' دکھانے کی اجازت ملی بھی تو آخری لمحات میں وہاں تالا ڈال دیا گیا اور ہمیں اندر داخل نہیں ہونے دیا گیا۔

پہلے ہی دن سے دائیں بازو کی صحافت نے ہمارا گلا دبانے کی کوشش کی، مگر 'اجوکا' بھارت کے دورے کے دوران اس کی انتہا ہوگئی۔ جب کھیل ختم ہونے پر گلزار مجھے گلے لگانے آئے تو کسی طرح یہ تصویر اُردو اخبارات کے ہاتھ لگ گئی۔ نتیجے کے طور پر مجھے ایک مسلمان 'بُری عورت' کے طور پر بلیک لسٹ کر دیا گیا کیوں کہ میں نے ایک نامحرم کو اپنا بدن چھونے کی اجازت دی تھی۔

ماخذ (انگریزی۔16)

بُرقع اوڑھ کر

ناہید صدیقی

میں بُرقع اوڑھ کر بھلے جو چاہے کرتی رہوں، سب ٹھیک ہے، لیکن اگر میں کسی بھی فن کا اظہار کھلے بندوں کروں تو اسے بے ہودگی سمجھا جاتا ہے!......

آخر مجھے کوئی یہ بھی تو بتائے کہ میں نے کبھی بھی، کسی موقعے پر بھی کوئی نازیبا حرکت کی! کبھی کسی بے ہودہ لباس میں پیش ہوئی! مسئلہ سارا دراصل یہ ہے کہ لوگوں کے سامنے صحیح فن کبھی پیش ہی نہیں کیا گیا۔

ماخذ (انگریزی۔10)

مجھے یاد ہے

ناہید صدیقی

مجھے آج بھی یاد ہے جس طرح ضیاالحق کے دور میں میرے رقص کرنے پر پابندی لگادی گئی تھی۔ جب میں ٹیلی وژن کے لئے کتھک پر ایک سلسلہ وار پروگرام کررہی تھی۔ وزیرِ ثقافت بولے کہ یہ پروگرام سب سے زیادہ گندہ ہے اور اُسے ہمیں فوری طور پر بند کردینا چاہیے۔ میں نے اخبار میں بھی یہ پڑھا کہ 'ناہید صدیقی ہماری نوجوان نسل کو تباہ کررہی ہے'۔

کلاسیکی رقاصوں کے کے خلاف ضیا کی اس صفائی مہم کا نتیجہ یہ نکلا کہ آج ہمیں نہایت ہی بے بنیاد اور گھٹیا قسم کے ناچ دیکھنا پڑ رہے ہیں جن سے ضیا کو سب سے زیادہ خوف آتا تھا۔ سچ بات تو یہ ہے کہ ہمیں وہی کچھ ملا جس کے ہم مستحق تھے۔

ماخذ (انگریزی۔20)

دروازے پر دستک

نگہت چودھری

میں اُس دن کے انتظار میں ہوں کہ جب میرے دروازے پر دستک ہو اور میں گرفتار کرلی جاؤں۔ کسی بھی پروگرام کو پہلی بار پیش کرتے وقت یہ یقین ہی نہیں آتا کہ یہ پروگرام آخر تک پیش کیا جاسکے گا۔

ماخذ (انگریزی۔49)

اعضا کی شاعری

شبانہ شیخ

ہمارے ہاں ہر قسم کی شاعری کرنے کی تو آزادی ہے اور اُس کی حوصلہ افزائی بلکہ اُس کی عزت افزائی بھی کی جاتی ہے۔ مگر اعضا کی شاعری 'شجرِ ممنوعہ' ہوتی جارہی ہے۔

ماخذ (اُردو۔۱۴۱)

شہرت کے بھوکے

انیتا ایوب

جب میں ایشیا پیسیفک پیجنٹ میں شریک ہونے والی تھی، شہرت کے کچھ بھوکے لوگوں نے یہ مطالبات کرنا شروع کر دیے کہ مجھے سنگسار کر دیا جائے، مجھے پھانسی دی جائے۔ اور اسی قسم کی بکواس۔ آخر میرے بارے میں یہ فیصلہ کرنے والے یہ لوگ کون ہوتے ہیں جو مجھے بتائیں کہ مجھے کیا کرنا چاہیے اور کیا نہیں! پھر میں مقابلے سے تو دست بردار ہو گئی مگر مجھے افسوس بہت ہوا......

میرا نام تو اُن لوگوں نے پیش کیا تھا جنھوں نے ۱۹۸۸ء میں، کراچی جیم خانہ میں 'سے کوئن' کے مقابلے میں مجھے 'مس پاکستان' ہونے کا اعزاز بخشا تھا۔ اگر میں مقابلے میں شریک ہوتی تو پہلے راؤنڈ میں غرارہ پہنتی اور اس کے بعد مقابلے میں، سوئمنگ کا سیٹوم پہن کر پیش ہوتی۔ نہانے کا لباس پہن کر نہ تو مجھے جھینپ آتی ہے اور نہ ہی میں شرماتی ہوں، البتہ نہانے کا کا لباس پہن کر میں کیمرے کے سامنے ضرور شرمانے لگتی ہوں۔

ماخذ (انگریزی۔48)

سوچ اور 'اپروچ'

رُوحی بانو

عریانی زندگی کی ایک ٹھوس حقیقت ہے جس سے مفر نہیں۔ البتہ 'فحاشی بہر حال ایک بُری چیز ہے۔ پھر بھی 'عریانی اور فحاشی کا انحصار انسان کی اپنی سوچ اور اپروچ پر ہے۔ مثلاً منٹو کے افسانے' ایک شخص کے نزدیک فحش ہیں اور دوسرے کے نزدیک نہیں۔

ماخذ (اُردو۔۱۰۵)

آخر 'سیکس' ہے کیا!

میرا

سوال: آپ کے خلاف اتنا شور وغل کیوں مچا!

میرا: مجھے تو ابھی تک یہ نہیں معلوم کہ یہ سب کچھ کیوں ہوا! میری یہ فلم زیرِ تکمیل ہے اور کسی نے اُسے دیکھا

بھی نہیں مگر کچھ لوگوں نے یہ کہنا شروع کر دیا ہے کہ ’نظر‘ ایک گندی فلم ہے اور اس میں بوسہ بازی کا ایک منظر بھی شامل ہے۔

سوال: کیا یہ سچ ہے کہ بالی ووڈ کی فلم میں کام کرنے کے باعث، حکومت نے آپ پر 10 ملین روپے کا جرمانہ عائد کیا!

میرا: مجھ پر کوئی جرمانہ عائد نہیں ہوا، بلکہ یہ تو میں نے کہا ہے کہ اگر مجھ پر ’بازاری پن‘ کا الزام ثابت ہو جائے تو میں ایک کروڑ روپے جرمانہ بھروں گی۔

سوال: بھٹ صاحب کی آئندہ فلم جس میں ہاشمی کام کر رہے ہیں، لگتا ہے کہ یہ فلم کھلم کھلا قسم کے چند مناظر پیش کرنے والا ایک آسان نسخہ ہے!

میرا: میں تو یہ نہیں سمجھتی کہ اس میں کوئی بہت ایسی ویسی بات ہو گئی ہے۔ آخر ’سیکس‘ ہے کیا! جس طرح ہمیں بھوک لگتی ہے، ہم ٹائلٹ جاتے ہیں، اسی طرح ’سیکس‘ بھی ہمارے بدن کا ایک وظیفہ ہے۔ ذرا اس ملک کی آبادی تو دیکھیں، آخر اتنے سارے لوگ کہاں سے آ گئے! اس کا مطلب یہ ہے کہ لوگ ’سیکس‘ سے کام لے رہے ہیں۔ غیر ممالک میں تو ’سیکس‘ کے بارے میں کلاسز ہوتی ہیں جب کہ ہمارے ملک میں اس بارے میں تربیت تک نہیں دی جاتی ’خاص کر لڑکیوں کو...... مگر ہمیں یہ سمجھ لینا ہو گا کہ ’سیکس‘ زندگی کا ایک حصہ ہے۔

ماخذ (انگریزی۔ 14)

ایک بڑی اداکارہ کا مشورہ

شمع

’الٹی میٹم‘ میں جس قسم کا ’ریپ‘ سین میں نے فلم بند کرایا ہے ’ایسے سین‘ خیر مجھے اچھے تو نہیں لگتے مگر لگتا ہے کہ میری تقدیر میں زیادہ تر ’ریپ‘ سین ہی ہیں۔ ایک مرتبہ ’محبت ہے زندگی‘ میں مجھے ایک اور قسم کا رول آفر ہوا۔ میں نے انکار کیا تو سیٹ پر موجود اداکارہ ممتاز نے بڑے پیار سے مجھے کہا: ’کرلو نا، اس میں کوئی برج تو ہے نہیں‘۔

میں نے بھی سوچا کہ اتنی بڑی اداکارہ مجھے اتنے پیار سے کہہ رہی ہے تو پھر میں کیوں نہ کرلوں! چناں چہ میں وہ سین کرلیا، لیکن وہ کچھ زیادہ ہی نیچرل تھا، جسے سنسر والے برداشت نہ کر سکے اور اُسے فلم سے کاٹ دیا گیا۔

ماخذ (اُردو۔ ؟)

رول کا تقاضہ

عاشی

میں عریانی کی تو مخالف ہوں، لیکن اگر میرے رول کے لئے ضروری ہو تو میں سوئمنگ کاسٹیوم بھی پہن لوں گی۔

غیر ملکی فن کاروں میں مجھے راکیل ویلچ پسند ہے حالاں کہ وہ ایک سیکس سمبل کے طور پر مانی جاتی ہے اور مجھے اُس کی عریانیت بھی پسند نہیں۔ مگر یہ کوئی ضروری تو نہیں کہ میں بھی وہی کرنے لگوں جو میری پسندیدہ اداکارہ کرتی ہے۔

ماخذ (اُردو۔ ۱۱۷)

عوام کا ردِ عمل

فردوسی

بلاشبہ، فلموں میں پائی جانے والی عریانیت اور سوقیانہ پن کے لئے فلمی ستارے بدنام ہیں ' حالاں کہ حقیقت تو یہ ہے کہ ناظرین یہ سب کچھ پسند کرتے ہیں۔ میں نے تو ایسے واقعات سنے اور پڑھے ہیں، جب 'گرما گرم' قسم کی چیزیں نہ دکھانے پر' عوام نے سینما کے فرنیچر کو آگ لگادی۔

ماخذ (انگریزی۔ 41)

عوام کا مزاج

نجمہ رومانی

فلمی صنعت میں اب فن کی نہیں، بدن کی قدر ہوتی ہے۔ ہر فلم ساز کی خواہش ہوتی ہے کہ فلم بنانے پر جتنی رقم خرچ کرے، اُس سے دُگنی رقم وہ فلم فروخت کر کے، فوراً ہی حاصل کر لے۔ اپنی اس خواہش کو پورا کرنے کے لئے، فلم ساز عوام کے مزاج کو مدِ نظر رکھ کر فلم بناتا ہے اور پھر ہم اداکاراؤں کو، فلم ڈائریکٹر کی مرضی کے مطابق' عریاں لباس پہننے اور عریاں رقص کرنا پڑتے ہیں۔

ماخذ (اُردو۔ ۱۱۶)

عریانی کا زینہ

نجمہ

یہ غلط ہے کہ میں نے کامیابی کی منزل تک پہنچنے کے لئے عریانی کو زینہ بنایا۔ جب میں 'خان زادہ' میں پہلی بار کام کر رہی تھی تو میرے وہم وگمان میں بھی نہ تھا کہ میں عریانی کی مرتکب ہو رہی ہوں۔ دراصل ایک نئی نئی اداکارہ ہونے کی وجہ سے نہ تو مجھے کیمرہ سینس تھا اور نہ لائٹوں کی تمیز۔

میرے اس رقص کے دوران، ہدایت کار نے زوم لینس کا استعمال کیا اور زوم لینس نے میرے ہر ایکشن کو ایک عریانی کا روپ دے دیا۔ آپ یقین کریں مجھے اس بات کا علم اس وقت ہوا جب 'خان زادہ' ریلیز ہوئی۔

ماخذ (اُردو۔۱۱۸)

میرا کیا قصور!

نمی

اگر کسی کے پاس ایک خوب صورت بدن ہے اور پُرکشش ہونے کی وجہ سے لوگ اُسے پسند کرتے ہیں تو اس میں اُس کا اپنا کیا قصور ہے، جسے قدرت نے یہ سارے اثاثے عطا کئے ہیں!

ماخذ (اُردو۔؟)

آہ آہ، واہ واہ!

ننی

فلموں میں 'منی' ساری سب سے پہلے میں نے ہی باندھی تھی...... بلاؤز بھی اونچا، ساری بھی اُونچی، تاکہ سیکس نمایاں ہو۔ لیکن صرف اس حد تک کہ دیکھنے والے 'واہ، واہ' کریں، 'آہ، آہ' نہ کریں۔ میں شادی کی قائل نہیں ہوں کہ دو چار بچے پیدا کر لئے اور گھر بیٹھ گئے۔ فی الحال تو میں عورت نہیں صرف ایک لڑکی ہوں، بلکہ ایک اداکارہ۔

ماخذ (اُردو۔۱۲۰)

عریانی کا سیلاب

دلجیت مرزا

فحاشی اور عریانی کا سیلاب بین الاقوامی ہے اور اُسے روکنا ایسا ہی ہے جیسے گندگی اور تعفن کو ڈھانپنا۔ اسی لئے بہتر یہی ہے کہ دوسرے ممالک کی طرح ہمارے ہاں بھی، سیکسی فلموں کے لئے سینما گھر مخصوص کر دیئے جائیں۔

ماخذ (اُردو۔۱۳۲)

دوطرفہ ذمہ داری

نعمان

ہماری فلموں میں' عریانی اور فحاشی کا یہ رُجحان گذشتہ چند برسوں کے دوران پیدا ہوا ہے۔ اگر آپ ہدایت کاروں پر، معاشرے کو بگاڑنے کی ذمے داری عائد کرتے ہیں تو پھر معاشرے پر بھی اس بات کی ذمے داری عائد ہوتی ہے کہ وہ فلم سازوں اور ہدایت کاروں کو ایسی فلمیں بنانے پر مجبور کرتا ہے۔

ماخذ (اُردو۔۱۳۳)

سینماٹوگرافی ایکٹ کا مطالعہ

اسلم ڈار

میری فلم کا نام 'مسٹر ۳۰۳' تھا۔ اُس زمانے میں فلم اسلام آباد میں سنسر ہوتی تھی۔ جب میں فلم لے کر وہاں پہنچا تو اُسے دیکھنے کے بعد' اس وقت کے سنسر بورڈ کے چیئرمین نے مجھ سے پوچھا کہ کیا فلم آپ نے بنائی ہے۔ میں نے کہا' جی ہاں۔ تو انھوں نے پوچھا کہ کیوں نہ اس فلم کو بین کر دیا جائے! میں نے کہا اگر اس میں واقعی کوئی قابل اعتراض بات ہے تو اسے بین کر دیں۔ انھوں نے مجھے بتایا کہ آپ کی فلم ہم نے فُل بینچ کو ریفر کر دی تھی۔ فلم کی کٹنگ کے بعد جو فلم انھوں نے مجھے دی وہ اتنی تھی کہ اس سے بہتر تو یہی تھا کہ یہ فلم لگائی نہ جائے۔

چونکہ مجھے آگے بھی فلمیں بنانی تھیں اس لئے میں نے سنسر بورڈ کی ایکٹ کی تمام شقوں کا

مطالعہ کیا جس کے تحت ایک فلم سنسر ہوتی ہے۔ آپ کو حیرانی ہوگی کہ سینماٹوگرافی ایکٹ کے بغور مطالعے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا کہ اس ایکٹ کے تحت تو پاکستان میں کوئی فلم بنا ہی نہیں سکتا۔ یہ جو فلمیں بن رہی ہیں اور سینما گھروں میں چل رہی ہیں، یہ تو فلم سنسر بورڈ کے اراکین کی صوابدید پر چل رہی ہیں۔ میری اس فلم کو سنسر کرانے میں مجھے گیارہ ماہ کا ٹائم لگا اور یہ ٹائم میں نے بڑی تکلیف سے گذارا۔ فلم کے حشر کے بارے میں تو ہم پہلے ہی تیار بیٹھے تھے اور اس طرح 'مسٹر ۳۰۳' ناکام ہوگئی۔ بہرحال، اس فلم کے بعد میں محتاط ہوگیا۔

سنسر بورڈ کے قوانین صرف کتابوں میں بند ہیں اور اُن کا اطلاق کہیں بھی نہیں ہوتا۔ نہ پہلے ہوتا تھا، نہ اب ہو رہا ہے۔ ایک زمانے میں اصول یہ تھا کہ ہیرو اور ہیروئن کے درمیان تین فٹ کا فاصلہ ہوگا مگر اس پر عمل کبھی نہیں ہوا اور نہ ہو سکتا تھا۔ پھر فلموں میں' ہیرو اور ہیروئن لپٹتے چمٹتے نظر آنے لگے اور آج بھی نظر آرہے ہیں۔ سنسر بورڈ کے ذریعے یہ جو مذاق عوام اور فلم انڈسٹری کے ساتھ کیا جا رہا ہے، میں نے آپ کے سامنے بیان کردیا ہے۔ یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے۔

ماخذ (اُردو۔۱۱۰)

عُریانی کی لہر

سید نور

عُریانی کی لہر نے پوری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا ہے لیکن بیرون ممالک فلموں میں عُریانی کے حوالے سے 'کیٹیگریز' بنادی گئی ہیں اور مختلف نوعیت کی فلموں کے لئے الگ الگ سینما مختص ہیں جہاں فلم بینوں کا داخلہ اُن کی عمر کے تعین کے مطابق ہوتا ہے۔ لیکن ہمارے ہاں فلمی عُریانی بے لگام گھوڑے کی مانند ہے۔ جس کا دل جو چاہتا ہے، کرتا ہے۔

عُریانی اور فحاشی کو فروغ دینے میں سنسر بورڈ نے بھی ایسا کردار ادا کیا ہے جو انتہائی گھناؤنا ہے۔ سنسر بورڈ فلم سنسر کرتے وقت جو عُریاں مناظر کاٹ دیتا ہے، بعد میں پیسے لے کر انھیں مناظر کو چلانے کی اجازت بھی دے دیتا ہے۔

ماخذ (اُردو۔۱۳۹)

بُری بات

شہزاد رائے

میں نے اپنی نئی البم 'بُری بات' میں شامل گانے میں 'سالی تو مانی نہیں' کے الفاظ انتہائی سوچ سمجھ کر استعمال کیے ہیں اور ان کو تبدیل کرنے کا میرا کوئی ارادہ نہیں کیوں کہ 'سالی' معاشرے میں عام استعمال ہونے والا لفظ ہے جس میں کسی صورت بدتمیزی کا کوئی عنصر نہیں۔

ماخذ (اُردو ـ ۱۳۸)

rekhta

آنکھیں شرم سے جھک جاتی ہیں

رانی

فلم سنسر بورڈ کی رُکن اور سابقہ ادارہ رانی نے کہا ہے کہ قومی اور ملکی مفادات اور فلمی صنعت کی بہتری کے لئے بہت ضروری ہے کہ فلمی صنعت اور فلم سنسر بورڈ میں باہمی افہام و تفہیم کی فضا قائم کی جائے۔

فلموں کے موجودہ رجحانات اور ان کی سنسر کے حوالے سے گفتگو کرتے ہوئے رانی نے کہا کہ ایک تو ہماری فلموں کا معیار روز بروز پست ہوتا جا رہا ہے، دوسرے سنسر بورڈ کے اراکین میں سے کئی رکن ایسے ہیں جو فلم کی ٹیکنیک کو نہیں سمجھتے۔ ان اراکین کے فلم ٹیکنیک سے ناواقف ہونے کی وجہ سے سنسر کے وقت بہت مشکل پیش آتی ہے۔ کسی بھی فلم کو سنسر کرنے کے لئے ضروری ہے کہ اسے مکمل طور پر تسلسل سے دیکھا جائے اور اس کے کسی بھی حصے پر اعتراض، کہانی اور کرداروں کے سیاق و سباق کی روشنی میں کیا جائے۔ سنسر شو میں ہوتا یہ ہے کہ بعض اراکین تاخیر سے آتے ہیں، بعض اراکین شو کے دوران سو جاتے ہیں، یوں وہ پوری فلم تسلسل سے نہیں دیکھ پاتے، لیکن اعتراض کرتے ہوئے وہ سب پیش پیش ہوتے ہیں مثلاً اگر انھیں کسی مکالمے کے ایک لفظ یا سین کے ایک شارٹ پر اعتراض ہو تو وہ اس لفظ کا یا شاٹ کا سیاق و سباق جانے بغیر مطالبہ کرتے ہیں کہ پورا سین یا پورا مکالمہ کاٹ دیا جائے۔ اسی طرح بعض گانوں کی صورت میں بعض اراکین کو انترہ اور استھائی کے فرق کا بھی علم نہیں ہوتا اور اعتراض کی صورت میں وہ پورے گانے کو کاٹنے کی سفارش کرتے ہیں، حالاں کہ اگر ان ٹیکنیکل چیزوں کا علم ہو تو ایک لفظ یا صرف ایک بول بدلنے سے باقی گانا کٹنے سے بچ سکتا ہے۔ جب میں فلموں میں کام کرتی تھی تو میری فلم تہذیب کے ایک گانے۔ لگا ہے مصر کا بازار دیکھو، نئی تہذیب کے شہ کار دیکھو میں سنسر بورڈ کے بعض اراکین کو لفظ مصر پر اعتراض تھا، ہم نے ان کے اعتراض پر لفظ مصر حذف کر کے اس کی جگہ لفظ ’حسن‘ ڈب کر دیا۔ یوں پورا گانا کٹنے سے بچ گیا۔ لیکن اب صورتِ حال یہ ہے کہ اراکین ایک لفظ پر اعتراض کی صورت میں بھی پورا گانا کاٹنے کا مطالبہ کرتے ہیں۔

ایک سوال کے جواب میں رانی نے بتایا کہ میری تجویز یہ ہے کہ سنسر بورڈ کے اراکین کو فلم کی ٹیکنیک کا شناسا ہونا چاہیے۔ جب کوئی نیا سنسر بورڈ تشکیل ہو تو اراکین کو فلم ٹیکنیک کے بارے میں چند لیکچر ضرور دینے چاہئیں تاکہ بعد میں کسی قسم کی مشکل پیش نہ آئے۔ اب صورتِ حال یہ ہے کہ جو اراکین فلم کی ٹیکنیک کو نہیں سمجھ رہے ہوتے، وہ اعتراض کو وقار اور انا کا مسئلہ بنا لیتے ہیں۔ بعض اوقات

فلموں کے ناموں پر بھی اعتراضات کر دیے جاتے ہیں جن کے بارے میں میری رائے یہ ہے کہ دیکھنا یہ چاہیے کہ نام کو فلم میں کس انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ اگر اس نام کے معاشرے پر برے اثرات مرتب نہیں ہوتے تو اس پر کوئی اعتراض نہیں ہونا چاہیے۔ اس کے علاوہ فلموں پر پیش کی جانے والی بعض ایسی باتوں پر بھی اعتراضات کر دیے جاتے ہیں جو ٹی وی پر دکھائی جا رہی ہوتی ہیں۔ مثال کے طور پر ٹی وی پروگرام ’اسٹوڈیو نمبر ۲‘ میں معاشرے کے ہر طبقے کے بارے میں کھل کر تنقید و تبصرہ کیا جاتا ہے لیکن اس قسم کا تبصرہ یا تنقید اگر فلم میں موجود ہو تو اس پر اعتراض کر دیا جاتا ہے۔

اب رہا فلموں کے موجودہ معیار اور رجحانات کا مسئلہ۔ فلموں کا معیار روز بروز پست ہوتا جا رہا ہے اور صورتِ حال یہ ہے کہ بعض اوقات فلموں میں ایسے ایسے لچر اور بے ہودہ سین آ جاتے ہیں کہ ہم جو دو چار خواتین ہال میں بیٹھی ہوتی ہیں، اپنی آنکھیں شرم سے نیچی کر لیتی ہیں۔ میں یہ سب کچھ فلمی صنعتی مفاد میں کہہ رہی ہوں۔ میں نے اپنی زندگی کا بہترین حصہ فلمی صنعت میں گزارا ہے، لہٰذا مجھے اس صنعت کی ترقی اور بہتری عزیز ہے۔ ہمیں ایسی فلمیں بنانی چاہئیں کہ لوگ اپنی بہو بیٹیوں کے ہم راہ انہیں دیکھ سکیں، چہ جائے کہ سنسر کے وقت ہماری آنکھیں شرم سے نیچی ہو جائیں۔ ہمارے دور میں بھی ہر طرح کی فلمیں بنتی تھیں لیکن ہر چیز طریقے اور سلیقے سے پیش کی جاتی تھی اور اس کا کچھ مقصد ہوا کرتا تھا لیکن آج کی فلمیں بے مقصدیت کا شکار ہیں۔ فلمی صنعت کے مفاد میں، یہ انتباہ کر رہی ہوں کہ اگر فلموں کا موجودہ رجحان نہ بدلا گیا تو کہیں ایسا نہ ہو کہ سنسر میں اتنی سختی شروع ہو جائے اور اتنی کتر بیونت ہو کہ فلم کی بجائے دیکھنے والے کے پاس ٹریلر پہنچے کیوں کہ سنسر بورڈ کے اراکین پر معاشرتی، اخلاقی اور تہذیبی ذمے داریاں بھی عائد ہوتی ہیں۔

ماخذ (اُردو۔۱۳۷)

میری مجبوری

مولانا عبدالقادر آزاد

ہمارے ہاں فلموں کا حال تو بہت ابتر اور بدبودار ہے۔ میں ایک سال تک فلم سنسر بورڈ کا ممبر رہا ہوں۔ یہ فلمیں دیکھ کر مجھے گھن آتی تھی، مگر ہم ان فلموں کو ’پاس‘ کرنے پر مجبور تھے۔

ماخذ (اُردو۔۱۱۱)

پی ٹی وی کے پروگرام

آغا ناصر

ثقافت والا سوال اور لوگوں کی شکایت میرے خیال میں بہت غیر واضح ہے۔ میں نے یہ اعتراض بہت سنا ہے۔ کراچی کے ثقافتی میلے پر بھی لوگوں کو یہی اعتراض تھا کہ 'پاکستان کی ثقافت کہاں ہے!' ثقافت...... پاکستان کی ثقافت اتنا مشکل مرحلہ ہے کہ اس کا فیصلہ اور انتخاب آج تک نہیں ہوسکا ہے۔ لہٰذا ہم بھی معذرت خواہ ہیں کیوں کہ ہمارے خیال میں لوگوں کے طور طریقے، رہن سہن کے انداز، اُن کے لباس یہ سب کچھ پاکستان کی ثقافت ہیں۔ لیکن جب اُس کو پیش کیا جاتا ہے تو لوگ پوچھتے ہیں 'پاکستان کی ثقافت ہے کہاں؟' جس دور سے ہم گزر رہے ہیں، وہ بہت رنگا رنگ ہے۔ حتیٰ کہ ایک خاندان تک میں یکسانیت نہیں ہے تو پھر ٹی وی اس رنگا رنگی سے کیسے بچ سکتا ہے! اس کا اندازہ آپ کو یوں کرلیں کہ ایک ہی گھر میں چھینک آنے پر باپ 'شکر الحمد للہ' اور بیٹا 'ایکسکیوز می' کہتا ہے۔

جہاں تک بے مقصدیت کا تعلق ہے تو پاکستان ٹی وی کے ناظرین مزاج، طبقات اور کئی لحاظ سے مختلف حلقوں میں تقسیم ہیں۔ ہر حلقے کی الگ پسند ہے۔ ایک طبقہ کہتا ہے، پاکستانی گانے کھڑے ہوکر گانے کی چیز نہیں ہیں۔ جب کہ دوسرا کہتا ہے کہ نہیں گانے کے ساتھ تھرکنا بھی ضروری ہے۔ اچھا لکھنے والا کبھی کوئی غلط چیز نہیں لکھتا لہٰذا اُس کی کسی بات یا کردار کو لوگوں کو ذرا سی پسند و ناپسند پر ختم کرنا ناممکن ہے۔ جہاں تک بچوں کا بڑوں کے پروگرام دیکھنے کا تعلق ہے تو یہ غلطی سراسر والدین کی ہے۔ وہ شروع سے بچوں کو منع کیوں نہیں کرتے!

ہمارے پاس اس شکایت کا ایک ہی حل ہے کہ ایسے پروگرام دیر سے پیش کریں۔ لیکن جب یہ قدم اُٹھایا گیا تو اگلے دن اخبار میں تھا کہ کل بچوں کی اکثریت دیر سے اسکول پہنچی۔ اب یہ غلطی تو ہماری نہیں تھی۔ پھر لوگ یہ کیوں نہیں دیکھتے کہ آج کے بچے زیادہ باخبر اور ہوشیار ہیں بہ نسبت اب سے ۱۰ سال پہلے بچوں کے۔

ماخذ (اُردو ـ ۹۸)

فیصلہ کا حق

طلعت حسین

میں پوچھتا ہوں کہ قومی سطح پر عریانی کیا ہے اور کیا نہیں، یہ طے کرنے کا حق 'اُن' کو کس نے دیا ہے! یقین کریں، عریانی ایک ایسی تجرید ہے جس کا احاطہ بلوں اور قوانین کے ذریعے نہیں کیا جاسکتا۔ اس لئے کہ اس مسئلے کا سارا انحصار اس بات پر ہے کہ آپ کتنے تعلیم یافتہ اور کتنے مہذب ہیں۔

ہمارے ملک کے بارے میں، میں آپ کو ایک مثال دیتا ہوں۔ میرے اپنے لئے یہ کوئی خاص بات نہیں کہ میں راستہ چلتے وقت اپنی بیوی کا ہاتھ تھامے رہوں۔ لیکن ایک مولوی صاحب جو اپنی بیوی کو سات پردوں میں رکھتے ہوں، سب کے سامنے اپنی بیوی کے ساتھ بیٹھتے بھی نہیں اس لئے کہ اُن کے نزدیک یہ ایک 'بری' بات ہوگی۔ اب آپ ہی بتلائیں قانون کا اطلاق آپ کس طرح کریں گے۔ یا پھر یہ کہ کیا آپ مختلف لوگوں کے لئے مختلف قسم کے قانون بنائیں گے!

ماخذ (انگریزی۔ 31)

عریانی کے خلاف محاذ

عبدالسّلام خورشید

رفیع اللہ شہاب

ایم صدیقی

اِلحان نیاز

ایس طلعت

جمیل اختر

خالد احمد

سعدیہ دہلوی

اسلام کے نام پر یلغار

عبدالسلام خورشید

ہمیں اندیشہ ہے کہ اگر اسلامی نظام کے حوالے سے جاہل قسم کے نکتہ چینوں کو ادب اور ادیبوں پر کُھل کھیلنے کا موقع دیا گیا تو وہ دن دور نہیں کہ لوگ حکیم الامت حضرت علامہ اقبال کے بیش تر کلام کو بھی اُن کے مجموعوں سے حذف کرنے کا مطالبہ کر ڈالیں۔ انھی دنوں ایک صاحب نے ہفت روزہ ’زندگی‘ میں مرقع ادب (نصاب برائے انٹرمیڈیٹ) پر تنقید کرتے ہوئے علامہ کی اِس غزل کو بھی قابلِ اعتراض قرار دیا ہے اور اِسے شاملِ نصاب کرنے کو ’خیرہ چشمی‘ بتایا ہے۔

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں
تہی زندگی سے نہیں یہ فضائیں یہاں سینکڑوں کارواں اور بھی ہیں
قناعت نہ کر عالمِ رنگ و بُو پر چمن اور بھی آشیاں اور بھی ہیں

ہم پوچھتے ہیں اس میں خرابی کیا ہے! اس غزل پر بھی اعتراض کیا گیا ہے جس کا مطلع یہ ہے۔

اگر کج رَو ہیں انجم آسماں تیرا ہے یا میرا مجھے فکرِ جہاں کیوں ہو جہاں تیرا ہے یا میرا!

اعتراض یہ ہے کہ ان اشعار میں ’غیر ضروری قسم کی شوخی بلکہ گستاخی کا عنصر غالب ہے‘۔ اِسی مضمون میں میرؔ پر ’تشکیک، خدا بیزاری اور جہالت آفرینی‘ کا الزام لگایا گیا ہے۔ مصحفیؔ کو یاسیت کا مبلغ بتایا گیا ہے، ذوقؔ پر ’محبوبِ حقیقی کی تخفیف‘ کا الزام عائد کیا گیا ہے اور فرماتے ہیں: ’غالبؔ کی زبان سے دعا اور جنت کا استخفاف دیکھئے‘۔

جان تم پر نثار کرتا ہوں میں نہیں جانتا دُعا کیا ہے
واعظ نہ تم پیو نہ کسی کو پلا سکو کیا بات ہے تمہاری شرابِ طہور کی!

الحمد للہ کہ نواب مرزا داغؔ کے صرف دو شعروں کو ’دینی نقطہ نظر سے محلِ نظر‘ ٹھہرایا گیا ہے اور جدید شاعروں میں حفیظؔ جالندھری، حفیظؔ ہوشیار پوری، فیض احمد فیضؔ، ظہیرؔ کاشمیری، انجمؔ رومانی اور منیرؔ نیازی کو رگڑا گیا ہے۔ اور ہاں، احمد ندیم قاسمی کو بھی!

مقالہ نگار فرماتے ہیں: ’یہ ہے مرقع ادب کی ایک جھلک جسے پڑھاتے ہوئے ایک دردمند

مسلمان پاکستانی اُستاد شرم میں ڈوبا رہتا ہے۔ جس کے اشعار کی تشریح میں باغیرت باپ اپنی بیٹی کی کوئی مدد نہیں کرسکتا اور بھائی بہن اکٹھے بیٹھ کر اُس کا مطالعہ نہیں کر سکتے'۔ اس کی وجہ مقالہ نگار کے نزدیک عشق و عاشقی کا موضوع ہے۔ آخر میں فرماتے ہیں' کاش' ذمے دار حضرات کے خلاف مناسب تادیبی کارروائی ہو سکے ۔

آخر ستم کی کچھ تو مکافات چاہیے

ذمے دار حضرات کون ہیں یہ بھی ملاحظہ فرمالیجیے۔ استاد گرامی قدر پروفیسر حمید احمد خان مرحوم مغفور، پروفیسر قیوم نظر، پروفیسر سجاد باقر رضوی۔ اوّل الذکر اللہ کو پیارے ہوگئے، قیوم نظر نوکری سے ریٹائر ہو چکے اس لیے پکڑ لیجیے سجاد باقر رضوی کو! جب ہم پانچویں جماعت میں پڑھتے تھے تو ہماری نصابی کتاب کا نام بھی 'مُرقعِ ادب' تھا۔ اِسی لیے غالب کے یہ شعر ابھی تک یاد ہیں ۔

بے نیازی حد سے گزری' بندہ پرور کب تلک   ہم کہیں گے حالِ دِل اور آپ فرمائیں گے کیا!
آج واں تیغ و کفن باندھے ہوئے جاتا ہوں میں   عذر میرے قتل کرنے میں وہ اب لائیں گے کیا
گر کیا ناصح نے ہم کو قید اچھا یُوں سہی   یہ جنونِ عشق کے انداز چھٹ جائیں گے کیا

اعلیٰ کلاسوں میں بڑے بڑے اساتذہ کی غزلیات پڑھیں۔ ایف اے میں فارسی نصاب کا نام تھا 'سبدِ گل'۔ اس میں حافظ اور سعدی اور دُوسرے فارسی شعرا کی غزلیات، حضرت مولانا علم الدین سالک سے پڑھیں اور 'زندگی' کے مقالہ نگار یہ سُن کر حیران ہوں گے کہ نہ مولانا علم الدین سالک کو شرم آئی نہ ہمیں۔ اور اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے ہمارا اخلاق اور چال چلن ٹھیک ٹھاک رہا۔

اور اب ماہنامہ 'سیارہ' کی تازہ ترین سہ ماہی اشاعتِ خاص پر نظر ڈالیے۔ اداریہ حضرت نعیم صدیقی نے لکھا ہے جو نامی گرامی ادیب، شاعر، اور نثر نگار ہیں۔ موصوف نے ادب میں فحاشی پر یورش فرمائی، بہت اچھا کیا۔ انھوں نے مثال کے طور پر جس افسانے کا ذکر کیا وہ ہمارے مطالعے میں نہیں آیا۔ لیکن اقتباس دیکھ کر جو نہایت فحش ہے ہمیں خیال آیا کہ ادب اور آنہ لائبریریوں کے ذریعے سے تقسیم ہونے والی فحش تحریروں میں کچھ فرق ہونا چاہیے۔ بہر حال ہم بڑے ادب کے ساتھ عرض کرتے ہیں کہ اگر نعیم صدیقی اقتباس دینے کے بعد یہ سطور لکھتے۔ 'ایسے معلوم ہوتا ہے کہ افسانہ نگار خود اُس بستر پر موجود تھا جس پر یہ کارروائی ہو رہی تھی اور وہ باقاعدہ ہر چیز کے نوٹس لے رہا تھا کہ کس کا ہاتھ اب کہاں ہے اور کس کی ٹانگ کیا کر رہی ہے' تو ابلاغ میں کوئی کمی نہ رہتی۔

اسی لئے رسالے کے مدیر انتظامی جناب فضل من اللہ نے ادب کے مختلف پہلوؤں پر جو تاثرات قلم بند فرمائے ہیں اُن میں بہت سے ادیبوں پر یورش فرمائی ہے۔ جمیلہ ہاشمی نے قرۃ العین طاہرہ پر ناول لکھا جو ایران کی ایک مشہور غیر مسلم شاعرہ تھی۔ اس پر ٹیلیویژن تبصرے کے دوران میں

انتظار حسین نے کہیں یہ کہہ دیا کہ طاہرہ سے مجھے میرابائی یاد آ گئی۔ اس پر مقالہ نگار کا خون کھول گیا۔ احمد ندیم قاسمی نے ایک افسانے میں مرکزی کردار کی پنڈلیوں کی تعریف کر دی تو مقالہ نگار فرماتے ہیں:

'ہمارا ساٹھ برس کا ادیب بھی عورت کے جسمانی حسن کو چٹخارے لے لے کر پیش کیے بغیر نہیں رہتا'۔

لیکن اِسی رسالے میں ایک افسانے میں اس جرم کا ارتکاب یوں فرمایا گیا ہے: 'گڈو کانچ کی گڑیا کی مانند تھی۔ متناسب اعضا میں ایک کشش تھی۔ دل کو موہ لینے والی جاذبیت تھی۔ گڈو میدے اور شہاب میں گوندھے ہوئے جسم کے ساتھ اُس کے حواس پر چھا گئی تھی'۔ موصوف نے آغا بابر کو رگڑا ہے۔ ڈاکٹر احسن فاروقی مرحوم کو رگید ڈالا ہے۔ انتظار حسین سے خصوصی چشمک معلوم ہوتی ہے کہ اُن پر تناسخ جیسے اسلام دشمن نظریے پر مرمٹنے کا الزام بھی لگا ڈالا ہے، کیوں کہ انھوں نے بودھی جاتکون پر مبنی ایک کہانی میں اس کا ذکر کیا ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا کے گہرے ساتھی اور ترجمان جناب انور سدید کی زبانی ندیم کے خلاف مواد چھاپا ہے اور 'سیارہ' کے مدیر مسئول جناب فروغ احمد نے ڈاکٹر وزیر آغا کو بھی ہدف بنایا ہے۔ فرماتے ہیں: 'ابھی دنوں سرگودھا کے ایک دانشور نے دھرتی کی بالائی نظریاتی تقسیم کو غیر اہم قرار دیتے ہوئے زیریں وحدت کو ناقابلِ تقسیم ثابت کرنا شروع کیا اور انھیں اُشیرواد ملی'۔

سنسکرت کے ایک وِدوان گرو سے جن کا اسم معروف چند عربی حروف مقطعات پر مشتمل تھا۔ اور مزے کی بات یہ ہے کہ جناب فضل من اللہ نے ابنِ انشا مرحوم کے ایک خط کو سہارا بنا کر عبدالعزیز خالد پر بھی حیا سوزی کا الزام لگا دیا ہے۔ یاد رہے کہ 'سیارہ' عبدالعزیز خالد پر ضخیم خاص نمبر چھاپ چکا ہے اور اس شمارے میں بھی اُن پر کچھ اور مضامین درج ہیں۔ سچ پوچھیے تو ہم کنفیوز ہو گئے کہ آخر 'سیارہ' کس قسم کا ادب چاہتا ہے! اور جب وہ اخلاقی قدروں کا ذکر کرتا ہے تو کون سے حدود متعین کرتا ہے! الحمدللہ کہ فضل من اللہ صاحب کے مضمون میں ایک فقرہ مل گیا۔ فرماتے ہیں:

'اس کی (اسلامی ادیب کی) ایمانی غیرت اسے ہر اس صورت سے باز رکھے گی جس میں بے حیائی اور بے غیرتی (نکاح کے نظام کے خلاف اور زنا کے قریب) کا عمل دخل ہو'۔ مطلب یہ کہ 'عاشقی قید شریعت' میں آجائے تو ادب کا موضوع بن سکتی ہے ورنہ نہیں۔ یہ بات ہماری سمجھ میں آ گئی، لیکن جب 'سیارہ' میں مطبوعہ غزلیات کا مطالعہ کیا تو بالکل مختلف صورت نظر آئی۔ ایک نہ دو، اکٹھی اکتیس غزلیں درج ہیں اور اُن میں وہی مضامین باندھے گئے ہیں جو پرانے اساتذہ باندھا کرتے تھے۔ وہی ہجر، وہی وصل، وہی فراق، وہی مایوسی، وہی آہ و بکا، وہی رونا دھونا، وہی 'جو نہیں جائز اس کی دعائیں'۔ تو ہمیں ان میں کہیں نکاح کا نظام تو نظر نہیں آیا!

ہماری عرض یہ ہے کہ ادب میں فحاشی کے خلاف ضرور جہاد کیجیے گا کہ فحاشی کے لیے کوئی وجہ جواز موجود نہیں۔ ہمارے نزدیک وہ ادب ہی نہیں جو زندگی آمیز اور زندگی آموز نہ ہو جو اعلیٰ اخلاقی

قدروں کی پیش رفت کا ذریعہ نہ ہو۔ اور ظاہر ہے کہ ہمارے نزدیک اسلام ہی اعلیٰ ترین اخلاقی قدروں کا حامل ہے لیکن اگر کچھ لوگوں نے اسلام کا نام لے کر ہر ادیب اور شاعر پر یلغار شروع کردی اور اس میں جہالت سے کام لیا تو یہ اسلام دوستی نہیں اسلام دشمنی ہوگی۔ دوسری عرض یہ ہے کہ فحاشی کو فروغ ہوتا تو ہے ادب میں عشق و عاشقی کو موضوع بنانے سے نہیں بلکہ اُن فلموں سے جنھوں نے معاشرے کا مذاق بگاڑ کر رکھ دیا ہے۔ ریڈیو اور ٹی وی کے اُن کمرشل پروگراموں سے جو بدذوقی کے حامل ہیں اور ناشائستگی کے مظہر۔ اور ان فحش کتابوں اور رسالوں سے جو مغربی ممالک سے درآمد کر کے کھلم کھلا اور کبھی خفیہ طور پر بیچے جاتے ہیں اور ایسی کتابوں اور رسالوں سے بھی جو اس ملک میں چھپ کر تقسیم ہوتے ہیں اور اُن پر پریس کا نام درج ہوتا ہے۔ اس لیے فحاشی کی روک تھام کرنا ہے تو ان چیزوں کی طرف دھیان دیا جائے۔

ماخذ (اُردو۔۱۴۰)

اپنی پسند کا اخلاق

رفیع اللہ شہاب

عریانی ایک ایسی برائی ہے جس پر ہر معاشرے میں ملامت کی جاتی ہے اور معاشرے کے اچھے لوگ اس برائی کو صفحۂ ہستی سے معدوم کرنے میں لگے رہتے ہیں۔ خصوصاً علما اس بارے میں بڑے فعال ہوتے ہیں اور عریانی کو اسلامی تعلیمات کے منافی گردانتے ہوئے اُس کے خلاف جلسے جلوس نکالتے رہتے ہیں مگر بدقسمتی کی بات تو یہ ہے کہ اُن کی عریانی کی تعریف ناقص ہوتی ہے۔ اس لیے بعض اوقات تو وہ نہ صرف عریانی کے اہم سرچشموں کو نظر انداز کر بیٹھتے ہیں بلکہ ایسا لگتا ہے کہ وہ بھی اُن کے حامیوں میں شامل ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنا تمام تر زور اُن معاملات پر صرف کرتے ہیں جن کا عریانی سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ مجھے اس سلسلے میں ذاتی تجربہ ہے جس کی تفصیل میں بیان کر رہا ہوں۔

۱۹۶۱ء میں، جب حکومتِ پاکستان نے عائلی قوانین نافذ کیے تو کچھ علما نے مولانا مودودی کی سربراہی میں ان قوانین کو عریانی کا منبع قرار دیتے ہوئے ان کی تنسیخ کے لیے ایک تحریک چلا دی۔ یہاں اس بات کا یاد رکھنا ضروری ہے جب ۱۹۲۹ء میں مصر میں ایسے ہی قوانین نافذ کیے گئے تھے، تو ہمارے علما نے ان کو سراہا تھا بلکہ مودودی صاحب تو اس پر اتنے خوش تھے کہ انھوں نے ان قوانین کو 'حقوق زوجین' کے نام سے کتابی شکل دے دی۔

بعد ازاں، جب ایک دور میں، ایک جنرل صاحب نے اسلام کا نام استعمال کرنا شروع کیا تو اسی دوران کچھ جماعتوں نے اپنی تمام تر توانائیاں خواتین کی ہاکی ٹیم جیسے مسائل پر صرف کرنا شروع کر دیں اور اس مسئلے پر، بحث و مباحثے کا ایک طویل سلسلہ شروع کر دیا گیا۔ انھی مباحثوں کے دوران ایک خاتون رہنما نے فرمایا کہ خواتین اپنے گھروں کی چہار دیواری کے اندر ہاکی اس طرح کھیل سکتی ہیں کہ مرد حضرات اُن کو دیکھ نہ پائیں۔ اس موقعے پر میں نے کہا کہ بلاشبہ اسلام اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ بنی ٹھنی عورتیں مردوں کے سامنے اپنی نمائش کریں، مگر اس کا اطلاق کھیلنے والی لڑکیوں پر نہیں ہوتا۔ ہاکی کھیلنے کے دوران تو چہرے بھی اتنے گرد آلود ہو جاتے ہیں کہ اُن کو پہچاننا مشکل ہو جاتا ہے۔ پھر جب میں نے ان خاتون رہنما سے پوچھا کہ ذرا وہ چہار دیواری تو دکھائیں جس میں ہاکی کا کھیل کھیلا جا سکتا ہے تو اُن کی حامی خواتین نے غصے میں آ کر سونے کے زیورات سے بھری ہوئی اپنی کلائیاں فضا میں لہرانا شروع کر دیں۔ جب اُن کو بتایا گیا کہ اس طرح کلائیوں میں سونا پہن کر اُس کی نمائش کرنا، خود ایک

طرح کی عریانی ہے، تب اُن کا غصہ ٹھنڈا ہوا۔

بہر حال اس طرح کے حضرات نے آج کل اُن اشتہارات کے خلاف تحریک چلا رکھی ہے جو حیض کے دوران کی استعمال کی جانے والی گدیوں کے بارے میں ہوتے ہیں۔ مجھے تو ان حضرات پر واقعی حیرت ہوتی ہے اس لیے کہ ان اشتہارات میں کسی عورت کی تصویر تو ہوتی نہیں۔ حیرت کی بات تو یہ ہے کہ موٹاپا کم کرنے کے بارے میں مختلف اشتہارات اکثر اخبارات میں چھپتے رہتے ہیں جن میں نیم عریاں عورتوں کی تصاویر بھی شامل ہوتی ہیں مگر ان اشتہارات کے خلاف کوئی آواز نہیں اٹھائی جاتی۔

عُریانی کے بارے میں اس طرح کا اپنی پسند کا اخلاق پیش کرنے سے ان حضرات کے درپردہ مقاصد کی نشان دہی ہوتی ہے۔ اسی طرح سونے کے زیورات پر مبنی اشتہارات تو یہ حضرات خود بھی چھاپتے رہتے ہیں۔ اور تمباکو نوشی کے اشتہارات پر بھی یہ حضرات چپ سادھے رہتے ہیں، جس کی وجہ وہ خود ہی جانتے ہوں گے۔

ماخذ (انگریزی-35)

عریانیت کیا ہے!

ایم صدیقی

عریانی کے روایتی تصورات کے بارے میں ہربرٹ مارکیوزے کے طنز کو تو یہاں نقل نہیں کیا جاسکتا۔ بس یوں سمجھ لیں کہ اس کے خیال میں، وہ عورت عریانی کی مرتکب نہیں جو اپنے بدن کی نمائش کر رہی ہے البتہ ویت نام میں گلی سڑی لاشوں کے انبار یقیناً عریاں ہیں۔

یہ بات صحیح ہے کہ مارکیوزے نے یہ الفاظ اس وقت کہے تھے جب ویت نام کی جنگ جاری تھی مگر آج کے پاکستان، خصوصاً صوبہ سندھ کے حوالے سے بھی یہ الفاظ قطعاً بے محل معلوم نہیں ہوتے۔ آپ خود ہی بتائیے: 'نامناسب' لباس پہنے ہوئے ایک لڑکی اور کسی تعلیمی ادارے میں کلاشنکوف تھامے ہوئے ایک لڑکا، ان دونوں میں زیادہ 'عریاں' کون لگتا ہے! مجھے تو یہ بھی کچھ فحش فحش سا لگتا ہے: مثلاً ایک بس یا منی بس کا جلا ہوا ڈھانچا، آگ اور دھوئیں میں جھلسی ہوئی ایک دکان، ایک اسپتال کا وہ وارڈ جس پر ڈاکٹروں نے تالا ڈال رکھا ہے، ایک ایسی بس جس میں مسافر ایک دوسرے سے کیڑوں کی طرح چمٹے ہوئے ہیں، فلک بوس عمارتوں اور عالی شان کوٹھیوں کے برابر بنی ہوئی غریبوں کی جھگیاں اور کیبنیں، ایک بیگم صاحبہ جو سونے کے کڑوں سے بھرا ہوا اپنا ایک ہاتھ کار سے باہر نکالے کسی بھکارن کو خیرات دے رہی ہے، اور ایک ایسا معاشرہ جس نے 'پیس آف مائنڈ' کے مصنف لاتھ لیب مین کے بقول، 'موت بڑی مکروہ اور انسانی زندگی اتنی ناقابلِ برداشت ہو کر رہ گئی ہے کہ بے شمار لوگوں کے لیے اپنا ذہنی توازن اور ہوش و حواس قائم رکھنا ناممکن ہو کر رہ گیا ہے'۔

کوئی مجھے یہ بتادے کہ عریانی کے خلاف چلائی جانے والی تحریک میں یہ کس قسم کے ذہنی توازن کا مظاہرہ ہے کہ جس کا مقصد خواتین کے لباس کی اصلاح تو ہے مگر جس کے دوران ان لوگوں کی نظریں بجتے گنڑوں کے ساتھ لگی ہوئی چکن تکّے کی دکانوں اور راستے کے بالکل بیچوں بیچ شادی کے شامیانوں جیسی قابلِ نفرت عریانیوں پر نہیں جاتیں!

ہمیں یہ بھی معلوم نہیں کہ وہ کون سا پاکستانی 'عقل مند' تھا جو کالجوں اور جامعات کی تقریبات میں جا کر وہاں عریانی تلاش کرنے لگا بلکہ جس نے وہاں 'بی عریانی' کی چوٹی بھی پکڑ لی! حالاں کہ دیکھا جائے تو یہ بے ضرر قسم کی سالانہ تقریبات ہوا کرتی تھیں جن میں ہمارا ثقافتی بانجھ پن بھی

جھلکتا تھا...... کچھ گانے، ایک آدھ چٹکلہ، کچھ مزاحیہ نقلیں اور پھر تقسیمِ انعامات، اور بس چل دیے گھروں کی طرف۔ اگر کسی کے خیال میں، ان تقریبات میں ایسے ناچ بھی دیکھنے میں آئے تھے، جن کو معاشرہ پسند نہیں کرتا، تو اُن پر حیرت کا اظہار بھی ہو سکتا تھا۔ اُن پر تنقید بھی کی جا سکتی تھی۔ بہر حال 'اس قسم کی غیر ضرر رساں تقریبات کو 'عریاں' قرار دینا' دنگے اور فساد کے ذریعے ان میں رخنہ ڈالنا، اس بات کی پہلی علامت تھی کہ ہمارے شہری معاشرے میں غیر فطری پن سرایت کرنے لگا ہے۔ مگر اس کا سب سے بد قسمت پہلو تو یہ تھا کہ اس قسم کی حرکتوں کو خود حکومت کی تائید حاصل رہی۔ پھر مسئلے کے اس پہلو پر تو ابھی بحث و مباحثہ ہوا ہی نہیں کہ معاشرے میں بالعموم اور نوجوانوں میں بالخصوص پایا جانے والا تشدد، آیا اس قسم کی معمولی تفریحات پر بھی پابندی کے ساتھ شروع ہوا یا اس کے نتیجے میں سامنے آیا!

جو کچھ ہماری فلمی صنعت کے ساتھ ہوا، اس پر بھی یہاں کچھ کہہ دیا جائے تو وہ بے محل نہ ہوگا۔ پاکستانی فلموں اور اُس کے ہیرو اور ہیروئنوں کو اخلاقی اقدار کے لیے خطرہ بتا کر، ان فلموں کا سماجی مقاطعہ کیا گیا، مگر اس کا نتیجہ کیا نکلا! نتیجہ یہ نکلا کہ تقریباً ہر گھر میں، غیر سنسر شدہ بھارتی فلمیں دیکھی جانے لگیں جس سے ہماری تین نسلیں متاثر ہوئیں۔ اور اس طرح کی عریانی پر جتنی پابندی لگائی گئی اس سے کہیں زیادہ عریانی لوگوں نے دیکھی۔ اب صورتِ حال یہ ہے کہ ہر متوسط طبقے کے گھر میں وی سی آر کی شکل میں عریانی موجود ہے اور منی ڈش انٹینا کی آمد بہت جلد متوقع ہے۔ کالجیں اور جامعات تو اب بند پڑی ہیں اور نوجوان لڑکوں کے پاس گلی کوچوں میں کرکٹ کھیلنے اور اُن بھارتی فلموں کو دیکھنے کے سوا کوئی اور تفریح باقی نہیں بچی جن میں اس سے کہیں زیادہ عریانی ہے جو کالج کی تقریبات میں مبینہ طور پر پائی جاتی تھی۔

اور اب تو بات صرف عریاں فلموں تک محدود نہیں رہی۔ اب نوجوانوں کو بُروس لی اور جھگڑالو ننجا قسم کی مار دھاڑ سے بھری ہوئی فلمیں پسند آنے لگی ہیں جو تشدد سے بھری ہوئی ہوتی ہیں۔ مختصراً یہ کہ سیکس اور جرائم پر مبنی یہ وہ تفریحات ہیں جو ہم نے اپنے نوجوانوں کو کالج کی تقریبات میں پائی جانے والی 'عریانی' کے عوض چُپ چاپ پیش کر دی ہیں۔ اب اس میں ہمارے لیے حیرت کی کوئی بات نہیں ہونا چاہیے کہ سینیٹ کی کھیلوں کی کمیٹی واویلا مچا رہی ہے کہ لڑکے لڑکیاں کھیلوں میں دلچسپی نہیں لیتے۔ اس وقت صورت حال یہ ہے کہ لڑکیاں ہاکی نہیں کھیل سکتیں، موسیقی اور ڈرامے تو لڑکے اور لڑکیوں دونوں ہی کے لئے ایک 'بُری بات' قرار دیے گئے ہیں جب کہ کسی مخیرانہ مقصد کے لیے بھی لڑکے لڑکیوں کے کسی ملے جلے مقابلے میں بھی عریانی کے عناصر نظر آنے لگے ہیں۔ اس قسم کے مصلحین کو اب خوش ہونا چاہیے کہ کالج اور یونیورسٹی کے تقریبات تو بند ہو چکیں اور لڑکوں نے اپنے ہاتھوں میں بندوقیں سنبھال لی ہیں اور گلیوں میں اُن جاسوسی فلموں کے مناظر دہرائے جا رہے ہیں جسے

جوان بڑے اطمینان سے اپنے گھروں میں بیٹھ کر گھنٹوں تک دیکھتے رہے ہیں اس لیے کہ کل صبح کالج جانا نہیں۔

ایک بار پھر ہم ذہنی توازن کے موضوع پر بات کرتے ہیں۔ آپ کسی بھی معاشرے کی اصلاح اس طرح نہیں کر سکتے کہ آپ ان تمام چیزوں پر حملہ کرنا شروع کر دیں جو آپ کو ذاتی طور پر ناپسند ہیں۔ اصلاح تو معاشرے کی مکمل درستی کا نام ہے۔ ہر قسم کے سماجی بگاڑ تو جمالیات کی ضد ہیں۔ اس سے پہلے کہ آپ فن میں پائی جانے والی عریانی سے اڑ نکالیں، ضروری ہے کہ آپ سماجی گندگیوں کا قلع قمع کر دیں۔ خوب صورت اور بدصورت کسے کہتے ہیں' عریانی اور دل کشی میں کیا فرق ہے اور فن اور بازاری پن کے کیا معنی ہیں' ان سوالوں کے جواب ایسی تنگ نظری پر مبنی نہیں ہونا چاہئیں جو تیزی سے سکڑتی ہوئی اس دنیا کی بین الاقوامی تسلیم شدہ رائے کے خلاف ہوں۔ آپ 'سوویٹ حیاتیات' کے نام پر کوئی بھی ڈرامہ تادیر تک نہیں رچا سکتے بھلے آپ ایک سُپر پاور ہوا کریں۔ نامعقولیت کی ہار لازمی ہے۔

اگر کوئی اپنے طور پر ایک الگ دنیا تھی تو وہ کمیونسٹ دنیا تھی جس میں، چوری، منافع، سچ، جھوٹ، آزادی، ظلم، انحطاط، ترقی کی اُس کی اپنی 'تعریفیں' چلتی تھیں۔ وہ دنیا اب ڈھے چکی ہے، جس میں ہم سبھوں کے لیے ایک سبق ہے۔ عریانی، جمالیات اور ثقافت کے بارے میں ہم اپنی پرانی تعریفیں چلا نہیں سکتے' یہ بھول کر کہ ساری دنیا کا ان کے بارے میں کیا رویّہ ہوگا۔ میرا خیال ہے اگر ہم ایسا کریں گے تو پاکستان ساری دنیا بلکہ مسلم ممالک سے بھی کٹ کر رہ جائے گا۔ ہمیں ہوش مندی سے کام لینا چاہیے۔ ہمارے لڑکے لڑکیوں کو تھوڑی بہت ثقافتی آزادی ملنا چاہئے۔ ہمیں اُن پر بھروسہ کرنا چاہیے۔

ماخذ (انگریزی-25)

ایک پُرانی بات

الحان نیاز

گزشتہ شب میں شاہین پی ٹی وی سروس کی معرفت اے ایکس این چینل کی سلسلے وار 'سلک اسٹاکنگز' دیکھ رہا تھا تب ایس پی ٹی وی کے نگراں محتسبوں نے اس خوف سے کہ کہیں کسی کا اخلاق خطرے میں نہ پڑ جائے 'اختلاطی قسم کے مناظر کو خلط ملط کرنا شروع کر دیا۔ اپنے ناظرین کے اخلاق کی حفاظت کا یہ جذبہ دیکھ کر میں ایس پی ٹی وی کی تعریف کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ مگر ساتھ ہی ساتھ میں پاکستان کی تاریخ میں احتساب کی نوعیت اور اُن دلیلوں پر غور کیے بغیر بھی نہیں رہ سکتا جو اس سلسلے میں احتساب کے حامیوں نے پیش کی ہیں۔

احتساب کے ان حامیوں نے اپنے دلائل کو دو بڑے خطوط پر استوار کیا ہے۔ پہلی صف کے طور پر 'احتساب اور مملکت کی طرف سے عائد شدہ پابندیوں کے جواز میں، حفاظتی امور اور سیاسی وجوہ کا سہارا لیا گیا ہے۔ اس قسم کے عالمی نقطۂ نظر کی روشنی میں 'کہانی کچھ یوں ہے کہ 'ترقی پذیر ممالک میں' مرکز گریز اور تخریبی رجحانات خاصے طاقت ور ہوتے ہیں جب کہ مملکت سے وفاداری اور عوام میں حکومتی پالیسیوں کے بارے میں سمجھ بہت کم ہوتی ہے۔ اس عدم توازن کی روک تھام کے لیے ضروری ہے کہ ابلاغی ذرائع کو قومی یکجہتی کے مقاصد کے لیے استعمال میں لایا جائے اور انھی کے ذریعے، حقیقتِ حال کے بارے میں، حکمران طبقے کا نقطہ نظر عوام تک پہنچایا جائے۔ اور اس طرح 'ذرائع ابلاغ کو محض ایک وضاحتی اور کفالتی کردار ادا کرنے تک محدود کر دیا جاتا ہے بجائے اس کے کہ وہ ایک مضبوط، معروضی اور ناقدانہ کردار ادا کریں جیسا کہ وہ دنیا کے آزاد معاشروں میں کرتے ہیں۔

اس دلیل کا دوسرا انداز جو احتساب کے حق میں پیش کیا جاتا ہے اُس کی بنیاد، اخلاق اور ثقافتی اقدار کے ایک مخصوص ادراک سے ہے۔ اس مکتبۂ خیال (جو کلّہ دراز علما پر مشتمل ہے) کے مطابق، بعض چیزیں اس نوعیت کی ہیں کہ اگر انھیں بلا کم وکاست، ٹی وی یا ریڈیو پر پیش کر دیا جائے تو دیکھنے والوں اور سننے والوں کے اخلاق متاثر ہوتے ہیں۔ پاکستان میں، احتساب کو انھی دو مقاصد کے حصول کے لیے استعمال کیا جاتا ہے جن کے بارے میں دلیلوں کے انداز نہایت کمزور ہیں۔

پہلی بات تو یہ یاد رکھنی چاہیے کہ احتساب کی وجہ سے مرکز گریز رجحانات میں اعتدال نہیں

آتا بلکہ اس سے تلخیاں اور بڑھتی ہیں۔ حکومت کی پالیسیوں کی مخالفت روکنے کے مؤثر طریقے اور بھی ہیں بجائے اس کے کہ مخالفین کو تصفیے کے ان جائز ذرائع سے بالکل ہی دور رکھا جائے۔ علاوہ ازیں، ذرائع ابلاغ کو محض تائیدی اور وضاحتی کردار تک محدود کردینے سے حکومتی زیادتیوں کی روک تھام بالکل ہی ختم ہوکر رہ جاتی ہے اور وقت کے ساتھ، سرکاری ابلاغی اداروں کی پیش کردہ تصویرِ حقیقتِ حال سے اتنی مختلف نظر آتی ہے کہ عوام سرے سے بیزار ہوجاتے ہیں اور سرکاری پالیسیوں کی تائید عملاً ختم ہوکر رہ جاتی ہے۔

آج کل کے حالات میں یہ بھی یاد رکھنے والی بات ہے کہ جب کبھی' پی ٹی وی اور ریڈیو کسی نقطہ نظر کو پیش کرتے ہیں تو عوام اس پر یقین نہیں کرتے، خواہ وہ سچ ہی پر مبنی کیوں نہ ہو۔ اس کے برعکس، کسی آزاد ابلاغی ادارے سے کوئی بات سنی یا دیکھی جائے تو اس پر فوراً یقین کرلیا جاتا ہے، بھلے وہ سراسر جھوٹ ہی کیوں نہ ہو۔ اس لیے آج کل کی کوئی سمجھ دار حکومت اپنے وسائل اپنا ٹی وی اسٹیشن چلانے پر صرف نہیں کرتی بلکہ وہ بڑی خوش اسلوبی سے کسی آزاد ابلاغی ادارے سے اپنا کام نکالتی ہے۔

احتساب، اخلاقِ عامہ کے تحفظ کی غرض سے ایک تخمینی گوشوارے کے سوا، زیادہ سے زیادہ، ایک رائیگاں مشق اور کچھ زیادہ ہی ناموافق حالات میں، ایک اداراتی منافقت کے سوا کچھ نہیں۔ مثلاً ہمارے معاشرے میں کسی بھی ایسے ابلاغی ادارے کو جو حکومت کے پنجے میں ہے، اُسے اس بات کی اجازت نہیں کہ وہ کوئی اختلاطی منظر پیش کرسکے۔ احتساب کے سلسلے میں جواز یہ پیش کیا جاتا ہے کہ چوں کہ ابلاغی اداروں کی اس قسم کے اختلاطی مناظر کی پیش کش سے 'اسلامی نظام' اقدار کی خلاف ورزی ہوتی ہے، اس لیے اس نظام کی حفاظت کے لیے احتساب ضروری ہے۔

جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے قرآن مقدس، ان اختلاطی مناظر کی پیش کش سے کہیں زیادہ تشدد کی مذمت کرتا ہے۔ مگر ہمارے زیادہ تر 'اسلامی' محتسبین کے لیے یہ کبھی مسئلہ نہیں رہا کہ ہمارے ٹی وی پر کتنا تشدد اور کتنی قتل و غارت گری دکھائی جاتی ہے۔ بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ یہ مریض حضرات جو ہمارے معاشرے کی اخلاقی نگہبانی کے دعوے دار ہیں، تشدد کے عوامی مظاہروں کو بھی اسلامی سمجھ کر اُن سے چشم پوشی کرتے رہتے ہیں مگر جسمانی اختلاط کی ذرا سی پیش کش کو ثقافتی تخریب کاری کا نام دے کر فوراً شور مچانے لگتے ہیں حالاں کہ تشدد کے مضر اثرات تو تسلیم کیے جاچکے ہیں اور مغرب میں تو تشدد کو بھی 'ایک اور طرح کی عریانی' کے طور پر 'انڈیسینسی' (Indecency) یعنی 'ناشائستگی' کی تعریف میں شامل کرلیا گیا ہے۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو احتساب کے حق میں دی جانے والی دلیلیں ذہنی طور پر من پسند اور عملی طور پر غیر سود مند ہیں۔

پاکستان ایک ایسا احتساب زدہ معاشرہ ہے جس میں ٹی وی اور ریڈیو سے لے کر کتابوں

تک بھی کچھ کو، حکمران اشرافیہ کی اخلاقیات اور قومی تصورات پر پورا اُترنا ضروری سمجھا جاتا ہے اور اس نظام کا مقصد پاکستانی شہری کو محب وطن اور ایک اخلاقی انسان کے طور پر ڈھالتے ہوئے ملک کی سالمیت اور وحدت کو برقرار رکھنا سمجھا جاتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ فہم و فراست کے لمحوں میں ہمارے رہبران خود یہ محسوس کرتے ہوں گے کہ احتساب نے نہ صرف ہماری اختراعی صلاحیتوں اور پیش قدمیوں کو روکے رکھا ہے بلکہ اس کی وجہ سے ہماری اخلاقی، سماجی اور سیاسی ساخت میں بھی کسی اصلاح کے آثار دکھائی نہیں دیتے۔ ہمیں اپنے آپ سے یہ سوال کرنا ہوگا کہ آیا ہماری حکومتیں اسی طرح، مانگے تانگے کی رقوم اور اپنا وقت، ایس پی ٹی وی کے پروگراموں کو خلط ملط کرنے، اپنا ٹی وی چلانے اور اطلاعات کے آزادانہ بہاؤ پر پابندیاں لگانے میں صرف کرتی رہیں گی!

ہمارے سی ای (چیف ایگزیکٹو) نے اخباری کاغذ کا کوٹا ختم کر کے اپنے کسی بھی منتخب شدہ یا غاصب پیش روؤں۔ سے کہیں زیادہ عقل مندی کا ثبوت پیش کیا ہے۔ بہر حال اگر سی ای صاحب حقیقی جمہوریت قائم کرنے میں واقعی سنجیدہ ہیں تو ٹھوس اقدامات کے طور پر اُن کا پہلا کام یہ ہونا چاہیے کہ ان کی حکومت ابلاغی اداروں کی نگرانی چھوڑ دے اور نصف صدی سے زیادہ عرصے تک لگائی جانے والی احتسابی پابندیوں کو ختم کر دے۔

ماخذ (انگریزی-36)

عُریانی سے جنگ

ایس طلعت

بظاہر ایسا لگتا ہے کہ وزیراعظم نے مُصمّم ارادہ کر لیا ہے کہ وہ معاشرے سے عُریانی ختم کر کے دم لیں گے۔ کم از کم 'خبرنامے' اور نیوز بلیٹن تو چند دنوں سے یہی بتا رہے ہیں۔ مگر عُریانی ہے کیا، یہ ایک مشکل سوال ہے۔ اور پھر ہمارے وزیراعظم تو مشکل سوالات کے ضمن میں اتنی مہارت بھی نہیں رکھتے۔ اگر عُریانی کوئی ایسا بھیانک جرم ہوتا تو دہشت گردی کی طرح اس کے خلاف بھی ایک عدالت قائم کر دی جاتی۔ مگر عریانی کا کیا کیا جائے کہ اس کم بخت کی کوئی صحیح تعریف ہی نہیں کر پاتا۔ سوائے اس کے کہ چند سینما گھروں کے مالکان کے خلاف چالان پیش کر دیے جائیں جو بے چارے پہلے ہی سے اخلاقی احتساب اور ناکامیاب فلموں کے بوجھ تلے دبے ہوئے ہیں۔

فلسفیانہ قسم کے سوالات دماغ کی چولیں ڈھیلی کر دیتے ہیں اور عریانی بھی انھی میں سے ایک ہے۔ کیا منٹو فحش تھا! آیا صادقین کی بنائی برہنہ تصاویر فن کارانہ تخلیق کو جنم دیتی ہیں یا عُریانی کی ترغیب! یہ کچھ تو سیدھے سادے سے سوالات ہیں مگر زیادہ پیچیدہ صورتِ حال تو امریکا میں اس وقت پیش آئی جب قدامت پرست ری پبلکن پارٹی کے دور میں فحش نگاری اور انحرافی طرزِ عمل کے مابین کوئی رشتہ تلاش کرنے کی کوشش کی گئی۔ لامحالہ، جیسا کہ اس طرح کی اکثر تحقیقات میں ہوتا ہے، یہ کوشش بھی انتہائی الجھنوں کا شکار ہو گئی۔ بلاشبہ، زنا بالجبر کے کچھ مجرموں نے یہ ضرور اقرار کیا کہ وہ 'پلے بوائے' اور اس قسم کے دوسرے رسائل پڑھتے رہے ہیں مگر ان سے زیادہ تعداد 'پلے بوائے' دیکھنے اور اُن پڑھنے والوں کی تھی جو باقاعدہ گرجا گھروں میں جاتے تھے۔ اور مذہب سے ان کو خاص شغف تھا۔

اب عُریانی ایک ایسا جرم ہو کر رہ گیا جس کی غیر ضروری تشہیر کی جاتی ہے۔ سبھی کو معلوم ہے کہ بھارتی فلموں میں عُریاں ڈانس دکھائے جاتے ہیں اور یہ وڈیو فلمیں لاکھوں میں بکتی ہیں مگر تعزیرات پاکستان کی دفعات ۲۹۲، ۲۹۳ اور ۲۹۴ کے تحت صرف وہ پکڑا جاتا ہے جس کے پاس اپنا وی سی آر نہیں۔ ہمارے معاشرے میں یہ دفعات ایک بڑی عُریانی کی علامت ہیں یعنی اپنے شہریوں سے غیر مساوی برتاؤ۔ دفعہ ۲۹۲ عریاں مواد کی فروخت کے سلسلے میں بحث کرتی ہے اور اس کے تحت جو کوئی بھی (الف) فروخت کرتا ہے، کرائے پر اُٹھاتا ہے، تقسیم کرتا ہے، کھلے عام نمائش کرتا ہے یا کسی اور طرح سے تقسیم کرتا ہے یا پھر بیچنے، کرائے پر اُٹھانے، کھلے عام نمائش کرنے، تقسیم کرنے کے لیے بناتا ہے، یا اس کے اپنے

قبضے میں کوئی عریاں مواد برآمد ہوتا ہے۔ جیسا کہ آپ نے باری باری یہ شقیں دیکھیں، آپ نے محسوس کیا ہوگا کہ انتہائی پیچیدہ زبان میں 'عریاں' مواد کو ممنوع قرار دینے کے باوجود، ان میں کہیں بھی یہ نہیں بتایا گیا کہ کسی عریاں شے کی تعریف کیا ہوگی۔ اسی طرح دفعہ ۲۹۴ کا تعلق عریاں افعال سے ہے مگر یہ نہیں بتایا گیا کہ عریاں فعل کسے کہتے ہیں۔

تجربے اور اخبارات میں چھپنے والی خبریں ہمیں یہی بتاتی ہیں کہ ایک غریب آدمی جو ویڈیو پر بھارتی فلم دیکھ رہا ہے وہ عریانی کا مرتکب ہو رہا مگر 'اونچے لوگ' جو میڈونا کو دیکھ رہے ہیں اور میں بتا نہیں سکتا کتنی خطرناک قسم کی 'بلیو' فلمیں دیکھ رہے ہیں، وہ صرف 'فیشن' ہے۔ نہیں بالکل نہیں، جناب وزیراعظم' اس سے پہلے کہ عریانی کے خلاف آپ کی مہم کے دوران آپ کے لوگ ہم تک پہنچیں آپ کو سوچ سمجھ کر ہمیں یہ بتانا ہوگا کہ عریانی کیا ہے اور کیا نہیں۔ مجھے یقین ہے کہ آپ کے جواب سے نہ تو پاکیزہ لوگ مطمئن ہوں گے اور نہ عوام۔ بابرہ اور انجمن دونوں ہی کی فلمیں اکثر گھروں میں دیکھی جاتی ہیں۔ اور دونوں کو 'عریاں' نہیں سمجھا جاتا۔ پھر وزیراعظم کا فیصلہ آنے تک کہ کیا عریاں ہے اور کیا عریاں نہیں، کسی کو سزا کیوں سنائی جائے!

ماخذ (انگریزی-35)

فحش فحش، اڑا ئے دے ہوش……

جمیل اختر

’فحاشی کا سیلاب۔ حکومت کیا کر رہی ہے‘؛ ’فحش رسائل بند کرو‘؛ ’ٹی وی اور ریڈیو کے پروگرام فحش ہیں‘؛ ’فحاشی بند کرو یا حکومت چھوڑ دو‘۔ ان نعروں نے دیواروں کا حُسن نگل لیا ہے، اخبارات کے اوراق سیاہ کر ڈالے ہیں۔ یہ نعرے سن سن کر کان پک گئے ہیں۔ مگر فحاشی ہے کیا! کیا یہ واقعی یہودیوں اور ہندوؤں کی خطرناک سازش ہے جو وہ پاکستان کے خلاف کر رہے ہیں جیسا کہ ’حکایت‘ کے عنایت اللہ اور اس کے چند ساتھیوں کا خیال ہے! یہ کوئی سیاسی چکر ہے جو اپوزیشن چلا رہی ہے! جہاں چند افراد اکٹھے ہوتے ہیں یہ سوال سر اُٹھاتے ہیں، پھر بحث وتمحیص کا سلسلہ چل نکلتا ہے اور کسی نتیجے پر پہنچ نہیں پاتا۔

فحاشی کے معانی مختلف افراد کے نزدیک مختلف ہیں۔ بعض لوگ قدیم روایات سے انحراف کو فحاشی قرار دیتے ہیں۔ کچھ لوگ جھوٹ کو فحاشی سمجھتے ہیں جن دنوں یہاں سوشلزم پر باتیں ہونے لگی تھیں، سرمایہ دار طبقوں نے سوشلزم کو ننگِ انسانیت اور فحاشی کے ناموں سے نوازا تھا۔ اور جواباً جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کو فحاشی کی انتہا قرار دیا گیا۔ اکثریت اس بات پر متفق نظر آتی ہے کہ دائرہ تہذیب سے خارج حرکتیں فحاشی کے زمرے میں آتی ہیں۔ فحاشی ہے کیا! اس کا تعین کرنے کے لیے اصول وضع کیا جاسکتا ہے اور نہ ہی اسے ناپنے کے لیے کوئی پیمانہ بنایا جاسکتا ہے۔ آپ جو بھی طریقہ اپنائیں گے، ضروری نہیں کہ وہ دوسروں کی سوچ سے مطابقت رکھتا ہو۔ چلیے جھوٹ سچ کو چھوڑیئے۔ طبقاتی اختلاف کو بھی کسی اور وقت کے لیے اُٹھا رکھیے۔ آیئے تہذیب پر بحث کرتے ہیں کیوں کہ اکثریت فحاشی کے ڈانڈے اسی سے ملاتی ہے۔

یہ کہنا غلط ہے کہ ہر ملک کی تہذیب جدا ہے درست یہ ہے کہ ہر نسل کی تہذیب دوسرے سے مختلف ہے اور ہر ملک میں کئی نسلیں آباد ہیں۔ اور یوں بھی بھی ممالک کئی تہذیبوں کا گہوارہ ہیں۔ انسان میں خوبی یہ ہے کہ وہ بنے بنائے راستے پر چلنا سہل سمجھتا ہے۔ اور متبادل راستوں کو شک وشبے کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ اسے اپنی تہذیب اچھی لگتی ہے کیوں کہ وہ اس سانچے میں ڈھل چکا ہوتا ہے۔ اور دوسری تہذیبوں میں سو سو نقائص دکھائی دیتے ہیں۔ جس معاشرے میں میں اور آپ بستے ہیں اس میں بھاری

بھر کم لباس مروج ہیں۔ چناں چہ جب بھی لباس مختصر ہونے لگتا ہے۔ ناصحوں کی پیشانی پر بل آتا ہے۔ اور وہ فحاشی فحاشی چلانے لگتے ہیں۔ ان کے نزدیک نیم عریانی بھی فحاشی کے دائرے میں آتی ہے۔ ذرا اپنی سوچ معاشرتی خول سے باہر نکالیے اور حقیقت پسندانہ اندازِ فکر اپنایئے تو آپ محسوس کریں گے۔ فحاشی کا اطلاق مکمل عریانی پر بھی نہیں ہوتا جس طرح انسان ننگا پیدا ہوتا ہے۔ اسی طرح معاشرہ بھی ننگا پیدا ہوا تھا اور ارتقا کے لاکھوں برس برہنہ رہا تھا۔ قدیم معاشرے میں ستر پوشی کی روایت چند بوڑھوں نے ڈالی تھی۔ وجہ یہ نہیں تھی کہ انھیں عریانی میں فحاشی دکھائی دینے لگی تھی۔ سبب یہ تھا کہ ان کے بوڑھے اور ناتواں بدن موسم کے تغیر و تبدل اور سختیاں جھیلنے کے عادی نہیں رہے تھے۔ انھوں نے عافیت اسی میں جانی تھی کہ جسم کے نازک حصوں کو تند و تیز اور سرد گرم ہواؤں سے محفوظ رکھا جائے، پھر تن پوشی کا رواج ہوا اور معاشرتی ترقی کے ساتھ ان گنت لباس تراشے گئے، انھیں مختلف نسلوں نے اپنایا اور تراش خراش کا سلسلہ فیشن کے طور پر جاری رکھا۔ آج یورپ، امریکا اور دیگر ترقی یافتہ ممالک میں نیم عریاں لباس مروج ہے وہ اسے فحاشی نہیں کہتے اپنی تہذیب کا حصہ گردانتے ہیں۔ اسی طرح بنگلہ دیش کے چند قبیلے اور افریقہ کے تاریک جنگلوں میں بسنے والے حبشی برہنہ زندگی گزارتے ہیں۔ اس برہنگی میں وہ کوئی حجاب محسوس نہیں کرتے کیوں کہ یہ عریانی ان کی تہذیب کا جز ہے۔ آپ چاہے کچھ بھی کہتے پھریں وہ اسے فحاشی نہیں سمجھتے۔

آیئے اب اپنے معاشرے کی طرف لوٹ چلیں۔ بات بے لباسی کی تھی۔ اگر عریانی کو فحاشی کہا جاسکتا ہے تو ان لاکھوں بچوں کے بارے میں کیا خیال ہے جو ننگے ہو کر گلی کوچوں میں دندناتے پھرتے ہیں۔ ان لاکھوں بوڑھوں اور جواں مردوں کے متعلق کیا رائے ہے جو ایک آدھ لنگوٹ کے سوا ہر لباس سے بے نیاز رہتے ہیں۔ دل چسپ بات یہ ہے کہ مغرب میں عورت عریاں ہے اور مشرق میں مرد۔ اگر آپ مردوں کی عریانی کو فحاشی سے مستثنیٰ سمجھتے ہیں اور اس کا اطلاق خواتین پر کرتے ہیں تو مجھے کہہ لینے دیجیے کہ آپ جنس کے گورکھ دھندے میں اُلجھے ہوئے ہیں اور اسے فحاشی سمجھ بیٹھے ہیں۔ جنس کا مسئلہ جتنا اہم ہے اتنا نازک بھی ہے۔ مختلف ادوار میں، مختلف تہذیبوں میں اس کی حیثیت مختلف رہی ہے۔ امریکی معاشرہ جشن آزادی کا ہم نوا ہے۔ وہاں ہر جوان لڑکے اور لڑکی کو حق حاصل ہے کہ وہ گرل فرینڈ یا بوائے فرینڈ رکھیں۔ فرانسیسی تہذیب میں سرِعام بوس و کنار ایک عام سی بات ہے۔ وہاں اس پر کسی اخلاقی معاشرتی، یا قانونی پابندی کا اطلاق نہیں ہوتا۔ یورپ کے دیگر ممالک میں بھی صورتِ حال اس سے مختلف نہیں۔ آپ اسے گراوٹ اور جنسی بے راہ روی کا نام دے سکتے ہیں۔ مگر وہ حق بجانب ہونے میں منطقی دلائل رکھتے ہیں۔

اگر فحاشی کا تعلق جنس سے ہے تو یہ سراسر جوانوں کا مسئلہ ہے۔ کیوں کہ بچے اس حس سے نابلد

ہوتے ہیں اور بوڑھوں کے اعضا مضمحل ہو چکے ہوتے ہیں۔ ناتوانی کا احساس سب سے تلخ اور اذیت ناک ہے۔ یہ احساس انھیں نفسیاتی مریض بنا دیتا ہے اس کا اظہار وہ جوان نسل پر اعتراضات اور الزامات کی شکل میں کرتے ہیں کہ جوان نسل بے راہ رو ہے۔ اخلاقی گراوٹ کا شکار ہے، فحاشی کو اپنائے ہوئے ہے۔ کتنا شان دار زمانہ تھا وہ جو ہم نے گذارا۔ ہم یہ تھے ہم وہ تھے وغیرہ وغیرہ...... آیئے فرض کر لیتے ہیں۔ وہ دور بہت سُندر تھا۔ لیکن پرانی نسل سے یہ گزارش کرنے کی جسارت ضرور کریں گے۔ وہ ٹھنڈے دل اور غیر جانب دارانہ نظر سے اپنی جوانی کے بیتے لمحے ذہن میں لائیں، میں یقین سے کہہ سکتا ہوں، تب انھیں نئی نسل سے زیادہ شکایت نہیں رہے گی اور ان کے انداز فکر میں مثبت تبدیلی آئے گی۔

جنس گندگی یا غلاظت کا نام نہیں۔ یہ قابل نفرت شے بھی نہیں ہے۔ جنس تخلیق حیات کا نام ہے تخلیق کا فعل سب سے حسین اور سب سے معصوم ہے۔ اسی لیے فطرت نے اس میں کشش اور لذت رکھی ہے۔ یہ حیات کی ابتدا بھی ہے اور انتہا بھی۔ دنیا کی ساری ترقی، جدو جہد اور تگ و دو اس کے مرکز کے گرد گردش کرتی ہے۔ فرائیڈ کے مطابق ہر سوچ اور عمل کا تعلق غیر شعوری طور پر جنس سے ہوتا ہے۔ فطرت نے انسان کو دو احساس تفویض کیے ہیں، پہلا بھوک ہے اور دوسرا جنسی بھوک۔ پہلی کی تشنگی سے جسمانی موت واقع ہوتی ہے دوسرے کی تشنگی روحانی موت پر آ کر تمام ہوتی ہے۔ جنسی تشنگی کا شکار خواہ وہ روشنی کی چادر اوڑھے بیٹھا ہو، جنونی کیفیت میں مبتلا ہوتا ہے۔ وہ ہر عمل اور ہر پہلو کو شعوری یا غیر شعوری طور پر جنسی نقطۂ نگاہ سے تکتا ہے۔ اپنی نمایاں اور نا قابل احترام شخصیت کی بنا پر جب وہ اظہار کے رستے بند پاتا ہے تو چڑ چڑا اور بد دماغ ہو جاتا ہے۔ اس کی مثال وہ لوگ ہیں جو کسی وجہ سے تجرد کی زندگی بسر کرنے پر مجبور ہیں، ایسے لوگوں میں جذبۂ ترحم مفقود ہوتا ہے۔ ان میں مروت ہوتی ہے نہ سوچ کا مثبت انداز۔ وہ اخلاقی تقاضوں کو خاطر میں نہیں لاتے، ہر کسی سے الجھتے ہیں، ہر ایک سے جھگڑتے ہیں، حتیٰ کہ لوگ ان سے پناہ بھی مانگتے ہیں۔

اگر جنس کو ہی فحاشی کہتے ہیں تو آیئے اس بحث کو آگے بڑھائیں۔ جیسا کہ میں پہلے کہہ آیا ہوں۔ اس کا تعلق جوانوں سے ہے کیوں کہ انھی میں یہ حس تیز ہوتی ہے جس کو بہت سے عوامل تحریک دیتے ہیں۔ آپ انھیں نازیبا حرکات بھی کہہ سکتے ہیں اور فحاشی کے نام سے بھی پکار سکتے ہیں لیکن اصل مسئلہ یہ ہے کہ وہ کون سی اشیا ہیں جو اس اشتہا کو انتہا تک پہنچاتی ہیں۔ ان کا تعین دشوار ہی نہیں ناممکن بھی ہے۔ نفسیاتی طور پر ہر انسان دوسرے سے مختلف ہے۔ کچھ لوگوں کے جذبات میں کاجل بھری آنکھیں دیکھ کر ہیجان برپا ہو جاتا ہے۔ کیا آپ آنکھوں میں کاجل ڈالنے کو بھی فحاشی قرار دیں گے! کچھ افراد کو ہلکی سی مسکراہٹ لے ڈوبتی ہے کیا آپ مسکراہٹ پر بھی فحاشی کا لیبل چسپاں کریں گے! بعض لوگ ایسے بھی ہیں کہ پرندوں اور حیوانوں کو باہم شیر و شکر دیکھ کر ان کے جذبات میں طوفان اُٹھنے لگتا

ہے۔ کیا آپ پرندوں اور حیوانوں کو فحش قرار دے کر ملک بدر کر سکتے ہیں! ایسے افراد کی بھی کمی نہیں جو تنہائی میں آنکھیں موند کر تصور میں ڈوبتے ہیں تو بھٹکتے ہی چلے جاتے ہیں کیا آپ تصور کو فحاشی کہہ کر اس پر پابندی عائد کر سکتے ہیں! عریاں تحریروں اور تصویروں کا مسئلہ بھی متنازع ہے۔ ایسے لوگوں کی کمی نہیں جو بلیو تصویریں اور بلیو فلمیں دیکھ کر بھی نارمل رہتے ہیں۔ بتایئے آپ کی اخلاقی حدود کہاں ختم ہوتی ہیں اور فحاشی کی سرحدیں کہاں سے شروع ہوتی ہیں۔ بہت ممکن ہے جو باتیں آپ کے نزدیک مبنی بر اخلاق ہوں انھیں دوسرے بہت سے لوگ فحاشی سمجھیں۔

ادب میں جنس کی تاریخ اتنی ہی قدیم ہے جتنا کہ خود ادب ہے۔ وہ تہذیبیں جو مٹ چکی ہیں ان کے کھنڈرات کی صورت میں موجود ہیں۔ ان کھنڈروں سے نکلنے والے مجسمے اور تصویریں عریاں اور نیم عریاں ہیں۔ قدیم ادب جو ہم تک شعری اور نثری صورت میں پہنچا ہے جنس کے ذکر سے مبرا نہیں۔ فن کار کے پاس اپنا کچھ نہیں ہوتا اس کا ذہن حقیقت میں سلو سلائیڈ ہے جس پر اُس دور کے نقش ثبت ہو جاتے ہیں وہ جو کچھ دیکھتا ہے۔ اسے اپنے انداز میں پیش کر دیتا ہے۔ تصویر ہو یا مجسمہ، نظم ہو یا نثر اپنے دور کی تاریخ ہے۔ اُردو ادب کو ہی لیجیے۔ یہاں شاعری میں مرد کا محبوب مرد ہے، مرد کی جفاؤں کا ذکر ہے اس کی اداؤں کا تذکرہ ہے۔ طوالتِ شبِ ہجر کا رونا ہے۔ رقیبوں کے جور و ستم کا بیان ہے۔ مرد کا مرد سے عشق بظاہر غیر فطری ہے۔ لیکن یہ اس دور کی حقیقی تصویر ہے۔ جب فطری طریقے پابندیوں کی نظر ہو جائیں تو غیر فطری طریقے خود بخود مروج ہو جاتے ہیں۔ ہند میں لڑکیوں کا حصول ابتدا سے ہی مسئلہ رہا ہے۔ کہیں لڑکی حصولِ زر کا مظہر تھی۔ کہیں لین دین کا پیمانہ، کہیں خاندانی پیچیدگیاں تھیں کہیں منقولہ جائیداد کی تقسیم کے مسائل۔ بعض قبیلوں میں یہ مسئلہ اتنا نازک تھا کہ تین چار افراد مل کر ایک عورت سے شادی کیا کرتے تھے۔ تاریخ کے ورق الٹیے اور چند صدیاں پیچھے چلیے۔ ایک گاؤں کے مرد دوسرے گاؤں کے مردوں پر حملہ کر دیا کرتے تھے اور پھر لڑکیاں اُٹھا لے جا کر، مال اسباب لوٹ کر، ناچتے گاتے لوٹ آتے تھے۔ موجودہ دور کی بارات اسی قدیم طریقے کی ترقی یافتہ اور مہذب شکل ہے۔ ظاہر ہے جب لڑکیاں کم یاب ہوں تو خوب رو لڑکے کے بالوں کو للچائی ہوئی نگاہوں سے تکا جانے لگے گا۔ اور میر تقی میر جیسا خشک شاعر بھی یہ کہنے پر مجبور ہوگا۔

میر کتنے سادہ ہیں، بیمار ہوئے جس کے سبب
اُسی عطار کے لونڈے سے دوا لیتے ہیں

جب مردوں سے صنفِ نازک کا سا برتاؤ کیا جانے لگے تو نفسیاتی طور پر مردانہ اوصاف زائل ہونے لگتے ہیں اور نسوانیت کی چھاپ گہری ہونا شروع ہو جاتی ہے۔ یہ تہذیب آپ ریختی کے توسط سے قدیم لکھنؤ میں دیکھ سکتے ہیں جہاں خوب رو لڑکے بال بڑھانے لگے تھے۔ زنانہ لباس زیب بدن کرتے تھے، شرماتے تھے بل کھاتے تھے اور گفتگو میں خواتین کا محاورہ اپناتے تھے۔ ان کے خاکے

ہمیں ہند کے کلاسیکی ادب میں ملتے ہیں۔ آپ ان قلم کاروں کو فحش نگار نہیں کہہ سکتے۔ انھوں نے اپنی جانب سے کچھ نہیں لکھا۔ اپنی معاشرت کی عکاسی کی ہے۔

جہاں محلاتی معاشرت ہو، ایک جانب حکمران ہوں، امرا اور جاگیردار ہوں، دوسری طرف ناتواں اور فاقہ مست غریب۔ وہاں انسانیت کے اصول بری طرح پامال ہوتے ہیں۔ حسین چہرے نذرانے کی شکل میں درباروں میں پیش کر دیے جاتے ہیں یا زبردستی اٹھا لیے جاتے ہیں وہ کنیزیں بنتی ہیں، باندیاں بنتی ہیں، تحفے میں دی جاتی ہیں، ان کے تبادلے ہوتے ہیں۔ ان کا کوئی گھر نہیں، در نہیں، وہ کسی کے دل کی ملکہ نہیں، کوئی ان کے لیے نہیں جیتا، وہ تو بس کھلونے ہیں، انھیں بنایا سنوارا جاتا ہے، آدابِ محفل سکھائے جاتے ہیں، رقص و موسیقی کی تربیت دی جاتی ہے، پھر ان کے ہاتھ میں جام و سبو تھما دیئے جاتے ہیں، تب عیش و طرب کی محفلیں جمتی ہیں، یہ شاہانہ ٹھاٹھ باٹھ کے اظہار کا طریقہ تھا۔ یہ باندیاں جب حرموں سے نکلیں تو بازاروں میں جا بیٹھیں اور طوائفیں کہلائیں۔ محلاتی معاشرت کے زیرِ اثر، متوسط طبقے کے شرفا اپنے بچوں کو تربیت کے لیے ان کے کوٹھوں پر بھیجتے تھے۔ یہ مغلیہ دور کی معاشرت ہے۔ حتیٰ کہ رنگیلا شاہ کے عہد میں مذہبی تقریبات میں بعض مردوں کو شراب سے غسل دیا جاتا تھا اور مرد و زن کھلے بندوں رنگ رلیاں مناتے تھے۔ اس زمانے میں مصوروں نے ان مناظر کو رنگ اور برش کی مدد سے کینوس پر محفوظ کیا۔ ان تصاویر کو دیکھ کر عہدِ رفتہ نگاہوں کے سامنے لہرانے لگتا ہے۔ آپ مصور پر فحاشی کا الزام نہیں لگا سکتے۔ فحش تو وہ معاشرت ہے۔ جس کی اُس نے تصویر کشی کی۔

زمانہ آگے بڑھ آیا ہے۔ ترقی کے ان گنت باب وا ہوئے ہیں۔ مگر اس خطے کی حالت میں مجموعی طور پر کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ پابندیاں رواجوں کی شکل میں موجود ہیں۔ جاگیردار چلے گئے ہیں۔ ان کی جگہ زمین داروں نے لے لی ہے۔ امرا کی نشست، صنعت کار اور تجار سنبھال بیٹھے ہیں۔ معاشی تفاوت قائم ہیں۔ کہیں شادی تک دشوار ہے کہیں اندر سبھائیں بنی ہیں۔ کل کی طرح آج کا فن کار بھی حساس ہے۔ اگر عصمت افسانہ لکھتی ہے تو اس پر اعتراض کیسا! اگر صادقین مصوری کرتا ہے تو اس پر احتجاج کیوں! آپ حقیقت کا سامنا کرنے کی جرأت نہیں رکھتے تو ہر فن کار کی آنکھوں پر پٹی باندھ دیجیے کہ وہ روشنی اندھیرے کے امتزاج میں تھرکتے سائے نہ دیکھ پائیں۔ ان کے کانوں میں روئی ٹھونس دیجیے تاکہ ان کے احساس کو سرگوشیوں میں ڈوبی سسکیاں نہ جھنجھوڑیں۔

موجودہ دور میں پیچیدگیاں بڑھی ہیں، تعلیم عام ہوئی ہے، اچھائی برائی کا شعور جاگا ہے۔ نئی نسل آزاد فضا میں سانس لینا چاہتی ہے مگر معاشرے کی باگ ڈور پرانی نسل کے ہاتھ میں ہے۔ وہ رسم و رواج کو ہر صورت قائم رکھنا چاہتے ہیں۔ کش مکش کی کیفیت طاری ہے، نفسیاتی دباؤ اور تناؤ بڑھ رہا ہے جس کے اعصاب شل ہونے لگتے ہیں وہ راہ فرار اختیار کرتا ہے، منشیات سے یارانہ گانٹھتا ہے یا اعلانیہ

باغی حرکات کرنے لگتا ہے۔ دیہاتوں میں نسبتاً سکون ہے، وہاں آزادانہ میل ملاپ کے مواقع زیادہ ہیں۔ وہاں کی فضا معصوم ہے۔ آڑی ترچھی پگڈنڈیاں اور اونچے اونچے پودے بہکی ہوئی سرگوشیوں کو اپنے اندر جذب کر لیتے ہیں۔ کوئی دیکھ نہیں پاتا کوئی سن نہیں پاتا۔

بحث مصوری اور ادب سے چلی تھی۔ میں بتانا یہ چاہتا تھا۔ فن اُس معاشرے کی تصویر ہوتا ہے جس میں فن کار آنکھ کھولتا ہے، دیکھتا اور محسوس کرتا ہے اور پھر اسے کاغذ پر محفوظ کر لیتا ہے۔ امریکی ادب کو ہی لے لیجیے وہاں ادب پاروں میں جنس کے ساتھ لوٹ مار ڈاکہ زنی اور قتل و غارت گری کے نقوش بھی ملیں گے کیوں کہ اس معاشرے میں یہ باتیں عام ہیں۔ اس ماحول میں جہاں میں اور آپ بستے ہیں گھٹن زیادہ ہے۔ یہاں ادب اور فن کار کا مطالعہ تاریخ سے آگاہی کے لیے نہیں کیا جاتا جنسی چٹخارے کے لیے کیا جاتا ہے۔ اس معاملے میں کچھ لوگ اتنے حساس ہیں کہ مذہبی کتابوں میں بھی جنسی لذت کا پہلو ڈھونڈ نکالتے ہیں۔ بہر حال ہر شخص گھٹن سے نجات چاہتا ہے، اپنے جذبات کی تسکین چاہتا ہے مگر بات پھر وسائل کی ہے۔ جن کے پاس وسائل زیادہ ہیں وہ کلب ہو آتے ہیں یا بالا خانے کی محفلیں سجاتے ہیں۔ کچھ لوگ تیز فلمیں دیکھتے ہیں اور واپس آکر سکون کی نیند سوتے ہیں۔ کچھ رسائل پڑھ کر اپنے جذبات کو ٹھنڈا کرتے ہیں جو یہ نہیں کر سکتے انھیں جنسی بھوک گھر سے باہر لا کھڑا کرتی ہے۔ وہ ہر چہرے کو بھوکی نگاہ سے تکتے ہیں، آوارہ گردی کرتے ہیں، آوازے کستے ہیں اور بہت سی دوسری خرابیوں کا سبب بنتے ہیں۔ انسانی ذہن حقیقت میں ایک بائلر کی طرح ہے، بائلر میں گیس مخصوص دباؤ کی حد تک ہی سما سکتی ہے، دباؤ بڑھتا رہے اور نکاس کے راستے بند ہوں تو بائلر پھٹ کر قیامت برپا کر دیتا ہے۔ اسی طرح انسان بھی جب تسکین کی راہیں مسدود پاتا ہے تو ایک نہ ایک روز اخلاقی حصار کو توڑ کر پھٹ پڑتا ہے اور معاشرے کے لیے مشکلات کا موجب ہوتا ہے۔ یہ ادب، فلمیں اور مصوری جنھیں آپ فحش قرار دیتے ہیں، حقیقت میں اس طبقاتی معاشرے کو سنبھالے ہوئے ہیں۔

ادب اور فن پر احتجاج کیسا! آپ فحاشی کو ختم کرنا چاہتے ہیں تو اس نظام کو بدلیے جہاں بچے تیرہ برس کی عمر میں بالغ ہو جاتے ہیں مگر تیس کا ہندسہ چھونے پر بھی ان کی شادی نہیں ہو پاتی جہاں شادی کاروبار ہے، طبقاتی اور خاندانی وقار کا اظہار ہے۔ جہاں لڑکیاں جہیز کی خاطر بوڑھی ہو جاتی ہیں، جہاں معاشی بندھن لڑکوں کو گھر بسانے نہیں دیتے۔ وہاں عریاں فلمیں بھی چلیں گی۔ بلیو تصویریں بھی چھپیں گی۔ جنسی ادب بھی تخلیق ہوگا۔ آپ پابندی عائد کر دیجیے۔ یہ خفیہ ٹھکانوں میں چلی جائیں گی۔ سلگتے ہوئے جذبات کو تسکین کی ٹھنڈک درکار ہے۔ ایک راہ بند ہو تو سو صورتیں خود بخود نکل آتی ہیں۔

ماخذ (اُردو۔۱۰۴)

فحاشی کا ایک اور دورہ

خالد احمد

پاکستان ایک بار پھر اسی بحث میں خطرناک حد تک اُلجھا ہوا نظر آ رہا ہے کہ فحاشی ہے کیا! مگر اس سے کچھ مفید نتیجہ نہیں نکلے گا اس لیے کہ اس بحث کے لیے جس ذہنی عطیے کی ضرورت ہوتی ہے وہ ہمیں حاصل نہیں۔ اور پھر یہ کہ دلیل اگر ذرا سی بھی پیچیدہ لگی تو رد کر دی جائے گی یا پھر لوگوں کے سر سے گذر جائے گی اس لیے کہ ہم ایک ایسے معاشرے کے فرد ہیں جسے اپنی نظریاتی بے مغزی پر فخر ہے۔ ایک بے چاری جسے 'پیمرا' کے نام سے پکارا جاتا ہے اُس نے کیبل ٹی وی پر تمام بھارتی تفریحات کو تو ممنوع قرار دے دیا ہے جب کہ دوسری طرف مغربی چینلز پر دکھائی جانے والی اس قسم کی تفریحات پر اُسے کوئی اعتراض نہیں۔ اگر یہ سلسلہ جاری رہا تو عریانی کی منطق جس کی تہ تک کوئی نہیں پہنچ سکتا' رینگتے رینگتے کارٹونوں تک جا پہنچے گی، جیسا کہ پہلے بھی ہو چکا ہے۔ کوئی بھی شخص نہ عریانی کی تعریف بیان کر سکتا ہے اور نہ اس کی حدود کا تعین کر سکتا ہے۔

روزنامہ پاکستان کے ایک سروے (۲۶ رستمبر ۲۰۰۳ء) کے دوران علامہ جاوید احمد غامدی نے بھارتی تفریحات پر پابندی کی مخالفت کرتے ہوئے فرمایا کہ پابندی عائد کرنے سے سرکشی اور بے زاری پیدا ہوتی ہے جیسا کہ سعودی عرب، افغانستان اور ایران میں ہوا۔ پاکستان میں بھی اسی قسم کی مثالیں ملتی ہیں مگر اِکا دُکا۔ ذرا ۱۰ رستمبر ۲۰۰۳ء کو 'جنگ' میں شائع ہونے والی اس خبر کو ملاحظہ کیجیے جس میں کہا گیا کہ ڈسٹرکٹ جج کی طرف سے ملی ہوئی ضمانت کے ختم ہونے پر' فلمی اداکاراؤں مدیحہ شاہ اور شہزادی کو پولیس نے گرفتار کر لیا۔ ان دونوں پر مقامی تھیئٹر میں ناچنے کے دوران، فحاشی کے ارتکاب کا الزام تھا۔ اُن دونوں نے روتے ہوئے عائد شدہ الزام سے انکار کیا اور عدالت کو بتایا کہ بات صرف اتنی ہے کہ کچھ افراد انھیں پریشان کرنا چاہتے ہیں۔ اسی دن ایک اور جج نے ان کی ضمانت دوبارہ منظور کر لی۔

کالم نگار ارشاد حقانی نے روزنامہ پاکستان کو (۲۴ رستمبر ۲۰۰۳ء) بتایا کہ اسلام آباد نے بھارتی خبروں اور تفریحات کے دونوں چینلز پر پابندی لگا دی تھی مگر پاکستانی آپریٹرز کے مطابق، عوام کا مطالبہ صرف تفریحی چینلز کھولنے کا تھا۔ انھوں نے فرمایا کہ پاکستان کی ثقافت بھارت کی ثقافت سے

مختلف ہے مگر یہ بات ذہن میں رہنی چاہیے کہ بنگلہ دیش کے مسلمان بھارتی ثقافت کے مخالف نہیں، جیسا کہ ٹی وی چینلز سے پتا چلتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ بھارتی خبروں کے چینلز دوبارہ کھول دینا چاہئیں۔ انہوں نے فرمایا کہ پاکستان کے خواص اور مقتدرین ایک اور ہی ثقافت سے لطف اندوز ہوتے ہیں مگر عوام سے چھپ کر۔ کالم نگار نے بنگلہ دیش کے بارے میں جو پہلے تو پاکستان ہی کا ایک حصہ تھا مگر جس نے پھر یکا یک ایک اور ثقافت اپنالی تھی، کے بارے میں ایک اور باریک نکتہ بھی اٹھایا۔ وہ یہ کہ اس ثقافتی اختلاف کے باوجود، پاکستانی عوام بنگالنوں کے رقص بڑے شوق سے دیکھتے ہیں۔

آخر ثقافت ہے کیا! اگر آپ کسی تفریح کے بارے میں یہ پیمانہ اپنائیں کہ ایسی تفریح جس سے خاندان کے سبھی افراد ایک ساتھ بیٹھ کر لطف اندوز ہو سکیں، تو اس بارے میں دو افراد بھی متفق نہیں ہوں گے۔ بھارتی فلمی چینلز کی آمد کے ساتھ ہی لوگوں نے ڈش انٹینا خریدنا شروع کر دیے تھے۔ سچ تو یہ ہے کہ صرف حکومت اور چند حضرات ہی ثقافتی پابندیوں کے حق میں ہیں۔ ان پابندیوں کی منطق اُس وقت دم توڑتی ہوئی نظر آتی ہے جب اس قسم کی بھارتی چینلز پر تو پابندی لگائی جاتی ہے مگر مغربی چینلز پر اس طرح کی کوئی پابندی نہیں لگائی جاتی حالاں کہ اُن میں فحاشی زیادہ ہوتی ہے۔

رقص ہمارے ہاں پہلے بھی ہوا کرتے تھے۔ مگر یکا یک ہماری ثقافت بدل گئی ہے۔ ذرا اسے بھی پڑھیے۔ روزنامہ جنگ کے مطابق، گجراں والا میں قانون کی سختیوں میں اور بھی شدت آگئی جب مقامی ڈسٹرکٹ جج نے ان چار تھیئٹروں کو بند کر دیا جنھوں نے پہلے سے پاس شدہ اسکرپٹس سے ہٹ کر پروگرام پیش کیے۔ ان پر فحاشی پھیلانے کے الزام میں کارروائی کی گئی۔ ۲ر اکتوبر کو گجراں والا کے ایک سیشن جج کے حکم پر، جب تین تھانوں کی پولیس ایک تھیئٹر کو سیل کرنے اور دو اداکاراؤں یعنی حنا شاہین اور سلوی کو جو فحاشی کے الزام میں عدالت کو مطلوب تھیں، گرفتار کرنے پہنچی تو ایک بھگدڑ مچ گئی۔ اگر آپ یہ معلوم کرنا چاہیں کہ پشاور میں کیا ہو رہا ہے تو اسے پڑھیے: نوائے وقت کے مطابق، ۳۰ ڈنڈا بردار غنڈوں نے قصہ خوانی بازار کی چار ہوٹلوں پر اس لیے حملہ کر دیا تھا کہ وہاں کیبل ٹی وی کے فحش پروگرام دیکھے جا رہے تھے۔ دوسری طرف لاہور میں بھی لوگ اشتہارات کو سیاہ کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔

اس قسم کے وحشیانہ پن کے سامنے ہر کوئی بے بس نظر آتا ہے۔ نچلی عدالتیں اپنے باقی بچے ہوئے کاموں کو نمٹانے کے ساتھ ہی ساتھ فحاشی کے ان مقدمات کی سماعت کے دوران، اپنا خاصا وقت اس شخص کے ذہن کو سمجھنے میں صرف کرتی ہیں جس کے جذبات، مبینہ عریانی سے مجروح ہوئے تھے۔ روزنامہ پاکستان (۱۸ر ستمبر ۲۰۰۳ء) کے مطابق، لاہور ہائی کورٹ کے چیف جسٹس نے فلمی اداکاراؤں شہزادی اور مدیحہ کی فحاشی کے الزام میں اپیل کے دوران فرمایا کہ پاکستان میں عوامی تفریح کے ذرائع یوں بھی کم ہیں، اور انھیں اور بھی کم کرنا ممکن نہیں۔ مگر اسی دوران، لاہور ہی کے ایک سیشن جج نے

صائمہ، نرگس، ریما اور نصیبو کے خلاف وارنٹس جاری کیے۔ ان فلمی اداکاراؤں پر الزام یہ تھا کہ انھوں نے بارش میں بھیگتے ہوئے رقص کیا اور ایک گانا بھی ریکارڈ کرایا۔ عدالت نے سنسر بورڈ کے اُن اراکین کو بھی طلب کیا جنھوں نے رقص کا یہ منظر پاس کیا تھا۔

یہ مزاحیہ قسم کی غنائیہ تمثیل کچھ یوں چلتی ہے کہ ایک خبطی قسم کا آدمی عدالت میں پہنچ جاتا ہے اور وہاں کچھ کہنے لگتا ہے، مثلاً یہی کہ ہماری خواتین کی ہاکی ٹیم عُریانی پھیلا رہی ہے۔ ۲۳ستمبر ۲۰۰۱ء کو 'خبریں' میں چھپنے والی ایک رپورٹ کے مطابق، سابق وفاقی وزیر اور پاکستان ویمن ہاکی ٹیم کی صدر محترمہ شاہدہ جمیل نے کہا ہے کہ اسلامی نظریاتی کونسل کا یہ کہنا غلط ہے کہ خواتین کی ہاکی ٹیم سے ملک میں فحاشی پھیلتی ہے۔ انھوں نے مزید فرمایا کہ اس کونسل کو چاہیے کہ اس طرح کے مسئلے اُٹھانے کے بجائے وہ پاکستان میں منشیات کے پھیلاؤ کے روک تھام کے سلسلے میں کچھ کام کرے۔ اس کونسل اور اس کے لفظ پرست چیئرمین کو یہ نہیں معلوم کہ کونسل کی اس طرح کی رائے زنی کی بنیاد پر کوئی بھی شخص خواتین کی ہاکی ٹیم کے خلاف عدالت میں پہنچ سکتا ہے۔ یا پھر وہ عورتوں کی ہاکی ٹیم پر حملہ آور بھی ہوسکتا ہے۔ اگر ظاہر پرستی کا یہ کھیل شروع ہوجائے تو کچھ یوں ہوگا کہ ہاکی ٹیم کی لڑکیاں نچلی عدالتوں کے سامنے پیش نہیں ہوں گی اور عدالت اپنا یک طرفہ فیصلہ سناتے ہوئے ان سب کے خلاف گرفتاری کے وارنٹس جاری کردے گی۔ اور جب یہ سارا مسئلہ ہائی کورٹ تک پہنچے گا تو عدالت اپنے کچھ مشفقانہ ریمارکس کے ساتھ ان سب کو رہا کردے گی۔ فحاشی کے بارے میں اسی قسم کے ناقص نقطۂ نظر کی وجہ سے فن کار عوام کو تفریح مہیا کرنے والے، پاکستان میں ہر وقت خطرے میں گھرے رہتے ہیں۔

فحاشی سے ہر وقت ناراض رہنے والے ہم میں سے اکثر حضرات یہ بھول جاتے ہیں کہ ہم اس بارے میں پہلے بھی بہت کچھ کرچکے ہیں۔ ایک بار ڈاکٹر اسرار احمد نے عمران خان کو صرف اس لیے مجرم قرار دے دیا کہ عمران اپنی گیند کو، اپنی ران پر نہایت ہی اشتعال انگیز طور پر رگڑتے رہتے ہیں۔ اور بہت سارے علما نے تو تمام قسم کے کھیلوں ہی کو 'لہو' اور 'لعب' قرار دیا ہے۔ ہمارے سرکاری ٹی وی چینلز، کارٹونوں تک کی سنسر شپ کرتے ہوئے پاگل پن کی حد تک پہنچ گئے ہیں۔ اور اُن فن کاروں کی طلاق کا اعلان کروادیا گیا جنھوں نے کسی ٹی وی کے ڈرامے میں کسی غیر مرد یا غیر عورت کے ساتھ میاں بیوی کا کردار ادا کیا ہو۔ ہماری پی ٹی وی انگریزی فلموں کو سنسر کرنے کے لیے بھی خاصی مشہور ہے کیوں کہ ان کی اس سنسر شپ کے بعد ان میں کہانی نام کی کوئی چیز باقی نہیں بچتی۔ اس لیے کہ ایسے تمام منظر جن میں بدن کا کوئی بھی حصہ نظر آرہا ہو، بالغوں یا کسی بڑی لڑکی کو بوسہ لیتے ہوئے دکھایا گیا ہو بلکہ کسی کو کسی کا گال چومتے ہوئے بھی نہیں دکھایا جاتا کیوں کہ اس سے دیکھنے والے مسلم عوام کے جذبات بھڑکتے ہیں، خواہ گال چومنے والا اپنی بہن یا بیٹی ہی کے گال شفقت کے ساتھ ہی کیوں نہ چوم رہا ہو۔ اس سوچ

کے پیچھے جو سوچ ہے وہ یہ ہے کہ باپوں، بھائیوں کو کوئی ایسی حرکت نہیں کرنا چاہیے جس سے معاشرے میں ترویجِ محرمات کے جراثیم پھیلیں۔

حیوانات کی زندگی کے بارے میں بننے والی فلموں میں بھی کانٹ چھانٹ ہوتی رہتی ہے اور ان کی زندگی کو عوام کی آنکھوں سے اوجھل رکھنے کے پیچھے بھی یہی سوچ کارفرما ہوتی ہے کہ کہیں ایسے مناظر سے عوام کے جذبات بھڑک نہ اُٹھیں کیوں کہ ایسے مناظر سے جذبات کی برانگیختگی، ترغیب کے ذریعے ہوتی ہے۔ اگر ایک چیونٹی کسی دوسری چیونٹی پر سوار ہوتی ہوئی نظر آئے تو ہمارے دیکھنے والے، تصور ہی تصور میں ان دو چیونٹیوں کے بجائے دو افراد کو یہی کچھ کرتے دیکھنے لگتے ہیں۔ بندر چوں کہ اپنی نامختون عریانی کو چھپاتے نہیں، اس لیے ان کے بارے میں فلموں کی سنسر میں بڑی احتیاط سے کام لیا جاتا ہے۔ ایک ایسے ہی پروگرام کے ایک منظر میں، دو گورخر' کھیل ہی کھیل میں ایک دوسرے پر سوار ہونے کی کوشش کر رہے تھے، اس منظر کو پیش نہیں کرنے دیا گیا حالاں کہ ان دونوں کے بیچ کوئی جنسی حرکت نہیں ہو رہی تھی۔ مگر شاید سنسر کرنے والوں کی یہ سوچ صحیح تھی کہ اس منظر کو دیکھنے والا' ان دو گورخروں کی بجائے دو ہم جنس پرست افراد کو یہی سب کچھ کرتے دیکھنے لگے گا۔ ان حالات میں ٹی وی نے یہ بڑا دانش مندانہ فیصلہ کیا کہ ایسے پروگرام سرے سے دکھائے ہی نہ جائیں۔

ماخذ (انگریزی-16)

تھوڑی سی سیکس اور، پلیز

سعدیہ دہلوی

سیکس، سیکس اور سیکس۔ وہ ہر جگہ سے پھوٹ نکلی ہے۔ بڑے بڑے اشتہارات میں، کلبوں میں، فلموں میں، رسائل میں، فیشن میں، غرض ہر جگہ۔ آزاد ہندوستان نے پہلے سبز انقلاب دیکھا، پھر سفید انقلاب اور اب وہ 'بلیو' انقلاب سے دوچار ہے۔ اس بات کو جانے دیں کہ بلیو انقلاب یہاں اس وقت آیا ہے جب مغرب میں سیکس فرسودہ ہو کر رہ گئی ہے۔ اب جب کہ مغرب میں صحت، تجرد اور رومان کی اہمیت کا ایک نیا احساس اجاگر ہو رہا ہے، ہم اُن لذتوں کے بارے میں جاننے لگے ہیں جن کے بارے میں ہمارا خیال تھا کہ وہ صرف تولید تک محدود ہیں۔

ہم برصغیر کے باسی گھٹیا قسم کی خود توقیری سے متاثر ہیں اور چوں کہ اذیت ہمارے مزاج میں شامل ہے، ہم اکثر اداس رہنے کی راہیں تلاش کر لیتے ہیں...... عذاب میں مبتلا بیوی، بھینٹ چڑھنے والی ماں اور بوجھوں تلے دبا ہوا شوہر۔ دیگر کرداری نمونوں کی طرح، مصائب کے اپنے فوائد ہیں۔ بالآخر یہ جانتے ہوئے کہ غم سے کیوں کر نمٹا جائے، ہم غم کے ساتھ اپنے آپ کو محفوظ سمجھتے ہیں اور کسی بھی قسم کی تبدیلی سے ہمیں خوف آنے لگتا ہے۔ یہ بلیو انقلاب انھی تمام باتوں سے متعلق ہے۔

'سیکس' کے بارے میں میڈیا پر چلنے والی موجودہ بحث اس وقت شروع ہوئی جب ایک اشتہار میں پوجا بیدی نے 'کام شاسترز' کنڈوم دکھاتے ہوئے کہا کہ وہ محفوظ سیکس کی حامی ہے۔ اس واقعے کو بالکل الگ تھلگ کر کے نہیں دیکھا جا سکتا اس لیے کہ اسی سے ہمیں پتا چلتا ہے کہ ہمارے سماجی رویّوں میں کتنی زبردست تبدیلیاں آ چکی ہیں اور آج کی سب سے زیادہ بکنے والی کتابوں میں یہ جدید ہندوستانی قدریں صاف جھلکتی نظر آتی ہیں۔ وکرم سیٹھ کے ادبی کلاسک 'دی گولڈن گیٹ' اور شوبھا ڈی کی ادبی لغویت بعنوان 'اسٹیرے نائٹس' کے بیچ، جنسی تجربے کا ایک مکمل نیا اِسترہ ہے جسے مختلف رسائل پیش کر رہے ہیں۔

فلموں میں، عورت کو زیادہ تر قربانی کی ایسی بھیڑ کے طور پر پیش کیا جاتا ہے جسے اس کے دو چاہنے والے ایک شٹل کاک کی طرح اِدھر سے اُدھر اُچھالتے رہتے ہیں۔ پرانی کلاسک فلموں مثلاً 'انداز' 'سنگم' اور 'چودھویں کا چاند' سے لے کر امیتابھ کی 'دوستانہ' تک ساری کامیاب فلموں کا موضوع ایک

مثلث ہی رہا ہے۔ اب فرق صرف اتنا ہوا ہے کہ ایک مرد سے ایک عورت کی بجائے دو عورتیں بیک وقت اظہار محبت کرتی ہیں اور پھر وہی دو اس کی قسمت کا فیصلہ کرتی ہیں جیسا کہ 'حنا' اور 'لمحے' میں دکھایا گیا ہے۔

اب نئی کامیاب فلموں میں یہ ہو رہا ہے کہ ہیرو کی بجائے ہیروئن اس کا پیچھا کرتی ہے اور ہیرو کے گال پر اس کا بوسہ لینے میں بھی ہیروئن ہی پہل کرتی ہے۔ نئی اداکاراؤں نے بڑی کامیابی کے ساتھ ماضی کی ہیلن، بندشی کلا اور ارونا ایرانی جیسی فلمی عیاراؤں کو چلتا کر دیا ہے۔ اس لیے کہ آج کی ان اداکاراؤں کو ننگا ہوتے ہوئے، سگریٹ نوشی کرتے ہوئے، بوسہ لیتے ہوئے، ڈسکو کرنے میں یا کیبرے ڈانس کرنے میں کوئی عار نہیں۔ ان غصیلی نوجوان اداکاراؤں نے پرانی طرز کی عیاراؤں کو اس طرح باہر نکال پھینکا جس طرح امیتابھ بچن نے ویلن کا رول بھی ہڑپ کر لیا۔

آج کے فلمی رسالے ان نئی اداکاراؤں کی جنسی من موجیوں کا برملا اظہار کرتے ہیں۔ امریتا سنگھ کا کہنا ہے کہ: 'کنواریاں اب تقریباً ناپید ہو چکی ہیں'۔ کپور خاندان کے چشم و چراغ کریزما اعلان کرتے ہیں کہ: 'کچھ عرصہ بعد، سیکس سے بوریت ہونے لگتی ہے'۔ ایک رسالے کو انٹرویو دیتے ہوئے مہیش بھٹ اپنی بیٹی' پوجا بھٹ سے فرماتے ہیں: 'جو چاہو سو کرو......بس پیٹ سے مت ہونا'۔ ان رسائل کے بیچوں بیچ چھپنے والی تصاویر کچھ سے کچھ ہو گئی ہیں۔ جیکی شروف' عامر خاں' سلمان خاں' راہول رونے اور اس قبیل کے دوسرے پن اپ اداکار صرف ایک تولیہ باندھے آرام کے مزے لیتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

اب ہندوستانی مرد جنسی علامت کے طور پر سامنے آ گیا ہے اور آج کل کئی اشتہارات میں کسی نہ کسی طور مردانہ بدن کی نمائش ہو رہی ہے۔ حتیٰ کہ سنجیدہ رسالے بھی فیشن کے نام پر اس طرح کی تصاویر چھاپ کر اپنی اشاعت بڑھانے کے چکر میں ہیں۔ مردانہ ڈیزائنوں کی بڑھتی ہوئی مانگ دیکھ کر ایسا لگتا ہے کہ مرد حضرات بھی ایک ہی قسم کے کردار ادا کرتے کرتے تنگ آ گئے ہیں۔ ایک سروے کا مطالعہ کرنے کے بعد جس میں کہا گیا تھا کہ اب شبینہ گھروں میں تیس سال سے زیادہ کے مرد زیادہ تعداد میں آنے لگے ہیں، میں کئی سال بعد شیراٹن کے ڈسکو، 'گھنگھرو' پہنچ گئی۔ میری تو یہ دیکھ کر آنکھیں نکل پڑیں کہ سارا کا سارا ہال ایسے ذوجنسی مردوں سے بھرا ہوا ہے جن میں کوئی تو زنانہ کپڑے پہنے ہوئے ہے کوئی اپنے جالی دار موزے دکھا رہا ہے، کسی نے کھلکھلاتی آئی شیڈو کا استعمال کیا ہوا ہے اور کوئی اپنے ہاتھ میں چمکیلی ہینڈ بیگ تھامے ہوئے ہے۔

گزشتہ کئی سالوں میں ہمارے ہاں سماجی سمجھوتے کی سطح خاصی اونچی ہو گئی ہے۔ اب 'گے ز' یعنی ہم جنس پرستوں کو نہ صرف قبول کر لیا گیا ہے بلکہ اب وہ ایک اختراع کے ہم معنی سمجھے جانے لگے

ہیں۔ ’بومبے دوست‘ نامی رسالہ انھی ہم جنس پرستوں کی ترجیحات سے بھرا ہوا ہوتا ہے۔

دہلی میں ’سلوی‘ نامی ایک شخص کے ہیراسٹائل پارلر میں اس قسم کے سارے مرد جمع ہیں۔ کوئی اپنے بالوں کی چٹیا بنواتا ہے، کوئی اپنے چہرے کو جڑی بوٹیوں کے ماسک سے سجاتا ہے۔ ان حالات میں مجھے بی بی سی کے ڈیوڈ فروسٹ کے الفاظ یاد آنے لگتے ہیں۔ وہ کہتا ہے: ’ایک زمانہ تھا کہ ہم جنسیت کو قانون کے تحت ایک جرم سمجھا جاتا تھا۔ اب اُسے قانونی بنا کر رکھ دیا گیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ مجھے واپس انگلستان پہنچ جانا چاہئے اس سے پہلے کہ ہم جنسیت لازمی قرار دیدی جائے‘۔

ماخذ (انگریزی۔26)

اخلاقی احتساب

برٹرینڈ رسل

ٹائن بی/ ڈیسا کو اکیدا

ایئن رین

☆☆☆☆☆

عطاؤ اللہ پالوی

سید سجاد ظہیر

کرشن چندر

محمد حسن عسکری

ن م راشد

rekhta

قوانینِ اشاعت

برٹرینڈ رسل

یاٹ: آپ کے خیال میں اشاعت کے سلسلے میں کچھ قوانین ہونے چاہئیں کہ کیا چھاپا جائے اور کیا نہیں!

رسل: خیر، یہ تو ایک ایسا مسئلہ ہے جس کے بارے میں میرا رویہ انتہا پسندانہ ہے اور مجھے اندیشہ ہے کہ میرے اس موقف سے بہت کم لوگوں کو اتفاق ہوگا۔ میرے خیال میں ناشائستہ اشاعتوں کی روک تھام کے لیے کوئی قانون نہیں ہونا چاہیے۔ کچھ تو اس لیے کہ اس قسم کے قوانین کی موجودگی میں مجسٹریٹ واقعتاً وقیع تحریروں پر محض اس لیے سزا کر دیں گے کہ انھیں دھچکا لگا ہے، ایک وجہ تو یہ ہوئی۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ امتناعی قوانین کچھ اور چیزوں کی طرح فحش نگاری کو بھی عوام میں بے پناہ مقبول بنا دیتے ہیں۔ جب میں شراب بندی کے زمانے میں اکثر امریکا جایا کرتا تھا تو وہاں شراب نوشی کا دور دورہ زیادہ رہا کرتا تھا۔ اور فحش نگاری پر بھی پابندی کے اثرات کم و بیش یہی ہوتے ہیں۔ اب میں آپ کو ایک مثال دیتا ہوں کہ امتناعات سے میری مراد کیا ہے! فلسفی ایمپیڈ وکلیز کا خیال تھا کہ 'لارل کی پتیاں' چبانا ایک فعل قبیح ہے اور چوں کہ اُس نے یہ پتیاں چبا ڈالی تھیں اس لئے اُسے دس ہزار سال تک خارج کے اندھیروں میں بھٹکنا پڑے گا۔ اب دیکھیے کہ آج تک مجھے نہ کسی نے اِن پتیوں کو چبانے سے منع کیا اور نہ میں نے چبائیں، مگر ایمپیڈ وکلیز نے وہی کیا جس کی اُسے ممانعت کی گئی تھی۔ اور میرے خیال میں فحش نگاری پر بھی یہ بات صادق آتی ہے۔

یاٹ: لیکن کیا اگر ہر کسی کی ہر عریاں کتاب چھپتی رہے تو لوگوں کی دل چسپی میں اضافہ نہیں ہوگا!

رسل: میرے خیال میں تو اس طرح دل چسپی کم ہو جائے گی۔ مثال کے طور پر عریاں تصویروں والے پوسٹ کارڈوں کی اجازت دے دی گئی تو پہلے ایک دو سالوں میں اُن کی بے حد مانگ ہوگی اور پھر لوگ اِن سے اُکتا جائیں گے اور دوبارہ اُن کی طرف کوئی نہیں دیکھے گا۔

یاٹ: اور کیا یہی کچھ تحریر پر بھی لاگو ہوگا!

رسل: جی ہاں، ایک حد تک۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ لوگ کسی تحریر کو اسی وقت پڑھیں گے جب کہ وہ کوئی اچھا فنی نمونہ ہو نہ کہ اُس کی فحاشی کی بنا پر۔

ماخذ (انگریزی-1)

جنسی آزادی

ٹائن بی/ دیساکو اکیدا

اکیدا: آج کی دنیا میں جنسی آزادی جو ایک عالم گیر مظہر کے طور پر سامنے آئی ہے (اگرچہ یورپ، امریکا اور جاپان میں اس کی موجودگی خصوصیت کے ساتھ محسوس کی جا رہی ہے)، اس رفتار اور قوت کے ساتھ پیش قدمی کر رہی ہے کہ اس سے جدید تہذیب کی بنیادوں ہی کے متزلزل ہونے کا خطرہ لاحق ہو گیا ہے۔ وہ باتیں جنھیں پہلے شرم ناک تصور کیا جاتا تھا، اب کھلے بندوں کہی اور کی جا رہی ہیں۔ بالکل فطری طور پر، اب ضرورت اس امر کی ہے کہ جنس کو صحیح طور پر سمجھا جائے۔ اسے بے وقوفی کے ساتھ چھپانے کی ضرورت نہیں، کیوں کہ اس سے سوائے اس کے کچھ نہ ہوگا کہ اس کی طرف ایک غیر فطری رویے کو فروغ ہو۔ دوسری طرف مجھے اس امر میں بھی شک ہے...... جیسا کہ بعض لوگ اقرار کرتے ہیں، کہ جنس کے بارے میں موجودہ بے لگام اور مکمل آزادی کا رویہ، انسانی حریت کا راستہ ہے۔ حریت، اور کھل کھیلنے کی مکمل آزادی، ایک ہی چیز نہیں ہیں، اور مجھے اس امر کا ایقان ہے کہ موجودہ جنسی آزادی میں ایک شدید قسم کا نقص پایا جاتا ہے۔ جنس کے بارے میں اس رویے میں کوئی اہم عنصر ضرور مفقود ہے۔

ٹوائن بی: بات یہ ہے کہ انسان خود کو اس عجیب و غریب اور حیا انگیز صورتِ حال سے دوچار پاتا ہے کہ وہ ایسا حیوان ہے جو خود آگاہ روحانی ہستی بھی ہے۔ وہ اس امر کا شعور رکھتا ہے کہ اس کی فطرت کے روحانی پہلو نے اسے ایک ایسا وقار عطا کر دیا ہے جو دوسرے حیوانوں میں مفقود ہے اور وہ ایسا محسوس کرتا ہے کہ اسے اس وقار کو برقرار رکھنا چاہیے۔ اسی لیے بنی نوع انسانی کے افراد ان جسمانی اعضا اور وظائف اور اشتہاؤں پر حیا محسوس کرتے ہیں جو ان میں اور دوسرے غیر انسانی حیوانات میں مشترک ہیں اور جو ہمیں وحشی حیوانات کے ساتھ ہماری جسمانی مماثلت و علائق کی یاد دلاتے ہیں۔ غیر انسانی حیوانات، اپنی طبعی ماہیت کے وظائف پر شرم سار نہیں ہوتے کیوں کہ وہ خود آگاہ نہیں۔ فقدانِ وقار کے خوف سے شرم ساری کی کیفیت کا پیدا ہونا اور وقار کے حقیقتاً زائل ہو جانے کی رسوائی، خالصتاً انسانی پریشانیاں ہیں۔

اب انسانوں نے اپنی فطرت کے حیوانی پہلو کے ہوتے ہوئے اپنے وقار کو برقرار رکھنے کے لیے یہ کیا کہ اپنے آپ کو حیوانات سے ممتاز کرنے کے لیے ان حیوانی اعضا اور وظائف کے لیے جو

ہمارے ناگزیر حیاتیاتی ورثے کی لازمی ساخت کا حصہ ہیں، بعض روایتیں اور طریقے ایجاد کر لیے جن کی حیوانات نقل نہیں کرتے اور نہ کر سکتے ہیں۔ ثقافت اور تہذیب کی جانچ کا ایک انسانی پیمانہ وہ ہے جس میں یہ دیکھا جاتا ہے کہ مصنوعی روایات کے ذریعے ہم ان جسمانی اعضا اور وظائف سے جو تمام حیوانات میں مشترک ہیں کس طرح عہدہ برآ ہوتے ہیں۔

اکیدا: جنس کے بارے میں تمام تہذیبوں کے اپنے رسوم اور رواج ہیں اور یہ عام طور پر ایک نسل سے دوسری نسل کو منتقل ہوتے رہتے ہیں۔ آج کل جنسی تعلیم کی تدریس کچھ اس طرح ہو رہی ہے جیسے کہ وہ کوئی بڑی خاص چیز ہو جب کہ صورتِ حال یہ ہے کہ کسی نہ کسی صورت میں یہ تمام ثقافتوں کا ایک جزو رہی ہے۔

توائن بی: بلاشبہ ان موضوعات پر بیش تر تہذیبوں میں رسوم و رواج موجود ہیں، اور اکثر اوقات یہ رسوم و رواج مختلف بھی ہوتے ہیں۔ آج ہماری ثقافت یہ ہے کہ ہم اپنے جنسی اعضا اور اعضائے بول و براز کو مستور رکھتے ہیں۔ ہم سرِعام جنسی مباشرت سے یا اس عمل سے جسے ہم نے خوب صورتی سے 'رفع حاجت' کا نام دے دیا ہے، گریز کرتے ہیں، اور آدابِ دسترخوان کی پابندی کرتے ہیں۔ آدابِ دسترخوان میں کافی اختلاف پایا جاتا ہے۔ یہ چیزیں، ثقافتی اختلافات کا ایک بڑا نازک اشاریہ ہیں مگر یہ ثقافتی صحت و سقم کا یقینی اشاریہ ہرگز نہیں کیوں کہ کھانا اور پینا حیوانی وظائف ہیں جن میں چوہوں اور مویشیوں کے ساتھ انسان کے اشتراک پر اسے شرم محسوس نہیں ہوتی (بشرطے کہ ہم چوہوں اور مویشیوں کے انداز میں کھا اور پی نہ رہے ہوں)۔ اس کے برعکس رفع حاجت اور جنسی مباشرت تمام انسانوں کے لیے فی نفسہٖ باعثِ شرم ہیں، قطع نظر اس کے کہ ان کا ثقافتی انداز کس طرح کا ہے اور یہی وجہ ہے کہ ان فطری وظائف کی ادائیگی میں انسان کچھ رواجوں کی پابندی کرتے ہیں۔

جنس خاص طور پر باعثِ شرم ہے کیوں کہ انسان میں جنسی خواہش بلوغ سے پہلے بیدار نہیں ہوتی۔ اس لیے یہ ضروری ہو جاتا ہے کہ بلوغ کی عمر کو پہنچنے والے ایک نوعمر انسان کو زندگی کے جنسی حقائق سے روشناس کرایا جائے مگر تعلیم کی یہ راہ یقیناً پُرخطر ہے، اگر بچّے کے بزرگ جنس کو ایک پُراسرار شے بنا کر رکھیں اور بچّے کو حقائقِ جنسی کے بارے میں آگاہ کرنے میں اس وقت تک تاخیر کریں جب تک وہ بچہ جنسی طور پر بلوغ کی پختہ عمر کو نہیں پہنچ جاتا، تو اس کا نتیجہ یہ ہو سکتا ہے کہ بچّے کے جنسی تجسس کو مہمیز ہو اور اسے بزرگوں کا رویہ اچھا نہ لگے کہ انھوں نے اسے جنس کے بارے میں تاریکی میں رکھا۔ اس کا نتیجہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ بچّے کی سوچ جنسی خیالات سے مغلوب ہو جائے اور وہ وظیفۂ جنسی کی انجام دہی کے لیے ضرورت سے زیادہ اشتیاق کا شکار ہو جائے۔ اس کے برخلاف اگر والدین بچّے کی نظروں میں رہتے ہوئے وظیفۂ جنسی انجام دیں گے تو وہ اس کی نظروں میں اپنے وقار کو گرا دیں گے۔ اس صورت میں عین

ممکن ہے کہ بچہ، جسمانی طور پر بلوغ کی عمر کو پہنچے بغیر ہی جنسی میلانات سے مغلوب ہو جائے۔ جنسی تعلیم میں ایک طرف حد سے بڑھی ہوئی نقصان رساں بے تکلفی اور دوسری جانب حد سے بڑھی ہوئی نقصان دہ رازداری اور قیود و پابندیوں کے درمیان ایک اطمینان بخش بیچ کی راہ تلاش کرنا ایک بہت مشکل کام ہے۔

اکیدا: آپ کا خیال درست ہے۔ یہ مسئلہ ہمیشہ سے ایک مسئلہ رہا ہے اور یقیناً آج بھی یہ ایک مشکل مسئلہ ہے۔

ٹوائن بی: وقارِ انسانی کے بارے میں ایک کمزور نکتہ یہ ہے کہ اس کی بقا کے لیے اپنے حیوانی اعضا اور وظائف کو مصنوعی طور پر پوشیدہ کر دینے کے علاوہ کوئی اور بہتر طریقہ دریافت نہیں کر پائے ہیں۔ اگر کسی غیر انسانی حیوان کو عارضی طور پر انسانی فہم و شعور سے آراستہ کیا جا سکے اور اسے بلا کسی پابندی کے انسانی طرزِ زندگی کا معائنہ کرنے کا موقع دیا جا سکے تو ہمارا یہ خیالی مشاہدہ کنندہ یقیناً یہ فتویٰ صادر کرے گا کہ وقارِ انسانی محض ایک فریب ہے جسے روایتی طریقوں کی مدد سے اس حقیقت کی پردہ پوشی کے ذریعے برقرار رکھا گیا ہے کہ نوعِ انسانی حقیقتاً کسی بھی زندہ مخلوق کی کسی بھی نوع سے زیادہ باوقار نہیں ہے۔ انسان تو پھر بھی سچ مچ یہی سوچتا ہے کہ وہ فی الواقع وقار کا مالک ہے اور اگر وہ اس وقار کو برقرار رکھنے میں ناکام ہو جائے تو وہ شرفِ انسانی سے ایک پست تر سطح پر گر جائے گا۔ میرا خیال ہے کہ وقارِ انسانی کے بارے میں یہی بات صحیح ہے نہ کہ ہمارے خیالی معائنہ کنندہ کا فتویٰ۔ انسان کا احساسِ شرف دراصل ایک دوسرا نام ہے انسان کے اس وقوف کا کہ اپنی جسمانی ساخت کے اعتبار سے ایک حیوانی عضویہ ہونے کے باوجود وہ ایک روحانی ہستی ہے۔

اکیدا: جی ہاں! اگر ہم یہ دعویٰ کریں کہ انسان کے روحانی اعمال و وظائف، محض کذب اور کہانی ہیں، تو وہ تمام کرداری روایات جو انسان نے اپنے شرف کو سہارا دینے کے لئے تشکیل دی ہیں، لایعنی ہو جاتی ہیں۔ تاہم حقیقت تو یہ ہے کہ انسان ایک روحانی ہستی ہے اور روحانی وظائف اس کی ہستی کے ایک زیادہ بڑے حصے پر محیط ہیں۔ نتیجتاً جنس، خورد و نوش اور دوسرے انسانی حیوانی وظائف کا احاطہ کرنے والی روایات، قابلِ توجہ معنی کی حامل ہیں۔

ٹوائن بی: اپنے حیوانی اعضا اور وظائف کے انتظام سے متعلق احکام کو اپنے اوپر عائد کر کے انسان اپنی انسانیت کا ادعا کر رہا ہے اور اس کا تحفظ کر رہا ہے۔ ابھی تک تو انسانیت آفاقی طور پر یکساں قاعدے قانون اختیار نہیں کر سکی ہے۔ انسان کے مختلف معاشروں میں مختلف قاعدے قانون مروج ہیں۔ جب ہم ان قوانین کے مختلف مجموعوں کا موازنہ کرتے ہیں تو یہ فیصلہ کرنے میں کوئی دشواری نہیں ہوتی کہ ان میں سے بعض مجموعے دوسروں سے بہتر ہیں۔ ہم اپنے قوانین کو مسلسل بدلتے رہتے ہیں۔

یکن جہاں تک ہمارے علم کی رسائی ہے، کوئی انسانی معاشرہ ایسا نہیں گزرا ہے جس نے بالکلیہ تمام وانین کو اٹھا کر بالائے طاق رکھ دیا ہو۔ یہ تصور کرنا دشوار ہے کہ ایسا کرنے کے بعد کوئی معاشرہ کس طرح ایک انسانی معاشرے کے طور پر باقی رہ سکتا ہے۔ دوسری انواع کے حیوانات کی بہ نسبت انسان کو فعل کی زیادہ آزادی حاصل ہے۔ ہم اس امر میں آزاد ہیں کہ غیر انسانی حیوانات کی بہ نسبت بدتر کردار کو اختیار کریں یا ان سے بہتر کردار کو۔ اگر ہم قوانین کے تحت زندگی نہیں گزاریں گے تو یقیناً بدتر کردار اختیار کرلیں گے۔

جنسی اختلاط کے مسئلے سے نبرد آزما ہونے کے لیے درست معیار شرف انسانیت کو برقرار رکھنا اور معاملاتِ انسانی کے اس شعبے میں جنسی رشتوں کو انسانیت کے دائرے میں لانے کے لئے 'شرف' شرہ ناگزیر ہے جس سے بڑھ کر ایک روحانی صفت اور ہے اور وہ ہے محبت۔ انسانی جنسی تعلقات محبت اور وقار سے عاری ہو کر اور محض ایک حیوانی اشتہا کی سطح پر گر کر' روحانیت کے نقطہ نظر سے' درجہ انسانیت سے گرا دینے والے افعال بن جاتے ہیں۔ غیر انسانی حیوانات میں محرکِ جنس کا جوابی فعل غیر خود شعوری ہوتا ہے اور اسی لیے یہ فعل معصومانہ ہوتا ہے۔ مزید برآں، ان حیوانات کی زندگی میں اختلاطِ جنسی' عضویے کی ساخت میں ودیعت شدہ فطری میکانیت سے کنٹرول ہوتا ہے۔ انسانی زندگی میں وقار اور محبت سے عاری جنس تو ایک فعل حیوانی بھی نہیں۔ یہ روحانی اور اخلاقی سطح پر اس درجے سے بھی فروتر بات ہے' جس پر فطرت نے وحشی حیوانات کے جنسی اختلاط کو رکھا ہے۔

اکیدا: بے شک' بغیر قواعد و قوانین کے کوئی انسانی معاشرہ نہیں رہ سکتا۔ سچ تو یہ ہے کہ ایسا معاشرہ انسانی معاشرے کے قریب تر بھی نہ ہوگا کیوں کہ سائنس دانوں نے یہ مشاہدہ کیا ہے کہ وہ تمام حیوانات بھی' جو محدود روحانی اوصاف رکھتے ہیں' قواعد و قوانین کی پابندی کرتے ہیں۔ مثلاً بعض بن مانسوں میں کھانا کھلانے اور جنسی اختلاط میں ترتیب مراتب کے ضمن میں واضح قاعدے قانون ہوتے ہیں۔ بن مانس معاشروں میں ان قاعدوں کی سختی سے پابندی کی جاتی ہے۔ قاعدے قانون کے بغیر انسان ان بن مانسوں کی بہ نسبت سماجی طور پر ادنیٰ درجے پر ہوگا۔

ٹوائن بی: جنسی قاعدے قانون سب سے زیادہ اہم ہیں کیوں کہ جنس فطرتِ انسانی کے حیوانی پہلو کا سب سے زیادہ وقیع شعبہ ہے۔ جنسی رشتے کم از کم دو افراد کو متاثر کرتے ہیں اور اگر ان کے فطری نتائج برآمد ہوں یعنی بچے پیدا ہو جائیں تو گویا دو سے بھی زیادہ افراد ان رشتوں سے متاثر ہوں گے۔ راہب اور راہبات ان رشتوں کو رد کر دیتے ہیں لیکن ان کے بغیر نسل انسانی باقی نہیں رہ سکتی کیوں کہ اس کے بغیر وہ اپنے آپ کو پیدا نہیں کر سکتی۔ فطرت کی طرف سے انسان میں جو جنسی اشتہا رکھی گئی ہے، جنسی رشتوں کی قانون بندی سے اس میں ایک وقار شامل ہو جاتا ہے اور اپنی ہیئت کو تبدیل

کر کے وہ محبت میں بدل جاتی ہے۔ کنفیوشس کی یہ سوچ بالکل درست ہے کہ شوہر اور بیوی کے درمیان نیز والدین اور بچوں کے درمیان محبت انسانی عمرانیات اور اخلاق کی روح ہے۔

اکیدا: اساسی طور پر تو میں اس خیال سے متفق ہوں، مگر مجھے یہ محسوس ہوتا ہے کہ جنسی اخلاق کا فقدان اور جنس میں محبت کی عدم موجودگی اُس رجحان کا ایک حصہ ہے جس میں زندگی کو محض مادی اقدار ہی کے حوالے سے دیکھا جا رہا ہے۔ جنس کو محض ایک وسیلۂ لذت اندوزی میں تبدیل کیا جا رہا ہے جو روحانیت سے کاملاً مبرّا ہے۔ مجھے اس بات کا یقین ہے کہ جب تک ہم اس رجحان کا اس کے بنیادی اسباب کی روشنی میں تجزیہ نہ کریں گے ہم کسی حل تک نہ پہنچ سکیں گے۔

ٹوائن بی: کسی انسانی معاشرے کے قاعدے، آداب اور روایات کا مکمل مجموعہ دراصل ایک منفرد اور باہم مربوط نظام ہوتا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ انسانی زندگی کے مختلف شعبوں کو چلانے والے قوانین میں کوئی منطقی ربط نہ ہو مگر ایک نفسیاتی ربط ضرور ہے ان معنوں میں کہ کسی ایک شعبے میں ڈھیل یا جکڑ بندی کا اثر دوسرے شعبوں تک پہنچتا ہے۔ یقیناً یہ کوئی حادثاتی اثر نہیں کہ موجودہ زمانے میں جنسی رشتوں میں اباحیت کے ساتھ ساتھ منشیات کے استعمال، بددیانتی اور ذاتی یا سیاسی مقاصد کے حصول کے لیے تشدد کے استعمال (بحیثیت ایک شارٹ کٹ) سے اباحیت کو بھی فروغ ہوا ہے۔

زندگی کے متعدد شعبوں میں قانون شکنی کی اس حالیہ وبا کا ایک سبب تو یہ ہے کہ دو عالمی جنگوں اور ۱۹۱۴ء کے بعد لڑی جانے والی متعدد مقامی جنگوں میں لاکھوں انسانوں کو سپاہی بنا دیا گیا۔ اب جہاں تک جنگ کا تعلق ہے، یہ انسانی جان لینے کے خلاف فطری مقاومت کی سوچی سمجھی تعدیل ہے۔ ایک سپاہی کے لیے اپنے بنی نوع انسان کی جان لینا ایک فریضہ بن جاتا ہے جب کہ اگر وہ بحیثیت ایک شہری کے قتل کا مرتکب ہوتا ہے تو یہ فعل ایک جرم متصور ہوتا ہے۔ ایک بڑے اہم اخلاقی قانون کی اس طرح من مانی اور غیر اخلاقی تعدیل بجائے خود نہایت حیران کن اور ہمت شکن ہے۔ مزید یہ کہ ایک سپاہی جو بالفعل اپنے فرائض میں مصروف ہے، اپنے روایتی سماجی ماحول سے کٹا ہوا ہوتا ہے اور بنا بریں اپنی تمام روایتی سماجی قیود سے آزاد ہوتا ہے۔ جب اسے قتلِ نفس کا حکم دیا جاتا ہے تو یہ تعجب کی بات نہیں کہ وہ دوسرے فطری موانع جیسے زنا بالجبر، لوٹ مار اور منشیات کے خلاف ضوابط کا بھی پابند نہیں رہتا۔ ویت نام میں امریکی افواج کا اخلاق سے عاری ہو جانا ایک انتہائی مثال تھی لیکن سچ تو یہ ہے کہ مہمات میں مصروف سپاہی ہمیشہ یہی کچھ کرتے ہیں۔

اکیدا: ہر عہد میں جنگ اسی طرح کے اخلاقی اقدار کے زوال کو فروغ دیتی ہے۔

ٹوائن بی: جنگ شر ہے لیکن سائنسی روح ایسی نہیں۔ تاہم میرا خیال ہے کہ نادانستہ طور پر اور بالواسطہ سائنسی روح نے موجودہ لاقانونیت کی وبا کے فروغ میں، خصوصاً جنسی علائق کے میدان میں

حصہ لیا ہے۔ سائنس کی اخلاقی خوبی یہ ہے کہ وہ صداقت کے انکشاف اور اس کے ساتھ نبرد آزما ہونے کے عمل کے ساتھ وابستہ ہے۔ سائنس تمام روایتی عقائد' رسوم ورواج اور عادات کو چیلنج کرتی ہے۔ جنسی کردار کے بارے میں تمام معاشروں میں رویہ کسی نہ کسی حد تک ممانعت ہی کا رہا ہے۔ میری رائے یہ ہے کہ یہ اخلاقی طور پر درست بات ہے۔ تاہم قیود جتنی سخت ہوں گی، ان کی خلاف ورزیاں بھی اتنی ہی کثیر اور عیاں ہوں گی اور ان کے خلاف ورزیوں کا مصلحت آمیز اخفا بھی اسی تناسب سے زیادہ منافقانہ ہوگا۔ آج کے عہد میں بچے تعلیم یافتہ ہیں۔ محض رسمی طور پر نہیں بلکہ تعلیم حیات کے مفہوم میں بھی کہ وہ صداقت کے لیے ایک سائنسی جوش اور دروغ کے لیے ایک سائنسی حقارت کا رویہ رکھتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ آج والدین اور ریاست' دونوں کا وقار اور نتیجتاً ان کا اختیار، اعتماد کی خلیج کے باعث ٹوٹ چکے ہیں۔ آج کے بچے یہ بات ماننے پر آمادہ ہیں کہ ان کے والدین' جنسی رشتوں یا کسی بھی دوسری چیز کے بارے میں وہ کچھ نہیں کرتے جس کی وہ تلقین کرتے ہیں۔ اگر جنسی کردار کے بارے میں روایتی رسوم ورواج کے خلاف موجودہ بغاوت کا یہ ایک سبب ہے اور مجھے یقین ہے کہ ایسا ہی ہے، تو یہ بات بعید از قیاس ہوگی کہ باغی نسل اپنے جنسی کردار میں اصحاب اقتدار کی طرف سے اختیار کیے جانے والے سخت رویّوں یا جنسی زہد کے لیے رضا کارانہ تحریکوں کے نتیجے میں اپنے جنسی کردار کو کسی قانون کا پابند بنانے کی طرف مائل ہوجائے گی۔

اکیدا: جنسی آزادروی کے رجحان کو میں ایک دوسرے نقطۂ نظر سے دیکھتا ہوں۔ مجھے اس کی حقیقی علت' حیات کی اندرونی قوت کی کمزوری میں نظر آتی ہے یہ کمزوری پیدا کردہ ہے موجودہ مادی تہذیب کے ظالمانہ اثرات کی۔ جنس کو انسانی زندگی کے اپنے مخصوص مقام پر رکھنے کے لیے محبت کی جس توانا اسپرٹ کی ضرورت ہے وہ ایک نقاہت زدہ قوتِ حیات کے بطن سے پیدا نہیں ہوسکتی۔ میں آپ کے اس عقیدے کے ساتھ اتفاق کرتا ہوں کہ محبت کے عمل کے ذریعے' موجودہ صورتِ حال کو تبدیل کرنے کے لیے ایک راہ نکالی جاسکتی ہے مگر میرا یہ بھی خیال ہے کہ اگر ہمیں روحانی قوتوں کے عملی ثمرات کی توقع رکھنی ہے تو ہمیں مزید ایک قدم آگے جاکر حیات کی ان قوتوں پر بھروسہ کرنے کی ضرورت ہوگی' جو خود محبت کو جنم دیتی ہیں۔ جنسی کردار میں انسانیت کو اس کے منصب پر بحال کرنے کا طریقہ یا تو یہ ہوگا کہ ان خارجی عوامل کو نکال باہر کیا جائے جو روح کو مغلوب کیے دے رہے ہیں' یا اس داخلی قوت کو پروان چڑھایا جائے' متحرک کیا جائے اور مضبوط بنایا جائے جو حیات کی ممد اور اس کو جنم دینے والی اصل ہے، مگر ایسا کیوں کر ہوسکتا ہے؟

ٹوائن بی: جنسی اباحیت کے علاج کے لیے واحد نتیجہ خیز علاج ایک مثبت قدم ہوگا۔ جنسی اباحیت دراصل انسانیت کے مستقبل کے بارے میں ایقان اور امید کے معدوم ہونے کا ایک اظہار

ہے۔ اس کا علاج یقیناً یہ ہوگا کہ باغی نسل کے سامنے کوئی ایسا نصب العین رکھا جائے، جو ان میں ایک روح پھونک دے، تاہم وہ محض خیالی نہ ہو۔ جنسی کردار کے لیے قوانین کا کوئی بھی مجموعہ مقدس نہیں ہے۔ انسانی زندگی وحوش کی سطح پر اتر آئے گی، اگر انسانی جنسی روابط قوانین کے ایک ایسے مجموعے کے تحت نہ لائے گئے جو ان تمام جسمانی وظائف میں جنھیں انسان اپنے دوسرے غیر انسانی بنی نوع حیوان کے ساتھ مشترک رکھتا ہے، اس انتہائی بے ہنگم عمل کو انسانی وقار دے سکے، اور جسے ایک وقار بخش طریقے کے طور پر تسلیم بھی کیا جائے۔

ماخذ (أردو ۔۴۷)

غلط اور صحیح کا تعیّن

ٹائن بی/ دیسا کوا کیدا

اکیدا: بغیر کسی شک و شبے کے، کسی بھی ادبی فن کار کو کسی سائنس داں کی طرح عظیم کام کرنے کے لیے روحانی طور پر آزاد ہونا چاہیے۔ ادب جو سماجی مقاصد کا پابند بنایا جائے کسی لائق نہیں ہوتا۔ ادب کو اگر فاقہ کشی کے سلسلے میں کچھ کرنا ہے تو اس کو طے شدہ مقاصد تک محدود ہونے کی بجائے لازمی طور پر آزاد تخلیقی رجحان کا نتیجہ ہونا چاہیے۔ اس حوالے سے بات کرتے ہوئے ہمیں ادب اور سیاسی حکومت کے تجزیے کو جاری رکھنا چاہیے۔ کیا مارکسی ادب ممکن ہے! یا عیسائیت کی نام نہاد شہنشاہیت میں ادب پروان چڑھ سکتا ہے! تاریخ گواہ ہے کہ نظریات کا پابند ادب دنیا کی توجہ حاصل کرنے میں ناکام رہا ہے۔ مثلاً روسی انقلاب کے پچاس سال بعد بھی روسی داستوسکی سے بہتر ادب تخلیق نہیں کر سکے ہیں۔

ٹوائن بی: عموماً اظہارِ خیال کی آزادی دینے کے خلاف دو مختلف تحریکیں پائی جاتی ہیں۔ ایک تحریک تو نظریاتی راسخ الاعتقادی قائم رکھنے سے متعلق ہے (عیسائی، اسلامی، مارکسی، سرمایہ دارانہ وغیرہ) اور دوسری کا تعلق اخلاقی اقدار کو قائم رکھنے سے ہے۔

ادب پر مذہبی بنیادوں پر لگائی جانے والی پابندی بُرا اثر رکھتی ہے اور میرے خیال میں اسے کسی بھی حالت میں منصفانہ قرار نہیں دیا جا سکتا۔ بہر حال نظریاتی پابندی کا نفاذ آسان ہے۔ کسی خیال یا احساس کے اظہار پر پابندی کی ضرورت ہے یا نہیں اس کا فیصلہ طاقت ور، مطلق العنان سیاسی یا مذہبی حکام کے فرمان پر منحصر ہوتا ہے۔ اخلاقی بنیادوں کے اعتبار سے یہ پابندی مزید مشکلات و مسائل پیدا کرتی ہے۔ کچھ ہی لوگ اس پر راضی ہو سکتے ہیں کہ ایسی ذاتی ترغیبات جن میں جنسی میل جول، بے راہ روی، منشیات کا استعمال یا شراب نوشی اور جسمانی تشدد کو ہر حال میں ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر آزادی سے دکھایا جائے۔ اکثر بالغ العمر افراد یہ سمجھتے ہیں کہ بُرے اثرات کے زیرِ اثر نوجوانوں کا جو کردار سامنے آتا ہے اس کو قابو کرنا بہت مشکل ہے، لیکن اس سوال پر کوئی اتفاق رائے نہیں ہے کہ کیا چیز بگاڑ کا سبب ہے، یا کہاں پر پابندی اور آزادی کے درمیان حد کھینچنی چاہیے! اس کے علاوہ یہ بات بھی بحث طلب ہے کہ کسی پابندی کے کچھ دوسرے نتائج بھی ہو سکتے ہیں مثلاً یہ تجسس کو اُبھار سکتی ہے اور مخالفت پیدا کر سکتی ہے۔

اکیدا: چوں کہ ادب کسی دور کی روح ہوتا ہے اور اپنے خالق معاشرے کے رجحانات کا آئینہ دار، اس لیے اکثر ادبی سلسلے گوناگوں اقدار کے دور میں ابھرتے ہیں جیسے موجودہ دور میں ادب میں فحش نگاری ہمارے وقت کے بدلتے ہوئے رویے کے ایک پہلو کی عکاس ہے۔ بہر حال میں اس پر یقین نہیں کرسکتا کہ ایسے ادب کی موجودہ تیزی برقرار رہ سکے گی کیوں کہ فحش نگاری کا لالچ اور اس کے نتیجے میں حاصل ہونے والی لذت کا احساس دونوں ناپائیدار ہیں۔ اب ایسا وقت آئے گا کہ عوام کی اکثریت فحش نگاری پر کوئی توجہ نہ دے گی۔ ہمیں یقیناً اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے کہ فحش نگاری نوجوانوں کو بگاڑ سکتی ہے اور معاشرے میں بدنظمی پیدا کرسکتی ہے۔ اس وقت بھی بہت سارے لوگ یہ آواز اٹھا رہے ہیں کہ اخلاقی نقطۂ نظر سے فحاشی پر سختی سے قابو پانا چاہیے۔ میں بنیادی طور پر ابھی بھی اظہار خیال پر کسی قسم کی پابندی لگانے کے خلاف ہوں۔ ماضی کے تجربات اچھی طرح بتاسکتے ہیں کہ پابندی ایک دفعہ کسی بھی شکل میں لگادی جائے، بہت جلد خیالات، عقائد اور مذہب کے معاملات تک بڑھ جاتی ہے۔

ٹوائن بی: انتظامیہ کو ایسا کوئی اخلاقی حق حاصل نہیں کہ وہ اپنی طاقت کو اپنے علاوہ تمام مذاہب، فلسفوں اور نظریات کو کم تر بتانے کے لیے استعمال کرے۔ مذہب یا فن جو انتظامیہ کی نظروں میں خلاف عقیدہ ہو، ایسے آمرانہ ماحول میں پروان نہیں چڑھ سکتا۔ ایسی آب و ہوا میں جہاں حکومت کا رویہ اتنا سخت اور محاسبانہ ہو، راسخ الاعتقاد ادب اور فن بھی مرجھا جائے گا۔ اس لیے کہ راسخ الاعتقاد ادیب یا فن کار بھی پابندیوں کی خلاف ورزی کرنے کا خطرہ مول نہیں لینا چاہیں گے۔ یہ تشویش ان کی آزادی کو ختم کردے گی جو تخلیق کی صلاحیت کے لیے لازمی شرط ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی ایک تاریخی حقیقت ہے کہ ادب اور فن کے کچھ عظیم کام ایسے ہی پابند دور حکومت میں، چوتھی صدی سے لے کر ساتویں صدی تک کے عیسائی عہد میں، عیسائی ممالک میں اور مسلم ممالک میں، کچھ عرصہ پہلے تک تخلیق کیے گئے۔

اکیدا: اخلاقی معاملات میں آپ کے فرمانے کے مطابق صحیح اور غلط کے متنازع فیہ مسائل پر غیر جانب داری ناممکن ہے۔ لیکن عملی حیثیت پر گفتگو کرتے ہوئے، میں عوامی ذرائع ابلاغ کے سلسلے میں، لازمی غیر جانب داری کے اصرار پر مجبور ہوں۔ اس قسم کی عملی غیر جانب داری کے رہنما کے اصول کے طور پر میں یہ تجویز پیش کرسکتا ہوں کہ عوامی ذرائع ابلاغ کو مسلسل اور مستقل طور پر لوگوں کے حقوق کی حفاظت کرنا چاہیے اور خبروں کو زندگی کے احترام کے نقطۂ نظر سے پیش کرنا چاہیے۔

ٹوائن بی: اس اہم اور ضروری شرط کو مدنظر رکھتے ہوئے کہ صحیح اور غلط کے درمیان غیر جانب داری ناممکن ہے، میں اس سے متفق ہوں کہ عوامی ذرائع ابلاغ کا غیر جانب دارانہ استعمال ہونا چاہیے

بلکہ میں تو اس سلسلے میں آگے بڑھ کر یہاں تک تجویز کرنے کو تیار ہوں کہ ذرائع ابلاغ کا انتظام کرنے والا ادارہ' ان لوگوں کو جنھیں اس کی انتظامی نگرانی' اخلاقی طور پر غلط معلوم ہوتی ہو اپنا موقف پیش کرنے کا موقع دے' لیکن اس بات کو چھپائے بغیر کہ انتظامی ادارے کی اپنی رائے ان لوگوں کے خلاف ہے۔

لیکن ہم اس ادارے میں جسے غیر جانب دار ہونا چاہیے' افراد یا اراکین ادارہ کو کیسے متعین کریں گے اور کیسے اس بات کو یقینی بنائیں گے کہ غیر جانب دارانہ ذہنیت کا ادارہ ذرائع ابلاغ کی غیر جانب داری کو عملاً برقرار رکھے گا! میں نہیں سمجھتا کہ حکومت کی جانب سے تقرر یا رائے دہندگان کی جانب سے انتخاب' ممکنہ طور پر ذرائع ابلاغ کے لیے ایک غیر جانب دارانہ ذہنیت کا انتظامی ادارہ فراہم کریں گے۔ میری تجویز ہے کہ اس ادارے کے اراکین کا ذاتی اوصاف کی بنیاد پر انتخاب کیا جائے، لیکن ہم عوامی ذرائع ابلاغ کے انتظام کے لیے وہ کون سے مالی ذرائع تلاش کر سکتے ہیں جو مجلس منتظمہ کو مالی دباؤ سے محفوظ رکھ سکیں! اگر اسے ہم کسوٹی مان لیں تو ہمیں ٹیکس سے حاصل کردہ رقم کا وہ حصہ جسے عوام کے سیاسی حاکم متعین کرتے ہوں اور وہ رقم جو نجی تجارتی کاروبار کے اشتہارات سے حاصل کی گئی ہو' دونوں کو اس ادارے کے ذریعے آمدنی کے طور پر رد کر دینا چاہیے۔ ایک متبادل راہ' دیکھنے اور سننے والوں سے لائسنس کے طور پر رقم کی وصولی ہے۔ یہ ذرائع ابلاغ کو ان لوگوں تک محدود کر دے گا جو لائسنس کے رقم دینے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ بہر حال جس طور سے جائزہ لیں' ذرائع ابلاغ سے فائدہ اٹھانے والے وہی لوگ ہوتے ہیں جو آلہ وصول کنندہ کو خریدنے یا کرائے پر لینے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ اس ضروری آلے کی قیمت کے مقابلے میں لائسنس کی وہ رقم جو خدمات کی اجرت کے لیے کافی ہو' کم ہی ہوگی۔

اکیدا: موجودہ آئینی ریاستوں میں اظہار کی آزادی' جس میں تقریر اور پریس کی آزادی شامل ہیں' تسلیم کی گئی ہے لیکن زبانی دیے ہوئے اور مطبوعہ بیانات کے عوام پر اثرات سے تعلق رکھنے والے سوالات ناقابل گریز طور پر حد بندی کے مسائل پیدا کرتے ہیں۔ اظہار کی آزادی میں عام طور پر تسلیم شدہ موانع مندرجہ ذیل موضوعات سے تعلق رکھتے ہیں: عوامی اخلاقیات' ریاست کے راز اور انفرادی شخصیتیں۔ ترقی یافتہ مغربی ممالک میں حالیہ رجحان تحریری فحاشی کی رکاوٹوں کو کم کرنے کی جانب مائل ہے۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ یہ رجحان کم سنوں کی تعلیم کے نقطہ نظر سے ناپسندیدہ ہے' لیکن میرے نقطہ نظر سے اس خدشے کو صحیح نہیں کہا جا سکتا۔ میں کسی صورت میں بھی سیاسی دباؤ کے استعمال کو اس طرح کے معاملات کی روک تھام کے لیے جائز نہیں سمجھتا۔ فطری طور پر انسان ان چیزوں کے بارے میں جو سخت پوشیدہ رکھی جائیں' جستجو میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ جنس کو پوشیدہ رکھنے کے بجائے ہمیں

نوجوانوں کو اس کے متعلق صحیح نقطۂ نظر پیدا کرنے میں معاونت کرنا چاہیے۔

نائن بی: ہوسکتا ہے کہ پوشیدہ رکھنا بعض صورتوں میں نقصان نہ پہنچائے لیکن یہ کسی طور پر فائدہ مند بھی نہیں۔ مثال کے طور پر میری اس زمانے میں پرورش ہوئی تھی کہ جب انگریزی متوسط طبقے میں جنس کو اس قدر باعث مجوبیت سمجھا جاتا تھا کہ بچوں کو اس کے متعلق کچھ نہیں بتایا جاتا تھا۔ جب میری عمر دس یا بارہ سال کی تھی تو میرے والد نے مجھے جنسی فعل کے بارے میں بتانے کی کوشش کی لیکن ان کی جھجک اتنی زیادہ تھی کہ میرے لیے ان کی بات سمجھنا بہت مشکل تھا۔ اس کے بعد میرے اسکول کے ایک استاد نے ان چیزوں کی وضاحت کرنا چاہی لیکن وہ بھی میرے باپ سے زیادہ کامیاب نہ ہوئے کیوں کہ وہ بھی اس موضوع پر ان ہی کی طرح مجوبیت زدہ تھے۔ شادی سے پہلے میں انگلستان میں ایک ڈاکٹر کے پاس گیا اور اس سے مدد کے لیے کہا لیکن تعجب کی بات یہ ہے کہ اس پیشہ ور آدمی کو بھی اس معاملے میں صاف گوئی مشکل معلوم ہوئی اور کوئی وضاحت کرنے کے بجائے اس نے مجھے ایک درسی کتاب رٹا دی جس میں کھینچی ہوئی شکلیں تھیں۔ یہی شادی سے قبل میری جنسی تعلیم تھی اور یہ مضحکہ خیز تھی۔ اپنے ان ابتدائی تجربات کے نتیجے کے طور پر فحش تحریروں کا کوئی ذوق مجھ میں پیدا نہیں ہوا لیکن میں سمجھتا ہوں کہ یہ پوشیدگی لوگوں کو اس جانب لے جاسکتی ہے۔ میں پوری طرح متفق ہوں کہ اگر جنس کے بارے میں کھل کر گفتگو کی جائے تو اس کی ہیجانی کشش میں کچھ کمی آجائے گی اور انسانی زندگی میں یہ اپنا فطری مقام حاصل کرلے گی۔

اکیدا: نجی آزادی کا مطلب یہ ہے کہ ہم فحش تحریروں کو رد کرنے کی آزادی بھی رکھتے ہیں اور انھیں قبول کرنے کا اختیار بھی۔ دوسرے لفظوں میں 'میں یہ نقطۂ نظر اختیار نہیں کرتا کہ فحش تحریروں کو مکمل طور پر عدم ممانعت کا اجازت نامہ مل جائے' لیکن اس پر ضرور اصرار کرتا ہوں کہ رکاوٹوں کو 'انتخاب کی آزادی کے بنیادی اصول سے ہم آہنگ حد بندی کا پابند ہونا چاہیے۔

ماخذ (اُردو۔۴ے)

فحاشی اور احتساب (ایک مذاکرہ)

(شُرکا: ہیو ہیفنر (پبلشر۔ ایڈیٹر/ 'پلے بوائے')، نارمن۔ جے۔ او۔ کانر (پادری، دانشور، ادیب)، رچرڈ ای گیری (پادری، دانشور)، مارک ٹینم (ربی۔ سیاسی رہنما)، مرے برنیٹ (ثالث)۔

برنیٹ: آج رات ہم اس دور کے سب سے نازک اور اہم مسئلے پر بات چیت کریں گے یعنی فحاشی اور سنسر شپ پر۔ جب میں سنسر شپ کا ذکر کرتا ہوں تو اس سے میری مراد ہر نوع اور ہر قسم کے احتساب سے ہے جو حکومت کی طرف سے لگایا جاتا ہے یا معاشرے کی طرف سے یا پھر انفرادی سنسر شپ۔ اس سنسر شپ میں' میں ناشروں اور اغلباً لکھنے والوں کو بھی شامل کروں گا تاکہ اس کا کوئی پہلو تشنہ نہ رہ جائے۔ اس مسئلے کا آغاز کرتے ہوئے میں سب سے پہلے ہیفنر سے پہلا سوال یہ پوچھوں گا کہ کیا وہ کسی قسم کے سنسر شپ پر یقین کیا رکھتے ہیں!

ہیفنر: جن معنوں میں آپ نے بات کی ہے، میں کسی سنسر شپ پر یقین نہیں رکھتا۔ کیوں کہ یہ ایک ایسی چیز ہے کہ مواد' موضوع' طرزِ نگارش اور خیالات کو استثنائی صورت دینا ہے جن سے کوئی شخص بھی کسی بھی موقعے پر اختلاف کی گنجائش پیدا کر سکتا ہے۔ جہاں تک میں سمجھتا ہوں' ایک آزاد خود مختار معاشرے میں سنسر شپ کا دو صورتوں میں ہی جواز نکل سکتا ہے۔ پہلی صورت میں ازالۂ حیثیتِ عرفی کے مقدمے کا ثبوت مل چکا ہو جس میں کسی شخص کے بارے میں 'معلومات' حاسدانہ اور ضرر رساں عناصر کو شامل کر کے فراہم کی گئی ہوں۔ دوسری صورت وہ ہے جس میں زبانی' تحریری یا عملی طور پر خطرے کا احساس دلایا گیا ہو اور یہ احساس مادی اور غیر مادی اعتبار سے فحش ہو۔

برنیٹ: اگر کسی تھیئٹر میں کوئی شخص فحاشی کا کھلم کھلا اظہار کر رہا ہے تو کیا وہ آپ پر گراں نہیں گزرے گا!

ہیفنر: اگر یہ فحاشی پروگرام میں شامل ہو جسے دیکھنے کے لیے میں نے پیسے خرچ کیے ہوں تو شاید نہیں۔ لیکن اگر میں اس سے برافروختہ ہو بھی جاؤں تو میں تھیئٹر سے اٹھ کر چلا جاؤں گا۔ ہاں، اگر کوئی شخص جو تھیئٹر دیکھنے والوں میں سے ایک ہو اور وہ فحش باتیں کر رہا ہو یا فحش حرکات کا مظاہرہ کر رہا ہو جس سے کھیل میں مداخلت ہو رہی ہو تو پھر یقیناً دوسری بات ہے۔ اس سے یقیناً میں بھی پریشان ہوں گا اور یہ توقع رکھوں گا کہ ایسے شخص کے ساتھ کچھ کیا جائے۔ لیکن اس 'کچھ' کو میں سنسر شپ کا نام نہیں دے سکتا، بلکہ ایسے شخص پر امن میں خلل انداز ہونے کا الزام لگایا جا سکتا ہے۔

برنیت: اب اس مسئلے کو تحریر، فوٹوگرافی اور فلموں کے حوالے سے دیکھیے۔ کیا آپ یہ سمجھتے ہیں کہ ان شعبوں میں فحاشی اور عریانی پر کسی قسم کا سنسر نہیں لگنا چاہیے!

ہیفنر: معاشرہ کسی چیز پر اُس وقت سنسر لگاتا ہے جب دراصل وہ اس چیز سے خوف زدہ ہوتا ہے امریکا میں ہم 'سیکس' پر سنسر لگاتے ہیں جس سے ہم خوف زدہ ہیں۔ سنسر شپ اصل میں ماضی کے تعصبات' اوہام اور عقائد کی تجدید کا نام ہے۔ سوچنے والی بات یہ ہے کہ کیا ہمارے معاشرے کی جنسی اقدار اتنی مکمل، قیمتی ہیں کہ انھیں اسی طریقے سے برقرار رکھا جائے اور ان کو تحفظ دیا جائے! میں تو اس سے اختلاف کروں گا۔ میں سمجھتا ہوں کہ ہماری جنسی اقدار ہمارے معاشرے کا سب سے کمزور اور بیمار ترین جزو ہیں اور ان اقدار کی تبدیلی ناگزیر ہے اور یہ بھی لازمی ہے کہ ہم ان اقدار کی اچھی طرح چھان بین کریں۔

دراصل اس مسئلے کا سب سے ناقابل فہم اور مسخ کردہ پہلو یہ ہے کہ جنس کی مثبت اقدار کا تعلق کھینچ تان کر گناہ اور شرم کے ساتھ پیدا کر دیا جاتا ہے اور اسی سے سنسر شپ کا جواز اخذ کیا جاتا ہے۔ میں سنسر شپ کا اس لیے مخالف ہوں کہ میں آزاد اور خود مختار معاشرے پر ایمان رکھتا ہوں۔ ہمارے جمہوری طرز حکومت کی بنیادیں ان توانا قدروں پر رکھی گئی ہیں جن کے بارے میں بلا دریغ کہا جا سکتا ہے کہ ایسے نظام میں ہر طرح کے اختلافی خیالات اور اقدار کا آپس میں تبادلہ کیا جا سکتا ہے۔ اگر ہم اپنے آئینی اور جمہوری معاشرے کی بنیادوں کو پیش نظر رکھتے ہیں تو پھر سنسر شپ کا تصور بھی محال ہے۔ کہا جاتا ہے کہ بعض اقسام کا سنسر شپ معاشرے کے لیے سود مند ثابت ہو سکتا ہے۔ لیکن میں اس کی تائید نہیں کر سکتا۔

یہ ایک عجیب اتفاق ہے کہ انتہائی پوچ اور پست درجے کی فحاشی صرف اس ماحول میں ہی جنم لیتی ہے جو شدید ترین دباؤ اور گھٹن کا شکار ہو۔ اس کے برعکس ایک فراخ دل اور کھلے معاشرے میں اس قسم کی پست اور پوچ عریانی اور فحاشی جنم نہیں لے سکتی۔ انگلینڈ میں وکٹورین عہد میں سب سے زیادہ پوچ اور سستا ادب پیدا ہوا کیوں کہ وہاں سنسر شپ نے اس وقت انسان کے مخفی اور دبے جذبات کو ابھار دیا تھا۔ میرا ایمان ہے کہ جنسی اعتبار سے آزاد معاشرے میں فحاشی اور عریانی اپنی تمام تر افادیت کھو بیٹھے گی۔

گیری: میرا خیال ہے کہ ہم ایک نقطہ تک ضرور پہنچ چکے ہیں۔ ہیفنر نے جو جو باتیں کہیں ہیں' اس سے ہمیں اس مسئلے کی حدود کا تعین کرنے میں مدد مل سکتی ہے' کیوں کہ یہ مسئلہ بنیادی طور پر معاشرے کی ساخت اور نوعیت سے تعلق رکھتا ہے' اس لیے ہمیں اس مسئلے کو معاشرے کے ساتھ منسلک کرنا چاہیے جن کا ایک حصہ ہم خود ہیں' اس معاشرے میں ایسے کوئی مسلمہ معیار اور اصول نہیں ہیں جن

ی روشنی میں یہ کہا جا سکے کہ یہ فحاشی ہے' اس میں بدی اور عریانی کے عناصر گھلے ملے ہیں اور یہ چیز ان ناصر سے پاک ہیں۔

برنیٹ میرا خیال ہے کہ......

اوکانر: سپریم کورٹ کا خیال ہے کہ ایسا مسلمہ اصول موجود ہے اور اس نے فحاشی کی تعریف کو معاشرے کے معیار کے مطابق متعین کر دیا ہے۔

گیری: لیکن ہم اسے مسلمہ اصول اور تعریف کا نام نہیں دے سکتے۔

ہیفنر: سپریم کورٹ کے جسٹس مسٹر ڈگلس نے فحاشی کی جو تعریف متعین کی ہے وہ بہت لچک دار اور بہت مشکوک ہے اور پہلی دستوری ترمیم میں اظہار کی جو آزادی دی گئی ہے وہ اس سے متصادم ہے۔ یہ معیار ان شعبوں میں قبول نہیں کیا جا سکتا جہاں مذہب' معاشیات اور سیاست ملوث ہوں۔ اور اہم بات تو یہ ہے کہ ادب جس میں جنس کا اظہار کیا گیا ہو' اس کے لیے کوئی معیار سرے سے بنایا ہی کیسے جا سکتا ہے اصل میں جو سنسر لگا دیا جاتا ہے وہ ایک مخصوص گروہ کی طرف سے عائد کیا جاتا ہے اور یوں معاشرے میں ایسا خلا پیدا کر دیا جاتا ہے جو کسی طرح سے بھی پُر نہیں ہوتا۔

اوکانر: لیکن ایک معیار......

گیری: کوئی نہ کوئی ایک معیار ضرور قائم کرنا پڑے گا ورنہ ہم بات کو آگے نہیں چلا سکیں گے۔

اوکانر: اس سلسلے میں مسلمہ معیار یہ ہو سکتا ہے کہ دیکھا جائے کہ کیا عریانی اور فحاشی درست ہے یا غلط۔

ہیفنر: میں اس سے بھی متفق نہیں ہوں۔ میں اس ضمن میں ایک دو باتیں کرنا چاہتا ہوں۔ ایک بات تو میں یہ ضرور کہوں گا کہ عام طور پر وہ فحاشی جو تحریر میں ان دنوں نظر آتی ہے وہ میرے خیال میں معاشرے کے لیے سود مند ہے۔

اوکانر: کیا آپ کے خیال میں 'پلے بوائے' فحش ہے؟

ہیفنر: نہیں۔ میں نے جو سنجیدہ سوال اٹھایا ہے 'پلے بوائے' اس کی حدود سے کہیں پیچھے ہے۔ وہ سوال 'پلے بوائے' کے پبلشر کا نہیں بلکہ ایک ایسے فرد کا ہے جو ایک آزاد معاشرے میں زندہ رہنا چاہتا ہے۔ میں ایک آزاد معاشرے پر ایمان رکھتا ہوں اور یہی وہ معاشرہ ہے جس میں زندگی گزارنا چاہتا ہوں۔

اوکانر: لیکن کیا یہ معاشرہ ہی نہیں ہوتا جو حکومت کو چلاتا ہے اور سنسر شپ اور دوسرے قواعد کو نافذ کرتا ہے! ہم اپنے معاشرے میں جب دوسری پابندیوں کو قبول کرتے ہیں تو سنسر شپ کو کیوں قبول نہیں کرتے! ہمارے معاشرے میں شادی' طلاق اور دوسری شادی اور اسی قسم کے کئی امتناعی قوانین بھی

تو موجود ہیں۔

ہیفنر: میرا خیال ہے کہ ہمیں آزادی اظہار، تحریر اور پریس کی آزادی اور برتاؤ کی آزادی میں جو فرق ہے اسے ملحوظ رکھنا ہوگا۔ یہ دونوں ایک ہی چیز نہیں۔ ہمیں اپنی وسیع تر آزادی کے لیے دوسروں کے خیالات، خواہ وہ ناپسندیدہ اور غیر معقول ہی کیوں نہ ہوں، قبول کرنا ہوں گے۔ عملی دنیا میں ہم دیکھتے ہیں کہ جمہوریت بھی متضاد اور متصادم نظریات اور خیالات سے توانائی حاصل کرتی ہے اور یہ تاریخ، معاشرے اور سائنس کے حوالے سے ہم یہ جان چکے ہیں کہ وہ اخلاقی سچائی جو ایک دور میں قابل قبول تھی، دوسرے دور میں اسے قبول نہیں کیا گیا۔ اسی طرح ایک دور میں جس چیز کو رد کیا گیا کچھ عرصے بعد اسی کو گلے لگا لیا گیا ہے۔

نیئم: ہاں، لیکن ہمارے اپنے زمانے میں ہنری ملر کے ناول 'ٹراپک آف کیپری کورن' کو ضبط کیا گیا، اور لوگ اسے اسمگل کر کے اس ملک میں لاتے رہے۔

اوکانر: اس سلسلے میں جیمز جوائس کے ناول 'یولیسز' کی مثال بھی دی جا سکتی ہے۔

نیئم: یا 'فینی بل' قسم کی کتابیں جنھیں لوگوں نے فوری طور پر قبول کر لیا اور اب یہ کتابیں عام کتب فروش بیچتے ہیں اور ہر جگہ سے دستیاب ہیں۔

ہیفنر: اس سے تو میں یہ سمجھتا ہوں کہ ہمارا معاشرہ زیادہ وسیع، زیادہ آزاد اور زیادہ بردبار ہوتا جا رہا ہے۔

برنیٹ: اصل میں ہمیں فحاشی اور عریانی کی وہ تعریف وضع کرنی چاہیے جو عمومی طور پر سب کے لیے قابل قبول ہو سکے۔

ہیفنر: ایک شہوت انگیز فلم جس میں ایک جوڑے کو بالتفصیل حالت مجامعت میں مختلف انداز میں دکھایا گیا ہو، فحاشی ہے، کیوں کہ دیکھنے والے اس سے جنسی طور پر مشتعل ہوں گے اور انھیں ترغیب ملے گی۔ یا کوئی ایسی تصویر (فوٹوگراف) جس میں کہ مجامعت کو اشتعال انگیز انداز میں دکھایا گیا ہو یا ایک کتاب جس کا مقصد وہی ہو جو ایک عریاں اور بلیو فلم کا ہوتا ہے۔ لیکن ایک ایسی کتاب جس کے کچھ حصے شہوت کو حقیقت پسندی سے پیش کر رہے ہوں فحش قرار نہیں دی جا سکتی۔ شہوانی حقیقت پسندی ایک حقیقت ہے اور فحاشی اس سے بالکل مختلف چیز ہے۔ جہاں تک میں سمجھتا ہوں اس سے زیادہ فحاشی کی سادہ تعریف نہیں کی جا سکتی……

ماخذ (اردو۔۹۳)

احتساب: ریاستی اور وفاقی

این رین

میں ایک عرصے سے کہتی چلی آئی ہوں کہ سرمایہ داری کے مبینہ حامیوں کی دانشورانہ کوتاہیوں کی بنا پر ریاستیت بلا مقابلہ جیت پر ہے اور یہ کہ آزادی اور سرمایہ داری اپنی ایک مضبوط اور فلسفیانہ اساس سے محروم ہے۔ مزید برآں، آج کے قدامت پرستوں کے بنیادی دعوے وہی ہیں جو کہ آج کے لبرلز کے ہیں۔ اس طرح ان باتوں نے ریاست پسندی کی راہ ہموار کرلی ہے۔ میں یہ بات بھی بار بار دہراتی ہوں کہ (اخلاقی) پابندیوں کے خلاف جنگ کی نوعیت بنیادی طور پر فلسفیانہ ہے اور اسے گھٹیا طریقوں سے جیتا نہیں جاسکتا اس لیے کہ یہ فلسفہ ہی ہے جو بشمول سیاست، تمام تر انسانی وجود پر حکم رانی کرتا ہے۔

مگر فلسفہ وہ علم ہے جس کا معاملہ وسیع ترین تجریدات سے ہے اور اس لیے اکثر لوگ اس کے اثرات دیکھ نہیں پاتے یا پھر انھیں یہ معلوم نہیں ہوتا کہ وہ اس عمل کو اپنی گرفت میں کس طرح لائیں گے جس کے ذریعے فلسفہ ہماری روزمرہ کی زندگی پر اثر انداز ہوتا ہے۔ بہرحال، ایک حالیہ واقعہ اس عمل کی نشان دہی کرتا ہے کہ عملی طور پر فلسفہ کس طرح اثر انداز ہوتا ہے جو قدامت پرست اور لبرل نظریات کی ماہیت (اور ان کے تناقصات) بھی ہمارے سامنے لاتا ہے۔ اس واقعے سے میری مراد سپریم کورٹ کا وہ فیصلہ ہے جس میں عریانی کے پانچ (حالیہ) مقدمات شامل ہیں۔

۲۰ر نومبر ۱۹۷۲ء کو میں نے صدر نکسن کی طرف سے سپریم کورٹ کے چار ججوں کے تقرر پر اظہار خیال کیا تھا حالاں کہ اس وقت مجھے اُن کے خیالات کی صحیح نوعیت سے آگہی نہ تھی، لیکن میں نے کہا تھا کہ: 'اگر وہ اپنی بھاری ذمے داریوں کے نبھانے میں کامیاب رہتے ہیں تو ہم نکسن کی کئی اور کم زوریوں کو معاف بھی کر سکتے ہیں کیوں کہ اس ملک میں سپریم کورٹ ہی فلسفیانہ اثرات کے باقیات کی آخری بچی کھچی نشانی رہ گئی ہے۔ کم و بیش کوئی ایک سال گزر جانے کے بعد آج اس بات کے اچھے خاصے شواہد ہمارے سامنے آگئے ہیں کہ نکسن کو معاف کر دینے کی کوئی دانش ورانہ بنیادیں باقی نہیں بچیں۔ کیوں کہ متضاد صغریٰ کبریٰ کا اختتام باہم متضاد کارروائیوں پر منتج ہوتا ہے، یہ ناممکن نہیں کہ سپریم کورٹ کے بعض فیصلے روادارانہ قسم کے ہوں۔ مثال کے طور پر، عدالت نے اسقاط کو قانونی

قرار دے کر نہ صرف عدل و انصاف کا بول بالا رکھا بلکہ انفرادی حقوق کا بھی تحفظ کیا۔ فیصلے میں جس استدلال سے کام لیا گیا اس سے تو میں متفق نہیں ہوں مگر جو نتیجہ سامنے آیا اس کی میں پر جوش تائید کرتی ہوں، یعنی اس بات کا اعتراف کہ عورت کے بدن پر اس کا اپنا حق ہے۔ مگر عریانی کے بارے میں عدالت کا موقف اس کے بالکل برعکس ہے کیوں کہ احتساب کی قانونی اور دانش ورانہ بنیاد قائم کر کے، اس بارے میں کسی بھی مرد (یا عورت) کو اس کے اپنے ذہن کے استعمال کا حق دینے سے انکار کیا گیا۔

قبل اس کے کہ میں اس فیصلے پر گفتگو کروں، میں ریکارڈ کی درستگی کی خاطر یہ بتا دینا چاہتی ہوں کہ جسے، یک سر یا ظاہر و باہر فحش نگاری کہا جاتا ہے اس کے بارے میں میری اپنی رائے کیا ہے۔ تو میں اسے ناگفتہ بہ حد تک کراہیت انگیز سمجھتی ہوں۔ میں نے کبھی نہ اس قسم کی کوئی کتاب پڑھی ہے اور نہ اس قسم کی کوئی فلم کبھی دیکھی اور نہ ہی اس طرح کا کوئی ارادہ ہے۔ اس بارے میں اپنی ایک رائے قائم کرنے کے لیے قانونی مقدمات میں، آج کل کی 'گوارا' قسم کی فحش نگاری کے تذکرے میرے لیے کافی ہیں۔ فحش نگاری کے بارے میں میری رائے کی وجہ، عام رایوں سے بالکل برعکس ہے۔ میں 'سیکس' کو برا نہیں سمجھتی، میں اسے زندگی کے اہم ترین پہلوؤں میں سے ایک کے طور پر، اچھا، سمجھتی ہوں، اور اتنا اہم کہ جسے، تشریحی طور پر ایک موضوع بنایا جا سکتا ہے۔ مگر یہاں مسئلہ، سیکس کے بارے میں اپنی ذاتی رائے کا نہیں۔ یہاں تو مسئلہ درپیش ہے کہ آزادیٔ اظہار اور پریس کی آزادی کا یعنی اس حق کا کہ کوئی بھی شخص، کوئی بھی رائے دے سکتا ہے اور اس کا اظہار بھی کر سکتا ہے۔ فحش نگاری فراہم کرنے والوں اور ان کے گاہکوں پر عائد شدہ پابندیوں کے لیے لڑنا کوئی ولولہ انگیز بات تو نہیں، مگر ریاستیت کی طرف عبور میں، انسانی حقوق کے ہر تجاوز کی ابتدا، ایک حق کے سب سے کم حق دار کو کچلنے سے ہوتی ہے اور اس مقدمے میں بھی، مجرموں کا گھناؤنا نوعیت کا جرم، اس ایک اصول سے وفا کرنے والوں کے لیے ایک کڑی آزمائش کا درجہ رکھتا ہے۔

۲۱ جون ۱۹۷۳ء کو عریانی کے جن پانچ مقدمات کے بارے میں فیصلہ ہوا، اس میں سپریم کورٹ کے پانچ اراکین ایک طرف تھے اور چار دوسری طرف۔ ہر مقدمے میں اکثریتی فیصلہ چیف جسٹس برجر نے لکھا جن کے ساتھ چاروں جسٹس صاحبان یعنی بلیک من، پاول اور رین کوسٹ (نکسن کے مقرر کردہ) اور (کینیڈی کے مقرر کردہ) جسٹس وہائٹ شامل تھے۔ اختلافی نوٹ جسٹس بریتان نے لکھا جس میں جسٹس اسٹیورٹ اور جسٹس مارشل شامل تھے۔ جسٹس ڈگلس نے، ہر مقدمے میں اپنا ایک الگ اختلافی نوٹ لکھا۔ ان مقدمات میں دو اہم ترین مقدمات ہیں، میلر بمقابلہ کیلی فورنیا اور پیرس ایڈلٹ تھیٹیز بمقابلہ سلیٹون۔

میلر کے مقدمے میں کیلی فورنیا کا ایک ایسا شخص ملوث تھا۔ جسے کھلم کھلا جنسی مواد جس میں

فحش کتابوں کی تشہیر تھی ارسال کرنے کے الزام میں سزا ہوئی تھی۔ اسی مقدمے کا فیصلہ سناتے ہوئے جسٹس برجر نے فحش مواد کی جانچ پڑتال کے لیے ایک نیا معیار پیش کیا تھا اور وہ یہ تھا کہ عریانی کی حقیقت کو ثابت کرنے والے کا بنیادی رہنما اصول یہ ہونا چاہیے کہ (الف) آیا ایک اوسط آدمی، مروجہ معاشرتی معیار کو سامنے رکھتے ہوئے، اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ زیر بحث عریاں مواد، بہ حیثیت مجموعی، مریضانہ جذبات ابھارتا ہے۔ (ب) آیا یہ مواد ان جنسی طور طریقوں کی جن کی بالخصوص تعریف کردی گئی ہے اور جن پر ریاستی قوانین کا اطلاق ہوتا ہے' نفرت انگیز طور پر تصویر کشی کرتا ہے اور (ج) آیا کہ موادِ زیرِ بحث میں سنجیدہ ادبی، فنی، سیاسی یا علمی قدر و قیمت کا سرے سے فقدان ہے۔

اس معیار کی اساس سپریم کورٹ کے سابقہ فیصلے ہیں، رُوتھ بمقابلہ ریاست ہائے متحدہ، ۱۹۵۷ء، نو سال بعد ۱۹۶۶ء میں، میموئرز بمقابلہ میسی چوسٹس، کے مقدمے کے دوران سپریم کورٹ نے ایک اور معیار پیش کیا تھا: 'کسی کتاب پر اس وقت تک پابندی نہیں لگائی جا سکتی جب تک کہ وہ سماجی طور پر قابلِ تلافی خوبیوں سے بالکل عاری نہ ہو'۔ یہ تو اپنی جگہ ایک بری بات تھی مگر فیصلے نے تو اس مختصر نقطہ نظر کو بھی تاکیداً رد ہی کر دیا اور اس کی بجائے خود اپنا ایک نہایت ہی ہولناک معیار پیش کر دیا یعنی: آیا کہ زیرِ بحث مواد میں' سنجیدہ ادبی، فنی، سیاسی یا علمی قدر و قیمت کا سرے سے فقدان ہے'۔

مجموعی طور پر، دیکھا جائے تو یہ معیار، بشمول جسٹس برجر کے فیصلے کے، اخلاقی نقطہ نظر سے، اجتماعیت کی ایک پکار ہے، سیاسی طور پر نہ سہی، مگر خصوصی طور پر، اخلاقی اجتماعیت کے نقطہ نظر سے آپ نے دیکھا جو کوئی لکھے، شائع کرے، پڑھے یا دیکھے اس پر پابندی عائد کرنے کے لیے ایک اور فرد کے ذہن پر جس عقلی معیار کی حکمرانی تھوپی جا رہی ہے وہ ہے: مروجہ معاشرتی معیار کی روشنی میں ایک اوسط درجے کے آدمی کا فیصلہ، مگر ایسا کیوں' اس بارے میں کوئی وجہ نہیں بتائی جاتی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اجماع کی رائے کو، بلا حیل وحجت تمام اقداری فیصلوں کے منبع، جواز اور معیار کے طور پر تسلیم کر لیا جائے۔

معاشرہ کیا ہے، اس کی کہیں تعریف نہیں کی گئی، لہٰذا وہ کوئی مملکت، کوئی شہر کوئی گرد و نواح یا پھر وہ بلاک جس میں آپ رہتے ہوں، کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ پھر یہ معاشرتی معیار کیا ہیں، ان کی بھی کوئی تعریف نہیں کی گئی۔ حقیقت تو یہ ہے کہ معاشرتی معیار، بمقابلہ منفرد شہریوں کے اپنے اپنے معیاروں کا نتیجہ ہوتے ہیں، محض اتفاقات، غفلت، منافقت، مستعملیت، بے تعلقی، خوف، مقامی خدائی فوجداروں یا پھر بے وقعت، طاقت کے بھوکوں کی کارستانیوں اور کبھی کبھی ماضی کے کسی بڑے ذہن سے ورثے میں ملی ہوئی شریفانہ اقدار کی رسمی قبولیت کا مگر سپریم کورٹ کے اس فیصلے کے تحت، ہر ایک بڑے دماغ کو مجرم قرار دیا جا رہا ہے۔

یہ 'اوسط' آدمی کون ہے' اس کی کہیں وضاحت نہیں ملتی۔ کچھ اشارے ملتے ہیں کہ اوسط آدمی

سے مراد ایک ایسا آدمی ہے جو جنسی طور پر نہ تو بہت زیادہ حساس ہے اور نہ بالکل ہی بے حس مگر جنسی لحاظ سے اوسط آدمی کی تلاش اپنے سے کہیں زیادہ بعید از قیاس اور ناممکن قسم کی ذمے داری ہے بہ نسبت اس کے کہ دوسری انسانی خصوصیات کے حامل اوسط آدمی کی تلاش کی جائے۔ اور پھر یہ بھی تو ہے کہ خود سپریم کورٹ کے فیصلے کا منشا بھی یہ نہیں۔ فیصلہ تو صرف 'اوسط' کی بات کرتا ہے یعنی اس مسئلے کے مطابق اوسط، جس پر فیصلہ دیا گیا ہے، ذہنی طور پر اوسط، ذہانت میں اوسط، قابلیت میں، خیالات و تصورات میں، اپنے احساسات کے طور پر، اور اپنے مذاق کے لحاظ سے جس کے معنی ہوں گے، اہمیت و حیثیت سے عاری، ایک لکیر کا فقیر، اس 'اوسط' آدمی کا وجود ثابت کرنے والے کسی بھی دعوٰی کے لیے یہ ضروری ہے کہ چوٹی کے افراد اور نچلی سطح کے تمام لوگوں کو بھلا دیا جائے، یعنی بہترین اور بدترین دونوں قسم کے لوگوں کو۔ اس طرح ایک جوہر قابل اور ایک گھامڑ کے بیچ کا فرق خود بخود ختم ہو جاتا ہے یا ممنوع قرار دے دیا جاتا ہے۔ اور پھر ان دونوں قسم کے حضرات سے کہا جاتا ہے کہ وہ اپنے سارے خیالات و نظریات اوسط آدمی کے تابع کریں۔ آخر اس 'اوسط' آدمی کو اتنی تعجب خیز رعایت کیوں دی جا رہی ہے، صرف اس لیے کہ اسے اپنے طور پر کوئی خصوصی اعزاز حاصل نہیں! ظاہر ہے کہ سوائے نظریہ اجتماعیت کے، اس کا کوئی اور جواز نہیں اور یہ نظریہ خود اپنی جگہ بلا جواز ہے۔

عدالت نے اپنے فیصلے میں بار بار جتایا۔ صرف جتایا کہ اس حکم کا اطلاق محض یک سر عریانی و نخش نگاری پر ہوگا یعنی کہ بعض ایسے خیالات جن کا تعلق سیکس سے ہے، کسی اور قسم کے خیالات سے نہیں، اس اصرار کے ساتھ کہ دیگر قسم کے خیالات کو پہلی ترمیم، کے تحت تحفظ حاصل ہے جب کہ جنسی خیالات کے اظہار کو یہ تحفظ حاصل نہیں۔ ایک بات تو یہ ہے کہ ان دو اقسام کے مابین خطِ امتیاز کھینچنا ممکن ہے (جس پر ہم بعد میں گفتگو کریں گے) اس کے علاوہ خود اسی فیصلہ کے متن میں اس امتیاز کی تردید موجود ہے: فیصلہ کرنے والے جج صاحبان کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اس بات کو طے کریں کہ آیا زیر بحث مواد میں موجود جنسی عنصر میں سنجیدہ ادبی، فنی سیاسی یا علمی قدر و قیمت کا فقدان ہے کہ نہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا (اور اس کا کوئی دوسرا مطلب نہیں) کہ حکومت کو یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ ادبی، فنی، سیاسی یا علمی قدر و قیمت کے بارے میں فیصلہ کرے اور اسی کے مطابق ایسے کاموں کی اجازت دے یا پھر ان پر پابندی عائد کرے۔

ایک بار جب یہ طے ہو گیا کہ حکومت کو اختیار حاصل ہے، پھر اس اختیار کے مبینہ حدود، اور یہ شرائط کہ یہ اختیار کب، کہاں اور کون استعمال کرے گا، ان باتوں کی کوئی خاص اہمیت باقی نہیں رہ جاتی۔ اس لیے کہ باقی امور کے لیے صرف تفصیل اور وقت درکار ہوتا ہے۔ موجودہ سپریم کورٹ تو شاید، معاشرے کی مرضی کی بنیادوں پر، محض جنسی مواد پر جنسی پابندی لگانا چاہتا ہے۔ پھر مستقبل کی عدالت

یں، علمی مباحثوں سے ناپسندیدہ گفتگو پر لگانا چاہے، اور پھر ایک اور عدالت سیاسی مباحثوں پر اور پھر یک سال بعد تمام میدانوں میں ہر قسم کے مباحثوں پر پابندی لگادے کیوں کہ قانون تو مسلمہ نظائر سے نطقی نتائج اخذ کرنے ہی کا ایک عمل ہے۔

’اوسط‘ آدمی کے مروجہ معاشرتی معیار کا اصول رُوتھ کیس کے دوران وضع کیا گیا تھا، مگر سماجی افادیت کی قدروں کے سراسر فقدان کا معیار تو اتنا مبہم ہے کہ اس سے کوئی فوری خطرہ ہی نہ تھا کہ کسی بھی چیز یا کام کے لئے یہ دعویٰ کیا جاسکتا ہے کہ اس میں کچھ نہ کچھ سماجی افادیت موجود ہے، لہٰذا، منطقی طور پر، اس نظیر کی بنیاد پر حالیہ عدالت نے احتساب کی جانب قدم اُٹھایا۔ اس طرح حکومت کو چار مخصوص ذہنی میدانوں میں سپرداری کے ساتھ ساتھ یہ اختیار بھی مل گیا کہ وہ ان میدانوں میں ہونے والے کاموں کے بارے میں بھی یہ طے کرے کہ آیا ان میں کوئی سنجیدگی ہے کہ نہیں۔

’سنجیدگی‘ ایک غیر سنجیدہ معیار ہے۔ یہ کون طے کرے گا کہ کیا سنجیدہ ہے، کس لئے اور کس معیار کے مطابق، کیوں کہ اس بارے میں کوئی تعریف موجود نہیں۔ فرض ہی کرنا پڑے گا کہ معیار جس کا اطلاق ہونا ہے، وہی ہے جن کو رہنما اصولوں کی صورت میں پیش کیا گیا ہے۔ عین سنجیدہ وہی ہے جسے ایک آدمی سنجیدہ سمجھتا ہے۔ کیا آپ تصور بھی کر سکتے ہیں کہ اس اوسط آدمی کو احتساب کی اعلیٰ ترین سند تسلیم کرنے کے ادب پر فنونِ لطیفہ پر، سیاسیات پر، علم پر کیا کیا اثرات مرتب ہوں گے! ایک ایسی سند جس کا فرمان بزورِ قوت نافذ کیا جائے گا اور جس کے تحت یہ فیصلہ ہوگا کہ علم کے ان میدانوں میں کن چیزوں پر پابندی لگے گی اور کون سی آزاد ہوں گی! میں نہایت انکساری کے ساتھ عرض کروں گی کہ میرے نزدیک تو اس طرح کا امکان ہی اخلاقی طور پر، کسی فحش فلم سے بھی کہیں زیادہ بے ہودہ ہے۔

ان علمی میدانوں میں سے کیس کا ایک بھی کوئی بھی درجہ اوّل کا ذہن، اس طرح کے معیاروں اور اس طرح کی مقتدرہ کی حاکمیت کے تحت کام کرنے سے انکاری ہوگا، چاہے اس مقتدرہ میں دنیا کے بہترین دماغ ہی کیوں نہ شامل ہوں۔ چہ جائے کہ وہ مقتدرہ ہی اوسط دماغوں سے بھری ہوئی ہو۔ اور پھر جتنا بڑا ذہن ہوگا، اتنی ہی شدت سے انکار ہوگا۔ اور جو لوگ اس بات پر رضا مند ہوں گے، ان کے بارے میں کیا کہا جائے! ذرا اس حقیقت کی اخلاقی ستم ظریفی تو دیکھئے کہ آج اس قسم کے لوگوں کی ایک بڑی تعداد موجود ہے اور عام طور پر ان سے نفرت کی جاتی ہے۔ یہ سب کے سب کرائے کے ٹٹو ہیں۔ ٹکٹ گھر کی کامیابی کے متمنی ایسے لوگ جو روپیہ کمانے کی خاطر عوام کو وہ کچھ دیتے ہیں جو عوام مانگتے ہیں۔ بظاہر تو ذہنی قحبگی، جس میں خودغرضی کی نیت سے ملوث ہوا جائے ایک برائی ہے لیکن اگر اسے معاشرے کی ’اخلاقی پاکیزگی‘ کی خاطر قبول کرلیا جائے تو یہی ذہنی قحبگی ایک فضیلت بن جاتی ہے۔

عریانی کے پانچ اور مقدمات (ریاست ہائے متحدہ بمقابلہ ۱۲۲۰۰ فٹ ریل آف سپر ۱۱۸ ایم ایم فلم) میں خود چیف جسٹس برجر نے، مگر ایک بالکل ہی مختلف سیاق وسباق میں، اس خطرے کا ذکر کیا ہے، جو کسی بھی نظیر کے منطقی مضمرات سے پیدا ہوتا ہے۔ وہ فرماتے ہیں: 'کسی قانونی ضابطے کی ارتقائی تکمیل کی زنجیر میں پیش قدمی کی گم راہ کن معقولیت، اکثر اوقات، تیسری، چوتھی بلکہ پانچویں گم راہ توسیع تک پہنچنے پر بھی سمجھ میں نہیں آتی۔ ہر قدم اٹھتے وقت یوں لگتا ہے جیسے وہ پچھلے قدم کی مطابقت میں ہے۔ حالاں کہ مکمل یا آخری نتیجہ جو سامنے آتا ہے، وہ ہوتا ہے جس پر پہلی نظر میں سنجیدگی سے غور ہی نہیں کیا گیا تھا۔ اس طرح کا حامل رجحان 'خط کھینچنے' کا متقاضی ہے، جیسا کہ عدالتی کاروائیوں اور قانون سازی کے دوران ہوتا ہے: 'اتنی دور تک سہی، مگر آگے نہیں'۔ میری دلیل یہ ہے کہ چوں کہ قانونی ضابطہ ایک اصول ہے اس کے منطقی نتائج کی نشوونما کو ختم نہیں کیا جا سکتا، بجز اس کے کہ اصول ہی کو منسوخ کر دیا جائے۔ لیکن اگر یہ فرض کر لیں کہ ایسی منسوخی ممکن ہے۔ میلر کے مقدمے میں اس طرح کا کھینچا ہوا کوئی خط نظر نہیں آتا بلکہ جنسی معاملات میں اوسط ذہن کے آدمی کے مروجہ معیار ہی کو صریحاً مقتدرہ اعلیٰ تسلیم کیے جانے کا اعلان ملتا ہے۔ میلر کے اس مقدمے میں، چیف جسٹس برجر نے اس بات کا اعتراف کیا کہ اس طرح کا کوئی خط نہیں کھینچا جا سکتا: 'پہلی ترمیم کی رو سے، یہ طے کرتے وقت کہ آیا بیان کردہ مواد حقیقتاً عریاں ہے کہ نہیں، جیوری کے لیے یہ ضروری نہیں کہ وہ فرضی اور ناقابل تحقیق قسم کے 'قومی معیار' پر غور کرتی رہے۔ اس سلسلے میں وہ اس سے پہلے کے ایک اور مقدمے میں جسٹس وارن کے یہ الفاظ نقل کرتے ہیں: 'میں مانتا ہوں کہ ایسا کوئی قومی معیار نہیں ہے جس سے ثابت کیا جا سکے۔ بہر صورت، یہ عدالت ایسا کوئی معیار پیش نہیں کر سکی اور یہ توقع بھی بعید از عقل ہے کہ مقامی عدالتیں اس بارے میں پیش گوئی کر سکیں گی'۔

آخر وہ کون سے ذرائع ہیں جن سے مقامی عدالتیں، اس مسئلے میں کوئی پیش گوئی کر سکتی ہیں! واقعتاً عریانی سے متعلق قابل ثبوت معیار وہ ہوگا جو معروضی ہوگا اور جسے فلسفیانہ طور پر پرکھا جا سکے اور تمام لوگوں پر لاگو کیا جا سکے۔ قانون کے لحاظ سے ایسے معیار کی نہ تو تعریف کی جا سکتی ہے اور نہ ہی اسے نافذ کیا جا سکتا ہے۔ اس کے لیے تو ایک پورے فلسفیانہ نظام کے تشکیل کی ضرورت ہوگی۔ لیکن ایسا معیار کبھی بھی، کسی کو یہ حق نہیں دے گا کہ اسے دوسروں پر طاقت کے ذریعے تھوپا جائے۔ لیکن جب کوئی عدالت، 'قابل ثبوت قومی معیار'، کی بات کرتی ہے تو اس سے مراد معروضی معیار نہیں ہوتا۔ بلکہ وہ معروضی کی بجائے، اجتماعی کی بات کرتی ہے اور منشا اس کے قوم کے اوسط لوگوں کے معیار کے اعلان کا ہوتا ہے۔ چوں کہ ایسے کسی تصور کا اندازہ بھی صریحاً ناممکن ہوتا ہے اس لیے عدالت یہ نتیجہ اخذ کرتی ہے کہ جو کچھ، قومی سطح پر ناممکن ہے (اور بے محل بھی) وہ مقامی (ریاستی) طور پر روا ہے۔ اور اس طرح عملاً وہ اپنی

ذمے داری ریاستی قانون سازوں کے حوالے کر دیتی ہے، اس اختیار سمیت کہ وہ ان من مانے (نا قابلِ ثبوت) مقامی معیاروں کا نفاذ بھی کر سکے۔

میلر کے مقدمہ میں چیف جسٹس برجر کے دلائل کچھ زیادہ مؤثر نہیں، وہ فرماتے ہیں کہ: ’یہ نہ تو کوئی حقیقت پسندانہ اور نہ ہی دستوری طور پر مستحکم بات ہوگی کہ ہم پہلی ترمیم کا یہ مطلب نکالیں کہ میں یا مسی سپی کے لوگ وہی قبول کریں جو لاس ویگاس یا نیو یارک کے رہنے والوں کے لیے گوارا ہے‘۔ میری دانست میں پہلی ترمیم کے مطابق کسی شخص کے لیے یہ ضروری نہیں کہ وہ کوئی ایسی بات قبول کرے جسے وہ نہ تو پڑھنا چاہتا ہے اور نہ دیکھنا چاہتا ہے مگر اسے اس بات کی بھی ممانعت نہیں کی گئی کہ وہ ان لوگوں کے حقوق آزادی کی تنسیخ کرے جو یہ چیزیں پڑھنا اور دیکھنا چاہتے ہیں۔ ایک اور دلیل جو قومی معیار کے مطابق فحاشی کیا ہے‘ کے خلاف دی گئی ہے‘ کے بارے میں یہ فیصلہ کہتا ہے کہ: ’مختلف ریاستوں میں لوگوں کے مذاق اور رویے مختلف ہیں اور نافذ کردہ یکسانیت کے ذریعہ اس تنوع کا گلا نہیں گھونٹا جا سکتا‘ تو پھر اسی ریاست ہی کی حدود میں نافذ شدہ یکسانیت کے بارے میں کیا کہا جائے گا! اور ان کے بارے میں کیا خیال ہے جو لکیر کے فقیر نہیں! مختلف ریاستوں کے باشندوں کے مابین ابلاغ کے بارے میں کیا ہوگا! اور خیالات کے ’قومی بازار‘ کی آزادی کا کیا بنے گا! ان سوالات کے جوابات ہمیں نہیں ملتے۔

پھر حاشیے پر پائی جانے والی یہ دلیل کسی بھی سنجیدہ ٹریبونل کے شایانِ شان نہیں ہو سکتی:

’صرف اس بنا پر کہ کسی ایک ہی مواد کے بارے میں، مختلف جیوریاں مختلف نتائج پر پہنچ سکتی ہیں، اس کے معنی یہ نہیں کہ دستوری حقوق کم کر دیے گئے ہیں۔ جیسا کہ اس عدالت نے رُوتھ بمقابلہ ریاست ہائے متحدہ میں کہا ہے کہ یہ ایک عام تجربے کی بات ہے کہ کسی ایک ہی فوج داری ضابطے کے بارے میں مختلف جیوریاں، مختلف نتائج پر پہنچیں ہیں۔ (مگر یہ تو) ہمارے جیوری نظام پر چلنے کا ایک ثمرہ ہے‘۔ فوج داری مقامات میں جیوری کے ذمے صرف یہ کام ہوتا ہے کہ وہ یہ طے کرے کہ آیا کوئی ایک مخصوص مدعا علیہ اس ایک جرم کا مرتکب ہوا ہے کہ نہیں جس کی واضح تعریف میں موجود ہے۔ (اس کے برعکس) عریانی کے نئے ضابطے کے مطابق جیوری کو یہ طے کرنا ہوگا کہ آیا مدعا علیہ سے وہ جرم سرزد ہوا ہے کہ نہیں جس جرم کی تعریف نہیں کی گئی اور ساتھ ہی ساتھ یہ بھی طے کرنا ہوگا کہ وہ جرم ہے کیا!

اس لحاظ سے صدر نکسن کا احتسابی اختیارات کی شراکت کی غرض سے، سارے ملک میں اس کے بے سوچے سمجھے پھیلاؤ کا تصور بھی اتنا ہی خیالی ہے جتنا کہ مالی شراکت کے ذریعے ان کا ریاستوں کو اختیارات واپس کرنے کا تصور۔ ایک طرف تو مقامی (ریاستی) احتساب کی چوں چوں کرتی ہوئی ریل گاڑی میں سوار عوام کبھی پٹری سے اترتی ہوئی اور کبھی دیر میں پہنچتی ہوئی اور ہر چھوٹے اسٹیشن پر رکتی

ہوئی، ریل گاڑی میں اپنا سفر طے کر رہے ہیں تو دوسری طرف ریاستیت کی تیز رو اپنی پوری رفتار سے ایک صاف ستھری پٹڑی پر بھاگی چلی جا رہی ہے۔

وہ چار جج صاحبان جو میلر کے مقدمہ کے فیصلے میں شامل تھے، انھیں قدامت پسند تسلیم کیا جاتا ہے۔ پانچویں جج، مسٹر وہائٹ درمیانہ روی کے قائل مانے جاتے ہیں۔ دوسری جانب، جسٹس ڈگلس سب سے زیادہ لبرل اور اپنے بائیں جانب جھکاؤ کے لئے مشہور ہیں اور اس کے باوجود بھی ان کا اختلافی نوٹ، احتجاج اور جائز خفگی کی ایک جذباتی پکار معلوم ہوتا ہے جو اس خیال کو رد کر رہا ہے کہ پہلی ترمیم، سے عریانی کے معاملے میں استثنا کا مفہوم نکلتا ہے۔ وہ کہتے ہیں: 'میں سمجھتا ہوں کہ ایسا نہیں۔ اور اس بارے میں اپنے خیالات کو بار بار دہراتا ہوں'۔ پھر فرماتے ہیں کہ: 'عریانی جس کی ہم ٹھیک سے تعریف بھی نہیں کر سکتے، ایک طرح کی کھچڑی ہے۔ لوگوں کو ایسے معیاروں کی خلاف ورزی کرنے پر جیل بھیجنا جسے وہ سمجھ نہیں سکتے، جس کا مطلب نہیں نکال سکتے، جس کا اطلاق نہیں کر سکتے، اور وہ بھی ایک ایسی قوم کے لئے جو غیر جانب دارانہ مقدمے اور ایک مناسب طریق عمل پر ایمان رکھتی ہو، ایک بھیانک سی بات ہے'۔

تو پھر ان خلاف ارتکاز قوانین کے بارے میں کیا کہا جائے گا جو اس قسم کی بھیانک باتوں کے ذمے دار ہیں! جسٹس ڈگلس ان باتوں کا ذکر کرتے مگر یہ سب کچھ خلاف ارتکاز ہی کا مسئلہ ہے جسے آج ہمیں بھگتنا پڑ رہا ہے۔ بہرحال جسٹس ڈگلس، احتساب کے بارے میں، خطیبانہ حد تک باوضع ہیں، کہتے ہیں: 'یہ تصور کہ پہلی ترمیم، ایسے خیالات کو سزاوار سمجھتی ہے جو کسی خاص جج یا جیوری ممبر کے لئے ناگوار ہوں، حیران کن ہے۔ زبان و ادب کا اس سے بڑا ہموار کرنے والا اور کوئی نہیں۔ محتسب کو ایسے اختیارات سونپنا، جیسا کہ آج کل ہم کر رہے ہیں، ایک آزاد معاشرے کی روایات سے انحراف ہے۔ پہلی ترمیم، اس لئے نہیں گھڑی گئی تھی کہ اس سے سکون آور گولیاں مہیا کرنے کا کام لیا جائے، اس کا اولین کام یہ تھا کہ وہ 'ناپسندیدہ' اور 'متحمل مزاجوں' کے مابین مباحثہ جاری رکھے۔ ساری تاریخ پڑھ جایئے، یہی رجحان ملتا ہے کہ فرد کو زیر کیا جائے اور حکومت کی قوت میں اضافہ کیا جائے۔ معیاری و جارحانہ اقدام کے استعمال سے حکومت کو ایسا اختیار مل جاتا ہے جو پہلی ترمیم کی جڑیں کاٹ کر رکھ دیتا ہے۔ جیسا کہ عدالت کی رائے سے پتا چلتا ہے، ہمارے سامنے کا مواد ممکن ہے کچرا ہی ہو، مگر پھر، سیاسی معرکوں، اخبارات، ٹی وی اور ریڈیو پر بھی تو یہی کچرا نظر آتا ہے۔ یہ پہلی ترمیم ہی ہے بلکہ سراسر اسی کی وجہ سے مقررین اور ناشرین کو نہ دھمکایا جاتا ہے اور نہ انھیں رام کیا جاتا ہے صرف اس بنا پر کہ ان کے خیالات و افکار کچھ لوگوں کو ناگوار گذرتے ہیں۔ میں ان کے اس بیان پر صرف، آمین کہوں گی۔

غور فرمایئے کہ سپریم کورٹ کے اکثریتی فیصلوں میں ایسے معاملات کا ذکر کہیں ملتا جن میں

مملکت کے خلاف فرد ہوتا ہے۔ یہ تو جسٹس ڈگلس جو کہ کٹر لبرل ہیں، فرد کے حقوق کی مدافعت کرتے ہیں۔ قدامت پرست جج حضرات تو اس طرح بات کرتے ہیں کہ جیسے فرد کا کوئی وجود ہی نہیں اور سماجی تشویش کی اکائی صرف اجتماع ہے یعنی ایک مخصوص معاشرہ۔ اخلاقی اجتماعیت سے اتنی گہری وابستگی بلاوجہ، محض خلا میں نہیں ہوتی اسے ایک علمیاتی بنیاد کی بھی ضرور ہوتی ہے اور پیرس ایڈلٹ تھیٹر کے بمقابلہ (سلیٹون) کے سلسلے میں سپریک کورٹ کا اکثریتی فیصلہ اس بنیاد کا انکشاف کرتا ہے۔

اس مقدمے میں، اٹلانٹا اور جارجیا کے دو تھیٹرز، سینما گھر ملوث تھے جو صرف بالغوں کو مبینہ عریاں فلمیں دکھایا کرتے تھے۔ مقامی عدالت کے فیصلے کے مطابق، دستوری طور پر، ان کا یہ فعل جائز تھا مگر جارجیا کی سپریم کورٹ نے یہ فیصلہ الٹ دیا، اس بنا پر کہ پہلی ترمیم میں یک سر یا کھلی فحش نگاری کو تحفظ حاصل نہیں۔ اور اس طرح امریکا کی سپریم کورٹ کے سامنے جو مسئلہ آیا تھا کہ آیا رضامند بالغوں کو ان کی آزادی سے محروم کرنا کوئی قانونی بات ہوگی۔ عدالت نے اپنے اکثریتی فیصلے میں کہا کہ 'ہاں' علمیاتی سطح پر یہ فیصلہ غیر معروضیت کا اعلان ہے اس لئے کہ وہ سماجی مظاہر کی سب سے بڑی برائی کی واضح طور پر حمایت اور مدافعت کرتا ہے اور وہ سب سے بڑی برائی ہے، غیر معروضی قانون۔ اس فیصلے کا، جسے جسٹس برجر نے لکھا ہے، اعلان ہے کہ: 'ہم سمجھتے ہیں کہ تجارتی عریانی کی روک تھام میں اس مملکت کے جائز مفادات داؤ پر لگے ہوئے ہیں۔ معیار زندگی میں عوام کی دل چسپی عمومی، معاشرتی ماحول، بڑے مراکز میں تجارت کا حال اور ممکنہ طور پر امنِ عامہ۔ ذرا کوشش کر کے کوئی ایک مسئلہ یا وہ فعل بتا دیں جو مملکت کے اس قسم کے جائز مفادات میں شامل نہ کیا جا سکے!'۔

پروفیسر بکیل کی کتاب سے ایک اقتباس پیش کرتے ہوئے فیصلہ میں کہا گیا کہ 'ایک آدمی کو اپنے کمرے میں بیٹھ کر عریاں کتاب پڑھنے کا تو حق حاصل ہو سکتا ہے لیکن اگر وہ ایک ایسے حق کا تقاضا بھی کرے کہ اسے اس قسم کی کتابیں اور تصویریں بازار میں بھی ملیں، تو اسے ایسا حق دینے کا مطلب یہ ہوگا کہ اس کے اس حق سے ہم باقی لوگوں، اردگرد کی دنیا اور ہماری نجی زندگیاں بھی متاثر ہوں گی۔ اس لئے کہ جو کچھ عام طور پر پڑھا جاتا ہے، دیکھا اور سنا جاتا ہے اور کیا جاتا ہے، ان سب کا ہم پر اثر و نفوذ ضرور ہوتا ہے، خواہ ہم چاہیں یا نہ چاہیں' اب ذرا بتائیں کہ اس قسم کے اعلان کے بعد وہ کون سا انسانی فعل ہے، جو باقی بچ گیا۔ اور کلی آمریت کا وہ کون سا حامی ہے جو اس اعلان کی تائید نہیں کرے گا!

جناب برجر اس بات کا اقرار کرتے ہیں کہ ایسے کوئی معلومہ حقائق موجود نہیں جو اس بات کو حتمی طور پر ثابت کر سکے کہ عریاں مواد کا انکشاف مرد اور عورتوں یا معاشرے پر برے اثرات مرتب کرتا ہے۔ مگر اس قسم کے مواد پر پابندی کے خلاف وہ اس دلیل کو رد کر دیتے ہیں۔ اور پھر تو پرانے عدالتی

فیصلوں کے اقتباسات اور بیانات کا ایک برفشار شروع ہو جاتا ہے جن سب میں (نقش نگاری کے مسئلے سے کہیں زیادہ وسیع تر معنوں میں) حتمی ثبوت کی کوئی ضرورت نہیں۔ اور یہ کہ مملکت کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ 'جو ہے' اور 'جو ہوگا' کی بنیاد پر قانون مرتب کرے۔ 'علمی حقائق' (ان الفاظ کے اصلی اور لفظی معنوں میں) کا مطلب ہے 'حقیقت کا وہ علم جو عقل کے ذریعے حاصل ہوا ہو' قطعی ثبوت کے معنی ہیں کہ پیش کردہ قضیہ ایک امر واقعہ اور حقیقت کے طور پر ثابت کیا جا چکا ہے۔ اب یہ عقل اور حقیقت ہی ہیں جن کو مملکتی اختیارات کی تجدید سے ہٹایا جا رہا ہے اور اس کی بجائے، کسی بھی مفروضے، بے دلیل دعویٰ، کسی بھی قیاس بلکہ جذبے اور ذہنی رو کی بنیاد پر یا بغیر بنیاد کے قانون سازی کا اختیار مانگا جا رہا ہے۔

یہ فیصلہ اس بات کی تصدیق کرتا ہے کہ ہم قانون سازوں سے یہ تقاضا نہیں کرتے کہ قانون سازی کے لیے علمی طور پر چند ثابت شدہ حقائق ضروری ہیں، حالاں کہ عریاں مواد اور سماج دشمن رویے کے مابین تعلق کے بارے میں کسی کے پاس کوئی قطعی ثبوت موجود نہیں۔ پھر جارجیا کے قانون ساز اسی بات کو ایک 'صحیح' اندازے کے مطابق یہ طے کر دیتے ہیں کہ ایسا تعلق ہو سکتا ہے اور ہے۔ زوتھ کے مقدمے کا فیصلہ کرتے وقت عدالت نے اس بات کو ضمنی طور پر قبول کر لیا کہ کسی نظام اور اخلاقی ڈھانچے کے تحت، سماجی مفاد کے تحفظ کی خاطر، اس طرح کے اخذ کردہ نتائج کی بنیاد پر عمل کیا جا سکتا ہے۔ لیکن اگر یہ تصور کہ کسی بھی چیز پر پابندی لگانے کے لیے صرف اتنا جواز کافی ہے کہ وہ سماجی مفاد، کے لیے خطرہ بن سکتی ہے، پھر تو نازی اور سوویت آمریت، دونوں اپنی اپنی جگہ حق بجانب تھے کہ انھوں نے ہر اس شخص کو اپنے راستے سے ہٹا دیا جو ان کی دانست میں، نازی یا سوویت مفاد کے لیے خطرہ بن سکتا تھا۔

حکومت چاہے کوئی سا بھی نظریہ پیش کرے، امریکا کی بنیاد رکھنے والے بزرگان کا یہ تصور کبھی نہیں رہا۔ حیرت کی بات سہی مگر لگتا ہے کہ چیف جسٹس برجر بھی اس نکتے سے ناواقف نہیں کیوں کہ وہ خود آگے چل کر، امریکا کے وجود میں آنے سے پہلے کی بات یاد دلاتے ہیں۔ مہذب معاشروں میں ابتدا ہی سے قانون ساز اور جج حضرات غیر ثابت شدہ مفروضوں سے کام چلاتے رہے ہیں۔ (کیوں کہ) زیادہ تر تجارتی اور کاروباری معاملات کی مملکتی ضابطگی کی تہ میں ایسے مفروضے کارفرما نظر آتے ہیں۔

یہ بات زیادہ سچ ہے، نتائج آپ خود دیکھ لیں۔ ریاست ہائے متحدہ امریکا کے وجود میں آنے سے پہلے کی تمام حکومتوں کی تاریخ اٹھا کر دیکھ لیں۔ ہماری وہ پہلی حکومت تھی جس کی بنیاد ایسی

تحریری دستاویز، دستور پر رکھی گئی جس کی وہ سراسر پابند تھی اور جس نے اس کے لیے انفرادی حقوق کی پامالی اور خصوصاً اپنی من مانی کرنے کو ناممکن بنا دیا تھا۔ دوسری تمام اقسام کی حکومتیں غیر ثابت شدہ مفروضوں پر چلنے والی، بلا قید و بند حکومتوں کے مظالم، اس بنیاد پر سیاسی نظریے کی افادیت اور ان کی درستگی ثابت کرتی ہیں جن پر اس ملک کی بنیاد رکھی گئی تھی۔ مگر ذرا ہماری سپریم کورٹ کو دیکھیے۔ جو ان تمام خون آلودہ ہزاریوں کے حوالے نظیر کے طور پر دیتی ہے تا کہ ہم ان پر چلیں۔

اب اگر یہ سب کچھ ناقابل فہم سا لگتا ہے تو اس فیصلے میں، جناب برجر کا دوسرا ہی جملہ وجوہات کی طرف اشارہ کرتا ہے اور جو قانون کی نشوونما میں، نظیر کی حیثیت کا ایک نہایت ہی واضح ثبوت ہے۔ اس دوسرے جملے سے اڑتے ہوئے پروں کا ایک طوفان سا آ گیا اور یوں لگا جیسے ہم ماضی کی دہائیوں میں برپا ہونے والی ہیر پھیر، مفاہمت، ناانصافی اور حقوق کی پامالی کی پاداش میں نتائج بھگت رہے ہوں۔ پھر دوسرا جملہ یہ ہے: 'یہی (غیر ثابت شدہ مفروضوں کی بنیاد) بات، وفاقی تحفظات، مانع ارتکاز قوانین اور بہت سارے وفاقی ضابطوں کی بھی بنیاد ہے'۔ اب رسمی طور پر مجھے کہنا پڑے گا: 'اوہ! مسٹر چیف جسٹس!' مگر غیر رسمی طور پر میں کہنا چاہوں گی کہ......'اوہ! برادرِ من!'

جناب برجر مزید فرماتے ہیں کہ: مثال کے طور پر کانگریس اور ریاستی قانون سازوں نے مانع ارتکاز قوانین کو اپنا کر، شراکتی قوانین کو بری طرح محدود کر کے اور تجارتی قانون سازوں نے منافعے میں شرکت کے کوپن اور تحفظات کے اجرا کرنے والوں اور ڈیلرز پر پابندی کہ وہ عوام کے سامنے کیا لیں اور کیا نہیں، انھی مفروضات کی بنیاد پر لگائی ہے۔ قابل فہم طور پر، وہ حضرات جو پہلی ترمیم کی مطلقیت کے قائل ہیں انھیں اس بات کی وضاحت میں بڑی پریشانی ہوتی ہے کہ اگر اشیا اور زر کی مارکیٹ میں، جماعتی اور آزادیٔ اظہار اور آزادیٔ وابستگی پر اس بری طرح قدغنیں لگائی جاتی ہیں تو پھر نقش نگاری کے بازار میں ایسا کیوں نہیں ہو سکتا!

بلا شبہ، اجتماعیت کے قضیئے کی رو سے اس کا جواب نہیں ملتا۔ آج کے حالات میں اس کا جواب یہی ہے کہ اس قضیے کی جانچ پڑتال کرنے کے بعد اسے رد کر دیا جائے اور (امریکی) دستور اور انفرادی حقوق کی بری طرح پامالی کے تمام اقدامات کی تنسیخ کی شروعات کر دی جائے۔ مگر عدالت کی اکثریت نے اس طرح کا کوئی فیصلہ نہیں دیا۔ چیف جسٹس برجر نے عدالتی اور قانون سازی کے بارے میں حامل رجحان، کے بارے میں خود اپنی تنبیہ کو بھول کر، اس نظیر کو ایک مطلق اور ناقابل تنسیخ قبول کر کے، ملک کو ریاستیت کی تحت الثریٰ میں دھکیل دیا۔

فیصلے میں آگے چل کر کہا گیا کہ: 'اسی طرح جب قانون اور مہتمم حضرات طبعی ماحول اور جنگلات کے نہروں اور باغات کے ذخائر کو آلودگی سے بچانا چاہتے ہیں' انھیں چاہیے کہ وہ ایسی ہلکی پھلکی باتوں پر بھی غور کریں کہ موجودہ پارکوں اور غیر آباد (علاقوں کے قریب یا بیچ سے گزرنے والی سڑکوں پر کیا اثرات ہوں گے! چناں چہ، جسٹس برجر فیڈرل ۔ ایڈ ہائی وے ایکٹ ۱۹۶۸ء کے بارے میں کہتے ہیں کہ یہ قوانین اس قوم کے اعلیٰ ترین قانون ساز ادارے کے اس پر خلوص عزم کا اظہار ہیں کہ بغیر کسی سماعت کے، بنا کسی تحقیق کے اور کابینہ کے کسی افسر کی سربراہی میں محض یہ فیصلہ کر لینے سے کہ ایک شاہ راہ بنانی ہے، ان باغات کا حسن اور ان سے میسر آنے والی صحت افزا سہولتیں برباد نہیں کی جا سکتیں۔ حقیقت یہ ہے کہ کانگریس کا ناقابل تصدیق مفروضات پر مبنی کوئی بھی ایسا حکم کہ لوگوں کے لیے فلاں بات اچھی ہے بشمول بے وزن جمالیاتی مفروضات کے' کسی قانون کو غیر دستوری ثابت کرنے کے لیے ایک ناکافی دلیل ہے۔ کیا ایسا نہیں! اگر ایسا نہیں ہے تو سرکاری افسران کے بے وزن جمالیاتی مفروضے اس بات میں حق بجانب ہوں گے کہ وہ ادب و فن کے میدان پر بھی حملہ آور ہوں جس طرح کہ جناب برجر کا یہ فیصلہ انھیں دعوت دیتا ہے۔

اس فیصلے کے اس پیراگراف میں جس میں نظریۂ اختیار پر ایک بغلی ضرب لگائی گئی ہے، ایثار کا غلیظ ہاتھ رینگتا نظر آتا ہے۔ ہم نے یہ بات نوٹ کی ہے کہ نہ تو پہلی ترمیم، اور نہ ہی نظریہ اختیار، ریاستوں کو 'نیلے آسمانی' قوانین کی ان ضابطہ بندیوں سے روکتے ہیں جن میں کہا گیا کہ فروخت کرنے والے اپنے بارے میں کیا لکھتے ہیں اور کیا شائع کراتے ہیں۔ ایسے قوانین اس لیے ہوتے ہیں کہ وہ کم زور، بے خبر اور سیدھے سادے، قسم کے لوگوں کی اس طرح حفاظت کریں کہ کہیں وہ اپنی مرضی استعمال نہ کر بیٹھیں۔ اور پھر اس مقصد کے لیے باقیوں کو بھی جو کم زور، بے خبر سیدھے سادے ہیں، انھیں بھی اپنی مرضی استعمال کرنے سے روکا جاتا ہے۔ ایثاریت کا حقوق اور آزادی سے کیا تعلق ہے اس بارے میں یہاں صرف اتنا کہنا کافی ہے۔

لیجیے ایک اور چوزہ نکلتا ہوا نظر آ رہا ہے: کچھ لوگ ریاستوں سے کہہ رہے ہیں کہ عریانی و فحاشی کے مسئلے کے حل کے لیے انھیں عدم مداخلت کے کاروباری اصول کا انتظار کرنا ہوگا۔ اور خلاف قیاس یہ بات ان لوگوں کی طرف سے کہی جا رہی ہے جنھوں نے عدم مداخلت کے اصول کے بارے میں کبھی کسی اچھی رائے کا اظہار نہیں کیا۔ بالخصوص شہری، تجارتی اور فضا کو آلودگی سے پاک رکھنے کے مسائل کے بارے میں۔ اسی مسئلے سے بہت سارے مسئلے پیدا ہوتے ہیں۔ اتنے سارے کہ ان تمام کے لیے میرے پاس یہاں جگہ

نہیں، مگر جتنا کچھ میں نے کہا ہے، وہ اس فیصلے کی نوعیت، اسلوب اور مزاج کو سمجھنے کے لئے کافی ہے۔

اس فیصلے کے اختلافی نوٹ میں، جسٹس برنن کے ساتھ مل کر جسٹس اسٹورٹ اور جسٹس مارشل نے اس بارے میں بعض اچھے دلائل پیش کیے ہیں کہ رضامند بالغوں کے لیے احتسابی پابندیاں غیر دستوری ہیں۔ مگر جسٹس برنن، متذبذب اور ہچکچاتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ وہ مفاہمت چاہتے ہیں آزادیٔ اظہار اور ریاست کے جائز مفادات کے بیچ یا ایک توازن قائم کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ اس خیال کو تسلیم کرتے ہیں کہ عریاں مواد کو پہلی ترمیم، کے تحت تحفظ حاصل نہیں مگر ساتھ ہی ساتھ وہ اس بات پر اپنی گہری تشویش کا اظہار بھی کرتے ہیں کہ عدالت تحفظ شدہ اور غیر تحفظ شدہ اظہار کے مابین کوئی واضح خط کھینچنے میں ناکام رہی ہے۔ وہ عریانی کے مقدمات میں عدالتی فیصلوں کا ریکارڈ پیش کرتے ہوئے ان میں پائے جانے والے انتشار اور تضادات کی مثالیں تو پیش کرتے ہیں مگر اس مسئلے سے پہلو تہی کرتے ہوئے ایک فٹ نوٹ میں فرماتے ہیں: '(قطع نظر اس کے کہ) آیا عریاں، قسم کا کوئی ایسا اظہار بھی ہے جسے بالکل تحفظ حاصل نہیں۔ میں اس نتیجے پر پہنچنے پر مجبور ہوں کہ اس قسم کے اظہار کی کوئی واضح تعریف موجود نہیں جس کا ابہام کی بنیادوں پر دفاع کیا جا سکے۔ نتیجتاً' اس رائے کا تمام تر انحصار نظریہ' کالعدم ابہام پر ہے'۔

جسٹس برشین، مبہم قوانین کے خدشات کی بات بھی نہایت خطیبانہ انداز میں کرتے ہیں اور اس بارے میں جسٹس ویرن کی نقل کرتے ہیں، جنھوں نے کہا کہ ایک فوج داری قانون سے دستوری تقاضوں کی قطعیت کی اس وقت خلاف ورزی ہوتی ہے جن کے ذریعے ایک معمولی سمجھ بوجھ کے آدمی کو مناسب طور پر یہ تنبیہہ بھی نہ کی جا سکے اور اس کا سوچا سمجھا رویہ قانون کی رو سے ممنوع ہو۔ مگر، وہ خلافِ ارتکاز قوانین کا ذکر کرتے ہیں جن سے یہی سب کچھ ہوتا ہے۔ وہ کہتے ہیں: نتیجے کے طور پر سامنے آنے والی غیر یقینیت سراسر ناقابل برداشت ہے۔ نہ صرف اس لیے کہ اس طرح بک سیلنگ کا پیشہ خطرناک بن جاتا ہے بلکہ اس لیے بھی کہ اس طرح من مانے اور بے ضابطہ قوانین کے نفاذ کی دعوت ملتی ہے۔ وہ اس حقیقت پر بھی اظہار افسوس کرتے ہیں کہ عریانی کے بارے میں فیصلے' مقدمہ در مقدمہ' اور 'دیکھا دیکھی' بنیادوں پر کیے جاتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ عدالت اس کوشش میں لگی ہوئی ہے کہ وہ ان قانون سازانہ اقدامات کی روک تھام کرکے، ان کو (ماتحت) عدالتوں تک پہنچا دے اور پھر عدالت عظمٰی تک، جہاں پر مقدمہ در مقدمہ، فوج داری اور دستوری قانون کے تمام دھاک بٹھانے والے کام ایک ساتھ چلتے ہیں۔ مگر پھر بھی وہ مانع ارتکاز کی جیتی جاگتی جنجم کا کوئی ذکر نہیں کرتے جو مقدمہ در مقدمہ قانون سازی کی بھیانک یادگار ہے۔ بہر صورت، اصولوں کا برتر احترام اور ان کے نتائج کی فہم کا اظہار جسٹس

برنن کے اختلافی نوٹ میں بہتر طور پر نمایاں ہے۔ وہ اعلان کرتے ہیں کہ "یہ بات سمجھنا مشکل نظر آتی ہے کہ ہمارے ذہنوں میں حکومت کی نافذ کردہ اُس طبقہ سازی کی پیش بندی کیسے کی جائے! اس لئے اگر کوئی حکومت، ایک خاص اخلاقی مزاج قائم رکھنے یا ڈھالنے کی غرض سے اپنے شہریوں پر یہ حکم لگاتی ہے کہ وہ کیا کچھ پڑھ نہیں سکتے اور کیا کچھ دیکھ نہیں سکتے، تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اس غرض سے وہ حکومت اپنے شہریوں پر یہ حکم بھی لگا سکتی ہے کہ ان کے لئے کون سی کتابیں پڑھنا اور کون سی فلمیں دیکھنا لازمی ہوگا۔

مگر بہترین بات ایک بار پھر اپنے پُرزور اختلافی نوٹ کے اخیر میں جسٹس ڈگلس ہی نے ان الفاظ میں کہی: "مگر دنیا کی اور جگہوں کے برخلاف، آزادی اور اختیارات کے حوالے سے ہمارے معاشرے میں (اپنے اپنے) ذوق، اعتقادات اور خیالات کی نگہ بانی حکومت کے نہیں، بلکہ خود افراد کے ذمے ہے۔ پہلی ترمیم کا یہی فلسفہ اور یہی وہ رُکن ایمانی ہے جو ہمیں دوسری اقوام سے ممیز کرتا ہے"۔ میں اس بات کی تائید تو کروں گی مگر اس استثنا کے ساتھ کہ ہمارے لیے یہ کوئی رُکنِ ایمانی نہیں بلکہ ایک قابلِ ثبوت، معقول سائنس کا عمل ہے۔

کسی قوم کی زندگی میں، قانون وہی کام کرتا ہے جو ایک فرد کی زندگی میں سوچ بچار کا عمل کسی فیصلے پر پہنچنے کے لیے کرتا ہے۔ وہ اپنے فیصلوں کے لیے اپنے ایسے بنیادی قضایوں کا اطلاق اپنی ترجیحات پر کرتا ہے، جنھیں وہ تبدیل بھی کرسکتا ہے مگر کبھی نہیں کرتا۔ کسی قوم کے قوانین کی بنیادی تمہید اس کے مقتدر سیاسی فلسفے کے طابع ہوتی ہے اور عدالتیں اس کا نفاذ کرتی ہیں۔ جن کے ذمے، مخصوص مقدمات میں بنیادی طے شدہ اصولوں کا اطلاق ہوتا ہے۔ اس معاملے میں کوئی نظیر، بنیادی تمہید کے مترادف ہوگی جسے چیلنج بھی کیا جاسکتا ہے مگر کبھی کبھار ہی ایسا ہوتا ہے۔ ڈھیلے ڈھالے الفاظ میں کی جانے والی قانون سازی ایک نظیر کے طور پر کتنی دور نکل جاتی ہے اس کا لرزہ خیز مظاہرہ سپریم کورٹ کے عریانی سے متعلق پانچ مقدمات میں سے ایک ریاست ہائے متحدہ بمقابلہ اور پٹو میں ہوا ہے۔ یہ مقدمہ اس شخص سے متعلق ہے جس پر جان بوجھ کر ایک مشترکہ کارندے کے ذریعہ ریاستوں کے مابین عریاں مواد بھجوانے کا الزام تھا۔

بین الریاستی تجارت کو منضبط کرنے کی غرض سے کانگریس کو ملنے والے اختیارات کی ایک شق، (ہمارے) دستور میں پائی جانے والی بڑی غلطیوں میں سے ایک ہے۔ بہ نسبت کسی اور شق کے یہی شق ہمارے دستور کی کی بنیاد میں دراڑ کی صورت، ریاستیت کی وہ مداخلتی میخ ہے جس کے ذریعہ بتدریج ایک فلاحی مملکت کے قیام کے لیے پروانہ جاری ہوا ہے۔ مگر میں یہ کہنے کی جرأت کروں گی کہ یہ شق جو کچھ اب بن گئی ہے اس کے بارے میں ہمارے دستور سازوں نے کبھی سوچا بھی نہیں ہوگا۔ اسے تحریر کرتے وقت اگر ان کا مقصد یہ تھا کہ تجارت کو فروغ ہو اور ریاستوں کے بیچ تاکہ بندیاں قائم نہ

ہوں تو پھر اس شق نے ہمیں ایک بالکل ہی مختلف منزل پر پہنچا دیا ہے۔ اب آپ کو اس ملک میں پچاس ایسی مختلف سرحدوں کے لیے تیار رہنا چاہیے جہاں کسٹم افسران آپ کے سامان اور جیبوں کی تلاشی ان چیزوں کے لیے لے رہے ہیں جو ایک ریاست میں قانونی ہیں تو دوسری میں غیر قانونی۔

پہلے کے ایک اور فیصلے سے کچھ اقتباس پیش کرتے ہوئے، چیف جسٹس برجر اس مقدمے میں فرماتے ہیں: 'بین الریاستی تجارت کے ایک ضابطے کا مقصد اور محرک، وضع قوانین کے پرکھ کی شق کے وہ معاملات ہیں جن کو بروئے کار لانے پر دستور کوئی پابندی عائد نہیں کرتا اور جن پر عدالتوں کو کوئی اختیار حاصل نہیں۔ اس قسم کی تعبیر کا یہ مطلب یہ ہے کہ ایک قانون سازانہ فیصلے کو وضع قوانین کی پرکھ کے تمام اختیارات حاصل ہیں یعنی کسی ایک اصول کی پابندی اور کسی بھی قدغنی توازنِ اقتدار سے بہت پرے، سیاق و سباق کا حوالہ نہ دینے کی یہ ایک انتہائی شرمناک مثال ہے۔ مجموعی طور پر دستور بطورِ خود، حکومت کے اختیارات پر ایک بنیادی قدغن ہے خواہ، قانون سازی میں یا پھر کسی اور شعبے میں۔

جناب برجر اعلان فرماتے ہیں کہ: 'یہاں اس معقول حد تک تسلیم شدہ اصول کو دہرا دینا کافی ہوگا کہ کانگریس ان لوگوں پر متعلقہ شرائط اور مطالبات نافذ کر سکتی ہے جو بین الریاستی تجارتی ذرائع کا استعمال کرتے ہیں تا کہ یہ ذرائع بدی کی تشہیر کے ذرائع نہ بن جائیں (قطع نظر اس کے کہ) وہ برائی طبعی ہو، اخلاقی ہو، خواہ معاشی قسم کی'۔ اتنا کچھ کہنے کو ناکافی سمجھتے ہوئے ایک فٹ نوٹ کا اضافہ ہوتا ہے جس میں پھر کہا گیا کہ: کانگریس یقیناً اس بات کی مجاز ہے کہ وہ بین الریاستی تجارت کی ضابطہ بندی کرے۔ وہ ایسی تجارت کرنے والے پر پابندی لگا سکتی ہے اور ان کو سزا دے سکتی ہے جو اس طرح تجارت کرتے ہیں کہ دوسری ریاستوں کے لوگوں میں بداخلاقی، اور بُرائی پھیلے اور ان کو نقصان پہنچے۔ مگر بداخلاقی، برائی اور نقصان کا ناپنے کا پیمانہ کیا ہوگا!

ان پانچ مقدمات کے اکثریتی فیصلوں میں جس حق کو تسلیم کیا گیا وہ صرف یہ ہے کہ آپ کو اپنی پسندیدہ چیز پڑھنے اور دیکھنے کا حق حاصل ہے، مگر اپنے کمرے کے اندر، باہر نہیں۔ اور ہاں، آپ کو یہ حق بھی حاصل ہے کہ آپ جو بات سوچنا چاہیں وہ بھی اپنے ذہن کے اندر سوچ سکتے ہیں۔ مگر یہ حق تو وہ ہے جسے مطلق قسم کی آمریتیں بھی چھین نہیں سکتیں۔ (سوویت روس میں بھی آپ کی سوچ پر کوئی پابندی نہیں۔ آپ اس سوچ پر عمل نہیں کر سکتے)۔ یہاں ایک بار پھر، جسٹس ڈگلس کی تنہا آواز، ایک شدید احتجاج کے طور پر ابھرتی ہے: 'ہماری ساری دستوری میراث ہی حکومت کی طرف سے لوگوں کے ذہنوں پر قدغنیں لگانے کے خلاف ایک بغاوت ہے'۔

قدامت پرست اور لبرل نقطۂ نظر کی تقسیم، کم سنجیدہ یا خالص سیاسی بحثوں کی بہ نسبت، سپریم

کورٹ کی آرا میں زیادہ صاف و شفاف انداز میں جھلکتی ہے۔ اپنے کام کی نوعیت کے اعتبار سے سپریم کورٹ کو فلسفے کی آواز ہونا چاہیے اور وہ واقعی فلسفے کی آواز ہے۔ اصولوں کو برتنے کی ضرورت نے سپریم کورٹ کے اراکین کو ہر قسم کے خیالات کے اولین نمونے بنا کر رکھ دیے ہیں۔ بلکہ دو بنیادی سیاسی گروہوں کی روح کی وہ نمائندگی کرتے ہیں۔ گو کہ انھیں سیاسی نظریات کی اس غیر واضح، غیر متعین، تجریدی افراتفری میں اصل نمونوں کے طور پر نہیں چنا گیا تھا جن پر ڈھیلے ڈھالے انداز میں، قدامت پرست اور لبرل، کے ٹھپے لگائے جاتے ہیں۔ (کیوں کہ) ان میں کسی ایک بھی لازمی خصوصیت یا مثالی نمائندے کا انتخاب ممکن نہیں۔ اس کے باوجود جب کوئی سپریم کورٹ کی آرا کا مطالعہ کرتا ہے تو بہت سے بنیادی قضیے، ایک عجیب سی روشنی اور انکشافی وضاحت کے ساتھ سامنے آجاتے ہیں اور یہ بات سمجھ میں آجاتی ہے کہ ان قضایوں پر یقین رکھنے والوں کے بیچ پائے جانے والے چھوٹے اختلافات اور تضادات کے باوجود ایک یا دوسرے سیاسی گروہ کے بنیادی قضیئے وہی ہیں۔ یہ بالکل ایسا لگتا ہے کہ کوئی ایک مدِ مقابل فلسفے کو نہیں بلکہ زندگی کے بارے میں ان کے نقطۂ نظر کو دیکھ رہا ہے۔

عریانی کے ان پانچ مقدمات میں، عریانی بطور عریانی زیرِ بحث نہ تھی بلکہ ایک حاشیائی اور غیر اہم بات کے طور پر۔ لیکن جو بات زیرِ بحث آئی وہ اس سے کہیں زیادہ اہم تھی یعنی آدمی کی زندگی کا جنسی پہلو۔ کسی آدمی کے لیے، جنس نہ تو ایک بالکل الگ چیز ہے اور نہ ہی کردار کا محض جسمانی پہلو۔ وہ تو (ایک طرح سے) اس کی تمام تر بنیادی قدروں کا نہایت پیچیدہ مرکب ہے۔ اس لیے یہ کوئی حیرت کی بات نہیں کہ جنسی نوعیت کے مقدمات (بدترین اظہار کی صورتوں سمیت) میں، فلسفے کی تمام شاخوں کے اثرات ملتے ہیں۔ ہم اخلاقیات، علمیات، سیاسیات اور جمالیات (جو بحث کا فوری شکار بنتی ہے) کے اثرات دیکھ چکے ہیں۔ پھر فلسفہ کی پانچویں اور بنیادی شاخ یعنی مابعد الطبیعیات کے بارے میں کیا کہا جائے گا! اس کے اثرات کا پتا ان ہر دو مخالف فریقین کے اندرونی تضادات سے چلتا ہے جن سے یہ تضادات سمجھ میں بھی آتے ہیں۔ گویا کہ فطرتِ انسانی کے بارے میں ان کا نقطۂ نظر ہے، اُن کی مابعد الطبیعیات ہے۔ ہر دو فریقین کا قضیہ ایک ہی ہے۔ یعنی بدن اور ذہن کی تفریق مگر، وہ چنتے ہیں اس مہلک مغالطے کا مخالف پہلو۔

قدامت پرست حضرات مادی دنیا میں آزادی چاہتے ہیں اور وہ صنعت و تجارت، پیداوار اور مادی دولت پر حکومت کی پابندیوں کے مخالف تو ہیں مگر وہ انسان کی روح، اس کے شعور پر حکومت کے کنٹرول کے حق میں ہیں۔ وہ حکومت کی طرف سے احتساب اور اخلاقی اقدار کے تعین اور اخلاق کے نفاذ کی غرض سے سرکاری نظام اور عقل پر پہرے بٹھانے کے بھی حامی ہیں۔ (اس کے برعکس) لبرل

حضرات، روحانی دنیا کی آزادی کے قائل ہیں۔ اور احتساب کی مخالفت کرتے ہیں۔ وہ خیالات پر پابندی لگانے، فنون پر پابندی لگانے، پریس پر پابندی لگانے اور تعلیم پر پابندی لگانے کے بھی مخالف ہیں۔ (ورسی، آزادی کے بارے میں ذرا ان کی تشویش کو ملاحظہ فرمائیں) مگر وہ مادی پیداوار پر سرکاری کنٹرول کی حمایت میں ہیں۔ بلکہ ملازمتوں، اُجرتوں، منافعوں اور تمام قسم کی جائیداد پر حد بندی بلکہ سرے سے ان تمام پر مکمل اختیار کے قائل ہیں۔

قدامت پرست حضرات، آدمی کو ایک ایسے جسم کے طور پر دیکھتے ہیں جو ساری دنیا میں اپنی کھوپڑی میں لگے ہوئے ایک الیکٹرونک کمپیوٹر کی مدد سے جو واشنگٹن سے کنٹرول ہوتا ہے، ریت کے گھروندے یا فیکٹریاں بناتا رہتا ہے۔ لبرل حضرات، آدمی کو ایک ایسی جان سمجھتے ہیں جو کائنات کے دور دراز کونوں تک آزدانہ سیر کرتی رہتی ہے۔ لیکن سڑک پر روٹی خریدنے بھی نکلتی ہے تو وہ سرتا پیر زنجیریں پہنے ہوئے ہوتی ہے۔ تاہم قدامت پسند ہی زیادہ تر مذہب پرست ہوتے ہیں اور جو بدن پر روح کی برتری کا اعلان کرتے ہیں اور جسے میں 'اسرار روحانی' کہوں گی، وہ اس کی نمائندگی کرتے ہیں۔ اس کے برعکس، لبرل حضرات وہ ہیں جو زیادہ تر مادہ پرست ہوتے ہیں اور جو 'اسرار عضلات' کی نمائندگی کرتے ہیں۔

یہ کوئی تضاد نہیں محض ایک متناقضہ ہے۔ ان میں سے ہر فریق اس اقلیم پر قبضہ جمانا چاہتا ہے۔ جو اس کی نظر میں مابعد الطبیعیاتی طور پر اہم ہے اور صرف انھی سرگرمیوں کی اجازت دیتا ہے جس سے وہ نفرت کرتا ہے۔ ذرا غور سے دیکھیں تو پتا چلے گا کہ قدامت پسند، دولت مندوں کی اور مادی پیداوار میں کامیاب حضرات کی تضحیک کرتے نظر آتے ہیں کیوں کہ وہ انھیں اخلاقی طور پر کم تر نظر آتے ہیں۔ جب کہ لبرل حضرات کے نزدیک، خیالات ایک طرح کا قنوطی کاروبار اعتاد ہے۔ دونوں فریقین کے لیے 'نظم وضبط' کا مطلب ہے قوت کے بل بوتے پر حکمرانی۔ دونوں میں سے کوئی ایک فریق بھی آزادی کو بہ حیثیت ایک قدر تسلیم کرنے کو تیار نہیں۔ قدامت پرست حضرات آدمی کے شعور پر حکمرانی کرنا چاہتے ہیں۔ اور لبرل حضرات اس کے بدن پر۔ اس قضیے کی رو سے دونوں میں سے کسی بھی ایک فریق نے اپنے آپ کو تا حال اس بات کے مشاہدے کی اجازت نہیں دی کہ دونوں اقلیموں میں اثر انگیز صرف قوت ہے۔ قدامت پسند اپنے پُر اسرار عقیدوں میں منجمد اور اقلیم تصورات میں مفلوج بلکہ ناکارہ نظر آتے ہیں۔ جب کہ دوسری طرف لبرل حضرات، مفت ہاتھ آنے کے منتظر اور مادی پیداوار کی دنیا میں نااہل بلکہ اُس کے دشمن نظر آتے ہیں۔ (ذرا ان کے ماحولیاتی جہاد کو دیکھیے)۔

آخر یہ دونوں فریقین، مادی قوت پر اتنا اندھا بھروسہ کیوں کرتے ہیں! میں یہاں (اپنی

کتاب) 'اٹیلس شرگڈ' سے ایک اقتباس پیش کر رہی ہوں۔ 'آپ نے دیکھا کہ 'ذہن و بدن' کی دوئی کے اس نظریے سے کس انسانی صلاحیت کا خاتمہ مقصود تھا! اس سے ذہن کی نفی کرنا مقصود تھی تا کہ آدمی بکھر کر رہ جائے۔ قدامت پسند اور لبرل دونوں ہی انسانی ذہن بالفاظ دیگر 'عقل' سے نفرت کے معاملے میں متحد ہیں۔ قدامت پسند حضرات، ایمان کے مقابلے میں عقل کی تنسیخ کرتے ہیں جبکہ لبرل حضرات جذبات کے حامی ہیں۔ ذہنی مسائل کے بارے میں قدامت پسند حضرات یا تو کاہلانہ حد تک لاتعلق رہتے ہیں یا عملاً اُن کے دشمن۔ اس معاملے میں لبرل حضرات بڑے چالاک واقع ہوئے ہیں۔ وہ عقل کی نفی کرنے اور اسے نیست و نابود کرنے کے لیے عقلی ہتھیاروں ہی سے کام لیتے ہیں (جسے وہ نئے سرے سے تعریف کرنا، کہتے ہیں) جب لوگ عقل کو مسترد کر دیں تو پھر ایک دوسرے کے ساتھ پیش آنے کے لیے ان کے پاس سوائے ایک وحشیانہ، جسمانی قوت کے اور کیا رہ جاتا ہے'۔ میں 'اٹیلس شرگڈ' سے ایک اور اقتباس پیش کروں گی:

'جن کو آپ مادیین اور رُوحانیت پرست کہتے ہیں وہ اک ہی چیرے پھاڑے ہوئے انسان کے ایسے دو نصف ہیں جو اپنی تکمیل میں لگے ہوئے ہیں، یا تو اپنے گوشت پوست کے وجود کو یا پھر اپنے ذہن کو تباہ کر کے، حقیقت سے آنکھیں چرا کر' اور ذہن سے کسی نہ کسی طرح فرار حاصل کر کے، چوں کہ دونوں فریقین ایک ہی سکّے کے دو رُخ ہیں، بلکہ اسی چھوٹے سکّے کے۔ وہ دونوں ایک دوسرے سے قریب تر ہوئے جارہے ہیں۔ ذرا ان کے فلسفیانہ نظریوں کی بنیادی یکسانیت کو تو ملاحظہ کیجیے: مابعد الطبیعیات میں، ذہن و بدن کی دوئی، علمیات میں غیر عقلیت، اخلاقیات میں نظریہ ایثار اور سیاسیات میں نظریہ ریاستیت۔

قدامت پسندوں کا دعویٰ تھا کہ وہ روایات کی پابندی کرتے ہیں۔ جب کہ لبرل حضرات کو گھمنڈ تھا کہ وہ 'ترقی پسند' ہیں۔ مگر ذرا ملاحظہ تو فرمائیں کہ یہ چیف جسٹس برجر قدامت پسند ہیں جو ایک جنگ جو یانہ قسم کی اجتماعیت تجویز کرتے ہیں اور ایک ایسا عام اصول ڈھالتے ہیں جو مملکت کے اختیارات میں، عریانی سے نمٹنے کے علاوہ بھی، بہت سا غیر ضروری اضافہ کر دیتا ہے۔ اور دوسری طرف جسٹس ڈگلس ہیں جو ایک لبرل سمجھے جاتے ہیں جو ایک آزاد معاشرے کی دہائی دیتے ہیں اور (ساتھ ہی ساتھ) ہمارے دستوری میراث کی بھی وکالت فرماتے ہیں۔

اگر ۱۸۹۰ء میں کوئی بھی یہ بات کہتا کہ تاجروں کے لیے بنائے ہمارے خلاف ارتکاز قوانین، جلد یا بدیر، دانشوروں کے احتساب کے لیے استعمال ہونگے تو اس پر کسی کو یقین نہ آتا، مگر ہم یہی کچھ دیکھ رہے ہیں۔ آج جسٹس برجر لبرل حضرات سے کہتے ہیں کہ وہ اس بات کی وضاحت نہیں

کر پائیں گے کہ اشیا اور زر کے بازاروں میں تو حقوق پر بری طرح پابندیاں لگائی جا سکتی ہیں مگر عربانی کے بازار میں نہیں‘ تو پھر میں یہ سوچنے پر مجبور ہوں کہ ان کے ساتھ جو کچھ ہو رہا ہے، بجا ہو رہا ہے، بجز اس کے کہ ہم بھی اس کا شکار ہیں۔

اگر یہ احتسابی ضابطہ منسوخ نہیں کیا گیا تو اگلا قدم اور بھی قطعی ہوگا اور وہاں ’بازار عریانی‘ کی بجائے ’بازار خیالات‘ کے الفاظ لکھ دیے جائیں گے۔ پھر جب لبرل حضرات کی باری آئے گی تو وہ ایک نظیر بنا لیں گے اور اس کی بنیاد پر یہ طے کریں گے کہ ’سماجی افادہ‘ کے نام پر کون سے خیالات پہ پابندی لگائی جائے! اس قسم کے مقابلے کوئی نہیں جیت سکتا، سوائے حکومت کے مجھے نہیں معلوم کہ سپریم کورٹ کے قدامت پرست اراکین کو واشنگٹن میں جیفرسن کی یادگار سنگ مرمر پر کندہ ان الفاظ کو پڑھنے کی ہمت کیسے ہو سکتی ہے!: ’میں نے ’آدمی کے ذہن پر، ہر قسم کے جور و جبر کی مخالفت کا حلف اٹھا رکھا ہے‘

گستاخی معاف، مجھے اجازت دیجیے کہ کہوں کہ ’میں نے بھی یہی حلف اٹھا رکھا ہے‘

ماخذ (انگریزی۔5)

اقبالؒ اور فحشیات

عطاء اللہ پالوی

پروفیسر نعیم الرحمٰن صاحب ناقل ہیں کہ ایک مرتبہ لاہور کے اورینٹل کالج کے اہل ریش عربی طلبا نے علامہ اقبال سے شکایت کی کہ حسان کا دیوان نصاب سے خارج کرا دیجیے اس لیے کہ اس میں فحشیات ہی فحشیات ہیں۔ علامہ مرحوم نے نہایت معصومیت اور استعجاب سے سوال کیا۔

'کیا آپ کے درجے میں لڑکیاں بھی ہیں!'

کہا: نہیں'

فرمایا' تو پھر کیا حرج ہے! آپ سب ماشاءاللہ مرد ہیں اور داڑھی والے ہیں۔ آپ کو یہ بھی تو معلوم ہونا چاہیے کہ عرب 'شرفا' گالیاں کیسے دیتے تھے! آخر گالیاں بھی تو زبان اور ادائے خیال کا ایک طرز ہیں۔ اس سے بھی تو واقفیت ضروری ہے۔'

ماخذ (اُردو۔ ۷)

حسرت موہانی اور عریانی

سید سجاد ظہیر

جب ہماری یہ کانفرنس حیدر آباد (دکن) میں ہوئی، اُس وقت خاص طور پر اِن الزامات سے بھرے ہوئے مضامین بعض اُردو اخباروں میں شائع ہوئے۔ حیدر آباد کے چند نظام پرست اور مجلسِ اتحاد المسلمین سے تعلق رکھنے والے اخبارات اِن ہرزہ گوییوں میں پیش پیش تھے۔ ان باتوں کے پیشِ نظر ہم میں سے بعض نے یہ مناسب سمجھا کہ کانفرنس ایک ریزولیوشن کے ذریعے یہ بات صاف کر دے کہ فحاشی، ترقی پسند اصولوں کے خلاف ہے اور ہم ترقی پسند ادب میں فحاشی کو رجعت پرستی ہی کی ایک شق سمجھتے ہیں۔ اس قسم کی تجویز کی ضرورت ہم کو یوں بھی محسوس ہوئی کہ چوں کہ اردو کے بعض ادیب (مثلاً سعادت حسن منٹو) جن میں ترقی پسندی کے عناصر بھی تھے، اور جنھوں نے بعض اچھی ترقی پسند کہانیاں لکھی تھیں، کبھی کبھی فحاشی پر بھی مائل ہو جاتے تھے۔ نیز یورپی ادب میں نراجی رجعت پرستی اب فحاشی، بد اخلاقی اور ہر قسم کے معاشرتی نظم وضبط سے بغاوت کی شکل میں نمایاں ہو رہی تھی اور بعض کم فہم دانش ور سرمایہ داری کے زوال کی اس بے ہودہ جدت کو ترقی پسندی سمجھ کر اُس کی نقل کرتے تھے۔

فحاشی کے مسئلے پر تجویز کا مسودہ ڈاکٹر عبدالعلیم نے تیار کیا جو ہم میں صحتِ الفاظ، اختصار اور اپنے مطلب کے صاف اور واضح اظہار کے لیے بے نظیر تھے۔ اُنھوں نے ہی اس تجویز کو کانفرنس کے سامنے پیش بھی کیا۔ کسی نے اُس کی تائید بھی کر دی۔ غالباً احتشام حسین کانفرنس کے اس اجلاس کی صدارت کر رہے تھے جس میں یہ تجویز پیش ہوئی۔ جب تحریک اور تائید ہو چکی تو صدر نے رسماً دریافت کیا کہ کوئی اس کا مخالف تو نہیں ہے۔ کسی کا بھی خیال نہیں تھا کہ اس بدیہی تجویز پر کسی قسم کا اختلاف ہوگا یا اس پر زیادہ بحث کی ضرورت ہے، لیکن ہمارا یہ خیال غلط نکلا۔

مولانا حسرت موہانی ڈائس کے نیچے حاضرین کی پہلی صف میں بیٹھے ہوئے تھے، وہ یکا یک کھڑے ہو گئے اور صدر سے اس تجویز میں ایک ترمیم پیش کرنے کی اجازت چاہی۔ ہم سب سخت حیران ہو کر ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے۔ جلسے میں ابھی تک ایک اکتاہٹ کی سی کیفیت تھی جو رسمی قسم کی تجویزوں اور تقریروں سے ہمیشہ پیدا ہو جاتی ہے۔ مولانا کے اس طرح کھڑے ہو جانے سے ہر شخص چوکنا ہو گیا اور

سب دل چسپی کے ساتھ یہ سننے کے لیے مشتاق ہو گئے کہ مولانا فحاشی کے متعلق کیا کہتے ہیں۔

علیم نے جو قرارداد پیش کی تھی اُس میں کچھ اس طرح الفاظ تھے۔ 'یہ کانفرنس ایک بار پھر اس بات کو صاف کر دینا چاہتی ہے کہ ترقی پسند ادیب ادب میں فحش نگاری کے خلاف ہیں اور اُسے برا سمجھتے ہیں'۔۔۔ الخ۔ مولانا حسرت موہانی نے یہ تجویز پیش کی کہ اس جملہ کے آگے یہ جملہ پڑھا جائے 'لیکن وہ لطیف ہوسناکی کے اظہار میں کوئی مضائقہ نہیں سمجھتے'۔ مولانا کی اس ترمیم پر سارے حاضرین ہنس پڑے۔ لیکن مولانا پر استہزا کا کوئی اثر نہیں ہوا اور وہ پوری متانت اور سنجیدگی سے اپنی ترمیم کو منظور کروانے کے لیے تقریر کرنے لگے۔ اُن کا کہنا یہ تھا کہ 'فحاشی' کی تعریف بہت مشکل ہے۔ ہر شخص اس کے اپنے ہی مطلب نکالتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ بعض کٹر ملا اُردو اور فارسی کے تمام اس شاعری کے ذخیرے کو (جسے خود مولانا نے فاسقانہ یا انسانی عشق و محبت کے متعلق شاعری قرار دیا تھا) ہی ناجائز سمجھتے ہیں۔ کوئی شاعر یا ادیب ان ملاؤں کی اس بات کو نہیں مان سکتا اور ہمیں احمق یا بددیانت لوگوں کے حملوں سے گھبرا کر کوئی ایسی تجویز نہیں منظور کرنا چاہیے جس میں عاشقانہ شعروادب کو مطعون قرار دینے کا احتمال ہو۔

مولانا نے بڑے بھولے پن سے کہا: 'مجھے اس کا اعتراف ہے کہ میری اپنی شاعری کے بیش تر حصے میں ہوسناکی ہوتی ہے۔ لیکن یہ ہوسناکی تو لطیف ہوتی ہے۔ کسی کو اس پر کیا اعتراض ہو سکتا ہے! بہر حال کٹھ ملاؤں کو اعتراض ہو تو ہو، جو شاعری کو ہی فعل عبث سمجھتے ہیں، اُن ادیبوں کو نہیں ہونا چاہیے۔' علیم، قاضی عبدالغفار صاحب سے، مجھ سے اور چند دوستوں سے مشورہ کرنے لگے کہ اب کیا کیا جائے:۔۔۔۔۔ مولانا کی ترمیم اگر منظور کر لی جائے اور اُسے قرارداد میں جوڑ دیا جائے تو یہ ملک کے سارے ادبی حلقوں میں تضحیک و مذاق کا سب سے بڑا موضوع ہوگا کہ ترقی پسند ادیب فحاشی کے تو خلاف ہیں لیکن لطیف ہوسناکی میں کوئی مضائقہ نہیں سمجھتے' اس سے بڑھ کر مضحکہ خیز بات اور کیا ہو سکتی ہے! میں نے علیم سے کہا کہ: مولانا حسرت موہانی سے گفتگو کریں اور اُن سے کہیں کہ اپنی ترمیم واپس لیں چوں کہ مولانا جو واضح کرنا چاہتے تھے وہ سب کی سمجھ میں آگیا ہے۔ لیکن قرارداد میں 'لطیف ہوسناکی' والا ٹکڑا شامل کرنے سے ہم مسئلے کو الجھا دیں گے۔

اب قاضی عبدالغفار، علیم اور مولانا کو سمجھا رہے تھے لیکن وہ اپنی پوزیشن سے ٹس سے مس ہونے کو ذرا بھی تیار نہ تھے۔ آخر کار عاجز آ کر عبدالغفار صاحب کے مشورہ سے یہ طے ہوا کہ اصلی قرارداد فی الحال واپس لے لی جائے۔ اور بعد کو مولانا کے مشورے سے اس موضوع پر انجمن ایک مبسوط بیان شائع کرے۔ مولانا قرارداد کی واپسی کو آئینی طور پر روک نہیں سکتے تھے۔ اس لیے بالآخر چپ ہوئے اور اجلاس کی نشست قہقہوں میں ختم ہوئی۔ ہر شخص کی زبان پر مولانا کی 'لطیف ہوسناکی' والا فقرہ تھا۔۔۔۔۔ سبط حسن کو نشست کے بعد میں نے بڑبڑاتے ہوئے سنا: 'اس شخص کا تاریخی رول ہی ہمیشہ اس

قسم کی بے ڈھب بات کر کے سب کو مشکل میں ڈال دینا ہے۔ جب تک کانگریس میں رہے، یہی کیا۔ مسلم لیگ میں مسٹر جناح کو عاجز کر رکھا ہے۔ اور آج ترقی پسند مصنفین کی کانفرنس میں وہی رول ادا کر رہے ہیں۔' بہر حال مولانا کہ اس ترمیم سے یہ فائدہ ہوا کہ فحاشی کے مسئلے پر ہم زیادہ سنجیدگی سے غور کرنے پر مجبور ہوئے۔ گو بعد کو انجمن نے کوئی بیان شائع نہیں کیا۔

ماخذ (اُردو۔٣٨)

بُزرگ بمقابلہ نوجوان

کرشن چندر

جب ترقی پسند ادیبوں کی طرف سے عریانی کے خلاف قرارداد پیش کی گئی تو اس کی مخالفت کرنے والے مولانا حسرت موہانی تھے اور قاضی عبدالغفار۔ مزے کی بات یہ ہے کہ نوجوان عریانی کے خلاف تحریک پیش کر رہے تھے اور بزرگ اس تحریک کی مخالفت کر رہے تھے۔ کیوں کہ انھیں معلوم تھا کہ شاید اس طرح نوجوان اذہان کی قوتیں مسلوب ہوجائیں گی اور اُن کی تخلیقی نمو رک جائے گی۔ مولانا حسرت موہانی کی پر زور تقریر سے قرارداد مسترد کر دی گئی۔

ماخذ (اُردو۔٤١)

اقدار سے بغاوت

محمد حسن عسکری

پاکستان میں مسلمان ادیب کو اپنی ذمے داری کا زیادہ احساس ہوگا اور وہ عوام سے زیادہ یگانگت بھی محسوس کرے گا۔ اس کا رابطہ اپنے عوام سے زیادہ براہ راست ہوگا بلکہ اگر مسلمان ادیب اپنی سماج سے اور اس کی اقدار سے بغاوت کرنا چاہے گا تو بھی پاکستان میں رہتے ہوئے اس کی بغاوت میں زیادہ معنی ہوں گے اور وہ اہم بھی ہوگی کیوں کہ اکھنڈ بھارت میں اکثریت' اس کی پرواہ ہی کب کرے گی جو اس کی بغاوت کی فکر کرتی پھرے، وہاں تو ایسے آدمیوں کو زیادہ سے زیادہ پریشان کن عنصر سمجھا جائے گا۔ لیکن پاکستان میں حکومت کو ایسے آدمیوں پر ایسا غصہ آئے گا کہ لال پیلی ہو جائے گی۔ ایسے غصے میں بھی تو ایک اپنا پن پایا جاتا ہے، ایسے غصے کا تماشہ دیکھنے کی امید ہو تو شرارت کرنے کو بھی چاہے گا۔

غرض یہ کہ پاکستان اردو اب کو ایک نئی زندگی بخشے گا اور اس میں زندہ قوموں کا لب ولہجہ پیدا ہو سکے گا۔ بہت سے لوگوں کو نئے ادب کی عریانی کی بڑی شکایت ہے۔ مجھے انتظار ہے کہ پاکستان قائم ہو تو اس بدنام 'عریانی' میں بھی آب ورنگ آئے۔ غلاموں کی فحاشی تک تو بے مزہ ہوتی ہے۔

فرانز ہالز (Hals, Frans)...... کی ایک تصویر مجھے بہت پسند ہے 'بوہے مینی' (bohemienne)۔ یوں تو خیر یہ لڑکی ویسے بھی جنس رہی ہے لیکن اس کی رگوں میں نشاطِ زندگی' بلکہ صرف ومحض احساسِ حیات کا وہ جوش ہے کہ اس کے پستان تک کھل کھلائے پڑ رہے ہیں۔ یہ تصویر اس زمانے میں بنائی گئی تھی جب ہالز کا ملک نیا نیا آزاد ہوا تھا اور زندگی کی لہر اِس سرے سے اُس سرے تک دوڑ رہی تھی۔ مسلمان فن کار ایسا آرٹ صرف پاکستان ہی میں پیدا کر سکتے ہیں اور کریں گے۔ پاکستان کا محکمہ احتساب ابھی سے ہوشیار ہو جائے کیوں کہ وہ دن دور نہیں جب اُسے ہماری گوشمالی کرنی پڑے گی۔

ماخذ (اُردو۔۲۵)

واضح حل

ن م راشد

'فحاشی اور احتساب' کا گویا چولی دامن کا ساتھ چلا آتا ہے۔ ہمارے زمانے میں ان دونوں مسئلوں نے خاص اہمیت حاصل کرلی ہے۔ لیکن ان کا کوئی واضح حل آج تک نہیں مل سکا۔ میں اتنا کہہ سکتا ہوں کہ میں ہر قسم کے احتساب کے خلاف ہوں اور اس سے آپ خود یہ نتیجہ اخذ کرسکتے ہیں کہ میں فحاشی پر بھی احتساب کا قائل نہیں ہوں۔ لیکن فحاشی کی کوئی جامع و مانع تعریف آپ کے سامنے پیش نہیں کرسکتا۔ فحاشی کی جو قانونی تعریف کی جاتی ہے وہ کم از کم میرے فہم سے بالاتر ہے۔ فحاشی کے الزام میں بعض اردو ادیبوں پر مقدمے چلائے گئے ہیں۔ اور ان مقدموں میں گواہوں اور وکیلوں نے بیش تر رومی، اور سعدی جیسے بزرگوں کی تصانیف میں فحاشی کا حوالہ دے کر فحاشی کے لیے جواز حاصل کیا ہے یا سرے سے فحاشی کی موجودگی سے انکار کرکے الزام کو رد کرنے کی کوشش کی ہے۔ میرے خیال میں پہلا نقطہ غیر منطقی ہے اور دوسرے میں سراسر ریاکاری پائی جاتی ہے۔

فحاشی کے وجود سے انکار کرنا گویا انسانیت کی یا زندگی کی ہر بنیاد سے انکار کرنا ہے' کیوں کہ فحاشی جس کا اپنا تعلق جنسیت سے ہے انسان کے ساتھ لگی ہے بلکہ اس سے انسان کا خمیر مایہ اُٹھایا گیا ہے۔ اگر حضرت آدم دانۂ گندم نہ کھاتے ہم آپ شاید آج تک جنت ہی میں جمائیاں لے رہے ہوتے۔ بلکہ شاید ہمارا وجود تک کہیں نہ ہوتا۔ فحاشی کی عام تعریف یہ ہے کہ ہر وہ چیز جو سفلی جذبات یعنی شہوت کو اُکسائے۔ یعنی سفلی جذبات یا شہوت کا اظہار اگر پردے کے اندر ہو یا صرف چار بیویوں کے توسط سے ہو تو فحاشی نہیں۔ لیکن اگر اس طرح ہو کہ سب دیکھ سکیں یا کسی مُلاّ کی دعائے برکت اس کام میں شامل نہ ہو تو فحاشی ہے۔ اسی لیے بعض دفعہ یہ رعایت برتی گئی ہے کہ اگر اعضائے مخصوص کا نام کسی طبی کتاب میں لیا جائے تو فحاشی نہیں لیکن کسی نظم یا افسانے میں لیا جائے تو فحاشی ہے۔ اور جو نام لیا جائے وہ ایسا نہ ہو کہ کسی گالی میں استعمال ہوتا ہو۔ یا نام نہاد خواص یعنی 'اُمرا' کی زبان پر جاری نہ ہوسکتا ہو۔

یعنی فحاشی اور جنسیت کا تعلق نہ تو جسمانی صفائی سے ہے، نہ نفسیات سے، نہ طب سے، نہ ادب سے، نہ سائنس سے، نہ علمِ اجتماع سے، بلکہ صرف اس 'اصول' سے کہ جو کام ہم کر رہے ہیں وہ اس طرح چھپ کر کریں کہ دوسروں کو اُس کی تشویق حاصل نہ ہو یعنی وہ دوسرے اس لذت سے محروم رہیں

جس کا حق ہم نے اپنے لیے حاصل کرلیا ہے۔

جہاں تک احتساب کا تعلق ہے پہلی بات تو یہ ہے کہ احتساب کی ضرورت کو رد کرنا بھی مناسب نہیں۔ کیوں کہ احتساب کی ضرورت کو رد کرنا لفظ کی اس قوت کو رد کرنا ہے جس سے ہر حکومت ڈرتی ہے۔ میرے خیال میں احتساب کے بے ہودہ پن کے باوجود لفظ کی اس قوت کا رعب اور خوف قائم رہنا چاہیے جو حکومت کے نزدیک انسان کے فکر اور کردار پر اثر انداز ہوتی ہے۔ اگر ہم لفظ کی اس قوت کے منکر ہو جائیں تو گویا توراۃ اور انجیل سے لے کر کارل مارکس اور اقبال تک کسی کی ضرورت باقی نہ رہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ فحاشی کی سب قدر و قیمت اُس وقت تک ہے جب تک اس پر احتساب ہے۔ یعنی جب تک کسی عمل پر احتساب ہے اور جب تک ہم کسی عمل میں آزاد نہیں ہیں اس میں فحاشی کی لذت بخشنے کا امکان باقی ہے۔ یعنی اگر احتساب ہٹا دیا جائے تو برہنگی اس قدر بے کار ہو کر رہ جائے کہ اس میں لذت شامل کرنے کے نئے ذرائع تلاش کرنا پڑیں!

ماخذ (اُردو۔۱۱)

احتسابی ادارے

قلم بیں

ڈاکٹر خلیل احمد

rekhta

سنسر بورڈ

‘فلم بین’

وقت اور مالی اعتبار سے ہمارا فلم سنسر بورڈ حکومت کے خزانے اور فلمی صنعت دونوں پر ایک بوجھ ہے۔ کیا وہ کسی کے لیے کوئی بھلا کام کر رہا ہے! اگر ایسا ہے تو آیئے دیکھیں کہ وہ کس لیے کیا کر رہا ہے!

جہاں تک مقامی فلموں کا تعلق ہے، جب کسی منظر میں کوئی اداکارہ یا ہیروئن اپنے کُرتے کے دامن کو اونچا یا گلے کو نیچا کرنا چاہتی ہے، سنسر سختی سے اس پر قینچی چلا دیتا ہے۔ مکالمات کے سلسلے میں بھی یہی کچھ کہا جا سکتا ہے۔ سوائے پنجابی فلموں کے جن کے گانے یا رقص با اخلاق قسم کے لوگوں کے لیے ناقابل برداشت ہو جاتے ہیں۔ اس امر سے کم از کم یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ سنسر بورڈ کے اراکین مقامی بولیوں کو ٹھیک سے سمجھ لیتے ہیں۔ اتنی اچھی طرح کہ وہ ان کی قطع و برید کر سکیں۔

مگر سوال یہ ہے کہ آیا اونچے دامن اور کھلے گلے کے مناظر کاٹ دینے سے مقامی فلموں کی حد تک احتساب کا مقصد پورا ہو جاتا ہے! لیکن ایسا نہیں ہے۔ ہماری اداکارائیں سر سے پیر تک چھپی ہوئی ہونے کے باوجود کچھ اس انداز سے بدن اور کولھے ہلاتی ہیں، جسے دیکھ کر کسی مادر زاد برہنہ رقاصہ کو بھی شرم آ جائے گی۔ کسی ایک اردو یا پنجابی فلم کو دیکھ لیجیے اور آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ میں سچ کہہ رہا ہوں۔ آپ دیکھیں گے کہ ہر رقص اور گانے کے دوران لڑکی لڑکے کے ساتھ انتہائی نازیبا انداز میں پوز کر رہی ہے۔ لیکن چوں کہ اس میں لباس کی برہنگی شامل نہیں ہوتی، اس لیے احتساب کرنے والوں کو اس قسم کے ترغیبی مناظر پر اعتراض نہیں ہوتا۔ میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ سنسر بورڈ جس قسم کی عریانی کے پیچھے لگا ہوا ہے وہ ایک سعی لاحاصل ہے۔

جہاں تک انگریزی فلموں کا تعلق ہے، بسا اوقات مجھے سنسر کے اراکین سے ہمدردی ہونے لگتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سنسر شو کے وقت تمام بورڈ کو چھٹی دے دی گئی ہو اور کسی جاہل پنبہ بگوش کو اس ہدایت کے ساتھ بٹھا دیا گیا ہو کہ جب کبھی پردے پر کوئی چیز کپڑوں سے باہر نکلتی ہوئی دکھائی دے، وہ ’کٹ‘ کا نعرہ بلند کر دے اور بس۔ اس طرح یہ ہوتا ہے کہ جب فلم نمائش کے لیے پیش کی جاتی ہے تو اس میں بدن تو کہیں نظر نہیں آتا، لیکن مکالمات عریانی سے بھرے پڑے ہوتے ہیں۔ یہ میرا ذاتی مشاہدہ ہے کہ کوئی بھی انگریزی فلم اپنے تمام تر نازیبا مکالمات کے باوجود پاس ہو سکتی ہے۔ مثلاً ’سولجر

بلیو کو ہی لے لیجیے۔ یہ ایک واقعی خوب صورت فلم ہے، مگر سنسر کے معزز اراکین ہیروئن کی رانیں اور دوسرے اعضا ڈھانپنے میں اتنے مصروف تھے کہ انھیں یہ معلوم ہی نہ ہوا کہ اس کے منہ سے کس قسم کے الفاظ نکل رہے ہیں۔ وہ کچھ اس طرح کے تھے کہ بے چارے شریف ہیرو ’پیٹر اسٹروس‘ کو پوچھنا پڑ گیا کہ ’کیا تم ہمیشہ اس قسم کی باتیں کرتی ہو!‘

معلوم ہوتا ہے کہ سنسر کے اراکین فلموں کا احتساب کرتے وقت محض اپنی آنکھوں سے کام لیتے ہیں اور اس وقت دماغ اور کان کا استعمال غیر ضروری سمجھا جاتا ہے۔ ایک لحاظ سے تو میں ان کا مشکور بھی ہوں کہ صوتی اثرات سے غفلت برتتے ہیں ورنہ جس انداز سے مغربی ذرائع ابلاغ میں انگریزی بولی جاتی ہے، شاید ہم ایک ایسا ملک بن جائیں جہاں ساکت فلمیں دیکھنے کی اجازت ہوگی۔ احتساب کے اس قسم کے احمقانہ اصول کی وجہ سے سب سے زیادہ دھچکہ ہماری فلمی صنعت اور اس کے سرپرستوں کو اس طرح لگا کہ وہ ابھی تک محض ایک فارمولے کے گرد گھوم رہے ہیں۔ اور نتیجہ یہ ہے کہ ہمارے فلمی شائقین محبت اور جنس کے سلسلے میں تا حال ناپختہ ہیں۔ حالاں کہ فلمی صنعت نے ان دونوں موضوعات کو بری طرح برتا ہے۔ یہ لوگ اس قسم کی سڑی ہوئی فلمیں بناتے ہیں جن کا کوئی مقصد نہیں ہوتا۔

ان فلموں میں ایک یا دو عامیانہ رقص پیش کر دیے جاتے ہیں اور فلم کامیاب ہو جاتی ہے۔ ’خطرناک‘ اور ’خان زادہ‘ قسم کی فلموں نے محض چند ایک شہوت انگیز ناچوں کی وجہ سے ہی اتنا پیسہ کما لیا۔ بصورتِ دیگر دونوں فلمیں خام مواد کا وحشیانہ اسراف ہیں۔ اس پر طرہ یہ کہ دونوں فلمیں رنگین بھی نہیں ہیں۔ آج کل ہمارے اسٹوڈیوز صرف تیسرے درجے کی فلمیں ڈھالنے کی مشین میں تبدیل ہو کر رہ گئے ہیں۔ جب تک اس متروک، دقیانوسی اور کٹر جنسی ضابطے میں نرمی نہیں برتی جائے گی اور فلم کو ایک نئی تفریح کا ذریعہ نہیں سمجھا جائے گا، فلم بین طبقہ نسوانی بدن کے چکر سے آزاد ہو کر کسی مقصدی اور تعمیری فلم کا مطالبہ نہیں کرے گا یا پھر کسی بھی ایسی چیز کا جو بدن کی نمائش سے بہتر ثابت ہو سکے۔ یہی ایک طریقہ ہے جس کے ذریعے عوامی ذوق پختہ ہوگا۔ حد سے زیادہ پابندیاں اور ڈھانک چھپائی عوام کو ہمیشہ جنس کے چکر میں مبتلا رکھیں گی۔

یہ بات تو اب بہر حال ثابت ہے کہ سنسر انگریزی فلموں اور اردو فلموں کے سلسلے میں دوہرے معیار سے کام لیتا ہے۔ اول الذکر میں بوسے کی اجازت ہے جب کہ موخر الذکر میں ہونٹوں کو قریب بھی نہیں آنے دیا جاتا۔ اس سلسلے میں سنسر کی طرف سے یہ نقطہ پیدا کیا جاتا ہے کہ بوسہ مغربی تہذیب کا ایک جز ہے اور اسی طرح عریانی بھی۔ مگر سوال یہ ہے کہ کون کہہ سکتا ہے کہ ہماری طرزِ زندگی میں بوسہ شامل نہیں! ہماری فلموں میں بے چارہ ہیرو بر وقت ہیروئن کے چہرے کے گرد اپنی ناک گھماتا ہوا نظر آتا ہے۔ وہ بھی بے چارہ کیا کرے! اس کو اسی طرح سدھایا گیا ہے۔

بعض فلموں کو مضحکہ خیز حد تک کاٹ دیا جاتا ہے۔ فلم 'لیزا' جس میں دنیا کے بہترین اداکار شامل تھے مثلاً کیلیتھرائن ڈینیور اور 'ماسٹروئنو' جب سنسر سے واپس ہوئی تو وہ کل ۳۰ منٹ کی رہ گئی تھی۔ حالاں کہ کوئی بھی سینما گھر اس قسم کی کٹی ہوئی فلم کی نمائش کر کے اپنے فرنیچر اور پردے کی تباہی کا خطرہ مول نہیں لے گا۔ اس لیے جو بھی سینما گھر اس قسم کی مختصر فلمیں دکھاتے ہیں وہ دلچسپی کے لیے کچھ اور سامان مہیا کرتے ہیں۔ مثلاً ان میں انٹرول سے پہلے بیہودہ پنجابی رقص اور مقامی طور پر فلمائے گئے فحش مناظر پیش کیے جاتے ہیں۔ فلم کے اختتام پر ناظرین کے لیے پھر غیر ملکی عریاں فلموں کے مناظر پیش کیے جاتے ہیں۔ ایک خاص عرصے کے بعد متعلقہ حکام کو اس کا علم ہوتا ہے اور سینما گھر پر چھاپا مارا جاتا ہے۔ چوں کہ عموماً سینما گھر والے اس سلسلے میں پہلے سے باخبر ہوتے ہیں' چھاپہ ناکامیاب ثابت ہوتا ہے۔ اور اگر کبھی کامیاب بھی ہوا تو سینما کو پندرہ روز کے لیے بند کر دیا جاتا ہے۔ اس کے دوبارہ کھلنے پر کوئی صاف ستھری فلم پیش کی جاتی ہے مگر شائقین نہیں ہوتے' نتیجتاً وہی حرکتیں دوبارہ کرنا پڑتی ہیں اور ایک مرتبہ پھر یہ سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ یہ سلسلہ کوئی دس سال پرانا ہے۔ لیکن وقت آ گیا ہے کہ کہ اس آنکھ مچولی کو بند کیا جائے اور مسئلے کو ہمیشہ کے لیے حل کر لیا جائے۔ سنسر اراکین کو معلوم ہونا چاہیے کہ اب وہ زمانہ گزر گیا ہے جب محض عورت کا کھلا ٹخنا نظر آنے سے دیکھنے والوں کے جذبات میں ہل چل مچ جاتی تھی۔

اگر پاکستان میں فلمی صنعت کو زندہ رہنا ہے تو سنسر کے اراکین کو فلم بین طبقے کے ساتھ اپنا بزرگانہ رویہ ترک کرنا ہوگا۔ انھیں یہ خیال بھی ترک کرنا ہوگا کہ جنس ایک بری چیز ہے جو فلموں میں گھس آئی ہے اور وہ رفتہ رفتہ ختم ہو جائے گی۔ سنسر بورڈ کی موجودگی میں بھی جنس کسی نہ کسی صورت میں ہماری فلموں میں موجود ہے اور امکانات یہی ہیں کہ وہ موجود رہے گی۔ 'خطرناک' کو جب نمائش کے لیے پیش کیا گیا تو کیا ہوا!! ابتدا میں اس کی نمائش کی اجازت سارے پنجاب کے لیے تھی مگر خاصی دیر کے بعد سنسر بورڈ کو یہ محسوس ہوا کہ اس میں جو کچھ بظاہر نظر آتا ہے اس کے علاوہ بھی بہت کچھ ہے۔ لیکن تقسیم کنندگان نے جن کا پیسہ برباد ہو رہا تھا' ہائی کورٹ سے حکم امتناعی حاصل کر لی اور نتیجتاً فلم کو مزید نقصان پہنچے بغیر اس کی نمائش جاری رہی۔

عریانیت کے سلسلے میں کوئی مستقل پالیسی ہے نہ ہو سکتی ہے۔ یہ دنیا بدلتی رہتی ہے اور اسی کے ساتھ ساتھ تصور سے بھی تیز تر انداز میں یہاں کے قوانین' رسوم اور سماجی قدریں بھی بدلتی رہتی ہیں۔ کل جو چیز فحش تھی آج وہ فیشن میں داخل ہے۔ جو چیز کسی ایک فرد کے لیے اچھی خاصی عریانیت کی حامل ہو' ممکن ہے دوسروں کی نظروں میں بالکل معصوم ہو۔ اور یہی وہ سیال کیفیت ہے جو سنسر کے اراکین کی الجھاؤ کا باعث رہتی ہے۔

عموماً یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ اگر احتساب میں ڈھیل برتی گئی تو لوگ اخلاقی طور پر دیوالیہ ہو جائیں گے۔ یہ ایک کوری بکواس ہے اس لیے کہ عوام اپنے اخلاق سے اچھی طرح واقف ہیں، ورنہ پھر تو اسی دلیل کے سہارے یہ بات بھی کہی جاسکتی ہے کہ چوں کہ سنسر بورڈ کے اراکین ملکی اور غیر ملکی فلموں کو کانٹ چھانٹ سے پہلے دیکھتے ہیں، اس لیے وہ بھی اخلاقی طور پر دیوالیہ پن کے قریب ہوں گے۔ حالاں کہ ایسا نہیں ہے اور یہی بات فلم بین طبقے کے لیے بھی سچ ہے۔

دراصل یہ قینچی کا ناجائز استعمال ہی ہے جو جنس مخالف کی جانب ہمارے نوجوانوں کا رویّہ غیر صحت مند بنا دیتا ہے۔ لڑکیوں پر آوازیں کسنا، ان پر قہقہے لگانا، اور ان کے ساتھ دھکم پیل کرنا ہمارے سینما گھروں، گلیوں اور بازاروں کے عام مناظر ہیں۔ ہمارے کسی ایک نوجوان کا مغرب کے کسی ایک لڑکے کے ساتھ موازنہ کریں۔ کوئی بھی امریکی نوجوان لڑکی پر نظر پڑتے ہی اس قسم کا تماشہ پیش نہیں کرے گا۔ چہ جائے کہ وہ اُسے تاڑنا شروع کردے۔ اس اعتبار سے وہ پاکستانی نوجوانوں کے مقابلے میں زیادہ پختہ ہیں، بہتر اور اخلاقی طور پر زیادہ متمول ہے۔ نوجوانوں کے گھٹے ہوئے جذبات اور احساسات کی نکاسی کے لیے کوئی نہ کوئی سبیل ضرور ہونی چاہیے کیوں کہ یہ ایک فطری امر ہے۔ اس سیفٹی والو کی غیر موجودگی میں ہمارا نوجوان اسی طرح برتاؤ کرے گا جس طرح وہ کرتا ہے۔ پاکستان دنیا میں ان چند ممالک میں سے ہے جہاں آج بھی لڑکیاں اپنی حفاظت کی غرض سے نگہبانوں کی ضرورت محسوس کرتی ہیں۔

میں نے سنسر بورڈ کے ایک رکن سے پوچھا کہ یہ عجیب بات ہے کہ ایک شخص پیسہ خرچ کرنے کے بعد کسی شبینہ کلب میں عورت کو ننگا ناچتے تو دیکھ سکتا ہے مگر پردہ سیمیں پر اس کا عکس بھی نہیں دیکھ سکتا۔ اس رکن نے بچگانہ معصومیت کے ساتھ جواب دیا: لیکن شبینہ کلبوں میں صرف دولت مند لوگ جاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس کے خیال میں اس قسم کی تفریحات محض چند متمول لوگوں کے لئے مخصوص ہونا چاہیے۔ غریب لوگ تو ٹیلی ویژن بھی خرید نہیں سکتے۔ پھر انھیں جنس کی بھی کیا ضرورت ہے! غالباً سنسر حضرات کا خیال ہے کہ یہاں کے عوام جنس سے محروم ہیں۔

سنسر کے اراکین فلموں کے ناموں کے سلسلے میں بہرحال فیاض واقع ہوئے ہیں۔ 'سیکسی سوزن نوز ہاؤ' اور 'سوئفٹ سنس آف سیکسی سوزن' نامی دو فلمیں ابھی حال ہی میں نمائش کے لیے پیش کی گئیں۔ حالاں کہ تمام مناظر پر قینچی چلا کر ایسی فلموں کا نام برقرار رکھنا ان فلم بینوں کے ساتھ دھوکہ کرنے کے مترادف ہے جو موسم سے بے نیاز بھاری تعداد میں پیسہ خرچ کرنے کے لیے باہر نکلتے ہیں اور سنسر بورڈ کے اراکین کی شان میں قصیدے پڑھتے ہوئے مایوسانہ گھر لوٹتے ہیں۔

اگر اس سلسلے میں کسی کا خیال ہے کہ محض چند نافرمان لونڈے فلموں میں آزادی چاہتے ہیں تو اسے چاہیے کہ وہ اپنے خیالات کی دوبارہ جانچ پڑتال کرے اور کسی بھی ایسے سینما گھر جائے جہاں جذبات میں ہلچل مچا دینے والی کوئی فلم دکھائی جا رہی ہو۔ اسے معلوم ہوگا کہ نوجوانوں کے ساتھ ساتھ معمر قسم کے بزرگ بھی قطار میں لگے ہوئے ہیں۔ خود مجھے اس وقت قطعاً حیرت نہیں ہوئی جب میں نے اپنے بزرگ پروفیسر کو کراچی کے ایک سینما گھر میں 'میڈم بواری' کی قطار میں لگے ہوئے دیکھا۔ اس لیے کہ قطع نظر اس واقعے کے وہ بہر حال ایک عام 'صحت مند مرد' بھی تو تھے۔

اب ایک تجویز یہ بھی پیش کی گئی ہے کہ فلم بنانے سے پہلے اس کے مسودے کی جانچ پڑتال کر لی جائے۔ اگر جانچ پڑتال کرنے والوں نے اپنا کام دیانت داری سے نبھایا اور فلم کی تکمیل کے بعد اس میں مزید کتر بیونت نہیں کی تو ہمیں پاکستان میں بہتر فلمیں بننے کی امید رہے گی۔ یہ بات تو بہر حال مقامی فلموں کے سلسلے میں ہے ورنہ غیر ملکی فلموں کے سلسلے میں ابھی کوئی فیصلہ نہیں ہوا۔ کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ ہمیں وہ اسی طرح کٹے پھٹے انداز میں دکھائی جاتی رہیں گی۔ جیسا کہ اب ہو رہا ہے!

ہمیں امید ہے کہ سنسر بورڈ کے اراکین ہوش کے ناخن لیں گے اور اپنے وحشیانہ تعصبات کے لبادے کو الگ کر کے عوام کے اخلاق کی تنگ بانی کا لبادہ اتار پھینکیں گے' جو انھوں نے خود سے پہن لیا ہے۔ وقت آ چکا ہے کہ سنسر بورڈ اخلاقیات کے سودے چکانا بند کر دے۔ عوام الناس کے اخلاق کا انحصار نہ کبھی وفاقی سنسر بورڈ پر تھا نہ ہے اور نہ کبھی ہوگا۔

ماخذ (انگریزی۔40)

پیمرا اور عوامی ذوق کی ضابطہ بندی

ڈاکٹر خلیل احمد

پیمرا، یہ سرکاری ادارہ آج کل اطوفیائی قسم کے مبہم جوؤں کا آلہ کار بنا ہوا ہے۔ یُوں بھی جہاں تک الیکٹرونک میڈیا کا تعلق ہے، شروع میں تو لوگ حکومت کے زیرِ انتظام چلنے والے، پاکستان ٹیلی ویژن کی اذیتیں برداشت کرتے رہے ہیں کیوں کہ انھیں دیکھنے اور سننے کو صرف وہی ملتا جو حکومت چاہتی۔ بعد میں تھوڑی، بہت نرمی برتی جانے لگی اور ساتھ ہی ساتھ سرکاری احتساب کے تحت ہی سہی، مگر دو دوسرے چینلز کو بھی اُن کے اپنے پروگرامز نشر کرنے کی اجازت دے دی گئی۔ مگر اسی دوران ٹیکنالوجی میں ترقی کے باعث لوگوں کو اپنی اپنی پسند کے پروگرام دیکھنے کا موقع بھی مل گیا۔

ڈش انٹینا کی آمد سے اس قسم کی آزادی میں کچھ اور اضافہ ہوگیا، حالاں کہ اس آزادی سے وہی فیض یاب ہوئے جو اُس کی قیمت ادا کر سکتے تھے کیوں کہ حکومت نے اس پر ایک بھاری فیس عائد کر دی تھی۔ پھر تو یہ ہوا کہ چھوٹے قسم کے کاروباری لوگ اس میدان میں گھس آئے اور ایک نیا بزنس شروع ہوگیا یعنی انھوں نے اپنے اپنے چینلز قائم کر کے، ڈش انٹینا کے ذریعے زیادہ سے زیادہ لوگوں کو پروگرامز دکھانا شروع کر دیے۔ کیوں کہ ہر نیا کاروبار ایک نئے ضابطے اور ایک نئے ٹیکس کی زد میں آتا ہے، اس لیے حکومت نے کیبل آپریٹرز پر بھی ٹیکس اور ضابطہ نافذ کرنے کا فیصلہ کیا اور اس طرح مارچ ۲۰۰۲ء میں 'پیمرا' وجود میں آگئی۔

'پیمرا' کے ذمے جو فرائض عائد کیے گئے وہ یہ تھے: (۱) اطلاعات، تعلیم اور تفریحی پروگراموں کا معیار بلند کرنا۔ (۲) حالات حاضرہ' مذہبی تعلیم' سائنس' ٹیکنالوجی' معاشی ترقی' فن و ثقافت' موسیقی' ڈراموں' کھیل کود اور دیگر عوامی اور قومی سرگرمیوں کا دائرہ وسیع کرنا۔ (۳) مقامی اور کمیونٹی کی سطح پر ذرائع ابلاغ کی اس طرح اصلاح کرنا کہ وہ ذمہ داریوں اور طاقت کو نچلی سطح پر منتقل کرنے میں ممد ثابت ہو سکے اور (۴) اطلاعات و معلومات وغیرہ کا آزادانہ بہاؤ اتنا زیادہ کرنا کہ شفافیت' جواب دہی اور بہتر حکمرانی کو یقینی بنایا جا سکے۔

لیکن اب پیمرا جس طرح کا کام کر رہی ہے وہ تو ان فرائض سے سراسر مختلف ہے۔ اطلاعات، تعلیم اور تفریحی پروگراموں کا معیار بہتر ہونے کی بجائے اور بھی خراب ہو رہا ہے۔ حالات

حاضرہ، فن وثقافت، سائنسی پروگراموں، موسیقی، کھیل کود، ڈراموں، مقامی اور کمیونٹی سطح پر، ذرائع ابلاغ کی کارکردگی بہتر ہونے کی بجائے اور خراب ہورہی ہے۔ ذمے داریوں اور طاقت کو نچلی سطح پر منتقل کرنے کی راہ میں روڑے اٹکا رہی ہے۔۔ یہی نہیں بلکہ پیمرا تو اطلاعات و معلومات کے بہاؤ میں اضافہ کرنے، شفافیت، جواب دہی اور بہتر حکمرانی کی راہیں ہموار کرنے کی بجائے اس بہاؤ کو روکنے میں لگی ہوئی ہے۔

کیبل ٹی وی کا چینل چلانے کے لیے جو آٹھ قسم کا ہوتا ہے (بی۔ ۱ سے لے کر بی۔ ۸ تک) اس کے لیے ایک لائسنس ضروری ہوتا ہے جس کی بنیاد چندہ دہندگان کی تعداد پر منحصر ہوتی ہے۔ اس کی ان نامناسب شرائط کے علاوہ، ان کیبل آپریٹرز کو قابو میں رکھنے کے لیے' اپنے نرخوں کے ڈھانچے میں ہیر پھیر کرتی رہتی ہے۔ پیمرا کی فہرست پر آنے کے لیے ایک نئی چینل چلانے والی پارٹی کے لئے ضروری ہے کہ وہ اس مقصد کے لیے ایک باقاعدہ درخواست پیش کرے۔ نہ صرف یہ بلکہ اس پارٹی کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ اپنے پروگرامز کو پیمرا کے سامنے پیش کرے تاکہ اُن کے مافیہ کے بارے میں فیصلہ کیا جاسکے۔

پیمرا نے ایک اور کارروائی یہ کی ہے کہ اس نے مختلف غیر ملکی چینلز خصوصاً بھارتی چینلز پر کسی نہ کسی بہانے کئی ایک پابندیاں عائد کردی ہیں اور وہ بھی عوامی خواہشات اور مطالبوں کے بالکل برعکس۔ مگر' پیمرا کی اپنی ذمے داریوں سے مکمل انحراف کی مثال اس کی وہ ۵۴ غیر ملکی کیبل ٹی وی چینلز کی فہرست ہے' جو ہر کسی کیبل آپریٹر کے گاہکوں کے مطالبے پورا کرنے میں آڑے آتی ہے۔ یہ فہرست نہ صرف یہ کہ کیبل ٹی وی کے کاروبار کے لیے ایک رکاوٹ ہے بلکہ عوامی پسند پر پابندی لگائے جانے کے مترادف بھی ہے۔

یہ فہرست کچھ اس قسم کی شرائط کے ساتھ منتھی ہے کہ مثلاً' ان ٹی وی آپریٹرز کو اپنے اپنے پروگرامز کے وہ تمام حصے حذف کرنا ہوں گے جو کسی نہ کسی طرح پیمرا کے کسی بھی ضابطے کی خلاف ورزی کرتے نظر آتے ہیں۔ اس فہرست میں ۹ خبریات کی چینلز (۲ عربی، ۷ انگریزی) ، ۸ تعلیمی، اطلاعاتی (انگریزی)، ۶ برائے اطفال (انگریزی)، ۱۲ کھیل کود، ۷ تفریحی (۹ یا ۱۰ انگریزی، ایک چینی، ایک بنگالی، ایک ترکی) اور ۲ مذہبی چینلز شامل ہیں۔

پیمرا کی اپنی اس پسند میں پاکستان کی کسی علاقائی زبان یا اردو زبان کا کوئی چینل شامل نہیں کیا گیا جس کا مطلب یہ ہے کہ لوگوں کو مجبور کیا جارہا ہے کہ وہ صرف انھی چینلز کو دیکھیں۔ مگر ناظرین تو اس بات پر واقعی حیران ہیں کہ آخر اس فہرست میں کسی بین الاقوامی اردو چینل کو شامل کیوں نہیں کیا گیا! شاید اس لیے کہ زیادہ تر اُردو چینلز بھارتی ہیں اور ان کے پروگرامز یہاں کے ناظرین کے لیے کسی

'ثقافتی حملے' کا ذریعہ بن سکتے ہیں۔

لیکن اگر ہم دیکھیں تو دوسری طرف کہانی کچھ اور ہی ہے۔ ۱۹۸۰ء میں جب پہلی بار ایک بھارتی فلم 'لاہور' کے لیے ٹیلی کاسٹ کی گئی تو ہوا یہ کہ مارکیٹ کے سارے کے سارے ٹی وی سیٹس اور انٹینا بک گئے۔ یہی نہیں بلکہ اس فلم کو دیکھنے کے لئے پاکستان کے دوسرے شہروں سے آنے والوں کی لاہور میں ایک بھیڑ سی لگ گئی۔ پھر جب کئی ماہ بعد، ان بھارتی فلموں کو دیکھنے پر پابندی عائد کردی گئی تو وہاں پر، خاص طور پر خواتین نے اس پابندی کے خلاف احتجاجی تحریک چلائی اور ان کا اصرار تھا کہ انھیں اُن کی پسند کی فلمیں دیکھنے کا حق حاصل ہونا چاہیے۔

یُوں بھی، بھارتی فلموں یا دوسرے تفریحی ذرائع ابلاغ پر اس طرح کی پابندی، شہری آزدیوں کی سراسر خلاف ورزی ہے۔ اس طرح ہو یہ رہا ہے کہ بجائے اس کے کہ میڈیا عوام کو ان کی پسند کے پروگرام مہیا کرے، میڈیا عوام پر اپنی پسند کے پروگرام مسلط کر رہی ہے۔ میڈیا کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ 'عوامی ذوق' کو ٹھیک کرنے میں لگ جائے کیوں کہ اُسے یہ حق دیا ہی نہیں گیا اور نہ وہ اُس کی اہل ہے۔

(غیر مطبوعہ)

دالتی فیصلے

❋ 'یولی سیز'

❋ 'گوڈز لٹل ایکرز'

☆☆☆☆☆

❋ اسداللہ خاں غالب بنام مولوی امین الدین (ڈاکٹر مولوی عبدالحق)

☆☆☆☆☆

❋ ٹھنڈا گوشت (سعادت حسن منٹو)
(۱) مجسٹریٹ درجہ اوّل
(۲) اپیل برائے سیشن
(۳) اپیل برائے ہائی کورٹ

❋ بو اپیل

❋ میری ایکٹریس بھابی	عصمت چغتائی
❋ وہ بچہ کیا جانے!	عشرت رحمانی
❋ وہ آوارہ ہوگئی	سعید امرت
❋ آفت کا ٹکڑا	حاجی فضل الرحمٰن خاں
❋ ضبط شدہ پینٹنگز	(ملکیت) جے اے رحیم

'یُولی سیز'

ریاست ہائے متحدہ نے ۱۹۳۱ء کے ٹیرف ایکٹ' دفعہ ۳۰۵' قانون ریاست ہائے متحدہ' شق ۱۹' دفعہ ۱۳۰۵ کے ماتحت جیمز جوئس کی کتاب 'یولی سیز' کے خلاف اس بنا پر ضبطی کا مطالبہ پیش کیا ہے کہ اس دفعہ کی رو سے یہ کتاب فحش ہے اور اس لئے ریاست ہائے متحدہ کی حدود میں نہیں لائی جا سکتی' بلکہ قانوناً اسے ضبط کر کے برباد کیا جا سکتا ہے۔ اس مطالبے کے ساتھ ایک اقرار نامہ بھی ہے جس کا ذکر بعد میں ہوگا۔

ضبطی کے حکم کے حق میں اور اس مقدمے کو خارج کر دینے کی تجویز کے خلاف ریاست ہائے متحدہ کی طرف سے سرکاری وکیل سیموئیل سی کول من اور نکولس اٹیلس ہیں۔ مقدمے کو خارج کر دینے کی تجویز کے حق میں اور ضبطی کی تجویز کے خلاف مدعا علیہ رینڈم ہاؤس کی طرف سے میسرز گرین بام ولف اور ارنسٹ' وکیل ہیں جن کی نمائندگی مورس ایل ارنسٹ اور الیگزنڈر لینڈے کر رہے ہیں۔

مقدمے کو خارج کرنے کی تجویز منظور کی جاتی ہے اور نتیجہ کے طور پر ضبطی کا حکم صادر کرنے کی سرکاری تجویز کو رد کیا جاتا ہے۔ لہٰذا یہاں یہ حکم درج کیا جاتا ہے کہ مقدمہ بغیر جرح کے خارج کر دیا گیا۔ اس مقدمے میں اس اصول کی پیروی کی گئی ہے جو میں نے ریاست ہائے متحدہ بنام ایک کتاب 'ضبط تولید' ف ۵۱ (۲ د) ۵۲۵ و (د) حوالے مقدمے کے ضمن میں پیش کی تھی اس کی تفصیل یوں ہے: 'یولی سیز' کی ضبطی کے متعلق مدعی علیہ کا جواب داخل ہو جانے کے بعد ریاست ہائے متحدہ کے سرکاری وکیل کے دفتر اور مدعی علیہ کے وکیلوں کے درمیان ایک اقرار نامہ ہوا جس کی شرائط یہ ہیں:

(۱) کتاب 'یولی سیز' مقدمے کا حصہ سمجھی جائے اور اس میں شامل کر لی جائے۔ گویا یہ کتاب پوری کی پوری مقدمے کے ماتحت آتی ہے (۲) فریقین جیوری کے ذریعہ مقدمے کے حق سے دستبردار ہوتے ہیں (۳) ہر فریق نے منظور کر لیا ہے کہ وہ اپنے حق میں فیصلہ صادر ہونے کی تجویز پیش کرے گا۔ (۴) یہ تجویزیں پیش ہونے کے بعد عدالت قانونی مسائل اور دوسرے امور کے متعلق فیصلہ کر سکے گی اور ان کے متعلق عمومی حیثیت سے اپنی رائے دے سکے گی۔ (۵) ان تجویزوں کے متعلق فیصلہ ہو جانے کے بعد عدالت کا فیصلہ اس طرح درج ہوگا گویا یہ فیصلہ باقاعدہ مقدمے کے بعد ہوا ہو۔ میرے خیال میں ایسی کتابوں کی ضبطی کے مقدمے کے لئے یہ طریق کار بہت مناسب ہے۔ یہ طریق کار خصوصاً

موجودہ مقدمے کے لئے بہت ہی کارآمد ہے کیونکہ 'یولی سیز' کی طوالت اور اسے پڑھنے کی دشواری کے پیش نظر جیوری کے ذریعے مقدمہ اگر ناممکن نہیں تو انتہائی غیر تسلی بخش ضرور ہوتا۔

(۲) میں نے 'یولی سیز' ایک دفعہ تو پوری پڑھی ہے اور جن حصوں کی حکومت کو خاص طور سے شکایت ہے' انہیں کئی دفعہ پڑھا ہے۔ دراصل کئی ہفتوں سے میرا سارا فرصت کا وقت اسی مقدمے کے متعلق غور و خوض کرنے میں صرف ہو رہا ہے جس کے بارے میں فیصلہ دینے کا فرض میرے اوپر عائد ہوا ہے۔ 'یولی سیز' کوئی ایسی کتاب نہیں ہے جسے آسانی سے پڑھا یا سمجھا جا سکے۔ لیکن اس کے بارے میں بہت کچھ لکھا گیا ہے اور اس پر ٹھیک طرح غور کرنے کے لئے یہ بہتر ہوگا کہ بہت سی دوسری کتابیں بھی پڑھ لی جائیں جو اس کتاب کے خوشہ چینیوں میں ہیں۔ چنانچہ 'یولی سیز' کا مطالعہ بڑا مشکل کام ہے۔

(۳) بہرحال' ادبی دنیا میں 'یولی سیز' کی جو شہرت ہے وہ اس بات کی متقاضی تھی کہ میں اس پر جتنا بھی وقت ضروری ہو' صرف کروں تاکہ مجھے اس مقصد کے متعلق پوری پوری تشفی ہو جائے جس کے ماتحت یہ کتاب لکھی گئی ہے۔ کیونکہ جب کسی کتاب پر فحش ہونے کا الزام لگایا جائے تو پہلے یہ طے کرنا ضروری ہے کہ اس کتاب کے لکھنے کا مقصد عام محاورے کے مطابق عریاں نگاری تھا یا نہیں' یعنی یہ کتاب عریانی سے ناجائز فائدہ اٹھانے کی غرض سے لکھی گئی ہے یا نہیں! اگر ہم اس نتیجے پر پہنچیں کہ یہ کتاب عریاں نگاری کے تحت آتی ہے تو بس تحقیقات پوری ہوگئی اور کتاب کی ضبطی لازمی ہے۔ مگر 'یولی سیز' میں غیر معمولی صاف گوئی کے باوجود مجھے کہیں بھی شہوت پرستی کا شائبہ تک نہیں ملتا۔ چنانچہ میری رائے ہے کہ یہ کتاب فحش نگاری کے ماتحت نہیں آتی۔

(۴) 'یولی سیز' لکھتے ہوئے جوئس نے ایک بالکل نادر قسم کی ادبی صنف میں نہ سہی تو کم سے کم ایک نئی صنف میں سنجیدگی کے ساتھ ایک تجربہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس نے نچلے متوسط طبقے کے کچھ لوگ لئے ہیں جو ۱۹۰۴ء میں شہر ڈبلن میں رہتے ہیں۔ ایک طرف تو وہ یہ بیان کرتا ہے کہ اس سال شروع جون میں ایک دن اپنے روزمرہ کے کاروبار کے سلسلے میں شہر میں پھرتے ہوئے ان لوگوں نے کیا کیا کام کئے اور ساتھ ہی یہ بھی بتاتا ہے کہ ان میں سے کئی لوگ اس دوران میں کیا سوچتے رہے!

میں تو سمجھتا ہوں کہ جوئس نے بڑی کامیابی کے ساتھ یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ شعور کے پردے پر تاثرات اسی طرح جلدی جلدی بدلتے ہیں جیسے سیربین میں مناظر۔ یہ پردہ اس تختی کی طرح ہے جس پر بیک وقت نیچے اوپر دو تحریریں لکھی ہوں۔ ایک آدمی اپنے چاروں طرف جو حقیقی چیزیں دیکھتا ہے وہ بھی اس پردے پر نظر آتی ہیں اور ان کے ساتھ ہی ساتھ پچھلے تاثرات کے دھندلے خاکے بھی جن میں کچھ تو حال ہی کے ہوتے ہیں اور کچھ تلازمۂ خیال کی مدد سے لاشعور سے ابھر آتے ہیں۔ جوئس نے پہلے یہی عمل پیش کیا ہے۔ اس نے دکھایا ہے کہ جو کردار وہ پیش کر رہا ہے' اس کے افعال

واعمال اور اس زندگی پر ان میں سے ہر تاثر کس طرح اثر انداز ہوتا ہے۔ جوئس جو چیز پیش کرنی چاہتا ہے وہ کچھ اس طرح کی ہے جیسے سینما کی فلم پر دو دفعہ یا ممکن ہو تو کئی دفعہ تصویر کھینچی جائے جس میں اصلی منظر تو صاف ہو اور پس منظر دکھائی دیتا ہو مگر کچھ دھندلا سا اور مختلف درجوں میں فوکس سے باہر۔ اس قسم کا اثر مصوری والی تکنیک زیادہ اچھی طرح پیدا کر سکتی ہے۔ لیکن جوئس نے یہ اثر لفظوں کے ذریعے پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ میرے خیال میں 'یولی سیز' پڑھتے ہوئے آدمی کو جس ابہام اور مشکل پسندی سے سابقہ پڑتا ہے' اس کا بہت بڑا سبب یہی ہے اور اس سے کتاب کے ایک اور پہلو پر بھی روشنی پڑتی ہے جس پر میں آگے چل کر غور کروں گا' یعنی جوئس کا خلوص اور صحیح صحیح طور پر یہ دکھانے کی ایماندارانہ کوشش کہ اس کے کرداروں کے دماغ کس طرح عمل کرتے ہیں۔

جوئس نے 'یولی سیز' میں جو تکنیک اختیار کی ہے' اگر وہ اس پر عمل کرنے میں پوری پوری ایمانداری نہ برتتا تو نفسیاتی اعتبار سے نتیجہ گمراہ کن اور اس کے انتخاب کردہ تیکنک کے بالکل خلاف ہوتا۔ فن کے نقطہ نظر سے ایسا رویہ ناقابل معافی ہوتا۔ چونکہ جوئس نے اپنی تکنیک سے پوری وفاداری برتی ہے اور اس کے جو لازمی نتائج ہوتے ہیں ان پر عمل کرنے سے نہیں گھبرایا بلکہ اس نے ایمانداری سے پوری پوری طرح یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ کردار کن چیزوں کے بارے میں سوچ رہے ہیں' اسی لئے جوئس پر اتنے حملے ہوئے ہیں۔ اس کے مقصد کو اکثر غلط طور پر سمجھا گیا ہے اور اس کی غلط ترجمانی کی گئی ہے۔ اپنا مقصد حاصل کرنے کی ایماندارانہ اور پرخلوص کوشش میں اسے اتفاق سے چھ ایسے لفظ استعمال کرنے پڑے ہیں جنہیں عام طور پر فحش سمجھا جاتا ہے اور اس بنا پر وہ صورت حال پیدا ہوئی ہے جس کی وجہ سے لوگ کہتے ہیں کہ اس کے کرداروں کے خیالات میں جنسیات کو بہت ہی زیادہ دخل ہے۔

جن لفظوں پر فحش ہونے کا الزام لگایا جاتا ہے' وہ پرانے 'سیکسن' الفاظ ہیں جن سے تقریباً تمام مرد' بلکہ میں تو کہوں گا کہ بہت سی عورتیں بھی واقف ہیں۔ جن لوگوں کی جسمانی اور ذہنی زندگی جوئس بیان کرنے کی کوشش کر رہا ہے' وہ لوگ میرے خیال میں تو ایسے الفاظ عادتاً اور بالکل فطری طور پر استعمال کرتے ہیں۔ جہاں تک کرداروں کے دماغ میں بار بار جنس کا موضوع ابھر آنے کا تعلق ہے' یہ بات ہمیشہ یاد رکھنا چاہئے کہ جوئس کے کردار کیلٹ نسل کے ہیں اور یہ بہار کا زمانہ ہے۔ جوئس جیسی تکنیک استعمال کرتا ہے اس سے لطف اٹھانا تو اپنے مذاق پر منحصر ہے جس کے متعلق بحث یا اختلاف رائے بیکاری چیز ہے لیکن اس تکنیک کو کسی اور تکنیک کے معیار سے پرکھنا تو مجھے بالکل مہمل بات معلوم ہوتی ہے۔ لہٰذا میری رائے ہے کہ 'یولی سیز' ایک ایماندارانہ اور پرخلوص کتاب ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ جن عقلی دلائل پر اس کتاب کی بنیاد رکھی گئی ہے ان کے سامنے یہ اعتراضات بالکل نہیں ٹھہرتے۔

(۵) اس کے علاوہ اگر ہم اس پر غور کریں کہ جوئس نے اپنے سامنے جو مقصد رکھا تھا وہ کتنا مشکل تھا مگر اسے بڑی حد تک کامیابی حاصل ہوئی ہے، تو پتہ چلتا ہے کہ ‘یولی سیز’ جوئس کی ہنرمندی کا بڑا حیرت انگیز مظاہرہ ہے۔ جیسا میں کہہ چکا ہوں ‘یولی سیز’ کوئی آسان کتاب نہیں ہے۔ کبھی تو بہت شاندار ہو جاتی ہے اور کبھی بالکل بے رنگ، کہیں تو آسانی سے سمجھ میں آ جاتی ہے کہیں بالکل معلق ہو جاتی ہے۔ اس میں بہت سی ایسی جگہیں ہیں جہاں مجھے گھن آنے لگتی ہے۔ حالانکہ جیسا میں پہلے کہہ چکا ہوں، اس کتاب میں بہت سے ایسے الفاظ ہیں جنہیں عام طور سے گندا سمجھا جاتا ہے مگر مجھے اس میں کوئی ایسی چیز نہیں ملتی جسے میں ‘فحش برائے فحش’ سمجھ سکوں۔ جوئس اپنے پڑھنے والوں کے لئے جو تصویر بنانے کی کوشش کر رہا ہے اس میں کتاب کا ہر لفظ ایک لازمی جز کا حکم رکھتا ہے۔ جیسے پچی کاری میں ذرا ذرا سی تفصیل پورے نقش کو مکمل کرنے میں مدد دیتی ہے۔

جوئس جن لوگوں کا نقشہ کھینچ رہا ہے، ان سے اگر کوئی نہ ملنا چاہے تو یہ اس کی مرضی ہے۔ ممکن ہے کوئی آدمی ان سے بالواسطہ بھی تعلق نہ رکھنا چاہے اور اس وجہ سے ‘یولی سیز’ نہ پڑھنا چاہتا ہو، یہ بات سمجھ میں آتی ہے لیکن جب لفظوں کا ایسا حقیقی فنکار جیسا لوئس، بے شک و شبہ، یورپ کے ایک شہر میں رہنے والے نچلے متوسط طبقے کی اصلی تصویر کھینچنا چاہے تو کیا امریکا کے لوگوں کے لئے یہ تصویر دیکھنا قانونا ممنوع ہونا چاہئے؟ اس سوال کا جواب دینے کے لئے محض یہ سمجھ لینا کافی نہیں ہے کہ جیسا میں اوپر کہہ آیا ہوں، جوئس نے ‘یولی سیز’ اس مقصد کے ماتحت نہیں لکھی جسے عام طور سے فحش نگاری کہا جاتا ہے۔ یہ کتاب جس مقصد سے لکھی گئی ہے اس سے قطع نظر یہ معلوم کرنے کے لئے فی الجملہ اس کتاب کا اثر کیا ہوتا ہے مجھے چاہئے کہ اسے ایک اور زیادہ معروضی معیار سے جانچوں۔

(۶) وہ قانون جس کے ماتحت یہ مقدمہ دائر کیا گیا ہے، جہاں تک اس وقت ہمارا تعلق ہے صرف غیر ملکوں سے ریاست ہائے متحدہ کے اندر کوئی ‘فحش کتاب’ لانے کو مذموم قرار دیتا ہے۔ ۱۹۳۰ء کے ٹیرف ایکٹ کی دفعہ ۳۰۵، شق ۱۹، قانون ریاست ہائے متحدہ، دفعہ ۱۳۰۵، اس قسم کے معاملات سے متعلق قانون میں عام طور سے جو الزامی اسمائے صفت پائے جاتے ہیں وہ اس دفعہ میں کتابوں کے خلاف استعمال نہیں کئے گئے ہیں۔ چنانچہ مجھے یہ طے کرنا ہے کہ اس لفظ کی قانونی تعریف کی حدود میں ‘یولی سیز’ فحش ہے یا نہیں! عدالت نے قانون کے اعتبار سے لفظ ‘فحش’ کے جو معنی مقرر کئے ہیں وہ یہ ہیں:

‘جس سے جنسی خواہشات کے حرکت میں آنے یا جنسی اعتبار سے ناپاک اور شہوت انگیز خیالات پیدا ہونے کا امکان ہو۔’ ڈنلپ بنام ریاست ہائے متحدہ، ۱۶۵ یو ایس ۴۸۶، ۵۰۱، ریاست ہائے متحدہ بنام ایک کتاب مسمی بہ ‘ازدواجی محبت’ ۴۸ ف (۲ د) ۸۲۱، ۸۲۴، ریاست ہائے متحدہ بنام ایک

کتاب، مسمی بہ ضبط تولید، ۵۱ ف (۲ و)، ۵۲۵، ۵۲۸، اور مقابلے کے لئے ڈائی سارٹ بنام ریاست ہائے متحدہ ۲۷۲ یو ایس ۶۵۵، ۶۵۸، سٹورنگن بنام ریاست ہائے متحدہ ۱۶۱ یو ایس ۴۴۶، ۴۵۰ ریاست ہائے متحدہ بنام ڈینیٹ، ۳۹ ف (۲ و) ۵۶۴، ۵۶۸، ک ک (۲) چیپل بنام وینڈ لنگ، ۲۵۸ ن ی، ۴۵۱، ۴۵۳۔

ایک خاص کتاب ایسے جذبات اور خیالات پیدا کر سکتی ہے یا نہیں، اس کا فیصلہ عدالت کی رائے کے ذریعے یہ دیکھ کر ہو گا کہ اوسط درجے کی جنسی جبلتیں رکھنے والے آدمی پر اس کا کیا اثر ہوتا ہے۔ ایسے آدمی پر جسے فرانسیسی 'معمولی قسم کی حسیات رکھنے والا انسان' کہتے ہیں اور جس کی حیثیت قانون تفتیش کی اس شاخ میں ایک فرضی عامل کی ہوتی ہے جسے عدالت خفیفہ کے مقدموں میں ''سمجھ بوجھ والے آدمی'' کی حیثیت ہوتی ہے یا رجسٹری کے قانون میں ایجاد کے مسئلے کے متعلق 'فن کے ماہر' کی۔ ایسے فرضی عامل کے استعمال میں خطرہ یہ ہوتا ہے کہ جو آدمی ان چیزوں کے بارے میں فیصلہ کر رہا ہے وہ خواہ کتنا ہی غیر جانبدار کیوں نہ رہنا چاہتا ہو مگر اس کے اندر یہ فطری رجحان ہوتا ہے کہ اس عامل کو اپنے ذاتی میلانات کا بہت زیادہ پابند بنا دے۔ یہاں میں نے کوشش کی ہے کہ اگر ممکن ہے تو اس خطرے سے بچوں اور اپنے عامل کو حتی الوسع معروضی بناؤں۔ اس کے لئے میں نے یہ طریقہ اختیار کیا ہے:

'یولی سیز' کا جو پہلو زیر غور ہے اس کے متعلق اپنا فیصلہ کر چکنے کے بعد میں نے اپنے تاثرات کا مقابلہ دو دوستوں کے تاثرات سے کیا جو میرے خیال میں ایسے معروضی عامل کی مندرجہ بالا شرائط پوری کرتے تھے۔ میں ان ادبی مشیروں سے الگ الگ ملا اور ان میں سے کسی کو بھی یہ معلوم نہیں تھا کہ میں دوسرے آدمی سے بھی مشورہ لے رہا ہوں۔ یہ دونوں ایسے آدمی ہیں کہ ادب اور زندگی دونوں کے بارے میں ان کی رائے کا بڑا احترام کرتا ہوں۔ ان دونوں نے 'یولی سیز' پڑھی تھی اور ان کا مقدمے سے ذرا بھی تعلق نہیں تھا۔ میں نے اپنے مشیروں کو یہ نہیں بتایا کہ میرا فیصلہ کیا ہے۔ میں نے انہیں فخش کی قانونی تعریف بتا دی اور دونوں سے الگ الگ پوچھا کہ اس تعریف کی حدود کے اندر آپ کے خیال میں 'یولی سیز' فخش ہے یا نہیں؟ میں نے یہ بات بڑی دلچسپی سے سنی کہ وہ دونوں میری رائے سے متفق تھے۔ یعنی یہ کہ اگر 'یولی سیز' کو مجموعی طور سے پڑھیں جیسے اس قسم کا فیصلہ کرنے کے لئے ہر کتاب کو پڑھنا چاہئے تو اس سے جنسی خواہشات یا شہوت انگیز خیالات نہیں بھڑکتے، بلکہ 'یولی سیز' کا آخری اثر ان دونوں پر یہ مرتب ہوا کہ انہیں یہ کتاب مردوں اور عورتوں کی زندگی کی ذرا المناک سی اور بڑی مؤثر تفسیر معلوم ہوئی۔

قانون کا تعلق صرف اس اوسط درجے کے آدمی سے ہے جو اپنے ہوش و حواس میں ہو۔ چنانچہ 'یولی سیز' جیسی کتاب کے سلسلے میں نقش نگاری کی صرف ایک ہی مناسب کسوٹی ہو سکتی ہے اور یہ وہی ہے جو میں نے بتائی ہے کیونکہ یہ کتاب انسانیت کے مشاہدے اور بیان کا ایک نیا ادبی اسلوب وضع کرنے کی سنجیدہ اور پرخلوص کوشش ہے۔

مجھے پورا احساس ہے کہ 'یولی سیز' کے بعض حصے اتنے تند و تیز ہیں کہ اوسط درجے کے حساس آدمی سے برداشت نہیں ہو سکتے۔ مگر بہت طویل غور و خوض کے بعد میری رائے یہ ہے کہ گو بہت سی جگہ پڑھنے والے پر 'یولی سیز' کا اثر کچھ کراہت انگیز تو ہوتا ہے، مگر شہوت انگیز کہیں بھی نہیں ہوتا۔ لہٰذا 'یولی سیز' ریاست ہائے متحدہ کی حدود میں لائی جا سکتی ہے۔

جون' ایم وولزے
ڈسٹرکٹ جج
(۶ر دسمبر ۱۹۳۳ء)

’دگوڈز لیٹل ایکر‘

مشہور امریکی ناول نگار ارسکائن کالڈویل کے ناول ’گوڈز لیٹل ایکر‘ کی اشاعت کے پورے دو سال بعد نیویارک کی ’اخلاقی برائیوں کے انسداد کی انجمن‘ نے وائکنگ پریس پر اس ناول کو شائع کرنے کے جرم میں مقدمہ چلایا۔ مقدمے کا چلنا تھا کہ تمام امریکی پریس میں شور مچ گیا۔ ملک کے مشہور قلم کاروں نے ملک کے موٴقر جرائد میں انجمن کے اس اقدام کے خلاف احتجاج کے طور پر مراسلے، مقالے شائع کرانے شروع کیے اور جب عدالت کی توجہ مضامین کی طرف دلائی گئی تو استغاثہ کے وکیل مسٹر سمنر نے عدالت کو مخاطب کرتے ہوئے کہا:

’ہمیں ایسے معاملات سے پہلے بھی سابقہ پڑ چکا ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آیا کسی فوجداری استغاثے کو فیصل کرنے کا حق ایسے جانبدار فریق کو ہے جو پریس میں شور مچا سکتا ہے اور جس کا مفاد عوام الناس کی بہبود سے قطعاً وابستہ نہیں ہے، یا پھر فیصلے کا حق ان عدالتوں کو ہے جو اس مطلب کے لئے بنائی گئی ہیں اور جو محض مصنفوں کے طائفے ہی کی نہیں بلکہ سب کی برابر نمائندگی کرتی ہیں۔‘

مسٹر سمنر نے اس قبیل کے ایک اور مقدمے کے فیصلے میں فاضل جج کے ان ریمارکس کا حوالہ دیا: ’نقش نگاری کا معاملہ، متوازن دل و ذہانت کے آدمیوں کی رائے کے مطابق طے ہونا چاہئے نہ کہ غیر متوازن دل و دماغ رکھنے والے آدمیوں کی رائے کے مطابق۔ اگر ان حالات میں قانون کو منضبط کرنے کی اجازت غیر معقول آدمیوں کو دے دی گئی تو نتائج بے حد افسوس ناک ہوں گے۔ فاضل جج کے ان الفاظ کی ترجمانی کرتے ہوئے مسٹر سمنر نے عدالت سے کہا: ’اگر ہم فاضل جج کے الفاظ غیر متوازن دل و دماغ کے آدمیوں کی جگہ ایک لفظ یعنی ’مصنفین‘ رکھ دیں تو یقیناً ان تمام مراسلوں، مقالوں اور مضمونوں کی، جو اس کتاب کے مصنف کے حق میں شائع ہوئے ہیں، پوری حقیقت کھل جائے گی۔‘

مسٹر سمنر کی اس ترجمانی پر نیویارک کی عدالت مذکورہ کے فاضل جج مسٹر بنجمن گرین چپین نے اپنا فیصلہ دیتے ہوئے کہا: ’مسٹر سمنر نے ملک کے ادبی اور تعلیمی حلقہ خیال کے رہنماؤں کی معقولیت کے ساتھ فیصلہ کرنے کی صلاحیت پر اعتراض کیا ہے، عدالت اس کی تائید نہیں کر سکتی۔ عدالت یہ باور کرنے سے انکار کرتی ہے کہ لوگوں کا اتنا بڑا اور نمائندہ گروہ کسی ایسی کتاب کی خواہ مخواہ حمایت پر تل سکتا ہے جس کی اہمیت اور جس کے ادبی اوصاف پر وہ دل سے یقین نہیں رکھتا۔ عدالت کی صحیح اور پختہ رائے

یہ ہے کہ غیر معتدل لوگوں کے اس گروہ میں کسی ادبی تخلیق کی قدر و قیمت کے تعین کی صلاحیت ان لوگوں سے کہیں بڑھ کر ہے جو کتاب کو مجموعی حیثیت سے دیکھنے کے بجائے اس میں سے ادھر ادھر کے چند عریاں اقتباس نکالنے ہی کی استطاعت رکھتے ہیں:

'عدالت نے اس کتاب کو بڑے غور سے پڑھنے کے بعد یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ مصنف نے حقیقت پسندانہ طریقے سے اس کتاب میں جنوبی ریاستوں کے ان پڑھ دیہاتی کاشتکار کنبے کی طرز زندگی کی صحیح تصویر کشی کی ہے۔ اس کنبے کی ایک لڑکی جنوب کے صنعتی قصبے کے کسی مزدور سے بیاہی گئی ہے جہاں تھکا دینے اور اکتا دینے والی دہقانی زندگی اور صنعتی قصبے کی زندگی میں باہمی تفاعل پیدا ہو جاتا ہے۔ گاؤں اور قصبے دونوں جگہ کے لوگ انتہائی مفلس اور تہذیب کے بالکل ابتدائی مدارج میں ہیں اور ترقی کے سامانوں سے یکسر محروم ہیں۔ ان لوگوں کی سرگرمیاں زیادہ تر جنسی قسم کی ہیں۔ ظاہر ہے کہ ایسے سادہ فطرت لوگوں کا بہیمانہ جذبہ ہر وقت سطح پر ہوتا ہے۔ جس طبقے کی کیفیت اس میں بیان کی گئی ہے، گو عدالت اس سے پوری طرح واقف نہیں، پھر بھی مصنف کا بیان صحیح معلوم ہوتا ہے۔ عدالت کی اس بات سے یہ نتیجہ نہیں نکالا جا سکتا کہ واقعے کو صحیح طور پر بیان نہیں کیا گیا۔ کتاب میں اس بات کی اندرونی شہادت موجود ہے کہ جنوب کے ایک طبقے کی زندگی کو سچائی اور دیانت داری کے ساتھ دکھانے کی مخلصانہ کوشش کی گئی ہے۔ مصنف کا مقصد ایک سچی تصویر پینٹ کرنا تھا۔ ایسی تصویروں میں بعض ضروری تفصیلوں کا آ جانا لابدی امر ہے اور چونکہ ایسی تفصیلوں کا گہرا تعلق زندگی کے جنسی پہلو سے ہوتا ہے اس لئے انہیں بہیمانہ صاف گوئی کے ساتھ بیان کر دیا جاتا ہے۔ اس لئے عدالت یہ حکم صادر نہیں کر سکتی کہ ایسی تصویریں سرے سے بنائی نہ جائیں۔ کرداروں کی زبان بلاشبہ بھدی اور گندی ہے مگر عدالت مصنف سے ان پڑھ اور غیر مہذب لوگوں کے منہ میں شائستہ زبان ڈال دینے کا مطالبہ بھی نہیں کر سکتی۔

یہ چیز پوری طرح عیاں ہے کہ کتاب مجموعی حیثیت سے فحش نگاری پر مبنی نہیں ہے۔ یہ بھی عدالت کے لئے ضروری نہیں کہ وہ اس بات کا فیصلہ کرے کہ آیا یہ کتاب ادب کی اہم چیز ہے۔ اس کے نزدیک کتاب کا موضوع ایک ادبی کاوش کے لئے جائز میدان ہے اور موضوع کے ساتھ مصنف کا سلوک بھی بالکل جائز ہے۔ عدالت کے لئے ضروری تھا کہ وہ تمام کتاب پر مجموعی حیثیت سے غور کرتی۔ اگرچہ یہ صحیح ہے کہ بعض پیراگراف اپنی الگ حیثیت سے قابل اعتراض ہیں۔ اس معاملے میں اسی انجمن کے ایک اور قبیل کے مقدمے میں ایک فاضل جج کے ریمارکس کے مطابق 'کسی کتاب کے چند پیراگرافوں کے اقتباس سے پوری کتاب کا صحیح اندازہ نہیں لگایا جا سکتا۔' ان کی جداگانہ اشاعت قانونی طور پر قابل گرفت ہو سکتی ہے، بالکل اسی طرح جیسے ارسٹوفین، چاسر بوکیچو بلکہ کتاب مقدس کے بعض مقامات کو قابل تعزیر گردانا جا سکتا ہے۔ تاہم کسی کتاب کو سمجھنے کے لئے اسے مجموعی طور پر دیکھنا چاہئے۔

عدالت کی صائب رائے یہ ہے کہ یہ کتاب ایسی نہیں جس میں برائی اور بدکاری کو خوبی اور نکوکاری کی حیثیت سے دکھایا ہو جس کا منشا معقول آدمیوں کے دل و دماغ میں ہیجان پیدا کرتا ہو لیکن بیمار دل و دماغ والوں پر اس کے اثرات کی پیش بندی عدالت نہیں کر سکتی۔ اگر عدالت ایسی کتابوں کی اشاعت کو محض اس لئے روک دے کہ وہ بیمار دل و دماغ والوں میں شہوت پیدا کرنے کا امکان رکھتی ہیں تو پھر ہمارا تمام ادب سکڑ کر چند غیر دلچسپ اور خشک کتابوں کا چھوٹا سا ذخیرہ بن کر رہ جائے گا کیونکہ اعلیٰ درجے کے ادب کا بیشتر حصہ یقیناً حذف ہو جائے گا۔ نتیجتاً ''گوڈز لیٹل ایکڑ'' اپنے پڑھنے والوں کو ہرگز اپنے کرداروں کے مطابق زندگی گزارنے کی ترغیب نہیں دیتی اور نہ اس کا میلان شہوانی خواہشات کو ابھارنے کی طرف ہے۔ وہ لوگ جن کی نگاہیں کسی چیز کی خوبیوں کی بجائے برائیوں کو دیکھنے کی طرف لگی رہتی ہیں، ان کی مثال چند درختوں میں الجھ کر پورے جنگل کی وسعت کو نظر انداز کر دینے والوں کی سی ہے۔

میں ذاتی طور پر یہ محسوس کرتا ہوں کہ ایسی کتابوں کو سختی سے دبا دینے پر پڑھنے والوں میں خواہ مخواہ تجسس اور استعجاب پیدا ہوتا ہے جو انہیں شہوت پسندی کی ٹوہ لگانے کی طرف مائل کر دیتا ہے، حالانکہ اصل کتاب کا یہ منشا نہیں ہوتا۔ مجھے پورا یقین ہے کہ اس کتاب میں مصنف نے صرف وہی چیز منتخب کی ہے جسے وہ امریکی زندگی کے کسی مخصوص طبقے کے متعلق سچا خیال کرتا ہے۔ میری رائے میں سچائی کو ادب کے لئے ہمیشہ جائز قرار دینا چاہئے۔

دستخط جج

اسداللہ خاں غالبؔ بنام مولوی امین الدین (١٨٦٧ء)

(غالب کے دعوی کی بنیاد اس بات پر تھی کہ ان کے خلاف لکھی جانے والی کتاب میں 'عریاں' الفاظ بھی استعمال کیے گئے ہیں)

پیش گاہ صاحب ایں سرشتہ

چونکہ مقدمہ جات فوجداری نمبری مسٹر اشاکذن صاحب پیش ہوتے ہیں یہ مقدمہ انھی صاحب بہادر کے اجلاس میں پیش ہوگا اور صاحب عزت وغیرہ کو بحال صاحب (؟) بہ خوبی جانتے ہیں' یہ خط بخدمت مسٹر اشاکذن صاحب بہادر پیش ہووے۔

٣ ڈسمبر ١٨٦٧ء

صاحب والا مناقب' عالی شان سرچشمہ لطف و احسان' جناب صاحب ڈپٹی کمشنر بہادر دہلی دام اقبالہٗ

بعد عرض مدارج تعظیم و تسلیم گزارش کرتا ہوں کہ مجھے ایک شخص پر ازالہ حیثیت عرفی کی نالش منظور کرنی ہے' اس واسطے اگرچہ میرے مدارج عزت آپ کو خوب معلوم ہیں، لیکن چونکہ اس دعوے کے بیان میں کچھ بیان اپنی عزت کا ضرور ہے لہٰذا عرض کیا جاتا ہے کہ میں قوم کا ترک ہوں' دادا میرا شاہ عالم کے عہد میں ترکستان سے آیا۔ باپ اور چچا' بہ سبب ضعف' سلطنت مرہٹوں کی نوکری کرتے رہے' باپ میرا عبداللہ بیگ خان بہادر سرکاری عمل داری سے پہلے ایک لڑائی میں مارا گیا' حقیقی چچا میرا نصر اللہ بیگ' خان بہادر' جرنیل ایک بہادر کا رفیق چار سو سوار کے سرکشان ہند کی لڑائیوں میں شریک رہا' چار سو سوار کا بریگیڈیئر اور لاکھ روپے کے پرگنے کا جاگیردار تھا۔ جرنیل صاحب کے سامنے بہ مرگ ناگاہ مر گیا۔ جاگیر موافق قرارداد سرکار میں بازیافت ہوئی اور میرے واسطے عوض جاگیر کچھ نقدی سرکار سے مقرر ہوگئی۔ پس میں رئیس زادہ بہ عوض جاگیر نقدی پانے والا ہوں۔ جاگیرداروں کے بعد میرا نمبر ہے اور باقی آپ کے دفتر سے لے کر دلی کی کمشنری اور لاہور کی لیفٹیننٹ گورنری' کلکتے کے گورنر جرنیل بہادر کے دفتر تک میرے مدارج عزت بہ خوبی ثابت ہیں۔ ایک شخص امین الدین بنام دلّی کا رہنے والا کہ اب وہ پٹیالہ میں راجا کے مدرسے کا مدرس ہے' اس نے ایک کتاب لکھی' اگرچہ بنا کتاب کی بحث علمی پر ہے لیکن اس نے اس بحث علمی میں میرے واسطے وہ الفاظ ناشائستہ اور ایسی گالیاں دی ہیں کہ کوئی شخص کسی چمار کو بھی یہ الفاظ نہ لکھے اور ایسے گالیاں نہ دے گا۔ ناچار میں نے منشی عزیز الدین صاحب کو اس

قدمے میں اپنا وکیل کیا ہے۔ اُمید وار ہوں کہ بعد تصدیق وکالت نامہ سرشتۂ فوج داری میں یہ مقدمہ یش ہو اور خاص کر آپ کی تجویز سے اول سے آخر تک یہ مقدمہ فیصل ہو اور کسی محکمہ ماتحت میں یہ مقدمہ پرد نہ ہو۔ فقط

راقم اسداللہ خان غالب

مرقوم دوم دسمبر ۱۸۶۷ء

زپیش گاہ مسٹر اشاکڈن صاحب اسسٹنٹ کمشنر بہادر،

منشی وزیر علی، دیبی پرشاد گواہان حاشیہ نے جانب مقر سے شہادت سامنے ہو کر بہ اقرار صالح مضمون مختار نامہ کو تصدیق کرایا، لہٰذا تصدیق مختار نامہ عمل میں آئی۔

مورخہ ۹ دسمبر

العبد/ جائے دستخط

جولا ناتھ شرف

جو مجھ کو بہ نام امین الدین ساکن دہلی، مدرس مدرسہ پٹیالہ بابت ازالہ حیثیت حسب دفعہ ۵۰۰، ۵۰۱ تعزیرات ہند بہ صیغہ فوج داری نالش کرنی منظور ہے، لہٰذا میں نے اپنی طرف سے عزیز الدین وکیل سرشتہ کو واسطے گزارنے عرضی اور پیروی کرنے مقدمے کے وکیل کیا۔ وکیل مذکور جو کچھ سوال و جواب پیروی مقدمہ ہذا میں کرے جملہ ساختہ پرداختہ اس کا مثل ذات خاص اپنی کے قبول و منظور ہے، اس واسطے یہ مختار نامہ لکھ دیا گیا۔ فقط

العبد/ محمد اسداللہ خاں

گواہ شد۔ دیبی پرشاد

گواہ شد۔ منشی وزیر علی

المرقوم چہاردہم دسمبر ۱۸۶۷ء

آج وکیل نے کتاب پیش کی، حکم ہے کہ یہ کاغذات بروز سوموار کے پیش ہوں اور وکیل مدعی انگریزی میں ترجمہ ان الفاظ کا مع اس عبارت کے جہاں یہ الفاظ واقع ہوئے ہیں، کرا کر پیش کرے اور مقدمہ درج رجسٹر کیا جائے۔

۱۲ دسمبر ۱۸۶۷ء

دستخط حاکم

حکم ہے یہ
مختار نامہ تصدیق کیا جاوے اور وکیل پہلے کتاب پیش کرے۔

۱۵ دسمبر ۱۸۶۷ء

جناب عالی

جو حال عزت و اقتدار میرے موکل کا گورنمنٹ میں، ہے اس کی تصریح دفاتر سرکاری اور آمد خطوط اور چٹھیاں حکام، خصوصی سیکریٹری گورنمنٹ پنجاب و نواب گورنر جرنیل بہادر کشور ہند سے بہ خوبی ہوسکتی ہے۔ مسمی امین الدین، ساکن دہلی، حال مدرس، پٹیالہ نے ایک کتاب 'قاطع القاطع' برہان مصنفۂ موکلم تصنیف کی، اس میں ایسے الفاظ ناشائستہ بلکہ دشنام مغلظہ نسبت موکلم تحریر کیے ہیں اور اس کتاب کو چھپوا کر مشتہر کیا ہے کہ جس سے نیک نامی کو نقصان پہنچنے کا باعث ہوا، اور ازالہ حیثیت کہ جس کی تعریف دفعہ ۴۹۹ تعزیرات ہند میں درج ہے، وقوع میں آوے۔ پس مدعا علیہ مرتکب اس جرم کا ہوا جس کی سزا تعزیرات ہند کے ۵۰۰ اور ۵۰۱ میں قرار پائی ہے، لہٰذا امیدوار ہوں کہ بعد تحقیقات معروضہ فدوی کے مدعا علیہ کو سزا مندرجہ دفعات مذکورہ فرمائی جاوے کہ آئندہ عزت داران سرکار کا کوئی مزیل حیثیت کا نہ ہوئے۔ زیادہ حد ادب۔

تفصیل ان الفاظ مندرجہ و مشتہرہ کتاب کہ جس سے ازالہ حیثیت کا ہوا، وہ مع نمبر صفحہ:

نمبر صفحہ	الفاظ مزیلۂ حیثیت
۱۳	بایں بے چارہ چہ حرکت ناکردنی کردہ است
۱۳	پیش حاکم وقت رفتہ زخم نہانی خویش وانماید
۲۳	ایں خرعیسیٰ نمد زین را بر پشت خود نہادہ است
۲۳	بہ دشنام پردازم
۲۸	میان خون حیض غوطہ خورد
۳۲،۱۷	کلال اکبرآبادی دریں جا تمسخر بہ کار بردہ
۳۲،۱۹،۱۸	سیلی و گردنی ہارا برائے او بنیاد نہند
۵۱	فصد باید کشاد تا جنونش فرو گردد
۱۶،۱۸	این خبطی
۶۶،۳۰	از خرابہ اکبرآباد بوے بہ دہلی رسیدہ است
۷۰	معترض ازیں عضو صد متے دیدہ است
۱۲،۱۱	

علاوہ اس کے اور بہت جگہ ایسے الفاظ ہیں، ملاحظہ کتاب سے واضح رائے عالی ہوں گے۔

عرضے کمترین عزیز الدین وکیل اسد اللہ خان پنشن دار سرکاری
عرف مرزا نوشہ معروضہ ۱۵ دسمبر ۱۸۶۷ء

'یہ ممکن نہیں'۔

۲۳ جنوری ۱۸۶۸ء
دستخط

صاحب والا مناقب عالی شان سرچشمۂ لطف و احسان جناب ڈپٹی کمشنر بہادر دہلی زاد شوکتہٗ

بعد تعظیم و تکریم و اظہار آرزوئی بمواصلت کثیر الافادت التماس یہ ہے کہ تخمیناً تیسرا مہینہ ہے کہ میں نے بہ وکالت منشی عزیز الدین صاحب کے عدالت فوج داری میں ازالہ حیثیت پیش کیا' وکالت نامہ تصدیق ہوگیا اور میرا خط مع وکیل کے حضور میں گزرا اور آپ نے وہ مقدمہ تجویز کے واسطے صاحب والا قدر اسٹا کٹن صاحب بہادر کے سپرد کیا۔ میری خوشی تو اس میں تھی کہ وہ مقدمہ آپ تجویز کرتے۔ اب بہ صد گونہ عجز و زاری استدعا کرتا ہوں کہ کاغذات مقدمہ وہاں سے منگائے جائیں اور حضور کے سامنے پیش کیے جائیں تا کہ امین الدین مدعا علیہ کی طلبی کا حکم پنہیا لے کو جائے اور بعد اس کے حاضر ہونے کے بہ مواجہ اس کے اور میرے وکیل کے مقدمہ تجویز ہو کہ میری دادرسی ہو اور مدعا علیہ کو سزائے سخت ملے۔ تا کہ پھر کوئی چھوٹا آدمی بڑے آدمی کو ایسے کلمات فحش و ناسزا نہ لکھے۔ مجھے یقین ہے کہ آپ اس اپنے تابع دار قدیم کی عرض قبول کرلیں گے اور بہ ذات خود میری دادرسی فرمائیں گے۔ فقط۔

راقم اسد اللہ خاں غالب
(۲۳ جنوری ۱۸۶۸ء)

جو کہ ہماری تبدیلی اس ضلع سے ہوگئی
حکم ہوتا ہے کہ
میرے بعد بہ حضور صاحب ڈپٹی کمشنر بہادر پیش ہووے
تحریر ۳۰ جنوری ۱۸۶۸ء
دستخط

از پیش گاہ مسٹر اوبرین صاحب بہادر
حکم ہوا کہ
پرسوں کے واسطے مدعا علیہ بہ اجرائے سمن طلب ہووے۔ فقط
۵ فروری ۱۸۶۸ء

عرضی مولوی امین الدین مدعا علیہ کی بیچ مقدمہ ازالہ حیثیت عرفی مرزا اسد اللہ خان غالب مدعی کے معروضہ تاریخ ۸ ر ماہ فروری ۱۸۶۸ء (اس کی نقل کی چنداں ضرورت نہ تھی اس واسطے نہیں کی گئی)

اطلاع نامہ بنام مولوی امین الدین (اس کی نقل نہیں کی گئی)

اظہار وکیل مدعی

نام میرا عزیز الدین وکیل مرزا اسد اللہ خان عرف مرزا نوشہ

‘قاطع القاطع’ میں امین الدین نے صفحہ ۱۳ میں لکھا ہے کہ ‘صاحب برہان با ایں بے چارہ چہ حرکت ناکردنی کردہ است’۔ بار دیگر صفحہ مذکور میں ہے۔ ‘پیش حاکم وقت رفتہ زخم نہانی خویش وانماید تا فریادش کارگر آید’ صفحہ ۲۳ کی سطر ۱۴ میں ہے: ‘ایں خر عیسیٰ نمد زین را بر پشت خود نہادہ است’۔ صفحہ ۲۸ میں ہے۔ ‘میاں خون حیض غوطہ خوردہ’ صفحہ ۴۲ کی سطر ۱۷ میں لکھا ہے۔ ‘کلال اکبرآبادی دریں جا مسخر بابہ کار بردہ’۔ صفحہ مذکورہ کی سطر ۱۸، ۱۹ میں لکھا ہے: ‘سیلی و کردنی بارا برائے او بنیاد نہند’۔ صفحہ ۵۱ میں لکھا ہے: ‘فصد باید کشاد تا جنونش فرو کردد’۔ صفحہ ۶۱ کی سطر ۱۸ میں لکھا ہے: ‘ایں خبطی ......’ صفحہ ۶۶ کی سطر ۲۱ میں لکھا ہے: ‘از خرابہ اکبرآبادی بوئے بہ دہلی رسیدہ است’۔ صفحہ ۵۷ کی سطر ۱۱، ۱۲ میں لکھا ہے: ‘معترض ازیں عضو صدمے دیدہ است’۔ علاوہ اس کے جو جو کچھ اور لکھا ہے ذیل میں گزارش ہے:

صفحہ	سطر	خلاصہ
۱۲۷	۱۶، ۱۷	اگر ایں چنیں تہمت را حاکم منصف می دید بینی چہ گویم گوشش می برید
۱۳۱	۱۵	بضاعت خویہ ہمیں ازار است بر کس را نشان می دہد
۱۳۲	۱۸	معترض خایہ را چرا گرفت؛ مگر برائے ترکیب نان خورش گرفتہ باشد
۱۶۳	۱۰	جستن خرس را یاد کردہ است و رقص بوزنہ را بہ اظہار آوردہ است
۱۷۲	۲۰	گوش و بینی چرا گویم دست خواہد برید و زبان بہ قفا خواہد کشید
۳۸	۲۱	گوش او از بنا گوش برکنند یا بہ سوراخش میخے زنند

ان الفاظ سے اور عبارت سے ازالۂ حیثیت عرفی میرے موکل کا ہے۔ میرے موکل کے رگ باشندے اکبرآباد کے تھے۔ فہرست گواہان کل داخل کروں گا۔

یہ اظہار ہمارے اہتمام سماعت میں بہ رعایت حکم ایں جانب تحریر ہوکر مظہر کو بہ زبان اردو س کو وہ سمجھتا ہے' پڑھ کر سنایا گیا۔ اقرار کیا' صحیح ہے' مدعا علیہ نے سوال نہیں کیا۔

حکم ہے کہ مدعی فہرست گواہان داخل کرے۔ سوائے' قاطع القاطع' کے باقی کتابیں واپس وں چنانچہ واپس ہوئیں۔ فقط

۲۰ فروری ۱۸۶۸ء

جناب عالی

چوں کہ فدوی کو نقل ہائے گزرانیدہ مدعی واسطے گزارنے معنے کے مطلوب ہیں' لہٰذا بذریعہ گزارش درخواست ہذا امیدوار کہ نقل جملہ الفاظ ہائے گزرانیدہ مدعی فدوی کو عطا ہو جاویں۔ فقط

مولوی امین الدین

مختار نامہ از جانب مولوی امین الدین اسمی انبہ سہائے وکیل (نقل نہیں کیے گئے)

فہرست گواہان مولوی امین الدین مدرس پٹیالہ:

(۱) مولوی ضیاء الدین صاحب، (۲) مولوی سدید الدین خانصاب (۳) حکیم حشمت اللہ خان صاحب، پروفیسر عربی مدرسہ سرکاری، استاد میور (؟) صاحب سیکریٹری اعظم' (۴) محمد حمید الدین خان صاحب (۵) مولوی ابراہیم صاحب (۶) مولوی محمد حسین صاحب عرف عبدالحکیم صاحب' (۷) مولانا قمرالدین صاحب۔

فہرست گواہان مرزا اسد اللہ خاں غالب:

(۱) مولوی منشی سعادت علی خان' مدرس کالج دہلی' (۲) ماسٹر پیارے لال صاحب' سیکریٹری' (۳) مولوی نصیرالدین صاحب مدرس' مدرسہ دہلی' (۴) مولوی لطیف حسین صاحب' مدرس، (۵) منشی حکم چند صاحب' مدرس کالج دہلی۔

نام میرا امین الدین ولد مولوی زین الدین' قوم شیخ' ساکن پٹیالہ' عمر ۵۹ برس' پیشہ مدرسی

بیان ہے کہ:

میں نے ایسا نہیں لکھا کہ جس میں ازالہ حیثیت عرفی مدعی کا ہو، یہ کتاب 'قاطع القاطع' تصنیف میری ضرور ہے۔

سوال: فرد قرارداد جرم تم کو سنائے جاتے ہیں' تم مرتکب جرم قرارداد کے ہوئے یا نہیں؟ تمہارا کیا جواب ہے؟ کیونکر صفائی کرو گے؟

جواب: فرد جرم میں نے سنی۔ جواب یہ ہے کہ اس کتاب میں تین قول ہیں' ایک تو محمد حسین' 'برہان قاطع'۔ دوسرا مرزا اسد اللہ خان' مصنف 'قاطع برہان'۔ تیسرا قول میرا۔ 'قاطع برہان' میں رد کیا ہے۔ 'برہان قاطع' کو اور میں نے تردید کری ہے۔ 'قاطع برہان' کی۔

صفحہ ۱۳ میں جو لکھا یہ برائے مثل ہے' سوائے معنے تحت لفظی کے اور کچھ معنی میں نے نہیں خیال کئے۔ 'زخم نہانی' مراد رنج دلی سے ہے اور دیگر شاعروں نے بھی یہی معنے لئے ہیں' بہت شعر ہیں جن میں الفاظ 'زخم نہانی' کو ڈالا ہے اور معنے اس کے رنج دلی لئے ہیں' سو اب یاد سے شعر پیش کروں گا۔

صفحہ ۲۳ میں جو لکھا ہے۔ 'خر عیسیٰ...... ' خر کے معنی نادان کے ہیں' لفظ عیسیٰ صرف بطور مرکب کے ڈالا گیا ہے۔ یہ عبارت جو درج ہے کہ 'بدشنام پرداز' معنے یہ ہیں کہ ساتھ گالی کے مشغول ہوتے ہیں' مگر آگے اس کے جو عبارت ہے اس سے صاف ظاہر ہے کہ میں نے درج کیا ہے کہ زبان ایسی خراب کرلی ہے۔

صفحہ ۲۸ میں لکھا ہے کہ 'میان خون حیض غوطہ خورد' اس کے معنی یہ ہیں کہ کیوں گناہ گار ہوتے ہو' یہ الفاظ کچھ تحت مثل ہے' 'خون حیض' کا لفظ عرفی اور حافظ (دیکھیے صفحہ ۸۲۱) نے لکھا ہے' اور یہ بھی معنے دیتا ہے کہ کیوں گناہ گار ہوتے ہو!

صفحہ ۳۸ میں جو لکھا ہے لفظ 'سوراخ' اور لکھا ہے 'گوش او را ز بنا گوش برکنند' اس کے معنی یہ ہیں' 'کان کو اکھیڑ دیا' 'کان کے سوراخ میں میخ مارو' یہ الفاظ ایسے مقام پر آتے ہیں' جب کوئی اعتراض کیا کرتا ہے تو کہا جاتا ہے کہ تمہارے کان اکھاڑے جاویں گے اور تمہارے کان بند کرائے جائیں گے۔

صفحہ ۴۲ میں جو درج ہے 'کلال اکبرآبادی' کلال معنے میں سست کے لئے ہیں دوسری جگہ لکھا ہے۔ 'سیلی و گردنی بارا برائے او بنیاد نہند' اوپر کی عبارت سے اسے شامل کیا جائے تو معنے اس کے یہ ہوتے ہیں کہ 'شریک خوشی کے ہوئے'۔

صفحہ ۵۱ میں لکھا ہے۔ 'فصد باید کشاد تا جوشش فرو گردد' یہ الفاظ ایسے مقام پر آتے ہیں کہ جب کوئی اعتراض بے جا کرتا ہے تو کہا جاتا ہے۔ معنے اس کے تحت لفظی ہیں۔

صفحہ ۶۱ میں جو لکھا ہے 'خبطی' اس کے معنی بھی یہی ہیں یعنی برگشتگی مزاج۔

صفحہ ٦٦ میں ہے ’از خرابہ اکبرآباد بوے بہ دہلی رسیدہ است‘ بوم کے معنے مدعی نے بھی اپنے قول میں جو اوپر درج ہیں زمین کے لئے ہیں یعنی لکھا ہے۔ ’کاش از بوم دکھن دگرے برخیزد‘ چنانچہ میں نے بھی معنے ’زمین‘ کے لئے ہیں معنے اس کے یہ ہوتے ہیں کہ زمین اکبرآباد سے ایک شخص آئے ہیں۔

سوال: مدعی ’خرابہ‘ کا مضاف الیہ کون ہے؟

جواب: اکبرآباد بوم ہے اور ’ی‘ بوم کی واسطے تحسین کلام کے ہے۔ فقط۔

صفحہ ٧٠ میں جو لکھا ہے، ’عضو‘ میں نے اس کے معنی ’خواندن‘ کے لئے ہیں انہوں نے اپنے کلام میں جو اوپر درج ہے ’عضو‘ کے معنے آلہ تناسل کے لئے ہیں۔ میری مراد یہ ہے کہ مدعی نے لفظ ’عضو‘ سے کچھ صدمہ اٹھایا‘ رنج دیکھا ہے۔ ’از یں‘ کی ضمیر قریب پر آتی ہے‘ بعید پر نہیں جاتی۔

صفحہ ١٢٧ میں لکھا ہے۔ ’بینی چہ گویم گوشش ی برید‘ اوپر کی عبادت سے ملا کر اس کے یہ معنی ہوتے ہیں کہ اگر حاکم اس تہمت کو دیکھتا‘ سزا دیتا۔

صفحہ ١٤١ میں لکھا ہے۔ ’بضاعت خواجہ ہمیں ازار است ہر کس را نشان می دہد‘ یہ الفاظ ’ازار‘ مدعی کے قول میں درج ہے مگر معنے اس کے چادر کے ہیں اور یہی میں نے لئے ہیں۔

صفحہ ١٤٢ میں لکھا ہے۔ لفظ ’خایہ‘ اس کے معنی بیضہ مرغ کے ہیں‘ میری مراد یہ ہے (کہ) معترض نے اس ہی لفظ ’خایہ‘ کو بہ معنے خصیہ کیوں لیا‘ مگر نام واسطے خورش کے بہ معنے بیضہ مرغ لیا ہو۔

صفحہ ١٦٤ میں لکھا ہے کہ ’جستن خرس را یاد کرد است و رقص بوزنہ را بہ اظہار آوردہ‘ اس کے معنی تحت لفظی ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ معترض کی باتیں یاد کریہی ہیں کہ ’جستن خرس و رقص بوزنہ‘ کہ بیکار ہیں یاد کری جاویں۔

صفحہ ٢١٧ میں ’گوش و بینی چرا گویم دست خواہد برید و زبان بہ قفا خواہد کشید‘ اس کے معنی تحت لفظی ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ معترض نے چوری الفاظ کری ہے‘ اس کی سزا ملنی چاہئے۔

میں نے یہ کتاب صرف بہ بحث علمی چھپوائی ہے‘ گواہ میرے موجود ہیں۔

یہ جواب میرے مواجہ میں قلم بند کیا گیا‘ اس میں تمام بیان مشخص با خود مشتہادی صحیح و درست مندرج ہے

اظہار گواہ مدعی با اقرار صالح بہ اجلاس مسٹر اوبرین صاحب بہادر مرقوم ٢ مارچ ١٨٢٨ء

نام میرا پیارے لال ہے ولد رام نرائن ہیڈ ماسٹر اسکول قوم کھتری ساکن دریبہ‘ عمر ٣٠ برس کی پیشہ ماسٹری۔ بیان یہ ہے کہ صفحہ ١٣ ’قاطع القاطع‘ کی عبارت جس پر نشان سرخی کا ہے‘ میں نے

پڑھی۔ معنے 'حرکت نا کردنی' کے ہیں 'اغلام ضربت ہا کشیدہ۔' اس مقام پر وہ معنے لئے جاتے ہیں کہ جب بحالت مجامعت ضرب لگتی ہے۔ 'زخم نہانی' کے لغوی معنے ہیں 'پوشیدہ زخم' مگر یہاں اس زخم سے مراد ہے کہ جو فعل بد سے عائد ہوئے 'جو شخص پڑھ سکتے ہیں وہ اس سے یہی مراد سمجھیں گے۔

سوال از طرف مدعا علیہ: آپ مرزا نوشہ کے شاگرد ہیں؟

جواب: میں شاگرد نہیں ہوں۔

سوال دوسرا: آپ فارسی کما حقہ جانتے ہیں؟

جواب: عربی میں نہیں جانتا' اور عام فارسی بھی اچھی نہیں جانتا' جس قدر جانتا ہوں معنے بیان کر دیئے۔

سوال تیسرا: مدعی نے ترجمہ ان الفاظ کا انگریزی میں آپ سے کرایا تھا؟

جواب: ہاں' مجھی سے کرایا تھا۔

صفحہ ۲۳ سطر ۱۵ میں لکھا ہے۔ 'خر عیسیٰ' اس کے معنی 'عیسیٰ کا گدھا' مگر یہاں مراد صرف گدھے سے۔ عیسیٰ کے لفظ سے کچھ حاصل نہیں۔ لکھا ہے 'بدشنام پر وازم' یعنی میں گالیاں دیتا ہوں۔

صفحہ ۲۸ سطر ۱۹ میں لکھا ہے: 'میاں خون حیض غوطہ خورد' اس کے معنے یہ ہیں کہ خون حیض میں غوطہ کھایا اور لفظ نسبت مخالف کے ہیں۔

سوال مدعا علیہ: آپ مضاف الیہ کو جانتے ہیں؟

جواب: جانتا ہوں۔

صفحہ ۳۲ کی سطر ۱۷۔ ۱۸۔ ۱۹ میں لکھا ہے: 'کلال اکبر آبادی' یعنی 'اکبر آباد کا کلال' سوائے اس کے اور کچھ معنے پیدا نہیں ہوتے۔ 'رقص میموں' بندر کا ناچ 'شتر غمزہ' بہ معنے بدکاری۔

سوال مدعا علیہ: کلال بالفتح لفظ ہندی ہے اور یہ کتاب فارسی ہے' لفظ ہندی فارسی میں آتا ہے؟

جواب: دو طرح لفظ پڑھنے میں آتا ہے 'کلال وکلال' کلال کے معنے شراب کش اور کلال کے معنے کمہار۔

صفحہ ۴۳ میں لکھا ہے: 'دست را بہ سیلی ولب را بدشنام باز کشاید' یعنی ہاتھ کو تھپڑ کے ساتھ اور لب کو گالی سے کھولا۔

صفحہ ۵۱ میں لکھا ہے، 'فصد باید کشاید تا جنونش فرو گردد' فصد کے معنی ہیں نشتر سے خون نکالنا' 'جنونش فرو گردد' یعنی جنون اس کا جاتا رہے۔

صفحہ ٦١ میں لکھا ہے، 'خبطی' معنے اس کے جنونی ہیں۔

سوال مدعا علیہ: دوسرے معنے آپ جانتے ہیں؟

جواب: میں نہیں جانتا۔

صفحہ ٦٦ میں لکھا ہے: 'آرے از خرابہ اکبر آباد بوے بہ دہلی رسیدہ' معنے یہ ہیں کہ 'اجاڑ اکبر آباد سے ایک اُلو دہلی میں پہنچا' سوائے اس کے اور کچھ معنے میرے نزدیک نہیں ہیں۔

صفحہ ٧٠ میں لکھا ہے: 'عضو' لغوی معنے اس کے ہیں 'جسم کا کوئی حصہ' مگر یہاں مراد عضو تناسل ہے۔ بدیں مراد کہ معترض نے اس عضو سے صدمے اٹھائے ہیں' اور یہ بیان مصنف کا سمجھتا ہوں۔

صفحہ ١٢٧ میں لکھا ہے: 'بینی چہ گویم گوشش می برید' معنی یہ ہیں کہ ناک کو کیا کہوں، کان اس کے اکھاڑیئے 'گوشش' کی ضمیر بہ طرف معترض ہے۔

صفحہ ١٤١ میں لکھا ہے: 'بضاعت خواجہ ہمیں ازار است ہر کس رانشان می دہد' اس کے معنے میں نہیں سمجھتا۔

صفحہ ١٤٢ لکھا ہے: 'خایہ راچرا گرفت' اس مقام پر 'خایہ' کے معنے عضو تناسل کے ہیں' اگرچہ معنے اس کے بیضہ دان بھی ہیں۔

صفحہ ٣٨ میں جو لفظ 'میخ سوراخ' کا لکھا ہے اس سے مراد مقعد ہے۔

صفحہ ١٦٤ میں لکھا ہے: 'جستن خرس رایاد کردہ است ورقص بوزنہ را بہ اظہار آوردہ' معنے یہ ہیں کہ خرس کے کودنے کو یاد کیا ہے اور بندر کے ناچنے کو ظاہر کیا ہے۔

یہ اظہار ہمارے اہتمام ساعت میں بہ رعایت حکم ایں جانب تحریر ہو کر مظہر کو بہ زبان اردو جس کو وہ سمجھتا ہے' پڑھ کر سنایا گیا' اقرار کیا صحیح ہے۔ مدعا علیہ کے سوال کا جواب لکھا گیا

اظہار گواہ بہ اقرار صالح بہ اجلاس مسٹر اوبرین صاحب بہادر مرقوم ٢ مارچ ١٨٦٨ء

نام میر الطیف حسین ولد حکیم محمد حسین خاں' شیخ' مدرس عربی فارسی' ساکن کوچہ حکیم بقاء اللہ' عمر ٣٥ برس کی۔

بیان یہ ہے:

صفحہ ١٣ میں لکھا: 'حرکت ناکردنی' 'ناشایستہ' کے معنے ہیں' خلاف وضع فطری' جو کوئی پڑھے یہ معنے لے گا

سوال مدعا علیہ: ان الفاظ کے معنے اور بھی ہو سکتے ہیں؟

جواب: تحت لفظی معنے اور بھی ہو سکتے ہیں مگر اس مقام پر یہی معنے ہیں۔

صفحہ ١٣: 'زخم نہانی' کے معنے اس مقام پر 'اندام نہانی' کے ہیں' اور ضرب سے وہی مراد ہے جو

اس کام سے ضرب ہوتی ہے۔

صفحہ ۲۳ میں لکھا ہے: ’خرعیسیٰ‘ اس کے معنی گدھا ہے‘ بے وقوف‘ عیسیٰ کا لفظ کچھ معنے نہیں دیتا‘ اس صفحے میں لکھا ہے۔ ’بدشنام پردازم‘ معنے اس کے یہ ہیں کہ گالیاں دوں۔

صفحہ ۲۸ میں لکھا ہے: ’میان خون حیض غوطہ خوردہ‘، خون حیض وہ جو عورتوں کو ماہواری آتا ہے‘ ناپاک ہے‘ گالی نہیں ہے‘ کلمہ سخت ہے، اور کچھ معنے نہیں ہوسکتے۔

صفحہ ۳۸ میں لکھا ہے: ’بہ سوراخش میخ زنند‘ اس مقام پر سوراخ کے معنے مقعد کے ہیں، لفظی معنے چھید کے ہیں۔ ’سوراخش‘ کے شین کی ضمیر بہ طرف گوش کے ہوسکتی ہے‘ مگر اس مقام پر میری دانست میں معنی مقعد کے ہیں۔

صفحہ ۴۲ میں لکھا ہے: کلال اکبرآبادی‘ اگر ضم سے پڑھا جاوے تو ’کمہار‘ اور اگر فتح سے پڑھا جاوے‘ تو معنے ’مے فروش‘۔ دوسری جگہ لکھا ہے: ’سیلی وگردنی ہارا برائے او بنیاد نہند‘ معنے یہ ہیں‘ ہاتھوں سے گردن پر مارنا۔

صفحہ ۴۳ میں لکھا ہے: ’دست را بہ سیلی ولب را بہ دشنام باز کشاید‘ معنے وہ ہیں کہ وہ جو لفظی ہیں‘ اور کچھ معنے نہیں ہوتے۔

صفحہ ۵۱ میں لکھا ہے کہ ’فصد باید کشاد تا جوشش فرو گردد‘ یعنی فصد کھولنا چاہیے تو جنون اس کا جاتا رہے۔

صفحہ ۶۱ میں لکھا ہے ’خبطی‘ اس کے معنے یہ ہیں کہ ’دیوانہ‘۔

صفحہ ۷۰ میں لکھا ہے: ’معترض از عضو صدمے دیدہ‘۔ ’عضو‘ سے مراد ’عضو تناسل‘ ہے۔

صفحہ ۱۲۷ میں لکھا ہے کہ ’بنی چہ گویم گوشش می برید‘ ’گوشش‘ کی ضمیر بہ طرف معترض ہے۔

صفحہ ۱۴۱ میں لکھا ہے کہ ’بضاعت خواجہ ہمیں ازار است بر کس را نشان می دہد‘ معنے یہ ہیں کہ یہی پاجامہ ہے جو ہر ایک کو دکھاتا ہے۔

سوال مدعا علیہ: ازار کے معنے اور بھی ہیں؟

جواب: مجھے معلوم نہیں۔

صفحہ ۱۴۲ میں لکھا ہے: ’خایہ را چرا گرفت‘ معنے لفظی یہ ہیں کہ معترض نے لفظ ’خایہ‘ کو کیوں لیا‘ اور لفظ کیوں نہیں لیا۔ دوسرے معنے یہ ہیں کہ بیضے کو کس واسطے لیا اور عربی میں ’خایہ‘ بیضے کو بھی کہتے ہیں۔

صفحہ ۱۶۴ میں لکھا ہے کہ ’جستن خرس را یاد کردہ است ورقص بوزنہ بہ اظہار آوردہ‘ معنے یہ کہ کود نے ریچھ کو یاد کیا اور بندر کا ناچ ظاہر کیا یعنی ریچھ کی طرح وہ شخص کودا ہے اور بندر کا ناچ کیا ہے۔ ضعیف معنے یہ بھی ہوسکتے ہیں کہ کودنا ریچھ اور بندر کا یاد کیا ہے۔

صفحہ ۱۸۶ میں لکھا ہے: 'گوش و بینی چرا گویم دست خواہد برید و زبان بہ قفا خواہد کشید'۔ سوائے معنی لفظی اور کچھ معنے اس کے نہیں ہو سکتے۔ میں ایسی تحریر کو بہت درست سمجھتا ہوں اور ہر ایک شخص کی سمجھ میں ایسا ہی آوے گا' جیسا میں نے بیان کیا ہے اور کوئی کتاب میں نے نہیں دیکھی جس میں ایسی عبارت ہو۔

سوال مدعا علیہ: 'قاطع برہان' آپ نے دیکھی؟

جواب: میں نے دیکھی۔

یہ اظہار گواہ کا ہمارے اہتمام سماعت میں آیا۔ مظہر کو بہ زبان اردو' جس کو وہ سمجھتا ہے سنایا گیا۔ اقرار کیا' صحیح ہے' مدعا علیہ کے سوال کا جواب لکھا گیا' فقط

اظہار گواہ مدعی:

نام میرا نصیر الدین ولد محمد علیم الدین، قوم سید، ساکن کوچہ پنڈت، عمر ۳۳ سال، پیشہ روزگار۔

بیان یہ ہے کہ:

میں فارسی اور عربی خوب جانتا ہوں اور انگریزی بہت کم جانتا ہوں صفحہ ۱۲ میں جو لکھا ہے کہ وہ میں نے اس سے سابق بھی اس عبارت کو دیکھا ہے۔ 'حرکت ناکردنی' سے یہ مراد ہے کہ' جو حرکت نہ کرنے کی ہو'۔ 'زخم نہانی' کے وہ معنی ہیں کہ 'زخم پوشیدہ' مگر اس جگہ مراد اس زخم سے ہے جو دکھایا نہیں جاتا۔

سوال مدعا علیہ: آپ مدعی کے شاگرد ہیں؟

جواب: میں شاگرد نہیں ہوں۔

صفحہ ۲۲ میں لکھا ہے: 'بدشنام پردازم' معنے اس کے یہ ہیں کہ 'گالیاں دوں'۔

صفحہ ۲۸ میں لکھا ہے: 'میان خون حیض خورد'۔ معنے خون حیض کے وہ ہیں کہ جو عورت کو ماہ بہ ماہ اندام نہانی سے پیدا ہوتا ہے' یہ چیز نہایت نجس اور ناپاک ہے' اور ایسا لفظ آج تک استعمال میں نہیں آیا۔

صفحہ ۳۸ میں لکھا ہے: 'گوش او از بنا گوش برکنند یا بہ سوراخش میخ زنند'۔ سوراخ سے مراد 'مقعد' ہے اور یہ معنے عام جو اس عبارت کو پڑھیں گے' سمجھیں گے۔

صفحہ ۴۲: 'کلال اکبر آبادی' ضم سے مراد کمہار سے ہے اور فتحہ سے مراد شراب کش سے ہوتی

ہے۔ اس مقام پر دونوں معنے ہو سکتے ہیں‘ بہ معنے رنج بھی آتا ہے مگر اس جگہ معنے رنج کے نہیں دیتا۔ عربی میں معنے اس کے سستی ہیں۔ وہ بھی اس جگہ موزوں نہیں ہوتے۔ اس صفحے میں ‘شترغمزہ’ لکھا ہے اس کے معنے صرف بیہودگی کے ہیں۔

صفحہ ۵۱ میں لکھا ہے: ‘فصد باید کشاید تا جونش فرد گردد’ اس کے معنے یہ ہیں کہ ‘جنون ہو گیا ہے فصد کھولنی چاہیے’۔

صفحہ ۶۱ میں لکھا ہے کہ ‘از خرابہ اکبر آباد بوے بہ دہلی رسیدہ است’ یعنی جنگل اکبر آباد سے ایک اُلو دہلی میں پہنچا ہے۔

صفحہ ۷۰ میں لکھا ہے: ‘معترض ازیں عضو صدمے دیدہ است’ معنے اس کے عضو کے عضو تناسل سے مراد ہے، ٹکر کھاتا۔

صفحہ ۱۲۷ میں لکھا ہے: ‘اگر ایں چنیں تہمت را حاکم منصف می دید بینی چہ گویم گوشش می برید’ پس ضمیر شین کی بہ طرف معترض ہے‘ ضمیر اس شین کی بہ طرف تہمت نہیں ہو سکتی۔

صفحہ ۱۴۱ میں لکھا ہے: ‘بضاعت خواجہ ہمیں ازار است بر کس را نشان می دہد’ معنے اس کے یہ ہیں کہ ‘اس کے پاس یہی پاجامہ ہے’ اور گالی کا کہنا یہ ہے کہ ‘ہر کسی کو دکھاتا ہے کہ خریداری کرے’۔

اس کے بعد صفحہ ۱۴۲ میں لکھا ہے: ‘معترض خایہ را چرا گرفت’ معنے ‘خایہ’ کے خصیہ اور انڈے کو بھی کہتے ہیں‘ یہاں شاید مراد خصیہ لئے ہیں۔ جو کوئی پڑھے گا وہی اس کے معنے خصیہ کے سمجھے گا۔

صفحہ ۱۶۴ میں لکھا ہے: ‘جستن خرس را یاد کردہ است و رقص بوزینہ را بہ اظہار آوردہ’۔ معنے یہ ہیں کہ ریچھ کے کودنے کو یاد کیا ہے‘ اور بندر کے ناچنے کو یاد کیا ہے۔

صفحہ ۱۷۲ میں لکھا ہے: ‘گوش و بینی چرا گویم دست خواہد برید و زبان بہ قفا خواہد کشید’ معنے اس کے یہ ہیں کہ کان اور ناک کو میں کیا کہوں ہاتھ کاٹے گا اور زبان ساتھ گدی کے کھینچے گا۔

سوال از طرف وکیل مدعی: یہ الفاظ کس کی طرف بیان کئے گئے ہیں؟

جواب: دیباچہ دیکھ کر بیان کرتا ہوں کہ نسبت مرزا اسد اللہ کے ہیں۔

یہ الفاظ نوشتہ اظہار گواہ ہمارے اہتمام سماعت میں بہ رعایت حکم ایں جانب تحریر ہو کر مظہر کو بزبان اردو جس کو وہ سمجھتا ہے پڑھ کر سنایا۔ اقرار کیا ‘صحیح ہے’ مدعا علیہ کے سوال کا جواب لکھا گیا۔

اظہار گواہ مدعی:

نام میرا حکم چند ولد رام دیال، قوم اہیر، ساکن کھاری کوئی، عمر ۳۶ برس کی

بیان یہ ہے کہ:

صفحہ ۱۳ میں لکھا ہے: ’چہ حرکت ناکردنی کردہ است‘ اس کے معنے یہ ہیں کہ جو حرکت کرنے کے لائق نہیں ہے وہ کی ہے۔ یعنی اغلام کیا ہے۔

دوسری جگہ لکھا ہے: ’زخم نہانی خویش وانماید‘ زخم نہانی جائے مخصوص سے مراد ہے۔ میری رائے میں یہی معنے آتے ہیں، عام لوگوں کو میں نہیں کہہ سکتا ہوں مگر یقین ہے یہی معنے بیان کریں گے اور یہ عبارت سابق بھی میں نے دیکھی ہے۔

سوال مدعا علیہ: تمہاری تصنیف پر مرزا نے تصدیق لکھی؟

جواب: ہاں لکھی ہے اور دیگر حکام نے بھی لکھی ہے۔

صفحہ ۲۳ میں لکھا ہے: ’خر عیسیٰ‘ اس جگہ مراد خاص گدھے سے ہے۔ دوسری جگہ لکھا ہے۔ ’بدشنام پردازم‘ اس کے معنے یہ ہیں کہ گالیاں دوں میں۔

صفحہ ۲۸ میں لکھا ہے کہ ’میانِ خونِ حیض غوطہ خورد‘ اس کے معنی وہی ہیں جو معنے لفظی ہیں۔

صفحہ ۳۸ میں لکھا ہے: ’بہ سوراخش میخ زنند‘ سوراخ کے معنے اس جگہ مقعد کے ہیں۔ شین کی ضمیر بہ طرف معترض ہے، بہ طرف گوش نہیں۔

صفحہ ۴۲ میں لکھا ہے۔ ’کلال اکبر آبادی‘ اگر لفظ عربی ہو تو بہ معنے سستی اور اگر بہ ضم ہو تو بہ معنے کمہار، اور اگر بہ فتح ہے تو بہ معنے مے کش۔ دوسری جگہ لکھا ہے۔ ’سیلی وگردنی ہارا برائے او بنیاد نہند‘ اس کے معنی یہ ہیں کہ تھپڑ ماریں۔

صفحہ ۵۱ میں لکھا ہے: ’مگر فصد باید کشاد تا جنونش فرد گردد‘ سوائے لفظی معنے کے اور کچھ معنے نہیں۔

صفحہ ۶۱ میں لکھا ہے: ’خبطی‘ اس کے معنے ’دیوانہ‘

صفحہ ۷۰ میں لکھا ہے۔ لفظ ’عضو‘ کا اس عضو سے مراد آلہ تناسل ہے۔

صفحہ ۱۲۷ میں لکھا ہے۔ ’بنی چہ گویم گوشش می برید‘ سوائے معنے تحت لفظی کے دوسرا مطلب نہیں ہے۔ ’گوشش‘ کے شین کی ضمیر بہ طرف معترض ہے۔

صفحہ ۱۴۱ میں لکھا ہے: ’بضاعت خواجہ ہمیں ازار است ہر کس را نشان می دہد تا خریداری نماید‘۔

حاصل اس کا یہ ہے کہ اس کے پاس یہ پاجامہ ہے اور ہر ایک کو دکھاتا ہے۔

سوال مدعا علیہ: ’ہمیں‘ کی ضمیر کس طرف جاتی ہے اور لفظ ازار کس کا لیا ہوا ہے؟

اس کا جواب ضرور نہیں ہے۔

صفحہ ۱۴۲ میں لفظ 'خایہ' کا لکھا ہے اس کے معنے خصیہ ہیں۔

صفحہ ۱۶۴ میں لکھا ہے: 'جستن خرس را یاد کردہ است و رقص بوزنہ را بہ اظہار آوردہ' سوائے لفظی معنے کے اور کچھ بات پیدا نہیں ہو سکتی ہے۔

صفحہ ۱۷۲ میں لکھا ہے: 'گوش و بینی چرا گویم دست خواہد برید و زبان بہ قفا خواہد کشید' معنے اس کے تحت لفظی کے اور کچھ پیدا نہیں ہوتے ہیں۔

یہ اظہار گواہ کا ہمارے اہتمام سماعت میں بہ رعایت حکم ایں جانب تحریر ہو کر مظہر کو بہ زبان اردو جس کو سمجھتا ہے' پڑھ کر سنایا گیا۔ اقرار کیا صحیح ہے۔ مدعا علیہ کے سوال کا جواب لکھا گیا۔ فقط

اظہار گواہ مدعا علیہ بہ اقرار صالح بہ اجلاس مسٹر اوبرین صاحب بہادر، ۳۰ر مارچ ۱۸۶۸ء
نام میر اضیاء الدین ولد محمد بخش ساکن دہلی' پروفیسر عربی' دہلی کالج

بیان یہ ہے کہ:

میں نے سابق اس کتاب کو دیکھا ہے۔ صفحہ ۱۳ میں جو عبارت لکھی ہے وہ 'حرکت ناکردنی' بہ ہمہ الفاظ کسو خاص حرکت پر خصوصیت نہیں دیکھی۔ اس کے معنے وہ ہیں' جو حرکت لائق کرنے کے نہ ہو' لفظ 'ضربت ہا' جو لکھا ہے اس کے معنے مارنے کے ہیں' خصوصیت کسی دوسرے معنی پر نہیں رکھتا۔

'زخم نہانی' کے معنے یہ ہیں' زخم اندرونی' یا صدمہ' دل۔ استعمال معنے اس کے لوطیان میں چاہے جو کچھ لے لے' طرز عبارت سے جو کوئی دیکھے گا وہ معنے اس لفظ کے اور معنے کر کے خیال نہیں کر سکتا ہے۔ یہ عبارت نہ فحش نہ سزا گوئی ہے۔ 'زخم' موصوف اور 'نہاں' اس کی صفت ہے۔ نہاں کے معنے کسی نے مقعد کے نہیں لئے۔

صفحہ ۲۳ میں لکھا ہے: 'خرعیسیٰ'؛ 'خر' کے معنے بے وقوف ہیں اور لفظ 'عیسیٰ' سے عظمت اور بزرگی ہوتی ہے جیسے کہ فریزر صاحب کمشنر دہلی یہاں مارے گئے ہیں ان کی تاریخ وفات میں ایک قطعہ یہ ہے:

چوں فریزر کمشنر دہلی گشت مقتول ازتفنگ بلا
از فلک چار میں ندا آمد خرعیسیٰ نمود وا ویلا

'خرعیسیٰ' ایسا ہے جیسا کلب حسین اور کلب علی' چنانچہ والی رام پور، کا نام کلب علی خاں ہے' معنے 'کتے علی کے'۔

سوال وکیل مدعی: اس عبارت سے کیا مراد ہے؟

جواب: میرے نزدیک کوئی امر تضحیک کا نہیں ہے۔

صفحہ ۲۸ میں جو لکھا ہے کہ ’میاں خون حیض غوطہ خورد‘ یہ صنعت ایہام ہے‘ بہ لحاظ حقیقی معنے کے کسی طرح مذمت نہیں۔ اس کے معنے یہ ہیں کہ کام نہایت بے وقوفی سے کرنا‘ اور وہ کام جو نہیں کرنا ہے۔ معنے خون حیض کا پینا نہایت بے وقوفی ہے۔ دوسرے معنی یہ کہ خون حیض کو بہ لحاظ رنگ ناپاک مشابہت شراب سے ہے گویا کثرت شراب۔

سوال وکیل مدعی: اگر آپ کتاب کو دیکھیں تو کیا کہو گے؟

جواب: لطیف عبارت اس واسطے ہم ہنسیں گے مگر تضحیک کسی طرح کی اس میں ہے۔ عرفی کا قول ہے۔ ع خون حیض دختر زجوشد از لب ہائے من

خون حیض عورتوں کو آیا کرتا ہے۔ اگر مرد کی نسبت کہا جائے تو معنے بے وقوفی ہیں‘ جیسا کہ حیض الرجال مرد محل نہیں ہے حیض کے واسطے‘ اس کے معنے عیب اور بدگوئی کے ہیں۔

صفحہ ۳۸ میں لکھا ہے کہ: ’گوش اداز بنا گوش برکنند‘ یا‘ بہ سوراخش میخ زنند‘ سوراخش کے شین کی ضمیر بہ موجب قاعدے کے قریب کی طرف ہوتی ہے یعنی بہ طرف کان مطلب یہ ہے کہ کان، کھولے جاویں‘ مگر صرف لواطت والے اور معنے بھی سمجھ سکتے ہیں۔

صفحہ ۴۲ میں لکھا ہے۔ ’کلال اکبر آبادی‘ بہ معنے مے فروش‘ مگر اس شخص کے واسطے جو دائم الخمر ہو عیب نہیں ہے بلکہ مرزا نوشہ کا شاگرد تخلص مے کش ہے۔ جو شراب نہ پیوے اس کے نزدیک عیب ہے مگر مدعی دائم الخمر ہے اس واسطے اس کی نسبت کچھ تضحیک نہیں ہے۔ دوسری جگہ لکھتا ہے: ’سیلی وگردنی ہارا برائے او بنیاد نہند‘ یعنی ہنسیں ان کے اوپر اور اصل یہ ہی ہے۔

صفحہ ۱۵۱ میں لکھا ہے کہ ’فصد باید کشاد‘ یہ محاورہ روزمرہ کا ہے، کچھ تخی کلام نہیں ہے۔

صفحہ ۶۱ میں ہے ’خطی لغوی معنے اس کے یہ ہیں لڑ چلنا‘۔

صفحہ ۶۶ میں لکھا ہے: ’از خرابہ اکبر آباد بوے بہ دہلی رسیدہ است‘ یہ صنعت ایہام ہے مگر اس جگہ معنے زمین کے ہی اچھی طرح ہو سکتے ہیں۔

صفحہ ۷۰ میں لکھا ہے، لفظ ’از یں عضو‘، اس از یں عضو کی ضمیر بہ طرف قریب پھرتی ہے عضو تناسل کی طرف مگر کوئی کافی نہیں ہے۔

صفحہ ۱۲۷ میں جو لکھا ہے اس کے معنی یہ ہیں کہ خوب اس کو سزا دینا۔

صفحہ ۱۴۱ میں لکھا ہے، لفظ ’ازار‘ اس کے معنی عربی میں چادر کے ہیں مگر ہندی میں پاجامے کو کہتے ہیں۔ یہ کتاب فارسی اگر دیکھا جاوے تو بہ معنے چادر سمجھا جاوے گا۔

صفحہ ۱۴۲ میں لفظ ’خایہ‘ کا لکھا ہے‘ یہ بھی صنعت ایہام ہے مگر اس مقام پر معنے بیضہ مرغ کے

ہیں۔

صفحہ ۱۶۴ میں جو لکھا ہے اس کے معنے یہ ہیں اور ایسے مقام پر یہ عبارت لکھی جاتی ہے کہ جو حرکت بے جا ظہور میں آئی ہو جیسا کہ رقص......

صفحہ ۱۷۲ میں جو عبارت لکھی ہے اس کے معنے یہ ہیں کہ حاکم خوب سزا دے گا۔

عبارت متنازعہ کو ہم لطافت اور خوبی بیان کرتے ہیں اور ایسی تحریر میں دشنام یا ہتک نہیں سمجھتے۔

یہ اظہار گواہ کا ہمارے اہتمام سماعت میں بہ رعایت حکم ایں جانب تحریر ہو کر مظہر کو بہ زبان اردو جس کو وہ سمجھتا ہے، پڑھ کر سنایا گیا، اقرار کیا۔ صحیح ہے۔ مدعا علیہ نے سوال نہیں کیا۔ فقط

اظہار گواہ مدعا علیہ بہ اقرار صالح بہ اجلاس مسٹر اوبرین صاحب بہادر، واقع ۱۳ مارچ ۱۸۲۸ء

نام سدید الدین، والد کا نام رشید الدین، قوم شیخ، ساکن گلی امام، عمر تخمیناً ۶۰ برس کی بیان ہے کہ:

میں نے ان دنوں میں اس کتاب کو دیکھا ہے۔ صفحہ ۱۳ میں لکھا ہے کہ ’حرکت ناکردنی کردہ است‘۔ اس کے معنے یہ ہیں کہ ’حرکت‘ بہ معنی ہلنا اور ’ناکردنی‘ بہ معنے بے جا سوائے اس کے اور کچھ معنے میرے خیال میں نہیں آتے۔ لفظ ’زخم نہانی‘ کے معنے زخم پوشیدہ ہیں یعنی زخم اندرونی، اگر بہ حیل لطیفہ گوئی اور معنے ہوں تو مجھ کو معلوم نہیں۔ ’ضربت ہا کشیدہ‘ کے معنے ہیں کہ کچھ مارا گیا ہے۔

صفحہ ۲۳ میں لکھا ہے کہ ’خر عیسیٰ‘ اس کے معنے بے وقوف کے ہیں۔

صفحہ ۲۸ میں لکھا ہے کہ ’میان خون حیض غوطہ خورد‘ اس کے معنے یہ ہیں کہ جیسے کہ دوسرا فریق لکھتا ہے کہ میں پھنس گیا، مصنف اس کا لکھتا ہے کہ ناپاک چیز میں پھنس گیا۔

سوال از طرف مدعا علیہ: حیض الرجال کے معنے کیا ہیں؟

جواب: بدگوئی کے۔

صفحہ ۲۸ میں لکھا ہے کہ ’گوش اواز بنا گوش برکنند یا بہ سوراخش میخ زنند‘ سوراخش کے شین کی ضمیر بہ طرف گوش ہے معنے اس کے تحت لفظی ہیں۔

سوال وکیل مدعی: اگر سوراخش کے شین کی ضمیر بہ طرف گوش ہو تو بھی ایسے الفاظ سخت ہوتے ہیں یا نہیں؟

جواب: کچھ سخت الفاظ نہیں ہیں۔

صفحہ ۴۲ میں لکھا ہے: ’کلال اکبرآبادی‘ اردو میں کلال مے فروش کو کہتے ہیں، مگر یہ کتاب فارسی میں ہے، اس واسطے بہ معنی مے نوش۔ ’رقص میمونی دشتر غمزہ‘ کے معنے بیہودہ کلام ہے۔

سوال وکیل مدعی: تحت لفظی معنے کیا ہیں؟

جواب: صاف ہیں۔

صفحہ ۶۸ میں لکھا ہے کہ ’دستش بستہ بہ لائے شراب اندازند‘ اوپر کی عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے معنے شراب کے نہیں ہیں، اگر پیدا کرے جاویں تو معترض کے ہاتھ باندھ کر ’بہ لائے شراب‘ ڈالیں۔

صفحہ ۷۰ میں ’معترض ازیں عضو صدمے دیدہ است‘ معنے یہ ہیں کہ مصنف ’قاطع برہان‘ یعنی اس جگہ معنے عضو تناسل لکھا ہے، اور جگہ اس عضو کو دیکھا ہے۔ مصنف اس کتاب کا یہ قول ہے، کہ معترض نے اس عضو سے کیا صدمہ دیکھا ہے۔

صفحہ ۱۲۷ میں جو عبارت لکھی ہے۔ ’ایں چنیں تہمت را حاکم منصف می دید بینی چہ گویم گوشش می برید‘ اس کے معنے صاف ہیں اور معنے اس کے تحت لفظی ہیں دوسرے معنے یہ کہ ’حاکم سزا دیتا‘ اور معنے نہیں۔

صفحہ ۱۴۱ میں لکھا ہے۔ ’بضاعت خواجہ ہمیں ازار است ہر کس را نشان می دہد‘۔

’ازار معنے ’تہمد کے ہیں، امور بجیہ کے نہیں، صرف علمی بحث ہے۔

صفحہ ۱۴۲ میں لکھا ہے لفظ ’خایہ‘ کا، اس کے دو معنے ہیں، ایک بیضہ مرغ دوسرے خصیہ مگر چونکہ اس مقام پر لفظ ’نان خورش‘ اس واسطے معنے اس کے اس مقام پر بیضہ مرغ کے ہیں۔

صفحہ ۱۶۳ میں لکھا ہے: ’جستن خرس را یاد کردہ است و رقص بوزنہ بہ اظہار آورد‘ اس کے معنے حرکت لغو اور کام بیہودہ کے ہیں۔

صفحہ ۱۷۲ میں جو لکھا ہے اس کے معنے تحت لفظی صاف ہیں۔

سوال عدالت: جو فقرے آپ نے پڑھے ہیں آپ ان کو کیا سمجھتے ہیں؟

جواب: میں فقروں کو لطائف سمجھتا ہوں، بحث میں ایسے بھی فقرے ہوتے ہیں، فحش یا بدنامی کسو کی نہیں ہے، نہ کسی کو برا معلوم ہوگا۔

یہ اظہار گواہ کا ہمارے اہتمام سماعت میں بہ رعایت حکم ایں جانب تحریر ہو کر مظہر کو بہ زبان اردو جس کو وہ سمجھتا ہے، پڑھ کر سنایا گیا، اقرار کیا صحیح ہے، وکیل مدعا علیہ کے سوال کا جواب لکھا گیا۔ فقط

اظہار گواہ مدعا علیہ بہ اقرار صالح، بہ اجلاس مسٹر اوبرین صاحب بہادر ۱۳؍ مارچ ۱۸۶۸ء

نام میرا حشمت اللہ خاں، ولد غلام نقش بند خاں، قوم ساکن ضیا محل، عمر ۴۲ سال پیشہ حکمت بیان یہ ہے کہ:

اس چار پانچ روز کے عرصے میں مظہر نے اس کتاب کو دیکھا ہے۔ صفحہ ۱۳ میں لکھا ہے: ‘حرکت ناکردنی، زخم نہانی وضربت ہا’ حرکت ناکردنی خصوص کسی حرکت کے واسطے نہیں ہے، ‘ضربت ہا’ کے تین معنے ہیں اول (؟) دوم‘ پیدا کرنا۔ سوم‘ اپنا ہاتھ سر میں مارنا۔ چہارم‘ سستے نقصان کے بھی ہیں، اور زخم نہانی معنے دردِ دل کے ہیں، اور اکثر کتابوں میں لکھا ہے کہ ‘زخم نہانی’ معنے رنج دوری حاصل کرنے کے ہیں۔

صفحہ ۲۳ میں لکھا ہے۔ ‘خرعیسیٰ’ اس کے معنے بے وقوف کے ہیں، اور ‘خر’ کے معنی نادان ہیں، اور لفظ عیسیٰ بہت بزرگ ہیں۔ اگر ہم کو خرعیسیٰ کہا جاوے، تو ہم اپنی عزت سمجھیں۔

صفحہ ۲۸ میں لکھا ہے: ‘میاں خون حیض غوطہ خورد’ اس کی مراد بے وقوف اور گندی بات سے ہے۔ اصل مراد اس کی مصنف سے پوچھی جاوے۔

صفحہ ۳۸ میں لکھا ہے۔ ‘بہ سوراخش میخ زنند’ سوراخش کے شین کی ضمیر بہ طرف گوش کے ہے۔

سوال وکیل مدعی: اس مضمون سے کوئی شخص برا مانتا ہے؟

جواب: شعرا کے نزدیک برا ماننے کے نہیں ہے، اگر کوئی جھوٹ ہم سے کہے تو برا مانیں، مگر برا ماننے کی کوئی بات نہیں ہے۔

صفحہ ۴۲ میں لکھا ہے۔ ‘کلال’ کے معنے ہندی میں مے فروش کے ہیں، اور عربی میں سست کو کہتے ہیں۔ یہ کتاب فارسی ہے، ہندی کے معنے نہیں ہو سکتے۔

سوال وکیل مدعی: فارسی میں کیا معنے ہیں؟

جواب: اس کا حال نہیں معلوم۔

صفحہ ٦٦ میں لکھا ہے۔ ‘از اکبرآباد بومے بہ دہلی رسیدہ’ اس کے معنے یہ ہیں اور ترکیب مقلوب ہے، یعنی از بوم اکبرآباد معنے ہیں، اس جگہ معنے ‘الو’ کے نہیں ہیں وانکہ اوپر معترض نے لکھا ہے کہ بوم مصنف نے لکھا ہے کہ اکبرآباد بوم۔

صفحہ ۷۰ میں لکھا ہے۔ ‘معترض ازیں عضو صدمتے دیدہ است’ اس کی ضمیر بہ طرف آلہ تناسل ہوتی ہے اور ‘ازیں’ کی ضمیر بہ طرف قریب ہے۔

صفحہ ۱۲۷ میں جو لکھا ہے اس کے معنی تحت لفظی ہیں کہ اگر حاکم اس کی ‘تہمت کو دیکھتا تو

کان کا تنا۔ صفحہ ۱۴۱ میں لکھا ہے کہ ’بضاعت خواجہ ہمیں ازار است ہر کس رانشان می دہد تا خریداری نماید‘ معنے ازار کے چادر کے ہیں‘ ’خریداری‘ کے معنے قبول کرنے کے ہیں۔

صفحہ ۱۴۲ میں لکھا ہے کہ ’خایہ‘ اس کے معنی بیضہ مرغ کے ہیں‘ اور مرزا نے بھی اسی قول میں معنے اس کے بیضہ مرغ اوپر لکھے ہیں۔

صفحہ ۱۶۳ میں ’جستن خرس رایاد کردہ است ورقص بوزنہ یاد آوردہ‘، معنے اس کے یہ ہیں کہ بے جا باتوں کو یاد کیا جیسا کہ ’جستن خرس ورقص بوزنہ‘ حرکت بے جا ہے۔

صفحہ ۱۷۲ میں لکھا ہے: ’گوش و بینی چرا گویم وتشی خواہد برید‘ معنے اس کے اوپر کی عبارت سے یہ ہیں کہ حاکم سزا دیتا ہے۔ میرے نزدیک سخت کلامی اس میں نہیں ہے‘ شعراء ایسی عبارت لطافت طوالت کے ساتھ خیال کرتے ہیں۔

یہ اظہار گواہ کا ہمارے اہتمام سماعت میں بہ رعایت حکم ایں جانب تحریر ہو کر مظہر کو بہ زبان اردو جس کو وہ سمجھتا ہے‘ پڑھ کر سنایا گیا‘ اقرار کیا‘ صحیح ہے‘ مدعا علیہ کے سوال کا جواب لکھا گیا۔ فقط

اظہار گواہ مدعا علیہ

نام میرا حمید اللہ‘ عرف عبدالحکیم ولد محمد عبداللہ‘ قوم سید‘ عمر ۳۹ برس‘ ساکن کلاں محل‘ پیشہ روزگار۔

بیان یہ ہے کہ:

میں نے اب یہ کتاب دیکھی صفحہ ۱۳ میں لکھا ہے‘ ناکردنی ضربت ہا و زخم نہانی۔‘ ’حرکت ناکردنی‘ کے معنے لفظی ہیں خصوصیت کسی حرکت پر نہیں‘ ’ضربت ہا‘ کے معنے رنج وصدمے کے ہیں اور ’زخم نہانی‘ کے معنے رنج کے ہیں اور اکثر شعرا نے بھی یہی معنے باندھے ہیں۔

صفحہ ۲۳ میں لکھا ہے: ’خرعیسیٰ‘ اس کے معنے یہ ہیں کہ ’خر‘ بہ معنی نادان‘ اور ’عیسیٰ‘ کا نام پیمبر کا لفظ جس سے فخر ہو گیا۔

صفحہ ۲۸ میں لکھا ہے۔ ’میان خون حیض غوطہ خوردہ‘ اس کے معنے یہ ہیں کہ گناہ گار ہوئے‘ مگر در (؟) لفظ ہیں اگر دوسری دفعہ کوئی غلطی کرے گا تو اس عبارت کو باندھ جاوے گا۔ دیوان حافظ میں کئی جگہ خون حیض درج کیا گیا ہے‘ اس وقت کوئی شعر یاد نہیں‘ یقین ہے‘ کہ مولانا شاہ عبدالعزیز نے ’تحفۂ

اثنا عشریہ میں ان الفاظ کو لکھا ہے۔

صفحہ ۳۸ میں لکھا ہے کہ 'سزاوار بنا گوش برکنند یا میخے بہ سوراخش زنند'۔ معنے اس کے لفظی ہیں 'سوراخش' کے شین کی ضمیر بہ طرف گوش ہے۔

صفحہ ۳۲ میں لکھا ہے 'کلال اکبر آبادی' یہ کتاب فارسی ہے' فارسی میں کلال بہ معنے ست کے ہیں اور اردو میں بہ معنے مے فروش۔

صفحہ ۶۶ میں لکھا ہے کہ 'آرے از خرابہ اکبر آباد بوے بہ دہلی رسیدہ'۔ معنے یہ ہیں کہ بوم اکبر آباد سے یعنی زمین اکبر آباد سے کوئی دہلی میں پہنچا۔

صفحہ ۷۰ میں لکھا ہے کہ 'ازیں عضو صد ستے دیدہ است' معترض کے دل میں ہے کہ 'از ہمیں عضو' اس ہمیں کی اضافت بہ طرف عضو تناسل ہے اور ازیں عضو کی اضافت بہ طرف اس عضو کے ہے۔

صفحہ ۱۲۷ میں جو لکھا ہے' اس کے معنے یہ ہیں کہ حاکم سزا دیوے۔

صفحہ ۱۳۱ میں لکھا ہے کہ 'بضاعت خواجہ ہمیں ازار است' بر کس رانشان می دہد۔

اوپر قول ہے معترض کا جس میں لکھا ہے کہ 'کلاہ را ازار نام نہادہ' مصنف نے لکھا ہے کہ یہ وہی ازار ہے، معنے چادر کے ہیں۔

صفحہ ۱۳۲ میں لفظ 'خایہ' لکھا ہے' اس کے معنے بیضہ مرغ کے ہیں۔

صفحہ ۱۶۳ میں لکھا ہے کہ 'جستن خرس رایاد کردہ است' اور 'رقص بوزنہ بہ اظہار آوردہ' اس کے معنے نظر کرنے کے جہاں (؟) نے قاصد باندھ لئے ہیں۔

صفحہ ۱۷۲ میں لکھا ہے، اس کے معنے تحت لفظی ہیں 'اگر اس چوری کو میں کہوں تو کان ناک کیا کہوں ہاتھ کاٹے جاتے ہیں۔

ایسی عبارت کو برا نہیں سمجھتا ہوں' جہاں مناظر علمی ہوتا ہے وہاں ایسی عبارت ہمیشہ ہوتی ہے بلکہ اوروں نے زیادہ اس سے لکھا ہے۔

اظہار گواہ ہمارے اہتمام سماعت میں بہ عبارت معمولی۔

جناب عالی!

جو کہ مجھ مدعی کا مقدمہ بہ نام مولوی امین الدین بابت ازالہ حیثیت عرفی حسب منشائے دفعہ

۴۹۹ تعزیرات ہند عدالت سے، چنانچہ بہ فہمائی چند گرامی روسائے شہر باہم رضامندی ہوئی اب مجھ کو کچھ دعوی بابت مقدمہ باقی نہیں، مقدمہ داخل دفتر ہو جائے۔

عرض

عزیز الدین وکیل مدعی ۲۳ر مارچ ۱۸۶۸ء

از پیش گاہ اوبرین صاحب بہادر
مقدمہ خارج اور کاغذات داخل دفتر۔ فقط

ماخذ (اردو۔ ۵)

rekhta

’ٹھنڈا گوشت‘

ایک اردو رسالہ بہ نام ’جاوید‘ کے ایڈیٹر عارف عبدالمتین اور اس کے پبلشر نصیر انور کو معہ ایک مصنف مسمی سعادت حسین منٹو کے میرے پاس مقدمہ زیر دفعہ ۲۹۲ پی پی سی کے لئے بھیجا گیا ہے۔ موخر الذکر ملزم کے خلاف یہ الزام ہے کہ وہ ایک فحش کہانی جس کا عنوان ’ٹھنڈا گوشت‘ ہے، کا مصنف ہے اور جو مذکورہ بالا رسالہ کے ایک خاص نمبر میں شائع ہوئی ہے۔ دوسرے دو ملزموں کے خلاف یہ الزام ہے کہ انہوں نے اس کہانی کو مندرجہ بالا انداز میں شائع کرنے کا جرم کیا ہے۔

رسالہ ’جاوید‘ کا خاص نمبر مارچ ۱۹۴۹ء میں شائع ہوا تھا۔ یہ سید ضیاء الدین، مترجم پریس برانچ حکومت پنجاب، کے علم میں آیا۔ جو اس مقدمہ میں گواہ استغاثہ نمبر ۳ کی حیثیت سے پیش ہوا۔ اس کا یہ فرض ہے کہ وہ کسی بھی طبع شدہ چیز میں کوئی فحش مواد محسوس کرے تو اس سے حکومت پنجاب کو مطلع کرے۔ اس کے خیال میں مذکورہ بالا ایڈیشن میں شائع شدہ کہانی بعنوان ’ٹھنڈا گوشت‘ فحش تھی۔ چنانچہ اس نے حکومت پنجاب کی توجہ اس طرف مبذول کرائی اور اس غرض کے لئے قانونی کارروائی کے لئے کہا۔ اس کہانی کی تصنیف اور خاص نمبر میں اس کی اشاعت سے انکار نہیں کیا گیا۔ اور نہ پہلے دونوں ملزم رسالے کے مدیر اور ناشر ہونے سے منکر ہیں۔ لہٰذا اب سوال صرف یہ رہ جاتا ہے کہ کہانی بعنوان ’ٹھنڈا گوشت‘ فحش ہے یا نہیں!

استغاثے نے مذکورہ رسالے کے خاص نمبر کو پیش کیا ہے جو ریکارڈ میں (ایکس۔ پی۔ ایف) کی حیثیت سے درج کیا گیا ہے۔ کہانی جو اس قانونی چارہ جوئی کا موضوع ہے اس شمارے کے صفحہ ۸۸ سے ۹۳ تک چھپی ہے۔ میں نے نہایت غور سے اس کہانی کو پڑھا‘ جو موضوع کی تشکیل کرتی ہے اور دیکھا کہ اس میں گندہ طرز بیان‘ اور ناشائستہ گالیاں استعمال کی گئی ہیں۔ میں نے یہ بھی محسوس کیا کہ اس کہانی میں کئی شہوت پرستانہ مقامات پیش کئے گئے ہیں اور جنسی اشارات کا اکثر ذکر کیا گیا ہے۔ یہ طے کرنے کے لئے کہ آیا کوئی تصنیف مثلاً زیر بحث کہانی فحش ہے یا نہیں‘ ضروری ہے کہ ایک معیار مقرر کیا جائے‘ جس سے فحاشی کی تمیز کی جا سکے۔

۳ کیو۔ بی ۱۸۶۸ء میں ہکلن رپورٹ میں اسی موضوع کے ایک مشہور مقدمے میں لارڈ کاک برن جی جے نے صفحہ نمبر ۳۷۱ تا ۳۶۰ پر فحاشی کا یہ معیار مقرر کیا تھا: ’جب مواد کا رجحان جس پر

عریانی کا الزام ہے، انہیں بداخلاقی کی طرف مائل کرنا ہو جن کے اذہان اس قسم کے اثرات قبول کر سکتے ہیں اور اس قسم کی اشاعت جن کے ہاتھ لگ سکتی ہے"۔ معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان کی تمام عدالت ہائے عالیہ ہمیشہ اس معیار کی تقلید کرتی رہی ہیں۔ اس معیار سے یہ ظاہر ہے کہ قانون میں مستعملہ عریانی اس ماحول سے متعلق ہے جس میں کہ یہ جانچی جاتی ہے۔ وہ باتیں جو ایک پاکستانی کے اخلاق کے لئے ضرررساں خیال کی جائیں، جہاں تک ایک فرانسیسی کا تعلق ہے بالکل بے ضرر سمجھی جاسکتی ہیں۔ ہر سوسائٹی کے اپنے اخلاقی معیار ہوتے ہیں اور وہ چیزیں جو ایک سوسائٹی کا اخلاقی قوام خیال کی جاتی ہیں، بعض اوقات دوسری سوسائٹی کے معیار کے مطابق غیر اخلاقی ہو سکتی ہیں۔ اسی طرح اظہار کے بعض اسالیب کا اثر مختلف سوسائٹیوں کے افراد پر مختلف ہوتا ہے، خواہ یہ اظہار مخالف معیاروں کے نزدیک غیر اخلاقی ہی کیوں نہ ہو۔ اس لئے زیر بحث کہانی کے فحش یا غیر فحش ہونے کا فیصلہ پاکستان کے مروجہ اخلاقی معیاروں کے پس منظر پر کرنا ہوگا۔ اور اس کے اثر کے مطابق جو اس قسم کی تحریر اس سوسائٹی میں رہنے والے لوگوں کے اذہان پر ڈالے گی۔

لارڈ کاک برن کا قائم کردہ معیار ایک مکمل اور جامع تعریف نہیں ہے۔ یہ جیسا کہ اس کا مفہوم ظاہر کرتا ہے، صرف ایک معیار ہے۔ اس کے علاوہ کچھ اور بھی معیار ہو سکتے ہیں۔ ان میں سے ایک وہ رجحان ہے (یہ الزام زدہ مواد میں موجود ہے) جو قارئین کے اخلاقی احساسات کو ٹھیس پہنچاتا ہے۔ یہ معیار بھی قارئین کے اخلاق پر منحصر ہے۔

استغاثہ نے ابتدا میں صرف پانچ گواہ پیش کئے اور کیس بند کر دیا۔ گواہ استغاثہ (۱) مسٹر محمد یعقوب، منیجر کپور پرنٹنگ پریس، (۲) شیخ محمد طفیل، (۳) مرزا محمد اسلام۔ گواہ استغاثہ (۴) خدا بخش نے ان امور کے متعلق شہادت دی، جن کا فحاشی سے کوئی تعلق نہیں۔ گواہ استغاثہ نمبر ۳، سید ضیاء الدین نے دوسرے امور بیان کرنے کے علاوہ اپنی رائے ظاہر کی کہ زیر بحث کہانی فحش ہے۔ تاہم ریکارڈ میں کوئی اس قسم کا مواد نہیں جن سے ظاہر ہو کہ یہ گواہ ماہر ادب سمجھا جاسکتا ہے۔ میرے خیال میں قانون شہادت کی دفعہ نمبر ۴۵ کی رو سے اس کی شہادت قابل قبول نہیں ہے۔ اس لئے جہاں تک فحاشی کے مسئلے کا تعلق ہے، استغاثے کا کیس جیسا کہ ابتدا پیش کیا گیا، خود عدالت کی رائے اور الزام زدہ مواد کے مطالعہ کے بعد اس کی ماہیت پر منحصر ہوگا۔

ملزمین نے صفائی میں سات گواہ، ادبی امور کے ماہرین کی حیثیت سے پیش کئے۔ ان گواہوں کی شہادت سے یہ ثابت کرنا مقصود تھا کہ زیر بحث تحریر فحش نہیں ہے۔ صفائی کے اختتام پر استغاثے نے درخواست کی کہ مسئلے کی اہمیت کے پیش نظر کچھ اور ماہرین بطور عدالتی گواہ بلائے جائیں اور میں نے انصاف کی خاطر چار اور ماہروں کو بطور عدالتی گواہ بلوایا۔

بیشتر ماہرین نے خواہ وہ صفائی کی طرف سے پیش ہوئے یا عدالت کی طرف سے، کسی نہ کسی فریق کے حق میں رائے دی کہ زیر بحث کہانی فحش ہے یا نہیں۔ جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے، تعزیرات میں جو فحاشی کی اصطلاح استعمال ہوئی ہے' اس کی ٹیکنیکل اہمیت ہے' جس کا تعین عدالت کو کرنا ہے۔ ماہرین کی شہادت اسی حد تک ضروری ہے جہاں تک ادب کے مُروّجہ معیاروں' اظہار کی شُستگی' سوقیانہ پن' اخلاقی یا غیر اخلاقی حیثیت اور اس رجحان کے متعلق جو کوئی تحریر قارئین کے اذہان پر اثر انداز ہو روشنی ڈالتی ہے۔ ان امور سے یہ تعین کرنا عدالت کا کام ہے کہ کوئی چیز 'فحاشی' کی شرائط کو پورا کرتی ہے یا نہیں۔

صفائی کے گواہ (نمبر۱) مسٹر عابد علی، (نمبر۲) مسٹر احمد سعید، (نمبر۳) ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم، (نمبر۴) ڈاکٹر سعید اللہ، (نمبر۵) فیض احمد فیض، (نمبر۶) صوفی غلام مصطفی تبسم، (نمبر۷) ڈاکٹر آئی لطیف، سب صاحب علم ہیں۔ ان کے خیال کے مطابق کیونکہ آرٹ زندگی کا آئینہ دار ہے، اس لئے فنکار کوئی ایسی چیز جو زندگی کی سچی تصویر ہو' حقیقت پسندانہ طور پر پیش کرنے سے اپنے حقوق سے تجاوز نہیں کرتا۔ اس لئے وہ یہ جواز پیش کرتے ہیں کہ زندگی کا حقیقت پسندانہ اظہار فحش نہیں ہوسکتا۔ وہ زیر بحث کہانی کی غیر شائستہ زبان اور اس کے سوقیانہ محاوروں کو بھی قابل گرفت نہیں سمجھتے، کیونکہ یہ اس قسم کی گفتگو کی نمائندگی کرتے ہیں جو پیش کردہ کردار کی نوع کے لوگ بولتے ہیں۔ ان میں سے بعض نے یہ کہا ہے کہ زیر بحث کہانی میں قارئین کے اخلاق کو بگاڑنے کا کوئی میلان نہیں پایا جاتا۔ بعض نے اس نکتے پر خاموشی اختیار کی۔ عدالتی گواہ (نمبر۱) مولانا تاجور، (نمبر۲) آغا شورش کاشمیری، (نمبر۳) مولانا ابوسعید بزمی، (۴) ڈاکٹر تاثیر بھی اسی پائے کے علمی آدمی ہیں۔ ان گواہوں کی شہادت سے یہ بات نمایاں ہوتی ہے کہ زیر بحث کہانی 'بُرا ادب ہے، اور غیر شائستگی سے پیش کی گئی ہے۔

صفائی کے گواہ (نمبر۷) ڈاکٹر آئی لطیف نے رائے ظاہر کی کہ اگر زیر بحث کہانی کسی میڈیکل جریدے میں شائع ہوتی تو یہ ایک سبق آموز کیس ہسٹری ہوتی' لیکن ایک مقبول عام رسالے میں جسے ہر شخص پڑھ سکتا ہے' ناموزوں معلوم ہوتی ہے۔ صفائی کے گواہ (نمبر۵) کرنل فیض احمد فیض کا خیال ہے کہ اگرچہ وہ اسے فحش نہیں کہہ سکتے تاہم یہ کہانی ادب کا کوئی اچھا نمونہ نہیں۔ اس میں بعض غیر شائستہ محاورے استعمال کئے گئے ہیں جن سے اجتناب کیا جا سکتا تھا۔ عدالتی گواہ (نمبر۱) مولانا تاجور نے اس کی سخت اور غیر مبہم الفاظ میں مذمت کی اور کہا کہ انہوں نے اپنے چالیس سالہ ادبی تجربہ میں اس سے زیادہ کوئی چیز غیر شائستہ نہیں دیکھی۔ عدالتی گواہ (نمبر۴) ڈاکٹر تاثیر کی رائے ہے کہ اس میں ان لوگوں کا اخلاق بگاڑنے کا رجحان موجود ہے جو شہوانی حرص کی طرف مائل ہوتے ہیں۔

پاکستان کے مروجہ اخلاقی معیار، قرآن پاک کی تعلیم کے حوالے سے بہت صحیح طور پر معلوم ہوسکتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ غیر شائستگی اور شہوانیت کی لگام شیطان کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ غیر شائستگی'

شہوانیت، نفس پرستی اور سوقیانہ پن میں زندگی موجود ہے۔ اگر ادبی مذاق کے اس معیار کو تسلیم کر لیا جائے جسے صفائی کے گواہوں نے بیان کیا ہے تو زندگی کے پہلوؤں کا حقیقت نگارانہ اظہار اچھا ادب ہو سکتا ہے، لیکن پھر بھی یہ ہمارے معاشرے کے اخلاقی معیار کی خلاف ورزی کرے گا۔ ملزم سعادت حسن منٹو کی لکھی ہوئی کہانی ایک سوقیانہ آدمی کے کردار کو پیش کرتی ہے جو اپنی معشوقہ سے، جسے بہت شہوت پرست دکھایا گیا ہے، وحشیانہ اور سوقیانہ انداز سے جنسی فعل کا طالب ہوتا ہے۔ جنسی تضمین کے ساتھ غیر شائستہ گالیوں کا استعمال عام کیا گیا ہے۔ جنسی نوع کے افعال کے سلسلے میں نسوانی جسم کے پوشیدہ اعضا کا ذکر نہایت بدتہذیبی سے کیا گیا ہے۔ ساری کہانی ایک ناشائستہ جنسی معاملے پر مرکوز ہے۔ درحقیقت جنسی بدتہذیبی ہی اس کہانی کا بنیادی تصور ہے۔

ادبی اور نفسیاتی ماہر کہانی کا ایک خاص انداز سے ردعمل قبول کر سکتے ہیں، تاہم میری رائے میں ایک الہڑ نابالغ پر اس قسم کی کہانی کا ردعمل، اظہار، بول چال اور خیالات میں غیر شائستگی کی حوصلہ افزائی کی صورت میں ہوگا۔ سعادت حسن منٹو جیسے بزعم خود مشہور مصنف کی مثال قرار پیش نظر رکھتے ہوئے وہ نوجوان جو اس کہانی کو پڑھیں گے اسی طرح سے غیر شائستگی کو تقویت دیں گے۔ کہانی بعنوان 'ٹھنڈا گوشت' کو غور سے پڑھنے کے بعد مجھے اطمینان ہو گیا ہے کہ اس میں قارئین کا اخلاق بگاڑنے کا میلان موجود ہے اور یہ ہمارے ملک کے مروجہ اخلاقی معیاروں کی خلاف ورزی کرتی ہے۔ اس لئے میں ملزم سعادت حسن منٹو کو ایک فحش تحریر پیش کرنے کا ذمہ دار ٹھہراتا ہوں اور اسے زیر دفعہ ۲۹۲ پی پی سی، تین ماہ قید بامشقت اور تین سو روپے جرمانے کی سزا دیتا ہوں۔ عدم ادائیگی جرمانہ کی صورت میں اس کو مزید ۲۱ یوم کی سزا بھگتنی پڑے گی۔ ملزمین عارف عبدالمتین اور نصیر انور جو واضح طور پر جریدے کے مدیر اور ناشر ہیں، جس میں مذکورہ کہانی شائع ہوئی ہے، ایک فحش تصنیف کی اشاعت عام کے مجرم ہیں اور وہ بھی اسی دفعہ کے تحت آتے ہیں، تاہم ان کے معاملے میں ان کی کم عمری کے پیش نظر اور پھر یہ کہانی کا مصنف ایک ایسا شخص تھا، جو خاصی ادبی شہرت کا مالک ہے، انہوں نے اسی اعتماد کی وجہ سے کہانی قبول کر لی ہوگی کہ یہ قابل قبول ادب پارہ ہوگا، میں ان ہر دو ملزموں کے لئے تین تین سو روپے جرمانے کی نرم سزا تجویز کرتا ہوں، چونکہ یہ انصاف کے تقاضوں کو پورا کرے گی، اس لئے میں اس کے مطابق حکم دیتا ہوں۔ عدم ادائیگی جرمانہ کی صورت میں ملزمین عارف عبدالمتین اور نصیر انور کو اکیس یوم قید بامشقت بھگتنی پڑے گی۔

دستخط

اے۔ ایم۔ سعید

مجسٹریٹ درجہ اول۔ لاہور

اپیل برائے سیشن:

یہ تین نوجوانوں، عارف عبدالمتین، نصیر انور اور سعادت حسن منٹو کی طرف سے ایک ایک اپیل ہے۔ اول الذکر دونوں ایک اردو رسالہ 'جاوید' کے علی الترتیب مدیر اور ناشر ہیں۔ تیسرا ایک ادیب ہے جس نے مذکورہ رسالے کے مارچ ۱۹۴۹ء میں شائع شدہ ایک خاص نمبر میں اپنی ایک کہانی جس کا نام 'ٹھنڈا گوشت' ہے، چھپنے کے لئے دی۔

انہیں بحکم میاں اے ایم سعید، مجسٹریٹ درجہ اول، لاہور، مورخہ ۱۶ جنوری ۱۹۵۰ء زیر دفعہ ۲۹۲ پی پی سی (فحش کتابوں کی فروخت وغیرہ) کی خلاف ورزی کے سلسلے میں مجرم قرار دیا گیا ہے۔ مصنف مسٹر منٹو کو تین ماہ قید بامشقت اور تین سو جرمانہ بصورت عدم ادائیگی جرمانہ ۱۲ یوم مزید قید بامشقت اور تین سو جرمانہ بصورت عدم ادائیگی جرمانہ ۱۲ یوم مزید قید بامشقت سزا دی گئی ہے۔ دوسرے دو یعنی مدیر اور ناشر کو صرف تین تین سو جرمانہ بصورت عدم ادائیگی، تین تین ہفتہ قید بامشقت کی سزا دی گئی ہے۔ یہ تینوں اپیل میں پیش ہوئے ہیں۔ واقعات فیصلہ زیر اپیل میں موجود ہیں۔ مضمون کی طرف حکومت کی توجہ پریس برانچ کے ایک عہدے دار نے مبذول کرائی تھی، چیف سیکریٹری نے قانونی چارہ جوئی کا حکم دیا تھا۔

میں نے فریقین کے فاضل مشیران قانون کو سنا ہے اور مثل کا مطالعہ کیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ ملزمان کے خلاف جرم ثابت نہیں کیا جا سکا اور سزا برقرار نہیں رہ سکتی۔ میرا خیال ہے کہ مضمون زیر بحث کو فحش اور خاص طور پر خلاف قانون قرار نہیں دیا جا سکتا۔ ملزمین رسالہ سے اپنا تعلق مانتے ہیں۔ اب طے کرنے کے لئے فقط ایک سوال ہے کہ کہانی فحش اور خصوصاً خلاف قانون ہے یا نہیں! اس سلسلے میں کئی نکتے پیدا ہوتے ہیں۔ اولاً یہ کہ لفظ 'فحش' سے ہم کیا مراد لیتے ہیں۔ دوم یہ کہ یہ ایسا معاملہ ہے جس میں ماہرین کی شہادت پیش کی جا سکتی ہے۔ سوم یہ کہ آیا مضمون زیر بحث قابل اطلاق معیاروں کے مطابق فحش قرار دیا جا سکتا ہے؟ میں نے قانون جرائم ایڈیشن ۱۹۴۵ء میں رتن لال وغیرہ کومنٹری دیکھی ہے اور وہاں اٹھائے ہوئے سوالوں پر فریقین کے پیش کردہ دلائل پر غور کیا ہے۔

فحاشی کی جانچ کا معیار وہاں یہ مقرر کیا گیا ہے کہ آیا 'مواد کا رجحان جس پر عریانی کا الزام

ہے' انہیں بداخلاقی کی طرف مائل کرتا ہے' جن کے اذہان اس قسم کے اثرات بدقبول کر سکتے ہیں اور اس قسم کی اشاعت جن کے ہاتھ لگ سکتی ہے۔ قانون کا منشا ہے کہ اس کو روکے۔ اگر کوئی تحریر حقیقتاً کسی ایک بھی جنس کے نوجوانوں یا زیادہ عمر کے لوگوں کے اذہان کو انتہائی گندے اور شہوت پرستانہ قسم کے خیالات بجھائے تو اس کی اشاعت خلاف قانون ہے' خواہ ملزم کے پیش نظر' کوئی در پردہ مقصد کیوں نہ ہو' جو معصوم حتیٰ کہ قابل تعریف ہی کیوں نہ ہو۔ کوئی چیز جو شہوانی جذبات کو مشتعل کرے' فحش ہے۔'

پھر ایسے فیصلے بھی ہیں جو قرار دیتے ہیں کہ محض فقروں اور جملوں کو اس لئے معاف نہیں کیا جاتا کہ باقی کی اشاعت ناقابل اعتراض ہے اور یہ کوئی جواز نہیں کہ شائع شدہ مضمون کسی ممتاز مصنف کا لکھا ہوا ہے یا ایسے اسلوب میں لکھا گیا ہے، جو آسانی سے ہر ایک کی سمجھ میں نہیں آ سکتا یا یہ کہ اشاعت میڈیکل ہے اور صرف مخصوص گاہکوں کے پاس بیچی جاتی ہے۔ ہمیں صرف تصنیف کی ماہیت کو بلکہ حاضر معاشرہ کی حالت کو بھی دیکھنا ہے۔ اگر تصنیف بازار میں آزادانہ مہیا ہو سکتی ہے تو ہمیں یہ طے نہیں کرنا کہ مخصوص یا خواہش سے خریدنے والے گاہک اور پڑھنے والے کون ہیں۔ ہمیں تو صرف یہ دیکھنا ہے کہ آیا یہ عوام تک پہنچ سکتی ہے' جن میں دونوں جنس کے جواں سال اور بڑی عمر کے لوگ بھی شامل ہیں۔ پس ہمیں تصنیف کی ماہیت کا اپنے سماج کی موجودہ حالت کی روشنی میں تعین کرنا ہے۔ میرے خیال میں اس معاملے کو اس مقام پر چھوڑا جا سکتا ہے اور ہمیں اس کی طرف بعد میں رجوع کرنا چاہئے، جب ہم اس مسئلے پر غور کر چکیں کہ آیا یہ سوال ماہروں کی رائے سے طے ہو سکتا ہے یا نہیں! جہاں تک اس امر کا تعلق ہے' میں سمجھتا ہوں کہ یہ معاملہ ماہروں کی رائے سے ہرگز طے پانے والا نہیں۔ ہمیں اس پر غور نہیں کرنا کہ اس کے متعلق کچھ خاص اور ممتاز ادیب کیا رائے قائم کرتے ہیں۔ اس کے برخلاف ہمیں یہ پڑتالنا ہے کہ پڑھنے والوں پر عام طور سے اس تحریر و تصنیف کا کیا ردعمل ہوگا!

اگر میرا یہ خیال درست ہے تو فاضل عدالت ماتحت کی ریکارڈ کردہ شہادتوں کا کوئی حصہ اس نکتے کے لحاظ سے قابل قبول نہیں رہ سکتا۔ اگر بفرض محال وہ حضرات جو فریقین یا عدالت کی طرف سے پیش ہوئے' ہم ان کی شہادت کو عام پڑھنے والوں کی شہادت کی حیثیت سے قبول کریں اور کسی فریق کو خاص اہمیت نہ دیں تو ریکارڈ شدہ شہادت عدالت کو کوئی زیادہ مدد نہیں دیتی۔ گواہوں کی ایک جماعت نے یہ کہا ہے کہ زیر بحث مضمون انتہائی فحش ہے۔ دوسری جماعت نے اس کے خلاف بیان دیا ہے اور اسے ایک ایسا فن پارہ قرار دیا ہے جس میں کوئی بھی غیر اخلاقی چیز نہیں۔

غور کرنے پر یہ پتہ چل سکتا ہے کہ یہ رائے عین قدرتی فرق ہے۔ مختلف طبقوں کے پڑھنے والوں کا ردعمل مختلف ہوتا ہے جب تک ہم جانچ کا ایک معیار مقرر نہ کریں جس کو پیش نظر رکھا جائے'

اتفاق رائے پیدا نہیں ہو سکتا۔ اور یہ بھی ظاہر ہے کہ مختلف مزاجوں' عمروں' پیشوں اور مختلف قسم کی تعلیم حاصل کئے ہوئے لوگوں کا ردعمل بھی ضرور مختلف ہوگا۔ اور علاوہ اس کے یہ طے ہے کہ اخلاق ایک اضافی اصطلاح ہے۔ فحاشی کے سوال پر نظریات ضرور ایک دوسرے سے مختلف اور بہت نمایاں حد تک مختلف ہوں گے۔ میری رائے میں صحیح بات یہ ہے کہ اس مسئلے کو اس 'افسانوی آدمی' یعنی پبلک کے ایک عام رکن' کے نقطہ نظر سے جانچنا چاہئے۔ یہ طے کر چکنے کے بعد ہمیں یہ دیکھنے کے لئے زیر بحث مضمون پر غور کرنا ہے کہ یہ ہمارے سماج کے مسلمہ اخلاقی نظریات کے خلاف کہاں تک جاتا ہے!

اس موقعہ پر مجھے زیر اپیل فیصلے کے ایک غلط مفروضے اور گمراہ کرنے والی دلیل کی طرف اشارہ کرنا ہے۔ فاضل مجسٹریٹ نے اس بیان سے ابتدا کی کہ 'فحاشی کی اصطلاح اس ماحول کے ساتھ متعلق ہے جس میں اس کے متعلق فیصلہ کیا جاتا ہے۔' اس نے کہا کہ 'مختلف قوموں اور سوسائٹیوں کے معیار مختلف ہو سکتے ہیں'۔ یہاں تک وہ درست تھا' اس نے غلطی وہاں کی جب اس نے یہ سمجھا کہ پاکستان کے مروجہ اخلاقی معیار قرآن پاک کی تعلیم کے سوا اور کہیں سے زیادہ صحیح طریقے پر معلوم نہیں ہو سکتے۔ پھر وہ یہ کہتا ہے کہ اس کے مطابق 'غیر شائستگی اور شہوت پرستی شیطان کی طرف سے ہے'۔ اس میں شک نہیں کہ یہ ہمارا آدرش ہے۔ لیکن سوال یہ نہیں ہے' بلکہ سوال یہ ہے کہ ہمارے سماج کی اصلی حالت کیا ہے۔ جیسا کہ ظاہر ہے ہم نے اپنا نصب العین ابھی تک حاصل نہیں کیا۔ اپیل کرنے والوں کو اس کے مطابق جانچنا چاہئے' جس طرح کہ ہماری سوسائٹی ہے نہ کہ اس طرح جیسا کہ اسے ہونا چاہئے۔

جب ہم سوچتے ہیں کہ کیسی کیسی مطبوعات مارکیٹ میں موجود ہیں جن پر کوئی احتساب قائم نہیں' تو ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ زیر بحث مضمون تو کہیں کم قابل اعتراض ہے۔ متعدد 'اسراری' مطبوعات کی اشاعت کے خلاف کوئی پابندی نہیں جن سے زیادہ اور کوئی چیز فحش نہیں ہو سکتی۔ سینماؤں میں 'تماشاؤں' کی نمائش پر کوئی احتساب نہیں۔ جو زیر بحث مضمون سے کچھ کم قابل اعتراض نہیں ہوتے۔ اگر ہمیں مغربی تہذیب کو اپنانا اور اس کو پسند کرنا ہے' جیسا کہ ہم کر رہے ہیں تو میں سمجھتا ہوں کہ ہم ایسی تحریر پر جیسی کہ ہمارے سامنے موجود ہے' معقول طور پر فحاشی کا اعتراض نہیں کر سکتے۔ یہ تو اس تہذیب کا لازمی نتیجہ ہے اور حسب معمول اس کے علاوہ کچھ نہیں۔

چوما چاٹی اور بغل گیری ایسی چیز ہے جو ہر روز سینماؤں میں پیش کی جاتی ہے۔ بدکاری وہ عام بنیادی زمین ہے' جس پر پچی کہانیاں اور دائمی مثلثیں استوار کی جاتی ہیں۔ درحقیقت یہی تمام انگریزی اور مغربی ناولوں کا بنیادی پلاٹ ہے۔ اگر ان پر کوئی اعتراض نہیں کیا جاتا تو مجھے کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ ہم ان نوجوانوں پر کیوں سختی کریں!

زیر بحث کہانی رسالے کے صفحہ ۸۸ سے لے کر صفحہ ۹۳ تک چھپی ہے۔ قصہ یوں بیان کیا

گیا ہے کہ ایک خاص شخص کا جس کا نام ایشر سنگھ تھا' اس کا ایک خاص عورت کلونت کور کے ساتھ ناجائز تعلق تھا۔ اس نے فسادات کے دوران میں ایک مکان میں چھ آدمیوں کو قتل کر دیا تھا اور ایک خوبصورت لڑکی کو وہاں سے اٹھا لایا تھا۔ اس نے اس لڑکی کے ساتھ زنا بالجبر کرنے کی کوشش کی' لیکن اسے پتہ چلا کہ لڑکی مر چکی ہے۔ یہ 'ٹھنڈا گوشت' ہے۔ اس کہانی کے مطابق اس انکشاف نے ایشر سنگھ پر ایسا اثر کیا اور اس کے شہوانی جذبات کو اتنا سن کر دیا کہ جب وہ بعد میں کلونت کور کے پاس گیا تو وہ اس قابل نہیں تھا کہ اس کے ساتھ سو سکے' حالانکہ اس نے اس مقصد کے لئے ابتدائی اقدام اٹھائے تھے۔ اس میں یہاں وہاں کچھ ناشائستہ اصطلاحیں اور کچھ قابل اعتراض الفاظ موجود ہیں اور کچھ سوقیانہ گالیاں بھی۔ بالکل اسی قسم کی جو ہماری سوسائٹی کے نچلے طبقے میں عام ہیں۔

اب کسی مضمون کی ماہیت پر غور کرنے کے لئے آدمی کو کئی اصطلاحات اور تصریحات کو زیر نظر رکھنا پڑے گا۔ مثلاً چند ایک کا نام لیں تو ایک مضمون 'باذوق' یا 'بدذوق'، غیر مناسب' یا 'سوقیانہ' ناشائستہ' یا 'فحش' ہو سکتا ہے۔ اتنے تدریجی رنگوں کے امتزاج کو ایک دوسرے سے الگ ہٹا کر اس مضمون کو جسے فحش قرار دیا جاتا ہو' قطعی طور پر 'غیر شائستہ' غیر اخلاقی' ضرر رساں' اور بہت کچھ ہونا چاہئے' لیکن زیادہ سے زیادہ جو میں اس مضمون کے متعلق کہوں گا وہ یہ ہے کہ یہ سوقیانہ اور ناشائستہ ہے۔

فاضل پی پی ایس نے کسی ایسے خاص قابل اعتراض پیروں کی طرف اشارہ نہیں کیا جس کو وہ یقینی طور پر 'فحش' قرار دیتا۔ کسی شخص نے کہانی کی چند سطروں پر نشان لگائے ہیں، لیکن وہ ایسی ہی ہیں جن کے متعلق میں پیشتر ذکر کر چکا ہوں اور ان کو دوبارہ پیش کرنے سے کوئی مفید مقصد حاصل نہیں ہوگا۔

مجھے اس لئے فاضل عدالت ماتحت سے اختلاف ہے لیکن میں یہ واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ میرا مقصد یہ نہیں ہے کہ مجھے اس مضمون سے اتفاق ہے۔ میں اسے 'فحش' یا زیادہ قابل اعتراض نہیں سمجھتا۔ چنانچہ میں اپیل منظور کرتا ہوں اور تینوں اپیل کرنے والوں کو بری کرتا ہوں۔ وہ پہلے ہی ضمانت پر ہیں۔ جرمانہ اگر ادا کیا گیا ہے تو وہ سارے کا سارا واپس دیا جائے۔

عنایت اللہ خان
ایڈیشنل سیشن جج۔ لاہور
(۱۶ جنوری ۱۹۵۰ء)

سرکار کی اپیل

سرکار کی طرف سے تعزیرات کی دفعہ ۲۹۲ کے ایک الزام میں بریت کے خلاف یہ اپیل ہے۔ اس میں مدعا علیہان میں عارف عبدالمتین، نصیر انور اور سعادت حسن منٹو ہیں جن پر میاں ایم اے سعید مجسٹریٹ درجہ اول، لاہور کی عدالت میں عریاں مواد چھاپنے کے الزام میں مقدمہ چلایا گیا اور انہیں سزائیں ہوئیں۔ اول الذکر دو ملزمان پر تین سو روپے فی ملزم جرمانہ عائد ہوا اور تیسرے کو تین ماہ قید بامشقت اور تین سو روپے جرمانہ کی سزا ہوئی۔ اپیل دائر کرنے پر ایڈیشنل سیشن جج جناب عنایت اللہ خاں نے مجسٹریٹ کا فیصلہ بدل دیا اور ملزمان بری کر دیئے گئے۔ عارف عبدالمتین اردو رسالہ 'جاوید' کے مدیر ہیں اور نصیر انور اس رسالے کے ناشر۔ مارچ ۱۹۴۹ء میں اس رسالہ نے ایک مختصر کہانی شائع کی جس کا عنوان 'ٹھنڈا گوشت' تھا اور جو سعادت حسن منٹو نے لکھی تھی۔ اس کہانی کی اشاعت کے نتیجے میں مدعا علیہان پر مقدمہ قائم کیا گیا۔

استغاثہ کے مطابق یہ کہانی عریاں تھی اور اس لئے تعزیرات کی دفعہ ۲۹۲ کے تحت قابل گرفت۔ کہانی کی تصنیف و اشاعت کی ذمہ داری قبول کر لی گئی مگر صفائی میں کہا گیا کہ کہانی ایک ادب پارہ ہے اور وہ عریاں نہیں۔ فاضل مجسٹریٹ نے کہانی کو عریاں قرار دیا اور سزائیں بھی تجویز کیں مگر فاضل ایڈیشنل سیشن جج نے صفائی قبول کرتے ہوئے اپیل کی اجازت دے دی۔ ہمارے سامنے اب مختصر سا مسئلہ یہ ہے کہ آیا یہ کہانی تعزیرات کی دفعہ ۲۹۲ کے تحت 'عریاں' ہے کہ نہیں!

کہانی میں صرف دو کردار ہیں۔ ایشر سنگھ اور اس کی داشتہ کلونت کور۔ ایشر سنگھ مضبوط کاٹھی کا اکڑ باز قسم کا ایک ایسا سکھ ہے جو بار بار قسم اٹھاتا ہے۔ کلونت کور خود بھی ایسی ہی کاٹھی کی ایک عیاش عورت ہے۔ ۱۹۴۷ء کے فرقہ وارانہ فسادات کے دوران ایشر سنگھ نے کئی لوگوں کو قتل کیا اور ان کا مال و اسباب ہتھیا لیا۔ ایک بار اس نے ایک ایسے مکان پر حملہ کیا جس میں ایک ہی خاندان کے سات افراد رہتے تھے۔ اس نے ان میں سے چھ کو قتل کر دیا اور ساتویں کو جو کہ ایک خوبصورت لڑکی تھی، اغوا کر لیا۔ وہ اسے اپنے کاندھوں پہ ڈال کر تھوہر کی جھاڑیوں میں لے گیا اور زمین پر لٹا کر اس سے لطف اندوز ہونا چاہتا تھا کہ اس پہ یہ لرزہ خیز انکشاف ہوا کہ لڑکی تو مر چکی ہے۔ کچھ دنوں بعد جب اس نے کلونت کور سے مباشرت کرنا چاہی تو اس کے جنسی نظام نے اس کا ساتھ نہیں دیا۔ آٹھ دن گزرنے کے بعد وہ

کلونت کور کے پاس دوبارہ یہ عزم لے کر گیا کہ وہ ہر صورت میں اس کے ساتھ مباشرت کرے گا۔ پھر دونوں نے مل کر سب کچھ کر ڈالا مگر جسمانی طور پر وہ ناکارہ ہی رہا۔ کلونت کور کا اندازہ تھا کہ کوئی دوسری عورت اس کے اور ایشر سنگھ کے درمیان آ گئی ہے اور اس بنا پر اس نے ایشر سنگھ سے کئی سوالات کر ڈالے۔ اس مرحلہ پر ایشر سنگھ کو اسے بتانا پڑا کہ وہ کیا کر گزرا ہے اور اس پر کیا بیتی ہے۔

خلاصے کے اعتبار سے کہانی بالکل بے ضرر لگتی ہے حالانکہ یہ سوال اپنی جگہ رہتا ہے کہ آیا اس طرح کی جنسی صورت حال کسی کو پیش آ سکتی ہے۔ یہ کہانی کی تفصیلات اور وہ الفاظ ہیں جو ایشر سنگھ اور کلونت کور نے گفتگو کے دوران استعمال کئے' جن پر استغاثہ کا الزام ہے کہ وہ عریاں ہیں! ان میں سے بعض نہایت گندے محاورے ہیں اور کچھ ایسے بھونڈے استعارے ہیں جو جنسی فعل کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ سب سے زیادہ قابل اعتراض منظر وہ ہے جب کلونت کور سے اپنی دوسری ملاقات کے دوران ایشر سنگھ اسے اور اپنے آپ کو جنسی فعل پر آمادہ کرتا ہے۔ ایک عیاش کی تمام حرکتیں صاف صاف بیان کر دی گئی ہیں۔ عبارت کا یہ حصہ کلونت کور کے ننگے بدن کے حوالوں سے بھرا ہوا ہے اور اس میں وہ ساری تفصیلات ہیں کہ اس نے کلونت کور کو 'ابلتی ہانڈی' کے مرحلہ تک لانے کے لئے کیا کیا حرکتیں کیں۔ ان ابتدائی حرکتوں کو 'پھینٹنے' اور آخری فعل کو 'پتا پھینکنے' کے استعاروں سے ظاہر کیا گیا ہے۔ شائستگی کے کسی بھی معیار کو پیش نظر رکھا جائے' تو یہ عبارت عریاں ٹھہرے گی۔ یہ سچ ہے کہ اخلاقیات اور عریانی تقابلی اصطلاحات ہیں اور جس بات کو ایک معاشرے میں عریاں یا برا سمجھا جاتا ہے اسے دوسرے معاشرے میں نہایت شائستہ اور اچھا سمجھا جاتا ہے۔ لیکن یہ طے کرنے کے لئے کہ آیا بعض مخصوص الفاظ یا کوئی ایسی ہی اور پیش کش عریاں ہیں کہ نہیں' ہمیں اُن اصولوں کا اطلاق کرنا پڑے گا جو اس معاشرہ میں رائج ہیں جن میں یہ الفاظ یا پیش کش ہوئی ہے۔ اس میں کے شک ہو سکتا ہے کہ موجودہ معاشرتی ڈھانچے میں ہمارے ہاں یا مہذب دنیا میں کہیں اور بھی' اس تمام تفصیل کو جو مباشرت کی ابتدائی حرکتوں سے متعلق ہو' عریاں ہی سمجھا جائے گا خواہ یہ تفصیلات زندگی سے کتنی ہی قریب کیوں نہ ہوں۔

مقدمہ کی سماعت کے دوران، کئی اہل قلم صفائی یا استغاثہ کے گواہان کے طور پر پیش ہوئے تاکہ وہ بتا سکیں کہ کہانی عریاں ہے کہ نہیں۔ ڈاکٹر آئی لطیف' صدر شعبہ نفسیات' ایف سی کالج لاہور نے استغاثہ کے گواہ (نمبر ۲) کی حیثیت سے بتایا کہ یہ کہانی پڑھ کر جنسی جذبات مشتعل ہوتے ہیں اور اس کہانی کو کسی عام رسالہ میں شائع نہیں ہونا چاہئے تھا۔ دیال سنگھ کالج لاہور کے پروفیسر مولانا احسان اللہ خاں تاجور نجیب آبادی نے استغاثہ کے گواہ (نمبر ۱) کے طور پر کہا کہ کہانی شرمناک ہے اور نہایت بھونڈے مذاق اور گھٹیا انداز میں لکھی گئی ہے اور یہ کہ انہوں نے اپنی چالیس سالہ ادبی زندگی میں اتنی ذلیل

اور ایسی گندی کہانی نہیں پڑھی۔ اسی طرح، شورش کاشمیری نے استغاثہ کے گواہ (نمبر۲) کے طور پر کہا ک ان کا جس معاشرے اور خاندان سے تعلق ہے، اس کے پیش نظر نہ تو وہ ایسی عریاں اور ننگی کہانی شا کریں گے اور نہ اپنے لڑکے لڑکیوں کو اس کے پڑھنے کی اجازت دیں گے۔ مدیر احسان' لاہور' مولا ابوسعید بزمی نے استغاثہ کے (تیسرے) گواہ کے طور پر پیش ہوتے ہوئے کہا کہ اس کہانی کے پڑھ سے اخلاق خراب ہو سکتے ہیں۔

مدعا علیہ منٹو نے اپنے تحریری بیان میں جس نکتہ پر زور دیا ہے وہ یہ ہے کہ یہ مصنف کی نیت سے چلتا ہے کہ آیا استعمال شدہ الفاظ عریاں ہیں کہ نہیں اور ان کے اس دعویٰ کی تائید کئی ادبی حضرات نے کی ہے۔ ان میں دیال سنگھ کالج لاہور کے پرنسپل جناب عابد علی عابد' دیال سنگھ کالج کے پروفیسر جناب احمد سعید' سابق صدر شعبہ فلسفہ و نفسیات' عثمانیہ کالج کے ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم' سویلین افسر رائل پاکستان ایئرفورس کے ڈاکٹر سعید اللہ اور گورنمنٹ کالج لاہور کے پروفیسر صوفی غلام مصطفیٰ تبسم شامل ہیں۔ یہ افسوس اور حیرت کی بات ہے کہ مقدمہ کی سماعت کے دوران ادیبوں کے درمیان اس مسئلہ پر اختلاف ہوا کہ آیا یہ کہانی عریاں ہے کہ نہیں۔ اس کہانی کو بے ضرر سمجھنے والے حضرات ادب اور فن کے سلسلے میں خواہ کچھ ہی نظریات رکھتے ہوں' انہیں یہ بتانا ضروری ہے کہ وہ عریانی کے قانونی مفہوم سے بالکل ناواقف ہیں۔ سرکار بمقابلہ ہکلن ۱۸۶۸ء (ل ر ۳ ق ب ۳۶۰) سے لے کر اب تک عریانی کو جانچنے کا ہمیشہ ایک معیار یہ رہا ہے کہ آیا' مواد کا رجحان جس پر عریانی کا الزام ہے' انہیں بداخلاقی کی طرف مائل کرنا ہے جن کے اذہان اس قسم کے اثرات بدقبول کر سکتے ہیں اور اس قسم کی اشاعت جن کے ہاتھ لگ سکتی ہے' اور یہ کہ اگر اس کی تفصیلات بذات خود عریاں ہیں تو اس کی اشاعت میں شامل نیت اور ارادہ بھی اسے عریاں ثابت ہونے سے نہیں روک سکتے۔ کئی ایک مقدمات میں اسی تعریف کو متواتر پیش نظر رکھا گیا ہے اور اس کی تازہ ترین مثال کیلاش چندر اچاریہ بمقابلہ سرکار (انڈین لاء رپورٹ ۶۰ کلکتہ ۲۰۱) ہے جس میں اس مسئلہ پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔

(زیر بحث) کہانی کا وہ حصہ جس کا اس سے پہلے بھی ذکر کیا گیا ہے' ایک ضمنی قصے کی ایسی انتہائی ناشائستہ اور جنسی تفصیلات سے بھرا پڑا ہے جن سے نہ صرف نوجوانوں بلکہ کسی بھی جنس کے پختہ عمر کے افراد کے ذہن بھی خراب ہو سکتے ہیں۔ یہاں یہ نکتہ بالکل غیر اہم ہے کہ کہانی لکھتے وقت مصنف کی نیت کیا تھی۔' ایسے مقدمات میں رجحان کی اہمیت ہوتی ہے نہ کہ نیت کی۔ معاملہ برعکس ہوتا تو کسی ایسی لڑکی پر عریانی کا جرم لاگو نہیں ہوگا جو مال روڈ پر کھڑی ہو کر اپنے بدن کی نشوونما' تناسب اعضاء اور خطوط کی نمائش اس دعویٰ کے ساتھ کرے کہ وہ تو مسلک برہنگی کے جسمانی فوائد کا مظاہرہ کر رہی ہے۔ مگر کیا اس مثال کے سلسلے میں دو آراء ہو سکتی ہیں کہ آیا وہ عریانی کے جرم کی مرتکب ہوگی کہ نہیں!

مدعا علیہان کے فاضل وکیل نے ایک اور نکتہ بھی اٹھایا ہے جس پر توجہ کرنا ابھی باقی ہے۔ ہم پہلے ہی بتا چکے ہیں کہ مدعا علیہان پر الزام ساری کی ساری کہانی کے سلسلے میں ہے۔ فاضل وکیل صفائی کا اعتراض یہ ہے کہ چونکہ فاضل ایڈیشنل سیشن جج نے مدعا علیہان کو رہا کردیا ہے اس لئے فاضل ایڈووکیٹ جنرل کا فرض تھا کہ وہ کہانی کے ان حصوں کی نشاندہی کرتے جو استغاثہ کے مطابق عریاں ہیں۔ ہمیں اس دلیل میں کوئی وزن نہیں لگتا۔ اس لئے کہ اشاعت جس پر عریانی کا الزام ہے کوئی کتاب نہیں بلکہ ایک مختصر کہانی ہے اور ساری کی ساری کہانی پر عریانی کا الزام ہے۔ اس کے باوجود جب یہ نکتہ اٹھایا گیا تو ہم نے اپیل کی سماعت ملتوی کردی تاکہ مدعا علیہان کے فاضل وکیل کو ایڈووکیٹ جنرل کی جانب سے عبارت کے ان حصوں کے سلسلے میں نوٹس وصول ہو جائے جو استغاثہ کی نظر میں عریاں ہیں۔ ان عبارات کی بالآخر نشاندہی کردی گئی اور ان میں وہ ٹکڑا بھی شامل ہے جس کا ہم نے خصوصی ذکر کیا ہے۔ مندرجہ بالا وجوہات کی بناء پر ہم تمام مدعا علیہان کو مجرم گردانتے ہیں اور چونکہ پاکستان کے بعض ایسے ادبی حلقوں میں جن کا ایک ممبر منٹو ہے' ادب میں شائستگی کے سلسلے میں نہایت مسخ شدہ نظریات پائے جاتے ہیں' اس لئے ہم ہر مدعا علیہ پر تین سو روپے فی کس جرمانہ عائد کرتے ہیں۔ عدم ادائیگی کی صورت میں ایک ماہ قید بامشقت۔

چیف جسٹس محمد منیر
(دستخط)

'بو' (اپیل)

زیر نظر مقدمہ دفعہ ۲۹۲ تعزیرات ہند کے تحت ہے، جس میں برکت علی اور نذیر احمد کو ساٹھ روپے جرمانہ اور عدم ادائیگی کی صورت میں ایک ماہ قید بامشقت کی سزا دی گئی ہے۔ اس سزا کے خلاف مجھ سے اپیل کی گئی ہے۔ ماتحت عدالت فاضلہ نے اپنے فیصلے میں یہ ریمارک کیا ہے کہ مضمون 'بو' کا مصنف سوسائٹی کی نظروں میں سخت ترین سزا کا مستحق تھا اور یہ صحیح تھا کہ اسے قانونی گرفت میں لیا جائے مگر پیش رو فاضل جج (مسٹر بنواری لال) نے اسے بری کر دیا۔

موجودہ ملزموں میں سے ایک پبلشر ہے اور دوسرا ایڈیٹر جس نے مضمون چھاپا، قابل غور امر یہ ہے کہ ایسے اشخاص ملزمین کی صفائی میں پیش ہوئے جو اردو زبان کے عالم ہونے کی حیثیت میں بہت مشہور ہیں۔ مثال کے طور پر خان بہادر عبدالرحمٰن چغتائی، مسٹر کے ایل کپور، پروفیسر ڈی اے وی کالج، راجندر سنگھ (بیدی) اور ڈاکٹر آئی ایل لطیف، پروفیسر ایف سی کالج جو بطور گواہان صفائی پیش ہوئے۔ ان سب کی رائے ہے کہ مضمون 'بو' میں ایسی کوئی چیز نہیں جو شہوانی حسیات پیدا کرے۔ بلکہ ان لوگوں کا یہ کہنا ہے کہ مضمون ترقی پسند ہے اور اردو ادب کے موڈرن رجحان سے تعلق رکھتا ہے۔ حتیٰ کہ استغاثہ کے گواہ نمبر ۴، بشیر نے بھی دوران جرح تسلیم کیا کہ مضمون انسان کے اخلاق پر برا اثر نہیں ڈالتا۔ میری نظر میں مضمون ایک عشقیہ کہانی ہے، ایک لڑکے اور لڑکی کی جس میں ایسی بات کا دلچسپ ذکر ہے عموماً نوجوان آدمیوں میں نہیں ہوتی۔

ماتحت عدالت فاضلہ نے ہندوستانی نوجوانوں کی عیش پسند زندگی کا ذکر کرتے ہوئے افسوس کیا ہے اور اس بات پر ماتم کیا ہے کہ ملک میں ہندوستانیوں کا پرانا کریکٹر نابود ہو رہا ہے۔ ماتحت عدالت کے فاضل جج نے وہ خوبیاں بھی یاد کرائی ہیں جن کے لئے ہم ہندوستانی کبھی مشہور تھے اور یہ نصیحت کی ہے کہ نئے فیشنوں کو ختم کر دینا چاہئے۔

معلوم ہوتا ہے کہ ماتحت عدالت فاضلہ کے خیالات ترقی پسند نہیں ہیں۔ ہمیں زمانے کے ساتھ ساتھ چلنا ہے۔ حسین چیز ایک دائمی مسرت ہے، آرٹ جہاں کہیں بھی ملے، ہمیں اس کی قدر کرنی چاہئے۔ آرٹ خواہ وہ تصویر کی صورت میں ہو یا مجسمے کی شکل میں، سوسائٹی کے لئے قطعی طور پر ایک پیش کش ہے چاہے اس کا موضوع غیر مستور ہی کیوں نہ ہو۔ یہی کلیہ تحریروں پر بھی منطبق ہوتا ہے۔

جب ملک کے مشہور و معروف آرٹسٹوں اور ادیبوں نے ملزمین کے حق میں کہا ہے تو سارا فیصلہ یہیں ہو جاتا ہے۔ زیر بحث مضمون ایسا مضمون نہیں کہ جس پر کسی قانونی عدالت میں نکتہ چینی کی جائے۔ اس لئے مجھے اپیل منظور کرنے میں کوئی پس و پیش نہیں۔ جرمانہ اگر ادا کیا گیا ہے تو واپس کیا جائے۔ میں اپیل کرنے والوں کو بری کرتا ہوں۔

ایم۔ آر بھاٹیا
ایڈیشنل جج' لاہور
(۲۴ نومبر ۱۹۴۵ء)

rekhta

'میری ایکٹریس بھابی'

شکایت کنندہ فضل محمد خاں' کلکٹر آفس' کراچی کا پریس کلرک ہے' جہاں دفتری ریکارڈ کے لئے مطبوعات کی نقول پیش کی جاتی ہیں۔ اس کا مقدمہ یہ ہے کہ مذکورہ دفتر میں ایک اردو کتاب 'ستاروں کے خواب' جو ہند و پاکستان کے اردو مصنفین کے مضامین کا انتخاب ہے، موصول ہوئی اور جو بازار میں فروخت کی جارہی ہے۔ کتاب کی مصنفہ (ملزم نمبر۱) عصمت چغتائی' (ملزم نمبر۲) صہبا لکھنوی' (ملزم نمبر۳) مرزا سعید بیگ' مرتب و ناشر نے کی جبکہ (ملزم نمبر۴) شجاع الدین' ٹائمز پریس کا نگران ہے جہاں کتاب طبع ہوئی۔ مضامین کے اس مجموعہ میں ملزم نمبر۱ عصمت چغتائی کا لکھا ہوا مضمون 'میری ایکٹریس بھابی' کے عنوان سے شریک ہے جو مستغیث کے خیال میں زبان و بیان اور مواد کے لحاظ سے فحش ہے۔ استغاثہ میں مستغیث نے اس مضمون کے وہ مختلف حصے درج کئے ہیں جو مجموعی حیثیت سے موضوع پڑھنے والے کے ذہن میں غلط جنسی میلانات کو ابھارتے ہیں۔ بنابریں یہ درخواست کی گئی کہ ملزمان کو زیر دفعہ ۲۹۲ تعزیرات پاکستان سزا دی جائے۔

استغاثہ پہلے اے سی ایم' نسیم کی عدالت میں ۱۶ دسمبر ۵۵ء کو کیا گیا تھا۔ بعد میں ۲ جون ۵۶ء کو جب ابھی کوئی شہادت پیش نہیں کی گئی تھی' اس عدالت میں منتقل کیا گیا۔ فاضل وکیل استغاثہ نے (ملزم نمبر۱) عصمت چغتائی کو بری کر دیا کیونکہ ملزمہ ہندوستان میں ہیں اور مستقبل قریب میں ان کے خلاف عدالتی کارروائی پر عمل پیرا ہونے کا کوئی امکان نہیں۔ چنانچہ درخواست کو منظور کر لیا گیا۔ ملزمان پر جو الزام عائد کیا گیا ہے اس کا خلاصہ پڑھ کر سنایا گیا اور سوال کیا گیا کہ کیوں نہ انہیں زیر دفعہ ۲۹۲ تعزیرات پاکستان سزا دی جائے!

ملزمان نے کتاب کی اشاعت کو تسلیم کیا' مگر ساتھ ہی کہا کہ مضمون کا موضوع اور زبان کسی طرح بھی فحش نہیں ہے۔ انہوں نے اس امر پر زور دیا کہ استغاثہ اسے سمجھنے میں ناکام رہا ہے اور ان کے خلاف غلط فہمی کی بنا پر کارروائی عمل میں لائی گئی ہے۔ مقدمے کی حمایت میں وکیل سرکار رضا مرزا نے صرف شکایت کنندہ کو اپنے گواہ کی حیثیت سے پیش کیا۔ اپنی صفائی میں ملزمان نے بھی ایک ہی گواہ پیش کیا جس پر استغاثہ نے خاصی لمبی جرح کی۔ ملزمان کی پیروی جناب منور عباس نے کی۔

شکایت کنندہ فضل محمد خاں نے بیان کیا کہ کراچی میں شائع ہونے والی کتابیں اس کے دفتر

میں موصول ہوا کرتی ہیں اور تحت فرائض وہ انہیں پڑھا کرتا ہے۔ زیر مقدمہ کتاب بھی اسے ملی جو عدالت میں پیش کی گئی۔ اس نے قابل اعتراض مضمون کا حوالہ دیا جو صفحہ ۱۵۰ تا صفحہ ۱۶۳ موجود ہے۔ اس نے کہا کہ مضمون گندہ، فحش اور کردار بگاڑنے والا ہے۔ اپنے نقطہ نظر کی وضاحت کرتے ہوئے اس نے کہا کہ مصنفہ نے چار بھابیوں کا تذکرہ کیا ہے اور ان کے کرداروں کو جنسی سرگرمیوں میں ملوث کر کے پیش کیا ہے۔ اس کی رائے میں پیش کردہ موضوع اور زبان نوجوان ذہنوں کو متاثر کرتے ہیں اور ایک غلط جنسی خواہش پیدا ہوتی ہے۔

جرح کے دوران میں فضل محمد خاں نے بتایا کہ اس کی علمی صلاحیت میٹرک تک ہے اور اس کی فارسیت مجوزہ نصاب تک محدود۔ وہ نقاد کی حیثیت سے ایک دو مضامین بھی لکھ چکا ہے۔ وہ یہ نہیں بتاسکا کہ آیا سماجی رسوم پر نکتہ چینی تنقید کا درجہ رکھتی ہے۔ اس کے خیال میں فحش زبان وہ ہے جو معیار اخلاق سے پست ہو۔ وہ استعارے کے معنی نہیں جانتا۔ اسے اس کا علم نہیں کہ گو بعض تحریریں بظاہر پسندیدہ نہیں ہوتیں مگر ان کا منشا' سماجی کردار کی اصلاح ہوتا ہے۔ اس کے بموجب زیر نظر مضمون چار بھائیوں اور ان کی بیویوں کی کہانی ہے جن میں ہر ایک کا کردار علیحدہ پیش کیا گیا ہے اور ان کا مقصد سماجی نظام کی برائیوں پر نکتہ چینی نہیں۔ اسے یہ تسلیم ہے کہ عبدالمجید سالک، ماہر القادری اور شاہد احمد دہلوی اچھے لکھنے والے ہیں۔ اس کی رائے میں اکبر الہ آبادی کا یہ شعر فحش نہیں ہے ۔

کم سن مسوں سے آپ کسی شب نہ چوکئے　　جیبی گھڑی ہیں ان کو صبح و شام کوکئے

اس نے یہ بھی تسلیم کیا کہ ساری کتاب میں سے اس نے صرف متنازعہ مضمون ہی پڑھا ہے۔

استغاثہ کی مندرجہ بالا شہادت کے مقابلے میں ملزمان نے صرف شاہد احمد دہلوی کو گواہ کی حیثیت سے پیش کیا۔ انہوں نے بیان کیا کہ وہ ماہنامہ 'ساقی' کے گزشتہ انتالیس سال سے مدیر ہیں اور پچھلے پینتیس سال سے پیشہ صحافت سے وابستہ ہیں، انہوں نے کہانیاں بھی لکھی ہیں مگر مضامین زیادہ لکھے ہیں، کوئی سو (۱۰۰) کتابیں شائع کی ہیں، کل پاکستان ادبی رسائل کے جنرل سیکریٹری ہیں۔ انہوں نے متنازعہ مضمون پڑھا اور ان کی رائے میں یہ کسی طرح بھی فحش نہیں۔ فاضل وکیل استغاثہ کی جرح کے جواب میں انہوں نے بتایا کہ وہ دہلی کے باشندے ہیں اور شمس العلماء مولوی ڈاکٹر نذیر احمد کے پوتے ہیں جو اردو کے بڑے ادیبوں میں شمار ہوتے ہیں اور جن کی مستعملہ زبان سند سمجھی جاتی تھی۔ انہوں نے بتایا کہ وہ خود گریجویٹ ہیں۔ 'طنز' کو انگریزی میں 'سیٹائر' کہتے ہیں۔ انہوں نے الگزانڈر پوپ کی ایک دو چیزیں پڑھی ہیں اور وہ اسے ایک طنز نگار سمجھتے ہیں۔ ان کی رائے میں عصمت چغتائی ہندوستان میں اردو کی ایک بہترین طنز نگار ہیں اور پاکستان میں یہی درجہ سعادت حسن منٹو کو حاصل ہے۔

فاضل وکیل استغاثہ نے گواہ صفائی سے تقریباً ان تمام حصوں پر جرح کی جو استغاثہ کے بموجب فحش تھے یا فحاشی کا مفہوم دیتے تھے۔ اس جملے کے بارے میں کہ ’اس لئے ایک لمحے کے لئے میری بھابی کا جسم بیاہ گیا‘۔ انہوں نے بتایا کہ اس کے معنی صرف یہ ہیں کہ اس کی شادی ہوگئی‘ (فاضل مجسٹریٹ نے اس کا انگریزی میں ترجمہ بھی کردیا ہے۔ ’میری بھابی نے اس کے جسم پر چڑھے ہوئے گوشت کو نہ روکا‘ اس کی تو جوتی روکتی‘ وہ اس کی تھی کون؟‘ (یہاں بھی انگریزی ترجمہ درج ہے)۔ گواہ صفائی نے بتایا کہ اس کا قطعی مفہوم نہیں کہ کوئی اس کے جسم پر چڑھ بیٹھا تھا۔ ’وہ اس کی تھی کون؟‘ کا مطلب محض ایک دوسرے کے رشتے کے منفی پہلو کو رمزیہ طور پر ظاہر کرنا ہے۔ یہ جملہ کہ وہ ’کنوارہ اور بانجھ رہا‘، وہی معنی دیتا ہے جو کہ ان الفاظ کے ہیں یعنی ’کنوارا‘ اور ’بانجھ‘۔ ایک مرد کو بھی ’بانجھ‘ کہا جاسکتا ہے اور گواہ صفائی بھی اپنی تحریروں میں اس لفظ کو اس مفہوم میں استعمال کرچکا ہے۔ ’سانجھے کی بانڈی‘ کا مفہوم یہ ہے کہ کئی بچوں کی ماں بن جانے کے بعد وہ بچوں اور شوہر میں تقسیم ہوگئی تھی۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ وہ عاشقوں وغیرہ میں تقسیم تھی۔

یہ جملہ کہ ’اس نے دل والیوں کو رنڈیوں کے کوٹھے پر ڈھونڈا‘ (صفحہ ۱۰۲) گواہ صفائی کو دکھایا گیا اور انہوں نے بتایا کہ ’دل والی‘ کے معنی بہادر یا حساس عورت کے ہیں۔ ایک طوائف کو بھی ’صاحب دل‘ کہا جاسکتا ہے اس سلسلہ میں انہوں نے مرزا ہادی علی رسوا کے کردار امراؤ جان ادا کا حوالہ دیا۔ اگر ’پھیکی سی بدمزہ‘ کے الفاظ عورت کے لئے استعمال کئے جائیں تو اس کا مطلب صرف اتنا ہوگا کہ اس میں کشش برائے نام ہے اور اس سے بات چیت کرنے میں کوئی خوشی محسوس نہیں ہوتی۔ ’لاکھوں ہی گھونگھٹ پلٹ ڈالے‘ کا مطلب یہ نہیں کہ عورتوں کی اتنی بڑی تعداد سے اس کے جنسی تعلقات تھے‘ اس کے معنی صرف یہ ہیں کہ اس نے بہتوں کے چہرے دیکھے تھے۔ ’محبوبہ دل نواز‘ کے بارے میں انہوں نے کہا کہ ایک عورت اور ایک بیوی بھی ’محبوبہ دل نواز‘ ہوسکتی ہے۔ ’لنڈورے‘ اور ’یتیم‘ کا مفہوم ہے کہ اسے تنہا چھوڑ دیا گیا تھا۔

فاضل وکیل استغاثہ نے گواہ صفائی سے ’گھونگھٹ‘ کے لفظ پر مزید جرح کی۔ گواہ صفائی نے بیان کرتے ہوئے کہا کہ دلہن کا ’گھونگھٹ‘ صرف دولہا ہی نہیں پلٹتا ہے بلکہ سسر اور خاندان کی دیگر خواتین بھی رونمائی کے لئے گھونگھٹ پلٹتی ہیں۔ اس پیراگراف کے مشمولات کا مفہوم یہ ہے کہ اس نے ہر عورت میں وہی کراہیت پائی جو اس کی بیوی میں تھی۔ ’وہ تو اگر بھولے سے بھی کسی کی طرف دیکھ لے تو وہ عورت فوراً حاملہ ہوجاتی ہے۔‘ گواہ صفائی کے خیال میں اس جملے کا مفہوم کنایتاً کثیرالعیالی کو ظاہر کرتا ہے۔ صفحہ ۱۵۲ پر ’بدوضع‘ کا لفظ ایام حمل میں جسم کے بھدے پن کو واضح کرتا ہے۔ بچوں کے بارے میں ’ناک چاٹنے‘ ’ننگ دھڑنگ‘ کی جو صفتیں استعمال کی گئی ہیں وہ ان حالات کو ظاہر کرتی ہیں جن میں بچے

رکھے گئے ہیں۔ 'کھوسٹ' کا لفظ معمر اور حواس باختہ آدمی کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ اگر اسے باپ کے لئے استعمال کریں تو اس میں کوئی فحاشی نہیں۔ صفحہ ۱۵۶ پر 'افزائش نسل کا سانڈ' شوہر کی کوتاہیوں کو ظاہر کرتا ہے۔ 'تمہارا مصرف کیا ہے؟' سے مراد ایک سوال ہے کہ تمہاری کیا قیمت ہے؟

گواہ صفائی کے خیال میں مزاح اور پھکڑ پن میں محض درجے کا فرق ہے اور پھکڑ پن فحاشی کی حدود کو نہیں چھوتا۔ انہوں نے تسلیم کیا کہ عصمت چغتائی کی کہانی 'لحاف' کو شائع کرنے کے سلسلے میں ان کو اور عصمت چغتائی کو ماتحت عدالت سے سزا ہوئی تھی مگر اپیل میں وہ بری ہو گئے تھے۔ ان سے جب 'جگ کی دلہن' کے بارے میں پوچھا گیا تو انہوں نے بتایا کہ اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ طوائف تھی۔ 'اس سڑک کی مانند ہے جس پر سب چلتے ہیں'، اس جملے کا مطلب یہ ہے کہ وہ ایک مظلوم عورت ہے۔ مضمون کے دیگر حصوں کے متعلق جواب دیتے ہوئے گواہ صفائی نے واضح طور پر مضمون کو ہر نوجوان لڑکی اور لڑکے کے لئے قابل مطالعہ قرار دیا تاکہ انہیں معلوم ہو سکے کہ سماجی نظام میں کتنی خباثتیں کارفرما ہیں۔ ان کے مطابق 'یہ مضمون معاشرے کی خرابیوں اور برائیوں کو دور کرنے کے لئے لکھا گیا ہے اور گھناؤنے معاشرے کے خلاف نفرت اور غصے کو ابھارتا ہے۔

یہ مندرجہ بالا فریقین کی پیش کردہ شہادت کا خلاصہ ہے۔ درحقیقت استغاثہ اپنے مقدمے کی حمایت میں کوئی ذہین شہادت پیش نہیں کر سکا' بجز اس کے کہ مضمون بحث و تمحیص اور استدلال کی نذر ہو گیا۔ استغاثہ نے یہ بھی کوشش کی کہ وہ گواہ صفائی سے جرح کر کے کوئی مقدمہ بنائے۔ گواہ صفائی شاہد احمد دہلوی' مسلمہ طور پر ایک پرانے اور آزمودہ صحافی ہیں' جو مقدمے کی صفائی کی حمایت میں اپنے موقف سے ایک انچ بھی نہیں ہٹے۔ استغاثہ نے مقدمے کے آغاز کے سوالات میں گواہ صفائی کی صلاحیت و قابلیت کے مقام کا تعین کیا جو صفائی کے اس باب میں تائید کرتا ہے کہ مضمون کے سلسلے میں دی گئی آرا ایک ایسے مشہور صحافی کی ہیں جن کی صحافت میں بلند خاندانی روایات شامل رہی ہیں۔ تحریری استغاثے کے ساتویں پیراگراف میں یہ کہا گیا ہے کہ تمام مضمون معاشرے کی فحش انداز میں تصویر کشی کرتا ہے۔ مگر یہ ایک کھلی حقیقت ہے کہ معاشرے میں ایسی خرابیاں اور برائیاں ہیں جنہیں ختم کرنا چاہئے اور اس کے لئے کوئی اور طریقہ کار نہیں ہو سکتا بجز اس کے کہ ان کو پیش کرتے ہوئے ان پر شدید نکتہ چینی کی جائے۔

'پہلی بھابی' جو اس مضمون میں پیش کی گئی ہے' اوسط طبقے کی عورت ہے' پرانے رسوم کی پابند اور نئی تہذیب سے ناآشنا۔ مصنف نے اس عورت کے ساتھ اپنے خیالی بھائی کی ازدواجی زندگی کا نقشہ کھینچا ہے۔ اس نے ان حالات میں عورت اور مرد کے کردار کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے اور ساتھ ہی اپنے خیالی بھائی کے احساسات کا ان ازدواجی حالات میں جائزہ لیا ہے۔ پہلے ہی پیراگراف میں یہ بتایا

گیا ہے کہ گو وہ ایک شوہر تھا اور کئی بچوں کا باپ بھی' تاہم وہ ذہنی طور پر کنوارا تھا اور ہمیشہ ہی رہے گا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کی بیوی اس کی پسند کی عورت نہیں' وہ ماں باپ کی پسند کی ہوئی ہے۔ وہ اپنے باپ کے خوف کی وجہ سے اپنی ناراضی کے اظہار کی جرأت نہیں کر سکا۔ اس صورت حال کو پیش کرنے کے لئے مصنف نے مندرجہ ذیل جملے استعمال کئے ہیں جو استغاثہ کے بموجب فحش ہیں: 'وہ گھوڑے پر نہیں چڑھا'، 'اس کی میت ماں باپ کی ہٹ دھرمی سے گھوڑے پر لٹکا دی گئی'، 'وہ اپنی دلہن نہیں لایا بلکہ وہ ماں باپ کی دلہن تھی'، 'مگر ایک مجبور بیٹے کی طرح بنا آہ وزاری وہ دلہن کے پاس بھی گیا' اس کا گھونگھٹ بھی اٹھایا' مگر وہ ارادہ کر چکا تھا کہ خود وہاں نہیں بلکہ اس کا باپ ہے' جو اس دلہن کا دولہا ہے۔'

جملوں کے اس تسلسل میں یقیناً کوئی لفظ فحش نہیں۔ اس میں جو کچھ پیش کیا گیا ہے وہ ان حالات کا منطقی نتیجہ ہے جن میں ایک دولہا والدین کی مرضی کی دلہن بیاہ لایا ہے اور فرمانبرداری اور عزت وناموس کی خاطر وہ اپنے والدین کے کئے ہوئے معاہدے کے احترام پر مجبور ہے۔ مصنف نے اپنے اس کردار سے کہا ہے کہ وہ اس معاہدے کو جو اس کی مرضی کے بغیر عمل میں آیا ہے' ایک تابعدار کی طرح پورا نہ کرے۔ اسی لئے دلہن کو 'اس کے باپ کی دلہن' سے تعبیر کیا گیا ہے کیونکہ وہ انہوں نے منتخب کی تھی۔ وہ گھوڑے پر دولہا کی حیثیت سے برات کے جلوس کے لئے سوار ہوا' مگر فی الحقیقت اس کا مردہ جسم تھا جو گھوڑے پر رکھا گیا تھا۔ اس لئے اس کو میت کے جلوس سے جائز طور پر تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ اگر کوئی مصنف حقیقت کے اظہار کے لئے منطقی استعارے استعمال کرے تو اس سے تحریر فحش نہیں بن جاتی۔

استغاثہ کے بموجب تیسرا قابل اعتراض حصہ یہ ہے: 'مگر چونکہ اس وقت میری بھابی بڑی نہ تھی' میرا مطلب ہے کہ وہ جسمانی طور پر دبلی پتلی اور نازک سی چھوکری تھی' اس لئے ایک لمحے کو میری بھابی کا جسم بیاہ گیا' لیکن بہت جلد ہی وہ دبلی پتلی عورت بڑھنا شروع ہوئی' اور پھول پھال کر بے تکے گوشت کا ڈھیر بن گئی۔ میرے بھائی نے اس کے چڑھتے ہوئے گوشت کو نہ روکا' اس کی تو جوتی روکتی' وہ اس کی تھی کون!'۔ اس اقتباس میں بتایا گیا ہے کہ وہ اپنی خیالی بھابی سے جسے اپنے والدین کی پسند کی وجہ سے دلہن ماننا پڑا تھا وہ مجبوراً رغبت کا اظہار کرتا رہا' 'اس کا جسم ایک لمحے کو بیاہ دیا گیا ہے'، یہ ٹکڑا شادی کے منظر کے تسلسل میں ہے' جو دراصل اس کے لئے میت کا جلوس تھا۔ اس لئے کہ اس کی شادی والدین کی مرضی سے ہوئی تھی۔ 'دلہن کا جسم اس سے بیاہا گیا' یہ کوئی روحانی ملاپ نہ تھا جو شادی کی روح ہوتا ہے، شادی جو زندگی بھر کا ملاپ ہوتی ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ وہ تمام نفرت اور کراہیت کے احساسات کے ساتھ ازدواجی تعلقات قائم کئے رہا اور چونکہ بیوی اس کی پسند کی نہ تھی اس لئے اس نے اس کے جسم کے مسلسل بڑھتے ہوئے گوشت کو کم کرنے کے بارے میں کبھی نہ سوچا اور وہ ایسا کرنے کے لئے پابند بھی نہ تھا' اس لئے کہ وہ اس کی کوئی نہ تھی' اگرچہ والدین کے انتخاب کے نتیجے میں وہ اس کی بیوی تھی۔ یہ موضوع

اور پیرایۂ اظہار کسی طرح بھی فحش نہیں اور نہ کسی طور معمولی ذہن کو غلط جنسی احساس میں مبتلا کرتا ہے۔

چوتھا قابل اعتراض اقتباس یہ ہے: 'لیکن وہ بچے...... اس کے ماں باپ کے بچے جنہیں وہ کبھی بھولے سے بھی نہ چھوتا...... ناکیں سڑسڑاتے' میلی ٹانگیں اچھالتے...... مگر میرے بھائی کے دل کے دروازے ویسے ہی بند رہے۔ وہ ایسا ہی کنوارا اور بانجھ رہا......' یہاں جو سخت قابل اعتراض بات ہے وہ یہ کہ بچے اس کی ماں اور باپ کے تھے۔ اس سے کسی طرح بھی یہ نتیجہ اخذ نہیں کیا جاسکتا کہ وہ بچے دولہا کے باپ یا دلہن کے سسر کی پیداوار ہیں۔ مصنفہ اس باب میں ماں اور باپ کے الفاظ استعمال کرنے میں محتاط رہی ہے۔ بچوں کے باوجود بھی دولہا کنوارا اور بانجھ رہا کیونکہ اس کی روح کبھی اپنی بیوی کے ساتھ نہ رہی۔ گندے غلیظ اور بے توجہی کے شکار بچوں کا تذکرہ محض بیانیہ ہے۔ وہ کنوارا رہا کیونکہ یہ شادی دو روحوں کی شادی نہیں تھی' وہ بانجھ رہا' کیونکہ بچوں کے پیدا کرنے میں بیوی سے اس کی کوئی روحانی وابستگی نہیں تھی۔

صفحہ ۱۵۲ کے پیراگراف 1 اور 2 کو بھی استغاثہ نے زبان و موضوع کے لحاظ سے فحش قرار دیا ہے: 'میری بھابی کچھ ایسے مرحلے میں پھنس گئی' اس نے پلٹ کر بھی بھیا کی طرف نہیں دیکھا' کہتی...... میں پہلے تو ساس سسر کی بہو ہوں' نند کی بھوجائی ہوں' بچوں کی اماں ہوں' نوکروں کی مالک ہوں' محلے ٹولے کی بہو بیٹی ہوں' اور پھر اگر وقت ملا تو تمہاری بیوی بھی بن جاؤں گی۔ بھیاؔ' اس طرح ساجھے کی ہانڈی بڑی پھیکی اور بدمزہ لگی...... اس لئے وہ اب بھی کنوارا دل لئے پھرتا ہے' کسی دل والی کی تلاش میں' اس نے دل والیوں کو رنڈیوں کے کوٹھے پر ڈھونڈا' گندی گلیوں میں گھومنے والیاں...... لاکھوں ہی گھونگٹ پلٹ ڈالے مگر وہی عورت' وہی ساس سسر کی بہو' وہی ان کے بچوں کی ماں......'

جو کچھ مصنفہ بتانا چاہتی ہے وہ یہ کہ وہ شخص اپنے والدین کی پسندیدہ لڑکی کو اپنی بیوی کی حیثیت سے برداشت کرتا رہا اور جوں جوں وقت گزرتا گیا وہ بھی ایسے مسائل میں الجھتی گئی کہ شوہر کی طرف مطلقاً توجہ نہ کرسکی۔ دقت یہ تھی کہ وہ اپنے ساس سسر کی بہو' نند کی بھاوج' بچوں کی ماں' نوکروں کی مالک اور محلے والوں کی بہو بیٹی تھی' ان مصروفیات نے اسے اپنے شوہر کی طرف توجہ دینے کا وقت ہی نہ دیا۔ اگر وقت ملا تو وہ اپنے شوہر کی بیوی بھی بن جائے گی' جس طرح وہ اس کے والدین کی بہو اور اس کی بہن کی بھاوج اور اسی طرح دوسرے رشتوں سے منسلک تھی۔ اگر ساس' سسر اور بہو کے درمیان رشتے کا تذکرہ قابل اعتراض نہیں ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ شوہر کے سلسلے میں بیوی کے فرائض کا تعین اور اس کا اظہار قابل اعتراض قرار پائے۔ چنانچہ مصنف نے آخر میں جو نتیجہ اخذ کیا ہے وہ یہ ہے کہ اس کی بیوی گھریلو اور خاندانی ذمہ داریوں میں مستقلاً جکڑی ہوئی تھی۔ اس لئے شوہر کا یہ احساس قدرتی تھا کہ اس کی توجہ بچوں اور دیگر افراد خاندان میں بٹ گئی تھی۔ اس صورت حال کے اظہار کے لئے مصنفہ نے یہ

معنی خیز جملہ استعمال کیا: 'بھیا کو اس طرح کی ساجھے کی ہانڈی بڑی پھیکی اور بدمزہ لگی'۔

اس سے صرف یہی مترشح ہوتا ہے کہ شوہر زیادہ عرصے تک اپنی شوہرانہ حیثیت کو برقرار رکھنا پسند نہیں کرتا تھا۔ چنانچہ اپنی تسکین کے لئے اس نے اس عورت کی تلاش میں جو اس کی روح کو مطمئن کرنے کے لئے پرسکون اور خوش گوار فضا مہیا کر سکے' وہ تمام ذرائع اختیار کئے' جو اس کے امکان میں تھے مگر طوائفوں کے کوٹھوں سے لے کر شریف زادیوں تک ہر جگہ اسے وہی پرانی کہانی اور وہی ماحول ملا۔ ہر عورت جس سے وہ ملا' اپنے ساس' سسر کی بہو اور اپنے بچوں کی ماں تھی۔ دراصل مصنفہ نے یہاں یہ بتایا ہے کہ کئی بچوں کا باپ بن جانے کے بعد ایک شوہر اپنی بیوی کی گھریلو ذمہ داریوں سے اکتا جاتا ہے' چنانچہ وہ تسکین کی تلاش میں گھر سے نکلتا ہے لیکن صرف شوہر اور باپ کی طرح لوٹتا ہے۔

صفحہ ۱۵۳ پر یہی موضوع حقیقت پسندانہ تنقید کے ساتھ واضح بیانیہ انداز میں جاری ہے۔

مصنفہ نے یہ بتایا ہے کہ افراد خاندان کی بڑھتی ہوئی تعداد گھریلو حالات کو متاثر کرتی ہے۔ چنانچہ شوہر بھی ان سے نفرت کرنے لگا تھا۔ وہ محسوس کرتا تھا کہ اس کے بے شمار غلیظ اور بدصورت بچے معزز ملاقاتیوں پر قابل شرم اور تکلیف دہ اثر ڈالتے تھے۔ آمدنی کے محدود وسائل و ذرائع ہمیشہ گھریلو زندگی کے معمولی معیار کا سبب ہوتے ہیں اور یہ صورت حال ملاقاتیوں پر بھی خوش گوار اثر نہیں ڈالتی۔ شوہر کی زندگی ان حالات میں ناقابل برداشت ہو جاتی ہے۔ چنانچہ ایسے بھی مواقع آتے ہیں کہ وہ اپنی نجات زندگی کے خاتمے میں دیکھتا ہے۔ مصنفہ نے اسی پہلو کو دوسرے زاویہ نظر سے دیکھا ہے۔ وہ بتاتی ہے کہ اس کے برعکس اگر شوہر صاحب حیثیت ہے تو وہ اپنے دل کی تسکین کے لئے کسی دوسری عورت کو اپنے بنگلے کی زینت بناتا ہے۔ مگر صورت حال بھی زیادہ عرصے تک قائم نہیں رہ پاتی، وہ عورت بھی اسے چھوڑ جاتی ہے اور پھر پہلے کی طرح تنہا رہ جاتا ہے۔ سماجی برائیوں کے سلسلے میں یہ موضوع اور پیرایہ اظہار حقیقت پسندانہ ہے' جو نام نہاد نا آسودہ شوہروں کے غیر حقیقی میلانات طبع کو ظاہر کرتا ہے۔

صفحہ ۱۵۵ پر مصنفہ نے ایک اور بھابی پیش کی ہے جس کا شوہر غریب اور مفلس والدین کا بیٹا ہے۔ علاوہ ازیں نوجوان بھائیوں اور بہنوں کی پلٹن ہے' بڑی مصیبتوں سے اسے تعلیم دلائی گئی۔ ایک متمول نواب نے اسے اپنی ایک چہیتی باندی کی بیٹی کے لئے منتخب کر لیا۔ اس کے والدین نے بھی مستقبل کے روشن امکانات اور اس مالی امداد کے مدنظر جو ہونے والی بہو کی طرف سے متوقع تھی' جس سے ان کے دیگر بچے بھی اسی معیار زندگی پر لائے جا سکتے تھے' اس پیش کش کو قبول کر لیا۔ مصنفہ نے دکھایا ہے کہ اس عورت نے پیسے سے شادی کی ہے۔ وہ ایک خوبصورت اور نوکر چاکر والے بنگلے میں محصور ہے جہاں وہ کچھ نہیں کرتا اور اسے ہر ممکنہ آرام و آسائش مہیا ہے۔ یہاں بھی مصنفہ یہ تاثر پیدا کرنا چاہتی ہے کہ اس قسم کی زندگی بھی نفرت اور بے زاری کو جنم دیتی ہے۔ وہ شخص سوچتا ہے کہ گھر میں اس کی

حیثیت افزائش نسل کے سانڈ سے زیادہ نہیں۔ استغاثہ کے خیال میں یہ استعارہ فحش ہے۔ اگر ان تمام حالات کا جن میں یہ کردار رہ رہا ہے' سماجی سرگرمیوں سے الگ تھلگ دوستوں اور عزیزوں سے دور، جائزہ لیا جائے تو مذکورہ استعارہ ایک عام اور اوسط پڑھنے والے کے ذہن کو جنسی یا اخلاقی کسی طور بھی گمراہ نہیں کرتا۔ اگر ایسا ذہن موجود ہے تو ہم اسے ایک مجرم اور اخلاق باختہ استثنائی صورت گردانتے ہیں، ایسے ذہن کو عورت کی ایک جھلک بھی کسی اقدام کے لئے آمادہ کرسکتی ہے جو قانونی طور پر موجب سزا ہے۔

مصنفہ نے تیسری بھابی پیش کی ہے۔ یہ ایک تعلیم یافتہ بھابی ہے جس کی شادی کے لئے والدین نے امیدواروں کی ایک بڑی تعداد کو طلب کیا ہے۔ اس جگہ مصنفہ نے اپنے منفرد طرز نگارش میں ذیل کا اقتباس لکھا ہے جو معترضہ حصوں میں سے ایک ہے: 'اور خدا رکھے سن بلوغ کو پہنچی تو اس کے روشن خیال والدین نے اس کے حضور میں ہونہار امیدواروں کی ایک رجمنٹ کو پیش ہونے کی اجازت دے دی۔ ان میں آئی سی ایس بھی تھے' اور بی ایس بھی، حسین بھی اور تعلیم یافتہ بھی...... اور پھر اس سے کہہ دیا کہ 'بیٹی تیری آنکھیں بھی ہیں اور ناک بھی۔ خوب ٹھوک بجا کر ایک بکرا چھانٹ لے۔'

مندرجہ بالا سطور میں کوئی چیز فحش نہیں۔ اگر مصنفہ کا انداز اتنا ادبی نہ ہوتا تو ان سطور کی صورت یہ ہوتی: 'جب وہ بالغ ہوگئی تو اس کے باپ نے پڑھے لکھے اور مختلف قسم کے رشتوں کا ذکر اس سے کیا اور اسے بتایا کہ بیٹی یہ تیرا اپنا معاملہ ہے اور عمر بھر کا ساتھ ہے' تو تعلیم یافتہ ہے' اپنا برا بھلا دیکھ ان میں سے جس جگہ کو تو پسند کرے' اس جگہ 'ہاں' دی جائے۔' گو اس طرح بیان طویل ہوگیا تاہم طنزیہ انداز کے بجائے یہ سلیس پیرایہ اظہار ہے۔ 'امیدواروں کی رجمنٹ' کے الفاظ میرے نزدیک مزاحیہ طرز اظہار ہے۔ اس میں انسانی ذہن کو جنسی طور پر پراگندہ کرنے کی قطعاً کوئی بات نہیں۔ 'تم ان میں سے ایک بکرا چھانٹ سکتی ہو' قابل اعتراض نہیں۔ اردو زبان جو استعاروں کے لحاظ سے بڑی مالا مال ہے، اس میں 'قربانی کا بکرا' کے معنی ایک بہترین منتخبہ چیز کے ہیں۔ مسلمان اپنے نظریئے کے مطابق قربانی کے واسطے بہترین بکروں کا انتخاب کرتے ہیں اور اس امر کا لحاظ رکھا جاتا ہے کہ وہ ہر طرح کے عیب اور نقص سے پاک ہوں۔ اگر شوہر کے انتخاب کے لئے مصنفہ نے استعارے کے طور پر اسے استعمال کیا ہے تو اس سے کسی جنسی جذبے کو ابھارنا مقصود نہیں۔ اس بھابی کو پیش کرتے ہوئے مصنفہ نے اپنے منفرد طرز نگارش میں معاشرے کی برائیوں کی طرف اشارہ کیا ہے اور بتایا ہے کہ بعض صورتوں میں شادی شدہ جوڑے ایک دوسرے سے محبت نہیں کرتے اور نہ ایک دوسرے کی پرواہ کرتے ہیں' بلکہ اپنی مخالف جنس سے دوستی پیدا کرتے ہیں۔ صفحہ ۱۵۹ کے آخری پیراگراف میں مصنفہ نے ان جوڑوں کی دوسروں سے محبت کا ایک سلسلہ پیش کیا ہے۔

صفحہ ۱۶۰ پر ایک اور بھابی کا تذکرہ ہے جس کی روش ناپسندیدہ ہے۔ اس کے کردار اور

سرگرمیوں کو قطعی الفاظ میں ظاہر کرنے کی بجائے مصنف نے بطور استعارہ اُسے ’جگ کی دلہن‘ کہا ہے، ’وہ اس سڑک کی مانند ہے جس پر سب چلتے ہیں‘، ’اس چھاؤں کی طرح ہے جو سب کو آرام پہنچاتی ہے‘، ’وہ دلہن ہے جو ہر رات ایک نیا دولہا اپناتی ہے اور بیوہ ہو جاتی ہے‘، وہ ایک ایسے شوہر کی بیوی دکھائی گئی ہے جو اس کی سرپرستی میں ناکام رہا ہے‘ چنانچہ وہ گزر بسر کے لئے خود کمانے پر مجبور ہے۔ وہ پہلے ایکٹرس بنی اور بعد میں طوائف۔ یہ موضوع معاشرے کے مشاہدے سے ہم آہنگ ہے۔

میرے خیال میں مضمون کا سارا موضوع معاشرے میں پھیلی ہوئی برائیوں اور خرابیوں کو اجاگر کرنے میں حقیقت پسندانہ انداز لئے ہوئے ہے۔ کوئی بھی ٹکڑا ایسا نہیں جو فحاشی کی ترغیب دیتا ہو۔ مصنف نے بس یہ کیا ہے کہ وہ موضوع کی گہرائی میں گئی ہے اور معاشرے کی خباثتوں سے زہر میں بجھے ہوئے پیرائے میں نفرت دلائی ہے۔ مصنف صحافی ہوتا ہے‘ واعظ نہیں‘ واعظ کا اپنا علیحدہ طریقہ، پند و تلقین ہے۔ اسی طرح مصنف خالصتاً سماجی مصلح بھی نہیں ہوتا جس کا خود اپنا ایک مخصوص خشک طریقۂ اظہار ہے جو پڑھنے والوں کو درشت لہجے میں تنبیہ کرتا ہے۔ چارلس ڈکنز نے اپنی تحریروں میں اصلاح کا بیڑہ اٹھایا تھا اور مصنفہ ایک حد تک اس کے اسٹائل کو اپنانے میں کامیاب ہوئی ہے۔

میری رائے میں نہ مضمون کا موضوع فحش ہے اور نہ زبان۔ اس جگہ ان فلموں میں برہنہ مناظر پر تنقید بے نتیجہ نہ ہوگی جو تمثیلی انداز میں فحاشی کی بلندی کو چھوتے ہیں۔ ان مناظر کا واحد مقصد ذہن کو جنسی طور پر پراگندہ کرنا ہوتا ہے۔ معاشرہ نہ صرف یہ سب کچھ برداشت کر رہا ہے بلکہ ان میں گہری دلچسپی بھی لے رہا ہے۔ ایک آدمی اعتماد کے ساتھ یہ بات کہہ سکتا ہے کہ فحاشی کی یہ بلندی آج کی سماجی زندگی کی عادت بن گئی ہے۔ ان فحش فلموں کی پذیرائی‘ شہرت اور تعریف کسی فحش تحریر کی پذیرائی کو صحیح قرار نہیں دیتی۔ زیرِ نظر مضمون میں مصنفہ کا مقصد و منشا معاشرے کی زیرِ بحث خباثتوں سے تنفر اور کراہیت پیدا کرانا ہے۔ معاشرے کی اصلاح اور رہنمائی کے لئے مصنفہ نے قدم قدم پر درس دیئے ہیں۔ میں گواہ صفائی سے متفق ہوں کہ یہ مضمون پڑھنے کے لائق ہے‘ اس لئے کہ یہ معاشرے میں کارفرما خباثتوں سے نفرت دلاتا ہے۔

اوپر کی بحث کی روشنی میں ملزمان کو ضابطہ فوجداری کے زیرِ دفعہ ۲۴۵(۱) بری کرتا ہوں۔

فیصلہ کھلی عدالت میں سنایا گیا۔

(دستخط) شیخ ذکر الرحمٰن
سب ڈویژنل مجسٹریٹ‘ کراچی۔ ۶
(۲۰ رفروری‘ ۱۹۵۸ء)

’وہ بچہ کیا جانے!‘

یہ استغاثہ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ اور کلکٹر آفس کے پریس کلرک نے ماہنامہ ’بیسویں صدی‘ (کراچی) کے ناشر عشرت حسین زیدی اور مدیر سوز شاہ جہاں پوری کے خلاف ستمبر ۱۹۵۳ء کے شمارے میں عشرت رحمانی کی ایک مختصر کہانی ’وہ بچہ کیا جانے!‘ کی اشاعت پر قائم کیا ہے۔ عشرت رحمانی بھی مصنف کی حیثیت سے استغاثے میں شامل ہیں۔ ان تینوں ملزمان نے رسالے میں مذکورہ کہانی کی اشاعت‘ ادارت اور تخلیق میں حصہ لینے کی ذمہ داری قبول کی ہے‘ لیکن ان سب نے کہانی کو فحش یا اخلاق سوز ماننے سے انکار کیا ہے۔ اپنے بیانات کے بعد ان ملزمان نے یہ درخواست کی ہے کہ مزید شہادتیں قلم بند کئے بغیر استغاثے کی پیش کردہ کہانی کے بارے میں فیصلہ صادر فرمایا جائے۔ مفصل ترین بیان کہانی کے مصنف جناب عشرت رحمانی نے داخل کیا ہے۔

نکات کے تعین کے لئے یہ ضروری ہے کہ اس کہانی کا خلاصہ پیش کیا جائے: (۱) ایک بچہ اپنے والدین کی بے خبری میں اُنہیں جنسی فعل میں مصروف دیکھتا ہے اور وہ یہ سمجھتا ہے کہ یہ اُن کے درمیان کوئی ’کھیل‘ ہے۔ ایک دن وہ صبح کو امّی کے پیٹ پر بیٹھ کر کودنے لگا تو امی نے کہا: ’ٹھہرو! ننھے‘ میرا پیٹ نہ دباؤ‘ دکھتا ہے۔‘ تو بچے نے ترکی بہ ترکی جواب دیا کہ پھر ڈیڈی کو بھی منع کیجئے۔ (۲) جب نوکرانی کی لڑکی بچے کے ساتھ مستیاں کر رہی تھی تو بچے کی امی نے اسے دیکھ لیا اور لڑکی کو ڈانٹ پلائی۔ اس موقع پر بچے نے ایک اور ذہنی احتجاج محسوس کیا۔ (۳) تیسری مرتبہ جب اس کی امی اپنے شوہر کے ساتھ ہم آغوشی سے اس لئے کترا رہی تھی کہ بچہ ابھی جاگ رہا ہے تو اس کے ڈیڈی بولے: ’بکرے کی ماں کب تک خیر منائے گی!‘ بچہ جو جاگتا رہتا ہے‘ رات گئے ایک بار پھر اپنے والدین کی ہم آغوشی میں مخل ہوتا ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اردو کی یہ ضرب المثل اس کے تحت الشعور پر ثبت ہو کر رہ جاتی ہے۔ (۴) جوان ہونے کے بعد جنسی بیداری کے عالم میں یہ کہاوت اس کے کانوں میں گونجتی رہتی ہے۔ (۵) اسے اس کی ایک دوست لڑکی بتاتی ہے کہ اس کو بچپن میں اپنے والدین کی ایسی ہی سرگوشیاں سننے کا موقع ملا تھا۔ (۶) سترہ سال کی عمر میں بچہ اپنی انّا کی بھتیجی سے جسے وہ باجی کہا کرتا تھا اور جس کی شادی ہونے والی تھی‘ شادی کے متعلق پوچھتا ہے۔ پھر دونوں میں ایسی گفتگو ہوتی ہے کہ دونوں شرما جاتے ہیں۔ اس گفتگو سے اس کا شوق بھڑکتا ہے اور وہ اپنے ہونے والے بچوں کی ماں کے متعلق سوچنے لگتا

ہے جس کا ابھی نام و نشان تک نہ تھا۔

عشرت رحمانی صاحب نے اپنے تحریری بیان میں اپنی کہانی کے حوالے سے جس کا خلاصہ اوپر پیش کیا گیا، مندرجہ ذیل نکات قائم کئے ہیں: (۱) انہوں نے عام لوگوں کی توجہ کے لئے ان والدین کا مسئلہ پیش کیا ہے، جو چھوٹے بچوں کے سامنے جنسی تعلقات میں یہ سمجھ کر مصروف ہو جاتے ہیں کہ بچے ناسمجھ ہیں اور نہ ایسی باتوں سے کوئی نقصان ہوتا ہے، حالانکہ یہ رویہ انتہائی نقصان دہ ہے۔ (۲) ایسا ادب جس کا مقصد اصلاح ہو ایسے الفاظ استعمال کئے بغیر تخلیق نہیں ہو سکتا جن میں جنسی اشارے یا حوالے پائے جاتے ہوں، مگر اس قسم کے طرز اظہار کو الزام کی بنیاد نہیں بنایا جا سکتا۔ (۳) مصنف کو یہ فخر حاصل ہے کہ وہ اب تک اصلاحی، عالمانہ اور اخلاقی نوعیت کی کئی ادبی تخلیقات پیش کر چکا ہے۔ ’بداخلاق بنانا‘ اور شہوت جگانا اس کی نیت میں شامل نہیں۔ (۴) اس اعتبار سے کہ ادب زندگی کی عکاسی کرتا ہے، موجودہ طرز زندگی اور حالات حاضرہ کا تقاضا ہے کہ نت نئے پیدا ہونے والے مسائل کو بناوٹی شرم و حیا کے پرانے حدود کا لحاظ کئے بغیر بلا کم و کاست زیر بحث لایا جائے۔ (۵) اس تمام عظیم اور کلاسیکی ادب میں فحش عبارتیں موجود ہیں، جو درسگاہوں میں پڑھایا جاتا ہے۔

فاضل وکیل صفائی نے استغاثے پر ایک اور اعتراض بھی اٹھایا ہے۔ انہوں نے فرمایا کہ موجودہ استغاثے کا کوئی جواز نہیں بنتا کیونکہ استغاثہ دائر کرنے والی ایجنسی نے ان ہزارہا غیر ملکی رسائل جو عریاں تصاویر سے بھرے ہوتے ہیں اور جو کراچی میں عام بکتے ہیں، اشتہارات اور سینما کے سینکڑوں پوسٹر جن پر برہنہ بدن پیش کئے جاتے ہیں اور ان بیسویں کھیل تماشوں اور ناچوں پر جن میں عریانیت کے سوا کچھ نہیں ہوتا اور جن کی نمائش عام مقامات پر ہوتی رہتی ہے، کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کی۔ قبل اس کے کہ ہم یہ طے کریں کہ زیر بحث کہانی فحش ہے کہ نہیں، ان نکات پر توجہ دینا ضروری ہے۔

رسالے کے مدیر سوز شاہ جہاں پوری نے اس کہانی کا ایک مختصر تعارف لکھا ہے۔ اسے اور ان کے جواب دعویٰ کو پڑھ کر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کا مقصد یہ تھا کہ وہ ایک سماجی مسئلے کو فوری طور پر اصلاح کی خاطر پیش کریں۔ وہ حصے جو ان کی دانست میں عریاں تھے، انہیں کہانی کی درستی کرتے وقت وہ خود پہلے ہی حذف کر چکے ہیں۔ ان کے جواب دعویٰ کے پہلے حصے کو ان کے ناشر عشرت زیدی نے بھی دہرایا ہے اور پھر دونوں نے وہی باتیں کہی ہیں جو عشرت رحمانی نے اپنے نکات نمبر ایک اور نمبر دو میں بیان کی ہیں۔ لہذا میں ان حضرات کے جواب دعویٰ سے علیحدہ علیحدہ بحث نہیں کروں گا۔ سوز شاہ جہاں پوری کے جواب دعویٰ کا دوسرا حصہ جس میں انہوں نے کہا ہے کہ عریاں حصوں کو وہ پہلے ہی حذف کر چکے ہیں، اس صورت میں بے معنی ہو کر رہ جاتا ہے، اگر شائع شدہ کہانی کو میں ’عریاں‘ قرار دے دوں۔

اب جو قضیہ ہمارے پیش نظر ہے' اس کا باقاعدہ جائزہ لینے سے پہلے ہمیں یہ طے کرنا ہوگا کہ عریانی بذاتہ کیا ہے! ایک معیار تو وہ ہے جس کی طرف عالی جناب چیف جسٹس محمد منیر نے حکومت بمقابلہ سعادت حسن منٹو (پی ایل ڈی ۱۹۵۲ء لاہور۔ صفحہ ۳۸۷) میں اشارہ کیا ہے: 'آیا کہ مواد کا رجحان جس پر عریانی کا الزام ہے' انہیں بداخلاقی کی طرف مائل کرتا ہے جن کے اذہان اس قسم کے اثرات بد قبول کر سکتے ہیں اور اس قسم کی اشاعت جن کے ہاتھ لگ سکتی ہے' اور یہ کہ اگر تفصیلات اپنے طور پر عریاں ہیں تو اس تحریر کی اشاعت میں شامل نیت یا ارادہ بھی اسے عریاں قرار دیئے جانے سے نہیں بچا سکتے۔ ایسے مقدمات میں رجحان کی اہمیت ہوتی ہے نہ کہ نیت کی۔ معاملہ برعکس ہوتا تو کسی ایسی لڑکی پر عریانی کا جرم لاگو نہیں ہوگا جو مال روڈ پر کھڑی ہو کر اپنے بدن کی نشوونما' تناسب اعضا اور خطوط کی نمائش اس دعویٰ کے ساتھ کرے کہ وہ تو مسلک برہنگی کے جسمانی فوائد کا مظاہرہ کر رہی ہے۔ مگر کیا اس مثال کے بارے میں دو آراء ہو سکتی ہیں کہ آیا وہ عریانی کے جرم کی مرتکب ہوگی یا نہیں!'

میں فاضل چیف جسٹس کے تمام تر احترام کے باوجود مندرجہ بالا تشریح کے سلسلے میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ انہوں نے 'رجحان' کے اس تصور کی پوری وضاحت نہیں کی جس کا انہوں نے ذکر کیا ہے۔ عریانی کو طے کرنے کا نہایت اہم معیار یہ ہے کہ آیا مواد جس پر عریانی کا الزام ہے جنسی حقائق کو نہایت بالواسطہ اور ایسے الفاظ اور صاف ستھرے حوالوں کے ذریعے اس طرح پیش کرتا ہے کہ وہ حیاتی اور روحانی نوعیت کے ردعمل اور اثرات مرتب کرتا ہے یا پھر وہ الفاظ' حوالوں اور ہیئت کے اعتبار سے ناشائستہ ہے کہ اس کا ردعمل کم و بیش جسمانی نوعیت کا ہو سکتا ہے، خصوصاً اثر پذیر اور حساس ذہنوں پر! اس بات کا لحاظ ہمیشہ ضروری ہے کہ جنس کا موضوع بہ ذات خود فحش نہیں ہے۔ طبی اور دینی کتب و رسائل میں' جنس کے متعلق واضح الفاظ میں گفتگو کی جاتی ہے کیونکہ وہاں ایسا کرنا ضروری ہوتا ہے' لیکن اس کے برعکس ایک پیشہ ورانہ ادیب کے لئے جنس کے تمام تر جسمانی مظاہر کے حوالوں کی ضرورت نہیں ہوتی۔ یوں ہمارے سامنے ایک تیسرا معیار آتا ہے جو 'نظریۂ ضرورت' ہے۔

اب آیئے ذرا اس مفروضے کی کھری آزمائش کے لئے ادب کے دوسرے مقامات کا جائزہ لیں۔ جب باری تعالیٰ بی بی مریم کے حوالے سے کہتا ہے، 'والتی احصنت فرجھا' (الانبیاء ۲۱/۹۱) تو اس کا اشارہ عورت کی شرم گاہ کی طرف ہوتا ہے' لیکن کیا بدترین قسم کے فاسق و فاجر کے ذہن میں بھی اس سے کوئی جنسی ردعمل پیدا ہوتا ہے یا پیدا ہونے کا امکان ہے! ہرگز نہیں۔ کیونکہ یہاں اس لفظ کا استعمال ضروری تھا اور اس کے رجحان میں بھی کوئی گراوٹ نہیں پائی جاتی۔ ہر علمی تصنیف کو بھی 'نظریۂ ضرورت' کے تحت تحفظ حاصل ہوتا ہے۔ ڈاکٹر ہرنام دت کی کتاب 'ہدایت نامہ خاوند و بیوی' کو الہ آباد ہائی کورٹ نے فحش قرار نہیں دیا تھا حالانکہ اس میں مباشرت کے مختلف آسن بیان کئے گئے تھے۔ اسی

طرح مندرجہ ذیل دو اشعار کے پڑھنے سے عریانی اور محض حیاتی لذت کا فرق ایک بار پھر ہمارے سامنے آتا ہے۔

گہے بہ بوسہ زباں دردہاں بگر دانیم   مزیم باادابیا سخن لابہ بہ گہے
(غالب)
بوسہ خواہم زازاں لب تو چہ می فرمائی   گرصواب است بگو ورنہ خطائے بکنم
(سلمان سارجی)

ان بنیادی اصولوں کی وضاحت کے بعد اس بات کا امکان نہیں ہے کہ زیر بحث مقدمے کے سلسلے میں میری رائے کو من مانی یا غیر اصولی سمجھا جائے۔ میں اس کہانی کے ضمنی حصوں کا حوالہ دے چکا ہوں۔ پہلا حصہ یوں ہے: ’ایک دن میں صبح کو امی کے پیٹ پر بیٹھ کر کودنے لگا تو امی نے کہا۔ ٹھہرو ننھے! میرا پیٹ نہ دباؤ‘ دکھتا ہے‘ میں نے کہا‘ تو پھر ڈیڈی کو بھی منع کیجئے!‘ میاں بیوی کے مابین محبت کے ’کھیل‘ کے حوالے سے دوسری جگہ یوں کہا گیا: ’امی ہمیں نہیں کھیلنے دیتیں۔ نوکرانی کی لڑکی کو ڈانٹا کیوں! میں نے سوچ لیا تھا کہ اگر اب وہ ڈیڈی کے ساتھ کھیلیں گی تو میں بھی انہیں ڈانٹوں گا۔‘ پھر تیسری جگہ یوں کہا گیا: ’میں سمجھ گیا۔ ڈیڈی امی کے ساتھ کھیلنا چاہتے ہیں۔ میں جاگتا رہا۔ ڈیڈی کا مطلب تھا کہ دیکھوں یہ کب تک جاگتا ہے۔ مجھے بھی ضد ہوگئی۔ میں نے سوچا کہ میں بھی کیوں نہ کھیلوں، میں سوتا بن گیا۔ ڈیڈی نے تھوڑی دیر بعد مجھے آواز دی۔ ’ننھے! سو گئے بیٹا۔‘ میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ ڈیڈی نے امی سے آہستہ سے کچھ کہا، امی ڈیڈی کی مسہری پر جا کر لیٹ گئیں۔ ذرا دیر بعد میں بھی اٹھا‘ کود کر امی اور ڈیڈی کے درمیان جا کھڑا ہوا اور چلا کر بولا: ’بکرا آ گیا۔‘ امی ایک دم اٹھ کر بیٹھ گئیں اور ڈیڈی زور سے ہنس پڑے۔‘ چوتھی بار اس وقت کا ذکر ہے جب لڑکا بالغ ہو چکا ہے: ’اندھیرے میں ڈیڈی کی آواز سنائی دیتی جیسے وہ آہستہ سے امی سے کہہ رہے ہوں۔ ’بکرے کی ماں کب تک خیر منائے گی! اور پھر میں بے اختیار ہو کر بے چینی سے کروٹیں بدلنے لگتا۔‘

یہاں تک تو مرکزی خیال کی نوعیت انتہائی ادیبانہ اور معصومانہ رہی اور فنی اعتبار سے بھی ’مناسب‘ مگر مصنف کے ہاں اس خوبی کا جسے ’فنی قدغن‘ کہتے ہیں‘ فقدان ہے۔ آگے چل کر لکھتے ہیں: ’جی چاہتا ہے میرے برابر بھی کوئی بکری ہوتی اور میں چپکے چپکے اس سے کہتا: ’بکرے کی ماں کب تک ...... اور پھر وہ ہنستی اور ہم دونوں رات بھر اسی طرح ہنستے کھیلتے۔‘ اس سے قبل بھی ایک اور عبارت میں اسی خیال کو یوں پیش کیا گیا: ’اور اس وقت میرا بے اختیار جی چاہتا کہ بس...... کیا کہوں‘ کیا کیا جی چاہتا! یہی کہ کسی جوان عورت کی خیر نہ رہے۔‘

یہاں پہنچ کر مصنف نے نہایت اطمینان سے 'کھیل' والے استعارے کو بھی پس پشت ڈال دیا اور پابندیوں سے بے نیاز جنسی تسکین کی طرف ایسا کھلا اشارہ کر دیا جو سر تا سر فسق و فجور سے بھرا ہوا ہے۔ پانچویں ٹکڑے کی عبارت اتنی پیچیدہ اور لفاظی سے بھرپور ہے کہ عریانی سر سے گزر جاتی ہے اور وہ کسی جسمانی تحریک کا باعث نہیں ہو سکتی' مگر چھٹے حصے میں عبارت اپنے معنی اور مفہوم کے اعتبار سے ایک بار پھر نہایت واضح ہے: 'تم اپنی بیوی کے ساتھ کیا کرو گے!' میں اس سوال پر شرما گیا' اور منہ نیچے کر کے چپ ہو گیا' مگر وہ پوچھتی رہی۔ آخر میں نے جھینپ مٹانے اور بات ٹالنے کو کہا۔ تم اپنے میاں کے ساتھ کیا کرو گی! تمہاری شادی جو ہو رہی ہے! اس نے مجھ سے قریب ہو کر سرگوشی میں کہا: 'اسی لئے تو پوچھتی ہوں'۔ اور اس وقت ڈیڈی اور امی کی چپکے چپکے کی باتیں یاد آ گئیں اور ڈیڈی کا یہ کہنا کہ ننھا کیا جانے، بچہ ہے۔ کاش یہ باتیں میں نے نہ سنی ہوتیں۔ اور آخر اس عورت نے اپنی شادی کی سب باتیں مجھے شادی سے پہلے ہی بتا دیں'۔ اب کوئی یہ بتائے کہ نوعمر اذہان کی تحریک کے لئے اور کیا کسر باقی رہ گئی! اب میں ان نکات کو لیتا ہوں جو صفائی میں پیش کیے گئے ہیں۔ ان نکات پر ایک نظر ڈالنے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ نکات نمبر (۱) اور نمبر (۳) کا تعلق موضوع اور نیت سے ہے جبکہ نکات (۲) اور (۴) کا تعلق اس طرز اظہار سے ہے جسے مصنف نے اپنے لئے منتخب کیا۔ آیئے ان نکات پر ایک نظر ڈالیں۔

نکات نمبر (۱) اور (۳): مصنف کہتا ہے کہ اس نے ایک ایسا مسئلہ پیش کیا ہے جو ہم میں سے اکثر لوگوں کو پیش آتا رہتا ہے۔ یہ تو ایک عام مشاہدہ ہے کہ بچے جنسی معاملات کی طرف بڑی جلدی متوجہ ہو جاتے ہیں اور یہ کہ ہم اس بارے میں احتیاط نہیں برتتے جو ایک افسوسناک بات ہے۔ مصنف کو یقیناً یہ حق حاصل ہے اور یہ اس کا فرض ہے کہ وہ ایسی باتوں کی نشان دہی کرے اور یہ بھی مانا جا سکتا ہے کہ اس کا مقصد اصلاح ہو مگر کیا یہ بھی باتیں انتہائی سطحی قسم کی معذرتیں نہیں! اس سلسلہ میں آیا کوئی ایسا معروف طریقہ بھی موجود ہے جس کے ذریعے اس قسم کی معلومات طفلانہ مشاہدات سے دور رکھی جا سکیں! اگر جناب رحمانی کی کہانی والا بچہ اپنے والدین کو نہ دیکھتا تب بھی وہ اپنے گھر میں مرغا مرغی اور چڑے چڑیا کو یہی کچھ کرتے دیکھ لیتا۔ رحمانی اور سوز صاحب ایسے دو ذہین افراد کی معروضات کو سن کر کہ بچوں کو جنسی معلومات سے بچانا والدین کی ذمہ داری ہے' میرے لئے ہنسی روکنا مشکل ہو گیا، کیونکہ اس قسم کی تمام روک تھام مہلک ہو گی۔ ایسی ہر کوشش اس وقت سے ناکام ہوتی چلی آئی ہے جب سے آدم کے گھر اولاد پیدا ہوئی اور اس قسم کی تمام کوششیں مسلسل ناکام ہوتی رہیں گی۔ بھلا وہ کون ہے جو آدمی کی اس کے اپنے طریقۂ پیدائش سے دلچسپی ختم کر سکے' خصوصاً جبکہ اس طریقے میں اس قدر لذت بھی شامل ہے! ان معنوں میں مصنف اور مدیر کو تو سرے سے اس بات کا علم ہی نہیں کہ دراصل مسئلہ ہے کیا! ٹھیک

نیتی ہی سے سہی، مگر مسئلے کو سمجھے بغیر اس قسم کی معنی خیز کہانیاں لکھنے کا یقیناً کوئی جواز نہیں ہو سکتا۔ میں تو حیران ہوں کہ یہ حضرات کس قسم کی اصلاح چاہتے ہیں! کیا ہمارے گھروں میں بیڈ رومز علیحدہ ہونے چاہئیں! کیا پاکستان میں اس قسم کی تجویز وہ ایک عام آدمی کے سامنے پیش کر سکتے ہیں! ایک عام آدمی کا مسئلہ علیحدہ بیڈ رومز نہیں بلکہ اس بے چارے کا مسئلہ تو یہ ہے کہ وہ اپنے سر پر چھت کہاں سے لائے!

ایک ایسے موڑ پر جب کہ پاکستان کے عوام کا اصل مسئلہ رزق حلال کا ایک ٹکڑا ہے، صرف شقی القلب ادیب ہی اپنے آپ کو ان جنسی نزاکتوں کے مسائل میں الجھائے رکھ سکتے ہیں۔ مگر میں محض نقاد نہیں بننا چاہتا۔ میں ان سے کہوں گا کہ اگر ان کی نظر میں سماجی اور جنسی مسائل ایسے ہی اہم ہیں کہ ان مسائل کو زندگی اور موت کے مسائل پر ترجیح دی جانا چاہئے تو پھر ان کے لئے ان مسائل سے ایسے مبہم انداز میں نمٹنا مناسب نہیں۔ ان کے لئے ضروری تھا کہ وہ اس مسئلے پر اصلاحی نقطہ نظر سے غور کرتے جیسا کہ ان کا دعویٰ ہے۔ مصنف نے اس مسئلے کا کوئی حل پیش نہیں کیا۔ مدیر نے بھی صرف مبہم انداز میں مسئلے کی اہمیت جتائی ہے۔ وہ کیا اصلاح تجویز کرتے ہیں، لگتا ہے، ان کے پیش نظر کوئی اصلاح نہیں۔ مصنف نے اپنے تحریری جواب دعویٰ میں کہا ہے کہ اس کے فن میں مقصدیت ہے حالانکہ ہمیں اس کا کہیں ہلکا سا اشارہ بھی نہیں ملتا کہ جس مسئلے کو اس نے اٹھایا ہے، اس کے بارے میں اس کے پاس کون سا حل موجود ہے، نو عمر لڑکے لڑکیاں اتفاقات کے بل بوتے پر جنسی معلومات حاصل کرتے رہیں گے۔ بچپن کے بعض واقعات ان کے ذہنوں پر نقش ہوتے رہیں گے اور ارادتاً بھی وہ جنسی افعال میں ملوث ہوتے رہیں گے، خواہ ان کے والدین احتیاط برتیں یا نہ برتیں۔ اصل مقصد ان باتوں کو چھپانے سے نہیں بلکہ جنسی تعلقات کو معمول پر لانے اور جنسی معلومات کو عام کرنے کا ہے۔ سماجی مصلحین کو چاہئے کہ وہ بچوں سے لے کر بڑوں تک کے لیے سائنٹفک جنسی معلومات پھیلائیں۔ نیم پختہ نظریات کی حامل اس قسم کی اخلاق سوز کہانیوں سے جو بھونڈی اور معنی خیز ترکیبوں سے بھری ہوئی ہوں، یہ مقصد کبھی حاصل نہ ہوگا، خواہ وہ کتنی ہی نیک نیتی سے کیوں نہ لکھی گئی ہوں۔ یہ دلیل کہ اس کہانی میں ایک مسئلے کی نشان دہی کی گئی ہے اور اس کا مقصد قابل ستائش ہے، گہری سوچ کے سامنے فوراً ہتھیار ڈال دیتی ہے اس لئے کہ اس میں ذہن کو بد اخلاقی کی طرف مائل کرنے کا رجحان اتنا واضح ہے کہ انکار کی گنجائش نہیں۔

نکات نمبر (۲) اور (۳): یہ نکات جیسا کہ میں نے عرض کیا، کہانی کی ہیئت سے متعلق ہیں۔ ان میں کہا گیا ہے کہ زیر بحث مسئلے کو جنسی حوالوں اور بناوٹی شرم و حیا کے حدود کو پھلانگے بغیر واضح نہیں کیا جا سکتا تھا۔ میں یہاں بھی متفق نہیں ہوں۔ مثلاً کہانی کے چوتھے اقتباس پر بحث کرتے وقت میں نے عرض کیا تھا کہ اسے قانون شکنی کئے بغیر بھی فنکارانہ پیش کش کی حدود میں برتا جا سکتا تھا۔ میں اپنے مصنفین کے لئے انتہائی احترام کے جذبات رکھتا ہوں جو دنیا بھر کی ادبی پختگی کی دوڑ میں برابر کے

شریک ہیں، مگر میری رائے میں مفہوم یا تاکید کو قربان کئے بغیر بھی یہ بات ممکن ہے کہ انتہائی ناشائستہ حوالوں سے بچا جا سکے۔

منٹو کی کہانی ’کھول دو‘ اس کے افسانے ’ٹھنڈا گوشت‘ سے کہیں زیادہ واضح اور طاقت ور کہانی ہے۔ موخر الذکر کہانی تو ایک انتہائی ناشائستہ مسئلے اور ایک ایسی صورت حال سے متعلق ہے جو بہت کم لوگوں کو پیش آتی ہے۔ جناب رحمانی صاحب کا طرز اظہار نہایت ناشائستہ ہے اور ان کے اشارے اتنے عامیانہ ہیں کہ وہ اچھے ادب کا درجہ نہیں پا سکتے۔ ہم ’بکرے کی ماں کب تک خیر منائے گی‘ والے محاورے کے برمحل استعمال کی داد تو دے سکتے ہیں مگر ساتھ ہی ساتھ ان کے ان مندرجہ ذیل جملوں پر صرف نفرت ہی کا اظہار کر سکتے ہیں۔ ’اب وہ ڈیڈی کے ساتھ کھیلیں گی تو میں بھی انہیں ڈانٹوں گا۔‘ ’کیا کہوں جی کیا کیا چاہتا ہے! یہی کہ کسی جوان عورت کی خیر نہ رہے۔‘ ’جی چاہتا ہے میرے برابر بھی کوئی بکری ہوتی اور میں چپکے چپکے اس سے کہتا، بکرے کی ماں کب تک...... اور پھر وہ ہنستی اور ہم دونوں رات بھر اسی طرح ہنستے کھیلتے۔‘

اگرچہ کہ جناب رحمانی نے ایک بھی ایسا لفظ استعمال نہیں کیا جو بہ ذات خود عریاں ہو، مگر مجھے یہ کہنے میں ہچکچاہٹ نہیں کہ اس کے باوجود ان کا مقصد سوائے جنسی فعل اور اس کے تمام تر بھونڈے پن اور شہوانی لذت سے پیدا شدہ حوصلہ افزائی کی طرف اشارہ کرنے کے اور کچھ بھی نہیں۔ نکتہ نمبر (۵): صفائی کا پانچواں نکتہ یہ ہے کہ اگر اس قسم کے الفاظ اور اسالیب ممنوع قرار دے دیئے جائیں تو پھر اسکولوں اور کالجوں میں مختلف زبانوں کے عظیم اور کلاسیکی ادب پڑھانے کا کوئی جواز باقی نہیں رہ جاتا۔ اس دلیل میں اتنی حد تک تو وزن ضروری ہے کہ عظیم اور کلاسیکی ادب کے بعض حصے قطعاً فحش ہیں، لیکن مجھ سے بڑھ کر خود کلاسیکی ادب کے پرستار حضرات بہ شمول مصنف اور مدیر ہٰذا اس بات کا اعتراف کریں گے کہ اس قسم کا ادب اپنی فحاشی کے باوجود عظیم ہے نہ کہ وہ فحاشی کی بنیاد پر عظیم ہے اور اسے درس گاہوں میں اس لئے پڑھایا جاتا ہے کہ اس میں پائی جانے والی عظمت قابل مطالعہ ہے۔ زیر بحث کہانی کا دفاع کرنے والوں کو میں چیلنج کرتا ہوں کہ وہ ساری کہانی میں صرف ایک ایسا ٹکڑا بتا دیں جو کلاسیکی ادب کا سا حسن اور عظمت لئے ہوئے ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ کلاسیکی ادب میں پائی جانے والی عریانی کے مقابلے میں اس کے محاسن کہیں زیادہ ہیں اس لئے کلاسیکس سے متعلق اس دلیل کی آڑ میں عریانیت کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔

نکتہ نمبر (۶): صفائی کے سلسلے کی آخری دلیل فاضل وکیل صفائی اور اردو کے معروف شاعر جناب آل رضا نے نہایت قابلیت سے پیش کی ہے۔ انہوں نے فرمایا کہ عریانی ایک اضافی اصطلاح ہے اور معاشرے کی نوعیت کے ساتھ ساتھ اس کا مفہوم بھی تبدیل ہوتا رہتا ہے۔ موجودہ معاشرہ کا حال

ہے کہ اس کے اونچے طبقے میں مخلوط رقص رواج پا چکا ہے، اور اس کے اعلیٰ طبقے کا تو ذکر ہی کیا، نچلے طبقے کے لوگ بھی سینما بینی کے رسیا ہیں۔ اس معاشرہ میں تمام اشتہارات عورت کے ننگے بدن کی بنیاد پر کامیاب ہوتے ہیں، اردو اور انگریزی رسائل برہنہ اور چومنے چاٹنے والے انداز کی تصاویر سے سجائے جاتے ہیں۔ اس قسم کے معاشرے کو اس بات کا حق نہیں کہ وہ کسی ایسی انتہائی کم معضرت رساں کوشش پر شک و شبہ کرے جس میں نیک نیتی سے حقیقی مسائل بے نقاب کئے گئے ہیں۔ یہ بھی باتیں مانی جا سکتی ہیں، مگر اس دلیل میں دو اہم باتوں کو نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ ایک بات تو یہ کہ یہ تصویر کراچی، لاہور اور شاید ڈھاکہ کی تو ہو سکتی ہے، مگر پشاور، ہزارہ، لاڑکانہ، کوئٹہ یا پنجاب کے کسی گاؤں کی نہیں ہو سکتی۔ جب ہم پاکستان کے معاشرے کا تصور کرتے ہیں تو ہمارے ذہنوں میں صرف کلفٹن یا مال روڈ نہیں ہوتے اور نہ ہونا چاہئیں۔ ابھی ہمارے معاشرے میں عام طور پر مخلوط اجتماعات ناپسندیدگی کی نظروں سے دیکھے جاتے ہیں۔ ہماری لڑکیاں اجنبیوں سے بات کرتے ہوئے جھجکتی ہیں، ہماری عورتیں گھورنے والوں کو برا بھلا کہتی ہیں اور ابھی تک برسرعام چوما چاٹی پر ہنگامہ برپا ہو سکتا ہے۔ ہمیں آج بھی دائرہ اسلام سے نکلنے سے انکار ہے اور ہم میں سے ہر شخص اپنی اپنی سمجھ کے مطابق اسلام کا پیرو ہے۔ ہمیں آخری خندقیں ہی سمجھ لو، مگر قانون کا پرستار ہمیشہ آخری خندق کا محافظ ہوتا ہے۔ آیئے ہم نوعمر ذہنوں کو نفسیاتی الجھنوں سے بچائیں۔

جناب رحمانی نے کہا ہے کہ ان کی کہانی کے مذکورہ لڑکا لڑکی دونوں کے اوائل عمری کے جنسی تجربات کا باعث ان کے بچپن کے مشاہدات ہیں۔ یہ کیسا مغالطہ اور حقائق کی کیسی تکذیب ہے! انہیں چاہئے کہ وہ 'کنسے رپورٹ' کا مطالعہ کریں۔ انہیں معلوم ہوگا کہ قطع نظر اس سے کہ کسی فرد کے اولین تجربات کیا رہے ہیں، جنسی جبلت عمر کے بعض ادوار میں اپنے لئے راہیں تلاش کر ہی لیتی ہے۔ ایسی صورت میں نوعمر ذہن کو ایسی غیر صحت مند ذہنی غذا کیوں مہیا کی جائے جسے نہ وہ ہضم کر پائے اور نہ جسے ہضم کرنے کا کوئی پرچہ ترکیب استعمال اسے مہیا کیا جا سکے! دوسری بات جسے نظر انداز کر دیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ ان معاملات کا حوالہ دے کر جو عدالتوں کے سامنے نہیں لائے گئے، قانونی بنیادوں پر انصاف کے تقاضوں سے نہیں بچا جا سکتا۔ چوری چوری رہے گی باوجود اس کے کہ ہزاروں مقدمات میں چور پکڑے نہیں جاتے، قتل قتل ہے حالانکہ سینکڑوں قاتل ناکافی شہادتوں کی بنا پر رہا ہو جاتے ہیں۔ پھر یہ دلیل کہ انتظامیہ کے پاس ایسا کوئی موزوں ادارہ نہیں جو عریانی کی تمام صورتوں اور اس کے تمام آثار کو مٹا سکے، بہ مشکل ایسی دلیل ہے جسے میں، ایماندارانہ طور پر رہائی کی بنیاد بنا سکوں۔

ان حالات میں جبکہ الزام شدہ کہانی واقعی عریاں قرار پا چکی ہے، میں تینوں ملزمان جناب رحمانی، جناب عشرت زیدی اور جناب سوز کو زیر دفعہ ۲۹۲ تعزیرات پاکستان مجرم قرار دیتا ہوں، مگر میں

منتقمانہ اور سخت ترین سزا نہیں دوں گا۔ یہاں پر میرا واسطہ اخلاقی خباثت سے ہے اور نہ میں مجرموں سے نمٹ رہا ہوں۔ میری تو خواہش ہے کہ جہاں تک عریانی کے تحریری پہلو کا تعلق ہے اسے تعزیرات پاکستان سے الگ کر دیا جائے۔ اس کی سزا پریس قوانین اور ضابطہ اخلاق کے تحت ہونی چاہئے اور یہ ضابطے اور قوانین حکومت کے اس کمیشن کی زیر سرپرستی بنائے جائیں جو سینکڑوں دیگر مسائل پر چھان بین اور سفارشات مہیا کرنے کی غرض سے تشکیل دیا جانے والا ہے۔

میں ملزم حضرات کے مقاصد کی نیک نیتی کا قائل ہوں۔ میں نیت پر نہیں رجحان پر معترض ہوں۔ مجھے امید ہے اور یقین بھی کہ قانونی اعتبار سے عریانی کی وضاحت کے سلسلے میں جو کچھ یہاں کہا گیا ہے، وہ اس پر غور کریں گے۔ میں صرف جرمانوں کا حکم دیتا ہوں۔ جناب سوز شاہ جہاں پوری پر پچیس روپے جرمانہ بہ صورت عدم ادائیگی ایک ماہ قید محض، جناب عشرت رحمانی پر پچھتر روپے جرمانہ بصورت عدم ادائیگی ایک ماہ قید محض اور جناب عشرت زیدی کے لئے پچاس روپے بہ صورت عدم ادائیگی ایک ماہ قید محض۔ چونکہ متعلقہ اشاعت پرانی ہو چکی ہے اس لئے ضبطی کا حکم ضروری نہیں۔

(دستخط)

مہدی علی صدیقی
ایڈیشنل سٹی مجسٹریٹ نمبر ۹
کراچی (۱۸۔۶۔۱۹۵۵ء)

’وہ آوارہ ہوگئی‘

مقدمۂ ہذا، چار افراد، سعید امرت‘ محمد شفیق‘ مقصود یوسف عثمانی اور آغا سرخوش قزلباش کے خلاف زیر دفعہ ۲۹۲، ایک ناول ’وہ آوارہ ہوگئی‘ کے سلسلے میں درج کیا گیا ہے۔ یہ کتاب جس پر فحش ہونے کا الزام لگایا گیا ہے، سعید امرت نے لکھی اور شفیق بک ڈپو کے محمد شفیق نے اسے شائع کیا۔ مقصود یوسف عثمانی نے اپریل ۱۹۵۰ء میں اُسے عثمانی پریس میں چھاپا اور آغا سرخوش قزلباش نے اپنی دکان ’کتاب محل‘ واقع الفنسٹن اسٹریٹ‘ کراچی میں فروخت کیا۔

میں نے اس کتاب کو کافی غور کے ساتھ اور نقادانہ نظر سے دیکھا ہے اور میری رائے میں اس کتاب کو فحش نہیں کہا جاسکتا۔ کتاب کی کہانی کچھ اس طور پر پیش کی گئی ہے کہ مجموعی تاثر نتیجہ خیز اور ناصحانہ ہے۔ کہانی ایک نوجوان لڑکی کے متعلق ہے جو ایک اوسط درجے کے گھرانے میں پیدا ہوئی۔ اس کے والدین کوئٹہ کے زلزلے میں ہلاک ہوگئے اور اس لڑکی کو ایک سخی مزاج مجسٹریٹ نے منہ بولی بیٹی کہہ کر اپنے گھر میں رکھ لیا۔ اس مجسٹریٹ کا ایک اکلوتا لڑکا بھی تھا‘ جس کی عمر اسی لڑکی کے لگ بھگ تھی۔ مجسٹریٹ نے ہر دو کو اعلیٰ تعلیم بھی دلوائی۔ دونوں نے ایک خوشگوار ماحول میں پرورش پائی اور آخر لڑکی کو جو ناول کی ہیروئن ہے، اپنے ایک کلاس فیلو سے محبت ہوگئی جو ایک شرمیلا‘ سنجیدہ‘ غریب لیکن خوبصورت جوان تھا۔ ادھر محبت کے نقش پختہ ہوتے چلے گئے اُدھر مجسٹریٹ کا لڑکا جوئے بازی اور عیاشی میں ڈوب گیا۔ مجسٹریٹ نے جب دیکھا تو اس نے اپنی دیرینہ تمنا کو فوری طور پر پورا کرنے کا تہیہ کرلیا۔ وہ اپنے لڑکے کی شادی اسی لڑکی سے کرنا چاہتا تھا۔

اب کہانی میں پیچیدگیاں داخل ہوتی ہیں اور لڑکی اپنی زندگی کے ایک المناک موڑ سے گزرتی ہے۔ اپنی مرضی کے خلاف اسے مجسٹریٹ کے لڑکے سے شادی کرنا پڑی جس نے بعد میں اس کے ساتھ حیوانوں جیسا سلوک ہوا۔ کیوں کہ وہ اس سے نفرت کرتا تھا۔ اس لیے کہ اس کی موجودہ بیوی کبھی اپنی جماعت کے ایک غریب لڑکے سے محبت کی پینگیں بڑھایا کرتی تھی اور اس سے اس کے غرور کو ایک چوٹ لگتی تھی۔ چنانچہ یہ شادی ایک تباہی اور بربادی کا پیش خیمہ بن گئی۔ لڑکی اپنے محبوب سے

باقاعدہ ملتی رہی اور جب اس کا علم اس کے خاوند کو ہوا تو وہ فوری طور پر کراچی منتقل ہو گیا۔ بدقسمت عاشق بھی اسی شہر میں آ گیا اور ان کو پھر ایک دوسرے سے ملنے کا موقع ملا۔ جب لڑکی کے خاوند کو اس کا علم ہوا تو اس نے لڑکی کو طلاق دے دی اور اسے گھر سے نکال دیا۔

اس اثناء میں اس کا عاشق اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لئے انگلستان جا چکا تھا۔ چنانچہ اسے اپنے محبوب کی خالہ کے گھر میں پناہ لینی پڑی اور اب اس کی زندگی میں عیاشی اور لہو ولعب کا دور دورہ ہوتا ہے۔ لیکن یہ سب چیزیں حالات کی پیدا کردہ تھیں، ایسے حالات جن پر اس کا کوئی قابو نہ تھا۔ بے چارگی اور لاچاری نے اسے ان لوگوں کے سامنے لا کھڑا کیا جن کی آنکھوں میں شیطانیت رقص کرتی تھی، جو ظاہری طور پر اسے پناہ دینے کے وعدے کرتے تھے لیکن ان کے دلوں میں کچھ اور تھا۔ اُسے دو وقت کی روٹی کے لئے آخر اپنا جسم فروخت کرنا پڑا اور اس طرح آہستہ آہستہ وہ ایک فاحشہ بن گئی۔ کیونکہ اس کے پاس صرف ایک ہی دولت باقی تھی اور وہ تھا اس کا خوبصورت اور پرکشش جسم، اس نے اپنا جسم ان لوگوں کے حوالے کر دیا جو شہوانی جذبات کی تسکین کی خاطر دولت لٹاتے ہیں۔ کہانی کا خاتمہ گہرا المناک ہے۔ ایک کمزور اور لاچار عورت دنیا میں تنہا کھڑی نظر آتی ہے۔ اس دنیا میں جہاں غربت ایک جرم ہے۔

اب ان مختلف پیروں کو فرداً فرداً لیا جاتا ہے جن میں فحاشی کی نشاندہی کی گئی ہے۔ یہ سچ ہے کہ کتاب میں بوسہ بازی اور دو جوانیوں کی معصوم اور پرجوش محبت کا مظاہرہ ہوتا ہے اور فاحشہ عورتوں کے ہتھکنڈوں کا بھی ذکر ہے۔ لیکن ان میں سے کچھ بھی ہمارے ذوقِ حُسن کو ٹھیس نہیں پہنچاتا اور نہ ہی یہ مناظر اس طرح بیان کئے گئے ہیں جنہیں شہوت انگیز کہا جا سکے۔ اگر اردو زبان کی ادبی کاوشوں کو سامنے رکھتے ہوئے اس کتاب کو ایک فنی نقطہ نظر سے دیکھا جائے، تو یہ خاصی معیاری کہی جا سکتی ہے۔

آرٹ کی دنیا ایک ایسے تخلیقی عمل کا میدان ہے جس کی تعریف اور بُرائی اس چیز پر منحصر ہوتی ہے کہ اُسے نقاد نے کن آنکھوں سے دیکھا ہے۔ ہر قسم کا آرٹ اس کوشش کا نام ہے جو ایک آرٹسٹ اپنے احساسات کی دنیا کو صفحۂ قرطاس پر لانے کے لئے کرتا ہے۔ کون سی چیز فحش ہے اور کون سی چیز فنی نقطہ نظر سے اچھی، یہ بات دراصل اپنے اپنے خیال اور پسند پر منحصر ہوتی ہے۔ مرد اور عورت کے درمیان جو جنسی کشش ہے اور جن جن مختلف رنگین صورتوں میں یہ کارفرما ہے، اگر ان سب کو حرام اور ممنوع قرار دے دیا جائے تو پھر یہ عیاں ہے کہ مصوری کا ایک بڑا حصہ اور ادب میں جس چیز کو آرٹ کہا جاتا ہے اس سے ہم کو ہاتھ دھونے پڑیں گے۔

ادب جیسا کہ عام طور پر مشہور ہے، دراصل زندگی کی تصوراتی تعبیر کا دوسرا نام ہے۔ موجودہ صدی میں پرانی روایات سے ہٹ کر لکھنے کا جو ایک رجحان پرورش پا رہا ہے اس نے ماضی کے نظریۂ اخلاقیات پر کافی چوٹیں کی ہیں اور جس کی کچھ مثالیں مشرق میں بھی ملتی ہیں۔ وکٹوریائی عہد میں اوسط درجے کے لوگ جن چیزوں کو اچھی سمجھتے تھے وہ آج مضحکہ خیز معلوم ہوتی ہیں اور اس لئے ادب کو عکاسی اسی طرح کرنی چاہئے جس روپ میں وہ نظر آتی ہے نہ کہ جس روپ میں آنی چاہئے۔ زندگی کے دونوں پہلوؤں کا اجاگر کرنا ضروری ہے۔ اگر ایک طرف دولت کی فراوانی ہے تو دوسری طرف غربت کا بھوت بھی ناچتا ہوا نظر آتا ہے۔ اگر ایک طرف نقرئی قہقہوں کی گونج ہے تو دوسری طرف دبی دبی آہیں بھی ہیں۔ اگر کچھ لوگ اپنی نیکی کے سہارے زندگی کا لطف اٹھاتے ہوئے نظر آتے ہیں تو دوسری طرف کچھ کمزور انسان خوفناک موجوں سے لڑتے ہوئے بھی نظر آتے ہیں، جن کو جذبات کے سیلاب نے بہا کر تقدیر کے سمندر میں لا پھینکا ہے۔ ناول نگار یہ نہیں کر سکتا کہ ان میں سے ایک پہلو کو نمایاں کر دے اور دوسرے سے احتراز کرے۔ اگر وہ اس طرح کرتا ہے تو وہ زندگی سے فرار چاہتا ہے۔ زندگی کا گھناؤنا پن بھی اتنی ہی اہمیت رکھتا ہے جتنا کہ اس کا دوسرا پہلو۔

اس سلسلے میں میرے سامنے کچھ اور ادبی چیزیں ہیں جو اگرچہ کہ جنسی جذبات سے لبریز ہیں لیکن اس کے باوجود وہ قانون کی حدوں سے باہر نہیں گئیں۔ 'لیڈی چیٹر لیزلوز' کو لیجئے، اس میں تو جنسی ماحول اس قدر شدت سے نمایاں ہے کہ اس لحاظ سے اردو کی یہ کتاب اس کے مقابلے میں بالکل سرد ہے۔ ایک اور کتاب 'فورایور ایمبر' میں ایک عورت کی کہانی ہے جسے ایک آدمی سے والہانہ محبت کرتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ اُن تمام لوگوں سے بے وفائی کرتی ہے جن سے وہ باری باری شادی رچاتی ہے اور یہاں تک کہ اُسے اپنے ایک خاوند کے لڑکے سے سیاہ کاری کرتے ہوئے بھی حجاب نہیں آتا۔ 'گون وِتھ دی ونڈ' میں بھی جنسی جذبات کے بہت شرمناک طریقے سے پیش کئے گئے ہیں۔ اسی طرح شیکسپیئر کی 'ریپ آف لُکریس' پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ انگریزی میں اس سے بڑھ کر اور کہیں بھی شہوانی خیالات کا تذکرہ نہیں ملے گا۔ سترہویں صدی کے ڈرامہ میں بھی ایسے عنصر کافی مقدار میں ملتے ہیں۔

ان کے علاوہ بھی بہت سی کتابیں ہیں جو جنس کے موضوع پر لکھی گئی ہیں' جن میں بڑی تفصیل سے جنسی اختلاط کے طریقے اور اقسام بتائی گئی ہیں مثلاً 'آئیڈیل میرج'، 'دی انسائیکلو پیڈیا آف سیکسوئل نالج' اور ہیولاک ایلس کی عظیم الشان کتاب 'سٹڈیز ان سائیکولوجی آف سیکس'۔ یہی نہیں بلکہ کچھ ایسی کتابیں بھی ہیں جن میں اختلاط کے آسن بھی بتائے گئے ہیں مثلاً 'اورینٹل ٹیکنیک اِن میرج' جس کے مصنف اور پبلشر کو گرفتار کیا گیا لیکن بعد میں عدالت نے انہیں چھوڑ دیا۔

آخر میں، ہم فلموں کی طرف آتے ہیں جن میں بوسہ بازی اور محبت کے مناظر کچھ اس طرح پیش کئے جاتے ہیں کہ ان کے مقابلے میں کتابوں میں لکھے ہوئے اسی قسم کے فقرے کچھ اثر نہیں رکھتے۔ اگر سینما کے پردے پر قانون کی خلاف ورزی نہیں ہوتی تو میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اگر انہی مناظر کو کتاب میں قلمبند کرلیا جائے تو اس میں قانون کی خلاف ورزی کیونکر ہوتی ہے! اگر ایک طرف آرٹ پر قانون کی بندش نہیں ہے تو دوسری طرف ادب پر یہ بندش کیوں اور وہ بھی محض اس لئے کہ انہیں جذبات کا اظہار یہاں چند فقروں میں کردیا گیا ہے! مجھے اس بارے میں اب کوئی شک نہیں کہ کتاب ہذا فحش نہیں ہے۔ اس لئے میں تمام ملزمان کو بری کرتا ہوں۔

(دستخط) علی جوآد

ایس ڈی ایم (کراچی)

rekhta

'آفت کا ٹکڑا' (اپیل)

یہ اپیل مندرجہ ذیل حالات میں دائر کی گئی:

فضل الرحمٰن اپیل کنندہ نے ایک کتاب 'آفت کا ٹکڑا' کے نام سے لکھی۔ حکومت نے اس کے بعض حصوں پر یہ اعتراض کیا کہ اس سے ویسٹ پاکستان پریس اینڈ پبلی کیشنز آرڈی نینس کی شقوں الف اور جے کی دفعہ ۲۴ کی ذیلی دفعہ (۱) کی خلاف ورزی ہوتی ہے۔ اس ضمن میں یہاں اس امر کا حوالہ دینا بے موقع نہ ہوگا کہ حکومت کے نقطہ نظر سے کتاب مذکورہ میں ایسا مواد تھا جو ناشائستہ فحش' مخرب اخلاق' وغیرہ تھا۔

چناں چہ حکام متعلقہ نے کتاب کے پرنٹر اور پبلشر کے نام فردِ جرم جاری کی ہے اور وہ حاضر ہوئے۔ انہوں نے الزام کو صحیح تسلیم کیا اور رحم کی درخواست کی۔ چونکہ پرنٹر اور پبلشر نے آغاز ہی میں صاف صاف تسلیم کر لیا تھا' اس لئے کوئی تعزیری کارروائی نہیں کی گئی' سوائے اس کے کہ کتاب بحق سرکار ضبط کر لی گئی۔ ان دونوں (پرنٹر اور پبلشر) میں سے کسی نے بھی اپیل دائر نہ کی اس لئے معاملے کو ختم سمجھا گیا۔ لیکن مصنف فضل الرحمٰن خان' حالانکہ وہ پہلے ایڈیشن کا کاپی رائٹ پبلشر کو دے چکا ہے' شکایت لے کر حاضر ہوا اور اس لئے یہ اپیل سامنے آئی۔

مصنف کی جانب سے یہ سوال اٹھایا گیا ہے کہ چونکہ شروع میں اسے 'شوکاز' نوٹس جاری نہیں کیا گیا تھا اس لئے وہ حکم جس کے مطابق کتاب کو ضبط کیا گیا' ازروئے قانون درست نہیں ہے اور اس لئے وہ بے اثر ہے۔ بادی النظر میں یہ سوال بے وزن نہیں ہے لیکن ہم اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کر سکتے' جو اس عالم گیر محاورے میں پوشیدہ ہے کہ 'ہر چیز جو چمکتی ہے' سونا نہیں'۔ بدقسمتی سے فائل میں کوئی ایسی بات نہیں ہے جس سے یہ ظاہر ہوتا ہو کہ اپیل کنندہ کا ضبط شدہ کتاب سے کیا مفاد وابستہ ہے کیونکہ وہ کاپی رائٹ پبلشر کے نام فروخت کر چکا ہے۔ اس سلسلہ میں رشید احمد کا حلف نامہ خاص طور پر قابل ذکر ہے یعنی اپیل کنندہ کا اپنا گواہ بھی بالکل اسی امر کی توثیق کرتا ہے۔

اب چوں کہ اپیل کنندہ پہلے ایڈیشن کا کاپی رائٹ فروخت کر چکا ہے اس لئے اسے ازروئے قانون 'پارٹی' نہیں قرار دیا جا سکتا۔ اسے ضبط شدہ ایڈیشن سے کوئی نقصان نہیں پہنچا۔ ضبط شدہ کتاب سے مالی یا کسی اور قسم کا کوئی مفاد وابستہ نہیں رہا۔ اس لئے اپیل کنندہ کو آرڈی نینس کی دفعہ

۴۸(۱) کی حدود اور منشا کے مطابق اپیل کرنے کا بھی کوئی حق نہیں پہنچتا۔ اپیل کنندہ نے بطور اسناد پی ایل ڈی ۱۹۶۷ء لاہور کی دفعہ ۴۲ پر بھروسہ کیا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ جس قانون کے تحت یہ حکم نافذ کیا گیا ہے اگر وہ خاموش بھی ہو تب بھی قدرتی طور پر انصاف کے قواعد کا اطلاق تو ہونا ہی چاہئے' اور ہوگا۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ چونکہ اپیل کنندہ کا ضبط شدہ کتاب سے کوئی مفاد وابستہ نہیں ہے' اس لئے پی ایل ڈی ۱۹۶۷ء لاہور کی دفعہ ۴۲ کی عبارت کا اطلاق اس کیس پر نہیں ہوتا۔ نتیجتاً فریق مخالف یعنی حکومت کا کیس جوں کا توں رہتا ہے یعنی مذکورہ کتاب میں ان حالات کا واضح وقطعی ثبوت موجود ہے جن کے تحت حکومت نے اسے ممنوع قرار دیا ہے۔ اگر اس کے برعکس ہوتا تب بھی ہمارے نزدیک یہ اپیل اس وجہ سے قابل قبول نہیں ہے کہ اپیل کنندہ کی پوزیشن آرڈی نینس کی دفعہ ۴۸ کے تحت صحیح ثابت نہیں ہوتی۔

جب حقیقی وقانونی پوزیشن یہ ہو تو اپیل کے فوائد خود بخود ساقط ہو جاتے ہیں اور ہم بے جھجک بذریعہ حکم ہذا اپیل خارج کرتے ہیں لیکن اس کیس کے خصوصی حالات کے تحت ہم مستغیث کے اخراجات کا بار اپیل کنندہ پر ڈالنے کا جواز نہیں سمجھتے۔ اس لئے فریقین اپنے اپنے اخراجات خود برداشت کریں گے۔

(دستخط) چیئرمین ٹریبونل
'ممبر'
مورخہ ۲۹/جون ۱۹۷۰ء

ضبط شدہ پینٹنگز

جناب بدرالعالم ایڈووکیٹ نے جناب جے۔ اے رحیم کی جانب سے ایک درخواست زیر دفعہ ۵۲۳ تعزیرات پاکستان پیش کی ہے جس میں جناب رحیم کی ضبط شدہ اشیاء (پینٹنگز، فائلیں اور دستاویزات) واپس کرنے کی استدعا کی گئی ہے۔ اس سلسلے میں استغاثہ کو نوٹس جاری کئے گئے اور ۵ ستمبر ۷۷ء کو دلائل کی سماعت ہوئی۔ جناب رحیم کے فاضل وکیل نے بتایا کہ ان کا موکل پاکستان پیپلز پارٹی کا بانی رکن رہا ہے اور اس پارٹی کے اقتدار میں آنے کے بعد وہ مرکزی کابینہ کا سینئر وزیر بنا۔ لیکن بعد میں اختلاف رائے کی بنا پر اس نے اس پارٹی سے علیحدگی اختیار کر لی۔

مورخہ ۱۱ جنوری سن ۷۶ء کو سی آئی اے کے ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ نور خان نے ایک وارنٹ کی بنیاد پر جو ایک دن پہلے یعنی ۱۰ جنوری سن ۷۶ء کو تعزیرات پاکستان کی دفعہ ۹۸ کے تحت جاری کیا گیا تھا، ان کی کوٹھی پر چھاپہ مارا۔ یہ وارنٹ ایک اطلاع کی بنیاد پر اور اس حکم کے ساتھ جاری کیا گیا تھا کہ کسی بھی نوعیت کا قابل اعتراض مواد اور ایسی تمام دستاویزات ضبط کر لی جائیں جن سے تحفظ امن عامہ کو خطرہ لاحق ہو یا جو عوام میں خوف اور بے چینی پیدا کرنے کا باعث بنیں۔

زیر دفعہ ۹۸ تعزیرات پاکستان بمعہ دفعہ ۱۰ سندھ تحفظ امن عامہ آرڈیننس کے تحت جاری ہونے والے اس وارنٹ کی تعمیل ڈی ایس پی، سی آئی اے نے کی اور اس نے طبع شدہ اور ٹائپ شدہ مواد کے علاوہ چھ پینٹنگز بھی ضبط کر لیں۔ ضبط شدہ اشیاء کی بحالی کے سلسلے میں پیش کی جانے والی ایک درخواست عدالت ہذا نے ڈی ایس پی، سی آئی اے کا بیان لینے کے بعد ۱۶ مارچ سن ۷۶ء کو زیر دفعہ ۵۱۶ الف تعزیرات پاکستان خارج کر دی اور ۲۴ اپریل سن ۷۶ء کو یہ درخواست عدم پیروی کی بنا پر خارج کر دی گئی۔

فاضل وکیل برائے جے۔ اے رحیم نے آل انڈیا رپورٹ ۵۲ء (راجستھان) صفحہ ۱۲۸/۱۲۹ سے نظیر پیش کی ہے جس کی رو سے عدالت پر لازم تھا کہ وہ زیر دفعہ ۵۲۳ ضبط شدہ اشیاء کے بارے میں فیصلہ صادر کرتی نہ کہ درخواست خارج کر دی جاتی۔ اس سلسلے میں فاضل وکیل نے کئی نظائر پیش کی ہیں (آل انڈیا رپورٹ ۵۴ء: کلکتہ: جسٹس چندرا، پاکستان کرمنل لاء جرنل ۷۰ء: صفحہ ۱۲۵۵، جسٹس چیمہ۔ اور آل انڈیا رپورٹ ۲۶ء بمبئی صفحہ ۵۵۷ جسٹس فوتان) فاضل وکیل نے عدالت کی توجہ آل انڈیا لیگل رپورٹ ۱۷ صفحہ ۷۴۸ء بمبئی کی طرف بھی مبذول کرائی جس کی رو سے یہ طے پایا تھا کہ قانون

کے مقاصد پورے ہو جانے کے بعد ضبط شدہ اشیاء اس کے مالک کو واپس کی جانی چاہئیں۔

استغاثہ کی جانب سے اے پی پی جناب منگھی نے دلائل پیش کرتے ہوئے کہا کہ کسی ملکیت کے بارے میں یہ فیصلہ کرتے وقت اس ملکیت کی نوعیت کو بھی مدنظر رکھنا ضروری ہوگا۔ فاضل اے پی پی نے تعزیرات پاکستان کی دفعہ ۵۲۳ کے لوازمات کے تحت عدالت کو حاصل شدہ اختیار کا اقرار تو کیا مگر ساتھ ہی ساتھ انہوں نے عدالت کو یہ بھی بتایا کہ جہاں تک ان چھے پینٹنگز کا تعلق ہے، وہ سب کی سب دفعہ ۲۹۲ تعزیرات پاکستان کی زد میں آتی ہیں اور عدالت تعزیرات پاکستان کی دفعہ ۱۰۴ کے تحت انہیں ضبط کرنے کا حق رکھتی ہے۔ ضبط شدہ نصف درجن پینٹنگز کے سلسلے میں ذیل کی تفصیل فراہم کی گئی ہے:

(۱) ایک ایسی پینٹنگ جس میں ایک عورت اپنے پستان دکھا رہی ہے (۲) ایک ایسی پینٹنگ جس میں ایک عورت کا سر پستان دکھائی دے رہا ہے (۳) ایک ایسی پینٹنگ جس میں تین برہنہ عورتیں نظر آتی ہیں (۴) ایک برہنہ عورت کی پینٹنگ (۵) ایک ایسی پینٹنگ جس میں بیٹھی ہوئی عورت کا بالائی بدن برہنہ ہے اور (۶) ایک ایسی پینٹنگ جس میں ایک عورت ایک خاص رخ سے اپنا پستان دکھا رہی ہے۔

فاضل وکیل استغاثہ نے بہرحال، طبع شدہ اور ٹائپ شدہ مواد جو ضبط کیا گیا ہے، اس کے بارے میں کچھ نہیں کہا۔ انہوں نے دفعہ ۵۲۳ تعزیرات پاکستان کے لوازمات کو پہلے ہی تسلیم کر لیا تھا مگر اب انہوں نے تعزیرات پاکستان کی دفعہ ۲۹۲ کی روشنی میں یہ ایک اور دعویٰ کیا ہے۔ اس مرحلے پر سب سے پہلے یہ دیکھنا ہوگا کہ (۱) عریانی کیا ہے اور (۲) آیا زیر بحث پینٹنگز فحش ہیں اور اگر (۲) کا جواب اثبات میں ہے تو کیا ان پینٹنگز کی نمائش سرعام ہو رہی تھی!

فحاشی کا معیار وہی ہے جو ایک فرد اُس کے بارے میں روا رکھے، مگر یہ تصور ایک فرد سے دوسرے فرد، ایک عہد سے دوسرے عہد اور ایک خطے سے لے کر دوسرے خطے تک بدلتا رہتا ہے۔ فحاشی دراصل ادراک کا مسئلہ ہے اور اس سے مراد کوئی ایسے شے ہوگی جو حیا اور شائستگی کے منافی اور جو گھناؤنی اور مکروہ ہو۔ جو بات ایک شخص کے لئے فحش ہو، ضروری نہیں کہ وہی بات دوسرے کے نزدیک بھی فحش ہو۔ دراصل یہ ذہن کی ایک کیفیت کا نام ہے۔ عام جگہوں پر چھاتیوں کی نمائش صریحاً ایک فحش فعل ہے لیکن ہمارے ملک میں ایک ماں کا کھلے مقامات پر بھی اپنی چھاتیوں سے بچے کو دودھ پلاتے دکھائی دینا کوئی غیر معمولی منظر نہیں حالانکہ اس کے لئے پستانوں کو برہنہ کرنے کی ضرورت پیش آتی ہے مگر اس منظر کے تقدس سے کون انکار کر سکتا ہے!

ان معروضات سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ عریانی ادراک کی ایک صورت کا نام ہے اور یہ مسئلہ

سراسر فرد کی صوابدید پر منحصر ہے اور اس سلسلے میں افراد کے درمیان اختلاف ہوسکتا ہے۔ عریانی کی بہترین تعریف یہ ہوسکتی ہے کہ کوئی ایسی بات جو شہوانی جذبے کی تحریک کا باعث بنے اور ذہن کو پراگندہ کرے۔ پہلے نکتہ کا جواب حاصل ہونے کے بعد اب ہمیں یہ طے کرنا ہے کہ پینٹنگ کسے کہتے ہیں اور آیا ایک پینٹنگ فحش بھی ہوسکتی ہے کہ نہیں!

مصوری رنگوں کا وہ براہ راست عمل ہے جس کے ذریعہ کسی سطح پر ہلکے اور گہرے رنگوں کی آمیزش سے کوئی دیدہ زیب اہتمام پیش کیا جائے یا پھر قدرتی شکلوں اور تصوراتی اشیاء کی صورت گری کو بھی مصوری کہتے ہیں۔ دراصل مصوری تاریخ کا ایک منبع بھی ہے اور وہ دیگر فنون لطیفہ (مثلاً قدیم یونان اور ازمنہ وسطیٰ کے یورپ میں فن تعمیر اور مجسمہ سازی) کے ساتھ مل کر اپنے عہد کی عکاسی بھی کرتی ہے۔ یوں مصوری کے ذریعہ تاریخ کے مختلف ادوار کو پرکھا جاسکتا ہے۔ ابتداً عیسائی اور بعد ازاں بازنطینی فنکاروں نے علامتی اور صاحب طرز دیواری تصاویر اور آرائشی مسودات کی ایسی نادر مثالیں پیش کی ہیں جو عیسائی فن کی بنیاد قرار پائی ہیں۔ نشاۃ ثانیہ کی فنی ترقی کے ساتھ ہی قرونِ وسطیٰ کی مصوری کی انتہائی روحانی روایات کا رخ نسبتاً دینوی شکل اختیار کرگیا اور 'گوٹو' کی دیواریں پر بنائی ہوئی قصوں' کہانیوں کی عکاسی کرنے والی تصاویر نے زندگی افروز خیالات اور جذبات کے اظہار کو ایک نیا اسلوب بخشا۔

تحریک نشاۃ ثانیہ کے عروج کے دوران فن کے زیادہ تر نمونے فصیلوں کی زیب وزینت اور گرجوں کی قربان گاہوں کی سجاوٹ سے متعلق تھے۔ ظاہر ہے کہ وہ مروجہ طرز پر بنائے گئے تھے اور لوگوں کی اکثریت کو پسند تھے۔ رافائیل اور مائیکل انجلو کے شاہکاروں کے علاوہ فلارنس کے ماہرین فنکاروں کے زیادہ تر عمومی نمونے اسی نوعیت کے ہیں۔ 'ٹیز' اور دیگر لادینی موضوعات کی ابتدا اسی دور میں ہوئی، 'روکوکو' کی بنیاد پڑنے کے بعد مصوری مزید بے تکلفانہ رنگ اختیار کرگئی۔ پیرس کے عجائب گھر 'لودرے' میں دیگر شاہکاروں کے ساتھ ہی ساتھ روبز کی بنائی ہوئی وہ دودرجن پینٹنگز بھی شامل ہیں جن میں ملکہ میری ڈی میڈیسی کو مختلف پہلوؤں سے پیش کیا گیا ہے۔ آخرکار 'گوٹو' اور 'پکاسو' کے شاہکار کیا ہیں! حقیقت تو یہ ہے کہ مصوری فن کی قدیم ترین اور اظہار فن کی بہترین صورت ہے۔ اب اس سوال کو لیجئے کہ آیا زیر بحث پینٹنگز فحش ہیں کہ نہیں۔

کچھ لوگوں کے لئے یہ پینٹنگز فن کا حیرت انگیز اظہار ہیں، اس لئے فحش نہیں۔ علاوہ ازیں ان پینٹنگز کو کسی کھلے عام مقام سے نہیں بلکہ گھر کی چہار دیواری کے اندر سے ضبط کیا گیا ہے۔ اگر گھر کے اندر سجائی جانے والی اس قسم کی تصاویر کو فحش سمجھ لیا جائے تو پھر گھر کے اندر کی جانے والی اور کہی جانے والی بہت سی اور باتوں کو بھی فحش تسلیم کرنا پڑے گا اور اس طرح فطری گھریلو زندگی بسر کرنا ناممکن اور غیر

اخلاقی قرار پائے گا۔

مندرجہ بالا حقائق کی روشنی میں مجھے یقین کامل ہے کہ چونکہ یہ پینٹنگز مکان کی چہار دیواری سے ضبط کی گئی تھیں اس لئے دفعہ ۲۹۲ تعزیرات پاکستان کی زد میں نہیں آتیں۔ چونکہ فاضل وکیل استغاثہ نے دفعہ ۵۲۴ تعزیرات پاکستان کی لوازمات کو پہلے ہی تسلیم کرلیا ہے، بنابریں میں یہ حکم دیتا ہوں کہ ان پینٹنگز اور دیگر ضبط شدہ اشیاء کو فیصلہ صادر کئے جانے کے سات دن کے اندر اندر کسی وقت ان کے مالک جناب جے۔ اے رحیم کو ذاتی طور پر لوٹا دی جائیں۔ فیصلہ کھلی عدالت میں سنایا گیا۔

(دستخط) اسلم سنجرانی
ایس ڈی ایم (ایسٹ)
(۲۷ ستمبر ۷۷ء)

rekhta

نو فہرستیں

پہلی فہرست	سات نام
دوسری فہرست	دو نام
تیسری فہرست	ایک نام
چوتھی فہرست	کئی نام

(ب)

پانچویں فہرست	کئی نیک نام
چھٹی فہرست	‘مشہور’ لکھنے والوں کی ’بدنام‘ تحریریں
ساتویں فہرست	خواتین کے پرکشش ناموں سے لکھنے والے
آٹھویں فہرست	’بدنام‘ خودنوشتیں/خطوط
نویں فہرست	ناحق بدنام تحریریں

rekhta

پہلی فہرست

سات نام

جعفر زٹلی	(۱) کلیات میر جعفر زٹل، مرتبہ، مولوی محمد فرحت اللہ صاحب بلند شہری، پرنٹر قاضی محمد رفیق، نجات مشین پریس، بجنور ۱۲۸۳ء	اردو کے چھ یا سات الفاظ جن کو انتہائی فحش سمجھا جاتا ہے، زٹلی کی شاعری میں بلا تکلف استعمال ہوئے ہیں (مرتب)
	(۲) زٹل نامہ (کلیاتِ جعفر زٹلی) مرتب، رشید حسن خاں انجمنِ ترقی اردو ہند، دہلی ۲۰۰۳ء	ہزل گوئی کا آغاز دہلی میں جعفر زٹلی سے ہوا جو غالباً محمد شاہ کے زمانے میں تھے۔ ان کے کلام کو میں نے اول سے آخر تک دیکھا ہے، ہوا فحش گوئی اور حد سے بڑھی ہوئی بے حیائی کے، نہ کوئی شاعرانہ خوبی نظر آتی ہے اور نہ زبان کا کوئی لطف ہے! ماخذ (اُردو۔۷۲) ڈاکٹر زور نے 'تذکرہ مخطوطات' کی چوتھی جلد میں، جعفر سے متعلق لکھا ہے: 'زیادہ ہجویں اور فحش کلام لکھتے تھے، آخر میں اُسی پاداش میں شہنشاہ فرخ نے ان کو قتل کرا دیا۔ کلام جعفر کا ایک حصہ فحشیات پر مشتمل ہے۔ متقدمین اور متاخرین میں سے بیشتر حضرات نے اُسی کو جعفر کی کل کائنات سمجھ لیا۔ یہ عجیب بات ہے، لیکن اس سے بھی زیادہ عجیب بات یہ ہے کہ کسی نے اس پر غور نہیں کیا کہ اس فحش کلام کی حیثیت کیا ہے! کیا یہ محض دشنام طرازی ہے یا اس برہنہ گفتاری کا کوئی اور پہلو بھی ہے! ماخذ (اُردو۔۶) جعفر زٹلی عہدِ عالمگیری کے ایک بے باک و بے لگام مزاح نگار ہیں۔ وہ اپنے اشعار میں امراء و رؤسا اور شاہان و شہزادگان کو بھی اسی طرح اپنے طنز کا نشانہ بناتے ہیں جس طرح دوسرے افراد و عوام الناس کو۔ لیکن ان کا اسلوب اتنا عریاں

اور ان کی لفظیات بیشتر مقامات پر ایسی ناشائستہ ہیں کہ چیدہ چیدہ اشعار و اجزاء کے سوا ان کے کلام کو کسی مہذب اور ثقہ مجلس میں پڑھنا اور سنانا مشکل ہے۔ اس لئے ان کی مزاحیہ شاعری لسانی اور لغوی محاسن کے اعتبار سے خواہ کتنی ہی اہم کیوں نہ ہو' لطافت فن کے زاویئے سے صرف ایک یادگار تاریخی کڑی قرار پاتی ہے۔ **ماخذ (اُردو۔۳۰)**

صاحبقراں

(جعفرزٹلی) کے بعد دہلی ہی کی خاک سے صاحبقراں تخلص کے ساتھ بلگرام کے ایک ہزل گو لکھنؤ میں آئے اور یہیں چمکے۔ ان کا نام سید امام علی تھا اور آصف الدولہ کے زمانے میں وارد لکھنؤ ہوئے تھے۔

معلوم ہوتا ہے کہ لکھنؤ کے مبتذل مذاق والے رئیس زادوں میں ان کا نشو ونما ہوا۔ ان کا دیوان ملتا ہے اور گو کہ کلام فحش اور تہذیب سے کوسوں دور ہے' مگر پھر بھی اس میں ایک بات ہے۔ شاعرانہ خوبیوں کے ساتھ زبان اور محاوروں کا پورا لطف ہے۔ **ماخذ (اُردو۔۷۲)**

میاں مشیر

اس فن میں سب سے زیادہ شہرت مرزا دبیرؔ کے شاگرد میاں مشیر کو حاصل ہوئی۔ ہجو گوئی اور فحاشی پہلے بھی تھی مگر مشیر نے جس قسم کے محاورات سے کام لیا' بندش الفاظ' طرز ادا اور استعمال تشبیہات میں جیسی مضحکہ خیزی پیدا کی اور مارے ہنسی کے لوٹا دینے اور سامعین کے پیٹ میں بل ڈال دینے کے لئے جو زبان اور جیسا اسلوب سخن اختیار کیا' اس کی خوبیاں اور جدتیں بیان سے باہر ہیں۔ ابتذال میں بھی لطف پیدا کر کے اسے شائستہ لوگوں کے سامنے پیش کرنے کے قابل بنا دینا ان کا خاص جوہر تھا جو ان سے پہلے اور ان کے بعد کسی کو نصیب نہ ہوا۔

ماخذ (اُردو۔۷۲)

رفیع احمد خاں

میں نے بہت سے ذہین آدمی دیکھے ہیں۔ بہت سے پڑھے لکھے جاہلوں اور عالموں سے سابقہ رہا ہے' بڑے بڑے حاضر

جوابوں کے کمالات دیکھ چکا ہوں۔ مگر رفیع احمد خاں اپنا جواب خود ہیں۔ انگریزی میں ایک تبحر صاحب قلمؔ اردو میں ایک جادو بیان شاعرؔ جادو یہ ہے کہ ان کا کلام نظر نہیں آتا......

ایک ایک قہقہہ بردوش' توبہ کرا دینے والا شعر استادی کے سانچے میں ڈھلا ہوا سننے کو مل جائے گا۔ یہ اشعار کہیں لکھے نہیں جاتے' نہ چھپ سکتے ہیں۔ نہ باتکلف لوگوں کو سنائے جا سکتے ہیں۔ مگر علم سینہ بن کر حافظوں میں محفوظ رہ جاتے ہیں اور بڑے بڑے شاعر اِنھی شرمناک اشعار کو اپنے نام سے منسوب کر کے لوگوں کو سناتے ہوئے ذرا بھی شرم محسوس نہیں کرتے **ماخذ (اُردو۔۶۲)**

یاروں نے جسم انسانی کے اعضائے عورت کے نام لینے کو فحش نگاری سمجھ رکھا ہے۔ ان کو نہیں معلوم کہ صرف گالی بک دینے یا پوشیدہ اعضاء کے نام نظم کر دینے سے کام نہیں چلتا۔ فحش نگاری میں بھی سنجیدہ شاعری کی سی لیاقت' صلاحیت کا موجود ہونا اشد ضروری ہے وہ فحش نگاری کے بادشاہ تھے' انہوں نے فحش نگاری کو ادبِ عالی کا جو مقام بخشا تھا اور اس میں جو شعریت پیدا کی تھی وہ شیخ سعدی اور مُلا عبید ذاکانی کے درجے کی چیز تھی اور بعض اوقات تو وہ ان دونوں سے بھی آگے بڑھ جاتے تھے۔

افسوس کہ میری قوم میں ابھی تک مردوا پن پیدا نہیں ہوا' ورنہ ان کے فحش اشعار نقل کر کے اپنے دعویٰ کو مُدلل کر دیتا۔

ماخذ (اُردو۔۵۴)

ایک بار حکیم عبدالوالی بارہ بنکی سے چند روز کے لیے لکھنؤ آئے۔ جوشؔ بھی ان دنوں لکھنؤ میں تھے۔ وہ جوشؔ سے ملنے گئے اور واپس آکر بتایا کہ جوشؔ کے ہاں رفیع احمد خاں سے بھی ملاقات ہوئی اور انھوں نے دونوں کو دوسرے روز رات کے کھانے پر بلالیا ہے۔ ایک چھوٹی سی نشست ہوگی۔ حکیم عبدالوالی نے اپنے دو تین بے تکلف دوستوں کو بھی کہلوادیا۔ ان کا اپنے دونوں بھتیجوں یعنی میرے والد اور حکیم عبدالوالی مرحوم کے بیٹے حکیم محمد بشیر ابراہیم مخمورؔ

سے بھی بے تکلف دوستوں جیسا برتاؤ تھا مگر میرے دادا حکیم عبدالقوی کی موجودگی میں یہ دونوں اس نشست میں شرکت سے گریزاں تھے۔ حکیم عبدالوالی نے ان سے کہا: ’تم دونوں بر حیثیت سے اتنے ہی بالغ ہو جتنے بھائی‘۔ میرے دادا بولے ’والی‘ تم عمر سے پہلے سٹھیا گئے ہو۔ تمہارا بس چلے تو خلیق کو بھی اس صحبت میں اپنے ساتھ بٹھالو۔ اُس تک سے ایسی باتیں کرتے ہو جو اس عمر کے لڑکوں سے نہیں کرنے چاہییں‘۔ ’اسی عمر میں تو یہ باتیں کرنے چاہییں تا کہ بھٹکنے کا امکان نہ رہے‘۔ انھوں نے جواباً کہا۔ میں اپنے منجھلے دادا کا بہت سر چڑھا تھا۔ وہ دنیا کے ہر موضوع پر مجھ سے باتیں کرتے اور جب بھی کوئی نیا افسانہ یا مضمون لکھتے اور لکھنؤ آ کر سناتے تو ان کے سامعین میں میرا ہونا ضروری تھا۔ میں اگر اس وقت موجود نہ ہوتا تو میرا انتظار کرتے۔ بہرحال میرے دادا نے فیصلہ کیا کہ وہ اس نشست میں شرکت پر آرام کرنے کو ترجیح دیں گے۔ میں تو ظاہر ہے کہ اس نشست کے قریب بھی نہیں پھٹک سکتا تھا۔ دوسرے روز رات کو نشست جمی۔ میں بہ ظاہر گھر میں سونے لیٹ گیا تھا مگر نیند کوسوں دور تھی۔ رفیع احمد خاں کا کلام انھی کی زبانی سننے کی خواہش اس بری طرح سوار تھی کہ تھوڑی دیر بعد چپکے سے اٹھا اور چوری چوری اس نشست کی سن گن لینے چل پڑا اور پکڑا گیا۔ میری جو حالت ہوئی اس کا آپ بہ خوبی اندازہ لگا سکتے ہیں۔ اس وقت تو کوئی خاص سرزنش نہیں ہوئی اور مجھے سونے بھیج دیا گیا لیکن یہ رات سخت کرب میں گزری۔ صبح سب کو کیسے منہ دکھاؤں گا۔ گھر میں مجھے بہت آزادی حاصل تھی اور میرے بڑوں نے کبھی مجھ پر کوئی بے جا پابندی نہیں لگائی تھی۔ میرے والد کو مجھ پر بہت اعتماد تھا۔ صبح ہوئی اور میں خفت وندامت کے بوجھ سے دبا ہوا تھا۔ غالباً اسی وجہ سے شب گذشتہ کی غلطی رات گئی بات گئی کے مصداق بھلا دی گئی۔

آپ میں سے جو لوگ رفیع احمد خاں کے بارے میں کچھ نہیں

جانتے انھیں بھی اندازہ ہوگیا ہوگا کہ وہ کس قسم کی شاعری کرتے تھے۔ انھیں فحش نگاری میں کمال حاصل تھا۔ اس میدان میں اردو زبان نے ان سے بڑا شاعر پیدا نہیں کیا۔ حمد، نعت، منقبت، سلام، قصیدہ، مرثیہ، مثنوی، غزل، نظم کوئی صنف ایسی نہیں تھی جسے انھوں نے اپنے مخصوص رنگ میں برتا نہ ہو اور قلم نہ توڑ دیا ہو۔ ظاہر ہے یہ کلام نہ تو وہ کسی مشاعرے میں سنا سکتے تھے اور نہ کبھی یہ مطبوعہ صورت میں آپ کی نظروں سے گزر سکے گا۔ یہ سینہ بہ سینہ اشاعت پذیر ہوتا تھا۔ ان کے عزیز دوست شوکت تھانوی اس کے حافظ تھے۔ ایک زمانے میں مجروح کو بھی خاصا یاد تھا۔ اب لکھنؤ میں رفیع احمد خاں کے ایک اور دوست صباح الدین عمر غالباً وہ واحد شخص ہیں جنہیں یہ کلام بہت زیادہ یاد تھا (کیا ہی اچھا ہو کہ وہ اسے ضبطِ تحریر میں لاکر انجمن ترقی اردو کے کتب خانے یا کسی اور معتبر ادارے میں محفوظ کرادیں)۔ شوکت تھانوی نے لکھا ہے کہ علامہ اقبال نے رفیع احمد خاں کا کلام سن کر کہا تھا کہ اگر یہ شخص سنجیدہ شاعری کرتا تو بڑے بڑوں کے پیر اکھڑ جاتے۔

رفیع احمد خاں انتہائی ذہین و فطین آدمی تھے لیکن ان کی غیر معمولی صلاحیتیں لایعنی مشاغل کی نذر ہوگئیں۔ جاگیردارانہ تہذیب کے پروردہ بعض جوہرِ قابل زوال پذیری کی قربان گاہ پر کس بری طرح بھینٹ چڑھے، رفیع احمد خاں اس کی افسوس ناک تصویر تھے۔ ان کی شخصیت میں بعض شب رنگ عیوب اور سپیدۂ سحر کو شرما دینے والی خوبیوں کا عجیب و غریب آمیزہ تھا، انھوں نے اپنی زندگی لکھنؤ یونی ورسٹی کے پیش رو کیننگ کالج میں انگریزی زبان و ادب کے استاد کی حیثیت سے شروع کی اور جلد ہی اپنی شخصیت کے تاریک گوشوں میں چھپی ہوئی ایک علت کے باعث اس باوقار عہدے سے سبک دوش کردیے گئے۔ یہ افسوس ناک واقعہ پیش نہ آتا تو شاید وہ فراق گورکھپوری اور امرناتھ جھا سے کم رتبے کے آدمی نہ ہوتے۔ انھیں اردو، فارسی کے ساتھ ساتھ انگریزی زبان و ادب

پر عبور حاصل تھا۔ شوکت تھانوی کے مشہور افسانے 'سودیشی ریل' کا انھوں نے انگریزی ترجمہ کیا تھا جو کتابچے کی صورت میں شائع ہوا تھا۔ جوشؔ کی پہلی کتاب 'روحِ ادب' ۱۹۲۱ء میں شائع ہوئی تو اس میں رفیع احمد خاں کا لکھا ہوا طویل مقدمہ شامل تھا۔ ہمارے زمانے میں وہ کوآپریٹو سوسائٹیز کے رجسٹرار کے عہدے پر فائز تھے۔ یار باش اور مرنجاں مرنج آدمی تھے۔ ملنے جلنے میں انتہائی شائستہ اور مزاح اور دل لگی کی باتوں میں بھی متانت کو ملحوظ خاطر رکھتے تھے۔ نجی صحبتوں میں کیا رنگ ہوتا تھا، کس طرح کھلتے تھے، اس کے دیکھنے کی تو نوبت ہی نہیں آئی۔ شادی تمام عمر نہیں کی۔ ایک ڈیرے دار طوائف سے گہری دوستی تھی۔ اکثر شامیں اس کے ہاں دوستوں کے ساتھ رہی کھیلتے گزرتیں۔ ان کے انتقال کے بعد لوگوں کو معلوم ہوا کہ اپنی تنخواہ کا بیشتر حصہ وہ بیواؤں کی امداد اور نادار طلبہ کی تعلیم پر صرف کرتے تھے۔'

ماخذ (اردو۔۵۷)

عریاںؔ

'کلیاتِ عریاںؔ' حیدرآباد (دکن) ۱۹۳۸ء

ان کا اصل نام کرنل اشرف الحق تھا۔ مولوی عبدالحق، محدث دہلوی کے پوتے اور مفسر قرآن مولوی نذیر احمد کے نواسے تھے۔ علی گڑھ سے فارغ ہوکر چودہ سال ولایت میں رہے اور ایڈنبرا سے ڈاکٹری کی سند لے کر آئے۔ پھر قلعہ گولکنڈا میں ریاست حیدرآباد کی افواجِ باقاعدہ کے بڑے ڈاکٹر مقرر ہوئے۔

اپنے کلیات کی دونوں جلدیں باہتمام خاص انہوں نے خود شائع کرائی تھیں اور اپنے بے تکلف دوستوں اور اعزاء کو تحفۃً پیش کیا کرتے تھے۔ ان اصحاب میں خواجہ حسن نظامی، ابوالخیر مودودی، ان کے چھوٹے بھائی ابوالاعلیٰ مودودی، ماہر القادری اور جوشؔ ملیح آبادی وغیرہ شامل تھے۔

ان میں سے بعض حضرات پر انھوں نے اپنے مخصوص انداز میں طبع آزمائی بھی کی ہے، جو ان کلیات میں موجود ہے۔ یہ کلیات تصویری خاکوں سے بھی مزین ہیں۔ (مرتب)

وہ اعادۂ شباب کے نامور ماہر تھے اور نیاز صاحب سے ان کی جان پہچان تھی۔ اس کے علاوہ شاہد (احمد دہلوی) صاحب کے پھوپھی زاد بھائی تھے۔ کرنل صاحب باوجود اس کے کہ ڈاکٹری علم و فضل میں کمال رکھتے تھے ایک خاص نوع کے شعر کہنے کے عادی تھے عریاں تخلص کرتے تھے اور جوانی کا ہر پہلوان کی بے باک گفتگو اور شعروں کا موضوع بن جاتا تھا۔ **ماخذ (اُردو۔۶۴)**

مسکرات کے تجربات کرتے ساری عمر گزر گئی۔ تجربہ اپنے اوپر بھی کرتے تھے اور دوسروں پر بھی۔ مزاج درویشانہ تھا۔ فرقہ رفاعیہ سے منسلک ہو گئے تھے۔

وہ اس قدر عجیب و غریب کردار کے آدمی تھے کہ ان پر ایک علیحدہ مضمون لکھنے کی ضرورت ہے۔ مختصراً یوں سمجھئے کہ منجملہ اور صفات کے شعر کہنے کا بھی خاص ملکہ رکھتے تھے۔ مگر ہزل تو کیا' نرا کھرا فحش۔ عریاں تخلص تھا۔ شعر و شاعری کی وجہ سے حیدرآباد کے تمام شاعروں سے تعلق تھا اور سب کا دم یوں بھی ان سے نکلتا تھا کیونکہ ذرا سی بات پر فحش ہجو لکھ دیا کرتے تھے اور ستم بالائے ستم خود جا کر اسے سنا بھی دیتے تھے۔

ماخذ (اُردو۔۶۳)

ڈاکٹر اقبال

لاہور آنے کا شوق سب سے زیادہ اس لیے تھا کہ سر محمد اقبال سے ملیں گے، چنانچہ ملے۔ شاعرِ اعظم انتہائی سادگی کے ساتھ ایک مونڈھے پر بیٹھے ہوئے، حقے سے شغل فرما رہے تھے۔ گفتگو نہ جانے کہاں کہاں ہوتی ہوئی رفیع احمد خاں صاحب تک پہنچ گئی جن کا ایک شعر میں نے ڈاکٹر صاحب کو سنایا تھا۔

رفیع احمد خاں صاحب عریاں کہتے ہیں مگر ڈاکٹر صاحب نے اصرار کر کے ان کے بہت سے شعر سنے اور کہنے لگے کہ خیریت ہے کہ یہ صاحب اس رنگ میں کہتے ہیں ورنہ بڑے بڑوں کا پتا نہ چلتا کہ کدھر گئے۔ اس رنگ کے خود بھی اکثر شعر سنائے۔

ماخذ (اُردو۔۶۲)

۲ کہا جاتا ہے کہ اقبال نے فحش شاعری بھی کی۔ اگر انہوں

نے ایسی شاعری کی تب بھی وہ ان کے صرف مخصوص دوستوں کے حلقے تک محدود رہی اور کبھی بھی اشاعت پذیر نہیں ہوئی۔

ماخذ (انگریزی۔8)

جوش ملیح آبادی جوش صاحب کو سرور گنٹھ رہا تھا۔ ان کی گل افشانی شروع ہوگئی۔ بلا کا حافظہ پایا ہے اس شخص نے۔ نشہ چڑھتا جاتا تھا اور زبان کھلتی جاتی تھی۔

ملحدانہ رباعیوں کے بعد (جوش نے) اپنا فحش کلام سنانا شروع کردیا۔ جب وہ بھی ختم ہوگیا تو فی البدیہہ کہنا شروع کردیا۔ مگر آخر میں اعتراف بھی کیا کہ اس کا استاد رفیع احمد خاں ہے۔

ماخذ (اُردو۔۶۳)

(ب)

چرکین ہزل گوئی کے سلسلہ میں میاں چرکین کا نام بھی لینا چاہیے۔ لکھنؤ کے زمانہ وسطی میں عاشور علی خاں نام ایک زندہ دل اور نہایت ہی قابل و بامذاق رئیس تھے' ان کے وہاں کی صحبت اس وقت کی سوسائٹی کا اکمل ترین نمونہ تھی۔ انھی نے جان صاحب اور چرکین کو پیدا کیا اور بعض لوگ کہتے ہیں کہ انھی کی صحبت میں صاحبقراں کا بھی نشو و نما ہوا تھا۔

چرکین اپنے ہر شعر میں پیشاب پخانے کی رعایت رکھتے اور ان کے اشعار سے ایسی تعفن آتی ہے کہ ان کا نام سنتے ہی ناظرین کے دماغ سڑ گئے ہوں گے۔ مگر چونکہ ان کی ایک قسم کی خصوصیت تھی' ہم نے ان کا ذکر کردیا۔ ان کے کلام میں بعض شاعرانہ خوبیاں اور اچھی تشبیہیں بھی ہیں مگر ان کے مذاق نے ان خوبیوں کو بھی گندہ اور پلید کردیا ہے۔ ماخذ (اُردو۔۷۲)

اگر جمالیاتی قدر محض الفاظ کی شستگی اور بندش کی چستی پر منحصر ہوتی تو چرکین کو ہمارے چوٹی کے شعراء میں ہونا چاہیے تھا' لیکن ایسا نہیں ہے۔ ہم اسے بڑا شاعر اس لیے تسلیم نہیں کرتے کہ اس کے تجربات لغو اور قدریں غلط ہیں۔ ماخذ (اُردو۔۲۷)

دوسری فہرست

(دونام)

(اندازاً، ۱۹۲۰ء سے ۱۹۴۰ء تک)

ظہور الحسن میکش، گڑھ مکتیشری کے کتابچے

آوارہ کی ڈائری	گرگ اینڈ کو آریہ پستک بھنڈار، بازار کھاری باؤلی، دہلی
بیوی کی ڈائری	گرگ اینڈ کو دہلی
جوانی کی ڈائری (عرف سہاگ رات)	۔ ۔ ۔
شوہر کی ڈائری	۔ ۔ ۔
عاشق کی ڈائری	۔ ۔ ۔
عورت کی ڈائری	۔ ۔ ۔
مرد کی ڈائری	۔ ۔ ۔
معشوق کی ڈائری	۔ ۔ ۔
آدھی رات کی تصویریں	۔ ۔ ۔
خوفناک بدکاریاں	۔ ۔ ۔
دلہن کی آپ بیتی	۔ ۔ ۔

ندیم صہبائی فیروز پوری کا 'بازاری' سلسلہ

بازاری پریاں	نوبہار بکڈپو، کوچہ دکھنی، دریا گنج، دہلی
بازاری دوشیزہ (کی ڈائری)	۔ ۔ ۔ ۔
بازاری فقیر	۔ ۔ ۔ ۔
بازار نواب	۔ ۔ ۔ ۔
جانِ جہاں (کی ڈائری)	۔ ۔ ۔ ۔
لیلیٰ کی ڈائری	۔ ۔ ۔ ۔
مجنوں کا روزنامچہ	۔ ۔ ۔ ۔
رنگیلا نواب	۔ ۔ ۔ ۔
شادی کی پہلی رات	۔ ۔ ۔ ۔
عورت اور شراب	۔ ۔ ۔ ۔
فلمی دوشیزہ	۔ ۔ ۔ ۔

تیسری فہرست

ایک نام

(وہی وہانوی کی کتابیں)

کم و بیش نصف صدی (۱۹۴۰ء۔۱۹۹۰ء) تک، کئی لوگ، اس پراسرار نام کے تحت مارکیٹ کی مانگ پوری کرتے رہے مگر بلیو فلموں کی آمد کے بعد یہ سلسلہ اب ختم ہو گیا ہے۔ ان کتابوں کے ناموں کو اس طرح ترتیب دیا گیا ہے کہ اندازہ ہو سکے کہ اب تک اردو کے عریاں نویس اس موضوع پر کن کن زاویوں سے مشق زنی کرتے رہے ہیں۔ بہرحال، یہ فہرست مکمل نہیں۔ (مرتب)

اُٹھتی جوانی	مکتبہ شباب۔ لکھنؤ (انڈیا)
بہکی جوانی	مکتبہ شباب۔ لکھنؤ (انڈیا)
تڑپتی جوانی	مکتبہ شباب۔ لکھنؤ (انڈیا)
توبہ، توبہ، یہ جوانی!	مکتبہ جنسیات، پالی ہل، مادھوگنج
مجبور جوانی	
جب جوانی آئی	مکتبہ شباب، لکھنؤ
جب لٹ گئی جوانی	مکتبہ جنسی دنیا، دہلی
جوانی کا طوفان	مکتبہ شباب، لاہور
جوانی کے مزے (عرف خفیہ کوک شاستر)	مکتبہ شباب، لاہور
میرا نام ہے جوانی	مکتبہ جنسی دنیا، دہلی
بچپن، جوانی، بڑھاپا (باتصویر)	سندھ بک ایجنسی، میرپور خاص
بے چین لڑکی	مکتبہ شباب، لکھنؤ
پیاسی	مکتبہ شباب، لکھنؤ (بھارت)
جنم جنم کی پیاسی	
جنسی دیوانی	
ہوس کی پیاسی	
ہوس پرست حسینہ	
آوارہ حسینہ	مکتبہ نوبہار۔ لکھنؤ
آوارہ دوشیزہ	مکتبہ جان بہار۔ لکھنؤ (انڈیا)

آوارہ لڑکی	مکتبہ شباب، لکھنؤ (بھارت)
البیلی	مکتبہ شباب، لکھنؤ
البیلی دوشیزہ	مکتبہ نوبہار۔ لکھنؤ (بھارت)
بس آوارہ	مکتبہ نوبہار۔ لکھنؤ
عیاش نازنین	مکتبہ شباب، لکھنؤ
آوارہ پھول	
کچے پھول	
کچی کلیاں	
کنواری لڑکی	
سیپی	
بند پھول	
بی جمن عرف بچے باز	
ننگی عورت	
کشمیر کی کلی	گلاب سنگ پبلشرز۔ امرتسر
کنواری لڑکی	
ایک تھی لڑکی	مکتبہ شباب، لکھنؤ (بھارت)
بے شرم	مکتبہ جنسی دنیا، الہ آباد (بھارت)
چالو لڑکی	مکتبہ شباب، لکھنؤ (بھارت)
خراب لڑکی	
نئی لڑکی	
عصمت فروش	پانڈا پریس۔ جالندھر
کیفے گرل	
ہیروئن	
البیلی	مکتبہ شباب، لکھنؤ
تتلی	مکتبہ جنسی ادب، جھنڈرا اسٹریٹ، لکھنؤ
چٹکیلی	
چنچل	

rekhta

مستانی	
جان بہار	مکتبہ شباب، لکھنؤ
دلبہار	
قلوپطرہ	
ونڈن گرل	
بنو رانی	مکتبہ شباب، جالندھر (بھارت)
گڈو رانی	مکتبہ جنسی ادب، بھنڈرا اسٹریٹ، نیو دہلی
رانی لتا	مکتبہ جنسی دنیا، کانپور (انڈیا)
راج کماری	
عیاش عاشق	نیو پبلیکیشنز، رام اسٹریٹ، کلکتہ (انڈیا)
بری عورت	مکتبہ جنسی ادب، بھنڈرا اسٹریٹ، لکھنؤ
عیاش ملکہ	
......بازملکہ	
ننگی عورت	مکتبہ جنسی ڈائجسٹ، بھنڈرا اسٹریٹ، لکھنؤ
تاجو	مکتبہ شباب، جالندھر
یارو	نیو پبلیکیشنز۔ کلکتہ
راجو	ہانڈا پریس، ریلوے روڈ، جالندھر (بھارت)
لاجو	ہانڈا پریس، ریلوے روڈ، جالندھر (بھارت)
انوری (عرف ایک مرد تین کہانیاں)	نشاط پریس، لکھنؤ
بلوری	
چاندنی	
چکوری	
روحی	
زیبی	
نوری	
جولی	نشاط پریس، لکھنؤ
روزی	

شیلا	مکتبہ جنسی دنیا' کانپور (انڈیا)
فلوری	
بملا	
بیلا	مکتبہ جنسی دنیا' کانپور (انڈیا)
پدماوتی	
رجنی	ہانڈا پریس۔ جالندھر (بھارت)
جے شری	قاضی اینڈ برادرز' امرتسر (بھارت)
مدراشانتی	ناگالینڈ پبلیکیشنز' لاٹوس روڈ' لکھنؤ
وجینتی	
شبنم	
شمع	
شمیم	
عشرت	
عندلیب	
نرگس	مکتبہ کانپور۔ انڈیا
ترانہ	نشاط پریس۔ لکھنؤ
حسینہ	
رخسانہ	
روبینہ	
سلطانہ	ہانڈا پریس۔ لکھنؤ
لبنیٰ	
حمیرا	
رضیہ	مکتبہ کانپور۔ انڈیا
ستارہ	
سعیدہ	
شاکرہ	
صاعقہ	

rekhta

rekhta

شکیلہ	ہانڈا پریس۔ لکھنؤ
شہلا	
غزالہ	چوڑی والان، راج پبلیکیشنز، دہلی
نادیہ	مکتبہ کانپور۔ انڈیا
اسکول گرل	مکتبہ شباب، لکھنؤ
استانی جی	
لیڈی ڈاکٹر	
نرس	
پگلی	
نابینا عورت	
کنوارے جذبات	مکتبہ شباب، لکھنؤ بمبئی
کنواری لڑکیاں	
آوارہ لڑکیاں	مکتبہ جنسی ادب، بھنڈرا اسٹریٹ، لکھنؤ
قبائلی حسینائیں	مکتبہ جنسی ادب، بھنڈرا اسٹریٹ، لکھنؤ
کوک شاستری لڑکیاں	چترا پریس، نئی سڑک، دہلی
بہکی لڑکیاں	جنسی دنیا پبلیکیشنز
الھڑ جوانیاں	مکتبہ شباب، لکھنؤ
بے قرار جوانیاں	
جنسی جوانیاں	
سسکتی جوانیاں	
گرم جوانیاں	
ویران جوانیاں	
دوستانیاں	
چار استانیاں	
پانچ لڑکیاں	مکتبہ جنسی ادب، بھنڈرا اسٹریٹ۔ لکھنؤ
مستورات	مکتبہ بلوان، کانپور (انڈیا)
سرخ ہونٹ	جنسی دنیا پبلیکیشنز

گوری رانیں	
ننگا بدن	مکتبہ شباب، تابلیاں اسٹریٹ، لکھنؤ
بھیگی شلوار	مکتبہ بلوان، کانپور، انڈیا
پھٹی انگیا	
ننگی باہیں	
ننگی گود	
ست خصمی انگیا	مکتبہ بلوان، کانپور (انڈیا)
کالا برقعہ	مکتبہ بلوان، کانپور (انڈیا)
گلابی آنچل	
لال شلوار	
لال پری	
میری پرائیویٹ ڈائری	جنسی ادب، بھنڈرا اسٹریٹ۔ لکھنؤ
پرکاش کور کی ڈائری	مکتبہ شباب، لکھنؤ دہلی
رُوحی کی ڈائری	جنسی دنیا، الہ آباد
مارگریٹ کی ڈائری	مکتبہ شباب، لکھنؤ
آسیہ عرف ایک سچی کہانی	مکتبہ شباب۔ دہلی
پری ملکہ عرف سرور جاں (اصلی ایڈیشن)	مکتبہ بلوان کانپور (انڈیا)
زیبا کی سچی کہانی	مکتبہ شباب، لکھنؤ
زینت امان (جنسی بلی)	مکتبہ بلوان کانپور (انڈیا)
مادھوبالا کی رنگین راتیں	
وحیدہ رحمٰن	
ماتا ہری کی ڈائری	
فلمی معاشقے	
شہناز گل	جنسی دنیا پبلیکیشنز، مکتبہ شباب۔ لکھنؤ
شہناز گل کی ڈائری	مکتبہ بلوان، کانپور (انڈیا)
شہناز گل کی رنگین راتیں	

پہلی بھول	شاہین ایکسپریس۔ پریس
آفیسر	مکتبہ شباب۔ لکھنؤ
بوے	ہانڈا پریس۔ جالندھر
چودھری	
دلال	
صاحب	
گاہک	
ماسٹر جی	
منشی جی	
مولوی صاحب	جذبات پبلیکیشنز، شام بازار، الہ آباد (انڈیا)
ایک ڈاکٹر، تین نرسیں	
رنگیلا ڈاکٹر	
عیاش ڈاکٹر	
بدن تراش	مکتبہ شباب، لکھنؤ
حُسن کا چور	
رنگیلا نواب	
عیاش لیڈر	
آوارہ	
بُرا آدمی	
بدکردار	مکتبہ شباب، لکھنؤ
عیاش	
صائب خاں	
مطلب خاں	
راج کمار	
راج کنور	
رام لال بگڑم	
مکھن راجہ	

rekhta

جمو نے......	
منڈو	
منڈو کا پیار	
تین رنگیلے	مکتبہ شباب، لکھنؤ
رات کے شہزادے	
شیطان کے چیلے	
کئی حرام زادے	
باجی	
بنّو آپا	
وہ بھائی بہن!	
ایسا باپ، ایسی بیٹی!	
رنگیلی ماں، رنگیلا بیٹا	
ماں اور بیٹی	
بھائی جان (تین حصے)	پرنٹرز تسکین جذباتی، زیڈ اے پبلشرز، بمبئی (انڈیا)
بھائی صاحب	
بھابی جان	ہانڈا پریس۔ جالندھر
دیور بھابی	مکتبہ شباب۔ لکھنؤ
دیور جیٹھانی	
بیٹے کی بہو	
دلہن	
سالی	
چٹنی	جان عالم پبلیکیشنز، کلکتہ (انڈیا)
داشتہ	
عیاش گھرانہ	مکتبہ جنسیات، کیپٹن بازار ڈھاکہ
کنواری بیوہ	۔جان عالم پبلیکیشنز، کلکتہ (انڈیا)
سہیلی	مکتبہ جنسیات، کیپٹن بازار ڈھاکہ
چار سہیلیاں (عرف چار جوانیاں)	

rekhta

بھین جی	ہانڈا پریس، جالندھر
جیجا جی	مکتبہ شباب، لکھنؤ
رات رنگیلی، مست نظارے	
جوبن کے نظارے	مکتبہ شباب، لکھنؤ
رات کا آخری پہر	
رات گئی، بات گئی	
گولڈن نائٹ	نیتو پبلیکیشنز، رام اسٹریٹ۔ کلکتہ
پیرس کی راتیں	مکتبہ بلوان۔ کانپور
چاندنی راتیں	مکتبہ شباب، لکھنؤ
سہانی راتیں	
سیاہ راتیں	
کالی راتیں، کالے منہ	
گرم راتیں، ٹھنڈے دن	
گناہ کے دن، گناہ کی راتیں	
اندھیرے سے اجالے تک	
سب کچھ اندھیرے میں......	
برسات میں	
بھیگی شام	
تنہائی	
جذباتی لمحے	
رنگین بہاریں	
گناہ ایک رات کا	سلور بک کمپنی، سرکولر روڈ، کراچی
بند دروازہ	
بند کمرہ	
بیڈ روم	سلور بک کمپنی، سرکولر روڈ، کراچی
بیچ کا دروازہ	
سبز دروازہ	

rekhta

سبز دروازے کے پیچھے	
پٹ کھول	
پردہ اٹھنے سے پہلے	
پردہ اٹھنے کے بعد	
کھلنے کے بعد	
آوارگی	
شوق آوارگی	مکتبہ آشا کرن۔ لکھنؤ
چاشنی مکتبہ شباب، لکھنؤ	
ذائقے	
سسکاریاں	
مزے ہی مزے	
مزہ	عشرت پریس، دریا گنج۔ دہلی
نشاط زندگی عرف کوک شاشتر	مکتبہ شباب، لکھنؤ (بھارت)
لو اسٹوری	
دھبے	
سرخ دھبے	
ایوننگ ان پیرس	
لو ان لندن	
مصر کا بازار	مکتبہ شباب، لکھنؤ (بھارت)
اس گلی میں	
بازار حسن	
چاندنی چوک	
چکلہ	
عزت فروشوں کی محفل	
گرم بستر	سلور بک کمپنی، سرکلر روڈ، کراچی
بس اسٹاپ	قاضی اینڈ کو برادرز امرتسر (بھارت)
رنگین کلب	

rekhta

ننگوں کا کلب	
......کی دنیا	
پکنک	
سالگرہ	
آگ	مکتبہ شباب، لکھنؤ
اور آگ بجھ گئی	
اندھی ہوس	دلچسپ سیریز، رام نگر، راولپنڈی
جنسی محبت	مکتبہ شباب، لکھنؤ
عشق اور ہوس	
جوان امنگیں	مکتبہ شباب، لکھنؤ
ننگی خواہشیں	
ایک کے بعد ایک	جنسی ادب، جھنڈرا اسٹریٹ، لکھنؤ
صرف ایک کے لئے	
سیکس، سیکس، سیکس	مکتبہ ادب، اونچا بازار، لکھنؤ
جوانی کا انتقام	مکتبہ شہریار، لکھنؤ (بھارت)
پرکاش کور کا انجام	مکتبہ جنسی ادب، جھنڈرا اسٹریٹ، لکھنؤ
فلوریڈا کا انجام	مکتبہ شباب، لکھنؤ
مارگریٹ کا انجام	
مجرم کون!	جنسی دنیا پبلیکیشنز، مکتبہ شباب، لکھنؤ
مستانی جاسوسہ	
بلیک میلر	مکتبہ ناز۔ دہلی
نیلی کار	
چاندی کے مجسمے	
بے غیرت کون!	عشرت پریس۔ دریا گنج۔ دہلی
سرکٹا شیطان	
شکاری	
خوفناک شکاری	جنسی دنیا پبلیکیشنز

ننگا شکاری	
شیرنی اور شکاری	
اجنبی مسافر	
قدم قدم شرارے	جنسی دنیا پبلیکیشنز
دنگل	جان عالم پبلیکیشنز۔ کلکتہ (انڈیا)
سنگم	مکتبہ شباب، لکھنؤ
آگے دیکھ تماشا!	مکتبہ بلوان۔ الہ آباد (بھارت)
ایسے بھی ہیں مہرباں	مکتبہ شباب، لکھنؤ
ایسے بھی لوگ ہوتے ہیں	
کبھی ایسا بھی ہوتا ہے!	مکتبہ بلوان۔ الہ آباد (بھارت)

rekhta

چوتھی فہرست

کئی نام

(اندازاً ۱۹۳۴ء سے ۱۹۵۸ء تک)

آغا اشرف	جلوے	آزاد بکڈپو لاہور
اے ایچ آغا	جوانی کی سیاہ کاریاں گناہ کی تصویریں	پنجاب لٹریچر کمپنی، لاہور (۱۹۴۲ء)
اظہار اثر	اُبھرتے جوبن	کتب خانہ آریہ ورت، دہلی
اظہار اثر	چارسوبیس لڑکیاں	کتب خانہ آریہ ورت، دہلی
اظہار اثر	میری پہلی رات	کتب خانہ آریہ ورت، دہلی
ایم سکندر	جب بتی بجھ گئی	کتب خانہ آریہ ورت، دہلی
ایم سکندر	کلی سے پھول	کتب خانہ آریہ ورت، دہلی
جمنا داس اختر	بردہ فروش	کتب خانہ آریہ ورت، دہلی
خان محبوب طرزی	رنگین جوانی	نسیم بکڈپو لکھنؤ (۱۹۳۴ء)
خان محبوب طرزی	سیاہ کاریاں (عرف سراب شبستاں)	(۱۹۳۷ء)
خوشتر گرامی	جوانی کی راتیں	پریم شاستر بکڈپو لاہور (۱۹۳۶ء)
رام لعل	جو عورت ننگی ہے	بیسویں صدی، دہلی (۱۹۴۵ء)
روندر سنگھ	جب جوانی آتی ہے	شمع بکڈپو، دہلی
سرکوب آفریدی	جوانی کی تباہ کاریاں	اظہر برادرز اودھ کتاب گھر، کراچی (۱۹۵۵ء) (مجسٹریٹ علی جواد کی عدالت میں مقدمہ قائم ہوا اور پریس پر جرمانہ ہوا)
سرکوب آفریدی	رنگین افسانے	اظہر برادرز اودھ کتاب گھر، کراچی
سرکوب آفریدی	رنگین جوانی	اظہر برادرز اودھ کتاب گھر، کراچی
سعید امرت	ایک حمام میں تین ننگے	بیسویں صدی، دہلی، ۱۹۴۶ء
سعید امرت	ننگی جوانی	شمع بکڈپو، دہلی، ۱۹۵۰ء
سعید امرت	کالی راتیں	بیسویں صدی، دہلی

سعید امرت	بدچلن (ناول)	مکتبہ رومان، جاوید ایجنسیز، بندر روڈ، کراچی (۱۹۵۱ء میں کتاب پر دو سو روپے جرمانہ ہوا)
سعید امرت	گنہگار (ناول)	شفیق بکڈپو، بندر روڈ، کراچی (۱۹۵۲ء میں کتاب ممنوعہ قرار دیدی گئی)
سعید امرت	وہ آوارہ ہوگئی (ناول)	شفیق بکڈپو، بندر روڈ، کراچی (۱۹۵۳ء میں مقدمہ قائم ہوا اور پانچ سال تک مقدمہ چلنے کے بعد کتاب بری کردی گئی)
سعید امرت	مچلتے ارمان	شباب پبلشرز، پوسٹ بکس ۶۲، کراچی
شہزاد تبسم بی اے	ننگی تصویریں	کتب خانہ آریہ ورت، دہلی
شہزاد تبسم بی اے	اٹھارہ راتیں	پنجاب پبلشرز، چوک فتح پوری، دہلی (کسٹم کی ممنوعہ لسٹ پر ہے)
شہزاد تبسم بی اے	منہ کالے	پنجاب پبلشرز، چوک فتح پوری، دہلی
م۔ غوری	ایک عورت، دو مرد	مکتبہ ادارہ جنسیات، آگرہ (۱۹۴۵ء)
م۔ غوری	بے حیا	مکتبہ ادارہ جنسیات، آگرہ (۱۹۴۵ء)
م۔ غوری	دس عورتیں	مکتبہ ادارہ جنسیات، آگرہ (کسٹم کی ممنوعہ لسٹ پر ہے)
م۔ غوری	طوفان (غیر مطبوعہ)	مکتبہ ادارہ جنسیات، آگرہ
م۔ غوری	'میں ننگی ہوں'	مکتبہ ادارہ جنسیات، آگرہ (۱۹۴۹ء) اس کتاب کی پاکستان میں اشاعت پر پابندی تھی مگر ۱۹۵۱ء میں لاہور کے ایک اشاعت گھر نے اسے چھاپ دیا۔ اس سلسلہ میں کراچی میں مقدمہ قائم ہوا اور مجسٹریٹ ابرار حسن کی عدالت سے اس پر جرمانہ عائد ہوا
م۔ غوری	سیاہ کار (ناول)	مکتبہ رومان، جاوید ایجنسیز، بندر روڈ، کراچی

☆☆☆☆☆

آنند کمار چاؤلہ (محمد تقی چاؤلہ)	رنگین راتیں	شفیق بکڈپو، بندر روڈ، کراچی (کتاب ممنوع قرار دیدی گئی اور ۱۳۰۰ روپے جرمانہ ہوا)

اختر حسین	گناہ کے افسانے	پریم شاستر بکڈپو، لاہور (۱۹۴۱ء)
'ایوب پاکستانی'	آوارہ جوانی	مدینہ پرنٹنگ پریس جاوید پبلیکیشنز، لاہور ۶۳ء
(حکیم) بشیرالدین انصاری	سترہ عورتیں (عرف اصغری کے خطوط)	نیو تاج آفس، اردو بازار دہلی، ۱۹۴۰ء (کتاب ضبط کرلی گئی)
(ایس) حمید امرتسری	گنہگاروں کی جنت	ملک فتح محمد، شاہ چراغ چیمبرز، لاہور (۱۹۵۹ء میں کتاب ضبط کرلی گئی)
ش مظفر پوری	آوارہ گرد کے خطوط	مکتبہ ادب، اردو بازار، دہلی
ش مظفر پوری	بند کمرے میں	نیو تاج آفس، اردو بازار، دہلی
ش مظفر پوری	حلالہ	نیو تاج آفس، اردو بازار، دہلی
(د۔س) شدرشن	سوسائٹی گرل	مکتبہ حسن وشباب، دہلی
شہزادہ ایاز	برہنہ شرم	مکتبہ خاور، سکھر (سندھ) ۱۹۵۰ء
ظہیر	سات کنواریاں	ادارہ کتاب محل، مالیر کوٹلہ (مشرقی پنجاب)
ظہیر	شباب عالم	ادارہ کتاب محل، مالیر کوٹلہ (مشرقی پنجاب)
ظہیر	ننگی دوشیزہ	ادارہ کتاب محل، مالیر کوٹلہ (مشرقی پنجاب)
ظہیر	یہ لڑکیاں	ادارہ کتاب محل، مالیر کوٹلہ (مشرقی پنجاب)
(کپتان ایس ایم) عبداللہ کلکتہ والے	اندھی جوانیاں	شمع بکڈپو، دہلی
(سید) غلام احمد امروہی	شب عروسی کے افسانے	نایاب بکڈپو، دہلی
قدوس صہبائی (بی۔اے۔آنرز)	سات کنوارے	مست قلندر بکڈپو، لاہور
کوکب جمال	بھوکی روحیں	مکتبہ شباب، لکھنؤ
گوہر سیلانی	کالج گرل کے خطوط	کتابستان اردو، لاہور
منظر سلیم	آغوش (ناول)	کتابی دنیا، لکھنؤ (کسٹم قوانین کے تحت اس پر پابندی عائد ہے)
(ایس) منوورما	بیسویں صدی کی سیاہ کاریاں	دی پوپولر بکڈپو، بسنت روڈ، لاہور (۱۹۳۹ء)
	گناہ کی دنیا	دی پوپولر بکڈپو، بسنت روڈ، لاہور (۱۹۳۹ء)
نادم سیتاپوری	محل سرا (ناول)	نسیم بکڈپو، لکھنؤ

نذیر سیال چنیوٹی	ننگی سوسائٹی	ادارہ کتاب محل، مالیر کوٹلہ (مشرقی پنجاب)
واقف صدیقی	باغی دوشیزہ کی ڈائری	مکتبہ ادب، اردو بازار، دہلی

☆ ☆ ☆ ☆ ☆

گمنام	حرام زادی	مکتبہ کائنات، سوہا بازار، لاہور
گمنام	سہاگ راتیں	کتب خانہ آریہ ورت، دہلی
گمنام	شرمناک کہانیاں	
گمنام	گناہ کے افسانے	کتب خانہ آریہ ورت، دہلی
گمنام	گناہ کی لذتیں	مست قلندر بک ڈپو، لاہور
گمنام	برہنہ لڑکیاں	شفیق بک ڈپو، بندر روڈ، کراچی
گمنام	ننگی پریاں	شفیق بک ڈپو، بندر روڈ، کراچی

☆ ☆ ☆ ☆ ☆

تیرتھ رام فیروز پوری (مترجم)	مغرب کی حسین اور گنہگار عورتیں	قاسمی دیتا گیہ، راولپنڈی ۱۹۴۳ء
خوشتر گرامی	بڑے آدمیوں کا عشق	بیسویں صدی، دہلی
خوشتر گرامی	شاہی محلات کی پریم کہانیاں	
راجہ مہدی علی خاں	دنیا کی رنگین مزاج عورتیں	نرائن دت سہگل اینڈ سنز، لاہوری دروازہ، لاہور، [illegible]ء
دکھی پریم نگری (بی۔اے۔آنرز)	کرسٹن کیلر عرف فسانہ لندن	اعوان پبلیکیشنز، شیدی ویلج روڈ کراچی، پوسٹ بکس نمبر ۵۱۴۹ (۱۹۶۳ء)
سید قیم شاہ	مصر کا راجہ اندر (شاہ فاروق)	۲۹ حبیب بینک بلڈنگ، چوک اردو بازار، لاہور
شکیل احمد ضیاء	کرسٹن کیلر	مکتبہ ارتقائے ادب، بندر روڈ کراچی (ستمبر ۱۹۶۳ء میں تمام کاپیاں ضبط کرلی گئیں)
شکیل احمد ضیاء	ڈاکٹرز وارڈ	(۱۹۶۴ء)
راحیل اقبال	تاریک سائے (مصطفیٰ زیدی کی کہانی)	حسرت پبلیکیشنز، گورودت سنگھ روڈ، کوئٹہ
راشد سعید	شہناز بیگم (شہناز زیدی عرف شہناز گل)	غضنفر اکیڈمی، جیل روڈ، کراچی

راشد سعید	اس حمام میں (جنسی جرائم پر مبنی سچی کہانیاں)	کلیکشن بکس، کراچی ۲۰۰۱ء
عابد تہامی	کلنٹن کے سیکس اسکینڈلز	تہامی پبلشرز لاہور، فروری ۱۹۹۸ء
ظہیر احمد بابر	امریکی صدر کے معاشقوں کی خفیہ رپورٹ	
ظہیر احمد بابر	پارلیمنٹ سے بازارِ حسن تک (پاکستانی سیاست دانوں کے شرمناک اسکینڈلز)	نیو برادرز لاہور، اپریل ۲۰۰۰ء

☆☆☆☆☆

(اندازاً ۱۹۳۴ء سے ۱۹۵۸ء تک)

ایم اے۔ زاہد	ایک گناہ اور سہی	رومانی پبلیکیشنز لاہور (۱۹۷۳ء)
ایم اے۔ زاہد	پیرس کی راتیں	مکتبہ چودھویں صدی، اندرون دہلی گیٹ، ملتان
ایم اے۔ زاہد	لندن کی شام	مکتبہ چودھویں صدی، اندرون دہلی گیٹ، ملتان
ایم اے۔ زاہد	ہانگ کانگ	مکتبہ چودھویں صدی، اندرون دہلی گیٹ، ملتان
ایم اے۔ زاہد	کولڈ کافی (افسانے)	سیکس انٹرنیشنل، کراچی ۲۵
ایم اقبال	بھیگی جوانی	الفتح اکیڈمی، شاہین مارکیٹ، ملتان
ایم اقبال	پیرس کی حسینہ	جلیل برادرز، بوہڑ گیٹ، ملتان
راحیل اقبال	اُجلے دھبے	حسرت پبلیکیشنز، موتی رام روڈ، کوئٹہ
راحیل اقبال	زاویے	حسرت پبلیکیشنز، موتی رام روڈ، کوئٹہ
راحیل اقبال	جانِ محبت	مکتبہ کامران، پنڈی پریس، راولپنڈی
راحیل اقبال	رات کی بات	حسرت پبلیکیشنز، موتی رام روڈ، کوئٹہ
راحیل اقبال	جائز و ناجائز	حسرت پبلیکیشنز، موتی رام روڈ، کوئٹہ
راحیل اقبال	بیروت کی شامیں	جذبات اکیڈمی، اردو بازار، لاہور
راحیل اقبال	اُف، یہ جوانی!	جذبات اکیڈمی، اردو بازار، لاہور
راحیل اقبال	جوبن کے نظارے	اقبال برادرز، اردو بازار، لاہور
راحیل اقبال	مستِ شباب	اقبال برادرز، اردو بازار، لاہور
راحیل اقبال	لندن بائی نائٹ	اقبال برادرز، اردو بازار، لاہور
راحیل اقبال	ننگی رات اور کراچی	اقبال برادرز، اردو بازار، لاہور

راشد سعید	دھڑکنیں	غضنفر اکیڈمی، جیل روڈ، کراچی ۱۹۷۱ء
راشد سعید	جوانی کی ہوا	اقبال بک ایجنسی چھوٹی گنگی، حیدر آباد (سندھ)
راشد سعید	پریم دیوانی	اقبال بک ایجنسی چھوٹی گنگی، حیدر آباد (سندھ)
راشد سعید	آر پار	مکتبہ حسن و شباب، کچا نسبت روڈ لاہور
راشد سعید	تازو	مکتبہ جنسی ڈائجسٹ ۱۴ بی شاہ عالم مارکیٹ لاہور
راشد سعید	ہائے اللہ!	سعید اکیڈمی، ہیرآباد، حیدر آباد (سندھ)
راشد سعید	جنسی کتیا	راشد اکیڈمی، نیو سمن آباد، لاہور
راشد سعید	شمو جوان ہوگئی	راشد اکیڈمی، نیو سمن آباد، لاہور
راشد سعید	ہائے میں ہار گئی	راشد اکیڈمی، نیو سمن آباد، لاہور
راشد سعید	عیاش جوانیاں	راشد اکیڈمی، نیو سمن آباد، لاہور
راشد سعید	سلگتی عورتیں	گلف کمرشل انٹر پرائز، لاہور/ ملتان
راشد سعید	نورین	گلف کمرشل انٹر پرائز، لاہور/ ملتان
ایس۔ قمر	کال گرل	سیکس انٹرنیشنل، کراچی
ایس۔ قمر	نائٹ کلب	سیکس انٹرنیشنل، کراچی
ایس۔ قمر	اور شباب لٹتا رہا	شاہین اکیڈمی، ملتان
ساجد لدھیانوی	اندھیرے میں......	پبلشر محمد حیات، مکتبہ جدید مشرق، کراچی
	ارمان بھرے دل	پبلشر محمد حیات، مکتبہ جدید مشرق، کراچی
لطیف گل	جوان عورتیں	داؤد پبلشرز، کھوری گارڈن، کراچی
	ننگے لوگ	داؤد پبلشرز، کھوری گارڈن، کراچی
شہزادہ جانِ عالم	جانِ محبت	مکتبہ حسن و شباب، کچا بسنت روڈ، لاہودر
شہزادہ جانِ عالم	مستانی محبوبہ	
شہزادہ جانِ عالم	'آہستہ آہستہ'	مکتبہ حسن و شباب، کچا بسنت روڈ، لاہور
شہزادہ جانِ عالم	ایک بار اور	راشد اکیڈمی، مصری شاہ، نیو سمن آباد، لاہور
شہزادہ جانِ عالم	'بھئی ایسے نہ کرو'	پرنٹر افتخار احمد، لاہور
شہزادہ جانِ عالم	کچی کلیاں (باتصویر)	سیکس انٹرنیشنل، کراچی
شہزادہ جانِ عالم	نہ کلی نہ پھول	جنسی پبلیکیشنز، ایبک روڈ، لاہور
شہزادہ جانِ عالم	باغی حسینہ	جنسی پبلیکیشنز، ایبک روڈ، لاہور

شہزادہ جان عالم	مستانی محبوبہ	جنسی پبلیکیشنز' ایبک روڈ' لاہور
شہزادہ جان عالم	پریم دیوانی	جنسی پبلیکیشنز' ایبک روڈ' لاہور
شہزادہ جان عالم	جنسی دیوانی	سعید اکیڈمی' ہیرآباد' حیدرآباد (سندھ)
شہزادہ جان عالم	ننگی لڑکی	مکتبہ جذبات ادب' یادگار چوک' پشاور
شہزادہ جان عالم	چنچل تتلیاں	(۱) مکتبہ ادب' میزان گیٹ' کوئٹہ (۲) کنگ پبلیکیشنز' انارکلی لاہور
شہزادہ جان عالم	دلہن	مکتبہ حسن وشباب' کچا بسنت روڈ' لاہور
شہزادہ جان عالم	سدا دلہن	مکتبہ حسن وشباب' کچا بسنت روڈ' لاہور
شہزادہ جان عالم	دلہن [illegible]	جنسی پبلیکیشنز' ایبک روڈ' لاہور

☆☆☆☆☆

عیش جاودانی	الف [illegible] جوانی	اقبال پبلیکیشنز' اردو بازار' لاہور
عیش جاودانی	[illegible] جوانی	جنسی پبلیکیشنز' ایبک روڈ' لاہور
عیش جاودانی	پاگل جوانی	مکتبہ جنسی ڈائجسٹ' [illegible] شاہ عالم مارکیٹ لاہور
نواب ارسلان مرزا	ننگی جوانی	مکتبہ شباب' کچا بسنت روڈ' لاہور
نواب ارسلان مرزا	خوبصورت لڑکی	مکتبہ شباب' کچا بسنت روڈ' لاہور
نواب ارسلان مرزا	شیطان جوانی	مکتبہ ادب' اردو بازار' یادگار چوک' پشاور
نواب ارسلان مرزا	مچلتی جوانی	اقبال بکڈپو' چھوٹی گٹی' حیدرآباد
نواب ارسلان مرزا	جوانی کا گناہ	اقبال پبلیکیشنز' اردو بازار' لاہور
نواب ارسلان مرزا	جوانی کے ارمان	اقبال پبلیکیشنز' اردو بازار' لاہور
نواب ارسلان مرزا	جوانی کی بھول	مکتبہ جذبات ادب' یادگار چوک' پشاور
اُبو ابلیس	جب میں جوان ہوئی	مکتبہ جذبات ادب' یادگار چوک' پشاور
اُبو ابلیس	ریشماں جوان ہوگئی	ماہنامہ روبی' ۲۹ حبیب بینک بلڈنگ' اردو بازار' لاہور
اُبو ابلیس	برہنگی شباب	قمر بکڈپو' جناح چوک' ٹنڈو آدم
اُبو ابلیس	شباب' ایک عذاب	گائیڈ پبلشرز' شاہ عالم گیٹ۔ لاہور
اُبو ابلیس	مستِ شباب	اقبال پبلیکیشنز' انارکلی' لاہور
اُبو ابلیس	ننگا شباب	نیشنل پبلشرز' انارکلی' لاہور
پرنس۔ ایم	اُجلے بدن	کنگ پبلیکیشنز' پرنس روڈ' حیدرآباد

ایم۔ اقبال	گورا بدن	الفتح اکیڈمی، شاہین مارکیٹ، ملتان
راحیل اقبال	بند کلی	جنسی دنیا، ۲۹ حبیب بنک بلڈنگ، چوک اردو
راحیل اقبال	سیپ	جنسی پبلیکیشنز، ایبک روڈ، لاہور
راحیل اقبال	شگوفے	جنسی پبلیکیشنز، ایبک روڈ، لاہور
طارق	ہوسٹل کی کنواریاں	راشد اکیڈمی، بندر روڈ، کراچی
پرنس ایم	روشنی کی گڑیا	کنگ پبلیکیشنز، کوئنس روڈ، کراچی
ایس۔ قمر	سستی عورت	کنگ پبلیکیشنز، کوئنس روڈ، کراچی
ایم۔ شہزاد	کال گرل	سیکس انٹرنیشنل، کراچی
ایم۔ شہزاد	نائٹ گرل	شالیمار پبلیکیشنز، صدر بازار، جہلم
ایک نامعلوم خاتون	گنہگار ماں	عوامی ڈائجسٹ، کراچی، جون ۱۹۷۳ء
اشفاق احمد	ماں بیٹے کی شادی کا انجام	باب السلام پریس، لیاقت آباد، کراچی

☆☆☆☆☆

	انگڑائیاں	پرنٹر افتخار احمد
	گداز لمحے	مکتبہ ادب، اردو بازار، یادگار چوک، پشاور
	جنس ننانوے کے پھیر میں	گلف کمرشل انٹر پرائز، کراچی
ندیم	جنسی بلی	مکتبہ خضر راہ ۱۴ بی شاہ عالم مارکیٹ، لاہور
	جنسی کتیا، جنسی محبت	مکتبہ خضر راہ ۱۴ بی شاہ عالم مارکیٹ، لاہور
	کتا، کتیا	مکتبہ جذبات ادب، یادگار چوک، پشاور
	تشنگی	نیشنل اکیڈمی، بندر روڈ، کراچی
	ہوس کے پجاری	اقبال بکڈپو، چھوٹی گٹی، حیدرآباد (سندھ)
	چوری چوری	قلندری بکڈپو، میران کی کھوئی، لاہور
	دیکھا دیکھی	قلندری بکڈپو، میران کی کھوئی، لاہور
ایم۔ اقبال	راوی کے کنارے	کنگ پبلیکیشنز، کوئنس روڈ لاہور
ایم۔ اقبال	سیکس ان بیروت	مکتبہ ادب، اردو بازار، لاہور
ایم۔ اقبال	'دھیرے دھیرے'	جلیل برادرز، پوہڑ گیٹ، ملتان
	'ڈارلنگ ڈارلنگ'	کنگ پبلیکیشنز، انارکلی لاہور
	'ستاتے کیوں ہو!'	مکتبہ ادب، اردو بازار، پشاور

	ماڈرن سوسائٹی	ریاض بکڈپو، جناب چوک، ٹنڈو آدم
	ننگی دنیا	نیشنل پبلشرز، انار کلی، لاہور
	'اجی ٹھہرو نا!'	کنگ پبلشرز، کوئنس روڈ، کراچی
	'اُف!'	کنگ پبلرز، کوئنس روڈ، کراچی
ندیم	'اُوہوں'	مکتبہ ادب عظیم، پیسہ اخبار، لاہور
	'اوئی اللہ'	راشد اکیڈمی، نیو مزنگ آباد، لاہور
ارشد سعید	'...... نہ کرنا'	مکتبہ جذبات ادب، چوک یادگار، پشاور
ارشد سعید	'ہائے، اوئی'	
ارشد سعید	'ہائے ہائے'	جنسی پبلیکیشنز، ایبک روڈ، لاہور

☆☆☆☆☆

حسینہ کانپوری	اجلا بدن	رہبر کارنر، ترکمان گیٹ، دہلی نمبر ۶
حسینہ کانپوری	جوانی کی آگ	رہبر کارنر، ترکمان گیٹ، دہلی نمبر ۶
حسینہ کانپوری	شرمیلی	رہبر کارنر، ترکمان گیٹ، دہلی نمبر ۶
حسینہ کانپوری	کنواری کلی	رہبر کارنر، ترکمان گیٹ، دہلی نمبر ۶
حسینہ کانپوری	گناہوں کی بستی	رہبر کارنر، ترکمان گیٹ، دہلی نمبر ۶
ذکیہ نازلی	بے غیرت	
سمرن چودھری	بدن کا گناہ	سمیعہ پبلیکیشنز، پی سی ایچ ایس، کراچی ۷۶ء
(ضیاء ساجد!)	'کوئی آجائے گا' (افسانے)	تخلیقات، ۸۷ پٹیالہ ہاؤس، لاہور

☆☆☆☆☆

عرفان احمد خاں	غازہ خور (ناول)	لاہور، ۱۹۹۰ء
ذکیہ نازلی	بے غیرت	
	غنڈی بدمعاش (ناول)	مکتبہ ادب جدید، ۱۱۷ ایبک روڈ، لاہور
شبانہ افروز	کاش! میں جواں نہ ہوتی	
صبیحہ بانو	چھلاوا	مکتبہ الف لیلیٰ ڈائجسٹ، کراچی
		(اردو میں سب سے زیادہ چھپنے والی سرگزشت)
عذرا ملک	شراب اور شباب	تماشہ پبلشرز، اسمٰعیل آباد، ملتان

لیلیٰ صہبائی
نئی الف لیلیٰ عرف آج اور کل کی رنگین کہانیاں
پلے بوائے پبلیکیشنز، نیویارک، ۲۰۰۷ء

‘قیمت! دوا اور کتاب کی کوئی قیمت نہیں ہوتی ان کی قیمت ان کی ضرورت ہوتی ہے‘

‘اس کتاب کے جملہ حقوق بالکل غیر محفوظ ہیں۔ کرداروں کے نام بڑی حد تک فرضی ہیں مگر واقعات اور مقامات سچے ہیں، پھر بھی کوئی مطابقت صرف اتفاقیہ ہی ہو سکتی ہے‘

لذتی فخش نگاری کے طور پر یہ کتاب اپنی نوعیت کی پہلی اُردو کتاب کہی جا سکتی ہے۔ صیغہ متکلم میں بیان کی جانے والی یہ کہانیاں، افسانوی اور آپ بیتیوں کا ایک ایسا عجیب و غریب کاک ٹیل ہیں جن میں اردو کے بیشتر فخش نویسوں کی اصل تحریریں خلط ملط کردی گئی ہیں۔ ان کہانیوں میں جنسی لذت کے ہر پہلو پر بلا تکلف اقرارنامے موجود ہیں اور کسی رشتے، کسی مقام اور کسی بھی وقت اور موقعہ کو بخشا نہیں گیا۔ (مرتب)

پانچویں فہرست

کئی نیک نام

شبلی نعمانی: شبلی نے طبیعت حُسن پرست پائی تھی۔ فارسی شاعری میں کُھل کھیلتے اور معاملہ بندی کو بڑے لطیف انداز میں سرمستی کی حد تک پہنچادیتے۔ بمبئی اور جنجرہ کو تو یار لوگ لے اڑے اور بدگمانی اور مبالغہ کے زور سے سوئی کو بلم بھالا بنادیا' لیکن ایسا بھی نہیں کہ بات سرے سے بے اصل ہو

ماخذ (اردو۔۶۱)

مہدی الافادی گورکھ پوری: اپنے دیباچے میں مولانا عبدالماجد دریا آبادی فرماتے ہیں: (مہدی) کے بعض مضامین کی شوخیاں سنجیدگی' ادب کے حدود سے متجاوز نظر آ ئیں گی۔ اس کا کھلا جواب یہ ہے کہ حضرت مہدی 'معلم اخلاق نہ تھے' ادیب و انشا پرداز تھے۔ اور جب شاعر کے لئے 'برہنہ رقاصی' کا جواز بڑے بڑے ثقہ حضرات نے تسلیم کرلیا ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ نثر کے شاعر پر' انشائے عریاں' حرام رہے۔

ماخذ (اُردو۔۱۵)

مولانا عبدالماجد دریا آبادی اور خود مہدی الافادی خواہ کچھ کہیں' لیکن اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ' فلسفۂ حُسن وعشق' 'بنت عم' یا' عالم خیال' جیسے مضامین میں اگر شاعرانہ بیان کا حسین ولطیف پردہ نہ پڑا ہوتا تو یقیناً انہیں عریاں ادب میں جگہ دی جاتی۔

مہدی الافادی خصوصیت کے ساتھ 'مقیاس الشباب' کے بیان میں وہ جوانانہ خوش فعلیاں کرنے لگتے کہ اس کے آگے شوق کی عریاں نویسی بھی ماند پڑ جاتی ہے۔ رشید احمد صدیقی کی رائے بڑی جچی تلی ہے کہ' شوخی وشرارت سجاد حیدر کے ہاں بھی ہے لیکن شہد پن نام کو نہیں'

ماخذ (اُردو۔۱۸)

چودھری محمد علی ردولوی:

انہوں نے ۱۹۲۶ء میں 'صلاح کار' کے نام سے ایک کتاب لکھی جو اردو میں سائنسی نقطہ نظر سے لکھی جانے والی جنسیات پر پہلی کتاب تھی۔

ماخذ (اُردو ـ ۵۷)

(ب)

مولانا عبدالحلیم شرر:

'دربارِ حرام پور' (۱۸۶۰ـ۱۹۲۶ء)
'حُسن کا ڈاکو' دفترِ 'دلگداز' لکھنو ۱۹۲۵ء وغیرہ

والیٔ ریاست نواب حامد علی خاں بڑے علم دوست اور ادب نواز تھے۔ تاریخِ عالم پر اُن کو بڑا عبور تھا لیکن عیاش طبع ہونے کی وجہ سے اُن کی تمام صلاحیتوں پر پردہ پڑ گیا تھا......

مولانا عبدالحلیم شرر لکھنوی نے اِنھی نواب صاحب کے متعلق دو ناول تصنیف کر کے شائع کرائے۔ ایک 'دربارِ حرام پور' اور دوسرا 'حُسن کا ڈاکو'۔ یہ دونوں ناول بہت مشہور ہوئے۔ اگرچہ ان میں بڑی حد تک افسانہ طرازی اور مبالغہ آرائی سے کام لیا گیا ہے ۔ تاہم کہا جاتا ہے کہ بعض واقعات اصلیت پر مبنی تھے۔

ماخذ (اُردو ـ ۵۵)

یہ ناول ریاست رام پور کے حقیقی واقعات پر مبنی ایک ایسا آئینہ ہے جس میں اس زمانے کی دیسی ریاستوں اور راجواڑوں کی گھناؤنی شکل دیکھی جا سکتی ہے۔ شرر نے حکیم عبدالوالی سے دربار رام پور کے حالات سُنے اور حکیم سراج الحق کا خیال تھا کہ حکیم عبدالوالی ہی کے ایما پر یہ ناول لکھا گیا۔

ماخذ (اُردو ـ ۵۷)

ان ناولوں میں سماجی رسومات کی کافی بازاری طریقے سے ہنسی اڑائی گئی ہے۔ بات ذرا سخت ہے لیکن کہنا ہی پڑتی ہے کہ شرر اخلاقی اور مذہبی جوش کی وجہ سے کبھی کبھی جب کلیساؤں' راہب خانوں یا موجودہ سماج کی برائیوں کا ذکر کرتے ہیں تو ان کی تحریریں فحش نویسی کی حد تک جا پہنچتی ہیں۔

ماخذ (اُردو ـ ۲۷)

ماہرالقادری	انگڑائی (جنسی تصویر اور دوسرے افسانے)	عالمگیر بکڈپو بازار سید مٹھا، لاہور، ۱۹۴۳ء
ماہرالقادری	حُسن وشباب (افسانے)	کتب خانہ تاج آفس، بمبئی
ماہرالقادری	جب میں جوان تھی (ناول)	مست قلندر بکڈپو، لاہور
ماہرالقادری	محبت بھرے خطوط	مست قلندر بکڈپو، لاہور
ایم۔ اسلم	گناہ کی راتیں (ناول)	ملک دین محمد اینڈ سنز، لاہور، ۱۹۵۰ء
رئیس احمد جعفری	رُوسیاہ	تاج آفس، ادبی پریس، کراچی ۱۹۴۹ء اس ناول پر مقدمہ قائم ہوا مگر بعد ازاں اسے خارج کر دیا گیا۔ عریاں حصوں کو حذف کر دینے کے بعد یہ ناول ’رابعہ‘ کے نام سے شائع ہوا
ایم۔ شفیق بریلوی	حادثاتِ شباب (افسانے)	پاکستان اکیڈمی، پوسٹ بکس ۵۵۹، کراچی اکتوبر ۱۹۵۰ء میں کتاب ممنوع قرار دیئے جانے کے بعد ضبط کر لی گئی)

☆ ☆ ☆ ☆ ☆

(بدنام کتابوں کے ترجمے)

’داستان‘	پیری لوئی (مترجم) سید عابد علی عابد	ہاشمی بکڈپو، لاہور، ۱۹۶۰ء
’مادام بواری‘	گستاؤ فلابیر (مترجم) محمد حسن عسکری	
دِلّی	خوش ونت سنگھ (مترجم) یونس حسرت، محسن فارانی	تخلیقات، لاہور

چھٹی فہرست

'مشہور' لکھنے والوں کی 'بدنام' تحریریں

شوکت تھانوی: کہا جاتا ہے کہ وہی وہانوی جیسے پُر اسرار نام کی ایجاد کا سہرا شوکت تھانوی کے سر جاتا ہے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اس نام سے چھپنے والی پہلی سات کتابیں یا تو خود انہوں نے لکھیں یا پھر نسیم انہونوی نے۔ وہ کتابیں یہ ہیں: بھنور، دلدل، شرمناک افسانے، خانگی، گندم، جس نے ڈالی بُری نظر ڈالی، اور رخسار، یہ سب کتابیں نسیم بکڈپو، لکھنؤ نے شائع کیں۔ (مُرتب)

سجاد حیدر یلدرم (‘خارستان وگلستان’)

یہ افسانہ یلدرم کے افسانوی مجموعے 'خیالستان' میں شامل ہے اور اسے سلیم اختر نے اردو کا پہلا جنسی افسانہ قرار دیا ہے جس میں نسوانی ہم جنسیت کو موضوع بنایا گیا ہے۔

ماخذ (اُردو۔۴۳)

☆☆☆☆☆

سید سجاد ظہیر، احمد علی رشید جہاں اور صاحبزادہ محمود الظفر

'انگارے' ۱۹۳۲ء میں نظامی پریس، لکھنؤ سے شائع ہوئی اور اسی سال ضبط کرلی گئی۔ اس مجموعے میں نہ تو کوئی پیش لفظ تھا نہ مقدمہ جس سے اس کی اشاعت کا مقصد واضح ہوتا۔ لیکن کہانیوں کے موضوعات، اپنی تکنیکی مہارت، بیباکانہ تیور، اپنی زبان سے احتجاج اور سرکشی کا اعلان کررہے تھے۔

ان افسانوں میں سب سے تیکھی لہر مذہب کے خلاف تھی اور اسی وجہ سے اس کی سب سے زیادہ مخالفت مذہبی طبقے کی طرف سے ہوئی۔ یہ تیکھی لہر سجاد ظہیر کے افسانوں میں بطور خاص نظر آتی ہے۔ ان کہانیوں کا دوسرا اہم موضوع عورت یا جنس ہے۔ باقی تمام کہانیاں عورت کی مظلومیت، جنس کی شدت، مرد کی حکمرانی اور ہوس پرستی کے گرد گھومتی ہیں۔ 'دلاری'، 'بادل نہیں آئے'، 'دلی کی سیر' اور 'جواں مردی' کا مرکز ومحور عورت ہے۔

ماخذ (اُردو۔۴۴)

۱۹۳۲-۳۳ء میں افسانوں کے مجموعے کی اشاعت سے اردو کی ادبی دنیا میں زلزلہ آ گیا۔ اس مجموعے کے نوجوان مصنفوں کو اس کی دھما چوکڑی کا احساس ہو یا نہ ہو اتنا ضرور معلوم تھا کہ یہ قدامت پرستوں اور روایت پسندوں کے تن بدن میں آگ لگا دے گا' اسی وجہ سے اس کا نام 'انگارے' رکھا۔

(اُردو۔۵۷)

☆☆☆

سعادت حسن منٹو

'کالی شلوار' اور 'دھواں' ۔ یہ دونوں افسانے، ساقی بکڈپو سے ۱۹۴۵ء میں شائع ہونے والی کتاب 'دھواں' میں شامل ہیں۔

'کالی شلوار' اور 'دھواں' ان دنوں لکھے گئے جب منٹو آل انڈیا ریڈیو دہلی میں ملازم تھے۔ دونوں افسانے پہلی بار 'ساقی' دہلی میں شائع ہوئے اور بعد میں 'دھواں' کے نام سے ایک مجموعے میں شائع ہوئے۔

'کالی شلوار' کے سلسلے میں دسمبر ۱۹۴۴ء میں کارروائی شروع ہوئی اور جنوری ۱۹۴۵ء میں منٹو گرفتار ہوئے۔ اس کہانی پر بنوری لال کی عدالت میں مقدمہ چلا۔ پھر سیشن عدالت میں پہنچ کر یہ کہانی فحاشی سے مبرا قرار دے دی گئی۔ مگر جب کچھ عرصہ بعد 'دھواں' شائع ہوئی' جس میں یہ کہانی شامل تھی تو اس کہانی کو بھی تعزیرات ہند دفعہ ۲۹۲ کے تحت مقدمہ میں دوبارہ شامل کرلیا گیا۔

'دھواں' پر ستمبر ۱۹۴۵ء میں حکومت نے لاہور کی ایک عدالت میں مقدمہ چلایا۔ منٹو نے ہاجرہ مسرور کو بھی صفائی کے گواہ کے طور پر بلوالیا۔ اسپیشل مجسٹریٹ رائے صاحب لالہ رام نے 'کالی شلوار' اور 'دھواں' دونوں ہی افسانوں کو فحش قرار دے دیا اور منٹو پر سو روپے جرمانہ کی سزا عائد کی۔ فیصلے کے خلاف سیشن میں اپیل کی گئی جو منظور ہوئی اور جرمانہ واپس کر دیا گیا۔' (مرتب)

دلی آنے کے بعد' منٹو کی افسانہ نگاری کا دور جدید شروع ہوا۔ انہوں نے طبع زاد افسانے اچھوتے انداز میں لکھنے شروع

کئے۔ 'ساقی' کے لئے ہر مہینے ایک افسانہ بغیر مانگے مل جاتا۔ 'دھواں' اسی ریلے میں لکھا گیا اور اس کی اشاعت پر دلی کے پریس ایڈوائزر نے مجھے اپنے دفتر بلوالیا۔ وہ پڑھا لکھا اور بھلا آدمی تھا۔ انگریزی ادبیات میں میرا ہم جماعت رہ چکا تھا۔ بولا 'بھائی، ذرا احتیاط رکھو زمانہ بُرا ہے۔ یہ بات آئی گئی ہوگئی۔ میں نے منٹو سے اس کا ذکر کیا' حسب عادت بہت بگڑا' مگر 'ساقی' کے باب میں کچھ احتیاط برتنے لگا۔

ماخذ (اُردو۔ ۶۳)

یہ افسانہ 'ادب لطیف' لاہور کے ۱۹۴۴ء کے سالنامے میں شائع ہوا۔ رسالے کے مالک چودھری برکت علی اور مدیران' چودھری نذیر احمد اور احمد ندیم قاسمی اور منٹو کے خلاف زیر دفعہ ۲۹۲ تعزیرات ہند اور ۳۸ ڈیفنس آف انڈیا رولز کے تحت مقدمہ قائم ہوا اور ۲۹ مارچ ۱۹۴۴ء کو ایک چھاپے کے دوران رسالے کی ساری کاپیاں ضبط کرلی گئیں۔

مقدمہ لاہور میں بنوری لال کی عدالت میں پیش ہوا' جنہوں نے منٹو کو بری کردیا۔ ان کے تبادلے کے بعد بقیہ سماعت چودھری مہدی علی خاں نے کی۔ اُن کے ۳ مئی ۱۹۴۵ء کے فیصلے کے مطابق احمد ندیم قاسمی بھی بری کردیے گئے۔ لیکن چودھری برادران یعنی برکت علی اور نذیر احمد پر ساٹھ روپے فی کس جرمانہ عائد ہوا۔ عدم ادائیگی کی صورت میں ایک ایک ماہ قید بامشقت کی سزا تجویز ہوئی۔ دونوں نے جرمانہ فوراً ادا کردیا۔ اس سزا کے خلاف اپیل' ایڈیشنل سیشن جج جناب ایم' آر بھاٹیہ کی عدالت میں پیش کی گئی۔

(مُرتب)

دھواں/ بلاؤز ان دونوں کہانیوں کا موضوع' نوخیزوں میں جنسی بیداری اور لذت آشنائی ہے۔

کھول دو 'نقوش' لاہور شمارہ ۳۰۔ ۱۹۴۸ء

اس افسانہ کی اشاعت پر' امن عامہ کے منافی مواد چھاپنے کے الزام میں' سزا کے طور پر رسالہ کی اشاعت پر چھ ماہ کی مدت

کے لیے پابندی عائد کردی گئی۔

پھاہا

یہ منٹو کی سب سے زیادہ گھن پیدا کرنے والی کہانی ہے

ننگی آوازیں

اوپر، نیچے اور درمیان

گوشۂ ادب' لاہور، ۱۹۵۴ء

یہ کہانی پہلی بار ۳ فروری ۱۹۵۴ء میں 'احسان' لاہور میں شائع ہوئی۔ جسے 'پیامِ مشرق' کراچی نے منٹو کی اجازت کے بغیر ۱۹۵۴ء میں شائع کردیا جس پر کراچی ہی میں مقدمہ قائم ہوا۔ خالد حسن کے بقول 'یہ افسانہ 'المنتظر' والے میاں بشیر احمد اور ان کے طبقے پر ایک بھرپور طنز ہے۔ ویسے تو اس افسانہ میں فعل جنسی کی مبادیات اور پس منظر کا تذکرہ ہے اور سماج کے تین مختلف طبقوں میں یہ امور کتنے مختلف ہوتے ہیں' اُس کی تفصیل ہے۔

منٹو پر چلنے والا یہ آخری مقدمہ کراچی میں 'مہدی علی صدیقی کی عدالت میں پیش ہوا۔ اس مقدمہ میں نہ تو کسی وکیل کی خدمات حاصل کی گئیں اور نہ تو منٹو نے اپنی صفائی میں کچھ کہا بلکہ پہلی پیشی پر ہی اقبالِ جُرم کرلیا۔ عدالت نے پچیس روپے جرمانہ کی سزا سنائی جو بحال رہی کیونکہ بقولِ منٹو اپیل وپیل کا جھنجھٹ ہی غلط تھا' کب تک عدالتوں کی ٹھوکریں کھاتے رہتے!' (مرتّب)

مُنٹو کی بدنام کہانیوں کے اقتباسات'

ڈاکٹر اطہر پرویز' ماہِ نو' نومبر ۱۹۷۷ء

پنجاب کی حکومت کے ایما پر مقدمہ قائم ہوا مگر معاملہ صرف تنبیہ پر رفع دفع ہوگیا۔ اس وقت پرچہ کی مدیرہ کشور ناہید تھیں۔

شکاری عورتیں

رام نگر بک ڈپو' گاندھی نگر' دہلی، (یہ کتاب کسٹم کی ممنوعہ لسٹ پر ہے)

☆☆☆☆☆

عصمت چغتائی

'چوٹیں' ساقی بکڈپو' دہلی' ۱۹۴۲ء

'لحاف' کا موضوع نسوانی ہم جنسیت ہے۔ دسمبر ۱۹۴۴ء میں اس کہانی پر مقدمہ قائم ہوا۔ اوائل ۱۹۴۵ء میں عصمت گرفتار ہوئیں اور پھر ضمانت پر رہا ہوئیں۔

یہ مقدمہ بھی اسپیشل مجسٹریٹ رائے بہادر لالہ سنت رام کی عدالت میں پیش ہوا جس میں 'کالی شلوار' اور 'دھواں' پر مقدمات زیرِ سماعت تھے۔

۲ر فروری ۱۹۴۵ء کو جارج ششم بمقابلہ عصمت چغتائی کی سماعت شروع ہوئی۔ مسٹر ہیرا لال جو منٹو کے وکیل صفائی تھے عصمت کے بھی وکیل بنے۔ ۱۹۴۶ء تک پیشیاں ہوتی رہیں' بعد میں مقدمہ خارج کر دیا گیا اس لئے کہ الزام ثابت نہیں ہو سکا۔

ماخذ (اُردو۔۶۳)

حسن عابدی کے بقول' عصمت کی ان دو کہانیوں' لحاف' اور 'تل' نے روایتی اخلاق اور مُسلّمہ ادبی روایات کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔

خود عصمت کے بقول' یہ کہانی ('لحاف') اس وقت چھپی جب وہ اور شاہد لطیف شادی کے بارے میں سوچ رہے تھے۔ شادی تو ہو گئی' مگر کہانی کی اشاعت کے بعد عصمت کو بے شمار گندے خط لکھے گئے اور ان کے خلاف اتنا بڑا طوفان کھڑا کیا گیا کہ شاہد نے انہیں طلاق کی دھمکیاں دینا شروع کر دیں مگر بقول عصمت، میں نے اسے اپنی غلطی ماننے سے صاف انکار کر دیا'

عصمت کے مطابق' اشاعت سے پہلے میں نے اپنی بھابھی کو بھی یہ کہانی پڑھ کر سنائی تھی۔ انہیں تو اس میں کوئی گندگی نظر نہیں آئی بلکہ وہ کہانی کے کردار کو بھی پہچان گئیں۔ میں نے یہی کہانی' اپنے ایک رشتے دار کی چودہ سالہ لڑکی کو بھی پڑھ کر سنائی تھی مگر وہ بیچاری تو کچھ سمجھی ہی نہیں'

محمد حسن عسکری

•پھسلن' 'حرامجادی'

یہ افسانہ 'جزیرے' میں شامل ہے۔ پہلی بار اپریل ۱۹۴۱ء میں شائع ہوا۔ کہانی کا موضوع ہم جنسیت ہے۔

عسکری کی بدنام کہانی 'حرامجادی' 'ادبی دنیا' کے سالنامے ۱۹۴۱ء میں شائع ہوئی۔

☆☆☆☆☆

ممتاز مفتی	غسلِ آفتابی	'ان کہی' مکتبۂ اردو' لاہور ۱۹۷۵ء
ہاجرہ مسرور	'ہائے اللہ'	'ہائے اللہ' نیا ادارہ' لاہور ۱۹۴۳ء
ہاجرہ مسرور	'ننھے میاں'	'ہائے اللہ' نیا ادارہ' لاہور ۱۹۴۳ء
آغا بابر	'باجی ولایت'	'نیا دور' کراچی' ۲۱/۲۲' خاص نمبر
آغا بابر	خالہ تاج	'سیپ' کراچی' شمارہ ۱۲ خاص نمبر ۱۹۶۸ء، 'رسالے کے اس شمارے کی تمام کاپیاں ضبط کر لی گئیں
اوپندر ناتھ اشک	'اُبال'	'ساقی' دہلی
اے۔ حمید	'دوسری ملاقات' ماہِ نو' کراچی' استقلال نمبر ۱۹۵۲ء	

اس کہانی کو عریاں قرار دیا گیا۔ اس استغاثہ کی دلچسپ بات یہ تھی کہ اس میں حکومت مدعی بھی تھی اور مدعا علیہ بھی۔

شفیع عقیل	'بھوکے'	مکتبہ کائنات' سولجر بازار' لاہور م ۱۹۵۳؟

مقدمہ کی بنیاد پر' شفیع عقیل کو انسپکٹر کنور یونس علی خاں نے کراچی میں گرفتار کیا۔ ۱۹۵۲ء میں یہ مقدمہ لاہور کی ایک لیڈی مجسٹریٹ کے سامنے پیش ہوا جس میں سعادت حسن منٹو' مولانا عبدالمجید سالک اور شورش کاشمیری بطور گواہان صفائی پیش ہوئے۔ اسلم حیات وکیل صفائی تھے۔ لیڈی مجسٹریٹ فرسٹ کلاس' ثریا صاحبہ نے اپنے خصوصی اختیارات کے تحت' ایک ہزار روپے جرمانہ اور چھ ماہ قید بامشقت کی سزا سنائی۔ اپیل کے بعد قید معاف کر دی گئی اور جرمانہ بھی بہت کم رہ گیا جو ادا کر دیا گیا۔

رفیق چودھری	'بھٹکتی جوانیاں، یہ کتاب خود مصنف نے چھاپی تھی،

افسانوں کے اس مجموعے پر مقدمہ قائم ہوا۔ اور مصنف چودھری نرسریز، سولجر بازار سے گرفتار ہوا اور دو دن بعد کراچی جیل سے ضمانت پر رہائی ہوئی۔ کتاب ضبط کر لی گئی۔

انتصار حسین	'اللہ کے نام پر'	ادارۂ فروغ اردو' لاہور

اس ناول پر مقدمہ قائم ہوا مگر پھر بری کر دیا گیا اور اسی کو 'سائبان کے نیچے' کے عنوان سے اسٹیج پر پیش کیا گیا۔

انتصار حسین ڈھلتی شام تاج آفس، کراچی

اس ناول پر بھی مقدمہ قائم ہوا مگر بری قرار دیا گیا اور اس کا شمار ۱۹۵۱ء کے بہترین ادب، میں ہوا۔

عابدی جعفر ‘بدکارہ’ مکتبۂ جنسیات، کراچی، ۱۹۵۹ء

کتاب پر مقدمہ، مہدی علی صدیقی کی عدالت میں پیش ہوا اور اس پر ۲۰۰ روپے جرمانہ عائد کیا گیا، مگر اس جرمانے کے خلاف کوئی اپیل نہیں کی گئی۔ عابدی جعفر کا دعویٰ تھا کہ یہ ایک سچی کہانی ہے۔

عبداللہ حسین ‘اُداس نسلیں’

جب اس ناول کو ایوارڈ ملنے کی خبر اخبارات میں شائع ہوئی تو مجھے (یعنی قدرت اللہ شہاب کو) نواب کالا باغ کا ٹیلی فون آیا۔ وہ کہہ رہا تھا کہ یہ کس ناول کو ایوارڈ دلوا دیا! ہم تو اس پر مقدمہ چلانے والے تھے، یہ کتاب نہیں، کنجر خانہ ہے، بالکل واہیات ہے، اب صدر ایوب نے اسے ایوارڈ دے دیا، ہم اس پر مقدمہ کیسے چلائیں!

ماخذ (اُردو۔ ٦٥)

ساتویں فہرست

خواتین کے پر کشش ناموں سے لکھنے والے

اصل نام	فرضی نام	عنوان	
فضل حق قریشی	'طاہرہ دیوی شیرازی'	'دخترِ کفش دوز'	سحر بنگال' ساقی بک ڈپو' دہلی ۱۹۳۶ء
نیاز فتح پوری اور دیگر حضرات	'قمر زمانی بیگم'	خطوط بنام شاہ دلگیر اکر آبادی	'قمر زمانی بیگم' مرتبہ ڈاکٹر فرمان فتح پوری' اردو اکیڈمی' کراچی' لاہور ۱۹۷۵ء
انور عنایت اللہ' اصغر بٹ	'شاہینہ بیگم'	ناگ اور نگینہ (جاسوسی ادب)	کتاب کا پیش لفظ شاہد احمد دہلوی نے لکھا اور سرورق صادقین نے بنایا ہے۔
؟	'عذرا ساگر'		چند برس قبل 'سیپ' میں اس نام سے راتوں کی نیند اڑا دینے والی چند نظمیں شائع ہوئیں۔ اس کے بعد ان 'خاتون' کی تصویر بھی شائع کی گئی جس نے عوام کی بے چینی میں اضافہ کر دیا۔ پھر اچانک یہ سلسلہ منقطع ہو گیا۔ خواتین کی طرف سے 'عذرا ساگر' کو پہلی باقاعدہ فحش نگار شاعرہ کا خطاب دیا جا سکتا ہے'

ماخذ (اُردو ـ ۱۰۳)

آٹھویں فہرست

خودنوشتیں/خطوط

محل خانہ شاہی عرف پری خانہ	واجد علی شاہ اختر ۱۲۷۵ء	مکتبۂ راہی، کراچی ۱۹۷۰ء
'یادوں کی بارات'	جوش ملیح آبادی	مکتبۂ شعر و ادب، لاہور، اضافہ شدہ ایڈیشن، مئی ۱۹۷۵ء خوش ونت سنگھ نے 'السٹریٹڈ ویکلی آف انڈیا' میں اس کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا کہ 'جوش فرینک ہیرس سے بھی کہیں بڑے دروغ گو ہیں، اس لئے اس سے بڑے فنکار بھی'
علی پور کا ایلی الکھ نگری (حصہ دوم)	ممتاز مفتی	'علی پور کا ایلی' میں ممتاز مفتی نے اخفا سے کام لیا ہے مگر اخفا کے پردے میں انہوں نے مبالغہ آرائی بھی خوب کی ہے۔ اس مبالغے کے پیچھے، فکشن رائٹر اور افسانہ نگار ممتاز مفتی چھپا ہوا ہے' ماخذ (اُردو۔۳۵)
خطوط جوش	مرتب: راغب مرادآبادی	ویلکم بک پورٹ (پرائیوٹ لمیٹڈ) مین اردو بازار، کراچی ۱۹۹۳ء اس کتاب میں جوش کے لکھے ہوئے سو (۱۰۰) سے زائد اہم خطوط شامل ہیں جو انہوں نے ابوالکلام آزاد سمیت کئی اوروں کے نام لکھے۔ ان میں کمن عرف 'فتنۂ آخری الزماں' کے نام بھی خطوط شامل ہیں جو پیرانہ سالی میں جوش کے انیسویں معاشقے کے دستاویزی ثبوت کے طور پر پیش کیے گئے ہیں۔ سینما اور ٹیلی ویژن پر کسی منظر کا فیڈ آؤٹ اور کتاب میں الفاظ کی بجائے 'ستارے' یا خالی جگہیں

نظر آنا' بلیو پینسل کے استعمال کی غمازی کرتے ہیں۔ اور اس کتاب میں بھی اکثر مقامات پر 'ستارے' لگتے نظر آتے ہیں مگر تمام تر احتیاط کے باوجود کتاب میں ایک سے زائد جگہوں پر اُردو کے تین ممنوعہ الفاظ چھپ گئے ہیں۔ ڈاکٹر محمد علی صدیقی نے اس کتاب کے شروع میں لکھا ہے کہ: 'زیرِ نظر خطوطِ جوشؔ میں تو بعض ایسے مقامات بھی آئے ہیں کہ ان خطوط کو شرطیہ طور پر تنہائی میں پڑھا جا رہا ہو تو بھی نگاہِ احتیاط دفعتاً اِدھر اُدھر گھوم جاتی ہے کہ مبادہ......!

(مرتب)

بُری عورت کی کتھا	کشور ناہید، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۷
آپ بیتی/ پاپ بیتی	ساقی فاروقی، اکادمی بازیافت، کراچی، ۲۰۰۸

rekhta

نویں فہرست

ناحق بدنام کتابیں

'عورت' نفسیات کے آئینے میں'	(مترجم) کشور ناہید	وین گارڈ ایلائیڈ پریس' لاہور مارچ ۱۹۸۳ء یہ کتاب سیمون دی بوار کی 'سیکنڈ سیکس' کا تلخیص و ترجمہ ہے۔ اگست ۱۹۸۳ء میں حکومتِ پنجاب نے اس پر پابندی لگادی تھی۔
'اُس بازار میں'	شورش کاشمیری	چٹان پرنٹنگ پریس' لاہور' مئی ۱۹۹۴ء اس کتاب میں شورش نے کوئی چھ سو کے قریب عورتوں سے ان کی فحش کاری کے اسباب کی چھان پھٹک کرنے کے علاوہ' عصمت فروشی کی مختصر تاریخ بھی بیان کی ہے (مرتب)
نوجوانوں کے جنسی مسائل	ڈاکٹر مبین اختر	یہ پمفلٹ ماہنامہ 'کراچی نفسیات ہسپتال بلیٹن' مارچ، اپریل ۱۹۸۴ء کی اشاعت کے ساتھ شائع ہوا۔ اس میں شامل کچھ خاکوں پر 'غیر سرکاری' طور پر اعتراضات ہوئے۔ پھر اس کی اشاعتی خلل کو بہانہ بنا کر حکومت سندھ نے پریس اینڈ پبلی کیشنز آرڈی نینس ۱۹۶۳ء کی دفعہ ۹ (۳) (۴۰) کے تحت '۵ فروری ۱۹۸۷ء کو پرچے کا ڈیکلریشن معطل کر دیا جو بعد میں حکومت کی تبدیلی کے ساتھ ہی بحال ہو گیا۔ (مرتب)

مآخذ (اُردو)

(۱) مقدمۂ شعروشاعری	الطاف حسین حالیؔ	انوار المطابع، لکھنو
(۲) شعرالعجم (حصہ اوّل)	شبلی نعمانی	معارف پریس، اعظم گڑھ (طبع دوم) ہجری ۱۳۳۱ء
(۳) شعرالعجم (حصہ دوم)	شبلی نعمانی	الناظر پریس، لکھنؤ، ۱۹۳۵ء
(۴) اُردو شاعری پر ایک نظر	کلیم الدین احمد	اُردو مرکز، پٹنہ، ۱۹۵۲ء (طبع دوم)
(۵) احوالِ غالبؔ	مختار الدین	انجمن ترقی اردو علی گڑھ، ۱۹۵۳ء
(۶) زٹل نامہ	مرتب، رشید حسن خاں	انجمن ترقی اردو، ہند دہلی، ۲۰۰۳ء
(۷) تذکرۂ شوقؔ	عطاؤ اللہ پالوی	مکتبۂ جدید، لاہور ۱۹۵۶
(۸) حسرتؔ	عبدالشکور (ایم اے علیگ)	شاہ اینڈ کمپنی، آگرہ، ۱۹۳۶ء
(۹) میری بہترین نظم	مرتب، محمد حسن عسکری	کتابستان، الہ آباد، ۱۹۴۳
(۱۰) انتخاب شعرائے بدنام	جلیل قدوائی	اردو اکیڈیمی سندھ، کراچی، ۱۹۶۵
(۱۱) لا: انسان	ن م راشد	مکتبۂ اُردو، لاہور، ۱۹۴۱
(۱۲) کوہ ندا	مصطفےٰ زیدی	
(۱۳) بدن دریدہ	فہمیدہ ریاض	مکتبۂ دانیال، کراچی، ۱۹۷۴
(۱۴) شاخِ حنا	نجمہ عثمان	دبستان خواتین، کراچی، جون ۱۹۸۹
(۱۵) افاداتِ مہدی	ایم مہدی حسن عرف 'افادی الاقتصادی' مرتب، مہدی بیگم	شیخ مبارک علی، لاہور، ۱۹۴۹ (طبع چہارم)
(۱۶) انگیں	عطاؤ اللہ پالوی	نرائن دت سہگل، لاہور، مئی ۱۹۴۴
(۱۷) پروین	عطاؤ اللہ پالوی	نرائن دت سہگل، لاہور، ۱۹۴۴
(۱۸) محشرِ خیال	سجادؔ علی انصاری	آئینۂ ادب، چوک مینار انارکلی، لاہور، ۱۹۷۱

(۱۹) انتقادیات (حصہ اوّل)	نیاز فتح پوری	عبدالحق اکیڈمی، حیدرآباد دکن، دسمبر ۱۹۴۴
(۲۰) مقالاتِ تاثیر	دین محمد تاثیر	مجلس ترقی اردو، لاہور، جون ۱۹۷۸
(۲۱) مقالاتِ راشد	ن م راشد مرتب: شیما مجید	الحمرا پبلشنگ، اسلام آباد، ستمبر ۲۰۰۲
(۲۲) تحقیق کی روشنی میں	عندلیب شادانی	مکتبۂ علم وفن، دہلی، اپریل ۱۹۶۵
(۲۳) تنقید کیا ہے!	آل احمد سرور	کتابی دنیا، لمیٹڈ، دہلی، ۱۹۴۷
(۲۴) روایت اور بغاوت	سید احتشام حسین	ادارہ فروغ اُردو، لکھنؤ، ۱۹۵۶ء، (طبع دوم)
(۲۵) جھلکیاں (حصہ اوّل)	محمد حسن عسکری مرتبین: سہیل عمر/ نغمانہ عمر	مکتبۂ الروایت، لاہور، ۱۹۸۱ء
(۲۶) تنقیدی رس	ممتاز حسین	اُردو اکیڈمی سندھ، کراچی، ۱۹۵۷
(۲۷) میزان	فیض احمد فیض	ناشرین، لاہور، فروری ۱۹۶۲ء
(۲۸) معیار	ممتاز شریں	نیا ادارہ، لاہور، ۱۹۶۳ء
(۲۹) تنقید اور مجلسی تنقید	وزیر آغا	مکتبۂ اُردو زبان، سرگودھا، جنوری ۱۹۷۶
(۳۰) تنقید نما (فرمان فتح پوری کے دیباچے)	مرتب: سید محمد اصغر کاظمی	فرید پبلشرز، اردو بازار، کراچی، ستمبر ۲۰۰۱ء
(۳۱) روایت ۳ (بیادِ سلیم)	مرتبین: سہیل عمر، جمال پانی پتی	سہیل اکیڈمی، کراچی، ۱۹۸۶ء
(۳۲) کاوشیں	یونس حسنی	زباب پبلیکشنز، دہلی کالونی ۲، کراچی، ۱۹۹۲
(۳۳) ادب اور لاشعور	سلیم اختر	مکتبۂ عالیہ، لاہور، ۱۹۷۶ء
(۳۴) ادب اور سماجی عمل	اے بی اشرف	کاروان ادب، ملتان، ۱۹۸۰ء
(۳۵) جدیدیت اور پس جدیدیت	ناصر عباس نیر	کاروان ادب، ملتان، دسمبر ۲۰۰۰
(۳۶) اُردو کی نثری داستانیں	ڈاکٹر گیان چند جین	انجمن ترقی اُردو (پاکستان)، کراچی، ۱۹۵۴ء
(۳۷) فکشن، فن اور فلسفہ	ڈی۔ ایچ لارنس (ترجمہ) مظفر علی سید	مکتبۂ اسلوب، کراچی نمبر ۱۸، ۱۹۸۶ء

(۳۸) روشنائی	سید سجاد ظہیر	مکتبۂ اردو، لاہور، نومبر ۱۹۵۶ء
(۳۹) ترقی پسند ادب	سردار جعفری	انجمن ترقی ہند، علیگڑھ ۱۹۵۱ء
(۴۰) ترقی پسند ادب	عزیز احمد	ادارۂ اشاعتِ اردو، حیدر آباد (دکن)، مارچ ۱۹۴۵ء
(۴۱) پودے (رپورتاژ)	کرشن چندر	سنگم پبلشرز، لاہور، جولائی ۱۹۷۳ء
(۴۲) نیا ادب میری نظر میں	مرتب، آغا سرخوش دہلوی	ہندوستان پبلیشرز، دلّی، ۱۹۴۴ء
(۴۳) انگارے	خالد علوی	ایجوکیشنل پبلی کیشن ہاؤس، لال کنواں، دہلی، ۱۹۵۵ء
(۴۴) بیدار شعاعیں	شاہد نقوی	ارتقا مطبوعات، گلشن اقبال، کراچی، اکتوبر ۲۰۰۲ء
(۴۵) ٹھنڈا گوشت	سعادت حسن منٹو	نیا ادارہ لاہور ۱۹۵۰ء
(۴۶) لذتِ سنگ	سعادت حسن منٹو	نیا ادارہ، لاہور، ۱۹۵۰ء
(۴۷) جزیرے	محمد حسن عسکری	ساقی بکڈپو، دہلی، ۱۹۴۳ء
(۴۸) گہما گہمی	ممتاز مفتی	لاہور، ۱۹۴۵
(۴۹) شہرِ ممنوع	واجدہ تبسم	نیا ادارہ، لاہور، ۱۹۷۵ء
(۵۰) اُترن	واجدہ تبسم	محمود پبلیکیشنز، اردو بازار، لاہور، اگست ۱۹۷۷ء
(۵۱) حادثاتِ شباب	ایم شفیق بریلوی	ناشر: پاکستان اکیڈمی، عباس لیتھو آرٹ پریس کراچی، ۱۹۵۰
(۵۲) جسمانے	(ترتیب) خالد ارمان	نگارشات، میاں چیمبرز، ٹیمپل روڈ، لاہور ۲۰۰۲
(۵۳) جہانِ جاوید	جسٹس (ریٹائرڈ) ڈاکٹر جاوید اقبال	سنگ میل پبلیکیشنز، لاہور ۲۰۰۳
(۵۴) یادوں کی بارات (اضافہ شدہ ایڈیشن)	جوش ملیح آبادی	مکتبہ شعر و ادب، لاہور، مئی ۱۹۷۵
(۵۵) عشرتِ فانی	عشرت رحمانی	سنگ میل پبلیکیشنز، لاہور، ۱۹۸۵

(۵۶) رسیدی ٹکٹ	امرتا پریتم	مکتبہ شعر و ادب، سمن آباد، لاہور
(۵۷) منزلیں گرد کے مانند...	خلیق ابراہیم خلیق	فضلی سنز، اردو بازار، کراچی، اگست ۱۹۹۹
(۵۸) خطوط جوش	مرتب، راغب مراد آبادی	ویلکم بک پورٹ، اردو بازار، کراچی، اگست ۱۹۹۳ء
(۵۹) منٹو: میرا دشمن	اوپندر ناتھ اشک	الہ آباد، ۱۹۷۶ء
(۶۰) کرشن بھی مر گیا	محمد حسن	۸۳ شرف آباد، کراچی ۵، ۱۹۸۵ء
(۶۱) شبلی نقادوں کی نظر میں	مرتب، محمد واصل عثمانی	صفیہ اکیڈمی، ۶۱۳ پی آئی بی کالونی، کراچی ۵، نومبر ۱۹۶۷
(۶۲) شیش محل	شوکت تھانوی	اردو بک اسٹال، لوہاری دروازہ، لاہور، ۱۹۴۷ (بار ششم)، جون ۱۹۵۴
(۶۳) گنجینۂ گوہر	شاہد احمد دہلوی	مکتبۂ نیا دور، کراچی، ۱۹۶۲ء
(۶۴) نایاب ہیں ہم	صادق الخیری	شہباز بک کلب، نوید پرنٹنگ پریس، ناظم آباد، کراچی، جون ۱۹۸۳
(۶۵) یہ صورت گر کچھ خوابوں کے	طاہر مسعود	اکادمی بازیافت، کراچی، ۲۰۰۷
(۶۶) مجنوں کی ڈائری	قاضی عبدالغفار	اردو اکیڈمی، لاہور، ۱۹۴۹ء
(۶۷) لیلیٰ کے خطوط	قاضی عبدالغفار	آئینہ ادب، انارکلی، لاہور، ۱۹۷۱
(۶۸) اُس بازار میں	شورش کاشمیری	مطبوعات چٹان، میکلوروڈ، لاہور، مئی ۱۹۹۴ء
(۶۹) جنسیات	رئیس امروہوی	فرید پبلشرز، اردو بازار، کراچی، ۲۰۰۳ء
(۷۰) جنسیاتی مطالعے	علی عباس جلالپوری	تخلیقات، علی پلازہ، ۳ مزنگ روڈ، لاہور، فروری ۲۰۰۳ء
(۷۱) موجودہ معاشرہ اور برہنہ فلمیں	حسن منظر	تقسیم کار، فضلی سنز، اردو بازار، کراچی، ۱۹۸۸ء

(۷۲) گزشتہ لکھنؤ	عبدالحلیم شرر	ناشر عزیز الرحمٰن نے یونائیٹڈ انڈیا پریس، لکھنؤ سے چھپوا کر نسیم بکڈپو سے شائع کیا۔ ۱۹۱۰؟
(۷۳) (مغربی) پاکستان میں عورتیں کیا پڑھتی ہیں!	مولانا صلاح الدین احمد	قومی کتاب مرکز، کراچی، نومبر ۱۹۶۴ء
(۷۴) انتخاب زندگی (ایک مکالمہ)	آرنلڈ ٹائن بی/ دیسا کو اکیدا (ترجمہ، ڈاکٹر منظور احمد)	آکسفورڈ یونیورسٹی پریس، ۱۹۹۳ء
(۷۵) پردہ	ابوالاعلیٰ مودودی	چین اسلامک پبلیشرز، لاہور ۱۹۷۴ء
(۷۶) مولوی کا غلط مذہب	علامہ المشرقی	'التذکرہ' مشرقی ہاؤس، لاہور، اکتوبر ۱۹۷۹ء
(۷۷) حلال و حرام	عطاء اللہ پالوی	مکتبۂ جدید، لاہور ۱۹۶۰
(۷۸) انٹرنیٹ اور ہمارا معاشرہ	ریحان احمد یوسفی	دانش سرا، بہادر آباد چورنگی، کراچی

☆☆☆☆☆

(۷۹) نگار (لکھنؤ)	جنوری ۱۹۴۰ء (نظیر نمبر)
(۸۰) نگار (لکھنؤ)	ستمبر ۱۹۳۶ء
(۸۱) نگار (کراچی)	۱۹۶۷ (اصناف سخن نمبر)
(۸۲) ادب لطیف (لاہور)	فروری ۱۹۴۴ء (سالنامہ)
(۸۳) ادب لطیف (لاہور)	فروری ۱۹۹۴ء
(۸۴) نقوش (لاہور)	مارچ ۱۹۵۵ء
(۸۵) افکار (کراچی)	اگست ۱۹۸۹ء
(۸۶) طلوع افکار (کراچی)	دسمبر ۱۹۶۵ء (ادب و جنس نمبر)
(۸۷) سیپ (کراچی)	شمارہ ۱۳
(۸۸) ارتقا (کراچی)	جنوری تا مارچ ۲۰۰۳ (شمارہ ۳۴)
(۸۹) انشاء (کراچی)	جولائی ۱۹۶۰ء (جلد ۴ شمارہ ۷
(۹۰) عالمی ڈائجسٹ (کراچی)	اکتوبر ۱۹۷۱ء

(۹۱) عالمی ڈائجسٹ (کراچی)	مارچ ۱۹۷۲ء
(۹۲) قند (پشاور)	شمارہ ۱۴/۱۵، ۱۹۶۳ (ڈراما نمبر)
(۹۳) خیالات (لاہور)	جلد ۱، شمارہ ۱۶، ۲۹ جون؟ (ممنوعہ کتب نمبر)
(۹۴) کتاب (لاہور)	مئی ۱۹۷۴ء
(۹۵) کتاب (لاہور)	جون ۱۹۷۴ء
(۹۶) ناول سیریز (کراچی)	مارچ ۱۹۷۶ء
(۹۷) نئی نسلیں (کراچی)	نومبر ۱۹۷۸ء
(۹۸) معیار (کراچی)	۱۲ جون ۱۹۷۶ء
(۹۹) معیار (کراچی)	جلد ۷، شمارہ ۴۵/۴۶ (دسمبر کا پہلا شمارہ)
(۱۰۰) دھنک (لاہور)	جنوری ۱۹۷۳ء
(۱۰۱) دھنک (لاہور)	فروری/مارچ ۱۹۷۴ء
(۱۰۲) دھنک (لاہور)	فروری ۱۹۷۶ء
(۱۰۳) دھنک (لاہور)	مارچ ۱۹۷۶ء
(۱۰۴) دھنک (لاہور)	جولائی/اگست ۱۹۷۶ء
(۱۰۵) ملن (لاہور)	اکتوبر ۱۹۷۵ء
(۱۰۶) پکار (لائل پور)	فروری ۱۹۷۶ء
(۱۰۷) عکس (ملتان)	اپریل ۱۹۷۶ء
(۱۰۸) شالیمار (لاہور)	جنوری ۱۹۷۵ء
(۱۰۹) عقاب (کراچی)	نومبر ۱۹۷۸ء
(۱۱۰) نگار (کراچی)	۷ فروری ۲۰۰۳ء
(۱۱۱) تصویر (۷) (پاکستان)	۱۷ مئی ۱۹۹۶ء

(۱۱۲) پاکیزہ ڈائجسٹ (کراچی)	سالگرہ نمبر ۱۹۷۸ء
(۱۱۳) پاکیزہ ڈائجسٹ (کراچی)	اپریل ۱۹۷۸ء
(۱۱۴) دوشیزہ ڈائجسٹ (کراچی)	ستمبر ۱۹۷۸ء
(۱۱۵) دوشیزہ ڈائجسٹ (کراچی)	نومبر ۱۹۷۸ء
(۱۱۶) اخبار خواتین (کراچی)	۵؍فروری ۱۹۷۷ء
(۱۱۷) اخبار خواتین (کراچی)	۹؍جولائی ۱۹۷۷ء
(۱۱۸) اخبار خواتین (کراچی)	۳؍دسمبر ۱۹۷۷ء
(۱۱۹) اخبار خواتین (کراچی)	۲۲؍دسمبر ۱۹۷۷ء
(۱۲۰) اخبار خواتین (کراچی)	۱۹؍اگست ۱۹۷۸ء
(۱۲۱) اخبار خواتین (کراچی)	۱۰؍فروری ۱۹۷۹ء
(۱۲۲) اخبار خواتین (کراچی)	۵؍مئی ۱۹۷۹ء
(۱۲۳) اخبار خواتین (کراچی)	۱۶؍جون ۱۹۷۹ء
(۱۲۴) اخبار خواتین (کراچی)	۴؍اگست ۱۹۷۹ء
(۱۲۵) حور (لاہور)	۱۲؍دسمبر ۱۹۸۱ء (جلد ۳۲، شمارہ ۱۶)
(۱۲۶) العلم (کراچی)	اپریل تا جون ۱۹۶۶ء
(۱۲۷) طلوع اسلام (کراچی)	اکتوبر ۱۹۶۶ء
(۱۲۸) دستاویز (راولپنڈی)	دسمبر ۱۹۸۵ء
(۱۲۹) ساحل (کراچی)	ستمبر ۱۹۹۹ء (جلد ۱۱، شمارہ ۹)
(۱۳۰) اشراق (کراچی)	مارچ ۲۰۰۶
(۱۳۱) کراچی سائیکیاٹرک اسپتال بلیٹن	اکتوبر ۱۹۸۹ء
(۱۳۲) جنگ (کراچی)	۴؍جون ۱۹۷۶ء (فلم ایڈیشن)

(۱۳۳) جنگ (کراچی)	۲۰ر اکتوبر ۱۹۷۷ء (فلم ایڈیشن)
(۱۳۴) جنگ (کراچی)	۲۶ر فروری ۱۹۷۹ء (ادبی صفحہ)
(۱۳۵) جنگ (کراچی)	۱۷ر اپریل ۱۹۸۱
(۱۳۶) جنگ (کراچی)	۱۱ر دسمبر ۱۹۸۸ء
(۱۳۷) جنگ (کراچی)	۳ر مارچ ۱۹۹۰ء
(۱۳۸) جنگ (کراچی)	۲ر اکتوبر ۲۰۰۵ء
(۱۳۹) جنگ (کراچی)	۱۹ر دسمبر ۲۰۰۶ء
(۱۴۰) مشرق (کراچی)	۲۱ر جولائی ۱۹۷۸ء
(۱۴۱) مشرق (کراچی)	۲۵ر جولائی ۱۹۸۰ء

rekhta

مآخذ (انگریزی)

1. Bertrand Russell Speaks His Mind
   Bard Books, Eighth Avenue, New York, N.Y. 1960
2. Why I Am Not a Christian By Bertrand Russell
   George Allen & Unwin, London, 1976
3. On Life and Sex By Havelock Ellis
   Signet Books, the New American Library Inc, New york, 1957
4. An Essay on Liberation By Herbert Marcuse
   Penguin Books, London, 1972.
5. Philosophy: Who Needs It By Ayn Rand
   A Signet Book, New York, 1984
6. 'to deprave & corrupt...' edited by John Chandos
   Souvenir Press,London, 1962.
7. Breaking the Curfew: a political journey through Pakistan by
   Emma Duncan, Arrow Books, London, 1989
8. *Shikwa & Jawab-i-Shikwa* translated by Khushwant Singh
   Oxford University Press, 1981

☆☆☆☆☆

9. The Hearld(Karachi) August 1973
10. The Hearld(Karachi) February 1982
11. The Hearld(Karachi) April, 1985
12. The Hearld(Karachi) May, 1988
13. The Hearld(Karachi) January 1997
14. The Hearld(Karachi) May 2005

15. Friday Times (Lahore) March 22-28, 2002
16. Friday Times (Lahore) October 17-23, 2003
17. Friday Times (Lahore) March 11-17, 2005
18. Friday Times (Lahore) May 3-10, 2005
19. Friday Times (Lahore) August 10-17, 2005
20. Friday Times (Lahore) November 17-23, 2006
21. The Choice (Karachi) January, 1988
22. The Choice (Karachi) March, 1992

23.	The Illustrated Weekly of India	February 5, 1961
24.	Filmfare (Karachi)	April, 1976
25.	Dawn (Karachi)	June 15,1990
26.	Dawn (Karachi)	August 26,1994
27.	Daily Times (Lahore)	June, 9-15, 2002
28.	Daily Times (Karachi)	December 28, 2004
29.	Daily Times (Karachi)	May 3, 2005
30.	Daily Times (Karachi)	August 10, 2005
31.	Daily Times (Karachi)	September 20, 2005
32.	The News (Karachi)	August 20, 1991
33.	The News (Karachi)	April 21, 2000
34.	Teh Nation (Karachi)	March 23, 1993
35.	The Nation (Karachi)	March 23, 1993
36.	The Nation (Karachi)	October 16, 2000
37.	The Nation (Karachi)	April 29, 2001
38.	Khaleej Times (City Times)	December 29, 2005
39.	The Sunday Telegraph	Septemèbr 4,2005
40.	Pakistan Times (Lahore)	June 1, 1975
41.	Morning News (Karachi)	December 13,1977
42.	Sun (Karachi)	August 5,1976
43.	Sindh Observer (Hyderabad)	June 22,1975
44	The Frontier Post (Lahore)	June 28, 1990
45.	The Frontier Post (Lahore)	July 27,1990
46.	The Frontier Post (Lahore)	April 16,1991
47.	The Frontier Post (Lahore)	April 22, 1994
48.	The Star (Karachi)	July 14, 1988
49.	The Star (Karachi)	November 16, 1989
50.	The Star (Karachi)	May 5, 2001 .

ekhta

Recommended Readings

Obscenity & Arts

Art and Morality	Nishida Kitaro, David Dilworth and Waldo Viglielmo, University Press of Hawaii, Honolulu, 1973
Art and Morality	Oliver de Selincourt, London, 1935
Art and Morality	R.W. Beardsmore, Macmillan, London, 1971
Art and Pornography	Morse M. Peckham, Harper & Raw, New York, 1971.
Art Censorship: A Chronology of Proscribed and Prescribed Art	Jane Clapp, Scarecrow Press, New Jersey, 1972.
Erotic Art: A Survey of Erotic Fact and Fancy in the Fine Arts	Eberhard and Phyllis Kronhausen, Grove Press, New York, 1968
Fear of Art: Censorship and Freedom of Expression in Art	Moshe Carmilly-Weinberger, R.R. Bowker Company, New York/ London, 1986.
Indecency and the Seven Arts	Horace M. Kallen, Liveright, New York, 1930
Obscenity and the Arts	A. Kaplan, *'Law and Contemporary Problems'* Vol. 20, No. 4, Duke University, 1955.
Sex in the Arts (a symposium)	John McDermott and Kendall B. Taft, New York/London, 1932.
The Nude	Kenneth Clark, Garden City, N.Y. Double Day, 1956

Obscenity & Literature

Sex Expression in Literature	V.F. Calverton, New York, 1926
Sex in Literature	John Atkins, Panther, London, 1970
The Erotic in Literature	David G. Loth, Secker and Warburg, London 1961
The Erotic Motive in Literature	Albert Mordell, Bonnie and Liveright, New York, 1919

Obscenity & Law

A Note on Obscenity	A.E. Crawley, London
A Question of Obscenity	Robert Pitman, Scorpion Press, 1960.

Cases & materials on Obscenity	Richard Fox Monash University, Faculty of Law.
Criminal Obscenity	John Ford, 1926
Freedom of the 'Press' and 'Obscene'	Theodore Schroeder, New York, 1906,
Literature, Obscenity and Law	Flannery Lewis, Southern Illinois University Press, 1976
Moral Principles towards a Definition of the Obscene	Harold C. Gardiner, *Law and Contemporary Problems'* vol. 20
'Obscene' Literature and Constitutional Law: A Forensic Defence of the 'Freedom of the Press'	Theodore Schroeder, New York, 1911
Obscene Literature in Law and Practice	Sir Edward Atkinson, London 1937
Obscenity	Geoffrey Robertson, Weidenfeld and Nicholson, London, 1979
Obscenity and the Law	Norman St. John-Stevas, Secker and Warburg, London, 1956.
Obscenity and Law of Reflection	Henry Miller *Remember to Remember'* New York, 1947
Obscenity and the Public Interest	Frank Kermode, *'Modern Essays'*, Fontana, London, 1971
Obscenity as an Aesthetic Category	Abraham Kaplan, *Law and Contemporary Problems'* vol. 20, 552-559, 1955
Obscenity in Literature	Henry Miller, *New Dimensions*, London, 1957
The Metaphysics of the Law of Obscenity	*'The Supreme Court Review'*, University of Chicago Law School, 1960,
The Evolution of Literary Decency	Blackwoods, (March/1990)
The Law of Obscenity	Frederick Hallis, London, 1932

* * *

Erotics and Erotic Literature in	K.L. Kukhopadhya,

Ancient India	Calcutta (India)
Erotic in Greek Literature	Hans Licht, *'Sexual Life in Ancient Greece'* George Routeledge and Sons, London 1932.

* * *

Forbidden Fictions (Pornography in 20th Century France)	John Phillips, Pluto Press, London, Sterling, Virginia, 1999

* * *

History of English Erotic Literature	C.R. Dawes, (Typescript in the 'Private Case' of British Museum), 1943.
Libertine Literature in England (1660-1745)	David Foxon, University Books, New York, 1965
The Banned Books of England and Other Countries	Alec Craig, George Allen and Unwin Ltd., London 1962.
The Erotic Literature in England	Dr. Iwan Bloch, *'Sexual Life in England'* Corgi, London, 1965
The Other Victorians	Steven Marcus, Basic Books, USA, 1966
The Worm in the Bud	Ronald Pearsall, Weiden and Nicholson, 1969
Walter: The English Casanova	E. Kronhausen and P. Kronhausen, Polybooks, London, 1967.
Books in Dock	C.H. Rolph, Andre Deutch, London, 1669
The Trial of Lady Chatterley	C.H.Rolph Penguin, 1961
The End of Obscenity	Charles Rembar, And Deutsch, London, 1969

* * *

Does Pornography Matter?	C.H. Rolph, Routeledge and Kegan Paul, London, 1961
Foolish fig leaves: (Pornography in and out of Court)	Richard H. Kuh, Macmillan, New York, 1967.
Is Pornography a Cause of Crime!	E. Van Den Haag. *'Encounter'*, 52-56, 29, 1967
Perspectives on Pornography	D.A. Huges, Macmillan, London, 1970
Perspective on Pornography	George Steiner

Pornography	*'Encounter'* Special Issue, March, 1972
Pornography: Some New Perspectives on an Old Problem	E.E. Levitt, *'The Journal of Sex Research'* 1968
Pornography:Raging Menace or Paper Tiger?	W.Simon and J.H. Gagnon, Aldine, New York, 1970
Pornography and the Law: The Psychology of Erotic Realism	E. and P. Kronhausen Ballantine Books, New York, 1959
Pornography and Sexual Deviance	Michael Goldstein and Sansford Kant, University of California Press, 1973
Pornography and the Sex Offender	R.F. Cook, R.H. Rosen and A. Pacht, *'Journal of Applied Psychology'* 503-511, 1967.
Pornography, the Law and Mental Health,	F.E. Kenyon, *'British Journal of Psychiatry'*, 225-233
Sex Pornography and Justice	Albert A. Gerber, Lyle Stuart Inc., New York, 1965.
Symposium on Pornography and Obscenity	C.B. Cox, *'Critical Quarterly'*, Summer, 1961
The Pornogrphic Imagination	Susan Sontag, *'Story of the Eye'* George Bataille, Penguin, 1982

Censorship

The Uses and Abuses of Pornography	H.J. Eysenck, *'Psychology is about People'* Penguin, 1972.
The Value of Pornography	Earl Finbar Murphy, *'Wayne Law Review'*, 1964
Censorship: A Challenge to Sex Censors	Theodore Schroeder, New York, 1938
Catholic viewpoint on Censorship	Harold C. Gardiner, Doubleday-Image, 1958.
Censorship and Freedom of Expression	H.M. Clor, Rand McNally, 1971
Censorship: the Search for	Morris Ernst and Allen

Obscene	Schwartz, Macmillan, New York, 1964.
Censorship and Sexual Literature	Alec Craig, *'The Encyclopedia of Sexual Behaviour'*, New York, 1961
Censorship of Obscenity: the Developing Constitutional Standards	Lockhart and McClure, *'Minnesota Law Review'* 45/1960
Censorship: Opposing Viewpoints	Greenhaven Press, New York
Dirty hands or the True-born Censor	R.P. Blackmur, Cambridge, 1930
Federal Censorship: Obscenity in the Mail	James Paul and Murray Schwartz, Free Press of Glancoe, New York, 1961
Obscenity in the Mail: A study in Administrative Restraint	Edward De Grazia, *'Law and Contemporary Problems'* Duke University of School of Law, vol. 20, No. 4/619.
Keeping it Dark or the Censors' Handbook	Bernard Custon and G. Gordon Young, London, 1930.
Love and Death: A Study in Censorship	G. Legman, Breaking Point, New York, 1949.
Obscenity and the Case for Censorship	Walter Berns
Obscenity Censorship: the core constitutional issue:	Lockhart and McClure, *'Utah Law Review'*, 7/1961.
What is 'Obscene': Obscenity and the case for Censorship	Irving Kristol, *'The New York Times,'* Magazine, March/1971.
Pornography, Sex and Censorship	Fred R. Berger, *'Philosophy of Sex'* Alan Soble, Littlefield Adams Co. US 1980
Sex and Censorship in Contemporary Society,	Margaret Mead
Sex, Literature and Censorship	D.H. Lawrence, (essays, edited by Harry T. Moore) Twayne Publishers, New York, 1953
Sex, Censorship and the Feudian Left	Beatrice Faust

The Censor Marches On...	Morris Ernst and Alexander Lindey. New York, 1940.
The Cultural Context of Sex Censorship	Larrabee, *'Law and Contemporary Problems'* Vol. 20/672, 683-684, 1955
The Laughing Horse.	(The number is devoted to censorship), University of California, February 1930.
To the Pure: A study of Obscenity and the Censor	Morris Ernst and William Seagle. New York, 1928.
Versions of Censorship	John McCormick and Mairi MacInnes, Anchor Books, New York, 1962.

Cinema & Theatre

Banned: The Theatrical Censorship in Britain	Richard Findlater, Panther, 1928.
Censored: The Private Life of the Movies	Morris Erst and Pare Lorentz, 1930.
Sex in the Movies	A. Walker, Pelican, 1968.
The History of Sex in the Movies	Arther Knight
What the Censor Saw?	John Travelyan, Michael Joseph,1973.

Indian Cinema

Liberty and licence in the Indian Cinema	Aruna Vasudev, Vikas, New Delhi, 1973
Other Side of the Coin: An intimate Study of the Indian Film Industry	Guar Madan, Trimurti Prakashan, Bombay, 1973.

TV & Violence

Sex, Violence and the Media	H.J. Eysenck, Maurice Temple Smith, London, 1978.
Television and Aggression	Syemour Feshbach and Singer, San Francisco, 1971.
The Effects of Television	J.D. Halloran, Panther, 1970.
Violence on Television	BBC Publications, 1972.

Pornography & Children

'Into Whose Hands'?	George Ryley Scot,

Mass Media and Children	London, 1945. L. Bailyn
Seduction of the Innocent: A study of Horror Comics	E. Wertham, Rhinehart, New York, 1953

Pornography & Women

Fantasies of Femininity: Reframing the Boundaries of Sex	Jane M. Ussher Penguin Books, 1997
Pornography and Feminism	Bernard Williams, Review of Books, 17-31, London, March 1983
Pornography and Silence	Susan Griffin, The Women's Press London, 1981.
Pornography: Men Possessing Women	Andrea Dworkin, The Women's Press London, 1981
Take back the night: Women on Pornography.	Laura Lederer, Bantam Books, 1980
The Pornography of Representation	Susanne Kappeler, Polity Press, Great Britain, 1986.
Women, Sex and Porrography	Beatrice Faust, Macmillan Publisher Co. Inc., New York, 1980

Iconography

Parade of Pleasure: A study of popular Iconography in the US.,	Geoffry Wagner, Duke Verschoyle, London, 1954
Sex, Vice and Business	Monroe Fry, New York, 1959
Smut: Erotic reality, Obscene Ideology	Murray S. Davis, University of Chicago Press, Chicago/London, 1983.
The Pin-up	M. Gabor, Andre Deautsch, 1972.
The Smut Peddlers	James J. Kilpatrick, Double Day, New York, 1960.

Sex Fairs

Catalogue of the International Exhibition of Erotic Art	E. Kronahusen Kunst-Hall, Sweden, 1968
The Danish Sex Fairs	J.C. Laurel,

	Jasmine Press, 1970
The Secret Museum: Pornography in Modern Culture	Walter Kendrick, USA, 1972

Other Countries

Venus in India: Pornography and British India:	Sandra Findley, (Unpublished M.A. Thesis), University of Essex, 1979.
Pornography and Censorship in India	G.D. Khosla, India Book Company, New Delhi, 1976.
Pornography and Sex Crime in Denmark	B. Kutchinsky, Martin Robertson, London
Sex and Society in Sweden	Bitgitta Linner, Panther, New York, 1967.
'Sweden in Casual on Pornography'	'The New York Times', November, 5/1957.

Reports on Pornography

Report of the Joint Committee on Lotteries and Indecent Advertisements	HMSO, 1908 November, 1909
Reports of Joint Select Committee of the House of Lords and the House of Commons on the stage Plays Reports of Joint Committee on Censorship of the Theatre	HMSO, 1967

☆☆☆☆☆

Film Censorship: the Cinema and the William's Committee	R.S Camplin, Cinematography Exhibitors' Association of Great Britain and Ireland, 1978.
Reports of the Committee on Obscenity and Film Censorship	Cmnd, 7772 Home Office, Her Majesty's Stationery Office, London, 1979.

☆☆☆☆☆

The Report of the Commission on Obscenity and Pornography	The first authoritative study by government-appointed experts on the effects of pornography

The Messe Commission Report	Washington, 1986

* * * * *

Effect of erotic films on sexual behaviour of married couples	Technical reports of the Commssion on Obscenity and Pornography, Vol. 8, US. Government Printing Office, Washington D.C.
Psychological Reactions to Pornographic films	Technical reports of the Commission on Obscenity and Pornography, Vol. 8,
Report on the Pornographic Material	The Gatherings Committee Government Printing Office, Washington, D.C., 1970
Technical reports of the Commission on Obscenity and Pornography	H. Abelson, R. Cohen, E. Heaton and C. Suder, U.S. Government Printing Office, Washington, D.C., 1970

* * * * *

The Longford (Committee) Report	The British Report on Obscenity and Pornography Coronet Books, London, 1972
Report on Pornography	Bernard Williams, London.
Study paper on Obscenity	R.G. Fox, Law Reforms Commission, Canada, 1972.

Sex & Morality

Law and Morals	Simon Lee, Oxford University Press, 1987.
Logic and Sexual Morality	John Wilson, Penguin, 1965.
Obscenity and Public Morality	H.M. Clor, Chicago University Press, 1969.
Pornography as a Public Health Problem	*American Journal of Public Health*, 374-377, 1972
Sane Sex Order	Pitrim A. Sorokin, 1958.
Sex and Morality	A Kardiner, 1954.
Sex and Morals	C.H. and Winifred M. Whiteley. B.T. Batsford Ltd, London, 1967.

Sex and Social Order	G.H. Steward, Penguin, 1954.
Sexual Morality	Ronald Atkinson, Hutchinson & Co. Ltd., London, 1965.
Sex Life & Sex Ethics (vol.1)	Renex Guyon, Bodley Head Ltd. London, 1933
Sexual Freedom (Vol. 2)	Rene Guyon, 1939
Social Control of Sex Expression	Geoffrey May, London, 1930
The Enforcement on Morals	Sir Patrick Davlin, Oxford University Press, London, 1959

☆☆☆☆☆

History of Sexuality	Michel Foucault, Vintage Books, New York, 1978
Sex in the Modern World	G.L. Simons,
Sex Tomorrow	G.L. Simons, New English Library, London, 1971.

☆☆☆☆☆

Sex and Dehumanization in Art, Thought and Life in Our Time	David Holbrooke, Pitman Publishing, London, 1972.
The Erotic Minorities: A Swedish View	Lars Ullerstam, Calder and Boyers, London, 1967.
The Erotic Revolution	Lawrence Lipton, Sherbourne Press, California, 1971.
The Sexual Wilderness	Vance Packard, Longmans, London, 1968

☆☆☆☆☆

Comstokery in America	Robert Haney, Beacon, Boston, 1960
Eros Denied	Wayland Young, Weiden and Nicholson, 1965
Moralities: Sex, Money and Power	Joan Smith, Allen Lane, 2001
Mrs. Grundy	Leo Marklin D. Appleton, New York/ London, 1930
Public Interest and Private	Stuart Hampshire,

Morality	Cambridge University Press, New York, 1978
The Limits of Sex	Cella Haddon, Michael Joseph, London
The Poison of Prudery	Walyer M. Gallichan, London, 1929.

* * *

On Obscene Words	Sandor Ferenczi, *'Contributions to Psychoanalysis' Boston*, 1916
The Folkfore of Sex	Albert Elis, 1951
The Role of Obscenity In the Folktales of the 'Intellectual' stratum of our society.	Richard Waterman, *'Journal of American Folklore*, Vol. 62/1620-5, April/1949.
The Social importance of Prurient Interest	I.G. Ratner, 42, Southern California, *Law Review*, 1969.
Obscenity Regulations Versus Thought-Privacy: Rationale of the Dirty Joke	G. Legman, Grove Press New York, 1968.

Internet

Censorship on the Internet	Alexander K.A. Grubler, *'German Comments'*, No 50/April, 1998
Fighting the 'Net' threat: piracy and pornography	S. Smith, *Computer Weekly*, Jan. 4, 1998
'For'your Eyes Only' (the only fool-proof filter for screening smut for young is to sit next to the child at a terminal)	Nicollette Jones *The Times*, London, Jan 7, 1999
'Net Sex'.	T. Tamosaitis, Ziff-David Press, 1965.
Online: the porn pioneers	Roly Springler, Reuters.
Porn: Spicy Internet (few care to discuss)	Lydia Zajc Reuters feature, Nov. 3, 1998
Regulating the Internet	*The Economist*, London, June 10th, 2000
Sex, Laws, and Cyberspace	Jonathan Wallace and Mark Mangan, Henry Holt and Company Inc.

	New York 1996
Sex on the Internet	Jay Doughty, dpa, Oct. 26, 1999
Sex-the most searched-for topic on the Internet Web	Reuters, Aug.18, 1997
'Porn-trepreneurs' get Internet business tips	Michael Kahn, Reuters, Jan., 2000
Web Smut Hunters Are Busy	*International Herald Tribune*, Thursday, June24, 1999

اشاریہ

آداب شکنی ۲۰
آزاد خیالی ۳۶۸، ۳۷۶
آزاد معاشرہ ۶۳۳
آزادی، فکری ۲۱
آزادیٔ اظہار ۲۰، ۲۱، ۲۲۳، ۲۲۶، ۳۳۵، ۶۱۱، ۶۱۸، ۶۲۷، ۶۲۹
آزادیٔ نسواں ۲۱۶
آن لائن شاپنگ ۴۳
ابتذال ۱۱۶، ۱۲۵_۱۲۷، ۱۸۳، ۱۸۷، ۱۹۵، ۲۵۸، ۳۱۶، ۴۲۰، ۷۳۲
ابلیس جنس ۱۲۱
احتساب، اخلاق ۱۹، ۲۱، ۲۶، ۵۳۲، ۵۳۵، ۵۵۹_۶۳۲
احتساب زدہ معاشرہ ۵۸۱
احتساب کے سرچشمے ۵۳۳
احتسابی ادارے ۶۳۳_۶۵۲
اخبارات پر پابندی ۲۶
اخلاق، حاکم و محکوم ۲۷۳
اخلاق خراب کرنا ۶۶، ۸۳، ۲۲۹، ۲۶۵، ۲۶۶، ۲۶۸، ۵۲۳، ۵۲۶، ۵۲۸، ۵۲۹، ۶۸۸، ۶۸۹، ۶۹۶
اخلاق خطرے میں ۵۸۵
اخلاق، سرمایہ دارانہ ۲۲، ۲۷۶
اخلاق سنوارنے کا ٹھیکہ ۳۵۰
اخلاقی اجتماعیت ۶۱۹، ۶۲۵، ۶۲۷، ۶۳۳
اخلاقی تضاد ۵۱
اخلاقی مثالیہ ۵۳۳
اخلاقی نظام ۵۲، ۳۱۸، ۳۱۹
اخلاقیات کا بند کمرہ ۳۹
ادب ۷۱_۳۱۹، ۵۲۷
اسرار احمد، ڈاکٹر ۵۹۳
اسلام ۴۳۶، ۵۱۳، ۵۱۹، ۵۵۳، ۵۷۳
اسلامی ممالک ۲۷، ۳۹۸
اسلامی نظام اقدار ۱۲۳، ۵۸۱
اشتہارات ۵۵، ۵۷۶، ۵۹۳، ۵۹۶، ۷۱۶
اقبالؒ ۵۱، ۶۵، ۱۰۸، ۱۷۰، ۲۱۱، ۲۲۷، ۲۵۵، ۲۵۶، ۲۵۷، ۲۸۷، ۳۱۵، ۳۱۶، ۳۲۵، ۳۷۷، ۳۶۶، ۵۷۱، ۶۳۶، ۶۴۳، ۷۳۵، ۷۳۷، ۷۳۸
اقدار ۳۳، ۴۷، ۱۰۸، ۱۲۹، ۱۳۱، ۱۵۱، ۱۵۲، ۱۵۳، ۱۶۳، ۱۶۸، ۱۷۰، ۱۷۱، ۱۸۷، ۲۰۵، ۲۱۷، ۲۲۳، ۲۳۵، ۲۴۰، ۳۷۳، ۴۱۳، ۴۱۵، ۴۲۶، ۴۴۳، ۵۵۲، ۵۷۳، ۵۷۴، ۶۰۶، ۶۰۹، ۶۱۹، ۶۳۲
اقدار، آج کی ۱۲۹
اقدار، اضافی ۱۳۲
اقدار، پرانی ۳۶۲
اقدار، جمالیاتی ۱۵۲، ۲۱۸
اقدار، جنسی ۴۳
اقدار، عفت مآب ۱۲۱
اقدار، مروجہ ۳۰
اقدار، مطلق ۲۹
اقدار، معلومہ ۲۹
اقدار سے بغاوت ۶۳۰
اقلیت ۲۹، ۳۶۵
اقلیتیں، شہوانی ۲۳
اکثریت ۳۷۳، ۳۹۱، ۵۳۳، ۵۳۴، ۶۲۳، ۶۲۷، ۶۳۰
اکثریت، اخلاقی ۲۳
اکثریت، خاموش ۲۷
الفاظ (لفظ) ۲۲، ۲۳، ۳۱، ۶۸، ۸۳، ۸۸، ۱۱۷، ۱۳۰، ۱۳۲، ۱۶۱، ۱۷۳، ۲۳۲، ۲۷۳، ۲۷۶، ۳۰۷، ۳۲۷، ۳۵۰، ۳۹۱، ۵۰۵، ۵۰۶، ۵۱۲، ۵۳۰، ۵۳۱، ۵۳۶، ۶۳۶،

۶۵۷، ۶۵۸، ۶۶۳_۶۸۵، ۶۹۳، ۷۰۲، ۷۰۳، ۷۱۰،
۷۱۵، ۷۳۱، ۷۳۸، ۷۷۳
الفاظ، اینگلو سیکسن ۸۰، ۶۵۷
الفاظ، غیر پارلیمانی ۳۵۰
الفاظ، فورلیٹرز ۸۰، ۱۳۳، ۵۰۶
امریکا ۲۰، ۲۳، ۲۴، ۸۰، ۸۵، ۸۹، ۱۰۳، ۱۳۲، ۱۳۳، ۱۳۶،
۱۳۹، ۱۵۳، ۱۶۰، ۱۶۳، ۲۲۸، ۲۳۱، ۳۳۸، ۳۳۹، ۳۵۶،
۳۵۹، ۳۶۰، ۳۶۱، ۴۲۹، ۴۳۵، ۵۵۱، ۵۸۳، ۵۸۶،
۶۰۱، ۶۰۲، ۶۲۵، ۶۲۶، ۶۵۸
امریکی صدارتی کمیشن ۲۳، ۲۷
امریکی کانگریس ۲۷
امیر خسروؒ ۵۲۳
انٹرنیٹ ۲۶، ۳۳۱_۳۳۰، ۳۳۷
انڈیسینسی ۵۸۱
انقلاب، ابلاغیاتی ۲۶
انقلاب، بلیو ۵۹۵
انقلاب، جنسی ۲۳
انگلستان ۸۰، ۸۵، ۸۹، ۱۰۱، ۱۰۳، ۱۳۳، ۲۰۰، ۳۵۶، ۶۱۲
اوبسین بکس اینڈ پکچرز ایکٹ ۱۵۵
اوبسین پبلی کیشنز ایکٹ ۱۳۶، ۱۵۷
اوبسینٹی ۱۳۲، ۱۵۳، ۳۱۸
اوسط آدمی ۶۱۹، ۶۳۱، ۶۵۹، ۶۶۰، ۶۹۲
بازاری پن ۵۵۹
بالغان ۶۸، ۷۳، ۸۹، ۹۰، ۲۳۵، ۲۸۵، ۳۰۹، ۳۸۲،
۴۳۲، ۴۳۶، ۴۶۳، ۵۱۶، ۵۳۲، ۵۵۷، ۵۸۶،
۵۸۷، ۶۰۹، ۶۱۰، ۶۱۱، ۶۲۵، ۶۲۹، ۶۳۹
برطانیہ ۲۳،، ۱۳۹، ۱۵۶، ۱۵۹، ۱۶۲، ۱۶۳
برقع ۱۰۲، ۴۲۸، ۵۱۱، ۵۱۳، ۵۵۲، ۵۵۶
برہنگی ۱۹، ۲۳، ۸۳، ۹۸، ۳۶۶، ۳۱۶، ۴۷۰، ۵۵۱،
۵۸۶، ۶۹۶
برہنہ گفتاری ۷۳۱
بسنت ۲۶، ۴۵۲

بوڑھے ۷۳، ۹۱، ۱۲۲، ۱۳۱، ۲۰۷، ۲۰۹، ۲۱۰، ۳۰۸،
۳۳۵، ۳۴۸، ۳۶۱، ۵۱۱، ۵۲۰، ۵۷۳، ۵۸۷، ۶۰۳،
۶۳۹
بی بی سی ۲۲، ۲۳، ۲۷، ۵۹۷
بے حیائی ۱۳۰، ۲۳۳، ۳۲۹
بے ہودہ گوئی ۱۹
'بی عریانی' ۵۷۷
پاکستان ۲۵، ۲۷، ۱۵۳، ۱۵۹، ۱۷۶، ۲۳۶، ۲۳۹، ۲۵۰،
۲۵۳، ۲۵۴، ۲۵۵، ۲۵۶، ۳۵۷، ۳۶۵، ۳۶۷، ۳۷۸،
۴۱۳، ۴۳۲، ۵۴۹، ۵۵۳، ۵۷۹، ۵۸۰، ۵۸۵، ۵۹۲،
۶۳۰، ۶۳۷، ۶۳۸، ۶۳۹، ۶۵۱، ۶۵۲، ۶۸۸، ۷۱۳
پاکستان کا خاندانی نظام ۶۷
پاکستان کی ثقافت ۵۶۷، ۵۷۷
پاکستانی حکمند ۵۷۷
پاکستانی مرد ۶۳۸، ۶۳۹
پاکستانی معاشرہ ۲۵، ۶۶، ۶۷
پردہ ۵۷، ۵۸، ۱۳۸، ۲۵۷، ۲۷۲، ۴۰۰
پورن (سیکس) سائنس ۲۷، ۴۲۳، ۴۳۱، ۴۳۲
پورنو انڈسٹری ۲۳، ۴۲۳
پورنوٹوپیا ۲۱۸
پورنوگرافی ۶۹، ۱۳۲، ۱۵۰، ۱۵۳، ۱۶۳، ۴۳۳، ۳۶۲،
۴۰۳، ۴۲۷، ۴۳۹، ۵۱۰، ۵۲۳، ۵۵۵
پورنوگرافی، سوفٹ ۲۳
پورنوگرافی، ہارڈ کور ۲۳، ۲۴، ۴۲۳
پی ٹی وی ۲۵، ۵۶۷، ۵۸۰، ۵۸۱، ۵۸۲، ۵۹۳، ۶۵۰
تکرا ۶۵۰_۶۶۲
ٹینگو ۳۵۴، ۵۵۲، ۷۳۳، ۷۳۶
تحریک نسواں ۴۷۰
تشدد ۵۷۸، ۵۸۱
تعلیم نسواں ۱۹۰_۱۹۱، ۱۹۳، ۱۹۵، ۱۹۸، ۱۹۹_۲۰۶،
۲۵۸
تفریح ۳۷۱
تلذذ پرستی ۳۶۷

تصغیر ۷۶، ۱۳۹، ۱۵۳، ۲۲۸، ۳۶۹_۳۸۳، ۵۹۱، ۶۱۳، ۶۲۵
ٹی وی ۲۰، ۲۲، ۲۶، ۵۵، ۱۳۹، ۳۷۱، ۳۷۸، ۳۸۲، ۳۹۳، ۴۰۷، ۵۷۳، ۶۳۸
ٹی وی، اٹلی ۲۰
ٹی وی، امریکی ۲۰
ٹی وی، جاپانی ۲۰
ٹی وی، روسی ۲۳
ٹی وی، فرانسیسی ۲۰
ٹی وی، میکسیکن ۲۰
ثقافت، بالشویکی ۲۲
ثقافت، صیہونی ۲۲
ثقافتی آزادی ۵۷۹
جاپان ۱۹، ۱۶۶
جاگیردار ۵۸۹
جاگیردارانہ اقتدار ۱۸۰، ۲۵۸
جاگیردارانہ معاشرہ ۱۵۱
جاوید اقبال: جنس (ریٹائرڈ) ۳۱۱_۳۱۹، ۳۷۷
جرمنی ۲۲
جسمانیات کی ملک بدری ۲۴
جمالیات ۱۹، ۲۰، ۲۱، ۳۵، ۱۵۳، ۲۳۱، ۲۶۲، ۲۷۸، ۳۷۳، ۳۷۴، ۴۶۳، ۵۲۸، ۵۷۹، ۶۳۲
جمالیاتی باخبری ۳۵۳
جمالیاتی جرم ۳۵۳
جمالیاتی مفروضے ۶۲۸
جنس ۱۹، ۲۹، ۳۱، ۳۳، ۵۷، ۷۶، ۷۸، ۱۱۰، ۱۱۳، ۱۱۸، ۱۲۱، ۱۲۲، ۱۲۳، ۱۳۱، ۱۳۳، ۱۳۴، ۱۴۲، ۱۴۳، ۱۴۴، ۱۴۷، ۱۴۹، ۱۵۰، ۱۶۱، ۱۶۳، ۱۷۰، ۱۷۶، ۱۷۸، ۱۸۰، ۱۸۱، ۱۸۲، ۱۸۳، ۲۰۷، ۲۰۸، ۲۲۱، ۲۳۳، ۲۴۵، ۲۴۷، ۲۵۷، ۲۵۹، ۲۶۱، ۲۶۳، ۳۵۶، ۳۵۷، ۳۵۸، ۳۶۱، ۴۰۵، ۴۰۸، ۴۱۵، ۴۳۰، ۴۷۰، ۵۰۵، ۵۰۷، ۵۰۸، ۵۰۹، ۵۱۲، ۵۱۳، ۵۱۶، ۵۲۶، ۵۳۱، ۵۳۵، ۵۳۷، ۵۳۸، ۵۴۴، ۵۵۵، ۵۸۶، ۵۸۸، ۵۹۰، ۶۰۳، ۶۰۴، ۶۰۶، ۶۰۷، ۶۱۲، ۶۱۳، ۶۱۵، ۶۳۳، ۶۳۶، ۶۴۷، ۷۴۰
جنس پرستی ۱۸۶، ۲۵۸
جنس زدگی ۱۸۵، ۱۸۷، ۱۹۶، ۳۵۸، ۵۰۸، ۵۲۰
جنس نگاری ۵۷، ۱۳۲، ۱۳۳، ۱۳۴، ۱۳۵، ۱۳۶، ۱۳۷
جنس نوازی ۱۹
جنسی آزادی ۲۲۸، ۲۵۷، ۲۵۹، ۵۳۳، ۶۰۲، ۶۰۷
جنسی آسودگی ۳۲، ۲۶۱
جنسی اخلاق ۵۰
جنسی اقتدار ۶۱۳
جنسی اطوفیہ ۲۳
جنسی بحران ۲۵
جنسی بمباری ۲۳
جنسی بھوک ۲۶۱، ۵۸۷
جنسی تشنگی ۱۸۰
جنسی تعلم ۵۳، ۸۶، ۹۲، ۱۶۸، ۳۳۷، ۶۰۲، ۶۰۳، ۶۱۲
جنسی تلذذ ۲۳، ۴۹، ۵۳۷
جنسی توہمات ۵۲۵
جنسی جرائم ۲۱، ۱۳۸، ۳۲۷
جنسی حقیقت نگاری ۱۹، ۱۱۳
جنسی عامیانہ پن ۵۰۹
جنسی گھٹن ۱۸۱
جنسی موضوع ۱۹، ۳۲، ۱۳۱، ۱۸۲، ۲۵۷، ۲۵۸، ۲۵۹، ۲۸۲، ۳۰۲، ۳۴۰، ۵۳۶، ۶۵۷، ۷۷۱
جنسیات ۳۳، ۴۳، ۴۷، ۵۸، ۱۲۲، ۱۸۴، ۲۰۸، ۲۱۳، ۲۳۷، ۲۷۸، ۲۸۱، ۲۸۷، ۲۹۵، ۳۰۳، ۳۷۹، ۳۹۵، ۶۵۷، ۷۶۳
جنسیت ۳۳، ۱۱۳، ۱۱۶، ۱۲۱، ۱۳۸، ۱۷۵، ۱۷۸، ۱۸۲، ۱۸۳، ۲۷۳، ۲۷۵، ۲۷۸، ۲۷۹، ۳۹۱، ۳۹۲، ۳۹۳، ۴۵۳، ۴۶۰، ۴۶۱، ۴۶۳، ۴۷۴، ۵۰۹، ۵۲۸، ۶۳۱
جنگ ۶۰۳
جھوٹی شرم و حیا ۸۱، ۸۳، ۸۴، ۹۶، ۱۳۲، ۱۳۴، ۱۳۵، ۱۸۰، ۳۹۳، ۷۱۳
چائلڈ پورن ۲۳
چیٹنگ ۳۳۰، ۳۳۱، ۳۳۳، ۳۳۵
چین ۱۹، ۲۳

حرف برہنہ ۲۵
حریتِ فکر ۲۱
حسرت موہانی ۱۳۵، ۶۳۷_۶۳۹
حقوقِ نسواں ۲۱، ۲۷، ۲۷۶
حمایتِ نسواں ۲۵۷
حیاتیات ۱۹
خطِ امتیاز/ فاصل ۲۱، ۲۲، ۲۰۹، ۶۲۰، ۶۲۲، ۶۲۹
خواتین ۲۶، ۸۸، ۸۹، ۹۹، ۱۷۲، ۱۸۱، ۳۳۸، ۳۵۳،
۳۵۸، ۳۵۹، ۴۰۰، ۴۴۴، ۴۴۶، ۵۲۱، ۵۸۶، ۵۸۸
خواتین، جنسی مساوات پسند ۲۳
خوف، احتساب کا ۵۲۳
خوف، جنس کا ۱۳۵
خوف، عریانی کا ۸۳
دماغی جلق ۴۸۹
دماغی عریانی ۱۲۸
دماغی عیاشی ۳۰۰
دماغی غلاظت ۲۸۷، ۵۰۵
ڈانس ۲۱۳، ۵۴۸، ۵۸۳
ڈانس، اسٹرپ ٹیز ۳۹۸
ڈانس، بالنی ۳۷۶
ڈانس، بیلی ۲۱۳، ۳۹۸، ۴۰۱
ڈانس، فیمن ۳۹۸
ڈانس، کپل ۳۹۸
ڈانس، کین کین ۱۵۳
ڈانس، ممتاز مارکہ ۳۸۸
ڈائجسٹ رسالے ۶۷، ۳۴۳، ۳۵۰، ۳۵۲، ۳۵۴،
۵۳۸، ۵۵۰
ڈراما ۴۷، ۶۶، ۵۷۸
ڈنمارک ۲۲۸، ۳۳۹
ذوقِ سلیم ۲۳۹، ۲۴۴، ۲۷۴، ۵۳۳
ذہنی عیاشی ۴۲۶
ذہنی قحبگی ۶۳۱
ذہنی گندگی ۱۱۵
رُجحان ۶۲۳، ۶۸۷، ۶۸۹، ۶۹۶، ۷۱۱، ۷۱۳، ۷۱۷
رسائل ۶۷
رسل، برٹرینڈ ۸۶، ۱۲۳، ۱۲۴، ۱۳۲
رقاصی، برہنہ ۷۶۳
رقص ۲۶، ۱۵۰، ۱۶۷، ۲۱۲، ۲۷۷، ۳۹۸_۴۰۲، ۳۵۲،
۳۶۷، ۵۵۷، ۵۶۱، ۵۸۹، ۵۹۱، ۵۹۲، ۷۱۰
رقص، پنجابی ۶۳۷
رُوم، مولانا ۵۶، ۱۰۰، ۱۳۵، ۱۳۹، ۱۴۲، ۱۴۹، ۱۷۰، ۲۸۳،
۳۱۵، ۳۲۲، ۳۲۵_۳۲۶، ۶۳۱
ریڈیو ۵۵، ۱۴۳، ۴۴۲، ۵۴۸، ۵۷۳، ۵۸۱
سائبر ایروٹیکا ۲۳
ستر کشائی ۲۰، ۲۳، ۲۲۰، ۴۳۹
سعودی عرب ۲۳، ۴۴۳، ۵۹۱
ساجی مفاد (ادارہ) ۵۳۱، ۵۳۲، ۶۲۱، ۶۲۶، ۶۳۵
سنسر بورڈ ۴۷، ۴۳۹، ۵۶۲، ۵۶۳، ۵۶۵، ۵۶۶، ۵۹۳،
۶۳۹
سنسر شپ ۲۶، ۱۷۲، ۲۲۸، ۳۳۵، ۳۴۳، ۳۳۶، ۴۰۱،
۴۱۷، ۴۴۶، ۴۴۳، ۵۵۹، ۵۹۳، ۶۱۳، ۶۱۴، ۶۱۵، ۶۳۵
سول لبرٹیز ۲۰، ۶۵۲
سویڈن ۲۳، ۲۲۸، ۳۵۱، ۳۵۶، ۳۵۹
سیکس ۱۹، ۲۶۱، ۳۸۷، ۳۹۰، ۳۹۲، ۳۹۳، ۳۹۶، ۴۲۹،
۵۰۵، ۵۲۱، ۵۵۸، ۵۵۹، ۵۷۸، ۵۹۵، ۶۱۸
سیکس انڈسٹری ۲۳
سیکس بطور تجارت و تفریح ۲۳
سیکس چینلز ۲۳
سیکسوراما ۲۳
سینماٹوگرافی ایکٹ ۵۶۲
سینما گھر پر چھاپا ۲۶
شاعری ۴۷_۶۲، ۱۳۵، ۱۸۷_۱۹۸، ۲۰۸، ۲۱۱،
۳۵۹_۴۷۳، ۴۸۷_۴۸۸، ۵۷۱_۵۷۳، ۵۵۸
شاعری، اسلامی ۳۴۴، ۳۶۹
شاعری، اعضا کی ۵۵۷
شاعری، جنسی ۶۱، ۱۲۰، ۱۶۱، ۳۶۳
شاعری، چٹخارے والی ۶۲
شاعری، فاحشانہ ۳۰

شاعری، فاسقانہ ۴۰
شاعری، مریضانہ ۴۶۶
شباب پرستی ۴۲
شبینہ کلب ۴۵
شخصی ذوق ۲۱
شوخ نگاری ۱۲۸
شوکت تھانوی ۲۲۸، ۳۳۲، ۳۵۲، ۷۶۵
شہوانیت ۴۷، ۲۵۹، ۳۶۱، ۳۶۳، ۵۳۶، ۶۸۹
شہوت پرستی ۱۱۹، ۱۸۸، ۱۹۶، ۶۵۶
شہوت نگاری ۱۹
شہوانی لذائذ ۵۳۳
شیخ سعدیؒ ۱۳۵، ۱۳۹، ۱۷۵، ۲۰۹، ۲۳۹، ۲۸۳، ۳۲۳، ۳۲۴، ۳۲۵، ۳۳۰، ۵۷۲، ۶۳۱، ۷۳۳
صحافت ۳۵۴، ۵۲۲، ۵۲۳، ۵۳۳
صحافت، دائیں بازو کی ۵۵۶
صنفی اطوفیہ ۲۳
صنفیات ۱۹
طبقہ، (اشراف/اونچا) ۱۲۳، ۱۶۵، ۱۸۳، ۱۸۴، ۱۸۵، ۱۹۳، ۴۷۷، ۵۲۳، ۵۸۲، ۵۸۳، ۵۸۹، ۶۳۶، ۶۴۸، ۷۱۶
طبقہ، قدامت پرست ۲۳، ۲۵، ۳۳، ۱۶۲، ۱۷۰، ۲۶۵، ۳۹۵، ۳۹۶، ۵۲۲، ۵۸۳، ۶۱۷، ۶۲۳، ۶۳۱، ۶۳۲، ۶۳۳، ۶۳۴، ۶۳۵، ۷۶۶
طبقہ، لبرل ۳۳، ۱۶۲، ۱۶۳، ۵۳۱، ۶۱۷، ۶۲۳، ۶۳۱، ۶۳۲، ۶۳۳، ۶۳۴، ۶۳۵
طبقہ، متوسط ۱۱۳، ۱۱۴، ۱۳۵، ۱۸۳، ۱۸۶، ۲۹۵، ۳۷۳، ۳۹۰، ۵۰۷، ۵۲۹، ۵۳۵، ۵۷۸، ۶۵۶، ۷۰۳
طبقہ، نچلا ۱۳۵، ۱۸۳، ۳۹۰، ۶۹۳، ۷۱۶
عرب دنیا ۱۹
عریاں/فحش اشاعت ۸۱، ۸۳، ۵۲۸، ۶۰۱
عریاں طرازی ۲۳۹
عریاں نگاری ۵۶، ۸۳، ۱۲۹، ۱۳۳، ۱۳۵، ۱۳۶، ۱۳۷، ۱۳۹، ۲۳۷، ۲۵۸، ۲۶۱، ۲۶۳، ۲۶۹، ۴۷۱، ۵۵۱، ۵۱۲، ۵۱۳، ۵۱۶، ۶۵۶
عریاں نویسی ۲۹
عریانی ۲۰، ۲۱، ۲۲، ۲۳، ۲۴، ۲۵، ۲۶، ۲۷، ۳۰، ۳۳، ۳۹، ۴۱، ۴۶، ۶۵، ۷۴، ۷۶، ۷۸، ۸۰، ۸۲، ۸۵، ۹۰، ۹۵، ۹۶، ۹۷، ۹۸، ۹۹، ۱۰۰، ۱۰۴، ۱۰۵، ۱۰۶، ۱۰۷، ۱۱۴، ۱۲۰، ۱۲۱، ۱۲۲، ۱۲۳، ۱۲۶، ۱۳۲، ۱۳۳، ۱۳۸، ۱۴۰، ۲۲۰، ۲۲۳، ۲۶۱، ۲۶۳، ۲۶۵، ۲۷۳، ۲۷۵، ۲۷۸، ۲۷۹، ۲۹۳، ۲۹۶، ۲۹۸، ۳۰۵، ۳۰۶، ۳۰۹، ۳۱۳، ۳۱۴، ۳۶۶، ۳۷۲، ۳۷۳، ۳۷۶، ۳۷۷، ۳۸۱، ۳۸۳، ۴۲۲، ۴۲۳، ۴۳۳، ۴۶۱، ۴۶۳، ۴۷۰، ۴۸۱، ۵۱۱، ۵۱۲، ۵۱۶، ۵۱۸، ۵۱۹، ۵۲۰، ۵۲۷، ۵۲۸، ۵۳۶، ۵۳۷، ۵۵۱، ۵۵۲، ۵۵۸، ۵۶۱، ۵۶۲، ۵۷۵، ۵۷۷، ۵۷۸، ۵۸۳، ۶۱۳، ۶۱۷، ۶۱۸، ۶۲۰، ۶۲۲، ۶۲۸، ۶۲۹، ۶۳۰، ۶۳۰، ۶۳۵، ۶۳۶، ۷۱۵، ۷۱۶، ۷۱۷
عریانی، ایک اور طرح کی ۵۸۱
عریانی، باعصمت ۴۰
عریانی، بدنی ۱۲۸
عریانی، بطور عریانی ۶۳۲
عریانی، تجارتی ۲۳، ۶۲۵
عریانی، تحریم ۸۸
عریانی، جنسی ۷۷
عریانی، عارضی ۲۰
عریانی، فضلاتیاتی ۷۷
عریانی، فطری ۴۰
عریانی، مجرمانہ ۴۰
عریانی، مقصدی ۱۳۹
عریانی، نیم ۵۸۶
عریانی، دینی او نیم دینی کتب کی ۱۳۵، ۱۵۸، ۱۷۶، ۳۳۱_۳۳۸، ۵۹۰، ۷۱۱
عریانی، عربی اور فارسی ادب کی ۱۰۵، ۱۳۵، ۱۵۵، ۲۳۷، ۲۸۹، ۵۷۲
عریانی، چوڑیوں بھری کلائیوں کی ۵۷۵
عریانی، کلاسیکی ادب کی ۲۰۵، ۱۳۹
عریانی، کرکٹ کے گیند کی ۵۹۳

عریانی، ہاکی کے کھیل کی ۳۵۲، ۵۷۵، ۵۷۸، ۵۹۳
عریانی برائے معاوضہ ۵۲۷، ۵۳۰
عریانی کی لہر ۵۶۳
عریانی (فحاشی) کی حقیقی تعریف ۲۰، ۷۹، ۸۳، ۸۶، ۱۳۹،
۱۵۷، ۱۵۹، ۵۷۵، ۵۸۳، ۵۸۴
عریانی کچلنے کی کوششیں ۷۸، ۷۹، ۸۸
عریانی کے تین درجے ۹۸
عریانی کے خلاف محاذ ۵۶۹۔۵۹۷
عریانی کے عدالتی ماہرین ۲۱، ۶۸۷، ۶۸۸، ۶۹۱
عریانی کے فکری مغالطے ۲۰
عریانی کے مُحتسبین ۹۱، ۴۷۳، ۵۲۶، ۵۶۸، ۵۹۳
عریانی کے مترادفات ۲۰، ۸۶، ۹۸، ۱۳۲
عریانی کے متلاشی ۸۷، ۹۵
عریانی کے معتوبین ۳۵۵۔۵۶۸
عریانی کے معذرت خواہ ۱۱۷
عریانیات ۴۷۳۔۴۷۵
عریانیت/عدم عریانیت ۱۲۹، ۱۳۰، ۱۵۳، ۲۲۳، ۲۲۵،
۵۱۴، ۵۶۰، ۵۷۷، ۶۳۷، ۷۱۰، ۷۱۵
عمران خاں ۵۹۳
عورت/عورتیں ۱۸۳۔۲۰۶، ۱۰۲، ۱۱۷، ۱۳۸، ۲۰۸، ۲۱۵،
۲۳۶، ۲۳۹، ۲۴۸، ۲۵۷، ۲۷۶، ۲۸۵، ۲۸۹، ۲۹۵،
۳۱۳، ۳۵۵، ۳۰۷، ۳۱۶، ۳۵۲، ۳۵۳، ۳۵۹، ۳۷۳،
۳۷۵، ۳۷۸، ۳۸۰، ۳۸۱، ۳۸۲، ۳۸۸، ۳۸۹، ۳۹۳،
۵۰۵، ۵۱۳، ۵۱۵، ۵۲۵، ۵۵۱، ۵۵۲، ۵۸۶، ۶۱۸،
۶۲۵، ۶۳۷
عورت پرستی ۳۲، ۳۳
عید کارڈز ۳۶
غامدی، جاوید احمد ۵۹۱
فحاشی ۲۰، ۲۱، ۲۲، ۲۳، ۲۵، ۲۶، ۲۷، ۳۰، ۳۲، ۳۳، ۳۵،
۵۳، ۶۰، ۷۲، ۹۲، ۹۸، ۹۹، ۱۰۰، ۱۰۳، ۱۰۵، ۱۰۶، ۱۰۷،
۱۱۸، ۱۲۹، ۱۳۰، ۱۳۲، ۱۳۱، ۱۳۲، ۱۳۳، ۱۳۹، ۱۵۰، ۱۵۱،
۱۵۲، ۱۵۷، ۱۶۱، ۱۶۸، ۱۶۹، ۱۷۰، ۱۷۲، ۱۷۳، ۱۷۴،
۲۱۷، ۲۲۰، ۲۲۳، ۲۲۵، ۲۲۷، ۲۲۸، ۲۳۹، ۲۶۱، ۲۶۲،
۲۶۳، ۲۶۹، ۲۷۱، ۲۷۳، ۲۷۸، ۲۷۹، ۲۸۸، ۲۹۰، ۲۹۱،
۲۹۲، ۲۹۶، ۳۲۶، ۳۳۱، ۳۴۱، ۳۴۲، ۳۷۲، ۳۷۳،
۳۷۶، ۳۸۳، ۴۰۳، ۴۱۳، ۴۱۴، ۴۱۵، ۴۱۶، ۴۱۹، ۴۲۲،
۴۲۳، ۴۲۵، ۴۲۶، ۴۳۳، ۴۶۳، ۴۶۶، ۴۶۷،
۴۷۰، ۴۹۲، ۵۱۹، ۵۲۰، ۵۳۲، ۵۳۶، ۵۳۷، ۵۳۸،
۵۴۰، ۵۴۶، ۵۵۸، ۵۶۲، ۵۶۳، ۵۷۲، ۵۷۳،
۵۸۶، ۵۸۷، ۵۸۸، ۵۹۱، ۶۱۰، ۶۱۳، ۶۱۴، ۶۲۳،
۶۲۸، ۶۳۷، ۶۳۸، ۶۸۶، ۶۹۲، ۷۰۸، ۷۱۹، ۷۳۲
فحاشی، چینی ۴۷
فحاشی، سیاسی ۳۵۱
فحاشی، غلاموں کی ۶۳۰
فحاشی، نیم تخلی ۴۷
فحاشی کی تعریف ۲۱، ۴۷، ۲۹۲، ۴۷۰، ۵۹۱، ۶۱۵، ۶۱۶،
۶۲۳، ۶۳۱
فحاشی کی زد میں آئی ہوئی عریانی ۲۲۵
فحاشی کی روک تھام کے لیے عالمی کانفرنس ۷۹، ۱۵۷
فحاشی کے پیچھے لٹھ لے پھرنا ۲۸۵
فحاشی کے دورے ۵۹۱
فحاشی کے فتوے ۲۸۸، ۵۲۵
فحاشی کے مترادفات ۲۰
فحاشیت، دولت کی ۳۵
فحش ۲۳، ۳۵، ۳۶، ۴۷، ۵۲، ۶۵، ۸۰، ۱۰۹، ۱۱۰، ۱۱۷،
۱۱۸، ۱۱۹، ۱۴۷، ۱۵۰، ۱۵۳، ۱۵۹، ۲۲۵، ۲۷۱، ۲۸۲،
۲۸۳، ۳۹۱، ۳۹۳، ۵۱۰، ۵۱۸، ۵۱۹، ۵۲۷، ۵۳۶،
۵۷۷، ۵۸۵
فحش اور غیر فحش ۱۰۱، ۱۰۳، ۱۱۷، ۳۹۲، ۵۳۰
فحش بیانی ۴۷۳
فحش بینی ۳۳۱، ۳۵۶
فحش پارے ۱۹
فحش پرستی ۱۹
فحش جوئی ۳۳۱
فحش دشمنی ۸۵، ۲۹۲
فحش زدگی ۱۷۲
فحش عملیات ۱۷۷
فحش کاری ۲۴۲، ۷۷۵

فحش کلاسکس ۳۳۵
فحش گوئی ۳۰، ۱۱۵، ۳۳۱، ۷۳۱
فحش نگاری ۱۹، ۲۱، ۶۰، ۷۳، ۷۳، ۹۰، ۹۳، ۱۲۱، ۱۲۲،
۱۲۳، ۱۲۹، ۱۳۹، ۱۵۱، ۱۵۳، ۱۵۷، ۱۵۸، ۱۶۰، ۱۶۲،
۱۶۳، ۱۶۴، ۱۶۵، ۱۶۶، ۱۶۷، ۱۷۳، ۱۷۲، ۱۸۱، ۱۸۳،
۱۸۷، ۱۹۵، ۱۹۶، ۱۹۷، ۲۰۶، ۲۱۷، ۲۱۹، ۲۲۸، ۲۳۰،
۲۳۲، ۲۳۸، ۲۶۵، ۲۸۳، ۲۹۹، ۳۰۱، ۳۰۳، ۳۰۵، ۳۱۳،
۳۳۱، ۳۳۷، ۳۵۹، ۵۱۰، ۵۲۲، ۵۲۵، ۵۲۳، ۵۸۳،
۶۰۱، ۶۱۸، ۶۲۰، ۶۲۶، ۶۲۷، ۶۵۸، ۶۶۱، ۶۶۲، ۷۳۳
فحش نگاری، تحقیق ۹۱
فحش نگاری، خاص ۳۳۵، ۵۲۷
فحش نگاری، لذتی ۶۱، ۷
فحش نگاری، انسداد ۱۵۵، ۱۵۷
فحش نگاری اور جرائم ۲۱
فحش نگاری بطور تفریح ۲۰
فحش نگاری بطور مرض ۲۰
فحش نگاری بطور سازش ۳۳۵، ۵۸۵
فحش نوشی ۲۹۲
فحش نویسی ۲۸۹، ۲۹۲، ۲۹۳، ۵۲۷
فحشیات ۲۳، ۱۷۵، ۷۳۱
فرانس ۲۳۳
فضلاتیات ۱۹، ۷۶، ۷۷
فلم ۲۲، ۵۵، ۷۵، ۱۳۹، ۲۱۵، ۲۸۳، ۲۸۵_۳۱۰، ۳۱۳،
۳۱۷، ۳۱۸، ۳۲۱، ۳۲۸، ۵۲۶، ۵۳۵، ۵۲۳، ۵۶۶،
۵۷۳، ۵۷۸، ۵۹۰، ۵۹۳، ۵۹۵، ۶۱۳، ۶۲۱، ۶۲۹،
۶۳۵، ۶۳۸
فلم، اردو ۳۸۷، ۶۳۶
فلم، انگریزی ۳۳۳، ۲۸۷، ۵۳۹، ۵۹۳، ۶۳۵
فلم، بلیو ۲۳، ۱۶۳، ۱۶۷، ۲۱۶، ۲۲۰، ۲۲۵، ۲۳۹، ۳۰۱،
۳۰۳_۳۱۰، ۳۲۲، ۳۳۳، ۳۳۶، ۵۲۱، ۵۸۳، ۵۸۸،
۶۱۶
فلم، بھارتی ۳۹۱، ۵۷۸، ۵۸۳، ۵۹۱، ۶۵۲
فلم، پشتو ۳۹۱، ۳۰۱، ۷۶۳
فلم، پنجابی ۳۸۷، ۳۸۸، ۳۰۱، ۶۳۵

فنکارانہ ضبط ۵۲۹
فنی تدفن ۵۲۹
فواحش ۲۳۸
قحبہ نگاری ۲۲۷
قدیم مصری ۱۹
کتابیں ۳۳۹_۳۶۲،، ۵۲۷، ۵۷۳، ۶۳۰
کتابیں، ممنوعہ ۱۹
کتب سوزی ۲۲
کنز جنسی ضابطے ۶۳۲
کیمشن اگینسٹ پورنوگرافی ۲۳
کیتھارسز ۱۱۹، ۱۶۹، ۳۸۸
گالی/گالیاں ۱۱۷، ۱۳۳، ۱۷۹_ ۱۹۷_ ۱۹۸، ۲۶۷،
۲۸۳، ۲۸۵، ۲۸۹، ۲۹۰، ۲۹۱، ۲۹۹، ۳۰۳، ۳۰۹، ۳۱۵،
۳۱۶، ۳۳۳، ۳۵۰، ۳۵۲، ۳۷۱، ۳۸۹، ۴۵۰_ ۴۵۱،
۴۵۹، ۵۲۲، ۶۳۱، ۶۸۶، ۶۸۹، ۶۹۳، ۷۳۳
گانے ۳۹۶، ۳۹۷، ۵۲۸، ۵۶۳، ۵۶۷، ۶۳۵
لانگ فورڈ کمیٹی ۲۳
لباس ۹۶، ۱۳۷، ۱۶۸، ۱۹۶، ۲۲۳، ۲۸۳، ۲۸۷، ۳۸۹،
۳۹۲، ۳۹۳، ۴۴۳_۴۴۹، ۴۶۸، ۴۶۹، ۵۲۸، ۵۳۹،
۵۶۰، ۵۶۱، ۵۷۷، ۵۸۸، ۶۳۵
لذائذ کی دنیا ۳۳
لذت اندوزی ۳۷
لذت انگیزی ۳۲۷
لذت پسندی ۳۳۳، ۳۳۶
لذت پرستی ۱۱۳، ۵۶۳
لذت فروشی ۲۳
لذت نگاری ۱۹
لذت نوشی ۲۲۶
لذتیت ۲۲۸، ۲۹۳، ۳۶۱
لڑکیاں ۵۳، ۸۸، ۱۰۶، ۱۰۷، ۱۳۳، ۱۳۸، ۱۷۶، ۲۵۸،
۲۵۹، ۲۹۵، ۳۰۵، ۳۵۶، ۳۵۷، ۳۵۸، ۳۵۹، ۳۶۰،
۳۶۱، ۴۰۰، ۴۰۳، ۴۰۶، ۴۳۳، ۵۱۶، ۵۳۵، ۵۷۹
لطیف ہوسناکی ۶۳۸
لطیفے ۶۶_۶۸

لسیات ۳۶۲، ۳۶۳
لیڈی ڈیانا ۳۴۷
ماتحت اور اعلیٰ عدالتوں
کے فیصلوں میں تضاد ۱۰۳، ۱۵۸
ماڈلنگ ۲۶، ۴۴۷، ۴۴۸، ۵۴۴، ۵۵۳
مارکیوزے، ہبریٹ ۴۲، ۵۷۷
محبت ۵۳۶، ۶۰۷، ۶۳۶
مخلوط تعلیم ۲۶
مروجہ معاشرتی معیار ۸۶، ۱۵۸، ۳۷۳، ۴۳۱_۴۵۴،
۶۲۱، ۶۲۲، ۶۸۷، ۶۸۸، ۶۹۲
مدارس ۳۲۵، ۳۳۱_۳۳۳_۳۳۸، ۳۴۲
مذہب ۱۹، ۱۳۷، ۲۰۸، ۳۸۳، ۴۵۲، ۴۶۵، ۴۷۹، ۵۲۰،
۶۱۵
مشرق کے بند معاشرے ۱۹
مصلحتی سکوت ۲۵، ۱۳۳
معیار ۳۰، ۴۷، ۵۵، ۱۰۰، ۱۰۲، ۱۳۲، ۱۳۶، ۱۶۰، ۱۶۱،
۱۶۶، ۲۷۳، ۲۸۶، ۲۹۰، ۳۸۰، ۵۳۰، ۵۵۳، ۵۶۶،
۵۸۵، ۶۱۵، ۶۱۹، ۶۲۲، ۶۲۳، ۶۳۱، ۶۵۰، ۶۸۶،
۶۸۷، ۶۸۹، ۶۹۰، ۶۹۱، ۶۹۲، ۷۲۵
معیار، ذہنی ۳۰
مغرب/مغربی معاشرہ ۱۹، ۲۳، ۳۳، ۴۲، ۳۲۷، ۳۳۰
مغرب پرستی ۲۵
ملٹن ۲۱، ۳۶، ۱۳۵
مودودی، ابوالخیر ۷۳۶
مودودی، ابو الاعلیٰ ۲۳۰، ۷۳۶
موسیقی ۲۱، ۲۵، ۲۶، ۵۵، ۶۶، ۱۲۶، ۲۰۸، ۲۳۲، ۳۷۷،
۳۹۶_۳۹۷، ۳۹۸، ۵۸۹، ۶۵۰
مینٹل ماسٹربیشن ۳۸۹
نابالغ ۲۰، ۲۱، ۲۳، ۳۰، ۶۸، ۸۹، ۹۳، ۹۸، ۱۰۲، ۱۲۳،
۱۵۸، ۱۶۰، ۱۶۱، ۲۰۷، ۳۱۰، ۳۲۶، ۳۳۷، ۳۴۲، ۳۵۳،
۴۰۶، ۴۱۳، ۴۴۳، ۴۶۲، ۵۳۲، ۵۶۷، ۵۸۶، ۶۰۳،
۶۱۱، ۷۱۳، ۷۱۴، ۷۱۶
ناشائستگی ۲۰، ۷۳، ۴۵۲، ۴۵۳

نجاست نگاری ۱۹
نظام اخلاق ۲۶۹، ۲۷۰، ۲۷۱
نمائشی حیاپسندی ۸۱، ۸۲
ننگا پن ۲۲۳
نئی اخلاقی کائنات ۲۳
نئی اخلاقیات ۴۸، ۵۱
نئی اقدار ۴۴، ۱۱۳، ۳۶۲
نئی تہذیب ۹۹
نیت ۱۰۰، ۱۰۱، ۱۵۹، ۱۷۷، ۲۵۸، ۲۹۰، ۳۸۱، ۴۳۷،
۴۴۸، ۴۵۲، ۶۹۶، ۷۱۱، ۷۱۳، ۷۱۷
نیوائیر نائٹ ۲۶
ویلنٹائن ڈے ۲۶، ۴۳۰، ۴۳۱
وہی وہانوی ۶۰، ۱۴۳، ۲۲۸، ۳۴۲، ۳۴۴، ۳۴۵، ۳۴۶،
۳۵۲، ۳۵۳، ۳۵۷، ۳۵۸، ۴۴۴، ۵۴۲، ۷۳۰، ۷۶۵
ہزلیات ۱۴۵، ۱۷۵، ۲۲۸، ۳۲۵، ۳۵۲
ہم جسمانیات ۲۳
ہم جنسیت ۸۶
ہوس پرستی ۹۷، ۷۶۵
ہوس کاری ۴۲، ۴۳، ۴۴، ۵۰
ہوس نگاری ۱۹، ۴۰
ہیومن کلوننگ ۲۳
یورپ ۲۰، ۹۳، ۱۰۲، ۱۰۵، ۱۳۸، ۱۵۳، ۲۵۷، ۳۵۷،
۳۶۱، ۴۲۹، ۵۸۶
یوم پاکستان ۲۶
یونان ۲۱، ۱۱۳

'روشنی کم، تپش زیادہ'

علی اقبال کی زیرِ نظر فقیدالمثال کتاب 'روشنی کم، تپش زیادہ' عریانی اور فحش نگاری کے موضوع پر اردو ادب اور دیگر فنونِ لطیفہ کے زمرے میں آنے والی تحریروں اور ان تحریروں پر معاشرتی اور عدالتی احتساب کا انسائیکلوپیڈیا ہے۔

امرِ واقعہ ہے کہ یہ بے مثال کارنامہ قارئین کو ایک اہم اور حساس موضوع پر اہم اور تاریخی نگارشات سے نہ صرف متعارف کرواتا ہے بلکہ عریاں نگاری اور فحش نگاری کے موضوع پر قارئین ادب اور فنون کے لئے ایک ایسا خزینہ، معلومات فراہم کرتا ہے جس کی تلاش اور تدوین کے لئے علی اقبال کو ۳۰۔۳۵ سال لگے۔ ادب میں شاعری ہو یا فکشن یا تنقید اور بصری فنون میں مصوری ہو یا فلم یا مصور یا خود فنکار، علی اقبال نے ہر نوع کے احتساب پر سے پردہ اٹھایا ہے۔ اس دائرے میں انٹرنیٹ تک شامل ہے۔ علاوہ ازیں، ہر شعبے کی احتساب زدہ کاوشوں کی فہرستیں بھی پیش کر دی گئی ہیں تاکہ ہم عہدِ گذشتہ کے معیاراتِ تنقید کا موجودہ دور کے معیارات سے مقابلہ بھی کر سکیں۔ اس خزینۂ علمی میں اردو کے بڑے اہم ادبا کے علاوہ بین الاقوامی شہرت کے ادبا اور فلسفیوں کی آرا بھی شامل کر لی گئی ہیں۔ الغرض، علامہ شبلی نعمانی، حکیم الامت علامہ اقبال، مولانا حسرت موہانی، علامہ مشرقی، غالب، جوش ملیح آبادی، فراق گورکھپوری، سعادت حسن منٹو، میراجی، خشونت سنگھ اور سلیم احمد کے ساتھ کشور ناہید، فہمیدہ ریاض اور مصور جمیل نقش اور احمد سعید ناگی وغیرہ وغیرہ کے ساتھ ایک ایسی محفل لفظ، رنگ اور آواز سجائی گئی ہے کہ قارئین سوچنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ آیا عریانی اور فحش نگاری بالذات مظاہر ہیں یا محض ہماری سوچ کے وہ انداز ہیں جو کبھی غیر فحش کو فحش اور فحش کو غیر فحش سمجھتے آئے ہیں۔ یہی بات اس عمل پر صادق آتی ہے جسے ہم احتساب سمجھتے ہیں۔

علی اقبال نے عریانی اور فحش نگاری کے مقدمے میں منصف بنے بغیر، کتاب شامل مواد کو، موضوعات کی ترتیب سے، اس طرح پیش کیا ہے کہ یہ عمل بڑے سلیقے کے ساتھ بذاتِ خود احتساب معلوم ہوتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ علی اقبال نے اپنے پس منظر اور اعلیٰ تہذیبی آدرشوں کی مدد سے، اس کتاب کو اعلیٰ درجے کی تدریسی ضرورت بنا دیا ہے۔

یہ اپنی نوعیت کا اولین کام ہے، جس کی جس قدر تعریف کی جائے، کم ہے۔

ڈاکٹر محمد علی صدیقی
۹ جولائی ۲۰۰۹ء، کراچی

Price Rs. 1250.00
ISBN: 978-969-407-359-0

Cover designed by Ovaes Ameen

ROYAL BOOK COMPANY
BG-5, Rex Centre, Fatima Jinnah Road,
Karachi-75530, Pakistan.